مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کا جریدہ



مجلس ادارت

پتہ: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ ۸ا منزلہ بمبئی نمبر ۳۲-۴۰۰۰

اِمکان

بار اوّل

جنوری۔ فروری۔ مارچ ۱۹۸۰ء

قیمت: ۱۰/ روپے



کتابت:۔ اسلم کرتپوری، احمداللہ خان

سرورق:۔ ایم۔ حسین

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی نے گورنمنٹ سنٹرل پریس
بمبئی نمبر ۴ میں چھپواکر دفتر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی
نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ ۱۸ واں منزلہ بمبئی نمبر ۳۲ سے شائع کیا

ترتیب

مضامین:

۱۔ اُردو شعریات — ڈاکٹر محمد حسن
۲۔ لینن میوزیم میں چند لمحے — جگن ناتھ آزاد
۳۔ مولوی عبدالحق (نفسیاتی مطالعہ) — ڈاکٹر عبدالستار دلوی
۴۔ برار کا دبستانِ شاعری — ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
۵۔ اُردو لغت ایک سرسری جائزہ — شاہد ندیم
۶۔ انارکلی میں تصادم، کشمکش اور عمل — اخلاق حسین عارف
۷۔ میرا پسندیدہ ادیب — رشید قریشی

افسانے:

۱۔ اسٹاپ — جوگندر پال
۲۔ روز و شب — غیاث احمد گدی
۳۔ تین افسانے — رتن سنگھ
۴۔ بے نام رشتوں کی ضرب — احمد عثمانی
۵۔ رام تجار — علی امام نقوی
۶۔ پوسٹ مارٹم — مصطفیٰ علی اکبر
۷۔ وہ کتاب — نسیم شمع

ڈرامہ:

۱۔ رہزن — رفیعہ منظور الامین
۲۔ غالب بمبئی میں — سلام بن رزاق

علاقائی ادب:

۱۔ نقشِ قدم — ڈاکٹر عبدالستار دلوی
۲۔ سکہ — شمر بانو مُلّا
۳۔ بازار کی بات — سلام بن رزاق
۴۔ مدرسہ کا راستہ — محمد حسین پرکار
۵۔ میری ماں — فاطمہ مومن
۶۔ پوسٹ آفس — ڈاکٹر سُکتیا جوہری

طنز و مزاح:

۱۔ چاندنی چوک — رؤف خوشتر
۲۔ بستیاں بستیاں — پرویز یداللہ مہدی

غزلیں:

۱۔ سکندر علی وجد
۲۔ جگن ناتھ آزاد
۳۔ گلزار دہلوی
۴۔ مظفر شاہجہانپوری
۵۔ عشرت جالندھری
۶۔ مظفر حنفی
۷۔ ممتاز راشد
۸۔ میر ظہیر
۹۔ قمر اقبال
۱۰۔ منشاء الرحمٰن منشاء
۱۱۔ ذکیہ سلطانہ نیّر
۱۲۔ نظام الدین نظام
۱۳۔ عتیق احمد عتیق
۱۴۔ خیال انصاری
۱۵۔ محبوب راحت
۱۶۔ ساز عثمانی
۱۷۔ شبیر احمد راہی
۱۸۔ رفیعہ شبنم عابدی
۱۹۔ افتخار امام صدیقی
۲۰۔ حنان ارمان
۲۱۔ شمیم فاروق
۲۲۔ عبدالاحد ساز
۲۳۔ سعید طارق
۲۴۔ ارتضیٰ نشاط
۲۵۔ رفیق جعفر
۲۶۔ تنویر عالم جلگانوی
۲۷۔ کنیز انجم
۲۸۔ شبانہ سحر

نظمیں:

۱۔ اُردو — ساغر نظامی
۲۔ فیضانِ سبتی — عرشی زادہ
۳۔ کربلا — سردار جعفری
۴۔ دعا۔ تلاش — انجم رومانی
۵۔ تین نظمیں — حفیظ آتش

سیمینار

گوشۂ پریم چند:

۱۔ پریم چند اور ہم — آل احمد سرور
۲۔ پریم چند، قومی یکجہتی کا علمبردار — خواجہ احمد عباس
۳۔ کفن کا تجزیاتی مطالعہ — باقر مہدی
۴۔ پریم چند کا سماجی اور طبقاتی شعور — ڈاکٹر قمر رئیس
۵۔ پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو — شمس الرحمٰن فاروقی
۶۔ پریم چند، ایک نظر میں — خواجہ عبدالغفور

گوشۂ مخدوم محی الدین:

۱۔ مخدوم کی زندگی اور شعر — ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
۲۔ مخدوم ۔ فن اور شخصیت — صفی الدین صدیقی
۳۔ مخدوم کی سیاسی شاعری — معین شاکر
۴۔ مخدوم ۔ احوالِ دگر — خواجہ عبدالغفور
۵۔ مخدوم ۔ محرکات اور ماحول — ایشور راج صاحر

گوشۂ فانی بدایونی:

۱۔ افتتاحیہ — ڈاکٹر اسحٰق جہانہ رالا
۲۔ کلامِ فانی کے بعض پہلوؤں پر ایک سرسری نظر — فضیل جعفری
۳۔ فانی کا تصورِ مرگ — بشر نواز
۴۔ فانی ۔ ایک تاثر — ڈاکٹر عبدالستار دلوی
۵۔ فانی کی شخصیت، ایک تجزیہ — رشید الدین
۶۔ ذاتی: ایک یاد — خواجہ عبدالغفور



اکادمی ڈائری

رشتۂ تحریر

حرفِ آغاز

لیجئے "امکان" پیش خدمت ہے ——————

اہلِ علم و نظر نے ہمارے پہلے شمارے 'نورس' کو داد و تحسین کی نظر سے دیکھا ہے اور ہمیں تعریفی خطوط سے نوازا ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔

پچھلے دنوں اردو اکادمی نے پریم چند پر بمبئی میں، مخدوم محی الدین پر اورنگ آباد میں فانی بدایونی پر شولاپور میں سیمینار منعقد کئے۔ ان سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالے شاملِ اشاعت ہیں۔ ہندوستانی ادب میں مراٹھی افسانے اور کہانیاں اپنے سیدھے سادے اسلوب اور جیتے جاگتے زندگی سے قریب موضوعات کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اس بار ہم کئی مراٹھی افسانوں کے تراجم بھی پیش کر رہے ہیں۔ مراٹھی اور گجراتی کے یہ تراجم ہمیں ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب کے توسط سے حاصل ہوئے۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے علاقائی زبانوں کا یہ حصہ بھرپور ہوگیا۔ آئندہ بھی ڈاکٹر دلوی کے توسط سے زیادہ سے زیادہ تراجم پانے کی توقع ہے۔ اس سے ہم اردو اور مراٹھی میں قریبی تعلق پیدا کرکے لسانی یک جہتی کی روایات کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے انتخاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ نئے لب و لہجہ اور تازہ فکر کی حامل شاعری کو خصوصی اہمیت دی جائے ——

اردو اکادمی کی جانب سے حال ہی میں پاکستان کے مشہور افسانہ نگار انتظار حسین اور احمد ہمیش کی آمد کے موقع پر استقبالیہ اور شامِ افسانہ منعقد کی گئی تھی۔

اس سے پہلے بھیونڈی میں فصاحت جنگ جلیل پر سیمینار منعقد کیا گیا تھا۔ اس شامِ افسانہ اور سیمینار کی روداد ہم اگلے شمارہ میں پیش کریں گے۔ مہاراشٹر میں اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے اردو اکادمی کی خدمات کے اعتراف میں جن حضرات نے ہمیں اپنے خطوط سے نوازا اور مبارکباد بھیجی ہے ہم ان کے مشکور ہیں۔

اپنے نئے مالی سال کے دوران ہمیں آپ کے مشوروں کا انتظار رہے گا —— آپ کی رہنمائی ہمارے ارادوں کو استحکام اور حوصلے کو یقین بخشے گی۔

اپنی بات

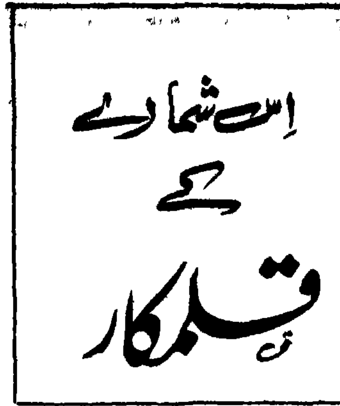
بعض ٹیکنیکل مجبوریوں کے سبب "نورس" اب "امکان" میں بدل چکا ہے۔ گذشتہ بار ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اگلا شمارہ ہم اور بھی بہتر بنانے کی کوشش کریں گے، ہم نے بہتری کوشش کی ہے، یقین ہے کہ آپ بھی اس کی گواہی دیں گے۔

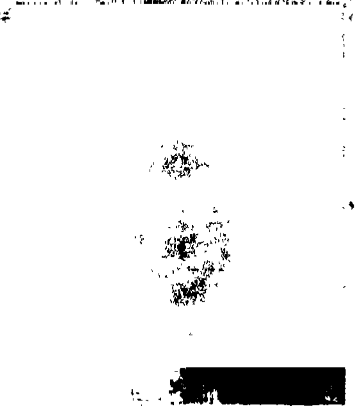
"نورس" کا جس گرمجوشی سے استقبال کیا گیا ہے اس نے ہمیں مزید حوصلہ بخشا ہے۔ جن حضرات نے ہماری خامیوں کی نشاندہی کی ہے، ہم ان کے بھی مشکور ہیں اور کوشش کریں گے کہ انھیں بھی مطمئن کرسکیں۔

مختلف مقامات سے جن مشاہیرادب نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے ہم ان کے بھی مشکور ہیں۔ ہم مسلسل یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ ہر شمارہ کے ساتھ ادبی وزن و وقار میں اضافہ ہوتا رہے۔ ہماری ایک اور شعوری کوشش یہ بھی ہے کہ مراٹھی افسانوں کو جن کا ہندوستان کی زبانوں میں ایک بہت اہم اور اعلی مقام ہے، برابر اردو میں منتقل کریں۔ چنانچہ اس بار بھی ہم چند خوبصورت مراٹھی اور گجراتی افسانوں کے ساتھ یہ شمارہ پیش کر رہے ہیں۔

ہمیں آپ کی مسلسل رہنمائی کی ضرورت ہے

حسن کمال



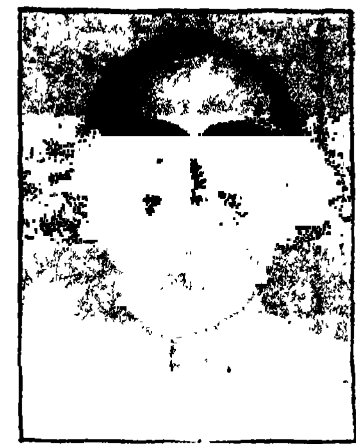

آل احمد سرور


سردار جعفری


جگن ناتھ آزاد

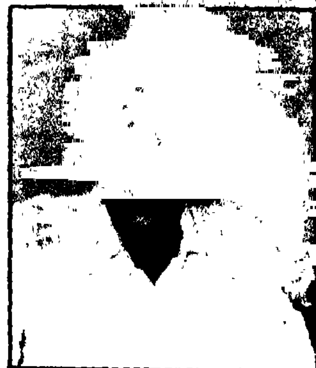

قمر رئیس


شمس الرحمن فاروقی

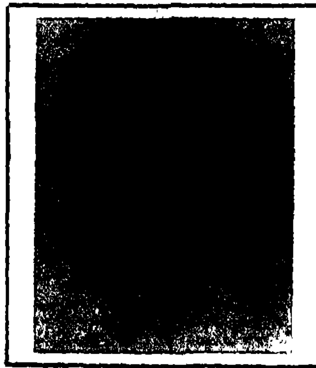

خواجہ عبدالغفور


خواجہ احمد عباس

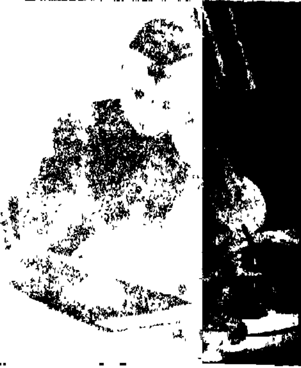

ڈاکٹر عبدالستار دلوی



بشر نواز



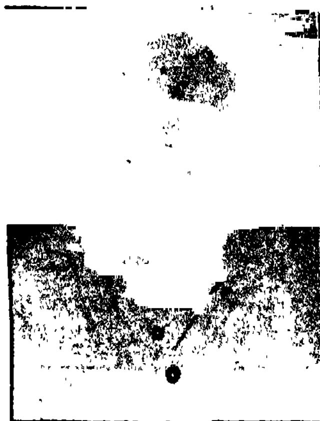
فضیل جعفری



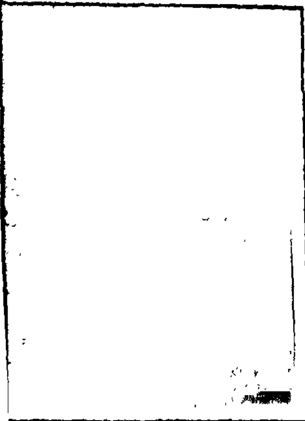
گلزار دہلوی



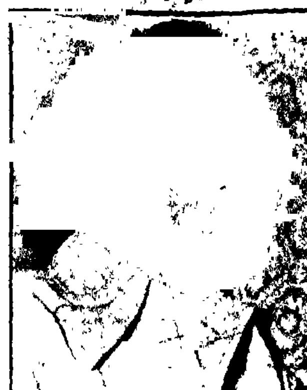
شبیر احمد راہی



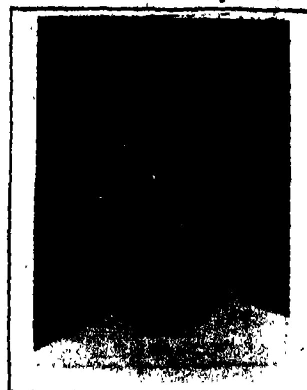
منشاء الرحمن منشاء



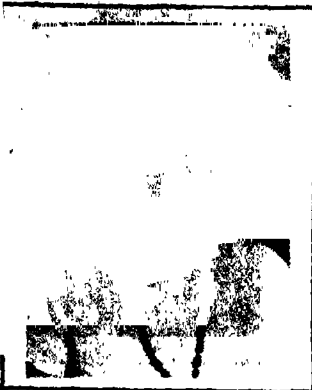
انجم رومانی



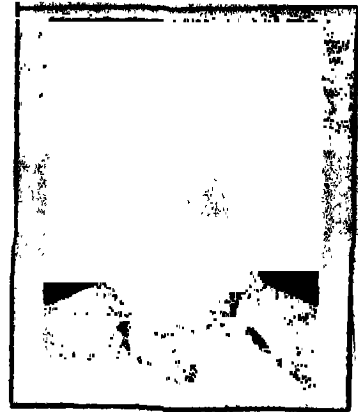
غیاث احمد گدی



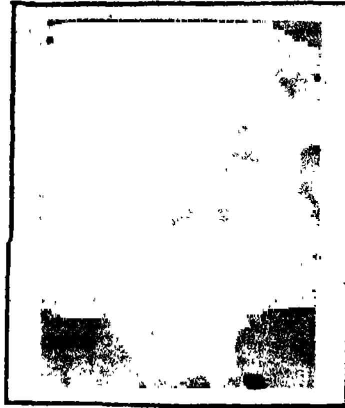
مصطفیٰ علی اکبر



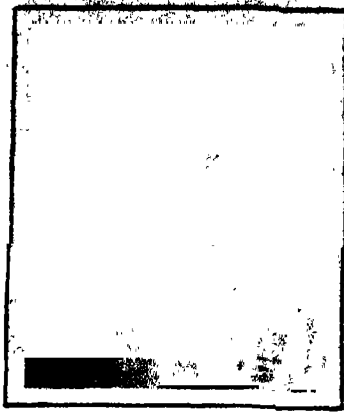
رفعیہ شبنم عابدی



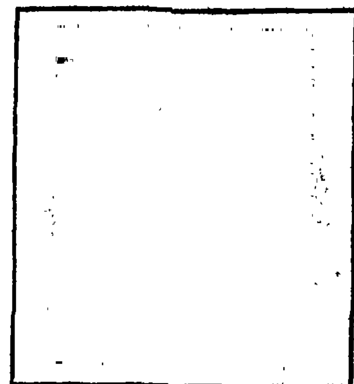
عبدالاحد ساز



نظام الدین نظام



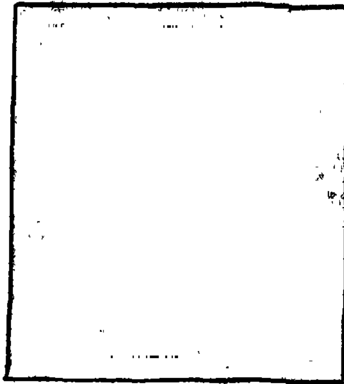
نسیم شمع



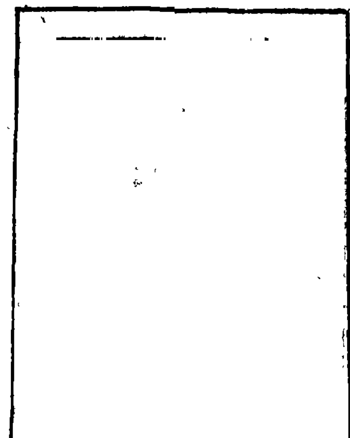
ارتضیٰ نشاط



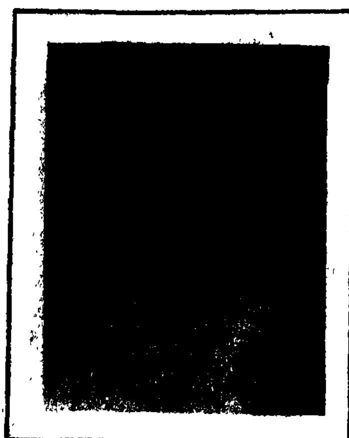
ڈاکٹر سکینہ جوہری



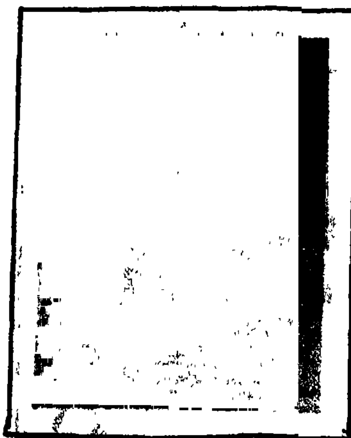
شہر بانو مُلّا



فاطمہ مومن



شبانہ سحر



شاہد ندیم

ڈاکٹر محمد حسن

اُردو شعریات

اردو شعریات کا مسئلہ خاصہ پیچیدہ ہے اردو ایشیائی زبان ہے۔ اس نے یہاں کے مزاج اور کردار سے بہت کچھ حاصل کیا۔ پھر مغرب کا بول بالا ہوا تو ارسطو کی بوطیقا اور مغربی شعریات کا چلن ہوا اور اس سے بھی اردو شعریات نے بہت کچھ سیکھا پھر اس کا اپنا مزاج ہے اور اس کے مطابق اس کے اپنے معیار و اقدار کی تلاش کی جانی چاہیئے۔

مغربی معیاروں پر اردو شعریات پر حکم لگانے کی کوشش عام ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے تخلیقی سرچشمے مغرب میں نہیں مشرق میں ہیں مزاج بھی ایشیائی ہے۔ اور یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ انسانی ارتقا کے پانچ گہواروں میں سے دو یعنی چین اور ہندوستان جہاں بھرت نے ناٹیہ شاستر لکھا اور بعض کے نزدیک پانچویں صدی قبل مسیح میں لکھا جہاں اس کا نظریہ وضع ہوا دھونی اور النکار کے نظریے رائج ہوئے اور تخلیق فن کے رشتے انسانی شخصیت، شعور، کیفیت اور آگہی سے جوڑے گئے لفظوں کی محاکاتی اور صوتی تقسیم ہوئی اور تخئیل اور انبساط کے نئے رشتے تلاش کئے گئے پھر چین اور جاپان تھے جہاں چینی شاعری، مخصوص مصوری اور نوہ ڈرامے اور ہائیکو نے جنم لیا۔ چند صدیوں بعد مغربی ایشیا نے افلاطونی فکر اور عرب اور ایرانی تہذیب سے روشنی لے کر فصاحت اور بلاغت کے نظریے وضع کئے اور ادب اور فن کا ایک نیا پیمانہ وضع کیا۔

تنقیدی نظریات کے اس آئینہ خانے میں اجنتا کی ان تصویروں کو شامل کر لیجئے جن کے بنانے والوں کا نام کوئی نہیں جانتا۔ ان چینی نظریوں کو بھی شامل کر لیجئے جن کو آئی اے رچرڈ اور ایزرا پاؤنڈ نے بیسویں صدی میں کلیدی تصور کی حیثیت سے قبول کیا۔ اور جس کا بھونڈا سا ترجمہ 'توازن' کیا جا سکتا ہے۔ وہ ڈراموں کو بھی شامل کر لیجئے جن میں بدھ سے متعلق ہی کوئی لطیف سا قصہ مخصوص علایم، سنگیت اور رقص کے ساتھ اسٹیج کیا جاتا ہے۔ غزل کو بھی شامل کر لیجئے جس کی لفظیات اور علامتیں معین ہیں اور جس کے مضامین کی حد بندی میں انفرادی نقش و نگار نغمہ و آہنگ ابھرتے ہیں ان میں ہندوستانی اور ایرانی کی موسیقی کو بھی شامل کر لیجئے جس میں مضامین اور موضوعات راگ راگنی حتیٰ کہ اوقات بھی معین ہیں اور فرد کا کمال صرف یہ ہے کہ وہ ضوابط اور آہنگ کے مطابق ان کی ادائیگی کر سکے۔ یہی صورت رقص کی ہے کہ کتھا کلی سے کتھک تک معین سانچے کار فرما ہیں۔

ان سب سے نئی تصویر ابھرتی ہے۔ یقیناً یہ تصویر Naturalism سے قطعاً اور ارسطو کے نظریہ نقل سے کسی قدر مختلف ہے یعنی فن نقل فطرت ہے لیکن فطرت کا مجموعی پیکر یا ہئیت کیا ہے؟ گویا روح عصر یا روح اشیا کیا ہے۔ کیا کوئی مجموعی ہئیت Form ہے جو اپنے کو مختلف شکلوں میں ظاہر کرتی ہے۔ گویا حقیقت کے اسی اجتماعی ہیولیٰ کی دریافت علم و دانش ہے اور اس ہیولیٰ کو آئین و ضوابط کے مطابق پیش کرنا فن ہے اسی لئے شعر کا رشتہ شعور سے اور فن کا رشتہ دانش سے جوڑا گیا اور شعر و حکمت کی پیوند کاری ظہور میں آئی۔

یہاں توجہ طلب ہے یہ پہلو کہ فن فرد کی آواز نہیں اجتماعی ہیولے کی آواز ہے فن کار کی ذاتی اور انفرادی کاوش اسی روح اجتماعی کی تابع تھی یہ مسئلہ صرف اس فنی پیکر اور دانش عصر اور آہنگ اجتماعی کا وسیلہ بننے کا تھا جیسے روح اجتماعی فن کار کو اپنی آواز کے طور پر برت رہی ہو لہٰذا Form اور Norm۔ ہئیت اور ضوابط اہم تھے اور فرد غیر اہم۔ شاعر اور فنکار کے نام سے بے اعتنائی یا تخلص کا استعمال اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب شاعر Form اور Norm

کی آواز ہوتی ہے تو اپنی نجی شخصیت سے مختلف محض وسیلۂ اظہار ہوتا
ہے خواہ آواز کو سماوی قرار دیا جائے یا روح عصر۔
ایشیائی آرٹ کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ تربیت یافتہ
قاری یا ناظر کی عملی شرکت کے بغیر ادھورا ہے۔ اگر ہمارا مخاطب غزل کی
علامتوں سے واقف نہیں تو نہ صرف ترسیل اور اظہار ادھورے ہیں
بلکہ فن فن کا درجہ ہی حاصل کرسکتا گویا اختصار اور اشاروں سے بات
کرنا ایشیائی بوطیقا کی ایک لازمی شرط ہے تفصیل غیر ضروری مربوط
تاثر پارے کسی قدر بے جا اور بے محل ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ
۱۸ ارکان میں پورے ہونے والے ہائیکو سے لے کر دو مصرعوں میں مضمون
کو پورا کرنے والے غزل کے شعر میں سارا نظام صرف اشاروں کا ہے۔
ایک ہائیکو ملاحظہ کیجئے ؛۔

دتلی
مندر کے بڑے گھنٹے پر
بے خبر سو رہی ہے '

مراد یہ ہے کہ اسے اپنی موت کی خبر نہیں کہ گھنٹہ بجے گا اور وہ مرجائیگی۔
غزل کا کچھ یہی احوال ہے کہ اخلاقی ، متصوفانہ اور عشقیہ مضامین تک
ایک مدت اسے محدود رکھا گیا اور اشاروں کا یہی فن علامت اور لفظیات
میں جگہ پاتا رہا۔ جدید جمالیات شاہد ہے کہ حسن کلام کا ایک پہلو قاری
یا مخاطب کی شرکت بھی ہے ایسی تصویریں ہیں جن کا ایک حصہ جان بوجھ کر
ادھورا چھوڑ دیا گیا ہے کہ دیکھنے والا خود اپنے تخیل کی مدد سے اسے مکمل
کرکے اپنی تخلیق کا سا انبساط محسوس کرے۔ یہی حال غالب کے متعدد
اشعار کا بھی ہے۔ اختصار اور اشاراتی پیرایہ ایشیائی بوطیقا کا اہم جزو
ہیں اور اردو غزل میں ان کی گونج بڑی حد تک قدرتی ہے جو مغربی
بوطیقا اور شعریات کی مدد سے حل نہیں کیا جاسکتا۔
ایشیائی بوطیقا کا ایک اور پہلو تخیل کا ایک نئے انداز سے استعمال
بھی ہے۔ تقریباً سبھی ایشیائی ممالک کی مصوری میں پس منظر کا استعمال
نہیں ہوا ہے خواہ مغل اور راجپوت دور کی miniature مصوری
ہو یا چین اور جاپان کی علامتی تصویریں یہ بات کسی حد تک مشترک ہے۔
یہی صورت جاپان کے نوہ ڈرامے سے لے کر اردو میں اندرسبھا تک مشترک
ہے کہ کئی مقامات اور کئی مختلف وقت میں ہونے والے واقعات ایک ہی
وقت میں اسٹیج پر اور تصویریں ایک ہی سطح پر دکھائے جاسکتے ہیں اور
دیکھنے والے سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ خود ان مختلف تصویروں کو
وقت اور مقام کے اعتبار سے الگ الگ کرے گا مثلاً اندرسبھا میں
ایک ہی وقت میں ایک ہی اسٹیج پر سبز پری کے گھر کا منظر بھی ہے اور

اسی اسٹیج کے دوسرے کنارے پر راجہ اندر کا دربار بھی ہے اور کالا دیو
مختلف اپنی علامتی حرکات کے ذریعے اسٹیج پر اڑتا ہوا اور سبز پری
کو لاتا ہوا پیش کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تخیل کا یہ استعمال اور پس منظر
کے بغیر پیش منظر ہی میں مختلف مناظر کی یک جائی دوسرے فنون لطیفہ
پر بھی اثر انداز ہوئی۔ انداز بیان میں مرصع کاری ایک شعر یا مصرعے کو
مختلف تصویروں کی میناکاری سے مرقع تیار کرنا اسی فن کا مظاہرہ ہے
جسے آتش کی زبان میں نگوں کے جڑنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی قسم
کے تارٹ کو اگر تخیل کی مدد سے زمان و مکان سے ماورا -extra
temporal اور extra-spatial جہات کی تلاش قرار دیا
جائے تو بے جا نہ ہوگا گو اس منزل تک جانے کے لئے بھی زمان و مکان
سے گہری قربت لازمی ہے مگر اس کا رشتہ حقیقت کی نقل یا
Naturalism اور Realism کے بجائے تخیل کے فن کارانہ
اور تخلیقی استعمال سے ملتا ہے۔
جاپانی اور چینی شعریات سے گہری مماثلت ہندوستان عرب اور
ایران کے تنقیدی تصورات میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے
جو تصورات عربی اور فارسی ادب میں ابھرے ان میں اتفاق معذرات
تخیلی پر زور ہے یہاں اشیا اور تصورات کے باہمی ہم آہنگی
Parallism اور تخالف Contrast کی مدد سے ایک نیا فنی
پیکر تراشنے اور کیفیت اور انبساط پیدا کرنے میں زور دیا گیا فصاحت
اور بلاغت کی تعریف اور اس کے اصول و ضوابط پر عربی۔ فارسی اور
اردو میں دقیع کتابیں موجود ہیں یہی نہیں تقریباً سبھی تذکرہ نویسوں
اور شاعروں نے فصاحت کے اصول وضع کرنے اور انہیں ملحوظ رکھنے
کی کوشش کی ایک طرف تلاش لفظ تازہ اور دوسری طرف موقع و محل
کے مطابق موزوں الفاظ برتنے اور شیریں اور غیر نامانوس آوازوں کی
ترتیب سے خوش گوار آہنگ پیدا کرنے پر زور دیا گیا اور ہمارے کلاسیکی
شاعروں نے ان تصورات کو پیش نظر رکھا۔ یہی نہیں استادی اور شاگردی
کے سلسلے اور اصلاح کلام کے رواج مدتوں قائم رہے اور اب بھی جاری
ہیں جن میں فصاحت اور بلاغت کے یہی اصول پیش نظر رکھے جاتے ہیں
اور تنافر کلمات ، تنافر اصوات ، ثقالت ، شترگربگی اور دوسرے اقسام
سے کلام موزوں کو پاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ان اداروں اور تحریکات
کے باقاعدہ مطالعے سے اردو شعریات کی بنیادی تصورات ابھر سکتے ہیں
جو ہمیں مغربی شعریات کی کورانہ نقالی سے بچا کر ان کے تخلیقی استعمال اور
مشرقی بلکہ ایشیائی اور ہندوستانی شعریات سے استفادے کی طرف
رجوع کرسکتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

لینن میوزیم میں چند لمحے

(زیر تالیف سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" کا ایک غیر مطبوعہ باب)

تیسرے دن (۵ ستمبر) کی صبح کو جاگا اور کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو سڑکیں پانی سے تربتر تھیں۔ غالباً رات کو اچھی بارش ہوئی تھی۔ لیکن کمرے چونکہ ائیرکنڈیشنڈ ہیں۔ اس لئے باہر بارش ہو رہی ہو تو اندر نہ اُن کی آواز آتی ہے نہ اس کا کچھ بھی اثر پڑتا ہے۔ سڑک پر ٹریفک کا شور و غل بھی کمرے تک نہیں پہونچتا بلکہ سچ پوچھیں تو ماسکو میں سڑک پر ٹریفک کا شور و غل ہوتا ہی نہیں۔ موٹر کاریں اور بسیں وغیرہ ذوالفقار علی خان کے موٹر کی طرح تیز پا ہونے کے ساتھ ہی ساتھ خموش بھی ہیں۔ اس اعتبار سے ماسکو کو ایک سناٹے کا شہر کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ گورکی اسٹریٹ پر ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن کیا مجال جو کسی طرح کا شور کانوں میں پڑ جائے۔ ہاں ہوائی جہاز اوپر سے گذر جائے تو بات دوسری ہے۔

میں الگزینڈر کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ۱۱ بجے انھیں آنا تھا اسی دوران میں ڈاکٹر گاندھی کا فون آیا اور انہوں نے بتایا کہ اُوما شنکر جوشی آج ۹ بجے کے طیارے سے آرہے ہیں۔ جوشی جی گجراتی کے ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے شاعر ہیں ہماری ساہتیہ اکیڈمی کے صدر ہیں۔ دہلی میں بین الاقوامی اقبال صدی تقاریب کا افتتاح انھیں نے کیا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے اقبال پر جو مقالہ پڑھا وہ ایک دائمی ادبی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی شخصیت پر اقبال کے اس مصرع کا بآسانی اطلاق ہوتا ہے۔

بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

تھوڑی دیر میں گاندھی، جوشی صاحب کو اپنے ساتھ لے کے اسی ہوٹل میں پہنچ گئے جس میں میں مقیم تھا۔ گاندھی جی نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نامور سنگھ، ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر گوپ بھی اسی طیارہ سے ماسکو پہنچے ہیں اور ملسک ہوٹل میں مقیم ہیں۔ یہ تینوں حضرات فرینڈشپ ہاؤس کے مہمان تھے۔ جوشی صاحب میری طرح سوویٹ رائیٹرز یونین کے مہمان تھے۔

اس وقت تک الگزینڈر بھی پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کے چائے پی۔ یہ میزبانی ڈاکٹر گاندھی کی طرف سے تھی جوشی صاحب نے کہا کہ آزاد صاحب! آپ سے ملنے کے لئے روس آنا پڑا میں نے کہا میں اگر دلی میں ہوتا تو میری طرف سے یہ گستاخی ہرگز نہ ہوتی کتنی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکا ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ میں جموں میں ہوں اور دہلی کی ادبی سرگرمیوں سے دور ہو گیا ہوں۔

چائے کے بعد میں اور الگزینڈر لینن کا مقبرہ دیکھنے کے لئے نکلے وہاں پہنچے تو ایک طویل کیو (Q) سے سابقہ پڑا۔ کیو میں ہم لوگ کھڑے تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اب میرے لئے بارش میں کھڑا ہونا دشوار تھا۔ بقول فراق ؎

ارے وہ درد محبت سہی تو کیا مر جائیں

فوراً کمرے کا رخ کیا کمرے میں پہنچے۔ تھوڑی دیر بات چیت کی۔ اسی دوران میں حبیب الرحمٰن صاحب اور اشفاق صاحب کے ٹیلی فون آئے۔ انہوں نے دن کے پروگرام کے متعلق پوچھا میں نے تفصیل کہہ سنائی۔ اشفاق صاحب نے شام خالی رکھنے کی فرمائش کی۔

کھانے کے بعد موسم قدرے بہتر تھا۔ سوچا اب پھر لینن کے مقبرے کا رخ کرنا چاہیئے۔ تو ملیشیا والوں نے بتایا کہ مقبرہ ایک بجے بند ہو جاتا ہے لیکن ابھی دو چار منٹ میں ٹھیک تین بجے (Changing of the guard) ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ کر جائیے۔

(Changing of the guard) کا منظر میں لندن میں شاہد (بکنگھم پیلس پر) کئی برس پہلے دیکھ چکا تھا۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا انتہائی دلکش۔ دونوں مناظر ڈسپلن اور ٹریننگ کی ایک ایسی

تصویر تھے جس کی تعریف الفاظ میں ممکن نہیں۔

اس کے بعد لینن میوزیم کے بارے میں پوچھا۔ پتہ چلا کہ ابھی کھلا ہے۔ پانچ بجے تک کھلا رہے گا۔ چنانچہ ہم نے لینن میوزیم کا رخ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہی عظیم لینن کے عظمت نے ہمارا استقبال کیا اور جوں جوں میں میوزیم میں آگے بڑھتا گیا مجھ پر ہیبت کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی گئی جو لینن کے متعلق متعدد کتابیں پڑھنے پر بھی طاری نہ ہوتی تھی۔ یہ میوزیم کیا تھا۔ تاریخ کا ایک بڑا اہم باب تھا جس کے صفحے لحہ بہ لحہ میرے سامنے کھلتے جا رہے تھے۔ اور یقین محکم، عمل پیہم کا مفہوم مجھ پر واضح کرتے چلے جا رہے تھے۔ نہ جانے یہ شخص فولاد کا بنا ہوا تھا یا کیا تھا۔ اس کو کیا طلسماتی قوت عطا ہوئی تھی کہ اس نے غلاموں کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا کر کے زارشاہی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

مختلف کمروں میں لینن کے کوٹ، اوور کوٹ، ٹوپیاں اور دوسرے کپڑے رکھے تھے وہ تحائف بھی تھے جو اسے عوام نے پیش کئے تھے۔ اس کے زیر استعمال آنے والی چیزیں بھی۔ کرسیاں بھی۔ لیکن ایک کمرہ ایسا تھا جسے میں دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ یہ لینن کا کمرۂ مطالعہ تھا اور بالکل اسی انداز پر سجایا گیا تھا جس انداز سے یہ لینن کے زیر استعمال رہا تھا۔ میز پر دائیں طرف بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ سامنے پیپر کٹر اور قینچی رکھی تھی۔ قلم دوات کاغذ بالکل اسی طرح رکھے تھے جس طرح وہ لینن کے استعمال میں رہتے تھے۔ کرسی کے پیچھے اور دائیں بائیں کتابوں سے بھرے ہوئے ریک اور الماریاں رکھی تھیں۔ اس کمرے نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ میری نظر میں چارلس۔ ڈکنز، شکسپیئر اور اقبال کے وہ کمرے گھوم گئے جن میں یہ لوگ رہتے تھے اور جس میں انہوں نے فلک بوس بلندیوں والا ادب پیدا کیا تھا۔ لینن کے تخلیقی ادب کی نوعیت دوسری تھی لیکن روس کی عظمت بتا رہی تھی کہ یہ بھی کسی سے کم نہیں تھی۔

لینن میوزیم سے باہر نکلے تو پھر بارش نے گھیر لیا۔ گاڑی آج ہمارے پاس نہیں تھی۔ لیکن فوراً ہی ٹرالی بس مل گئی جس نے بڑے آرام سے ہوٹل تک پہنچا دیا۔

ہوٹل واپس آئے پتہ چلا کہ ماسکو یونیورسٹی میں لیکچر کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور وقت بھی ۷ ستمبر شام کے پانچ بجے۔ دوسری اطلاع یہ تھی کہ دوسرے دن مجھے اور جوشی صاحب کو روسی ادیبوں اور دنیا کے تیس ملکوں سے آئے ہوئے ڈیلیگیٹوں کے ساتھ یاسنایا پالیانا جانا ہے۔ جو ٹالسٹائی کی جنم بھومی ہے۔ ان دنوں روس میں ٹالسٹائی کی ایک سو پچاس ویں سالگرہ منائی جا رہی ہے اور یاسنایا پالیانا میں ہم لوگوں کو اس عظیم فن کار کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا ہے اس اطلاع سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ابھی گزشتہ دسمبر میں مجھے لاہور اور سیالکوٹ (پاکستان) جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ جہاں علامہ اقبال کے گھر جا کر ان کی یاد میں میں نے اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔ آج مجھے ٹالسٹائی کی جنم بھومی میں پہنچ کر یہی فرض ادا کرنے کی سعادت مل رہی تھی ؎

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اُس وقت اقبال کے یہ اشعار جو انہوں نے عالمِ بالا کی صحبتِ رفتگاں میں ٹالسٹائی کے منہ سے کہلوائے ہیں میرے حافظے میں تازہ ہو گئے۔

بار کش اہرمن لشکری شہریار   اِنچۂ نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
زحمت پر چشمش نکہت معز ندانہ زہر پرست   مردکِ بیگانہ دوست سینۂ خویشاں درید
دارائے بہشتی ہست تاج کلیسا و طن   جانِ خدا داد را خواجہ بہ جامے خرید

اور

عقلِ دو رو آفرید فلسفۂ خود پرست
دریں رضائی دہد بندۂ مزدور را

اور میں سوچنے لگا کہ وہ وقت کب آئے گا جب دنیا ادیبوں اور شاعروں کے تصور کی دنیا بنے گی۔ ایک اکائی جس میں انسان صرف دنیا کا شہری ہوگا۔

ٹھیک اسی وقت قمر رئیس کو فون کیا چاہا کہ ان سے پوچھوں وہ کہ وہ اور ڈاکٹر ظہور الدین کل کی یاترا میں شریک ہیں یا نہیں کوشش کے باوجود قمر رئیس نہ مل سکے۔ نامور شکرا گئے انہوں نے بتایا کہ وہ دونوں یاسنا پالیانا جا رہے ہیں۔ یہ اطلاع باعث مسرت ہوئی شام ہوتے ہی مرزا اشفاق بیگ حسب وعدہ تشریف لائے کھانے پینے کا سامان وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ دس بجے تک ان کے ساتھ محفل جمی رہی اپنے بھائی۔ فیض، سبط حسن اور سردار جعفری کی باتیں ہوتی رہیں۔ شعر و شاعری کا دور بھی چلا گویا ماسکو میں تھوڑی دیر کے لئے ہم دونوں نے ایک چھوٹا سا برصغیر ہند و پاک بنا لیا۔

اشفاق صاحب پراگریس پبلشرز سے وابستہ ہیں اور براہ راست روسی سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ کرتے ہیں۔ یہ ادارہ ماسکو میں علم کی ایک ایسی جوت جگائے ہوئے ہے جس کی تجلی مشرق و مغرب میں دور دور تک پہنچ رہی ہے۔

رات کو میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ قمر رئیس کا ٹیلی فون آیا۔ ماسکو میں ان کی آواز سن کر جی خوش ہو گیا۔ بولے کل یاسنا پالیانا کے لئے گاڑی یہاں آپ کے ہوٹل سے چلیں گی ہم لوگ صبح سات بجے آپ ہی کے ہوٹل میں آ جائیں گے۔ پھر دن بھر ساتھ رہے گا۔ اس سے زیادہ خوش آئند اطلاع اور کیا ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

مولوی عبدالحق

نفسیاتی مطالعہ

مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں میرٹھ ضلع کے قصبے ہاپڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، اور اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم علی گڑھ تشریف لائے، جہاں سے ۱۸۹۴ء میں فلسفہ و تاریخ میں بی۔ اے پاس کیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران میں سرسیّد سے بہت قریب ہو گئے۔ یہاں تک کہ زیادہ وقت سرسیّد کے ساتھ علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہتے۔ وہ زمانۂ طالب علمی ہی میں سرسیّد کے خاندان کے ایک فرد بن گئے تھے۔ جب علی گڑھ کالج کے لئے پہلے پہل یونی فارم بنا تو سرسیّد نے اپنے اور سیّد محمود کے علاوہ کسی اور کے لیے یونیفارم تیار کرایا تو وہ عبدالحق تھے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد عبدالحق ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد تشریف لے آئے، جہاں پر نہایت قلیل مشاہرے پر ملازمت قبول کر لی اور بعد میں انگریزی دانی کی بہ دولت اپنے لیے ترقی کا راستہ ہموار کیا۔ حیدر آباد ہی میں انہوں نے ایک مولوی صاحب سے عربی زبان و صرف و نحو اور ادب کی کتابیں پڑھیں۔ ہندی سے دل چسپی بھی اسی دوران میں پیدا ہوئی اور اس پر عبور بھی حاصل کیا۔ دکنی اور بِرج کا بھی مطالعہ کیا اور ان میں مہارت بہم پہنچائی۔ علم کے دریائے ناپیدا کنار سے دل چسپی جو سرسیّد ہی کی وساطت سے پیدا ہوئی تھی، اس کو اوجِ ترقی پر پہنچانے کے حوصلے اور مواقع سرزمین حیدر آباد ہی میں میسر آئے اور بلند و بالا مقاصد کی تعمیر ہونے لگی ۱۹۰۲ء میں افسر الملک کے کہنے پر رسالہ 'افسر' جاری کیا، جس کا مقصد اردو زبان میں علمی، تاریخی، فلسفیانہ، تمدنی، قومی مضامین اور عمدہ کتابوں پر ریویو لکھنا تھا۔ اس رسالے کے قلمی معاونین میں حالی، ذکاء اللہ، چراغ علی، عماد الملک، گرامی اور ظفر علی خاں جیسی ہمارے ادب کی دیو پیکر شخصیتیں تھیں۔ رسالہ افسر کے اجرا سے دراصل عبدالحق کی ادبی خدمات کا باب کھلتا ہے اور اردو میں علمی، تاریخی، فلسفیانہ اور تمدنی مضامین لکھنے کا رواج عام ہوتا ہے۔

اردو ادب میں مولوی صاحب مختلف النوع شخصیت کے مالک ہیں اور ادبی دنیا اُن سے ایک مورّخ، محقق، نقاد، لغت نویس، مترجم اور خاکہ نگار کی حیثیت سے واقف ہے۔ تحقیق کے میدان میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم دکنی ادب کو منظرِ عام پر لا کر اُسے عوام سے روشناس کرایا اور اُس کی عمر کو صدیوں آگے بڑھایا۔ ابھی کچھ سال پہلے تک دکنی شعر و ادب سے ہم ناواقف تھے، مولوی صاحب نے ہمیں دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی ادبی خدمات سے روشناس کرایا اور اس عہد کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کے فن پاروں کو بہ تصحیح مرتب کر کے شائع کیا۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کے سب سے اہم اور قابلِ قدر کارنامے خواجہ گیسو دراز[۱] کی 'معراج العاشقین'، قطب شاہی دربار کے ملک الشعرا اور عظیم شاعر ملا وجہی کی 'قطب مشتری' اور 'سب رس' ہیں۔ سب رس جو مولوی صاحب کے حسنِ ذوق اور دلی شوق کا نتیجہ ہے، اردو نثر کی پہلی داستان ہے، جو مربوط اور صاف ادبی زبان میں ہمارے سامنے آئی۔ اردو میں باقاعدہ نثر لکھنے کی تحریک دراصل اسی داستان سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری کتابوں پر لکھے ہوئے مولوی صاحب کے بسیط اور عالمانہ مقدمے محض تحقیق ہی نہیں، بلکہ تنقید بھی ہیں۔ اردو ادب میں تحقیق اور تنقید کے مقامِ اتصال کی نشان دہی کی اوّلین اور بہترین مثالیں مولوی صاحب کے انہیں مقدّموں میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں 'باغ و بہار' اور 'انتخابِ میر' کے مقدمے تحقیق اور تنقیدی نظر کی گہرائی اور گیرائی اور اُن کے

۱۔ جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ معراج العاشقین' مخدوم حسینی کی تصنیف ہے، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نہیں۔

مقاماتِ اتّصال کی بہترین مثالیں ہیں۔

عبدالحق نے سرسیّد اور حالی کے عہد کو دیکھا ہی نہیں، بلکہ اُن سے متاثر ہو کر اُن کے ساتھ اُن کے مقاصد کی تعمیر میں عملی حصّہ بھی لیا۔ وہ کام جس کی ابتدا سرسیّد اور حالی کے ہاتھوں ہوئی۔ اُس کام کو نئی نسل سے روشناس کرانے کا سہرا عبدالحق ہی کے سر ہے۔ ہمارے ہاں تاثرات میں رنگینی و رعنائی پیدا کرنے کا کام "ادب" رکھا گیا تھا۔ آزاد کے الفاظ میں "اِس عہد کے ادب کی ساری پونجی مضامینِ عاشقانہ، تملّقِ مستانہ وہی تقدیر کا رونا اور امیدِ موہوم پر خوش ہونا تھی۔" سرسیّد نے اِس تصورِ ادب کی زہرناکی کو محسوس کر لیا تھا۔ انہیں اس چیز کا اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بھی ادب محض شاعری اور پُر تکلّف مسجع و مقفیٰ نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتا، بلکہ اُسے ہمارے خیالات کے اظہار کا فطری آلہ کار ہونا چاہیئے۔

عبدالحق نے اپنے تمام تنقیدی و تحقیقی مضامین میں جو زبان استعمال کی ہے، وہ سرسیّد اور حالی کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اسلوبِ بیان میں اِس پرکار سادگی کی ہمارے ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ عبدالحق کے ہاں وہ عبارت آرائی نہیں جو ابوالکلام اور نیاز وغیرہ کی خصوصیت ہے۔ اِن کی عبارت میں تسلسل اور روانی ہے جو بلاشبہ اِن کے خیالات میں تسلسل و روانی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ عام طور سے گنجلک خیالات، عبارت آرائی اور تشبیہات و استعارات کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ عبدالحق کی نثر اُن کے خیالات کا آئینہ ہے اور لطف تو یہ ہے کہ اِس روانی کے باوجود جوش اور احساس کی شدّت میں کسی طرح فرق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُن کے خیالات کی قطعیت کا نتیجہ ہے، جو اُس عہد میں تنہا عبدالحق کی خصوصیّت ہے۔

اردو نثر کی اِن خصوصیات کے ساتھ ہی ساتھ اردو تنقید بھی گوناں گوں تبدیلیوں سے دوچار ہوئی اور تنقید میں قدیم مشرقی اور جدید مغربی نظریات کے امتزاج نے ایک نئی روایت کو جنم دیا۔ عبدالحق نے اِس تنقیدی روایت کو جس کے علم بردار حالی ہیں، بڑے خلوص اور عزم کے ساتھ برتا ہے۔ حالی کی طرح وہ بھی ماضی سے رشتہ توڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ماضی اور حال کی تمام اچھائیوں کو قبول کرتے ہوئے، اُن تمام چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھا جو ہمارے ادبی ورثے کے لیے خطرناک ہو سکتی تھیں۔ یہ اُن کی عظمت کی نشانی ہے۔ حالی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ اپنے فکر و عمل میں توازن رکھتے تھے اور ہر پرانی چیز کو سونا سمجھ کر نئی چیز سے بدکتے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالحق حقیقی معنوں میں حالی کے جانشیں کہلاتے۔

تنقید کے ذیل میں عبدالحق کے تبصروں کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔

اردو ادب میں تبصرہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن اِس سے پہلے جو بھی تبصرے لکھے گئے، بہ استثنیٰ حالی کے تبصروں کے وہ عموماً تعریف یا تنقیص ہوتے تھے۔ اِسے فن کی حیثیت سے بہت کم برتا گیا تھا۔ عبدالحق نے حالی کی پیروی کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی، متانت اور غیر جانب داری کے ساتھ تبصرے لکھے اور اردو ادب میں تبصرہ نگاری کو فن کا درجہ دیا۔ بڑا آدمی وہ ہے جو دوسروں کی بڑائی کا اعتراف کرے۔ عبدالحق نے دوسروں کی بڑائی کے اعتراف میں شاید ہی کبھی پس و پیش کیا ہو۔ جب علّامہ اقبال کی "بانگِ درا" شائع ہوئی تو عبدالحق نے اس پر تبصرہ لکھا۔ اِس سے عبدالحق کے ذہن کی تیزی اور عالمانہ وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "کتاب کھولتے ہی پہلی نظم جس پر نظر پڑی "ہمالہ" ہے، کوہ ہمالہ ہندوستان کی شان و شوکت کا نشان اور اس کے دامن کا پاسبان ہے۔ ہندوستان کا بچّہ بچّہ اِسے جانتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔ جس کی شاعری کی ابتدا ہمالہ ہو اُس کی انتہا کیا ہوگی؟ میں اقبال کے لئے اس میں نیک شگون پاتا ہوں۔ وہ محاسن جو بعد میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اقبال کے کلام میں ہم نے نکالے ہیں، اُن سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخیّل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں۔ لیکن سب سے بڑی بات جو ہم اس نظم میں دیکھتے ہیں اور جو اپنا پیغام دلوں تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اِس میں حبِّ وطن کی بُو آتی ہے۔"

اقبال کی دوسری نظموں اور اُن کی شاعری کی روشنی میں اگر عبدالحق کے تبصرے کو دیکھا جائے تو اُن کی رائے میں توازن، سنجیدگی و متانت اور شخصیّت و فن کے اعلیٰ پارکھ اور نباض ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔

میں نے ابتدا میں مولوی صاحب کے مورّخ اور ماہرِ لسانیات ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِس حقیقت کا اندازہ "قواعدِ اردو" اور "تذکرۂ لطافت" کے مقدّمے پڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی طرح قدیم ادب کی جتنی کتابیں مولوی صاحب نے مرتّب کی ہیں، اُن میں انہوں نے لسانی مطالعے کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے الفاظ کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ وہ زبان کو ثقیل نہ بناتے ہوئے اُس میں شیرینی، صفائی اور سادگی پر زور دیتے ہیں۔ اپنے مختلف مضامین کے علاوہ اپنی دوسری دو مستقل تصانیف "نصرتی" جو بیجاپور کے ملک الشعرا کے حالاتِ زندگی اور کلام سے متعلق ہے اور "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں بھی عبدالحق کا یہ

نقطۂ نظر برابر قائم رہا اور اُنہوں نے اِس کے زیرِ اثر داخلی اور خارجی دونوں خوبیوں کو پیش کیا ہے۔ مولوی صاحب کے دماغ کا یہ تجزیاتی پہلو جو اُن کی دوسری تصانیف میں بھی دکھائی دیتا ہے، اِس کی بنیاد شاید لسانیات ہی پر ہے، جو مولوی صاحب کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ 'خطباتِ اردو' میں بھی اُن کا تجزیاتی ذہن کارفرما ہے۔ 'خطباتِ اردو' اور 'چند ہم عصر' میں جو اُن کے آٹھ مضامین پر مشتمل ہے، اُن کے نقطۂ نظر، سیرت و کردار اور تلاش و جستجو کا رجحان بدرجۂ اتم دکھائی دیتا ہے۔ عبدالحق نے اپنے آپ کو جو چھپانے کی کوشش کی ہے، اُس کی پردہ دری تھوڑی بہت اگر کہیں ہوتی ہے تو وہ اِنہی خطبات اور خاکوں کے اِسی مجموعے میں۔

مولوی صاحب کی شخصیت اور سرسیّد کی شخصیت میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں دھن کے پکّے تھے۔ اپنی زبان کے عاشق وشیدا اور آزاد خیال (MODERNISM) کے دریردہ PRIMITIVE تھے۔ مذہب سے دونوں کا تعلق تھا بھی اور نہیں بھی۔ بظاہر اِن دونوں سے زیادہ کافر اور مرتد مسلمانوں میں کوئی اور نہیں اور بباطن اِن دونوں سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کا غمگسار ملنا مشکل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرسیّد نے سرکاری نوکری کی اور سیاست میں بھی حصّہ لیا اور مولوی صاحب سیاست سے بیگانہ رہے، اتنے بیگانہ کہ مصلحت اندیشی، جسے غیر از سیاست جائز کہا جاتا ہے، مولوی صاحب کے لیے ناگوار تھی۔ اُن کی کمزوریاں محاسن کا پیش خیمہ تھیں۔ وہ ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ اردو تحریک جس کے کئی روپ ہیں اور جو انجمن ترقیِ اردو سے لے کر عثمانیہ یونیورسٹی تک پہنچی۔ بلا کسی سیاسی نقطۂ نظر کے اپنا کام کئے جارہی تھی اور کسی مفاد پرست کا اِس تحریک سے تعلق نہیں تھا۔ مولوی صاحب ہمارے ادب میں پہلے ڈکٹیٹر تھے اور شاید آخری بھی، اُن کی یہ آمریت مفاد پرستوں کے لئے مفید ثابت نہیں ہوئی، لیکن اردو کو اِس سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ کہتے تھے :

> "ایسے لوگ بھی دھوکا دے گئے جن کے متعلق میں سمجھتا تھا کہ یہ مجھ سے زیادہ مخلص ہیں۔ اب تو یہ صورت ہے کہ خود اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں رہا۔"

اِس سے اِس بات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب شروع میں صلاح و مشورے سے کام کرتے رہے ہوں گے۔ بعد میں احباب کے رویّے نے اُنہیں ادبی آمر بنا دیا۔

عبدالحق نے شروع ہی سے ایک مقصدی زندگی گزاری۔ مقصدی زندگی کا ڈھونگ تو سبھی رچاتے ہیں، مگر بہت کم لوگ اِس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ مقصد ذاتی مفاد، فلیٹ اور کار کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے اپنی زندگی کو مقصد کی نذر کیا۔ اپنی زندگی کے قیمتی ایام 'انجمن' کے دفتر میں گزارے۔ اُنہیں نہ صحت کی پروا تھی نہ جاہ و منصب کی۔ بس ایک دھن اور ایک لگن اور ایک مقصد تھا، جس کی طرف وہ کھینچے جا رہے تھے۔

مولوی صاحب نے شادی نہیں کی۔ شادی کرنا کون نہیں چاہتا؟ شادی کے بعد توجّہ کا ہٹ جانا یقینی ہے۔ بیوی اور اولاد سے پیار، نیت اپنے مقصد سے محبّت میں مانع آتی ہے۔ وہ اپنے مقاصد میں کسی طرح کا دخل گوارا نہیں کر سکتے تھے اور شاید اِسی لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب کی سپھلتا کا راز وہ ماحول اور زمانہ ہے جو سرسیّد کے عہد سے لے کر آج تک ہمارے درپیش رہا ہے۔

اس میں مطلق شُبہ نہیں کہ ماحول کا اِنسان کے مقصد میں بہت بڑا دخل ہے۔ ایک ناسازگار ماحول اکثر اوقات اعلیٰ سے اعلیٰ دماغی صفات کو ضائع کر دیتا ہے اور اگر کوئی معقول صحبت یا ماحول مل گیا اور صلاحیت بھی ہوئی تو آدمی ترقی کی اوج تک پہنچ جاتا ہے۔ مولوی صاحب بڑی حد تک ماحول ہی کی پیداوار ہیں، جنہیں اُن کے مقصدِ حیات اور مقاصد نے ترقّی کی اوج تک پہنچانے میں مدد کی۔

بزمِ فروغِ اردو، اسلامیہ کالج، لاہور کے سپاس نامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> "میں آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں۔ میری طرح کبھی بوڑھے نہ ہوں۔ اِس دعا کو کوئی معمولی یا ناممکن نہ سمجھے۔ ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے۔ بے شک جوانی لوٹ کر نہیں آتی، لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی کو قائم رکھنے کے لئے کوئی بلند مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد سے زندگی بنتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔ آپ بار بار مجھے بڈھا اور پیر کہتے ہیں۔ میں ابھی دو سال پہلے تک بڈھا نہیں تھا۔ جوانی چوڑے چکلے سینے، کسے ہوئے ڈنڈ اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڈھا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں بنتا۔ جوانی ہمّت اور عزم سے ہوتی ہے، جوان وہ ہے، جس کا عزم جوان ہے۔"

برنارڈشا کی طرح مولوی صاحب کو بھی ادب میں شخصیت سے زیادہ تصوّرِ حیات سے دلچسپی رہی۔ شخصیت پرستی سے زندگی بنتی نہیں، بگڑتی ہے۔ شخصیت پرستی سے ذہنی صلاحیتیں فروغ پانے کی بجائے مرنے

گئی ہیں۔ انہیں خوشامد اور ظاہر داری سے چڑ ہے۔ "چنداں" ہم عصر" میں جابجا ایسی مثالیں ملیں گی جن سے میرے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ وہ شخصیتوں کے مداح نہ تھے، اُن کے کارناموں کے گرویدہ تھے۔

"چند ہم عصر" میں مولوی صاحب کے مختلف اشخاص پر لکھے گئے خاکے ہیں۔ یہ کتاب صرف ادبی حیثیت سے ہی نہیں، بلکہ مولوی صاحب کے سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتی ہے۔ دوسری شخصیتوں کو سمجھنے کے لئے ہر شخص کے پاس حسن و قبح کا ایک مخصوص میزان ہوتا ہے۔ دوسروں میں وہی باتیں اور محاسن دیکھنا چاہتا ہے جو اُسے پسند ہوں۔ آدمی کی بڑائی کا معیار علی الترتیب حسنِ خلق، پاکیِ سیرت، انکسار، خندہ پیشانی، پابندیِ صوم صلوٰۃ، وقار، متانت اور شگفتہ بیانی ہیں۔ امیر مینائی کے حال میں لکھتے ہیں:

"منشی صاحب مرحوم نہایت با اخلاق اور پاک سیرت آدمی تھے۔ تکبّر اور عُجب نام کو بھی نہ تھا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے۔ وقار اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا اور علاوہ اس کے شگفتہ بیان تھے۔"

شخصیت کے سانچے میں خاکہ نگار کا خوبیوں اور کمزوریوں کا معیار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اِس سے اُس کے ما فی الضمیر کا سمجھنا اور اس کی ذہنیت و سیرت کا انگیز کرنا اور اُس کے جذبات و خیالات کا سمجھنا اور ذہنی کوائف کا جاننا آسان ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے "انسان دوستی" کے بعد محنت اور مقصد کو جس قدر سراہا ہے اور وقار، متانت اور خندہ پیشانی و شگفتہ بیانی پر جو زور دیا ہے، وہ محض اتفاق نہیں بلکہ اُس کی تہ میں مولوی صاحب کی ذہنیت اور سیرت کا پرتو ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کے ثناخواں ہیں۔ وہ ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے، کاموں کو سراہتے ہیں۔ شخصیت سے زیادہ اُس کے تصوّرِ حیات سے دل چسپی لیتے ہیں۔ "نام دیو مالی" کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، دن رات برابر کام کرتا رہا، لیکن اُسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے، اسی لئے اُسے کبھی اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اُسے کسی سے بیر نہ تھا نہ جلاپا، وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبّت کرتا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام کرتا۔ آدمیوں، جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اُسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اُس نے یہ سمجھنا شروع کیا: نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیّت رکھی ہے۔ اس صلاحیّت کو درجۂ کمال کو پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجۂ کمال تک کوئی پہنچا ہے، نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کہ دن بھاگا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا، تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی، اُسے کمال تک پہنچانے اور اُس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اُس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔"

مندرجۂ بالا اقتباس میں مولوی صاحب کی سیرت جلوہ بار ہے۔ چنانچہ سخاوت و ایثار میں مولوی عبدالحق ممتاز درجے پر فائز ہیں۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ اپنے اور پرایوں کی امداد اور غریب طلبا کے وظائف میں صرف ہوتا۔ طلبہ کی امداد اور تعلیم کا خیال ہر لمحہ مولوی صاحب کو رہا۔ والدین کی خدمت، اطاعت گزاری اور محبّت اِس سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بھائیوں اور عزیز و اقارب کے ساتھ ہمیشہ محبّت اور خلوص سے پیش آتے۔ مولوی عبدالحق کے ایک بھائی بھوپال میں تھے، مولوی عبدالحق کا گزر جب بھی بھوپال کے راستے ہوتا، بھائی سے جاکر ملنا ان کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا۔ بھائیوں کی اولاد سے بھی وہ بطورِ خاص شفقت سے پیش آتے۔

حسنِ خلق مولوی صاحب کے لئے ثانوی مزاج کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ کی ملاقات میں لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اُن کی بزم بزمِ بے تکلف ہوتی۔ اختلاف اور بحث و تکرار کے موقع پر بھی وہ اعتدال کی حد سے نہ گزرتے۔ مستقل ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں مولوی صاحب کو اردو کی پروفیسری پر ماہانہ ایک ہزار روپے تنخواہ پر مامور کیا گیا۔ حکومت کے ساتھ شرط تھی کہ جب تک چاہیں گے ملازمت میں رہیں گے اور جب تک وہ خود علاحدگی نہ چاہیں، اس عہدے پر مامور رہیں گے۔ ہاتھ پاؤں میں قوّت بھی تھی، مگر مولوی صاحب نے جب دیکھا کہ اس سے وہ

ترقیٔ ادب' کا کام خاطر خواہ طریقے سے نہیں کر سکتے' وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور دلی جا کر قیام کیا۔ چند ہم عصر' میں عبدالحق کی اپنی شخصیت متعدد بار اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ اِن خاکوں میں عبدالحق نے جن سیرتوں پر روشنی ڈالی ہے' اس سے بڑی حد تک خود اُن کے سوچنے سمجھنے کے انداز پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کی وہ اخلاقی قدریں سامنے آتی ہیں' جنہیں وہ پسند کرتے تھے۔ سید محمود کے حال میں لکھتے ہیں :

"باوجود اِس لیاقت اور ثروت کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت' دولت اور حکومت' جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے' وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے' ورنہ چاہتے تو اِس قدر شہرت و دولت حاصل کر سکتے تھے' جو دوسروں کی قدرت سے باہر ہے۔ لیکن انہوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے۔"

بقول عابد صاحب کے "مولوی صاحب کے مذاق کی خاص چیز جو محسن الملک میں تھی' وہ یہ تھی کہ اُن میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو' کہیں کا ہو' اُن سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں۔ اگر کسی نے سلام بھی کر لیا تو ان پر اس کا بار رہتا اور جب تک اس کا معاوضہ نہ کر لیتے' اُن کو چین نہ آتا یہاں تک کہ وہ اپنے دشمن کو بھی نہیں بھولتے تھے۔"

یہی وجہ تھی کہ نواب محسن الملک کی رخصت کے وقت حیدر آباد میں کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمیوں کا ٹھٹھ اسٹیشن کے باہر اور اندر لگا ہوا تھا۔ سینکڑوں آدمی جن میں غریب' بیوائیں' یتیم سبھی تھے' زار و قطار رو رہے تھے۔

عبدالحق' حالی سے ادب ہی میں نہیں' بلکہ زندگی کے متعلقات میں بھی متاثر تھے۔ اُن کی زندگی حالی کی زندگی کا عکس ہے۔ حالی کی شرافت' نیک نفسی' ہمدردی اور شفقت سے مولوی صاحب متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب تھے۔ وہ تمام خصوصیتیں جو حالی میں تھیں' عبدالحق کے حصے میں بھی آئیں۔ حالی سے متعلق لکھتے ہیں :

"مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت' ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگذر کا یہ عالم تھا کہ کوئی اُن سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے' کیا مجال کہ اُس کی بدسلوکی یا بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آئے۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا' جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گری کے بغیر مانتے ہی نہیں' اُن کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔"

حالی ہی کے سلسلے میں ایک واقعہ لکھتے ہیں :

"ایک صاحب جو علی گڑھ کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے' مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے کھڑی کی۔ یہ حضرت ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور سٹراسٹر کئی ہنٹر اُس غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اِس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے اوپر چڑھ آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔ 'ہائے ظالم کیا کیا!' اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی' وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے : 'یہ معلوم ہوتا ہے وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔' اِس کیفیت سے جو درد و کرب مولانا کو تھا' وہ بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔"

عبارت کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولوی عبدالحق بھی اس درد و کرب میں حالی کے برابر کے شریک تھے۔

انکسار' خندہ پیشانی' مروّت' ہمدردی اور اخلاق جس کی تلاش مولوی عبدالحق نے دوسری شخصیتوں میں کی ہے' اِس کا نادر نمونہ خود آپ کی ذات تھی۔ مقبرۂ رابعہ دورانی شہر سے دور جنگل میں ہوتے ہوئے بھی مولوی صاحب سے ملنے والوں کا ایک ہجوم رہتا۔ ملاقاتیوں میں امیر زادے اور غریب بھی رہتے اور آپ سبھوں سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ رئیسوں اور اکابرینِ شہر کی موجودگی میں اُن کی توجہ کسی غریب اور معمولی آدمی پر مرکوز ہوتی' جو وہاں بیٹھا ہوتا۔

مولوی صاحب معمولی اور غریب آدمیوں میں اپنے اخلاق سے
احساسِ کمتری پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ بامروت ایسے تھے کہ اُن
کے ملاقاتیوں میں سے اگر کوئی اناپ شناپ اور غیر متعلق باتیں بھی کرتا
اور اُن کے کاموں میں ہرج بھی ہوتا تو وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے اور
اُس کی باتوں کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی جاتے۔ طبیعت میں انکسار
اس قدر تھا کہ قصبہ بھینسہ (ضلع ناندیڑ) کے مڈل اسکول کے معاینے
کے لئے گئے۔ اس موقع پر وہ وہاں کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے طریقۂ تعلیم
سے اس قدر خوش ہوئے کہ کتاب الرّائے (Remarks Book)
میں لکھا: "مجھے فخر ہوتا، اگر میں ان کی ماتحتی کرتا۔"

مولوی صاحب اپنے ماتحتوں سے نہایت شفقت کے ساتھ
پیش آتے، اُن سے بے تکلف ہوتے اور اُن کے شکوہ و شکایت میں اُن
سے ہم دردی سے پیش آتے اور اشتراک بھی کرتے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد اورنگ آباد آئے،
اُن کی مولوی صاحب سے عقیدت اُنہیں مقبرۂ رابعہ دورانی لے آئی،
جہاں پر گھنٹوں مولوی صاحب سے اُن کی گفتگو ہوتی رہی۔ بنگلے
کے چاروں طرف پولس کا گھیرا تھا۔ اُس وقت کوئی شخص مولوی صاحب
سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ اتفاقاً مدرسے کا چ[illegible]ر مولوی صاحب
سے ملنے کا خواہش مند تھا اور ملنے کی غرض سے مولوی صاحب کے بنگلے
کی طرف بڑھ رہا تھا کہ پولس کے آدمیوں نے اُسے روک دیا۔ اُس
وقت مولوی صاحب مہاراجہ کشن پرشاد سے محوِ گفتگو تھے۔
اس دوران اُن کی نظر کسی طرح اُس چوکی دار پر پڑی۔ مولوی صاحب
کے پچھوانے پر معلوم ہوا کہ وہ درخواست پیش کرنا چاہتا ہے۔
مولوی صاحب نے درخواست لینے کے لیے کہا اور اپنی عدیم الفرصتی
کی وجہ سے اُسے دوسرے روز ملنے کا وقت دیا۔ جب مہاراجا
کشن پرشاد چلے گئے تو درخواست پڑھی۔ جس میں لکھا تھا کہ
"صدر مدرّس نے اُسے مارا ہے اور جس چپّل سے اُسے مارا ہے،
وہ درخواست کے ساتھ منسلک ہے۔"

دوسری صبح چوکی دار مولوی صاحب سے ملنے آیا اور مولوی
صاحب کی میز پر اُن کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مولوی صاحب
نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس مدرسے میں رہنا چاہتا ہے یا صدر
مدرّس کا تبادلہ کیا جائے؟ اِس پر چوکی دار نے کہا کہ وہ اِسی گاؤں
کا رہنے والا ہونے کی وجہ سے وہیں رہنا چاہتا ہے! مولوی صاحب
نے مسکراتے ہوئے اُسے جانے کے لیے کہا اور بتایا کہ صدر مدرّس
کا تبادلہ کیا جائے گا۔

اپنے ماتحتوں سے ہمدردی کے ساتھ یہ بھی انسان دوستی کی اعلیٰ
مثال ہے۔ مولوی صاحب کے دربار میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں
کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مولوی صاحب کی چائے کی میز پر مہاراجہ کشن پرشاد
اور چوکی دار میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہ اخلاقِ انسانی کی معراج ہے۔

مولوی صاحب کے نظریاتِ اخلاق میں بڑی وسعت ہے۔ مندرجۂ
بالا واقعات اور بیانات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے۔ اُن کے اِس نظریۂ اخلاق
کو دیکھیے اور قول و فعل میں مطابقت کی داد دیجیے:

"اخلاق سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے
خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت
پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کر دے۔ زبان و قلم
سے ہمدردی کا اظہار کرے یا اکثر جیسا کہ اکثر تعریف
کے طور پر کہا جاتا ہے 'مرنجانِ مرنج ہو'۔ اخلاق کی حدود
اِس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و
تحمّل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت)، کام کی لگن،
فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف،
ہمدردی، ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ اِن سب
میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے یعنی ذاتی اغراض
پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دکھ درد
کو اپنا دکھ درد سمجھے، انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول
جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔"

عبدالحق کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اِن خاکوں میں
'مَیں' کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، اپنا اشتہار نہیں کرتے۔ بلکہ خود دوسروں
تک پہنچنے کی خلوصِ دل سے کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو اہمیت
نہیں دیتے، بلکہ دوسروں کی ذات کو اہم سمجھتے ہیں۔ بات بات میں اپنا
ذکر کرنا ادب کی دوسری اصناف میں ممکن ہو، پسند کیا جائے، خاکوں میں
خصوصاً یہ بہت معیوب ہے۔ شاید یہی وجہ ہے، ضمیرِ متکلم کا صیغہ وہ کم سے
کم استعمال کرتے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کے حالات کی غیر موجودگی میں
میں اُن کی تصانیف سے مواد فراہم کرنا عام ہے، لیکن یہ اُس وقت ہوتا
ہے، جب ادیب اور شاعر کچھ اشتہاری قسم کا ہو۔ مولوی صاحب کے
یہاں یہ اشتہاری انداز نہیں ملتا۔ برعکس اس کے کہ وہ اپنے آپ کو پیش
کریں، کچھ لیے دیے سے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش
کرتے ہیں۔

حیدرآباد ابتدا ہی سے اردو کا اہم مرکز رہا ہے۔ سلاطینِ گولکنڈا
اور بیجاپور نے اردو کی جو بھی خدمت کی، وہ آج کسی سے پوشیدہ

نہیں ہے۔ یہاں سلاطین کی اردو نوازی کا سراغ لگانا بھی مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ ورنہ آج سے کچھ سال پہلے تک اردو کا دکنی دور عالم خفا میں تھا۔ دورِ جدید میں حیدرآباد میں اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے عام کرنا اور اُسے اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے رائج کرنے کا سہرا بھی مولوی صاحب کے سر ہے۔ زبان کی مقبولیت کا راز اُس کی عوام دوستی میں ہے، لیکن اسی کے ساتھ سلاطین اور نوابوں کی سرپرستی کی وجہ سے بھی زبانیں اُس علاقے کے عوام میں مقبول ہو جاتی ہیں۔ محکوم، حاکموں کی زبان کو جاننا اور بولنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اس لحاظ سے حیدرآباد میں اردو کو مقبول بنانے کے سلسلے میں مولوی صاحب نے نفسیاتی طریقہ اختیار کیا۔ نواب عمادالملک ناظم تعلمات تھے اور ولی عہد میر عثمان علی خاں کے اتالیق بھی۔ مولوی صاحب سے نواب صاحب نے اردو خطوط نویسی پر رسالہ لکھنے کی ضرورت پر اپنے خیال کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے فرمائش کو حکم جان کر ۱۹۰۱ء میں اس موضوع پر دو رسالے مرتب کیے، جس میں دوسرے رسالے میں بیٹے کے نام باپ کا ایک خط ہے :

"جانِ پدر !

چونکہ اِس خط میں تمہاری تعلیم کا ذکر آگیا ہے۔ میں اِس موقع پر ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ اِس میں شک نہیں کہ تم قریب قریب سب مضامین میں اچھے ہو اور اُن میں دل چسپی بھی ہے، لیکن میں ایک بڑی کمی دیکھتا ہوں، جس کا ظاہر کر دینا میرا فرض ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم اردو یعنی اپنی مادری زبان کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہو۔ اِس سے زیادہ افسوس کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ہم دوسری زبان کے حاصل کرنے میں تو ہمہ تن مصروف ہیں، لیکن اپنی مادری زبان کی طرف بالکل توجہ نہ کریں۔ علاوہ مادری زبان کے ہمیں زیادہ کام اب تک اسی زبان سے پڑتا ہے۔ آپس کی خط و کتابت اور عدالت کی کارروائی اردو ہی میں ہوتی ہے۔ اِس میں علمی ذخیرہ بھی اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں اس کی طرف سے بے توجہی کرنا سراسر غلطی ہے اور اس میں نقص رہ جانے سے بعد میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔"

باپ کے اِس پیغام پر بیٹے کا سعادت مندانہ جواب بھی ملاحظہ ہو :

"آداب !

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ نے جو تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ حقیقت میں افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنی زبان کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ ہمارے ایک استاد بھی کہا کرتے ہیں، مگر یہ ہے کہ متعدد مضامین تیار کرنے کی وجہ سے بہت کم فرصت ملتی ہے کہ ان چیزوں کی طرف بھی توجہ کی جائے، جو ہمارے امتحان میں نہیں ہیں۔ لیکن آج سے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ فرصت کا تمام وقت اردو کے سیکھنے میں صرف کروں۔"

اِس طریقے سے مولوی صاحب نے ولی عہد میر عثمان علی خاں میں، جو آئندہ تاجدارِ حیدرآباد ہونے والے تھے، اردو کے لئے ذوق و شوق پیدا کیا۔ جس کی سرپرستی نے حیدرآباد میں اردو کی بنیادیں مستحکم کیں، اور جہاں وہ صحیح معنوں میں اس قابل ہوئی کہ ثقہ بہنوں سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے۔ مراٹھواڑہ میں آج بھی اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ اور وہاں کے طلبہ بی۔ اے میں اردو علاقائی زبان (Regional Language) کی حیثیت سے امتیازی مضمون کے طور پر پڑھتے ہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کا فیضان ہے۔

"تصویر جس قدر بڑی، شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ تاکہ اُس کے خط و خال واضح ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے، جنہوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارِ نمایاں کئے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اُن میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی۔ (وہ آدمی ہی کیا جس نے مخالف نہ پیدا کیے۔) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ اُن میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو۔ اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو دراصل حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔"[1]

اِس ضمن میں مولوی عبدالحق نے بھی بیشتر مخالف پیدا کیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مخالف پیدا ہوئے۔ اِس کُلیے کے طور پر جو ہمیشہ سے مرنجانِ مرنج اور بڑے آدمیوں کے ساتھ رہا ہے، جو اپنی ذات کو دوسروں کے لئے فنا کر دیتا ہے۔ اِن مخالفتوں کی بنیاد عام طور پر حسد اور بغض ہوتا ہے۔ سرسید اور شبلی کی طرح مولوی عبدالحق بھی ان مخالفتوں سے نہ بچ

---

[1] سرسید احمد خاں، حالات اور افکار، ص

سکے۔ اُن کے مقاصد اور اعمال کو شک کی نظروں سے دیکھا گیا مظاہرے ہوتے اور جلسے جلوس کیے گئے لیکن مولوی صاحب نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی اور ایک تناور درخت کی طرح استقلال و استقامت سے کھڑے مقابلہ کرتے رہے۔ مخالفتیں کیا تھیں؛ بادِ صرصر کی طرح آئیں اور گزر گئیں۔ یہی نہیں بلکہ مخالفین کے ساتھ بعد میں خندہ پیشانی سے پیش آتے اور بساط بھر اُن کی مدد بھی کرتے۔ مخالفین کے خلاف اُنہوں نے اپنے دل پر غبار تک آنے نہیں دیا۔ وہ مخالفتوں کو کام کرنے کے لئے بہت ضروری سمجھتے تھے اور شاید یہ مخالفتیں ہی تھیں، جنہوں نے خلوص اور مقصد سے لگن کی آنچ کو تیز تر کر دیا۔ بہت زیادہ مخالفتوں سے آدمی میں کام کرنے کے سلسلے میں ایک ضد سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کام کرنے والوں کے لئے مخالفتوں کا یہ ایک اچھا پہلو ہے۔ اردو کانفرنس کراچی کے خطبے میں کہتے ہیں :

"کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں بھی ہے — مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے اُن جوہروں کو جِلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑتے تھے۔ مخالفت درپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص و استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک سو بسوے کامیاب ہوگی۔"

پھر یہی نہیں بلکہ پاکستان رائٹرس گلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کام کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں :

"صرف انجمنیں بنا دینا، قرار دادیں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا۔ ہمیں کام کرنا ہوگا۔ کام سے مراد یہ نہیں، جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ نو بجے آئے اور چار بجے چلتے بنے۔ یہ کام جو ہمیں کرنا ہے، پوری طاقت اور استقلال سے کرنا ہوگا۔ دن رات، گرمی سردی بارش سے بے نیاز ہو کر۔ کام سے عشق ہونا چاہیئے۔ عشق نہیں، تو وہ کام نہیں، بے گار ہے۔ جو لوگ کسی بڑے مقصد کو لے کر خلوص و صداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پرواہ نہیں کرتے، وہ کبھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جو اپنی جان عزیز رکھ کر محنت سے جی چُراتے ہیں، مرتے ہیں۔"

نام دیو مالی کے بیان میں کہتے ہیں :

"کام اُسی وقت ہوتا ہے جب اُس میں لذت آنے لگے۔ بے مزہ کام، کام نہیں — بے گار ہے۔"

چنانچہ جس دلچسپی اور انہماک کے ساتھ مولوی صاحب کام کرتے تھے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ علی گڑھ کالج میں اپنے زمانہ طالب علمی سے لے کر آخر تک اُن کی زندگی کام کرتے گزری۔ کام سے والہانہ عشق نے اُنہیں وقت کا بھی پابند بنا دیا تھا۔ ہر ہر منٹ کا خیال رکھتے تھے۔ اور دوسروں سے بھی وقت کی پابندی کی توقع رکھتے تھے اور وقت کی پابندی نہ کرنے پر اچھے اچھوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔

خطباتِ عبدالحق میں بھی مولوی صاحب کی بے چین اور مقصدی زندگی کی جھلکیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ اُن کی قوتِ مقاومت، عزم، استقلال، مقصد کی لگن، کام کرنے کا جذبہ، یہ تمام چیزیں خطبات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اُن کے اندازِ گل فشانیٔ گفتار سے اُن کی تحریریں زعفران زار بنی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی خطبات میں اُن کا طرزِ تخاطب یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بنیادی حیثیت سے ایک معلم ہیں اور ایک استاد کی طرح جو بچوں کو آسان سے آسان زبان میں اپنی باتیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ "اے حضرات"، "حضرات"، "صاحبو" کے بعد اُن کے چھوٹے چھوٹے سلیس اور رواں دواں جملے اور اُن کی ساخت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی تبلیغ کر رہے ہیں اور ظاہر ہے تبلیغ کے لئے سلیس اور سادہ زبان اور پیرایۂ بیان ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ لیکن فطرت اُسے زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتی، وہ شادی کر لیتا ہے اور اپنی اولاد کے ذریعے اپنا نام زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ عبدالحق نے شادی نہیں کی۔ اُن کے اولاد نہیں تھی۔ اُنہوں نے اردو کو گود لیا۔ انجمن اور اردو کے ساتھ اُن کا تعلق وہی تھا، جو ایک باپ کا اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اپنی زندگی، اپنا روپیا پیسا سارا انجمن اور اردو کے لئے تھا۔

بیوی اور بچوں سے متعلق مولوی صاحب بہت ہی دلچسپ خیالات رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ

"جن لوگوں کو دنیا میں بڑے کام کرنے ہیں۔ انہیں شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ شادی سے انسان میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ گھر بار کے چکر میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ تن، من، دھن سے کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ لوگ جو تخلیقی کام نہیں کر سکتے، وہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ ایک دو نہیں، بلکہ درجنوں بچے۔"

مولوی صاحب اِس ضمن میں بھی بڑے وسیع الذہن تھے۔ گو
آدمی تھے پرانے زمانے کے لیکن مگر ضبط تولید کے سختی سے قائل تھے۔
کہتے تھے کہ

"جب مہاجروں کی جھگیوں سے گذرتا ہوں تو دو
چیزوں کی افراط پاتا ہوں۔ ایک کتّے اور دوسرے
ننگ دھڑنگ کلبلاتے ہوئے بچّے۔"

کہتے تھے کہ

"میرا بس چلے تو ان تمام لوگوں کی نسل آپریشن کرا کر ختم
کر دوں۔ جن کی آمدنیاں قلیل ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"انسان نہیں رہتا، لیکن اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں
اور یہی اُس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کی بھی ہے اور
کون جاندار ہے جو اِس پر قادر نہیں۔ بلکہ جتنے ادنیٰ اور
ذلیل جانور ہیں، اُن کی اتنی ہی زیادہ اولاد ہوتی ہے۔
چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ آن کے ایک گھنٹے میں
ہزاروں، بلکہ لاکھوں بچّے پیدا ہوکر مرجاتے ہیں، لیکن
اُس کا نام اُس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد
کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و
ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں
ہیں، بلکہ اُن کے کیرکٹر کی وجہ سے۔"

مولوی صاحب کے اعمال، مقصد کی لگن اور اُن کے کام میں جو
سلیقہ ہے، اُسے اُن کے تجرد کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مذہب کے بارے میں مولوی صاحب کی ذات سے متعلق مختلف
قسم کے خیالات ہیں۔ اکثر لوگ انہیں ملحد و زندیق سمجھتے ہیں۔ مولوی قسم
کے لوگ "لا اوریت" ان کا مذہب بتاتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ
انہیں اگناسٹک (Agnostic) کہتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں پہلے بیان
کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے قدیم لوگوں کی طرح مولوی عبدالحق بھی سخت قسم
کے مذہبی آدمی تھے۔ میں نے مولوی عبدالحق کو قدیم وضع کا
Primitive اسی لحاظ سے کہا ہے۔ اُن کی یہ مذہبیت بالفعل نہ
سہی لیکن مذہب میں نظریاتی اعتبار سے اُن کا پورا عقیدہ تھا۔ خدا اور
رسول ہی سے نہیں، بلکہ اولیائے کرام اور صوفیہ سے بھی مولوی صاحب
کو گہری عقیدت تھی۔ البتّہ طبیعت میں آزاد مشربی ضرور تھی، جو انہیں
سرسیّد کے واسطے سے ملی تھی اور پھر لطیف مذاقِ سخن، جس کی وجہ
سے شرارتاً ایسی باتیں کرتے تھے جس سے لوگوں کو مولوی عبدالحق کے
مذہب سے متعلق شبہات پیدا ہونے لگے تھے۔ نظریاتی اعتبار سے
اُن کی مسلمانیت کی مثالیں اُن کی تحریروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اُن کے
دل و دماغ کی یہ مسلمانی ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی کے نام خط میں اِس بری طرح
پیش ہوئی ہے کہ اِس کے بعد مذہب سے متعلق مولوی عبدالحق کے معتقدات
کے بارے میں شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔ بقول کیفی ؎

حال یہ بے خودیٔ عشق میں کیفی کا ہوا
شیخ کافر اُسے اور گبر مسلماں سمجھا

مولوی صاحب مرنجانِ مرنج انسان تھے۔ مقصد کی لگن، ہم قوموں
سے محبّت اور حسنِ خلق کے ساتھ ہی طبیعت میں مزاح اور بذلہ سنجی بھی
تھی، جو آمد کا حکم رکھتی ہے۔ وہ مزاح کو جا و بے جا استعمال نہیں کرتے،
تاہم اُسے زندگی میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی سنجیدگی میں
مزاح اور مزاح میں سنجیدگی ہوتی ہے۔ خوش طبعی کو وہ مخصوص محفلوں کے لئے
اٹھائے رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی مقصدی زندگی میں کامیابی کا شاید
ایک راز اُن کی خوش طبعی بھی ہے، جس کی مدد سے وہ اپنے کام کے بارِ گراں
کو ہلکا کرنے میں مدد لیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں:

"ظرافت، دلیلِ ذہانت ہے اور زندہ دلی، سلامت
طبعی اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بارِ گراں کے
ہلکا کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔"

مولوی صاحب کی یہ باوقار زیرِ لب مسکراہٹ اُن کے ساتھ ہمیشہ
سے رہی۔ اُن کی یہ ذہنی پھلجھڑیاں احباب و ارباب کے علاوہ "چند ہم عصر"
کے مضامین میں بھی بہ کثرت بکھری پڑی ہیں۔ میرن صاحب کے خاکے میں
لکھتے ہیں:

"ایک روز میرن صاحب کہیں باہر سے آئے، بیچ میں شامت
کا مارا اُن سے پوچھ بیٹھا کہ میرن صاحب آپ کہاں
گئے تھے؟ کہنے لگے "بھئی! آج آنکھ ذرا سویرے کھل
گئی، چمن میں تھوڑی دیر ٹہلتا رہا۔ پھر ضروریات سے فارغ
ہوکر منہ ہاتھ دھویا، کپڑے پہنے۔ اتنے میں میاں عادل
آگئے"۔ میں نے بات کاٹ کر کہا کہ میرن صاحب میں نے
تو یہ پوچھا تھا کہ آج صبح آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟
فرمانے لگے "کہہ تو رہا ہوں"! اب انہوں نے وہیں سے بات
شروع کی، جہاں سے چھوڑی تھی۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ
اتنے میں میاں عادل آگئے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کڑے
مانک پور کے رہنے والے ہیں۔ میں انہیں حیدرآبادی
سمجھتا تھا۔ اُن کا سارا کنبہ یہیں ہے۔" انہوں نے یہاں

کے پرانے قصّے مزے مزے کے بیان کیے! اب مجھے الجھن ہونے لگی اور میں نے قطع کلام کرکے کہا "حضرت! میں یہ نہیں پوچھتا، میں نے تو صرف آپ سے اتنا دریافت کیا تھا کہ آپ تشریف کہاں لے گئے تھے؟ یہ آپ نے کیا قصّہ چھیڑ دیا؟" کہنے لگے "میں تو یہی کہوں گا، تمہیں سننا ہے تو سنو، نہیں تو جانے دو۔"

سرسیّد کے حال میں لکھتے ہیں :

"مولوی مشتاق حسین (نواب وقارالملک) ایک بار اُن کے ہاں مہمان تھے۔ ایک روز اپنے کمرے سے کرتا پاجامہ پہنے سیّد صاحب کے بڑے کمرے میں آگئے، جہاں بیٹھے وہ کام کیا کرتے تھے۔ مولوی مشتاق حسین کی توند ذرا بڑھی ہوئی تھی پاجامہ کھسک کھسک جاتا تھا اور وہ بار بار ہاتھ سے اوپر چڑھاتے جاتے تھے۔

سیّد صاحب نے جو دیکھا تو کہنے لگے، میاں مشتاق حسین تمہارا پاجامہ ہمیشہ کھونٹی پر ٹنگا رہتا ہے"

اس واقعے کے پیش کرنے میں سرسیّد سے زیادہ عبدالحق کی ظرافتِ طبع اجاگر ہوتی ہے۔ عبدالحق بہت بڑے بذلہ سنج تھے۔ اُن کی بذلہ سنجی کی بے شمار مثالیں ہیں، لیکن اُن تمام مثالوں کا دُہرانا طوالت سے خالی نہیں، تاہم چند واقعات ملاحظہ کیجیے :

ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے کی شادی میں دعوتِ ولیمہ میں مولوی صاحب بھی شریک تھے۔ کھانے کے بیچ ایک صاحب نے ہڈّی سے گودا منہ سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر جب ناکام رہے تو چینی کی رکابی پر ہڈّی بجانے لگے۔ مولوی صاحب نے بیرے سے بہت سی پلیٹیں منگوائیں اور اُن صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ "صاحب! آپ کی مشقِ ستم اگر یوں ہی جاری رہی تو انشاءاللہ ان سب پلیٹوں کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا آپ انہیں اپنے سامنے رہنے دیجیے۔"

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ کر صاف کرنے کی عادت بھی مولوی قسم کے لوگوں میں عام ہے۔ یہ عادت بھی بہت ہی مذموم اور بدتہذیبی کی نشانی ہے۔ جسے لوگ اسلام جیسے مہذب ترین مذہب میں کارِ ثواب جان کر کیا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ کسی دعوت میں ایک صاحب اِس کارِ ثواب میں مشغول تھے۔ مولوی صاحب سے نہ رہا گیا۔ آخر اپنی انگلیاں بھی پیش کردیں اور کہا کہ "صاحب! جب آپ کی انگلیاں صاف ہو جائیں، تو ذرا انہیں بھی صاف کر دیجیے گا۔"

حیدرآباد میں مولوی صاحب کے ایک دوست کی لڑکی کی شادی تھی، جس میں کل پچاس افراد مدعو تھے اور اِس فہرست سے مولوی صاحب اور اُن کے احباب غائب تھے۔ مولوی صاحب کی شرارت پسند طبیعت نے کہیں سے ایک رقعہ حاصل کرلیا اور اسی انداز کے تقریباً ڈھائی سو رقعے چھپوائے اور اتنے ہی افراد کو مع خاندان دعوت دی۔ نتیجتاً صاحبِ خانہ کے یہاں مہمانوں کی کثرت ہو گئی۔ ہوٹلوں سے مہنگے داموں کھانے منگوائے گئے۔ جب شادی کی محفل ختم ہوئی تو صاحبِ خانہ کو اس کی تلاش ہوئی کہ اس کا سراغ لگایا جائے کہ آخر اتنے دعوتی رقعے کیسے چھپے اور تقسیم ہوئے۔ بہت دنوں کے بعد پتا چلا کہ یہ شرارت مولوی صاحب کی تھی۔

مولوی صاحب صاف گو اور صاف دل تھے۔ اُن کی صاف گوئی کی متعدد مثالیں ان کی تحریروں میں بکھری پڑی ہیں۔ "چند ہم عصر" میں انہوں نے جہاں اپنی اخلاقی اقدار دوسروں کی شخصیتوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، وہیں انہوں نے بڑی جرات مندی کے ساتھ ان شخصیتوں کی سیرتوں کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مولوی صاحب کے اختلافات ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی تھے اور پھر اختلاف کرنے میں بھی نہایت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے، جس کی وجہ سے اختلافات بجائے اختلاف کے مدح کا جز بن گئے ہیں۔ تاہم جاننے والے جانتے ہیں کہ مولوی صاحب نے ہلکے ہلکے طنز بھی کئے ہیں۔

مولوی صاحب کی بے لاگ اور غیر جانب دارانہ رایوں میں سے صرف ایک پر اکتفا کرتا ہوں۔ مولانا محمد علی سے متعلق لکھتے ہیں :

"وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اُس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو وہ بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبّت و مروّت کا پُتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا۔ بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُس کے جان نثار اور فدائی تھے، لیکن اِس طرح بچتے تھے جیسے آگ پرست آگ سے بچتا ہے۔"

مولانا محمد علی سے متعلق ۸ نومبر ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر انصاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ سے کسی بات کا پردہ نہیں اور میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ جب میں یہاں سے علی گڑھ جا رہا تھا تو میرا دل جوش اور مسرت سے بھرا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بانیانِ یونیورسٹی کے متعلق کام کی اسکیم تیار کر رکھی ہوگی۔ اُن کے پاس کافی سرمایہ ہوگا اور کام کرنے کے لئے آدمی بھی ہوں گے، لیکن جب وہاں جاکر معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہیں، تو مجھے بہت افسوس اور رنج ہوا اور مایوسی بھی۔ اتنا بڑا کام اور استغنا اور بے خبری کا یہ عالم!

ایک دوسری بات جس سے میرے دل کو بے انتہا تکلیف ہوئی وہ یہ کہ میں نے محمد علی اور شوکت علی کو ایک انتہا درجے کا "ملّا" پایا۔ اس لفظ میں تعصّب، توہّم، سختی، عناد، ناروا داری، سب کچھ آگیا۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ میں محمد علی کے خلوص، صداقت، جرات، بے نفسی، ایثار اور اعلیٰ قابلیت کا اتنا ہی قائل ہوں، جس قدر آپ۔ لیکن اُن کا ہر بات میں خدا کو لانا اور ہر حکم کو خدا اور اُس کے رسول سے منسوب کرنا اور ہر بات میں سختی اور غلو کے ساتھ تعصّب برتنا، ہر معقول پسند آدمی کو ناگوار گزرتا ہے۔ اُن کا بار بار یہ کہنا کہ میں خدا کے حکم سے یہاں ہوں اور خدا اور اُس کے رسول کا یہ حکم ہے، دلوں پر زیادہ اثر نہیں کرتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اُس رات کو جب ہم دلّی سے علی گڑھ گئے ہیں اور کھانے کے بعد محمد علی نے اپنی اور کلکٹر کی گفت گو سنائی تو اثنائے گفتگو میں کلکٹر نے کہا کہ آپ لڑکوں کو نافرمان بناتے ہیں۔ محمد علی نے کہا کہ میں اُن کو خدا کا فرمان بردار بنانا چاہتا ہوں۔ کلکٹر نے کہا اور اپنا (Yourself)۔ اگرچہ کلکٹر نے کسی نیّت سے کہا ہو، مگر میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھ پر اِس لفظ کا بڑا اثر ہوا اور اب تک ہے اور رہے گا۔ بڑے سے بڑا صوفی بھی اگر کہتا تو یہی کہتا۔ اس لفظ کی تہ میں بڑا راز ہے۔ اچھے اچھے لوگ، یہاں تک بعض اوقات اولیا تک نفس کے احکام کو خدا کے احکام سمجھنے لگتے ہیں اور اس میں بڑا دھوکا ہوتا ہے، اس سے بچنا چاہیئے۔ یہ نفس ہی تو شیطان ہے۔ میں موجودہ طرزِ تعلیم کا مخالف ہوں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ محمد علی کی طرح علی گڑھ کالج کو "کفّار اور منافقین کا کالج" کہوں۔ اُن لوگوں کو جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں، کافر و مردود و ملعون کہنا کسی کو بھی اور خصوصاً ایک سردارِ قوم (لیڈر) کو ہرگز جائز نہیں۔ اگر یہ جائز رکھا جائے تو کفر و ایمان میں کچھ یوں ہی سا فرق رہ جاتا ہے۔ یونیورسٹی بنانے کے یہ ڈھنگ نہیں ہیں۔ تعصّب، توہّم، فسادات و عناد پر اس کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ آپ خدا کے لئے اس رنگ کو بدلیے اور سب سے پہلے کسی معقول شخص کو پرنسپل بنایئے۔ موجودہ حالات میں محمد علی پرنسپلی کے لئے موزوں نہیں۔" [1]

اس خط سے عبدالحق کے مزاج کی تندی و تیزی، جرات و ہمّت اور سختی کے ساتھ اُن کے مذہبی معتقدات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ بات بات میں خدا اور رسول کا واسطہ، کفر و زندیق کے فتوے اور مذہبی معاملات میں غلو، یہ ساری چیزیں عبدالحق کو سخت ناپسند تھیں۔ وہ صبر و تحمّل، اعتدال، رواداری اور فرض شناسی کو پسند کرتے تھے۔ "ملّائیت" یا ملّاپن سے انہیں سخت نفرت تھی۔

تحقیق اور تنقید کے میدان میں جس محنت اور کاوش کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عبدالحق اس میدان میں بھی بہت ہی محتاط ہو کر قدم رکھتے تھے۔ اپنی ذمّہ داری کا احساس، علمی و ادبی کاموں کی افادیت اور اہمیت کا احساس انہیں ہر لحظہ لگا رہتا تھا۔ تحقیق اور تنقید کے میدان میں "جگر خون کرنا" مولوی صاحب کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ اسی سلسلے میں فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

"کرم نامہ پہنچا اور اس کے ساتھ شوق کے تذکرے کا مقدّمہ بھی وصول ہوا۔ ابھی میں نے مقدّمہ نہیں پڑھا۔ صرف پہلے صفحے پر نظر ڈالی۔ اس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے مجھ سے تذکرے کی طباعت کے متعلق دریافت کیا تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس میں غلطیاں بہت ہیں۔ حضرت! ایک دو نہیں، بے شمار غلطیاں ہیں اور جگہ جگہ سے ناقص ہے۔ یہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخے کا حال ہے۔

---

[1] عبدالحق کی یہ تنقید بہت ہی سخت اور مبالغہ آمیز ہے۔ تاہم عبدالحق کی غلط فہمیوں کا ازالہ ڈاکٹر انصاری کے خط سے ہو گیا تھا، جو انہوں نے مندرجہ بالا خط کے جواب میں عبدالحق کو لکھا تھا۔
(دیکھیے: رسالہ جوہر، عبدالحق نمبر، ص ۶۵-۶۴)

دو اور نسخے مہیا کیے، وہ بھی ناقص نکلے۔ اب
ایک اور نسخے کا پتا چلا ہے، تو وہ بھی دیکھوں گا
کہ اس کی کیا کیفیت ہے۔ میرے پاس مرتب کیا
ہوا اور خوش خط لکھا ہوا نسخہ موجود ہے۔ لیکن
جب تک دو ایک معتبر نسخوں سے مقابلہ کر کے
تصحیح نہ کر لی جائے اور جو صفحے چھوٹ گئے ہیں،
پورے نہ ہو جائیں، اُسے طبع نہیں کر سکتا۔ جھٹ
پٹ کام اچھا نہیں ہوتا اور نہ قابلِ اعتماد اور استناد
ہوتا ہے۔ کامل طور پر مرتب ہونے پر حاشیہ جا نوٹ
دینے کی ضرورت ہوگی۔ اِس قسم کے کاموں میں
بڑی محنت اور تحقیق اور احتیاط کرنی پڑتی ہے۔"

عبدالحق کی شخصیت کا ایک اور پہلو اُن کی طبیعت کی نفاست ہے۔ عبدالحق کی اِس نفاست پسندی اور شستگی کا اندازہ اُن کی خوش پوشاکی سے ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے باطن کا پتا لگانا آسان ہے۔ چنانچہ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ عبدالحق کی ظاہری وضع قطع اور خوش پوشاکی کا پرتو اُن کے باطن پر بھی پڑتا ہے۔ خوش پوشاکی کے ساتھ ساتھ خوش خوراک بھی تھے اور پھل بہت پسند کرتے تھے۔ کھانے میں بھی تہذیب و شائستگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو لکھتے ہیں:

"یہ خوب ہوا کہ آپ کو یقین کے اور بھی دیوان مل
گئے آپ اُسے ضرور مرتب کیجیے۔ خرچ میں دوں گا
لیکن حیدرآباد میں ہرگز طبع نہ کرا دیجیے گا، ورنہ میں
ذمے دار نہیں۔ حیدرآباد میں آج تک کوئی کتاب
ابھی نہیں چھپی۔ یا تو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پریس
میں چھپوائیے یا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مطبع
میں۔ یہ دونوں مطبعے بہت اچھا کام کرتے ہیں
اور قابلِ اعتماد ہیں۔"

باطن کی صفائی کا یہ حال تھا کہ دل میں کبھی کدورت نہ رکھتے تھے۔ دوسروں کی غلطیوں کو اکثر نظر انداز ہی نہیں، بلکہ معاف بھی کر دیتے تھے، یہاں تک کہ مخالفین سے تعلق بھی اپنے دل میں غبار نہیں آنے دیتے تھے اور جب بھی ملتے، ایسے ملتے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ خوش ذہن بھی تھے اور بات بات میں مزاح پیدا کرتے تھے۔ اسپتال میں جو نرس دوائی پلانے آتی، اُسے مس رُوح افزا کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ وہ پیروں میں پیر، جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچے تھے۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے اور اکثر بچوں کی طرح معصوم شرارتیں بھی کرتے تھے۔ اُن میں شبنم کی برودت اور نرمی بھی تھی اور شعلے کی لپک، بلکہ آفتابِ نصف النہار کی پگھلا دینے والی گرمی بھی۔ وہ ابتدائے عشق ہی سے آگ تھے اور انتہائے عشق میں، جب کہ لوگ خاک ہو جاتے ہیں، وہ آگ ہی رہے۔ زمانے کی سردی، گرمی اور اونچ نیچ اُن کے مقصد کی لگن کی آگ کو سرد نہ کر سکی۔

عبدالحق ایک ادارہ اور ایک عہد تھے۔ تقریباً ایک صدی زندہ رہ کر پُرانے اور نئے لوگوں کے درمیان رابطہ بنے رہے اور آج ہم میں نہ ہوتے ہوئے بھی، ہم میں موجود ہیں۔

سچ ہے، مقصد سے زندگی بنتی ہے، بڑھتی بھی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔

●●

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

برار کا دبستانِ شاعری

ریاستِ مہاراشٹر کا تاریخی علاقہ برار[1] ایک زمانے میں علما و ادبا اور شعرا و فضلا کا ایک ایسا مرکز تھا، جہاں دور دور سے تشنگانِ علم و ادب آکر اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ افسوس کہ اب اس کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو کبھی پہلے تھی۔ اس سرزمین پر حضرت مولانا ابراہیم سندھی، حضرت مولانا یحییٰ سندھی (ف ۱۰۵۰ھ) اور مولوی شیخ غلام مصطفیٰ انسان (ف ۱۱۴۲ھ) جیسے جید علما نے بیٹھ کر درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ یہیں سے آقا محمد امین وفا، ابوالحسن رسا، مبارک خاں مبارک، سید محمد درویش درسی، میر لطف علی لطفی، شاہ غلام حسین، شاہ باقر، اور سید امجد حسین خطیب امجد جیسے عظیم شعرا ابھرے جنہوں نے اپنے علم و فن اور شعر و سخن کی ندرت سے دنیائے ادب کو منور کیا۔

موجودہ برار چار اضلاع : امراوتی، آکولہ، ایوت محل اور بلڈانہ پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں نے اس سرزمین پر سب سے پہلے اس وقت اپنا قدم رکھا جب ۱۲۹۴ء میں علاء الدین خلجی دیوگری پر حملہ آور ہوا تھا۔ علاء الدین نہ صرف برار کے تاریخی شہر ایلچ پور[1] کے راستے سے ہوتا ہوا دیوگری گیا تھا بلکہ اس شہر میں دو دن رُک کر آرام بھی کیا تھا۔ اس کی حکومت کے زمانے میں مسلم فوجیں دہلی سے برار کے ہی راستے سے ہو کر دکن جایا کرتی تھیں۔ حکومتِ یادو کے زوال (۱۳۱۲ء) کے بعد سے ۱۸۵۳ء تک برار مسلسل مسلم حکمرانوں کے قبضے میں رہا۔ ابتدا میں یہ بہمنی حکومت کے زیر اثر تھا۔ اس کے بعد پندرھویں صدی عیسوی کی اخیر دہائی میں یہاں عماد شاہی حکومت وجود میں آئی جو تقریباً ۸۰ سال تک قائم رہی۔ پھر احمد نگر کے نظام شاہی حکمراں اس پر قابض ہو گئے اور اخیر میں مغل بادشاہوں اور حیدرآباد کے نظاموں کا یکے بعد دیگرے اس پر غلبہ رہا۔

اس طویل عرصے میں یہاں جو حکمراں آتے یا گورنر، صوبیدار اور نواب مقرر ہوئے، وہ نہ صرف علم و ادب کے قدرداں تھے بلکہ ان میں سے بعض اچھے شاعر، ادیب اور فن کار بھی تھے۔ یہ خوش گوار فضا ادب و شاعری کی ترویج و اشاعت کے لئے اتنی مفید ثابت ہوئی کہ یہ علاقہ علما، ادبا اور شعرا کا ایک اچھا خاصا مرکز بن گیا۔ یہ ادب و شاعری کی بدنصیبی ہے کہ تاریخ نے ان میں سے بہت ہی کم بزرگوں کو اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ قدیم کتب اور تذکرے کی روشنی میں یہاں صرف چند شعرا کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

فانی : خواجہ احمد شیراز دہاری نزیل

یہ[2] شیراز کے قصبہ دہار کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے شاہ فتح اللہ شیرازی سے علم معقول و منقول سیکھا تھا۔ تحصیل علم کے بعد شیراز سے بیجاپور چلے گئے اور علی عادل شاہ کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ بادشاہ کی وفات کے بعد احمد نگر کا رُخ کیا، جہاں برہان نظام شاہ نے انہیں ناظر سلطنت مقرر کیا۔ جب نظام شاہی کے پوتے نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اس نے فانی کو برار کا صوبیدار بنا کر بھیجا۔ وہ اس منصب پر بادشاہ کے انتقال تک فائز رہے۔ بعد کو گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اسی عالم میں ۱۰۱۶ھ میں ۷۶ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ شرح گلشنِ راز، حواشی نفحات الانیس، فصل الخطاب اور شرح خطبۂ بیان آپ کی وقیع تصانیف

[1] - ایلچ پور (موجودہ اچل پور) برار کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ اس کی بنیاد راجہ ایل نے ڈالی تھی۔ کسی وقت میں یہ برار کا صدر مقام تھا لیکن آج یہ امراوتی ضلع کی ایک تحصیل ہو کر رہ گیا ہے۔ تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ایک زمانے میں نو لاکھ کے قریب آبادی پہنچ گئی تھی لیکن آج اس کی آبادی ۴۵ ہزار سے زائد نہیں ہے۔ ادبی اور علمی لحاظ سے بھی یہ زمین ہمیشہ زرخیز رہی ہے۔

[2] تذکرہ شعرائے دکن۔ مولفہ عبدالجبار ملکاپوری۔ حصہ دوم۔ ص ۸۸۶

بیدر ثانی صاحب دیوان شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی مشہور تصنیف تاریخ ادب اردو (حصہ اول) میں اُن کے اردو کے کئی اشعار نقل کئے ہیں۔ مولوی عبدالجبار ملکاپوری مولف تذکرہ شعرائے دکن نے اُن کے کلام کے جو نمونے دیئے ہیں، اُن میں سے دو شعر ملاحظہ کیجئے :

یک جرعہ کہ از حریف مستت برسد
پس چاشنی دم الستت برسد
این نام نہادہ اند برطاق بلند
تا بہ سرِ خویش نہ کر دستت برسد

شاہ عبدالرحمٰن

شاہ[۳] عبدالرحمٰن قادری بیجاپور کی تباہی کے بعد برار آئے تھے، جہاں وہ ایک طویل عرصے تک مقیم رہے۔ یہاں حسنِ اتفاق سے اورنگ زیب کے فرزند شاہ عالم سے اُن کی ملاقات ہوگئی اور وہ اُن کے مقربین میں شامل ہو گئے۔ پھر برار چھوڑ کر دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔

ع۳۔ مولوی ابوتراب عبدالجبار ملکاپوری اپنے والد خواجہ مظفر شتّہ کی وفات کے بعد قاضی مقرر ہوئے۔ ننہال کی طرف سے ان کا سلسلۂ نصب محمد طاہر محدث پٹنی (گجرات) مصنف مجمع البحار سے ملتا ہے۔ اُنہوں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے ماموں غلام لیٰسین ابن شیخ گلاب سے اپنے پیدائشی وطن ملکاپور (ضلع بلڈانہ) میں حاصل کی تھی۔ پھر تحصیل علم کے شوق میں جنگاؤں، امراؤتی، بمبئی اور حیدرآباد کا سفر کیا۔ بعدازاں مولوی محمد زماں خاں شاہجہاں پوری سے فقہ کا علم سیکھ کر لکھنؤ اور لاہور کے علماء سے استفادہ کیا۔ انہوں نے مولوی عبدالحی اور مولوی فیض الحسن صاحب سے بھی سند حاصل کی تھی۔ تحصیل علم کے بعد فکر معاش نے انہیں حیدرآباد پہنچا دیا، وہاں مدرسہ اعزّہ میں عربی فارسی کی معلمی مل گئی جہاں وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ وہیں انہیں تاریخ کی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ نادر اور نایاب کتابوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ان کی تعداد تین سو سے زائد پہنچ چکی تھی کہ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی میں یہ تمام سرمایہ تلف و تباہ ہوگیا۔ انہوں نے دکن کے سلاطین، شعرا اور صوفیا کی ایک مستند اور جامع تاریخ لکھی ہے جو اُن کی زندگی میں پانچ جلدوں میں تذکرہ سلاطین دکن (۱)، تذکرہ شعرائے دکن (۲) اور تذکرہ اولیائے دکن (۲) کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ اِن کا انتقال ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء میں ہوا۔

ع۴ ۔ دکن میں اردو مولفہ نصیرالدین ہاشمی (۱۹۶۳) ص ۳۸۰
دکنی ادب کی تاریخ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ ص ۹۹

تھی۔ انہوں نے باغِ حسینی (۱۱۳۱ھ) کے نام سے تقریباً ۱۶ ہزار اشعار کی ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ خانقاہ عنایت الہیٰ بالاپور (ضلع آکولہ) میں محفوظ ہے۔ اُن کے چند اشعار دیکھئے، اپنے وطن بیجاپور کی تباہی کا تذکرہ کس قدر پُر درد لہجے میں کیا ہے :

جو اس وقت میں تھا بیجاپور شہر   سو اس شہر کی تھی جہاں میں خبر
اتھے بادشاہ واں کے صاحب عمل   نہ تھا ایک رتی کام کا کیں دخل
جتی خلق واں کی وضیع و شریف   سخی، مہرباں، ہور بہوتیچ لطیف
تبرّا تھے سب چھند فریباں ستے   اتھے معتقد وہ فقیراں ستے
جو آدیں بزرگاں مرے شہر میں   رکھیں کر وطن اپنا آرام سیں
اتھا نام اِس شہر کا ہر دیار   تو آدیں خبر سُن کے عالِم اپار
خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا   اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا
ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگ زیب   کئے اس کے لینے کے تئیں کئی فریب
دیئے بھیج فوجاں کی اوّل عتاب   جو جا کر کریں ملک سارا خراب
پچھیں آپ آ ایک حیلے ستے   لئے شہر ہور ملک سب غضب تے

انسان : شیخ غلام مصطفیٰ

اصل[۵] میں ملاباد کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں دکن آئے اور منصب داری کے عہدے پر مامور ہوئے۔ نوکری ترک کرنے کے بعد ایلچپور میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ انہوں نے ملا قطب الدین سہالوی اور شیخ غلام نقشبندی لکھنوی سے علم حاصل کیا تھا اور شیخ جان محمد قادری دہلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ یہ اپنے زمانے کے ایک جیّد عالم اور مشہور صوفی تھے۔ ان کے کلام میں توحید و معرفت کے قوی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اردو اور فارسی کے علاوہ ہندی میں شعر اور دوہے بھی بڑی روانی سے کہتے تھے۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دیہاتی نوجوان پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئے تھے۔ اتفاقاً ایک دن اُس نوجوان کا انتقال ہوگیا اور وہ اس حادثے سے اتنے متاثر ہوئے کہ پاگل ہو گئے۔ اِس کے بعد انہوں نے اپنی بقیہ زندگی جنگل میں گذاری۔ آخرکار ۱۱۴۲ھ میں اسی حالت میں رحلت فرمائی اور ایلچپور میں شاہ دولہ عبدالرحمٰن کے مقبرے کے قریب دفن کئے گئے۔ اُن کی ایک رباعی بہت مشہور ہے :

ہستی شخص و عدم چو آئینہ بہ پیش   عالم بمثال عکس بیخویش بخویش
انساں بمثل چو چشم چو عکس است دور   آں شخص عیاں نمودہ پاک از کم و بیش

ع۵۔ تذکرہ شعرائے دکن (حصہ اوّل) ص ۱۹۶، سروِ آزاد مرتبہ غلام علی آزاد بلگرامی

دوشعر [illegible] ملاحظہ کیجیے :

نہ بیرا و تو تنہا دارد از نرگس چمن چشمی
بود با دام چشمی لالہ چشمی یاسمن چشمی
چہ عجب در روشِ دہر گر افتاد خلل
پیر شد چرخ ازاں گشت دماغش مختل

وفا : آقا محمد امین

وفا[۶] کے والد حکیم محمد تقی خاں اصفہانی اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں اصفہان سے ہندوستان آئے تھے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ آصف جاہ بہادر (ف ۲۱ مئی ۱۷۴۸ء) کی رفاقت میں گذارا تھا' جس کے صلے میں دو ہزاری منصب ذات اور سات سو سواروں سے سرفراز کئے گئے تھے۔ بعد ازاں آصف جاہ نے انہیں برار کی نظامت سپرد کی تھی۔

وفا ۱۱۱۰ھ میں ایلچپور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی نگرانی میں پرورش و تعلیم پائی۔ انہوں نے ملا شیخ محمد مازندرانی اور مولوی شیخ غلام مصطفیٰ انسان جیسے جید علما سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ جب شاعری کا شوق دامن گیر ہوا تو انہیں دونوں بزرگوں سے مشورہ کیا۔ والد کے انتقال کے بعد جاگیر و منصب کی پرواہ کئے بغیر خالص علمی و ادبی زندگی بسر کی۔ درس و تدریس ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بس گھر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر یہی خدمت انجام دیتے تھے انہیں حکام کی طرف سے جو کچھ مل جاتا تھا' اسی پر صبر و قناعت سے زندگی گذارتے تھے۔ اُن کے مزاج میں خلوص' سادگی' خاکساری' توکل' قناعت اور بردباری تھی۔ انہوں نے ۱۱۹۳ھ میں وفات پائی اور ایلچپور میں سپردِ خاک ہوئے۔ نمونۂ کلام دیکھئے :

عجب میں ہر طرف اے دل رُبا عاشق کے پھیرے ہیں
دل و جاں' چشم و گوش و ہوش سب نت محو تیرے ہیں
اُگے گا سبزۂ خط آبیاری سیں تری مکھ کی
زمینِ حسن میں جو دانہ ہائے خال پھیرے ہیں
دسے جیوں آشیاں' ہر حلقۂ جعدِ معنبر ہو
وفا یک زلف میں کئی طائرِ دل کے بسیرے ہیں

ع۶ ـ تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۱۵۰ ـ تذکرہ گلشنِ گفتار ـ
[illegible] ایم کے فاطمی (۱۹۴۳ء) ص ۷۸ (مولفہ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی)
[illegible] الشعرا مصنفہ مرزا افضل قاقشال ص ۱۱۹ ـ سب رس (حیدرآباد) اکتوبر
ص ۲۳

دو جہاں کو ترک کر اک دل رُبا کے واسطے
اب خودی سیں باز آ اے دل خدا کے واسطے
گھیر سے جامہ کے ہوں میں بند گھیرے میں پھنسا
دل کی گھنڈی بن کے میں تیری قبا کے واسطے
بل گئے بلدار چہرے پر ترے عاشق کے دل
پیچ میں ہم کو لپیٹا کس خطا کے واسطے
سرخروئی ہو مجھے تا دستگیری سیں تری
خوں مرا پامال کر رنگِ حنا کے واسطے
محضرِ دل خاکساری سے قبولیں مہر وصل
خاکِ رہ میں ہو رہا کس نقشِ پا کے واسطے
خال و خط نے پیو کی مجھ دل سیں نکالا ہے دھواں
تخم ریحاں کا کرو شربت دوا کے واسطے
نہ لگا خوبی کو اپنی بے وفائی کا کلنک
مت وفا سے ترک کر ملنا خدا کے واسطے

رسا : ابوالحسن

ابوالحسن[۷] اپنے زمانے کے ایک بلند فکر شاعر تھے۔ اُن کا مولد و مسکن بالاپور (ضلع آکولہ) تھا۔ وہیں مزار بھی ہے۔ یہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ چند اشعار دیکھئے :

بس کہ دل محوِ خیال چشمِ نرگس فام ہے
ہر طرف مدِ نظر موجِ گلِ بادام ہے
بلبلیں شعلے پہ جھپٹ مارتے ہیں جیوں پتنگ
بے مروّت' بے وفا' نا مہرباں' خود کام ہے
حاجتِ جال و قفس اے پُر جفا صیاد نیں
رشتۂ مدِ نگہ مجھ ناتواں کا دام ہے
التجا ہے ساغرِ سرشار ساقی میں رسا
ہر نگاہِ مست اُس کی مد بھرا اک جام ہے

مکھ سیں دل بر کے و انقاب کرو
حُسن کو اُس کے بے حجاب کرو
ذوق پابوس ہے اگر دل میں
حلقہ چشم کو رکاب کرو
جامِ مے کی موہن کو خواہش ہے
دل کو میرے نے جا کباب کرو
طبع میری بلند ہے یارو
ہے بجا گر رسا خطاب کرو

ع۷ ـ تذکرہ گلشنِ گفتار ـ ص ۷۷

خواجہ: ایوب (جمیل بیگ خاں)

[8] اِن کے والد کا نام خواجہ محمد رضا کرتھا، جو درویش صفت اِنسان تھے خواجہ ایوب کو آصف جاہ بہادر نے برار کی صوبیداری پر مامور کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ ایک عرصے تک یہاں مقیم رہے۔ بہت نڈر اور بے باک تھے، مستقل مزاج، خوش کردار اور دوست نواز تھے، مجلس سماع کے دل دادہ تھے، ترک ملازمت کے بعد اورنگ آباد میں جا بسے تھے، وہیں ۱۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا۔ نمونتاً فارسی کے تین شعر درج کئے جاتے ہیں :

ہلاک گذشتنِ مجنوں ہزار سال گذشت
ہنوز در کنفش بوے سیو محبت یافیست
گہرفشاں شدہ اشکم زچشم بہرِ نشار
بپاے بوس تو ہردم باہر و رفتستم
صدائے قلقلِ مینا شنیدہ مست شدند
کسے چگونہ چند قطرۂ ایاغ ترا

محرم: محمد ماہ (معظم خاں)

[9] اِن کے والد نواب شجاعت خاں، دکن کے مشہور و معروف صوفی شاہ نظام الدین گمنامی کے نواسے تھے۔ انہیں نواب آصف جاہ (ف ۲۱ مئی ۱۷۴۸ء) نے پنج ہزاری منصب اور شجاعت خاں کا خطاب دے کر برار کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ جب مرہٹہ سردار رگھوجی جبراً لگان وصول کرنے کی غرض سے برار پر حملہ کیا تو انہوں نے اس کا دلیری سے مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں شہید ہوگئے۔ والد کی شہادت کے بعد محرم کے بڑے بھائی سید شریف خاں شجاعت جنگ، برار کے صوبیدار بنائے گئے۔ انہوں نے جون ۱۷۵۲ء میں رحلت فرمائی۔

محرم بڑے سلیقہ مند اور ذہین تھے، عقل و فراست اور تمکین و متانت میں بہت مشہور تھے۔ وہ زیادہ تر فارسی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے، ریختہ بہت کم کہتے تھے۔ اِن کا بھی انتقال ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں ہوا۔ اُن کی زبان بہت ہی سلیس اور شگفتہ ہے کلام میں استادانہ باریکیاں پائی جاتی ہیں :

نزاکت بس کہ رکھتا ہے وہ دل دار جہاں آرا
صفائی آئینہ ہے یار اُس کے عکس عالی کا
شاخ کی مینا کو کس شوخ سے لاتی ہے بہار
گل پہ شبنم نہیں، اس کو مے پلاتی ہے بہار
بہار آوے تو بلبل کو قفس میں قید مت کرنا
تو ایسا ظلم اُس پہ کس پہ اے صیاد مت کیجو

صارم: میر عبدالحی خاں (صمصام الملک)

[10] میر عبدالحی خاں بہادر وقار و صارم کے جدِ امجد میر کمال الدین خواف سے اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور شاہی دربار سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں اِس خاندان کے افراد اورنگ آباد جا بسے، جہاں بادشاہ نے انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا صارم کے والد صمصام الدولہ شاہنواز خاں عرصۂ دراز تک برار کی دیوانی کے صدر رہے۔

صارم کی پیدائش ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں اورنگ آباد میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۷۴۸ء میں خطاب اور منصب حاصل کیا اور برار کے دیوان مقرر ہوئے۔ بعد ازاں اورنگ آباد کے ناظم بنائے گئے۔ انہوں نے ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۱ء) میں رحلت فرمائی اور حیدرآباد میں دفن کئے گئے۔ میر غلام علی آزاد نے تاریخ وفات کہی :

افسوس کہ رفت امیر عالی گوہر — دیوان دکن صاحب فضل و ہنر
تاریخ وفات ابن امید دانا — "صمصام الملک عقل کل کرد سفر"

(۱۱۹۶ھ)

صارم ایک کامیاب نثر نگار اور شاعر تھے۔ اردو اور فارسی زبانوں میں اشعار کہا کرتے تھے۔ اردو کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :

مجھے گر جاں کنی کا حکم وہ شیریں دہاں کرتا
کہا اُس کا خدائی سوں ارے یارو بجاں کرتا
فلک گرتا زمیں پھٹتی، چمن سے رنگ اُڑ جاتا
اگر میں اپنے دل کا حال اے ظالم بیاں کرتا

---

[8] ۔ تذکرہ شعرائے دکن (جلد اول) ص ۳۹۲

[9] ۔ دکن میں اردو، ص ۔ ۴۱۴
تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۔ ۱۰۲۲
چمنستانِ شعرا مصنفہ لچھمی نرائن شفیق (مرتبہ عطا کاکوی) ۱۹۶۸ء ص ۔ ۶

[10] ۔ تذکرہ بے نظیر مولفہ سید عبدالوہاب افتخار (مرتبہ عطا کاکوی) ۱۹۶۸ء، ص ۳۲
تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۱۰۱
دکن میں اردو ۔ ص ۴۰۹

سمجھ تجھ کو رقابت میں بلا جانا ہے ہمارے ساتھ میں کب دل رہا ہے
نہیں کھلتا ہمارا وہ بانا سوال دل یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے
چمن کے صحن میں ہم بھی نہال ہو جاتے جو تیرے پاؤں تلے پائے مال ہو جاتے

عاصی : شیخ نور محمد

[۱۱] اگرچہ برہان پور میں پیدا ہوئے اور ان کی زندگی کا آغاز وارتقا بھی اسی سرزمین پر ہوا، لیکن وہ میر عبدالحی خاں صارم کے ہمراہ عرصے تک برار میں مقیم رہے۔ جب برار سے اورنگ آباد منتقل ہوئے تو ملازمت چھوڑ کر فقیرانہ زندگی اختیار کرلی۔ اُن کی وفات ۱۱۷۵ھ میں برہان پور میں ہوئی۔ ایک شعر ملاحظہ ہو :

تجھ غم کی آگ دل میں رکھا ہوں چھپا کے میں
ڈرتا ہوں تا فلک نہ اُڑے یہ شرر کہیں

رنگین : نورالدین حسین خاں

[۱۲] اِن کے والد ضیاءالدین حسین خاں دکن کے صدر الصدور تھے۔ انہوں نے ابتدا میں رجا اور بعد میں رنگین تخلص اختیار کیا تھا۔ مثنوی نگاری سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ غزلیں بہت ہی کم کہتے تھے۔ یہ ایک حسین وخوبصورت نوجوان تھے اور اسی عالم میں ۲۴ جمادی الثانی ۱۱۷۰ھ کو جمعہ کے دن ایلچپور میں اچانک ان کی موت واقع ہوئی۔ لچھمی نرائن شفیق مولف چمنستان شعرا نے وفات کی تاریخ اس طرح نکالی ہے :

" بمرگ مفاجات او شد ز دنیا " ۱۱۷۰ھ

میر عبدالقادر مہربان سے اِن کے گہرے تعلقات تھے۔ یہ بھی انتقال کے وقت اُن کے قریب موجود تھے۔ چنانچہ اس حادثے سے متاثر ہوکر برجستہ یہ مصرع کہا تھا :

" با جل رفت از جہاں رنگین "

مبارک : مبارک خاں

مولانا عبدالسلام ندوی نے مشہور تصنیف "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے" (مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۶۳ء) میں ماثر الامراء (حصہ سوم، ص ۷۶۳) کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ "محمد خاں نیازی امرائے اکبری و جہانگیری میں ایک مشہور علم دوست اور درویش صفت امیر تھے۔

آشتی (موجودہ آشٹی) پرگنہ برار اُن کی جاگیر میں تھا۔ اور چونکہ وہ دکن میں رہ چکے تھے اس لئے اس پرگنے کو انہوں نے اپنا وطن بنالیا تھا۔ اس کی آبادی میں اس قدر اضافہ کر دیا تھا کہ وہ ایک بڑا قصبہ ہوگیا تھا مرنے کے بعد وہ یہیں دفن ہوئے اور ان کے لڑکے احمد خاں نے وہاں ایک مقبرہ، مسجد اور باغ بنوایا ۔۔۔۔۔ یہ قصبہ مدتوں زیارت گاہِ خلائق رہا۔ لیکن اب وہ بلکہ پورا پرگنہ ویران ہوگیا ہے اور سو گھروں میں سے صرف ایک گھر میں چراغ جلتا ہے اور دس گاؤں میں سے صرف ایک گاؤں سے مال گذاری وصول ہوتی ہے۔"

دراصل یہی محمد خاں نیازی، مبارک خاں مبارک کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ مبارک[۱۳] کے والد کا نام مبارک خاں نیازی تھا جو عالمگیر کے زمانے تربیت خاں کے مصاحب ومقرب تھے۔ ان کی بدزبانی اور سخت کلامی کی وجہ سے ایک مغل کاشغری نے انہیں تلوار سے زخمی کر دیا تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ معاشی پریشانیوں کا شکار رہے۔ بالآخر نظام الملک آصف جاہ نے ان کے لئے ایک منصب مقرر کر دیا جو ان کے لئے معاشی خوش حالی کا سبب بنا۔ مبارک بھی اپنے والد کی طرح آصف جاہی منصب دار وجاگیردار تھے۔ خوش فکر اور خوش خیال شاعر تھے۔ انہوں نے ۱۱۹۰ھ میں رحلت فرمائی اور آشٹی میں سپرد خاک ہوئے۔ دو شعر دیکھئے :

شب تارِ فراقت زدہ ام پہلوے
لیک آں صبحِ وصالِ تو د میدن باقیست
گرچہ کردیم تہی سیکدہا ازسرِ شوق
مے ازاں نرگسِ چشم چشیدن باقیست

درسی : سیّد محمد درویش

[۱۴] درسی کی پیدائش سورجی انجن گاؤں (ضلع امراوتی) میں ہوئی تھی۔ ایک جگہ اپنے وطن کی تعریف وتوصیف اس طرح کرتے ہیں :

مکانست من عرصۂ سورجی
کہ ہرگز ندانم طریقہ کجی
دیا رست موزوں بصوبہ برار
چو آب و ہوایش طراوت دیار
بہشت است ثانی بہ آب و ہوا
ہوا روز در روز خوش پیشوا

---

[۱۱] ۔ تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۸۲۹، چمنستان شعرا۔ ص ۶۱
[۱۲] ۔ چمنستان شعرا ۔ ص ۴۴

[۱۳] ۔ تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۱۰۲۶ ۔ [۱۴] ۔ تذکرہ شعرائے دکن (جلد اول) ص ۴۲۳

آپ نے علم معقول و منقول مقامی علما سے سیکھا تھا۔ فارسی نظم و نثر پر بے انتہا قدرت رکھتے تھے۔ نواب عوض خاں بہادر عضد الملک صوبیدار برار سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ انہیں کی فرمائش پر ۱۱۳۳ھ میں فارسی میں ایک مثنوی "نادر پسند" لکھی تھی جس میں دو شہزادہ اور ملکہ کے عشق کی داستان ہے۔ جس شعر سے کتاب کی تالیف کا سن ظاہر ہوتا ہے وہ دیکھئے

بہ سن یک ہزار و صد و سہ و سی
ہمایوں در آں روز ہائے لبی
مرتب شد ایں نامۂ نام ور
چنیں کا نغ پرداختم در دہر

درگاہ نے ۱۱۸۵ھ میں رحلت فرمائی۔ صاحبِ دیوان تھے۔ ان کا کلام سلیس اور بامحاورہ ہوتا تھا۔ تشبیہ اور مبالغے سے بھی اکثر کام لیتے تھے۔ دو دو شعر ملاحظہ کیجئے :

ساغرم پُر نور کن ساقی بیا، ساقی بیا
پردۂ را دور کن ساقی بیا، ساقی بیا
بردیم دل تمام براہِ خیالِ دوست
حاصل شود بہ کنم خامۂ کمالِ دوست

لطفی : میر لطف علی

[۱۵] کئی تذکروں میں ان کا نام اور دو تین اشعار ملتے ہیں۔ مولوی عبدالجبار ملکاپوری مولفہ تذکرہ شعرائے دکن نے لکھا ہے کہ لطفی سید سعد اللہ ہشیر زادہ سید شہاب الدین کے پوتے اور درویش محمد خاں صوبیدار برار کے نواسے تھے عربی اور فارسی میں ذی استعداد تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں ان کی ایک مثنوی "بہلول صادق" پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں :

"مثنوی میں حمد و نعت نہیں ہے۔ قصّہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بنارس کا ایک مسلمان بہلول نام، ایک ہندو لڑکی پر جو روز دریا پر اشنان کے لئے آتی تھی، عاشق ہوگیا۔ لوگوں نے بہلول کو برا بھلا کہا اور کہا کہ اگر سچا عاشق ہے تو دریا میں ڈوب مر۔ بہلول عشق سے دیوانہ ہو چکا تھا۔ دریا میں کود پڑا۔

اس واقعے کی اطلاع اس لڑکی کو ہوئی، وہ دریا پر آئی اور خود کو اس میں ڈال دیا۔ کچھ دن کے بعد جب موجوں نے ان کو باہر لایا تو لوگوں کو یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ وہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ آخر دونوں کو ملا کر ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔"

یہ مثنوی ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سائز ۷ ۵/۸ × ۴ ۱/۲ اور ہر صفحے پر ۱۰ یا ۱۱ سطریں ہیں۔ اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے :

سنا ایک روز میں صاحب زباں سیں
جو اصل سخن تھا نیکو بیاں سیں
فرشتہ خوی تھا پاکیزہ صورت
جو بادِ صبح تھا بس تیز حرکت

لطفی نے ۱۲۰۰ھ میں رحلت فرمائی۔ تذکروں میں عموماً اُن کے یہ اشعار ملتے ہیں :

تجھ عشق کی اگن سیں شعلہ ہو جل اٹھا جیو
دَم موم کے نمونے کل کل پگھل گیا ہے
جیو کا چمن جلا سیو، جلتی انگارے لے کر
اُکلا کے آگ دینے ٹیسو جنگل گیا ہے
میں عشق کی گلی میں گھائل پڑا تھا تس پر
جوبن کا ماتھا آکر مجھ کو کھندل گیا ہے

شاہ غلام حسین

[۱۶] جس زمانے میں برار میں عماد شاہی حکومت قائم ہوئی تھی اور ایلچپور اس کا صدر مقام تھا، شاہ غلام حسین کے اجداد الہ آباد سے نقل مکان کر کے ایلچپور چلے آئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ شاہ غلام حسین کے والد غلام حسن، نظام الدین اورنگ آبادی کے خلیفہ شاہ اسمٰعیل چشتی کے مرید تھے۔ شاہ غلام حسین بذاتِ خود ایک صوفی بزرگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں تصوف و سلوک کے رموز ملتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) میں ایلچپور میں ہوا۔ اُن کی نو مثنویاں : اشغال نامہ، سفر نامہ، قلندر نامہ، جھولا نامہ، سکھی نامہ، اد دھو نامہ، یک رنگ نامہ، لگن نامہ اور مناقب ان کے دیوان "دیوانِ حسینی" میں موجود ہیں۔ یہ دیوان مخطوطے کی شکل میں ذوالفقار حسین خطیب ایلچپوری کے کتب خانے میں آج محفوظ ہے۔ ڈاکٹر سید نعیم الدین صاحب نے ان میں سے چند مثنویوں کا تعارف

---

[۱۵] تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۔ ۹۷۳
چمنستانِ شعرا :
تذکرۂ میر (نکات الشعرا) مرتبہ مصطفیٰ کمال فاطمی ۔ ص ۱۴۴
تین تذکرے مرتبہ عطا کاکوی (نومبر ۱۹۶۸) ص ۸۸
یورپ میں دکھنی مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی (۱۹۳۲ء) ص ۵۲۹
دکن میں اردو ۔ ص ۴۳۷

[۱۶] دکن میں اردو ۔ ص ۴۷۵
نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۸ء
تذکرہ رحمانی مولفہ محمد مہتاب خاں (۱۹۵۸ء) ص ۵۴

(ادارۂ ادبِ اردو بمبئی) میں کروایا ہے۔ بعض مثنویاں دیوناگری رسم الخط میں چھپ چکی ہیں۔ "یک رنگ نامہ" کے چند اشعار دیکھئے :

یوں دونوں جنے اک جاگہ سوں آئے
جگت میں مسلمان ہندو کہاوے
گھڑا ہے کمہار ایک ماٹی کے بھانڈے
ہوا کوئی مُلّا، ہوا کوئی پانڈے
یہ دونوں جنے کیوں بھٹکتے چلے ہیں
کدھر سوں، کدھر کو بھٹکتے چلے ہیں
مسلمان مسجد میں سجدے کو جاوے
او ہندو بھی پوجا کو دیول میں جاوے
وہاں جا کے ماٹی کی دیوار دیکھیں
اپس گھٹ کو چھانے تو دیوار دیکھیں
مسلمان تسبیح لمبی پھراویں
اور ہندو بھی مالا بھگل کے دکھاویں
دکھاتے ہیں لوگوں کو دانے پھرا کر
اپس منکا منکا نہ پھیریں ہرا کر
مسلمان اللہ کا نام بولیں
اور ہندو بھی ہر ہر جپیں رام بولیں

باقر : شاہ باقر حسین

شاہ[17] باقر حسین باقر کی زندگی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ صلابت خاں صوبیدار برار کے درباری شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ انہیں مذہبی امور سے گہری دلچسپی تھی۔ سلسلۂ طریقت میں شاہ حسین کے مرید تھے۔ انہوں نے دیوان میں کئی جگہ اپنے مرشد کا تذکرہ بڑے ہی ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں :

شاہ حسین پیر کا میں کیا کروں بیاں
باقر کو دو جہان سے آزاد کردیا

اب کلام کا نمونہ درج کیا جاتا ہے :

ساقی نہ دے پیالہ مجھے اب شراب کا
پردہ نہیں رہا ہے مرے پر حجاب کا

[17] ۔ دکن میں اردو ص ۷۷۴ ـــ ماہنامہ خیال (کاماٹی) اپریل ۱۹۴۰ء

گرچہ ہے بازار کثرت کا بھرا چاروں طرف
پر ترے دیدار میں امد کام مجھ کو کر رہا
جلوہ تو ترے نور کا ہر شے میں بھرا ہے
طالب میں جو دیکھا وہی مطلوب میں دیکھا
تو تو میرے آنکھ میں رہتا ہے ہردم ہر گھڑی
میں ترا ہوں دل سے عاشق، تو مرا دلدار ہے

جنرل : نواب نامدار خاں پنّی

جنرل، برار کی ایک مایۂ ناز ہستی اسمٰعیل خاں پنّی کے پوتے تھے۔ تاریخ امجدی کے مصنف امجد حسین خطیب نے اسمٰعیل خاں کے حالات پر یہ روشنی ڈالی ہے[18] :

"اسمٰعیل خاں پنّی ولد سلطان خاں بن حمید خاں بن شمس خاں بن جنید خاں بن بند الخاں از افغان بدہلی آمدہ اند، واز دہلی در علاقہ چتوڑ مارواڑ سکنی اختیار کردند، و بعد از مرورِ ایام در علی پور از نواحِ ناگپور آمدہ مقیم ماندند و نزد بخت بلند زمیندار ناگپور مسلازم شدند وایام چند پیشہ تجارت کردند باز آنجا در عہد محمد اورنگ زیب بہادر شاہ غازی در سنہ یکہزار و یک صد و ہشت فائز ایلچپور شدہ طرح اقامت انداختند و در اسلحداران ایلچپور کہ علی مراد خاں بود ملازم شدہ روزگار گذرانیدند"

اسمٰعیل خاں ایک جری اور بہادر انسان تھے۔ وہ اپنی صلاحیت اور شجاعت کی وجہ سے ۱۷۶۴ء میں برار کے گورنر مقرر ہوئے۔ ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ میدانِ جنگ میں گذرا اور آخر کار وہیں انہیں ۱۰ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے صلابت خاں (ف ۱۲ ربیع الاول ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء) ۱۷۹۰ء میں برار کے گورنر بنائے گئے اور چھوٹے لڑکے بہلول خاں کو ۱۷۹۲ء میں برار اور اورنگ آباد کی صوبے داری کا منصب ملا۔

نواب نامدار خاں پنّی جنرل نواب صلابت خاں کے صاحبزادے تھے۔ یہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۲۵ء میں برار کے گورنر مقرر ہوئے انہوں نے بہت ہی امن اور اطمینان کا زمانہ پایا تھا لہٰذا انہیں فنون لطیفہ کی خدمت کرنے کا کافی موقع ملا۔ انہیں عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا ـــ ایلچپور میں بارہ دری، امام باڑہ مسجد، آئینہ محل (شیش محل)[19] نامدار باغ

[18] ۔ تاریخ امجدی مصنفہ سید امجد حسین ۔ ص ۹۰

[19] Amravati District Gazetteer (1968) P. 114

اور تاریخ صبا انہیں کا بنایا ہوا ہے۔ یہ شاعری سے بھی مزاولت رکھتے تھے۔ ان کے دیوان میں جو قاضی الحاج کرم محی الدین ایلچپوری کے کتب خانے میں موجود ہے، ہر صنفِ سخن میں کلام پایا جاتا ہے۔ ایک دن ان کے چہرے پر اچانک فالج کا حملہ ہوا، جو ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا اور وہ ۹ محرم الحرام ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) کو جب کہ ان کی عمر مشکل سے ۴۴ سال ہوگی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔[19] اُن کی لوحِ مزار پر جو قطعات تاریخ کندہ ہیں، انہیں ملہم تخلص رکھنے والے کسی شاعر نے کہے ہیں۔ قطعات یہ ہیں[20] :

گشت متوجہ نامدار خاں ہیّ ذلک — چوں سوئے آستانِ اوجِ بہشت
داد ہاتف ندا از عالمِ غیب — "آفتابِ جہانِ اوجِ بہشت"

۱۲۶۰ھ

کرد چوں نامدار خاں رحلت — در محرّم ز مرضِ استقسا
بود نہم ز ماہ و پنج شنبہ — نوّر اللّٰہ مرقداً ابدا
گفت ملہم کہ وادریغا شد — چشم و نظم و نسق بے سروپا

۱۲۶۰ھ = ۶۰ + ۹۰۰ + ۳۰۰

اعزاز : مرزا دین محمد

[21] اعزاز اصل میں کابل کے رہنے والے تھے، تلاشِ معاش میں دہلی چلے آئے تھے، جہاں کچھ عرصے تک مقیم رہنے کے بعد ریاست ٹونک چلے آئے، وہاں نواب وزیر الدولہ نے انہیں سفارت کا عہدہ دیا۔ وہ کئی سال تک یہی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر ٹونک کی ملازمت چھوڑ کر حیدرآباد میں جا بسے اور وہاں سے برار کا رُخ کیا۔ برار میں اُن کی کافی قدر و عزّت کی گئی۔ وہ پہلے ملکاپور (ضلع بلڈانہ) میں منصفی کے عہدے پر فائز رہے، بعد ازاں تین سال تک جلگاؤں میں تحصیلدار کی حیثیت سے کام کیا۔ وہیں ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اُن کی وفات ہوئی۔ منشی رام سیوک گہر بار نے تاریخِ وفات کہی :

بگو تاجِ بلاغت چوں بیفتاد
بتاریخش دریغا وائے ویلا — ۱۲۷۷ھ

اعزاز خوش مزاج، خوش طبع، ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کے فارسی کے ۲۲ اشعار تذکرہ شعرائے دکن میں محفوظ ہیں۔ انہیں تصنیف و تالیف سے کما حقہ دلچسپی تھی۔ اخلاقِ محمدی، شاہنشاہ نامہ، فتاویٰ سنائی، دیوانِ اعزاز، عجائب الکلمات، مرآۃ الخیال وغیرہ اُن کی وقیع تصانیف تھیں۔ افسوس کہ یہ علمی و ادبی سرمایہ اب محفوظ نہیں رہا۔ فارسی کے چند شعر دیکھئے :

رفتم کہ ببوسم قدمِ پیرِ مغاں را
نذرِ درِ میخانہ کنم نقدِ رواں را
گفت قاصد کہ یار می آید
ایں خیالست دیدام در خواب
ز حسنت پرتوی در گلشن افتاد
نمود از چہرۂ گل رنگ پرواز
بر سرِ تربتِ اعزاز بناز آمد و گفت
کشتۂ کیست کہ خوں از کفشِ می بینم

ناقص[22] : قاضی محمد

ان کے والد کا نام خواجہ محمد عرف ننھے تھا۔ سلسلۂ نسب محمد بن فضل اللّٰہ برہانپوری سے ملتا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں ملکاپور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حضرت شیخ گلاب سے حاصل کرنے کے بعد ملکاپور کے کئی علمائے سے استفادہ کیا۔ انہیں ورثے میں والد اور خسر قاضی سیّد عبداللّٰہ کی طرف سے کافی جائیداد اور جاگیر ملی تھیں، جن کی وہ زندگی بھر نگہداشت کرتے رہے۔

ناقص غریب پرور اور مہمان نواز تھے۔ انکساری، بردباری، ہمدردی، سادگی اور تقویٰ و پرہیزگاری اُن کی شخصیت کے اہم عناصر تھے۔ ہندو مسلمان ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ انہیں تصوف سے دلی لگاؤ تھا۔ میر تقی علی کاکوروی کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن افسوس کہ اُن کا تمام شعری سرمایہ ضائع ہو گیا۔ اُن کا انتقال ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں ۷۵ سال کی عمر میں ہوا۔ جامع مسجد ملکاپور کے صدر دروازے کے سامنے مزار ہے۔

نفیس : بھوانی پرشاد

[23] نفیس کائستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد کا نام چنّی لال تھا۔

۱۹ـ Amravati District Gazetteer (1968) P. 114
۲۰ـ تذکرہ رحمانی ص۔ ۵۱، ۲۵
۲۱ـ تذکرہ شعرائے دکن (جلد اول) ص ۲۴۲
۲۲ـ تذکرہ شعرائے دکن (جلد دوم) ص ۱۰۹۶
۲۳ـ ایضاً ص ۱۰۹۴

نفیس کی پیدائش ایلچپور میں ہوئی تھی لیکن جب بڑے ہوتے تو بسلسلۂ معاش حیدرآباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی وکلا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ شاعری میں انہوں نے ۱۲۹۵ھ سے میر سرفراز علی الٰہ آبادی سے مشورہ لینا شروع کیا تھا۔ انہیں قانون دانی اور شاعری کے علاوہ ریاضی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ چند شعر:

بتوں کو سنگ دل حق نے بنایا | بچاؤں شیشۂ دل میں کہاں سے
فقط نفرت ہے مجھ سے ورنہ اے جاں | محبت ہے تمہیں سارے جہاں سے
دوا سمجھا ہوں اپنے دردِ سر کی | میں سر گھستا ہوں اُن کے آستاں سے

عنایت : محمد عنایت اللہ

عنایت کے والد عظمت اللہ، قصبہ بدنیرہ بی بی کی مسجد کے مؤذن اور پیش امام تھے۔ عنایت نے برار ہائی اسکول سے تعلیم پائی تھی، جہاں اُس وقت مولوی حسن صاحب صدر مدرس تھے۔ انہیں سے عنایت نے فارسی کی چند کتابیں نجی طور پر پڑھی تھیں، بعد ازاں آکولہ کے کسی کالج سے ریاضی وغیرہ کی تکمیل کی تھی۔ جب شاعری کا شوق دامنگیر ہوا تو منشی نور خاں صاحب کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ عنایت خوش گفتار اور خوش مذاق انسان تھے۔ تذکرۂ شعراے دکن کی تالیف کے وقت اُن کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی۔ دو شعر دیکھیے:[۲۷]

پھر گلوں سے ہوگیا ہے اِن دنوں گلزار سُرخ
عندلیبو فصلِ گل آئی ہوئے اشجار سُرخ
جب نظر مقتلِ عشاق پہ میری پہنچی
خون سے سُرخ تھے میدان ہزاروں لاکھوں

امجد : امجد حسین خطیب

ابوالفتح ضیاء الدین محمد المعروف بہ امجد حسین خطیب کے جدِّ اعلیٰ شاہ دولہ عبدالرحمٰن غازی کے ہمراہ ایلچپور آئے تھے۔ اِن کا سلسلۂ نسب حضرت علی تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد سیّد اشرف حسین خطیب ایک بلند پایہ عالم تھے۔ امجد کی پیدائش ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں ایلچپور میں ہوئی تھی۔ موصوف ایلچپور کی جامع مسجد اور عیدگاہ کے خطیب تھے۔ یہ منصب اُن کے خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آرہا تھا۔ ایک مذہبی عالم ہونے کے علاوہ امجد ایک بلند پایہ شاعر اور کامیاب مورخ بھی تھے۔ شاعری میں انہیں قصیدہ نگاری سے خصوصاً

۲۷۔ تذکرۂ شعراے دکن (جلد دوم) ص ۸۴۵

دل چسپی تھی۔ انہوں نے برار و دکن کی تاریخ فارسی زبان میں "تاریخ امجدی" کے نام سے لکھی تھی جو ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں خورشیدیہ پریس حیدرآباد سے شائع ہوچکی ہے۔ یہ کتاب ۲۵۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

انہیں سماجی و علمی خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ کی جانب سے خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ان کا دوسرا خطاب آفتاب برار تھا۔ خان بہادر مولوی سید امجد حسین خطیب ان کے بڑے صاحبزادے تھے جنہوں نے ایلچپور میں نورالبرار کے نام سے ایک پریس اس مقصد کے لئے قائم کیا تھا کہ تاریخ امجدی" کو اردو میں منتقل کر کے شائع کروائیں۔ مگر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اسی پریس سے موصوف نے ۱۹۰۹ء میں ایک تاریخی رسالہ نورالبرار جاری کیا تھا، جو کچھ ہی عرصے کے بعد بند ہوگیا تھا۔[۲۵]

ایلچپور کا خطیب خاندان علم و فضل کے اعتبار سے ابتدا ہی سے مالا مال رہا ہے۔ اس کے افراد نے ہر زمانے میں علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا سید عظمت حسین خطیب کے ماموں زاد بھائی سیّد مظہر حسین مظہر خطیب نے اس علاقے میں بہت ہی نام کمایا ہے۔ وہ امراوتی کی عدالت میں مترجم تھے۔ انہوں نے عثمانیہ مسجد روڈ، کیمپ امراوتی میں اسلامیہ پریس کی بنیاد ڈال کر جنوری ۱۹۱۰ء میں ۳۶ صفحات کا ایک ماہنامہ خادم، ۲۰×۲۶/۸ کے سائز پر نکالا تھا۔ سیّد مظفر حسین خطیب ایم۔ اے، ایل ایل بی (علیگ) انہیں کے بڑے صاحبزادے تھے، جو مدھیہ پردیش لیجسلیٹو اسمبلی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے تھے۔[۲۶]

الحاقِ برار کا شاعری پر اثر

برار میں ابتدا سے لے کر نوابی کے خاتمے تک ادب و شاعری کو کافی ترقی ملی لیکن جب ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے برار کو اپنے قبضے میں لے لیا تو یہاں کے شعر و ادب پر ایک جمود طاری ہوگیا۔ وہ ادیب و شاعر اور علما و دانشور جو اُمرا، رؤسا اور جاگیرداروں کی نگرانی میں پرورش پا رہے تھے، فکرِ معاش کی وجہ سے نقل مکانی پر مجبور ہوگئے جس سے علمی و ادبی اعتبار سے ہر طرف ایک سناٹا چھا گیا لیکن چند سالوں کے بعد وہاں سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ اُبھرا جنہوں نے ادب و شاعری کی ایک ٹھوس خدمت انجام دی اور استادی کے مرتبے کو پہنچ کر مقتدی شعرا کی صحیح رہنمائی کی اور اُن کے ذوق کو تکمیل کے درجے تک پہنچایا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ برار میں کئی کامیاب اور بہترین شاعر وجود میں آئے۔ منشی محمد حیات خاں مظہر کا نام اِس

۲۵۔ ہماری زبان (نئی دہلی) مورخہ یکم اپریل ۱۹۷۱ء (مضمون: برار کے اردو اخبارات و رسائل از ہادی نقشبندی)، ص ۴، ۲۶۔ محولۂ فوق

لحاظ سے سرفہرست ہے۔ مظہر اگرچہ مرتضیٰ پور (ضلع آکولہ) کے باشندے تھے مگر ملازمت کے سلسلے میں امراؤتی میں مقیم ہوگئے تھے۔ یہ محمڈن ہائی اسکول امراؤتی ادبیات کے مدرس تھے۔ وہیں ۱۹۲۶ء میں رحلت فرمائی۔ امراؤتی کے مشہور شاعر خلیل الہدیٰ شارق (پیدائش ۱۹۱۲ء) انہیں کے صاحبزادے ہیں۔

مظہر نے مرزا داغ دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ یہ اپنے زمانے کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "افکار مظہر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ان کی وجہ سے امراؤتی کے ادبی ماحول میں ایک نیا ذوق و شوق پیدا ہوا۔ حبیب الرحمٰن صدیقی (سابق پرنسپل گورنمنٹ ہائی اسکول، امراؤتی) اور منظور حسین شور جیسے معروف شعرا نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ افسوس کہ شور (پیدائش ۱۹۱۰ء) تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مقیم ہوگئے، جہاں اب تک بقیدِ حیات ہیں۔ موصوف امراؤتی ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انجمن ہائی اسکول ناگپور اور "نبضِ دوراں" ۱۹۵۹ء میں پاکستان سے شائع ہوچکا ہے۔

میجر سید آغا حیدری حسن عابدی ایم۔ اے، ایل۔ ٹی، ایف۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اب تک شاعری کی زلفیں سنوار رہے ہیں۔ موصوف ابتدا میں جبل پور اور رائے پور کے کالجوں میں معلم رہے۔ پھر امراؤتی کے کنگ ایڈورڈ کالج سے وابستہ ہوگئے وہاں بائیس سال خدمت انجام دینے کے بعد مارس کالج ناگپور میں شعبۂ اردو اور فارسی میں ۱۹۵۰ء تک بحیثیت پروفیسر کام کرتے رہے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد ۱۹۵۶ء میں امراوتی چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ بے شمار شعرا نے ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی اور متانت پائی جاتی ہے۔

عبدالصمد قیصر بھی اس علاقے میں اُستادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۹۴ء میں بدنیرہ (ضلع امراؤتی) میں ہوئی تھی۔ ان کا مجموعۂ کلام طوفان و ساحل ۱۹۵۸ء میں چھپ چکا ہے۔ ان کے معاصرین میں محمد ابراہیم شرار بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی نے اس علاقے میں علمی، ادبی اور صحافتی اعتبار سے بہت شہرت پائی ہے۔ انہیں طالبعلمی کے زمانے ہی سے صحافت و شاعری سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے "مرقع اردو" کی ادارت کی جو محمڈن اردو ہائی اسکول امراؤتی کے زیر اہتمام ستمبر ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا تھا۔ یہ پرچہ نگار مشین پریس لکھنؤ سے چھپ کر آتا تھا۔ بعد کو محمد تصدق حسین تاجی اور خلیل الہدیٰ شارق اس کے ایڈیٹر رہے۔ مرقع اردو کی ادارت سے علیحدگی کے بعد شرار نے جنوری ۱۹۲۵ء میں اپنے پیدائشی وطن ایلچپور سے ماہنامہ انیس جاری کیا۔ ادبی نوعیت کا یہ پرچہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپتا تھا۔ آگے چل کر وہ مذہب کی طرف اس قدر رجوع ہوئے کہ جنوری ۱۹۵۲ء میں ۳۲ صفحے کا ایک مذہبی ماہ نامہ "محشر" نکالا جو ۱۹۵۹ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ اس کے بعد وہ انجمن اسلام، بمبئی میں عربی اور دینیات کے معلم کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے[۲۷]

اس دور کے ایک اور نامور شاعر سید زوار حسین عالی سبزواری ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز برہانپور میں ہوا۔ انہوں نے برہانپور میں خورشید احمدی پریس قائم کرکے جنوری ۱۹۲۳ء میں ایک ہفتہ وار اخبار البرہان جاری کیا۔ چھ صفحات کے اس اخبار کا سائز ۲۲×۲۸/۲ تھا۔ اس کے سرپرست و نگراں خان بہادر سید عبدالرحمٰن سابق ڈپٹی کمشنر کے صاحبزادے سید مبین الرحمٰن بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) تھے، جو انگریزی کے ایک بہترین انشا پرداز اور خطیب تھے۔ ان کے مضامین انگلستان و ہندوستان کے مؤقر جرائد و رسائل میں نمایاں طور سے شائع ہوتے تھے۔ ان کی لیاقت و صلاحیت کے مولانا محمد علی جوہر اس قدر معترف تھے کہ ان کو کامریڈ کی ادارت سونپنا چاہتے تھے۔ انہیں اردو انشا پردازی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ "مراۃ الابرار" ان کی یادگار کتاب ہے۔ انہیں کی جدوجہد اور کوششوں سے سید زوار حسین عالی اپنا پرچہ اور پریس لے کر آکولہ چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سید مبین الرحمٰن کے انتقال کے بعد یہ پرچہ نواب عبدالوحید، غازی آف گیوردھا اسٹیٹ کی سرپرستی میں عالی مرحوم کی وفات (۱۹۴۹ء) تک مومن پورہ، آکولہ سے نکلتا رہا۔ اس پرچے نے برار میں علم و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اسی میں عالی سبزواری کا کلام بھی پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ اسی طرح محمد البشیر الدین بشیر ملکاپوری نے مارچ ۱۹۲۵ء میں ایک ادبی ماہنامہ البشیر نکالا تھا۔ ان کے کلام میں ندرت، سنجیدگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ برار کے مشہور رہنما سید عبدالرؤف شاہ عاصی بھی ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور اچھے انشا پرداز تھے۔ انہوں نے خلافت کے دور میں وکالت چھوڑ کر ملک کی سیاست میں پُر جوش حصہ لیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے — انہوں نے اگست ۱۹۲۸ء

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

۲۶۔ محولہ فوق ۲۷۔ ہماری زبان (مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۱ء ص ۶)

شاہد ندیم

اردو لغت

ایک سرسری جائزہ

لغت کسی زبان کا بڑا اہم سرمایہ ہوتا ہے۔ زبان کی وسعت اور پھیلاؤ میں لغت کا کسی حد تک اہم حصہ ہوتا ہے۔

اردو انسائیکلو پیڈیا نے لغت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ "قاموس ترتیب ہجی کے مطابق مرتب کردہ مجموعہ الفاظ جن میں ایک ہی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ ہو ان میں سے ہر ایک لفظ کے مقابل اس کا تلفظ اور معنی اسی یا دوسری زبان میں درج ہوں اس قسم کی لغت کو ادبی لغت کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ صنعتی اور فنی لغات بھی ہوتے ہیں جس میں اصطلاحی الفاظ اور ان کی تشریح درج ہوتی ہے۔"

ہمارے یہاں لغت سازی کا کام زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اردو میں لغت کی پہلی کتاب "خالق باری" سمجھی جاتی ہے مگر لغاتِ گجری کے فاضل مرتب پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے بیان کے مطابق لغات گجری "اردو لغت نویسی کی پہلی کوشش ہے"۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انہوں نے لکھا تھا کہ "خالق باری کو عام طور سے اردو کا پہلا نصاب نامہ اور غرائب اللغات کو پہلا لغت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غرائب اللغات کے دیسی الفاظ کی شکلیں بھی اس بات کی غماز ہیں کہ وہ ہماری لغت سے بہت بعد کی چیز ہے۔" لغات گجری قلمی نسخے کی صورت میں نجیب اشرف ندوی صاحب کے پاس عرصہ سے محفوظ تھی، جسے انھیں مرتب کر کے ادبی پبلیشرز، بمبئی سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

اردو میں لغت کا فن انگریزی عہد کی دین ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں انگریزوں خصوصاً گلکرائسٹ اور فوربس کی مرتب کی ہوئی لغات اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ اس کے بعد شکسپیئر اور فالن (مطبوعہ ۱۸۱۷ء) کی لغات شائع ہوئیں مگر اس عہد کی سب سے اہم اور مستند لغت جان۔ ٹی پلیٹس کی لغت ہے جو ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کی مرتب کی ہوئی لغات ہیں۔

۱۸۸۰ء میں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کی مرتبہ لغت گنجینۂ زبان اردو موسوم بہ "گلشن فیض" شائع ہوئی۔ جس میں اردو الفاظ کے معنی فارسی میں بیان کئے گئے ہیں اور اساتذہ کے کلام سے اشعار بھی سند میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو محاورات پر ایک لغت مصطلحات اردو کے نام سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی جس کے مولف محمد اشرف علی اشرف تھے۔ مولف کتاب کے الفاظ میں "یہ کتاب اردوئے معلیٰ کا دستور العمل ہے"۔ اس کے صفحات کی تعداد ۲۰۸ ہے۔

محاورات، زبان کا خوب صورت اور ناقابلِ نظر انداز سرمایہ ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں اردو محاورات کی اور بھی بہت سی لغتیں چھپ چکی ہیں مثلاً "ہندوستانی مخزن المحاورات" (مولف منشی چرنجی لال صاحب دہلوی) اور "نجم الامثال" جس میں تقریباً چار ہزار ضرب الامثال درج ہیں اس کے مرتب مولوی محمد نجم الدین تھے اس کے صفحات کی تعداد ۲۷۱ ہے۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہو چکی ہے اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

اردو کے مشہور شاعر امیر مینائی نے "امیر اللغات" کے نام سے ایک لغت ۱۸۹۱ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع کی تھی۔ افسوس کہ یہ مکمل نہ ہو سکی صرف دو جلدیں شائع ہوئیں جس میں جلد اول میں الف ممدودہ کے تین ہزار الفاظ اور جلد دوم میں الف مقصورہ کے ساڑھے تین ہزار الفاظ ملتے ہیں۔

اس لغت کی اہمیت کا اندازہ امیر مینائی کے دیباچے کے ایک اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

> "مولف نے اپنی معلومات کے علاوہ بہت سے مستند اور لائق لوگوں کے تصانیف نظم و نثر میں جو کچھ متفرق طور پر تھا اس کو اس میں یکجا کر دیا ہے یعنی زبان لکھنؤ و دلی کے مفردات مرکبات جملے، مثلیں۔ مشہور مقولے، محاورے، اصطلاحیں

شامل ہیں کنایات، صفات، تشبیہات، استعارات مناسبِ مقامات پر لوازم و خواص، شعراء کے خاص مستعملات الفاظ و مصطلحات، قانونِ کچہری اور اہلِ دفتر کے خاص محاورات، پیشہ وروں کی خاص اصطلاحیں، فقراء کی صدائیں آزادوں کی بولیاں، ٹھیلیاں، ریختی (عورتوں کی زبانی ڈھکے، عورتوں کی رسمیں، عورتوں کی منتیں، عورتوں کی خاص قسمیں، دعائیں، کوسنے، تکیہ کلام، طبع زاد فقرے، لوریاں عام کھیل، لڑکوں کے کھیل، لڑکیوں کے کھیل، مسلمانوں اور ہندوؤں کی شادی غمی کی رسمیں۔ تیوہار۔ کہیں کہیں کتب مذہب کی ضروری اور کار آمد اصطلاحیں، مشہور شعراء کے مختصر حالات، آسان اردو میں اختصار کے ساتھ لغات کے حقیقی اور مجازی معنوں کی تعبیریں اور ان کا محلِ استعمال، جداجدا پہلوؤں کے ساتھ بلکہ جلد سمجھ میں آنے کو موقع موقع سے زبانِ اردو یا کسی دوسری مانوس زبان میں ان کے مستعمل، مروجہ، مترادفات اور ان کے متضاد لفظ تذکیر و تانیث کی تحقیق، واحد جمع کی حالت میں لغات کے معنی اور محلِ استعمال کا فرق بعض حروف ابجد کا باہم ایک دوسرے سے بدلنا، لفظ کی تحقیق اشتقاق، مادہ، اگلی اور حال کی زبان کا فرق کسی مشہور شخص یا مشہور چیز کا مختصر حال اور اس طرح کے بہت سے قاعدے کی بکار آمد اور ضروری باتیں جہاں تک لغت کی شان پر پھبتی ہیں۔ داخل کی گئی ہیں۔"

یہ اقتباس طویل ضرور ہے مگر لغت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور اس سے امیر مینائی کی وسعت نظر اور اردو زبان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں تک رسائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں سید احمد دہلوی کی "فرہنگِ آصفیہ" شائع ہوئی، یہ اردو کی چند مستند لغتوں میں سے ایک ہے رام بابو سکسینہ نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف "تاریخ ادبِ اردو" میں لکھا ہے کہ "یہ کتاب لغات اردو کی کتب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکاہی کی یادگار ہے۔" یہ فرہنگ چار حصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں تقریباً ۵۵ ہزار الفاظ اور ۲۵۳۸ صفحات ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ایک طویل مقدمہ شامل ہے جس میں اردو زبان کے آغاز اور اس کے مزاج کے بارے میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ لغت نایاب ہو چکی تھی مگر سنہ ۱۹۷۴ء میں ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم و سماجی بہبود حکومتِ ہند کے لیے نیشنل اکاڈیمی دہلی نے پھر سے شائع کردی ہے۔

فرہنگ آصفیہ کے بعد سید احمد دہلوی نے سنہ ۱۹۱۷ء میں لغات النساء کے نام سے دوسری لغت شائع کروائی جو دہلی کی بیگموں، قلعۂ معلی کی شہزادیوں، شریف مسلمانوں اور ہندو خاتونوں، زنانہ درسی کتابوں سے ۱۷۰۰ لغات محاورات، اصطلاحات و ضرب الامثال کا بے نظیر مجموعہ" ہے۔

فرہنگ آصفیہ کے بعد دوسری اہم لغت "نور اللغات" ہے جس کے مولف نور الحسن نیر ہیں۔ یہ بھی چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ نومبر سنہ ۱۹۲۳ء میں اور آخری چوتھا حصہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

اس لغت میں الفاظ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اردو، انگریزی اور سنسکرت، عوام کی زبان اور عورتوں کی زبان کے لحاظ سے تقسیم کئے گئے ہیں۔ اور ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز مذکر مونث کا فرق اور اشعار اور فقروں میں مثالیں دی گئی ہیں۔ مولفِ لغت کے بیان کے مطابق "اردو میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کو موقع سے نوراللغات میں ظاہر کردیا ہے۔"

سنہ ۱۳۰۴ھ ہجری میں مشہور شاعر حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی نے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، بنگال کی فرمائش پر "سرمایۂ زبان اردو" تحریر فرمائی۔ اس کتاب کے دیباچے میں جلال لکھنوی نے لکھا تھا کہ "جملہ محاوروں اور کنایوں، اصطلاحوں اور مثلوں کے معنی اور محلِ استعمال لکھ دیئے اور بیشتر کے اسناد در نظائر کلام نظم شعرائے نامور و معتبر اردو زبان سے اخذ کر کے تحت میں معانی و مقامات استعمال کے درج کئے اور جن محاوروں اور کنایوں وغیرہ کی فارسی میں دستیاب ہوئی وہ محلِ معانی اور بیانِ محلِ استعمال کے لکھ دیئے۔"

اس کتاب کے اور بھی ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔

عزیز اللغات اردو زبان اور ادب کے طلبا کے لئے مرتب کی گئی تھی۔ اس کے مرتب عزیز لکھنوی نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ میں نے اس لغت میں عربی و فارسی لغات و محاورات کی بھرمار نہیں کی ہے۔ بلکہ صرف ردیف کی تکمیل کے لحاظ سے کہیں کہیں عربی و فارسی الفاظ لئے گئے ہیں ایسے الفاظ و محاورات کے لئے عربی و فارسی کے لغات بکثرت موجود ہیں۔ لغتِ اردو کا جامع مانع ہونا اگر محال نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ تاہم اس لغات میں ردیف وار اردو کے لغات اور محاورات یکجا کر دیئے گئے ہیں اور ان کے معنوں میں جو فرق

[illegible] کر دیئے گئے ہیں؟ عزیز اللغات کوئی اہم اور مبسوط لغات نہیں تھا جس کا اعتراف عزیز لکھنوی نے ان جملوں میں کیا ہے۔ "یہ مکمل فقط ہرگز نہیں ہے بلکہ ناتمام اور بہت ناتمام صرف الفاظ اور اس کے معنی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ شواہد و امثال و طولِ عبارت و مزید تحقیقات سے احتراز کیا گیا ہے۔"

ہندوستانیوں کی تیار کی ہوئی لغتوں میں فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات کے بعد خواجہ عبدالمجید کی "جامع اللغات" ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی۔ چاروں جلدوں کے صفحات کی کل تعداد تقریباً ۲۸۹۲ ہے۔

پہلی جلد کے آغاز میں اردو کی ابتداء شاعری اور نثری ارتقاء کے بارے میں ایک طویل مقدمہ شامل ہے۔" اس لغت میں ہزارہا عربی، فارسی سنسکرت، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ درج کر دیئے ہیں جو بالعموم مستعمل نہیں ہے۔ لیکن علمی مجالس اور اربابِ علم کے طبقوں میں یا تحریر و تقریر میں شاذ و نادر استعمال ہوتے ہیں: اس کے علاوہ اس لغت میں اردو اور دیگر زبانوں کے ادیبوں شاعروں، مقامات اور واقعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

۱۹۲۵ء کے قریب مولوی فیروزالدین کی "فیروز اللغات (اردو) شائع ہوئی اس میں "ساٹھ ہزار سے زیادہ الفاظ مرکبات، محاورات ضرب الامثال اور جدید اصطلاحات" شامل ہیں۔ یہ لغت دو حصوں میں شائع ہوئی تھی اب تک ہندو پاک میں اس کے بے شمار اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، ایک چھوٹا اڈیشن بھی فیروز اللغات جدید "کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

منشی غلام سیمں خان صاحب آفاق بنارسی کی مرتبہ "معین الادب" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس لغت کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں عربی فارسی اور انگریزی کے ہزاروں الفاظ کا قابل قدر ذخیرہ ہے۔ ہر لفظ کے کئی کئی معنی اور بحسابِ جمّل اعداد درج ہیں اور تذکیر و تانیث کے ثبوت میں اساتذہ کے اشعار درج ہیں۔"
حسابِ جمل کے لحاظ سے الفاظ کے اعداد درج کرنے کا یہ غالباً پہلا تجربہ تھا۔

اردو میں طلباء کے لئے مرتب کی جانے والی ایک لغت "سعیدی اللغات" یا سعیدی ڈکشنری (مرتبہ منیر لکھنوی) تھی اس لغت کے کل الفاظ کی تعداد ۳۴۵۵۰ ہے۔ مشہور زمانہ جریدے "معارف" اعظم گڑھ نے اپنے مارچ ۱۹۳۲ء کے شمارہ میں سعیدی اللغات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "سعیدی ڈکشنری اسکولوں کے طلباء کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر مرتب کی گئی ہے جس میں اردو میں رائج الفاظ خواہ کسی زبان کے ہوں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ پھر قانونی سیاسی، اخباری اور اقتصادی اصطلاحات وغیرہ علاحدہ علاحدہ ضمیموں میں ہیں۔ اردو اور فارسی کے محاورات کی تشریح کے لئے ایک جداگانہ ضمیمہ ہے آخر میں اردو محاوروں کے مترادفات انگریزی محاورے تقریباً سو کی تعداد میں یکجا کئے گئے ہیں۔ طلباء کے لئے جو لغات مرتب ہوئی ہیں ان میں یہ سب سے جامع مکمل اور کار آمد ہے۔"

تلفظ کی درستگی کے لئے عام طور سے لغت نویس بہت غیر واضح اور مبہم طریقے اختیار کرتے ہیں جس سے جگہ زیادہ گھرنے اور غلط فہمی کا اندیشہ رہتا ہے مگر فرہنگ عامرہ میں اس کے مرتب محمد عبداللہ خاں خویشگی نے ایک نیا طریقہ اپنایا، انہوں نے الفاظ کو توڑ کر ان کی تقطیع کر دی تھی۔ یہ طریقہ بہت کامیاب رہا اور کافی سراہا گیا۔ فرہنگِ عامرہ کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۷ء میں اور دوسرا اڈیشن ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تقریباً تین ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ مشہور صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی نے فرہنگ عامرہ کے بارے میں لکھا تھا کہ "فرہنگ عامرہ میں ان تمام الفاظ کے معنی اور تلفظ نہایت واضح اور جامع طریقہ سے دیئے گئے ہیں جو اردو میں عام طور پر موجود ہیں۔ فاضل مولف نے بڑی محنت و تحقیق سے کام لیا ہے۔"

قدیم لغت "فیض اللغات" کا ترمیم شدہ اردو لغت "ناولٹی اردو ڈکشنری" کے عنوان سے کتاب منزل لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں حروف کے معنی کے علاوہ ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات کے معنی الگ سے درج ہیں۔ اب تک اس کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ چھٹا اڈیشن ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا۔

"اردو لغت مجلس اشاعتِ ادب دہلی کی جانب سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مرتبین کے دعوے کے مطابق اردو کی یہ پہلی مصور لغت ہے اس لغت کو تین جلدوں میں مکمل ہونا تھا مگر غالباً تکمیل کے مرحلوں تک نہ پہنچ پائی۔

حال ہی میں شائع ہونے والی اہم لغتوں میں سے ایک "مہذب اللغات" ہے جس کے مرتب مہذب لکھنوی ہیں۔ اس لغت کو سولہ جلدوں میں مرتب کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اردو کی سب سے بڑی لغت کہی جا سکتی ہے۔

اس کی پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں نویں جلد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس لغت میں دلی اور لکھنو کی زبان کا فرق، عورتوں کی زبان کا لحاظ، فصیح و غیر فصیح، تذکیر و تانیث، عوام اور خواص کی زبان کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نیز کہیں کہیں قدیم شاعروں کے اشعار اور محلِ صرف کے ذریعہ دلیل بھی دی گئی ہے اور قولِ فیصل کے زیرِ عنوان مرتب نے اکثر اپنی

رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ مہذب اللغات کا زیادہ تر حصہ نوراللغات سے مستعار ہے۔

موجودہ دور میں ترقی اردو بورڈ کراچی کا تیار کردہ لغت ایک خاص سرمایہ ہے جس کے کچھ اجزا ترقی اردو بورڈ کے ترجمان "اردو نامہ" میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ترقی اردو بورڈ (ہند) کے زیر اہتمام لغت سازی کا کام بھی دلی اور بمبئی میں جاری ہے۔

ہمارے یہاں صرف اردو۔ اردو لفظوں کی لغت نویسی کا کام ہی نہیں ہوا بلکہ مختلف سطحوں پر اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے لغت مرتب کی جا چکی ہیں۔ مثلاً قانونی الفاظ کے لئے مولوی احمد خاں برتر کی اعظم اللغات جو "قانون میں اردو کا پہلا لغت" کہلانے کا مستحق ہے۔ جس کی ضرورت کے بارے میں مولف نے لکھا تھا کہ "مجھے یہ محسوس ہوا کہ دکن کے مصطلحات مال و دیوانی و فوجداری و فینانس و حساب وغیرہ کے سمجھنے میں قانون داں اصحاب کو سخت دشواری کا سامنا ہے کیونکہ قانون کا کوئی لغت ہی موجود نہیں ہے جس سے مدد لی جائے۔"

اس لغت میں (۱) ہر لفظ کے لغوی معنی و تحلیل (۲) صحیح تلفظ کے اظہار کے لئے اعراب و تشکیل (۳) زبان کی تصریح (۴) ہر لفظ کے معنوی اور قانونی (اصطلاحی) معانی نہایت عام او فصیح زبان میں (۵) اقسامِ کلمہ کی توضیح (۶) اغلاطِ مروجہ کی تصحیح (۷) انگریزی الفاظ کے مترادف الفاظ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اسی طرز پر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی نے ۱۹۳۷ء میں فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں" کے عنوان سے ہندوستان کے مختلف فنون اور صنعتوں کے اصطلاحی الفاظ و محاورات کا مجموعہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تقریباً بیس ہزار الفاظ پر مشتمل دو سو پیشوں کی اصطلاحیں جمع کی گئیں۔ یہ کتاب دس حصوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس فرہنگ کی اہمیت کا اندازہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اس اقتباس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ "یہ زمانہ مشین اور سائنس کا ہے۔ آج کل تعلیم میں بھی حرفت و صنعت کو داخل کر لیا گیا ہے۔ اس کے لئے لا محالہ اصطلاحی لفظوں کی ضرورت پڑے گی۔ یہ کتاب اس غرض کے لئے بہت کارآمد ہے" اس فرہنگ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ یہاں تک کہ شوقین اور پیشہ ور بازی گروں کی بازیوں اور فنِ سپاہ گری اور ورزشِ جسمانی کی اصطلاحوں کا بھی احاطہ کیا گیا تھا۔ مرتبِ فرہنگ مولوی ظفر الرحمٰن عباسی کے مطابق "غیر معروف اور پیچیدہ اصطلاحات کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے تصاویر کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔"

رسالوں، کتابوں، ناولوں اور اخباروں کے روزمرہ الفاظ کی ایک مختصر سی فرہنگ "مفتاح الاخبار" (مرتبہ تجمل خاں) کے نام سے علی احمد علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔

ہمارے یہاں "خاص طبقوں کے مشاہیر کے حالات" علاحدہ علاحدہ کتابوں میں بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں لیکن ہر طبقے کے مشاہیر کے حالات کے مجموعہ کی کمی تھی۔ اس کمی اور ضرورت کو نظامی بدایونی نے محسوس کیا اور ۱۹۲۴ء میں "قاموس المشاہیر" دو جلدوں میں شائع کی۔ اس کتاب میں قدمار سے لیکر ۱۹۲۴ء تک کے تمام مشاہیر کا حال درج ہے مگر اس میں (۱) صرف ان مشرقی مشاہیر و عمائد کو لیا گیا ہے جن کو عربی، فارسی اردو ہندی، سنسکرت کے علوم و فنون سے تعلق ہے۔ اگر کسی نامور کا سنہ ولادت یا وفات نہیں ملا ہے مگر اس کی کوئی تالیف و تصنیف مل گئی ہے تو اس کی تصنیف پر اکتفا کیا گیا ہے (۲) اہلِ علم کے سوا سلاطین و والیانِ ملک کو بھی ان کی شخصیت کے لحاظ سے جگہ دی گئی ہے۔ (۳) مشاہیر میں ایسے لوگ (جن کی کسی نہ کسی اہم تاریخی واقعہ سے تعلق ہے) شامل کر لئے گئے ہیں۔ (۴) تاریخِ ولادت وفات اور زمانہ زندگی حتی الواسع التزاماً لکھا گیا ہے (۵) کتاب کی تدوین لغت کی طرح بہ ترتیب حرفِ تہجی کی گئی ہے۔ مگر وہ باکمال جو اپنے تخلص یا کنیت یا خطاب سے زیادہ مشہور ہیں ان کو عرفِ عام کی ترتیب میں شامل کیا گیا ہے۔" اپنے موضوع کی انفرادیت، اولیت اور جامعیت کے اعتبار سے یہ کتاب قابلِ قدر ہے اور اہمیت کی حامل ہے۔

کسی خاص شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں استعمال ہونے والے الفاظ اس دور کی مخصوص رسوم و رواج، لباس، ہتھیار اور دیگر چیزوں تک پہونچنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے اب شاعروں کے مجموعہ کلام میں اس طرح آنے والے الفاظ کے معنی اور دیگر تفصیلات کی فرہنگ مرتب کی جانے لگی ہیں۔ اب تک غالب پر امتیاز علی عرشی کی مرتب "فرہنگ غالب" (یہ دراصل مرزا غالب کی قاطع برہان اور خطوط پر مبنی دس ہزار الفاظ پر مشتمل" فرہنگِ انیس (جلد اول) مرتبہ نائب حسین نقوی ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکی ہیں۔

ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے ساتھ بھی اردو لغتیں مرتب کی جا چکی ہیں۔ "اردو مراٹھی شبد کوش" اس سلسلے کی پہلی کوشش ہے۔ تقریباً ۲۵ ہزار الفاظ پر مشتمل اس شبد کوس کے مرتبین مشری پدماکر جی اور ڈاکٹر نظام الدین گوریکر ہیں۔ حکومت مہاراشٹر کے تعاون سے اسے مہاراشٹر راجیہ پاٹھیہ پستک منڈل نے شائع کیا ہے۔

دکھنی زبان کا اردو میں کافی اثر موجود ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی اردو میں دکھنی الفاظ کثرت سے مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین

خاں اور ڈاکٹر غلام عمر خاں کی مرتب "دکھنی اردو لغت" ۱۹۶۹ء میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکادیمی، حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ مرتبوں کے بیان کے مطابق اس لغت میں سات ہزار الفاظ شامل ہیں۔ فاضل مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس لغت کے بارے میں لکھا تھا کہ "مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس کی حیثیت نشانِ راہ کی ہے، منزل کی نہیں۔" جناب دیوی سنگھ چوہان نے اس لغت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس لغت کی سب سے بڑی خوبی ایک اور لحاظ سے دکھنی ادب کی بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں ہر لفظ اور محاورہ کے معنی کے ساتھ ساتھ اسناد بھی دیئے گئے ہیں۔"

اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء میں امیر عارفی کی مرتب ایک مختصر سی "دکھنی فرہنگ" شائع ہو چکی ہے جو دراصل دکنی ادب کی چھ اہم مثنویوں "گلشنِ عشق"، "من لگن"، "قطب مشتری"، "سیف الملوک بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" کے الفاظ سے تیار کی گئی ہے۔

"پدماوت کی فرہنگ" اس کتاب کے الفاظ پر مشتمل فرہنگ ہے۔ انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے ایک تیلگو اردو لغت بھی شائع کی ہے۔

ان علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو زبان سے دیگر اہم زبانوں کی کئی قابلِ قدر لغتیں مرتب ہو چکی ہیں۔ ایسی لغتوں میں عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کی لغتیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

عربی میں ایک قدیم لغت "لغات الصراح" کو ترمیم و اضافہ کے بعد "لغات الصراح بالتصریح و الایضاح" مولانا عبدالمجید نے مطبع مجیدی کانپور سے ۱۳۴۹ھ ہجری میں شائع کی تھی۔ اس لغت میں عربی الفاظ کے معنی اردو اور فارسی میں دیئے ہیں۔

عربی کا مشہور لغت "المنجد" کا ترجمہ بھی عربی الفاظ اور اردو معنی کے ساتھ جنوری ۱۹۶۰ء میں مطبع دارالاشاعت کراچی نے "المعجم" کے نام سے ایک اردو عربی لغت مارچ ۱۹۶۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں پینتیس ہزار الفاظ درج ہیں۔

مشہور عالم دین و صاحب طرز ادیب مولانا سید سلیمان ندوی نے مطبع معارف اعظم گڑھ سے عربی کے چار ہزار الفاظ کی تشریح و تحقیق "لغاتِ جدیدہ" کے نام سے ۱۹۱۲ء میں شائع کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن کے مشکل الفاظ کی ایک لغت "لغات القرآن" بھی مذکورہ مطبع سے شائع کی تھی۔

"لغات القرآن" کے نام سے ہی ایک اور لغت ۱۳۲۶ھ ہجری میں حاجی محمد ابن عبداللہ کی مرتب شائع ہو چکی ہے۔ حال ہی میں العیسری کی "لغات المفتاح" چار مختصر حصوں میں حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ عربی اردو لغات ہے۔

عربی کی بہ نسبت فارسی کی بہت کم لغتیں مرتب کی گئی ہیں کیونکہ فارسی کے بیشتر الفاظ اردو میں مستعمل ہیں اور اردو ہی کا حصہ سمجھے جاتے ہیں پھر بھی مولوی فیروزالدین کی فیروز اللغات (فارسی) فارسی اردو کی ایک اہم لغت ہے اس لغت کے دو ایڈیشن پہلا ۱۹۳۱ء اور دوسرا ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں تقریباً اکیاون ہزار الفاظ شامل ہیں اور صفحات کی تعداد ۸۰۵۱۱ ہے۔

"فرہنگ فارسی جدید" راجیسور راؤ اصغر نے ۱۳۲۹ھ ہجری میں شائع کی جس میں تقریباً بارہ ہزار فارسی الفاظ کے معنی بیان کئے گئے ہیں اس کا دوسرا اڈیشن ۱۳۵۷ھ ہجری میں مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہوا تھا۔

لکھنؤ کے مشہور پریس مطبع نول کشور سے منشی نول کشور نے فارسی اردو کی "لغت کشوری" بھی شائع کی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے کئی اڈیشن چھپ چکے ہیں۔

ہندی اردو کی اب تک کئی لغت شائع ہو چکی ہیں ۱۹۳۸ء میں بیس ہزار الفاظ پر مشتمل راجہ راجیسور راؤ اصغر کی "ہندی اردو لغت" شائع ہوئی۔ اس کے سرورق پر لکھا تھا "یہ ہندی زبان کا نہایت ہی مبسوط اور نہایت جامع لغت ہے جس میں ادبی، علمی، تاریخی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی، معاشی کتب رسائل اور مخازن کے تمام الفاظ کی حیثیت ظاہر کر کے ان کے مکمل معنی اور مفہوم بڑی تحقیق و تدوین اور شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے جو اس فن کا پہلا لغت ہے۔ اس لغت کی ہجائی ترتیب اور رسم الخط دونوں اردو ہیں تاکہ مسلم اور ہندو اصحاب یکساں فائدہ حاصل کر سکیں، اور صحیح تلفظ کے لئے الفاظ پر نہایت صحت و احتیاط کے ساتھ کامل اعراب لگائے گئے ہیں۔"

انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) کی ہندی ڈکشنری جو دس ہزار سے زائد معنی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ مولوی امام الدین رام نگری کی "ہندی اردو لغت" اور "اردو ہندی لغت" بھی کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

انگریزی اردو لغت کے بارے میں لکھتے ہوئے ایک جگہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ "ایسی لغت میں ایک مشکل تو یہ ہے کہ انگریزی لفظ یا محاورے کے صحیح مفہوم کو پوری طرح سمجھنا۔ دوسری مشکل اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ سمجھنے کے بعد اس کے لئے اپنی زبان کا ویسا ہی لفظ یا محاورہ تلاش کرنا جو اس مفہوم کو کامل طور پر ادا کر دے جب تک دونوں زبانوں پر قدرت نہ ہو اور الفاظ و محاورات کے سمجھنے سے کامل واقفیت نہ ہو اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ اس مشکل کو کون نہیں سمجھتا۔"

کا مشکل ہونے کے باوجود ہمارے یہاں اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغت کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ مولوی عبدالحق کی "دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" انگریزی اردو کی ایک اہم، معیاری اور مقبول عام ڈکشنری سمجھی جاتی ہے۔ اس کے کل صفحات کی تعداد ۱۵۱۲ ہے۔ آغاز میں مولوی عبدالحق کا ایک طویل اور مبسوط مقدمہ درج ہے مولوی عبدالحق کی ہی "دی اسٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری" اردو انگریزی ڈکشنری کے ذیل میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندو پاک میں ان ان دونوں لغتوں کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۲۵ء کے لگ بھگ غالباً انجمن ترقی اردو نے مولوی عبدالحق کی ہی مرتبہ سائنسی اصطلاحوں کی ڈکشنری "ڈکشنری آف سائنٹفک ٹرمس" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کو کئی جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر پیشِ نظر پہلی ہی جلد ہے۔

ہندوستانی الفاظ کے انگریزی معنوں پر مشتمل ایک ڈکشنری الہ آباد کے ایک پبلشر رام نرائن لال نے "دی اسٹوڈنٹ پریکٹیکل ڈکشنری" سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع کی تھی۔ اس کا بارہواں ایڈیشن سنہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔

انگریزی کے علاوہ غالباً روسی پہلی غیر ملکی زبان ہے جس میں اردو لغت شائع ہو چکی ہے۔ اردو روسی اور روسی اردو ڈکشنری تقریباً پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے اس ڈکشنری کے مرتب ڈاکٹر ظ۔ انصاری ہیں۔ یہ دو جلدوں میں روس سے شائع ہوئی ہے۔

> اردو کی پیدائش اور اس کی تاریخ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت عظیم الشان واقعہ ہے ـــــ یہ اس وقت وجود میں آئی جب کہ ملک ٹکڑے ہو رہا تھا۔ ہر رجواڑا خود مختاری کا دعوا دار تھا۔ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک عجیب بے سروسامانی، انتشار اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ آپس کی پھوٹ نے سارے کام درہم برہم کر رکھے تھے۔ کوئی ایک ملک تھا نہ کوئی نظام۔ ایسے وقت میں مسلمان یہاں آئے بے ترتیبی اور بدنظمی کو رفع کیا اور امن قائم کیا۔ نئے قواعد اور نئے آئین نافذ کئے ایک ملک، ایک زبان اور ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی اس میں ہندو مسلمان دونوں کا رنگ و روپ موجود ہے۔
>
> عبدالحق : اردو کانفرنس۔ ناگپور

بقیہ: [illegible]

میں پانڈر کیوڑہ (ضلع ایوت محل) سے مالی اعانت دے کر سید سجاد حسین اسرار کی ادارت میں ایک پرچہ "عزیزِ دکن" جاری کروایا تھا[28] جسے بعد کو محمد شرف الدین شرف امراوتی لے آئے تھے[29] شرف شیخ سالار کے فرزند تھے، وہ ۱۸۹۷ء میں ناگپور میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں امراوتی چلے گئے تھے اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا تھا۔ وہ ایک کامیاب وکیل اور شیریں بیاں شاعر تھے۔ انہوں نے قیصر حیدرآبادی سے استفادہ کیا تھا۔ مقامی پرچوں کے علاوہ ماہنامہ شاعر میں ان کا کلام اکثر چھپتا تھا۔ عاصی کا کلام عزیزِ دکن، الحق (ناگپور) اور اردو اخبار (ناگپور) میں پابندی سے شائع ہوتا تھا[29]

اس دور کے دیگر شعرا میں شیخ وزیر محمد آغا ایلچپوری، محمد ایوب صابر عبدالحکیم ذاکر کھام گانوی اور مصطور کارنجوی کے اسمائے گرامی بھی قابلِ احترام ہیں۔ آغا ایلچپوری کا کلام جلوۂ یار میرٹھ اور اردو اخبار ناگپور میں شائع ہوتا رہا ہے۔ انہیں لکھنؤ کی ادبی انجمن کی جانب سے "طوطیِ برار" کا خطاب ملا تھا۔ ذاکر کھام گانوی ایک کہنہ مشق اور مشاق شاعر ہیں۔ یہ عبدالکریم شائق کھام گانوی کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے اگست ۱۹۳۶ء میں کلام الشعرا کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ بھی جاری کیا تھا، جو خورشید احمدی پریس میں چھپتا تھا۔ اس کی ضخامت ۳۲ صفحات اور سائز $\frac{18 \times 26}{8}$ تھا[30]

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ برار میں تعلیمِ نسواں کا رواج عام ہو رہا تھا اور عورتوں میں علم و ادب سے دلچسپی پیدا ہو رہی تھی۔ اسی جذبے نے بغدادی بیگم اور خورشید آرا بیگم (پیدائش ۱۹۰۰ء) کو ادب و شاعری کی طرف رجوع کیا۔ قاضی سید قیام الدین کی یہ دونوں صاحبزادیاں اب تک پاکستان میں بقیدِ حیات ہیں۔ موخرالذکر ناگپور کے مسلم لیگی رہنما نواب صدیق علی خاں کی اہلیہ ہیں۔ ان کے مضامین ماہنامہ عصمت (دہلی) میں پابندی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ خورشید آرا بیگم کا مجموعہ "شعاعِ خورشید" پاکستان سے طبع ہو چکا ہے۔

دورِ حاضر کے ممتاز شعرا میں سید سعید الدین افسر، مردان علی خاں نشاط، محمد ابراہیم بسمل، عبدالمجید منظر، مشکل امراوتوی، تمیز امراوتوی، محمد یوسف اثر بدنیروی، پروفیسر سید احمد دعشی، ڈاکٹر انور رشید داروی، رشید کیفی، قاضی محمد یوسف نامی، حفیظ اللہ خاں بدر، عبدالقدوس ناطق، عبدالمجید خاں ہلال، بشیر احمد شہید ملکاپوری، زاہد انصاری، غنی اعجاز، انیس انور اور محبوب راہی وغیرہ کے اسمائے گرامی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا نے برار میں شعر و ادب کی آبرو کو اب تک قائم رکھا ہے۔ ●●

[illegible] ۲۸، ۲۹ ـ ہماری زبان ـ یکم اپریل ۱۹۷۱ء ص ـ ۵ [illegible]

اخلاق حسین عارف

انارکلی میں تصادم، کشمکش اور عمل

ڈرامہ کی ابتدا، مغرب میں یونان سے ہوئی ہے اور مشرق میں اس کا فخر ہندوستان کو حاصل ہے۔ ڈرامہ دراصل داستان، ناول اور کہانی کے فنی ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد کی ایک شکل ہے مگر بڑی حد تک ان چیزوں سے بلند مرتبہ کا حامل ہے۔ ڈرامہ اور ناول میں بس اس درجہ مماثلت ہے کہ دونوں میں واقعات اور اشخاص کا وجود یکساں ہے۔ ناول نگار کو اگرچہ یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ ناول کو مختصر لکھے یا طویل لیکن ڈرامہ نگار اتنا آزاد نہیں اسے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ڈرامہ کو عملی طور پر ادا کرنے کیلئے اسے معینہ وقت کے اندر اندر محدود کر دے[1]۔

"ہندوستان میں ڈرامہ کی تخلیق دو ہزار سال پہلے ہوئی لیکن اردو میں اس کی عمر بہ مشکل سو سال ہوگی۔ امانت کے اندر سبھا اور واجد علی شاہ کے چھتیس رہس کو اردو ڈرامہ کا اولین نقش کہا جاتا ہے[2]"

اگر اردو ڈرامہ نگار سنسکرت زبان سے واقفیت اور اس پر عبور رکھ کر ڈراموں کی طرف متوجہ ہوتے تو اردو ڈرامہ اس سے کہیں بیش تر عظیم ڈراموں سے زبان کو مالامال کر دیتا۔ مگر وہ اپنی ناواقفیت زبان کے باعث اس سے استفادہ نہ کر سکے۔

اردو کے ابتدائی ڈرامہ نگاروں میں رونق بنارسی کا نام لیا جاتا ہے مقبول حسین ظریف لکھنوی نے بھی اپنے بمبئی کے دوران قیام میں ڈرامے لکھے اسی طرح حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ مشہور و معروف ڈرامہ نگاروں کی صف میں آتے ہیں۔ ان سب میں باکمال اور مشہور شخصیت آغا حشر کاشمیری کی ہے جنہوں نے کلکتہ، بمبئی اور لاہور کے دوران قیام

[1] ارمغان ادب صفحہ ۲۴۳ مصنفہ راقم الحروف
[2] سید بادشاہ حسین حیدر آبادی

بہت سے ڈرامے لکھے جو بہت مقبول ہوئے ہیں[1]

ارسطو نے ڈرامہ کے چھ عناصر بتلائے ہیں۔ قصہ، کردار، الفاظ خیال، آرائش اور موسیقی[2]۔ لیکن ان میں اس نے قصہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لئے کہ بغیر قصہ یا ترتیب واقعات ڈرامہ کا وجود میں آنا ممکن ہی نہیں پلاٹ ہی ایسی چیز ہے جس کے گرد اس سے متعلقہ چیزیں گھومتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے ڈرامہ کے صرف دو بنیادی عناصر بتائے ہیں۔ پلاٹ اور کردار[3]۔ اور دونوں کو مساوی اہمیت دی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ڈرامہ کے دو اہم عناصر قصہ اور کردار ہی ہیں۔

پروفیسر اختر اورینوی لکھتے ہیں:

[4] "جب کسی انسان کی شخصیت اس کے اعمال سے مرتب ہو تو کردار کے منفرد خطوط خود بخود متعین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ڈرامہ میں جو صورت واقعہ بیان کی جاتی ہے اس کی پیش کش کا وسیلہ بھی کردار ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ قدیم یونانی ڈراموں میں بھی کردار کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اسکلس نے ڈرامہ میں دو کردار پیدا کئے اور مکالمہ ان ہی دو کرداروں کے درمیان ہوتا تھا۔ سوفوکلیز نے دو سے تین کردار کر دئیے یوریپڈیز نے اسے مزید وسعت دی"

[1] پروفیسر وقار عظیم
[2] بوطیقا ترجمہ عزیز احمد
[3] مضامین عابد
[4] ڈرامہ فنی نقطۂ نظر سے

ڈرامہ نگار ڈرامہ کے لئے ایسا مضمون تلاش کرتا ہے جس میں تصادم اور آویزش کے پہلو نمایاں ہوں۔ یہ تصادم کئی طرح سے وقوع پذیر ہوتا ہے کبھی دو کرداروں یا دو دماغوں کے تصادم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ کبھی خیر و شر کے پیکر میں رونما ہوتا ہے کبھی سماج معاشرہ یا رسم و رواج سے ٹکراؤ کی شکل میں۔ یونانی ڈراموں میں غیبی طاقتوں سے تصادم بتایا گیا ہے۔ غرضیکہ کسی نہ کسی صورت سے ڈرامہ میں تصادم کا پیدا ہونا امر لازمی ہے کیونکہ یہ خواہشات انسانی کا آلۂ کار ہے۔

تصادم اور کشمکش میں زیادہ فرق نہیں۔ دونوں بہت قریب کی چیزیں ہیں۔ تصادم کے تاثر کو کشمکش کہہ سکتے ہیں جو کہ تصادم کے دوران واقعات و حالات کے اتار چڑھاؤ سے کردار یا دیکھنے والوں کی حالتوں میں تبدیلی، کبھی شکست کا خدشہ، کبھی فتح کی انبساطی کیفیت، کبھی تذبذب اور کبھی الجھن کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

خوشی اور غم یہی انسانی کیفیت کے دو رخ نمایاں پہلو ہیں۔ ان دونوں کا وجود اس کی تخلیق سے وابستہ ہے۔ بقول علامہ شبلی :[1]

" جب کسی انسان کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ اس کے اظہار کے لئے کبھی جذباتی حرکات سے کام لیتا ہے کبھی ان حرکات کو لفظی جامہ پہناتا ہے۔"

کردار نگاری بہت بڑا فن ہے۔ ڈرامہ نگار کو کردار خود پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے اسے یہ دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے تخلیق کئے ہوئے کردار کسوٹی پر اترتے ہیں یا نہیں۔

جہاں تک "انارکلی" کے مصنف سید امتیاز علی تاج کا تعلق ہے انہوں نے اس ڈرامہ میں ایسے کرداروں کی تخلیق کی ہے جو اپنے اپنے منصب اور ماحول کے اعتبار سے اپنا اپنا کردار بڑی حسن و خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ اس ڈرامہ کے خاص کردار سلیم، انارکلی، دل آرام اور اکبر ہیں لیکن انھیں کرداروں کے ساتھ منسلک بختیار، مہارانی، ثریا، انارکلی کی ماں، زعفران ستارہ، مروارید، عنبر، خواجہ کافور، داروغہ زندان اور دیگر کنیزیں بھی ہیں جو اپنے اپنے محل پر اپنے اپنے کام انجام دیتے ہیں۔

انارکلی پلاٹ کے اعتبار سے خاصا جاذب توجہ ہے۔ یہ واقعی مصنف کا کمال ہے کہ ایک غیر معتبر قصہ کو وہ اس چابک دستی سے فنی اور ادبی معیار پر پورا اتارتا ہے کہ اصل معلوم ہونے لگتا ہے جس کی تعریف نہیں کی جاسکتی وہ دیباچہ میں رقم طراز ہے :[2]

" جہاں تک میں تحقیق کر چکا ہوں تاریخی اعتبار سے یہ قصہ بے بنیاد ہے۔ لاہور کے محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے انارکلی کے مقبرہ میں اس کی جو داستان ایک فریم میں لکھی ہوئی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے — لاہور کا سول اسٹیشن انارکلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطاب شہنشاہ اکبر کے حرم میں نادرہ بیگم یا شرف النساء بیگم ایک منظور نظر کنیز کو ملا تھا۔ ایک روز اکبر شیش محل میں بیٹھا تھا۔ نوجوان انارکلی اس کی خدمت میں مصروف تھی۔ تو اکبر نے آئینوں میں دیکھ لیا کہ وہ سلیم کے اشاروں کا جواب تبسم سے دے رہی ہے۔

بیٹے سے مجرمانہ سازش کے شبہ پر شہنشاہ نے اسے زندہ گاڑ دینے کا حکم دیا چنانچہ حکم کی تعمیل میں اسے مقبرہ مقام پر سیدھا کھڑا کر کے اس کے گرد دیوار چن دی گئی۔ سلیم کو اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے انارکلی کی قبر پر ایک نہایت عالی شان عمارت بنوادی۔ اس کا تعویز خالص سنگ مرمر کی ایک ہی سل سے بنا ہوا ہے اپنے حسن کے لحاظ سے غیر معمولی نقش کے اعتبار سے نادر روزگار ہے۔ بقول اسٹوک یہ تعویز سنگ تراشی کے بہترین نمونوں میں سے ایک ہے اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ۹۹ صفات کندہ ہیں۔ پہلوؤں پر ایک شعر کھدا ہوا ہے جو انارکلی کے عاشق جہانگیر نے کہا تھا ؎

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را
(مجنوں سلیم اکبر)

ایک دوسرے فریم میں اس عمارت کی تاریخ درج ہے کہ کس زمانہ میں اس عمارت سے کام لیا گیا۔ اس سلسلہ میں انارکلی کے زندہ گاڑنے کی تاریخ ۱۵۹۹ء اور مقبرہ کی تکمیل کی تاریخ ۱۶۱۵ء درج ہے یہ داستان نہ معلوم کب اور کیوں کر ایجاد ہوئی اور لاہور کی جن تاریخوں میں اس کا تذکرہ ہے ان میں کہاں سے لی گئی۔ خود داستان میں اندرونی شہادتوں کی بنا پر کئی ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے یہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی لیکن ان امور پر مورخ مجھ سے بہتر بحث کر سکتے ہیں۔"

[1] شعر العجم۔
[2] دیباچہ انارکلی صفحہ ۵ ناشر مکتبہ اردو بار سوم ۱۹۶۱ء

[1] دیباچہ انارکلی صفحہ ۶ ناشر مکتبہ اردو بار سوم ۱۹۶۱ء

تصادم (CONFLICT) کش مکش (SUSPENSE) اور عمل (ACTION) ڈرامہ کے تین خاص اجزاء ہوتے ہیں۔ ڈرامہ انارکلی میں یہ تینوں چیزیں ملتی ہیں۔ ڈرامہ دو کنیزوں (انارکلی اور دل آرام) شاہ زادہ (سلیم) اور شہنشاہ (اکبر) کی محبت کی کہانی ہے۔ ان میں اول الذکر کنیز پر شاہ زادہ فریفتہ ہے موخر الذکر کنیز جوشِ حسد اور رقابت سے ناگن کی طرح تڑپ تڑپ کر بل کھاتی ہے اور انتقام کے منصوبے کو کامیاب بنانے کی ترکیبیں سوچتی ہے۔ ان دونوں کنیزوں میں سے اکبر کو کسی کا بھی التفات حاصل نہیں ہوا اپنی سلگائی ہوئی آگ میں خود بھن رہا ہے بختیار سلیم کا بے تکلف اور ہمدرد دوست ہے جو سلیم کے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کی اسکیمیں بناتا رہتا ہے اور اسے مفید مشورے دیتا رہتا ہے۔ اکبر اپنے اقتدارِ اعلیٰ اور غیظ و جلال نیز شاہانہ اختیارات کے باوجود دل آرام جیسی معمولی کنیز کے اشاروں پر ناچتا ہے اور بالآخر اس کی سازش کا شکار ہو کر ایک بہیمانہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ سلیم اس کا بیٹا بھی ہے اور ایک موہوم خواب بھی، جس کی تعبیر میں فعل اقتدار کا مستقبل وابستہ ہے اسی کی آڑ لے کر وہ اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہندوستان اور ولی عہد دونوں کی بقا کا خواہش مند ہے صرف اس لئے کہ ان دونوں کی بقا سے خود اس کا مستقبل روشن ہو جائے گا۔ باپ بیٹوں کے درمیان شدید کشمکش جاری ہے۔

ڈرامہ نگار نے انارکلی کو سلیم کی محبوبہ بتایا ہے لیکن اس حقیقت سے انحراف نہیں کہ یہ خطاب نادرہ بیگم کو شہنشاہ اکبر نے عطا فرمایا تھا۔ یہ کم سن، ملول، افسردہ اور نازک اندام کنیز جس کے چمپئی رنگ میں اگر سرخی کی ہلکی سی آویزش نہ ہوتی تو بیمار سی لگتی۔ اس کے خد و خال کی انفرادیت نے اکبر جیسے جلیل القدر شہنشاہ کو متاثر کر دیا۔ یہ اسی گہرے قلبی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ مغلِ اعظم نے اسے مرتبوں کی مالا مرحمت فرمائی اور خطاب سے نوازا اور ایک پل میں فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا۔ اور وہ آنِ واحد میں نادرہ بیگم سے انارکلی بن گئی اس زاویہ نگاہ سے مطالعہ کیجئے تو اکبر سلیم کا رقیب ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ سلیم اس کی منظورِ نظر کنیز سے محبت کرتا ہے اور کنیز بھی اس کی اسیر ہے تو وہ درگذر نہیں کرتا بلکہ اتنا سخت رویہ اختیار کرتا ہے کہ قاری کا دل ہل جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس قدر مصلحت بیں اور دور اندیش ہے کہ اپنی گفتگو یا حرکات و سکنات سے اپنے قلبی تاثرات کسی پر بھی آشکار نہیں ہونے دیتا۔ کنیز کی موت بظاہر اکبر کی شکست ہے مگر در اصل وہ شہریت کے اس پیکر کو فنا کے گھاٹ اتار کر اپنی شکست کو فتح پر محمول کرتا ہے۔ یہاں پر ڈرامہ نگار نے شہنشاہ کے اس بہیمانہ فعل کا جواز سلیم کی بغاوت کا شاخسانہ قرار دیا ہے مگر وہ اس میں ناکام رہا ہے اور تاریخی اعتبار سے اکبر کی انصاف پسندی، فیاضی اور نرم دلی پر اس کی یہ ظالمانہ حرکت پانی پھیر دیتی ہے۔ اکبر اوصافِ حمیدہ، مردم شناسی اور معاملہ فہمی کے لئے مشہور ہے مگر ڈرامہ میں وہ ایک ظالم اور جابر کے پیکر میں جلوہ فرما ہوتا ہے۔

سلیم کا کردار سپاٹ ہے اس کا ظاہر اور باطن دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی تضاد نہیں وہ دونوں سطحوں پر ایک رومانی اور جذباتی نوجوان دکھائی دیتا ہے اسے نہ شہنشاہ کے خوابوں کی پرواہ ہے نہ اپنے شاندار مستقبل کی۔ وہ مصلحت اندیشی بھی نہیں کہ اپنی محبوبہ کے مقابلہ میں تاج و تخت کی قیمت کا اندازہ لگا سکے۔ وہ اپنے رومان میں اتنا سرشار ہے کہ ولی عہد سے زیادہ عاشق نظر آتا ہے۔ اسی لئے ڈرامے میں جگہ جگہ پر ابلتے ہوئے جذبات کو مرصع الفاظ میں ڈھال کر اپنی آرزو کو آسودہ کر لیتا ہے۔ اس میں عملی اقدام کی ذرا بھی سکت نہیں۔ وہ اپنی تمناؤں کی تکمیل کا خواہش مند تو ہے لیکن انھیں پورا کرنے کی طاقت سے عاری ہے۔ وہ مجبوری اور بے بسی میں بپھرتا ہے۔ روٹھتا ہے بسورتا ہے اور اشک بار ہوتا ہے اگر اسے اپنے من پسند کا کھلونا مل جائے تو وہ محلوں کی عشرت ہند کی سلطنت خزانوں اور دولت کے انبار یعنی سب کچھ اپنی محبوبہ کے معاوضہ میں قربان کرنے کو تیار ہے کیونکہ ایک مقام پر وہ اپنے ندیم بختیار سے اپنے دلی مدعا کا یوں اظہار کرتا ہے۔

" وہ تو فردوس کا ایک خواب ہے شباب کے آنکھوں کی قوس قزح اور سچ مچ بختیار، کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے وہ صرف میرا تصور ہے۔ اسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے میں نے ایک خیال کو دل کے سنگھاسن پر بٹھا لیا ہے اور اسے پوج رہا ہوں۔"

دل آرام "اترا شہنا"[1] ہے مگر وہ اتنی شاطر اور چال باز عورت ہے کہ ایک طرف وہ سلیم پر اپنا قبضہ جمانے کی چالیں چلتی ہے اور جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتی تو دوسری طرف اکبر جیسی جہاں دیدہ اور زیرک شخصیت کو اپنی سازش کا شکار بنا کر انارکلی کی موت کا فرشتہ بننے میں ذرہ برابر باک نہیں کرتی وہ شہنشاہ کی توجہ رقص کے دوران آئینہ کی جانب مبذول کرا کے سلیم اور انارکلی کی محبت کا بھانڈا پھوڑتی ہے۔

ثریا انارکلی کی چھوٹی بہن ہے گو اس سے کئی سال چھوٹی ہے مگر تجربہ کے اعتبار سے اس سے کہیں زیادہ بالغ نظر ہے۔ وہ دہرا کردار ادا کرتی ہے۔ ایک طرف دلآرام کو دھمکیاں دیتی ہے اور دوسری طرف سلیم کو کچوکے دیتی ہے، جوش دلاتی ہے، اکساتی ہے اور طرح طرح سے اسے بیدار کرتی ہے مگر سلیم عزم و عمل سے تہی ثابت ہوتا ہے۔ (باقی صفحہ پر)

---

[1] مثل مشہور ہے "اترا شہنا مردنگ تام"

سلیم جب ہر طرف سے مایوس ہوتا ہے تو اپنی ماں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے وہ اسے دلاسا دیتی ہے - دھمکیاں دیتا ہے - وہ خوف زدہ اور سہمی سی رہتی ہے وہ اپنی اولاد کے غم میں رنجیدہ ہوتی ہے دکھو سہتی ہے مگر اپنی اولاد کی بہبود کی خواہاں ہے وہ معاملات کو سلجھانے کی پیہم سعی کرتی رہتی ہے اور اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ سلیم بالک ہٹ سے باز آکر اپنے باپ کی آرزوؤں کے آگے سر تسلیم خم کردے ۔

انارکلی ڈرامہ کی ہیروئین ہے اور دلارام اس کی رقیب۔ وہ ایک کم سخن، کم آمیز، سیدھی سادھی نوخیز کلی ہے جس سے بہ یک وقت باپ اور بیٹا دونوں نفع لینا چاہتے ہیں۔ مگر باپ کی راہ میں شاہی آداب دبدبۂ سلطنت اور وقار مانع ہیں۔ بیٹا ڈرپوک، شاعر نما جذباتی نوجوان ہے وہ اپنے جذبات پر قابو پانے سے قاصر ہے اور اس درجہ عاقبت نا اندیش ہے کہ قبل از وقت اپنا راز دشمن پر منکشف کردیتا ہے۔ انارکلی نوجوان اور حسین و نازک اندام چھوکری ہے جس کا رخ روشن دیکھ کر ہر تخیل پسند کے ذہن میں کھلی ہوئی کلی کا تصور ابھر آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فن موسیقی اور رقص میں وہ ماہر ہے اور حاضر جواب بھی ہے کیونکہ پہلے ہی موقع پر وہ اکبر اعظم کا دل موہ لیتی ہے اور انعام و خطاب سے سرفراز ہوتی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ محبت کی چوٹ کھانے کے بعد اس کی چنچلتا اور تمام نفرتی صلاحیتیں جیسے سلب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد کے رویہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ایسی سوختہ شمع ہے جو تیز لو کی آنچ سے پگھلتی جارہی ہے اور اپنی خواہشات کے باوجود تباہی کے غار کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہی ہے۔ اس کی مثال اس آہو جیسی ہے جیسے دو شکاریوں نے اپنی اپنی زد میں لے رکھا ہے۔ موت کے علاوہ جس کا کوئی مداوا نہیں۔ وہ گم سم کھوئی کھوئی رہتی ہے اور سوچتی ہے کہ وہ کنیزی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اسے شاہزادہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس جرم کی پاداش میں اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ڈرامہ نگار نے انارکلی کے کردار کو حزن و یاس کے پیکر میں ابھار کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے علاوہ ڈرامہ میں تصادم کشمکش اور عمل کے جو نقوش ابھرے ہیں وہ دلارام کے کردار میں پورے آب و تاب سے جلوہ ریز ہیں اس حیثیت سے دلارام کا کردار اپنے معیار پر پورا اترتا ہے۔

بقیہ وابستہ کردار ثانوی حیثیت کے حامل ہیں اور اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے فرائض بجا آوری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈرامہ فنی اور ادبی حیثیت سے بھی کامیاب ہے

ڈرامہ نگار اسے بڑی دیدہ وری اور ہوشیاری سے المیہ کی طرف آہستہ آہستہ لیے جاتا ہے جو لائق ستائش ہے۔

اکادمی کے اغراض و مقاصد

○ لائبریریوں، پبلک ریڈنگ روم اور دارالمطالعوں کے لیے کتابوں اور رسائل کی فراہمی۔

○ ریاست میں رہنے والے ادباء و شعراء کو مختلف ادبی میدانوں میں اعلیٰ ادبی مساعی پر مالی انعامات۔

○ ریاست میں رہنے والے اردو اسکالرز اور طلبہ کو وظائف اور فیلوشپ۔

○ حکومت کے منظور شدہ طریقوں سے عوام کے مالی وسائل، عطیات اور فنڈ کی حصول یابی اور اکادمی کے مقاصد کے لیے ان کا استعمال۔

○ مہاراشٹر میں مقیم ادباء و شعراء کو بورڈ کی منظوری سے ان کی تخلیقات کی اشاعت کے لیے مالی امداد کی فراہمی۔

○ اردو کی ادبی تنظیموں کو ان کی ادبی سرگرمیوں کے لیے مالی امداد کی فراہمی۔

○ ریاست میں اردو کی حوصلہ افزائی کے لیے سیمینار، کانفرنس، سمپوزیم اور نمائش کا انعقاد اور ایسی سرگرمیوں کی امداد

○ مہاراشٹر میں اردو زبان کی ہمہ جہتی ترقی۔

○ تراجم اور دیگر ادبی سرگرمیوں کے ذریعے ریاستی زبان مراٹھی اور اردو کے درمیان تخلیقی خیالات کے تبادلے کا فروغ۔

○ ایسی اسکیموں اور سرگرمیوں کا آغاز اور ان کی امداد جن سے اردو کے مقصد کو تقویت پہنچے۔

○ اردو میں جرائد و رسائل اور کتب کی اشاعت کی ذمہ داری اور ایسے کاموں کی امداد

رفیعہ منظور قریشی

میرا پسندیدہ ادیب

ادب کا مطالعہ کرنا ہے تو اس کے ساتھ ذہنی استعداد میں سمجھنے، متاثر پذیر ہونے اور ادیب کو پہچاننے کی صلاحیت خود و فہم اور حقیقت شناس ہوتی جاتی ہے۔ اس مشغلے کی نیرنگی، پسند کے پردے پر ایک ادیب کے نقش پر دوسرے ادیب کا تازہ اور گہرا نقش جمتا چلا جاتا ہے اور کسی ایک سے پائیدار وابستگی برقرار نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ شوق کی اور سیدہ رفاقتیں جن نقش کو اپنی گہرائیوں میں اتار لیتی ہیں وہ اپنے اوپر لدے ہوئے نقوش میں بد رنگ، بے رنگ یا بے وجود نہیں ہو جاتا۔ رنگ و نور کے سرمایہ کو محفوظ رکھتے، ہر وقت اس یاد کا منتظر رہتا ہے جو اسے ڈھونڈتی آئے۔ اپنے پسندیدہ ادیب کے بارے میں جب میں سوچنے لگا مجھے بھی ماضی کی طرف لوٹ کر اس نقشِ اوّل کو ڈھونڈنا پڑا جس کا ہر رنگ میرے لئے ایک روشن اشارہ تھا۔

جامعہ عثمانیہ کی عارضی عمارتوں میں اڈریس ہال کے سامنے موٹر خانے تھے۔ ان ہی میں ایک جو اڈریس ہال کے بالکل مقابل تھا چائے خانہ تھا۔ اس چائے خانے کی چائے کی تاثیر کے بارے یہ روایت عام تھی کہ چائے کا گھونٹ حلق سے اترا اور دماغ کے چودہ طبق روشن۔ چودھویں طبق کی روشنی میں تو پینے والا شعر کہنے لگے یا سر پیٹنے لگے۔ اب اگر کسی کا یہ تجربہ ہو کہ ایک لبراتی افیونیت کے سوا اس کا کچھ حاصل نہیں تو اس کے بارے مشہور ہو جاتا کہ کم بخت کی کھوپڑی میں دماغ ہی نہیں۔ اس بدنامی سے بچنے کے لئے اکثروں نے اس چائے کی عادت سی ڈال لی تھی۔ ایک دن میں بھی چلا گیا۔ چائے پیتے پیتے اس کے ذائقے اور تاثیر کے تعلق سے اپنی اندرونی کیفیات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک صاحب دھماکے کی طرح داخل ہوئے۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کھڑے کھڑے چائے پی جا رہی تھی اور وقفے وقفے سے سگریٹ کے کش بھی لئے جا رہے تھے۔ چائے ختم کر کے وہ جانے لگے تو چائے خانے والے نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ "صاحب وہ پچھلے سال کا حساب" تحکمانہ لیکن بے تکلفی کے انداز میں جواب دیا گیا۔ "مرتا کیا میرے ہاتھ سے"۔ چائے خانے والے نے مسرت بھرے لہجے میں کہا "میرے مرنے سے پہلے حساب چکتا کر دیو صاب..." ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ میں نے محسوس کیا چائے خانے والے نے اس مکالمہ کی خاطر ہی حساب کا سوال کیا تھا اور دل سے اُٹھے اس قہقہے کی گونج میں گویا بے باقی کی اطمینان بخش بشارت مل گئی تھی۔ چائے پینے والا خوش کہ چلو آج تو پیچھا چھوٹا اور چائے خانے والا مطمئن کہ صاب کل بھی آئیں گے۔

میں اپنے کو روک نہ سکا اور کھڑے ہو کر درخواست کی "ایک چائے میرے ساتھ بھی پی لیجئے"۔ مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔ "کون ہو؟" میں نے اپنا تعارف کرایا۔ "اس سال آیا ہوں اردو فارسی کا ہوں" پھر پوچھا گیا۔ "ڈے اسکالر ہو؟" "جی نہیں عارضی اقامت خانے کا باشندہ ہوں"۔ "باشندہ...." انہوں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے دہرایا۔ اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس ہاتھ کو تھاما تو وہ اس قدر نرم محسوس ہوا.... جیسے اونی دستانے سے مصافحہ ہو رہا ہو... وہ کچھ جھینپ سے گئے، کھنکارتے ہوئے کہنے لگے "اے نو وارد یہ قلمی ہاتھ ہے...." اور انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

اشفاق حسین صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

میرے ادبی وجود پر اس قلمی ہاتھ کی گرفت کچھ ایسی سخت بیٹھی کہ گلو خلاصی کے لئے میری ہر کوشش اسے گہرا ہی گہرا دھنساتی چلی گئی... میرا یہ حال ہو گیا کہ میں اشفاق صاحب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس طرح ان کے سامنے آ جاتا جیسے یہ اتفاقیہ مڈبھیڑ ہے۔ وہ مسکراتے.. پوچھتے.. کیسے ہو۔ کیا ہو رہا ہے اور آگے بڑھ جاتے۔ دراصل وہ مجھ سے سینیئر تھے اور جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز اور ہر دلعزیز طالب علم مانے جاتے تھے اور اس وقت سینیئر اور جونیئر کے درمیان جو حدِ ادب نافذ تھی وہ اس قدر روا تھا نہ

ملو نگار کبھی جاتی کہ جونیر کی مجال نہ ہوتی وہ خود سینیر بننے تک سینیروں
کا ہم نشین بن سکے ۔ سب سے بڑی بدنصیبی تو یہ تھی کہ نہ میری صورت
جاذب نظر، نہ میری صلاحیت شعلۂ و شرر۔ اشفاق صاحب نے مجھے
مخاطبت سے زیادہ کا مستحق نہ سمجھا اور میں نے بھی اس التفات کو قسمت
کی طرح قبول کر لیا۔ کبھی یہ ملاقات سرراہے بھی نہ ہوتی تو میں اشفاق صاحب
کی اختر کی ڈائری پڑھنے لگتا۔ اس ڈائری میں میں نے اشفاق صاحب
کو پالیا۔۔ اس طرح کو ان کو آخر کار ۔۔ سب کو چھوڑ کر ۔۔ میرے
پاس آنا پڑا۔ اختر کی ڈائری میں اشفاق صاحب زندگی کی سرشاریوں
میں گھومتے ہیں۔ محبت کی دھڑکنوں میں گنگناتے ہیں اور ان کے وجدان
سے رنگینیوں کا آبشار گرنے لگا۔ وہ قاضی عبدالغفار صاحب کی طرزِ
انشا سے بہت متاثر تھے اور میں سمجھتا ہوں لیلیٰ کے خطوط کے مطالعے
کے بعد جواباً " نگارش ہے" کے طور پر یا اس مطالعے سے ہیجان میں
آنے والے جذبات کی انشائی شکل اختر کی ڈائری ہے۔ یہ کہنا کہ
اشفاق صاحب کے پاس قاضی عبدالغفار صاحب کے اندازِ نگارش کی
دلپذیری اور مضمون کی گہرائی نہیں انصاف پر مبنی نہیں۔ کیونکہ جس تجربے
کے ساتھ اور جس ماحول میں اشفاق صاحب نے
اگر اسی عمر اور ماحول میں قاضی عبدالغفار صاحب لکھنے بیٹھتے تو وہ بھی
وہی لکھتے جو اشفاق صاحب نے لکھا۔ فیضان ایک ہی ہے۔ صرف اس کو
حاصل کرنے والوں نے اپنے اپنے وقت اپنے اپنے انداز میں برتا ہے۔

یہ عبارت دیکھئے

" گنگناتے ہوئے بستر پر جاتا ہوں۔ ساری فضا ابدی نیند اور دائمی
سکون میں ہوتی ہے ۔۔۔ دو بجے میں دیکھتا ہوں تو چاند اپنی مدھم روشنی
کے ساتھ مغرب کی طرف جاتا نظر آتا ہے۔ یک بیک ریل کی سیٹی کی آواز
میرے کانوں تک پہنچتی ہے ۔۔ اس آواز میں کچھ ایسا سیلابِ موسیقی بہتا
آتا ہے کہ تڑپ اٹھتا ہوں ۔۔" یہاں تک اشفاق حسین صاحب ہیں۔ اس
کے بعد وہ مبداءِ علم جو قلمی ہاتھوں کو لکھنے کا حکم دیتا ہے ... لکھواتا ہے
" اپنی نزاکت احساس پر کمرے کی خاموشی میں داد طلب نظریں دوڑاتا
ہوں مگر ۔۔۔ مایوس ہو کر سو جاتا ہوں ۔"

یہاں میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اشفاق حسین صاحب
کی جگہ اگر قاضی عبدالغفار صاحب ہوتے تو وہ بھی عبارت کے آخری حصے
کو اسی طرح قلمبند کرتے جس طرح اشفاق حسین صاحب نے کیا ہے۔
کیونکہ قاضی عبدالغفار صاحب پر بھی دورانِ تحریر کسی خاص مقام پر ایسا
ہی القائی تسلط قائم ہو جاتا تھا اور پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکتا
تھا کہ لکھنے والے کا قلم کسی اور کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اب دیکھئے

انسانی کردار اور زندگی کا تجزیہ ہو رہا ہے۔" زندگی کا فلسفہ آج تک
میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ ہنستا رہتا ہوں۔ آخر کوئی حد بھی
ہے۔ ایک دوست نے بھری محفل میں ڈانٹ دیا تھا دو دن تک ان سے
خفا رہا وہ آئے مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔۔ رونے لگے۔ میں کیا کرتا
رو نہیں سکا، رونا نہیں جانتا۔ کب تک ہنستا
رہوں گا۔ ہنستے ہنستے خندۂ بے مسرت پر اتر آیا ہوں۔ بالکل تھک چکا
ہوں۔ اکبر دانش نے غم کے سہارے زندگی کا راز معلوم کیا اور میں مسرت
کو تھامے ہوئے ہوں۔۔ قدم ڈگمگا رہے ہیں غزل پر پہنچتے پہنچتے معلوم
نہیں کیا رہ جاؤں گا۔"

آپ کہیں گے یہ تو قاضی عبدالغفار ہیں۔ جی نہیں۔ یہ اشفاق حسین
ہیں۔ رومانوی فضاؤں سے نکل کر جب اشفاق حسین صاحب زندگی
کے میدان میں آتے تو ان کی تحریر میں رنگ کی جگہ گہرائی اور خوش آہنگی کی
جگہ حقیقت بیانی آ گئی۔ کبھی کبھی میں ان سے کہتا۔ آپ تو قلم سوار ہیں۔ جس
سمت میں چاہتے ہیں فراٹے بھرتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور کوئی آپ کی
دھول کو بھی نہیں پہنچتا" اظہارِ خوشنودی ہوتا۔" بکرمت مخدوم پر میں
نے جو مضمون لکھا ہے ۔۔ پڑھو ۔۔" میں پڑھنے لگتا ہوں ۔۔۔

" اس شہر نے اس کی رنگارنگ شخصیت کے سارے پہلو بے نقاب
دیکھے۔ اس کی کوچہ گردی اور بے راہ روی بھی دیکھی اس کی ستیزہ کاری اور
گرہ کشی بھی۔ اس کی محرومیاں بھی دیکھیں اور اس کی فتوحات بھی۔ اسے تہی دامن
بھی دیکھا اور گل بداماں بھی۔ اس کی آشفتہ سری بھی دیکھی اور محبوبیت بھی
اور شہر آخر میں بہ چشم نم وہ منظر بھی دیکھا ۔۔ آخری سفر کا منظر۔ ہزاروں
سوگواروں نے اس کا آخری دیدار کیا اور وہ شرر جو شعلہ بنا ۔۔ آفتاب بن کر
ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔"

نظریں اٹھائیں تو دیکھا ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔۔
رکتے رکتے کہنے لگے۔ "
رہا ہے.
۔۔ اور میں لکھتا ہی نہیں ۔۔ اتنا کاہل ہو گیا ہوں کہ کوئی کوڑے مار مار کر
لکھوائے تو اُسے دعا دوں ۔۔ خاکہ نگاری میں بھی اشفاق صاحب کو
کمال حاصل تھا۔ اور یہ مولوی عبدالحق کی تربیت کی دین تھی۔ سعادت
کے بارے میں لکھتے ہیں۔" اس کو خدا سی ہنسانا بھی۔ کوئی چبھتا فقرہ، ایک
چھوٹی سی اشتعال انگیز بات، کوئی بے ساختہ حرکت، کوئی فلک شگاف
قہقہہ محفوظ کر دیتا۔ ۵۲ء کی بات ہے میں دہلی میں تھا۔ اتفاق سے
مخدوم بھی وہیں تھے۔ دہلی میں جولائی سے ستمبر تک کا موسم بڑا مردم آزار
ہوتا ہے۔ برسات کی گرمی۔ پسینے میں شرابور ہم کناٹ پلیس پر دہلی کے
موسم کو گالیاں دیتے پھرتے ایک دن مخدوم نے کہا۔" محمد تغلق نے غلطی نہیں

کی کہ پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا بلکہ غلطی یہ کی کہ دولت آباد سے پھر دہلی آگیا۔ تاریخ تغلق کی اس غلطی کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔
دوسرے دن سعادت کو میں نے یہ بات بتائی۔ تڑپ گیا۔ اور جب خط لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے سامنے بیٹھا ہے ناقابل یقین حد مہذب باتیں کر رہے ہیں۔ مجھ سے مخاطب ہیں۔

"بمبئی میں جو مکان مجھے ملا ہے۔۔ وہ اس عظیم الشان عمارت کا ایک حصہ ہے جو چھٹی منزل پر ہے۔۔ سمندر ہر وقت نظر نواز بنا رہتا ہے۔ اور چھت پر جائیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمندر قدموں میں آگیا ہے۔ حالانکہ ایک فرلانگ فاصلہ ہوگا۔ یہاں سمندر پُرسکون ہے۔ ہماری زندگی کی طرح جواب سکون ہی چاہتی ہے۔ بہرحال خدا نے بڑا کرم کیا کہ اس ترقی کے ساتھ بمبئی جیسی جگہ پر ایسا شاندار محل رہنے کو دیا۔ اب ہم بمبئی میں ایک سال تک حکمرانی کریں گے۔ ہذا من فضلِ ربی۔"

میں سمجھتا ہوں اشفاق حسین صاحب کے اسلوب نگارش کا ہر روپ۔۔۔ حالات اور زمانے کے ساتھ بدلنا۔۔۔ سنورنا آپ کے سامنے آتا جارہا ہے۔

میں ساہتیہ اکادمی کا رکن ہوں اور مجھے یہ کام دیا گیا تھا کہ "اقبال اور انسان" پر اشفاق حسین صاحب کے مسودہ پر اپنی رائے کا اظہار کروں۔ میں نے جس حصے پر نشان لگا کر اس کی اشاعت کی سفارش کی۔۔۔ وہ حصہ یہ ہے۔

"انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز خودی کا شعور ہے۔ خودی کی ابتدائی منزلیں تلاش و جستجو کی منزلیں ہیں۔ نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات اس جستجو میں سرگرم سفر ہو کر ادنیٰ سے اعلیٰ منزلوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انسان کی پوشیدہ قوتیں جب ظاہر ہو کر اپنی ذات اور مخالف عناصر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور درجہ بدرجہ مقامات طے ہوتے ہیں تو انسان بالآخر مقامِ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر تسخیر کائنات آسان ہوجاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب انسان کی خودی مادہ پر فتح پاکر بااختیار ہوجاتی اور عشق و محبت سے استحکام پاکر زمانہ یا وقت پر غالب آجاتی ہے اور یہیں بقائے دوام پالیتی ہے۔"

یوں نظر آتا ہے جیسے موضوع کے تقدس کے سایے میں چھپے تلے الفاظ احترام کی گردن جھکائے مودب چل رہے ہیں۔

میں ایک دن اُن سے ملنے گیا تو۔۔ وہ بہت بے چین اور پریشان تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہا۔ سینے میں سخت تکلیف ہے۔ میں نے کہا۔۔ ہر تکلیف عارضی ہوتی ہے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟ کہا۔۔ یہ بات نہیں۔۔ مجھے بہت کچھ لکھنا ہے۔۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے۔۔۔ کچھ بھی لکھنا نہیں ہوگا۔ میں نے کہا آپ کہیں سے ٹیپ ریکارڈر منگوا لیجئے۔ بس جو کچھ کہنا ہو۔۔ اس میں محفوظ کر دیجئے۔۔ وہ میرے مشورہ کو ٹال گئے۔ میں نے کہا۔۔ اچھا یوں کیجئے۔۔۔ میں قلم کاغذ سنبھالتا ہوں۔۔ آپ لکھواتے جائیں۔ ٹہلنے لگے۔۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں۔۔ ان کی زبان سے الفاظ نکلنے لگے۔ میں نے تنہا جینا کیوں چاہا؟ جینے کا مزہ تو سب کے ساتھ جینے میں ہے۔ تنہا جینا بڑی خود غرضی ہے بڑی کمینگی ہے۔۔ انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔۔ اور بیٹھ گئے۔۔ سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ کچھ سنبھل کر کہنے لگے۔۔ لکھ لے۔ یہ دنیا آزمائش اور آسائش کی بہت خوبصورت جگہ ہے۔۔ اور یہ قبرستان بھی ہے۔ لیکن مجھے کینسر کی قبر۔ کیوں؟۔۔ کیوں۔۔؟ بستر پہ بے ہوش پڑ گئے۔۔ اور میں کمرے کی بوجھل خاموشی میں۔۔ ان کی تیز تیز لرزتی ہانپتی سانسوں کو گنتا کھڑا رہ گیا۔ اس کے بعد کینسر کی تحریر۔۔ آگہی اور اشفاق حسین صاحب کی نگارشات کا دفتر بند ہوگیا۔ فنا کا دور شروع ہوگیا جسے بقائے دوام بھی کہا جاتا ہے۔

●●

بابائے اردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے جو اس وقت تک اردو زبان کی خدمت کی ہے اس کے بارِ احسان سے ہم سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ان کے ایسے اعتدال پسند اور منصف مزاج ادیب فی زمانہ ہندوستان میں بہت کم ہیں۔

سر تیج بہادر سپرو

ڈان ایجوکیشن سوسائٹی حیدرآباد

اردو تعلیم کا جدید سائنٹفک طریقہ

خواجہ عبدالغفور : "میں رضی الرحمٰن صاحب کی تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا کام ان کی خدمت اور ان کی مساعی اور پھر ان سب کا نتیجہ اردو کی خدمت اور نئی پود کی تعلیم اور صحیح طریقہ پر تربیت کا مظہر ہے۔ یہ خلوص کوشش اور بے لوث جذبہ ایک سسٹم بن رہا ہے جو نسلاً در نسلاً مفید اور کار آمد رہے گا۔ ان کے کام کو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر (Recognition) ملنا چاہیئے اور یہ مل کر رہے گا میری نیک تمنائیں، پرخلوص دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔"

ڈاکٹر شارب ردولوی : ڈان سوسائٹی نے جس محنت اور لگن کے ساتھ بچوں کو اردو ہندی تلگو اور انگریزی پڑھائی ہے وہ قابل داد ہے۔ ان کا اردو پڑھانے کا قاعدہ نئے صوتیاتی طریقہ پر مبنی ہے جس سے ایک ایسا طالبعلم بھی چند دنوں میں اردو پڑھنا اور لکھنا بہت آسانی سے سیکھ جاتا ہے۔ جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے

حیات اللہ انصاری : ڈان بہت قابل قدر اسکول ہے ایسے اسکول بہت کم ہیں جو بنیادی طور پر انگریزی ہوں مگر اردو کو اس انہماک سے پڑھاتے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس اسکول کے اردو شعبے کو حکومت اور اکادمی کی طرف سے خاطر خواہ مالی امداد ملے۔

• • •

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے بمبئی میں مختلف مقامات پر ڈان اردو تعلیم کا اہتمام کیا ہے۔

جامعہ اُردو
علی گڑھ

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے جامعہ اُردو علی گڑھ کے امتحانات

ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل کے لئے باقاعدہ

کلاسوں کا اہتمام کیا ہے ـــــ۔

یہ کلاسیں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں یکم جون ۸۴ء سے شروع کی جائیں گی۔ امتحانات کی نگرانی اور انتظام کے لئے ایک بورڈ قائم کیا گیا ہے جس میں خواجہ عبدالغفور، عبدالمجید پاٹکا اور ڈاکٹر نظام الدین گوریکر شامل ہیں۔

جوگندر پال

اسٹا

شیام بابو گذشتہ بارہ سال سے تارگھر میں کام کر رہا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک یہ بات نہیں سمجھ پایا ہے کہ یہ بے حساب الفاظ برقی تاروں میں کہیں ٹکرا کر، بکھر کر اپنی اپنی سمجھ بوجھ سے نئے رشتوں میں منسلک ہو کر ریسیونگ اسٹیشنوں پر اسی طرح کیوں نہیں پہنچتے ۔ بیٹے نے ماں کو جنم دیا ہے، مبارکباد ۔ یا، چوروں نے پولس کو گرفتار کر لیا ہے ۔ یا، افسوس کہ زندہ بچہ پیدا ہوا ہے ۔ شیام بابو کسی مشین کی طرح میکانکی انداز میں برقی پیغامات کے کوڈ کو رومن حروف میں لکھتا جا رہا ہے ۔ کیا مضائقہ ہے! جیسے آج بیت رہی ہے، ہمارے پیغام بھی ویسے ہی کیوں نہ ہوں؟ ۔ کرتا ہوں اسٹاپ ۔ تار کے آخری الفاظ لکھتے ہوئے شائد اس نے اپنے آپ سے پوچھا، کیا کرتا ہوں؟ ۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ اتنے ہجوم میں اگر کوئی کسی ایک کو آواز دے تو کیا سارا ہجوم مڑ کر دیکھنے لگتا ہے؟ جس کے نام کا تار ہے وہی پڑھ کر دیکھ لے گا ۔ لیکن خلافِ معمول اشتیاق سا محسوس کر کے وہ یونہی اس تار کا مضمون پڑھنے لگا ہے ۔
اپنی شادی روک لو اسٹاپ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں اسٹاپ ۔ وہ ہنسنے لگا ہے ۔ چٹھی کی طوالت اور تار کا اختصار دونوں مضحکہ خیز صورت پیدا کر دیتے ہیں ۔ میں تم سے بے انتہا محبت کرتا ہوں ۔ مانو بے چارہ تھوڑی سی محبت کر کے باقی محبت کرنا بھول گیا اور پھر بات بگڑ گئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محبت ہی محبت کرنے پر تل گیا ۔
شیام بابو اگلے تار کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ کسی نے کسی بات پر دکھ کا اظہار کرنے کے لئے تارگھر کی اسٹینڈرڈ عبارت کا متعلقہ نمبر لکھا ہوا ہے ۔ پیسے بھی کم اور دکھ کے اظہار کا ڈرافٹ بھی سرکار کے نتھے ۔ ہاں، جو آپ ہی مر چکا ہو وہ اپنوں کی موت پر کیا دکھ محسوس کرے گا ۔؟ ۔ شیام بابو نے اپنے آپ کو ڈانٹا ہے، کوئی مرے یا جئے، تمہیں کیا! چپکے سے اپنا کام کئے جاؤ ۔ کام! مجھے تو مر کر بھی یہی کام کئے جانا ہوگا ۔ مر کر بھی؟ ۔ لو یہ تار پڑھو، تمہاری موت ہی کی خبر ہے ۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اسٹاپ ۔ اس کے خودکار قلم نے جلدی جلدی لکھا ہے اور وہ اپنی تحریر سے بے خبر سوچ رہا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ میں زندہ کہاں ہوں؟ اس کے باوجود مجھے اپنے جسم کی ٹک ٹک چلائے رکھنا ہوتی ہے، نہیں تو مجھے آفس سے اٹھوا دیا جائے ۔ گھر؟ ۔ گھر میں بھی کیا رکھا ہے؟ ۔ اسٹاپ ۔
شیام بابو کی شادی ہوئے سات آٹھ سال ہو چکے ہیں، مگر اس کی بیوی ابھی سے اپنے ماں باپ کے گاؤں میں انھیں کے ساتھ رہ رہی ہے اپنی شادی کے موقع پر وہ اس کی ڈولی اٹھوا کے گاؤں سے باہر تو لے آیا لیکن پھر جو سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کہاں لے جائے تو اس نے ڈولی کا منہ واپس گاؤں کی طرف پھروا لیا۔
"یہ تم نے بہت اچھا کیا، بیٹا" اس کی ساس نے کہا تھا۔ "کہ ایک بار اسے گاؤں سے باہر لے گئے۔ کم سے کم رسم تو پوری ہو گئی۔"
شروع شروع میں تو اس کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ سوتے میں بھی بیوی کے گاؤں کا رخ کئے ہوتا ۔ تم گھبراؤ نہیں، ساوتری، جوں ہی کوئی اچھی سی بھاڑے کی کھولی مل گئی اسی دم تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ ۔ لیکن برا ہو اس اتنے بڑے شہر کا، اتنا بھی ہول نہیں کہ انھیں اکٹھا رہنے کے لئے ایک ہی کمرے کا چھوٹا سا گھر دے دے۔ پورے ساڑھے سات برس اسی طرح گذر گئے ہیں۔ وہ یہاں اور وہ ساڑھے پانچ سو میل پر وہاں۔ پہلے پہل شیام بابو بیس کم تین سو پینسٹھ دن اپنی بیس دن کی انڈیو کا انتظار کرتا رہتا اور وقت آنے پر ریل گاڑیوں، بسوں، اور اکوں کو بدل کر اپنی بیوی کے گھر آ پہنچتا۔ اور ۔ اور اس کی خواہش اتنی شدید ہوتی کہ سج دھج کر تیار بیٹھی بیوی کو بے اختیار گلے لگاتے ہی اس کی سیٹی بج جاتی اور شرمندگی سے مسکراتے ہوئے وہ گویا کسی دفتری

"شیام بابو، سب کے لئے چائے ہو جائے۔"

"چائے ہی کیا، کچھ ادھار دے سکتے ہو تو کھانے کے لئے بھی جو چاہو منگوالو۔"

"ہاں، فکر مت کرو۔ میں سارا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ ارے او راموا ——— اِدھر آؤ رامو، باہر وہ ہوٹل والا ہے نا، اسے بلا لاؤ! ——— اب بھابی کو کب لا رہے ہو شیام بابو؟ ——"

"آج ہی چھٹی کی درخواست دیدوں گا، کیدار بابو!"

شیام بابو جی ہی جی میں اپنے کوارٹر میں بیٹھے کھانا کھا رہا ہے اور اس کے کندھوں پر اس کا لڑکا کھیل رہا ہے ——— کیا نام ہے اس کا؟ —— دیکھو نا، دماغ پر زور ڈالے بغیر اپنے اکلوتے بچے کا —— اپنا ہی تو ہے ——— نام بھی یاد نہیں آتا ——— اری سن رہی ہو بھلی لوگ؟ اگلی چپاتی کب بھیجوگی؟ دفتر سے دیر ہو رہی ہے ———

"لو شیام بابو، ہوٹل والا تو آگیا ہے —— ہر ایک کے لئے ایک چائے، ایک گلاب جامن اور ——— اور ایک سموسہ ——— چلے گا نا شیام بابو؟"

شیام بابو کو پتہ ہی نہیں چلا ہے کہ دفتر میں سارا بقیہ وقت کیسے بیت گیا ہے۔ وہاں سے اٹھنے سے پہلے اس نے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان سب کو اُن کی بھابی کی تصویر دکھا دے گا۔ "اتنی بھولی ہے کہ ڈرتا ہوں اس شہر میں کیسے رہے گی۔؟"

"ڈرو نہیں شیام بابو۔ بھابی کو لانا ہے تو شہر پر بہری کر رہو۔"

"ہہ ہا ہہ ——— ہہ ——— ہا ——— !"

دفتر کے باہر سڑک پر چھ بجے سے ہی اندھیرا چھانے لگا ہے۔ شیام بابو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے یہاں چوراہے پر آگیا ہے اور پان اور سگریٹ لینے کے لئے رک گیا ہے اور پھر تمباکو والے پان کا لعاب حلق سے اتارتے ہوئے نتھنوں سے سگریٹ کا دھواں بکھیرتے ہوئے ہلکی ہلکی سردی میں حدّت محسوس کرتے وہ بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ اپنے رہائش کے اڈے کی طرف ہو لیا ہے ——— ایک چھوٹی سی کھولی جس میں مشکل سے ایک چارپائی آتی ہے۔ ابھی پچھلے ہی ماہ خان سیٹھ نے اسے دھمکی دی تھی کہ بھاڑے کے دس روپئے بڑھاؤ یا خالی کردو۔

"چوہے کے اس بل کے پہلے ہی پچاس روپے وصول کرتے ہو خان سیٹھ اپنے خدا سے ڈرو۔"

لیکن خان سیٹھ نے گویا اپنے خدا کو ڈرانے کے لئے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

اِسی مہینے خالی کردوں گا ——— یہ لو اپنی کھولی، خان سیٹھ۔ تمہاری قبر کے پورے سائز کی ہے ——— سنبھالو! ——— نہیں،

جھگڑے دگڑے کا کیا فائدہ؟ چپکے سے اس کی کھولی اس کے حوالے کر کے اپنی راہ لوں گا ——— بس اسٹاپ آگیا ہے اور بس بھی کھڑی ہے لیکن بہت بھری ہوئی ہے۔ شیام بابو نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ پیدل ہی جائیگا یہاں سے ایک ہی کلومیٹر تو ہے۔

——— اس کی سگریٹ جل جل کر انگلیوں تک آپہنچی ہے لیکن ابھی تک اس کی اشتہا جوں کی توں ہے۔ اس نے ہاتھ کا ٹکڑا پھینک کر ایک اور سگریٹ سلگالی ہے ——— ساوتری کو میرا سگریٹ پینا بالکل پسند نہیں پھیپھڑے بھی جلاتے ہو اور پیسے بھی۔ اس سے تو اچھا ہے میرا ہی ایک سرا جلا کر دوسرے کو ہونٹوں میں دبالو اور دھواں چھوڑتے جاؤ ——— میرا مزہ کیا سگریٹ سے کم ہے؟ ——— اری بھلی لوگ، تمہارا ہی تو ایک مزہ ہے۔ سگریٹ وگریٹ کی لت کو گولی مارو۔ آؤ! ——— شیام بابو نے خیال ہی خیال میں بیوی کو سینے سے لگا لیا ہے اور راستے میں مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک عورت سے ٹکرا گیا ہے اور اسے لگا ہے جیسے اس کی ساوتری نے اس سے الگ ہونے کے لئے اپنے آپ کو جھٹکا ہے ——— ارے! ——— اُس نے اندھے پن میں اپنا ہاتھ اس عورت کی طرف پھیلا دیا ہے ——— ایڈیٹ! ——— وہ عورت غصّے سے پھنکارتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے اور شیام بابو کو شرمندہ ہو جانے کے باوجود بدستور خوش خوش ہے اور عورت کی پیٹھ کی طرف منہ لٹکا کر اس نے بہ آوازِ بلند کہا ہے،

آئی ایم ساری، میڈم! ——— شیام بابو اپنے ذہن کو جھاڑ رہا ہے اور اڑتی ہوئی گرد میں اس کی بیوی زور زور سے ہنس رہی ہے ——— اور ٹکراؤ پرائی عورتوں سے! ایک میں ہی تو ہوں جو بلا روک ٹوک سب کچھ کر لینے دیتی ہوں ۔ کسی اور کی طرف ذرا نظر اٹھا کے تو دیکھو ——— کسی اور کی طرف مجھے دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلی لوگ۔ میرے لئے تو بس ایک تم ہی تم ہو ———

شیام بابو نے اپنے آپ کو پھٹکار کر سمجھایا ہے، نہیں، تم نے اپنی بیوی کے ماتھے پر خواہ مخواہ کلنک کا ٹیکا لگا رکھا ہے ——— تمہارا بچہ تمہارا ہی ہے ——— اور اگر مان بھی لیں کہ تمہارا نہیں تو اس میں ساوتری کا کیا دوش؟ اس کا سارا سال تمہاری ارنڈ لیو کے دس بیس روز کا تو نہیں ——— چلو، سب ٹھیک ہے ۔ میں بھی کیسا باپ ہوں ۔ بیٹا دو سال کا ہو لیا ہے مگر میں نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ پچھلے سال مجھے ایک چکر کاٹ آنا چاہئے تھا ——— آج چھٹی کی درخواست دے آتا تو بہتر ہوتا اب کل پہلا کام یہی کروں گا اور اس ہفتہ کے آخر میں یہاں سے نکل جاؤں گا ۔ چھٹی کے بغیر اچانک اس کے سامنے جا کھڑا ہوں گا ——— ساوتری! ——— اسے لگے گا کہ وہ آنکھیں مل مل کر میری طرف دیکھتی رہ

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

غیاث احمد گدی

روز و شب

ہر صبح ......!

ہر صبح جیسے ہی میں بالکونی سے جھانک کر نیچے کی سمت دیکھتا ہوں — وہ لڑکی، وہ خوبصورت لڑکی سڑک کے سست رفتار ریلے میں بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔

دھوپ اس کے چہرے کو چومتی، اس کی مانگ میں افشاں چنتی، دھوپ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جگاتی تب اس کے دانتوں کی قندیلیں جھلملا اٹھتیں، اس وقت وہ ذرا ٹھہر کر کائنات پر، اس ارض و سما پر نظر ڈالتی جو اسے قدرے ہیچ نظر آتے، کہ جوان لہو، رگوں میں چراغ جلائے رہتا اور دل میں غرور کی کمان تنی ہوتی۔

لیکن شام پڑتے ہی جب وہ دفتر سے واپس آتی، اس کی تنی بانہیں ڈھیلی پڑ چکی ہوتیں گیسوؤں کی گھٹا شیالی چہرے پر جھریاں براج چکی ہوتیں اور وہ جوان لڑکی ادھیڑ بلکہ بوڑھی دکھتی۔ نہ اس کی چال میں مستانہ وشی ہوتی نہ انداز میں شباب کی دمک دکھائی پڑتی۔

یہ بارہ گھنٹے اس کی زندگی میں ہر روز بیس پچیس برس کی مدت لے آتے اور اسے بوڑھی کر کے آگے بڑھ جاتے لیکن دوسری صبح وہ اسی طرح جوان، تازہ دم اور خوبصورت دکھائی پڑتی۔ یہ پُراسرار کیفیت مجھے پریشان کئے رہتی اور میرا دل زور اٹھتا۔

تب ایک دن میں اپنی بیوی کو بتاتا ہوں، یوں پہلے تو وہ یقین نہیں کرتی، پھر جب میں نے ایک دن صبح و شام اس لڑکی کو دکھا دیا، اور میری بیوی صبح و شام کے فرق کو اچھی طرح سمجھ چکی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے .... یہ ہماری آنکھوں کی خطا ہے۔"

"نہیں یہ ہماری آنکھوں کی خطا نہیں، شرافت ہے جو لڑکی کی زندگی کی تہوں میں اتر جاتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس بات کا پتہ لگاؤں گا کہ رات بھر کی ساری کمائی وہ دن کے بارہ گھنٹے، اس سے کس طرح چھین لیتے ہیں۔ پھر رات اسے دوسرے دن کے لئے اتنا کچھ کہاں سے دیتی ہے؟

چنانچہ میں اس دن اور رات کی سی کیفیت والی لڑکی سے پوچھتا ہوں بیٹی یہ جو تم ہر صبح اتنا کچھ لے کر نکلتی ہو، دن کے دس بارہ گھنٹے میں کہاں گنوا دیتی ہو؟

"بابا" اس نے اپنائیت سے جواب دیا۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور حسب معمول وہ ہاتھ میں پلاسٹک کی تھیلی دوسرے میں پرس لئے دفتر کو جا رہی تھی۔

"بابا یہ ایک کہانی ہے، اس کے لئے آپ کو تھوڑی زحمت اٹھانی پڑے گی۔ اٹھائیے گا زحمت؟

"ہاں تھوڑی کیا بہت، تم بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"تو بابا چار بجے، جب میرا دفتر بند ہو جاتا ہے آپ کو صدر دروازے پر میرا انتظار کرنا ہوگا۔ پھر میں آپ کو ان ڈاکوؤں کے پاس لے جاؤں گی جو مجھے گھنٹوں میں کنگال کر دیتے ہیں۔"

"ڈاکوؤں کے پاس؟"

"ہاں ڈاکوؤں کے پاس۔"

میں اس خوبصورت لڑکی کی رسیلی باتوں کا جام پیئے گھر آ جاتا ہوں اور اپنی بیوی سے سارا واقعہ کہہ سناتا ہوں۔ پہلے وہ تعجب سے میری طرف دیکھتی ہے پھر ہنس پڑتی ہے۔ "وہ لڑکی پاگل ہے یا پھر بہروپیا ہوگی میں آج سارا دن سوچتی رہی ہوں کہ وہ لڑکی ضرور بہروپیا ہے۔"

پھر میری بیوی مجھے سمجھاتی ہے کہ وہ آپ کو پھانس رہی ہے۔ ایسی لڑکیاں خوش حال مردوں کو پھانس کر انھیں بلیک میل کرتی ہیں۔

جیسے لوٹتی ہیں
میں بیوی کی بات سن کر خاموش ہوجاتا ہوں۔ مگر میرا دل نہیں مانتا، بار بار اندر سے یہ آواز آتی ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو، یہ لڑکی کھری ہے، نکھری ہے، بالکل کندن ہے۔۔۔۔

چنانچہ دوسرے دن میں مقررہ وقت پر اس کے دفتر کے صدر دروازے پر جا کھڑا ہوتا ہوں اور انتظار کر رہا ہوتا ہوں کہ ابھی وہ دن بھر کی محنت کے بعد دفتر سے نکلے گی تو بوڑھی ہو چکی ہوگی اور میں اسے پہچان بھی نہیں پاؤں گا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ دن بھر کی کڑی مشقت کے سبب ہی اس کی رونق لٹ جاتی ہے۔

مگر ایسا نہیں ہوا، جب وہ دفتر کی سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اتری تو وہ اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کھیت میں ہل جوتنے والے کسان کی طرح دمک رہا تھا جیسے ہیرا دمکتا ہے۔

وہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے من میں سنسناہٹ جاگی۔ میری بیوی کی قیاس آرائی ۔۔۔۔۔۔۔۔

میں ذرا محتاط ہوگیا، (کیونکہ آدمی کا لاشعور جتنا ایماندار ہوتا ہے اتنا ہی بے ایمان بھی)

"چلئے" اس نے میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا "پہلے کینٹین میں چائے پی لی جائے۔"

وہ خاصی بے تکلف ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے ساتھ چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ لڑکی اتنی بے باک کیوں ہے؟

مگر مجھے اس سوال کا جواب اندر سے نہیں ملا۔ چائے ختم ہوگئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوہ نکالا، اس میں دس دس کے نوٹ تھے۔ لڑکی نے جلدی سے بٹوہ چھین کر میری جیب میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا، مگر وہ بدستور بے تکلفی سے ہنستی رہی گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی پھر لڑکی نے اپنے پرس سے چند آنے پیسے نکالے اور کینٹین والے لڑکے کو دیکر مجھے لئے باہر چلی آئی۔

اب میں یہاں سے بازار کی سمت چلتی ہوں۔ جہاں مجھے رات کے لئے آٹا خریدنا ہے۔ پھر سبزی، پھر چنے، چینی، تیل۔۔۔۔

آٹا، پھر سبزی، چنے کی دال تیل ۔۔۔۔۔ زندگی کا پہیہ انھیں اجناس کے بل بوتے چلتا ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی مر جائے۔ وہ خوبصورت لڑکی جو ساری کائنات کا حسن سمیٹے میرے آگے آگے چل رہی تھی کتنی اچھی ہے۔ میری عمر سے آدھے عمر کی ۔۔۔ میری بیٹی اگر زندہ رہ جاتی تو شاید ایسی ہی نکلتی۔ اتنی ہی بڑی۔۔۔ایسی ہی خوبصورت۔۔

مگر ذہن اس سچائی سے پرے بھی دیکھتا ہے۔ میں اپنی عمر سے بیس پچیس برس کم ہوجاتا ہوں اور اب کے اس حال میں جو مستانہ وحشی نظر آتی ہے وہ کوئی اور چیز ہے۔ کولہوں میں چلتے ہوئے جو مضبوط ٹیلے ہیں ان پر میری اپنی کشتی مطلب ہے۔ کشتی حیات ڈوبتی ابھرتی نظر آتی ہے۔ اور میں گلے تک پانی میں ڈوبا ہوا کھویا ہوا چلا جارہا ہوں کہ کائنات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ ماضی حال بن جاتا ہے اور سچائیاں کئی رنگ آمیزی کے باعث کوئی تڑپتا ہوا قتل کر دینے والا، لوٹ لینے والا تبسم۔۔۔

میں اسی وقت وہ لڑکی پلٹ کر میری طرف دیکھتی ہے۔ اور ذرا افسردگی سے دریافت کرتی ہے۔ دیکھا آپ نے ۔۔۔؟

"ہاں ۔۔" میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ پایا تھا تو بس اتنا کہ دنیا پیچھے کی طرف بھاگی جارہی ہے۔ سرپٹ اور اس کے ساتھ میں خود ۔۔۔۔

"کیا؟"

"یہی کہ تم بہت اچھی ہو، بڑی خوبصورت۔۔۔"

"اوہو بابا، چھوڑیئے نا میری خوبصورتی کو۔۔۔" اس نے لاپرواہی اور قطعی اطمینان سے جواب دیا۔۔۔ "آپ نے دیکھا نہیں جب میں نے بنیئے سے آٹے کا بھاؤ پوچھا تو کل کے مقابلے میں آج اس نے کیلو میں دو آنے زیادہ بتائے"

"ہاں ہاں سنا تھا میں نے"

"تو بس دیکھا نہیں اسی دم میرے چہرے کی خوبصورتی اور باہوں کی رونق آپ سے آپ گھٹ گئی،"

میں نے دیکھا واقعی اس کے چہرے کا رنگ پھیکا ہو چکا تھا، اور باہیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔

بس اسی طرح آپ دیکھتے چلئے۔ میرا تھوڑا تھوڑا سب میں بٹ جائیگا کچھ بنیا کی دکان پر کچھ سبزی والے کے پاس۔ کچھ تیل چنے نمک والے کے سامنے۔۔

وہ ایک بار مسکرائی، وہی قاتل، جان لیوا تبسم۔۔۔۔ مگر ولیسا نہیں محسوس ہوا کچھ اور لگا۔ وہ آگے بڑھ گئی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اور دفعتاً مجھے یاد آیا۔ یہ فیصلہ کون کرتا ہے کہ مونالیزا کی مسکراہٹ میں۔۔۔۔ ایک جوان عورت کا قتل کر دینے والا منصوبہ پوشیدہ تھا۔۔۔ کہ ماں کی مامتا تھی۔ ریونارڈ مل جاتا تو میں پوچھ لیتا۔

ویسے اس عجیب تبسم کی وضاحت مختلف معنوں میں ہوتی رہی ہے۔

جب وہ میرے دروازے کے قریب آچکی تو اس نے میرا شانہ جھنجھوڑنے کے انداز میں پوچھا، میں خیالات کی دنیا سے چونکا

اور اب دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ یہ تو کوئی اور تھی اتنی بوڑھی، اتنی بد صورت اور اتنی ہی لٹی ہوئی۔

میں اپنی بیوی کو ساری باتیں بتا چکا تو تعجب سے اس کا منہ کھلا رہ جاتا ہے کچھ دیر تک وہ چپ رہتی ہے۔ تعجب، تعجب، تعجب کتنے ہی لمحے گذر گئے۔ اچانک چونک کر پوچھتی ہے۔

"پھر رات بھر میں ....."

"ہاں، رات بھر میں اس کے پاس بہت سا اثاثہ جمع ہو جاتا ہے....

جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے مجھے اپنے شوہر سے ملایا۔ جو اپاہج ہے۔ اپنے تینوں خوبصورت بچوں سے ملایا جو کچے فرش پر ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھائے لکھ پڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی ایک بچہ اچھل کر ماں سے لپٹ گیا۔ اس کی گردن میں باہیں ڈال اور ٹھیک بچوں کے انداز میں ٹھنکنے لگا۔ ہوں ہوں ...... ماں میری گیند؟

پھر دوسرے بچے نے بھی ایسا ہی کیا۔ ماں میرا جھنجھنا؟

پھر تیسرا بھی منمنایا' اور میری کتابیں!

ذرا پیسے بچنے دو، پہلے تمہارے بابا کے پاؤں کی دوائیں آئیں گی پھر آجائیں گے جھنجھنا بھی، گیند بھی کتابیں بھی۔ ذرا دم لو، تمھارے بابا کے پاؤں ٹھیک ہوتے ہی وہ کام پر جانے لگیں گے۔

پھر میں نے دیکھا۔ وہ آدمی تڑپ کر رہ گیا، گویا یہ سچ ہے، یہ سچ ہے کہ میں کام پر..... میرے پاؤں ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ہاں ہاں ضرور، پھر یہ مہنگائی بھی کم ہوگی، کم ہوتی جائے گی....."

اس کے مایوس چہرے پر سیاہیاں کھلنے لگیں۔

"پھر میں نے دیکھا اس کے بچوں کے چہرے پر بھی نور بکھرنے لگا عین اسی وقت وہ لڑکی مجھے جھنجھوڑتی ہے ..."دیکھا بابا ...."

"کیا؟" میں پلٹ کر پوچھتا ہوں، پھر اس لڑکی کی طرف دیکھتا ہوں... واقعی، یہ تو وہی پہلے والی خوب صورت سجی سجیلی ......

میں یہ سب کہتا جا رہا ہوں ... میری بیوی انہماک سے سنتی جا رہی ہے اور سمے کا سبک بہاؤ جاری ہے۔ پل، چھن لمحہ، گھنٹہ ...... وقت ... وقت

"مگر وہ وقت کب آئے گا؟" اچانک میری بیوی پوچھ لیتی ہے "جب اس کے پتی کے پاؤں ..... اس کے بچوں کے کھلونے کتابیں ... کب مہنگائی کم ہوگی"۔

دفعتاً میں چونک اٹھتا ہوں، میری بیوی کے سوال بظاہر بہت معمولی ہیں، مگر اندر اترنے ہی تھاہ نہیں لگ رہی ہے۔ واقعی وہ وقت کب آئے گا۔ میں بہت دیر تک سوچتا ہوں، صبح دوپہر شام، دن رات، ہفتوں مگر جواب نہیں سوجھتا۔ بہت دیر تک میری بیوی ٹکٹکی لگائے میری جانب دیکھتی رہتی ہے۔ جب مجھ سے کوئی جواب نہیں بنتا تو میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں

"دیکھو، میں تو نہیں بتا سکتا، کہ مجھے خود پتہ نہیں، البتہ کل میں شہر کے کسی عالم، کسی سیاست داں کسی نجومی سے مل کر ضرور معلوم کروں گا پھر تمہیں بتاؤں گا۔ ضرور ضرور ......"

رتن سنگھ

تین افسانے

پہاڑی لڑکی

پہاڑی لڑکی تقریباً دس قدم اوپر ہمارا سامان اپنے سر پر اٹھائے رک گئی ہے اور میری طرف مسکرا دیکھنے کے بعد میرے پیچھے آرہی میری منگیتر کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کر اس کی ہمت بڑھا رہی ہے

اس معمولی نقش نین والی لڑکی کے چہرے پر اس وقت سورج کی کرنیں پڑ رہی ہیں۔ اور اس دھوپ نے اس کے مخنتی چہرے کے معمولی خدوخال کو بھی ایسی خوبصورتی عطا کر دی ہے کہ دل کرتا ہے کہ ایک دفعہ قریب جا کر بس لڑکی کے حسن کا نظارہ کیا جائے۔

لیکن اس لڑکی کے قریب جانا میرے لئے اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ مجھ سے دس قدم اوپر ہے اور تھکاوٹ کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔ سانس پھول رہی ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے میرے سینے میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہوں۔ پاؤں پہلے ہی پتھر ہو کر رک چکے ہیں۔ اس لئے میں اپنے ذہن سے اس لڑکی کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کو جھٹک کر پیچھے آرہی اپنی منگیتر کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ اب بھی مجھ سے دس قدم پیچھے ہے۔

اس کے چہرے پر بھی دھوپ اسی طرح پڑ رہی ہے اور اس دھوپ نے اس کے پیلے چہرے کو اور بھی زرد کر دیا ہے۔ نقاہت کے مارے اس کی بری حالت ہے اور ہر قدم پر وہ رک رک جاتی ہے۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے بھی مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ ہلائے ہیں، لیکن لگتا ہے جیسے اس میں مسکرانے کی بھی سکت باقی نہیں رہی۔ اس لئے اس کی مسکراہٹ بے جان، پھیکی اور پیلی پیلی سی لگی ہے۔ یہی لڑکی پہاڑ پر چڑھنے سے پہلے تک میرے لئے بڑی خوبصورت اور دل کش تھی لیکن ذرا سی محنت پڑنے پر جیسے اس کے جسم کی ساری قلعی اتر گئی ہے۔ ساری تڑک بھڑک جیسے جسم سے نچڑ کر بہہ گئی ہے اور باقی پیلے رنگ کا خول ہی بچا ہے جو ڈھانچے کی شکل میں میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی منگیتر کو دیکھ کر میرے دل میں اس وقت کوئی خواہش، کوئی جذبہ نہیں امڈ رہا، لیکن پھر بھی میں اس کے انتظار میں رک گیا ہوں تاکہ اسے ساتھ لے کر آگے بڑھوں۔

جب ہم دونوں آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے اس پہاڑی لڑکی کے پاس پہنچے تو اس نے میری منگیتر کی ہمت بندھائی۔

"وہ سامنے رہا ڈاک بنگلہ بی بی جی۔ بس اب تو صرف پانچ منٹ کی بات ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگی۔

پھر بھی پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ پانچ منٹ کا سفر اس پہاڑن عورت نے تو غالباً تین منٹ میں ہی طے کر لیا۔

میں نے اسے دس منٹ میں ختم کیا

اور میری منگیتر نے پندرہ منٹ میں۔ اور وہ بھی تب جب وہ پہاڑن لڑکی اپنے سر کا بوجھ گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں رکھ کر کودتی پھاندتی گئی اور میری منگیتر کو اپنے مضبوط ہاتھوں کا سہارا دے کر اوپر لائی۔

تھوڑا آرام کر لینے کے باوجود میں نے دیکھا کہ میری منگیتر کا چہرہ اسی طرح پیلا اور بے رونق تھا اور اس کے برعکس اس پہاڑن مزدور لڑکی کا چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ بار بار پسینہ پونچھنے کے لئے اپنے چہرے پر دوپٹہ پھیرتی تو جیسے اس کے کندن سے چہرے پر چمک کی نئی پرت چڑھ جاتی۔

میری منگیتر بھی شاید میری طرح اس پہاڑن کی صحت اور اس کے چہرے کی چمک سے متاثر تھی، اسی لئے اسے اپنی مزدوری کے پیسے انگلیوں سے گنتے دیکھ کر میری منگیتر کو جیسے اپنی برتری جتانے کا موقع مل گیا۔

"ارے تم اتنا بھی نہیں پڑھی ہو کہ اپنے پیسے ٹھیک سے گن سکو۔"

"کا بتاؤں بی بی جی! قسمت ہی خراب تھی" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے لال رنگ کی ہتھیلی پر پھیلے ہوئے سکوں کو پھر سے انگلیوں پر گننے لگی۔

نہ جانے یہ اس کی ہتھیلی پر پھیلی ہوئی رنگت کا اثر تھا یا اس کے چہرے پر چمکتے ہوئے زندہ حسن کا اثر کہ میرے دل میں ایک بار یہ زبردست خواہش

پیپیا چھوڑتی کہ اس کمزور پیلے ... کی نازک اندام منگیتر کو چھوڑ کر اس صحت مند دہقنی پہاڑن سے اپنی شادی کی بات طے کر لوں۔
لیکن پیشتر اس کے کہ میری خواہشیں الفاظ بن کر میری زبان پر آتے، وہ لڑکی اپنی مزدوری کے پیسے اپنی جیب میں ڈال کر نیچے پہاڑی راستے میں غائب ہو چکی تھی۔
وہ میری بات سننے کے لئے رکتی کیسے؟ اس نے تو خود ہی کہا تھا کہ اس کی قسمت خراب ہے۔
اور اب دور ڈھلان پر نیچے کی طرف جاتے ہوئے، اس نے پہاڑی گیت چھیڑ دیا ہے۔ میرے کان اس آواز کو میرے وجود میں بھر رہے ہیں۔ اور میں خالی خالی نظروں سے اپنی منگیتر کے زرد چہرے میں کوئی حسن کوئی کشش ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایسا حسن جو محنتی ہتھیلی کی طرح لال ہو اور جس میں اتنی ہمت ہو کہ گیت کی تان بن کر میری عمر کی گھاٹی پر ٹھنڈے میٹھے بادلوں کی طرح چھا سکے۔
لیکن وہ سنگیت تو دور ہوتا جا رہا ہے۔ اور دور۔
میری قسمت بھی تو خراب ہے۔

تیسرا حادثہ

بہت ہی اچھا سپنا دیکھا تھا اس نے، اور اس پر سپنے کا اتنا اثر تھا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس وقت بھی دراصل وہ سپنے کی دنیا میں ہی سانس لے رہا تھا۔
سپنے کی دنیا اتنی حسین، اتنی خوبصورت اور دلکش اور خوش کرنے والی تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ یہ سپنا کبھی نہ ٹوٹے۔ وہ ساری زندگی سویا رہے اور سپنا متواتر چلتا رہے۔
اسی لئے اس نے سونے کی کوشش میں آنکھیں پھر بند کر لیں تاکہ سپنے کی دنیا پھر سے پیدا ہو سکے۔ لیکن نیند نہ آئی۔ اس نے کئی کروٹیں بدلیں۔ اس انداز میں لیٹا جس طرح لیٹنے میں اس کو راحت ملتی تھی اور جلدی نیند آ جاتی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو چادر سے بھی ڈھانپا۔ لیکن سب کوششیں بیکار گئیں۔ نیند نہیں آنی تھی نہ آئی۔ اور سپنا، پھر حسین سپنا شیشے کے رنگ محل کی طرح ہوتا ہے جو ایک دفعہ ٹوٹتا ہے تو پھر دوبارہ نہیں بنا کرتا۔ اور جو لوگ اسے دوبارہ بنانے کی کوششیں کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں ان کے پاؤں میں ان کے جسم کے انگ انگ میں شیشے کی کرچیں درد بن کر چبھتی ہیں اور ان کی زندگی لہو لہان ہو جاتی ہے
اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔۔۔
۔۔۔ وہ جاگتے ہوئے آنکھیں بند کر کے سپنے کی کڑیوں کو ملانے لگا۔۔
وہ ایسی دنیا تھی جو اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس دنیا میں کب داخل ہوا، وہاں کیسے پہنچا، یا سپنا کیسے شروع ہوا، کہاں سے شروع ہوا اس بات کا سرا پکڑنا دشوار تھا۔ پھر بھی اپنی یادداشت کے سہارے سپنے کی جو تصویر اس نے دوبارہ مرتب کی اس کی شکل کچھ اس طرح کی تھی کہ بہت ہی خوبصورت باغ ہے، جس کے پیڑ اور پودے پھولوں اور پھلوں سے لدے ہیں۔ اس کے بیچ میں ایک رنگ محل ہے اور اس محل میں وہ جس طرف جاتا ہے، جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، وہاں زندگی کی مسرتیں اور راحتیں پری جمالوں کی طرح جھک کر اسے سلام کرتی تھیں جب وہ رنگ محل سے باہر قدم رکھتا ہے تو وہی خوشیاں مخملی گھاس کی طرح اس کے قدموں میں بچھ جاتی ہیں اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اسے بہت سا سونا چاہیئے اور اس کی نظر جیسے ہی اٹھتی ہے سامنے والا پہاڑ سونے کا بن جاتا ہے۔ اسے جواہرات کی خواہش ہوتی ہے تو پیڑوں پر لگے ہوئے پھل اور پھول، جواہرات میں تبدیل ہو کر، اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتے ہیں۔ اس کا سیب کھانے کو دل کرتا ہے تو جنت کے سیبوں سے بھری ہوئی سونے کی تھالی فضا میں تیرتی ہوئی اس کے سامنے حاضر ہو جاتی ہے۔
یہاں تک ہوتا ہے کہ بھری دوپہر کے وقت اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ اس وقت رات ہو جائے، تو اسی وقت اندھیرا چھا جاتا ہے اور آسمان پر چاند اور ستارے چمکنے لگتے ہیں۔ ایسے میں اسے نیند کی خواہش ہوئی تو جس حالت میں کھڑا تھا، اسی میں اسے گہری نیند آئی جیسے نرم و گرم بستر میں دبک کر سو رہا ہو۔
کہاں تو یہ عالم تھا سپنے میں۔ اور اب وہ ہزار کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح نیند آ جائے۔ لیکن نیند جیسے کوسوں دور تھی اور یہ جاگنا اس کی آنکھوں میں کانٹے بن کر چبھ رہا تھا جب وہ اس چبھن کے درد سے بے حد بے چین ہو گیا، اور سپنے کی دنیا ٹوٹتے ہوئے شیش محل کی طرح اس کے تصور سے نہ ہٹ سکی تو وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
اسے جاگا ہوا دیکھ کر اس کی بیوی اس کے پاس رکھے سٹول پر چائے کا ایک پیالہ رکھ گئی۔ بغیر ڈنڈی اس پیالے کے نیچے طشتری نہیں تھی۔ اور پیالے کے منہ پر جگہ جگہ کرچیں نکلی ہوئی تھیں۔ پیالے کو دیکھ کر اسے لگا کہ کہیں یہ ٹوٹا ہوا پیالہ اس کے ہونٹوں کو زخمی نہ کر دے۔ اسی لئے شاید سپنے کے ہی زیر اثر اس کے دل
امکان

میں بڑی معصومیت اور صاف سیدھے طریقے سے چندر سنگھ کے سامنے وہ بات کہہ دی تھی۔ لمحے بھر کے لئے چندر سنگھ سناٹے میں آ گیا تھا۔ اُس نے بالے کو نکال باہر کرنے کے لئے سوچا۔ لیکن پتا نہیں بالے میں کون سی قوت گھس آئی تھی کہ چندر سنگھ کی ساری دلیری اور اکڑ ختم کر گئی تھی۔ اُس روز بھی اُس نے بالے کو برداشت کر لیا۔ یہ اُس کے لئے کڑا امتحان تھا۔ اِس کے بعد بالے کی دوسری باتیں برداشت کرنا کون سا مشکل کام تھا۔

اُس دِن کی بات یوں تھی —

بالے اور چندر سنگھ دیو پور میں کھانا کھایا۔ وہاں چندر سنگھ کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ پھر اُس نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔ "بچو! ایک بوتل تو کیا یہ چندا سالا دو چار بھی چڑھا جائے گا تو کاربوریٹر کے پانی کی طرح نہیں اُچھلے گا۔ سمجھا۔" اُس کے بعد وہ روانہ ہوئے تو آٹھ بج چکے تھے۔ گاڑی کے پیچھے جس طرح دو لال بتیاں روشن تھیں۔ لیکن یہ چندر سنگھ کی آنکھیں تھیں کیبن میں — وہ گاڑی چلانے میں بڑا ماہر تھا۔ اِس لئے بغیر کسی رکاوٹ کے وہ دیو پور سے مرناپور تک آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اُس کی جیب خالی تھی اِس لئے اُس نے گاڑی اڈے پر روک کر بالے کو مال لانے کے لئے بھیج دیا۔ بالے مسافروں کو کھوج ہی رہا تھا کہ ایک عورت آ گئی۔ اگلے گاؤں کی جو پندرہ بیس میل دور تھا۔ اُس نے چلنے کے لئے کہا تو چندر سنگھ نے بالے کو پکار کر کہا۔ "ارے بالے آج کا مال مل گیا۔ واپس آ جا۔"

بالے واپس آیا تو اُس نے عورت کی طرف دیکھا۔ اُس کو عورت کچھ اچھی نہیں لگی۔ ایسی عورتیں اکثر لاری اڈوں پر ڈرائیوروں کی کھوج میں پھرتی تھیں۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ عورت بھی اُنہیں میں سے ایک ہے۔ لاری چل پڑی۔

جب گاڑی گاؤں سے کافی دور سنسان جگہ پر پہنچی تو چندر سنگھ نے بالے سے کہا۔ "تو جا اُوپر سو جا۔ تھوڑی دیر بعد چلیں گے۔" بالے نے چندر سنگھ کی طرف دیکھا نہیں۔ لیکن دوسرے کلینروں کی باتیں اُس کے ذہن میں گھوم گئیں۔ کل ہی چڈھا نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا استاد بیچ جنگل میں گاڑی روک کر کیبن میں ہی ایک عورت سے دھینگا مشتی کرتا رہا اور وہ اوپر والے باریک ہول سے دیکھتا رہا۔ بالے نے کہا — "استاد ریجک روٹی کی جگہ ایسا نہیں کرنا۔" چندر سنگھ کی آنکھیں لال تھیں ہی اُن میں اور خون اتر آیا۔ اُس نے بالے کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ "ابے او... بھڑ کے لونڈے تجھے کتنی بار کہا میرے رستے مت چل۔ سالے۔ جا اوپر سو جا۔"

بالے نے کہا۔ "اُستاد من من کی بات ہوتی ہے۔ چڈھا کا استاد ایسے ہی کرتا تھا۔ کل اُس کا کیا ہوا۔ میں تو جانتا ہوں اوپر۔ لیکن تو گاڑی چلا میری بات مان لے۔"

یہی وہ وقت تھا جب چندر سنگھ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ اُس چھوکرے سے پیچھا چھڑا لے اور سکھ دیو کو جیسے بھرے جنگل میں پیٹ کر چھوڑ دیا تھا ویسا ہی اِس کے ساتھ کرے مگر اُس کی طاقت جواب دے گئی۔ چڈھے کے اُستاد کا حشر اُس کے سامنے تھا یا بالے کی من من کی بات کا اثر تھا کہ اُس نے گاڑی نیوٹرل کر کے اسٹارٹ کر دی اور تھوڑی ہی دیر بعد ٹاپ گیر میں گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اسے جتنا غصہ آیا تھا اتنا اُس نے ایکسیلیٹر پر اُتار دیا۔

اُس عورت کو بھی بالے کی بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ وہ بار بار ایسی حرکت کر رہی تھی کہ بالے اپنی جگہ سے ہٹ ہٹ جاتا تھا۔ ایک بار تو چندر سنگھ نے اُس کو ہاتھ سے پرے ڈھکیل کر کہا۔ "سالے یہاں کہاں گھسا چلا آ رہا ہے اپنی ماں کی بغل میں کیوں نہیں گھستا؟" بالے کے لئے یہ لمحہ بہت کٹھن تھا۔ لیکن اُسے تو بہت ساری باتیں برداشت کرنے کی عادت تھی۔ ذرا سا سرک کر وہ اسپیڈومیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ اسّی اور نوے کے درمیان سوئی جھٹکے کھا رہی تھی۔ چندر سنگھ کی پوری توجہ سڑک پر تھی۔ چند ہی منٹوں میں اُس عورت کا گاؤں آ گیا۔ لاری رک گئی۔ وہ اُترنے لگی تو بالے نے کہا۔ "سوا روپیہ دینا بائی جی۔"

اُس عورت نے چندر سنگھ کی جانب یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو تمہارے اندر تو دم ہی نہیں ہے وصول کرنے کا۔ ایسے وقت چندر سنگھ کی مردانگی پھر طرح جاگتی تھی۔ لیکن آج بالے نے اُسے تھپک تھپک کر سُلا دیا تھا۔ اُس کے چند لفظوں میں اتنی طاقت تھی کہ چندر سنگھ ساری مردانگی گروی رکھے چپ بیٹھا رہا۔ اُس عورت نے بالے سے کہہ دیا۔ "تیرے اُستاد سے کہہ دے میرے گھر آ کر وصول کر لے۔" بالے بھونچکا کھڑا رہا۔ دوسرے ہی لمحے چندر سنگھ کی آواز سنائی دی۔ "بیٹھ جا بھوتنی کے۔ آج تیرے ستارے سو کی اسپیڈ میں چار ہے ہیں اور میرے دس کے اِسی لئے تو بچ گیا۔" لاری پھر چل پڑی۔

چندر سنگھ سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اِس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ جب سکھ دیو تھا تب بھی نہیں۔ لاری آگے دوڑ رہی تھی اور وہ پچھلی باتیں سوچ رہا تھا۔ جب سکھ دیو بالے کی جگہ پر تھا۔ بتا کتنا جوان۔ کبھی لاری اسٹارٹ نہیں ہوتی تھی تو اکیلے ہی لاری ڈھکیل کر اسٹارٹ کرا دیتا تھا — چندر سنگھ کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات تھی۔ آگے کیبن میں پانچ چھ مسافر بیٹھے تھے کہ ایک جگہ ایک عورت نے ہاتھ بتایا۔ اُس نے گاڑی روک لی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ عورت اُس کے پاس بیٹھے پر جگہ نہ تھی اور پہلے سے بیٹھے ہوئے مسافروں کو اُتارنا اچھی بات نہیں تھی۔ اِس

لے۔" اس نے سکھ دیو سے کہا۔ "اس مال کو اوپر ڈال لے۔" سکھ دیو نے ہاتھ بڑھا کر اس عورت کو اوپر کھینچ لیا۔ ادھر لاری چل پڑی تو ادھر سکھ دیو کے ہاتھ بھی چل پڑے۔ جب وہ گاڑی کی طرح اس عورت کو چیکا چکا تو اچانک گاڑی رک گئی۔ سب مسافر اتر گئے تو چندر سنگھ نے آواز لگائی "ارے سکھ دیو اس بھوتنی کو ادھر بھیج دے کیبن میں۔" اس وقت سکھ دیو بس ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھنے جا ہی رہا تھا کہ اسے یکدم بریک لگانے پڑے۔ اچانک آواز کا جواب سن پاکر چندر سنگھ نے کیبن کی کھڑکی میں جھانکا تو وہ عورت کھڑی بے بس تھی اور سکھ دیو گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ لیکن اس نے گھبراہٹ پر قابو پاکر کہا "استاد چلنے دو گاڑی۔ روز تو تم کہیں نہ کہیں تیل پانی کر ہی لیتے ہو۔ آج میں بھی ادھر ہاتھ لگ کر لوں۔"

چندر سنگھ دھم سے اوپر کو دا۔ ایک دھپ سکھ دیو کو جمائی۔ سکھ دیو نے کہا "دیکھو استاد گاڑی کی حفاظت کرنا۔" لیکن چندر سنگھ کب سننے والا تھا۔ سکھ دیو کو نیچے اترنے کا کہہ کر خود بھی نیچے اتر آیا اور سکھ دیو کو روئی کی طرح دھن ڈالا۔ وہ استاد استاد کہتا ہی رہ گیا۔ پھر چندر سنگھ نے اس عورت کو کیبن میں بٹھا لیا تھا اور لاری اسٹارٹ کر دی تھی۔ چند میل تک جلد ہی پہنچ کر اس نے لاری روک دی تھی۔ قریب ہی ایک جوہڑ تھا جہاں اس نے اپنا پٹرول لیا اور خوب ترنگ میں آکر اس عورت کے ساتھ رات گئے تک خوب موج اڑائی تھی۔

چندر سنگھ بالکل اجڈ گنوار تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ رشتے کیا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ضرور تھا لیکن پھر اسے لوگوں کی گالیاں، گھڑکیاں اور تھپڑ چانٹے یاد آتے جو اسے بچپن میں لگے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں، کہاں گئے؟ زندہ ہیں بھی یا مر گئے؟ لوگوں نے اسے بتایا ہوا تھا کہ ایک ہی دھرتی کے جب دو ٹکڑے کر دیئے گئے تو اس کے نتیجے میں اس کے ماں باپ کہیں کھو گئے۔ کسی ہمدرد آدمی نے اس کو پال لیا اور زندگی کی سختیاں جھیلنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اور یہی سختیاں اس کے لئے معاون ثابت ہوئی تھیں کیونکہ سختیاں جھیلنے کے نتیجے میں اس کا جسم پتھر کا بن گیا تھا۔ سو یہ بھاری لمبا چوڑا۔ اسی گروبل کی وجہ سے وہ ڈرائیور بنا تھا۔ جس چھوٹے سے قصبے میں وہ پل رہا تھا وہاں کے ایک زمین دار کی لونڈیا نے اسے تاک لیا تھا اور جب زمیندار کو اس کا علم ہوا تو وہ چندر سنگھ کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے وہ بھاگا تھا اور کلینر کا کام کرنے لگا تھا۔ اسی لئے وہ بالے کو برداشت کرتا تھا۔ اسے اپنی ابتدائی زندگی یاد تھی۔ بالے اس کی زندگی کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ بالے کو اسی دن ملا تھا جس دن اس نے سکھ دیو کو رات میں پیٹ کر جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔ اور اس عورت کی کمر پر ایک لات رسید کر کے اسے گاڑی کے نیچے ڈھکیل کر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر اوندھا سیدھا پڑ رہا تھا۔ صبح ہونے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے بھاری پلکیں کھولیں تو اسے بھی بالے دکھائی دیا جو لاری چمکا رہا تھا۔ میلے چکٹ پھٹے ہوئے کپڑوں سے اس کا جسم جھانک رہا تھا۔ چندر سنگھ کو کیبن سے نکلتے دیکھ کر اس نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بالے نے ایک بالٹی پانی لا کر چندر سنگھ کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھوئے تو ذرا ہوش آیا۔ پھر اس نے بالے سے پوچھا تھا کہ وہ یہاں کیسے آیا!

بالے نے جواب دیا۔ "ایک لاری پر کام کرتا تھا۔ لیکن ڈرائیور نے پتا نہیں کیوں صبح سویرے سے یہاں چھوڑ دیا اور چلا گیا۔ یہ لاری نظر آئی تو میں ادھر آ گیا۔"

"کام کرے گا؟" چندر سنگھ نے پوچھا تھا

کام نہیں کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے۔ اس دنیا میں تو میرا صرف کام ہی ہے۔"

"یعنی تیرے ماں باپ کوئی نہیں؟"

"کوئی نہیں۔ نہ گھر نہ ٹھکانا۔"

چندر سنگھ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "چل بیٹا تو تو اپنا جوڑی دار دکھائی دیتا ہے۔ اپنا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں۔"

تب سے ہی بالے اور چندر سنگھ ساتھ ساتھ تھے۔

بالے نے اس دن چندر سنگھ کی مردانگی کو بقول چندر سنگھ ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد کئی دن تک وہ بالے سے ٹھیک طرح بات نہیں کرتا رہا تھا۔ اس نے بالے کو بہت ساری گالیاں دی تھیں۔ لیکن بالے خاموش سر جھکائے اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ ایک رات جب چندر سنگھ دو بوتل چڑھا گیا تو اس نے بالے سے کہا۔ "آج تجھ کو بتانا پڑے گا کہ تجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ اپنے استاد کو ٹوک دے۔"

بالے نے دھیرے دھیرے کہا۔ "استاد میں ایسی ہی کسی رات کا بیج ہوں جو تیرے جیسے کسی ڈرائیور نے میری ماں کی کوکھ میں بو دیا تھا۔ پھر میری ماں بھی مجھے چھوڑ کر مر گئی۔ اب میں بے باپ کا بے سہارا بچہ ہوں، جو لوگوں کی گالیاں جھڑکیاں سختیاں جھیلتا ہے۔ تجھے تو معلوم ہی ہے کہ بے سہارا بچوں پر لوگوں کی سختیاں کیسی ہوتی ہیں؟ میں نہیں چاہتا کہ تیرا بیٹا بھی میری طرح زندگی بتائے۔ گالیاں کھائے اور کوئی آدمی اسے پکڑے اور وہ چلائے اور انکار کرے تو اسے بیچ جنگل میں چھوڑ کر چلا جائے۔ تو یہ سب اپنے بچے کو دینا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں تجھے نہیں ٹوکوں گا۔"

بالے کی باتیں سن کر چندر سنگھ کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور وہ بالے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ بالے کو نہیں بلکہ سڑک کو دیکھ رہا ہو کہ کہیں گاڑی ادھر ادھر نہ ہو جائے

علی امام نقوی

رام بجار

چو۔کھٹے پر موجود دکانوں کی پٹیرھیوں پر بیٹھے ہوئے کچھ دکانداروں نے شمالی سمت سے اپنے ہم جنسوں کے سہارے رام بجار کو گھسٹتے دیکھا تو تاسف کا شدید احساس ان کے دلوں کو برما گیا۔ کسی نے سوچا ہی نہ تھا کہ رام بجار اتنی جلد بے دست و پا ہو جائے گا۔

کل جب وہ جھومتا ہوا کسی گلی یا کوچے سے برآمد ہوا کرتا تھا تب دیکھنے والے آنکھوں ہی آنکھوں میں احترام کا جذبہ لئے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہ کچھ اس کی نذر کرتے، وہ بھی خاموشی سے بلا کچھ کہے، بلا کچھ سنے یا شاید سب کچھ سنے، لیکن بلا کچھ کہے ان کے نذرانے قبول کرنے کے بعد اپنی ڈھیڈ بھری آنکھوں سے نذرانے گذارنے والوں کو تشکر آمیز انداز میں دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ دو چار قدم چلنے کے بعد وہ پھر کسی دکان کے سامنے پہنچ کر رکتا، اپنی تمام ترنا سمجھی کے باوجود وہ یہ تو جانتا ہی تھا کہ میں جس دکان یا جس مکان کے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا، وہیں میری ضرورت پوری ہو جائے گی۔

جب اس کا میٹھا کھانے کو جی چاہتا وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا رشید حلوائی کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ رشید اسے دیکھتا، مسکراتا اور مٹھیوں میں بتاشے بھر کر اس کے سامنے کر دیتا۔ کچے چنے چبانے کی خواہش دل سے ابھر کر جبڑوں کے مثلث میں برق رو کی مانند دوڑتی تو وہ اپنی مخصوص چال چلتا ہوا چوکھٹے کی بائیں سمت مکٹ لال کی دکان پہ رکھی چنے کی دوری کے سامنے سرنیہوڑا کر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ مکٹ کے لونڈے خوب جانتے تھے کہ وہ کچے چنے چبانے کی آرزو لئے آیا ہے۔ لہٰذا فوراً ہی اندر سے بھوسی ملے چنے چھاج میں بھر وہ اس کے سامنے کر دیتے۔ جبڑوں کے مثلث میں دوڑتی خواہش کی برقی لہر کے تھمتے ہی وہ منہ پھیر لیتا تو تیلی کی گھانی کے پاس جا کھڑا ہوتا، تھوڑی سی کھل کھاتا۔ یا پھر چوکھٹے پر نصب پنچایتی نل پر کھڑے ہو کر سر ہلانے لگتا۔ کوئی راہ گیر نل کے گرد بنی ہودی میں پڑے ٹاٹ کے ٹکڑے سے پانی کے نکاس کی راہ بند کرنے کے بعد نل چلانے لگتا۔ دس پندرہ ہاتھ چلانے کے بعد پانی کے جمع ہوتے ہی وہ سر جھکا کر اپنی پیاس بجھاتا۔ پھر اپنا سر اٹھا کر دائیں بائیں سے ہٹ کر کسی کھیت کی ڈول پر کھڑے کھڑے اپنے بھائی بندوں کو کڑی محنت کرتے دیکھتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کے بھائی بند کڑی محنت کے دوران پل دو پل رک کر اس کی طرف دیکھتے، جیسے آنکھوں کی زبان سے کہہ رہے ہوں

" دیکھو، ہم بھی تمہارے ہی جیسے ہیں! تمہارے اپنے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر تم اتنے مقدس ہو گئے کہ لوگ تمہارا احترام کرنے لگے۔ بلا کسی محنت، بلا کسی مشقت، تمہارے کھانے پینے کا انتظام کر دیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں دن بھر کی کڑی محنت کے بعد صرف کونڈ بھر سنی میسر ہوتی ہے "۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس سے آگے کی باتیں اس کے بھائی بند نہ تو کہہ پاتے تھے اور نہ یہ سن پایا کرتا۔ سٹراپ کی ایک آواز بلند ہوتی، سونٹا اس کے بھائی بندوں کے چوتڑوں پر پڑتا وہ جھٹکے لے کر آگے بڑھ جاتے، اسی سمے کسی کا دایاں ہاتھ بڑھتا۔ اس کے شریر سے مس ہوتا اور پھر ہونٹوں پر پہنچ کر رک جاتا، ہونٹ سکڑتے، پچکاری کی ہلکی سی آواز دہن سے خارج ہوتی اور سر جھک جایا کرتا۔

چوکھٹا، کسی کھیت کی ڈول، دستی نل کی ہودی، اور کسی کنویں کی من اس کی زندگی کے روزان ہی چار منزلوں سے وابستہ تھے۔ اور شب، چوکھٹے پر موجود نیم کے زیر سایہ شیر نائی کی دکان کے چبوترے پر گزرتی۔ روز صبح دکان کھولنے سے پہلے شیر نائی اسے برا بھلا ضرور کہتا کیونکہ اس کے چبوترے پہ اجابت کرنا بھی رام بجار کے معمولات میں شامل تھا۔ شیر نے کئی مرتبہ چوکھٹے

---

[1] وہ منتی بیل جو بھگوان کے نام پر چھوڑا جاتا ہے۔! ع۔ا۔ن

سے دکانداروں سے دبے الفاظ میں درخواست کی کہ مجھے اس عذاب سے نجات دلائی جائے، لیکن سبھی نے اس سے معذرت چاہی اور سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ پر واقعتاً وہ سب مجبور بھی تھے۔ اس پر کسی کا کوئی بس ہی نہ تھا۔ تقدس کا جو ہالہ اُس کی پیدائش کے فوراً بعد مالک نے اس کے گرد قائم کر دیا تھا۔ وہی سب کی مجبوری کا باعث تھا۔ ویسے چرب زبان دکان داروں نے مشیر کو ایک مشورہ متفقہ طور پر دیا
"میاں تجھے تو رام بجار کا آبھاری ہونا چاہیئے' ایندھن کا خرچہ کم ہوئے ہے"
"لالہ جی۔ داڑھی منڈتے سب دیکھ لیویں ہیں مونچھیں بڑھتی کوئی نا دیکھیا"
وہ کلس کر جواب دیتا۔ اور بالٹی اٹھا کر نل کی طرف بڑھ جایا کرتا'
بلاناغہ چبوترے کی صفائی کے عذاب سے تنگ آکر ایک روز اس نے محکمہ صحت کے صفائی کے شعبے میں جا کر شکایت درج کروائی۔ کلرک نے خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے شکایت درج کی اور جب وہ لوٹنے لگا تب چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا
"رپٹ تو منے لکھ لی۔ پر ہونا کچھ نئیں"
"بھلا کیوں باؤجی ؟"
"ارے پگلے۔ وہ رام بجار ہے۔ وہ کسی کو کچھ نہ کرنے دیتے کا"
کلرک کی بات سن کر مشیر نے اس کے سامنے خود اپنی ماں سے رشتہ جوڑا' اور مزید اول فول بکتا وہ باہر چلا گیا۔
برسوں اس عذاب کو برداشت کرنے کے بعد پچھلے چند دنوں سے اُس نے جب چبوترے کو غلاظت سے محفوظ پایا تو خود اس کی آنکھیں بھی اسے تلاش کرنے لگیں، آتے جاتے، گلی، کوچے، ہٹے، چوکھٹے
آخر وہ گیا کہاں ؟
جانے کس حال میں ہو
"بھیئے ..... تہارا بجار نہ دکھائی دیوے ہے آج کل
ایک روز حجامت بناتے ہوئے اُس نے رام رکھ منہر سے پوچھ ہی لیا
"نکل گیا ہوگا کہیں"
رام رکھ منہر نے مختصر سا جواب دیا۔ اور پھر چوکی پر بیٹھ کر داڑھی منڈواتے وگمبر پرشاد سے چودھری چرن سنگھ کی کسان ریلی پر باتیں کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ بعد جب مشیر نے اس کی گدی پر برش پھیرا تو دس دس کے آٹھ سکے اس کے سامنے ڈال کر وہ چوکھٹے کی طرف بڑھ گیا۔
شام کو مکان کے گھیر میں بیٹھا جب وہ حقہ گڑگڑا رہا تھا تب ٹین کے کھلے دروازے کے وسط میں اس نے اسے دیکھا فیل پا کی مانند پھولا ہوا جو جسم ریگڑ کھانے سے جا بجا چھل چکا تھا اور زخموں سے [illegible] رہا تھا۔ اُس کے کچھ ساتھی اُسے گھسیٹ کر لے آئے تھے اور اب بھی اس کے گرد کھڑے ہانپ رہے تھے۔ رام رکھ منہر کے [illegible] لڑکی نے اسے دیکھا تو چلایا
"بابا۔ مارا' بجار آیا"
"چپکا ہو جا۔ اور جا کے کواڑ بھیڑ یا"
"مگر بابا مارا بجار ....."
"وہ رام بجار ہے للا! اب وہ نہ تہارا ہے گا نہ مارا"
"پر اُس سے چلا نہ جاوے بابا"
"ابے کیوں ٹائیں کر ریا ہے گا۔ جا کے کواڑ جو بھیڑ دے
گھورتی ہوئی آنکھوں اور درشت لہجے سے خوف زدہ ہو کر ترلوکی نے دوڑ کر کواڑ بھیڑ دیئے، پھر سر جھکا کر رسوئی کی طرف بڑھ گیا
صبح پیتل کی لٹیا اٹھائے وہ جونہی دروازے کی طرف بڑھا ٹین کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، چوڑے کھڑے تھے، انگوچھا پھیلائے' اور اُن کے پیچھے رام بجار کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اکڑی ہوئی اور کچھ مزید پھولی ہوئی۔ آنکھیں اس کی اب بھی کھلی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں اُسی مقدس ہالے کی خاطر یہ آخری کام اور کر دو۔

بقیہ: متین افسانے ....

(۵۱ سے آگے)

تھک کر منوں بھاری ہو گئے۔ اور جب اس نے دروازے کے پٹ آہستگی سے کھولے تو مجھے لگا جیسے وہ پٹ پہلے کی طرح میرے لئے کھلنے کو بے چین نہیں تھے۔

آج اس کے پیش کیئے ہوئے چائے کے ٹھنڈے پیالے پر جو بات چیت ہوئی، اُس سے یہ اندازہ ہوا کہ ہم کبھی ہم خیال تھے ہی نہیں۔ ہمارے سوچنے کے طریقے الگ الگ ہیں۔

آج جب میں اُس کے ہاں سے اُٹھنے لگا تو اُس نے رسمی طور پر بھی مجھے تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے لیے نہ کہا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ دوبارہ کب آؤ گے، دوسرے ہی لمحے میں اُس کے گھر کے باہر تھا۔

اُس کے گھر کے باہر آتے ہی راستہ بہت لمبا ہو گیا۔ کتنی دیر چلنے کے بعد کہیں ایک موڑ آیا تھا اور راستے میں ہی میں تھکن کے مارے چور سا ہو گیا تھا۔ ابھی تو گلی کے پانچ موڑ باقی تھے۔ پھر بازار کے کتنے ہی موڑ۔

یہ سب طویل سفر طے کر کے میں اب بس اسٹینڈ پر ایک گھنٹے سے کھڑا ہوں۔ اور بس ہے کہ آتی ہی نہیں۔ جسم کی تھکن کا یہ عالم ہے جیسے میرے گھر تک کا لمبا طویل راستہ بوجھ بن کر میرے سر پر رکھا ہوا اور میرے انگ انگ کو توڑ رہا ہو۔

مصطفیٰ علی اکبر

پوسٹ مارٹم

تھیٹر میں اس قدر بدبو تھی کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ درمیان میں ایک میز پر ایک لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ سارا جسم زخموں سے چور تھا جگہ جگہ چربی نکل آئی تھی اور جلد پھٹی ہوئی تھی۔ دونوں پیر پوری طرح پھیلے ہوئے لیکن ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے سوتے میں کسی نے پیر پر پیر چڑھا لیا ہو۔ ایک ہاتھ تو میز پر ٹکا ہوا تھا۔ لیکن دوسرا ہاتھ اوپر کو اٹھا ہوا اور اس کی تمام انگلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ جیسے بستر پر لیٹے لیٹے کوئی ہاتھ اٹھا کر کسی کو کسی کام سے منع کر رہا ہو۔ لگتا تھا وہ کوئی آخری پیغام دینا چاہتی تھی۔ سر کے ایک طرف کے بال جل کر آدھا سر ایسا بن گیا تھا جیسے کسی نے گھنگریالے بال کتروا رکھے ہوں۔ ہاں سر کے دوسری طرف جو بال بچے رہ گئے تھے وہ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ کبھی اس لڑکی کو اپنے بالوں کی چمک اور خوبصورتی پر بھی فخر رہا ہوگا۔

چہرے پر کوئی دہشت کوئی وحشت نہیں تھی بلکہ اس کے برخلاف وہ بے حد پرسکون تھا۔ ہاں کہیں کہیں کچھ خراشیں ضرور پڑ گئی تھیں جیسے اس کے سینے کے اندر کے زخم چہرے پر ابھر آئے ہوں۔ آنکھیں بند تھیں۔ جیسے اب انہیں کسی کا انتظار نہ رہا ہو۔ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست اور دانت اپنے درمیان زبان کو دبائے ہوئے کہ کوئی نام ان ہونٹوں پر نہ آ جائے اور زبان سے کہیں وہ سچائی نہ اگل پڑے جسے اس نے زندگی بھر راز ہی رکھا اور اسی راز کے بوجھ تلے دب کر ایک جوان جسم نے خود کو لپکتے شعلوں کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گردن سے نیچے کا سارا جسم جھلس چکا تھا غالباً اس لڑکی نے خود کو سب کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ زندگی بھر ناکامیوں نامرادیوں اور فریب کی آگ میں جلنے تڑپتے رہنے سے تو جلتی آگ میں ایک بار کود پڑنا ہی بہتر ہوگا۔ بہرحال یہ ایک خودکشی کا کیس تھا۔ اور ڈاکٹر یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ واقعی خودکشی تھی یا قتل کا کیس تھا۔ ہو سکتا ہے کسی نے اس لڑکی کو زہر بھی دیا ہو اور اس کے بعد اس کو جلا دیا ہو۔ اسی چھان بین کی غرض سے اب اس کے جسم کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا تھا۔

اس تھیٹر کا ماحول اسپتالوں کے آپریشن تھیٹروں کے ماحول سے قطعی مختلف تھا۔ اس میں دواؤں کی نہیں انسانی جسم کی بدبو بسی ہوئی تھی یہاں کسی جسم کو بے جان ہونے سے بچانے کی کوشش نہیں کی جا رہی تھی۔ بلکہ بے جان جسموں کو خالی کیا جا رہا تھا۔ مردہ جسموں سے دن رات کے واسطے نے یہاں کے کام کرنے والوں کو بھی جذبات و احساسات سے خالی کر دیا تھا۔ وہ بھی بس ایک مشین کی طرح کام کر رہے تھے۔

ایک شخص نے ایک بڑے پائپ سے نکلتی پانی کی تیز پچکاری سے لاش کو دھونا شروع کر دیا۔ چند لمحوں میں سر سے پیر تک خوب صاف کر دیا گیا۔ دوسرے شخص نے ایک تیز آلے سے اس لڑکی کے ابھرے ہوئے پیٹ کو نچلی طرف سے اوپر کی طرف چاک کر دیا۔ پوسٹ مارٹم کے انچارج ڈاکٹر نے بڑی احتیاط سے اس کھلے ہوئے پیٹ کا جائزہ لینا شروع کیا وہ ماں بننے والی تھی۔ پوری طرح بننے سے پہلے ہی بگڑ جانے والے اس بچے کو تھیلی سمیت ماں کی کوکھ سے نکال لیا گیا۔ اس کے دوسرے اعضاء کا تھوڑا تھوڑا حصہ کاٹ کر پلیٹوں میں نکالا جانے لگا البتہ اس کا معدہ پورا کا پورا نکال لیا گیا۔

جب پیٹ کا کام ختم ہو گیا تو سینے کی باری آئی۔ وہ سینہ جس کے اندر پتہ نہیں کتنی کہانیاں دم توڑ چکی تھیں۔ کسی کے سینے کے اندر پہنچنا کتنا مشکل ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر کا حال جاننے کے لئے ایک تیز آلے سے سینے کی ہڈیاں کاٹنی پڑیں اور اتنی جگہ بنائی گئی کہ اس کے دل کو مٹھی میں لیا جا سکے۔ جس نے شاید کبھی کسی کو اپنے اندر جگہ دی ہوگی اور اسی کے نام پر خود بھی دھڑک دھڑک کر مر چکا تھا۔

جو شاید کبھی ایک جیتی جاگتی بستی رہا ہوگا لیکن اب بے جان گوشت کے

غلطی پر ذرا سا سر جھٹک دیتا۔

ٹھیک ہے دو تین سال تو شیام بابو ہر سال اپنی بیوی سے ملنے گیا لیکن چوتھے سال عین چھٹی کے دنوں میں بیمار ہو گیا، پھر پانچویں سال بڑھا ہوا تو اس کے بعد پورے ڈھائی سال نہ جا پایا — جو پیسے اس طرح ضائع ہوں گے ان سے آدھوں کا بھی اس مہینے زیادہ منی آرڈر کروا دوں گا تو اس بھلی لوگ کے بیسوں کام نکل آئیں گے — ہاں، ان کا ایک لڑکا بھی ہے جس کے بارے اس کی بیوی نے لکھا کہ وہ اسے پانچویں سال کے دورے میں اس کی کوکھ میں ڈال آیا تھا۔ لیکن شام بابو سدا حساب کتاب کر کے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کا بیٹا اس کا بیٹا نہیں — شائد اس وجہ سے بھی وہ ان ڈھائی سال میں وہاں نہ گیا تھا، تاہم اس نے اس سلسلے میں اپنی بیوی کو کچھ نہ لکھا تھا، جو ہے سو ٹھیک ہی ہے۔ وہ بے چاری بھی کیا کرے؟ — اور — اور میں بھی کیا کروں۔ کبھی اچھے دن آ گئے تو سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا، اسے اور اس کے — ہمارے بچے کو بھی اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا، اسے اور اس کے — ہمارے بچے کو بھی اپنے پاس لے آؤں گا اور پھر ہم چین سے بسر کریں گے — بڑے چین سے! —

شیام بابو! — شیام با — !

اس کے دفتر کا کوئی ساتھی اس کا کندھا جھٹک رہا ہے مشین میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے اور وہ رکی پڑی ہے۔

شیام بابو!

"آں — ں — ! —" اس نے ہڑبڑا کر اپنی آنکھیں کھول لی ہیں۔

"طبیعت خراب ہے تو گھر چلے جاؤ۔"

"کون سے گھر؟ — نہیں، ٹھیک ہوں! — یوں ہی ذرا اونگھ آ گئی تھی — ٹک — ٹک — ٹک — ! — مشین پھر چلنے لگی ہے۔

"تمہارے لئے پانی منگواؤں؟"

"ارے بھائی، کہہ دیا نا، ٹھیک ہوں۔"

اس کے ساتھی نے حیرت سے اس کے کام پر جھکے ہوئے سر کی طرف دیکھا ہے اور پھر اپنے کام میں الجھ گیا ہے۔

شیام بابو کو اپنا جی اچانک بھرا بھرا لگنے لگا ہے۔

عام طور پر تو یوں ہی ہوتا ہے کہ اسے اپنی خوشی کی خبر ہوتی ہے نہ غم کی۔ وہ جیسے کبھی ہوتا ہے، بے خبری میں ہی ویسے ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور یوں سب کچھ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ بے خبر سا اپنے آپ اپنے دفتر میں آ پہنچتا ہے اور سارا دن قلم چلا چلا کر تھکا نے پر لوٹ آتا ہے اور پھر دوسرے دن ویسے ہی ڈیوٹی پر آ بیٹھتا ہے۔ اگر کوئی خاص اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے عین وہیں نہ دیکھے جہاں وہ بیٹھا ہو تو اسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ اس دن تو حد ہو گئی۔ ان کا باس ان کے پاس ہی کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ بھئی، شیام بابو کہاں ہے — شیام بابو! شیام بابو اس کے پہلو میں ہی اپنی سیٹ پر پورے کا پورا موجود تھا مگر باس کو نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر اس کی آواز سن رہا ہوگا۔ لیکن واقعی سن رہا ہوتا تو فوراً کھڑے ہو کر جواب کیوں نہ دیتا۔ یس سر! — ایسے بھولے بھٹکے چہرے شائد آنکھوں میں ٹھہرنے کی بجائے ہماری روحوں میں لڑھک جاتے ہیں۔ ان سے مخاطب ہونا ہو تو اپنی ہی تھوڑی سی جان دے کر انھیں زندہ کر لینا پڑتا ہے، ورنہ وہ آپ وہاں کہاں؟

گوشت کو رگوں میں خون دوڑنے کی اطلاع ملتی رہے تو وہ زندہ رہتا ہے، نہیں تو مٹی ہوتا جاتا ہے۔ جب شیام بابو کی اپنی زندگی بے پیغام ہے تو اسے کیسے محسوس ہو کہ ٹیلی گراموں کے ٹیکسٹ برقی کوڈ کی اوٹ میں ہنس رہے ہیں، رو رہے ہیں یا گم سم پڑے ہیں۔ مری مری مٹی پر کچھ لکھ دیجئے سر، لیے کیا؟ شیام بابو کو اس سے کیا، کہ کوئی کسے کیا پیغام بھیج رہا ہے۔ اس کی قسمت میں تو کسی کا کوئی پیغام نہیں، محبت کا یا نفرت کا، خوشی کا یا غم کا؟ — اس کی بیوی؟ — ہاں وہ اسے ہر ماہ باقاعدگی سے اپنی تنخواہ کا ایک تہائی بھیج دیتا ہے اور وہ اسے پیسوں کے پہنچنے کی خبر دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہی ایک فالتو جملہ لکھ کر کہ اس طرح اپنے پاس بلاتی ہے جیسے کہہ رہی ہو، آ سکتے ہو تو آ جاؤ، اور نہیں آ سکتے تو ہماری فکر مت کرو، ہم سب پوری خیریت سے ہیں — پوری خیریت کیا یہی ہوتی ہے؟ — شیام بابو کا جی بہت بھر آیا ہے — اسٹاپ میں بدیس سے لوٹ آیا ہوں اسٹاپ — اس نے اپنا سر اٹھا کر دیکھا ہے کہ صاحب کا چپراسی اس کی طرف سرکاری لیٹر بڑھا رہا ہے اس نے خط لے کر اس پر نظر دوڑائی ہے۔ اور پھر چونک کر خوشی سے کانپتے ہوئے اس کو دوبارہ پڑھنے لگا ہے۔ اسے اطلاع دی گئی ہے کہ تمہارے نام دو کمروں کا کوارٹر منظور ہو گیا ہے — "کیدار بابو! — جمیل! — کشن! — دیکھو! — دیکھو! —"

"کیا ہے بھائی؟"

"میرا کوارٹر منظور ہو گیا ہے۔"

"اچھا؟ — !

— "یہ تو بہت اچھا ہوا شیام بابو۔"

وعدے کے سوائے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب ساری توجہ سر کی طرف تھی۔ ایک آپ... کھوپڑی کے اوپری حصے کو ناریل کی طرح کاٹ کر اس کا بھیجا نکال لیا گیا۔ وہ بھیجہ جس کے اندر کبھی ایک سوچنے والا ذہن رہا ہو گا۔ اور اس ذہن نے زندگی کے مستقبل کے خوشیوں اور مسرتوں کے ان گنت خوبصورت خواب دیکھے ہوں گے اب وہی بھیجہ حزن کی سرخی اور ماضی اور ناکامی کی سیاہی میں لپٹا باہر نکل آیا تھا۔

اور اس طرح پوسٹ مارٹم کا ابتدائی لمحہ مکمل ہو چکا تھا۔ فوراً ہی ان کے چھٹے جسم اور سر کو سوئی دھاگے کی مدد سے پھر سے جوڑ دیا گیا پہلے اس جسم میں صرف جان ہی نہیں تھی اور اب اس میں کچھ بھی نہیں تھا جیتے جی اس لڑکی نے جب خالی پن کو محسوس کیا ہو گا تو اس کا وہ خالی پن اب جا کر مکمل ہوا تھا۔ پھر اس خالی خولی جسم کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس لاش کا نہ کوئی وارث تھا نہ لینے والا۔ اسے میونسپلٹی کے حوالے کر دیا گیا تاکہ منزل کی تلاش میں چھبیس برس تک بھٹک بھٹک کر خود کو منزل سے بے نیاز کر دینے والی اس بدنصیب لڑکی کو آخری منزل تک پہونچا دیا جائے۔

ڈاکٹروں کی ریسرچ نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ قتل کا نہیں خودکشی کا کیس تھا۔ اور پولیس کی تحقیقات سے زندگی اور موت کے درمیان پڑا ہوا پردہ بھی اٹھ گیا۔ جس کہانی کو اس لڑکی نے دنیا بھر سے چھپانا چاہا وہی کہانی ساری دنیا کے سامنے آگئی (۲۶) سال کی یہ لڑکی اکیلی رہتی تھی۔ وہ ملازمت تو کرتی ہی تھی لیکن اس نے محبت بھی کرنی شروع کردی۔ پیار اور محبت کے راستے پر دونوں جھومتے جھامتے چلتے رہے شادی کے وعدے برابر ٹلتے رہے۔ پھر اس نے پیار کے اپنے دیوتا کیلئے زندگی کے دوسرے سارے رشتے توڑ لئے۔ خاندان والوں نے اس سے ناطہ توڑ لیا۔ دوستوں نے ملنا بند کر دیا پڑوسی اس سے بات تک نہیں کرتے لیکن اسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ اپنے پیار کے لئے اور اس پیار نے اسے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ پھر ایک دن اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے خود کے اندر ... کوئی نئی کونپل پھوٹنے والی ہے۔ اس نے اپنے دیوتا کو بتایا۔ ہمیشہ ٹلنے والی شادی کی تاریخ آخر کو طے ہو گئی۔ لیکن ابھی تاریخ آئی نہیں تھی کہ وہ شخص اچانک کہیں غائب ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار اسے ڈھونڈتی رہی ... اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ... تک اس ... تلاش کے سارے راستوں سے گذر گئی لیکن اسے مایوسی کے سوائے کچھ نہ آیا اس نے لاکھ جتن کئے کہ ہونے والے بچے کو اندھیرے اور بدنامی ... میں بھٹکنے سے بہتر ہے کہ وہ جنم لینے سے پہلے ہی ماضی کے اندھیرے

میں کہیں گم ہو جائے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

پھر اس نے سوچا گمنام باپ کی اس اولاد کو سماج کبھی عزت نہ دیگا پھر کیوں نہ اس کے جنم لیتے ہی گلا گھونٹ دیا جائے۔ کیا ایسا وہ کر سکے گی؟

پیار اس نے کیا تھا، غلطی اس نے کی تھی، بھروسہ اس نے کیا تھا۔ پھر سزا بھی اسی کو ملنی چاہیئے ــــــ

ــــ اور ایک گرم دوپہر میں اس نے خود کو کمرہ میں بند کر کے مٹی کے تیل کا خود پر چھڑکاؤ کر کے اپنے آپ کو شعلوں کی لپٹ کے حوالے کر دیا۔ جب پڑوسیوں نے اس کو شعلوں سے جدا کیا تو تب تک زندگی اس کے جسم سے بہت دور جا چکی تھی۔

بقیہ :- اسٹاپ .....

جائے گی ــ ساوتری! ــــ اسے لگا کہ وہ کھلی آنکھوں سے سپنا دیکھ رہی ہے اور ــــ اور وہ بے اختیار رو دے گی ــ اٹھتے بیٹھتے تمہاری ہی صورت دکھائی دیتی ہے ــــ اب تو آجاؤ! ــــ اور میں آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لوں گا۔ اور وہ میرے بازوؤں میں بے ہوش ہو جائے گی ــــ ساوتری! ــــ ساوتری! ــــ اپنی کھولی کے سامنے پہنچ کر شیام بابو نے بے قابو ہو کر اپنی بیوی کو پکارا.... لیکن وہاں ... کے تار گھر کے رامو نے آگے بڑھ کر اسے جواب دیا ہے ....

" بابو جی ــ ؟ "

" ارے رامو، تم؟ " شیام بابو اپنے حواس درست کرنے لگا ہے

" کیسے آنا ہوا؟ "

" بابو جی " رامو کی آواز بھاری ہے اور وہ بولتے ہوئے ہانپ رہا ہے۔

" اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں ہو؟ ــ بولو نا؟ "

" آپ کا تار لایا ہوں۔ "

" میرا تار؟ "

" ہاں بابو جی، یہ تار آپ ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے پر آپ کا دھیان ہی نہیں گیا کہ آپ کا ہے۔ "

اپنا ہی نوشتہ پڑھنے کے لئے شیام بابو تار کا لفافہ تیز تیز چاک کر رہا ہے ــــــ ساوتری نے خودکشی کر لی ہے اسٹاپ ــــ

نسیم شیخ

وہ کتاب

وہ کتاب بہت دلچسپ تھی۔ جی چاہتا تھا لوگوں کو پکار پکار کے کہوں جھوٹ فریب کے مکھوٹوں کو نوچ ڈالیں اور اس کتاب کے کردار کی طرح صاف صاف باتیں کریں ـــــ اس کتاب کے مطالعہ نے میرے سوچنے کا ڈھنگ ہی بدل دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے "میں" سب سے الگ ہستی ہوں ـــــ بہت اونچی، عظیم خیالات رکھنے والی۔

اب میں نے نئی طرح کی زندگی شروع کی ہے۔ پہلے جب آفس جایا کرتی تھی تو کافی محتاط رہتی تھی کہ کہیں لوگ مجھے یہ نہ کہہ دیں کہ میں اس کے ساتھ کیوں ملتی ہوں، کیا کرتی ہوں کسی لڑکے کے ساتھ میرا نام تو نہیں جوڑ دیا جاتا ہے ـــــ لیکن کتاب نے جو راہ دکھائی تھی اس سے میں بہت خوش تھی۔ جب کسی لڑکے نے بات کرنا چاہا میں نے کھل کر بات کی۔ جب میرے من میں پاپ نہیں تھا تو پھر ڈر کیسا؟

کتاب کی باتیں سچ ہی تو تھیں کہ "سماج کے بندھن ہم نے اس لئے باندھے ہیں کہ ہم کوئی غلطی نہ کر بیٹھیں ـــــ اور غلطی اچھائی برائی ـــــ ان چیزوں کی کوئی تشریح نہیں ہوتی ـــــ مذہب، رسم و رواج سماج کے بندھن سب ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں ـــــ اس لئے وہ کام نہ کریں جو ضمیر گوارا نہیں کرتا۔"

گھر پر بھائی کے دوست ـ ڈیڈی کے دوستوں کے لڑکے، ممی کے رشتے دار سبھی تو آتے ہیں۔ میں سب سے ہنستی بولتی ہوں تب تو مجھے کوئی منع نہیں کرتا۔ تو پھر اگر باہر کسی لڑکے نے میرے ساتھ بات چیت کر لی تو کیا ہوا؟ کیا گھر میں سب کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنا ثواب ہے اور باہر بات کرنا گناہ؟

گناہ؟ ـــــ شائد لوگوں کو اس بات کا خدشہ لگا رہتا ہے کہ تعلقات بڑھ جائیں گے، عشقیہ باتیں ہوں گی اور پھر آخر وہ برائی نہ ہو جائے جسے گناہ کے کاناموں میں اوّل قرار دیا گیا ہے ـــــ میرا دل کہتا ہے اگر ہم گناہوں سے بچ کر کسی سے دوستی رکھیں تو اس میں برائی ہی کیا ہے! اور پھر کتاب میں بھی تو یہی لکھا ہے۔

اب میں بہت خوش ہوں ـــــ سب سے ملتی ہوں جس کے ساتھ جی چاہتا ہے ہو مل جاتی ہوں ـــــ سمندر کے کنارے بیٹھتی ہوں اور چونکہ میں تو اپنے آپ کو سماج کے بندھنوں سے آزاد تصور کرتی ہوں اور خود کو دوسروں سے کچھ الگ محسوس کرنے لگی ہوں اس لئے دنیا کا کیا ڈر! ـــــ کئی لڑکے مجھ سے بہت اچھی طرح بات کرنے لگتے ہیں ـــــ میں نے ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے میرے ساتھ دوستی ہوگی عاشقی نہیں ـــــ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے آفس کے بہت سارے لڑکے میرے قریب ہونے لگے ـــــ اب اپنے سارے دوستوں کو دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا ہے۔ کس کو خوش رکھوں کس سے ملوں، کس سے نہیں، ایک کو خوش رکھنے کے لئے دوسرے کو ناراض دیکھنا ہی پڑتا ہے ـــــ اور پھر وہ کتاب؟ میں سب کو خوشیاں کیسے بانٹ سکوں گی؟

پھر ایک اور نئی مصیبت! ـــــ آفس کی ساری لڑکیوں میں افواہیں پھیلنے لگیں کہ مجھ پر اتنے لوگ مہربان کیوں ہیں؟ کتنے ٹیلی فون آتے ہیں مجھے۔ آخر میں کیا ہوں۔ فلرٹ ہوں، آوارہ ہوں؟ اگر نہیں تو لوگ مہربان کیسے ہیں ـــــ کیوں کہ آج کی دنیا کا دستور بن چکا ہے لوگ اس پر مہربان ہوتے ہیں جو بہت امیر ہو یا فلرٹ ـــــ اب کیا کروں؟ ـــــ آفس میں گھورتی ہوئی آنکھیں میرے جسم میں گڑ جاتی ہیں ـــــ میں نے کوئی جرم نہیں کیا پھر بھی میں مجرم ہوں کیوں؟ اس سوال کا جواب تو نہیں ملتا بلکہ میرے دماغ میں سوچوں کا سمندر امڈتا ہے۔ اور خیالات ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹنے لگتے ہیں ـــــ اچانک مجھے بڑے صاحب کا پیغام ملتا ہے

کہ ان کو مجھ سے کچھ ضروری کام ہے۔ میں باس کے کیبن میں جاتی ہوں — وہاں باس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔

باس عجیب نظروں سے گھورتا ہوا سوال کرتا ہے۔

"کل شام کو کیا کر رہی ہو؟

"جی! اس غیر متوقع سوال پر حیران ہوں"

"میرا مطلب کہیں اپوائنٹمنٹ (Appointment) تو نہیں ہے؟

"جی! جی! نہیں لیکن کیا بات ہے سر!"

"سر نہیں ڈیئر کہو — تم آفس کے چھوٹے لوگوں کو منہ لگاتی ہو — کبھی مجھ سے بھی کچھ دلچسپ باتیں کیا کرو"

"کرتی تو ہوں سر"

"پھر وہی سر — میں نے تمہارے لئے اوبرائے شیرٹن میں ایک کمرہ بک کیا ہے — کل شام کو آفس کے بعد باہر مجھے ملنا — (Enjoy) انجوائے کریں گے"

"سر — میں — نہیں..... سر آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں — میں فلرٹ نہیں ہوں"

"ان دو ٹکوں کے لڑکوں میں تمہیں کیا خوبی نظر آتی ہے جو مجھ میں نہیں ہے — اور کیا دیتے ہیں وہ لوگ تمہیں؟"

"کچھ نہیں سر — وہ — میرا ان سے کوئی غلط رشتہ نہیں ہے"

"پھر بینڈ اسٹینڈ پر راکیش کے ساتھ کیوں گھوم رہی تھیں؟ شائد وہ سیدھی سادی باتیں کرنے کے لئے مناسب جگہ ہے"

"سر — دراصل راکیش ایک اچھا مصور ہے اور وہاں سمندر کے کنارے وہ تصویریں بناتا ہے — میں بھی کبھی اس کے ساتھ چلی جاتی ہوں کیونکہ مجھے بھی مصوری میں خاصی دلچسپی ہے"

"اچھا! یعنی مصور کی فنکاری دیکھنے کے لئے آپ اپنا وقت خواہ مخواہ برباد کرتی ہیں! — میں تجربہ کار بزنس مین ہوں۔ ہر طرح کے لوگوں کو پہچانتا ہوں اس عمر میں ایک نوجوان لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ کیسی مصوری کرتی ہے میں خوب جانتا ہوں۔"

"لیکن میں سچ کہتی ہوں — " میرا گلا رندھ گیا۔

"سنو مجھے پرسنل میٹر (Personal Matter) سے کچھ لینا دینا نہیں تم کہیں بھی جاؤ — مجھے تم اچھی لگتی ہو، اس لئے تم آؤ گی — جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

میں کشمکش میں ہوں۔ کچھ پریشان سی اپنے ٹیبل پر آتی ہوں تو ایک اور حملہ ہوتا ہے — میرے ٹیبل پر ایک لڑکے کا خط رکھا ہوا ہے جو میرے عشق میں گرفتار ہے۔ یہ وہ لڑکا ہے جس کے ساتھ میں نے ازراہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ پاس والے ٹیبل پر بیٹھی [illegible] لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ شائد وہ خط پہلے ہی پڑھ چکی ہے — کتنی غلط بات ہے کسی کا خط بلا اجازت پڑھنا۔ لیکن میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ اس نے خط پڑھا ہے — پوچھوں تو صاف مکر جائے گی — باس کے کمرے سے آئی ہوں سارے لڑکے چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے گھور رہے ہیں۔

کتاب کے جملے — خیالات — نوکری — باس کا آرڈر، چاروں راستے ایک ہی موڑ سے نکل کر اسی طرف لوٹ رہے ہیں۔ آخر میں فیصلہ کرتی ہوں میں ہوٹل نہیں جاؤں گی — تیسرے دن آفس میں ہنگامہ ہوتا ہے۔ مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔ الزام یہ کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے — میرے آفس والوں کا خیال ہے کہ میری آزادی کو دیکھ کر چھپ چھپ کر گناہ کرنے اور اب الٹا میں نقاب اوڑھنے والی لڑکیاں خراب ہو جائیں گی۔

گھر آتی ہوں — ابھی یہ سوچ ہی رہی ہوں کہ نوکری چھوٹنے کی بات کیسے کہوں کہ سوالات کی بوچھار شروع ہو جاتی ہے۔

"آج چرچ گیٹ اسٹیشن پر کون تھا ساتھ؟"

"بھیا وہ رابرٹ"

"اچھا! رابرٹ"

"ہاں بھیا"

"تو اس سے ملنے گئی تھی؟"

"ہاں بھیا"

"کیا ہاں بھیا، ہاں بھیا کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بے شرم اپنے کئے پر خاموش بھی نہیں رہ سکتی"

"لیکن میں نے کونسا جرم کیا ہے بھیا!"

"ہاں تو بس فلمی مکالمے دہرائے گی۔ پیار کیا تو ڈرنا کیسا؟ پیار کیا ہے کوئی جرم نہیں کیا ہے — گناہ نہیں کیا — بس بہت ہو چکا یہ ناٹک اگر دوسری بار ایسی حرکت کی تو مار ڈالوں گا"

"بھیا آپ خواہ مخواہ پریشان ہیں — بیکار غصہ ہو رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں؟"

"کیا بکواس کر رہی ہے — ایسی کوئی بات نہیں تو وہ خواہ مخواہ آدھا گھنٹہ تیرے انتظار میں اسٹیشن پر کھڑا رہا"

"اُف اوہ! بھیا دراصل اسے کچھ [illegible] کی دکان اسٹیشن کے پاس ہے۔ یہ دکان میری سہیلی کے بھائی کی ہے۔ وہ مجھے کنسیشن دیتا ہے۔ اسی لئے میں نے سوچا اس کا کوئی فائدہ ہو

بیٹھنے کا تو بڑا کیا نقصان ہے۔ اور پھر آپ ہی سوچئے اگر میں اسے آفس
جلدی تو پھر ہم لوگوں کو وہیں جانا پڑتا۔ اس لئے ہم اسٹیشن پہلے، ریکارڈس
خریدے اور آفس چلے گئے۔"

"میں ممی! اس عمر میں جو تو بیانے بنا رہی ہے ان راستوں سے ہم گذر چکے ہیں۔"

اتنے میں ڈیڈی آتے ہیں ——

" وہ داڑھی والا کون تھا تیرے ساتھ "

" کب؟"

"کل شام کو"

" وہ تو روبینہ تھا ڈیڈی"

" تو کہاں جا رہی تھی اس کے ساتھ "

" میں —— میں اس کے ساتھ ایر انڈیا کے آفس گئی تھی —— اس کی ماں بیمار ہے اور اسے پلین کا ٹکٹ نہیں مل رہا تھا۔"

بھیا بیچ میں بول پڑے۔" اچھا تو ایر انڈیا میں بھی کوئی تیری سہیلی کا بھائی انچارج ہوگا ۔"

" ہاں بھیا —— لیکن وہاں میری سہیلی کا بھائی نہیں میری سہیلی ہے :"

" خوب جانتا ہوں پہلے ایک لڑکے کو ٹکٹ خرید نے میں مدد کر رہی ہے دوسرے کو ریکارڈس میں کنسیشن دلوا رہی ہے —— ارے میں پوچھتا ہوں اگر وہ دو روپے زیادہ دیکر ریکارڈس خرید لیتا تو اس میں تیری کونسی جائیداد لٹ جاتی —— دوسرے کی ماں مر رہی ہے تو تجھے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ سارے جہان کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔!"

ڈیڈی چلاتے ہیں۔" نالائق ایک تیری بہن بھی تو ہے۔ ایک سیدھی سادھی ٹیچر —— دن کو اسکول میں پڑھاتی ہے۔ شام کو گھر پر بچوں کو ٹیوشن دیتی ہے اتنی محنت کے بعد گھر کام بھی سنبھالتی ہے —— ایک تو ہے کہ کمانے کا ہوش ہے نہ گھر کا —— آفس جاتی ہے تو لیسے گل کھلاتی ہے۔"

" میں نے کچھ بھی نہیں کیا ڈیڈی"

بھیا ڈانٹتے ہیں —— " کچھ نہیں کیا تو تجھے آفس سے کیوں نکال دیا گیا!"

" میں ...... وہ ...... باس اچھا نہیں ہے "

" اتنے دنوں کے بعد باس اچانک بُرا ہوگیا —— اور تم اچھی ہو!"

" بھیا میں سچ کہتی ہوں میرا کوئی قصور نہیں ہے "

" ڈیڈی غصے سے پاگل ہوئے جا رہے ہیں —— ممی اپنا لیکچر شروع کر دیتی ہیں "

" اب رونے پیٹنے سے فائدہ؟ —— پہلے تو جیسا کہتی تھی ہو لیا ہی اچھے تھے سب۔ دوسری کی طرح ٹیچر نہیں بن سکی —— کہتی ہے اس کی جندگی اپنی طرح چلے گی۔ ارے اتنی عمر میں ہم کو معلوم کیوں نہیں ہے کہ جندگی اس طرح سے بھی جیتے ہیں یا جندگی کیا ہے —— آپ سے کہتی تھی جیادہ نہ پڑھاؤ، پڑھتے پڑھتے دماغ خراب ہونے لگا ہے۔ بیٹے ناز تھا اپنی ٹیلی پارلی پر سیدھی سی پڑھے گی، سلائی سیکھے گی۔ اری اب پڑھ لکھ کر یہی سیکھی ہے۔ لڑکوں کے ساتھ گھومے اڑاتے آوارہ گردی کرے —— باپ بیٹے سمجھا رہے ہیں۔ وہ جانتے مار کر گھر میں نہیں بٹھا سکتے ۔"

" ممی میں نے کچھ نہیں کیا —— کوئی غلط کام نہیں کیا "

" ہاں تو سب ہی کرتی ہے۔ ہم سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے سارے محلے والوں کو غلط نہیں ہے —— تو جو پڑھی لکھی ہے سب کو سمجھانے جا چلا چلا کے صفائی دے ۔"

میرا چھوٹا بھائی جس کی عمر صرف سولہ سال ہے وہ بھی میری طرح کتابیں پڑھنے کا شوقین ہے سب سے کہتا ہے ۔

" آخر کیوں آپ سب دیدی کو تنگ کر رہے ہیں —— آج زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور آپ لوگ اسی تکرار میں الجھے ہوئے ہیں کون کیا کر رہا ہے۔ کہاں جا رہا ہے۔ پہلے تو آپ خود نہیں جانتے اچھے کیا ہے برا کیا ہے —— کسی زمانے نے کوئی قانونی لکیر نہیں کھینچی، کسی نے اچھائی برائی کی کوئی تصویر نہیں بنائی —— اور ..... "

" بدتمیز شرم نہیں آتی —— ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں گرے اور چلا ہے بہن کی حمایت کرنے ۔"

" بچے بڑوں کے بیچ میں نہیں بولتے، جاؤ یہاں سے "

ماں فیصلہ سنا دیتی ہے —— " اب میں اس کو ایک پل بھی بمبئی میں نہیں رکھوں گی —— سارے پڑوسی طعنہ دیتے ہیں۔ یہاں رہے گی تو اور بگڑ جائے گی۔ اس کا دماغ ٹھیک کرنے کے لئے کچھ دنوں اپنی بہن کے پاس ناگپور بھیج دیتی ہوں۔ چھوٹا شہر ہے۔ ان کے یہاں مذہبی ماحول ہے۔ لڑکی کچھ سدھر جائے گی۔"

مجھے مجرموں کی طرح اپنی خالہ کے یہاں بھیج دیا گیا ہے —— لیکن پھر بھی کتاب میرے ساتھ ہے۔ اب بھی اس میں کچھ اصول ایسے ہیں جن پر چل کر میں آتما کو شانت کر سکتی ہوں۔ مجھے نئے ماحول چھوٹے شہر میں کافی گھٹن محسوس ہونے لگی ہے۔ دھیرے دھیرے میں نے اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ڈھالنا شروع کر دیا ہے —— جہاں مذہبی باتیں ہیں۔ لیکن میری کتاب مجھے آنکھیں بند کر کے کسی چیز پر عمل کرنے

کی بجائے سمجھنے کی صلاحیت دیتی ہے چاہے وہ دنیاوی اصول ہوں یا دین کی باتیں ——

میں دیکھتی ہوں بڑی شردھا سے پوجا پاٹ ہوتی ہے، دان دیا جاتا ہے۔ بھوجن لگتا ہے —— ان بھوجن اور دان لینے والوں میں غریب کم اور ڈھونگی زیادہ ہیں۔ مجھ سے رہا نہیں جاتا میں منع کرتی ہوں —— کھانا اور کپڑا بنا بولے ایک ایسی عورت کو دے آتی ہوں جو ہماری ذات کی تو نہیں ہے مگر محنتی، غریب اور مجبور ہے۔ مانگ نہیں سکتی —— میری خالہ کو بہت غصہ آتا ہے، مجھے پھٹکار پڑتی ہے۔

"بیٹھ کر شلوک نہیں پڑھتی، پوجا پاٹ نہیں کرتی اور غیر جاتی والوں کو منہ لگاتی ہے جو اچھے گھروں میں ہیں انھیں کھانا کپڑا دے کر آتی ہے —— یہاں جو فقیر بیٹھے ہیں ان کا کیا؟"

"آنٹی ان لوگوں نے بھیک مانگنے کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ وہ لوگ یہ دھندا کرتے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو ہم تو دان کر رہے ہیں!"

"آنٹی دان ضرورت مندوں کو کرنا چاہیئے"

"بیٹی میں سکھا پڑھا کر بہت بڑا کمال کر دیا جو اب یہاں ہم لوگوں کو بہکانے آئی ہے تو —— ہمارے برسوں کے نیم توڑتے ہوئے شرم نہیں آتی۔"

"وہ عورت بے چاری لوگوں کے برتن مانجھتی ہے۔ لیکن اس کے بچے کی فیس کے لئے پیسے نہیں ہیں —— اس کے پاس ایک ساری کے علاوہ دوسری ساری نہیں ہے۔ وہ بیچاری شرم کے مارے مانگتی نہیں ہے۔ اور یہ فقیر پانچ پانچ سو روپے کے منی آڈر بھیجتے ہیں۔ چرس پیتے ہیں"

"ہاں ہاں! تو سب جانتی ہے نا! ارے میں پوچھتی ہوں وہ غریب ہے برتن مانجھتی ہے تو کیوں اپنے بچے کو میونسپل اسکول میں پڑھاتی نہیں! کیوں فیس والے اسکول میں پڑھاتی ہے؟"

"کیا اچھے اسکول میں پڑھنا صرف امیروں کے بچوں کا حق ہے۔"

"تو خاموش رہ! مجھے پڑھانے چلی ہے۔ اپنا کام کر۔ ایک تو چھوٹے لوگوں کو منہ لگاتی ہے اور ہمدردی جتاتی ہے —— تو ہی رہ گئی نا اس دنیا میں"

میں خاموش ہو جاتی ہوں پھر اپنی کتاب کے بارے میں سوچتی ہوں بار بار پڑھتی ہوں، اتنی تکلیفوں کے باوجود جب نیلے آسمان کی طرف دیکھتی ہوں تو عجیب سی خوشی ہوتی ہے لیکن کس طرح اپنی باتیں لوگوں تک پہنچاؤں کیسے سمجھاؤں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

پنڈت جی آئے ہیں کتھا ہو رہی ہے —— کتنی بار اشنان کرنا چاہیئے عورت کب اپوتر رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اسے کیا کرنا چاہیئے کھانے کے برتن کو نہیں چھونا چاہیئے —— لوگ کتنے برے ہو گئے ہیں، کیسا زمانہ آگیا ہے۔ جوان لڑکیوں کو کس طرح رکھنا چاہیئے۔ یہ فلمی ناٹکوں دکھانے والی لڑکیوں کو کوئی روک ہے۔ دان دینے والے کو کتنی بڑی سورگ ملے گی، پنڈت کو کتنا بھوگ دینا چاہیئے —— یہ سب لیکچر کے بعد شلوک منتر شروع ہو گئے —— سارے لوگ منتر رٹ رہے ہیں خوش ہو رہے ہیں بیچ بیچ میں پنڈت جی سمجھا رہے ہیں اس منتر پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ جب یہ منتر پڑھے گئے تھے تو کیا کیا کارنامے ہوئے تھے۔ اور کیسے معجزے ہوئے تھے۔

میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکی —— پنڈت جی یہ سارے لوگ تو سنسکرت نہیں جانتے پھر یہ منتر کیسے سمجھیں گے —— ان منتروں کا مطلب کیا ہے یہ تو سمجھائیے —— یہ بھولے ان پڑھ لوگ تو یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں انہوں نے منتر پڑھ لئے انہیں سورگ مل جائے گی۔ لیکن ذرا ان لوگوں کو یہ تو بتائیے ان منتروں میں کیا ہے۔ بھگوان کی ہستی کیا ہے؟ صحیح راستہ کونسا ہے۔

پنڈت جی غصہ ہو کر چلے گئے —— سبھا میں جتنے لوگ بیٹھے تھے مجھ پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ جو دیکھتا نگاہیں پھیر کر چلا جاتا —— خالہ کا رو رو کر برا حال تھا کہہ رہی تھی کہ ان کے نگر میں یہ بہت بڑی بات ہے کہ کسی لڑکی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہمارے پنڈت سے پوچھے ناک کٹوا دی —— ان لوگوں کی۔ اب کیا ہوگا؟ اچھی مصیبت اس کے والدین نے ہمارے گھر بھیج دی۔"

میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس چکی ہوں —— میری کتاب مجھے اچھے اچھے راستوں پر جانے کی بجائے برے راستے سکھا رہی ہے کیا؟ اگر نہیں تو لوگ میری بات سنتے کیوں نہیں —— اب تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے لوگ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں اور میں غلط۔

نگر میں لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں ایک لڑکی جو میری سہیلی ہے مجھے سمجھاتی ہے۔

"دنیا والوں کے لئے ہمیں جینا ہے —— چھوڑ تو کیوں اپنا دماغ خراب کرتی ہے۔ صرف تیرے کہنے سے، دان دینے سے غرباء کم ہو جائیں گے! لوگ منتر کا مطلب سمجھنے لگیں گے۔ ارے پگلی منتر پڑھنے میں اچھے لگتے ہیں۔ جلدی سے یاد ہو جاتے ہیں۔ کانوں کو بھلے لگتے ہیں اسی لئے تو لوگ پڑھتے ہیں سنتے ہیں —— اگر ان کا مطلب اور مذہبی باتیں صحیح طریقے سے سمجھائی جائیں تو وہ باتیں اتنی روکھی پھیکی ہوتی ہیں کہ کوئی سننا پسند نہیں کرے گا۔"

اس لڑکی کی ماں کچھ دنوں کے لئے باہر گئی ہے۔ میں اپنی خالہ

گھر والوں کی باتیں سن کر سنگ آ چکی ہوں ـــ ڈیڈی اور بھیا کے اپنے آدرش ہیں۔ اسی لئے خالہ کو بتائے بغیر سہیلی کے گھر جا کر چھپ جاتی ہوں۔ اور سہیلی سے معلوم کرواتی ہوں کہ میرے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے۔

گھر میں شور مچا ہوا ہے کہ ایک نوجوان لڑکی بھاگ گئی ہے ـــ بڑی میرا بن کر منتر کے مطلب سمجھا رہی تھی۔ ڈھونگی، فریبی ـــ خالہ تو کہتی ہیں انھیں اس بات کا یقین تھا کہ جس لڑکی نے بمبئی میں اتنے مراسم بڑھائے تھے تو یہی ہونا تھا۔ کوئی لڑکا بمبئی سے تلاش میں آکر بھگا لے گیا ہوگا ـــ

میری سہیلی مجھے سمجھاتی ہے "کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے۔ خوا مخواہ بدنام ہو رہی ہے ـــ میں جا کر بتا دیتی ہوں کہ تو یہاں ہے۔" وہ بھی میری وجہ سے پریشان ہے کسی نے دیکھ لیا تو اسے پریشان کریں گے کہ کیوں اس نے مجھے پناہ دی ہے۔ اور دوسرے دن اس کی ماں بھی آنے والی ہے۔ وہ تو طوفان مچا دے گی ـــ میں وعدہ کرتی ہوں کہ صبح تک کہیں چلی جاؤں گی۔

مجھے جانا ہے ـــ لیکن اکیلی جوان لڑکی! ـــ اپنی حفاظت کی خاطر سفید ساری پہن کر جوگن کا روپ دھار کر نکلی ہوں۔ کہاں جاؤں کیا کروں! کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــ آخر مجھے کس چیز کی تلاش ہے؟

اس کتاب کے لیکھک کی تلاش ہے جس نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے ـــ ایک تو دیکھ لئے جانے کا ڈر۔ دوسرا پریشان دماغ ـــ گھر سے دور کسی گاؤں میں چلی آئی ہوں ـــ یہاں کچھ سکون محسوس ہو رہا ہے یہاں کوئی جاننے والا ہے نہ انگلی اٹھانے والا۔ لیکن اب بھوک پیاس کا کیا علاج؟ ـــ مجھ جیسی لڑکی تو ظاہر ہے کسی سے کچھ مانگ نہیں سکتی۔ اسی لئے مندر پہنچ جاتی ہوں، یہ سوچ کر کہ بھگوان کے گھر کھانا نہیں تو پانی مل ہی جائے گا۔

یہاں پنڈت اور داسیاں میرے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے ہیں ـــ یہاں پر مجھے بہت اچھی باتیں سمجھائی گئی ہیں ـــ مجھے یہ جان کر خوشی ہو رہی ہے کہ پنڈت صرف منتر رٹتا نہیں ہے بلکہ کچھ اسے سمجھ کر شردھا سے پوجا بھی کرتے ہیں ـــ مذہب کو اپنانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کہتا کیا ہے ـــ مجھے بھی یہاں کی باتوں سے دلچسپی ہونے لگی ہے۔

میری آواز میں جادو ہے۔ بھجن گا کر اپنا دل بہلاتی ہوں ـــ لوگ ایک بچے کو بخار میں تپتا ہوا میرے پاس لاتے ہیں ـــ میں اس بچے کے سر پر سرد پانی کی پٹیاں رکھتی ہوں، اتفاق سے اس کا بخار صرف کم ہی نہیں ہوتا بلکہ بچہ کچھ ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔

اب نئی مصیبت کھڑی ہو گئی ہے۔ لوگ میرے بھجن سننے کیلئے بے تاب ہیں ـــ نائی، کمہار، دھوبی، سب مجھے ارپن کر رہے ہیں۔ میں لوگوں کو سمجھانا چاہتی ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھو مجھے کچھ گیان نہیں، لیکن لوگ مجھے سر پر بٹھانے کو تیار ہیں ـــ میں کتاب کے اصولوں پر غور کرتی ہوں۔ اور اس گاؤں سے چپکے سے بھاگ جاتی ہوں۔

ـــ لوگ کہتے ہیں ـــ "دیوی تھی ہمارے گاؤں کو پوتر بنا کر چلی گئی ـــ بھگوان کے گھر سے آئی تھی بھگوان کے گھر لوٹ گئی۔

اب مجھے شدت سے اس کتاب کے لیکھک کی تلاش ہے ـــ میں ایک گپھا میں پہنچتی ہوں۔ وہاں پر کوئی نہیں ہے ـــ کچھ کاغذات قلم، اور روشنائی رکھی ہے ـــ لیکن لیکھک کہاں ہے؟ میں دیوانوں کی طرح پکارتی ہوں ـــ مجھے بازگشت سنائی دیتی ہے ـــ "جاؤ اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ، دنیا والوں میں جس طرح زندگی نبھانی پڑے نبھاؤ ـــ لیکن قلم اٹھاؤ اور جو تمہارا جی چاہے لکھنا شروع کر دو ـــ اس طرح تم دنیا کو وہ کہہ سکو گی جو تم آج تک نہیں سمجھا پائی ـــ کہو وہی جس کو تمہاری آتما سچ مانتی ہے ـــ دراصل تم ایک صدی پہلے پیدا ہو گئی ہو ـــ اگر آج نہیں تو سو سال بعد لوگ سمجھیں گے جو تم کہہ رہی ہو۔ تم سو سال بعد پوجی جاؤ گی ـــ"

مجھے ایک نئی روشنی ملی ہے ـــ میں کاغذات اور قلم اٹھا لیتی ہوں وہ آواز ـــ ... "دراصل وہ میری آتما کی آواز ہے جسے کتاب کے اصولوں کی طرح کئی برسوں سے پڑھتی رہی ہوں۔

رفیعہ منظورالامین

رشتہ

کــــردار

نفیسہ ـــــ فرم میں پبلک ریلیشن آفیسر جس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

شاہد ـــــ نفیسہ کا پڑوسی، آزاد منش۔

رضا ـــــ نفیسہ کا شوہر۔

اکبر ـــــ نفیسہ کے ساتھ کام کرنے والا ایک شخص۔

رادھا ـــــ نفیسہ کی سہیلی۔

تہمینہ ـــــ نفیسہ کی لڑکی۔ Teen ager

(ہوٹل کے ایک ٹیبل پر نفیسہ اور اکبر بیٹھے ہیں۔)

نفیسہ :۔ لیکن اکبر! شاید تم نہیں جانتے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔

اکبر :۔ (حیرت اور نا امیدی سے جیسے اُسے cheat کیا گیا ہو) تمہاری شادی ہو چکی ہے۔

نفیسہ :۔ (مسکرا کر) ہاں، تم چونک کیوں رہے ہو ـــــ (رک کر) اور میری ایک لڑکی بھی ہے۔

اکبر :۔ (تقریباً چلّا کر) لڑکی بھی ہے ـــــ! لیکن تم نے، تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔

نفیسہ :۔ تم نے بھی تو پہلے کبھی شادی کی پیش کش نہیں کی تھی۔

اکبر :۔ تم بچہ نہیں ہو نفیسہ ـــــ تم دیکھ رہی تھیں کہ میں تمہاری طرف کھنچا آرہا تھا۔

نفیسہ :۔ عورت کی طرف کون کھنچا نہیں چلا آتا، جبکہ وہ بوڑھی نہ ہو اور خوبصورت بھی ہو (رک کر) اور خاص کر جب وہ اکیلی ہو۔

اکبر :۔ اس کا مطلب ہے مجھ سے پہلے بھی کسی نے ـــــ تم سے تمہیں مانگا تھا ـــــ؟

نفیسہ :۔ (شرارت سے) تو تمہیں حیرت کیوں ہو رہی ہے۔ یا تمہیں میں اس قابل نہیں لگتی کہ کوئی مجھ سے شادی کرنا چاہے ـــ؟

اکبر :۔ (خجل ہو کر) یہ بات نہیں ہے ـــــ یا پھر اسے معلوم نہیں ہوگا کہ تم نے اپنے بے چارے شوہر کو چھوڑ دیا ہے اور تمہاری ایک بچی بھی ہے۔

نفیسہ :۔ (طنزیہ ہنس کر) بے چارا شوہر ـــــ! نہیں، وہ جانتا تھا۔

اکبر :۔ پھر بھی ـــــ پھر بھی وہ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟

نفیسہ :۔ ہاں ـــ

اکبر :۔ پھر کیوں نہیں کی اس نے تم سے شادی!

نفیسہ :۔ تم تو وکیلوں کی طرح جرح کرنے لگے ـــــ اب تمہیں یہ بھی بتانا ہوگا؟

اکبر :۔ ہم ساتھ ہی دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو بتاؤ ـــ

نفیسہ :۔ میں نے ہی انکار کر دیا تھا تہمینہ کی خاطر۔

اکبر :۔ تہمینہ تمہاری لڑکی کا نام ہے ـــ کتنی بڑی ہے وہ؟؟

نفیسہ :۔ تیرہ سال کی، لیکن تب وہ اور بھی چھوٹی تھی۔

اکبر :۔ اور اس کے باوجود تم اب مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھیں؟

نفیسہ :۔ یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ شادی کی پیش کش تم نے کی تھی، میں نے نہیں۔

اکبر :۔ (جھلّا کر) تم بہت تجربہ کار ہو۔

نفیسہ :۔ عورت اور مرد میں یہی تو فرق ہے اکبر۔ مرد کئی تجربوں کے بعد بھی نا تجربہ کار رہتا ہے اور عورت کے پاس ان تجربوں کو دہرانے

بلیوقت نہیں ہوتا۔

بیرہ ؛۔ بیرہ بل لے آؤ ۔۔۔ معاف کرنا نفیسہ مجھے ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ (چلا جاتا ہے)

نفیسہ ؛۔ چلا گیا ۔۔ (طنزیہ ہنستی ہے) جانے بھی آدمی چھوڑ گیا ۔۔۔ لوگ یونہی پیالے آدھے چھوڑ جاتے ہیں۔ مجھے بھی اب چلنا چاہیئے۔

(دوسرا سین)

(نفیسہ کا گھر۔ ڈرائنگ روم میں وہ اور شاہد بیٹھے ہیں۔)

(دونوں کا مِلا جلا قہقہہ)

نفیسہ ؛۔ پھر تو وہ بے چارہ بھاپ بن کر اُڑ گیا۔

شاہد ؛۔ تم نے بھی تو اس کے نیچے سے قالین کھینچ لیا ۔۔۔ اس بے چارے نے کیا کیا۔ رومانٹک تانے بانے بُنے ہوں گے۔

نفیسہ ؛۔ تم سب مرد اس خوش فہمی میں کیوں مبتلا رہتے ہو کہ ہر عورت تم پر ریجھ جائے گی ؟

شاہد ؛۔ اور کیا ۔۔ دیکھو نا ۔۔ ہر کوئی ہماری طرح ہیرو تھوڑے ہی رہتا ہے۔ دوست، جس پر نفیسہ جیسا معجزہ نازل ہو جائے۔

(دونوں ہنستے ہیں)

نفیسہ ؛۔ اوہ شاہد، تمہاری باتیں ۔۔۔۔

شاہد ؛۔ (ایک دم سنجیدہ ہو کر) کیوں، کیا ایسا نہیں ہو سکتا نفیسہ ۔۔ ؟

نفیسہ ؛۔ (ہنستے ہوئے) کبھی کبھی تم ایسا مذاق کرتے ہو کہ سچ کا گمان ہونے لگتا ہے۔

شاہد ؛۔ اور واقعی یہ مذاق نہیں ہو ۔۔۔ تو ؟

نفیسہ ؛۔ (اسی طرح رسانی سے) تو پھر تمہاری ان گنت گرل فرینڈس کا کیا ہوگا ؟ ان کا تو ماتمی جلوس نکلے گا۔

شاہد ؛۔ جب تک میری طرح کے مردوں کی جیبیں گرم ہیں۔ شہرِ بُتاں آباد رہے گا نفیسہ۔

نفیسہ ؛۔ تمہاری ایک بات مجھے پسند ہے۔

شاہد ؛۔ (مُنہ بنا کر) صرف ایک ہی بات ؟

نفیسہ ؛۔ نہیں بابا ۔۔ کئی باتیں ۔۔۔ لیکن فی الحال صرف ایک ہی بات کہ تم خود پر سلیقے سے ہنسنا جانتے ہو۔

شاہد ؛۔ (سنجیدہ) واقعی نفیسہ میں تم سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔

نفیسہ ؛۔ Oh, Et tu brute! ۔ کیوں کرنا چاہتے ہو مجھ سے شادی ؟

شاہد ؛۔ تمہاری خاطر دوست ۔۔۔ نہیں تو کیا کالے چند کی خاطر جو اس روز تمہارے دولت خانے میں کودا تھا ؟

نفیسہ؛۔ فی الحال تو تم اور وہ کالا چند دونوں میری نظر میں ایک سے ہیں. اب سدھارو مجھے رادھا کے پاس جانا ہے۔

شاہد ؛۔ (ٹھنڈی سانس) کیا زمانہ آگیا ہے، لوگ کرشن کنہیا کو چھوڑ کر رادھا کے پیچھے دوڑنے لگے ہیں۔ اچھا دوست تم سے پھر کبھی نپٹیں گے۔ اب چلتے ہیں۔

(تیسرا سین)

(رادھا کا گھر)

رادھا ؛ ۔۔۔۔ آج پھر کچھ ہوا ہے ؟

نفیسہ ؛۔ (طنز سے ہنس کر) جب تک میری آنکھوں میں چمک ہے ۔۔ بالوں میں سیاہی اور کمر میں خم ہے تب تک ہوتا ہی رہے گا۔

رادھا ؛۔ اور تجھے شاید انتظار ہے ان ہی سب باتوں کے ختم ہونے کا ۔۔ ؟

نفیسہ ؛۔ انتظار سے کیا ہوتا ہے رادھا ۔۔۔ کچھ انجام انتظار کے محتاج نہیں ہوتے۔

رادھا ؛۔ کبھی کبھی تیرا یہ نراش وادی موڈ ۔۔ بس تجھے پیٹ دینے کو جی چاہتا ہے۔ ارے کمبخت تو نے دوسری شادی کیوں نہیں کر لی ؟

نفیسہ ؛۔ اور رضا ۔۔ ؟

رادھا ؛۔ رضا سے تو نے طلاق مانگی ہی کب ۔۔۔ وہ اب تک امریکہ میں کتنی شادیاں رچا کر ان عورتوں کو چھوڑ چکا ہوگا۔

نفیسہ ؛۔ مجھے طلاق کی ضرورت نہیں ۔۔ میرے پاس تہمینہ ہے۔

رادھا ؛۔ دوسرے الفاظ میں تیرا خیال ہے کہ تہمینہ کی محبت رضا کو واپس کھینچ لائے گی ؟

نفیسہ ؛۔ رادھا تجھے زخموں کو ٹٹولنے کی بڑی عادت ہے۔

رادھا ؛۔ تجھے ایسے ہی جراح کی ضرورت ہے جو تیرے زخموں میں نشتر گھول دے ۔۔ تو ہی بتا ۔۔ رضا کے دل میں اس بچی کی محبت کیسے جاگے گی جسے اس نے دیکھا ہی نہیں ؟

نفیسہ ؛۔ ہاں ۔۔ وہ مجھے شادی کے چار مہینے بعد ہی چھوڑ گئے تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ وہ باپ بننے والے ہیں۔

رادھا ؛۔ اوا، د' عورت اور مرد میں مختلف جذبات ابھارتی ہے نفیسہ ۔۔۔ عورت میں ایثار اور قربانی کا ۔۔۔ مرد میں انا اور فخر کا ۔۔۔ کیا تہمینہ رضا کے بارے جانتی ہے ؟

نفیسہ :۔ میں نے اسے اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ نہیں رہے ۔ جو جھوٹ بھی نہیں تھا ۔۔۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔

رادھا :۔ لیکن کیا ۔ ؟

نفیسہ :۔ اوہ رادھا ۔ میں تہمینہ کو جتنا بچہ سمجھتی تھی وہ ایسی نہیں ہے ۔

رادھا :۔ کیوں، کیا ہوا ؟

نفیسہ :۔ ایک دن میں اس کا کمرہ صاف کر رہی تھی ۔ اس کی میز کی دراز میں مجھے اس کی ڈائری ملی ۔۔۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ باقاعدہ ڈائری لکھا کرتی ہے ۔

رادھا :۔ کیا لکھا تھا ڈائری میں ؟

نفیسہ :۔ اس نے لکھا تھا "ممی کہتی ہیں، بابا اب نہیں رہے ۔۔۔ لیکن دوسرے لوگ کوئی اور کہانی سُناتے ہیں ۔۔۔ ہم یہ بات ممی سے پوچھ بھی نہیں پائیں گے ۔ کتنا اچھا ہوتا جو ہمارے بھی بابا ہوتے جیسے رینو، ستارہ اور فاطمہ کے ہیں ۔ لیکن ہمارے بابا تو ہیں بھی اور نہیں بھی ۔۔ " تب سے میرے دل پر بوجھ سا ہے رادھا شاید اس کا معصوم دماغ بھی دنیا کی طرح مجھے کٹہرے میں کھڑا ایک ملزم سمجھتا ہے ۔

رادھا :۔ جب وہ اتنی سمجھ دار ہے تو تم اسے رضا سے علیحدگی کی اصلی وجہ کیوں نہیں بتا دیتیں ؟

نفیسہ :۔ دنیا کے سقراطوں نے نہیں سمجھا تو وہ کیا سمجھے گی رادھا ۔ ابھی اس کا ذہن اتنا پختہ نہیں ہے ۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس کی سہیلیوں کے ماں باپ آپس میں پیار بھی کرتے ہیں لڑتے جھگڑتے بھی ہیں ۔۔۔ لیکن پھر بھی اندھیری رات میں چاندنی کی طرح گھل بھی جاتے ہیں ۔ وہ ابھی اس بات کو سمجھ نہیں پاتی کہ رضا کیوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے ۔

رادھا :۔ سچ پوچھو تو یہ بات کسی اور بھی سمجھ میں آنی مشکل ہے کہ رضا نے کیوں تمہاری قدر نہیں کی ۔

نفیسہ :۔ میں انہیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکتی رادھا ۔۔۔ میں اس وقت وہ نہیں تھی جو اب ہوں ۔۔۔ وہ اپنے ذہنی سفر میں جتنے آگے نکل گئے تھے، وہاں انہیں پندرہ سولہ سالہ خوبصورت نوخیز کلی کی ضرورت نہیں تھی جس کا ذہنی طور پر ان سے کوئی مقابلہ ہی نہ ہو ۔۔۔ انہیں آندھیوں میں جلتے رہنے والے چراغ کی ضرورت تھی جو دور تک روشنی پھیلا سکتا ہو (ٹھنڈی سانس) اور تم جانتی ہو، میں تو ہتھیلیوں کی اوٹ میں پلنے والا دیا تھی ۔

رادھا :۔ پھر کیوں کی انہوں نے تم سے شادی ؟ وہ مجبور تو نہیں تھے ؟

نفیسہ :۔ وہ مجبور کر دیئے گئے تھے ۔ ان کے ماں باپ کو اچھی لڑکی کی شادی کے لئے پیسہ چاہیئے تھا، جس کی ہمارے پاس کمی نہیں تھی ۔ اور میرے ماں باپ کو ایک ہینڈسم پڑھے لکھے داماد کی ضرورت تھی ۔۔۔ جواری جیت گئے لیکن مہروں نے جان لٹا دی ۔

(Pause)

رادھا :۔ نفیسہ، تم رضا کو پیار کرتی ہو ؟

(نفیسہ چپ رہتی ہے)

رادھا :۔ خاموش کیوں ہو ۔۔۔ شاید کرتی ہو ۔

نفیسہ :۔ میں کیسے کہہ سکتی ہوں رادھا ۔۔۔ میں نہیں جانتی ۔ پھر بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رادھا :۔ پھر بھی ؟

نفیسہ :۔ پھر بھی، وہ میری بچی کے باپ ہیں ۔۔۔ پگڈنڈی شاہراہ میں تبدیل ہو جائے پھر بھی اس پہلے قدم کو نہیں بھولتی جو سب سے پہلے اس کے آنچل پر پڑا ہو ۔

رادھا :۔ تو کیا تم پھر اس پگڈنڈی پر واپس نہیں جا سکتیں ؟

نفیسہ :۔ (اداس ہنسی) کیسے جا سکتی ہوں ۔۔۔ وہ پگڈنڈی اب شاہراہ بن چکی ہے ۔۔۔ بہت بھیڑ ہے وہاں ۔

رادھا :۔ تم کوشش تو کر دیکھو ۔۔۔ شاید کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آ جائے ۔

نفیسہ :۔ نہیں رادھا ۔۔۔ میری خود داری اس بات کی اجازت نہیں دیتی ۔

رادھا :۔ لیکن تم جس راستے پر جا رہی ہو نفیسہ، وہ راستہ بہت تنہا ہے، تم ابھی جوان ہو، خوبصورت ہو ۔۔۔ اس راستے پر رہزنوں کا ڈر ہے ۔ تمہارے قدم جب تھک جائیں گے تب کیا ہوگا ۔۔۔ ؟

نفیسہ :۔ تم ٹھیک کہتی ہو ۔ میں تھکنے لگی ہوں ۔۔۔ شاید تم اور شاہد دونوں ہی مجھے اس بات کا احساس اور بھی زیادہ دلا رہے ہو ۔

رادھا :۔ شاہد، تمہارا ہینڈسم پڑوسی ؟ تم نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا تھا ۔

نفیسہ :۔ ہاں جس رات میرے گھر چور آیا تھا ۔۔۔ شاہد نے ہی میری مدد کی تھی ۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ اکیلی عورت کی کیا مشکلات ہوتی ہیں ۔ اور کچھ دن بعد شاہد نے مجھ سے شادی کی خواہش ظاہر کر دی تھی ۔

رادھا :۔ اور تم نے نہایت بے وقوفی سے اسے باتوں میں اڑا دیا تھا ۔ !

نفیسہ :۔ میں کیا کر سکتی تھی رادھا ۔ میں جانتی ہوں تہمینہ اس

بات کو ہرگز نہیں مانے گی۔

رادھا :۔ اور شاہد، پھر اس نے کچھ نہیں کہا !

نفیسہ :۔ اس کا ظرف بڑا ہے رادھا ـــ اس نے شائد میرے انکار کو مجبوری سمجھا۔ وہ مجھے وقت دینے تیار ہے۔

رادھا :۔ تمہارا دامن تنگ ہے نفیسہ ـــ وقت کے ساتھ اتنا نہ کھیلو کہ وقت تم پر حاوی ہو جائے۔

نفیسہ :۔ ایک شاہد ہی صرف مجھ سے شادی کا خواہش مند نہیں ہے رادھا، لیکن زندگی کے ایک تلخ تجربے کے بعد کسی پودے پر پیر رکھتے گھبراتی ہوں کیا پتہ کب ٹوٹ جائے۔

رادھا :۔ یہ تو تمہارا دل ہی بتا سکتا ہے کہ شاہد کے ہاتھ اور اُن اَن گنت ہاتھوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں جو تمہارے دامن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

نفیسہ :۔ صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے رادھا۔

رادھا :۔ اور کون سی وجہ ہے ؟

نفیسہ :۔ (رُک رُک کر) ہو سکتا ہے ـ شائد ـــ شائد کبھی ـ ـ ـ ـ

رادھا :۔ بات پوری نہ کرو نفیسہ ـــ میں بھی عورت ہوں سمجھتی ہوں۔

(چوتھا سین)

(نفیسہ کا گھر)

تہمینہ :۔ شاہد انکل۔ آپ بھی اندر آجائیے۔ ممی آفس سے آرہی ہوں گی۔

شاہد :۔ نہیں بھائی اپنی تو ڈیوٹی پوری ہو گئی تمہیں اسکول سے لاکر چھوڑ دیا۔ اب جاتے ہیں۔

تہمینہ :۔ آگئیں ممی۔

شاہد :۔ ارے اب تو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔ صرف ایک کپ گرم گرم چائے کے لئے۔

نفیسہ :۔ آج مجھے دیر ہو گئی۔

تہمینہ :۔ شاہد انکل ہمیں اسکول سے لے آئے ہیں۔

نفیسہ :۔ یہ تو تم نے معمول ہی بنا لیا۔ اتنی تکلیف کیوں کرتے ہو تم۔ اس کا اسکول تو پاس ہی ہے۔

شاہد :۔ اس میں تکلیف کا کیا سوال ہے۔ میں آفس سے آتا رہتا ہوں، اور یہ اپنی ننھی منی چوٹیاں ہوا میں نچاتی سڑک کے ایک کنارے آرہی ہوتی ہے اور میں کار میں بٹھا لیتا ہوں۔

نفیسہ :۔ تہمینہ جاؤ، غفور بی سے کہو چائے بنا لائے۔

تہمینہ :۔ پھر ہم ریحانہ کے پاس جائیں گے چاہے comics لانے ہیں۔

(چلی جاتی ہے)

شاہد :۔ بہت پیاری ہے۔

نفیسہ :۔ اپنی عمر سے کچھ زیادہ سمجھ دار ہے۔

شاہد :۔ شائد تم اسی وجہ سے ڈرتی ہو !

نفیسہ :۔ اب تو شائد ڈر کی یہی ایک وجہ رہ گئی ہے۔

شاہد :۔ میں سمجھا نہیں۔

نفیسہ :۔ یہ خط دیکھو۔ (خط دیتی ہے) (شاہد خط پڑھتا ہے)

شاہد :۔ (خط بند کرتے ہوئے) ہوں۔ رضا صاحب کا خط ہے۔ وہ، اگر تم چاہو تو طلاق دینے کے لئے تیار ہیں ـــ کیا سوچ رہی ہو نفیسہ۔؟

نفیسہ :۔ یہی تو مشکل ہے شاہد ـــ ایسا لگتا ہے جیسے میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی۔

شاہد :۔ تو پھر مجھ پر بھروسہ رکھو۔ ہماری ملاقات لڑکپن اور جوانی کے رومانوی دور میں نہیں ہوئی۔ ہم ایک دوسرے کو کچھ ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر پسند کرتے ہیں۔

نفیسہ :۔ میں جانتی ہوں شاہد ـ لیکن تہمینہ، بلا شرکت غیرے مجھے اپنا سمجھتی ہے۔ اسے اگر باپ کی محبت نہیں ملی ہے تو میں اُسے اپنی ممتا سے بھی محروم کرنا نہیں چاہتی۔

شاہد :۔ تم پاگل ہو رہی ہو نفیسہ ـ تہمینہ اُبھرتا چاند ہے ـ وہ جب ساری دنیا کو اپنی باہنوں میں بھر لے گی تو تم بس سایہ ہی سایہ ہو کر رہ جاؤ گی۔

نفیسہ :۔ لیکن میری طرح تمہیں تو کسی نے نہیں ٹھکرایا تم مجھے کیوں اپنانا چاہتے ہو ؟ تمہیں اور کئی لڑکیاں مل جائیں گی ـ مجھ سے زیادہ خوبصورت، جوان ـ ـ ـ ـ

شاہد :۔ بس ہے ایک انداز جنون اپنا بھی ـــ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے تمہارا بال بنانے کا انداز پسند نہیں ہے ـــ تمہارا یہ بات کرتے کرتے نظروں کو جھکا لینا مجھے دیوانہ نہیں بناتا ـــ اپنی تعریف سن کر تمہارے گالوں میں چڑھ آتے گلابی رنگ کے چھینٹے مجھ پر نہیں گرتے ـ لیکن اِن سب باتوں کے علاوہ میں تمہیں اس لئے پیار کرتا ہوں کہ تم ـــ تم ہو۔

نفیسہ :۔ (مدھم) تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں شاہد۔

شاہد :۔ کیوں نہیں نفیسہ ـــ مجھے رضا پر رحم آتا ہے لیکن

میں ان کا شکر گزار بھی ہوں کہ وہ تمہیں طلاق دینے کے لئے تیار ہیں۔
ایسی صورت میں میں اپنے پیار کے کھلے اظہار میں کوئی قباحت نہیں
دیکھتا ــــ حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تم معصوم منہ بند کلی ہو نہ میں نے
فرشتوں کا دامن تھام رکھا ہے ــــ رضا کو چھوڑ جانے کے
بعد تم نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں ــــ اپنے مالدار باپ کی پناہ لینے
کی بجائے اپنی کوشش اور کشمکش سے ایک خود مختار زندگی بسر کر رہی ہو۔
میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔

نفیسہ :۔ لیکن یہ سب کچھ میں نے تہمینہ کی خاطر کیا ــــ میں
دوسروں کے سہارے اس کی پرورش کر کے اس میں احساسِ کمتری
نہیں پیدا ہونے دینا چاہتی تھی۔

شاہد :۔ لیکن تم دیکھنا یہی تہمینہ ایک دن تمہیں اپنی زندہ یتیمی
کا ذمہ دار ٹھہرائے گی۔

نفیسہ :۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ــ (کمزور پڑ کر) شاہد ــ
اب میں بہت تھک گئی ہوں مجھے اپنی باتوں میں مت الجھاؤ ــــ
لو چائے پیو اور دو چار لطیفے سنا کر چلتے بنو (اسے چائے دیتے
ہوئے اداسی سے ہنستی ہے) چائے کے پیالے میں اٹھتے بخارات
کے اس طوفان کو دیکھ رہے ہو نا ــ یہی حالت اس وقت تمہاری ہے۔
کچھ دیر میں یہ طوفان بیٹھ جائے گا۔ فکر نہ کرو۔

شاہد :۔ چھ مہینوں میں یہ طوفان نہیں بیٹھا دوست ــــ بلکہ
اب موجوں نے استقلال سے بہنا شروع کر دیا ہے ــ لیکن کیا تم یہ کہہ
سکتی ہو کہ اس خلا میں تمہارے دل کی آواز کی گونج بڑھتی نہیں جا رہی
ہے۔ خلا جسے جان بوجھ کر تم نے اپنے اطراف محیط کر رکھا ہے۔
تمہاری روح محبت کی پیاسی ہے نفیسہ، کیوں کہ اس شجرِ ممنوع کی
چھاؤں میں تم نے دم لیا ہی نہیں۔

نفیسہ :۔ شاہد!

شاہد :۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سہارے آگے بڑھیں گے
میں تمہیں دنیا کے ہر الم سے بچاؤں گا اور تم میری ہمت بنے رہنا۔ تمہیں
دوسروں کو سہارا دینے کی عادت ہو گئی ہے۔ کبھی کسی کا سہارا لینے
میں بھی مزہ آتا ہے ــ لے کر دیکھو۔

نفیسہ :۔ میں نے برسوں تنہا زندگی گزاری ہے شاہد۔ اب
مجھے تنہائی ڈستی نہیں۔

شاہد :۔ جھوٹ کہہ رہی ہو، عورت کی تنہائی آنسوؤں سے تر
رہتی ہے ــــ میں نے خود کئی بار تمہارے دل نشیں چہرے کو شبنم سے تر
دیکھا ہے جسے چھپانے کے لئے تم بناوٹی قہقہے لگاتی رہی ہو۔ کیا تم
نے کبھی بند آنکھوں سے کوئی دلفریب [illegible]
کئے؟ تمہارے سر سے کتنی چاندنی راتیں گزر گئیں ــ کیا کبھی چاندنی راتوں
میں محض کسی کا ہاتھ تھامے خاموش بیٹھے رہنے کی آرزو نے تمہارے
دل میں کروٹ نہیں لی؟ (نفیسہ کی سسکیاں) تم حسین ہو نفیسہ ــــ خاصہ
کماتی ہو ــــ اونچی سوسائٹی میں تمہارا رسوخ بھی ہے۔ بہت سے مرد تم سے
شادی کرنے کے خواہش مند ہوں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ہوس اور
سچے پیار میں فرق محسوس کر سکتی ہو۔ اب میں بھی اپنی بے راہ روی کی زندگی
سے اکتا گیا ہوں۔ جب سے میرے دل میں تمہاری محبت جاگی ہے، میں
نے کسی اور لڑکی کی طرف نظریں نہیں اٹھائی ہیں۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا
ہوں۔

نفیسہ :۔ اور تہمینہ ــــ بتاؤ تم تہمینہ کو بھی ایک باپ کا پیار
دے سکو گے؟

شاہد :۔ (ہنستا ہے) تہمینہ سے چند سال بڑی لڑکیوں سے
تو میں نے فلرٹ کیا ہے۔ یہ کیسے کہہ دوں کہ میں اسے باپ کا پیار دوں گا۔
ہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کے لئے ایک بہترین اور شفیق دوست بن
جاؤں گا ــــ (رک کر) اور دوستی میری نظر میں بہت مقدس جذبہ ہے،
نفیسہ ــــ میں اس کی آبرو کا پاس رکھوں گا۔

نفیسہ :۔ شاہد تمہاری صاف گوئی آہستہ آہستہ جیت
رہی ہے۔ لیکن مجھے کچھ وقت اور دو۔ میں جانتی ہوں تہمینہ بھی تمہیں
پسند کرتی ہے۔ اسے میں نے کسی اور کے ساتھ اتنا کھلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

شاہد :۔ شائد وہ آ رہی ہے ــ میں چلتا ہوں ــــ تمہارے
جواب کا انتظار رہے گا۔

(تہمینہ آتی ہے)

تہمینہ :۔ ممی، کیا شاہد انکل چلے گئے؟

نفیسہ :۔ ہاں، افوہ اتنے ڈھیر سارے comics ــ ریحانہ
کے پاس سے اتنے سارے کیوں اٹھا لائیں۔

تہمینہ :۔ واہ یہ تو میرے ہیں! ریحانہ پڑھنے لے گئی تھی۔

نفیسہ :۔ اتنے سارے تمہارے پاس کیسے آئے؟

تہمینہ :۔ انکل شاہد نے دلائے تھے۔

نفیسہ :۔ (تہدید) تمہیں اس طرح بے تحاشہ تحفے نہیں وصول
کرنے چاہئیں۔

تہمینہ :۔ لیکن یہ تو انہوں نے ہمیں انعام میں دیئے تھے۔

نفیسہ :۔ انعام کیسا؟

تہمینہ :۔ ہم نے ان کے LP ریکارڈز کو آرڈر میں جمایا تھا۔

نفیسہ :۔ تو تم ان کے گھر گئی تھیں ؟

تہمینہ :۔ تو کیا ہوا جب آپ گھر پر نہیں ہوتی ہیں تو ہم ان کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ممی ان کی لائبریری بہت اچھی ہے

نفیسہ :۔ تو تم کتابیں ان سے مانگ لاتی ہو ۔۔ اور کون رہتا ہے ان کے گھر میں ؟

تہمینہ :۔ کوئی نہیں۔ بس وہ اور ان کا بوڑھا نوکر، جسے ہم پیر فرتوت کہتے ہیں۔

نفیسہ :۔ تم پہلے تو کبھی نہیں جاتی تھیں ان کے پاس !

تہمینہ :۔ وہ کبھی پہلے گھر میں رہتے بھی تو نہیں تھے۔ بس وہ پیر فرتوت ہی رہتا تھا ۔۔ وہ ہمیں زہر لگتا ہے۔ ہم اور ریحانہ جب بھی جاتے تو وہ امرود کے پیڑ کے پاس سے ہٹتا ہی نہیں۔ جب سے شاہد انکل سے دوستی ہوئی ہے یہ مصیبت ختم ہو گئی۔

نفیسہ :۔ کیسے ؟

تہمینہ :۔ ہمیں اشارہ کر کے انکل شاہد اسے کسی کام کے بہانے بلا لیتے ہیں اور ہم دو منٹ میں امرود توڑ کر بھاگ آتے ہیں۔

نفیسہ :۔ تہمینہ اب تم بچّہ نہیں ہو ۔۔ اب یہ بھاگ دوڑ ٹھیک نہیں ہے۔

تہمینہ :۔ (سنجیدہ) ہاں ممّی ہم اب بچّہ نہیں ہیں ۔۔ لیکن انکل شاہد اتنا پیار دیتے ہیں کہ ان کے ساتھ بچّہ بن جانے کو دل چاہتا ہے ۔۔ وہ بہت اچھے ہیں۔

نفیسہ :۔ وہ تمہیں پسند ہیں ۔۔ کیوں ؟

تہمینہ :۔ وہ کبھی ایسا محسوس ہی نہیں ہونے دیتے کہ ہم ان سے اتنے چھوٹے ہیں۔ برابری کا برتاؤ کرتے ہیں ہمارے ساتھ۔

نفیسہ :۔ ابھی تو تم نے کہا کہ ان کے ساتھ بچہ بن جانے کو جی چاہتا ہے ۔۔ !

تہمینہ :۔ دل چاہتا ہے ممّی ۔۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ ہم بچّہ بن جاتے ہیں ۔۔ ہم کبھی سوچتے ہیں ممی ۔ ۔ ۔ کبھی سوچتے ہیں ... ۔۔۔ خیر جانے دیجئے۔

نفیسہ :۔ کیا کہنا چاہتی ہو تہمینہ ؟

تہمینہ :۔ (رُک رُک کر) ہمارے بھی بابا ہوتے تو کتنا

(وقفہ)

نفیسہ :۔ تہمینہ !

تہمینہ :۔ سوری ممی۔ ہم آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے ۔۔ ہم کہنا چاہتے تھے کہ انکل شاہد کو دیکھ کر بابا کی آرزو ہوتی ہے۔

نفیسہ :۔ وہ تمہیں بہت پسند ہیں ۔۔ ؟

تہمینہ :۔ کون ۔۔ انکل شاہد ۔۔ ! ہاں۔

نفیسہ :۔ (رُکتے رُکتے) تہمینہ ۔۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ۔۔ تم سمجھ دار ہو۔

تہمینہ :۔ کیا بات ہے ممّی ؟

نفیسہ :۔ تہمینہ ۔۔ میں ۔۔ میں ۔۔ اگر انکل شاہد سے شادی کر لوں ۔۔ تو ؟

(سکوت۔ تہمینہ چونک کر اسے دیکھتی ہے اور پھر مڑ کر جانے لگتی ہے)

نفیسہ :۔ تہمینہ، کہاں جا رہی ہو ۔۔ ؟

تہمینہ :۔ (رکھائی سے) اپنے کمرے میں۔

نفیسہ :۔ تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

تہمینہ :۔ تو سنیئے ۔۔ آپ نے ایسا کیا تو ہم زندگی بھر آپ کو معاف نہیں کریں گے۔

نفیسہ :۔ تہمینہ، رکو، میری بات سنو۔ (لیکن تہمینہ چلی جاتی ہے)

نفیسہ :۔ (پکار کر) یہ Comics اٹھالے جاؤ یہاں سے۔

تہمینہ :۔ انہیں جلا دیجئے ۔ اب ہم انہیں ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ (چلی جاتی ہے)

(پانچواں سین)

شاہد :۔ نفیسہ۔ نفیسہ ۔۔ رو رہی ہو تم ؟

نفیسہ :۔ چلے جاؤ شاہد ۔۔ اب تم یہاں کبھی مت آؤ۔

شاہد :۔ کیا ہوا ہے تمہیں ۔۔ میں پوچھنے آیا تھا کہ آج تہمینہ نے میرے ساتھ آنے سے انکار کیوں کر دیا ؟ وہ مجھ سے بولی بھی نہیں۔

نفیسہ :۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی۔ مجھے تم سے وہ سب کچھ مل رہا تھا شاہد جس کے لئے میں ترستی تھی ۔۔ لیکن اس کے لئے تہمینہ راضی نہیں ہے۔

شاہد :۔ نفیسہ۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تہمینہ ابھی بچّہ ہے۔ مجھے یقین ہے میں اسے منا لوں گا۔

نفیسہ :۔ نہیں شاہد، وہ لڑکپن اور جوانی کی خطرناک حد پر کھڑی ہے۔ جہاں باپ کی شخصیت خیالات پر حاوی رہتی ہے۔

شاہد :۔ اس باپ کی جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں !

نفیسہ :۔ شاید اسی وجہ سے اس کا یہ احساس شدید تر ہے۔

شاہد :۔ نفسیات میں تمہارا تجربہ محدود ہے دوست۔ تم نے صرف ماں کی طرح تہمینہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اسے ایک فرد کی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

نفیسہ :۔ اس نے خود کو محصور کر لیا ہے شاہد ـــ مجھے خود تک پہنچنے نہیں دیتی۔

شاہد :۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔

نفیسہ :۔ شائد تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اپنے مسائل خود حل کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔

شاہد :۔ مجھے موقع دو نفیسہ میں تمہاری ذہنی کشمکش ختم کر دوں گا۔ تمہیں ایک ایسی کمزور اور مجبور عورت بنا دوں گا جس جس کے سہارے کے بغیر مرد دو قدم بھی نہ چل سکے۔ آج تم نے بھی اقرار کر لیا ہے کہ تمہارے دل میں بھی میرے لئے کچھ جگہ موجود ہے۔ انکار کر سکو تو کر دو۔

نفیسہ :۔ میں انکار نہیں کروں گی۔ نہیں کرنا چاہتی ـــ لیکن تم بدقسمتی سے تہمینہ کے باپ نہیں ہو ـــ وہ تمہیں قبول نہیں کریگی۔ میں نے اس کے لئے ہر چھوٹی بڑی قربانی دی ہے ـــ لیکن آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے اس کے لئے بہت بڑی قربانی دے دی ـــ لیکن شاہد ـــ آج کے بعد شائد میں وہ نفیسہ نہ رہوں ـــ جو تھی۔

شاہد :۔ ٹھیک ہے دوست ـــ تم کہتے ہو تو ہم چلے جاتے ہیں ـــ لیکن اتنا خیال رکھو کہ ہم گیا وقت نہیں ہیں ـــ جب چاہو ـــ اک ذرا گردن جھکا کر دیکھ لو۔

(چلا جاتا ہے)

(چھٹا سین)

رادھا :۔ نفیسہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ـــ کچھ اکھڑی اکھڑی سی باتیں کرنے لگی ہو۔

نفیسہ :۔ میں ـــ میں نے کیا کیا؟

رادھا :۔ ابھی آتے میں پولس مین نے سانڈ بتانے میں دیر کی تو تم اس سے اُلجھ پڑیں۔

نفیسہ :۔ دراصل دفتر میں بہت تھک جانے لگی ہوں میں رادھا

رادھا :۔ مصرا صاحب جو تمہاری فرم میں کام کرتے ہیں کہہ رہے تھے کہ تم خوب جم کر کام کرتی ہو ـــ تبھی تمہاری ترقی بھی ہو گئی ہے ـــ مبارک ہو۔

نفیسہ :۔ (صرف ہنس کر رہ جاتی ہے)

رادھا :۔ لو تہمینہ بھی آگئی۔

تہمینہ :۔ (تھکی تھکی) ہلو آنٹی۔

نفیسہ :۔ (بپھر کر) تہمینہ تمہیں اسکول سے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی۔

تہمینہ :۔ ٹیوٹوریل کلاس تھی میری۔

نفیسہ :۔ روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی ہو۔ کہاں رہتی ہو تم۔ خاموش کیوں ہو جواب دو۔

تہمینہ :۔ ہمارا دل گھر آنے کو نہیں چاہتا۔

نفیسہ :۔ کیوں، پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔

تہمینہ :۔ پہلے اور بھی بہت کچھ نہیں ہوتا تھا ممی۔

(چلی جاتی ہے)

نفیسہ :۔ تہمینہ، تہمینہ ـــ سنو۔

رادھا :۔ یہ سب ٹھیک نہیں ہے نفیسہ۔ تمہاری ذاتی محرومی نے تمہیں دفتر میں ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر تو بنا دیا ہے۔ لیکن کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تم ایک کامیاب ماں کی ڈگر سے دور ہوتی جا رہی ہو!

نفیسہ :۔ کون کہتا ہے ـــ تہمینہ کی کونسی خواہش ہے جو میں پوری نہیں کرتی ـــ وہ کونسی قربانی ہے جو میں نے اس کے لئے نہیں دی۔

رادھا :۔ بس یہی احساس تو تمہیں کھائے جا رہا ہے کہ تہمینہ کے لئے تم نے بڑی قربانی دے دی ہے۔ اس کی خاطر تم نے اپنی آرزوئیں پامال کر لی ہیں۔ اب تہمینہ تمہارے پھٹے دامن کو جوڑتا ایک کانٹا بن گئی ہے نہ تم دامن سینا جانتی ہو نہ کانٹا پھینکنے بن پڑتا ہے۔

نفیسہ :۔ تم غلط کہہ رہی ہو ـــ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ اب مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں نے خود کو دفتری مصروفیات میں گم کر لیا ہے۔

رادھا :۔ ہاں یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ تم دن بدن کمپیوٹر بنتی جا رہی ہو۔

نفیسہ :۔ میں اس میں خوش ہوں۔

رادھا :۔ تم اسے خوشی کہتی ہو؟

نفیسہ :۔ (برداشت سے باہر) میں کیا کروں رادھا پھر۔ کیا مجھے زندگی میں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ عورت صرف ایک ماں نہیں ہوتی ـــ میں نے اپنی بھری جوانی زندگی سے ہاتھا پائی کرتے گزار دی۔ لیکن اب دور کھڑا بڑھاپا مجھے ڈرا رہا ہے۔ میں بے سہارا تنہا اور ناکردہ گناہ محسوس کرنے لگی ہوں۔

رادھا :۔ تم جو رضا کے چھوڑ جانے کے بعد کہتی تھیں کہ زندگی گزارنے کے لئے کسی مرد کی ضرورت نہیں ہوتی ـــ؟

نفیسہ :۔ ہاں، اس وقت میری ہر سمت بجلیاں کوند رہی تھیں۔ لیکن آپ میں دولت سے اندھیروں کے بادل اٹھتے صاف دیکھ رہی ہوں۔

رادھا :۔ یہ بہت عامیانہ سی بات ہے نفیسہ ۔۔۔ تم کسی تھرڈ ریٹ ناول کے کردار کی طرح بات کر رہی ہو۔

نفیسہ :۔ یہ تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ تمہیں ان کی محبت حاصل ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کا چراغ جلتا رکھتے ہو۔۔۔ تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے رادھا۔ مجھے رومانس کی تلاش نہیں ہے۔ مجھے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو مجھ سے برتر ہو ۔۔۔ جو صرف میری خوشیاں ہی نہیں میرا غم بھی چھین لے ۔۔۔ اور میں اسی میں مطمئن رہوں ۔۔۔ جب میں زندگی کے خاردار راستے سے گزروں تو بس ایک احساس بن کر میرے ساتھ رہے کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ میں اپنے احساس محرومی سے تنگ آگئی ہوں رادھا۔

رادھا :۔ لیکن اس کے لئے عورت کو کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں نفیسہ ۔ تمہیں ایک موقعہ ملا تھا جو تم نے کھو دیا ۔۔۔ تم نے شاہد سے شادی کر لی ہوتی ۔ تم تہمینہ کے لڑکپن سے ڈر گئیں جواب جوانی کی سرکش حدوں میں داخل ہو گیا ہے۔

نفیسہ :۔ لیکن اب بھی میں تہمینہ کے لئے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ اس کے سوائے میری زندگی میں اور کچھ نہیں ہے۔

رادھا :۔ لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بھی تمہیں اتنا ہی پیار کرتی ہے ۔۔۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ جب سے تم نے شاہد سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا ہے وہ تمہیں ایک غدار کی نظر سے دیکھنے لگی ہے۔

نفیسہ :۔ ایسے نہ کہو رادھا ۔۔۔ میں پھر بھی اس کی ماں ہوں۔

رادھا :۔ رات ہو رہی ہے نفیسہ ۔۔۔ اب میں چلوں۔

نفیسہ :۔ پھر کب آؤ گی ؟

رادھا :۔ جلد آؤں گی۔

(رادھا چلی جاتی ہے۔ نفیسہ اس کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھتی ہے ۔۔۔ کال بیل بجتی ہے۔)

نفیسہ :۔ (چونک کر) اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ تہمینہ جاگ نہ پڑے یونہی اسے بخار ہو رہا ہے گھنٹی پھر بجتی ہے۔

(نفیسہ اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے ۔۔۔ سہم کر ایک قدم پیچھے ہو جاتی ہے۔)

نفیسہ :۔ کون ۔۔۔ کون ہیں آپ ۔۔۔ کو ۔۔۔ ن ۔

(خاموش ہو جاتی ہے)

رضا :۔ میں ۔۔۔ وہ معاف کیجئے گا شائد میں غلط پتے پر آ گیا ہوں ۔ لیکن گھر کا نمبر اور نام تو وہی ہے ۔۔۔ کیا یہاں مسز نفیسہ ۔۔۔

نفیسہ :۔ جی ۔۔۔ ہاں میں نفیسہ ہوں (رک کر) اور آپ غلط پتے پر نہیں آئے ہیں۔

رضا :۔ نفیسہ ۔۔۔ آپ ۔۔۔۔ تم بہت بدل گئی ہو۔

نفیسہ :۔ لیکن آپ زیادہ نہیں بدلے ۔ (تکلف سے) بتایئے کیسے تکلیف کی۔

رضا :۔ (خوش مزاجی سے) مجھے اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہو گی؟

نفیسہ :۔ (تامل سے) اتنی رات گئے۔

رضا :۔ شائد میں اتنا بھی غیر نہیں کہ رات میں اپنی بیوی کے گھر بھی نہ جا سکوں۔

نفیسہ :۔ اپنایت اور غیریت کے جو اصول دنیا نے بنا رکھے ہیں ۔۔۔ اس لحاظ سے تو نہیں ۔۔۔۔

رضا :۔ لیکن تمہارے لئے شاید میں اجنبی ہوں۔

نفیسہ :۔ یہ تو آپ ہی بہتر جانتے ہیں ۔۔۔ بہتر ہوتا آپ سویرے آتے ۔ میں ساڑھے نو بجے تک گھر ہی رہتی ہوں۔

رضا :۔ (بے چین) Let us be civilised

نفیسہ ۔ میں سیدھا ایئر پورٹ سے چلا آ رہا ہوں ۔ اور تم ہی سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔

نفیسہ :۔ آپ نے مجھے پہلے خبر دی ہوتی۔

رضا :۔ (ہنس کر) تاکہ تم کسی ہوٹل میں میرا انتظام کروا دیتیں ۔۔۔ کیوں نہ ہو اب تم ایک کامیاب ترین پبلک ریلیشن آفیسر ہو۔

نفیسہ :۔ اور شاید اسی ناطے میں آپ کو اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں ۔ آ جایئے۔

رضا :۔ شکریہ ۔ (اندر آ کر بیٹھ جاتا ہے)

رضا :۔ کہاں جا رہی ہو نفیسہ ۔۔۔ ؟

نفیسہ :۔ ۔۔ Fridge میں کھانا رکھا ہے ۔۔ لے آؤں ۔۔۔ آپ نے کھایا نہیں ہو گا۔

رضا :۔ How homely ۔ کچھ دو گی تو ضرور کھاؤں گا ۔۔۔ ویسے مجھے بھوک نہیں۔

نفیسہ :۔ (خود سے) یا خدا ۔۔۔ کوشش کرنے پر بھی یہ شخص مجھے اجنبی کیوں نہیں لگتا یا یہ میرا احساس فرض ہے ۔ کیا یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ قانونی طور پر میرا شوہر ہے ۔ یہ کیوں چپ چاپ صوفے پر بیٹھا میری ہر حرکت کا جائزہ لے رہا ہے ۔۔۔ میرے پیر کیوں کانپنے لگے ہیں ۔۔۔ لیکن یہی تو برسوں پہلے مجھے دھتکار گیا تھا ۔۔۔ کیونکہ

میں اس کی اشتیاق پی قدر دل پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اس نے تو مجھے طلاق کی بھی پیش کش کی تھی۔ اب یہ یہاں کیوں آیا ہے ــــ اس کی آنکھوں میں شرمساری کیوں نہیں ہے۔ یہ کیوں اپنی آنکھوں میں گہرائی لئے میرے قریب آرہا ہے۔

(رضا اٹھ کر اس کے قریب آتا ہے)

رضا :۔ (دھیمے) نفیسہ! ــــ میرے قریب آؤ نفیسہ۔

نفیسہ :۔ مجھ سے دور رہو رضا۔ میرے قریب نہ آؤ۔

رضا :۔ میں قانونی طور پر تمہارا شوہر ہوں نفیسہ ــ کیا تم بھول گئیں کہ ہماری ایک لڑکی بھی ہے۔

نفیسہ :۔ میری فطری کمزوری سے فائدہ مت اٹھاؤ رضا۔ مجھے مت چھوؤ۔

رضا :۔ میری بانہیں تمہاری منتظر ہیں ــــ انہیں ان کے حق سے محروم نہ کرو۔

نفیسہ :۔ (کھوئی ہوئی) حق ــ صرف حق۔

(Fridge کا دروازہ کھولے کھڑی رہ جاتی ہے)

رضا :۔ میں تمہیں اور تہمینہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔ (اسے اپنی بانہوں میں لے لیتا ہے) (Pause)

نفیسہ :۔ (پلٹتے ہوئے) ساتھ لے جاؤ گے ــ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے تو طلاق کی پیش کش کی تھی۔

رضا :۔ کی تھی، لیکن تمہیں دیکھنے کے بعد میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔

نفیسہ :۔ کیونکہ اب میں وہ ناپختہ کلی نہیں ہوں ــ تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ سکتی ہوں۔

رضا :۔ اب تم میں ذمہ داری اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے جو اُس وقت نہیں تھی ــ اور اب مجھے زندگی میں ایسے ساتھی کی سخت ضرورت ہے۔

نفیسہ :۔ کاش رضا، اس کی بجائے تم نے شرمساری کے دو لفظ ہی کہے ہوتے۔ میں سب کچھ بھول کر تمہارے ساتھ ہو لیتی ــ یہ "ذمہ داری" اور "اعتماد" تم مجھے اپنی پناہ میں لے کر خود ہی سکھا سکتے تھے۔ جبکہ اب یہ محض میری تنہا کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ تم تو اپنی پیاس بجھانے کے بعد مجھے چھوڑ گئے تھے نا؟

رضا :۔ لیکن اب میں کہہ تو رہا ہوں کہ میں تمہیں اپنانے کے لئے تیار ہوں۔

نفیسہ :۔ کسی کو اپنانے کے یہ ڈھنگ نہیں ہوتے رضا ــــ پیار اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اسے تراشی ہوئی زخمی انگلیوں کی پرواہ نہ کی جائے ــ (ہنس کر) تم نے تو کمال سے پیار تراشنا چاہا اور جب اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے تو اسے اٹھا کر خاک میں پھینک دیا اور چلتے بنے۔

رضا :۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو اب۔

نفیسہ :۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں چلوں گی۔

رضا :۔ نفیسہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ ــ ابھی ابھی ہمارے دل ایک ساتھ دھڑکے ہیں۔ تم مجھے جھٹلا نہیں سکتیں۔

نفیسہ :۔ وہ ایک تھکی ہوئی عورت کی عارضی کمزوری تھی۔ اب تمہیں بھی مجھے حاصل کر کے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

رضا :۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

نفیسہ :۔ رضا ــ تم بھول رہے ہو کہ میں اب وہ چمپلی کی نازک ڈال نہیں رہی جسے تم چھوڑ گئے تھے ــ زمانے کی تند ہوائیں سہتے سہتے میں اب ایک مضبوط چٹان بن گئی ہوں ــ خود مختار ــ خود سر ــــ مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش مت کرو رضا سر پھوٹ جائے گا۔ میری کلائیاں اب کوئی بندھن برداشت نہیں کریں گی۔ اب میں تمہاری خود غرضی کا کھلونا نہیں بنوں گی۔ تم نے صرف دو لفظ ــــ دو ہی لفظ کہے ہوتے کہ "معاف کرو"، تو میں آج بھی تمہارے قدموں میں کھنچی چلی آتی۔

رضا :۔ میں نے آج تک اپنا سر کسی کے آگے نہیں جھکایا نفیسہ ــــ یہ تمہاری بھول ہے۔

نفیسہ :۔ سر کی عظمت تو ان سجدوں میں ہے رضا جو اس کی پیشانی میں مچل رہے ہوں۔

رضا :۔ یہ تو ایک عورت کی منطق ہے۔ میں اتنا مجبور نہیں ہوں۔

نفیسہ :۔ مجھے تمہاری تہی دستی پر رحم آتا ہے۔ تم اپنے گھمنڈ میں کچھ بھی نہ پا سکے۔

رضا :۔ اور تم نے کیا پالیا؟

نفیسہ :۔ میرے پاس تہمینہ ہے۔

رضا :۔ میں تمہیں اور تہمینہ دونوں کو اپنانا چاہتا ہوں

نفیسہ :۔ لیکن مجھے گھاٹے کا سودا منظور نہیں ہے۔

رضا :۔ یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟

نفیسہ :۔ میں تمہاری طرح اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتی۔

رضا :۔ پھر تو کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ میں چلتا ہوں ــ (رک کر) ایک بار تہمینہ سے ضرور ملنا چاہوں گا۔

نفیسہ :۔ وہ سو رہی ہے ــــ اسے بخار ہے۔

(باقی صفحہ ۱۰۳ پر)

سلام بن رزاق

غالب بمبئی میں

کردار

مرزا غالب .... ————

بیگم غالب .... ————

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ .... غالب کے دوست اور شاگرد

میر مہدی مجروح .... شاگردِ غالب

منشی ہرگوپال تفتہ .... شاگردِ غالب

مولانا الطاف حسین حالی .... شاگردِ غالب

ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر .... ————

بیرا .... ————

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

دلی اور لکھنؤ کی ادبی محفلوں کو اُجڑے زمانہ بیت گیا۔ وہ شعرائے باکمال اور گدایانِ تمثال جن کے دم سے متاعِ شعر و سخن کے بازار لگتے تھے۔ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مگر ہم آج بھی تصوّر کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ صحبتیں کیسی باغ و بہار اور رشکِ چمن زار ہوتی ہوں گی۔ جہاں شب و روز شعر و سخن کے گلدستوں سے طاق و ایوان سجتے اور تحسین و آفرین کے پھول برستے تھے۔

آج کے اس آشوبی دور میں نہ ویسی محفلیں ہیں، نہ صحبتیں، نہ وہ حکایتیں ہیں نہ روایتیں۔ تاہم آج آپ کی خدمت میں اردو کے سب سے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں المعروف بہ مرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالبؔ کی کتابِ حیات کے ایک ورق کی تمثیل برنگِ پیروڈی پیش کی جاتی ہے۔ یوں سمجھئے جب انقلابِ وقت نے بساطِ ادب کو درہم برہم کر دیا نیز محفلِ شعر و سخن کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ تب مرزا نوشہ کے اکثر احباب اور شاگرد اُن سے جدا ہو کر عروس البلاد بمبئی کو اپنا مستقر بنا لیتے ہیں۔ مرزا بھی تنہائی سے گھبرا کر تبدیلیِ ماحول کی خاطر

بمبئی پہنچ کر تے ہیں۔ کسی شاگرد کے ہاں قیام کرنا یا اُن پر بار بننا مرزا کی خودداری کو گوارا نہیں۔ اس لئے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں کرہ کرائے پر لے کر ٹھہرتے ہیں۔ بیگم غالب بھی ساتھ ہیں۔ گرہ میں اتنا مال نہیں کہ ہوٹل کے بھاری اخراجات زیادہ دنوں تک برداشت کر سکیں۔ آخرکار بیگم غالب مکان کی تلاش میں جاتی ہیں۔ مرزا غالب اپنی بیگم کے انتظار میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے اپنا ہی ایک مشہور شعر گنگنانے لگتے ہیں۔

غالب (گنگناتے ہوئے)

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

(گھڑی میں ٹن ٹن کی آواز)

اوہو! سات بج گئے۔ اب تک تو بیگم کو لوٹ آنا چاہیئے تھا۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا۔ مگر وہ کسی کی سنیں تب — اتنا بڑا شہر، سب اجنبی چہرے، نہ کوئی ہمدم نہ رفیق، خدا نخواستہ کوئی حادثہ نہ پیش آیا ہو — کیا کروں؟ — تھانے میں رپٹ لکھواؤں، مگر میرے منہ سے تو شراب کی بو آرہی ہے۔ کہیں تھانیدار اندر نہ کردے۔

کہوں کیا دل کی جو حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

(کال بیل کی آواز)

اوہو — شاید بیگم آگئیں۔ (دروازہ کھلنے کی آواز)
خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئیں —

بیگم غالب :۔ اُوہ — س — س — س — اللہ —

غالب :۔ آپ نہیں جانتیں ہم یہاں کتنے فکرمند تھے۔ دل کو ہزار وسوسوں نے گھیر رکھا تھا — دماغ الگ اندیشہ ہائے بیجا کا شکار — مگر — مگر آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟

؎ ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

بیگم :۔ اے لوجی، آپ کو تو ہر دم شاعری کی پڑی رہتی ہے۔ یہاں گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔

غالب :۔ ؎ لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

بیگم :۔ ہٹیے بھی، برقعہ تو اتار لینے دیجئے۔

غالب :۔ بھئی — اس قدر برہمی کی وجہ؟ مکان تو مل گیا نا!

بیگم :۔ آپ یہاں بیٹھے سخن آرائی کرتے رہیئے۔ مکان خود آپ کی حضور میں حاضر ہو جائے گا۔ ہم نے بھی شہر دیکھے ہیں۔ دلی، آگرہ، لکھنؤ، رامپور۔ مگر اس نامراد بمبئی جیسا شہر نہیں دیکھا۔

غالب :۔ بیگم! ہم نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ یہ آپ کا آگرہ یا لکھنؤ تو ہے نہیں کہ سر پر چادر ڈال کر نکلے اور ایک گھنٹے میں سارے شہر کا چکر لگا آئے۔ سنا ہے یہ کم بخت شہر کوچہ در کوچہ اس طرح پھیلا ہے کہ دلی کی بھول بھلیاں بھی اس کے آگے مات ہیں۔ اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ خود چلے جاتے ہیں۔

بیگم :۔ آپ بھلا کیسے جاتے؟ چار قدم چلتے ہیں تو سانس تیز ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے ترمرے سے اُڑنے لگتے ہیں۔ سینے کا درد بڑھ جاتا ہے۔

غالب :۔ درد کی کسے پرواہ ہے بیگم درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا مگر بیگم مکان کا حاصل کرنا بھی اشد ضروری ہو گیا ہے۔ آخر اس ہوٹل میں کب تک ٹھہرے رہیں گے۔ آج صبح ہی مینجر کہہ رہا تھا دو روز ہو گئے آپ نے ابھی تک اڈوانس ادا نہیں کیا؟ پچاس روپے یومیہ کے حساب سے ہم یہاں کتنے دن رہ سکیں گے۔ کل میرے پاس پچاس روپے تھے، میں نے اس کی ایک بوتل خرید لی۔ اب میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔

بیگم :۔ (جھنجلا کر) آپ کے لئے تو دیس پردیس دونوں برابر ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی شوق ہوا کہ آپ کے پاس پچاس روپے تھے اور آپ نے پچاسوں کی شراب خرید لی۔ اب ہوٹل والے کو کیا دیں گے؟

غالب :۔ جانِ غالب فکر کیوں کرتی ہو۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ اس نے ہر بشر کے لئے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ البتہ شراب کا وعدہ نہیں کیا سو اس خاطر ہم نے ----

بیگم :۔ بس، بس، میں تو عاجز آگئی آپ کے اس لطیفے سے۔ ہزار دفعہ آپ نے یہی ایک جواب دے کر مجھے لاجواب کرنے کی کوشش کی ہے۔ (وقفہ) یہ لیجئے —

غالب :۔ یہ کیا؟

بیگم :۔ میرے گلے کا ہار — سچے موتیوں کا ہے۔ امّی حضور کی نشانی ہے۔ اسے بیچ کر روپے لے آیئے تو شاید مکان کا انتظام ہو۔

غالب :۔ بیگم! ہمیں مکان خریدنا تو ہے نہیں۔ چند روز کے لئے کرایے پر لینا ہے۔ اس کے لئے یہ ہار بیچنے کی کیا ضرورت؟

بیگم :۔ آپ نہیں جانتے۔ اس شہر میں مکان لینے سے پہلے پگڑی دینی پڑتی ہے۔ اس ہار سے جو رقم آئے گی وہی پگڑی میں دی جائیگی۔

غالب :۔ (حیرت سے) پگڑی! بیگم، آپ کیا فرما رہی ہیں۔ کیسی پگڑی؟ مکان سے پگڑی کا کیا علاقہ! اور پھر پگڑی کے لئے اتنے سارے روپے؟ دس بیس روپے میں بہترین کلاہ طرے دار خریدی جا سکتی ہے۔

بیگم :۔ اب آپ کو کون سمجھائے۔ یہاں پگڑی سے مراد آپ کی کلاہ نہیں۔ پگڑی یعنی گھر لینے کی رشوت یا اس کی قیمت سمجھ لیجئے۔

غالب :۔ عجیب نامعقول شہر ہے ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

ہم تو سمجھے تھے آپ ایک اچھا سا مکان دیکھ کر لوٹیں گی۔ ہم آپ سے دریافت کریں گے، آپ کہیں گی ایک مکان دیکھا تو ہے۔ مگر لوگ اس میں بلا بتلاتے ہیں۔ ہم مسکرا کر کہیں گے۔ آپ سے بڑھ کر بھی بھلا کوئی بلا ہے۔ بات آئی گئی ہو جائے گی۔ اور ہم مزے سے نئے مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شہرِ نامراد میں کس طرح بسر کی جائے۔

بیگم :۔ میں پہلے ہی منع کر رہی تھی کہ اتنا دور دراز کا سفر مت کیجئے۔ مگر ۔۔۔۔۔

غالب :۔ بیگم! آپ تو ہمیں بہت سی باتوں سے منع کرتی آئی ہیں۔ شراب پینے سے، چوسر کھیلنے سے، شعر کہنے سے، دور دراز کے سفر سے۔ مگر آپ کو ہمارا مزاج معلوم ہے ع۔ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور، اس لئے ہمیں کسی بات سے نہ روکیے۔

بیگم :۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ آپ کو روکوں ۔۔۔ اور پھر میرے روکنے سے آپ کہاں رکنے والے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ یہاں اس فرنگی شہر میں یوں خراب ہونے سے بہتر تھا کہ ہم اپنی دلّی میں آرام سے پڑے رہتے۔

غالب :۔ بیگم! سچ کہنا ۔۔۔ دلّی میں ہمیں کونسا آرام نصیب تھا۔ ؎ کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

بیگم :۔ آپ سارا دن اشعار پڑھتے اور لطیفے گڑھتے رہیے۔ جب ہوٹل والا آکر سامان چھوڑا ہے پر پھینکے گا تب پتہ چلے گا۔ یہاں بھائی علی بخش بھی نہیں ہیں کہ آپ کی ضمانت کے لئے دوڑے چلے آئیں گے۔

(فیڈ آؤٹ)

غالب :۔ ؎ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

شاید ہوٹل والا آگیا۔ بیگم بھی خفا ہو کر اندر چلی گئیں۔

؎ کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

(پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

بھائی رُکو! کیا ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ (دروازہ کھول کر) ارے ۔۔۔ میر مہدی مجروح ۔۔۔ یار اندر آؤ ۔۔۔ بیغیروں کی طرح باہر کیوں کھڑے ہو؟

میر مہدی :۔ آداب بجالاتا ہوں۔

غالب :۔ بھئی، یہاں تو تم لوگوں کے لئے آنکھیں ترس گئیں۔ وطن سے دور اس دیارِ غیر میں تمہاری صورت دیکھ کر جو خوشی ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔

؎ اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست۔

آؤ میاں بیٹھو!

مہدی :۔ فرمائیے حضور! مزاج کیسے ہیں؟

غالب :۔ میاں مزاج کی مت پوچھو، دود چراغِ کشتہ ہوں۔ ناتوانی زور پر ہے۔

مہدی :۔ مگر حضور! یہ آپ کو اچانک بمبئی کی کیسے سوجھی۔؟

غالب :۔ شامتِ اعمال ۔۔۔ اس کے سوا کیا کہوں۔ سوچا تھا تھوڑی سی تبدیلیٔ آب و ہوا ہو جائے گی۔ مگر کم بخت مکان ہے کہ یہاں عنقا ہے۔ ملتا بھی ہے تو پگڑی نام کی ایک کلید ہے جس سے یہ کھلتا ہے۔ اور تم جانتے ہو ہم تو ابتدا ہی سے فاقہ مست اور تہی دست رہے ہیں۔ ؎ درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

مہدی :۔ حضور! میں بھی اوّل اوّل اس شہر میں بڑا خراب ہوا۔ کوچہ کوچہ چھان مارا مگر مکان تو مکان ایک کھولی تک نہ ملی۔ آخر یہاں سے چند کوس کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ اندھیری اُس کا نام ہے۔ وہیں ڈیرا ڈال دیا ہے۔ اب بفضلِ ربّی کئی چالیوں کا مالک ہوں۔ دو آنے کی چلیاں ہیں مزے میں گذر بسر ہو جاتی ہے۔

غالب :۔ تو کیا، میاں شاعری ترک کر دی؟

مہدی :۔ ترک کرنی پڑی حضور! کیوں کہ بقول آپ کے ع۔ یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا، اب نہ وہ سخن فہم باقی ہیں نہ وہ قدرداں ۔۔۔ آپ نے تو بہت پہلے فرمایا تھا۔ ؎
ہارے شعر میں اب صرف دل لگی کے اسدؔ کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

غالب :- (سرد آہ کھینچ کر) یہ تو سچ ہے میاں!
کہ ہمیں نے یہ بھی کہا تھا کہ

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اچھا میاں مجروح یہ تو بتاؤ تمہیں ہماری آمد کی خبر کس نے دی؟
مہدی :- آج صبح حالی کا فون آیا تھا کہ آپ شہر تشریف لائے ہیں اور کسی گمنام ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ سنتے ہی ناشتہ کئے بغیر گھر سے چل پڑا۔ آخر تلاش بسیار کے بعد حاضر خدمت ہوا ہوں۔
غالب :- تو یوں کہو نا کہ بھوک لگی ہے۔ ذرا وہ گھنٹی بجا دو

(گھنٹی کی آواز)

اچھا تو حالی بھی آج کل یہیں ہیں؟
مہدی :- جی ہاں — بھنڈی بازار میں کتابوں کی ایک دکان کھول لی ہے حضرت نے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری ہے۔
غالب :- خوب،
بیرا :- بولو صاب، کیا منگتا —؟
غالب :- میاں بیرے! ایک پلیٹ شامی کباب، ایک کافی اور ایک سوڈا لیتے آنا۔
بیرا :- شامی کباب شام کو ملتا ہے صاب، ابھی مٹن سینڈوچ ملے گا۔
غالب :- اچھا بھئی وہی لے آؤ —
مہدی :- جناب والا! یہ آپ کے لئے تحفتاً لایا ہوں۔ قبول کر لیجئے۔
غالب :- یہ کیا ہے بھئی مہدی!
مہدی :- ٹرانزسٹر ہے حضور! یہاں کی مشہور کمپنی کا پہلا سیمپل ہے۔
غالب :- میاں، اس کی کیا ضرورت؟ ہماری بیگم ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم انہیں کو چوبیسوں گھنٹے سنتے رہتے ہیں۔ بھلا اسے کب سنیں گے؟
مہدی :- (ہنس کر) رکھ لیجئے حضور، خبریں وغیرہ سننے کے کام آ جائے گا۔ آپ کومنٹری بھی تو سنتے ہوں گے۔
غالب :- نہیں، ہمیں اس کی لت نہیں ہے۔ ویسے سنا ہے کہ ایک عالم اس کی زلف کا اسیر ہے۔
مہدی :- بجا ارشاد فرمایا حضور نے، بعض شوقین حضرات غسل خانے تک میں ٹرانزسٹر کان سے لگائے کومنٹری سنتے پائے

گئے ہیں —
غالب :- لا حول ولا قوۃ۔
مہدی :- آج آکاش وانی بمبئی سے آپ کی غزل نشر ہو رہی ہے۔
غالب :- کب؟
مہدی :- وقت تو ہو گیا ہے — یہ دیکھئے۔
ریڈیو —

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
غالب ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں - - - - -

مہدی :- استاد یہ آپ کی کامیاب غزلوں میں سے ایک ہے۔
غالب :- تو کیا میاں! ہماری کوئی ناکام غزل بھی ہے؟
مہدی :- میرا مطلب یہ نہیں تھا حضور — میرا مطلب —
غالب :- رہنے دو تمہارا مطلب — کچھ نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کی بھی خبر ہے؟
مہدی :- جی ہاں حضور، وہ بڑے مزے میں رہے۔ انہوں نے کنسٹرکشن کا کام شروع کر رکھا ہے۔ شہر میں کئی بلڈنگیں ہیں۔ حالی کہہ رہے تھے کہ وہ بھی تشریف لا رہے ہیں۔ اور ہاں — اس سال وہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی نامزد ہو گئے ہیں۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

غالب :- میاں، دیکھو تو کون ہے؟
مہدی :- شاید، حالی ہوں گے —

(دروازہ کھلنے کی آواز)

شیفتہ :- آداب بجا لاتا ہوں حضور!
حالی :- تسلیمات عرض کرتا ہوں جناب!
غالب :- آہا، نواب مصطفٰی خاں شیفتہ — بھئی حالی بھی ہیں۔ ع بیا بیا کہ برائے تو چشم وا دارم
بیٹھو شیفتہ یہاں ہمارے پاس آ بیٹھو — کہو میاں حالی کیا حال ہے!

حالی :۔ آپ کی دُعا ہے حضور!

غالب :۔ میاں ہم کیا اور ہماری دُعا کیا۔ ہمارا تو اعتماد ہے۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مُدّعا نہ مانگ

(واہ، واہ)

فرمایئے نواب صاحب! آپ کیسے ہیں؟

شیفتہ :۔ دیکھئے اُستاد، میں آپ کا شیفتہ ہوں ۔۔۔ صرف شیفتہ، آپ کی زبانِ مبارک سے اپنے شیفتہ کے لئے لفظ نواب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اور ہاں ۔۔۔ میں آپ سے بہت خفا ہوں۔

غالب :۔ ارے ۔۔ رے ۔۔ آخر مجھ بڈّھے سے ایسی کیا تقصیر ہو گئی کہ میرا یار مجھ سے خفا ہو گیا؟

شیفتہ :۔ آپ یہاں تشریف لائیں اور اپنے شیفتہ کے ہوتے ہوٹل میں قیام فرمائیں، مجھ پہ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے۔

غالب :۔ لو بھئی مہدی ۔۔۔ اب تم ہی کچھ بولو۔

مہدی :۔ (ہنس کر) بات یہ تھی نواب صاحب کہ حضور اُستاد کو آپ کا پتہ نہیں معلوم تھا۔

شیفتہ :۔ اگر اُستاد کو نہیں معلوم تھا تو آپ نے بتا دیا ہوتا۔

مہدی :۔ بندہ بھی تو ابھی حاضر ہو رہا ہے جناب،

غالب :۔ اچھا بھئی شیفتہ کیا پیو گے؟ خالص انگور کی تو اس شہر میں ملنے سے رہی۔

شیفتہ :۔ حضور، میں تائب ہو چکا ہوں۔

غالب :۔ اماں پردیس میں بھی ۔۔۔ (ہنسی)

شیفتہ :۔ حضور، ڈاکٹروں نے سختی سے پرہیز کرنے کے لئے کہا ہے۔ جگر بالکل تباہ ہو گیا تھا۔

غالب :۔ یہاں تو دل و جگر دونوں ناکارہ ہو چکے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ ع "یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے"

اچھا میاں حالی تم کیا پیو گے؟

حالی :۔ (ہنس کر) حضور والا، میں تو صرف کافی پیوں گا اور کافی کے سوا کچھ نہ پیوں گا۔

غالب :۔ میاں بیرے! دو کپ خالص دودھ کی کافی لے آؤ۔

بیرا :۔ اچھا صاب،

شیفتہ :۔ حضور، یہ تو بتایئے آج کل پنشن کا کیا حال ہے؟

غالب :۔ بھئی، وہی جو پہلے تھا۔ کبھی ہر مہینے ملتی ہے، کبھی مہینوں نہیں ملتی۔ اور جو ملتی ہے سو بھی ناکافی ۔۔۔ آخر ایک پنشن آدمی روٹی کھائے کہ شراب پیئے۔ لوگ کہتے ہیں روٹی کھاؤ، شراب مت پیو۔ بھلا غالب سا بلا نوش بغیر شراب کے کتنے دن جی سکتا ہے؟ جبکہ حال یہ ہو۔

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے ۔۔ (واہ واہ)

حالی :۔ اور حضور یہ شعر بھی تو اسی غزل کا ہے نا ۔۔؟

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

غالب :۔ مولانا تمہیں خدا جزائے خیر دے۔ کیا بات یاد دلا دی۔

شیفتہ :۔ مگر حضور، مجھے سرکاری طور پر اطلاع ملی تھی کہ مرکز نے آپ کے نام معقول وظیفہ جاری کر دیا ہے۔

غالب :۔ سُنا تو میں نے بھی ہے۔ مگر آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں، بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آ گئی، دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا معجزہ اسد اللہی ہے۔

شیفتہ :۔ خیر ۔۔ اب آپ فکر نہ کریں، میں آج ہی وزیر اعظم سے ٹرنک کال پر بات کرتا ہوں۔

غالب :۔ ضرور کرو۔ میرے اور معاملاتِ کلام و کمال سے قطع نظر ۔۔۔ وہ کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

شیفتہ :۔ آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

مہدی :۔ حضور آپ تھک گئے ہوں گے۔ لایئے آپ کے پیر داب دوں۔

غالب :۔ میاں رہنے دو۔ تم ہو سیّد زادے۔ مجھ گنہگار کو مزید گنہگار کیوں کرتے ہو؟

مہدی :۔ اگر ایسا ہی خیال ہے تو اُجرت دے دیجئے گا۔

غالب :۔ ہاں، تب مضائقہ نہیں۔

مہدی :۔ (ہنستے) مگر حضور، آخر میں آپ فرمائیں گے تم نے ہمارے پیر دابے، ہم نے تمہارے پیسے دابے، حساب برابر ہوا۔ اب کے میں دھوکا نہیں کھاؤں گا۔ کچھ پیشگی ہی دے دیجئے۔

(تینوں ہنستے ہیں)

غالب :۔ (ہنس کر) میاں لگتا ہے تم نے بھی زمانے کی کافی چوٹیں سہی ہیں۔ درست ہے۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

(واہ، واہ)

بیرا :۔ صاب ــ کافی ــ

غالب :۔ ہاں رکھ دو ــ بھئی شیفتہ، میاں حالی! کافی لو۔

حالی :۔ آپ نہیں لیجئے گا حضور!

غالب :۔ نہیں بھئی، اس عرقِ بے لذّت سے ہمارا کیا بھلا ہوگا۔ ہمیں تو وہی آتشِ سیّال چاہیئے۔ جس سے دِل توانا اور دماغ روشن ہو جاتا ہے۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں ۔ (واہ، واہ)

(اچانک کچھ یاد کر کے) بھئی شیفتہ، آج کل استادِ شاہ حضرت ذوق کا کیا حال ہے؟ سُنا ہے وہ بھی بمبئی میں تشریف رکھتے ہیں۔

شیفتہ :۔ حضرت فلم لائن میں چلے گئے ہیں جناب، ایک ایک گیت کے سات سات ہزار لیتے ہیں، امپالا میں گھومتے ہیں۔ پالی ہل پر ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ ہے۔

غالب :۔ بھئی، یہ حضرت ہیں بڑے زمانہ شناس، اور ہم سے یہی بات نہیں ہوتی کہ روشِ عام پر چلیں

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

شیفتہ :۔ حضور، اگر آپ بھی پسند فرمائیں تو دو تین پروڈیوسر میرے ملاقاتی ہیں۔

غالب :۔ نہیں صاحب، یہ ادب فروشی ہمیں منظور نہیں۔

عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو دیکار نیکو نامیٔ فرہاد نہیں

(واہ، واہ)

بیرا :۔ صاب ــ

غالب :۔ کیا بات ہے بھئی میاں بیرے! ایسے دُبکے سہمے کیوں کھڑے ہو؟

بیرا :۔ صاب، وہ منیجر صاحب نے سلام بولا ہے۔

غالب :۔ وعلیکم السلام ــ خدا انہیں سلامت رکھے۔

بیرا :۔ بات یہ ہے صاب، منیجر صاحب نے بولا ہے ــ وہ اڈوانس ــ ــ

غالب :۔ اچھا ــ اچھا ــ صاحب سے کہہ دو ہم ابھی آتے ہیں۔

شیفتہ :۔ (ویٹر سے) ویٹر! منیجر سے کہو، اِن صاحب کا حساب نواب مصطفےٰ خان کے نام پر لکھ لیں۔ یہ رہا ہمارا کارڈ ــ منیجر صاحب کو دے دینا۔

بیرا :۔ اچھا صاب،

غالب :۔ بھئی شیفتہ ــ یہ تم نے کیا کیا ــ کل ہم واقعی سارا بل ادا کر دیتے۔

شیفتہ :۔ شیفتہ کے ہوتے آپ بل ادا کریں گے۔ تُف ہے میری زندگی پر ــ اور حضور، آپ یہاں نہیں رہیں گے غریب خانے کا ایک بڑا حصّہ بالکل خالی ہے۔ آپ جب تک چاہیں وہیں قیام کریں

حالی :۔ نواب صاحب بالکل بجا فرما رہے ہیں حضور اپنے خادموں کے ہوتے آپ اس طرح ہوٹل ہوٹل پیمائی کرتے پھریں۔ ہمارے لئے غیرت کا مقام ہے۔

مہدی :۔ میری سنئے تو آپ اسی وقت نواب صاحب کے ساتھ چلے چلئے۔

شیفتہ :۔ سیّد صاحب، بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں حضور! نیچے میری کار بھی کھڑی ہے۔ چلئے بیگم حضور سے تیار ہونے کو کہہ دیجئے۔

اسسٹنٹ منیجر :۔ جناب میں اندر آسکتا ہوں۔

شیفتہ :۔ آؤ ــ کیا بات ہے؟

اسسٹنٹ منیجر :۔ بندہ پرور میں اس ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر ہوں گستاخی معاف فرمایئے۔ بندہ آپ سے ناواقف تھا۔ اسی لئے دروازے پر بھی خاطر خواہ آپ کا استقبال نہ کرسکا۔ معذرت خواہ ہوں جنرل منیجر صاحب آپ کو جانتے ہیں۔

شیفتہ :۔ کوئی بات نہیں۔ جاؤ منیجر صاحب سے ہمارا سلام کہہ دینا

اسسٹنٹ منیجر :۔ خدمت گذاری میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو بندہ ایک بار پھر معافی کا خواستگار ہے جناب!

شیفتہ :۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔

اسسٹنٹ منیجر :۔ منیجر صاحب رات میں نو بجے آتے ہیں۔ میں آپ کا سلام عرض کر دوں گا۔

شیفتہ :۔ اچھی بات ہے۔

غالب :۔ سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

بھئی شیفتہ یہ تم راجیہ سبھا کے ممبر کب سے ہو گئے ؟

شیفتہ :۔ سب آپ کی صحبت کا صدقہ ہے حضور،

غالب :۔ صاحب، ہمیں کیوں بدنام کرتے ہو۔ بھئی حالی انہیں سمجھاؤ ـــــ (سب ہنستے ہیں)

شیفتہ :۔ خیر حضور، باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ آپ چلنے کی تیاری کیجئے۔

غالب :۔ ایسی بھی کیا جلدی، اب تم مل گئے ہو تو چلیں گے ہی کسی دن۔

ع تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل وجان اور

مہدی :۔ نہیں حضور، آپ ابھی چلئے۔ شام کا کھانا نواب صاحب کے مکان پر تناول فرمایئے۔

شیفتہ :۔ واہ میرے منہ کی بات چھین لی سید صاحب نے۔ اب انکار نہ کیجئے گا حضور،

غالب :۔ دیکھا حالی۔ یہ سیدزادہ کس قدر چالاک ہے۔ کھانا اسے کھانا ہے۔ اور بہانہ ہے ہمارے چلنے کا ـــــ

شیفتہ :۔ (ہنس کر) سب دوستوں ہی کا ہے حضور، اچھا آپ جلدی سے تیاری کیجئے۔

غالب :۔ لو بھئی ـــ تم جیتے میں ہارا۔ اب مجھ ساٹھ برس کے بڈھے میں وہ دم خم کہاں کہ تم جوانوں کا مقابلہ کروں۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

غالب :۔ بھئی حالی، دیکھو تو کون ہے۔

حالی :۔ (دروازہ کھولتے) آیئے منشی جی! آیئے۔

تفتہ :۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں حضور! آہا، نواب صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔

غالب :۔ آؤ بھئی تفتہ آؤ ـــــ وقت پر آئے ہو۔

تفتہ :۔ حضور، مجھے ابھی ابھی منترالیہ سے اطلاع ملی کہ آپ بمبئی تشریف لاتے ہیں۔ اور کسی گمنام ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کے ٹھہرنے کا معقول انتظام کروں۔

غالب :۔ ع

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

لو بھئی شیفتہ، اب تم ہی کچھ کہو، ہم تو چپ ہیں۔

شیفتہ :۔ کیوں منشی جی، حضور کی آمد کی اطلاع آخر منترالیہ کو کس نے دی ؟

تفتہ :۔ غالباً دلی سے مفتی صدرالدین خاں نے ٹرنک کال کیا تھا۔

غالب :۔ خدا سلامت رکھے مولانا کو ـــ ہماری حرکات و سکنات پر بالکل جاسوسوں کی طرح نظر رکھتے ہیں۔

تفتہ :۔ ہاں حضور، سرکاری طور پر بہت بڑے جلسے اور مشاعرے کا اہتمام بھی کیا جارہا ہے۔ اس جلسے میں کیسۂ زر بھی پیش کیا جائے گا۔

غالب :۔ ع دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تفتہ :۔ (شیفتہ سے) قبلہ نواب صاحب، جلسہ کمیٹی کے منتظمین اس جلسے کے بارے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ آج رات نو بجے وہ لوگ دولت خانے پر حاضر ہورہے ہیں۔ میں نے آپ کو فون بھی کیا تھا پتہ چلا کہ آپ بھی حضور استاد کی تلاش میں تشریف لے گئے ہیں۔

شیفتہ :۔ ہم لوگ چلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ حضور استاد آج سے میرے مہمان ہیں۔

تفتہ :۔ یہ اور اچھا ہوا۔ آپ کے یہاں حضور کو زیادہ آرام رہے گا۔ بھئی میر مہدی، جناب حالی ویسے آپ لوگوں کی خدمت میں بھی مشاعرے کے دعوت نامے روانہ کر دیئے جائیں گے تاہم میں اپنے طور پر بھی درخواست کرتا ہوں کہ آپ لوگ مشاعرے میں ضرور تشریف لایئے۔

مہدی :۔ جہاں حضور استاد کے اعزاز میں مشاعرہ ہورہا ہو۔ وہاں ہمارے لئے دعوت نامے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم تو یوں بھی پہنچ ہی جاتے۔

حالی :۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے،

غالب :۔ یار تفتہ! آج کل تم کہاں ہو؟ یہ منترالیہ سے تمہارا کیا واسطہ؟

تفتہ :۔ حضور، بندہ ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ میں چیف ہے۔ ملبار ہل پر سرکار کی جانب سے ایک بنگلہ بھی عنایت ہوا ہے۔ تشریف لے چلئے۔ نیچے میری کار بھی کھڑی ہے

غالب :۔ نہیں بھئی، اب تو پہلے شیفتہ کے ہاں چلیں گے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

تفتہ :۔ چلئے یوں ہی سہی، میں بھی چلا چلتا ہوں۔ آپ کا

سامان میری کار میں لدوا دیجئے۔

غالب :۔ میاں سامان ہی کیا ہے۔ لے دے کر یہ دو بڈھا بڈھی ہیں اور بس۔ البتہ آج صبح ہی خریدی ہوئی یہ ایک شراب کی بوتل ہے۔

شیفتہ :۔ بوتل کی فکر مت کیجئے حضور، خادم نائب ضرور ہو گیا ہے۔ مگر آپ کے لئے خالص پرتگالی اسکاچ کا انتظام ہے۔

غالب :۔ بھئی، ہمیں شراب کی فکر کیوں ہو ! ہمارا عقیدہ تو ہے۔

؎ کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

حالی :۔ اچھا حضور، اب مجھے اجازت دیجئے، صبح نواب صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں گا۔ مجھے پریس جاکر "یادگارِ غالب" کے نسخے بھی حاصل کرنے ہیں۔

غالب :۔ میاں حالی ! دلّی میں تمہاری اس تالیف کے بڑے تذکرے سنے ہیں۔

حالی :۔ کل صبح آپ کی خدمت میں نسخہ لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ سب آپ کی صحبتوں کا فیض ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم ——

غالب :۔ خدا تم جیسے شاگرد سب کو نصیب کرے۔ جاکر اپنے کاروبار کا ہرجہ مت کرو۔

شیفتہ :۔ بھئی حالی تک جاؤ۔ ساتھ ہی چلے چلیں گے۔ ہم تمہیں سبزی منڈی بازار پر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔

غالب :۔ ہاں ہاں رک جاؤ، اب بھری شام کہاں بسوں کے لئے لائن لگاتے پھرو گے۔

مہدی :۔ لائیے حضور، آپ کا سامان دیجئے ہم گاڑی میں پہنچا دیتے ہیں۔

شیفتہ :۔ ٹھہریئے سیّد صاحب کال بیل کا بٹن دبا دیجئے ویٹر آکر سامان لے جائے گا۔

(گھنٹی کی آواز)

غالب :۔ ہاں بھئی، اب تو میں تم لوگوں کا زندانی ہوں۔ جہاں لے چلو گے کشاں کشاں چلا چلوں گا۔

بیرا :۔ بولو صاب،

شیفتہ :۔ ویٹر ! صاحب کا سامان نیچے ہماری گاڑی میں پہنچا دو۔

ویٹر :۔ اچھا صاب، مگر صاب، سامان کدھر ہے ؟

غالب :۔ لو میاں، یہ کپڑوں کی پوٹلی اور یہ کتابیں بس یہی ہمارا کل اثاثہ ہے —— آپ لوگ تشریف رکھئے۔ میں ابھی حاضر ہوا۔ بیگم کو اطلاع کر دوں —— (شعر گنگناتے ہوئے)

؎ کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

(فیڈ آؤٹ)

مراٹھی کہانی

گرجا کیر
ترجمہ: ڈاکٹر عبدالستار دلوی

نقشِ قدم

ایک جھلملاتی سی صبح دل کے منڈوے تلے رقص کرنے لگی۔ علی الصبح ایک سفید جوہی کا پھول مسکرا اٹھا۔ اور کیا سچ مچ اس کا دل بھی کھلا کھلا سا تھا شبنم میں نہائی ہوئی گھاس کی طرح ترو تازہ گل کی طرح آج بھی صبح آئی ہوئی تھی اور پھولوں کی طرح کل بھی صبح ہونے والی تھی۔ راستہ تھا اس لیے راہی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ اور آج بھی کوئی رک گیا ہو تو کوئی نئی بات نہیں تھی؟ اور کوئی رک بھی گیا ہو تو دیوانہ بنانے والا واقعہ بھی آج ہی ہوا تھا۔ پھر چاروں طرف آج ہی کیوں خوشبو اڑ رہی تھی؟ پھولوں پر بھی یہ سونے کا ورق چڑھ گیا تھا؟ کیا دل کو بھی آسمانی پر لگ گئے تھے؟

لیکن آج یہ سب سچ ہی تھا! اس لمحے تک وہ خود بھی بالکل بے خبر تھی کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ لیکن کچھ ہو گیا تھا۔ اور...... اور...... پھر وہ جھوم جھوم کر تھرک رہی تھی۔

پھولوں کی ٹوکری نچاتی ہوئی وہ "دیوگھر" کی طرف آئی۔ ماں کے کہے بغیر ہی آج اس نے انگوٹھی بھی ڈال لی تھی۔ اس نے پوجا کا سارا سامان بھی تیار کر رکھا تھا اور چندن گھسنے میں مصروف تھی۔ پھر چپاتی بناتے ہوئے ماں کے ہاتھ رک رکھے گئے۔ کیا آج لڑکی پر کسی سائے کا اثر تو نہیں پڑا؟ سات بجے تک پاؤں پھیلائے سونے والی لڑکی آج ہی اس قدر جلد جلد کام کرنے میں کیوں لگی ہوئی ہے؟ ماں بھی مشکوک نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھنے لگی اور وہ تھی کہ خود اپنی ہی مستی میں چندن میں تر ہوئی انگلیاں سونگھ رہی تھی۔

"اری"
"ہاں"
"کہیں جانا ہے کیا؟"
"ہاں......"
"کہاں؟"
"ہاں"

"یہ ہاں کیا؟ کیا میں کوئی کہانی سنا رہی ہوں؟"
"کیا کہو؟ نظم سنا دوں، گیت گاؤں...... تاروں کا، ہوا کا، اجالے سے بھرا ہوا روشنی کا گیت گاؤں......"
"کیا تاڑی پی رکھی ہے تو نے؟"

وہ زیر لب مسکرا دی۔ اس کی ہنسی میں گویا نچھتروں کا نغمہ پھوٹ رہا تھا۔ صبح کا قطب تارا اس کے کانوں میں گنگنا کر چل دیا تھا۔ تبھی سے یہ حال ہو گیا ہے۔ ویسے اس کا گھر جہاں سے گاؤں کی حد شروع ہوتی تھی وہیں پر بنا ہوا تھا۔ کچھ اٹھا اٹھا سا تھا۔ دروازے میں جوہی کا منڈوا کھڑا تھا۔ بائیں طرف رات رانی جھوم رہی تھی دونوں طرف خوب کھلی کھلی سی جگہ تھی۔ مزے سے کبھی جھولنے کے لئے آنگن میں جھولا بھی پڑا ہوا تھا۔ گھر کے پچھلے حصّہ میں پانی پینے کے لئے ایک رہٹ بھی بنایا تھا، اس میں اس قدر پانی بھرا ہوا تھا کہ اس میں تیرا بھی جا سکتا تھا۔ وہیں پر ناریل کے چار درخت بھی لگے ہوئے تھے اس کے علاوہ وہاں پر کوئی گھنے درختوں کا جھنڈ نہیں تھا، تاہم اس باڑی میں دل کو مدہوش اور قدموں کو روک دینے والا سون چمپا ضرور موجود تھا۔ پھر اس حسین جگہ کا متلاشی اس گاؤں میں تھا ہی کون۔ گاؤں تھا ہی مٹھی بھر۔ وہی چہرے اور وہی گنے چنے لوگ۔ گھر اور اس میں بسنے والے چہرے ہر کسی کو زبانی یاد تھے۔ تیج آلو کے پتوں کی سبزی تو کل پوہوں کے پاپڑ۔ گرمی کے موسم میں چیزوں کو دھوپ میں سکھانا، برسات میں مسرت آمیز تیز دھاریں اور پھر آسمان پھٹنے کا سا سماں باندھنے والا برسات کی زیادتی کا منظر۔ پھر ایسے میں فرصت ہی کسے جو کسی کی تعریف کرے؟ گاؤں میں صرف ایک ہی مدرسہ تھا، اس لئے سبھی گھر کے بچے اس میں جایا کرتے تھے۔ اور کسی کے کامیاب ہونے یا ناکام ہونے پر کوئی بھی غم یا خوشی کا اظہار نہ کرتا۔ آخر پڑھ لکھ کر بھی کوئی شیر مارنے والا نہیں تھا۔ اور نہ ہی پڑھائی نہ کرنے سے کوئی بھوکا مرنے والا تھا، نہ ہی بھیک مانگنے والا تھا۔

پارو ایسے ہی ایک بدقسمت گاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور ایک سوال بن کر

اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا، اس میں اس کی ماں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پاروتی رنگ روپ میں خود اپنی ہی طرح تھی۔ نہ کہ جسم و مزاج میں اپنی ماں کی طرح اور نہ ہی اپنے باپ کی طرح۔ ہونٹ ہمیشہ جوہی کی طرح کھلے رہتے اور آنکھیں تو گویا ہر وقت باتیں ہی کرتی تھیں، پھر کیا مجال جو یہاں سے کوئی دل کو سنبھالے سلامتی کے ساتھ واپس ہی لوٹ جائے۔ پرکشش ترشا ہوا قد، جسے ناپنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ لیکن آنکھوں میں ہمیشہ رنگ آتے جاتے رہتے تھے۔

پاروتی بھی اپنے خاندان کے رسم و رواج کے مطابق اسکول پڑھ کر میٹرک پاس ہوئی۔ اب آگے کیا، اس کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ویسے گھر کے کاموں میں پاروتی کو کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ سینا پرونا بھی اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اب اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ ماں اسی فکر میں مبتلا تھی۔ کبھی تو اس کو پیٹ بھی دیتی تھی۔ پڑوس کی عورتیں کان بھرا کرتیں "دیکھو کہیں بد چلنی پر ہی نہ اتر آئے۔ اس سے پہلے ہی بیٹی کہیں بیاہ دو تو اچھا ہے۔" "میری شادی اگر ماں باپ نے مجھ سے پوچھے بغیر طے کی تو میں جان دیدوں گی۔ اس لئے میری شادی کے بارے میں کوئی دخل نہ دے تو اچھا ہے۔" اس پر پاروتی کا باپ سہم گیا۔ آخر لڑکی اتنی بری نہیں تھی۔ چال چلن بھی اچھا ہی تھا۔ بڑے ادب و لحاظ سے پیش آتی تھی۔ اس نے کہا، اگر خدا کی مرضی ہی نہ ہوتی تو اسی طرح رکھوں گا، اور سب کچھ اس مالک پر چھوڑ دوں گا۔

پارو کے برابر کی لڑکیاں سیانی ہو گئیں، وقت پر شادیاں ہو کر اولادیں ہوئیں ناچتی ہوئی میکے آیا کرتی تھیں، لیکن وہ ابھی جوں کی توں تھیں۔ ایک خاموش گھاٹ کی طرح۔ آخر ایک دن ماں ہی نے اسے اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔

"پارو، کیا تجھے کچھ کبھی محسوس ہی نہیں ہوتا ...."

"کس بات کے لئے؟"

"اور کونسی بات؟ تمہاری اب عمر ہو چکی ہے۔"

"ہونے دو، میں کیا بڑی جلدی ہوں۔"

"ویسے نہیں، آخر تمہاری کسی سے بھی کیوں نہیں؟"

"ماں اب تم ہی کہو کیا کوئی بھی شخص جانے کے لائق ہے اس گاؤں میں؟"

"ہے کیوں نہیں؟ پرسوں ہی تو وہ اچھوت تمہیں دیکھنے جو آیا تھا ......"

"وہ کیوں؟ اچھا! شرطیں بند صوا کر موڈک کھا جانے والا؟ اور پیٹ تو دیکھو جیسے پانچ مہینوں کی حاملہ عورت جیسا۔ اور وہ گنگا چاچی کا جگن ابھی سے ہی آدھا سر گنجا ہو چکا ہے۔"

"پھر وا سواتا کا ہیا تو تم نے دیکھا ہی ہے نا؟"

"سب کو دیکھ چکی ہوں، تم خود اپنے آپ کو کیا سمجھا ہے، اڑوسی سمجھ بیٹھی ہو، ہر ایک کو نا، تا کہ ایک دن کسی راہ چلتے راہی کا ہی ہاتھ تھامے بھاگ ہی جاؤ۔ بس تمہارا تو کچھ ہوگا نہیں۔ ایک ہم ہی قسمت کے ستائے ہوئے ہیں۔"

یہ تو ہمیشہ کی بحث تھی، لیکن پاروتی تھی کہ اس پر کسی کا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ دل کو اگر کوئی جچتا نہ ہو تو پھر اس کو کس طرح اپنا کہیں۔ کس طرح اسے پیار کریں؟ پھر اگر پیار ہی جب نہ ہو تو گھر بار کیسے کریں۔ کیا محض کھانے میں منہ ڈال کر پیٹ بھرنے کی طرح! ہم جیسے کتوں، یا بلیوں کو بچے ہوا کرتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی بچے ہی پیدا کرنے چاہیئے؟

اس نے اپنے ماں باپ کا سنسار دیکھا ہے اور دل مسل کر رہ جاتا ہے کیسی اجلی اجلی سی صاف ماں اور کیسا کسی ریچھ سے بالوں والا اس کا باپ پھر بھی بھولے بھٹکے نہ جانتے ہوئے بھی کبھی کبھی سنائی دینے والے بھدے فقرے۔ پھر صبح ماں کی کھنچی ہوئی آنکھیں دیکھ، پاروتی کو یہ احساس ہونے لگتا کہ گویا وہ فقرے اسی کے لئے کہے گئے ہوں۔ کیا اسی طرح سے میں پیدا ہوئی ہوں ...... اور اس کا جی چاہتا کہ وہ خود اپنے منہ پر طمانچہ مارے۔

ماں کبھی کبھی کہتی تھی، "ارے کیا ہمارے سنسار نہیں ہوئے!"

پاری ماں کو دیکھتی ہی رہتی اور اسے ماں پر ترس آجاتا۔ ماں پاپڑ بناتی اور نمک لاتی رہتی، دن بھر پیٹ جلاتی رہتی اور رات کو جسم جلاتی، کیا اسی کا نام سنسار ہے! کیوں کیا اس نے ایسا سنسار؟ اگر اس طرح کا سنسار نہ بھی کرتی تو دنیا کا کونسا تاج و تخت بیکار ہونے والا تھا۔ صرف جسمانی بھوک ہی مٹانی ہوتی تو کوئی اپنا من بھاون ہی ڈھونڈ کر عیش ہی کرتی تو!

سچ ہے اپنے من مطابق اپنی پسند کا ہی ہونا چاہیئے جسم کسی کی آغوش میں پھول بن کر کھل جانا چاہیئے۔ دل سے نغمے پھوٹنے چاہئیں۔ پھر پاروتی سوچتی بھی تو دل کیسی پاگل پن کی باتیں سوچنے لگ جاتا ہے اس کا دل بھی آج اس سے مخاطب تھا۔ جس طرح صبح ہر سمت سے پھوٹ پڑتی ہے اسی طرح اس کا دل بھی اس کے انجانے میں آج خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

ایک دن ایسے ہی بیساکھ کی تیز تپتی ہوئی دھوپ جلا رہی تھی کہ اچانک اس کے آنکھوں کے کاجل کی لکیریں تعجب سے پھیل گئیں۔ "ای ماں"! پھر وہ دوڑتی ہوئی سوت پیچھے کے درخت کے پاس آکر رک گئی اور گویا وہیں پر گم کر رہ گئی۔

باڑی کے پچھلے ہی پھاٹک کے پاس ایک جیپ رکی ہوئی تھی۔ کچھ سرکاری ملازم آئے ہوئے تھے۔ پھولدار قمیص اور مٹیالے رنگ کی پتلون میں ملبوس وہ لوگ کچھ ناپ حساب لینے میں مصروف تھے۔

ان میں سے ایک شخص لکڑی سٹینڈ پر لگی دور بین سے کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنے ماتحتوں کو کچھ ہدایتیں دے رہا تھا۔ پاروتی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی اس کا مردانہ حسن اس کے دل پر گویا منقش ہو کر رہ گیا۔

اس گندمی رنگ پر دھوپ کی سنہری روشنی کس قدر سج رہی تھی

پیشانی پر آنے والی بھوری زلفوں کو بیچ بیچ میں بائیں ہاتھ سے ہٹاتا ہوا وہ کس قدر یکسوئی سے دیکھ رہا تھا کبھی کبھی چہرے کو گھما کر کچھ کہتا بھی جارہا تھا۔ اسے وہ نظارہ بے حد بھا گیا تھا اور وہ بھی! اس بدحواس کرنے والی دوپہر کو وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ اس کو اس طرح دیکھتے رہنے میں کسی قسم کی پابندی دامن گیر نہ تھی اور کوئی اسے دیکھ بھی رہا ہے اس بات کا پتہ اس گندمی بھوے کو تو ہرگز نہ چلتا، پگلا! وہ خود ہی بڑبڑائی۔ جب تک اس کے پاؤں نہیں تھکے وہ وہیں پر جمی رہی اور پھر کبھی اس بیچ میں وہ جلد ہی کسی کام سے کہیں غائب ہو گئے۔ سارا سامان بھی باندھ بوندھ کر جیب میں پہنچ چکا تھا۔ شائد سب کچھ سمیٹا جا چکا ہے۔ پارو بھی چمپا چھوڑ کر پیچھے کی طرف مڑ گئی۔ مٹی کو روندتے ہوئے پاؤں گھر کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ کہ بس پانچ ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی، ...'

"اجی...... !"

دو مسکراتی بلکہ باتیں کرتی ہوئی آنکھیں، چہرے سے پھوٹتا ہوا جوانی کا جوش بھرا انکسار...

" یہاں پانی ملے گا ــــ"

" ہاں ضرور، اسی طرح آگے بڑھ آئیے۔ ذرا رک جاؤ میں لوٹا اور پیالے آؤں ــــ"

" کوئی ضرورت نہیں، کنویں کا تازہ پانی ہی زیادہ میٹھا ہوگا۔" وہ وہیں چبوترے پر بیٹھ گیا۔

" آپ کا گاؤں تو بڑا سندر ہے۔"

" سچ؟"

۔ اس نے اس کے سوال پر تعجب سے دیکھا، پھر پانی پلاتی ہوئی خوبصورت صندلی کلائیاں ہی دیکھتا رہا۔ اور جب سوال کرنے والی دلکش آنکھیں دیکھیں تو ان میں بہت سی ان کہی باتیں پوشیدہ تھیں۔ اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر پارو کچھ گڑبڑائی۔ کچھ تو پوچھنا ہی چاہیے۔ اس نے پوچھا۔ جس میں ابھی آپ دیکھ رہے تھے اس آلے کو کیا کہتے ہیں؟"

" تھیوڈ لائٹ، سطح کا اندازہ لگانے کے کام آتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

" کیا" ؟

" کہ میں سروے لے رہا تھا" ؟

" وہ صرف مسکرا کر رہ گئی، " کل آپ پھر آنے والے ہیں ؟"

" پانی پینے؟" اس کی آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔

" نہیں نہیں، جی، وہ سروے کے لیے۔ وہ کچھ بوکھلا کر شرما سی گئی اس کے چہرے پر ڈھیر ساری ہنسی لہرا گئی۔

اور پھر وہ اگلا سارا ہفتہ ہی سروے لیتا رہا۔ لیول دیکھتا رہا، پانی پیتا رہا بیساکھ کی دھوپ کو گندمی رنگ میں جذب کرتا رہا۔ سون چمپا کی خوشبو میں ڈوبتا رہا، گل موہر کا سلگتا سا رنگ نظروں میں سمیٹتا۔ ایک دوپہر کو پانی پیتے ہوئے کہنے لگا " اب سروے ختم ہو چکا، اس کے دل کی حرکت جیسے رکنے لگی: اور اس کے پھڑکتے ہونٹوں پر شوخ ہنسی لہرا گئی۔

" کل ہی بمبئی جانا ہوگا۔"

" پھر کب ملاقات ہوگی !"

جان کو آنکھوں میں لئے ہوئے ہی جیسے اس نے یہ سوال کیا ہو !

" اب ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ کنویں کا پانی بھی پی پی کر ختم ہونے کو آگیا ہے"

" ہاں!" اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

" کل صبح میں تمہارے گھر آنے والا ہوں۔"

" گھر...... ؟"

" ہاں گھر! تمہارے والد سے جو ملنا ہوگا"

" سچ ؟"

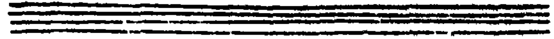
" تمہاری قسم، اس نے مدھم سی آواز میں کہا، اور وہ جذبات سے بھیگی ہوئی قسم کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے بھاگ گئی۔ اس کے لئے نقشِ قدم چھوڑتی ہوئی۔

آج صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ شروع ہونے سے قبل ہی وہ جاگ گئی تھی، کسی روٹھے ہوئے داماد کی طرح۔ اور اس کے دل کا مخملی ملائم سا خواب اس کی پلکوں کی لو پر تھرتھرا رہا تھا۔ ارے ہاں! کیا کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے؟ جوتی کے منڈوے کے پاس اس کی آنکھیں جم کر رہ گئیں اور جسم میں گویا چاندی کے پھول کھلنے لگے۔

وجیا راجا دھیکش

مترجم : شہر بانو ملا





صبح نو ساڑھے نو ہی بجے ہوں گے۔ گھر میں ایک دھوم سی مچی ہوئی تھی۔ سمن کھانا پکانے میں مصروف تھی اور بچے اسکول کی تیاریاں کرنے میں لگے ہوتے تھے۔ میں بھی اپنی پوری تیاریاں کر چکنے پر کھانے کے ہی انتظار میں تھا۔ ہاتھ کے اخبار پر نظر پھیر رہا تھا لیکن وہ محض ایک مشغلہ ہی تھا۔ دھیان تو اندر سے سنائی دینے والی گفتگو پر ہی لگا ہوا تھا۔ ایسی مصروفیت کے باوجود بھی سمن اور بچوں میں باتیں چل ہی رہی تھیں۔ ہمیشہ چلتی رہتیں۔ کبھی کبھی میں بھی اُن میں حصّہ لے لیا کرتا تھا۔ بچے کچھ نہ کچھ مانگا کرتے۔ کپڑے، کھلونے، یا کوئی لگانے کی چیز ہی۔ کبھی کبھی تو سمن کو بھی گھر آراستہ کرنے کی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ویسے گھر میں کمی ہی کس بات کی تھی ؟ لیکن نئی نئی فرمائشیں ہوا ہی کرتیں۔ اُن سب کو کب خریدا جائے اس پر بھی باتیں ہوتیں۔ یہ بھی ایک خوشی کی ہی بات تھی کہ، ہمیں کسی بات کی کمی نہیں۔ کسی بھی چیز کو بڑی آسانی سے خرید سکتے ہیں، خیال ہی کتنا اطمینان بخش تھا ! اسی طرح سے میرا گھر سنسار صبح و شام خوش و خرّم ہی نظر آتا۔ مشکلیں تھیں۔ پر وہ بہت چھوٹی چھوٹی سی اور وقتی قسم کی۔ یہ آرام یہ خوشی محض دس یا بارہ برسوں میں جمع کی ہوئی تھی۔ اس بات پر میں نازاں تھا۔ میں نے اپنے بیوی بچوں کو خوش رکھا ہے، جو بھی انہوں نے مانگا دے سکا ہوں۔ اس خیال سے بھی کتنی تسلی پہنچتی۔ پھر صبح صبح ہی ہونے والی باتوں میں گویا اُس خوشی کا پرتو ہی نظر آتا۔

آج بھی کچھ اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ دیوالی قریب تھی۔ چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ پھر چھٹیوں میں کہاں جائیں۔ اس بات کو طے کیا جا رہا تھا۔

"کیا مہابلیشور چلیں ؟" میرا آٹھ نو سالہ لڑکا کہہ رہا تھا۔

"ارے وہ پاگل، دیوالی میں تو وہاں بہت سردیاں ہوتی ہیں۔"

"پھر کہاں جائیں ؟"

"بھلا کہاں جائیں ؟ ——— پونہ ——— چلیں ؟"

"ہاں ماں" بچوں نے بڑے ہی جوش کے ساتھ کہا۔ "ہم پہلے جہاں ٹھہرے تھے، کیا اسی ہوٹل میں رہیں گے ؟ ہمیں وہ بہت ہی پسند ہے۔"

ایک سال پہلے ہی ہم اس گاؤں سے بالکل دور "رٹز" میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پُرسکون ماحول کا عمدہ کھانا، بچے بڑے ہی خوش ہوئے تھے۔ ڈھائی تین ہو روپے ضرور صرف ہوتے تھے، لیکن سال میں ایک بار تو اس طرح کے مزے تو کرنا ہی چاہیئے۔ اُتنا ہی ایک و آرام ! پونہ جانے کا پروگرام بنایا جا رہا تھا۔ اور میں اُن باتوں کو سُنتے ہوئے بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دل میں جھانکنے والا خیال آج بھی آگیا۔ یہ بچے کتنے خوش ہیں ! ورنہ ہمارا بچپن۔ وہ تنگ دستی۔ وہ شکایتیں۔ اُن سے لڑتے ہوئے ہی بچپن تو کیا، جوانی کی ابتدا بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ بڑے ہی معمولی طور پر کالج کی پڑھائی پوری ہوئی۔ قسمت نے ہی ساتھ دیا، اس لئے سیلس ٹیکس آفیسر کی نوکری ملی ورنہ یہ دن بھی دیکھنے نصیب نہ ہوتے ! ۔۔۔ شروع شروع کے وہ تکلیف بھرے کشمکش کے دن بار بار یاد آجاتے ہیں تو لگتا ہے کہ مجھے بھی زندگی بھر کلرکی ہی کرنی پڑی ہوتی ! مگر خدا کی مہربانی سے اُس چکّر سے بیچ میں ہی باہر نکل گیا ہوں ـــ اور دور ہی رہنے والا ہوں ۔۔۔ وہ گھر، وہ لوگ ۔۔۔ آج بھی وہیں پر ہیں۔ بوڑھے ماں باپ، زیرِ تعلیم بھائی، غیر شادی شدہ دو بہنیں۔ کیا کیا ذمّہ داری لیتے پھرتا ؟ بس فرض نہیں بھولتا ہوں۔ مہینے کی پہلی تاریخ پر دو سو روپیوں کا منی آرڈر بلا ناغہ بھیج دیا کرتا ہوں۔ دو ڈھائی سال سے گاؤں جا کر اُن سے مل آتا ہوں۔ اِس سے آگے کسی بھی جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔ یہ میں نے بالکل طے کر رکھا تھا۔ پھر میرا یہ خوشیوں سے بھرا سنسار میرا اپنا آباد کیا ہوا ہے۔ کوئی دوسرا اُس کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ کبھی بیچ میں گھر کے لوگ بمبئی آنے کی خواہش ظاہر کیا کرتے، مگر اس طرف میں نے کبھی بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ میرے بالترتیب سجائے ہوئے گھر میں وہ لوگ کتنے بے ترتیب نظر آتے۔ ۔۔۔ دو سال پہلے ہی میرے چچا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اکیلے ہی تھے ہمارے ہی گھر رہا کرتے تھے۔ مجھ سے بہت محبت کیا کرتے تھے۔ مرنے سے قبل

پندرہ دن پہلے ہی میں اُن سے ملا تھا تو بڑی ہی نحیف سی آواز میں مجھ سے کہا تھا۔۔۔" مجھے بمبئی لے چلتے ہو! شاید وہاں پر میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر تیرا گھر بھی دیکھنا ہے۔۔۔" اُس وقت تو میں خاموش رہا تھا لیکن بمبئی آنے پر اُن کو ایک مہینے کے لئے بمبئی بلانے کا ارادہ بھی میں نے پکا کر چکا تھا۔ اتنے میں ہی اُن کے فوت ہو جانے کا ٹیلی گرام ملا! بے کار ہی دل میں ایک خلش سی رہ گئی۔ آج بھی کبھی کبھی اُس یاد سے تکلیف ہی محسوس ہوتی ہے۔ آدمی عموماً طور پر خوش تو رہتا ہے لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی خلشوں کو بھی وہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

۔۔۔۔ دس بجے اور توقع کے مطابق سمن نے آواز دی، "چلو کھانے کے لئے آجاؤ۔" اب اُٹھنا لازمی تھا کیونکہ بس پکڑنی تھی، پھر خود کی گاڑی آنے تک تو وقت کی پابندی ضروری تھی لہذا باورچی خانہ پہنچ گیا اور کھانے کی میز پر بیٹھ گیا۔ بھاپ چھوڑتا ہوا کھانا میز پر چنا گیا تھا۔ آلو کے شوربے سے اُٹھتی ہوئی مہک۔ ملائی دار دہی، چیزیں دیکھ کر ہی دل خوش ہوا۔ بڑے ہی شوق سے کھانے لگا۔

ابھی آدھا ہی کھانا کھایا تھا۔ سمن بھی بڑے اصرار سے کھلا رہی تھی کہ اتنے میں بیل بج اُٹھی۔

"ذرا دیکھتی ہو، کون آیا ہے؟" میں نے کہا۔

سمن کے دروازہ کھولنے کی آواز سنائی دی۔" بھلا اس وقت کون آیا ہوگا؟" میں ابھی اندازہ ہی لگا رہا تھا کہ سمن اندر آگئی اور اس نے ہلکی سی آواز میں کہا 'درگا تائی' ایک پل کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کچھ دیر میں ہی یاد آگیا' درگا یعنی میری چچازاد بہن ساٹھ سال کے قریب پہنچی ہوئی بیوہ، گاؤں ہی میں رہا کرتی تھی۔ پھر اس وقت یہ بمبئی کیسے؟ ۔۔ اور وہ بھی اکیلی؟ ۔۔۔ میں ذرا پریشان ہوا۔

پیچھے پیچھے درگا تائی بھی اندر آگئی۔۔ اور اُس پر نظر پڑتے ہی میں چونک پڑا۔۔! وہ کتنی تھک گئی تھی۔ جسم پر ایک رنگ اُڑی ساڑی، ہاتھ میں کپڑے ٹھونسے ہوئے دو میلے جھولے۔۔۔۔ جسم جھرّیوں سے بھرا ہوا۔ اور نظروں میں بے چارگی۔۔۔ اُس کی طرف صرف دیکھ لیا اور منہ میں نوالا اٹکنے لگا۔ واقعتاً اُس کا اور میرا رشتہ بہت ہی مہر و خلوص کا رہا ہو ایسی کوئی بھی بات نہیں تھی لیکن اس کے لئے میرے دل میں ایک اپنا پن ضرور تھا۔ بالکل ہی جوانی کے عالم میں وہ بیوہ ہوگئی تھی۔ دس سال کا ایک اُس کا بچی تھا۔ اس کو بڑے دھیرج کے ساتھ پالا پوسا، تعلیم دی، کتنی سخت محنت اٹھائی تھی اُس کے لئے۔۔۔۔ لیکن اُس نے کبھی کسی سے مدد نہیں مانگی۔ سب کچھ خود اپنی ہمت پر کیا تھا اور آج وہی لڑکا اس کو پوچھتا بھی نہیں تھا! اس کی شادی ہو چکی تھی۔ بمبئی ہی میں اچھی نوکری بھی تھی۔ درگا تائی کچھ مہینے اس کے پاس رہ بھی چکی تھی۔ مگر اس کے ساتھ اس کی نہیں بنی۔ بہو سے ہر گھڑی بے عزتی ہونے لگی۔ اور ایک دن آخر لڑکے نے ہی اُس کو گاؤں بھیج دیا! خاموش چلی گئی بے چاری؟ اور چھوٹا سا ایک کمرہ لے کر اکیلی ہی رہنے لگی۔ اُس کا وہ کمرہ دیکھ کر تو میں دہل گیا تھا۔۔۔ لیکن چارا بھی کیا تھا؟ میں بھی کس کس کی مدد کرتا؟ سال بھر پہلے ہی میں اس سے مل چکا ہوں، اس وقت تو وہ اچھی بھلی نظر آئی تھی، اور اُس کے بعد آج! کیا حال ہو گیا ہے! مجھے لگا بیرے جسم کی طاقت ہی جانے لگی ہے۔ درگا تائی اسی طرح لاچار نگاہوں سے تاکتی ہوئی کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ نا" انجانے میں ہی میری آواز جذبات میں بھیگنے لگی۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر سمٹی ہوئی سی بیٹھ گئی۔

"کب آئی ہو؟"

"پندرہ دن ہو گئے"

"پندرہ دن؟ پھر اتنے دن کہاں رہیں؟"

"ہاسپٹل میں۔۔۔"

"یعنی تمہارا مطلب؟"

"پیٹ میں ہمیشہ درد رہا کرتا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹروں کے علاج سے جب کوئی فائدہ نہیں ہوا۔۔۔ تو سب کہنے لگے بمبئی چلی جاؤ۔ اس لئے مدھو کے پاس آگئی۔ مدھو نے کہا، تمہارا ہاسپٹل میں رہنا ہی زیادہ اچھا ہے۔ سب معائنہ ٹھیک سے ہو جائے گا۔ آٹھ دس دنوں تک وہاں پر رہی کسی نے بھی خبر نہیں لی۔ آخر آج سب معائنہ ختم ہوا تو سوچا جانے سے پہلے تم سے مل کر چلی جاؤں۔"

"کونسا ہاسپٹل؟"

"کے۔ای۔ ایم۔"

یعنی ہمارے ہی علاقے میں ہے اور مدھو نے تو اطلاع بھی نہیں دی؟ آٹھ دس دنوں تک یہ عورت جنرل وارڈ کی ایک کھاٹ پر پڑی رہی، نہ کوئی شناسا نہ اپنا۔ آس پاس صرف ہر طرح کے مریض۔۔۔۔ اِس خیال نے ہی میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ میں اس اسپتال میں کبھی دو تین بار گیا ہوں۔ وہاں کے صرف ماحول نے ہی میرا دم گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔ اسپتال کے احاطے کا آدمی کس قدر بدنما اور قابلِ رحم نظر آتا ہے۔۔۔ گویا موت کے سائے تلے چلنے والا ہو۔ دوائیوں کی بو، غریب، لاچار مریضوں کی بھیڑ۔۔۔۔ بدمزا کھانا۔ خود کے گھر سے بھی کبھی زیادہ باہر نہ نکلی ہوئی درگا تائی اس لاپرواہ عجیب و غریب ماحول میں آٹھ دس دنوں تک رہ کر آئیں!۔۔۔ مجھے تو لگا میں رو ہی پڑوں گا۔ اتنی آسانی سے کبھی پریشان نہ ہونے والا میں۔۔۔ اس وقت ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں؟

"لیکن اب تو تمہاری طبیعت ٹھیک ہوگئی ہے نا؟"

"نہیں، لیکن اب یہاں بھی اور کتنے دن رہوں؟ گاؤں ہی چلی جاؤں گی۔"

"اور گاؤں جا کر کیا کرو گی؟۔۔۔ اسی طرح سے لٹکتی رہو گی، اور

ایک دن مر جاؤ گی! — کمبخت نہ جانے کس طرح یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے کسی طرح سے اپنا کھانا ختم کر لیا۔

ہاتھ دھوتے وقت، کپڑے پہنتے وقت بھی میں سوچ ہی رہا تھا، اور آخر چار دن درگا تائی کو اپنے یہاں روکنے کا ارادہ پکا کر چکا۔ کون جانے اس کی بیماری کی خبر سن لیتا تو شاید اتنا پریشان ہوتا! پر اس کو دوبرو دیکھنے کے بعد۔۔۔۔

سمن پر میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا لیکن اس کو وہ نہیں جچا۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا، "خواہ مخواہ یہ اتنی بڑی ذمہ داری کیوں اپنے سر لے لیتے ہو؟ بیمار عورت، کچھ بھلا بُرا ہی ہو گیا تو۔" لیکن اس کی مخالفت کی طرف میں نے کوئی توجہ ہی نہیں کی مجھے یوں محسوس ہوا کہ درگا تائی کو میرے یہاں چار دن رہنا ہی چاہیئے۔

میں نے آفس جاتے ہوئے کہہ دیا، "دیکھو درگا تائی، واپس جانے کی جلدی مت کرنا۔ چار دن یہاں رہ جاؤ۔ پھر میں تم کو گاؤں پہنچانے کا انتظام کر دوں گا۔"

یہ بات اُس کو اچھی لگنے کے آثار اُس کے چہرے پر صاف نمایاں ہوئے۔ اُس کے لئے اتنی بھی ہمدردی کیا کسی نے دکھائی بھی ہو گی؟ آج تک کی زندگی محنت و مشقت اور ذلت میں ہی صرف ہوئی تھی۔ اب یہ آخری چار دن بچ گئے ہیں۔ مرتے وقت ہی کم از کم اس احساس سے مرنے دو کہ اپنا بھی کوئی ہے۔۔۔۔ درگا تائی کے اب بہت دن زندہ رہنے کی امید نہیں ہے، یہ اس کو دیکھتے ہی میں سمجھ چکا تھا۔

۔۔۔ میں آفس سے ذرا جلد ہی واپس لوٹ آیا تھا۔ سر میں لگاتار درگا تائی کا ہی خیال گردش کرتا رہا۔

"درگا تائی کیا کر رہی ہے؟" چائے پیتے وقت ہی میں نے پوچھ لیا۔

"آرام سے لیٹی ہوئی ہیں بے چاری۔" سمن کی آواز میں بھی اب احساسِ ہمدردی چھلک رہا تھا۔

"کتنی تھک گئی ہے! اب زیادہ دن نہیں جی سکتی!" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔" سمن نے ہامی بھر دی۔

"اسی سے کہہ رہا ہوں، چار دن اس کو یہاں رہنے دو، چچا کا کتنا ارادہ ہوتے ہوئے بھی ہم بُلا بھی نہ سکے۔ اور اُس سے پہلے ہی وہ بے چارے چل بسے۔" دل کو ہمیشہ رنج پہنچانے والا خیال میں نے کہہ ڈالا۔ اور پھر اس کی ٹیس سے تڑپ کر رہ گیا۔ اپنی ایک معمولی سی خواہش بھی پوری ہوئے بغیر ہی مرنے والے انسان کو کیا محسوس ہوتا ہے؟ چچا کو ٹماٹر کس قدر پسند تھے۔ جب بھی میں بمبئی سے وہاں جاتا، تو ہمیشہ پوچھتے رہتے، "میرے لئے ٹماٹر لے آیا ہے؟" اور اس بات پر تو ایک دن میں نے نہایت ہی بے رخی سے کہہ دیا تھا، "چچا کیسی عجیب بات کرتے ہو؟ بھلا اتنی دور سے ٹماٹر لیوں کر لے آتا؟ سب کے سب ٹوٹ کر ہی رہ جاتے۔" اور پھر اُس وقت کا اُن کا وہ مغموم چہرہ مجھے آج بھی یاد ہے۔۔۔ اُن کے مرنے سے پہلے ہی میں گاؤں گیا ہوا تھا، اس وقت ان کے لئے ایک قمیض کا کپڑا بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ خاص اُن کے لئے یہ میرا پہلا تحفہ تھا۔ ۔۔۔ وہ کپڑا ان کی صندوق میں ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔۔۔ بھرے ہوتے خوش اور آباد سنسار میں بھی چبھتی رہنے والی کچھ ایسی بھی باتیں تھیں۔

کچھ پریشانی کے عالم میں میں نے درگا تائی کو باہر کے کمرے میں آنے کے لئے آواز دی،

"یہاں آجاؤ نا، کچھ گپ شپ ہی کرتے ہیں۔"

"وہ باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی، صوفے پر رکھے ہوئے کشن کے خوبصورت ڈیزائن اور درگا تائی کی ساڑی کا اُڑا اُڑا سا رنگ۔۔۔۔

"ڈاکٹر نے تمہیں کچھ دوائیاں بھی لکھوائی ہوں گی نا؟"

"جی ہاں۔۔۔۔ پر میرے پاس اتنے پیسے ہی کہاں ہیں؟"

"اِس کی فکر تم مت کرو۔ سب دوائیاں ہم لے آئیں گے۔"

میں نے اس کے پاس سے فوراً ہی پرسکرپشن مانگ لیا اور نوکر کو پیسے دے کر دوائیاں لانے کے لئے بھیجنے لگا۔۔۔۔

"یہاں کاغذ کے کپ میں آئسکریم ملا کرتی ہے نا؟ کوئی کہہ رہا تھا۔"

"ہاں ہاں، کیوں، کیا تمہیں کھانی ہے؟"

"نا بھئی، اب لو سنو، آئسکریم کھانے کے لئے کیا میں چھوٹی ہوں!"

"رہنے دو۔" یہ کہتے ہوئے ہی میں نے نوکر کو ایک کپ آئسکریم بھی لانے کے لئے کہا۔

—— اور پھر درگا تائی کا آئسکریم کھانا، مجھ سے تو اس کی طرف دیکھا تک نہیں جاتا تھا۔ وہ چمچے کو جلد جلد بھر لینا۔ ٹھنڈی چیز کھانے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے دانتوں میں ہونے والی تکلیف کے چہرے پر نمایاں ہونے والے تاثرات۔۔۔ بیچ بیچ میں ساڑی پر گرتے قطرے اور پھر آخر میں آئسکریم پگھلنے سے اچانک منہ سے لگایا ہوا کپ۔۔۔۔

لیکن اس کے باوجود بھی چہرے سے برسنے والی خوشی۔ شاید اتنی معمولی سی چیز پر خوش ہونے کی عادت تو کبھی کی چھوٹ گئی تھی! — پھر بھی میں اس کی ایک خواہش تو پوری کر سکا! — یہی تو میری خوشی تھی۔

—— اور ایک یا دو دن بعد ہی سمن درگا تائی کو لے کر باہر گئی۔ میں نے کہا، "دیکھو، اُس کو ٹیکسی میں ہی لے جانا۔ ایک اور مزے کا لطف درگا تائی کو اٹھانے دو!" سمن اُس کے لئے ساڑی بھی خریدنے والی تھی۔

وہ دونوں جب واپس لوٹ آئیں تو سمن کے چہرے پر کچھ ناراضگی سی نظر آئی۔ میں نے اس کو وجہ پوچھی، تو شکایت بھرے لہجے میں بولی، "ایسی لالچی کو

سلی ہی نہیں ہوتی، ایک ساڑی لے دی، چولی کے لئے کپڑا بھی لے لیا، پھر بھی چھوٹی موٹی چیزیں خریدتی ہی رہتی ہیں!"

"چلو جانے بھی دو۔ آج تک زندگی میں کچھ بھی نہیں ملا! تو کچھ ہوس تو ہونی ہی چاہیئے، پھر تم نے دے دیا نا لے کر، جو وہ چاہتی تھیں؟"

"نہ دے کر کیا کرتی؟"

____ درگا دیوی نے آج تک نہ پائی ہوئی خوشیاں، اس کو کس آسانی سے دے کر میں سبکدوش ہو چکا تھا!

درگا تائی کو آئے ہوئے چار دن ہو چکے تھے۔ اُس کے چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ یہ دوائیاں شروع کرنے سے ہوگا یا پھر آرام ملنے سے ہوگا۔ اس کے اب گاؤں چلے جانے میں بھی کوئی ہرج نہیں تھا لیکن وہ تو جانے کا نام بھی نہ لیتی تھی ___ میں کچھ پریشانی محسوس کرنے لگ گیا تھا۔ سمن بھی۔ درگا تائی کی وجہ سے ہمارے سنسار میں بدنظمی سی پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے سونے کے کمرے میں اُس کے میلے اور بے ڈھب سے بھونڈے پڑے ہوتے تھے۔ اسٹینڈ پہ اس کی تہہ کی ہوئی ساڑی لٹکتی رہتی، اور ایک دن تو اس کی جیب مالا دیوان خانے میں پڑی ہوئی تھی! پھر اس کا ایک مشغلہ سمجھو، فین شروع کر دینا اور انہیں بند کرنے کا اس کو کوئی دھیان بھی نہ رہتا! یہ اس قسم کی لاپرواہی اور بے قاعدگی آخر کب تک چلتی؟ میری پریشانی بڑھنے لگی۔ اس کے علاوہ دو دن بعد ہی کچھ آفیسرس بھی میرے گھر کھانے پر آنے والے تھے۔

"اُس وقت ان کا کس طرح سے انتظام کریں گے! بڑی گڑبڑی ہے۔ اس سے پہلے وہ چلی ہی جائیں تو اچھا ہے۔" سمن نے رائے دی مجھے درست لگی۔

"درگا تائی مدھو کو اطلاع دے دیتا ہوں اور میں تمہارا کل کا ٹکٹ بھی لے آتا ہوں۔" دوسرے ہی دن میں نے اس سے کہہ دیا۔

وہ کچھ نہیں بولی لیکن جاتے وقت وہ زیادہ خوش نہیں تھی، اتنا تو سچ ہے۔ شاید وہ کچھ دن اور رہنا چاہتی ہوگی ___ مگر میں اب اور کتنے دن ذمے داری لے سکتا تھا؟ ___ گاڑی چھوٹتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تو میں پھر ایک بار دہل گیا۔ اُسی جذبے کے تحت پچیس روپے اس کو دیتے ہوئے میں نے کہا "اسے رہنے دو، تمہارے خرچ کے کام آئیں گے۔" اُس کے چہرے پر ایک اطمینان سا نظر آیا۔ میں بھی وہی چاہتا تھا۔ اس کا غم زدہ چہرہ مجھے اپنی یادداشت میں رکھنا نہیں تھا۔

میرے گھر واپس آنے تک سمن نے گھر کو بڑے قرینے سے ترتیب دے رکھا تھا اور پھر ایک بار بے ترتیبی باقاعدگی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"چلو آخر چار دنوں کا ہنگامہ ختم ہو گیا!" وہ بولی ___ خیر یہ تو چلتا ہی رہتا ہے لیکن وہ چار دن رہ کر چلی گئی یہ اچھا ہی ہوا ورنہ چچا کے واقعہ کی طرح ہی دل میں کسی قسم کی کوئی کسک باقی نہ رہنی چاہیئے!

درگا تائی کے لئے جو کچھ ممکن تھا، ہم نے وہ سب کر دیا ہے، اسی اطمینان کے نشے میں تھا ___ اور اب اگر کسی وقت بھی اُس کے مرنے کی خبر سن لوں گا تو کسی قسم کی خلش محسوس کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا! ●●

بقیہ: مدرسہ کا راستہ

گئی آئی پائیں باقی ہے۔ ایسی معمولی باتیں ہی تھیں۔

اس کے باوجود اپنا نام نکال کر دیکھا۔ شیلا پار نامے، حاضر، غیر حاضر کی جگہ خالی تھی۔ اس کے آگے ریمارک ___ اس میں آپا نے اپنے خار دار ہاتھوں سے اس دن کی تاریخ لکھ دی تھی اور آگے لکھا تھا ___

"نمونیا سے انتقال ہو گیا ____"

وینکٹیش ماڈگلکر
ترجمہ: سلام بن رزاق

بازار کی ہاٹ

ونچا تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جارہی تھی۔ اس کے سر پر سامان کی چھوٹی سی گٹھری تھی۔ جسے اس نے سیدھے ہاتھ سے تھامے رکھا تھا۔ اور بائیں ہاتھ میں تیل کی کپّی لٹکی ہوئی تھی۔ کچّی سڑک پر دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں پشت سے سائیکل کی ٹرن ٹرن سنائی دی۔ ونچا جھٹ ایک طرف کو ہٹ کر چلنے لگی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔

دن ڈوبنے کے قریب تھا۔ لوگ بازار ہاٹ سے فارغ ہو کر کب کے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ سڑک یہاں سے وہاں تک سنسان پڑی تھی۔ اور اس سنسان سڑک پر جوان اور صحت مند ونچا اکیلی تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جارہی تھی۔

آج بازار میں اس کی مرچوں کو دیر تک مناسب گاہک ہی نہیں ملا۔ کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد بازار کے ختم ہوتے ہوتے اس نے مرچیں بیچنا شروع کیں۔ اور کسی نہ کسی طرح آخری سیر بھر مرچیں بیچ کر کپڑا جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اپنے گھر کے لئے بھی کئی چھٹ پٹ چیزیں خریدنی تھیں۔ تیل، نمک، ناریل، جھاڑو، ساری چیزیں دیکھ بھال کر خریدتے خریدتے دن تمام ہو گیا۔ سامان کا گٹھر سر پر رکھ کر جب وہ اپنے گاؤں جانے کی تیاری کرنے لگی۔ تو سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں کی ساتھنوں کی تلاش بھی کی۔ والی کی گیا، سنار کی کرشنی، پوار کی دھونڈو بائی۔ یہ ساری عورتیں صبح گاؤں سے اس کے ساتھ ہی چلی تھیں۔ اور یہ طے ہوا تھا کہ "جاتے بکھت (وقت) بھی سب ساتھ ہی جائیں گی۔" مگر اتنی دیر تک کون ٹھہرتا؟ پھر اس نے سوچا شاید وہ سب نالے کے کنارے والے برگد کے نیچے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ اور وہ انھیں ادھر ادھر تلاش کرنے کے بجائے گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ مگر برگد کے نیچے کوئی بھی نہیں تھا۔ غالباً وہ سب اس کی راہ دیکھ کر کب کی جا چکی تھیں۔ ونچا گھبرا گئی۔ اور جلد قدم اٹھاتی اپنے گاؤں آدن واڑی کی طرف روانہ ہو گئی۔ پگڈنڈی پار کر کے وہ ٹیکری پر پہنچی۔ اور بڑی پُر امید نظروں سے سامنے کی کچی سڑک پر نگاہ ڈالی۔ مگر دور تک پھیلی اس سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ کسی ساتھی کے بغیر تنہا، پانچ میل جنگل کا یہ طویل راستہ کیوں کر کٹے گا۔ دن تو بس ڈوبنے کو ہی ہے۔ میل بھر جاتے جاتے رات سر پر آ جائے گی۔ اندھیری رات، سنسان راستہ اور راستے کے دونوں طرف بھائیں بھائیں کرتا جنگل دوسری طرف اکیلی جان جوان عورت۔ ڈر لگنا فطری بات تھی۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد متوحش نظروں سے آگے پیچھے تاکتی ونچا گاؤں کی طرف چلنے لگی۔ متناسب جسم پر کسی ہوئی گہرے سبز رنگ کی ساڑی کے نیچے اس کا سینہ بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ گیلی ہلدی کی گانٹھ جیسا اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ یوں تو وہ گاؤں کے راستے سے اچھی طرح واقف تھی۔ اور رات میں اندھیرے راستے سے گذرنا بھی اس کیلئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بابا کھیت سے گھر لوٹتے وقت دیر ہو ہی جاتی ہے۔ مگر کھیت سے گھر تک کے اس راستے میں اور اس جنگل ویرانے میں کافی فرق تھا۔ ایک نامعلوم خوف سے اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ پیچھے سے سائیکل کی گھنٹی دوبارہ ٹرن ٹرن بولی۔ اور ٹِکھا جادو تیزی سے پیڈل مارتا ہوا اس کے پاس سے نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر ایک نظر ونچا پر ڈالی۔ مگر وہ رُکا نہیں کچے راستے پہ اس کے بھاری جسم کے نیچے سائیکل کراہ رہی تھی۔ اور پینڈ (مویشیوں کی مخصوص غذا) کا تھیلا کیریئر پر لادے ٹِکھا اندھیرا پھیلنے سے پہلے گاؤں پہنچنے کے خیال سے تیز تیز پیڈل مار رہا تھا۔ ونچا سوچنے لگی یہ اگر پیدل چل رہا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا ہے۔ کم سے کم گاؤں تک ساتھ تو رہتا۔ مرد ہے پر کون پرایا ہے گاؤں ہی کا تو ہے۔ مگر یہ بھی ایا ہے تو سائیکل پر...

ونچا کی نظریں ٹِکھا کی دور ہوتی چوڑی چکلی پیٹھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ ٹِکھا سائیکل کھڑکھڑاتا چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ مشکل سے نصف فرلانگ ہی کا فاصلہ کر پایا ہوگا۔ کہ ونچا نے اچانک اسے سائیکل سے نیچے اترتے دیکھا۔ نیچے اتر کر وہ سائیکل پر جھکا۔ اس کا پچھلا پہیہ ٹٹول رہا تھا۔

"ہے راما! لگتا ہے ہوا نکل گئی۔"

ٹِکھا ایک ہاتھ سے سائیکل کا ہینڈل تھامے راستے ہی میں کھڑا تھا

وہ کنکھیوں سے کبھی سائیکل کی طرف تو کبھی قریب آتی ونجا کی طرف دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا۔ ٹائر تو پنکچر ہو ہی گیا۔ اب پیدل چلنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ ؟ کیوں نہ پھر اس عورت کا قریب آنے تک انتظار کروں۔ گاؤں تک ساتھ رہے گا۔ مگر اس کے یہاں پہنچنے تک میرا یوں سڑک پر کھڑا رہنا شاید مناسب نہ ہو۔ مجھے آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ وہ خود ہی بیچ کا فاصلہ طے کر کے مجھ سے مخاطب ہوگی تو بات کروں گا۔ ورنہ ـــــــ مگر وہ کیوں مجھ سے مخاطب ہونے لگی۔ وہ گاؤں میں اسے قریب آٹھ برسوں سے دیکھ رہا ہے۔ مگر کبھی اس سے بات کرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ نہیں وہ پہل نہیں کرے گی۔ پھر ؟ پھر کیا کیا جائے ؟ سکھا کے ذہن میں بار بار اسی قسم کے خیالات گھر رہے تھے۔۔۔

سکھا گاؤں کی قریب قریب سبھی عورتوں سے واقف تھا۔ مگر ان سب کے مقابلے میں ونجا کی حیثیت ہی اور تھی۔ گاؤں کے نوجوان ونجا سے گفتگو کے خواہشمند ہونے کے باوجود اس سے مخاطب ہونے کی بہت کم جرأت کر پاتے۔ کیوں کہ ونجا پری کی طرح حسین ضرور تھی۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے گھر پریوار میں ایسی مگن رہتی کہ اس کے بارے میں لوگوں کو رائے زنی کا بہت کم موقع ملتا۔ شادی ہوئے آٹھ برس کا عرصہ ہوگیا تھا۔ مگر لگتا تھا اس کا حسن روز افزاں شباب پر ہے۔ خوبصورت ہونے کے باوجود ونجا دوسری عورتوں کی طرح زیادہ ناز نخرے نہیں دکھاتی تھی۔ اور نہ اپنے بے پناہ حسن پر اتراتی پھرتی۔ اس کے متعلق گاؤں میں کسی قسم کی افواہ بھی کبھی نہیں پھیلی۔ جبکہ مجموعی طور پر عشق معاشقے کے تعلق سے اُڑن واڑی کافی بدنام جگہ تھی۔ گاؤں میں پانچ سات آوارہ چھوکرے ایسے تھے۔ جنہوں نے شریف بہو بیٹیوں کا گھروں سے باہر نکلنا دشوار کر رکھا تھا۔ کمبخت ایسے ایسے گُر جانتے تھے کہ کیسی ہی شریف عورت ہو اسے دو دن میں رام کر لیتے۔۔۔ روزآنہ صبح و شام اُجلے و چُست کپڑے پہن کر آوارہ گردی کرنا۔ اور موقع بے موقع یہاں وہاں سوراخ کرتے پھرنا۔ ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔۔۔!

گاؤں کی بہت سی شریف بہو بیٹیوں کو انہوں نے اس طرح راہ پر لگا دیا تھا۔ کہ پورا گاؤں ان کے ناپاک ارادوں سے خوف زدہ تھا۔ اِن باتوں کو لیکر کافی جھگڑا فساد بھی ہوا تھا۔ مگر لفنگوں کے منہ کون لگتا۔۔۔ ؟ شریف آدمی عزت کیلئے مرتا ہے۔۔۔ بیچارے جوتے کھا کر بھی ضبط کئے ہوئے تھے۔۔۔!

ایسی ایسی عورتیں جن کے بارے میں کوئی شبہ تک نہیں کر سکتا تھا ان کے ہتھے چڑھ چکی تھیں۔ اب ان عورتوں کے شوہر بے چارے راستوں سے گردنیں جھکائے ہوئے گذرتے۔ اپنی بیویوں پر کڑی نظر رکھتے۔ موقع موقع سے ان کی مرمت بھی کرتے رہتے۔ اس کے باوجود جو ہونا ہوتا چوری چھپے ہوتا رہتا۔۔۔ البتہ ابھی گاؤں میں کچھ عورتیں ایسی تھیں۔ جن کے ناموں کے ساتھ کوئی افواہ نہیں جڑی تھی ونجا بھی انہیں میں سے ایک تھی۔ وہ ایک اچھی بیوی تھی۔ شادی ہوئے آٹھ برس ہو گئے تھے۔ مگر بے چاری کی گود ابھی تک خالی تھی۔ اس کے تیور ایسے تھے کہ آوارہ چھوکروں کو اس کا راستہ کاٹنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی۔۔۔۔

سکھا سائیکل تھامے سڑک پر کھڑا یہی سب سوچ رہا تھا۔۔۔ ونجا تیز تیز قدم اٹھاتی قریب آتی جارہی تھی۔ دن ڈوب چکا تھا۔ بس اندھیرا پھیلنے ہی کو تھا۔ جنگل کی خنک ہوا درختوں کے پتوں اور شاخوں کے درمیان سے سرسراتی گذر رہی تھی اچانک شفق آلود مغرب کی سمت سے چمگادڑوں کا ایک جھنڈ شور مچاتا ہوا آیا۔ اور مشرق کی طرف پرواز کر گیا۔ ٹڈے اڑنے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف اُگی جھاڑیوں میں سرسراہٹ پھیلنے لگی۔۔۔ اور ابھی کافی راستہ طے کرنا باقی تھا۔ ونجا کاچھا باندھے، ایک ہاتھ یا بائیں سے سر پر رکھا گٹھری سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں بوتلیں لٹکائے بالکل قریب آگئی۔۔۔ اس کی گوری صحت مند پنڈلیاں دھول سے اٹی ہوئی تھیں اور چہرہ پسینے سے تربتر تھا۔ سکھا کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"بڑی دیری کر دی ونجا۔" سکھا سے تین چار قدم کے فاصلے پر ونجا رک گئی ہاتھ میں لٹکی بوتلوں کو نیچے پتھر سے ٹکا کر کھڑی کر دیں۔ سانس درست کیا۔ پھر ساڑی کے پلّو سے گردن کے پسینے کو پونچھتی ہوئی نرم آواز میں بولی۔

" نکلتے نکلتے اندھیرا ہو ہی گیا۔۔۔ "

وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بولی۔ سر پر رکھے گٹھر کو درست کیا۔۔۔ تھوڑا سستائی اور بوتلیں اٹھا کر دوبارہ آگے بڑھ گئی۔ سکھا خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ " کمبخت پہیئے میں بھی اسی وقت کانٹا لگنا تھا۔ اب چار میل تک سائیکل کو دھکیل کر لیجانا ہوگا۔۔۔"

سائیکل کو کھینچتا ہوا وہ بھی چلنے لگا۔ ونجا ایک ہاتھ سے سر پر رکھا گٹھر سنبھالے دوسرے ہاتھ میں بوتلیں لٹکائے چلی جارہی تھی۔ پیچھے سے سکھا کی سائیکل کی کھڑکھڑ سنائی دے رہی تھی۔ اس کا خوف ایک حد تک کم ہوگیا تھا۔ کہ اب گاؤں پہنچتے پہنچتے اگر رات ہو بھی گئی تو خطرے کی کوئی بات نہیں۔ گاؤں کا ایک مرد اس کے ساتھ تھا۔ سکھا گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اور اس کیلئے اجنبی بھی نہیں تھا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ عین وقت پر اس کی سائیکل پنکچر ہوگئی۔۔۔ پھر اچانک اس کا ذہن اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ کھیت سے لوٹ آئے ہوں گے۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد گاؤں میں ادھر ادھر پوچھ تاچھ شروع کر دی ہوگی۔ ممکن ہے گاڑی جوت کر اس کی تلاش میں نکل بھی چکے ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں میرا خیال ہی نہ آیا ہو۔۔۔۔۔ اس کی سوچ گھر کی جانب دوڑ رہی تھی۔ اور قدم تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔۔ پیچھے سکھا کی سائیکل کی کھڑکھڑ برابر سنائی دے رہی تھی کچھ دیر تک دونوں اسی طرح گُم سُم چلتے رہے۔۔۔ اندھیرا چھا گیا۔ آسمان پر اکّا دکّا ستارے چمکنے لگے تھے۔ جھینگروں کی جھائیں جھائیں شروع ہوگئی تھی۔ ونجا سوچنے لگی۔ سکھا پرایا تو نہیں ہے۔ گاؤں کا رہنے والا ہے۔ گھردار بال بچوں والا شخص ہے۔ میں بھی کوئی کنواری الھڑ چھوکری تو ہوں نہیں۔ اس طرح چُپ چُپ چلنا ٹھیک نہیں۔ آخر دو باتیں کرنے میں کیا حرج

باتوں میں راستہ بھی کٹ جائے گا۔ مگر میں کیسے شروع کروں؟ نہیں۔۔۔۔
وہ خود پہل کرے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ ونجا کے قدم سست پڑنے لگے۔ شکھا
اور اُس کے درمیان کا مختصر فاصلہ اور گھٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شکھا اس کے
برابر آگیا۔ اور سڑک کی دوسری طرف سائیکل تھامے چلنے لگا۔ دونوں کے
پیروں کی دھپ دھپ سے دھول اُڑ رہی تھی۔ سائیکل کی کھڑکھڑ بھی برابر جاری
تھی۔ ونجا کے ہاتھ میں لٹکی بوتلیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر فضا میں ہلکا ہلکا
ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ راستہ دھیرے دھیرے کٹنے لگا۔ ونجا کے برابر آتے
ہی ایک عجیب سی سوندھی سوندھی بو شکھا کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ جو بلاشبہ
ونجا کے صحت مند بدن سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی سوتی ساڑی کی شلکاہٹ
بھی سنائی دینے لگی۔ اور ساتھ ہی کسی تلی ہوئی چیز کی تیز خوشبو بھی آئی۔۔۔۔
ونجا نے شاید اپنے گھر والوں اور بچوں کیلئے مٹھائی خریدی تھی۔ مگر وہ تو بے اولاد
تھی۔ پھر یہ مٹھائی کس کیلئے؟ شاید شوہر کیلئے خریدی ہوگی۔ ممکن ہے اس
کا شوہر مٹھائی کا شوقین ہو۔ بہرکیف اس مٹھائی کی اشتہا انگیز خوشبو سے شکھا
کے منہ میں پانی بھر آیا۔ تھوک نگل کر ایک لمحہ توقف کے بعد بولا۔
" اندھیرا ہو گیا۔ ابھی تک سوندر کا باغ دکھائی نہیں دیا۔ گاؤں پہنچنے
میں دیر ہو جائے گی۔" " تو تو ہے۔" ونجا بولی۔
" ارجن پاٹل سوچ رہے ہوں گے کہ تم گاؤں میں کہیں رک گئی ہوگی۔۔۔"
" واہ! کیسے رُکتی۔۔۔"
" میرا مطلب ہے ٹائم ہو گیا ہے نا۔ اس لئے شاید انہوں نے ایسا سوچا
ہو۔" ونجا کی آنکھوں کے سامنے گھر کا منظر گھوم گیا۔ پستہ قد اور تھل تھل بدن
کے اس کے شوہر ارجن پاٹل گھر کے سامنے چبوترے پر کھمبے سے ٹیک لگائے بیٹھے
ہوں گے۔ پھر مونچھوں سے تاؤ دیتے دیور سے کہہ رہے ہوں گے۔" ارے
دیوا! تیری بھابی ابھی تک بازار سے نہیں لوٹی۔ دیکھ تو کہاں رہ گئی۔۔"
پھر ونجا سکھا سے مخاطب ہو کر بولی۔۔۔
" وہ تو غنیمت سمجھے کہ گھر میں انہیں ستانے کیلئے کوئی بچہ وچہ
نہیں ہے۔" یہ جملہ اضطراری طور پر اس کی زبان سے نکل گیا تھا۔ یہ اس کا
ایسا دکھتا پھوڑا تھا۔ جو لاکھ احتیاط کے باوجود موقع بے موقع رستا رہتا۔۔۔
بے خیالی میں وہ اپنے ہی زخم پر انگلی رکھ دیتی اور خود ہی تڑپ اٹھتی۔ گھر میں کبھی
کبھی ارجن پاٹل دوسری شادی کی بات بھی کرنے لگتے تھے۔ تب ونجا کا زخم کچھ زیادہ
ہی ہرا ہو جاتا تھا۔ ایسے موقع پر وہ دل ہی دل میں بہت کڑھتی تھی۔ ونجا کی بات
سن کر سکھا بولا۔ " ایشور کی مایا بھی عجیب ہے۔ یہاں ٹڈوں لڑوں ایک
جھونپڑی سی کرانہ کی دوکان ہے۔ نہ کھیت نہ جائداد نہیں پر بھی سال ڈیڑھ سال میں
ایک آدھ بچہ دکھا جاتا ہے۔۔۔، بے چارے ارجن پاٹل کتنا تڑپتے ہیں اولاد کیلئے
مگر ایشور کی نظر ہی نہیں۔ حالانکہ ارجن پاٹل سے چار پانچ سال بعد ہوئی۔۔

ہے میری شادی ۔۔" ونجا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں کے
سامنے سکھا کی بیوی کی صورت گھوم گئی۔ کالی سانولی۔ دُبلی پتلی اور بے حد
معمولی شکل و صورت کی اس کے باوجود اس کی گود کتنی زرخیز ہے۔ اور ایک یہ
۔۔۔۔ میری گود کتنی بنجر۔۔۔ اس روپ کا کیا لابھ ہوا شریر اور خالی کوکھ۔۔۔
آٹھ برس ہو گئے۔ بانجھ پن کا کلنک ختم ہی نہیں ہوتا۔ کیا کیا نہیں کیا میں نے۔
دوا دارو۔ جڑی بوٹی۔۔۔ تعویذ گنڈے۔۔۔ مگر سب بے کار۔۔۔ رنگ
روپ، جوانی کب تک ساتھ دیں گے۔۔۔ ایک دن تو انہیں ڈھلنا ہی ہوگا۔۔
کتنے برس گذار دیئے ایک جھوٹی امید میں۔ اُف! اب آگے میری جھولی میں کانٹے
اور دکھوں کے سوا کیا آئے گا۔۔۔۔۔۔۔
شکھا کنکھیوں سے ونجا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے تمتمائے چہرے پر
نظریں جما کر بولا۔"
" کچھ بات کرو یوں چپ چاپ چلنے سے راستہ کیوں کر کٹے گا۔؟"
" کیا بات کروں۔" ونجا ذرا سا گردن موڑ کر بولی۔۔۔
" لو اب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔۔ فرض کرو۔ اگر دو چار عورتیں تمہارے ساتھ
ہوتیں تب بھی یونہی خاموشی سے چلتی رہتیں تم۔؟"
" عورتوں کی بات دوسری ہوتی ہے۔" ونجا دبی آواز میں بولی۔ اندھیرے
میں سکھا پاٹل اس کے رخساروں پر دوڑتی سُرخی کو نہیں دیکھ سکا۔۔۔ آسمان پر تارے
جگمگا رہے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ راستے کی دو رویہ جھاڑیوں
میں مختلف قسم کی جھائیں جھائیں کیڑے کیڑے سنائی دینے لگی تھی۔ بیچ میں الّو کا
ایک جوڑا تیز آواز میں بولنے لگتا۔ سکھا کی سائیکل کا پہیہ ونجا کی ساڑی سے رگڑ
کھا رہا تھا۔ ونجا کی گٹھڑی میں بندھی مٹھائی لٹک رہی تھی۔۔۔۔
" بوتلیں مجھے دے دو۔" شکھا نے ونجا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔"
" نہیں رہنے دیجئے۔۔۔"
" ارے دے دو، سائیکل کے ہینڈل پر لٹکا دوں گا۔۔۔"
" نا۔ بابا! پھوٹ جائیں گے۔"
" اچھا پھر گٹھڑی دے دو چلو۔۔۔ ہینڈل سے لٹکا دیتے ہیں۔ سادھن
ہے تو پھر بے کار میں بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔" آخر شکھا کے بار بار اصرار
پر ونجا نے سر پر رکھی گٹھڑی کو ذرا سا اٹھایا۔ شکھا سائیکل کو اپنے پیٹ سے ٹکائے
گٹھڑی اتارنے میں ونجا کی مدد کرنے لگا۔ اسی دوران اس کی انگلیاں ونجا کی گداز
بانہہ سے چھو گئیں۔ ونجا کا سینے میں سمایا ہوا دل شبنم میں تر گلاب کی طرح لرز
رہا تھا۔
ونجا نے شکھا کے سخت بازوؤں کا لمس محسوس کیا اور جلدی سے ہاتھ کھینچ
لیا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ گٹھڑی اور بوتلیں اٹھائے اس کی گردن
اور بازو دُکھنے لگے تھے۔ سینے پر آنچل کو درست کرتی۔ وہ بنا ایک لفظ بولے چلنے لگی

سکھا ابھی پینڈل پر گھڑی ٹکائے اس کے برابر چل رہا تھا۔ ونجا نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالی۔ پھر سکھا کی طرف مڑ کر بولی ۔ " آپ بے کار ہی کنٹ کر رہے ہیں۔ تھوڑی دور اور اٹھا کر چلئے گاؤں آ جاتا ۔۔۔ "

" کہاں ہے گاؤں ؟ ابھی تو سونار کے باغ کا بھی پتہ نہیں۔ پاؤں اٹھاؤ ۔۔۔ "

" ہائے رام ! میں آپ کے برابر نہیں چل سکتی ۔۔۔ "

" پھر گاؤں کیسے آئیگا۔ آدھی رات ہو جائے گی ۔ "

" نہیں ہوگی ۔۔۔ میں اتنا تیز نہیں چل سکوں گی ۔ "

" اچھا ! اب سمجھا تم یہ سوچ رہی ہو کہ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ شاید ارجن پاٹل گاڑی جوت کر تمھاری تلاش میں نکل پڑے ہوں ۔ کیوں ؟ "

" اتنی چنتا نہیں ہے ۔ چنتی کی انہیں ۔ " ایک بار پھر بے خیالی میں کچے پھوڑے پر انگلی پڑ گئی ۔ اسے فوراً اپنی بھول کا احساس ہوا پرائے مردوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئے۔ پتا نہیں یہ اس کے کیا معنی لے گاؤں میں بات پھیلتے کہاں دیر لگتی ہے۔ ترنت وہ سنبھل کر بولی ۔۔۔

" بکھت بہت ہو گیا ہے نا ۔۔۔ پھکر تو کر رہے ہوں گے ۔۔۔ "

" ویسے ارجن پاٹل فکر کرنے والا اسم نہیں ہے ۔ دن بھر کھیت پر محنت کرکے لوٹے ہوں گے ۔ ممکن ہے کھا پی کر ابھی تک سو چکے ہوں ۔ "

" یہ تو سچ ہے ۔ نیند کے بڑے پکے ہیں وہ ۔ ابھی باتیں کر رہے تھے ۔ ابھی خراٹے لینے لگ جائیں گے ۔ "

" اصل چیز بے فکری ہے آدمی کو بے فکری ہو تو نیند بھی خوب آتی ہے ۔ انہیں چنتا ہی کیا ہے۔ گھر ، جائیداد ، کھیتی باڑی ، ڈھور مویشی سب کچھ تو دیا ہے۔ مالک نے انہیں ۔ "

" ہاں ان میں سے تو کسی چیز کی کمی نہیں ہمارے گھر میں ۔ "

" تو پھر ۔۔۔۔۔ ؟ "

" انہیں سب چیزوں سے تو من کو سنتوش نہیں مل جاتا ۔۔ "

" میں سمجھتا ہوں ۔۔۔۔۔ اولاد کی کمی بہت بڑی کمی ہے ۔ مگر اس کا دکھ جتنا عورت کو ہوتا ہے ۔ اتنا مرد کو نہیں ہوتا ۔ ابھی ایسی کون سی عمر گذر گئی ہے ۔ تم لوگوں کی ۔۔ ایشور کی کرپا ہوگی ۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا آدمی کا شردھا بھی ہونا چاہئیے ۔۔۔۔ بس ۔۔ پاٹل کو بہت مست اور کھرے آدمی مانے جاتے ہیں گاؤں میں ۔۔۔ "

سکھا بات کرتے کرتے اس کی دائیں طرف سے بائیں طرف کو آگیا تھا۔ اب درمیان کی سائیکل دوسری طرف چلی گئی تھی ۔ ونجا کا بدن بار بار سکھا کے بدن سے چھو جاتا تھا ۔ اس رگڑ سے بچنے کے لئے ونجا بار بار اپنا بدن سمیٹے لگتی ۔ ایک ایک دو دو قدم پیچھے رہ جاتی ۔ مگر دھول میں اٹی اوبڑ کھابڑ سڑک بہت تنگ تھی ۔۔۔ اندھیرے میں درمیان کے فاصلے کو برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا ۔ بار بار ان کے بدن ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے ۔ شروع شروع میں وہ بچتی سمٹتی رہی ۔ پھر سوچنے لگی ۔ کیا ہوا اگر بدن چھو گیا ۔ بازار میں مرد عورت ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے کیا ۔ ؟ جان بوجھ کر کوئی دھکا نہیں مارتا ۔ سڑک ہی تنگ ہے تو بیچارہ کیا کرے ۔ ؟ اس نے ذہن کو ادھر سے ہٹاتے ہوئے کہا ۔ "

" ہاں پاٹل تو گاؤں میں بہت مست آدمی مانے جاتے ہیں مگر ۔۔۔۔۔۔ دیکھئے آپ نے بات نکالی ہے اس لئے کہہ رہی ہوں ۔ ورنہ گھر کی باتیں باہر کہنے کی میری عادت نہیں ۔۔ "

" ہاں ہاں سچ ہے " سکھا نے جلدی سے تائید میں گردن ہلائی ۔ " تم بے فکر رہو ۔ میں کہاں ارجن پاٹل سے یہ سب کہنے جا رہا ہوں ۔ " سکھا ایک نئی بات دریافت کر لینے کی ولولہ انگیز مسرت کو دل ہی دل میں دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

" آپ ہی بتایئے بال بچے نہیں ہے ۔ تو اس میں میرا کیا قصور ؟ انسان کے بس میں تو کچھ نہیں ہوتا نا ۔ ایشور کی کرپا چاہئے ۔ مگر گھر میں سب مجھی کو دوشی سمجھتے ہیں ۔ اور وہ بھی بار بار مجھی پر خفا ہوتے ہیں ۔ ساس الگ طعنے دیتی ہے ۔ بڑے میاں الگ بات بات پر ٹوکتے ہیں ۔ ایک طرح سے گھر میں سبھی مجھ سے بیزار ہیں ۔ میں کہتی ہوں ۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے دوسری بہو لے آؤ نا ۔ مگر کہتے ہیں کہ سرکار کی اجازت نہیں ۔۔۔۔ "

ونجا نے محسوس کیا رات کے سناٹے میں اس کی آواز کافی بلند ہو گئی ہے ۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ بولتے بولتے ایک دم سے چپ ہو گئی ۔ سکھا اور قریب کھسک آیا ۔ " مگر میں کہتا ہوں کہ اس میں ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے بارہ بارہ برس کے بعد بھی کسی کسی کی گود ہری ہوتی ہے نا ۔ "

" کمال ہے ۔ "

" گھر میں سدا واتا کائی ہوتی رہے تو آخر کون کب تک سہن کرے گا ۔ جب بہت سن لیتی ہوں ۔ تو میری بھی زبان چلنے لگتی ہے ۔ بس پھر کیا ہے ۔ جانور کی طرح دھپا دھپ پیٹنا شروع کر دیتے ہیں ۔ جب غصہ ہوتے ہیں تو ڈنڈا دیکھتے ہیں نہ چابک ۔ جانور کی طرح سوت کر رکھ دیتے ہیں ۔۔۔ "

" باجی باپ نے کچھ نہیں کہتے بیٹے کو ؟ گلے میں پنڈھری کی مالا ڈالے پھرتے ہیں بڑے میاں ۔۔ "

" جگ دکھائی کے لئے ۔ ہاتھ میں مالا ۔ دل میں کالا ۔ "

" رام ۔ رام ۔ "

" بڑھا کم نہیں ہے ۔ " سکھدیو ونجا کے اس طنزیہ لہجے پر زور سے ہنس پڑا ۔ ونجا جوش میں تھی ۔ اس نے گھر پریوار کی ایک ایک بات کھول کر رکھ دی سکھدیو کے سامنے گفتگو کرتے کرتے اس کی آواز کبھی جوش سے

جلد ہو جاتی تو کبھی رفتہ رفتہ کم پڑ گئی۔ بات سے بات چلتی رہی۔ موڑ آتے رہے۔ آسمان پہ چاند اگ آیا تھا۔ کھیتوں پہ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ پرچھائیاں ڈولنے لگیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ ونجھا نے ساڑی کے آنچل سے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اور شکھا کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ اب سکھا کے جسم سے جسم چھو جانے کا خوف اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ بلکہ اب وہ ہر قسم کے خوف سے عاری ہو گئی تھی۔ سکھا جیسا اونچا پورا کڑیل جوان اس کے ساتھ تھا۔ اب اسے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ خوش تھی۔ کہ شکھا اس کی گفتگو پوری توجہ سے سن رہا ہے۔ وہ اس سے لمحہ بہ لمحہ بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اچھا ہے آج دل کا سارا غبار دھل گیا...

شکھا اجنبی سہی مگر اس کے لہجے میں ہمدردی ہے۔ کتنی اپنائیت سے سن رہا ہے وہ اپنی ایک ایک بات۔ پھر ایک سوال سانپ کی طرح پھن اٹھانے لگا۔ مگر ــــ مگر شکھا بہرحال پرایا ہے۔ میں اپنی ساری کمزوریاں اس کے سامنے کیوں کھول رہی ہوں۔ کیوں اپنے گھر کا رتی رتی حال اسے بتا رہی ہوں۔ یہ سب کہاں تک درست ہے۔ ؟

اُدھر شکھ دیو تھوڑا الجھ گیا تھا۔ اسے یہ سوچ کر عجیب سا سنسنی خیز تکلف محسوس ہو رہا تھا۔ کہ ونجھا اور اس کے درمیان کا تکلف دھیرے دھیرے ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ اپنے چاروں طرف چٹکی چاندنی سے یوں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی دھوپ سینکنے میں مست ہو۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کے نوجوان ونجھا کی ایک نظر کے متمنی رہا کرتے ہیں۔ اور آج یہ البیلی اس سے کتنی بے تکلفی سے اپنے گھر پریوار کی باتیں کر رہی ہے۔ یہ واقعی اس کیلئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ انوکھا اور دلچسپ۔ غرور اور مسرت سے اس کا سینہ پھول گیا۔ پھر بھی خوف پوری طرح اس کے دل سے زائل نہیں ہوا تھا ــــ وہ کوشش کر رہا تھا۔ کہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے۔ جس سے ونجھا کو شکایت یا خفگی کا موقع ملے۔ مگر شرابی جب شراب پلائے تو نشے سے کیونکر بچ سکتا ہے۔ وہ حتی المقدور لہجے کو سنجیدہ اور گمبھیر بنا کر بولا۔ " بہت وقت ہو گیا ہے۔ شاید تمہیں پہلے کبھی گاڑی آ رہی ہو ــــ "

ونجھا اس سے بالکل کھل چکی تھی۔ یہ جملہ سنتے ہی اس نے مورنی کی طرح گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اور تھوڑے کڑے لہجے میں بولی...

" پوری کہانی سن لینے کے بعد بھی آپ کچھ نہیں سمجھے ــــ "

ونجھا کے تیور دیکھ کر شکھ دیو بجھتر ہی بجھتر تھوڑا سٹپٹا گیا۔

" نہیں ــــــــ میرا مطلب یہ ہے ۔ " جملہ پورا کرنے کیلئے مناسب الفاظ نہیں ملے۔ تو خواہ مخواہ آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ " چاند نکل آیا ہے ۔ "

" نکلنے دیجئے۔ روز ہی نکلتا ہے۔ ہم لوگ اس راستے پہ نہ چلتے ہوتے تب بھی نکلتا۔ رہا۔ رہا۔ چلتے چلتے بہرے تو پاؤں رہ گئے۔ رات کا راستہ کٹنے کا نام ہی نہیں لیتا ــــ نہیں ؟ "

" کیا خیال ہے ؟ رک جائیں کچھ دیر کیلئے ـــ "

" واہ ایک طرف تو دیر ہو گئی کہ کر ڈرا بھی رہے ہیں۔ اور اب رکنے کیلئے بھی آپ ہی کہہ رہے ہیں۔ آپ بھی بڑے دو مونہے ہیں ــ "

ارد گرد دور تک لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ایک ایک پتہ، ایک ایک پودا، چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ونجھا کھیتوں کی طرف مڑ کر ایک دم سے بولی۔

" فصل کمر کمر تک بڑھ آئی ہے۔ "

شکھا بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ مڑ کر بولا۔ " بالکل "

دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اچانک ونجھا کا سینہ تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پتہ نہیں کس خیال سے اس کے کانوں کی لوئیں تک گرما گئیں۔ اور وہ اندر ہی اندر پانی پانی ہو گئی۔ اسے لگا کہ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ اچانک وہ ہلکی ایک دم ہلکی ہو کر ہوا میں اڑنے لگی ہے۔ سکھا اس کی بانہہ کو چھوتا ہوا بولا۔ " کچھ بولو نا ــ "

" کیا بولوں ــ جو بولنا تھا بول چکی ــ "

" نہیں بولو گی تو راستہ کیوں کر کٹے گا ــ " ؟

" راستہ تو قریب قریب کٹ چکا۔ سونارہ کا باغ کب کا پیچھے چھوٹ گیا۔ بامن کا بڑا آ گیا ہے۔ اس موڑ سے گاؤں کی بتیاں صاف دکھائی دے دیں گی ــــ "

" ہاں گاؤں قریب ہے۔ " سکھا کی آواز میں پتہ نہیں کیسی لرزش تھی۔ یکایک ونجھا ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بائیں طرف سے ایک باندھ کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔ " آئیے تھوڑی دیر سستا لیں۔ "

شکھا نے جھٹ سائیکل ایک درخت سے ٹکا دی۔ دونوں مناسب جگہ دیکھ کر ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ ونجھا نے اپنی گٹھڑی کھولی۔ اور مٹھائی کا دونا نکال کر شکھ دیو کے سامنے رکھ دیا۔ " مٹھائی کھائیں گے نا۔ "

پچھلے ایک گھنٹے سے جس مٹھائی کی اشتہا انگیز خوشبو اسے رغبت دلا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے رکھی تھی۔ اسے بھوک تو لگ ہی رہی تھی۔ مٹھی بھر میٹھی سیو اٹھاتا ہوا بولا ــــ " اور تم ۔ " ؟ " میں کھاؤں گی لہہ میں۔ پہلے آپ کھا لیجئے ـــ "

شکھا کے منہ میں خستہ سیو کُرمرانے لگا۔ ونجھا دونوں گھٹنے سینے سے لگائے۔ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے بڑی بڑی آنکھوں سے شکھ دیو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شکھا سچ مچ بہت بھوکا تھا۔ چاند چمک رہا تھا۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ اوس سے جھاڑیاں بھیگنے لگی تھیں۔ بازار کی راہ اب قریب قریب ختم ہو چکی تھی ــ

رتناکر متکری
ترجمہ محمد حسین پیدا کار

مدرسہ کا راستہ

سُنیلا پارنا سے مدرسے جا رہی تھی۔

تختی بستہ سنبھالتے ہوئے، چپل پھٹک پھٹک بجاتی ہوئی، رنگین ربن لگائی ہوئی چوٹیاں اڑاتی ہوئی سنیلا جلدی جلدی مدرسے جا رہی تھی۔ مدرسے وقت سے پر پہونچنا چاہیئے تھا۔ ورنہ دیر ہوتی۔ اور آپا کی باتیں سننی پڑتی۔ اس لئے سنیلا کا سارا دھیان مدرسے بروقت پہنچنے پر لگا ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی سی عمر میں مدرسے جانے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔۔۔۔

سنیلا صرف آٹھ سال کی تھی۔ سبھی کہا کرتے کہ اس کی عمر کے لحاظ سے اس میں کافی عقلمندی ہے۔ ہاتھوں پر گال ٹکائے گھر کی سیڑھیوں پر غور کرتی بیٹھی ہو تو کافی عمر والی لگتی ــــ

سنیلا ہر وقت کسی نہ کسی چیز پر غور کرتے رہتی۔ پڑھی ہوئی، رٹی ہوئی، دیکھی اور آن دیکھی۔ آن گنت باتوں پر وہ مَن ہی مَن میں سوچتی رہتی۔

اس کے والد اتنی بڑی قد و قامت والے

لیکن کبھی کبھار انہیں چھوٹے بچوں کی طرح پکڑ کر لایا جاتا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا یہ سنیلا کی سمجھ سے باہر تھا۔ والد کو اس طرح سے پکڑ کر لایا جائے۔ تو وہ فوراً سو جایا کرتے۔ لیکن اس سے پہلے وہ جو کچھ بڑبڑاتے اس میں کا ایک لفظ بھی سنیلا کے پلّے نہ پڑتا۔ لیکن اس حالت کے بارے میں اس نے بھول کر بھی کسی سے پوچھا نہ تھا۔ والد سے پوچھنے کی اس کی ہمت نہ تھی۔ اور ماں سے پوچھے تو، نہ جانے کیوں، ماں رو دے گی ایسا اسے احساس ہوتا اس لئے یہ سوال مَن ہی مَن میں دبائے رکھتا تھا۔ اتنا ہی نہیں تو اس کا جواب بھی انجانے سمجھ میں آنے لگا تھا ــــ ایسے اور بے شمار سوال اس کے دل میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے مدرسے کی آڈیو ریکر آپا کبھی کبھار اس کے جسم پر سے ہاتھ پھیرتی وہ کُھردرا لگتا۔ گویا کسی جانور کے پنجے آپا کے ہاتھوں پر ٹھونس دیے گئے تھے۔ گویا اس ہاتھ کو ناگ پھنی لگی تھی۔ اپنی ماں کے ہاتھ نئے پتے کی طرح نرم ہو کر آپا کے ہاتھ خاردار کیسے یہ سنیلا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔۔۔

لیکن یہ بھی اس نے کسی سے نہیں کہا۔ سُنیلا یوں تو کم گو ہی تھی خوب باتیں کی جائیں ایسا اس کے دل میں آتا۔ لیکن کچھ کہتے ہوئے اسے ڈر لگتا۔ تو خاموش بیٹھی رہ، چھوٹی ہے تو اب تک نہ، ایسا کوئی کہے گا۔ ایسا خوف ہوتا۔ اس کے باوجود وہ باتیں کرنے کا تہیّہ کر لیتی۔ پر عین بولنے کا وقت آنے پر اس کا گلا رُوندھ جاتا، اور ارادہ کی ہوئی باتوں میں سے بہت ہی تھوڑا کہنا ممکن ہو جاتا۔ وہ بھی گھبراتے گھبراتے ہوئے ادھورا ادھورا سا۔ سننے والا کہیں مذاق نہ اڑائے اس شبہ سے۔ پھر اسے اور زیادہ چپ لگ جاتی۔ چپ سادھے بیٹھی رہتا ــــ

مَن ہی مَن میں لیکن اس کی مکمل طور پر باتیں جاری رہتیں۔ گھٹنے سے کہنی اور ہتھیلیوں پر گال لگائے آنکھیں پھاڑ کر سنیلا بیٹھی رہتی۔ اور دل ہی دل میں خوب باتیں کیا کرتی۔ اور تعجب اس کا ہے کہ اس کا مَن ہی مَن میں۔ باتیں کرنا انتہائی بے خوف، اور خوب لمبا چوڑا ہوا کرتا۔ اسی کیلئے وقت کی کوئی پابندی نہ تھی۔ گھر ہی میں کیوں، مدرسے میں بھی ایک آدھ چھوٹے سے واقعے سے اس کی باتیں شروع ہو جاتی اور اس میں وہ مگن ہو جاتی۔

سنیلا ایکبار دل ہی دل میں باتیں کرنے لگے تو اس ذہن میں اسے کیا کیا سوجھتا! جو موضوع نہیں چاہیئے وہ نکل آتے جو نہ آنی چاہیئے۔ ایسی یادیں آتیں سنیلا ویسے ڈرپوک نہیں تھی۔ لیکن چند خاص یادیں نکل آئیں تو اس کے جسم پر تیزی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ایکبار اسے آدمی راہ پر ایک درخت کے نیچے مرغا مار کر اس کا خون گرا ہوا دکھائی دیا تھا۔ وہ یاد آیا کہ وہ گھبرا جاتی۔ ایکبار میلے میں ایک آدمی نے خود کی آنکھوں کی پتلیاں نکال کر جیب میں رکھتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ وہ کانچ کی تھیں یہ معلوم ہونے پر بھی اس کا خوف کم نہ ہوا تھا کسی کسی بالکل معمولی بات کا تو اسے اس سے بھی زیادہ ڈر لگتا۔ وہ یاد آنے پر اس کی جان جیسے اوپر نیچے ہو جاتی۔ چھم چھم آواز کرتے ہوئے ایک بار دروازے پر سے ایک گاڑی گذری تھی۔ اس کا ڈر، شب پرہ کے الٹے لٹکنے

کا ڈر، قفل زدہ کمرے کا ڈر، ایک بار رات میں جاگ جانے پر سناٹے میں اچانک کان پڑی ہوئی، ماں کی ابی مت مارو، !! ----- مت مارو کی دھیمی چیخ کا ڈر ----------

سنیلا ویسے بالکل ڈرپوک نہ تھی۔ لیکن گھر میں کیسے جکڑا ہوا، قید کیا ہوا سا لگتا۔ سنیلا کے گھر سے نہ جانے کیوں بالکل اداسی ٹپکتی۔ کبھی کبھار یہ اداسی اس درجے کو پہونچی کہ ایسے اداس بنے بیٹھے رہنے سے وہ گھر چیخ چیخ کر رونے ایسا اسے لگتا۔ اور کبھی کبھار وہ اس طرح رو بھی دیتا روتا۔ روتا اتنا ہی نہیں۔ بلکہ زور زور سے سسکیاں بھرتا۔ ماتم کرتا۔ چیختا، غصے میں آکر گالیوں پر اتر آتا۔ ----- سنیلا کو اس گھر میں میں چھوٹی ہوں۔ ایسا کبھی نہ لگتا۔ وہ چھوٹی ہے۔ ایسا کسی اور کو بھی نہ لگتا۔ نہ کوئی اسے کھیلنے بلاتا۔ کھلکھلا کر ہنس دیتا۔ اس کے ساتھ خود سے ہی باتیں کرتی بیٹھی رہتی اور گھر کے کونے کے سائے سے خوفناک یادیں اس کا ساتھ دینے آتیں۔

سنیلا مدرسے جا رہی تھی ---

آج میں نے گھر سے نکلتے وقت ماں کو ہاتھ ہلا کر دکھایا یا نہیں۔ اسے ٹھیک طور سے یاد نہیں آرہا تھا۔ روزانہ وہ نکلتے وقت ماں سیڑھیوں پر کھڑی رہا کرتی اس وقت گھر میں دوسرا اور کوئی نہ ہوتا۔ والد کام پر گئے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر تھے ہی نہیں۔ سنیلا کو بھائی بہن بھی نہ تھے۔ لیکن آج سیڑھیوں پر ماں کھڑی نہ تھی۔ گھر میں کوئی بیمار تھا۔ ڈاکٹر آئے تھے۔ وہ والدین سے سنجیدگی سے کچھ کہہ رہے تھے۔ نیمونیا ----------

نیمونیا ----- پچھلے چار پانچ روز سے یہ لفظ سنائی دے رہا تھا۔ نیمونیا، ! کیا بہترین ہے لفظ ! نیمونیا ----------

لینولیا ----- ڈیلیا ------- آئیے گھر آئیے ------

گھر میں مریض ہے اس لئے ماں کو دروازے تک آنے ملا۔ نہ ہوگا۔ اور دیر ہو رہی تھی اس لئے سنیلا جھٹ پٹ نکل پڑی۔

دور کہیں بھی دس کا گھنٹہ بجا۔ مدرسہ کھلنے کیلئے اب تک ٹھیک آدھ گھنٹے کی دیر ہے۔ پر کون کہے۔ گھنٹہ بجانے والی یہ گھڑی ٹھیک نہ ہو تو شاید وہ پیچھے بھی ہو۔ اور اس وقت کسی نے رعب دار آواز میں کہا سنیلا چل نکل ----- تیرا وقت ہو گیا۔ ! ایسا نہیں کہا تھا کیا ۔ ؟

سنیلا نے گھنٹے گنے نہیں۔ وہ دس بجے کے ہوں گے ایسا اس نے قیاس کیا۔ لیکن در اصل وہ دس پر رکے نہیں وہ تو بجتے ہی رہے -- سنیلا کو تعجب انگیز معلوم ہوا۔ وہ ایک دم بھاگنے لگی ------ لیکن تھوڑے فاصلے تک بھی وہ گھنٹے سنائی دیتے رہے۔

سنیلا تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ میں آج تک کبھی اتنی تیزی سے چلی نہ ہوں گی۔ ایسا اسے محسوس ہونے لگا۔ اتنی تیز کہ ہاتھوں کو ہوا بھی لگ رہی تھی۔ میں عجلت کیوں کر رہی ہوں یہ بات خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پر مدرسے ایکبار کب پہونچتی ہوں۔ ایسا اسے لگ رہا تھا اتنا پیچ ہے۔

مدرسے آنے کیلئے سنیلا ہمیشہ بے چین رہا کرتی۔ گھر میں پیش آتے ہوئے اس پر جو پابندی رہتی۔ وہ مدرسے میں تھوڑی تو کم ہوتی۔ مدرسے جانے کیلئے قدم اٹھایا کہ کیسے اسے کھلا پن لگتا۔ گھر میں کس لمحہ کیا ہوگا۔ اس کا بھروسہ نہ تھا۔ اس لحاظ سے مدرسہ محفوظ تھا۔ مدرسے میں اس کے ہم عمر بچے تھے۔ سب کیسے ٹھیک ٹھاک، بروقت ہونے والا، تہہ کئے ہوئے کپڑوں کی طرح ٹھیک ٹھاک تھا۔ مدرسہ ہنستا، کھلکھلاتا، خاموش بھی رہتا۔ پر وہ خاموش رہنا۔ مایوسی کا نہ تھا۔ مدرسے میں روشنی تھی، کونے نہ تھے۔ سائے بھی نہ تھے۔ مدرسے میں ہمیشہ دوپہر کا وقت رہا کرتا۔ رات رہتی نہ رات کی دبی چیخیں۔ ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں نہ ہوتیں۔ مدرسے کی ایک ایک بات جاننے کی بے تابی رہتی۔ نئی آپا آتی کہاں سے ہیں۔ پرانی آپا جاتی کہاں ہیں۔ اساتذہ کو سب کچھ پڑھانے بھی آتا کیسے ہے۔ چپراسی کے بٹن چمکتے کیسے ہیں۔ ان سب چیزوں کی بیتابی خاص کر حاضری بک سے متعلق۔ وہ ہرے رنگ کی کتاب آپا کے ہاتھ میں رہا کرتی اور اس میں سے وہ ایک ایک نام پڑھتیں۔ اس میں کے نام پڑھے جائیں۔ اپنا نام اس میں دیکھا جائے۔ ایسا سنیلا کو بہت لگتا۔ کسی نے کہا تھا کہ ہر نام کے آگے مہینے کے آخر میں جگہ چھوڑی ہوتی رہتی ہے، اور وہاں اس لڑکی کے بارے ریمارک لکھا ہوتا ہے۔ اپنے نام کے آگے کیا ریمارک ہوگا۔ اس بات کی سنیلا کو بہت بیتابی رہتی لیکن حاضری بک رہتا۔ ہمیشہ آپا کے قبضہ میں۔ حاضری پوری ہوئی تو چپراسی اسے آکر لیجاتا اس لئے وہ دیکھنے ملنا ممکن نہ تھا۔

سنیلا تیز تیز جا رہی تھی۔ لیکن آج کسی بھی حالت میں راستہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ میں کتنا چلی ہوں ایسا سنیلا کو لگا۔ لیکن راستہ پھر اتنا ہی باقی ! سنیلا کچھ پریشان سی ہو گئی۔ وہی وہی موڑ، وہی جانے پہچانے نشانات، وہی وہی درخت بار بار اسے نظر آتے۔ پھر لگتا۔ پہلے اسے دیکھا تھا یا صرف احساس ہوا ؟ کچھ بھی ہو لیکن یہ راستہ پیچھے چھوڑ جانے کے ٹھوس ارادے سے وہ چلنے لگی --

اور بالکل پہلی بار ایک اور بات سنیلا کے دھیان میں آئی۔ آج مدرسے کا راستہ بہت وسیع دکھائی دے رہا تھا۔ بیک وقت کتنی گاڑیاں ساتھ ساتھ چل سکیں گی۔ اتنا وسیع۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ راستے پر ایک بھی گاڑی نہ تھی۔ آمد و رفت بالکل نہ تھی سارا راستہ بالکل کھلا تھا۔ سنسان سنسان تھا۔ سنیلا اور بھی تیز تیز چلنے لگی۔

اسی اثنا ر میں یکایک کوئی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ راستہ مانگنے لگا۔ اتنا بڑا راستہ ہوتے ہوئے وہ شخص سامنے سے ہٹ نہیں رہا ہے۔ سنیلا سہم کر بازو ہٹ گئی۔ وہ آدمی نشے میں تھا۔ اس کے جسم پر شراب کی بو پھوٹی جا رہی تھی۔ کپڑے گندگی سے لت پت تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ الٹا سیدھا بڑبڑانے لگا۔ سُنیلا سے وہ سُنا نہ گیا۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔۔۔

چلتے چلتے وہ ایک بڑی عمارت کے سامنے پہونچ گئی۔ اور اس کے دھیان میں آیا کہ میں راہ بھولی ہوں۔ مدرسے جاتے ہوئے یہ عمارت راہ میں ملتی ہی نہیں۔ عمارت پر تختی تھی۔ " پاگل خانہ " وہ تختی دیکھ کر سُنیلا اتنی گھبرائی کہ وہاں سے بھاگ نکلنے کا خیال کر رہی تھی۔ اتنے میں وہاں کا سفید بے داغ وردی میں ملبوس پہرے دار اسے بانہہ پکڑ کر اندر لے گیا۔ وہاں ایک سفید پردہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ ہٹا کر سُنیلا نے آہستہ سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر پلنگ پر کوئی سویا تھا۔ پلنگ کے پاس بھیڑ کئے ہوئے دو چار ڈاکٹر کھڑے تھے۔ وہ رہ رہ کر پلنگ کی طرف دیکھتے اور پھر آپس میں بحث کرتے۔ ان میں سے ایک بوڑھے سے، رحدل ڈاکٹر کہہ رہے تھے۔ اس کے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اسے بہت ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ دوسرے خاکستری رنگ کے بالوں والے ڈاکٹر نے کہا۔ اسے اگر ایسا ہی ڈر محسوس ہوتا رہا ہے۔ تو کبھی نہ کبھی یہ پاگل ہوئے بنا نہیں رہ سکتی۔ اس وقت تیسرے دانت گرے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔ اجی کیسا آیا ہے اثر ؟ اسے لینولیا ہوا ہے۔ لینولیا ۔ ! دوسرا کچھ بھی نہیں۔ اس نے یہ کہتے ہی تینوں ڈاکٹر ہنسنے لگے۔ سُنیلا نے گھبرا کر سفید پردہ بالکل مضبوطی سے کھینچ لیا۔ اور وہ وہاں سے بھاگ نکلی۔

خوش قسمتی سے دروازے پر اس وقت کے پہرے دار نہ تھے۔ ان کی جگہ پر ایک عورت پیٹھ کئے کھڑی تھی۔ وہ سُنیلا کے پہچان کی ہی نکلی۔ سُنیلا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دور ہٹ گئی۔ کیونکہ خود وہ عورت ہی رو رہی تھی۔ سسکیاں بھرتے ہوئے۔ اس نے سُنیلا سے کہا، کیا کروں مری ؟ اب تک وہ نہیں آئے مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ اتنے میں تین چار لوگ پہلے دیکھے ہوئے اس شرابی کو لیکر آئے۔ ویسے ہی وہ عورت جلدی جلدی آگے بڑھی۔ سُنیلا مگر وہاں سے بچ کر نکل گئی۔

چلتے چلتے اسے راہ میں پانی ملا۔ سُنیلا کو پانی بہت بھاتا تھا۔ کم از کم ایکبار پانی میں پاؤں ڈبونے کی اس کی خواہش ہوئی۔ وہ چٹانوں پر سے چلنے لگی۔ اب وہ پانی تک پہونچی گی۔ کہ اسے چٹانوں پر خون نظر آیا۔ ۔ قطرہ قطرہ رِس کر پانی میں گر رہا تھا۔ اور پانی سُرخ ہو رہا تھا۔ ہوتے ہوتے سارا پانی لال لال ہوگیا۔ خون کی طرح نظر آنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس خون کی لہریں اس کی سمت پینگیں بڑھانے لگیں۔ چٹانوں کی دراڑ سے وہ خون رِسنے لگا۔ ویسے سُنیلا بھاگتے بھاگتے راستے پر آئی۔

پھر سے مدرسے کی راہ پر چلنے لگی۔۔۔۔۔

اتنے میں اندھیرا چھانے لگا۔ پہلے دھوپ صرف ہری ہری ہوئی گئی۔ اور پھر گھنے جنگل میں ہوتا ہے۔ ویسا بالکل ہرا گہرا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا۔ مدرسے پہونچنے میں اب کافی دیر ہوگئی اس احساس سے سُنیلا بے حد گھبرائی۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر یکایک اس کے دل میں آیا، صرف رفتار بڑھانے سے کیا حاصل ؟ اپنا راستہ ہی اصل میں بھول گئی ہوں۔ یہاں کی ایک نشانی تک جانی پہچانی نہیں لگتی۔ لیکن نہ بھی کیوں کر کہا جائے ؟ یہ سارا کبھی تو کہیں تو، دیکھا ہوا لگتا ہے۔ سب کچھ جلد جلد بدلتا جا رہا تھا۔ اور اس کے باوجود بڑی دیر تک رہ جاتا تھا۔ خواب کی طرح ورنہ سنیما کی طرح۔ کتنا راستہ چلا جائے پھر بھی مدرسہ آتا ہی نہ تھا۔

ماں نے اس سے کہہ رکھا تھا۔ کہ راستہ بھولنے پر پولس سے پوچھا جائے پولس کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں لہرسی دوڑ گئی۔ قریب سے ایک ٹرام گذر رہی تھی اس کی آواز جھم جھم جھم آ رہی تھی۔ راکھشش کے گلے کی بوجھل مالائیں جیسی اس طرح وہ آواز بڑھ کے اور بھاری تھی۔ میں وہ آواز جیسے گونج رہی تھی اور اس کی صدائے بازگشت اور بھی بھاری لگ رہی تھی۔ وہ آواز سُن کر سُنیلا کی چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ اور اس کے باوجود ٹرام میں کون بیٹھا ہے اور دیکھنے کی اس کی بے تابی ہونے لگی۔ اس نے گردن اونچی کر کے چپکے سے دیکھا۔ اندر قطار میں کتے بیٹھے تھے اطمینان سے مجسمے کی طرح۔ صرف ان کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ سینہ دھڑک رہا تھا۔ اور زبانیں باہر نکل کر رال ٹپک رہی تھی۔

سُنیلا کو آڈیو ریکارڈ پانے سُنائی ہوئی ریڈ رائیڈنگ ہوڈ کی کہانی یاد آئی۔ کہتے ہیں اسے جنگل میں بھیڑیا ملا تھا۔ سنیلا نے بھیڑیا کبھی دیکھا نہ تھا لیکن وہ بڑے شکاری کتے جتنا ہوتا ہے۔ ایسا آپا نے کہا تھا۔ ٹرام اب دور نکل گئی تھی۔ لیکن اس کی جھم جھم کی آواز اب بھی دھندلی سی سنائی دے رہی تھی

اتنے میں سُنیلا کے دھیان میں آیا کہ ٹرام سے کوئی اترا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں آ رہا ہے۔ وہ کون ہوگا۔ اس کا سُنیلا کو تصور نہ تھا پھر بھی اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ وہ بھیڑیا تھا۔ ! نظر آ رہا تھا۔ جیسے جنگلی کتے کی طرح۔ لیکن وہ بھیڑیا ہی تھا۔ یقیناً۔ کھڑکھڑ جوتے بجاتے ہوئے وہ اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

سُنیلا بھاگ نکلی۔ جوتوں کے کھڑکھڑ کی آواز پیچھے سے آ ہی رہی تھی۔ ہوا میں خنکی بہت بڑھ گئی تھی۔ سُنیلا کے دانت بھی بجنے لگے۔ سرد پانی میں غوطے کھائیں۔ ایسی وہ ہچکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے باوجود دوڑنا فرو رہا تھا

سامنے سے پولیس کا ایک دستہ آیا۔ ہر ایک اپنے ساتھ ایک ایک قیدی لے جا رہا تھا۔ سارے قیدیوں کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں چھن چھن بج رہی تھیں۔ اپنے تعاقب کرنے والے بھیڑیئے سے متعلق پولیس سے کہا جائے۔ ایسا شُنیلا کو ایک بار لگا۔ لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ تھا۔ کیوں کہ بھیڑیئے کے ہاتھ میں ڈالنے کیلئے ان کے پاس ہتھکڑیاں باقی نہ تھیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے شُنیلا کو بولنے ہی نہ دیا ہوتا۔ اس کا سارا ماجرا سُنے بغیر شاید اسے ہی پکڑ لئے ہوتا اور بھیڑیئے کو مدرسے پہونچا آتے۔ اس لئے شُنیلا ان سے ایک لفظ تک نہ بولی پوری پلٹن بائیں دہنے، بائیں دہنے کرتے ہوئے جانے تک راہ دیکھنا اس کیلئے ناممکن تھا۔ کیوں کہ جوتوں کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی وہ ویسے ہی پلٹن میں گھس پڑی۔

پلٹن کی دوسری جانب سے شُنیلا باہر نکل پڑی پھر بھی وہ آواز آ رہی تھی ــ ماں ٹنکیکالی کوٹلی، ویسی وہ آواز آتی۔ کھٹ کھٹ کھن۔۔۔۔۔ کھٹ کھٹ کھن۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شُنیلا کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے اتنی دوڑنے کے باوجود اس کے جسم کی سردی کم نہیں ہو رہی تھی۔ اب بھیڑیا صرف ہاتھ دراز کر کے اسے پکڑ سکتا تھا۔ اتنے میں شُنیلا کو ایک مجموعہ نظر آیا بچاؤ کی خاطر وہ ان میں شامل ہو گئی۔

ایک جادوگر کھیل دکھا رہا تھا۔ اس نے شُنیلا کی طرف انگلی اٹھائی ویسے ہی وہ آگے بڑھی اس نے اشارہ کرتے ہی اس نے ہاتھ آگے بڑھائے فوراً اس نے اپنی زبان کھینچ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ شُنیلا چیختے ہوئے ہاتھ جھٹکنے لگی۔ لیکن اس کا ہاتھ تنگ بڑھتو۔ رہا تھا۔ لکڑی کا ہو ویسے ڈبے جیس و حرکت ہو گیا تھا۔ وہ چیخنے لگی۔ لوگ ہنسنے لگے۔ اس لئے جادوگر کی اور بھی ہمت افزائی ہوئی۔ اس نے جلد جلد اپنی دونوں پتلیاں نکال کر اس کے ہاتھوں پر رکھ دیں۔ زور زور سے چیختی ہوئی سنیلا وہاں سے بھاگ نکلی۔ لیکن لوگوں کو یہ نہیں بھایا شور و غل کرتے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اب اندھا بنا ہوا وہ جادوگر تو سب کے سامنے ہی تھا۔۔۔!

یکایک سنیلا کو وہ اس وقت کی عورت دکھائی دی۔ وہ بھاگتی ہوئی جاکر اس کی کمر سے لپٹ گئی۔ تب تک غصے میں آیا ہوا مجمع وہاں تک پہونچ ہی گیا۔ کھوئی ہوئی آنکھوں سے ہی وہ جادوگر شُنیلا کی طرف ٹک لگائے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکھڑاتے بجاتے ہوئے بھیڑیا بھی وہاں آ پہونچا۔ لیکن اس عورت کی کمر سے لپٹ جانے کی وجہ سے شُنیلا کو کتنا محفوظ لگ رہا تھا اس میں سے کوئی بھی اسے اس سے کھینچ کر لے نہیں سکیگا۔ اس بات کا اسے یقین تھا دوسرے ہی لمحے کسی نے جھٹ سے کھینچا اس عورت کے سامنے سے پھوٹی ہوئی چیخ سُنائی دی۔ اس وقت وہ شرابی لکڑی اٹھائے اس عورت کو پیٹ رہا تھا۔ اب شُنیلا ہی اس عورت کی مدد کیلئے دوڑی دونوں کی بیچ میں پڑ کر خاموشی سے خود کے جسم پر مار سہنے لگی۔ شرابی غصے سے لگاتار لکڑی سے پیٹ رہا تھا۔ اور سنیلا خاموشی سے مار برداشت کر رہی تھی۔

ایک دم اسے اس مار سے اچھا معلوم ہونے لگا۔ سارا جسم کھل گیا۔ ایسا اسے لگا۔ گدّیاں پیٹنے پر جس طرح غبار اُڑتا ہے۔ اس طرح اس کی تکان دور ہو گئی دکھوں کا درد کا دھندلا سا تصور بھی اسے نہ رہا۔ جو ڈر سارے جسم میں بھر گیا تھا۔ وہ اس مار سے جسم سے دور ہو گیا۔ وہ جادوگر، وہ مجمع، وہ بھیڑیا، پولیس، قیدی، وہ ٹرام چٹانوں سے رسنے والا وہ خون۔۔۔۔۔۔۔ ان ساری ساری باتوں کا کچھ احساس بھی نہ رہا۔ جسم پر پڑے ہوئے ان ڈنڈوں سے وہ جسم جیسے سکون سے بھر گیا۔ ایک انوکھی مسّرت دل میں پیدا ہو لی۔ زور زور سے ہنستے رہیں ایسا شُنیلا کو لگنے لگا۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ اور اسی لمحے اسے مدرسہ دکھائی دیا۔ مدرسہ سامنے ہی تھا شُنیلا نے تختی بستہ پُشت پر درست کیا، فراک جھٹک دیا۔ اور باہر کے بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہو لی۔

مدرسے میں سناٹا تھا۔ ہو کا سنّاٹا، مدرسہ بھر گیا تھا۔ لیکن کسی بھی جماعت سے اساتذہ یا طلبار کی آواز باہر نہیں آ رہی تھی۔ اور سارا مدرسہ سفید براق نظر آ رہا تھا۔ احاطے کے درختوں پر ایک بھی پتہ باقی نہ تھا۔ رات بھر میں سارے درخت بے برگ ہو گئے تھے۔ ہر طرف انوکھی خاموشی پھیلی تھی۔ عام طور شُنیلا کو مدرسہ کھلنے کے بعد جماعت میں سے کتنا ڈر لگتا! لیکن آج اس کا سارا ڈر ختم ہو چکا تھا۔ سیدھی گردن کئے وہ اُس خاموشی مدرسے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

معمول کی عادت کے مطابق جماعت کے دروازے ہی سے اس نے اپنی جگہ کی طرف دیکھا۔ وہ درحقیقت خالی تھی۔ شُنیلا وہاں جاکر بیٹھ گئی ایسے ویسے کوئی خاص تاخیر ہوئی ہو ایسا معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ آڈیو ریکر آپا نے ابھی ابھی حاضری لینا شروع کر دیا تھا۔ ساری جماعت خاموش تھی۔ نہ کوئی ہنس رہا تھا۔ نہ شرارت کر رہا تھا۔ صرف اپنا نام لینے پر دھیرے سے "حاضر" کہہ رہا تھا۔

سنیلا کو اس سکون پر چپکے سے ہنسی آئی۔ اسے ہر بات کا لطف آ رہا تھا۔ گڑیوں کیطرح چپ بیٹھے ہوئے سب بچوں کو گدگدی کر کے، وہ روک ہی نہ سکیں اتنی ہنسی ہنسائی جائے ایسا اسے لگا۔

ساکت و شانت پانی میں جس طرح پتھر پھینکا جائے، اس طرح اس خاموشی کے عالم میں آپا ایک ایک نام لے رہی تھیں۔ شُنیلا کان لگائے سُن رہی تھی۔ سب کے نام پکارے گئے پھر بھی آپا نے سنیلا کا نام لیا ہی نہیں۔

سنیلا اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے ٹیبل پر رکھا ہوا حاضری بک اٹھایا۔ وہ دیکھنے کی اس کی کب سے خواہش تھی۔ ہمیشہ اسے ہاتھ لگانے کی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن آج خوف دراصل اُسے چھوڑ کر ہی چلا گیا تھا۔

حاضری بک میں اس نے سبھوں کے نام کے آگے لکھے ہوئے ریمارک پڑھے جیسا قیاس تھا۔ وہ ویسے مزے دار نہ تھے۔ اس میں صرف خالی خانے میں نام نکالا گیا

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

ایوا ڈیو
مترجم: مسز فاطمہ ہارون مومن

میری ماں

(مخصوص کہانی بچے کی زبانی)

یہ گندہ غلیظ مکان، یہ اندھیرا دالان اور سب سے بیکار یہ میری نئی ماں ــــ کالی کالی بھجنگ، بالکل مریل سی۔ ارے سچ کہوں، میں تو اس قدر اکتا گئی ہوں ان سبھوں سے، ایسا ہوتا ہے کہ بجائے اس کی مرجاؤں تو اچھا، یہ نئی ماں تو مجھے بالکل پسند نہیں۔ مجھے یہی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ابا جان کو یہ کیوں کر پسند آئی ہے؟ میری ماں کیسی گوری ہے! نرم نرم کپاس جیسے اس کے گال، سرخ سرخ گلاب جیسے اس کے ہونٹ اور نرم نرم اس کا سینہ، ایسے مزے کا کہ اس میں چھپ جانے کا مجھے بہت بہت دل ہوتا ہے۔ میری پیاری ماں کو نکال کر ابا جان ایسی خراب ماں کو کیا دیکھ کر لائے ہوں گے؟ میری یہی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سب لوگ تو ایسا ایسا بولتے ہیں! میری ماں کے بارے میں بہت کچھ بولتے ہیں کہ ماں گھر آنے والے چھیتو چچا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں مان ہی نہیں سکتی۔ دیکھو نا وہ گئی اس سے پہلے کچھ دنوں تک ابا جان کس قدر چیخیں مار کر میری پیاری ماں کے ساتھ لڑتے تھے! انہوں نے ایک دن تو بیچاری کو بال کھینچ کر گرا دیا تھا اس پر لاتیں ماریں وہ الگ! ماں کی کہنی سے کیسا خون نکلا تھا! پھر وہ چھیتو چچا کے گھر نہ چلی جائے تو کیا کرے! ایسے ہیرے چھیتو چچا کے لئے مردار چندن پھوپھی جو چاہے کہتی ہے! کہتی ہے تیری ماں تو نکٹی ہے نکٹی! ایسا اچھا فرشتہ آدمی چھوڑ کر اس شرابی کے ساتھ رہنے گئی چھی، چھی، اے ماں، مجھے تو بہت رونا آتا ہے! وہ پونجی چچی کہتی ہے مجھ سی پھول جیسی لڑکی کو چھوڑ کر تیری ماں کا جانے کے لئے کیوں کر جگر چلا؟ یہ کلجگ نہیں تو اور کیا ہے؟ سچ کہوں ایسے لوگ کیا نہ کریں؟ میں جانتی ہوں ان سب لوگوں نے مل کر میری ماں کو نکال دیا ہے۔ بیچاری کو ایسا تنگ کیا کہ چھیتو چچا کے ساتھ رہنے چلی گئی۔ وہ کیوں کر یہاں رہ سکتی ہے۔ ابا جان گالیاں دیں، مار پیٹ کریں۔ مگر سچ کہوں میرے ابا جان پہلے ایسے نہیں تھے، بہت اچھے تھے۔ اس نئی ماں نے انہیں بالکل بیکار کر دیا ہے۔ چھیتو چچا تو جوں کے توں ہیں۔ اس دن راستے میں ملے تھے تو بھی مجھے کتنے پیار سے بلایا تھا! مگر ابا جان تو بہت غصہ ہو گئے تھے۔ آنکھیں نکال کر مجھے کھینچ کر وہ تیزی سے آگے چلنے لگے۔ ابھی ابھی یہ خراب ہو گئے ہیں۔ پہلے تو مجھے اتنا پیار کرتے، اتنا پیار کرتے کہ ماں کھانے کے لئے یا کسی کام سے بلاتی تو بھی میں ان کی گود سے نہیں اٹھتی تھی۔ ماں بھی اسی طرح غصہ ہو جاتی (جو کہ جھوٹ موٹ ہوتا تھا۔ کیوں کہ فوراً کہہ دیتی)

پہلے تو بٹیا ریوٗلی، بٹیا ریوٗلی! کہہ کر وہ مجھے بلاتے! ٹافیاں لاتے، اچھا اچھا کھانے کے لئے لاتے، اور کبھی کبھی کھلونے بھی لے آتے۔ مجھے گود میں بٹھا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ مجھے ماں کی طرح بوسہ بھی لیتے۔ مجھے وہ سب بہت اچھا لگتا (جب ان کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی، جو گال پر بہت کاٹتی) اور مجھے ایسی گدگدی ہوتی کہ ہنس ہنس کر میرا پیٹ دکھ جاتا۔ مگر جب سے اس نئی ماں کو مریل سا کالا کلوٹا بیٹا ہوا ہے تب سے وہ مجھے گھڑکیاں ہی دیتے ہیں۔ بغیر کسی غلطی کے کافی عرصہ بیت گیا مجھے پیار سے اتنا بھی نہیں کہا کہ: "کیا چاہیئے میری بٹیا کو؟ بول تو ریوٗلی بٹیا!" اب تو وہ میری طرف دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ آتے ہی اس مریل کو گود لیتے ہیں اور تتلا کر بولتے ہیں "اے میرے بیٹے، اے میرے بیٹے" جب بھی دیکھو آتے ہی ڈانٹ ڈپٹ۔ دن بھر یہ نئی ماں اسی طرح کہتی ہے شام میں تیرے ابا جان کو آنے تو دے۔ پھر تیری بات ہے، میری ایسی خبر لیتی ہے کہ بس۔ رات کو ابا جان سے جھوٹی باتیں لگا کر مجھے مار کھلاتی ہے۔ اگر غلطی سے کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ جائے تب تو بن آئی سمجھو۔ اب تو مجھے اتنا ڈر لگتا ہے کہ اگر چاہوں تب بھی رو نہیں سکتی۔ اگر نہیں کہتا ہو تب بھی پیشاب نکل جائے۔ رات میں ایسے ایسے خواب آتے ہیں کہ ڈر لگتا ہے۔ اس دن خواب میں دیکھا تھا کہ "ایک پری آئی، بہت ہی خوبصورت، بالکل میری ماں

جیسا چہرہ، اتنا پیارا لگتا تھا! اس کے سر پر رکھا تاج جھلملا رہا تھا، اس کے ملائم ملائم کالے بال گھٹنوں تک جھول رہے تھے، سفید برّاق ساری پہنے ہوئے، اس قدر ریشمی وہ ساری! کیسے مزے کے بڑے بڑے پنکھ وہ بھی سفید سفید اور ملائم، ایسی فر فر اڑتی تھی وہ! پروانے کی طرح اڑتے ہوئے وہ میرے بستر کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ میرے گالوں پر بھینا بھینا لوسہ دے کر بولی ـــــ بٹیا گھبرانا نہیں، میں تجھے تیری ماں کے پاس لے چلوں گی، اس نے مجھے سینے سے لپٹا لیا، ماں کی طرح ہی ملائم اس کا سینہ تھا۔ اس میں میں نے اس طرح منہ ڈھانپ لیا، اس طرح چھپ گئی کہ وہ مجھے پیار کرتے کرتے اڑنے لگی۔ میں تو مارے خوشی کے پاگل ہوگئی۔ وہ تو اوپر ہی اوپر اڑنے لگی، چندا ماموں سے بھی پرے۔ ایسے میں مجھے تیز ہوا چلتی ہوئی محسوس ہوئی منہ نکال کر میں نے دیکھا تو دو کالے کوؤں کو ہمارا پیچھا کرتا ہوا پایا، لمبی لمبی کالی کالی چونچیں اور بڑے بڑے نکیلے پنجے، میں تو بہت گھبرائی، بھوم.... بھو.... م کرتے انہوں نے حملہ کر دیا۔ تھوڑی دیر میں تو پری کی آنکھیں، پوشاک، تاج سب کچھ تتر بتر کر دیا۔ بے چاری پری نے مجھے بچانے کی بہت کوشش کی مگر چالاک کوؤں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر کار دونوں نے ایک ہی ساتھ جھپٹا مار کر پری کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ بے چاری پری! اس کی دونوں آنکھیں درد کرنے لگیں۔ اسی لئے اس نے اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھنے کی غرض سے پھیلائے اور میں دھڑام کرکے آسمان سے نیچے قلابازیاں کھاتے ہوئے گرنے لگی۔ میرا دل دھک دھک ہوگیا۔ اس قدر خوف لگا کہ پیشاب ہوگئی اور مانو میں پتھر پر زور سے پٹک دی گئی۔ میری نیند ٹوٹ گئی۔ تعجب کی بات ہے میں تو اپنے بچھونے پر ہی لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ رضائی بھیگ چکی تھی۔ میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اے ماں، تو کہاں ہے؟ ماں مجھے جلدی یہاں سے لے جا۔ تو کہلا بھیجتی ہے مگر آکر لے کیوں نہیں جاتی۔ اب میں کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔ بہت دن ہوگئے ماں تیرے پاؤں پڑوں۔ مجھے آکر لے جا یہاں سے، جلدی جلدی!

میں نہیں کہتی تھی کہ میری ماں مجھے بھول ہی نہیں سکتی۔ صبح کوڑا پھینکنے باہر نکلی تو میں نے ایک شخص کو گھر کے باہر کھڑا ہوا دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا ہاتھ ہلایا، مجھے بلانے کی غرض سے! میں سمجھ گئی، میری ماں نے اسے بھیجا تھا۔ میری خوشی کی حد نہیں رہی، میری ماں کتنی اچھی ہے! میری نئی ماں نے کل مجھے خوب مارا تھا۔ میں نے سوتے سوتے لال جی بھگوان سے کئی مرتبہ کہا تھا اے بھگوان میری ماں کو جلدی جلدی بھیج دے نہیں تو میں یہاں پر مر جاؤں گی۔ میں دوڑتے ہوئے گھر میں گئی اور جاکر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو وہ شخص چکر لگا رہا تھا اور محلّے کے نکڑ پر چھیتو چچا کھڑے نظر آئے میں بہت خوش ہوگئی۔ اس شخص نے مجھے کھڑکی میں کھڑا ہوا دیکھ کر اطراف میں دیکھ بھال کر مجھے بلایا۔ نئی ماں سنہا رہی تھی، ابا جان بازار گئے تھے۔ میں تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس شخص نے میری انگلی تھام لی۔ یہاں وہاں دیکھ کر اس نے کہا، یہاں ابھی کوئی بھی نہیں ہے۔ چل جلدی جلدی چلے جائیں۔ میں سمجھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تمہیں میری ماں نے بھیجا ہے نا؟ نظریں بچا کر آس پاس دیکھ کر اس نے سر ہلایا، تب تک تو سامنے سے چھیتو چچا آگئے۔ چھیتو چچا، چھیتو چچا کہتی میں تو ان سے لپٹ گئی۔ ہم تیزی سے چلنے لگے۔ محلّے کے نکڑ پر ہی ابا جان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ہمیں دیکھتے ہی انھوں نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔

"ارے، پکڑو، پکڑو، یہ بدمعاش میری بیٹی کو اٹھا لے جا رہے ہیں۔ ارے دوڑو، دوڑو پکڑو وہ بھاگ رہا ہے اسے۔" وہ تاؤ میں ہماری طرف دوڑے۔ وہ شخص تو کودتے ہوئے بھاگ گیا مگر چھیتو چچا میرا ہاتھ تھامے وہیں کھڑے رہے۔ وہ وہاں سے ہٹے ہی نہیں۔ میں تو اس قدر گھبرا گئی کہ ان سے لپٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اُچک کر دیکھا تو لوگوں کی بھیڑ نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ لوگ شور مچا رہے تھے۔ اس طرح وہ چھیتو چچا کے پاس سے مجھے چھڑا رہے تھے۔ ابا جان آنکھیں نکال کر چلّا رہے تھے اور چھیتو چچا سے لڑ رہے تھے۔ مگر چھیتو چچا میرے ابا جان سے زیادہ زبردست تھے۔ ابا جان کی ان کے سامنے ایک بھی نہ چلی۔ انھیں وہ چھونے بھی نہیں دیتے تھے۔ اتنے میں تو دو پولیس لاٹھیاں پٹکتے ہوئے آپہنچے۔ اے ماں! انھیں دیکھ کر میں اتنی ڈر گئی۔ انہوں نے چھیتو چچا کو ڈانٹا اور ایک نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چھیتو چچا کے پاس سے چھین لیا۔ مجھے رونا آرہا ہے مگر رو نہیں سکتی تھی۔ جب اس نے مجھے خوب گھسیٹا تب ضبط نہ ہوا اور میں نے پیشاب کر دی۔ پولیس نے چھیتو چچا کو پکڑ لیا اور مجھے ابا جان کے سپرد کر دیا۔ اتنے میں شور مچا، اس قدر شور و غل مچا کہ میرے تو کان پھٹ گئے۔

اے ماں گھر لے جاکر مجھے ابا جان نے اس قدر پیٹا ہے، اتنی پٹائی کی ہے! دیکھو نا یہ خون کے گٹھے اب تک ویسے ہی نیلے ہیں۔ ابا جان کام پر گئے۔ اتنے میں نئی ماں نے میری پٹائی شروع کر دی وہ بھی دروازے بند کرکے۔ دونوں مجھے ایسا ہی کہتے ہیں "آزاد، مکار، تھوڑے دنوں میں تو یہ بھی بدمعاش ہوگئی۔" ایسے تو وہ بہت کچھ کہتے ہیں۔ مر گئے لوگ بھی جو منہ میں آیا کہتے ہیں ذرا سی لڑکی! اپنی ماں کو مات کردے ایسی نکلی ہے اے ماں! دیکھو تو یہ بالشت بھر کی لڑکی! غضب کیا۔ مجھے اس قدر غصّہ آیا کہ میں نے بھی چلا کر کہا، جاؤ دیکھتے رہو تم بھی۔ میں اپنی ماں کے پاس جاؤں گی۔ جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار۔ جب سے یہ لوگ مجھے گھر سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتے۔ اس طرح چھ دن بیت گئے۔

ایک دن ابا جان کسی کی موٹر لے کر گھر آئے۔ مجھے اور نئی ماں سے کہا کہ چلو تیار ہو جاؤ۔ مجھے کافی تعجب ہوا۔ ہمیں بٹھا کر ڈرائیور نے موٹر کو تیزی سے بھگایا۔ اس طرح کئی دنوں بعد مجھے باہر گھومنے ملا۔ اس لئے مجھے خوب لطف آیا۔ ہاں مجھے تو بہت لطف آیا۔ موٹر خوب بھاگی، خوب بھاگی ——
آخر کار لال اینٹ کے بڑے گھر کے پاس آکر رک گئی۔ موٹر میں سے ہی میں نے کئی پولیس کو ڈنڈے ہلاتے دیکھ لیا۔ میں گھبرا گئی۔ میں کیا کرسکتی تھی؟ اب مجھے پتہ چلا کہ ابا جان مجھے موٹر میں خواہ مخواہ بٹھا کر نہیں لائے ہیں۔ اب میں جاؤں بھی کہاں؟ اسی دوران ابا جان نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکالا۔ پھر نئی ماں نے بھی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے وہ بڑے سے کمرے میں لے گئے۔ میری نئی ماں ایسے میری طرف دیکھ رہی تھی! ارے باپ رے، کس قدر بڑے دالان، کتنے سارے لوگ! مجھے اب بہت ہی ڈر لگنے لگا تھا۔ ہمیں سب سے آگے بنچ پر بٹھایا گیا۔ میں یہاں وہاں دیکھ رہی تھی کہ اپنی ماں کو تھوڑی دوری پر بیٹھا ہوا پایا۔ میری جانب دیکھ کر وہ میٹھا سا مسکرائی۔ میں اسے دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس جانا چاہتی تھی مگر ابا جان نے آنکھیں نکال کر مجھے ڈرایا۔ تب بھی میں نظریں بچا کر اسے دیکھتی رہی۔ پیاری ماں کس قدر خوب صورت لگ رہی تھی۔
اتنے میں کوئی شخص کالے رنگ کا لمبا کرتا پہن کر اندر آیا۔ سبھی خاموش ہو گئے۔ اسی وقت پولیس میرے چھیتو چچا کو ہتھکڑی باندھ کر اندر لے آئے۔ انہیں اس طرح بندھا ہوا دیکھ کر مجھے رونا آیا۔ بے چارے چھیتو چچا کو لوگ کیوں اس طرح کر رہے ہیں۔ تب پھر دو کالے کوٹ والے ایک کے بعد ایک کھڑے ہو کر لڑنے لگے۔ لوگوں کو بلائیں، کٹہرے میں بٹھائیں، پھر ڈانٹیں، خوب ڈانٹیں! جب میری جانب گھوم کر آئیں تب کہیں یہ لڑکی ایسی! یہ لڑکی ویسی۔ تب مجھے کافی ڈر لگتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی پیاری ماں کے پاس چلی جاؤں۔ جب ابا جان اور نئی ماں کو کٹہرے میں بٹھا کر لتاڑنے لگے تب تو مجھے بہت مزہ آیا۔ وہ کالے کرتے والا اچھا تھا۔ جب دونوں کالے کوٹ والے گڑبڑ کرنا شروع کرتے تب وہ ہتھوڑی پیٹ پیٹ کر دونوں کو سمجھاتا۔ وہ بھی مان جاتے مگر تھوڑی دیر بعد دوبارہ جھگڑنے لگتے۔ مجھے تو ایسا مزہ آتا اتنے میں میری ماں کو بلا کر کٹہرے میں بٹھایا گیا۔ میں دوبارہ گھبرانے لگی۔ ایک کالے کوٹ والے نے اچھل اچھل کر میری ماں سے تکرار کی۔ کہنے لگا کیا تم نے ایسا کیا وہ سچ ہے؟ جب اس نے کافی دیر تک ایسا کیا تب مجھے پیشاب محسوس ہوئی مگر ایسی جگہ پر پیشاب کیسے کرسکتی پھر تو میری ماں رونے لگی۔ مجھے بھی خوب رونا آیا۔ میری ماں نے زور سے کہا۔ اگر ایسا ہے تو میری بیٹی سے پوچھ لو بٹیا رَیولی!" اتنا سنکر میں تو مارے خوشی کے اچھل پڑی۔ ماں نے مجھے بلایا۔ اے ماں کہہ کر میں دوڑی۔ پہلا کالے کوٹ والا مجھے پکڑنے لگا، مگر میں تو کٹہرے تک پہنچ بھی گئی۔ میری ماں بھی کٹہرے میں سے دھڑ دھڑ نیچے اتر آئی۔ وہاں کھڑے رہ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ارے ریولی بٹیا، تجھے کس کے پاس رہنا ہے؟ تیرے باپ کے پاس یا میرے پاس؟" میں نے چلا کر کہا۔ ماں، ماں، تیرے پاس۔ اس نے جھک کر مجھے چوم لیا اور میں اس کے نرم و گداز سینے میں چھپ گئی۔ ماں نے جوش میں آکر مجھے اپنے سے بھینچ لیا۔ میں نہیں کہتی تھی کہ میری پیاری ماں مجھے بھول ہی نہیں سکتی۔

دھوم کیتو
ترجمہ: ڈاکٹر شکنتیا جوھری

پوسٹ آفس

پچھلی رات کا نیلا آسمان، انسان کی زندگی میں جیسے بے شمار مبارک یادیں چمکتی ہیں، ویسے چھوٹے بڑے ستاروں سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے پھٹے پرانے کُرتے سے اپنے بدن کو لپیٹا ہوا ایک بوڑھا شہر کے بیچ سے گذر رہا تھا۔ اچھے خاصے کئی گھروں میں سے چکی کی میٹھی آواز عورتوں کے گانے کی باریک آواز سے مل کے آرہی تھی۔ ایک آدھ کتے کی آواز، کسی جلدی اُٹھنے والے شخص کے جوتوں کی آواز، دور سے سُنائی دیتی۔ یا کسی بے وقت جگی ہوئی چڑیا کی آواز۔ اس کے علاوہ شہر بالکل خاموش تھا۔ وہ میٹھی نیند میں سوئے ہوئے تھے اور سردی کی ٹھنڈ سے رات اور بھی گہری ہوچکی تھی۔ بنا بولے قتل کرے ایسے میٹھے آدمی کے مزاج جیسی سردی کی ٹھنڈ۔ قاتل چھری جیسے اپنا قابو سب جگہ پھیلا رہی تھی۔ بوڑھا کانپتا ہوا اور ڈگمگاتا ہوا آہستہ سے چلتا شہر کے دروازے سے نکل کر ایک سیدھی سڑک پر آپہنچا، اور آہستہ آہستہ اپنی پرانی لکڑی کے سہارے آگے بڑھا۔ سڑک کی ایک طرف درختوں کی قطار تھی اور دوسری طرف شہر کا باغ تھا۔ یہاں ٹھنڈ زیادہ تھی۔ اور رات بھی زیادہ تاریک تھی۔ ہوا زور سے کاٹتی ہوئی گذر رہی تھی، اور زہرہ ستارے کی پیاری چمک، زمین پر گرنے والی سفید اور شفّاف برف کی مانند گر رہی تھی، جہاں باغ کا آخری سرا تھا وہاں بالکل نئے انداز کا ایک خوبصورت مکان تھا۔ اس کی بند کھڑکی اور دروازے میں سے دیے کی روشنی باہر دکھائی دے رہی تھی عقیدت مند اپنے داتا کے گھر دیکھ کر جیسے عقیدت میں جھک جاتے ہیں ویسے یہ بوڑھا اس مکان کی لکڑی کی کمان دیکھ کے راضی ہوا۔ کمان پر ایک پُرانے تختے پر نئے حرفوں میں "پوسٹ آفس" لکھا تھا۔ بوڑھا پوسٹ آفس کے باہر اوٹے پر بیٹھا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ لیکن دو چار آدمی کام میں مصروف ہوں و یسی کھسر پھسر کی آواز آرہی تھی۔

"پولس سپرنٹنڈنٹ" اندر سے آواز آئی۔ بوڑھا چونک پڑا۔ پھر خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ عقیدت اور پیار اس سردی میں بھی اسے گرمی پہنچا رہے تھے ـــ اندر سے دوسری آواز سُنائی دی۔ کلرک انگریزی خطوں کے پتے پڑھ کے پوسٹ مین کو دے رہا تھا۔ کمشنر۔ سپرنٹنڈنٹ۔ دیوان صاحب لائبریرین ـــ ایسے بعد دیگرے بے شمار نام بتانے کا عادی تیزی سے خط دے رہا تھا ـــ اتنے میں اندر سے مذاق کرنے کی آواز آئی: "کوچ مین علی" ـــ بوڑھا کھڑا ہوگیا ـــ عقیدت سے آسمان کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا ـــ اور دروازے پر دستک دی۔

"گوکل بھائی!"

"کون؟"

"آپ نے میرا نام پکارا۔ میں آیا ہوں ـــ"

جواب میں بے درد مذاق بھری ہنسی سُنادی۔

"صاحب! یہ ایک پاگل بوڑھا ہے۔ یہ روزانہ اپنی چٹھی لینے کے لئے پوسٹ آفس کے چکّر کاٹتا ہے۔"

کلرک نے یہ بات پوسٹ ماسٹر کو بتائی۔ اتنے میں بوڑھا پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پچھلے پانچ سال سے اسی جگہ پر بیٹھنے کا وہ عادی تھا۔

علی شروع ہی سے ماہر شکاری تھا، وہ اس قدر ماہر اور شکار کھیلنے کا عادی ہوگیا تھا، جیسے افیونی کو ہمیشہ افیون کھانے کی ضرورت ہو۔ مٹیالے رنگ کے تیتر پر علی کی نظریں پڑتے ہی وہ اس کے ہاتھ میں آجاتی اس کی چالاک نظر خرگوش کے کھوہ میں جا پہنچی، گھاس پھوس میں چھپے ہوئے خرگوش کو شکاری کتا بھی الگ نہ کرسکتا، لیکن اٹلی کے باز جیسی نظریں ٹھیک خرگوش کے کان پر جا پڑتیں، اور وہ دوسرے لمحے اس دنیا سے چل بستا، کبھی علی مچھیرے کا دوست بن جاتا۔

لیکن جب زندگی کی شام ہونے لگی تو شکاری یکایک دوسری جانب

مر گیا۔ اس کی اکلوتی بیٹی مریم شادی کے بعد سُسرال گئی۔ اس کے داماد کو فوج میں نوکری ملی تھی اور وہ اس کے ساتھ پنجاب چلی گئی تھی۔ اور جس کے لئے وہ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس مریم کی تقریباً پچھلے پانچ سال سے کوئی خبر نہ تھی۔ ابھی علی کو معلوم ہوا کہ پیار کیا اور فراق کیا۔ پہلے تو وہ تیتر کے بچے کو تڑپتا دیکھ کر ہنستا تھا، یہ شکاری کی خوشی تھی۔ شکار کا نشہ اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔ لیکن جس دن مریم گئی تب سے اسے زندگی میں تنہائی محسوس ہونے لگی۔ اسی دن سے علی شکار کو جاتا تھا لیکن شکار کو بھول کے ایک نظر سے دھان کے ہرے بھرے کھیتوں کی طرف تکتے رہتا تھا۔ پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ قدرت پیار کی دنیا اور جدائی کے آنسو ہیں۔ پھر تو ایک دن درخت کے نیچے بیٹھ کے علی دل کھول کے رویا ـــــ بعد میں ہمیشہ صبح چار بجے اُٹھ کے وہ پوسٹ آفس آتا تھا۔ اس کا تو کبھی کوئی خط نہیں ہوتا تھا ـــــ مگر مریم کا خط ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا ـــــ وہ بندگی اور عقیدت سے آرزوں کی بے شمار اُمیدوں بھری خوشیوں کے ساتھ سب سے پہلے پوسٹ آفس میں آ کے بیٹھ جاتا۔

پوسٹ آفس۔ شاید دنیا کی سب سے خشک اور بے رونق جگہ! ـــــ ایک ہی جگہ اور ایک ہی کونے میں وہ روزانہ بیٹھتا تھا۔ لوگ اس کے بارے میں جان کر ہنستے، پوسٹ مین مذاق کرتے اور کبھی کبھی مذاق میں اس کا نام پکار کے اس جگہ سے پوسٹ آفس کے دروازے تک چکر کٹواتے۔ اٹوٹ عقیدت اور مستقل مزاجی کے ساتھ وہ ہمیشہ آتا اور ہر روز خالی ہاتھ واپس جاتا۔

علی بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں یکے بعد دیگرے چپراسی اپنے اپنے آفس کے خط لینے آنے لگے۔ زیادہ تر چپراسی بیسویں صدی کے افسروں کی بیویوں کے پرائیویٹ سکریٹریوں کی طرح ہوتے ہیں، اس لئے پورے شہر کو ہر ایک افسر کی نجی باتیں یہاں معلوم ہوتیں۔

کسی کے سر پر عمامہ، کسی کے پیر میں چم چم کرتا پیا جوتا، ایسے ہی سب اپنی اپنی ایک انوکھی خاصیت دکھاتے تھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ دِیے کی روشنی میں سامنے کرسی پر تمٹری جیسا سر اور ہمیشہ کا غمگین اور اداس چہرہ لے کے پوسٹ ماسٹر بیٹھا تھا۔ پیشانی پہ، منہ پہ اور آنکھوں میں اگر روشنی نہ ہو تو آدمی زیادہ تر گولڈاسمتھ کے کردار " ویلیج اسکول ماسٹر" اس صدی کا کلرک یا پوسٹ ماسٹر ہوتا ہے۔

"پولس کمشنر" کلرک چلایا۔

ایک بھاری بھرکم جوان نے پولس کمشنر کے خط لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

"سپرنٹنڈنٹ!" دوسرا ایک چپراسی آگے بڑھا۔

اور ایسے ہی ہزاروں ناموں کی فہرست کلرک ہمیشہ پڑھتا جاتا۔ آخر میں سب چلے گئے۔ علی اٹھا۔ پوسٹ آفس کو ایک مقدس جگہ کی طرح سجدہ کر کے چلا گیا۔

" ارے! جیسے صدیوں پہلے کا گنوار! ـــــ یہ آدمی پاگل ہے؟"

"پوسٹ ماسٹر نے پوچھا۔

"کون علی"

"ہاں جناب۔"

" پانچ سال ہوئے، کوئی اور کیسا بھی موسم ہو، پھر بھی خط لینے کے لئے ضرور آ جاتا ہے۔ اس کا خط شاید ہی ہوتا ہے" کلرک نے جواب دیا۔

"کسی کو فرصت ہوتی ہے؟ ہمیشہ تو خط کہاں سے آئے؟"

" ارے صاحب، اس کا دماغ چل گیا ہے، وہ پہلے بہت گناہ کرتا تھا۔ اس سے کوئی نقصی گناہ سرزد ہو گیا ہوگا ـــــ"

" بھائی، جو کرتے ہیں، وہ بھرتے ہیں" پوسٹ مین نے حامی بھری۔

" پاگل بہت عجیب ہوتے ہیں۔"

" ہاں، احمد آباد میں میں نے ایک پاگل دیکھا تھا، وہ سارا دن مٹی کا ڈھیر لگایا کرتا تھا اور کچھ نہیں ـــــ ایک پاگل کو عادت تھی کہ شام کو دریا کے کنارے جا کے پتھروں پر پانی ڈالتا تھا۔"

" ارے ایک پاگل کو تو ایسی عادت تھی کہ وہ سارا دن آگے پیچھے چلتا ہی رہتا تھا، اور ایک شعر گنگنایا کرتا تھا۔"

آج پوسٹ آفس میں پاگلوں کی کہانی چلتی رہی۔ ہمیشہ ایسی ہی ایک آدھ بات چھیڑ کے، اس پر دو چار منٹ بحث کر کے آرام حاصل کرنے کی عادت تقریباً سبھی درجوں کے ملازمین میں، شراب کی عادت کی طرح سرایت کر گئی ہے۔

سالا پاگلوں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ پاگل ہمیں پاگل سمجھتے ہوں گے اور شاید پاگلوں کی دنیا شاعروں کی دنیا کی طرح ہوتی ہوگی۔" آخری لفظ کہہ کر پوسٹ ماسٹر ہنس کر چل دیا۔ ایک کلرک وقت ملتے ہی ذرا سا پاگل پن کر دکھاتا اور سب اِس کا مذاق اڑاتے ـــــ پوسٹ ماسٹر نے بھی آخری جملہ اسی کی طرف مُڑ کے ہنستے ہوئے اسی سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

پوسٹ آفس پر پھر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

ایک بار علی دو تین روز تک نہیں آیا۔ پوسٹ آفس میں علی کے دل کو سمجھنے اور اس سے ہمدردی کرنے کی وسیع النظری کسی میں نہ تھی ـــــ لیکن وہ کیوں نہیں آیا؟ یہ جاننے کا انتظار سبھی کو ہوا ـــــ پھر علی یاد آیا ـــــ لیکن اس روز وہ ہانپتا تھا۔ زندگی کی شام کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ آج تو علی نے بے صبرا بن کے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا:

" ماسٹر صاحب، میری مریم کا خط ہے کیا؟"

پوسٹ ماسٹر اس روز گاؤں جانے کی جلدی میں تھے۔ ان کا مزاج اس سوال پر متوجہ ہو سکے اتنا شائشت نہ تھا۔

"ارے بھائی، تم کیسے ہو؟"

"میرا نام علی ہے۔" علی کا جواب بے ربط تھا۔

ہاں! لیکن یہاں کیا تمہاری مریم کا نام لکھ رکھا ہے کیا؟"

"لکھ کے رکھو نا بھائی! شاید خط آئے اور میں نہ ہوں، تو کام آئے گا۔

آدمی سے زیادہ زندگی جس نے شکار میں بتائی ہو اسے کیا معلوم کہ مریم کے نام کی قیمت اس کے باپ کے سوا اور کسی کو کچھ بھی نہیں۔

پوسٹ ماسٹر غصہ ہو گئے، بولے "پاگل ہو گیا! جاؤ۔ جاؤ تمہارا خط آئے گا تو کوئی کھا نہیں جائے گا۔"

پوسٹ ماسٹر فوراً چلے گئے اور علی آہستہ آہستہ باہر آیا اور باہر آتے ہوئے ایک بار مُڑ کے پوسٹ آفس کی طرف دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں میں بیتیانہ آنسو اُمڈ آئے۔ اسے عقیدت ضرور تھی مگر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"ارے، اب مریم کا خط کیسے پہنچے گا۔"

ایک کلرک اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ علی نے اس کی طرف مُڑ کر کہا۔

"بھائی"

کلرک چونک پڑا۔ وہ ایک اچھا آدمی تھا۔

"کیا؟"

"دیکھئے، میرے پاس یہ ہے۔"

اتنا کہہ کر اپنی جیب سے ایک پترے کی ڈبیا میں سے اس نے پانچ اشرفیاں نکالیں — کلرک ڈر گیا۔

ڈریے مت، یہ آپ کے کام کی چیز ہے۔ مجھے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایک کام کیجئے گا؟"

"کیا؟"

"یہ اوپر کیا دکھائی دے رہا ہے؟" علی نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

"آسمان۔"

"اوپر والے اللہ کی گواہی میں میں آپ کو یہ پیسے دیتا ہوں۔ آپ کو میری مریم کا خط پہنچانا ہو گا —"

کلرک حیران و پریشان کھڑا رہ گیا۔

"کہاں پہنچانا ہو گا؟"

"میری قبر پر —"

"کیا؟"

"سچ کہتا ہوں — آج میرا آخری دن ہے۔ ہائے اللہ! نہ مریم ملی نہ خط —" علی کی آنکھوں میں نشہ تھا — کلرک الگ ہو کر چلا گیا۔ اُس کی جیب میں تین تولہ سونا تھا۔

پھر علی کبھی دکھائی نہیں دیا۔ اور اس کی کھوج لگانے کی فرصت کسے تھی!

ایک دن پوسٹ ماسٹر ذرا اُداس تھے، اُن کی لڑکی پردیس میں بیمار تھی — اور خبر کے انتظار میں غمگین اور بے چین تھے۔ ڈاک آئی اور خطوں کا ڈھیر لگ گیا۔ لفافے کے رنگ پر سے اس نے اپنا خط سمجھ کر اٹھا لیا۔ اس پر پتا تھا "کوچ مین علی"۔ یوں سمجھئے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اُنہوں نے یکبارگی لفافہ پھینک دیا۔ افسوس اور فکر کے ذرا سے لمحے میں اس کا افسرانہ مزاج چھپ کر اصلی مزاج باہر آیا۔ انہیں یکایک یاد آیا کہ یہ اسی بوڑھے کا لفافہ ہے اور شاید اس کی لڑکی مریم کا —

"لچھمی داس۔"

انہوں نے آواز دی۔ لچھمی داس وہی شخص تھا جسے علی نے آخری بار اشرفیاں دی تھیں۔

"جی صاحب۔"

"یہ تمہارے کوچ مین علی میاں ..... آج کل کہاں ہیں وہ؟"

"معلوم کر دوں گا۔"

اس دن پوسٹ ماسٹر کی کوئی خبر نہیں آئی۔ ساری رات فکر میں گذار دی۔ — دوسرے دن صبح تین بجے ہی آفس میں آ کر بیٹھے — کب چار بجیں اور کب علی میاں آئیں اور میں خود انہیں خط دوں —" یہی ان کی خواہش تھی۔ بوڑھے ضعیف کی حالت آج پوسٹ ماسٹر کی سمجھ میں پوری طرح آ گئی تھی۔ پورے پانچ سال اسی طرح انتظار میں بسر کرنے والے ساری ساری رات بسر کرنے والے کے لئے آج خود دل بہت بار تڑپ اٹھا۔ ٹھیک پانچ بجے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ پوسٹ مین ابھی آئے نہیں تھے، لیکن ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ گویا یہ دستک علی کی ہو۔ پوسٹ ماسٹر اُٹھے، باپ کے دل کو باپ کا دل ہی پہچان سکتا ہے۔ وہ دوڑے، دروازہ کھولا۔

"آؤ علی بھائی، یہ آپ کا خط ہے۔"

دروازے پر ایک ضعیف لکڑی کے سہارے کھڑا تھا۔ آخری آنسو ابھی رخسار پر بہہ رہے تھے۔ چہرے کی شکن میں فخر کے ساتھ انسانیت ملی ہوئی تھی۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کی طرف دیکھا۔ پوسٹ ماسٹر ذرا ڈر سے۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آدمی کا نور نہ تھا۔

"کون ہے صاحب؟ علی میاں ..... ؟"

لچھمی داس دوسری طرف سے دروازے کے قریب آیا۔

پوسٹ ماسٹر نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ دروازے کے سامنے ہی تکتے رہے ۔مگر اب اس طرف کوئی نہ تھا۔ پوسٹ ماسٹر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ تکتے رہ گئے۔

"یہ کیا ــ" وہ لچھمی داس کی طرف مڑے۔

"ہاں، علی میاں، تم ہو نا ؟"

"جی، علی میاں مر گئے ہیں، لیکن ان کا خط مجھے دے دیجئے۔"

"کیا ؟ کب، لچھمی داس ۔"

"جی ، اس کو تو تین مہینے گذر گئے ۔"

ـــــ سامنے سے ایک پوسٹ مین آرہا تھا ' اس نے جواب پورا کر دیا۔

پوسٹ ماسٹر پتھر کی طرح جم سے گئے۔ اب بھی مریم کا خط دروازے میں کھڑا تھا۔ علی کی مورت اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی لچھمی داس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اسے آخری بار کب ملا تھا۔ پوسٹ ماسٹر کے کانوں میں وہ دستک اور نظر کے سامنے علی کی مورت کھڑی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے ۔"میں نے علی کو دیکھا یا میرا شک تھا ' یا وہ لچھمی داس تھا۔"

پھر وہی روزانہ کا معمول ہو گیا ۔

"پولس کمشنر "

"سپرنٹنڈنٹ"

"لائبریرین ۔۔۔۔" کلرک تیزی سے خطوں کے نام پڑھتا چلا۔ لیکن ہر ایک خط میں ایک دھڑکتا ہوا دل چھپا ہوا ـــ آج پوسٹ ماسٹر کو نظر آرہا تھا۔ لفافہ یعنی اکنی اور پوسٹ کارڈ یعنی دو پیسے کا حساب نظر سے ہٹ گیا تھا۔ افریقہ سے کسی بیوہ کے اکلوتے بیٹے کے خط کے معنی اب سمجھ میں آنے لگے تھے ـــ آدمی اگر اپنی نظر چھوڑ کے جب دوسروں کی نظروں سے دیکھنے لگے تو دنیا کی آدھی مصیبتیں کم ہو جائیں ۔

اس دن شام کو لچھمی داس اور پوسٹ ماسٹر آہستہ آہستہ علی کی قبر پر جا رہے تھے۔ مریم کا خط ساتھ تھا۔ قبر پر خط رکھ کر وہ واپس لوٹے۔

"لچھمی داس، آج صبح سب سے پہلے تمہیں آئے ؟"

"جی ہاں"

"اور تم نے کہا علی میاں۔۔۔۔"

"جی ہاں"

"لیکن تب ـــ تب کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ۔۔۔۔"

"کیا ؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں ــ" پوسٹ ماسٹر نے بات اڑا دی۔

پوسٹ ماسٹر اپنا گھر آتے ہی سوچتے سوچتے اندر چلے گئے۔ خود باپ ہو کر بھی علی کے دل کو نہ سمجھ پانے پر اپنے آپ کو کوسنے لگے ـــ اور آج بھی ابھی تک اپنی لڑکی کی کوئی خبر نہ تھی ـــ اور آج کی رات بھی اسی فکر میں گذاری تھی۔ پریشانی، شک اور پچھتاوا' ان تینوں کی آگ میں جل کے وہ دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔

قریب کوئلے کی انگیٹھی جل رہی تھی۔

ـــــــــــــــــــ

رؤف خوشتر

(طنز و مزاح)

چاندنی چوک

ہمارے پڑوسی امیر احمد (جو اپنا تعارف ہمیشہ "غریب کو امیر کہتے ہیں" کہہ کر سناتے ہیں) گرانی الاؤنس کی قسط ملتے ہی کہیں سے پرانا گراموفون خرید لائے۔ ہم نے لاکھ سے کچھ زیادہ مرتبہ منع کیا کہ بھابی جان کے ہوتے ہوئے آخر آپ کو کیسے بیٹے گراموفون کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ ان کا جواب تھا "اپنی مرضی سے گراموفون خاموش بھی کر سکتا ہوں۔" ہم نے ان کی اس مضبوط دلیل کے آگے مزید ذلیل ہونے سے بچنے کے لئے اپنے کان پکڑ لئے اور اب تک کانوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ امیر احمد کے مکان سے مسلسل ان کے ذاتی گراموفون کے علاوہ ایڈیسن والے گراموفون کی آوازیں ہمارے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ وہ تو کہیئے کہ مکان پختہ ہے۔ اگر گیت اچھے ہوتے تو ہم بھی کچھ دیر کے لئے سہی اپنے وزیر داخلہ کو ان خارجی مدھر آوازوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے چپ کراتے۔ پر ان گیتوں کو سن کر یہی دل کہتا ہے کہ ان ریکارڈوں کو توڑ کر ایچ۔ ایم۔ وی کی تاریخ میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جائے لیکن ایک ریکارڈ "دِلی ہے دلِ ہندوستان کا۔ یہ تو تیرتھ ہے سارے جہاں کا" سن کر یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ ہندوستان کے دل کو دیکھا جائے۔ فوراً پرانی فائیل سے بنک کی نئی اکاؤنٹ بک نکالی تو معلوم ہوا کہ صرف پانچ روپے جمع ہیں۔ بے نیاز فارسی کا قول "ہنوز دلی دور است" یاد آیا۔ اب ہم نے اپنے سیلانی دل کو دلاسا دلایا کہ ہندوستان کے دل کا دورہ کرنے کے لئے صرف دلدار ہونا کافی نہیں مالدار ہونا بھی ضروری ہے۔ دل کو سمجھاتے ہوئے مقامی طور پر دلی کی سیر کرنا شروع کر دیا۔

اپنے ایک لحیم شحیم دوست کو قطب مینار سمجھ کر چڑھنے کی کوشش کی۔ محلے کے سرخ ٹیہ خانے کو لال قلعہ کہہ لیا۔ پڑوسی میاں بیوی کو ہر دم جھگڑ و تکرار رہتا تھا پانی اور گالی گلوچ کے پیشِ نظر ان کے مکان کو پارلیمنٹ ہاؤس کا نام دیا۔ خستہ بازار کے علاقے کو کناٹ پلیس کا نام دیکر خوش ہوئے۔

ہمارے ایک دوست کے گنجے سر کو دیکھ کر بے اختیار چاندنی چوک کی یاد آئی۔ اگرچہ کہ دونوں میں خاصا تضاد ہے۔ کہاں چاندنی چوک کا گنجان، پُر آباد اور ہنگامہ پرور علاقہ اور کہاں صاف و شفاف غیر آباد کھوپڑی۔ اس پر یاد آیا کہ حال میں گنجوں کی بین الاقوامی کانفرنس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سماج میں اپنا سر بلند رکھنا چاہتے ہیں۔ مذکورہ کانفرنس کے مندوبین دو گروہ میں منقسم تھے۔ اوّل وہ جن کے بال نہیں۔ دوئم وہ جن کے نہ بال ہیں نہ بچے۔ وہاں انسانی سروں کا سمندر تھا لیکن سطح پر زلفوں کی لہروں کی بجائے کھوپڑیاں حُباب کی مانند چمک رہی تھیں۔ اُن کی دلیل کہ دنیا کے مختلف فلسفے، ایجادات، سائنسی انکشافات گنجوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اس معاملے میں ہم ان کے بال بال احسان مند ہیں لیکن اس دلیل کا خطرناک پہلو بھی ہے۔ مثلاً ایٹمی ہتھیار، زہریلی اور نشیلی دوائیں اور دوسری ہلاکت خیز اشیاء بھی تو ان گنجوں کی دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جن کی تباہی کے خوف سے ہی جسم کے سارے بال اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اب ہم نے بغیر بالوں والوں سے راہ و رسم بڑھانا شروع کر دیا۔ کیونکہ ہم بال بچوں سے بور ہو چلے تھے۔ ایک گنجے خان صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ شریعت کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے چار شادیاں کر ڈالیں۔ اُس وقت وہ صاحبِ زلف تھے اور صبح تک جوئیں پارٹی بدل سیاسی لیڈروں کی طرح بیگمات کی زلفوں کو چھوڑ کر ان کے سر میں آجاتیں اور دن بھر پریشان رہتے۔ آخر خدا نے اُن کی سن لی اور اب وہ اپنے گنج سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر گنگناتے ہیں

عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

ایک اور گنجے صاحب ہیں جو اپنے سر کے تعلق سے ایسے لا پروا

نظر آتے ہیں جیسے کرایہ دار کرایہ کے مکان سے۔ ہم نے جب اُن سے اس بے توجہی اور لاپرواہی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے۔ میاں اِس سر کو نالے کر کیا کروں جس پر کوئی بال نہیں۔ میں تو اپنے سر کو بھودان قطعۂ ارض تصور کرتا ہوں ہم نے جب اس اصطلاح کی وضاحت طلب کی تو آپ فرمانے لگے جیسے بڑے زمین دار، اپنی فالتو غیر آباد اور بنجر زمین کو بھودان تحریک کے سپرد کر کے اس سے لاپرواہ ہو گئے۔ ہم بھی اپنی بنجر کھوپڑی سے لاتعلق ہو گئے ہیں۔ ہم نے ٹھنڈک پہنچانے کے لئے جب ان کے پیاسے سر پر تیل ڈالا تو چکنے گھڑے پر تیل کہیں رکتا ہے۔ ہم نے حسرت سے تیل اور تیل کی دھار کو ناک کا رزق ہوتے دیکھا۔

اب آیئے زن مرید گنجے کا حال دیکھیں۔ جب ہم نے ان کی سطحِ مرتفع پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ کئی جگہ خون کی گلکاریاں اور زخم نخلستان کا سماں پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ بیگم صاحبہ کھوپڑی پر تیز ناخنوں کے نقوش ایسے اُبھارتی ہیں جیسے بڑی طاقتیں امن پسند ایشیا میں فوجیں اُتارتی ہیں۔ وہ یہ بتانے کے باوجود کہ بیگم صاحبہ کے ناخن کٹ چکے ہیں۔ رونا شروع کر دیا تو ہم نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے کہ دوستوں کی جانب سے ہمت بڑھانے اور بیگم صاحبہ ناخن کو کم کرنے کے باوجود مجھے فکر ہے کہ ؎

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ؟
زخم بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا ؟

ہمارے گنجے برادر اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ بالوں کی افزائش اور کھوپڑی پر نو آبادکاری پر صرف کر رہے ہیں۔ یہی رقومات اگر بنجر زمینوں پر کاشت کے لئے صرف کی جائیں تو غذائی مسئلہ حل ہو جاتا۔ یہی نہیں بیرونی ممالک کے لوگ سر کے بل چل کر یہاں سے غلّہ خریدتے۔ ہم نے آج تک اس فرق کو محسوس نہیں کیا کہ ہر گنجا فلسفی ہوتا ہے۔ بسا اوقات ہم نے فلاسفر کو ریچھ کے مشابہ پایا اور رامو دھوبی کو گنجا۔

مغرب کی خوش حالی کا راز شاید اس میں مضمر ہے کہ وہاں گنجے بکثرت ہیں۔ ان کے لئے آرائشِ زلف کا وقت بچ جاتا ہے اور یہی وقت وہ تعمیری کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ مشرق میں مرد و عورت دن کا بیشتر حصّہ آئینہ کے روبرو زلفوں کو سنوارنے میں گذارتے ہیں۔ کاش وہ اسی وقت میں تقدیر سنوارتے۔

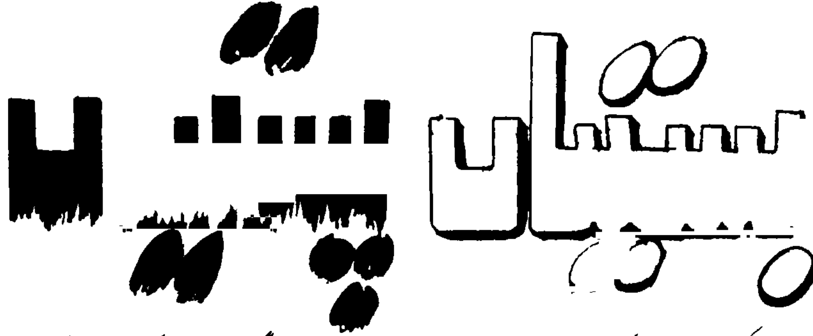
گنجے پن کا مرض اب مردوں کے سر پر ہی نہیں، خواتین بھی اس کی شکار ہوتی جا رہی ہیں جس کا پتہ ہمیں ایک عاشق مزاج دوست کے ذریعے چلا۔ قصّہ یہ ہے کہ ایک حسینہ سے ان کا عشق ہو گیا اور فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے روایتی انداز میں رٹے رٹائے طور پر کہا — "جانِ من، میں اپنی ساری زندگی تمہاری ان ساون کی گھٹاؤں جیسی زلفوں کے سائے میں گذارنا چاہتا ہوں۔" اس حسینہ نے پیار سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے سر سے الگ کر کے عاشق کے ہاتھوں میں تھما دیا اور دوسری وِگ پرس سے نکال کر سر پر ڈھانپ لی۔ اور ہمارے دوست گنجی عورت کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور گھر پہنچ کر چھت پر دوربین لے کر یہ شعر گنگنانے لگے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پر پریشاں کئے ہوئے

بُرا ہو اِن گنجوں کی صحبت اور اُن کے متعلق معلومات اخذ کرنے اور ان کی بال کی کھال کھینچنے کا کیونکہ دریں اثنا ہمارا سر جو اب تک ناصر حسین کی کسی فلم کے شائقین سے بھرا سینما ہال لگ رہا تھا، اب اس میں سے بال ایسے غائب ہو گئے تھے جیسے شانتا رام کی فلم سے تماشائی غائب ہوتے ہیں۔ اور ہمارا سر جنتا بازار سے چاندنی چوک بنتا جا رہا ہے۔ ہمیں اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب بیگم صاحبہ نے ہمارے سر کے ہمالہ کی چاندی کو پگھلتی دیکھ کر ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے منتیں، سماجتیں کی۔ ان کے پیر سے لے کر بال پکڑ لئے اور کہا کہ دوائیں، دعائیں اور مقوی غذائیں ہمارے گنجے پن کو دور کر سکیں گے۔ تو بیگم صاحبہ نے چوٹی کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

پرویز یداللہ مہدی



ایک مرتبہ کسی جگہ ہم نے اپنی بستی کی نامور ہستیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ "ہماری بستی میں بے ضرر عوام کے ساتھ بڑی بینچی ہوئی نامی گرامی بلکہ 'بہرامی' ہستیاں بھی رہتی ہیں" کسی نے فوراً قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا ـــ "ہم نے تو اب تک صرف نامی گرامی یا حرامی سنا تھا۔ یہ بہرامی کیا بلا ہے؟" ہم نے جواباً عرض کیا ـــ "نامی گرامی کے ساتھ 'بہرامی' کا قافیہ ہم نے دراصل اس لئے جوڑا ہے کہ ہماری بستی کا نام ہی بہرام ہے۔ اور ظاہر ہے اس نام سے دہشت کی اس قدر بو آتی ہے کہ سن کر ہی اچھے اچھوں کا قافیہ تنگ اور ردیف ڈھیلی ہوئی جاتی ہے۔

اس بستی کا نام بہرام کس طرح پڑا۔ یہ ایک تحقیق طلب نقطہ ہے اور اس "نقطۂ ناتحقیق" کے سلسلے میں جب ہم نے بستیوں کے بسنے اور اجڑنے کی تاریخ سے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ بستیوں کے نام عموماً اپنے وقت کے سورماؤں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ یہاں ہم ثبوت کے طور پر شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے چند مشہور اور تاریخی محلوں کے نام پیش کرتے ہیں، جیسے شاہ علی بنڈہ، سید علی چبوترہ، ماماجمیلہ کی ڈیوڑھی، بودے صاحب کی کھڑکی، نانا میاں کی چاوڑی، دولہے خاں کی دیوڑھی، ... گب کی چھاونی وغیرہ وغیرہ ـــ تاریخ کی اس ٹمٹماتی روشنی میں بہرام کے تعلق سے ہم نے بھی مرنہ ہی سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ اگلے وقتوں میں بہرام نامی کوئی سوشیل ورکر اسی بستی میں یا اس کے آس پاس گزرے ہوں، اور ان کے کارہائے نمایاں کے معمولی سے اعتراف میں اسی بستی کا نام موصوف کے نام پر رکھا گیا ہو ـــ واضح ہو کہ ہمارا یہ خیال اسی زمانے کی اپج تھا جب یہ بستی ہمارے لئے دور کا ڈھول تھی۔ لیکن جب تقدیر نے ہمیں اسی بستی کے ایک کونے میں عبرت حاصل کرنے کے لئے پہنچا دیا تو دور کے اس ڈھول کا پول کھلا۔ جب اس محلے کے نامی گرامی بندوں کے لبندے کالے دھندے اور ہتھکنڈے دیکھے تو یقین واثق ہو گیا کہ اس بستی کا نام کسی سوشیل ورکر کے نام پر نہیں بلکہ مشہور زمانہ بہرام ڈاکو کے نام پر رکھا گیا ہے۔

اس بستی میں رستموں کی کوئی کمی نہیں، ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں بلکہ ڈھونڈھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود آپ کو ڈھونڈھ کر ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ تاریخ میں تو ہم نے یہی پڑھا ہے کہ ایک رستم دوسرے رستم سے وہی سلوک کرتا ہے جو ایک بہادر کو دوسرے بہادر سے کرنا چاہیئے۔ لیکن اس بستی کے رستموں کا باوا آدم تو نرالا ہے ہی ماں حوا بھی کچھ کم نہیں۔ یہاں کا ہر رستم چونکہ دوسرے رستم کو سہراب سمجھتا ہے اس لئے ہر روز رستم و سہراب کا خونیں ڈرامہ کسی نہ کسی گلی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ بلکہ شر پسند تماشائیوں کے "مکرّر ارشاد" فرمانے پر پسندیدہ شعر کی طرح کئی کئی بار دہرایا بھی جاتا ہے۔

جن دنوں ہم اس بستی میں نئے نئے وارد ہوئے تھے نہ تو اس بستی کے آدابِ نشست و برخاست سے واقف تھے اور نہ ہی یہاں کے صاحبِ کردار حضرات کے چال و چلن کا ہمیں علم تھا۔ اسی لئے لاعلمی میں اپنی ہی چال چلتے رہے جو ظاہر ہے بستی کے کرتا دھرتا قسم کے حضرات کو ناگوار گزری۔ چنانچہ ایک دن بستی کے ایک ٹھیکیدار نے ہمیں زبردستی روکا اور پھر یوں ٹوکا ـــ "بہت اکڑ کر چلتے ہو خان۔ کیا اپنی کھٹیا کھڑی کروانے کا ارادہ ہے ـــ" جیسے کہ ہم نے عرض کیا۔ ہم یہاں بالکل نئی نئی پیداوار تھے۔ اس لئے موصوف کے طنز کو سمجھ نہیں پائے۔ بلکہ ہمدردی سمجھا اور دست بستہ عرض کی ـــ "آپ کی ہمدردی کا شکریہ بھائی صاحب! آج کے مشینی دور میں بھی ایسے لوگ باقی ہیں جو دوسروں کے تعلق سے یہاں تک سوچتے ہیں، بلکہ اس کی کھٹیا تک کی فکر کرتے ہیں مگر بھائی صاحب! میں تو فی الحال زمین پر سوتا ہوں ابھی تک کھٹیا

خرید نے کی توفیق نہیں ہوئی۔ جب خرید لوں گا آپ کو خدمت کا موقع ضرور دوں گا۔ ویسے بھائی صاحب انسان کو اپنی کھٹیا خود کھڑی کرنی چاہیئے دوسروں کو اس سلسلے میں خواہ مخواہ زحمت دینے سے گریز کرنا چاہیئے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں — " ہماری اس تشریح کے نتیجے میں وہ "کھٹیاؤں" کے ٹھیکیدار نے جس قسم کا بالجبر سلوک ہمارے ساتھ کیا اس کی تشریح کی ضرورت اس واسطے نہیں ہے کہ بمبئی کے باسی ہونے کی پاداش میں آپ کے ساتھ بھی یقیناً ایسا سلوک ہو چکا ہوگا یا کم از کم کسی بدنصیب کو اس قسم کے سلوک سے گذرتا دیکھ چکے ہوں گے — اسی بالجبر سلوک کے بعد ہماری چال کا وہ حال ہوا کہ اب ہم جب بھی گلی میں داخل ہوتے ہیں تو ہماری گردن یوں جھک جاتی ہے جیسے ہمارے گلے میں سوامن کا طوق پڑا ہو۔ اور قدم یوں احتیاط سے زمین پر دھرتے ہیں کہ چاپ تک سنائی نہیں دیتی۔ ظاہر ہے قدموں کی چاپ سنا کر اپنے گوشت پوست کے "ان گنت چاپ" بنوانے کا کوئی شوق نہیں ہے ہمیں قصہ مختصر یہ کہ گھر تک کا فاصلہ ہم اس طرح طے کرتے ہیں کہ کسی زاویئے سے ہماری کھٹیا کا کوئی پہلو یہ چیلنج کرتا ہوا نظر نہیں آتا کہ ہے کوئی مائی کا لال جو میری کھٹیا کھڑی کر سکے !!

ہماری بستی کا محلِ وقوع، ساخت اور ہیئت نہ تو تحریر کے ذریعہ سمجھائی جا سکتی ہے اور نہ زبانی۔ پھر بھی ہم ایک کوشش کر دیکھتے ہیں۔ آپ اگر کبھی دہلی اور لکھنؤ گئے ہوں تو یقیناً وہاں کی تاریخی بھول بھلیاں دیکھنے کا موقع ضرور ملا ہوگا ان بھول بھلیوں پر تو دہلی اور لکھنؤ والوں کو بڑا ناز ہے۔ ہاں کبھی زمانے میں یہاں کے باشندوں کو اپنی زبان پر بھی بڑا ناز ہوا کرتا تھا، خود کو اہلِ زبان اور دیگر علاقوں کے اردو والوں کو بے زبان، گردانا کرتے تھے۔ لیکن جب سے ابن الوقت قسم کے اربابِ اقتدار نے ان کی زبان کو سوتیلی نظر سے دیکھنا شروع کیا تو ان اہلِ زبان حضرات کی اکثریت نے بھی اپنی زبان سے نظر پھیر لی۔ اب یہ لوگ زبان سے زیادہ بھول بھلیاں پر ناز کرتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں اہلیانِ بمبئی نے کبھی ان اہلِ زبان حضرات کی نقل نہیں کی البتہ بھول بھلیوں کے جواب میں کئی بستیاں اسی طرز کی ضرور بنا ڈالیں — اس قسم کی بستیوں میں ہماری بستی سرِفہرست شمار کی جا سکتی ہے جو بھی قسمت کا مارا کسی کی تلاش میں پہلی بار اس بستی میں قدم رنجہ فرماتا ہے۔ گنجا ہونے تک بھٹکتا پھرتا ہے لیکن اپنے گنجِ گراں مایہ کی دھول بھی نہیں پاتا۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک دوست کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ اس بستی میں پہنچ کر کسی مطلوبہ شخص کو ڈھونڈنے میں انسان کو کم و بیش انہی صعوبتوں سے گذرنا پڑتا ہے جن سے کولمبس، امریکہ کی دریافت کے دوران گذرا تھا۔

ہمارے تعلق سے تو موصوف دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس بستی میں ہماری خیر و خبر دریافت کرنا ناممکن ہے کیونکہ مرزا غالب کا یہ شعر ہم پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

ع ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

موصوف کا خیال ہے کہ اس بستی میں ہمیں ڈھونڈنے سے تو حاتم طائی سوالاتِ صدا لے کے حمام بادگرد کی خبر لانا نسبتاً آسان ہے بلکہ ایک مرتبہ موصوف خود بہ نفسِ نفیس ایک عدد حمام بادگرد میں پہنچ کر اپنے بدن کی ساری گرد جھڑوا کر حمام بادگرد سے اپنی اچھی خاصی خبر گیری کروانے کے بعد لوٹ چکے ہیں۔ تفصیل اسی انجام پر حمام کی اس طرح بیان کرتے ہیں —

ایک روز وہ ہمارے بتائے ہوئے پتے کی روشنی میں نیم تاریک گلیوں کے چکر کاٹنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے آگے کا راستہ مسدود تھا اور جس دروازہ پر وہ پہونچے تھے اس پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "شاہی حمام خانہ" — اور اس کے نیچے خفی حرفوں میں نرخ نامہ درج تھا — "ٹھنڈا پانی: ایک روپیہ فی گھڑا" — گرم پانی: ڈیڑھ روپیہ فی گھڑا"۔ صابن اور تولیئے کے آٹھ آنے — ٹیکس علاوہ۔" ہمارے دوست ابھی یہ تحریر پڑھ ہی رہے تھے کہ ایک مشٹنڈے نے انھیں بہ زورِ دست و بازو اندر کھینچ لیا۔ اور زبردستی انھیں بے لباس کر کے ایک مونڈھے پر بٹھا دیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک عدد پانی کا گھڑا ان پر انڈیل کر بدن کی گرد کچھ اس طرح جھاڑی کہ ان کے بدن پر ایسے گومڑ ابھر آئے جو حجم میں کسی مرغابی کے انڈے کے برابر والے موتی سے کم نہیں تھے۔ سات سوال کا کوٹہ پورا ہونے میں ابھی پانچ سوال اور باقی تھے۔ لیکن دو ہی سوالوں نے ہمارے دوست کی وہ درگت بنائی کہ اس کے بعد پھر کبھی موصوف نے اس حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کی کوشش نہیں کی۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں ہماری بستی بھول بھلیوں کی طرز پر بنائی گئی ہے۔ اسی لئے ابتدائی دنوں میں ہم خود اکثر گلیوں کے اسی جال میں الجھ کر اس مصرعہ کی تفسیر بن جایا کرتے تھے۔ یعنی

نکلے تیری تلاش میں اور خود ہی کھو گئے

کافی دنوں تک کھونے اور پانے کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یعنی کبھی ہم تلاشِ گمشدہ کا اشتہار بن جاتے تو کبھی ہمارا غریب خانہ ناپید ہو جاتا۔

ایک دن روز روز کی اس آنکھ مچولی سے تنگ آ کر ہم نے اپنی مخصوص گلی کی کسی قابلِ ذکر شئے کی شناختی نشان یا خصوصی پہچان کے طور پر ذہن میں محفوظ کرنے کا بیڑہ اٹھایا — سب سے پہلے گھروں کی نشان کو کنگھالا کہ شائد کوئی گھر اپنی مخصوص ساخت اور ہیئت کی وجہ سے اس مصرعہ کی تفسیر بن کر ہمارے لئے نشان کے پتھر کا کام دے کہ سب میں شامل ہو مگر سب سے جدا لگتے ہو — لیکن جب تمام گھروں کی ساخت کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا تو ان میں اس قدر مماثلت اور یکسانیت نظر آئی کہ ہر گھر اپنا گھر معلوم ہوا — لیسے

ہا تھنوں کی کترن کی مدد سے بنی دیواریں جن میں مفلسی کی جھولی کی طرح بے شمار چھید مدقوق کی کمزور پسلیوں کی طرح ایک جیسی کھوکھلی نالیں دیسے ہی کمزور یتیم اور سہمے دروازے، بستر مرگ پر پڑے مریض کی طرح بجھی بجھی سانسیں گنتی ایک جیسی بوسیدہ کوٹھڑ —— ہمارا دعویٰ ہے کہ یک جہتی کی اس سے بڑی مثال شائد ہی ملے۔ ان مکانوں کی آپسی مماثلت کو دیکھ کر یہی دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ بھی کسی ہاؤزنگ سوسائٹی کے مکانوں کی طرح امداد باہمی اصولوں پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ جبکہ اصلیت یہ ہے کہ اس بستی کی تعمیر کے وقت امداد باہمی کے اصولوں کے خلاف ورزی کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے دنیا کے پہلے انسان کے ذہن میں پہلے پہل گھر کا جو نقشہ ابھرا ہوگا وہ ہو بہو ایسا ہی ہوگا —— ان گھروں کو گھر کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی حسینہ کی بکنی (BIKNI) کو لباس کہنا۔ اسی لئے سمجھدار لوگ ان نام نہاد گھروں کو کھولی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ گھر کھلے گلے کے بلاوز کی طرح چاروں طرف سے کھلے ہوتے ہیں اور مکینوں کی کسمپرسی کی جی کھول کر نمائش کرتے ہیں ہم نے جب بھی ان کھولیوں کا موازنہ پکے بلڈنگوں سے کیا ہے۔ یہی تشبیہ ہمارے ذہن میں ابھری ہے۔ پکے فلیٹ اگر مکمل سوٹ ہیں تو کچی کھولیاں انڈر ویئر (UNDERWEAR) اور اسی مناسبت سے کھولی نشینوں کی حیثیت سماج میں اس شخص کی طرح ہے جو صرف انڈر ویئر پہن کر سڑک پر نکل آیا ہو جسے متأثر یوری طرح بے عزت گردانا جاتا ہے اور نہ باعزت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس بات کو ذرا وسیع پیمانے پر دیکھئے تو بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ آج سارا متوسط طبقہ صرف انڈر ویر پہنے بیٹھا ہے۔ جب تک اس طبقہ کے افراد گھر سے باہر رہتے ہیں اوپر سے انڈر ویئر پہنے جب کھولی میں پہنچ جاتے ہیں، یہی انڈر ویئر انھیں پہن لیتا ہے

مرزا غالب نے جس بے در و دیوار سے گھر کا خواب دیکھا تھا وہ اُن کی وفات کے پورے سو سال بعد بمبئی کی کھولیوں کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا ہے ظاہر ہے جس تعبیر کی تعمیر ایسی ہو اس پر آدمی سوائے شرمندہ ہونے کے اور کیا کر سکتا ہے —!

کھولیوں کی طرف سے مایوس ہو کر ہم نے گلی کے کوائف کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر ہماری باچھیں کھل گئیں کہ جگہ جگہ سے گلی کی باچھیں بھی کھلی بلکہ "چھلی" ہوئی ہیں۔ لیکن ہماری خوشی کا باعث گلی کی چھلی ہوئی باچھیں نہیں تھیں بلکہ وہ پتھر تھا جو کسی سنتری کی طرح گلی کے بیچوں بیچ سر اٹھائے کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس کے فرائض منصبی میں غالباً لوگوں کو زمین پر چلنے کے آداب سکھانے کے ساتھ ایسے فرعون و شداد صفت حضرات کو جو یہ بھولے ہوتے ہیں کہ ان کا وجود ایک مٹھی خاک سے زیادہ نہیں اسی مشت خاک کو خاک فرش سے ہم آغوش کر کے ساری اکڑفوں نکالنا بھی شامل تھا —— ہم نے اسی پتھر کو نشان کا پتھر ٹھہرایا —— پہلے دو دن تک تو اس نے ہماری برابر رہنمائی کی، لیکن تیسرے روز پھر ہماری حالت اس بھولے بھٹکے مسافر کی سی ہو گئی جو کسی نامعلوم جزیرہ میں پہنچ کر دو نامانوس راستوں کے بیچ کھڑا یہ سوچ رہا ہو کہ میں اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں ——

نشان کا پتھر اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ گویا ہمارے حق میں ساری کائنات اپنی جگہ سے سرک گئی تھی۔ ہم نے سوچا کہیں کسی اور گلی میں تو نہیں پہنچ گئے، پھر اس شبہے کی تصدیق کے لئے آس پاس کی دو چار گلیوں کے چکر بھی لگا ڈالے شائد تیسری گلی میں نشان کا پتھر نظر آیا اسی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ یوں لگا جیسے وہ پتھر ٹرافک کانسٹبل کی طرح اشارے سے ہمیں لائن کلیئر کا سگنل دے رہا تھا۔ ہم نے تیز رفتاری سے راستہ طے کیا اور اندازے سے اپنے غریب خانے میں داخل ہوئے۔ لیکن جس تیز رفتاری سے اندر داخل ہوئے تھے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ہمیں واپس کوچ کرنا پڑا کیونکہ نشان کا پتھر تو وہی تھا لیکن نہ گلی اپنی تھی اور نہ غریب خانہ۔ اور غریب خانے کے اصل غریب نے وہ واویلا مچایا کہ ساری گلی کی نظر میں وہ غریب دیکھتے ہی دیکھتے عجیب و غریب ہو گیا۔ جب ہم نے اپنی نادانستہ بھول کی معافی مانگی اور ان گلیوں کے بھول بھلیوں کے جال، کھولیوں کی یکسانیت اور نشان کے پتھر کا حوالہ دیا تو صاحب غریب خانے کی نصف غریب خانی نے یوں نوحہ خوانی کی۔ یعنی انگلیاں چٹخا کر فرمایا "شائد وہی پتھر تمہاری عقل پر پڑ گیا ہے" ہم نے اقرار میں گردن ہلائی کیونکہ ہماری عقل واقعی نشان کے پتھر تلے دب چکی تھی —— ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ اس گلی سے ہم اس طرح اٹھیں گے کہ کسی شاعر کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہوگی ؎

یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

ملک الموتوں کی اس بھیڑ میں اچانک سیما آگے بڑھے اور بولے —

"ایک منٹ رُکو — جناب آپ اس پتھر کی بات کر رہے ہیں —" موصوف نے نشان کے پتھر کی جانب اشارہ کیا۔ ہم نے اثبات میں اپنی لٹکی ہوئی گردن ہلائی وہ فوراً چٹکی بجا کر بولے — "بھائیو! بے قصور ہیں۔ دراصل اس پتھر کی وجہ سے انھیں غلط فہمی ہوئی۔ یہ جان بوجھ کر ان کی کھولی میں نہیں گھسے — درحقیقت کل جب میں نے پڑوس کی گلی سے اس گلی میں انتقالِ مکانی فرمایا تو یہ مقدس پتھر بھی اکھاڑ لایا۔ کیونکہ ہمارے مرحوم پیر "ہر منگل کو اس پر بیٹھ کر مراقبہ کیا کرتے تھے"

پیر صاحب کی منگل وار کی بیٹھک کہیئے یا اُن کے مرید کی مداخلت یا پھر ہمارے بخت کی یاوری بہرحال کسی ایک کی برکت نے ہمیں بے آبرو ہو کر اس کوچے سے نکلنے سے بچا لیا۔ البتہ اس کے بعد ہر قسم کے پتھروں سے ہمیں

خوف محسوس ہونے لگا۔ ہر پتھر ہمیں کسی نہ کسی سنت فقیر کی، ایزی چیئر نظر آنے لگا۔ چنانچہ اب کی بار ہم نے جس نشان کا انتخاب کیا یا بالفاظِ دیگر اپنے چوبی پارلیمنٹ ہاؤس تک پہنچنے کے لئے جس انتخابی نشان کا انتخاب کیا وہ حزب کی علامت تھی یعنی چلیبا ـــــ ایک عدد رنگین چاک کی مدد سے ہم نے اپنی گلی کے نکڑ پر واقع کچرے کی کنڈی کی دیوار پر اپنا انتخابی نشان بنا دیا۔ لیکن اس نشان نے بھی دو چار روز بعد ہی اپنے پر پرزے نکال کر دکھا دیئے۔ ہمارے بنائے ہوئے نشان کی آل اولاد پتہ نہیں کہاں سے ٹپک پڑی، یعنی اسی قبیل کے نشان ہمیں ان تمام گلیوں میں موجود کچرے کی کنڈیوں پر نظر آئے جن سے گذر کر ہم اپنی گلی تک پہونچتے ہیں۔ حزب کی علامتوں کی اس بہتات پر ہمیں علی بابا چالیس چور کا قصہ یاد آگیا۔ جس میں چوروں کے سردار کو چکمہ دینے کے لئے علی بابا کی چہیتی کنیز مرجینا ایسے نشان بستی کے تمام گھروں کی دیواروں پر بنا دیتی ہے جیسا کہ چوروں کا سردار اپنی یادداشت کے طور پر علی بابا کے گھر کی دیوار پر بناتا ہے ـــــ ہم نے سوچا ایسی ظالم مرجینا کہاں سے پیدا ہو گئی جس نے اس جنم میں علی بابا کا ساتھ دینے کے بجائے اس کا جینا حرام کر دیا۔ اور اب ہم نے انتخابی نشان کے فتو کو ذہن سے ہمیشہ کے لئے جھٹک دیا اور خود کو کسی بادبانی کشتی کی طرح ہواؤں کے دوش پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ بھٹک بھٹکا کر کھولی تک پہنچتے پہنچتے ایک دن کھولی کا راستہ خود بخود ذہن نشین ہو گیا ـــــ!

کہاوت ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ لیکن کھولیوں کی دیواروں کو قدرت نے کان کے علاوہ آنکھوں کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔ اور یہ آنکھیں صرف عیب ہی دیکھتی اور دکھاتی ہیں۔

اب ہمیں ہی دیکھیئے۔ کام پر سے لوٹنے کے بعد اپنی کھولی میں اکثر پھٹی ہوئی تہمد اس طرح لپیٹ لیتے کہ کسی پہلوان کا لنگوٹ معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لنگوٹ نے ہمیں کچھ دنوں تک اس خوش فہمی میں رکھا تھا کہ اللہ مہربان تو گدھا پہلوان لیکن بہت جلد یہ بات ہم پر واضح ہو گئی کہ ہماری اپنی بے وفا دیواروں کی دغا باز آنکھوں نے پڑوسیوں پر یہ راز کھول دیا ہے کہ ہمارے پاس سوائے اس ایک عدد پھٹی ہوئی تہمد کے تہمت کے طور پر بھی کپڑے کی ایک چندی نہیں ـــــ اس سے پہلے یہ احساس ہمیں زندہ درگور کرتا۔ اس نئے اور قومی احساس نے ہمیں زندہ درکھولی کر دیا کہ اس حمام میں سبھی ادھ ننگے ہیں۔

دیواروں کی یہ مکار آنکھیں راتوں میں عجیب تماشے بھی دکھاتی ہیں۔ رات کی خاموشی میں اچانک ایک میٹھی رسیلی سرگوشی کانوں کے راستے آپ کے دل تک پہنچتی ہے۔ اور پھر خواہش کے مرمریں کنکر جذبات کی جھیل میں گرداب پیدا کرتے ہیں۔ آپ بے قابو ہو کر اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی شریکِ حیات کے اور قریب پہونچتے ہیں۔ لیکن وہاں جو سدِ مِن نظر آتا ہے وہ آپ کے جذبات پر اوس ڈال دیتا ہے۔ آپ کی بیوی تو سارے گھوڑے گدھے، کتے بلیاں اور مرغیاں بیچ کر مزے سے سو رہی ہے ـــــ اور جس سرگوشی کے سگنل نے آپ کو گدگدا کر جگایا تھا وہ دراصل پڑوسن کا تھا۔ اور آپ کے لئے نہیں بلکہ اپنے شوہر کے لئے تھا۔!

گویا وہی بات ہوئی ؎

چوڑی کوئی کھنکے تو یہ لگتا ہے کہ تم ہو ـــ !!

اسی طرح بھوک کے مارے رو رو کر نڈھال کوئی اور نونہال ہوتا ہے اور بغیر مانگ کے نہال کوئی اور نونہال ہوتا ہے ـــــ !!!

جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے اس بستی کی گلیاں اس قدر تنگ و تاریک ہیں کہ ان کے سامنے امیر کے دل اور مفلس کی جیب کی تنگی و تاریکی بھی شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ ان گلیوں میں سے اپنے اعضاء اور لباس کے ہر تار کو بہ حفاظت تمام نکال لانا ایسا ہی ہے جیسے مکھے میں سے بال یا کسی سرکش گھوڑے کے پاؤں سے نعل نکال لینا۔ چنانچہ روزانہ کئی حضرات بال کی طرح گلیوں کے مکھے میں سے صاف نکلنے کی کوشش میں خوب دولتیاں کھاتے ہیں۔ آپ نے دیو مالائی قصّوں اور طلسمی کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ کئی زندہ انسان جادو کے زور سے پتھر کے بنا دیئے جاتے ہیں اور مُردے زندوں کی طرح بھاگتے دوڑتے ہیں جو کہ حقیقی زندگی میں ناممکن ہے لیکن اس ناممکن کو اگر ممکن دیکھنا ہو تو اس بستی میں اسی وقت تشریف لایئے جب کوئی اس دارِ فانی کو لبیک کہتا ہے۔ ان گلیوں کی تنگی زندوں اور مُردوں دونوں کے ساتھ ایک ہی سلوک کرتی ہے۔ چنانچہ مُردے کو بھی ان گلیوں میں سے زندہ شخص کی طرح کھڑے قد چلاتے ہوئے باہر لانا پڑتا ہے۔ یہاں کی گلیوں کی تنگی و تاریکی کے بارے میں ہماری یہ طبع آزمائی آپ کو اس غلط فہمی میں نہ مبتلا کر دے کہ اس گلدستۂ ہائے سخن میں صرف چھوٹی بحر کی غزلیں ہی زیورِ طبع سے آراستہ کی گئی ہیں۔ اس میں ایک عدد بڑی بحر کی غزل بھی موجود ہے۔ یعنی، مقطع والی سخن گسترانہ بات کی ٹکر کی ایک بڑی گلی بھی ہے۔ اس بستی میں اس کی حیثیت بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ اندھوں میں کانے راجہ یا ان دنوں بارات میں بینڈ باجے کی ہے۔ اس گلی کو دیگر عام گلیوں میں مرکزی بلکہ قومی شاہراہ کا جلیل القدر مرتبہ حاصل ہے۔ ہمہ وقت اس کے دونوں اطراف دکانوں، چائے خانوں، دیوانوں فرزانوں، مردانوں زنانوں، جھلنگوں، پلنگوں اور ملنگوں کا میلہ سا لگا رہتا ہے۔ اس بھیڑ میں اپنا راستہ تلاش کرنے کے لئے کسی کو چھیڑنا بھڑ کے چھتے کو چھیڑنے کے برابر ہے بستی کی اس قومی شاہراہ پر کچھ کھولیاں ایسی بھی نظر آئیں گی جن کے دروازوں پر لٹکے رنگین پردوں کو دیکھ کر ایسا لگے گا کہ صاحبِ خانہ کا زنانہ سخت پردے

کا پابند ہے۔ یا پھر واقعی کوئی معشوق ہے اس پردۂ زن گاری میں لیکن اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کیا کیا تماشے ہوتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن انھیں دیکھنے کے لئے آپ کی جیب میں نقدی یا پھر بدن پر پولس کی وردی ہونی چاہیئے ــــ کیونکہ قانون کی ناک کے نیچے ہی دولت اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ہر غیر قانونی کام انجام دیتی ہے ـ !!!

کسی زمانے میں بستی کی آڑی باڑی، اگاڑی پچھاڑی ہر طرف کھاڑی ہی کھاڑی ہوا کرتی تھی (کھاڑی دراصل بمبئی کی زبان میں چھوٹے چھوٹے تالابوں کو کہتے ہیں۔ جن میں سمندر کا پانی مدوجزر کی زد میں آکر وقفے وقفے سے گھٹتا بڑھتا اور جمع ہوتا رہتا ہے۔ گویا کھاڑی سمندر کا پیکدان ہوتی ہے جب سمندر کا منہ بھر جاتا ہے وہ کھاڑیوں میں تھوک دیتا ہے۔) یار لوگوں نے بڑھتے ہوئے رہائشی مسائل سے خود ہی نمٹنے کے لئے ان ہی کھاڑیوں کو پاٹ کر اپنے خوابوں کے محل پانی پر تعمیر کر لئے ہیں۔ البتہ ہماری بستی کے پچھواڑے تھوڑی سی کھاڑی نمونے کے طور پر چھوڑ دی گئی ہے تاکہ ڈوب مرنے کو کم از کم چلو بھر پانی تو رہے۔ آپ ہی غور فرمائیے۔ لوگ اگر دوراندیشی سے کام لے کر اگر تھوڑی سی کھاڑی نمونے کے طور پر نہ چھوڑتے تو پھر مردہ بھینسوں، کتوں اور انسانی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ بڑی گمبھیر شکل اختیار کر لیتا ــــ بلکہ ہم تو کہتے ہیں بمبئی میں اگر سمندر اور اس کی شاخوں مثلاً کھاڑیوں کی سہولت حاصل نہ ہوتی تو پھر یہاں قتل و خون کی رفتار اور تناسب کو برقرار رکھنا دادا لوگوں کے لئے مشکل ہو جاتا۔ بمبئی کے داداؤں کی داداگیری کا سکہ جہاز دانگ عالم میں بیٹھا ہوا ضرور ہے لیکن ان کی مردانگی مشکوک ہے۔ اکثر جواں مردوں کا خیال ہے کہ یہاں کے داداؤں میں بہادری سینہ بہ سینہ منتقل نہیں ہوتی بلکہ پشت در پشت سے چلی آ رہی ہے اس لئے یہ حضرات سامنے سے وار کرنے کے بجائے پشت سے وار کرنا پسند فرماتے ہیں۔ یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے اس پر آپ ہم بھلا کیا کہہ سکتے ہیں۔ البتہ ہم نے یہاں کے داداؤں میں کم از کم اتنی شرافت ضرور دیکھی ہے کہ یہ اپنے شکار کا کام تمام کرنے کے بعد مقتول کی لاش کو نہ تو اپنی گلی میں ٹھکانے لگاتے ہیں اور نہ ہی مقتول کے محلے میں۔ بلکہ اس کار خیر کے لئے کسی دور دراز کی کھاڑی کا انتخاب کرتے ہیں۔ داداؤں میں اتنی شرافت کا پایا جانا بھی غنیمت ہے۔ اس سلسلے میں غالباً دوران ٹریننگ ہر دادا کے ذہن میں مرزا غالب کا یہ شعر بٹھا دیا جاتا ہے۔

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

اس قسم کی خود ساختہ بستیوں یعنی بستیوں کے باسیوں کے بیچ غالباً ایک انڈر گراؤنڈ قسم کا معاہدہ ضرور ہوتا ہے جس کی رو سے غالباً دونوں وفاداری کی یہ قسم کھا چکے ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کی بگڑی ہوئی حالت کی طرف کبھی توجہ نہیں دیں گے ــــ ہم نے جب جب بھی یہ سوچا ہے کہ کیا کسی روز ہماری بستی کے نصیب جاگیں گے، کوئی مسیحا یہاں بھی آئے گا۔ کبھی اس بستی کی بھی کایا پلٹ ہوگی ــــ تب تب ہمیں اپنے اندر سے یہی جواب ملا ہے یہاں کبھی کوئی مسیحا نہیں آسکتا کیونکہ اس بستی کا ہر باسی خود مسیحا ہے اور ہر مسیحے کا مقدر صلیب و دار ہے۔ تختے ہر طرف تختے، فرش دیواریں۔ دروازے اور اس بستی کا ہر باسی روز تختۂ دار پر چڑھتا ہے اور مصلوب ہوتا ہے اور پھر بھی زندہ ہے ـ !!!

بقیہ :- رہزن ------

(یکایک تہمینہ پردہ اٹھا کر اندر آتی ہے۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا ہے۔)

تہمینہ :- نہیں، میں نے سب سن لیا ہے ـ بابا ہم آپ کے ساتھ چل رہے ہیں۔

نفیسہ :- تہمینہ !!

رضا :- یہ کونپل جیسی شاداب لڑکی میری تہمینہ ہے !

(ہاتھ سے بریف کیس رکھ دیتا ہے)

نفیسہ :- تہمینہ ہے، لیکن تمہاری نہیں ــ میں نے اسے اپنا خونِ جگر دے کر پالا ہے ـ

تہمینہ :- بابا مجھے یہاں سے لے چلو ــ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔

نفیسہ :- (ملتجانہ) نہیں تہمینہ نہیں ــ رضا خدا کے لئے اسے مت لے جاؤ۔ یہ اگر چلی جائے گی تو میرا دامن خالی ہو جائیگا۔ میں نے اس کے لئے دکھ جھیلا ہے۔ ہر قربانی دی ہے ـ

تہمینہ :- بابا ــ ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ اپنے ہر دکھ ہر قربانی کی قیمت وصول کرتی ہیں۔

نفیسہ :- تہمینہ، تہمینہ، یہ تو کہہ رہی ہے ــــ جیسے ــــ جیسے (چلا کر) اچھا جا ــــ چلی جا میری نظروں سے دور ــــ رضا تم سمجھ رہے تھے میں بدل گئی ــ دیکھو میں پھر وہی جاہل اینٹھ نفیسہ بن گئی ہوں ــــ تم جب آتے ہو مجھ سے میرا کچھ چھین کر ہی لے جاتے ہو۔ اب کبھی میری زندگی میں مت آنا۔ کاش تم نے کبھی مجھے، میرے لئے چاہا ہوتا ــــ ہمارا سنجوگ ہی غلط تھا رضا ــــ پہلی بار میں تمہارے معیار پر نہیں اتری ــــ دوسری بار تم میری نظروں سے گر گئے۔

(صوفے پر گر کر سسکنے لگتی ہے۔ رضا تہمینہ کو لئے چلا جاتا ہے۔ جاتے جاتے دروازے کے پاس رک کر ـ دونوں پلٹ کر نفیسہ کو دیکھتے ہیں جو منہ چھپائے رو رہی ہے ــــ پھر دھیرے سے پلٹ کر چلے جاتے ہیں ـ

سکندر علی وجد

مخدوم کی یاد میں

اے صبا، غنچۂ امید کھلا آخرِ شب — اس نے بخشی غمِ ہجراں کی دوا آخرِ شب
دل میں تھا شام سے طوفانِ تمنا برپا — بارے مقبول ہوا حرفِ دعا آخرِ شب
راہ تاریک میں روشن ہیں ستاروں کی طرح — آنے والے ترے نقشِ کفِ پا آخرِ شب
گرم رفتار سے ملبوس کی خوشبو مہکی — خوب دمکی ترے ہاتھوں کی حنا آخرِ شب
دن میں الفاظ کی تقدیر نہ جاگی لیکن — اس نے چپکے سے کہا مان لیا آخرِ شب
احتیاطوں کا حجابوں کا چلن ختم ہوا — رنگ لائی ہے مئے ہوش رُبا آخرِ شب
ایک لحظے میں ہوئی دولتِ کونین عطا — کام آئی ہے تری لغزشِ پا آخرِ شب
پھر کبھی سو نہ سکا چین سے وہ شیدائی — جس نے دیکھی تری مستانہ ادا آخرِ شب
آج شاداب و معطر ہے مرا ویرانہ — کھل کے برسی تری زلفوں کی گھٹا آخرِ شب
تو اندھیرے میں مثالِ مہِ نو آیا تھا — بدر بن کر مرے پہلو سے نہ جا آخرِ شب
کون تھا ہوش میں، یہ کون بتا سکتا ہے — کون محفل سے گیا، کون رہا آخرِ شب
بادۂ شوق سے لبریز ہے مینائے غزل — لفظ کو نطق کا اعجاز ملا آخرِ شب

وجدؔ، مخدوم کی یادوں کے چمن میں اب تک
گونجتی ہے طرب انگیز نوا آخرِ شب

جگن ناتھ آزاد

یوں اک سبق مہر و وفا چھوڑ گئے ہم
ہر راہ میں نقشِ کفِ پا چھوڑ گئے ہم

دنیا ترے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم
اک حسنِ بیاں حسنِ ادا چھوڑ گئے ہم

ماحول کی ظلمات میں جس راہ سے گزرے
قندیلِ محبت کی ضیا چھوڑ گئے ہم

بیگانہ رہے دردِ محبت کی دوا سے
یہ درد ہی کچھ اور سوا چھوڑ گئے ہم

تھی سامنے آلائش دنیا کی بھی اک راہ
وہ خوبیٔ قسمت سے ذرا چھوڑ گئے ہم

اک حسن دکن تھا کہ نگاہوں سے نہ چھوٹا
ہر حسن کو ورنہ بخدا چھوڑ گئے ہم

قطعہ

کمالِ نقد و متاعِ نظر پہ ناز نہ کر
یہ دورِ بے ہنری ہے ہنر پہ ناز نہ کر

خرد رسا ہو کہ ہو نارسا ہے ایک سی بات
جو باخبر ہے دلِ باخبر پہ ناز نہ کر

ہوائے سرد کو دیکھ اے ذرا سے شعلۂ دل
متاعِ سوز و متاعِ شرر پہ ناز نہ کر

گلزار زتشی دھلوی



گلدستۂ تہذیب چمن بن کے رہے ہیں
ہر دور میں ہم نازِ وطن بن کے رہے ہیں

مٹ مٹ کے اُبھرتی رہیں قسمت کی لکیریں
ہم وقت کے ماتھے پہ شکن بن کے رہے ہیں

گو سیپ میں گنگا کی رہے قطرۂ نیساں
بازار میں ہم درِّ عدن بن کے رہے ہیں

ہے دل کی گپھاؤں میں سجا نقشِ اجنتا
دلّی میں بھی ہم حسنِ دکن بن کے رہے ہیں

گو شوق نے باندھی ہیں دستارِ فضیلت
ہم خونِ تمنّا کا کفن بن کے رہے ہیں

حیرت زدہ برسوں سے رہی وادیٔ تاتار
ہم ہند میں بھی مشکِ ختن بن کے رہے ہیں

ہر حال میں رکھی ہے نظر چال پہ ہمدم
ہم اپنے بزرگوں کا چلن بن کے رہے ہیں

دس پشت سے تزئین زباں کام ہے اپنا
ہر دور میں ہم جانِ سخن بن کے رہے ہیں

جب جب بھی کبھی یاد حسیں آئی لبوں پر
ہر موڑ پہ ہم مردِ حسن بن کے رہے ہیں

ہر صبح بنے شانۂ روزلفِ بتاں ہم
ظلمات میں سورج کی کرن بن کے رہے ہیں

سو جان سے قربان ہوئے لالہ و نسریں
ہم ایسے گلِ دشت و دمن بن کے رہے ہیں

ہوں کوثر و تسنیم ادب جس پہ تصدّق
وہ جلوہ گہ گنگ و جمن بن کے رہے ہیں

قربان ہوئی روح کسی جسم پہ جب سے
ہم شعر میں خوشبوئے بدن بن کے رہے ہیں

مانا کہ زمانہ ملا ہم کو متفقی
ہم روحِ ادب نازشِ فن بن کے رہے ہیں

اس سانس کے مانند جو اندر ہے نہ باہر
سینے میں غریبوں کے گھٹن بن کے رہے ہیں

صدقہ میں محبت کے شبِ ماہ میں ہم لوگ
چاند اور چکوری کا ملن بن کے رہے ہیں

کچھ حق میں ہیں یا غیر سے کچھ اپنے مخالف
ہم شہر میں موضوعِ سخن بن کے رہے ہیں

دیتے رہے منزل کا پتہ راہبروں کو
گلزار میں ہم سرو و سمن بن کے رہے ہیں

مظفر شاہجہاں پوری

نہ جانے کون نگاہوں سے ناگہاں گزرا
نظر سنبھل نہ سکی برق کا گماں گزرا

وہ سامنے رہے جب تک کرن کرن تھی نگاہ
وہ چھپ گئے تو زمانہ دھواں دھواں گزرا

غلط نگاہیٔ جاناں کا ایک لمحہ تھا
خطا جو کر کے مجھے کیف جاوداں گزرا

بس اتنا یاد ہے برقِ جمال ٹوٹ پڑی
کوئی بتاؤ کہ یہ حادثہ کہاں گزرا

نہ ان کے ساتھ سہی ان کی یاد ہی میں سہی
کوئی نفس بھی میرا رائیگاں کہاں گزرا

کچھ اجتناب توجہ طلب ہی کیا کم تھا
کہ التفاتِ گریزاں بلائے جاں گزرا

وفا کی مار پڑے اُن سُبک مزاجوں پر
مرا خلوصِ وفا بھی جنہیں گراں گزرا

قفس میں پھول کھلے جب بہار کا جھونکا
قریب سے لئے خوشبوئے آشیاں گزرا

تڑپ کے دل نے کہا خیر ہو نشیمن کی
نظر سے جب کہیں اڑتے ہوئے دھواں گزرا

بہت کیا جو دعا نے تو ہاتھ اٹھوائے
عمل اٹھا تو ستاروں کے درمیاں گزرا

زمینِ کوچۂ جاناں پہ پڑ رہے تھے قدم
کہ میرے پاؤں کے نیچے سے آسماں گزرا

یہ امتیاز مظفرؔ تجھے مبارک ہو
کہ بزم میں وہ تجھی سے کشاں کشاں گزرا

عشرت جالندھری

ہمارے گھر میں کچھ ایسی بلائیں آتی ہیں
جنہیں نجات کی ساری دعائیں آتی ہیں
وقارِ عشق نے مجبور کر دیا ورنہ
ہمیں بھی آپ کے جیسی ادائیں آتی ہیں
مرا قیام اِک ایسے چمن میں ہے کہ جہاں
بہار آئے نہ آئے خزائیں آتی ہیں
اگر چلو تو مجسّم چراغ بن کے چلو
کہ راستے میں اندھیری گپھائیں آتی ہیں
قدم نہ گھر سے نکالا کہ رہ گئے گھر کے
اِدھر سے جام اُدھر سے گھٹائیں آتی ہیں
مری نگاہ نے چھیڑا تھا ایک دن نغمہ
ترے بدن سے ابھی تک صدائیں آتی ہیں
کبھی رہے جو مرے حق میں گلفشاں عشرت
اب اُن لبوں پہ فقط بد دعائیں آتی ہیں

گرد بن جاؤں بکھر جاؤں ہوا ہو جاؤں
اب یہی سوچ لیا ہے کہ فنا ہو جاؤں

کس طرح تیز کروں اپنے بدن کی کرنیں
کس سے ٹکراؤں کہ خورشید نما ہو جاؤں
زندگی ہے کسی معشوق کا چہرہ تو نہیں
اس میں کیا بات ہے ایسی کہ فدا ہو جاؤں
وہ مرے قرب سے بیزار نظر آتا ہے
لیکن اتنا بھی نہیں ہے کہ جدا ہو جاؤں

جسم کے بوجھ نے مفلوج بنا رکھا ہے
ورنہ وہ جست لگاؤں کہ خدا ہو جاؤں
رات بھر دن کی تمنا میں کراہوں عشرت
دن نکلتے ہی گرفتارِ بلا ہو جاؤں

مظفر حنفی



پھر برف کی چوٹی سے اُگی آگ مرے بھائی
زنجیر ہلاتی ہے ہوا، جاگ مرے بھائی

فردوس کی تخلیق میں اُلجھے ہیں مرے ہاتھ
لپٹا ہے مرے جسم سے اک ناگ مرے بھائی

پرچھائیاں دم سادھے ہوئے رینگ رہی تھیں
گرتے ہوئے پتوں نے کہا بھاگ مرے بھائی

فرصت ہی کسے ہے کہ سُنے پیار کے نغمات
تو نے بھی کہاں چھیڑ دیا راگ مرے بھائی

آ اور قریب اور قریب اور قریب آ
باقی نہ رہے اور کوئی لاگ مرے بھائی

کہتے ہیں در توبہ ابھی بند نہیں ہے
اس بات پہ بوتل سے اُٹھے کاگ مرے بھائی

کل تک تو مظفر نے غزل اوڑھ رکھی تھی
اب کون سمیٹے گا یہ کھٹراگ مرے بھائی



جتنے عرصے میں نیا تیر کماں تک جائے
چیخنا ہے مری آواز جہاں تک جائے

تشنگی خاک اڑاتی رہی خوش فہمی کی
شاید آوارہ ہوا آبِ رواں تک جائے

اک وسیلہ نکل آئے تری شادابی کا
درد کی نہر اگر قریۂ جاں تک جائے

چاہتا ہوں کہ قدم جادہ بہ جادہ بھٹکیں
کوئی جادہ نہ کسی جائے اماں تک جائے

تیری قسمت میں اندھیروں کے سفر لکھے ہیں
دُوج کا چاند ترے ساتھ کہاں تک جائے

سر میں سودا ہے تو وہ دن بھی کوئی دور نہیں
سربلندی کی طلب نوکِ سناں تک جائے

اے مظفر تجھے غزلوں میں بھی سچ کہنا ہے
خواہ سچ کہنے کے ثمرے میں زباں تک جائے

ممتاز راشد



تو پریشاں نہ ہو اک پل میں بکھر جاؤں گا
میں ہوں جھونکا ترے کوچے سے گذر جاؤں گا

یوں تو میں ہوں کسی بہتے ہوئے دریا کی طرح
تو اگر مجھ کو پکارے گا، ٹھہر جاؤں گا

تو فرشتوں کے تصور میں مرے پاس نہ آ
میں ہوں انساں تری نظروں سے اُتر جاؤنگا

میں وہ مٹی ہوں جو ہے چاک کی گردش میں اسیر
تو اگر ہاتھ لگا دے تو سنور جاؤں گا

جب سے وہ بچھڑا ہے یہ سوچ رہا ہوں راشد
اس بھرے شہر میں تنہا میں کدھر جاؤں گا



جھیل میں چاند نظر آتی تھی حسرت اُس کی
کب سے آنکھوں میں لئے بیٹھا ہوں صورت اُسکی

ایک دن میرے کناروں میں سمٹ جائے گی
ٹھہرے پانی سی یہ خاموش محبت اُس کی

بند مٹھی کی طرح وہ کبھی کھلتا ہی نہیں
فاصلے اور بڑھا دیتی ہے قربت اُس کی

کس نے جانا ہے بدلتے ہوئے موسم کا مزاج
اس کو چاہو تو سمجھ پاؤ گے فطرت اُس کی

بے خبر ہے جو مرے حال سے کیا اُن کو پتہ
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہے قسمت اُس کی

ڈر یہ ہے روک نہ لے سود و زیاں کا احساس
کہیں دیوار نہ بن جائے ذہانت اُس کی

سیّد ظہیر

خیال و خواب کے تیشے کو مختصر کر دے
مجھے بھی تجھ سا بنا دے ذرا جگر کر دے

طلب کی راہ میں دشواریاں ہزاروں ہیں
ہماری پیاس کو دریا کی ہم سفر کر دے

مری طرح کے کئی لوگ سرخ رو ہوں گے
سرِ عزیز کو تلوار کا ثمر کر دے

مرض کے روپ میں پایا ہے ارمغانِ حیات
علاج ہو نہیں سکتا کہ چارہ گر کر دے

قیام، محلِ وقوعہ ہے شکستہ پائی کا
کوئی بھی سمت ہو، چل نکل، سفر کر دے

زوال کا بھی زمانہ وہیں سے چلتا ہے
سحر سحر نہ ہوئی دوپہر اگر کر دے

ظہیر دور رہے گا لطیف کی صورت
بلا کے پاس بٹھا، شخصیت صفر کر دے

پانی کی سطحِ خاک پہ تحریر کھنچ گئی
اے زندگی خوشا، تری شمشیر کھنچ گئی

پٹری پہ آنکھ بند کئے میں پڑا رہا
آتی ہوئی ٹرین کی زنجیر کھنچ گئی

کس کی طرف تھا، یہ بھی نہ معلوم ہو سکا
روئے سخن پہ جلسۂ تقریر کھنچ گئی

ننگے بدن کا سامنا کل رات کیا ہوا
سبزے کے لہلہانے کی تصویر کھنچ گئی

سورج اُٹھا رہا تھا جہاں اپنی دھوپ کو
سایوں کے رُخ پہ چادرِ تنویر کھنچ گئی

قمر اقبال



مرنے والوں کو تو زندہ کر گیا
خود مسیحا کس خوشی میں مر گیا

حادثے ہر راہ میں تھے منتظر
کیا کہوں ہر رات کیسے گھر گیا

وقت بھی لمحات کا ٹھہراؤ ہے
لمحہ لمحہ چھو کے اک پتھر گیا

اب رہا کیا دیکھنے کے واسطے
ہیں وہی آنکھیں مگر منظر گیا

اپنے ہی گھر پر پہنچ کر بارہا
دے کے دروازے پہ دستک ڈر گیا

آہٹوں میں گفتگو کی عمر بھر
سامنے سے وہ مرے اکثر گیا

شہر کو جل کر ہوئی مدت قمر
کیوں یہ آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا

منشاء الرحمٰن منشا



جفائیں کر کے ثبوتِ وفا بھی دیتا ہے
وہ دوستی کا کرشمہ دکھا بھی دیتا ہے

پڑا ہے پالا اس اک یارِ طرحدار کے ساتھ
جو درد ہی نہیں اس کی دوا بھی دیتا ہے

خفا تو ہوتا ہے سن کر مرا فسانۂ دل
نظر جھکا کے مگر مسکرا بھی دیتا ہے

وہ بزمِ خلوت و جلوت میں یاد آ آ کر
امید و یاس کے جھگڑے چکا بھی دیتا ہے

بصد حجاب مری روح میں سماتے ہوئے
تعینات کے پردے اٹھا بھی دیتا ہے

ستا ستا کے بہت توڑتا ہے دل لیکن
شکستہ خاطری میں حوصلہ بھی دیتا ہے

جو خونِ آرزو رہ رہ کے کرتا ہے منشا
اسے نہ جانے کیوں دل دعا بھی دیتا ہے

ذکیہ سلطانہ نیّر

ترے اندازِ تغافل پہ فدا ہیں کتنے
نہیں معلوم شہیدانِ صدا ہیں کتنے

ہر قدم قیدیِٔ گیسوئے رسا ہیں کتنے
کس سے پوچھیں کہ گرفتارِ بلا ہیں کتنے

ترے الطاف کا دیوانہ تو اک عالم ہے
ترے اندازِ تغافل پہ فدا ہیں کتنے

ابھی چل جائے گا طوفاں کے تلاطم کا پتہ
ناخدا کتنے ہیں، کشتی میں خدا ہیں کتنے

جب یہ عالم ہے تو منزل پہ پہونچنا معلوم
کارواں ایک سہی راہ نما ہیں کتنے

خار یہ راہ میں ہر گام پہ کرتے ہیں سوال
آبلے پاؤں کے ہم رنگِ حنا ہیں کتنے

شکوۂ اہلِ جفا عشق میں برحق لیکن
دیکھنا یہ ہے شہیدانِ وفا ہیں کتنے

جو رہِ عشق میں ہر ذرہ کو گلزار کریں
اس بیابان میں وہ آبلہ پا ہیں کتنے

جس کو دیکھو اسے دعوئ خدائی ہے یہاں
یا الٰہی مری دنیا میں خدا ہیں کتنے

چشم و دل میں ہیں بسے دور ہیں پھر بھی ہم سے
کتنے وہ پاس ہیں اور ہم سے جدا ہیں کتنے

تو اگر موجِ صبا ہے تو کھلا دے اُن کو
بِن کھلے پھول گلستاں میں صبا ہیں کتنے

یہ تو ٹوٹے ہوئے تاروں کو بھی معلوم نہیں
ساز اس بزم میں محرومِ صدا ہیں کتنے

ہر گھڑی محو ہیں ہم ان کی طلب میں نیّر
لٹے ہم عشق میں مدہونِ دعا ہیں کتنے

نظام الدین نظامؔ



دوست اِک اپنا نہیں ہے یار سب کا بن گیا
پھول سے نکلا تو وہ خوشبو کا جھونکا بن گیا

ذہن کے پردے پہ جب منظر کھلونا بن گیا
یوں ہوا کہ خود تماشائی تماشا بن گیا

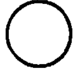
خون آنکھوں میں اُتر آیا تو بستی کیلئے
جاگتے آتش نشاں کا سُرخ لاوا بن گیا

درد کی شدّت سے سر میں خوف کی آندھی چلی
شاخ سے پتّہ گرا جیسے دھماکہ بن گیا

اُس سے دن میں بھی ملاقاتیں ہوا کرتی ہیں اب
وہ ہماری جاگتی آنکھوں کا سپنا بن گیا

یہ ہماری بد دماغی اور وہ اس کا غرور
"میرؔ کا دیوان" ملنے کا بہانہ بن گیا

پا کے انٹرویو کا لیٹر یوں لگا مجھ کو نظامؔ
لبندِ بے در میں جیسے ایک رستا بن گیا



عکس در عکس سلسلہ کیا ہے
ایک چہرے پہ دوسرا کیا ہے

پوچھ، اِک دن زبان والوں سے
لمس کی مئے کا ذائقہ کیا ہے

ہے ہواؤں کے ٹوٹنے کا ثبوت
اور جلتا ہوا دیا کیا ہے

دِل سے ملتی ہے بھیک اشکوں کی
آنکھ کشکول کے سوا کیا ہے

کیسی منزل کہاں کا رختِ سفر
راہ زن کون رہ نما کیا ہے

تیری صورت ہے میری آنکھوں میں
عکس پانی میں چاند سا کیا ہے

آؤ اِک دن تلاش کرتے ہیں
آسمانوں کے پار کیا کیا ہے

شعر ہے یہ کہ آرزو دل کی
قافیہ ہے کہ مُدعا کیا ہے

عتیق احمد عتیق

دل و نگاہ کی ساری لطافتیں بھی گئیں
بصیرتوں کی طلب میں بصارتیں بھی گئیں

گئے دلوں کی جہاں تک امانتیں بھی گئیں
نئی رتوں کی مہکتی بشارتیں بھی گئیں

سماعتوں کی فصیلیں تو پھاند آئی صدا
کبھی حصارِ صدا تک سماعتیں بھی گئیں!

مری کتھا جو گئی تا دیارِ شیشہ و سنگ
لہو لہان دلوں کی حکایتیں بھی گئیں

ہرا بھرا مجھے رکھتی تھیں جو ہر اک رُت میں
وہ شاخسار بدن کی حرارتیں بھی گئیں

غزل کا صدیوں پرانا لباس یوں بدلا
کہ فکر و فن کی مہذّب روایتیں بھی گئیں

بنامِ درد مرے دل کو جو میسّر تھیں
عتیقؔ اب تو وہ بے نام راحتیں بھی گئیں

خیالؔ انصاری مالیگانوی

کوئی بھی دَور ہو یہ کتابوں میں نظم ہے
عیسیٰ کے بخت میں تو صلیبوں کا زخم ہے

خود ساختہ رسولوں کی اک بھیڑ ہے یہاں
سچ یہ کہ سلسلہ ہی نبوت کا ختم ہے

اِتراؤ یوں نہ شوخ بدن کے کٹاؤ پر
اُترا ہے چڑھ کے دریا زمانے کی رسم ہے

ہے کوئی آج جس کو ہو اس بات کا یقیں
ارضِ حیات شوخ ہے خوش رنگ نرم ہے

خود مجھ کو مجھ سے ملنے نہیں دیتی ہے خیالؔ
ہے اینٹ گھر کی یا نگراں کوئی چشم ہے

محبوب راہی

اپنا افسانہ زمانے کی حکایات لکھوں
جی میں آتا ہے کہ اب کوئی طلسمات لکھوں

ظلم کو پیار، جفاؤں کو عنایات لکھوں
اشکِ خوں پی کے مسرت بھرے نغمات لکھوں

شیشۂ ربط کے چٹخ جانے کا اندیشہ ہے
رشتوں ناطوں پہ اگر اپنے خیالات لکھوں

کربِ پنہاں کو کہوں تحفۂ اخلاص و وفا
زخمِ خنداں کو ترے پیار کی سوغات لکھوں

ماہِ کامل میں کہوں عارضِ رنگیں کو ترے
تیری زُلفوں کو اماوس کی سیہ رات لکھوں

مصلحت مجھ کو کئے دیتی ہے مجبور کہ میں
آگ کو برف لکھوں، دھوپ کو برسات لکھوں

لا نہیں پائے گا صدیوں میں کوئی جن کا جواب
صفحۂ وقت پہ کچھ ایسے سوالات لکھوں

لمحہ لمحہ جو نیا رنگ بدل جاتے ہیں
کیسے نیرنگیٔ رنگینیٔ جذبات لکھوں

گردِ ابہام سے جو پاک ہوں یکسر راہی
ایسے اشعار کہوں ایسی غزلیات لکھوں

ساز عثمانی

معاشرے میں جو اونچا دکھائی دیتا ہے
وہ شخص کیوں مجھے چھوٹا دکھائی دیتا ہے

جب اپنی بیٹی کا چہرہ دکھائی دیتا ہے
تو ذوقِ زیست لرزتا دکھائی دیتا ہے

کسی کی یاد کا سورج طلوع ہوا شاید
مرا وجود پگھلتا دکھائی دیتا ہے

سمندروں کی بھی گہرائی اس پہ ختم ہوئی
جو اپنی فکر میں تنہا دکھائی دیتا ہے

ہر ایک ناک پہ عینک سجی ہوئی کیوں ہے
نہ آئینہ نہ تو چہرہ دکھائی دیتا ہے

اسی کو شاعر و فنکار لوگ کہتے ہیں
جو ٹوٹی قبر کا کتبہ دکھائی دیتا ہے

میں لفظ لفظ سے سورج اُگا رہا ہوں مگر
مرے ہی گھر میں اندھیرا دکھائی دیتا ہے

قلم سے ساز کو ناپو کہ اپنے قد سے مگر
نظر ہے جتنی بس اتنا دکھائی دیتا ہے

شبیر احمد راہی

ہر شخص تہی دست گداگر کی طرح ہے
دل ایک مگر اپنا قلندر کی طرح ہے

ہر دل کو سجا رکھا ہے خواہش کے بتوں سے
اس دور کا انسان بھی آذر کی طرح ہے

یہ سچ ہے کہ نازک ہے بہت شیشہ کی صورت
لیکن وہی دل سخت بھی پتھر کی طرح ہے

کیا چال قیامت کی چلا کرتے تھے کچھ لوگ
اب وقت خود اک فتنۂ محشر کی طرح ہے

جو چاہو وہ کہہ لو مجھے سب کچھ ہے گوارا
وسعت میں مری طبع سمندر کی طرح ہے

دیکھا تو نہیں تجھ کو مگر تیرا تصور
آنکھوں میں مری، نور کے پیکر کی طرح ہے

کیوں ناز نہ ہو مجھ کو مرے حال پہ راہی
قسمت مری، محبوب کے تیور کی طرح ہے

رفیعہ شبنم عابدی

وہ شخص جو طوفان کے سائے میں پلا ہے
اس شخص کی نظروں میں فنا ہے، نہ بقا ہے

کس شام کے بازار میں لائے ہو مجھے تم
بازو ہیں رسن بستہ مگر سر پہ ردا ہے

وہ پیڑ جو کمزور تھا، تنہا تھا چمن میں
وہ پیڑ خزاؤں میں بھی سرسبز رہا ہے

بادل کے گرجنے سے بھی جو دل نہ ڈرا تھا
کلیوں کے چٹکنے سے وہ دل کانپ گیا ہے

سیلاب گلی کوچوں میں آیا تو ہے لیکن
آنگن مرا اس سال بھی سوکھا ہی پڑا ہے

ان بھیگی فضاؤں میں کہیں ڈوب کے ابھروں
شبنم مرے اندر یہ کوئی بول رہا ہے

افتخار امام صدیقی



بس جاؤ کہیں مجھ ہی میں یا مجھ کو مٹا دو
تلوار سی دوری کو مرے سر سے ہٹا دو

شاید اسی صورت سے اندھیروں میں کمی ہو
جو داغ ہیں سینے میں وہ ماتھے پہ سجا دو

تنہائی کے جنگل میں بھٹکنا ہے قیامت
کب تک مجھے اس حال میں رکھو گے بتا دو

رکھ دو کسی تپتے ہوئے صحرا پہ قدم تم
جذبات کے شعلوں کو بھڑکنے کی ادا دو

یوں سنگِ ملامت سے تو حاصل نہیں کچھ بھی
گر میں ہوں خطاوار مجھے کوئی سزا دو

خان ارمان



بے حسی کی فصل، خوابیدہ شجر دیکھے گا کون
ایک ہی جیسا سماں، آٹھوں پہر دیکھے گا کون

نیم جاں قدموں تلے، مٹی بہت زرخیز ہے
ذرّے ذرّے کا کلیجہ، چیر کر دیکھے گا کون

بے نیازی شرط ٹھہری، رشتۂ جاں کے لئے
میرے اُس کے درمیاں، تارِ نظر دیکھے گا کون

انگلیاں گھائل ہیں اس کی، خطا دھوا ہے مگر
خون کی تحریر ہے، زیر و زبر دیکھے گا کون

دُکھ تیری میراث ہے، لے، اب میں اندھا ہو گیا
تیری پامالی کے دن، جانِ پدر دیکھے گا کون

فاروق شمیم



تشنگی اور بھی بڑھائے گی
ریت پانی کو آزمائے گی

چیختا ہی رہے گا سناٹا
وقت کی نبض ڈوب جائے گی

اس کو دیکھا تو کب یہ سوچا تھا
نیند آنکھوں سے روٹھ جائے گی

زندگی بخشتی ہے آج ہوا
کل مری خاک بھی اڑائے گی

ہونٹ سی لوں تو میری خاموشی
پھر اچھوتا خیال لائے گی

زندگی تجھ کو کیسے پہچانوں
روپ کتنے تجھے دکھائے گی

روشنیوں کا ہے سفر یہ شمیم
یعنی پرچھائیں بھی ڈرائے گی

عبدالاحد ساز



عُمر کی فصیلوں تک، کہکشاں کے ٹیلوں تک
بے کسی ہے برسوں تک، بے بسی ہے میلوں تک

پھر فضائے معنی ہے بے کراں خدا صورت
ہیتوں کی انجمن ہے لفظ کے وسیلوں تک

رُوح کے مسافر کو تشنگی ہی راس آئے
لَوٹ آئے ہم جا کر جسم کی سبیلوں تک

اِرتقا ہے تدریجِ شرحِ کربِ آگاہی
آرزو کی قوموں سے یاس کے قبیلوں تک

ذہن کے رسولوں کو جانے کب بشارت ہو؟
ہر 'وحی' معلق ہے دل کے جبرئیلوں تک

شرطِ قربِ لیلیٰ کی پھر وہی جنوں ٹھیری
عشق اپنا قانع سا تھا خِرد کے حیلوں تک

پشت پر لیے شیطاں، گمرہانِ فن پہنچے
درد کی بہشتوں تک، غم کی سلسبیلوں تک

کھر کھر شیشے کی سنگلاخ دیواریں
فِکر آنکھ پھوڑ آئی ذہن کی فصیلوں تک

ساز! شعر کی دھن میں ہم کہاں نہیں پہنچے
ہم نے کیا نہیں باندھا یعنی جبرئیلوں تک

سعید طارق



وہ جو عادت سی ہے اَن بَن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے
لطافت ہے کہ اپنا پن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے

نہ میں دنیا سے خوش اور نہ یہ دنیا ہے خوش مجھ سے
مگر امید کا دامن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے

تسلسل بے گماں ہے! اور خلیجِ نا بیانی پھر ــــــ
یہ کہتا ہے کہ حسنِ ظن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے

کم آمیزی، مگر جاگے تو پھر یکسر ہم آمیزی
طبیعت کا یہ سادہ پن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے

مرا بھی علم ہے، کیا شہر کی ہوتی ہے گل کاری!
ارادے کا مہکتا بن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے

وہی رفتار کا جادو — وہی لہجے کی نایابی!
وہی رجحانِ رقصِ فن نہ میں چھوڑوں نہ وہ چھوڑے

ارتضیٰ نشاط



وقت قبرستان لگتا ہے مجھے
اور سب ویران لگتا ہے مجھے

فائدہ نقصان لگتا ہے مجھے
خواب تک عرفان لگتا ہے مجھے

آسماں مریخ تک جانے کے بعد
چائے کی دوکان لگتا ہے مجھے

میں کہاں ہوں کون ہوں کیا حال ہے
دور تک میدان لگتا ہے مجھے

آنکھ رکھوا دوں گا اپنی بینک میں
دید کا اِمکان لگتا ہے مجھے

ایک ذرّہ بے حسی کی سوچ کا
سُرخ ریگستان لگتا ہے مجھے

رفیق جعفر

کسی پتھر، کسی پیکر میں نہ ڈھالو اِس کو
زندگی چیخ سہی پھر بھی سنبھالو اِس کو

اشک پلکوں ہی پہ ٹھہرا تو قیامت ہوگی
ہو سکے تم سے اگر یہ تو بہا لو اِس کو

دِل تو دیوانہ مزاجی کا بھرم رکھے گا
جتنا جی چاہے تمھیں اتنا ستا لو اِس کو

چین کی نیند محبت میں کہاں ملتی ہے
میری مانو تو کِسی طرح نبھا لو اِس کو

دل ہے، یہ حُسن کی گلیوں میں بھٹک جائیگا
دوستو اِس کی تباہی سے بچا لو اِس کو

یہ جو حسرت ہے تمھیں میرا جہاں پانے کی
میں یہ کہتا ہوں کہ تم دل سے نکالو اِس کو

راز نفرت کا نہیں، راز ہے الفت کا رفیق!
جب بھی جی چاہے شرافت سے اچھالو اِس کو

تنویر عالم جلگانوی

روشنی سے جسارتیں لے کر
سائے نکلے جسامتیں لے کر

ذات میں اپنی لوٹ آیا ہوں — شہر بھر سے بصارتیں لے کر
شخصیت ہے کُھلی کتاب میری — ہاں مگر، کچھ علامتیں لے کر
تیری محفل سے لوٹ آیا ہوں — اپنی متروک عادتیں لے کر
خود کو پھر ڈھونڈنے میں نکلا ہوں — بے سبب سی عداوتیں لے کر
رنگ بھر دو نئی کہانی میں — کچھ پرانی حکایتیں لے کر
"میں نے تکمیلِ ظلم دیکھی ہے" — آسماں سے بصارتیں لے کر
تُو خدا ہے تو ڈھونڈ لے مجھ کو — میری روشن عبادتیں لے کر
خود کو بہلانے گھر سے نکلا ہوں — اَن کہی سی کہاوتیں لے کر
آج چاہو تو ناپ لو خود کو — مجھ سے میری جسارتیں لے کر

نئے لہجے کے ساتھ آیا ہوں
تلخیوں میں حلاوتیں لے کر

کنیز انجم



نظر سے چھو کے بدن آب آب کر دے گا
وہ سانس سانس کو میری شراب کر دے گا

لکھا کرے گا حکایات دل اگر یوں ہی
بدن کو میرے وہ اک دن کتاب کر دے گا
کہاں کی اب کے برس سرکشی ہواؤں میں ہے
کلی کلی کو یہ جھونکا گلاب کر دے گا
وہ دور ہوگا تو آنکھوں سے دور ہوں گے خواب
وہ پاس ہوگا تو خوابوں کو خواب کر دے گا
کسے ہی جاتا ہے تارِ بدن خیال اُس کا
وہ انگ انگ کو چھو کر رباب کر دے گا
سکوں ملا نہ کسی اور کی رفاقت میں
یہ جرم بھی مرے نام انتساب کر دے گا
میں اُس کے سامنے کیا دفترِ گلہ رکھوں
بس اک ہنسی میں وہ سارا حساب کر دے گا

وہ آفتاب ہے انجم میں ذرۂ ناچیز
بس اک نظر میں مجھے ماہتاب کر دے گا

شبانہ سحر



بھیک کرتے ہیں طلب شام و سحر کس کس سے
رات دن چھپتے ہیں یہ دست نگر کس کس سے

اجنبی ہم کو کہا کرتے ہیں اہلِ دنیا!
ہم کریں عہد وفا آج مگر کس کس سے

کیا کہیں رستے ہوئے زخم تمنائے حیات
ہم نے پائے ہیں سرِ راہ گذر کس کس سے

اپنے حالات کے ماحول سے یا دنیا سے
آج تک الجھے ہیں اربابِ نظر کس کس سے

زندگی نام کی نسبت سے بڑی بھاری ہے
غم کے سائے میں بسر ہوگی مگر کس کس سے

چھوڑ کے مٹتے ہوئے خواب تمنا کے نقوش
رات رخصت ہوئی ہنگامِ سحر کس کس سے

کام آتا ہے شبانہ نہ کسی کے کوئی!
حال ہم اپنا کہیں بار دگر کس کس سے

ساغر نظامی

اُردو

تہذیب نہیں اک دن کا مل صدیوں میں کنول یہ کھلتا ہے
نسلیں خاکستر ہوتی ہیں تب جا کے یہ گوہر ملتا ہے

اک دل کی نہیں اے موجدِ نوایجاد کے سینے کی دھڑکن
صدیوں میں مرتب ہوتا ہے کہتے ہیں جسے شیرازۂ فن

انساں کی عقیدت صدیوں تک اس بت کو تراشا کرتی ہے
تب اس کے خال و خد میں کہیں اک مبہم شکل ابھرتی ہے

سو خونِ تمنا ہونے پر دادِ گل کاری ملتی ہے
بے گنتی دل ہوتے ہیں لہو، تب جا کے شفق یہ کھلتی ہے

اربابِ غنا احساسِ غنا کو خونِ دل میں ڈبوتے ہیں
آواز کے نغمہ بننے تک سو ساز شکستہ ہوتے ہیں

اس کوہِ گراں کے کٹنے تک لاکھوں فرہاد کچلتے ہیں
سو جوئے خوں بہہ چکتی ہیں جب دودھ کے دھارے چلتے ہیں

مدت کی عرق ریزی سے کہیں تہذیب کا سانچہ ڈھلتا ہے
پھر اس میں رنگ ابھرتے ہیں پھر اس میں نطق مچلتا ہے

تہذیب عطا کرتی ہے زباں خاموش و گنگ زمانے کو
دیتی ہے حقیقت کا درجہ ہر افسوں اور افسانے کو

پینے بھی نہیں پاتے میکش احساس ہی میں کھو جاتے ہیں
یہ جام نہیں آتا لب تک اور دور کئی ہو جاتے ہیں

نقاد، قلم کار اور صوفی نقاش صناعت کے ماہر
رقاص، مصور اور مطرب بت ساز مغنی اور شاعر

سب اپنا کمالِ فن کاری تہذیب پہ قرباں کرتے ہیں
تب جا کے گھور اندھیرے میں اک شمع فروزاں کرتے ہیں

تہذیب کی قیمت کے آگے کچھ قیمتِ تاج و تخت نہیں
اس کو نہیں ملتا یہ چشمہ جو قوم سکندر بخت نہیں

ہم آہنگی سے دیر و حرم کی سازسے جو نغمہ پھوٹا
میدانِ حیات میں مل جل کر پرواز سے جو نغمہ پھوٹا

قرآن، پران اور ویدوں کی تعلیم سے جو تادیب ابھری
تسنیم و گنگا سے مل کر اس دیش میں جو تہذیب ابھری

اُردو ہے اسی تہذیب کی جاں اُردو ہے اسی تہذیب کا دل
صدیوں کے تعین کا ثمرہ، مدت کی محبت کا حاصل

ویدانت کے بادۂ عرفاں کا اک نور بھرا پیمانہ ہے
اسلام کے خلقِ اکبر کا اک حق میں افسانہ ہے

عربوں کی حکمت کا دفتر، ایراں کی نزاکت کا ساغر
مغرب کے تفکر کا جوہر، بھارت کے درشن کا ساگر

زمزم کے کٹوروں میں جل ہے گنگا کے مقدس دھاروں کا
آفاقِ حرم کی جھرمٹ ہے یا گوکل کے مہ پاروں کا

سادھو کا سکوتِ لاہوتی، رندوں کی صدائے رندانہ
عاشق کی نوائے رنگیں ہے باغی کا نعرہ مستانہ

پنجاب کی ہیروں کا یہ بیاں کشمیر کے لالہ رخوں کی زباں
پارس کی حسینوں کی بولی گلشن کے بتوں کا نغمہ جہاں

احیائے دہر کی یہ ضامن، تفسیر کعبہ اقلیٰ سے ہوئی
اعجازِ مسیحا اس نے کیا، تبلیغ کلیسا اس سے ہوئی

اس کی مہکار، اس کی چہکار، اس کی گنجار، اس کا نغمہ
جنگل جنگل، بستی بستی، دریا دریا، صحرا صحرا

موجوں میں بھی ہے رجز کناں، میداں میں بھی ہے شور فشاں
شمعِ محفل، برقِ میداں، بازار کی جاں، محلوں کی زباں

وہ ساحلِ راس کماری ہو، کنولوں سے پٹا یا دامنِ ڈل
وہ کونسا منظر ہے کہ جہاں، چھیڑا نہیں اس نے سازِ غزل

ہر موڑ پہ اس کے رجزوں سے جنگِ آزادی گونجی ہے
اک گاؤں نہیں دو گاؤں نہیں، پوری آبادی گونجی ہے

یہ زندانوں میں گونجی ہے، یہ ویرانوں میں گونجی ہے
مشکل تھی جہاں اک جنبشِ لب، اُن ایوانوں میں گونجی ہے

انگریز کی نوکِ سنگیں پر اردو نے کلیجہ رکھا ہے
ہر لفظ تڑپ کر اردو کا خوں کے دریا میں کھیلا ہے

مجبور کے سینے کی دھڑکن، مزدور کی آہِ شعلہ فشاں!
بچوں کی زباں، بوڑھوں کی زباں، پیاسوں کی زباں بھوکوں کی زباں

اور آج بھی اس کے نغموں سے ہر ساز میں اک ہنگامہ ہے
باغوں میں اس کی باتیں ہیں کھیتوں میں اس کا چرچا ہے

کیا چھ صدیوں کی اک روشن تخلیق جلا دی جائے گی
کیا لاکھوں فنکاروں کی یہ توریث مٹا دی جائے گی

کیا اپنی متاعِ گویائی آنکھوں دیکھے لٹ جائے گی
کیا کھل کر گانے کی حسرت دل ہی دل میں گھٹ جائے گی

کیا میرؔ و غالبؔ اور مومنؔ افسانۂ پارینہ ہوں گے؟
کیا آنکھیں ہوتے اہلِ قلم اردو کے نابینا ہوں گے؟

اسلام کے خلق اکبر کا احسان بھلا دو گے بابا؟
ویدانت کے بادہ عرفاں کو مٹی میں ملا دو گے بابا؟

عربوں کی حکمت کا دفتر کیا آتشِ نو سلگا دے گی؟
بھارت کے درشن کا ساگر کیا بادِ تند سکھا دے گی؟

گنگا کے مقدس دھاروں کو گنگا کے پجاری روکیں گے
کیا گوکل کے مہ پاروں کو جمنا کے پجاری روکیں گے

سادھو کا ساز لاہوتی، سادھو کے ہاتھوں ٹوٹے گا
باغی کے نعروں کی پونجی کیا خود ہی باغی لوٹے گا

صوفی کی صدائے نیم شبی، ہونٹوں میں دبا دی جائے گی
عاشق کی نوائے رنگیں کیا بے رنگ بنا دی جائے گی

بولی ہی نہیں اردو لوگو! تہذیب کا قصرِ سنگیں ہے
معنیٰ کا مرصع رنگ محل، تخئیل کا حوضِ سیمیں ہے

کیا معنیٰ کا یہ رنگ محل، تخئیل کا یہ سیمیں
تادیب کا یہ برجِ سنگیں، تہذیب کا یہ قصرِ رنگیں

کیا ہم نے بنایا تھا یہ محل صدیوں میں ڈھا دینے کیلئے
کیا میرؔ و غالبؔ ابھرے تھے اے دوست! مٹا دینے کیلئے

اردو تہذیب کا تاج محل تعبیرِ محبت ہے یارو
یہ ہند کی قومی وحدت کی مضبوط امانت ہے یارو

اُردو نے خلیج دوری کو اپنے پیکر سے پاٹا ہے
اردو نے ہند کی قوموں کو جامِ توحید پلایا ہے

مُسلم کا اثاثہ ہے اردو ہندو کی وراثت ہے اردو
تقسیم کی نہیں ہو سکتی جو وہ ہند کی دولت ہے اردو

اخلاص کا یہ قصرِ خوشبو، یہ امن ورواداری کا کنول
یہ ایک نئی قومیت، اور یہ حکمتِ نو کا راج محل

کیا حکمتِ نو کا راج محل اور قصرِ نئی قومیت کا
کیا امن و رواداری کا کنول، فردوس وفا و الفت کا
زریں تہذیب کا تاج محل، تعمیر امن و محبت کیا؟
یہ متحدہ قومیت کا مینارِ حسن و صداقت کیا؟
جابر سیلاب حاضر میں تنکے کی طرح بہہ جائیگا
اور وقت کے خونیں دامن پر ہلکا سا نشاں رہ جائیگا

فیضانِ بمبئی

از

علامہ شبلی نعمانی

ترجمہ

عرشی زادہ

["یہاں بمبئی کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا۔ اپالو ایک عجیب سیرگاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے ..... تین چار غزلیں لکھیں جو کبھی آپ کی نظر سے گزریں گی"
مکتوب شبلی بنام مہدی افادی مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۶ء از بمبئی]

ذیل میں مذکورہ بالا فارسی غزلوں کے مضامین و خیالات کو اردو کے جامے میں پیش کیا جاتا ہے قارئین بقول مولانا حالی بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ ان میں ـــ خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے ـــــــ عرشی زادہ

(۱)

بمبئی ستمبر ۱۹۰۶ء

کب تک آلودۂ فکر و غمِ دنیا رہیئے
آج سے مستِ قدح نوشیِ صہبا رہیئے

مدتوں طوفِ حرم کرتے رہے ہیں کچھ دیر
درِ بت خانہ پہ بھی ناصیہ فرسا رہیئے

گرچہ رندی و ہوس شیوۂ فرزانہ نہیں
کیا ضروری ہے کہ فرزانہ و دانا رہیئے

بادہ ہر چند تہ خرقہ بھی پی سکتے ہیں
چشم ساقی کا مگر حکم ہے رسوا رہیئے

کیوں نہ مستانہ و پُر عربدہ آغوش میں لیں
تشنۂ وصل میں کب تک بہ محابا رہیئے

ہے یہ مشکل بہمہ دعویِ تمکین و شکیب
کہ وہ بے پردہ ہو اور آپ بھی ہر جا رہیئے

وصل سے بڑھ کے ہیں وہ جلوے جو دل کہتا ہے — لاکھ ہو جائے سحر محوِ تماشا رہیے
اے خوشا روز کہ یہ راز ہو عالم پہ عیاں — مے پیے خلق کے انبوہ میں رسوا رہیے

ق

محتسب دست بداماں ہو مگر مستی میں — دست در دامنِ محبوب خود آرا رہیے
دامن بمبئی ہاتھوں میں ہے جب تک شبلی — دامن عیش نہ چھوٹے گا شکیبا رہیے

(۲)

بمبئی ستمبر ۱۹۰۶ء

نثارِ بمبئی کیجیے متاع کہنہ و نو کو — طرازِ مسند جمشید و فرِ تاجِ خسرو کو
ہجوم دلبرانِ شوخِ بے پروا ہے وہ ہر سو — گزرنا راستوں سے ہو گیا دشوار رہرو کو
غضب ہے گرمی ہنگامۂ خوباں زردشتی — کیا ہے زلف و عارض میں بہم کیا ظلمت و ضو کو
پلا ساقی، مئے باقی کہ جنت میں نہ پائے گا — کنارِ آب چوپاٹی و گل گشتِ اپالو کو

(۳)

بمبئی ستمبر ۱۹۰۶ء

اُس کے غمزوں نے کیا زندہ جفا کوشی کو — تازگی جلووں نے دی خویش فراموشی کو
دیکھیے معجزۂ حسن کہ وہ نرگسِ مست — کیا بہم کر گئی ہشیاری و مدہوشی کو
اُس بتِ شوخ پہ مرتا ہوں کہ جس نے دمِ وصل — خود سکھایا مجھے اندازِ ہم آغوشی کو
مے کشی وہ بھی بہ اندازۂ پیمانہ و جام — رنگ تو دیکھیے آدابِ قدح نوشی کو
شبلیِ نامہ سیہ گرچہ سراپا ہے گناہ — دامنِ عفو بھی کیا کم ہے خطا پوش کو

(۴)

بمبئی ستمبر ۱۹۰۶

کی ہے جو مدحتِ شیراز و صفاہاں میں نے
شرم آتی ہے کیا ذکر پریشاں میں نے

بمبئی تھی جو مری منزلِ مقصود تو پھر
کیوں رکھا گامِ طلب در رہِ حرماں میں نے

ساغرِ زیست میں تلچھٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا
تھا تو یہ جرعہ جو پہنچایا بہ پایاں میں نے

کچھ تو آخر دلِ خود بیں کا بھی کہنا کرلوں
کی بہت ہمدمیِ دانش و عرفاں میں نے

کب تلک پردے میں ہو بات حقیقت یہ ہے
شیشۂ زہد کو بھی توڑ دیا ہاں میں نے

کل نیں افسانہ بنوں گا کہ بایں زہد و ورع
پی ہے ہمراہِ بتانِ بانے و دستاں میں نے

کچھ وہ پیمانے جو یادرخِ رنگیں میں بھرے
کچھ وہ جو ڈھالے بہ آغوشِ گلستاں میں نے

آج سے چھپ کے نہ پینے کی قسم کھائی ہے
پھر چھپاؤں اسے کیوں پی ہے جو پنہاں میں نے

دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں ضرر کس کا ہے
لو کہ پیمانے کو مارا سرِ پیماں میں نے

کیا پریشانیِ ایام کے ہاتھوں میں لئے
حلقہ ہائے خمِ گیسوئے پریشاں میں نے

واسطہ جب سے پڑا اس شہِ خوباں سے مرا
کر دیا ردِ حشمِ قیصر و خاقاں میں نے

آگ اُس شعلۂ رخسار نے یوں بھڑکائی
بڑھ کے خود پھونک دیا خرمنِ ایماں میں نے

تنگ ایسی ہوئی سی سالہ ریاضت کی قبا
چاک داماں کیا تا چاکِ گریباں میں نے

پیکر آرائیِ فن کی نہیں فرصت یعنی
نقشِ زیبا سے سجایا ورقِ جاں میں نے

لوگ اب ندوے میں کاہے کو مجھے دیکھیں گے
پائی ہے صحبتِ غارت گرِ ایماں میں نے

ہاتھ مجھ سے مرے احباب اٹھالیویں کہ اب
اس کے ہاتھوں پہ کیا وعدہ و پیماں میں نے

ہائے یہ فتنہ گرانِ عرب و ہند و عراق
کتنے دیکھے ہیں یم حسن کے طوفاں میں نے

کون جانے کہ بخلوت کدۂ ماہ تمام
کتنے ساغر لئے بر یادِ حریفاں میں نے

کیا عجب ہے جو کھلیں میرے لبوں سے گلشن
ان سے چومے ہیں جو وہ عارضِ خنداں میں نے

کل رہے ہیں مرے پہلو میں گلستاں کیا کیا
لی ہے جو فال ہم آغوشیِ جاناں میں نے

اس کی گفتار کے وہ لعل و گہر لوٹے ہیں
دیکھی ہے بے سروسامانیِ عماں میں نے

کتنے بوسے لیئے طوطیِ شکرخا کی طرح
اس کے ہونٹوں کو جو پایا شکرستاں میں نے

تھا یہ ڈر میرا دل آرام مجھے بھول نہ جائے
گرہیں دی ہیں بہ گیسوے پریشاں میں نے

سالہا زمزمۂ شوق سے گونجے گا جہاں
ہے نواؤں سے بھرا گنبدِ گرداں میں نے

لیک یہ زمزمہ دیسے ہی نہیں ہے شبلی
کی نہیں پیرویِ شیوۂ مستاں میں نے

(۵)

۲۷ر ستمبر ۱۹۰۶ء واپسی از بمبئی

کل شب وہ مہ جبیں جو مرا ہم وثاق تھا — پُر غلغلہ یہ گنبدِ فیروزہ طاق تھا

ہے فیضِ پارسائی جو چھوٹی ہے میکشی — اس فصل کا شباب میں تو اتفاق تھا

رندی و زہد آج ہیں یکجا مرے طفیل — مدّت سے ورنہ دونوں میں کیا کیا نفاق تھا

صحبت نے غیر کی یہ بگاڑ دی ہے اُس کی خو — ہنگامِ وصل پہلے تو ستم امذاق تھا

ہر چند رند پیشہ نہیں ہوں و لے مجھے — ایسی بھی صحبتوں کا کبھی اتفاق تھا

خود کو شمار کرتا ہے زاہد بھی آدمی — کم بخت جو ہمیشہ کا نا اہل و عاق تھا

اک روز بزمِ مے میں رہا محتسب شریک — یہ سوئے اتفاق مگر کتنا شاق تھا

ٹوٹا پڑا ہے یہ کہیں شبلی کا دِل نہ ہو — اک جام سرخ جو کبھی بالائے طاق تھا

سردار جعفری

کربلا

(ایک رجز)

پھر العطش کی ہے صدا

جیسے رجز کا زمزمہ

ہے ریگِ صحرا پر رواں

پھر اہلِ دل کا کارواں

نہرِ فرات آتش بجاں

راوی و گنگا خونچکاں

کوئی یزیدِ وقت ہو

یا شمر ہو یا حُرملہ

اس کو خبر ہو یا نہ ہو

روزِ حساب آنے کو ہے

نزدیک ہے روزِ جزا

اے کربلا
اے کربلا

گونگی نہیں ہے یہ زمیں
گونگا نہیں یہ آسماں
گونگے نہیں حرف و بیاں
گونگی اگر ہے مصلحت
زخموں کو ملتی ہے زباں
وہ خوں جو رزقِ خاک تھا

تابندہ ہے پائندہ ہے
صدیوں کی سفاکی سہی

انسان اب بھی زندہ ہے
زندہ ہے اعجازِ فغاں
ہر ذرۂ پامال میں
دل کے دھڑکنے کی صدا

اے کربلا
اے کربلا

عرشِ رعونت کے خدا
ارضِ ستم کے دیوتا
یہ ٹین اور لوہے کے بُت
یہ سیم و زر کے دیوتا
بارود ہے جن کی قبا
راکٹ کی لَے جن کی صدا
طوفانِ غم سے بے خبر
یہ کم سواد و کم ہُنر
نکلے ہیں لے کر اسلحہ

لیکن جل اٹھی زیرِ پا
ریگِ نواحِ کاظمہ
ریگِ نواحِ نینویٰ
آندھی ہے مشرق کی ہوا
شعلہ فلسطین کی فضا
اے کربلا
اے کربلا

یہ مدرسے، دانش کدے
علم و ہنر کے میکدے
ان میں کہاں سے آگئے
یہ کرگسوں کے گھونسلے
یہ جہل کی پرچھائیاں
لیتی ہوئی انگڑائیاں
دانش ورانِ بے یقیں
غیروں کے دفتر کے امیں
الفاظ کے خواجہ سرا
ان کے تصرّف میں نہیں
خونِ بہارِ زندگی
خونِ حیاتِ جاوداں

برہم ہے ان سے رنگِ گل
آزردہ ہے بادِ صبا
اے کربلا
اے کربلا

لیکن یہی دانش کدے
ہیں عشق کے آتش کدے
ہیں حسن کے تابش کدے
پلتے ہیں جن کی گود میں
لے کر انوکھا بانکپن
عصرِ رواں کے کوہکن
میرے جوانانِ چمن
بلبلِ نوا ، شاہین ردا
اے کربلا
اے کربلا

اے غم کے فرزندو اٹھو
اے آرزو مندو اٹھو
زلفوں کی گلیوں میں رواں
دل کی نسیم جاں فزا
ہونٹوں کی کلیوں میں جواں

بوئے گُل و بوئے وفا
آنکھوں میں تاروں کی چمک
ماتھوں پہ سورج کی دمک
دل میں جمالِ شامِ غم
رُخ پر جلالِ بے نوا
اے کربلا
اے کربلا

پیاسوں کے آگے آئیں گے
آئیں گے، لاپتے جائیں گے
آسودگانِ جامِ جم
سب صاحبانِ بے کرم
کھُل جائے گا سب کا بھرم
جُھک جائیں گے تیغ و عَلم
پیشِ سفیرانِ قلم
رخشندہ ہے روحِ حَرم
تابندہ ہے روئے صنم
سَردار کے شعروں میں ہے
خونِ شہیداں کی ضیا
اے کربلا
اے کربلا

انجم رومانی

تلاش

آپ ہندو
میں مُسلماں

وہ ہے سِکھ
یہ پارسی
وہ کرسچین ہے
یہاں سب لوگ اپنے اپنے ماتھے پر
کوئی لیبل لگائے پھر رہے ہیں
مگر میں

اِن کے دِل میں جھانک کر
انسانیت کو ڈھونڈھتا ہوں
میں انسانوں سے مِلنا چاہتا ہوں

دُعا

دُعا لبوں پہ جو آئی
تو
یہ ہوا محسوس
یہاں تو کوئی بھی فریادرس نہیں اپنا
نصیب میں جو لکھا ہے
بجا ہے
اچھا ہے

گذر گئے ہیں جو لمحے
جو آنے والے ہیں
مثالِ یارِ جفاکار بے وفا ہوں گے
کبھی نہ ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا ہوں گے

کہ ان پہ قابو نہیں
کوئی بس نہیں اپنا
یہاں تو کوئی بھی فریادرس نہیں اپنا
دُعا لبوں پہ جو آئی
تو یہ ہوا محسوس ....

\- - - - - - -

حفیظ آتش

تین نظمیں

یادِ رفتہ

جھلسا دینے والی
دھوپ سے بچ کر
چھجے کے نیچے کرسی پر
پیروں کو پھیلائے
بیزاری سے
اک بوڑھا
اخبار لئے بیٹھا ہے
آج کی تازہ خبروں کے عنواں سے
کل کی باسی خبریں پڑھتا ہے
اور کہتا ہے
اپنا وقت بہت اچھا تھا

○

بوجھ بدن

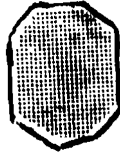
بدن مصروفیت سے تھک گیا ہے
کہیں افکار جاکر سو گئے ہیں
نظر بھی اب بہت دھندلا گئی ہے
چلو اب عمر کی سیڑھی ہٹالیں
کسی صحرا کی ویرانی پکاریں
بنا کر کوئی اچھا سا بہانہ
گھنے جنگل کی تنہائی میں رکھیں
پھر اپنے بوجھ سے آنکھیں بچا کر
وہاں سے تیز قدموں بھاگ آئیں

○

ادراک

میں بہت دیر سے کھڑا یونہی
جانے کیا تک رہا تھا ساحل پر
سرد جھونکے ہوا کے ٹکرائے
اور کچھ جسم پر لکھا میرے
بہت سے لوگ تھے وہاں لیکن
صرف میں ہی اُداس لوٹ آیا

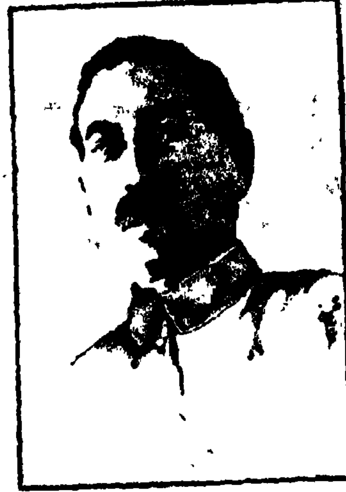
○



مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

کی زیرِ طبع کتابیں

- **تھور سنگیت کار**
  - ہندوستانی موسیقاروں کا ایک تذکرہ
- **بانگِ درا** ۔ (اقبال کی نظموں کا مراٹھی میں ترجمہ)
  - مترجم : سیتو مادھو راؤ پگڑی



”پریم چند کے افسانوں نے پہلی مرتبہ اردو میں ہمارے سماج کے بعض بعض کرداروں کو ہمارے سامنے اس طرح جیتا جاگتا لا کھڑا کر دیا ہے کہ ہم ان کی صورت شکل اور انداز کے علاوہ ان کی نفسیات ان کے جذبات اور ان کی دل کی گہرائیوں کے راز دار بن گئے ہیں پریم چند نے اردو کے افسانوں میں صحیح قسم کی کردار نگاری کا بھی رواج پیدا کیا اور اسی لئے لوگ اب تک پریم چند کو اردو کی مختصر افسانہ نویسی کا بادشاہ کہتے ہیں“ — وقار عظیم

مقالات

۱۔ پریم چند اور ہم — آل احمد سرور
۲۔ پریم چند قومی یک جہتی کا علمبردار — خواجہ عبدالغفور
۳۔ کفن کا تجزیاتی مطالعہ — باقر مہدی
۴۔ پریم چند کا طبقاتی اور سماجی شعور — ڈاکٹر قمر رئیس
۵۔ پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو — شمس الرحمٰن فاروقی
۶۔ پریم چند ایک نظر میں — خواجہ عبدالغفور

پروفیسر آل احمد سرور

پریم چند اور ہم

میں پریم چند سے ایک ہی بار ملا ہوں ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں ایک کانفرنس تھی۔ ان سے تعارف سید اشفاق حسین نے کرایا تھا جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں لیکچرر تھے اور بعد میں وزارت تعلیم کے پرائیٹ سکریٹری ہوئے۔ پریم چند درمیانے قد کے دبلے پتلے آدمی تھے۔ اس وقت وہ شیروانی اور دھوتی میں ملبوس تھے۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ سوئمنگ باتھ کے لان پر مدعوئین کی چائے تھی۔ وہیں یہ ملاقات ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ تھے جن سے اشفاق صاحب منشی جی کا تعارف کرا رہے تھے۔ ان سے باتیں تو رسمی سی ہوئیں، مگر میرے اوپر ان کی شفیق، ملنسار، بااخلاق ہنس مکھ شخصیت کا اچھا اثر ہوا۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ان کی جو تصویر ہے میں نے انھیں اسی تصویر کے مطابق پایا۔

پریم چند کی زندگی محنت، مشقت، جدوجہد، استقلال اور لگن کی داستان ہے۔ انھیں بجاطور پر قلم کا مزدور اور قلم کا سپاہی کہا گیا ہے انھوں نے شروع سے اپنے لیے جو راستہ چن لیا تھا اس پر آخر تک گامزن رہے۔ ادبی شہرت کی وہ بجاطور پر تمنا کرتے تھے۔ مگر انھیں پیسے کی ہوس کبھی نہیں رہی۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا بھی ہے کہ میں کسی دولت مند شخص کی عظمت سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ بنارسی داس چترویدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ کھانے کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھکو ہوس نہیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کتابیں لکھوں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہے۔ میں آرام سے بیٹھنا نہیں چاہتا۔ میں ادب اور آزادیٔ وطن کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں۔"

آزادیٔ وطن کے لئے پریم چند نے عملی کام بہت کم کیا۔ ہاں کچھ جلسوں میں شریک ہوئے تھے۔ دیانرائن نگم کے نام ایک خط میں لکھا ہے: "ادبی کام بھی خدمت کا ایک ذریعہ ہے"۔ انھوں نے نہ صرف اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ سے بلکہ اپنے مضامین، اداریوں اور خطوط کے ذریعہ سے بھی آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچائی اور وہ اس پر بجا طور پر نازاں تھے۔ انھوں نے ترک موالات تحریک سے متاثر ہوکر سرکاری نوکری چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے شروع ہی سے اپنا جوہر دریافت کرلیا تھا۔ اور پھر انھوں نے اپنی پٹری نہیں بدلی۔ فلم میں وہ عارضی طور پر آئے تھے کہ اس طرح انھیں کچھ مالی پریشانیوں سے نجات مل سکے اور شائد وہ فلم کے میڈیم کے ذریعہ سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ مگر جلد ہی ان پر واضح ہو گیا کہ فلم ایک انڈسٹری بن چکی ہے جس کا مقصد آرٹ کی خدمت نہیں بلکہ پبلک کے مذاق کو دیکھ کر روپیہ کمانا ہے۔ اور ان لوگوں کے مقدس جذبات کو کاروباری مقاصد کے لئے استعمال کرنا ہے۔

ایک اور جگہ انھوں نے لکھا ہے:

"میری زندگی ایک صاف اور سپاٹ میدان ہے جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ملیں گے لیکن اس میں کوئی ٹیلے، پہاڑیاں، گھنے جنگل، گہری وادیاں یا کھنڈر نہیں ملیں گے۔"

انھیں اپنی بیوی پسند نہیں تھی۔ شادی انھوں نے اپنی مرضی سے نہیں کی تھی بلکہ ان کے باپ نے کر دی تھی۔ ان کی ایک لغزش کی طرف قمر رئیس نے ان کی دوسری بیوی شیورانی دیوی کے حوالے سے اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے مرنے سے کچھ پہلے شیورانی دیوی سے اس کا اعتراف کیا تھا کہ دوسری شادی سے پہلے ان کا تعلق ایک استری سے ہو چکا تھا۔ جو شادی کے بعد بھی رہا۔ اس کے باوجود وہ دریافت کرنے پر یہی کہتے تھے کہ میری زندگی میں کوئی رومان نہیں۔ فراق سے بھی انھوں نے اس طرح کی بات کہی تھی۔ اس ایک کانفرنس کے علاوہ پریم چند کی زندگی واقعی ایک صاف اور سپاٹ میدان ہے، جس میں ایک گڈھا ضرور ہے۔ مگر نہ گھنے جنگل نہ پراسرار وادیاں نہ کھنڈر ہی ہیں۔ پرکاش چند گپت کو وہ ٹیگور کے مقابلے میں زیادہ ارضی مخلوق نظر آئے۔ ان پر ٹیگور کا اثر ضرور ہے، مگر انھوں نے ٹیگور سے زیادہ نئے دور کا خیر مقدم کیا۔ ادھر کچھ حلقوں میں ان کو اردو کے بجائے ہندی کا ادیب قرار دینے کی کوشش ملتی ہے اور ان کے بعض فقروں سے ان کے

یہاں فرقہ پرستی کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ پریم چند سے انصاف نہیں ہے۔ پریم چند بے شک دیا نرائن نگم کو ہندو اخبار نکالنے کی طرف مائل کرتے ہیں، وہ آریہ سماجی تحریک سے بھی متاثر تھے۔ مگر انہوں نے شدھی کی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے قدیم ہندوستان اور اس کی سنسکرتی اور سبھیتا کے بھی گن گائے ہیں۔ مگر پریم چند کی پوری زندگی اور سارے کارنامے پر نظر ڈالی جائے تو وہ مجھے صرف ہندی کے ادیب نہیں دکھائی دیتے اور محض ایک فرقہ کے جذبات کے ترجمان۔ وہ اردو اور ہندی دونوں کے ادیب ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا اردو سے کی اور ۱۹۱۵ء تک پہلے اردو میں لکھا۔ دیا نرائن نگم کو ۱۹۱۰ء میں لکھا تھا کہ ہندو پرچہ نکلنے والا ہو تو ہندی میں لکھنے کی عادت ڈالوں مالی مفاد دراصل انھیں ہندی کی طرف لے گیا کیونکہ ہندی میں افسانوں اور ناولوں کا معاوضہ زیادہ ملتا تھا۔ اور کتابوں کی اشاعت بھی ہندی میں زیادہ تھی جعفر رضا نے لکھا ہے کہ ان کے ۱۳۲ افسانے پہلے اردو میں ۹۲ پہلے ہندی میں اور بعد میں اردو میں شائع ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ بعد میں انہوں نے ہندی پر ساری توجہ صرف کردی، مگر اردو میں لکھا بھی اور دوسروں سے ترجمہ بھی کرایا گو اس پر نظر ثانی ضرور کی۔ وہ اگرچہ ہندوستان کی سب زبانوں کے لئے دیوناگری رسم الخط پر زور دیتے تھے، مگر ہندوستانی زبان کے پرجوش علمبردار تھے۔ اور اردو اور ہندی کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے قدیم ہندوستانی تہذیب کے گن گانے سے، یا راجپوتوں کی بہادری کی داستانیں بیان کرنے سے یا آریہ سماجی تحریک سے متاثر ہونے کی وجہ سے پریم چند متعصب یا تنگ نظر نہیں ٹھہرتے، جس طرح شبلی یا اقبال مشاہیر اسلام کی عظمت کے ترانے گانے کی وجہ سے موردالزام نہیں قرار دیئے جاسکتے۔ پریم چند سے امتیاز علی تاج سے خاصے گہرے مراسم تھے۔ ان کے نام ان کے خطوط کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے انہوں نے ان خطوط میں اردو کی خوبصورتی اور لوچ کی تعریف کی ہے۔ وہ ادب میں نسائیت کو ناپسند کرتے تھے۔ اس وجہ سے ٹیگور کی شاعری کے بھی زیادہ قائل نہ تھے۔ وہ مردانہ لہجے کے دلدادہ تھے جو انھیں ٹیگور کی شاعری میں کم نظر آتا تھا۔ وہ ادب میں تخیل کے قائل تھے، مگر اندازِ بیان سادہ پسند کرتے تھے۔ اردو میں ادبِ لطیف کے دور کی نثر انھیں پسند نہ تھی نقادِ آگرہ کے اسلوب پر اعتراض کرتے ہوئے انہوں نے تاج کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "سادگی اور نیچرل پن کو چھوڑ کر خواہ مخواہ شوکتِ بیان پیدا کرنے کی کوشش غلط ہے۔ ان کا ایک بڑے مزے کا خط دیا نرائن نگم کے نام ہے جس زمانہ کے ایک پورے ... کو آتش کی شاعری پر تبصرے کے لئے وقف کرنے پر انہوں نے اعتراض کیا ہے۔ اس ... کی شاعری پر اعتراضات میں وہ حالی کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں گو ان کا لہجہ حالی سے زیادہ تلخ ہے اردو کے شاعروں کے متعلق ایک دلچسپ اور معنی خیز رائے، بنارسی داس چترویدی کے نام ایک خط میں ملتی ہے۔ اردو کے شاعروں کا ذہن فلسفیانہ، حقیقت پسندانہ اور رجائیت پر مبنی ہے۔ ان کے نصف درجن شاعر مسلم قوم کو اخوت، مساوات اور جمہوریت کے اصولوں کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ مسلمان شاعر کمیونسٹ ہے۔ اقبال تک۔ (۱۹۳۵) یہ رائے غالباً اقبال اور جوش کا کلام پڑھ کر قائم کی گئی ہے، اور پریم چند کی قوت نقد سے زیادہ ان کی جذباتیت کو ظاہر کرتی ہے۔ مگر ان کی فکر اور ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے بہر حال مفید ہے۔ انھیں ہندی شاعروں کی یاس پسندی پر وہی اعتراض ہے جو اقبال کو تھا۔ پریم چند کے فن کو سمجھنے کے لیے (ا) ... تحریروں سے حسب ذیل اقتباسات مفید ہوں گے۔

(ا) "میرے قصے کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم بھی نہیں اٹھتا۔" (ایڈیٹر نیرنگِ خیال کے نام خط)

(۲) میں چاہتا ہوں کہ کہانی کا پلاٹ عام زندگی سے لیا جائے اور وہ زندگی کے مسائل کا حل بھی پیش کرے" (ونود شنکر ویاس کے نام خط)

(۳) کسی نے ابھی تک سماج کے کسی وشیش رنگ روپ سے ادھین نہیں کیا۔ آگرنے کیا مگر بہک گئے۔ میں نے کرشک سماج کو لیا۔ مگر ابھی تک کتنے ہی ایسے سماج پڑے ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سادھوؤں کے سماج کو کسی نے اسپرش تک نہیں کیا۔ ہمارے یہاں حکیا کی پردھا شاہے۔ انوبھوتی کی نہیں (بنارسی داس چترویدی کے نام خط ۱۹۳۰)

(۴) میں سماجک سدھار میں یقین رکھتا ہوں۔ ہمارا مقصد رائے عامہ کو بیدار کرنا ہونا چاہیئے۔ انقلاب سنجیدہ طریقوں کی ناکامی کی دلیل ہوتا ہے۔ کوئی سماجک سدھار کا مطلب نہیں ہوسکتا اگر ہم انفرادی طور پر ترقی نہ کریں۔ میں اصلاح چاہتا ہوں۔ تباہی نہیں۔ اگر مجھے کسی طرح یہ پتہ چل جائے کہ تباہی کا نتیجہ ہمارے لئے اچھا ہوگا تو میں تباہی کی بھی مخالفت نہ کروں گا۔ (اندرناتھ مدان کے نام)

پریم چند کے نزدیک افسانہ صرف منورنجن کے لئے نہیں اس میں سدھار کا پہلو ضروری ہے۔ گو اندازِ بیان میں منورنجن کی انہوں نے گنجائش رکھی ہے۔ ایڈیٹر نیرنگِ خیال کو لکھا ہے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔ پرکاش چندر گپت نے پریم چند کے محبوب موضوعات کی ایک فہرست دی ہے۔ یہ کئی وجوں سے بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔

۱۔ عورت کا زیور اور کپڑوں کا شوق کیسی مصیبت بن جاتا ہے۔
۲۔ کسانوں کی مصیبت کی کہانی۔
۳۔ فرقہ وارانہ کشاکش، قدامت پرستی، ضعیف الاعتقادی اور تعصب۔

۴۔ جہیز اور شادی کی بُری رسمیں۔
۵۔ ہندو بیوہ کی بپتا۔
۶۔ سوتیلی ماں
۷۔ سماجی تحریکیں اور قومی بیداری
۸۔ تاریخ سے دلچسپی زمانۂ وسطیٰ اور ماضی قریب کی ہندوستانی تاریخ۔
۹۔ وطن پرستانہ جوش اور ولولے
۱۰۔ مافوق فطری عناصر سے دلچسپی
۱۱۔ کبڈی اور گلی ڈنڈا جیسے کھیل
۱۲۔ ریاکاروں اور منافقت کی پردہ داری
۱۳۔ سماجی جبر اور نا انصافی کے موضوعات
۱۴۔ سماجی حقیقت کے اثر سے کردار میں تبدیلی اور بلند کرداری کی کہانیاں

ان موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو یہ زیادہ تر سماجی اور پھر سیاسی موضوعات ہیں یعنی پریم چند ایک مقصدی فن کار ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ ان پر ٹیگور سرشار، مہاتما گاندھی، ٹالسٹائی۔ وکٹر ہیوگو اور رومنس رولاں کا اثر ہے۔ نوعمری میں طلسم ہوش ربا اور چندر کانتا جیسی داستانیں سننے سے ان کے تخیل کو غذا ملی۔ وہ ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ جو شہر سے زیادہ دور نہ تھا مگر وہ ساری عمر گاؤں میں گھر بنا کر رہنے اور شہروں کی نام ونمود کی اور کشمکش اور مقابلے کی زندگی سے الگ ہو جانے کی سوچتے رہے۔ گوکھلے کے اثر کے زمانے میں وہ گاندھی جی سے اور گاندھی جی کے زمانے میں وہ نہرو سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ مگر نہرو کا صنعت کاری پر زور انھیں پسند نہیں وہ صنعت کاری کو تہذیب اور انسانیت کے لئے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کے دوست دیا نرائن نگم زیادہ سے زیادہ لبرل کہے جا سکتے ہیں۔ پریم چند ۱۹۲۲ء میں انھیں ایک خط لکھتے ہیں "میں تو اس آنے والی پارٹی کا ممبر ہوں جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے۔" آخر زمانہ میں پریم چند نے ترقی پسند تحریک کی ہمنوائی ہی نہیں رہنمائی بھی کی۔ وہ اس کی پہلی کانفرنس کے صدر تھے۔ اور ان کے خطبۂ صدارت میں افادی ادب اور سماجی خیر اور حسن کے تصور کے بدلنے پر زور دیا گیا ہے انہوں نے روس میں اشتراکیت سے تجربے کی کامیابی کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا جس طرح اقبال نے دیکھا تھا۔ یا جس طرح نہرو اور ٹیگور نے دیکھا۔ مگر پریم چند اشتراکی نہ تھے۔ سجاد ظہیر نے روشنائی میں لکھا ہے کہ پریم چند نے ان سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ چل تو رہا ہوں مگر ہانپ بھی رہا ہوں۔ دراصل پریم چند مارکسزم کے فلسفے سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ انھیں عوام سے ہمدردی تھی۔ زمیندار کے مقابلے میں کسان سے، سرمایہ دار کے مقابلے میں مزدور سے، ظالم کے مقابلے میں مظلوم کے ساتھ تھے۔ وہ انسان دوستی کی ان روایات کے امین تھے جو صوفیوں اور سنتوں کی دین ہیں۔ مگر ان سے آگے جا کر گاندھی جی کے آدرش کے مطابق اخلاقی اور روحانی قدروں پر ایک نیا سماج بنانا چاہتے تھے جو تخریب پر نہیں اصلاح پر، تشدد پر نہیں دل بدلنے پر اور برے آدمیوں میں چھپی ہوئی نیکی کو ابھارنے پر زور دے۔ مگر اقبال کی طرح تغیر اور تبدیلی کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے۔ اور اقبال ہی کی طرح ادبی کام کو اپنا عمل سمجھتے تھے یعنی ان کے نزدیک ادب کا کام ذہنوں کو بدلنا ہے اور ادیب کے لئے خود تلوار اٹھانا ضروری نہیں ہے۔ پریم چند کے اس نقطۂ نظر پر بعض ترقی پسند نقادوں نے اعتراض بھی کیا ہے ان کے نزدیک پریم چند کا نظریۂ اخلاق انھیں اپنے سفر میں آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ انھوں نے صنعت کاری اور سرمایہ دارانہ سماج کی تباہ کاریوں میں فرق نہ کر کے غلط بحث کیا۔ انھوں نے دیہات کو آدرشی نقطۂ نظر سے دیکھا اور شہروں کی زندگی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ اپنی آدرش پرستی کی وجہ سے صرف سدھار اور ارتقاد کے ذریعہ سے اس معیاری سوسائٹی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جہاں ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہوں۔ وہ مغربی تعلیم سے خوش نہیں تھے۔ نگم کو ایک خط میں لکھا ہے کہ لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ یہ یونیورسٹی میں نہ پڑھتے تو اچھا ہوتا۔ مدقوق، بدتمیزی، کج خلق، مزاج میں صد درجہ رعونیت، ناہموار خود پسند اور خودسر، یہ عام روش ہے۔ لڑکیوں میں بھی یہی نقائص نمایاں ہیں۔ قرائن بتلا رہے ہیں کہ آنے والا زمانہ گرہستی کے لئے قاتل ہو گا۔" ان کی نظر میں عورت کا آدرش، ایثار، خدمت اور پاکدامنی کا عکس ہونا چاہئے۔ "ایثار جو مسلسل خدمت بلا شکوہ اور پاکدامنی شبرو کی بیوی کے ہم پلہ جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکتا ہو۔" ایک اور خط میں لکھا ہے "شادی دراصل سمجھوتے اور سپردگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ اگر جوڑا خوش رہنا چاہے تو اسے ایک دوسرے کی بات ماننی ہی ہوگی۔ جوڑے میں سے ایک کا چاہے وہ مرد ہو یا عورت جھکنا ضروری ہے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ تمام قصور مردوں کا ہی ہے۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں عورتیں بہت عجیب شکایات کی بنا پر جھگڑے پیدا کر دیتی ہیں۔ جب ہمیں یقین ہے کہ طلاق ہمارے شادی سے متعلقہ تکلیفوں کا علاج نہیں تو سوسائٹی کے سر اسے کیوں منڈھا جاتا ہے۔ بے شک بعض حالتوں میں طلاق لازمی ہو جاتا ہے لیکن میری رائے میں یہ کہنا غلط ہو گا کہ کون مرد یا عورت نباہ نہیں کر سکتا۔

پریم چند کے ان خیالات پر غور کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ وہ آج سے سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے آج سے چوالیس سال پہلے انتقال کیا۔ اور پھر یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی کہ وہ سیاسی غلامی اور سماجی پستی سے بیزار تھے۔ جب گوکھلے کا دور تھا تو وہ گرام دل کے ساتھ تھے اور گاندھی جی کے عروج کے زمانہ میں نہرو سے قربت محسوس کرتے تھے۔ مغرب کے اثر سے ان میں حقیقت پسندی کی لہر آئی گو ان کی حقیقت پسندی عمر کے بڑے حصے میں آدرش حقیقت پسندی سے آگے نہ بڑھ سکی اندر ناتھ مدان کو لکھا ہے: "میرے ہر ایک ناول میں ایک معیاری کیرکٹر ہوتا ہے جس میں انسانی صفات بھی ہوتی ہیں۔

اور کمزوریاں بھی۔ مگر ان کا معیاری ہونا ضروری ہے۔ پریم آشرم میں گیان شنکر اور رنگ بھومی میں سورداس ہے۔ اس طرح کایا کلپ میں چکردھر اور کرم بھومی میں امرکانت ہے۔" پریم چند یہ مانتے تھے کہ انسانی فطرت نہ سیاہ ہوتی ہے نہ سفید ان میں دونوں رنگوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ مگر وہ نیکی کی بدی پر فتح، خیر کی شر پر جیت کو نمایاں کرنے کی ضرور کوشش کرتے تھے۔ اپنی تصور پرستی اور جذباتیت کے باوجود، وہ بہر حال اس دنیا اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی وجہ سے بہت اہم ہیں جسکی طرف اس وقت تک توجہ نہیں ہوئی تھی وہ اردو اور ہندی میں سماجی اور سیاسی ناول کے بانی اور اردو افسانے کے معمارِ اعظم ہیں۔ ناول اور افسانے دونوں کو انہوں نے بڑی بلندی، بڑی گہرائی بڑی وسعت، بڑی رنگا رنگی عطا کی اور اگرچہ آج کا ناول اور افسانہ دونوں پریم چند سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں مگر اس کی وجہ سے ان کی اہمیت ان کی اولیت، ان کی قدر و قیمت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

پریم چند کو جو روایت ملی تھی وہ بڑی حد تک یا تو داستان کی تھی یا رومان کی، یا تاریخی اور تمثیلی قصوں کی۔ انھیں جو نثر ملی تھی وہ شاعرانہ اسلوب کی بڑی حد تک حامل تھی۔ پریم چند سرشار سے متاثر ہوتے ہوئے ان سے زیادہ جدید نثر لکھتے ہیں وہ اس لحاظ سے نذیر احمد اور رسوا کی برادری میں ہیں۔ مذہب کے اثر سے انہوں نے شرر کی طرح عاشقانہ اور شاعرانہ مضامین نہیں لکھے۔ نہ ادب لطیف کے طلسم ہوش ربا میں گرفتار ہوئے۔ انہوں نے شرر کے تاریخی ناولوں سے فائدہ ضرور اٹھایا مگر صرف کچھ افسانوں کی حد تک جن میں ازمنہ وسطیٰ یا ماضی قریب کے کچھ خاکے ملتے ہیں۔ ان کی نثر اور ان کے موضوعات دونوں جدید کہے جا سکتے ہیں انہوں نے ہماری فکشن میں کسان اور دیہات کی وہ دنیا پیش کی جس سے اردو ادب اس وقت تک بے اعتنائی برت رہا تھا۔ ایک طرح انہوں نے ہمیں اس وسیع، بلند، پست، کشمکش، زیست میں مبتلا، چند قدروں کو سینے سے لگائے۔ دھرتی پر قدم جمائے مگر آسمان کی طرف تکتے ہوئے کسان سے آشنا کیا جو ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ اور اس ملک میں سب سے زیادہ مظلوم اور پچھڑا ہوا حصہ تھا گو اس پر ملک کی پیداوار کا بڑی حد تک دارومدار تھا۔ انہوں نے ہمیں صرف ایک نئی دنیا ہی نہیں دی' اس دنیا میں چلتے پھرتے، روتے، ہنستے، زندگی کے بوجھ تلے دبے ہوئے فریاد کرتے اور امیدیں باندھتے ہوئے بے شمار کردار دیئے جو ہمارے جانے پہچانے شہری آبادی سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کچھ ایسی انسانی دولت رکھتے ہیں جس سے شہری زندگی ایک بڑی حد تک محروم ہو چکی ہے۔

اس لئے پریم چند کے ساتھ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے کارنامے کو ان کے دور کے تناظر میں دیکھا جائے۔ آج کے معیاروں کی بات اپنی جگہ اہم ہے اور نظر انداز نہیں کی جا سکتی، مگر پریم چند کے دور کی ساری فکری اور فنی خصوصیات اس کی خوبیوں اور خامیوں، اس کی جدوجہد، اس کے آدرش اور اس کے خواب بہر حال ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ یہ دیکھنا ہوگا کہ انہوں نے افسانے کو طفولیت سے نکال کر نوعمری تک پہنچا دیا اور بلوغ کی بھی اس میں جھلک دکھائی دی اور انہوں نے ناول کے قلیل سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ پریم چند افسانہ نگار بہتر تھے یا ناول نگار۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے ناول خاصے بلند ہوتے ہوئے ان کے افسانوں کی بلندی کو نہیں پہنچتے، مگر بہر حال دونوں کا سرمایہ وقیع ہے۔ پریم چند کے افسانے اس لئے ان کے ناولوں سے بلند ہیں کہ ہمارے یہاں نثر میں مسلسل پرواز، مبہم بصیرت، شخصیت کے پست و بلند، شعر کی اشاریت اور بلاغت کے بجائے نثر کی وضاحت، استدلال، ثمرائے اظہار، تخیل کی چمک دمک کے بجائے تجربے کی چاندنی اور اس کی بصیرت کے لئے فضا سازگار نہ ہو پائی تھی۔ ہاں عشق کی وہ ایک جست خیال کی وہ اڑان۔ فن کی وہ میناکاری غزل کی روایت کی وجہ سے موجود تھی جو افسانے میں اپنے جوہر دکھا سکتی تھی۔ پریم چند کو عظیم افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ عظیم ناول نگار نہیں کہے جا سکتے، ہاں وہ ایک اچھے اور قابلِ قدر ناول نگار ضرور کہے جا سکتے ہیں۔

ناول اور افسانہ دونوں ہمارے یہاں مغرب سے آئے ہیں۔ نرمل ورما ہندی کے مشہور افسانہ نگار نے کہیں کہا ہے کہ ہندی والوں نے مغرب کی تقلید میں ناول کی طرف توجہ کی، مگر ان سے غلطی ہوئی۔ ناول ہمارا میڈیم نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ میں اس ہمارے اور تمہارے کی تقسیم کو غلط سمجھتا ہوں۔ اصلیت یہ ہے کہ ادب میں مختلف میلان، مختلف دوروں میں پروان چڑھے ہیں۔ رومان پہلے آیا حقیقت نگاری بعد میں اور اس حقیقت نگاری میں بھی آدرش حقیقت نگاری، نیچرلزم اور سماجی حقیقت نگاری کے مزید رنگ ابھرے۔ یہ کہنا حقائق سے انکار کرنا ہوگا کہ حقیقت نگاری کے اس رجحان نے جو مغرب سے آیا تھا ادب کو کچھ نہیں دیا۔ یا اس نے ادب کو نقصان پہنچایا۔ دراصل ہمیں مغرب کی تقلید اور جدیدیت (westenization & Mordnization) میں فرق کرنا چاہیئے۔

ہندوستانی فکشن کا مغربی فکشن سے متاثر ہونا اور ایک حد تک ابتدائی دور میں اس کی تقلید کرنا یقیناً صحت مند اور مفید رجحان تھا۔ فکشن کی ترقی دراصل اس متوسط طبقے سے وابستہ ہے جسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگے جو اپنے اخلاق و عادات کو عزیز رکھتا ہو جس کے پاس کچھ فرصت ہو مگر جس کا نقطۂ نظر کاروباری ہو جو اپنے سے نیچے طبقے کے بظاہر ناکارہ پن سے اپنے کو ممتاز سمجھتا ہو ہندوستان میں مغرب کے اثر سے یہ سب ہوا ہے مگر دیر میں ہوا اور پریم چند کے زمانے میں اس کا آغاز ہی تھا۔ اس لئے آزادی کے بعد اردو اور ہندی دونوں میں ناول کو یقیناً ترقی ہوئی اور اس نے بہت جلد ان سب مدارج سے گزرنا سیکھ لیا جو مغرب کی ادبی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ افسانے میں بھی یہی تاریخ دہرائی گئی۔

اس لئے پریم چند جب یہ کہتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ کہانی کا پلاٹ زندگی سے لیا جائے اور وہ زندگی کے مسائل کا حل بھی پیش کرے تو وہ زندگی کی عکاسی کے لحاظ سے جدید ہیں۔ مگر حل تلاش کرنے کی کوشش کی وجہ سے نسبتاً کم جدید۔ مسائل کے انتخاب کی وجہ سے وہ یقیناً معنی خیز ہیں۔ حل کے سلسلے میں نہیں مگر ان کی حل کی کوشش قابل ذکر ضرور ہے۔ خود ان کا حل بعض کی نظر میں گہرائی نہ رکھتا ہو یا بعض کے نزدیک ادب کو حل کی تلاش کا ذریعہ بنانا ہی زیادتی ہے۔

ناول کا موضوع انسانی رشتے ہیں۔ ناول میں انفرادی تجربے کی بنیادی اہمیت ہے۔ یہ تعلیم کرشمے کی نظر سے دیکھتی ہے اور انفرادی جذبہ کے خام مواد سے اپنا تانا بانا تیار کرتی ہے اور پھر اس کے فکر کے لئے یہاں بھی محض خیالات یا محض نظریہ ناول میں اہم نہیں ہے۔ لیکن اگر ذہنی فضا ایسی ہے کہ انفرادی تجربہ حقیقت سے ہم کنار نظر آتا ہے تو ناول فلسفیانہ یا نظریاتی بھی ہو سکتی ہے۔ پریم چند کے یہاں انفرادی تجربے میں باوجود جذباتیت کے حقیقت کی جھلکیاں ملتی ہیں اس لئے میں ان کے ناولوں کی قدر کرتا ہوں۔ گو میرے نزدیک اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے یا ایک قسم کی جھجک کی وجہ سے وہ سمندر کے کنارے تو آجاتے ہیں مگر سمندر میں کودنے ہچکچاتے ہیں۔ بازار حسن یا سیوا سدن میں یہی کمی رہ گئی ہے۔ پھر ان میں اس تنظیم کی کمی ہے جو طول کلام سے باز رکھتی ہے جو گان ہستی میں بھرتی کا احساس جا بجا ہوتا ہے۔ یوں بھی مشرقی مزاج اس ضبط و نظم کا خوگر بہت دیر میں ہوا جو ادھر ادھر بھٹکنے یا فلسفہ چھانٹنے یا بے ضرورت کرداروں کا جنگل اگانے یا سڑک پر چلتے ہوئے راستے کے جلوؤں سے دل بہلانے سے احتراز کرتا ہے انہوں نے سور داس کا کردار ہمیں ضرور دیا ہے مگر اندھے کی لاٹھی کو قابو میں نہیں رکھا میدان عمل میں گاندھی جی کے خیالات کی عکاسی کے ساتھ ایک باغیانہ رجحان بھی ہے اور گئودان میں زمینداروں اور صنعت کاروں دونوں کی خرابیوں پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ ہوری کے علاوہ یہاں دھنیا، جھنیا، میتہ اور مالتی اپنی طرف ضرور متوجہ کرتے ہیں۔ ہوری کو ایک عظیم کردار مانا گیا ہے۔ مگر اس کے متعلق ممتاز حسین نے ایک دلچسپ بات یہ کہی ہے کہ ہوری پریم چند کے اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے تو یقیناً عظیم ہے۔ لیکن وہ منشی پریم چند کے انقلابیت کے نقطۂ نظر سے یا سماجی انقلاب کے نقطۂ نگاہ سے عظیم نہیں ہے۔ مگر ممتاز حسین یہ بھول جاتے ہیں کہ فن کبھی سیاسی نظریئے کی صراطِ مستقیم پر نہیں چلتا اور کسی بڑے فن پارے میں زندگی اس تنظیم، درست منطق اور ترمیمات کے ساتھ نہیں آتی، جس طرح وہ کسی سیاسی یا فلسفیانہ نظریہ میں آتی ہے۔ میرے نزدیک پریم چند نے ایک نمائندہ کسان کی تصویر کھینچی ہے جو اپنے تضادات کے باوجود جاندار، روشن اور عظیم ہے۔

پریم چند نے ایک جگہ اپنے ناولوں میں رنگ بھومی کو بہترین کہا ہے۔ اپنے بہترین افسانوں میں انہوں نے بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ، حج اکبر، سینہ گرہ پرانجھت، سوتیلی ماں کا ذکر کیا ہے۔ تعجب ہے کہ انہوں نے کفن، دو بیل، پوس کی رات اور نجات کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود فن کار کا اپنے فن کا بہترین ناقد ہونا ضروری نہیں ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ نقاد کسی فن پارے کے کسی ایک ہی پہلو (   ) کو دیکھے۔ مثلاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دو بیل میں ہندو مسلمانوں کو علامتی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ایسی تعبیر اور تفسیر کی گنجائش ضرور موجود ہے۔ کفن نہ صرف پریم چند کی افسانہ نگاری کے نقطۂ عروج کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ آنے والوں کے لئے ایک نشانِ راہ بھی ہے۔ یہاں پریم چند مادھو اور گھیسو کو جس روشنی اور شفاف حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور جس طرح جذبات پر لگام دیتے ہیں اور صرف حقیقت سے سروکار رکھتے ہیں اس کے متعلق فلسفہ نہیں چھانٹتے۔ وہ بڑے دل گردہ کا کام ہے۔ جو ایک بڑا فن کار ہی انجام دے سکتا ہے۔ یہاں واقعی پریم چند نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ جو زندگی اور جان پریم چند کے کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کے کرداروں میں نظر آتی ہے وہ ان کے اوپر کے درجے کے کرداروں میں نظر نہیں آتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چند کو چھوڑ کر پریم چند کو مسلمان کرداروں کو سلیقے سے برتنا نہ آیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ پریم چند جس چیز سے اچھی طرح واقف تھے، جس کا تجربہ رکھتے تھے، جسے دیکھ سکتے تھے اسے اچھی طرح بیان کر سکتے تھے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ جن چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، انھیں پر اپنا زورِ قلم صرف کرتے تھے۔ ممکن ہے "کربلا" کے ساتھ جس طرح اردو داں طبقے نے سلوک کیا اس کی وجہ سے غیر شعوری طور پر وہ اس معاملے میں وہ محتاط ہو گئے ہوں گے۔ مگر ہمیں کسی بھی فن کار سے یہ مطالبہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کیا اور کیوں نہیں کرتا۔ ہمیں تو یہی دیکھنا چاہئے کہ اس نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ کیسا ہے۔ اور اس سے ہمیں زندگی کے متعلق کیا بصیرت ملتی ہے۔

پریم چند نے نہ صرف اردو افسانہ اور ناول کو فصیح بنایا اور اس صنعت میں قابل قدر اور اہم اور معنی خیز سرمایہ چھوڑا۔ انہوں نے ایک پورے اصلاحی اور سماجی دبستان کا باب کھول دیا۔ پریم چند سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی کے علاوہ کرشن چندر، بیدی، حیات اللہ انصاری، رام لال اور اس دور کے بہت سے افسانہ نگاروں کے نام آتے ہیں۔ اردو افسانہ نے پریم چند کے بعد بڑی ترقی کی ہے۔ اور جو زندگی کی قاش کو صرف ایک سمت سے کاٹنے کا قائل نہیں رہا اور نہ پلاٹ کی چستی اور قصے کی دلچسپی کا اس حد تک قائل نظر آتا ہے۔ مگر پریم چند کی عظمت اس کی وجہ سے ماند نہیں ہو سکتی۔ ان کی اہمیت اور معنویت کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل تو پریم چند نے اردو نثر کو بیانیہ انداز سکھایا۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں تشبیہات و استعارات

یا شاعرانہ فقرے نظر آتے ہیں۔ مگر نثر کا بنیادی ڈھانچہ چھوٹے چھوٹے، ایک دوسرے سے مربوط واقعات کو آگے بڑھاتے ہوئے جملوں سے عبارت ہے۔ وہ منظر نگاری میں بھی بے جا وقت صرف نہیں کرتے۔ چند جملوں میں ایسی تصویر پیش کر دیتے ہیں کہ وہ منھ سے بولنے لگتی ہے۔ ان کے مکالموں میں ایک فطری انداز ہے یہ مکالمے معلوم ہوتے ہیں، مصنوعی اور کتابی اور گھڑے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں بول چال کا لب و لہجہ ملتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ وہ کسانوں کی بولی پیش نہیں کرتے، صرف ان کے کچھ الفاظ لے آتے ہیں۔ مگر ایک طرف سے یہ حقیقت نگاری کی طرف ایک اہم قدم ضرور ہے جس سے آگے چل کر کچھ اور راہیں نکلیں۔ دوسری چیزوں کی طرح یہاں بھی پریم چند ابتدائی نقوش کی علمبرداری کرتے ہیں، مگر انھیں کی وجہ سے آگے ترقی ممکن ہو سکتی۔ ہوری کے بغیر بجوکا بھی ممکن نہ تھا۔ بجوکا میں بھی پریم چند کا خون جگر شامل ہے۔ پریم چند کی نثر کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں خیال انگیز باتیں کہہ جاتے ہیں جو ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑتی ہیں۔ چڑیاں آسمان پر رہتی ہیں مگر بسیرے کے لئے انھیں زمین پر آنا پڑتا ہے۔ اور ایم۔ لارنس کہتا ہے،

"میں زندہ انسان ہوں اور جب تک میرے بس میں ہے، میرا ارادہ زندہ انسان رہنے کا ہے۔ اس لئے میں ایک ناولسٹ ہوں اور چونکہ میں ناولسٹ ہوں اس لئے میں اپنے آپ کو کسی سنت، کسی سائنٹسٹ، کسی فلسفی، کسی شاعر سے برتر سمجھتا ہوں، جو زندہ انسان کے مختلف حصّوں کے بڑے ماہر مگر پورے انسان تک نہیں پہنچتے۔ ناول زندگی کی ایک روشن کتاب ہے۔ کتابیں زندگی نہیں۔ یہ فضا میں ارتعاشات ہیں لیکن ناول ایک ایسا ارتعاش ہے جو پورے زندہ انسان کے اندر سرزش پیدا کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو شاعری فلسفے، سائنس یا کسی اور کتابی ارتعاش کے بس کی بات نہیں۔ پریم چند کبھی کبھار اپنے ناولوں اور افسانوں میں پورے زندہ انسان کے اندر لرزش پیدا کر سکتے ہیں۔ ہر جگہ نہیں۔ مگر مستقل بلندی کس کے بس کی بات ہے اور اپنے دور اور ماحول سے کتنا کوئی بلند ہو سکتا ہے۔ پریم چند اسی طرح اردو نثر کے معمار اعظم ہیں جس طرح اقبال اردو نظم کے۔

دونوں دراصل جدیدیت کے پیش رو ہیں۔ دونوں کا اثر اردو ادب پر گہرا اور غیر فانی ہے دونوں کے یہاں بہت کچھ ملتا ہے۔ دونوں احساس ہوتا ہے مگر دونوں کی عظمت مسلّم ہے۔

پریم چند

پریم چند کا ذہن ارتقاء پذیر تھا۔ ان کا فن حالات کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ ان کے خیالات واقعات کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہندوستانی عوام کی روح میں اتر کر ان کے دکھ درد ان کے کرب و اضطراب، ان کی مایوسی اور امید ان کے خوابوں اور خیالوں کو دیکھ سکتے۔ وہ انہیں اس جال سے نکال کر ایک بہترین زندگی کا خلعت دینا چاہتے تھے جس میں وہ صدیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ براہِ راست عوام کے پاس گئے۔ اور ان کی تکلیفوں اور خوشیوں میں شریک ہوئے۔ انہوں نے عوام کے مقابلے میں دوسرے طبقات کے مظالم کا پردہ چاک کیا۔ اگرچہ وہ طبقات کے ختم ہونے سے بہتری کے جو امکانات تھے ان پر نظر نہ ڈال سکے لیکن عوام کا ساتھ انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا ـــــ اسی وجہ سے ان کی انسان سے محبت ان کی عوام دوستی ان کی بلند نگاہی کے مجموعی اثرات کے سامنے بعض قدیم تصوّرات کو عزیز رکھنا ایک معمولی سی چیز بن جاتا ہے اور پریم چند ہماری ترقی پسندی کی روایت کا ایک بہت ہی اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پریم چند کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے ان چند خامیوں یا ان فنّی نقائص میں اُلجھ کر نہیں رہ جانا چاہیئے جس سے پریم چند نہ بچ سکے بلکہ انسان دوستی کے اس بے پناہ طوفان کو دیکھنا چاہیئے جو غلاموں، مزدوروں، کسانوں، مظلوموں اور اچھوتوں کے لئے ان کے دل میں اٹھ رہا تھا۔ اور ان کے فن کو جہدِ حیات میں کام آنے والا ایک نازک تر مضبوط آلہ بنانا تھا۔

خواجہ احمد عباس

پریم چند قومی یکجہتی کے علمبردار

ہر بڑا ادیب اپنے عصر کا، اپنے ملک کا اور اپنی قوم کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور کیونکہ ہر عصر میں، ہر ملک میں اور ہر قوم میں رجعت پسندانہ اور ترقی پسندانہ دونوں قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں اس لئے ترقی پسند عظیم ادیب اپنے سماج کے ترقی پسند اور صحت مند اقدار کی نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہے۔

منشی پریم چند انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے لکھنا شروع کیا بیسویں صدی کے شروع میں۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ اٹھارہ سو ستاون کے ناکام انقلاب کے بعد ایک بار پھر قومی آزادی کی تحریک جنم لے رہی تھی۔ مختلف تہذیبی، تمدنی، اصلاحی اور سماجی تحریکوں نے قوم کے تعلیم یافتہ طبقوں میں ایک نیا شعور پیدا کر دیا تھا۔ انگریزی تعلیم نے ہندوستان کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں ایک بڑا پتھر پھینکا تھا اور ملک کی مذہبی، تہذیبی اور سماجی زندگی میں ایک ہلچل مچادی ہے۔

سوامی وویکانند، سرسید احمد خاں، بھارتیندو، حالی اور شبلی اور اُن کا کام اسی تہذیبی ہلچل کی روشن نشانیاں تھا۔

پریم چند کی ادبی زندگی جب شروع ہوئی تو اُن کے پیشرو تھے رتن ناتھ سرشار جن کا جنگی سائز کا ناول "فسانۂ آزاد" اُس وقت اردو زبان کا سب سے بڑا ناول تھا۔ مگر اس ناول کا اور اس کے کرداروں کا سماجی ماحول رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کا تھا جو پریم چند کے سادہ اور سادگی پسند مزاج کے لئے مناسب نہیں تھا۔ دوسری طرف ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے ناول مسلمان متوسط طبقے کی زندگی کی آئینہ داری کر رہے تھے۔ اگرچہ اُن کا رویّہ اور انداز روایتی نہیں بلکہ اصلاحی تھا۔ پریم چند نے اُتر پردیش کے دیہات میں آنکھ کھولی تھی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد مدرسی کو انہوں نے اپنا پیشہ بنایا اور آخیر وقت تک نچلے متوسط طبقے سے متعلق رہے۔ مگر اُن کو دیہاتی کرداروں کے بارے میں ذاتی طور سے جانکاری بھی تھی اور دلچسپی بھی۔ جاگیرداری سماج میں اُن کا جو استحصال ہو رہا تھا اُس کے بارے میں وہ لکھنا چاہتے تھے اگرچہ اُن کو معلوم تھا کہ یہ محنت کش طبقہ اُن کی تخلیقیں نہ اردو میں پڑھ سکے گا نہ ہندی میں مگر متوسط درجے کے طبقے کو ضرور انہوں نے دیہاتی زندگی کی تکلیفوں اور استحصال کے بارے میں جانکاری دی اور اُن کی ہمدردیوں کو دیہات کے عوام کی زندگی کے قریب لے آئے۔

پریم چند پہلے اردو ادیب تھے یا پہلے ہندی لیکھک تھے یہ سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ انڈا پہلے آیا یا مرغی۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند کی تعلیم دونوں زبانوں میں ہوئی تھی اور وہ بیک وقت اردو میں افسانے لکھ سکتے تھے اور بعد میں اُسے ہندی کا روپ دے دیتے تھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہندی میں کہانی لکھ کر بعد میں اس کو اردو افسانہ بنا دیتے تھے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے مضمون "فرقہ پرستی کے خلاف منشی پریم چند کا جہاد" میں اس مسئلے اور اس کے پس منظر پر بہت خوب روشنی ڈالی ہے۔

> "اردو اور ہندی میں جہاں بہت سی قدریں مشترک تھیں وہیں رسمِ خط، کچھ الفاظ اور کچھ مزاج میں اختلاف بھی تھا۔
>
> بدیسی راج میں اسی اختلاف کو ہوا دی گئی اور اس علاقے کی تہذیبی فضا میں اردو اور ہندی کا تنازعہ کھڑا کر دیا گیا اور اردو اور ہندی کو توام بہنوں کی بجائے دشمنِ جاں سوکنوں کا مقام دے دیا گیا۔۔۔
>
> پریم چند اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں میں کہانیاں لکھتے اور اس طرح ان دونوں زبانوں کی مشترکہ قدروں کو اُبھارتے تھے اور یہ پریم چند کا میری رائے میں سب سے بڑا ادبی اور تہذیبی کارنامہ ہے۔ خود ان کی ذات ان دونوں زبانوں اور ان زبانوں کے تخلیقی ادب کا سنگم تھی۔"

پریم چند نہ صرف اردو اور ہندی کے ایک سنگم تھے بلکہ گاندھی جی کے اثر میں آ کر پریم چند نے دیہاتی زندگی کے پس منظر میں ہندو مسلمان کے نوٹ کے مثالی

کردار پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر گوڈ نے اپنے مضمون میں ایک کہانی "پنچایت" کی مثال پیش کی ہے۔ اس کہانی کے کردار جمن شیخ اور الگو چودھری نے شاید شانتارام کی مشہور تصویر "پڑوسی" کے کرداروں مرزا اور ٹھاکر کو inspire کیا تھا۔

ویسے پریم چند نے صرف مسلمان کرداروں پر بھی اپنی تخلیقوں کی بنیاد رکھی ہے۔ "کربلا" نامی ڈرامے میں انہوں نے امام حسین کی شہادت کی نہایت خوبصورت اور ڈرامائی انداز میں عکاسی کی۔ اور اس میں ایک ہندوستانی کردار ساہس راؤ کو بھی داخل کر دیا جس سے یہ شہادت ہندوستانیوں کی زندگی سے بھی قریب آجاتی ہے۔

ایک کہانی ہے "حج اکبر" جس کا حوالہ بھی ڈاکٹر گوڈ نے نہایت تفصیل سے دیا ہے۔ یہ کہانی "دل بدست آور کہ حج اکبر است" کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ حج کا بہت بڑا ثواب ہے لیکن ایک بچے کی جان بچانے میں زیادہ ثواب ہے۔ اسے پریم چند "حج اکبر" کہتے ہیں۔

دراصل پریم چند مسلمان دوست ہی نہیں تھے۔ گاندھی جی کی طرح انسان دوست تھے اور گاندھی جی کی طرح ہی ہندو مسلم اتحاد کو اس انسان دوستی اور اور قومی تحریک آزادی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ بقول منشی دیا نارائن نگم کے

"پریم چند تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو مسلمان دونوں سے نالاں رہتے تھے۔ اور تنگ خیال پنڈتوں اور متعصب مولویوں دونوں کو ملک کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔"

اسی قسم کی سخت باتیں پریم چند نے فرقہ پرستی کے خلاف خاص طور پر ہندو فرقہ پرستی کے خلاف لکھیں۔ جب شدھی تحریک شروع ہوئی تو منشی پریم چند نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ واضح ہو کہ ہندو کانگریسی رہنما بھی اس تحریک کے خلاف آواز اٹھاتے ہچکچاتے تھے۔ مگر پریم چند نے اپنے مضامین میں خصوصاً اپنی کہانیوں میں شدھی اور اس کی مسلم جوابی تحریک "تبلیغ" دونوں کے خلاف کھل کر لکھا ہے۔

بے لوث رواداری، غیر متعصبی اور دوسرے مذہب اور دوسرے کلچر کی عزت کو پریم چند متحدہ قومیت کے جذبے کو ابھارنے کے لئے انہوں نے بے شمار کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔

دوسرا محبوب موضوع جو پریم چند کا تھا وہ تھا کسانوں کی زندگی اور ان کا استحصال۔ وہ جانتے تھے کہ یہ استحصال انگریز سامراج بھی کر رہا ہے اور ہندو مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعے کروا بھی رہا ہے۔ کسانوں سے یہ ہمدردی اور ان کے استحصال کی مخالفت پریم چند کو ترقی پسند ادیبوں کے بہت قریب لے آئی۔ سن پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس کے پہلے جلسے کی صدارت پریم چند جی نے کی تھی اور ان کا خطبۂ صدارت مدتوں تک ہمارے لئے ایک ادبی مینی فیسٹو رہا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا :-

"مختلف آدمی ترقی کے مختلف مطالب نکالتے ہیں۔ ترقی پسند وہ ہے جو ہمارے اندر عمل کی طاقت پیدا کرتا ہے۔ جو ہم سے وہ تمام داخلی اور خارجی حالات کا تجزیہ کراتا ہے جن کی وجہ سے ہم میں عمل کی طاقت چلی گئی ہے۔ اور ہم تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ترقی پسند ان تمام خامیوں کو دور کر کے ہم کو پھر انسان بناتی ہے۔

"ہم صرف اسی ادب کو ترقی پسند کہیں گے جو ہمیں اندھے اعتقاد سے ہٹا کر زندگی اور زندگی کی تمام قدروں کے بارے میں سوچنے پر اکساتا ہے، جو ہم میں آزادی کی روح پھونکتا ہے، جو ہم میں حسن کا احساس پیدا کرتا ہے، جو تخلیقی ہے، جو زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ نہیں چراتا، جو ہم کو عمل کے میدان کی طرف لے جاتا ہے، جو ہم کو افیم پلا کر سلاتا نہیں ہے کیونکہ اگر ہم ایسا ادب پیدا کریں گے جو ہمیں عمل کی بجائے بے عملی کی طرف لے جاتا ہے تو ہم زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھتے ہیں۔"

اس کے بعد پریم چند عملی طور پر اشتراکیت کے بہت قریب آگئے تھے اور یہ قربت ان کے نئے اور عظیم افسانے "کفن" میں ملتی ہے جس میں انہوں نے دیہاتی سماج کی نہایت بھیانک مگر سچی تصویر کشی کی ہے۔ اسی افسانے سے متاثر ہو کر مرنال سین نے اپنی ہندی اور تیلگو کی فلم "ایک گاؤں کی کہانی" نام سے بنائی۔ روس میں پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے اور ان کے کتنے ہی ایڈیشن وہاں کی مختلف زبانوں میں چھپے ہیں۔

پریم چند سچ مچ (جیسا کہ ان کے بیٹے کی کتاب کا ٹائٹل ہے) "قلم کے سپاہی" تھے۔ ان کا آدرش "ادب برائے ادب" نہیں تھا بلکہ "ترقی پسند ادب برائے زندگی تھا۔ زندگی سے ان کا مطلب زندگی کی بہترین اور ترقی پسند قدریں تھا۔ جو عوام کی بہبودی اور بہتری سے متعلق ہوں۔ اس لئے وہ ایسا ادب چاہتے تھے اور پیدا کرتے تھے جو عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھے۔ وہ عوام کی زندگی کی صحیح عکاسی ایسی کرتے تھے کہ غلط قدروں، توہمات وغیرہ سے ہٹ کر عوام کی نظر ترقی پسند قدروں پر لگ جائے۔

اس لئے پریم چند پر ہم جتنا فخر کریں کم ہے۔

ان کے ادب کا، ان کی کتابوں کا، ان کی قدروں کا جتنا پرچار کریں، وہ کم ہے۔

ان کی پیدائش کو سو سال ہونے کو آئے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ مادی حیثیت سے۔ مگر ان کا لازوال ادب ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہمارے لئے مشعل راہ کا کام دے گا!

باقر مہدی

کفن کا تجزیاتی مطالعہ

اردو افسانہ پریم چند سے الگ ہو کر کتنی ہی بار جست کر چکا ہے مگر داستانوں سے نکلنے کی پہلی جست پریم چند کی تھی اور آج ہم پریم چند سے اپنے رشتے استوار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ٹوٹتا ہوا تعلق جڑ بھی جائے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ہم اپنے اجداد کے ناخلف اولاد ہی کہلاتے رہیں۔

پریم چند ایک آزاد خیال مذہبی آدمی تھے۔ ان کا فن ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی ان کے ماحول میں بڑی حد تک قید تھا۔ وہ خاصے باشعور اور باضمیر ادیب تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے ماحول اپنی شخصیت اپنے فن کی محدود چار دیواری سے کبھی کبھی نکلنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ جیسے "کفن" میں۔ لیکن وہ نہایت محتاط، زیرک اور ہوشمند ادیب تھے۔ یہ خصوصیات مجھے کتنی ہی ناپسند ہوں مگر ناقابلِ برداشت نہیں ہیں۔ رشید صاحب نے ان سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا، "منشی جی آپ اپنے گاؤں کے نہیں معلوم ہوتے جتنے خود گاؤں ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ پریم چند چلتے پھرتے ہندستانی گاؤں تھے۔ یعنی وہی سادگی وہی بھولاپن بلکہ کسی حد تک احمقانہ معصومیت جو دیہاتی کی خصوصیت میں نرمی پیدا کرتی ہے۔ مجھے پریم چند کی شخصیت کا جو پہلو بہت پسند ہے وہ مسلسل پریشانیوں میں زندہ رہنے کی لگن ہے۔ مجاز نے اسی بات کو یوں کہا تھا ؎

صحرا ہو خار زار ہو وادی ہو آگ ہو
اک دن انہی مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

مجاز کے طفلی کے یہ خواب پورے ہوئے یا نہیں، البتہ پریم چند مسلسل معاشی پریشانیوں، صحت کی خرابی اور کسی حد تک ناقدری کا شکار تھے۔ اور وہ لوگ جو پریم چند کے ورثے کو اپنے سینے سے لگانے کے دعویدار ہیں ان سے کوئی جا کے پوچھے کہ کیا پریم چند کی یاد اسی طرح منائی جاتی ہے کہ پورے ملک میں نہ وہ شور و غلغلہ ہے جو جشن غالب اور اقبال کے سلسلے میں ہوا تھا اور نہ خاموشی سے ان پر سنجیدہ تنقیدی کام ہی ہوا ہے۔ فضیل جعفری نے سچ ہی کہا تھا ؎

غالب کے بعد جلسۂ اقبال چاہیے
روٹی مجاوروں کو بہر حال چاہیے

اور پریم چند کے مجاور اردو میں گنتی کے بھی نہیں ہیں اور ہم پریم چند کے سلسلے میں اسی پرانی بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ آیا وہ ہندی کے ادیب تھے یا اردو کے۔ پریم چند نے اپنے ایک خط میں کتنی دردناک بات لکھی تھی۔ یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو منشی دیا نرائن نگم کو اطلاع دی۔" اردو میں اب گذر نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دوں گا۔ اردو نویسی میں کسی ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہوگا؟" آج پریم چند کے یہ جملے میرے دل میں نشتر کی طرح چبھ جاتے ہیں۔ کاش وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر اور ان دنوں بلراج مین را، سریندر پرکاش، رتن سنگھ اور ساگر سرحدی وغیرہ کو اسی اردو سے فیض پہنچا ہے۔ دکھتی ہوئی یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ اردو افسانے کو ان لوگوں سے فیض پہنچا ہے۔ دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھنے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ برسوں سے پریم چند کی کتابیں تک نایاب ہیں۔ out of print ہیں۔ گئودان ایسا ناول بھی دوکانوں میں نہیں ہے۔

پریم چند کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شروع سے وہ شدید افلاس کا شکار رہے۔ ان کی صحت کی خرابی بھی اسی افلاس کا نتیجہ تھی۔ ان کے ایک مضمون "میری کہانی" کو پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ ان کی ابتدائی تحریریں اسی عذاب سے نکلنے کی کوششیں ہیں۔ اس مضمون کے چند

جلے نہیے اور آپ لمحا ایک لمحے کے لیے بھی اس غربت کی عبرتناک زندگی کے قائل ہو جائیں گے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے۔

"میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں گڈھے تو ہیں لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہے انہیں مایوسی ہوگی ....

پاؤں میں جوتے نہ تھے۔ بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ ..... اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا —— پانچ روپے تنخواہ ..... میں نے دو سو روپیہ میں گذر کر کے تین روپے گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھری میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا۔ بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا گھر سے کچھ برتن لایا، ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانج کر لائبریری چلا جاتا ... جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے۔ میری قوتِ ارادی کی باگ ڈھیلی ہو جاتی۔ للچائی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لیجاتیں، اور دو تین آنے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا ...... جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی۔ دو دو دن تک تو ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے ... ۱۸ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت یہ اٹھارہ روپے میری مایوس تمنا کی معراج تھے۔ ۱۹۱۸ء کی بات ہے ..... مہاتما جی (یعنی گاندھی جی) کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا ... غلامی سے نجات پاتے ہی نو سال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پا گیا۔ اس تجربے نے مجھے پورے طور پر قسمت پرست" بنا دیا۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی ہے"

یہ تحریر فروری ۱۹۳۲ء میں "ہنس" میں شائع ہوئی تھی۔

ان اقتباسات سے مجھے کسی قسم کے جذبۂ ترحم کو ابھارنا مقصود نہیں تھا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ پریم چند بھوک اور افلاس کی سطحوں اور گہرائیوں سے اچھی طرح واقف ہی نہیں تھے بلکہ وہ بحرِ غربت کے شناور ہی نہیں غواص بھی تھے۔ جب ہی وہ کسانوں کی زندگی کے اتنے سچے مرقعے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

پریم چند نے اپنے ادبی نظریات کو بھی نہایت صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا تھا تاکہ غلط فہمی یا خوش فہمی کا سدباب ہو سکے ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ آئے دن اپنے نظریات بدلتے رہتے تھے۔ ہاں ان کے ہاں واضح ارتقا ضرور ملتا ہے۔ ان کی زندگی پر سب سے زیادہ افلاس کے بعد گاندھی جی کے تصورات کا اثر تھا۔ اس کے علاوہ وہ مغربی ادب سے بھی خاصے واقف تھے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہیں اپنے فن کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اپنے ایک خط ۴ مارچ ۱۹۱۴ء میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں :

"مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کونسا طرز اختیار کرسکوں۔ کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں، کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں، آج کل کاؤنٹ ٹالسٹائے کے قصے پڑھ رہا ہوں۔ تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے، یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا ......" یہ بیان ایک حلیم الطبع منکسر مزاج شخص کا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال کی تھی مگر وہ خود تنقید کے ہنر سے بھی واقف تھے۔ انہیں عینیت اور حقیقت پسندی کے تنازع کی بھی صرف اطلاع نہیں تھی بلکہ ان کے ٹکراؤ کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے ایک مضمون ناول کے فن میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت پسندی اگر ہماری آنکھیں کھول دیتی ہے تو آدرش واد ہمیں اٹھا کر کسی سکون بخش مقام پر پہنچا دیتا ہے لیکن جہاں آدرش واد میں یہ خوبی ہے وہاں یہ خوف بھی رہتا ہے کہ ہم ایسے کرداروں کی تخلیق نہ کر بیٹھیں جو محض عقائد کی مورت ہوں، بے جان ہوں، کسی دیوتا کا تصور اور اس کی آرزو مشکل نہیں لیکن اس دیوتا میں انسانی روح کا پھونکنا مشکل کام ہے"

"ادب کا سب سے اونچا آدرش یہ ہے کہ اس کی تخلیق فن کی تکمیل کے لیے کی جائے، فن برائے فن کے اصول سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن وہی ادب قابلِ قدر ہو سکتا ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مظاہر پر رکھی جائے۔ محبت اور رقابت، غصہ اور حرص، عقیدت، تکلیف اور آسائش یہ سب ہماری مختلف ذہنی حالتیں ہیں۔ ان ہی جھلکیاں دکھانا ادب کا بنیادی مقصد ہے اور بغیر مقصد تو کوئی ادبی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی ہے۔"

میں پریم چند کے اقتباسات اس لیے دیتا جا رہا ہوں کہ وہ اپنے دور کے ادبی رجحانات سے واقف ہی نہیں تھے ان کے ناقد بھی تھے۔ وہ صرف مہاتما گاندھی کی جھلک دیکھ کر ان کے گرویدہ نہیں ہوئے بلکہ وہ گاندھی جی کی سیاسی رہنمائی کی سب سے زیادہ اہمیت جانتے تھے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ اس وقت تک یہ ملک آزاد اور خوشحال نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ کسانوں کی حالت اچھی نہیں ہوگی اور انہوں نے اپنے فن کو اسی نظریے کو پیش کرنے کے لیے کہیں کہیں قربان کر دیا ہے۔

پریم چند نے اپنے قلم کو صرف اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بنایا بلکہ اسے ایک تلوار کی طرح استعمال بھی کیا تھا۔ امرت رائے

نے جب ہی انہیں قلم کا سپاہی کہا تھا ۔ انہوں نے مختصر افسانے کے بارے میں ایک بڑی دلچسپ بات کہی تھی ۔" افسانہ عام انسانوں کے لیے لکھا جاتا ہے جن کے پاس نہ دولت ہے اور نہ وقت اور نہ فرصت ۔ یہاں تو اختصار ہی انتہائی کمال ہے ۔ مختصر افسانہ دھرپد کی وہ تان ہے جس میں فنکار محفل شروع ہوتے ہی اپنی تمام صلاحیتیں دکھا دیتا ہے ۔ ذرا سی دیر میں دل کو ایسا لطیف انداز سے اتنا مسحور کر دیتا ہے کہ جتنا رات بھر گانا سننے سے بھی نہیں ہو سکتا ۔" " یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح کسی زمانے میں شاعری ادبی اظہار کا محبوب ذریعہ تھی اسی طرح آج مختصر افسانہ ہے ۔ اعلیٰ ترین مختصر افسانہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی جائے ۔"

یہ ممکن ہے کہ پریم چند کے ناول اور کہانیاں ان کے اپنے اصولوں پر پورے نہ اتریں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ فن کی پیچیدگیوں سے آشنا ضرور تھے ۔ ان کا کمزور پہلو ان کی زبان ہے ۔ گو کہ شبلی نے کہا تھا کہ پانچ کروڑ مسلمانوں میں اس ایک کافر کی طرح کوئی دلنشیں اردو نہیں لکھ سکتا ہے ۔ مگر مجھے آج ان کے ناول اور بیشتر کہانیاں پڑھتے ہوئے ان کے الفاظ کی نشست و برخاست جملے کی ترتیب اور حد سے زیادہ سادگی کہیں کہیں عیوب نظر آتی ہے ۔ اس کے باوجود پریم چند کے پاس کئی افسانے اور ایک شاہکار افسانہ موجود ہے اور وہ کفن ہے ۔

کفن سب سے پہلے اردو میں لکھا گیا ۔ یہ افسانہ میرے بہترین افسانوں میں شامل نہیں ہے ، جسے پریم چند نے ۱۹۳۳ء میں مرتب کیا تھا ۔ اردو میں یہ کتاب بہت بعد میں چھپی ۔ کفن 'جامعہ' میں دسمبر ۱۹۳۵ میں شائع ہوا تھا ۔ اس کو بہت بعد میں شہرت ملی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پریم چند نے غیر شعوری طور سے فلمی تکنیک کو اپنایا تھا اور یہ تکنیک اس وقت خاصی نئی تھی ۔ پریم چند بمبئی سے واپس آ چکے تھے وہ اپنے ادبی زندگی کے آخری دور میں نقطہ عروج پر پہنچ چکے تھے ۔ وہ "گئودان" لکھ چکے تھے اور نیا ناول شروع کرنے سے پہلے "آرام" کے وقفے میں یہ افسانہ لکھا گیا تھا وہ عموماً ایک نشست میں افسانہ لکھتے تھے ۔ اکثر نظر ثانی نہیں کرتے تھے ۔ مگر کفن کو نظر ثانی کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔

مجھے یہ افسانہ پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے ، یہ گھیسو اور مادھو کی کہانی نہیں ہے بلکہ باپ اور بیٹے کے نازک ٹوٹتے جڑتے ہوئے رشتے کی تجزیاتی پرکھ ہے اور دونوں کو درد کی زنجیر منسلک کیے ہوئے ہے ۔ اس میں کوئی میلوڈرامہ نہیں ہے ۔ یہ نیچرلزم سے آگے کی بات ہے ورنہ حقیقت نگاری کا بار بار ذکر کرنے کے باوجود پریم چند کے یہاں ، نیچرلزم کی گہری پرچھائیاں ملتی ہیں ۔ ان کے کردار سفید اور سیاہ میں الگ تقسیم نہ ہونے کے باوجود سفید و سیاہ لکیروں میں اور دائروں میں گرفتار نظر آتے ہیں ۔ کفن نیک و بد خیر و شر کی کشمکش کی کہانی بھی نہیں ہے ۔ کفن پر جو کلبیت کا الزام لگایا جاتا ہے تو اس سلسلے میں چیخوف کا یہ قول ہی جواب ہو سکتا ہے

NO LITERATURE COULD OUTDO REAL LIFE

LOWER DEATH کے ۔ ہاں اس میں گورکی کے IN CYNCISM کی طرح کی سفاکی ملتی ہے لیکن سفاکی بھی انسانیت آمیز ہے ۔ اس کی تلخی میں آخری لذت تلخی کی نہیں ہلکی سی شیرینی کی ہے ۔ اس کہانی میں پریم چند نے کم از کم مکالمے رکھے ہیں اور پند و وعظ سے بھی گریز کیا ہے ۔ اپنی طرف سے بھی بہت کم جملے لکھے ہیں یعنی جہاں تک ممکن ہوا ہے اس کو تراش خراش کر پیش کیا ہے ۔

پہلا منظر مکمل خاموشی کا ہے ، صرف دردِ زہ میں مبتلا ایک عورت کی دل دہلا دینے والی چیخیں ہی سناٹے کی فضا کو چیرتی جاتی ہے ۔ ایک بجھے ہوئے الاؤ کے پاس دو نیم برہنہ سائے نما انسان بیٹھے ہوئے آلو بھون کر کھا رہے ہیں ۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو FOMAN نے WRETCHED OF THE EARTH کا لقب دیا تھا اور یہ لوگ آج بھی زندہ ہیں لیکن اب الاؤ کے لیے لکڑیاں عنقا ہیں ۔

پریم نے اپنی کہانی کی رفتار نہایت دھیمی رکھی ہے اس لیے کہ کوٹھری میں درد میں تڑپتی ہوئی عورت کی پوری بیکسی کو صرف اس کی چیخوں میں بیان کیا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ساتھ انسانی سماج اور فطرت دونوں کی بے رحمانہ سفاکی کو بلا کم و کاست کم از کم الفاظ میں بیان کرنا چاہتے ہیں ۔ چماروں کے ایک کنبے کی مختصر کہانی ہے جو ان پر کیے جانے والے صدیوں کے مظالم کو بیان کرتی ہے ۔

کیا واقعی گھیسو اور مادھو بالکل نکمے تھے ؟ ایسا نہیں تھا ۔ پریم چند نے اپنی کہانی کے تانے بانے میں ایک ایسا بھی پیراگراف رکھا ہے جو نکالا جا سکتا تھا مگر جو اس میں کھپ جاتا ہے کہ اس سے پہلے کا مکالمہ اس کو اپنے میں جوڑ لیتا ہے ۔ مادھو کہتا ہے ۔ " میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا ؟ سونٹھ ، گڑ ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں ۔"

"۔۔۔ کچھ آ جائے گا بھگوان بچہ دیں تو ۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے ۔ میرے نو لڑکے ہوئے ، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا ۔"

اس کے بعد وہ پیراگراف آتا ہے جو مجھے کبھی کبھی غیر ضروری لگتا ہے اور کبھی کبھی نہیں ۔ ......

اس پیراگراف کے چند جملے ملاحظہ ہوں ۔

" جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے

فائدہ اٹھانا جانتے تھے ۔ کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی نیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی ۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا، اور کسانوں کے تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا ۔"

میں اس کو کہانی سے الگ اس وقت سمجھتا ہوں جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ کہانی کی رفتار اور بھی آہستہ ہو جاتی ہے ، دوبارہ غور کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ کہانی آہستہ خرام ہے کہ Standstill ہونے کا گمان ہوتا ہے اس لیے اس کا ہونا چنداں گراں نہیں گذرتا ہے ۔

یہ کہانی تین مختصر حصوں پر مشتمل ہے ۔ گھیسو واقعی دنیا کے کاٹ پیچ سے واقف ہے ۔ جب ہی تو یہ کہتا ہے "اب کوئی کیا کھلانے گا ، وہ جمانا دوسرا تھا ، اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے ۔ ساری بیاہ میں مت کھرچ کرو ، کریا کرم میں مت کھرچ کرو ۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے ۔ مگر بٹورنے میں تو کوئی کمی نہیں ہے ۔ ہاں کھرچ میں کپھایت ہوتی ہے ۔" ـــــ اور پہلے حصے کو پریم چند نے لانگ شاٹ سے منعکس کرتے ہوئے ختم کیا ہے ۔

"ـــــ آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے ، جیسے دو بڑے اژدر کینڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی ۔" اس حصے میں Back ground پس منظر میں عورت کی چیخیں اور کراہیں ایک طرح کی دردناک موسیقی کو پیش کرتی ہیں جو دل کو ہلا کر رکھ دیتی ہے اور گھیسو اور مادھو کی بظاہر معمولی باتوں کو سنگین بنا دیتی ہے ۔

دوسرا حصہ عورت کی لاش سے شروع ہوتا ہے اس میں دونوں کی سادگی پر گریہ و بکا کی نقاب چڑھا دی گئی ہے ۔ غریب اگر واویلا کرے بھی تو اس کا یہ روز کا معمول ہے ، کون اس پر دھیان دیتا ہے ۔ پریم چند نے اس سفاکانہ سماج کی نہایت بیباکی سے فنکارانہ تصویر کشی کی ہے جس میں امیر و غریب دونوں مسخ ہو کر رہ گئے ہیں ۔ یعنی دونوں کے یہاں درندگی ہے ۔ ایک کی مہذب نظر آتی ہے دوسرے کی نہیں ! اس لیے کہ ایک کو اپنے کلچر میں اپنی وحشت چھپانے کا آرٹ آتا ہے لیکن دوسرا تو یہ روپ دھار نہیں سکتا ۔ وہ گریہ و بکا ہی کی نقاب پہن سکتا ہے ۔

اس افسانے میں پریم چند نے زمیندار کو درندہ بنا کر پیش نہیں کیا ہے ۔ ان کے بارے میں چند تیکھے جملے بھی لکھے ہیں....

" زمیندار صاحب رحمدل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا ۔ جی میں تو آیا کہہ دیں چل دور ہو یہاں سے ، لاش گھر میں رکھ کر سڑاو کو ۔ بلانے سے بھی نہیں آتا ۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے حرام خور کہیں کا بدمعاش ۔" مگر یہ غصہ و انتقام کا وقت نہیں تھا ۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیے ۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ منہ سے نہ نکالا ۔ ـــــ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی ۔"

دوسرا حصہ بھی عورت کے ذکر پر ختم ہوتا ہے ۔

" گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش کو آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا جاتی تھیں ۔

تیسرا حصہ افسانے کی انتہا اور خاتمہ ہے اس میں کوئی غیر ضروری جملہ نہیں ہے ۔ اور افسانے کی رفتار ایک دم تیز ہو جاتی ہے اور کفن پر باپ بیٹے بحث کرتے ہیں مگر ساری گفتگو طنزیہ Irony کے پیرائے میں ہے اور یہ پریم چند کی نفسیاتی دروں بینی کا کارنامہ ہے ۔ دونوں کفن کو فالتو اس لیے قرار دیتے ہیں کہ اس کثیر رقم یعنی پانچ روپے سے عیش کریں ۔ میں نے شروع میں پریم چند کے افلاس کا بیان اسی لیے کیا تھا تاکہ 'کفن' کے تجزیے میں اس سے مدد مل سکے ۔ یہاں گھیسو اور مادھو بھی شراب خرید کر دو سیر پوریاں تلی ہوئی مچھلی وغیرہ کھاتے ہیں اور پھر سزا و جزا کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہیں ۔ یعنی پیٹ بھرا ہی ان مسائل پر گفتگو کرتا ہے ۔

افسانے کے یہ جملے ملاحظہ ہوں ۔

" دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو ۔ (پہلے پریم چند دونوں کو اژدر کہہ چکے ہیں اور یہاں شیر سے مشابہ کرتے ہیں ۔) جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر ، ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا " ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا ۔"

مادھو نے فرط عقیدت سے سر جھکا کر تصدیق کی ـــــ " جرور سے جرور ہوگا ۔ بھگوان تم انتر جامی ہو اسے بیکنٹھ لے جانا ۔ ہم لوگ ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں ۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا ۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں تشویش پیدا ہوتی ہے اور وہ سوال کرتا ہے گھیسو بولتا ہے ۔

" تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملے گا ۔ تو مجھے گدھا سمجھتا ہے ، میں ۶۰ سال دنیا میں کیا گھانس کھودتا رہا ہوں ۔ اس کو کپھن ملے گا ، اس سے بہت اچھا ملے گا ۔"

اب دونوں پُر اعتماد لوگوں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں اب یہ اپنے جنگل کے شیر ہیں ۔

پریم چند اس موڈ کی عکاسی کرنے کے بعد دوسرے لمحے رقت کے موڈ کو پیش کرتے ہیں ۔ مادھو روتا ہے تو گھیسو کسی عقیدت مند شخص کی طرح نہایت "گہری" بات کہتا ہے ۔

"ـــــ کیوں روتا ہے بیٹا ، خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی ،

(بقیہ صفحہ ۱۸۰ پر)

ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند کا سماجی اور طبقاتی شعور

کسی ادیب کا سماجی یا سیاسی شعور کوئی معنی نہیں رکھتا اگر وہ اس کے تخلیقی شعور کی جمالیاتی اور فکری امارت کا ضامن نہیں ہوتا۔ اگر کسی فنکار کا سماجی یا سیاسی شعور بہت بالیدہ اور بلند ہے لیکن وہ اس کی تخلیقات میں منعکس ہوکر انھیں فنی اعتبار سے گہرائی اور دلکشی نہیں بخشتا یا وہ اس کی تخلیقات پر میکانکی یا معکوسی طور پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کی اہمیت صفر سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یہ حقیقت کسی شرح کی محتاج نہیں ہے کہ تخلیقی ادب میں سماجی شعور کی کارفرمائی اس طرح نہیں ہوتی جس طرح کسی تاریخ داں یا ماہر سماجیات کی تحریروں میں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ادب کی تخلیق کا عمل اور اس کی ماہیت کے عناصر دوسرے انسانی علوم سے مختلف ہی نہیں آزاد بھی ہیں۔ بلاشبہ ادب بھی دوسرے علوم کی طرح انسانی علم و آگہی کی ترسیل کا وسیلہ ہے۔ لیکن یہ اس کی ماہیت اور سماجی معنویت کا ایک رُخ ہے۔ اس کے دوسرے قابل اعتنا پہلوؤں کا تعلق انسانی تہذیب اور انسانی نفسیات سے ہے۔ انسانی جذبات، احساسات اس کی روحانی کیفیات اور اس کے پر اسرار ذہنی عمل کو حسن آفریں لفظی پیکروں میں ادا کرنا ہی ادب اور اس کی تخلیق کا ترکیبی عمل رہا ہے۔ بڑے ادب کی شناخت میں بھی یہی نسخۂ کیمیا ہمیشہ کارگر سمجھا گیا ہے۔ اس لئے جب ہم پریم چند کے سماجی شعور کی بات کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے ذہن میں پہلے سے ہوتی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کو جدید افسانوی ادب میں جو مقبولیت ملی ہے اور جو کلاسیک کا درجہ حاصل ہوا اس میں ان کی سماجی بصیرت کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اور ہر بصیرت کو انھوں نے اگر ہمیشہ نہیں تو بارہا تخلیقی ضبط و نظم اور فنی شعور کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اور یہ ان کا سماجی شعور جس میں ان کا طبقاتی، تاریخی اور عصری شعور بھی شامل ہے نوعی اعتبار سے ان کے دوسرے معاصرین سے مختلف تھا۔ میری مراد ہے راشد الخیری، سلطان چندر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری جیسے ادیب۔ ان ادیبوں کی تخلیقات بلاشبہ سماجی شعور سے عاری نہیں ہیں۔ لیکن ان کے شعور کی نوعیت اور مزاج نہ صرف پریم چند بلکہ باہمی طور پر بھی دوسرے سے مختلف ہے۔ راشد الخیری کا سماجی شعور نذیر احمد اور شرر سے بھی زیادہ محدود، جذباتی اور بے بضاعت ہے۔ سلطان حیدر جوش انگریزی تعلیم اور علی گڈھ تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود سماجی معاملات اور مسائل میں تنگ نظر اور قدامت پرست ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم صرف متوسط طبقہ کی قدامت پرستی اور ضعیف الاعتقادی سے الجھتے ہیں۔ اور جدید ترکی کے روشن خیال متوسط طبقہ کی طرح اسے قومی زندگی اور تہذیب کی رہنمائی سونپنا چاہتے ہیں۔ نیاز فتحپوری جو اردو میں حریت فکر و اظہار اور ذہنی غلامی کے خلاف سرکشی کی ایک معتبر روایت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جنھوں نے "نگار" "ملاخطات" اور "باب استفسار" میں سینکڑوں قومی اور بین الاقوامی مسائل پر عقلی اور آزادانہ نقطۂ نگاہ سے اظہار خیال کیا ہے۔ اپنی تخلیقات میں سماجی مسائل سے گریز کرتے ہیں۔ عورت یا عشق و محبت کے بارے میں بھی ان کا رویّہ عقلی نہیں بلکہ جذباتی اور جاگیردارانہ ہے۔

پریم چند کے بارے میں نیاز فتحپوری نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "پریم چند بڑے پایہ کے افسانہ نگار تھے لیکن وہ اتنے سربھرے نہیں تھے کہ صرف رومان نگار ہوکر رہ جاتے"۔ دوسری طرف پریم چند نے ایک خط میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ خواہش کے باوجود تخیلی حسن اور زبان بیان کی دلکشی سے معمور ایسے افسانے لکھنے کی قدرت نہیں رکھتے جیسے کہ حضرت نیاز لکھتے ہیں۔ اس گریز کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ اپنے معاصرین میں پریم چند کے فن کا امتیاز، انفرادیت اور کمال کا ایک اہم سبب ان کا سماجی شعور یا حیات اجتماعی کے بارے میں ان کا وہ رویّہ تھا جو ناگزیر طور پر ابتدا سے آخر تک ان کے تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل میں شریک غالب رہا ہے۔ جس نے ان کی تخلیقات کو روح عصر سے مالامال کر دیا۔ اور جو انسانی تہذیب انسانی نفسیات

کائنات اور دوسرے مظاہر حیات سے فرد کے رشتوں کی تفسیر و تعبیر میں ان کو روشنی بخشتا رہا۔ اس شعور حیات کا تدریجی نشو و نما عہد بہ عہد ان کے فن کی داخلی اور خارجی ہیت میں بھی تبدیلیاں لاتا رہا۔

پریم چند اپنے معاصرین سے اس لحاظ سے مختلف تھے۔ اور یہ اختلاف ان کی شخصیت کا غالب رجحان تھا کہ سماج میں ہونے والے ظلم و جبر، بے انصافیوں اور ہر طرح کے استحصال کے بارے میں ان کا ردعمل زیادہ شدید ہوتا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس ظلم اور بے انصافی کے سماجی اور نفسیاتی اسباب بھی تلاش کرتے تھے ۱۹۰۲ء میں لکھے ہوئے اپنے پہلے مطبوعہ خام اور ناتمام ناول "اسرار معابد" میں انھوں نے بڑی جرأت اور بے رحمی کے ساتھ مندروں کے مہنتوں، پروہتوں اور پجاریوں کے ان گھناؤنے جرائم کو بے نقاب کیا ہے۔ جو وہ سیدھے سادے انسانوں کا روپیہ اور زیور ہی نہیں ان کی عصمت و ناموس پر ڈاکہ ڈال کر کرتے ہیں۔ اس عہد میں اس شعر کو اس مضمون کو نظم کر دینا تو آسان تھا لیکن ناول کی واقعاتی زبان میں ان جرائم کی زندہ تصویریں دکھانا بڑے جان جوکھم کا کام تھا۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء کے مختصر وقفے میں ہندوستان میں حب الوطنی اور قوم پرستی کے مبہم اور سیال جذبات ایک ٹھوس پیکر میں ڈھلنے لگے ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ہاتھوں روس کی ایک بڑی زارشاہی طاقت کی شکست تقسیم بنگال کی تحریک کے خلاف غم و غصہ اور اس کے اظہار کیلئے بدیسی سامان کے بائیکاٹ کی تحریک۔ ۱۹۰۶ء سے کلکتہ کے اجلاس میں سودیشی سوراج اور قومی نظام تعلیم کے نعروں کی گونج اور ۱۹۰۷ء کے سورت کے اجلاس میں گرم دل اور نرم دل میں کانگریس کی تقسیم۔ تلک کے ہاتھوں کانگریس کی تحریک کا جارحانہ اور احتجاجی صورت اختیار کرنا اور دوسری طرف بنگال سے بہار تک دہشت پسند انقلابیوں کا ۱۹۰۸ء میں بم کے دھماکوں کے ساتھ نمودار ہونا۔ یہ سارے واقعات ایسے تھے جن سے نہ پریم چند بے خبر تھے اور نہ انگریز۔ پریم چند کی ساری ہمدردیاں تلک کے مسلک کے ساتھ تھیں۔ اس لئے جون ۱۹۰۸ء میں جب پریم چند کے وطن پرستانہ افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" سامنے آیا تو برطانوی حکومت نے اُسے ضبط کر لیا۔ اس کی داستانی طرز کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن ہے اس کے انجام میں جنگ آزادی میں زخمی ہونے والا وطن پرست نوجوان کہتا ہے

"تو مسافر ہے تو آ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیوں کہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے ...... افسوس ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا .... تو نے یہ کیا مرہم رکھ دیا خون نکلنے دے اسے روکنے سے کیا فائدہ۔ میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کیلئے زندہ ہوں۔ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا"۔

سوز وطن کی دوسری کہانی شیخ محمود کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

"ملک جنت نشاں کی تاریخ میں وہ بہت تاریک زمانہ تھا جب شاہ کشور کی فتوحات کا سیلاب بڑے زور شور کے ساتھ اس پر آیا۔ سارا ملک پامال ہو گیا۔ آزادی کی عمارتیں ڈھے گئیں۔ اور جان و مال کے لالے پڑ گئے۔"

غلامی کے نتیجے میں یہ پامالی اور بربادی کیسی تھی، اس کی تصویر تیسری کہانی "یہی میرا وطن ہے"۔ میں پریم چند نے کھینچی ہے۔ کہانی کا ہیرو تقریباً نصف صدی امریکہ میں گذار کر ہندوستان واپس آتا ہے۔

"وہ ایک ناقابل بیان مسرت کے ساتھ تیزی سے گاؤں کے قریب آ رہا تھا کہ اسے وہ نالہ دکھائی دیا جہاں وہ اور اس کے ساتھی ساتھی ہنستے اور غوطے لگاتے تھے مگر اب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چہار دیواری تھی۔ اور سامنے ایک میدان تھا جس میں دو تین انگریز بندوقیں لئے ہوئے ادھر اُدھر تاک رہے تھے۔ اور اس کا شکستہ جھونپڑا خاکستر ہو گیا تھا...... وہ اس برگد کے پیڑ کی طرف دوڑا جس کے خوش گوار سائے میں بچپن کی بہاریں گذاری تھیں اسے دیکھ کر رقت طاری ہو گئی۔ وہ پچھلی باتیں یاد کر کے گھنٹوں زمین پر بیٹھا روتا رہا۔ ... برگد کے درخت کے قریب تھانہ تھا۔ برگد کے نیچے کرسی پر کوئی لال پگڑی باندھے بیٹھا تھا۔ دس بیس لال پگڑی والے آس پاس دست بستہ کھڑے تھے اور ایک نیم برہنہ آدمی چابکوں کی مار کھا کر پڑا سسک رہا تھا۔"

یہ ہے پریم چند کے سماجی اور سیاسی شعور کا نقطۂ آغاز۔ غلامی کی شرمناک لعنتوں کا کربناک احساس برطانوی سامراج کے تسلط اور استحصال کے نتیجہ میں ملک کی تباہی اور تاراجی کا احساس اور یہ شعور کہ اس غلامی میں سب سے زیادہ تباہ ہوتے طبقے ملک کے کسان اور دست کار ہیں۔ کانٹے دار تار۔ بندوقیں لئے ہوئے انگریز۔ جھونپڑے کا خاکستر ہونا۔ سایہ دار برگد کے نیچے اب لال پگڑی والوں کا ہجوم اور ایک نیم برہنہ آدمی کا ہنٹر کھا کر تڑپنا اور سسکنا۔ یہی وہ کہانیاں تھیں جنھیں انگریز بہادر کو بغاوت کی بو آئی۔

یہ اقتباسات کچھ تفصیل سے میں نے اس لئے دیئے کہ پریم چند کے سماجی شعور کی تعمیر و توسیع اسی اساس پر ہوئی اب تک اپنی زندگی کا بڑا حصہ گاؤں میں گذارنے کی وجہ سے پریم چند سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں تھی کہ گاؤں کی معیشت تیزی سے تباہ ہو رہی ہے۔ بے رحمانہ استحصال کے علاوہ خشک سالی، قحط اور وباؤں نے بھی دست افتادوں کو جانوروں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۱ء تک گاؤں کے کھیت مزدوروں کی تعداد ساڑھے سات لاکھ سے بڑھ کر اکیس لاکھ ہو گئی تھی۔

ستمبر ۱۹۱۱ء میں شائع ہونے والے پریم چند کے پہلے حقیقت پسندانہ افسانے "بے غرض محسن" کا ہیرو ایک خود دار اور غیور کسان تخت سنگھ ہے جو کھیت مزدور بن جاتا ہے یہی تخت سنگھ گاؤں کے زمیندار کے بیٹے ہیرامن کو ڈوبنے سے بچاتا ہے۔ اور میلے کی بھیڑ میں گمنام اور روپوش ہو جاتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے۔

"دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن تھا اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے تھے۔

"اساڑھ کا مہینہ آیا۔ میگھ راج نے اپنی جاں نشیں فیاضی دکھائی۔ ہری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزو مند نگاہیں ان کے ساتھ ساتھ جاتیں یہاں تک کہ زمین انھیں اپنے دامن میں چھپا لیتی۔"

ایک کسان کی محرومی اور روحانی اذیت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اسے کسان سے مزدور بنا دیا جائے۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک پریم چند نے خون سفید اندھیر۔ صرف ایک آواز اور بانکا زمیندار جیسے افسانے لکھے جن میں مذہب، ذات پات، پولیس، مہاجنوں اور زمینداروں کے ہاتھوں کسانوں کی بربادی اور اس کے خلاف ان کی برہمی کے واقعیت پسندانہ قصے سنائے اور بتایا کہ دیہی سماج میں کسان کی بربادی اور مفلوک الحالی کی جڑیں کہاں تک پہنچی ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں کوئی منظم کسان تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ نہ اشتراکی خیالات نے بار پایا تھا۔ اور نہ ہی مہاتما گاندھی نے شہر کے متوسط طبقہ کو ان کروڑں انسانوں سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ جو گاؤں میں بستے تھے اس لئے اس دور میں پریم چند کا یہ شعور کہ ہندوستان کے بنیادی مسائل گاؤں میں رہنے والے کروڑوں کسانوں، ہریجنوں اور کھیت مزدوروں کے مسائل ہیں گاؤں سے پریم چند کے جذبۂ اتحاد ان کا ذاتی تجربے اور مشاہدے کی دین تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کچھ ہی سال بعد اعظم کریوی، سدرشن اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں گاؤں کی زندگی کا جو تصور ابھرتا ہے اس کی ترکیب میں جذباتی اور تخیلی عناصر کا زیادہ دخل ہے۔ جیسے شہر کے ہنگاموں، مادیت اور خود غرضیوں کے مقابلے میں گاؤں زیادہ پرسکون، پرحاقیت اور روحانی اور اخلاقی قدروں سے مالامال ہے۔ گاؤں کی بدحالی کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے جیسے افسانہ نگار ترس کھا رہا ہو۔ پریم چند ٹالسٹائی کی طرح غریب اور مجبور کسانوں کی سادگی اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف پر زور دینے کے باوجود ان کے رشتوں اور رویوں کو حقیقت پسندانہ ڈھنگ سے اس طرح دکھاتے ہیں جیسے ان میں سے ہوں۔ ان کی صف سے نکل کر آئے ہوں۔

اس طبقاتی جذبہ اتحاد نے ان کے افسانوں میں واقعیت کا گہرا رنگ بھرا ہے یہ واقعہ بھی قابل توجہ ہے کہ ۱۹۱۸ء سے پہلے ان کے افسانوں میں حقیقت پسندانہ رویہ ان کے آدرشواد پر حاوی ہے۔ جبکہ اس کے بعد درمیانی دور میں صورت حال مختلف ہو جاتی ہے۔ جس کا اثر ان کے آرٹ پر بھی پڑتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں بڑی نتیجہ خیز تبدیلیاں آئیں۔ کانگریس کے امرت سر اجلاس کے بعد مہاتما گاندھی — مولانا محمد علی اور دوسرے رہنماؤں کی سرکردگی میں لاکھوں محبان وطن عدم تعاون اور خلافت تحریک میں شریک ہوئے۔ پریم چند بھی فروری ۱۹۲۱ء میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر اس آگ میں بے خطر کود پڑے۔ اس کے بعد زیادہ آزادی اور زیادہ بے باکی سے انھوں نے تحریک آزادی میں مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ستیہ گرہ اور ترک موالات کی اس تحریک کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ پہلی بار ہندوستان کے لاکھوں کسان، مزدور اور اچھوت بھی اس میں شریک ہوئے۔ اور برطانوی حاکموں یا انگریزوں کا جو خوف اور رعب ہندوستانیوں پر طاری تھا وہ ان کے دلوں سے نکل گیا۔ پریم چند کے اس دور کے افسانوں اور ناولوں میں ایسے ہیرو، مرد عورت نظر آتے ہیں جو ستیہ گرہی ہیں۔ وہ حکومت سے اور ان طاقتوں سے جو بدی اور غلامی کی علامت ہیں عدم تعاون کرتے ہیں اور قربانیاں دیتے ہیں۔ لیکن یہ پریم چند کے عصری شعور کا ایک پہلو ہے۔ اس دور میں ان کے سماجی شعور کی تربیت کو سمجھنے کیلئے ہمیں کچھ اور حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ اس دور میں پریم چند مہاتما گاندھی کی شخصیت اور ان کے تصورات خاص طور پر ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ لیکن اسی زمانے میں روس کے اکتوبر انقلاب کی کامیابی نے بھی ان کے عوام دوست اور سرکش ذہن کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ فروری ۱۹۱۹ء کے زمانہ میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا ہے۔

"آنے والا زمانہ اب کسانوں اور مزدوروں کا ہے"۔

دنیا کی رفتار اس کا صاف ثبوت دے رہی ہے" پھر لکھتے ہیں۔

عوام کی اس ٹھہری ہوئی حالت سے دھوکے میں نہ آئیے۔ انقلاب سے پہلے کون جانتا تھا کہ اس مظلوم عوام میں اتنی طاقت چھپی ہے۔

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کا یہی وہ زمانہ ہے جب ملک کے بعض دوسرے علاقوں کی طرح یو۔پی کے کسان اور اچھوت بھی افلاس، قحط سالی اور ظلم و تشدد سے تنگ آ کر بغاوت پر آمادہ تھے۔ ڈاکٹر بدھا پرکاش اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں۔

The 3rd. great centre of peasant was U.P. The unrest started from Pratabgadh district and spread to neighbouring districts. On june 13-14 1921 the peasants of the Faizabad district joined the non-violent movement and held mammoth demonstration at several places. In Rae Bareilly the demonstrations were organised by the peasant union. The peasant

turned the properties of the land-lords, refused to pay taxes and forcibly rescued their comrades from arrest. The uprising quickly spread. It engulfed the Bareilly and Gorakhpur districts.

The peasant of lower castes, Madaris etc. started the EKA on the union of peasants. It counselled the peasants to stay on in their fields, when illegally asked to vacate them to pay only fixed slents— to refuse begar and insist on right to use pastures ponds and jungles." Reflections on the agrarians uprisings of nineteen twenties. Nehru Muslim seminar P. 579, 1970.

پریم چند اس زمانے میں گورکھپور ہی میں تھے۔ اور اپنے گرد وپیش کسانوں کی اس بغاوت برہمی اور سرکشی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اور لکھن پور گاؤں کے بارے میں اپنا ناول گوشۂ عافیت لکھ رہے تھے۔ اس ناول کے کسانوں منوہر بلراج، قادر خاں کو کم وبیش ان ہی مسائل کا سامنا ہے جن سے یو۔ پی کے کسان دوچار ہو رہے تھے۔ منوہر اور بلراج بھی زمیندار کے ظلم وجبر کے خلاف بغاوت کرتے ہیں یہ جرأت اور حوصلہ انھیں جن ذرائع سے ملتا ہے ان میں روس کا اکتوبر انقلاب بھی ہے۔ بلراج کہتا ہے کہ "روس میں کسانوں کا ہی راج ہے وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ ہم اب بیگار کیوں کریں۔"

ظلم اور بے انصافی کے خلاف کسانوں کی یہ سرفروشانہ جدوجہد، اکتوبر انقلاب کی کامیابی سے ہم آہنگ ہو کر پریم چند کے ذہن میں طبقاتی بیداری کی ایک زبردست لہر پیدا کرتی ہے۔ جس کی دھمک ان کے اس دور کے افسانوں اور ان کے ڈرامہ "سنگرام" میں بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ واضح طور پر ہندوستانی سماج کو ایسے طبقوں میں بٹا ہوا دیکھتے ہیں جن میں ایک طرف زمیندار، راجے، مہاراجے، مہاجن اور نیا ابھرتا ہوا سرمایہ دار طبقہ ہے جو اپنے طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لئے سامراجی حکومت کا محتاج اس کا وفادار اور آلۂ کار ہے۔ تو دوسری طرف کسان اور مزدور ہیں جن کو اپنے مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لئے ان طبقوں اور طاقتوں سے نبرد آزما ہونا ہے۔ یہ بات پریم چند کے ذہن میں صاف اور روشن تھی۔ اور یہ بھی کہ اس جنگ میں آخری فتح کسانوں اور مزدوروں کی ہوگی۔ پریم چند متوسط طبقہ کی موقع پرستی رعونت اور مفاہمانہ روش سے بھی نالاں تھے ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ کی اصلاحات کی اسکیم کے بارے میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں۔

"اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ اسامیاں زیادہ مل جائیں گی اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے۔ اس طرح یہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔"

ستیہ گرہ کی عوامی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"تعلیم یافتہ جماعت کا اس (تحریک) سے کنارہ کش رہنا کتنا دل شکن ہے۔ قانون پیشہ طبابت پیشہ، پروفیسر اور سرکاری ملازمان، ان سب نے جتنی غلامانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے اس کی مجھے امید نہ تھی۔ یہ طبقہ اپنی خیریت گورنمنٹ کے اقتدار قائم رہنے میں سمجھتا ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی آسائش اور دنیا طلبی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ یہی اس کا دین و ایمان ہے۔ وہ یا تو آزادی چاہتا ہی نہیں یا اس کے لئے قیمت نہ دے کر دوسروں پر تکیہ کرنا ہی اپنی شان کے مناسب سمجھتا ہے..... وہ صرف دیکھ رہا ہے کہ جو کچھ اسے ملا ہے جسے اب وہ اپنا حق سمجھتا ہے۔ وہ دوسروں کے ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ بورژوا فضا ہے جو نادار فرقہ کا دشمن بنا دیتی ہے۔" منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے صفحہ ۱۶۸-۱۶۷۔

دراصل ۱۹۳۲ء تک جو بات پریم چند کے ذہن میں جو صاف اور واضح نہیں تھی وہ یہ تھی کہ طبقاتی جنگ (جس میں آخری فتح بہرحال محنت کش طبقہ کی ہونا ہے) ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لڑی جائے یا منظم احتجاج اور اجتماعی قوت سے جس میں تشدد بھی شامل ہے۔ ان کی اس دور کی تحریریں شاہد ہیں کہ کم وبیش دس سال تک وہ اس تشکیک اور تذبذب کا شکار رہے۔ اگرچہ اس دور میں ان کا زیادہ میلان گاندھی جی کے زیر اثر عدم تشدد کی طرف ہی تھا۔ یہی دور ملک میں مہاتما گاندھی کے عروج اور اقتدار کا دور تھا۔ سیاسی سماجی تعمیری ہر تحریک پر ان کی چھاپ تھی۔ ان کی قیادت میں جو لڑائی لڑی جا رہی تھی اس میں متوسط طبقہ کے افراد رہنمایانہ رول ادا کر رہے تھے۔ وہ اس لڑائی میں سمجھوتے بھی کرتے ہیں اور غدّاری بھی اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے ذہنی اور اخلاقی پستی کا بھی شکار رہتے ہیں۔ پریم چند کے اس دور کے ناولوں اور کہانیوں میں ایسے کردار کثرت سے ملتے ہیں جو اہنسا کے پردے میں محنت کش اور وطن پرست عوام کے مفادات سے غداری یا بے وفائی کرتے ہیں۔ پریم شنکر (گوشۂ عافیت) دنے سنگھ (چوگان ہستی) چکر دھر (پردۂ مجاز) اور امرکانت (میدان عمل) ایسے ہی کردار ہیں۔ جو اپنے طبقہ کی مفاہمانہ اور خود پرستانہ ذہنیت سے دست بردار نہیں ہو پاتے۔ دوسری طرف پریم چند نے ان ناولوں میں منوہر، دیرپال سنگھ، سوامی آتمانند اور سورداس جیسے باغی کردار بھی پیش کئے ہیں۔ جو کسانوں کی صف سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے طبقہ کے مفادات اور اپنے آدرشوں کا کسی قیمت پر سودا نہیں کرتے۔ لیکن سورداس کے علاوہ ان میں سے کسی کردار

کو پریم چند ناول میں نمایاں حیثیت نہیں دیتے۔ ہیرو نہیں بناتے۔ حالاں کہ یہی وہ کردار ہیں جو طبقاتی سماج کی انقلابی قوتوں کو سمجھتے اور ظلم و استحصال کی طاقتوں کے خلاف ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن ناول میں وہ اپنے انقلابی حوصلوں کی ایک دو جھلکیاں دکھا کر روپوش ہو جاتے ہیں۔ صرف سور داس ہی ایک ایسا کردار ہے جو اپنی زمین کی حفاظت میں پورے عزم و استقلال کے ساتھ ستیہ گرہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس جہاد میں شہید ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال نے پریم چند کے مارکسی ناقدین کو حیران کر دیا ہے کہ وہ اپنے عہد کے طبقاتی سماج کے بنیادی تضادات کا شعور رکھنے کے باوجود اپنے ناولوں میں انقلابی طاقتوں کو ابھارنے سے گریز کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں وہ مہاتما گاندھی کے Change of heart. تالیف قلب کے اخلاقی نظریہ کے مطابق برسر اقتدار یا ظالم طبقہ کے افراد کو بھی اپنے مفادات اور اپنی پر آسائش زندگی سے دست بردار ہو کر مظلوم کسانوں اور مزدوروں کا حامی اور ہمنوا بنا دیتے ہیں۔ رانی جاہنوی، اندو، صوفیہ، سلیم، سکھدا، لالہ امر کانت اور اعلیٰ طبقہ کے دوسرے اشخاص بڑی آسانی سے تالیف قلب کے عمل سے گزرتے ہیں۔ پریم چند کے اس تضاد اور داخلی تذبذب نے ان کے اس دور کے افسانوں اور ناولوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا کر دی تھیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے کردار خارجی عمل اور اجتماعی حالات وحوادث کی لہروں پر کاغذی ناؤ کی طرح بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے اپنے وجود کی تہ داری ان کی باطنی کشمکش اور انفرادی غور و فکر کے نقوش دھندلے رہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کا انجام بھی۔ جو اکثر کسی سمجھوتہ یا ڈرامائی تبدیلی پر ہوتا ہے۔ سماجی ارتقاء کے عمل اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے تسلی بخش اور فطری معلوم نہیں ہوتا۔

پریم چند کے ذہن ان کے شعور حیات اور ان کی تخلیقی فکر کے اس تضاد کی جڑیں ان کے عہد میں ہی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں احیاء پسندانہ، اصلاحی، فلاحی، دہشت پسندانہ اور انقلابی الغرض ہر طرح کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ اس لئے پریم چند کی تحریروں میں جو اپنے عہد کی جیتی جاگتی زندگی کو بہ تمام و کمال پیش کرنا چاہتے تھے تضادات کا راہ پا جانا فطری تھا۔ اور ان تضادات سے ان کی ذہنی اثر پذیری بھی اگر فطری نہیں تو امکانی ضرور تھی۔ لیکن یہ محنت کش طبقہ کے مقدر سے ان کا جذبہ یگانگت تھا کہ ۱۹۳۲ء کے بعد زندگی کے آخری چند سالوں میں وہ ان تحریکوں کے فریب اور کھوکھلے پن سے مایوس اور بیزار ہو گئے۔ یہ حقیقت ان پر روشن ہو گئی کہ سیاسی آزادی کا حصول ہو یا کسانوں ہریجنوں اور مزدوروں کا استحصال، ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہو یا قومی زبان اور تہذیب کا۔ ستیہ گرہ، اہنسا اور بورژوا سیاست کے تدبر سے حل نہیں ہو سکتا۔ ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ سامراجی اور طبقاتی مفادات ان کی دولت اور طاقت محنت کش عوام کے اتحاد، آزادی اور سیاسی بیداری کی راہ میں دیوار کی طرح حائل ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں کہ وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہیں پریم چند نے دو ٹوک کے طور پر لکھا ہے کہ میں اس زمانے کی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں بلکہ میں اس آنے والی سیاسی پارٹی کا رکن ہوں جو ہندوستان کے عوام کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے گی۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک پریم چند نے اپنے رسالے جاگرن اور "ہنس" میں قومی اور بین الاقوامی صورت حال پر جو اداریے اور مضامین لکھے ہیں وہ ان کے ذہنی سفر کے اس موڑ کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں خاص طور سے وہ مضامین جو انھوں نے روس کے اکتوبر انقلاب اور اس کے پانچ سالہ منصوبوں کی کامیابی کے تعلق سے لکھے ہیں۔ اس سلسلہ کا آخری مضمون "مہاجنی تہذیب" ہے۔ جس میں انھوں نے کھلے ذہن سے ایک غیر طبقاتی منصفانہ سماج کی تعمیر کے لئے اشتراکیت کو لبیک کہا ہے.... لکھتے ہیں۔

"دور پچھم سے اب ایک نئی تہذیب کا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ جس نے اس ناٹکئے مہاجن وادیا پونجی واد کی جڑ کھود کر پھینک دی ہے..... زندہ رہے وہ تہذیب جو سرمایہ داری اور نجی ملکیت کا خاتمہ کر رہی ہے....... یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے کہ یہ تہذیب کسی خاص ملک کے سماجی حالات یا اس کے دھرم مذہب سے میل نہیں کھاتی۔"

رویے کی اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا طبقاتی شعور زیادہ صاف تیکھا اور کارگر ہو گیا۔ ستیہ گرہ، اہنسا انفرادی اصلاح اور اخلاقی قوت کے جادو پر سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا۔ اب وہ سماجی حقائق کو تاریخی عوامل اور طبقاتی آویزش کے شفاف آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اس سے ان کے فن میں زیادہ توانائی۔ تہ داری اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے بے شک "گئودان" میں پروفیسر مہتا اور گووندی کے کرداروں میں ان کے آدرش واد کی جھلکیاں ضرور مل جاتی ہیں اس لئے کہ اس ناول کا بڑا حصہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی عقلی دانش سماجی شعور اور طبقاتی تجزیہ کے زیادہ معتبر اور معیاری نمونے ان کے سامنے آخری دور کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ اب وہ عورت کو صرف محبت خدمت، ایثار اور وفاشعاری کے پیکر میں نہیں دیکھتے بلکہ مرد کے اقتدار اور جبر و تحکم کے خلاف اور اپنے انسانی حقوق کے تحفظ میں اسے احتجاج اور بغاوت کرتا ہوا دکھاتے ہیں۔ کسم، پدما، مالکن اور نئی بیوی جیسی کہانیوں میں وہ عورت کو ضعیف الاعتقادی اور رسم و رواج کی زنجیروں سے الجھتا ہوا اور اپنی شخصیت کے آزادانہ نشوونما کے لئے جد و جہد کرتا ہوا دکھاتے ہیں۔ اسی طرح ہریجنوں اور اچھوتوں کے بارے میں اب وہ اس فریب کا شکار نہیں رہتے کہ اعلیٰ ذات کے افراد کے ضمیر کو جگا کر انھیں سماج میں مساوی انسانی حقوق مل جائیں گے۔ نجات۔ دودھ کی قیمت اور کفن جیسی کہانیوں میں وہ ان کے بے دریغ استحصال اور افلاس کو جس نے انھیں حیوانوں سے بدتر بنا دیا ہے۔ بے رحمانہ واقعیت پسندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

گئودان میں بھی اس عہد کے سماج کا طبقاتی تجزیہ ان کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ تالیف قلب، ستیہ گرہ۔ اہنسا اور انفرادی

اصلاح پسندی کے ہتھیار میں انہوں نے جو بارہ سال گزار رہے تھے اور جس نے ان کے سماجی شعور کو دھندلا اور اس کی دھار کو کند کر دیا تھا۔ گئودان میں وہ اس سے باہر نکل آتے ہیں۔ زمیں دار ساہوکار پروہت اور متوسط طبقے کے دانشوروں کو وہ ناول میں اس عہد کے تاریخی تناظر اور ان کے طبقاتی نفسیات کے آئینے میں ہی پیش کرتے ہیں۔ گاؤں کے سماج سے تعلق رکھنے والے کردار بھی اس لئے جاندار ہیں کہ پریم چند نے کسی خاص تصویر یا نظریہ کی تصدیق اور تبلیغ کے لئے انہیں وضع نہیں کیا بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدے سے ان کے وجود میں واقعیت کا رنگ بھرا ہے۔ ہوری بھی اپنے طبقے اور اپنی پیڑھی کے کسانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ جن قدروں، جن سماجی رشتوں پر ایمان رکھتا ہے وہ جاگیردارانہ زرعی معاشرے کی اقدار اور رشتے ہیں۔ محبت، مروّت، وضع داری، صبر و تحمل اور اپنی زمین پر ناز جس کو بچانے کے لئے وہ اپنا سب کچھ، یہاں تک کہ اپنی بیٹی کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایسا اس لئے کرتا ہے کہ پریم چند نے اس کو ایسا ہی دیکھا اور پایا تھا۔ بقول ممتاز حسین ہوری ہمارے سامنے ایک فریادی کی حیثیت سے آتا ہے اس کا کام بغاوت کا علم بلند کرنا نہیں۔ لیکن پریم چند گوبر اور دھنیا کے کرداروں میں غصّہ، برہمی اور احتجاج کی اس سلگتی ہوئی آگ کو بھی دکھاتے ہیں جو ظلم اور بے انصافی پر قائم اس پورے استحصالی نظام کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پریم چند صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیچیدگیوں اور اس کے تضادات کا گہرا شعور نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس کی مذمّت انہوں نے کم و بیش اسی شد و مد سے اور اسی نقطۂ نگاہ سے کی ہے جو اقبال کی بعض نظموں میں نظر آتا ہے۔ یہ اس کی بنیاد محنت کش طبقے کے استحصال پر ہے۔ اس میں بخشی ہوئی جمہوریت، آزادی ایک فریب ہے اور یہ کہ اس نظام میں زر کے رشتوں اور نفسانی خواہشوں کا فروغ انسان کو اخلاقی اور روحانی طور پر کھوکھلا کر دیتا ہے۔ دونوں اس نظام میں برق و بخارات مشینوں اور صنعتوں کی ترقی سے خائف ہیں کہ یہ ان کے قریب جوہر انسانیت کو فنا کر دیتی ہے۔ دونوں آزادی، انصاف اور انسانیت کی بقاء کے لئے ایک ایسے سماج کی تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں جو رنگ و نسل، ذات پات اور طبقاتی تقسیم سے پاک ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس نظام کی حاکمیت پریم چند مزدور اور کسانوں کو سونپتے ہیں جبکہ اقبال محنت کش طبقے کی حاکمیت سے بھی خائف نظر آتے ہیں اور اسے دین سے جوڑ کر قانونِ الٰہی کو حاکمیت کا دستور العمل قرار دیتے ہیں۔ سماج میں عورت کی حیثیت اس کے حقوق اور دائرۂ کار کے بارے میں بھی دونوں کا روّیہ آخر وقت تک کچھ ایسے تحفّظات کا حامل ہے جنہیں قدامت پسندانہ ہی کہا جائے گا۔ دراصل یہی وہ مقامات ہیں جہاں اقبال اور پریم چند دونوں کے سماجی فکر کے تضادات ابھرتے ہیں۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ ان میں سے کوئی بھی مارکسی، اشتراکی، انسان دوستی کی قدروں کو عزیز رکھا۔ دونوں کی سماجی فکر کے ارتقاء میں تسلسل کے باوجود ایسے مرحلے آتے جب ان کے سماجی افکار میں ماورائی، اخلاقی اور دینی تصوّرات کی آمیزش ہوئی۔ پریم چند نے کسان اور محنت کش طبقے سے اپنی وابستگی اور جذبۂ اتحاد کی بنیاد پر اپنی سماجی فکر کو ان عناصر سے آزاد کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی جبکہ اقبال کی سماجی فکر آخر تک ان سے آزاد نہ ہو سکی۔ ●●

پریم چند کی یاد میں ---
"صد سالہ جشنِ پیدائش" منانے کے لئے سوویت یونین میں تیاریاں

ہمارے مقبول و معروف ہندوستانی ادیب پریم چند کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کا پروگرام تیار کرنے کے لئے ایک اجلاس ماسکو میں سوویت امن کمیٹی کے دفتر میں منعقد ہوا۔ اس میں صحافیوں، ریڈیو نامہ نگاروں، علم الہند کے ماہروں، ہندوستانی ادب کے مترجموں، سوویت ہند دوستی سوسائٹی کے ارکان، ماسکو میں ہندوستانی برادری کے نمائندوں نے شرکت کی جن میں ہندوستانی سفارت خانے کے عملے کے لوگ شامل تھے۔ ہندوستانی سفیر مقیم سوویت یونین مسٹر آئی۔ کے۔ گجرال بھی اجلاس میں شریک ہوئے۔

کمیشن کے نائب چیرمین یفگینی چلیسف نے سوویت یونین میں پریم چند پریم چند کی تصنیفات کے مطالعہ کی تاریخ اور ان کی تخلیقات کے ترجمے اور اشاعت پر مفصّل روشنی ڈالی۔ پریم چند کی کتابیں سوویت یونین کی چودہ زبانوں میں ۳۵ مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۵ لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ اس ادیب کے متعدد افسانے مختلف رسالوں، اخبارات اور مختلف مجموعوں میں سوویت قوموں کی تقریباً تمام زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔

کمیشن کے ایگزیکیٹو سکریٹری ایکسی سی جیٹ (لسانیات کے ڈاکٹر) نے تقریبات کے پروگرام پر روشنی ڈالی جس میں چھ کتابوں کی اشاعت شامل ہے۔ ان میں پریم چند کے تخلیقی کام کے مختلف پہلوؤں کے تذکرے ہوں گے۔ ان کے خالق ماسکو، لینن گراڈ، تاشقند اور دوشانبے کے اسکالر ہوں گے۔ پروگرام کے تحت اہم ادبی رسالوں اور اخبارات میں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے پریم چند پر مضامین نشر ہوں گے ماسکو، لینن گراڈ، تاشقند، دوشانبے اور دوسرے شہروں میں اس موقع پر جلسے ہوں گے، کتابوں کی نمائش منعقد ہو گی اور ادبی نشستوں میں پریم چند کے افسانے سنائے جائیں گے۔ پریم چند کی صد سالہ یوم پیدائش پر سوویت یونین ایک بڑے جشن کا اہتمام کر رہا ہے جس کی تیاریاں بڑے زور و شور سے وسیع پیمانے پر جاری ہیں۔ ●●

شمس الرحمٰن فاروقی

پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو

بعض افسانوں کی روشنی میں

افسانہ ایک عجیب دغریب صنفِ سخن ہے، اس معنی میں کہ یہ شاید وہ واحد صنف ہے جس میں فنکار کو ایک ایسی ذاتی اور داخلی کش مکش سے واسطہ پڑتا ہے جس کا اکثر اسے احساس بھی نہیں ہوتا، یا اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اس کا مداوا نہیں کر سکتا۔ اس کش مکش کو سادہ زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کردار یا واقعات یا مناظر کو کس طرح پیش کرے؟ کیا یہ مناسب ہے کہ جس کردار یا واقعے کو وہ اچھا سمجھتا ہے اس کے بارے میں وہ صاف صاف کہہ دے یا واضح اشارے تو ضرور کر دے کہ وہ اس کردار یا واقعے کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ مناسب نہیں، کیونکہ اس کا مطلب کم سے کم یہ ہوا کہ افسانہ نگار اپنی رائے یا اپنے تعصبات کو قاری پر مسلّط کرنا چاہتا ہے، اور یہ طریق کار حقیقت نگاری کے منافی ہے، کیونکہ حقیقت نگاری کا مطلب یہ ہے کہ اشیا جیسی بھی ہیں ویسی پیش کر دی جائیں اور قاری کو اس کا حق دیا جائے کہ وہ ان کے بارے میں اپنے نتائج آپ ہی نکالے۔ اگر افسانہ نگار یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ فلاں انسان اچھا ہے کیوں کہ میں اسے اچھا سمجھتا ہوں تو وہ قاری پر ظلم کرتا ہے، اس کی آزادی کو سلب کرتا ہے اور اس طرح حقیقت نگاری کے بجائے ایک طرح کے جبر کا استعمال کرتا ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ وہ خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے کی تفسیر ہوتا ہے، ہر بات افسانے کے بطن سے نکلتی ہے، افسانہ نگار قاری کی گردن پکڑ کر اس سے کہتا نہیں کہ دیکھو فلاں بات اچھی ہے اس کو قبول کرو، فلاں بری ہے اس سے گریز کرو۔ لیکن کیا یہ واقعی ممکن ہے کہ افسانہ نگار اپنے کرداروں اور واقعات کے بارے میں بالکل غیر شخصی رویہ اختیار کر لے اور کسی بھی طرح یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ کسی کردار یا منظر کے بارے میں خود اس کی اپنی رائے کیا ہے؟ ممکن ہے کہ شعوری طور پر افسانہ نگار پوری کوشش کرے کہ وہ اپنی ہمدردیاں، اپنے تعصبات، اپنی پسند ناپسند، اپنے تاثرات کو پس پشت ڈال دے، لیکن غیر شعوری طور پر وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے یا اس طرح کہہ جاتا ہے کہ قاری پر اس کا جبر قائم ہو جاتا ہے یا قائم ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ ہر افسانہ نگار جانتا ہے کہ اُسے کرداروں اور واقعات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ ان میں گڑھنت اور پہلے سے تجویز کردہ نتائج و انجام کا شائبہ نہ ہو، کیونکہ اگر گڑھنت اور پہلے سے تجویز کردہ انجام کا شائبہ بھی نظر آ جائے گا تو افسانے کی گرفت کمزور ہو جائے گی، وہ واقعے کی جگہ دھوکے کی ٹٹی یا کٹھ پتلی کا کھیل معلوم ہونے لگے گا جس میں کردار وہی کچھ کرتا اور بولتا ہے جو افسانہ نگار چاہتا ہے، کردار کی آزادانہ حیثیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ قاری کہے کہ مثلاً یہ مرزا صاحب نہیں ہیں بلکہ پریم چند کا ایک روپ ہیں۔ یہ کہنے کے بجائے کہ جمن شیخ نے الگو چودھری نے مقدمے کا فیصلہ کیا، یہ کہنا پڑے گا کہ پریم چند نے پریم چند کے مقدمے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ افسانے کا سارا فن اسی کش مکش کے درمیان ڈوبتا ابھرتا ہے۔ افسانہ نگار کو اکثر خبر بھی نہیں ہوتی لیکن وہ پٹی دار یعنی حریف یا دوست یا رقیب بن جاتا ہے۔ دستہ ئفسکی نے اسی کش مکش کا احساس کر کے یہ کہا تھا کہ اپنے بعض کردار اسے بے حد ناپسند تھے اور بعض ایسے تھے جنہیں وہ کچھ بنانا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ اور بن بیٹھے۔ ارسطو نے المیہ کردار نگاری کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ المیہ نگار ایک طرح کے الوہی جنون کا پابند ہوتا ہے اور المیہ کی تخلیق کرتے وقت جس کردار کو وہ بیان کر رہا ہوتا ہے اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ افسانوی فاصلے کی انتہائی شکل ہے، کیونکہ جب میں خود وہی کردار بن بیٹھا جو اچھا ہے یا برا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود اس کردار کے بارے میں میری کوئی رائے نہیں ہے، میں خود ہی وہی شخص ہوں، میں اچھا ہوں کہ برا ہوں، اس کے بارے میں فیصلہ میرا نہیں بلکہ میرے قاری کی طرف سے ہوگا۔

لیکن افسانوی فاصلے کی یہ شکل ڈرامے میں تو قائم ہو سکتی ہے (چاہے شکل سے ہی قائم ہو) لیکن افسانے میں، جو قدم قدم پر بیان کا سہارا لیتا ہے اور جو اشیا کو اسٹیج پر نہیں بلکہ کاغذ کے صفحے پر بیان کرتا ہے، اتنا فاصلہ نہیں برقرار رہ سکتا۔ ڈرامہ نگار کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ لیڈی میک بتھ کی شکل صورت کیسی ہے، لیکن پریم چند کو یہ بتائے بغیر چارہ نہیں کہ مالتی اور متیا کی صورتیں کیسی ہیں۔

اور جہاں بیان کا عنصر آیا، افسانہ نگار کا تعصّب کام کرنے لگتا ہے، یعنی وہ اس کش مکش میں گرفتار ہوجاتا ہے کہ کیا بتلائے اور کس طرح بتائے۔ یہاں تو کہنا آسان ہے کہ "شام کا وقت تھا ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے کے لئے تیار ہو رہے تھے، موٹر دروازے پر کھڑی تھی" لیکن اگلے ہی جملے میں مشکل کا سامنا ہوتا ہے جب وہ کہتے ہیں! "بوڑھے نے دھیرے دھیرے آکر دروازے میں پڑی ہوئی چک میں سے جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے اسے خدشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کوئی جھڑک نہ دے" کیونکہ اس جملے سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی ہمدردیاں بوڑھے کے ساتھ ہیں، ڈاکٹر چڈھا کے ساتھ نہیں، لیکن اگر وہ یہ نہ بتائیں کہ صاف ستھری زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے بوڑھے کو جھڑکی کا خدشہ تھا تو نہ بوڑھے کا کردار قائم ہوتا ہے اور نہ ڈاکٹر چڈھا کا۔ ڈاکٹر چڈھا کی صفائی پسندی، ان کی خشونت، ان کی اصول پرستی اور بوڑھے کی غریبی، بے چارگی، بے سائیگی، غرض مندی، یہ سب باتیں اس ایک جملے میں عیاں ہوجاتی ہیں۔ اس طرح جملہ بیک وقت بیانیہ اسلوب کے کمال اور افسانہ نگار کی بے ایمانی کے کمال کی دلیل ہے۔ کیونکہ محض ۳۲ الفاظ میں دو کرداروں کے نقوش، ان کے ماضی وحال سب کو روشن کر دینا معمولی بات نہیں۔ لیکن یہ بے ایمانی یوں ہے کہ پریم چند اپنے قاری کی گردن پہلے ہی پیراگراف میں دبوچ کر اس سے کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ دیکھو، سنو، سمجھو، میری ساری ہمدردی، ساری محبت اس بڈھے کے ساتھ ہے۔ افسانے کا جبر اتنا زبردست ہوتا ہے کہ قاری کو خبر بھی نہیں ہوتی اور افسانہ اس کا دین ایمان سب چھین لیتا ہے۔ کوئی اور شخص کہے کہ ڈاکٹر چڈھا نہایت روکھے اصول پرست اور کج خلق شخص ہیں تو ممکن ہے کہ میں اس کی بات ماننے سے انکار کر دوں، یا اور کچھ نہیں تو ثبوت مانگوں۔ لیکن افسانہ نگار جو بھی کہہ دے، ہم اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ افسانہ نگار نے کہا کہ ڈاکٹر چڈھا شام کو مریضوں کو نہیں دیکھتے بلکہ گولف کھیلنے جاتے ہیں اور ہم نے یقین کر لیا۔ افسانہ نگار نے کہا کہ ڈاکٹر چڈھا کا ایک جوان، خوبصورت اور ہونہار بیٹا ہے جس کا نام کیلاش ہے اور ہم نے یقین کر لیا۔ افسانہ نگار نے کہا کہ کیلاش اور ایک نوجوان حسینہ مالتی میں عشق ہے اور ہم نے یقین کر لیا۔ افسانہ نگار نے کہا کہ کیلاش کو سانپ پالنے کا شوق ہے اور ہم نے یقین کر لیا۔ کوئی سند، کوئی دلیل، کوئی گواہ ضروری نہیں۔ افسانے کی شرط ہی یہ ہے کہ افسانہ نگار اور قاری کے درمیان ایک غیر تحریری لیکن ناقابلِ شکست معاہدہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار جو بھی کہے یا بتائے، قاری اس پر اعتماد کرے گا۔ وہ افسانہ نگار جو ناقابلِ یقین اور بعید از قیاس باتیں لکھتے ہیں ان سے قاری کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ تم بعید از قیاس یا ناقابلِ اعتبار باتیں لکھ رہے ہو، بلکہ شکایت یہ ہوتی ہے کہ تم نے فلاں فلاں واقعات یا کردار کے لئے مناسب پس منظری حالات نہیں مہیا کئے جن کی روشنی میں وہ واقعات یا کردار بعید از قیاس نہ رہ جائے۔ چنانچہ ارسطو نے، جو یونانی المیے کے بعید از قیاس واقعات کا سخت نکتہ چیں ہے، اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ کسی واقعے کے ہونے کا احتمال ہی اس کی واقفیت کی دلیل ہے۔ اور اگر کوئی واقعہ تاریخی ہے تو پھر اس کے بعید از قیاس ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پریم چند کو یہ مقولہ بہت پسند تھا کہ افسانے میں سب کچھ سچ ہوتا ہے سوائے نام اور تاریخ کے، اور تاریخ میں سب کچھ جھوٹ ہوتا ہے سوائے نام اور تاریخ کے۔ یعنی افسانہ ایک طرح کی تاریخ ہوتا ہے، اور کسی بات کے سچ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہی یہ ہے کہ تاریخ اس پر گواہ ہو۔

اس طرح افسانہ نگار کو قدم قدم پر بے ایمانی کا لالچ رہتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ افسانے میں جو کچھ بھی لکھ دے گا قاری اسے قبول کر لے گا۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو اگر وہ بیان نہ کرے تو کردار نگاری مکمل نہ ہوگی، لیکن اگر بیان کر دے تو اس کی غیر جانب داری مجروح ہوگی۔ پریم چند بھی اس نکتے سے پوری طرح آگاہ تھے، لیکن جیسا کہ "منتر" نامی افسانے کے اقتباس سے ظاہر ہوا ہوگا، وہ کردار کی تصویر کشی کو غیر جانب داری کے اقتباس پر ترجیح دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ "منتر" اسی وجہ سے ناکام افسانہ ہے کہ کردار کی بے مثال تصویر کشی کے باوجود وہ اپنے اسلوب میں غیر جانب دارانہ رنگ قائم نہ رکھ سکے اور سانپ کا زہر جھاڑنے والے بوڑھے اور ڈاکٹر چڈھا دونوں کرداروں میں غیر معمولی فنی چابک دستی کے باوجود آخری تجزیے میں یہ دونوں کردار محض پریم چند کی کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے۔ لہٰذا قاری کو ایک دھوکے کا احساس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ اسی طرح ہو جس طرح پریم چند نے بیان کیا ہے، لیکن اپنی ہمدردیاں پوری طرح ظاہر کر دینے کی وجہ سے وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تمام کامیاب اور متمول ڈاکٹر بے مروّت اور سنگ دل ہوتے ہیں اور بے مایا لوگ بامروّت اور رحمدل ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ افسانوی اسلوب ایک طرح کی نقاب پوشی کا تقاضا کرتا ہے، محض اعلیٰ درجے کی کردار نگاری کا نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ کردار نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار اپنی رائے، تاثر اور ہمدردی کو بے نقاب نہ کرے بلکہ اگر اسے یہ سب پیش بھی کرنا ہے تو اسلوب کے ان طریقوں کو اختیار کرے کہ قاری پر اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو یا بہت کم ہو۔ زیر بحث افسانے میں تو پریم چند نے اتنے ہی پر بس نہیں کی ہے کہ پہلے پیراگراف میں بوڑھے کے خدشات کا تذکرہ کر کے ڈاکٹر چڈھا کی سرد مہری اور سنگ دلی کو واضح کر دیں۔ چند ہی جملوں بعد جب ڈاکٹر چڈھا بوڑھے کو دھتکار کر گولف کھیلنے چلے ہی جاتے ہیں تو پریم چند بوڑھے کے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں! "دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی تفریح

کے لئے دوسروں کی زندگی کی بھی پرواہ نہیں کرتے! شاید اس پر اب بھی اسے وشواس نہ ہوتا تھا۔ مہذب دنیا اس قدر سنگدل اور بے حس ہے، اس کا ایسا تعجب انگیز احساس اسے اب تک نہ ہوا تھا۔" یہاں تک پہنچتے پہنچتے قاری انصاف اور رحم کی دہائی دینے لگتا ہے۔ یہ باتیں تو افسانے کے پہلے ہی دو تین جملوں میں بیان ہو چکیں، اب ان کا ڈھول کیوں پیٹا جا رہا ہے؟ خاص کر جب اسی شور و غل کے باعث بوڑھے کے کردار کی معنویت اور شدّت بھی مجروح ہو رہی ہے۔ بوڑھا کوئی دودھ پیتا بچّہ نہ تھا، اور نہ دنیا سے دور کسی پہاڑ کے غار میں رہتا تھا کہ اسے شہر والوں یا پریم چند کی زبان میں "مہذّب دنیا" کے طور طریقوں کا پتہ نہ ہو۔ آگے پریم چند خود کہتے ہیں کہ بوڑھا "چاروں طرف سے مایوس ہو کر ڈاکٹر چڈھا کے پاس آیا تھا"۔ ظاہر ہے کہ چاروں طرف سے مایوس ہونے سے مُراد یہی ہے کہ اس نے اور ڈاکٹروں حکیموں کو بھی دکھایا ہوگا، اور "مہذّب دنیا" سے اس کی ملاقات پہلی بار ڈاکٹر چڈھا کے ذریعے نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن پریم چند کو اپنی ہمدردی اور رائے ظاہر کرنے، یعنی اپنے قاری پر جبر کرنے کی اتنی جلدی ہے کہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ افسانے کا جبر ایک دو دھاری تلوار ہے، اس سے قاری کا دین ایمان ہی نہیں، خود افسانہ نگار کا صحیفہ بھی قتل ہو سکتا ہے۔

تو پھر افسانوی اسلوب کیسا ہو؟ کیا اسلوب کی حیثیت موضوع سے ہٹ کر بھی متعین ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو موضوع کی اہمیت ہے یا اسلوب کی؟ لیکن اگر یہ فرض کیا جائے کہ اہمیت موضوع کی ہے تو پھر کیا یہ ثابت کرنا ممکن ہے کہ موضوع کوئی ایسی چیز ہے جسے الفاظ سے الگ کر کے دکھایا یا بیان کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوال بھی اُٹھ سکتا ہے کہ اگر موضوع کوئی جداگانہ شے نہیں ہے تو پھر اسلوب کا تصوّر آیا کہاں سے؟ اس سوال کا جواب تو یہ ممکن ہے کہ اسلوب کا تصوّر یعنی اس کا مجرد خیال، دراصل موضوع کی حیثیت کو سمجھ نہ پانے یا اس کی حیثیت کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات سمجھ لی جاتی ہے کہ موضوع ہی اسلوب ہے تو اسلوب کا الگ سے تصوّر بنانے یا فرض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ڈاکٹر چڈھا والے افسانے کی مثال شاید اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہو کہ افسانے کی ناکامی۔ (یعنی اس کے موضوع کی ناکامی) دراصل اس کے اسلوب کی ناکامی ہے۔ یہ سوال اکثر اٹھا ہے کہ اسلوب کی اساس دراصل کس چیز پر ہے، موضوع پر یا مصنّف پر یا اس کے عہد پر، یا زبان پر؟ اس سوال کے مختلف جواب مختلف زمانوں میں دیئے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں فرانسیسی نقاد بوفون (Bu-ffon) کا یہ قول اکثر نقل کیا گیا ہے کہ اسلوب دراصل شخصیت کا اظہار ہے۔ لیکن بوفون کا اصل قول Le style est l'homme meme اس کے انگریزی ترجمہ Style is the man اور اس کے اردو

ترجمے کے اسلوب دراصل خود شخص ہے سے کوئی خاص علاقہ نہیں رکھتا۔ یوں بھی یہ کہہ دینا کہ Style is the man دندان تو جلہ در دہانند کی طرح کی بات ہے کیونکہ اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اسلوب اگر شخصیت کا اظہار ہے تو پھر اسلوب کا مطالعہ چھوڑ کر شخصیت کا مطالعہ مفید ہوگا، لیکن شخصیت کے مطالعے سے یہ بات بالکل نہیں واضح ہوتی کہ پریم چند کہیں کہیں فارسی آمیز کہیں سادہ، کہیں کہیں بہت زیادہ عبارت آرائی پر مبنی اور کہیں کہیں تشبیہ و استعارہ سے بے حد مملو زبان کیوں لکھتے ہیں۔ شخصیت کا مطالعہ تو ہمیں صرف یہ بتاتا ہے کہ پریم چند ایک دل چسپ، دل کش، ہنسوڑ شخصیت کے مالک تھے۔ ان پر آریہ سماج کا بھی اثر تھا اور مہاتما گاندھی کا بھی۔ وہ رشوت سے گریز کرتے تھے لیکن اپنی تحریروں کے معاوضے کے بارے میں بڑے سخت تھے۔ وہ امتیاز علی تاج کے بجائے صبح امید کے مدیر کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ امتیاز علی تاج صرف بارہ روپے فی مضمون دیتے ہیں جبکہ صبح امید پندرہ سے بیس تک دینے کو تیار ہے۔ وہ ہندو مسلم ملاپ کے حامی تھے لیکن وہ ہندو کو ہندو اور مسلمان کو بھی مسلمان سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ شخصیت کے نقوش یا انسان کے ظاہری یا باطنی خد و خال دلکش ہوں یا نفرت انگیز، اسلوب کی دل کشی یا قوت یا محض خد و خال کا بیان یا توجیہ شخصیت کے حوالے سے نہیں ہو سکتا۔ اور یہ سکّہ اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے کہ افسانوی اسلوب کیسا ہونا چاہیئے۔ پریم چند یا کسی بھی افسانہ نگار کا اسلوب کیسا ہے، اس کا تعیّن اسی وقت ممکن ہے جب یہ طے ہو جائے کہ اسلوب کے عینی تقاضے کیا ہیں؟ اسلوب کے عینی تقاضے کی تعریف یہ کہہ کر ممکن نہیں ہے کہ اسلوب شخص کا اظہار ہوتا ہے، ہوتا ہوگا، لیکن اگر شخص کا اظہار ہے تو جتنے شخص اتنے اسلوب، ان میں اچھے بُرے یا کامیاب، ناکام کی تشخیص کیوں کر ہو؟ یہاں بات پھر اسی کشمکش کی طرف لوٹ جاتی ہے کہ جب افسانہ نگار اور قاری کے درمیان ایک زبردست معاہدہ موجود ہے کہ افسانہ نگار جو بھی کہے گا، قاری اس پر اعتبار کرے گا، تو کیا افسانہ نگار کی ذمّہ داری یہ نہیں ٹھہرتی کہ وہ کچھ بھی نہ کہے۔ صرف دکھلا دے! بیان نہ کرے، صرف پیش کر دے؟ لیکن اگر صرف دکھانا اور پیش کرنا ہی افسانہ نگار کا منصب ٹھہرا تو افسانہ کیوں لکھا جائے؟ افسانہ تو لکھا ہی اس لئے جاتا ہے کہ افسانہ نگار کو کچھ بیان کرنا ہے۔ لہٰذا افسانوی اسلوب دراصل بیان اور پیش کش کے درمیان کش مکش کا اظہار ہے اور یہ کشمکش زبان کی سطح پر طے ہوتی ہے یا ظاہر ہوتی ہے، اس لئے اسلوب کی اساس دراصل زبان پر ہے، نہ مصنف پر نہ موضوع پر۔ مصنف کا عہد اس پر ایک حد تک اثر انداز ضرور ہوتا ہے، لیکن پریم چند کی حد تک عہد کا اثر بہت کم ثابت ہو سکتا ہے، کیونکہ انہوں نے ایسے عہد کا آغاز خود ہی کیا۔ ان کے پہلے اردو ادب میں افسانے کا باقاعدہ وجود نہ تھا، اس لئے افسانے کا کوئی عہد ان کے پہلے یا

ان کے وقت میں موجود نہ تھا جس کی روشنی میں ان کا اسلوب کسی حد تک مرتب ہو سکتا ہے۔

فلوبیئر نے اسی کش مکش سے آزاد ہونے کے لئے پہلے تو یہ نظریہ پیش کیا کہ فن پارہ میں غیر شخصیت ہونا چاہیئے۔ اس نے مادام لو وائے داشانت پی mme Leroyer de chantpie کے نام ایک خط میں لکھا "فنکار کو اپنے فن پارے میں اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح خدا اپنی تخلیق میں نادیدہ لیکن مکمل قوت والا' جسے ہم جگہ محسوس کریں لیکن دیکھیں کہیں نہیں۔" مگر مشکل یہ ہے کہ بقول رولاں بارت "فن اور شخصیت کے درمیان لامحالہ ایک طرح کی discrepancy ہوتی ہے۔" فلوبیئر خدا بننا چاہتا تھا یعنی وہ حقائق کو اس طرح دکھانا چاہتا تھا جیسے کہ وہ دراصل ہیں لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے یا ثابت نہ ہو' صرف اس بات کا شک ہو جائے کہ یہ محض التباس ہے' یہ معاملہ اشیاء کا نہیں' بلکہ اشیاء کو محسوس کرنے کے طریقے کا ہے' تو کیا ہوگا؟ بقول پیٹرک سوئنڈن پھر اس کے دو ہی حل ممکن ہیں' یا تو ناول نگار اپنے شبہات کا اظہار ناول ہی میں کر دے یا پھر اصرار کرے' ضد کرے' قاری کو یقین دلائے یا مطمئن کرے کہ جو کچھ وہ لکھ رہا ہے وہ دکھاتا ہے' بتاتا نہیں۔ لیکن اشیاء جب ایک بار دیکھ لی جائیں یعنی ان کا ادراک کر لیا جائے تو پھر وہ اس ذات سے آزاد نہیں ہو سکتیں جس نے ان کا ادراک کیا ہے ادراک کرنے والی ذات سے آزاد نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس ذات کے ارادے' خواہشات' تقاضے' یہ سب اس کے ادراک پر اور اس طرح اس شے کی خود اپنی ہستی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر فنکار یا تو صرف انہیں چیزوں کا اظہار کرے جو اس کے اپنے بطون میں بند ہیں۔ اس کی اپنی ذات کا حصہ ہیں' یا اس بات پر صبر کرے کہ حقیقت کا جو بھی اظہار وہ کرے گا اس میں اس کا ذاتی رنگ شامل ہوگا' اور پھر بھی اسے اپنے قاری کو مطمئن کرنا ہوگا کہ یہی اصل حقیقت ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے فلوبیئر نے لوئیز کولے Louise Colet کے نام خط میں اپنی مشہور خیال کا اظہار کیا کہ اس کی نظر میں وہ کتاب بہترین ہے' وہ کتاب جس کی تخلیق کرنا اس کی تمنا ہے' جو محض نفی کے بارے میں ہو' یعنی کسی چیز کے بارے میں نہ ہو' ایسی کتاب جو کسی ظاہری شے سے متعلق نہ ہو' بلکہ اسلوب کی قوت سے اپنے کو قائم کرے۔ بہترین کتابیں وہی ہو سکتی ہیں جن میں مواد کم سے کم ہو سکن اظہار زیادہ سے زیادہ' یہاں تک کہ اظہار خالق فکر کی حد میں داخل ہو جائے۔ لیکن ایسا ہوتا کہاں ہے؟ اسلوب حقائق کو قائم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن درحقیقت جو کچھ قائم ہو جاتا ہے وہ حقائق کا وہ تاثر ہوتا ہے جو فنکار نے حاصل کیا ہوتا ہے' اس کی اصلیت اور جھوٹ کا ذمہ دار وہ خود ہوتا ہے مثال کے طور پر یہ افسانے کا ایک مشہور مفروضہ ہے کہ مکالمے میں وہی زبان لکھنی چاہیئے جو خود اصل کردار استعمال کرتا ہو' یا جو اس کردار کے مزاج اور ذہن سے مطابقت رکھتی ہو۔ پریم چند نے اس مفروضے پر ایک حد تک عمل کیا۔ لیکن اردو زبان جس طرح لکھی جاتی ہے اس میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اودھی بھوجپوری یا برج جیسی بولیوں کی آوازیں ظاہر ہو سکیں۔ اور نہ صرف یہ کہ آوازیں' بلکہ ان بولیوں کی قواعد بھی کھڑی بولی یعنی اردو سے بہت مختلف ہے' اس لئے درحقیقت ان زبانوں میں مکالمہ لکھنا گویا کئی زبانوں میں افسانہ لکھنا ہے' کیونکہ کوئی کردار بھوجپوری بولے گا' کوئی کھڑی بولی' کوئی اودھی' وغیرہ۔ پھر الفاظ کا تلفظ بدل کر لکھنے میں سیکڑوں طرح کی قباحتیں ہیں جن کا تعلق تلفظ کی ادائیگی میں مشکل سے لے کر مفہوم تک رسائی اور بدلے ہوئے تلفظ کے ساتھ لکھنے میں پیدا ہونے والی بدصورتی سے ہے۔ بالعموم حلال فی المقدور الفاظ کی اصل شکل بریکیٹ میں لکھ کر' یا نسبتاً مختلف زبان لکھ کر ہم کوشش کرتے ہیں کہ مکالمے کی زبان اور کردار کے ذہن و مزاج میں ممکن حد تک مطابقت پیدا ہو جائے۔ ورنہ عام طور پر قاری کو یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ وہ اصل مکالمہ نہیں بلکہ اس کا اردو ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ اس لئے پریم چند یا کسی بھی اردو افسانہ نگار کے اسلوب کی شان اس کے مکالموں میں اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ مکالمے میں اردو ترجمے کا بھی احساس ہو۔ اس حقیقت کو پرکھنے کے لئے "شطرنج کے کھلاڑی" کے مکالموں کا مقابلہ کسی ایسے افسانے مثلاً "راہِ نجات" کے مکالموں سے کیجئے جس کے کردار دراصل اردو بولنے والے نہ ہوں "شطرنج کے کھلاڑی" کے مکالموں میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں وہ کسی اور افسانے میں نہ ملیں گے' کیونکہ اس افسانے میں تمام کردار اپنی اصل زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور "راہِ نجات" کے کرداروں کا مکالمہ اصلی نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ یہ مکالمہ کامیاب اس لئے ہے کہ پریم چند اگرچہ کھڑی بولی میں لکھ رہے ہیں لیکن کرداروں کے ذریعے بیان ہونے والے خیالات کی سطح وہی یا تقریباً وہی ہے جس کی ہم کسی ان پڑھ گاؤں والے سے توقع کر سکتے ہیں۔ ان مکالموں کی قوت ان کے نام نہاد اصلی پن میں نہیں' بلکہ بات میں ہے کہ وہ ترجمہ (یعنی ذہنی ترجمہ) ہوتے ہوئے بھی پوری طرح زندہ اور لفظ بہ لفظ متحرک ہیں ملاحظہ ہو!

بدھو نے کہا! میں جو تمہاری جگہ ہوتا تو بنا اس کا گھر جلائے نہ مانتا

جھینگر نے سنجیدگی سے جواب دیا! چار دن کی زندگانی میں دشمنی اور عناد سے فائدہ ہی کیا؟ میں تو برباد ہوا ہی' اسے برباد کر کے کیا لوں گا۔

بدھو نے کہا! بس یہی تو آدمی کا دھرم ہے' لیکن بھائی غصے کے قابو میں آ کر عقل ایسی ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف "شطرنج کے کھلاڑی" کا ایک مکالمہ دیکھئے۔

مرزا: آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مُہرہ اسی گھر میں رکھ دیجئے۔

میر: اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مُہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا؟

مرزا: آپ قیامت تک مُہرے کو نہ چھوئیں گے تو کیا چال ہی نہ ہوگی؟ فرزیں پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر: دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتتا۔

مرزا: یہ بازی آپ کی مات ہوگئی۔

اس مکالمے میں ترجمہ کا شائبہ نہیں، یہ زبان پر قائم ہے اور "راہِ نجات" کا مکالمہ خیالات پر۔ پریم چند اس معنی میں ارسطو کے ہم نوا ہیں کہ مکالمے کی حد تک اور بولنے والے کی ذہنی سطح کی حد تک وہ جو چاہتے ہیں بن بیٹھتے ہیں۔ مثلاً "تیرتھ" میں اندمنی کہتے ہیں!

لو میں جاتا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا یہ ہتیا تمہاری گردن پر ہوگی۔ اگر لڑکے کو تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اسی دایہ کے پاس جاؤ۔ اس کی منت سماجت کرو، معذرت طلب کرو۔ تمہارے بچے کی زندگی اس کی نگاہِ کرم کی مرہونِ منت ہے۔

یہ زبان کوئی زبان ہی نہیں۔ اس چھوٹی سی تقریر میں بیان کی غلطیاں بھی ہیں، لیکن مکالمہ پھر بھی بول رہا ہے۔ اندمنی گھر میں واقعی کھلے زبان بولتے ہوں گے ہمیں اس سے سروکار نہیں لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ مندرجہ بالا مکالمہ اصلی نہ ہوتے ہوئے بھی زندہ مکالمہ ہے، کیونکہ اس کی سطح اندرمنی کی اس ذہنی تصویر سے مطابقت رکھتی ہے جو ہم نے بنا رکھی ہے۔ اس کی دلیل دیکھنا ہو تو بوڑھی دایہ کے یہ الفاظ سنیئے:

کیلاشی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی: ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی کاروبار اور وہی لین دین کا تذکرہ۔ رودر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت دیر میری گود سے نہ اترتا۔ لوٹ کر اسے ضرور دیکھنے جاؤں گی۔ ہے بھگوان کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے جان نکل رہی ہے۔ اتنی گھٹا اُمڈی ہوئی ہے لیکن برسنے کا نام نہیں لیتی۔ معلوم نہیں ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں۔

خیالات کے بے ربطی سے زیادہ ان کی سطح قابلِ لحاظ ہے۔ بے ربطی بھی قابلِ لحاظ ہے، کیونکہ اصلیت کا التباس پیدا کرتی ہے، لیکن سوچنے کا ڈھنگ اور مشاہدہ کا طریقہ اندمنی سے بالکل مختلف ہے۔ یہی اسلوب کا کمال ہے۔

اپنے مجموعے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچے (مورخہ ۱۹۳۴) میں پریم چند نے اس نظریئے کی تائید کی ہے کہ مصنف کو اپنے افسانے میں ہمہ وقت موجود اور ظاہر رہنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں: آج کے ناول میں ہم قدم قدم پر مصنف کے خیال سے، اس کی ذہنی کیفیت اور تربیت سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ خیالات جس قدر موثر ہمہ گیر اور مکمل ہوتے ہیں اسی قدر مصنف کی وقعت ہمارے ذہن میں بڑھ جاتی ہے۔" یعنی پریم چند اپنے قاری کی گردن اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ قول کامیو کے اس بیان کی یاد دلاتا ہے کہ ناول مختصر کی ہوئی ایک کائنات ہے۔" جہاں آخری فیصلے سنائے جاتے ہیں،" لیکن درحقیقت پریم چند افسانوی جبر کے تحکم کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور کامیو کی کائنات میں آخری فیصلے صرف موت کے حق میں ہوتے ہیں۔ اس کائنات میں کردار خود مجرم اور خود مصنف ہوتا ہے، اس کی سب سے اچھی مثال اس کے ناول The Fate میں ملتی ہے جس کا ترجمہ کچھ عرصہ ہوا محمد عمر میمن نے براہِ راست فرانسیسی سے کیا تھا۔ کامیو کا یہ کہنا کہ ناول یا اصل زندگی دونوں کے ہیرو ایک ہی رتبہ رکھتے ہیں کیونکہ دونوں پر بغاوت فرض ہے، سارتر کو قبول نہ تھا کیونکہ اس کے خیال میں بغاوت کسی وابستگی کے بغیر ناممکن یا بے معنی ہے۔ پریم چند ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے، وہ اپنے موضوع پر اپنا نقطۂ نظر حاوی کرکے ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو اُن کے نقطۂ نظر کی طرف واضح یا نیم روشن یا مبہم اشارہ کر سکے۔ اگرچہ خود اُن کا یہ نظریہ کہ ناول نگار کو چاہیئے کہ وہ قدم قدم پر اور کھلے طور پر اپنے خیالات کے ذریعے قاری کی رہنمائی کرے، ہر جگہ پوری طرح عمل میں نہیں آیا ہے۔ "منتر" نامی افسانے کی طرح کھلے بندوں قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش میں افسانے کو ہی ناکام کر دینے کا عمل ان کے کمزور افسانوں میں زیادہ واضح ہے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ اپنے کامیاب ترین افسانوں میں بھی وہ قاری کی گردن نہیں تو نکیل اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں، اُن کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ ان کا یہ طرزِ عمل فوراً واضح نہیں ہوتا، بلکہ اکثر تو بہت غور کے بعد محسوس ہوتا ہے، پریم چند نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قاری کے نقطۂ نگاہ کو مسترد یا معطل کرکے اپنا نقطۂ نگاہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے ان کی زبان کا مطالعہ اُن کے تشبیہی اور استعاراتی الفاظ ان کے لہجے اور بیانیہ الفاظ کی کلید کھولتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک نہایت کامیاب افسانہ "راہِ نجات" یوں شروع ہوتا ہے

سپاہی کو اپنی لال پگڑی پر، عورت کو اپنے گہنوں پر اور وید کو اپنے بیٹھے مریضوں پر جو ناز ہوتا ہے وہی کسان کو اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت دیکھ کر ہوتا ہے۔ جھینگر اپنے ایکھ کے کھیتوں کو دیکھتا ہے تو اس پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔

جھینگر کا کردار ابھی ہم پر ظاہر نہیں ہوا ہے، ابھی ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ چند ہی منٹوں بعد اس کی لڑائی بدھو گڈریے سے ہونے والی ہے جس میں زیادتی جھینگر سے شروع نہ ہوگی لیکن مجموعی زیادتی اور بے صبری اور بے مُروتی کا اظہار جھینگر کی طرف سے زیادہ ہوگا۔ جھینگر اپنے کرداری ارتقار کی جس منزل میں اس وقت ہے وہ پریم چند کو ناپسند ہے، اس لئے (غالباً) غیر شعوری طور پر وہ جھینگر کے جائز فخر و غرور کے لئے جو مثالیں لاتے ہیں وہ سب کی سب تحقیری یا اگر تحقیری نہیں تو تحقیری اور بُرائی کا پہلو لئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جھینگر کا غرور اس طرح کا ہے جیسا سپاہی کو اپنی لال پگڑی پر ہوتا ہے سپاہی جو سامراج اور استحصال کی زندہ مثال ہے۔ یا یہ غرور اس طرح کا ہے جیسا عورت کو اپنے گہنوں پر ہوتا ہے۔ ہمارے سماج میں آج بھی عورت دوئم درجے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا زیوروں، یعنی نمائش، نام و نمود اور ظاہری دولت سے لگاؤ مشہور ہے۔ زیور جو محض مایا ہیں، عورت یا بے وقوف ہی لوگ ان پر غرور کر سکتے ہیں۔ یا غرور اس طرح کا ہے جیسا وید جی کو مریضوں کے ہجوم پر ہوتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ مریضوں کا ہجوم لوگوں کے دکھ اور بیماری اور تکلیف کا آئینہ دار ہے، اس پر غرور وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود غرض اور ہوس کے بندے ہوں۔ اب جھینگر براہِ راست سامنے آتا ہے اور ہمیں بتایا جارہا ہے کہ اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھ کر اسے نشہ آجاتا ہے، یعنی وہ ایک ایسی ہستی بن جاتا ہے جس کو اپنے آپ پر قابو نہیں۔ ان چار مثالوں کا شعوری یا غیر شعوری انتخاب پریم چند اور جھینگر کا رشتہ واضح کر دیتا ہے۔ پریم چند کی رائے جھینگر کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔

اس طرح "فلسفی کی محبت" نامی افسانہ یوں شروع ہوتا ہے۔

> لالہ گوپی ناتھ کی طبیعت دورِ شباب ہی سے فلسفے کی جانب مائل تھی۔ ابھی وہ انٹرمیڈیٹ کلاس ہی میں تھے کہ مل اور برکلے ان کے نوکِ زبان ہو گئے تھے۔ وہ ہر قسم کی دل چسپیوں اور تفریحوں سے الگ رہتے۔ یہاں تک کہ کالج کے کرکٹ میچوں میں بھی ان کا جوشِ تماشا بیدار نہ ہوتا۔ زندہ دل رنگین طبع، بذلہ سنج احباب کی محبت سے کوسوں بھاگتے۔ اور ان سے حسن و محبت کا ذکر کرنا گویا شیطان کو لاحول سُنانا تھا۔

افسانہ یوں ہے کہ لالہ گوپی ناتھ پہلے فلسفہ اور پھر سماج سدھارک کی طرف مائل ہوکر خدمتِ خلق اور شادی نہ کرنے کا عہد کر لیتے ہیں۔ لیکن کئی سال بعد وہ اپنے اسکول کی ہیڈ مسٹریس آنندی سے عشق کرنے لگتے ہیں اور غیر رسمی شادی کر لیتے ہیں۔ ایک بچہ ہوتا ہے، تمام تہلکہ مچ جاتا ہے لیکن لالہ گوپی ناتھ اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتے کہ آنندی سے سچے عشق کے باوجود اس کو کھلے طور پر اپنا لیں۔ وہ اسے تقریباً چھوڑ دیتے ہیں اور بعد میں بہت ہمت کر کے اس سے خفیہ طور پر ملتے ہیں۔ دنیا پر راز کھل چکا ہے لیکن اب بھی ان میں جراءت نہیں کہ آنندی کو باقاعدہ بیوی بنالیں۔

اس خلاصے کی روشنی میں "فلسفی کی محبت" کے آغاز پر دوبارہ نظر ڈالئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے شروع سے ہی لالہ گوپی ناتھ کے خلاف ایک رویّہ اپنالیا ہے اور غیر شعوری طور پر وہ آپ کو بھی اسی رویّے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، بظاہر تو شروع کے ان جملوں میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے لالہ گوپی ناتھ کی داخلی زندگی کا پتا چلے اور ایسا ایک بھی فقرہ نہیں جو ان کے انجام کی طرف اشارہ کرے، لیکن پوری عبارت میں ایک خفیف سا تمسخر موجود ہے جس کی وجہ سے چوکنّے قاری کو احساس ہو جاتا ہے کہ لالہ گوپی ناتھ ملنے کے لائق شخص نہیں ہیں۔ لالہ صاحب کی طبیعت دورِ شباب ہی سے مائل تھی، لیکن فلسفہ کی طرف! پھر معلوم ہوا کہ وہ محض مائل ہی نہیں بلکہ بعض فلسفیوں کے حافظ بھی تھے۔ وہ دل چسپی اور تفریح سے رہتے لیکن ان میں جوشِ تماشا کی کمی نہ تھی، صرف بیداری کی کمی تھی! وہ احباب کی نجبت سے کوسوں دور بھاگتے۔ (کوسوں دور بھاگنا عام طور پر ایک تحقیری محاورہ ہے) عشق و حسن کا ذکر ان کے لئے لاحول تھا اور وہ شیطان۔

یہ پیراگراف خاصا طویل ہے اور اسی طرح کے اشاروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ تمام عبارت خاموش گُنا تبرزنی کی بہترین مثال ہے اور یہ افسانہ پریم چند کے اعلیٰ افسانوں میں سے ہے لیکن اگر اسی کو بیدی یا منٹو لکھتے تو شاید دنیا کے اعلیٰ افسانوں میں سے ہوتا۔ موجودہ صورت میں یہ ایک ہیرا ہے جو ٹھیک سے تراشا نہیں گیا ہے۔ نقطۂ نگاہ یعنی پسند ناپسند کا اس طرح در آنا کہ اس سے افسانہ آگے بڑھے، اور چیز ہے اور نقطۂ نگاہ کا افسانے کے بہاؤ میں حارج ہونا اور چیز۔ آخر الذکر کی مثال پریم چند کے بہترین افسانے 'کفن' میں ملتی ہے، میں 'کفن' کو بے تکلف دنیا کے افسانوں کے سامنے رکھ سکتا ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں وہ پیراگراف نہ ہو جو یوں شروع ہوتا ہے!

"جس سماج میں دن رات کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھّی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت پیدا ہو جانا کوئی تعجّب کی بات نہ تھی" ساری عبارت ژولیدہ اور بقیہ افسانے کے سادہ اسلوب جو چھوٹے جملوں اور آسانی سے ادا ہو سکنے والے الفاظ پر مبنی ہے (پہلے پیراگراف کے بنیادی الفاظ یہ ہیں! جھونپڑا، باپ بیٹا، بجھا ہوا الاؤ، خاموش، پچھاڑ کھارہی تھی، دل خراش جاڑے کی رات) بالکل الگ ہے، اس ایک پیراگراف کے علاوہ یہ افسانہ (اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ) Black Humour کا شاہکار نمونہ ہے اور اردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز کرتا ہے۔

خواجہ عبدالغفور (آئی اے ایس)

پریم چند ایک نظر میں

نثری اور شعری اردو ادب عرصہ دراز تک رومان پرور رہا اور ادیبوں شاعروں صحافیوں نے سطحی زاویہ نگاہ رکھا۔ حسن و عشق کے چرچے ہوتے رہے۔ قصیدے، مرثیے، ریختی سب کچھ لکھے گئے۔ نثری ادب میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے رہے۔ لیکن منشی پریم چند نے اپنی اردو ہندی کہانیوں اور ناولوں میں دیہات کا کینوس اپنایا۔ کسان ان کے محبوب عوام اور کردار رہے اور انہوں نے چھوت چھات اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کیا۔ ہندو مسلم ایکتا کے جذبات کو ابھارا۔ ہندوستانی تہذیب اور اس کی تاریخ کی بہترین روایتوں اور قدروں کو نکھارا اور ستیزہ کاری سے بچنے کی ترغیب دی۔ اندھی روایات اور توہمات طبقاتی کشمکش، عورتوں کی بے چارگی، کسانوں کا استحصال اور ہند و فرقہ پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ صداقت بے لوث خدمت انصاف اور نیکی کے عناصر کو للکارا۔ تنگ خیال اور فرقہ پرست ہندو اور مسلمانوں دونوں ہی کو مورد عتاب قرار دیا اور ملک کے لئے ایک خطرہ۔ ان کی کہانیاں دلچسپی اور دل بستگی سے معمور اور سبق آموز ہیں۔

انہوں نے اردو میں " حج اکبر " کہانی لکھی اور بتلایا کہ عباسی نے حج کو ٹال کر جذبہ ایثار سے ایک معصوم لڑکے کی جان بچائی۔ عباسی کو یقیناً حج اکبر کا ثواب ملا۔

ہندی کہانی "مہاتیرتھ" بھی ان ہی کیفیات کی مظہر ہے۔ " عیدگاہ " اور "معافی" بھی اس طرح کے کردار کے گرد گھومتی ہیں۔ "کربلا" میں "ساہی راؤ" کو حضرت امام حسین سے کربلا کے میدان میں ملاتے ہیں اور شہیدان کربلا کے جذبہ ایثار کو ابھار کر اور قربانی کا ساتھی بنا کر ایک امر کہانی میں مذہبی یکجہتی کا پہلو نکھارتے ہیں۔

جہاں پر فرقہ واریت کے خلاف علم بغاوت کھڑا کیا ہے وہیں پر حب الوطنی اور برطانوی سامراج کے خلاف بھی کہانیاں لکھی ہیں حتیٰ کہ "سوز وطن" کو انگریز کلکٹر نے برداشت نہ کرتے ہوئے انھیں راتوں رات طلب کر کے ان کی نظروں کے سامنے خاکستر کر ڈالا۔

اکتوبر ۱۹۰۳ء میں ان کی پہلی مسلسل ناول قسط وار شائع ہونے لگی۔ ان کا افسانہ " بڑے گھر کی بیٹی " ۱۹۱۰ء میں بہت مقبول ہوا۔ پہلا ناول "سیوا سدن" (بازارِ حسن) ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ افسانوں کا مجموعہ " مان سرودر " ۸ جلدوں میں طبع ہوا۔ عرصہ تک جریدہ "ہنس" کی ادارت کرتے رہے۔ جملہ ۱۲ ناول اور ۲۹۰ افسانے شائع ہوئے ان کا آخری مضمون " مہاجنی " تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا کے ۱۹۳۵ء والے ایکٹ نے ہندوستانیوں کے آزادی کے خواب کو جھنجھوڑ ڈالا اور برطانوی سامراج کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ اردو کے ادیبوں نے بھی اپنے جذبہ حب الوطنی کو ٹھیس لگتے دیکھ کر ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کی ۱۰ر اپریل ۱۹۳۶ء کو داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ اس انجمن کے لکھنؤ والے اجلاس کی صدارت منشی پریم چند نے بہ حسن و خوبی سنبھالی اور اپنے صدارتی خطبہ میں صریحاً کہا کہ ادب میں خوبصورتی اور قوت کے عناصر اسی وقت سطح پر آئیں گے کہ جب ہماری بصارت ہمہ جہتی کو قبول کرے گی۔ حب الوطنی اور سیاست ہمارے ادیب کے پیچھے ہرگز نہیں دوڑیں گے بلکہ صداقت کی شمعیں ادیب کے سامنے مشعل راہ بنیں گی۔

اس انجمن نے فرقہ واریت، انسانوں کے استحصال، پس ماندگی، افلاس، جہالت کے خلاف قلم اٹھانے کی دعوت دی اور سبھوں نے اس کو لبیک کہا۔ انہوں نے مافی الضمیر کے آزادانہ اظہار پر زور دیا اور بتایا کہ انسانیت علویت شرافت کی علم برداری ادیب کا فرض ہے اور پسماندہ پست کردہ حق سے محروم لوگوں کی حمایت اور وکالت ہر لکھنے والے کا فرض منصبی ہے۔

چنانچہ پریم چند کی کہانیاں اسی مقصدیت کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کا ہر کردار انھیں کی زبان بولتا ہے اور اس پیغام کو مقبول و معروف کرتا ہے (جو گاندھی جی خود پھیلانا چاہتے تھے اور پھیلا رہے تھے۔

ان کے کردار کہتے ہیں" ہم انصاف اور ستیہ کے لئے لڑ رہے ہیں اس لئے انصاف اور ستیہ کے ہتھیاروں سے لڑتا ہے۔ ہمیں ایسے بہادروں کی ضرورت ہے جو نشہ۔ اور غصہ کو دل سے نکال دیں اور ایشور پر اٹل وشواس رکھ کر دھرم کے لئے سب کچھ جھیلیں:

"کم از کم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آ بیٹھے۔ میں سوسائٹی کو ایسی حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں جہاں غریب آدمی کو بھی پیٹ بھر کر کھانا میسر آ سکے۔"

سفید خون میں لکھتے ہیں" بھیانک کی وہ جلتی ہوئی دھوپ آگ کے جھونکے زور سے ہر ہراتے ہوئے چلتے تھے اور وہاں ہڈیوں کے بے شمار ڈھانچے جن کے بدن پر عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا۔ مٹی کھودنے میں مصروف تھے گویا مرگھٹ تھا جہاں مردے اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے تھے"۔

الغرض ان کی تحریریں ان کا تفکر ان کا حوصلہ آج بھی ایک رابطہ کی شکل میں ان کے اور ہمارے بیچ قائم ہیں۔ اس لئے کہ کتنے ہی مسئلے جن کو انہوں نے چھیڑا آج بھی اپنا گھناؤنا منہ کھولے کھڑے ہیں اور انسانیت ان کے سامنے آج بھی سرنگوں ہے۔

ہمیں یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ وہ اردو کے افسانہ نگار تھے کہ ہندی کے کہانی کار لیکن ان کی عظمت مسلّمہ ہے اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ وہ سوچتے اردو ہی میں تھے اور اردو ہی میں انہوں نے تخلیقات کی ابتدا کی۔ ان کا اسلوب تحریر اس کا مظہر ہے۔

اردو میں ترقی پسند ادب کی داغ بیل میں ان کا کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ ان کے مذہبی رجحانات اور میلان طبع جو بھی رہے ہیں ان کی نگارشات نہایت ہی پاک صاف صلح جو ایکتا اور یک جہتی کے لئے بے مثال ہے۔ ذاتی شخصی عقائد کے لحاظ سے وہ حق و صداقت کے علمبردار ہوش مند صاحب بصیرت سچے انسان تھے۔ انہوں نے محض تبلیغ یا پرچار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک فعال انسان کی حیثیت سے راہبر بھی کہلائے جا سکتے ہیں۔

کسانوں کے مسائل کے عملی حل بھی سامنے رکھے ہیں مثلاً جاگرن میں وہ لکھتے ہیں۔ " ہندوستانی کسانوں کی اس وقت جیسی قابل رحم حالت ہے اسے کوئی لفظوں میں پیش نہیں کر سکتا۔ ان کی بدحالی کو وہ خود جانتے ہیں۔ یا ان کا خدا جانتا ہے۔ زمیندار کو وقت پر مالگذاری چاہئے۔ سرکار کو وقت پر لگان چاہئے۔ کھانے کو دو مٹھی غلہ چاہئے پہننے کے لئے چیتھڑا چاہئے سب کچھ لیکن ایک طرف پالا اور تیز بارش فصل کو چوپٹ کر رہی ہے ایک طرف آندھی ان کے رہے سہے کھیت کو برباد کر رہی ہے دوسری طرف بیماریاں پلیگ، ہیضہ، سردی ان کے نوجوانوں کو بھری بھری اور لہلہاتی جوانی میں اس طرح دنیا سے اٹھائے لئے چلی جا رہی ہے جس طرح لہلہاتا کھیت "۔

بقیہ : کفن کا تجزیاتی مطالعہ

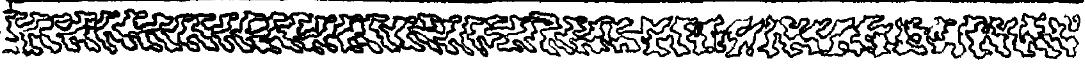
جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی" اور پھر دونوں وجد میں آکر گانے لگتے ہیں اور پھر گر پڑتے ہیں۔

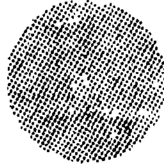
پریم چند نے کفن کو ایک جراح کی طرح پیش نہیں کیا ہے بلکہ ایک نباض کی طرح بدلتی ہوئی ذہنی کشمکش، افلاس اور لمحاتی مسرتوں کا collage بنایا ہے۔

اس فن کاری میں پریم چند نے بھوک اور افلاس کے اپنے تجربات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی شعور کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس طرح کفن موت کی علامت نہیں بلکہ افلاس کا استعارہ بن جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس میں وہ کشش آگئی ہے کہ ۴۵ سال بعد بھی یہ افسانہ بار بار پڑھا جا سکتا ہے۔

اور ہم اپنا رشتہ پریم چند کے اسی افسانے کفن سے جوڑتے ہیں۔ اس طرح ہمارے لئے یہ افسانہ پریم چند سے تعلق خاطر کا ایک نیا استعارہ بن جاتا ہے۔







امکان

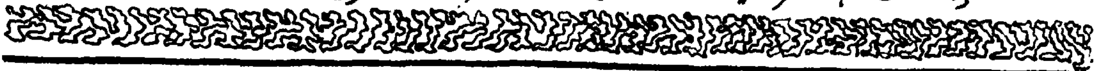
آپ کی رائے کا   کے بارے میں

ہمیں انتظار

رہے گا

خط و کتابت کا پتہ

امکان: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، ۱۸ واں منزل نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۳۲



"زمان و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زمانی ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گذارتا ہے، سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی تجربات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں"

مخدوم

○

مقالات

۱۔ مخدوم کی زندگی اور شعر ——— ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

۲۔ مخدوم۔ فن اور شخصیت ——— صفی الدین صدیقی

۳۔ مخدوم کی سیاسی شاعری ——— معین شاکر

۴۔ مخدوم ۔ احوالِ دیگر ——— خواجہ عبد الغفور

۵۔ مخدوم محرکات اور ماحول ——— ایشور راج ماتھر

○

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

مخدوم کی زندگی اور شعر

مخدوم کی زندگی اور مخدوم کی شعری تخلیق دو کوئی الگ الگ کمپارٹمنٹ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی زندگی اور ان کے شعر دونوں ہی کا ایک ہی جذباتی مرکز رہا ہے۔ ایک ہی مقصد ہے جس کی تکمیل میں وہ معروفِ سفر رہے ہیں۔ یہی سفر ان کی زندگی ہے اور یہی ان کی شعری تخلیقات کا سرچشمہ۔

ایسے لوگ، اور ان میں بہت سے نیک دل، کثرت سے ملیں گے جو خود ان کی زندگی میں ان ہی سے یہ کہتے رہے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین تحریک سے وابستگی نے مخدوم کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے اور وہ ان معروفیتوں سے سبکدوش ہو جائیں اور اپنی ساری توانائیاں شعر و ادب کی خدمت میں صرف کر دیں۔

تو بہار عالم دیگری، زِ کجا بہ ایں چمن آمدی

لیکن میری دانست میں ان کی عوامی معروفیتیں اور ان کی شعری تخلیقی سرگرمیاں دونوں ایک دوسرے کی معاون اور شریک کار رہیں اور دونوں ہی مخدوم کی شخصیت کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان دونوں کو الگ کرنا مخدوم کو بکھیر دینا ہوگا پھر وہ نہ وہ آہنی شخصیت رہیں گے جو رزم گاہِ سیاست میں وہ تھے، اور نہ ہی وہ قدآور شاعر رہیں گے جو ہمیشہ بزم ادب میں رہے ہیں۔

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہکن کی جیت ہو

اس شعر میں مخدوم نے اس عظیم اور مقدس نصب العین کا اعلان کیا ہے جس کے لئے ان کی نجی اور عوامی زندگی اور ان کی شعری تخلیقات وقف ہیں۔ زندگی کا بساطِ رقص وسیع سے وسیع تر ہو اور فضائے بسیط پر محیط ہو جائے۔ اور محنت اور محبت دونوں ہی اپنے حریف کو شکست دیں اور کامراں ہوں۔ "تیشہ" اور "کوہکن" یہاں دو علامتیں ہیں جو اپنے تلمیحی معنوں میں فرہاد کی محبت اور محنت دونوں ہی کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ "فرہاد" اس وقت تک کامراں نہیں ہو سکتا جب تک دھوکہ باز اور فریبی خسروؤں کو شکست نہیں ہو جاتی اس مقصد سے مخدوم کو جذباتی لگاؤ ہے اور اسی کی تکمیل کے لئے وہ معروفِ جدوجہد رہے ہیں۔ اسی جدوجہد سے وہ اپنے شعر کا مواد بیان کا خلوص، ادبی اعتماد اور پختگی حاصل کرتے ہیں۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مخدوم کا تصورِ حیات محض جینے کی کشمکش تک محدود نہیں ہے وہ رومان اور محبت کو زندگی کا جز مانتے ہیں جس سے جینے کی جدوجہد کو مہمیز ملتی ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں رقیب کا رونا نہیں ہے جہاں ہجر تلخی کا ہے بھی تو وہ اس تلخی کو کارزارِ حیات میں اپنا رفیق بنا لیتے ہیں۔

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانے میں

مخدوم ۴ فروری ۱۹۰۸ء کو تلنگانہ کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے اور یہیں ابتدائی زندگی بسر کی۔ یہیں دیہاتی مکتب میں پڑھائی شروع کی۔ اور جب مسیں بھیگ رہی تھیں، یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے "گاؤں کی" "ناآشنائے سیم وزر" "دخترِ پاکیزگی" سے ان کی آنکھیں چار ہوئیں اور انہوں نے "پہلے پہل" دل دھڑکنے کی صدا سنی۔

مخدوم نے ۱۹۲۹ء میں ضلع میدک کے صدر مقام سنگاریڈی سے میٹرک پاس کیا اور پھر حیدرآباد چلے آئے۔ جامعہ عثمانیہ میں شرکت حاصل کی۔ یہاں ۱۹۳۳ء میں یونیورسٹی ہاسٹل میں نووارد طالب علموں کا مذاق اڑانے کی تقریب میں اپنی پہلی نظم "پیلا دوشالہ" کہی جو جامعہ کے طالب علموں میں بہت مقبول ہوئی۔

بس کیا تھا تخلیقی چشمہ جیسے پھوٹ پڑا۔ اور پھر مخدوم نے کئی نظمیں کہیں۔

یہ دور مخدوم کی پاکیزہ رومانی شاعری کا دور ہے۔ "طور" "ساگر کے کنارے"، "تلنگن"، "سجدہ"، "آتش کدہ"، اور "انتظار" وغیرہ اسی دور کی نظمیں ہیں۔ "طور" میں مخدوم کہتے ہیں۔

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم، رشکِ طور ہوتی تھی
ملک بھولا بھلاتے تھے، عزلخواں حور ہوتی تھی

اسی نظم کے ایک اور بند میں کہتے ہیں:

بہے جاتے تھے بیٹھے، عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا تھا میں اس کو، نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں

عشق کے پاکیزہ تصور کی طرف توجہ کیجئے "سرورِ سرمدی"، "خلوتِ معصوم" کی ترکیبوں پر غور کیجئے۔ اسی لئے تو فخر سے کہتے ہیں۔

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدوم نے ناندیڑ میں گوداوری کے کنارے مہاراشٹرین لڑکیوں کے جھرمٹ کو دیکھا۔ وہ گگریاں لئے پانی بھرنے آتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کھیل رہی ہیں۔ نہا رہی ہیں۔ کھلکھلا کر ہنس رہی ہیں بس مخدوم کی نظم ساگر کے کنارے یہیں مکمل ہوئی۔

کچھ لڑکیاں آنچل کو لپیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

اس شعر میں جو منظر کشی کی ہے وہ محتاجِ توجہ ہے۔ اور شعر یوں بھی نزاکتوں سے معمور ہے۔ پانی میں آگ لگنا "حسنِ تعلیل" کی خوبصورت مثال ہے۔ مخدوم کی اس نظم میں ایک شعر اور تھا جو مجھے یاد تو نہیں رہا لیکن اس کا مفہوم کچھ یوں تھا۔ لڑکیاں "کسوٹا" مارے ہوئے ہیں اور ان کی "پنڈلیاں" تھیں کہ "فردوس کی نہریں" قاضی عبدالغفار کے منجھے ہوئے ادبی ذوق کیلئے "کسوٹا مارنا" اور "پنڈلیاں" صوتی اعتبار سے ناگوار ترکیبیں تھیں۔ انہوں نے اس شعر کو حذف کر دیا۔ اور پھر یہ نظم اس شعر کے بغیر ہی شائع ہونے لگی۔

مخدوم کی نظم "آتشکدہ" بالکل رومانی نظم ہے۔ "آتشکدہ" کی زبان سے کہلواتے ہیں

کیا کہوں کن ہوشوں کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں، کن کاکلوں کا ساتھ ہے

کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

جوش نے بھی تو کہا ہے۔

بڑا ہی لطف آتا تھا خنک جاڑوں کی راتوں میں
انگیٹھی کے کنارے صبح ہو جاتی تھی باتوں میں

اس دور میں ہندوستان کی سیاسی اتھل پتھل کا تذکرہ ضروری ہے جس نے سبھی نوجوانوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ اور لازمی طور پر مخدوم کے حساس ذہن پر اس کے ارتسامات پڑ رہے تھے اور ان کی شعری تخلیقات میں منسلک ہو رہے تھے۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء کے زمانے میں عالمی سرمایہ داری ایک بحران کا شکار ہو گئی تھی جو ۱۹۳۲ء میں اور بھی شدید ہو گیا تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں مخالف سامراج جدوجہد کا نیا ابھار شروع ہوتا ہے۔ عوامی جدوجہد کی اس دور کی خصوصیات یہ ہیں کہ ملک کے نوجوانوں اور محنت کشوں میں بائیں بازو کے رجحانات تیزی سے پھیل رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی تو ۱۹۲۴ء میں قائم ہو چکی تھی اور مزدوروں اور کسانوں میں کام بھی کر رہی تھی ۱۹۳۴ء میں کانگریس ہی کے اندر کانگریس سوشلسٹ پارٹی قائم ہوئی۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مزدوروں کی تنظیم آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس پھر سے متحد ہو کر نئی طاقت سے ابھری تھی۔ مزدوروں کی ہڑتالیں زوروں پر تھیں۔ ملک کے کسان بھی اپنی الگ تنظیم میں متحد ہو رہے تھے۔ اور مخالف زمینداری جدوجہد تیز ہو رہی تھی۔ یہ مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس ان سب تحریکوں اور تنظیموں کا ایک متحدہ قومی محاذ بن جائے۔ اور سامراج کے خلاف جدوجہد تیز کر دی جائے۔

اسی دوران مخدوم کے شعور نے انگڑائی لی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کا ملک غلام ہے۔ ان کا محبوب مشرق مغربی چیلوں کا لقمہ ہے عوام کی زندگی ایک مرگِ بے قیامت ہے۔ ایسے میں وہ دیکھتے ہیں کہ ہمالہ کے پرے افق پر انقلاب کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ اور ایک جہانِ نو کی بشارت دے رہا ہے۔ جب اقبال "مشرق" کے اپنے تابناک تصور کے ساتھ میدانِ ادب میں آتے ہیں تو مخدوم سوچتے ہیں یہ تو ان کا مشرق نہیں ہے۔ اور کہتے ہیں۔

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جنہیں صدیوں کا خرام

پیکر ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول

اور پھر اعلان کرتے ہیں :

اس زمین موت پرورده کو ڈھایا جائیگا
اک نئی دنیا ، نیا آدم بنایا جائے گا

ان کی اس دور کی نظموں میں جو مواد میں رومان اور انقلاب کے امتزاج کی کروٹ کی نشاندہی کرتی ہے۔ اورنگ آباد میں اجنتا کی پہاڑیوں میں وہاں کے رومان انگیز ماحول میں ماہِ کامل کو دیکھا۔ سینے میں جذبات کا تلاطم تھا اور ذہن خیالات کی رزم گاہ اس نظم کی ابتدائی شعراس رنگ کے ہیں۔

نگاہ یار سے ساجا کر (؟) ہے نگاہ
جنوں و حسن کو باہم ملا رہا ہے قمر

پھر نظم ایک موڑ لیتی ہے۔

فلک پہ ابر کے اٹھتے ہوئے جزیروں میں
زمیں کے درد کو اوپر بلا رہا ہے قمر

یہ کس غریب کے سینے میں ہوک اٹھتی ہے
لرز رہے ہیں محل تھرتھرا رہا ہے قمر

اور نظم ختم اس شعر پر ہوتی ہے۔

کہاں ہے ساقیٔ گلرو، کہاں ہے سرخ شراب
فسانۂ غم گیتی سنا رہا ہے قمر

" زمین کے درد " کے علاج کیلئے مخدوم " ساقیٔ گلرو " اور سرخ شراب " کی تلاش میں نکل پڑے ہیں۔

یہیں ایک لطیفہ سن لیجئے، مخدوم اورنگ آباد سے حیدرآباد آئے اور ان کی نظم " قمر " شائع ہوئی۔ پھر وہ گلبرگہ گئے۔ اب چاند وہ اجنتا کی پہاڑیوں کا جنون پرور ماہِ کامل نہیں تھا۔ وجود سے عدم کی طرف مائل بہ سفر تھا۔ ہر روز کچھ گھٹتا جاتا تھا۔ ایک دوست نے مخدوم سے فرمائش کی کہ قمر سنائیں۔ مخدوم نے پوچھا یہاں گلبرگہ میں قمر ہوتا ہے۔ دوست نے بے ساختہ جواب دیا " ہاں ہوتا ہے ایک چھوٹی طشتری جیسا " " مسافر " مستقبل " اور آزادیٔ وطن " سب اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔

تیرے ہمراہی کھو گئے رے مسافر   مسافر چلے چل
نہ جانے وہ کیا ہو گئے رے مسافر   مسافر چلے چل

تیری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل   مسافر
چلے چل چلے چل ، چلے چل چلے چل

اپنی نظم " مستقبل " میں جو اس زمانے میں لکھی تھی ، کہا ہے۔

دھڑکتے دلوں کی صدا آرہی ہے
اندھیرے میں آوازِ پا آرہی ہے
چلا آرہا ہے ، چلا آرہا ہے

اسی نظم کا ایک اور بند یہ ہے۔

نہ سلطانیٔ تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری
چلا آرہا ہے ، چلا آرہا ہے

" شاہی سواری " کا مفہوم کچھ اس دور کے دیکھے ہوئے حیدرآبادی ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نظام کی سواری نکلتی تھی تو راستے بند ہو جاتے تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ ایک بھکارن نظام کی تیز رفتار سواری کی زد میں آگئی۔ اسی پر تو جوش نے کہا تھا۔

کسی کی سواری آئی کسی کی جان گئی

مخدوم نے " غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری " میں اسی طرف اشارہ کیا ہے اپنی نظم " آزادیٔ وطن " میں کہتے ہیں۔

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کا پاسباں وہ تیغِ جوہر دارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ بر اندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے

بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی
کہو ہندوستان کی جے

۱۹۱۷ء میں جب انقلابِ روس ہوا ، مخدوم صرف ۹ سال کے تھے ان کے چچا کی عادت تھی کہ رات میں دسترخوان پر دنیا بھر کی خبریں سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک روز انہوں نے کہا کہ روس میں بالشویکوں نے انقلاب کر دیا ہے۔ اب امیر و غریب کا فرق مٹ گیا ہے اور سبھی ایک ہی دسترخوان پر

کھاتے ہیں۔ تب نخھے مخدوم یہ سوچا کرتے کہ "کتنا بڑا اور کتنا طویل ہوگا وہ دستر خوان جہاں ساری آبادی ایک ساتھ کھانا کھاتی تھی": آگے چل کر لڑکپن کے ذہن پر پڑے ہوئے یہی ارتسامات مخدوم سے "جہانِ نو" نظم کہلواتے ہیں۔

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہاں جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہاں جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پرور دگار بن

مخدوم نے اپنی نظم "روحِ فغفور" میں قدیم چین کے جابر شہنشاہ "فغفور" کو ظالم سامراج کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں

دخترِ خواجگی، روحِ غارت گری
موت کی ہمسفر، مرگھٹوں کی پری

وہ شب اندام وہ قبر کی تیرگی
میرے گھر میں وہ کل یک بہ یک گھس گئی

پستِ گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں، روحِ فغفور ہوں

مخدوم کی نظم "باغی" میں قاضی نذر الاسلام کی نظم "بدروہی" کی صدائے بازگشت ملتی ہے اس وقت تک نذر الاسلام کی نظموں کا اختر حسین رائے پوری کا کیا ہوا ترجمہ "پیام شباب" کے نام سے شائع ہو چکا تھا اور اردو لکھنے پڑھنے والوں میں بہت مقبول ہو رہا تھا۔ مخدوم کی نظم "باغی" کے یہ تیور ہیں۔

رعد ہوں، برق ہوں، بے چین ہوں، پارا ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ، خود آرا ہوں میں

سرِ پر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا
عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا
توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

یہ دور ہی گرم انقلابی شاعری کا دور ہے۔ ملک کی سیاسی جدوجہد کی گرمی کا عکس حساس شاعروں کی تخلیقات میں واضح ہے

یہاں تک کہ اقبالؔ کہہ اٹھتے ہیں۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کی در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اور مخدوم اپنی نظم "موت کا گیت" میں کہتے ہیں۔

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مور بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ، دو عالم کو دگر گوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

اور اس نظم کو ختم اس طرح کرتے ہیں۔

زلزلو آؤ، دہکتے ہوئے لاوٴ آؤ
بجلیو آؤ، گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

مخدوم کی نظم "حویلی" جاگیرداری سماج کے جبر اور اس کی سڑاند کی بہت نمائندہ نظم ہے۔

ایک بوسیدہ حویلی، یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج

مار و کژدم کا ٹھکانہ جس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک

جن میں رہتے ہیں مہاجن، جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن، جن میں کعبے کے فقیر

اور اس نظم کو یوں ختم کرتے ہیں۔

ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے سازِ الفت اور گائے زندگی
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

اسی زمانے میں آصف جاہ سابع کی سلور جوبلی ... حیدری تھی۔ وفا دارانِ "یارِ وفادارِ حکومتِ برطانیہ" نے بڑی دھوم

چھارگئی تھی۔ اور مخدوم کے دل پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے "سلور جوبلی" عنوان سے ایک نظم لکھی۔ کہتے ہیں۔

جنتیں خاک پہ جس رات اتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ نگن روحِ جہاں بانی تھی

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں تری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

قاضی عبدالغفار مرحوم نے اسے "دھواں" عنواں سے شائع کیا۔ اور تب سے اس نظم کا عنوان یہی ہوگیا۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہوئی، مخدوم ابھی جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تھے اور ۱۹۳۷ء میں انہوں نے ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک برطانوی ہندوستان میں کانگریسی حکومتیں تھیں۔ مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ اور ان کا اثر حیدرآباد پر پڑنا بھی لازمی اور ناگزیر تھا۔ حیدرآباد میں تو شہری آزادی بالکل نہیں تھیں۔ ہر جلسہ کی پہلے سے اجازت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ ٹریڈ یونین قانون تک نہیں تھا۔ صنعتی تنازعات کی یکسوئی کے لئے کوئی قانون نہیں تھا۔ سیاسی تنظیموں کو کھلے بندوں نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ایسے میں شہری آزادیوں کے لئے اور ریاست میں جمہوری تبدیلیوں کیلئے سیاسی جدوجہد شروع ہوئی۔ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس اس کی رہنمائی کررہی تھی۔

اسی زمانے میں چھوٹے سے کمیونسٹ گروپ بھی پیدا ہوگئے تھے کمیونسٹ سرگرمیوں کا ایک مرکز اورنگ آباد میں تھا۔ اور کامریڈ حبیب الدین اس کے رہنما تھے۔ کامریڈ جیندر گپتے۔ چودھری تو جیل میں تھے۔ اسی گروہ کے کچھ ساتھی دیشس میانین اور دی۔ڈی دیشں پانڈے کانگریس میں تھے۔ دوسرا گروہ آندھرا علاقے کی پارٹیاں کے زیر اثر اضلاع تلنگانہ میں کام کررہا تھا۔ کامریڈ راوی ناراین ریڈی، بدم ایلا ریڈی وغیرہ اس سے وابستہ تھے۔ اور شہر حیدرآباد میں ان ہی دونوں گروہوں سے وابستہ ایک گروپ کام کررہا تھا جس نے ایک ادارہ کامریڈز ایسوسی ایشن قائم کرلیا تھا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ کنہیا لال منشی اس زمانے میں بمبئی میں وزیر داخلہ تھے۔ انہوں نے حکومتِ حیدرآباد کو باقاعدہ طور پر وارننگ دی تھی کہ وہ کامریڈز ایسوسی ایشن سے ہوشیار رہے۔ یہ کمیونسٹوں کی خطرناک تنظیم ہے۔

مخدوم کا اس تحریک سے شروع ہی سے تعلق رہا ہے۔

اسی زمانے میں جرمنی اور اطالیہ میں فاشزم نے زور پکڑا اور ساری دنیا کے دانشور اس کے خلاف متحد ہو رہے تھے۔ روم رولاں ہنری باربوس، لوئی اراگاں، میکسم گورکی غرض بیسوں عالمی شہرت کے ادیبوں نے فاشزم اور جنگ کے خلاف آواز اٹھائی۔ دنیا دوسری عالمگیر جنگ کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ گئی۔

اسی زمانے میں مخدوم نے اپنی مشہور نظمیں "زلفِ چلیپا" اور "انقلاب" لکھیں۔ "زلفِ چلیپا" میں کہتے ہیں۔

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام

رام و لچھمن کی زمیں، کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمد کی زمیں، وہ ابنِ مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیبِ بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے

برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

اور اس نظم کو یوں ختم کرتے ہیں۔

پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کہ سرمایہ کا نام
موت کا لبریز ساغر عصرِ حاضر کے غلام

عزمِ آزادی سلامت، زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد

اور مخدوم کی شاعرانہ پیغمبری شان سے سامراجی جنگ کو سرمایہ داری کے خلاف بغاوت میں بدل دینے کی بشارت دیتے ہیں۔

انقلاب میں کہتے ہیں۔

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گذر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

مخدوم نے حیدر آباد کی سڑکوں پر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی اپنی فوج کو جو "راجہ پلٹن" کے نام سے موسوم تھی۔ پریڈ کرتے اور مشرقِ وسطیٰ میں انگریزوں کی جنگ لڑنے کیلئے جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر ان کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا۔ پھر وہ لکھنؤ گئے۔ وہاں لوگوں کو عشرہ شریف میں مرثیہ پڑھتے سنا اور جب ریل گاڑی سے واپس ہو رہے تھے تو فوج کا کوچ، مرثیہ کا جو گیا راگ ان کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے اور ریل کے چلنے کی آواز نے تال کا کام کیا۔ اور مخدوم کی نظم "سپاہی" نازل ہوئی۔ کہتے ہیں :—

جانے والے سپاہی سے پوچھو — وہ کہاں جا رہا ہے
کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے — بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے — زندگی ہے کہ چلا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو — وہ کہاں جا رہا ہے
کتنا سہمے ہوئے ہیں نظارے — کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے — سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے
جانے والے سپاہی سے پوچھو — وہ کہاں جا رہا ہے
گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرہ — ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے — کھل گیا انقلابی پھریرا
جانے والے سپاہی سے پوچھو — وہ کہاں جا رہا ہے

جنرل فرینکو کی فاشسٹ قوتوں کے خلاف اسپین کی خانہ جنگی کا زمانہ یاد کیجئے۔ ہٹلر اور میسولینی پوری طرح فرینکو کی مدد کر رہے تھے۔ انگلستان اور فرانس کی سامراجی حکومتیں نظارہ بازی ہی تو کر رہی تھیں۔ دنیا کا جمہوری ضمیر بغاوت کر رہا تھا۔ کرسٹوفر کاڈویل جیسے ادیب فرینکو کے خلاف عوامی گوریلا جدوجہد میں شامل اور شہید ہو رہے تھے۔ جواہر لال نہرو نے بچشم خود بارسیلونا میں فاشسٹ بمباری کا دلخراش منظر دیکھا اور ہندوستان آکر اسپین کے عوام کی مدد کے لئے اپیل کی۔ اسپین کے گورنیکا گاؤں پر فاشسٹ بمباری کی تصویر مشہور مصور پکاسو نے کینوس پر بنائی۔ یہ شہرۂ آفاق تصویر آپ کے ذہن میں ابھر گئی ہی۔ تباہی کا بھیانک منظر ہے کہیں گھوڑے کی کٹی ہوئی ٹانگ پڑی ہے۔ کہیں انسانی ہاتھ ہے۔ کتاب روندھی پڑی ہے اور اس اندوہناک بربادی کے منظر میں امید کی شمع بھی روشن ہے۔

اب مخدوم کی نظم اندھیرا پڑھیئے اسی زمانے کی نظم ہے اور لگتا ہے پکاسو کی پینٹنگ "گورنیکا" کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

" وہ تہذیب کے زخم "
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اِس پار سے اُس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں

اور پھر یہ بشارت دیتے ہیں۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مخدوم ۱۹۳۶ء میں روزنامہ مشیر دکن میں خبروں کے ترجمے کا کام کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد ایک سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ پھر ۱۹۳۹ء میں سٹی کالج میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ لیکن سیاسی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں اور کالج کی ملازمت اور سیاسی کام ایک ساتھ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ اور کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے۔

اسی زمانے میں ہٹلر کے سوویت یونین پر حملے نے نئی صورت پیدا کردی۔ ادھر برطانیہ میں چیمبرلین سبکدوش کر دیئے گئے۔ اور چرچل نے ہٹلر اور فاشزم کے خلاف واقعی جنگ لڑنے میں سنجیدگی دکھانی شروع کی اور برطانیہ، امریکہ اور سوویت یونین کا جرمنی، اٹلی اور جاپان کے محور کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہوا۔ اب جنگ کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اب یہاں ہار جیت کا معاملہ فاشزم اور سامراج تک محدود نہ تھا۔ اب فاشزم کی شکست متحدہ اقوام کی جیت تھی اور اس شکست سے دنیا بھر کے جمہوریت پسند اور آزادی خواہ عوام کا مفاد وابستہ تھا۔ اگر فاشزم کی جیت ہوتی ہے تو آزادی اور جمہوریت دونوں ہی بیسوں برس پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

اس دور میں مخدوم نے کئی نظمیں کہیں۔ اس زمانے کی ان کی سب سے اچھی نظم قازقستان کے بزرگ شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ "استالین" ہے۔ جب وطن کے پاکیزہ جذبے سے معمور یہ نظم اپنی شوکتِ لفظی کیلئے بھی مخدوم کو بہت عزیز تھی اور سننے والوں میں بہت مقبول ہوئی۔

قرۃ العین ! میری جانِ عزیز

او! میرے فرزندو
برق پا دہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنہ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالارِ جہاں استالین

یہی محشر ہے، دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں
دوسرا ایک ابھرتے ہوئے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے، یہ نجس اور ناپاک
سوسمار
دورِ وحشت کے درندے
موذی
دہنِ آژدر ہلاکت کا شکنجہ لیکر
میرے شاہین کے خلاف
رات دن ہیں کہ چلے آتے ہیں

. . . .

ہاں میرے ہموطنو!
جاؤ اور اپنے سمندروں کو بھنور تو کرو
سرخ فوجوں میں ملو
جوشِ پرجوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے پگھلتے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فاشسٹ خنازیر کو
فی النار کرو

قازقستان!
وطن!
اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اُٹھ
خیز با صد حشم و جلال

بہ ہزاراں جبروت
ایک جاں ایک جسد
پھونک دے دشمن ناپاک کی خاکستر کو

اسی زمانے میں مخدوم نے وہ مشہور نظم "جنگِ آزادی" لکھی جو ملک بھر میں عام جلسوں میں کورس میں سنائی جاتی تھی۔ اور لوگوں کی زبان پر چڑھ گئی تھی۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی دہقانوں کی مزدوروں کی

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی آزادی کیا مزدور کا جس میں راج نہ ہو

ان ہی دنوں برطانوی سامراج کی پالیسیوں کے نتیجے میں بنگال ایک زبردست قحط سے دوچار ہوا اور لاکھوں عوام موت کا نوالہ بن گئے دانشوروں کا ضمیر چلا اٹھا۔ کرشن چندر نے مشہور رپورتاژ "ان داتا" لکھا۔ خواجہ احمد عباس نے کہانی "ایک پاؤ چاول" لکھی اور مخدوم نے مشہور نظم "بنگال" لکھی۔

وہ درِ ہندوستان و سحر و نغمے کا دیار
دیدنی ہے آج اس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا بیماریوں کا بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سود خوار
قبر کے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالہ موت نے
شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے
امتِ مرحوم ہو یا ملتِ زنار دار۔
ان کے فاقوں کی گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ بچوں کی پکار

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا۔ مگر حیدرآباد کے عوام ابھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہی تھے۔ آزادی اور جمہوریت، امن کی طرح ناقابلِ تقسیم ہیں۔ حیدرآباد کے عوام بھی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے تھے نظام سے گلوخلاصی کیلئے برسرِ پیکار تھے۔ کیمونسٹ پارٹی ۱۹۴۶ء

ہی میں پابندی لگ گئی تھی اور مخدوم روپوش تھے لڑائی تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور آخر کار مسلح جدوجہد کا ادب اختیار کر گئی۔ اسی تلنگانہ جدوجہد کے متعلق مخدوم اپنی مشہور نظم "تلنگانہ" میں لکھتے ہیں۔

اٹھے ہیں تیغ بکف یوں بصد ہزار جلال
وہ کوہ و دشت کے فرزند کھیتوں کے لال
چمک رہی ہے درانتی اچھل رہے ہیں کدال
بنائے قصر امارت شکستہ و پامال
لرز لرز کے گرے سقف و بام زرداری
ہے پاش پاش نظام ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرق مبارک پہ ضربت کاری
حضور آصف سابع پہ ہے غشی طاری

زمانۂ روپوشی کی یہ پہلی اور آخری نظم ہے جو مخدوم نے کہی۔ اس کے بعد وہ مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر لئے گئے۔ جیل میں انہوں نے "قید" نظم لکھی۔

قید ہے، قید کی معیاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں داد نہیں

مجھے غم ہے کہ میرا گنج گراں مایۂ عمر
نذر زنداں ہوا
نذر آزادئ زندان وطن کیوں نہ ہوا

مخدوم جب ۱۹۵۲ء میں انتخابات میں حصہ لینے کیلئے رہا ہوئے ہیں تو ہزاروں عوام اس نظم کو کھلے جلسوں میں بہ اصرار سنتے اور سر دھنتے۔

اس کے بعد مخدوم آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے ٹریڈ یونینوں کے عالمی وفاق کے مرکزی دفتر میں کام کرنے کے لئے ویانا چلے گئے۔ سویت یونین اور چین کا دورہ کیا۔ اسی عالمی وفاق کے نمائندے کی حیثیت سے کولمبو کانفرنس میں شریک رہے۔ پھر ۱۹۵۴ء میں ہندوستان واپس آئے اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے کلکتہ والے اجلاس میں جائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے اور اے آئی ٹی یو سی کے ہیڈ کوارٹرز دہلی میں رہنے لگے۔ اسی حیثیت سے انہوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ اور پھر ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد آ گئے اور یہاں کی سیاسی اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں جٹ گئے۔

اس پورے زمانے میں مخدوم نے کوئی نظم نہیں لکھی۔ مخدوم جب جیل سے باہر آئے تو دنیا بدل چکی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا یوروپ اب دوسرا ہی یوروپ تھا۔ ہندوستان میں بھی بڑی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ان تبدیلیوں کو اچھی طرح جان لینا روح عصر کو اپنی گرفت میں لے لینا اور عصری کشمکش کا ادراک کرنا صبر آزما کام تھا جس کے بغیر مخدوم کے لئے کچھ لکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس طویل خاموشی کے زمانے میں مخدوم اسی کشمکش سے گذر رہے تھے اس کے بعد مخدوم پھر شعری تخلیقات لئے بزم میں آ گئے۔ مخدوم نے "گل تر" کے دیباچے میں کہا ہے کہ یہ کلام اپنی سج دھج، نفس مضمون، حقیقت ندرت جمالیاتی کیف و کمیت اور تاثر کے اعتبار سے "مختلف" ہے پھر آگے چل کر اسی دیباچے میں کہتے ہیں۔ "یہ فرق میری نسل میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقاء کی نشان دہی کرتا ہے۔ پھر بھی انسان دوستی اور میٹھا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہیں" چارہ گر" "آج کی رات نہ جا"، "پھاگ متی" سب اس دور کی چیزیں ہیں۔ "چارہ گر" میں محبت کی ازلی تشنگی بتائی ہے۔ پیار "حرف وفا" ہے، "خدا" ہے اور پھر پیار کرنے والوں کی "چتا" بھی بن جاتا ہے۔ مخدوم روائتی "چارہ گر" سے پوچھتے ہیں۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے۔

مخدوم نے اپنی نظم "آج کی رات نہ جا" سوریا پیٹھ میں اس وقت کہی جبکہ وہ اور میں نلگنڈہ ضلع کی کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اس نظم میں تضادات زندگی کا بھرپور اظہار ہے۔ زندگی کوئی یک رخی راستہ نہیں ہے۔ لطف بھی ہے آزار بھی ہے۔ دید بھی ہے اور حسرت دیدار بھی ہے۔ دار بھی ہے دلدار بھی ہے۔

اس دور کی بہترین نظم "چاند تاروں کا بن" ہے۔ اس نظم میں آزادی سے پہلے آزادی، اور پھر آزادی کے بعد اور آگے کے مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں۔ آزادی سے پہلے۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے
منتظر مرد و زن

اور جب آزادی ملی تب ـــ

رات کی شہ رگوں سے اچھلتا ہوا
جوئے خوں بن گیا
کچھ رہا ماں صد مکر و فن

اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی لوک زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے
آزادی کا روپ ایسا ہے ؟
رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا اجالا بھی ہے

پھر آگے کیا ؟ —

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو
"رقص" اسی زمانے میں لکھی ہوئی مخدوم کی ایک بہت نمائندہ نظم ہے
وہ روپ رنگ گلگ پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آگیا

وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی
"رقص" زندگی کی بھرپور مسرت کی نمائندہ نظم ہے۔ سمندروں کی جھاگ سے بنی ہوئی ناپائیدار جوانیاں محبت کی جنوں پرور چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپ کر مضبوط ہوئی ہیں۔ تبھی تو زندگی محبت اور مسرت سے معمور ہے۔ یہاں "سمندروں کی جھاگ سے ہمارا روایت آشنا ذہن" امرت منتھن" کی طرف جاتا ہے جہاں سمندر سے امرت بھی نکلا تھا۔ اور زہر بھی۔ جوانی بھی نمودار ہوئی تھی اور حسن بھی۔ ساتھ ہی یونانی دیو مالا کے دیوتا وینس کی طرف بھی ذہن رجوع ہوتا ہے جو سمندروں کی جھاگ سے بنا تھا۔
غرض یہ نظم ہر لحاظ سے مکمل نظم ہے اور اس کے آخر میں مخدوم اپنی ساری زندگی اور شاعری کا مقصد نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔
الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو، کوہکن کی جیت ہو
اس کے بعد مخدوم نے غزلیں کہنی شروع کیں۔ اور یہاں غزل کی روائتی علامتوں سے عصری کشمکش کی زیریں رو جھانک جھانک کر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔
ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخئ ایام بھی پی ہے

کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر رنگِ چمن
میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے
بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

دراز ہے شبِ غم سوز و ساز ساتھ رہے
مسافرو! مئے میناگداز ساتھ رہے

اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہمکنار کریں

کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لئے
کیرالا میں جب ۱۹۵۷ء میں ہندوستان کی پہلی کمیونسٹ وزارت بنی تو رجعت پسند بوکھلا اُٹھے تھے۔ ہندو، عیسائی، مسلمان سبھی رنگ کے فرقہ پرستوں نے کانگریس کے رجعت پسند رہنماؤں کے ساتھ مل کر اس حکومت کے خلاف زبردست مہم چلائی۔ بالآخر مرکزی حکومت نے اس سرکار کو بے دخل کر دیا اور صدر راج نافذ ہو گیا اور پھر درمیانی مدت کے چناؤ غالباً ۱۹۶۰ء میں ہوئے۔ اس موقعہ پر مخدوم پارٹی کی چناؤ مہم میں حصہ لے رہے تھے۔ اور اسی وقت ان کی مشہور غزل "آخرِ شب" ہوئی۔ ان اشعار میں لطیف سیاسی اشاروں پر غور فرمائیے۔
گل ہے قندیلِ حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب
ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب
اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب
"قندیلِ حرم"، "کلیسا کے چراغ" اور "پیمانہ" کی علامتوں کی بلاغت محتاجِ توجہ ہے۔

اپنی پرانی نظم "قمر" میں مخدوم نے پوچھا تھا۔

کہاں ہے ساقیٔ مہرو، کہاں ہے "سرخ شراب"

اور اب "آخرِ شب"، "دستِ دعا"، اسی "سرخ شراب" سے "بسریز پیمانہ" کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ان ہی غزلوں کے ساتھ ساتھ مخدوم نے اس زمانے میں بعض نہایت ہی حسین نظمیں بھی کہی ہیں۔ "جانِ غزل"، "احساس کی رات"، "سناٹا"، "وادیٔ فردا"، "لعنتِ جگر"، "وصال" اور "رات کے بارہ بجے" وغیرہ

"جانِ غزل" میں کہتے ہیں۔

میری جانِ غزل
خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کی مے پئیں
راستے منتظر، گل بداماں ہے ہر رہ گذر
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر، کچھ دور تک
آج تو ساتھ چل

"خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں" کی ترکیب توجہ طلب کرتی ہے۔ اور "مے" زندگی کی موجود مسرتوں کی علامت بن کر آئی ہے۔

"احساس کی رات" میں مخدوم طوفانِ حوادث کی ہولناک یلغار کے سامنے لطفِ احساسات کے سرد ہو جانے کے خطرے کے تصور ہی سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ آخر یہی تو احساسات ہیں جنہوں نے انسان کو سربلند و سرفراز رکھا ہے۔

"سناٹا" میں مخدوم نے اس کربناک خاموشی کی طرف اشارہ کیا ہے جو دردِ زیست کی انتہا ہے۔

ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتّہ کھڑکے
کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے

"وادیٔ فردا" کشمیر کی وادی ہے۔ آج تو وہاں یہی کچھ ہے۔

جھاڑیاں درد کی
دکھ کے جنگل

ندیاں
جنہیں بہا کرتے ہیں دل کے ناسور
رات ہی رات ہے سناٹا ہی سناٹا ہے

پھر کل کیا ہوگا؟ —

تیری پرواز ہی بن جاتی ہے سامانِ سفر
دامنِ کوہ میں سوتی نظر آتی ہے

تیرے خواب کی زرین سحر

—

"لعنتِ جگر" وہ ناخواستہ "طفلکِ بے پدر" ہے جیسے کوئی "ماں"

کئی سال پہلے
زمانے کے ڈر سے
سرِ رہگذر
چھوڑ آئی اور پھر وہی "طفلک"
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کا ھادی بنا
پھر خدا بن گیا۔

"وصال" ایک دوشیزہ کی کہانی ہے جس نے محبت کی، اور قدامت پسند ماں باپ رکاوٹ بن گئے۔ لیکن محبت کامراں ہو جاتی ہے۔ اور ایک طرف،

دولہن کی دیوڑھی کے کھنڈروں میں
بڑھا ناگ کھڑا روتا ہے

اور دوسری طرف
دو پھول
تنور بدن
شبنم پی کر سو جاتے ہیں

"رات کے بارہ بجے" نظم ان دنوں لکھی گئی جب ملک میں فسادات ہو رہے تھے اور خاص طور پر احمد آباد کے فسادات نے روحِ جمہور کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

رات کے کوئی بارہ بجے ہوں گے
گرمی ہے
سڑکوں پر کوئی نہیں

. . . .

اور چاروں دوست دھیرے دھیرے سرکتے سرکتے چوراہے کے چکر کی ہریالی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چاند نکلا

تو چاروں نے دیکھا
وہ چاند تنہا ہے

چاند کی تنہائی میں وہ اپنی کربناک تنہائی دیکھتے ہیں۔ اور پھر

جوشِ سرمستی کے عالم میں
شیشے میں جتنی بھی تھی
وہ سب بانٹ کر

قہقہے مار کر
پی گئے

اس کے بعد ـــــ

ناچتے ناچتے
چاروں رونے لگے
اور ہر ایک کے منہ سے نکلا
یارو !
ماں یاد آتی ہے ۔ جاتا ہوں

یہاں رات کا سناٹا بے بسی کی علامت ہے ۔ بھی کبھی شراب جینے کی خواہش ہے لیکن عدم سلامتی کا احساس مارے ڈالتا ہے۔ سلامتی ماں کی گود میں ممکن ہے ۔ ماں کی یاد آتی ہے۔

"ماں" مخدوم کی زندگی کا ایک عجیب باب ہے ۔

مخدوم کے والد کا اسی وقت انتقال ہوگیا تھا جب مخدوم بہت چھوٹے تھے اور مخدوم کی جری ماں نے اس وقت کے سماجی آئین کو ٹھکرا کر دوسری شادی کرلی تھی۔ لیکن مخدوم کے چچا نے مخدوم سے یہ بات نہ بتائی۔ مخدوم کو بہت بعد کو پتہ چلا کہ ان کی ماں زندہ ہے اور ان کے بطن سے ان کی ایک بہن بھی ہے۔ بالاخر ان کی ماں ان کے ساتھ رہنے لگی تھیں اور مخدوم ہی کے گھر میں ان کا انتقال ہوا۔

قصہ مختصر مخدوم کی زندگی اور مخدوم کی شاعری دونوں ہی کا جذباتی مرکز اور نصب العین ایک ہی ہے ۔ لیکن شاعری ان کے پاس شعری عظمتوں کے ساتھ ہے۔ وہ کشمکش حیات کا بھونڈا بیان نہیں ہے ۔ اسی لئے تو ان کی شاعری عوام اور خواص دونوں ہی میں مقبول ہے ۔

تذکرے رستوں میں، چرچے ہیں پری خانوں میں

ویٹ نام کے عظیم رہنما ہوچی منہ نے امرتا پریتم سے کہا تھا وہ دونوں ہی غلط اقدار کے خلاف لڑ رہے ہیں، بے کہ نہیں ! تم اپنے قلم سے اور میں اپنی تلوار سے" لیکن مخدوم کے پاس وہ ہنر تھا کہ وہ حسب ضرورت تلوار کو قلم میں اور قلم کو تلوار میں تبدیل کر لیتے تھے۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ مخدوم کی تاریخ وفات ان الفاظ سے نکلتی ہے ۔

"پشت و پناہِ غربا"

اور یہی تو وہ زندگی بھر بنے رہے ان کی قبر پر یہی دو عبارتیں کندہ ہیں ۔

پشت و پناہِ غربا
اور
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

"سحر" جس کے لئے مخدوم نے زندگی بھر صعوبتیں اٹھائیں اور جس کی آرزو میں شعر بھی کہتے رہے اور اپنی صلیب اٹھائے چلتے بھی رہے اس سحر سے پہلے ہی وہ سو گئے ۔ مگر لگتا ہے وہ پھر روپوش ہو گئے ہیں۔ اور اپنے انڈر گراؤنڈ ڈن سے برابر ہدایات بھی بھیج رہے ہیں اور گیت بھی ۔

بقیہ :- مخدوم کی سیاسی شاعری

"چاند تاروں کا بن" اسی موضوع سے متعلق ہے ۔ استحصال کرنے والے طبقے کو اسے

کہئیے مخدوم	سمجھا ۔ جو "خون نور سحر" پی جاتا ہے ۔ صبح
کے اجالے کو اجالا نہیں	اس کے باوجود بھی مخدوم کا پیغام

اور مزاجیت کا نہیں بلکہ مزید جدوجہد کا ہے ۔ اب بھی انہیں پیار کی، دار کی اور کوئے دلدار کی منزلوں کی تلاش ہے ۔ یہ صرف ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے سارے غیر اشتراکی ملکوں کی منزل ہے ۔

مخدوم کی سیاسی شاعری کو انقلاب کی شاعری کہا جا سکتا مجھے اس پر اصرار نہیں ہے ۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ مخدوم کے پاس کامیاب اور بہترین سیاسی نظموں کی تعداد ضرور کم ہے لیکن وہ اقبال کے بعد شاید اردو کے سب سے اچھے سیاسی شاعر ہیں ۔ جس میں بے معنی نعرہ بازی نہیں ۔ Naked پروپگنڈہ نہیں ۔ پارٹی لائن کا میکانکی اظہار نہیں، اور الفاظ اور صرف الفاظ کی گھن گرج بھی نہیں ۔ شاعری ان کی سیاسی شخصیت کا اب جز ہے جس کو الگ کرنا ناممکن ہے ۔ اس طرح سیاست کو ان کی شاعری سے علیحدہ کر کے پرکھنا بھی حماقت کے مترادف ہے مخدوم کی شاعری ان کی سیاسی بوجھ کا بہترین اظہار ہے ۔ ان کی نظمیں جیسے سپاہی، انقلاب، جنگ آزادی، قید اور چاند تاروں کا بن ہمیشہ زندہ رہنے والی نظمیں ہیں ۔ کیونکہ ان سوچنے والے مرد اور عوامی ذہن " Man's mind ایک بہترین اتحاد موجود ہے ۔



صفی الدین صدیقی

مخدوم ۔ فن اور شخصیت

خواتین و حضرات ! لگ بھگ گیارہ سال کے بعد اس شہر اورنگ آباد میں ہم یادِ مخدوم منا رہے ہیں ۔ آج کے اس جلسے میں کچھ ایسے اہلِ علم بھی موجود ہیں جن کا تعلق مخدوم محی الدین کی شہرت سے ہے اور ان کے بعد کی نسل کے بھی چند ایسے لوگ جنہیں مخدوم صاحب سے نیاز حاصل رہا ہے ۔

آج کے اس یادگار جلسے میں جو مضمون میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اس کی بنیاد ان دو مضامین پر رکھی گئی ہے جو میں نے صبا کے مخدوم نمبر (۱۹۶۶ء) اور ماہنامہ کتاب لکھنؤ (۱۹۶۹ء) میں شائع کئے تھے ۔

مخدوم صاحب کے بارے میں میری اس ادبی پیش کش کی نوعیت کچھ جداگانہ قسم کی ہے کہ میں اپنے اندر احترام کے اس جذبے کو جاگزیں رکھتا ہوں جو ایک شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ ہونا چاہیئے ۔ استاد ایک اچھا دوست ہوتا ہے لیکن جہاں تک افکار اور عقائد کا تعلق ہے ایک شاگرد کو اپنے استاد سے نظریاتی اختلاف ہو سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں ارسطو کے ایک مقولے نے میری رہنمائی کی ہے ۔ وہ کہتا ہے ـــــ " صداقت مجھے عزیز ہے اور افلاطون کو بھی میں عزیز رکھتا ہوں لیکن افلاطون کے مقابلے میں صداقت مجھے عزیز تر ہے " ۔

چونکہ اکثر لوگ مخدوم صاحب کو ایک شاعر اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے جانتے ہیں تو انہیں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ مخدوم صاحب شاعری کی حد تک میرے استاد رہے ہوں گے ۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے میں شاعر نہیں ہوں ۔

میں تو ان مخدوم محی الدین کی بات کر رہا ہوں جو اب سے چالیس سال قبل ایک استاد کی حیثیت سے سٹی کالج آئے تھے ۔ ان دنوں میں میٹرک کا طالب علم تھا ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مخدوم صاحب نے شاید ہی درسی یا نصابی کتب میں دلچسپی لی ہوگی ۔ وہ اکثر زبان و ادب کی باتیں کرتے تھے جو ہمارے اپنے معیار سے بہت اونچی ہوتیں لیکن ان باتوں کو سننے میں ہم کو بڑا لطف آتا تھا ۔

ان دنوں مخدوم صاحب جب بھی کلاس میں داخل ہوتے تو ان کے ہاتھ میں ایک پتلی سی مجلد کتاب ہوتی ۔ میرے اکثر ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ ہو نہ ہو یہ مخدوم صاحب کا مجموعۂ کلام ہوگا ۔ اور ہم نے مخدوم صاحب سے اس کتاب کے بارے میں پوچھ لیا ۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہنے لگے ـــــ یہ مجموعۂ کلام تو ہے لیکن میرا نہیں بلکہ بنگال کے انقلابی شاعر نذر الاسلام کی نظموں کا مجموعہ ہے ۔ اس کے بعد انہوں نے نذرل کی کچھ نظمیں پڑھ کر سنائیں ۔ وہ نظمیں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے ہم طالب علموں کے لئے بالکل نئی تھیں ۔ چنانچہ ہمارے ناپختہ ذہنوں نے ان کو شاعری ماننے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ اردو کی جن نظموں کو ہمارے ذہنوں نے قبول کیا تھا وہ نذرل کی نظموں سے بالکل مختلف ہیں اور جو بچگانہ/طفلانہ مزاج سے زیادہ ہم آہنگ بھی تھیں ۔ ان میں وزن ہوتا ہے قافیوں کی جھنکار بھی ہے ۔ اور انہیں ترنم کے ساتھ پڑھا بھی جا سکتا ہے ۔ دلچسپ بات تو یہ تھی ، ہم نے نذرل کی نظموں کو اردو کی نظمیں سمجھ لیا تھا ۔ نذرل خواہ بنگال کا رہنے والا کیوں نہ ہو اس کی مادری زبان اردو ہی ہونی چاہیئے ہم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بنگالی مسلمانوں کی مادری زبان بنگالی اور ملیالی مسلمانوں کی زبان ملیالی ہوتی ہے ۔ دیسے دیکھا جائے تو اردو کے تعلق سے ہمارا یہ نظریہ بالکل وہی تھا جو آج کل کے بعض اردو دشمنوں کا ہے جو اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں ۔ ہمارا یہ نقطۂ نظر درحقیقت اس وقت کے جاگیردارانہ سماج کی دین تھا ۔ مخدوم صاحب نے پہلی بار ہم کو یہ احساس دلایا تھا کہ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ادب کے انمول خزانے موجود ہیں ۔ چنانچہ اپنی طالب العلمانہ زندگی میں جو پہلی کتاب ایچ بک ڈپو سے میں نے خریدی وہ نذرل کی بنگالی نظموں کا اردو ترجمہ تھا ۔

ہم میں سے اکثر طالب علموں نے مخدوم صاحب کو مشاعروں میں اپنی نظمیں پڑھتے ہوئے سنا تھا ۔ وہ مخصوص ترنم میں نظمیں سناتے تھے جس کے باعث ان کی اثر پذیری میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ۔ بعض مرتبہ کلاس کے باقاعدہ اوقات میں بھی ہم مخدوم صاحب سے نظمیں سنانے کی خواہش کرتے تھے ۔ پہلے تو وہ اس فرمائش کو ٹالتے رہے لیکن جب ہماری طرف سے اصرار بڑھتا گیا تو دو تین بار انہوں نے اپنی نظمیں بھی سنائیں لیکن بسا اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ نظمیں ہماری اپنی پسند

کی نظمیں نہ ہوتیں۔ مخدوم صاحب حویلی، انقلاب، [illegible] اور مشرق نام کی نظمیں سنانا پسند کرتے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ وہ اپنی نظم "انتظار" سنائیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ حویلی، مشرق، انقلاب یا اندھیرا کے مقابلے میں "انتظار" اور "ساگر کے کنارے" جیسی نظمیں آخر ہمارے لئے کیوں پسندیدہ تھیں تو اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ پسند اور ناپسند کے مقابلے میں عمر اور ذہنی سطح کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ عمر کی اس منزل میں خود رومانیت کا زیادہ دلدادہ ہوتا ہے خواہ یہ رومانیت اس کو کسی بھی شباب سے دستیاب ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نوعمری میں انقلابی تصورات کو قبول کرنے کی صلاحیت فرد کے اندر بالکل نہیں پائی جاتی۔ وہ ان تصورات سے اثر تو قبول کرتا ہے لیکن اس کی انقلابی ذہنیت پر بھی رومانیت کی چھاپ ہوتی ہے۔

شاید اس وقت ہم لوگ ذہنی طور پر اس قدر پختہ نہیں تھے کہ مخدوم صاحب کی شاعری کے رُخ کو متعین کر سکتے۔ ہم جس سماج کے اندر سانس لے رہے تھے وہ اس قدر پرانا اور ٹھہرا ہوا تھا کہ اس کو بدلنے کا خیال ہمارے ذہنوں میں آنا محال تھا۔ ہم اس کو ایک آئیڈیل سماج سمجھے ہوئے تھے اور ہمیں اس سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ گو دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا لیکن اس جنگ کا ہماری زندگیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ ہم کو اس بات کا احساس بالکل نہیں تھا کہ ہم جیسے نوجوان ریاست کے باہر اور اندر ہر محاذ پر آزادی کی جنگ کر رہے ہیں۔

۱۹۴۱ء میں مخدوم صاحب نے معلّمی کا پیشہ ترک کر دیا اور عملی سیاسیات سے وابستہ ہو گئے۔ اب وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی رکن بن گئے۔ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم ان کا لائحہ عمل بن گیا۔ ان کی زندگی میں یہ موڑ کیسے آیا۔ اس انقلابی شعور کا باعث کیا تھا اس پر میں روشنی نہیں ڈالوں گا۔ اس کی مکمل داستان تو مخدوم صاحب کے وہ ساتھی قلمبند کر سکتے ہیں جو کمیونسٹ تحریک کی حد تک ان کے شریکِ کار رہے ہیں (ڈاکٹر ملا راج بہادر گوڑ، کامریڈ چندر گپت چودھری، ڈاکٹر مسز کرونا چودھری)

لیکن مخدوم صاحب کی اس تبدیلی پر مجھے تعجب نہیں ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کی شخصیت کے اندر ابتدا ہی سے ایسے ذہنی عوامل کارفرما تھے جو انہیں کسی بڑی تبدیلی کی طرف لے جا سکتے تھے۔ ایک محفوظ اور مامون زندگی کو تج کر کسی خاص مقصد کے لئے خود کو وقف کر دینا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے ایقان کی تلاش میں پرانے عقائد کو تہس نہس کرنا پڑتا ہے اور نئے نئے خطروں کو دعوت دینی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ مخدوم صاحب نے کیا۔

اب میں سٹی کالج کی تعلیم ختم کر کے جامعہ عثمانیہ میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً سکندرآباد جانے والی ایک بس میں مخدوم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ خاکی نیکر اور خاکی قمیص میں ملبوس تھے اور ہاتھ میں ایک بڑا سا چرمی بیگ تھا۔ رات بھر میری تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب میں نے کہا کہ فلسفۂ سیاسیات میرا خاص مضمون ہے تو کہنے لگے مارکسزم کا فلسفہ بھی تم نے پڑھا ہوگا۔ میں نے جواب دیا اس کے بغیر فلسفۂ سیاسیات کی تحصیل کیوں کر مکمل کی جا سکتی ہے۔ پوچھنے لگے اس کے اندر کیا پایا تم نے؟ میرا جواب تھا۔ مارکسزم کو میں اپنے عہد کا ایک عظیم ترین فلسفہ تو مانتا ہوں مگر یہ واحد فلسفہ نہیں ہے۔ مساوات ہی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مخدوم صاحب نے کہا۔ یہ تم نہیں بلکہ تمہارے اندر کا اقبال بول رہا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ فکرِ اقبال نے مارکسزم کے تعلق سے اعتقاد کی یہ راہ مجھ کو سجھائی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ میں برٹرنڈ رسل کی اس رائے کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مارکسی فلسفے کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔

۱۹۴۲ء میں مخدوم صاحب کی منزل متعین ہو چکی تھی۔ اس راستے کے وہ تنہا مسافر نہیں تھے بلکہ حیدرآباد کے کچھ اور نوجوان بھی ان کے شریکِ سفر تھے۔ حکومت کے خلاف بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور تین ماہ کے قید کی سزا دی گئی۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کن حالات میں اور کن مقاصد کے تحت ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس انجمن کی شاخیں دیس بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن حیدرآباد میں مخدوم صاحب ہی کی کوششوں سے یہ انجمن وجود میں آئی۔ ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں پہلی بار اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا اجتماع ہوا۔

۱۹۴۴ء میں مخدوم صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "سُرخ سویرا" کے نام سے شائع ہوا جس میں ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک لکھی ہوئی شعری تخلیقات شامل ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم اتحادیوں کی مکمل فتح پر ختم ہوئی۔ اس طرح فاشسٹی طاقتوں کا قلع قمع ہو گیا۔ لیکن برطانوی سامراج کا عفریت اب بھی ہندوستان پر سوار تھا۔ ہندوستان کی اکثر و بیشتر سیاسی پارٹیوں کا مشترکہ لائحہ عمل ملک کی آزادی تھا۔ البتہ دیسی ریاستوں کے حکمراں برطانوی سامراج سے آس لگائے بیٹھے تھے کیونکہ دیش کی آزادی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔

آزادی ملی لیکن اس طرح کہ عظیم تر ہندوستان دو ملکوں میں بٹ گیا۔ ۳۱۔ تقسیم کے بڑے ہی ہولناک اور بھیانک ادب ہمارے سامنے آئے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اس درندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کچھ ادیبوں کو اس آزادی نے میں مبتلا کر دیا۔ اس کو داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے مخدوم نے بھی اشعار کی کرب ناک گھڑیاں بتائی تھیں اور بلند آواز میں یہ گیت گایا تھا ؎

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگزار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے

عوامی طاقتوں کو اُبھرتا اور کامران ہوتا دیکھ کر مخدوم نے ایک خوشگوار مستقبل کی پیش بینی کی تھی ؎

چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
نہ سلطانی و قیصری ہے نہ زاری
نہ تخت سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے

جنگ کے خاتمے کے بعد ادھر حیدرآباد کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا۔ ایسی سیاست جس میں نہ تو بصیرت تھی نہ عقلیت پسندی کا نام ونشاں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حیدرآباد کو آتش فشاں کے دہانے پر بٹھا دیا گیا ہے جو پتہ نہیں کب پھٹ پڑے۔ اس نام نہاد سیاست کا جو انجام ہوا وہ ہم سب دیکھ چکے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مخدوم انڈرگراؤنڈ ہو گئے۔ تلنگانہ تحریک کا وہ غلغلہ بلند ہوا جس نے ریاست کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔ اس زمانے میں مخدوم کی نظم "تلنگانہ" خفیہ طور پر لوگوں تک پہنچ چکی تھی جو اب ان کے دوسرے مجموعۂ کلام گل تر میں شامل ہے۔ تلنگانہ کو شاعر نے دیارِ ہند کی محبوب ارضِ حسیں سے تعبیر کیا ہے۔ میں مخدوم محی الدین کے اس گیت کا ذکر خاص طور پر کروں گا جو اس زمانے میں مزدوروں اور محنت کشوں کا ترانہ بن چکا تھا۔ مزدور تنظیموں کے مرحلہ کا آغاز اسی ترانے سے ہوا تھا۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی،
آزادی کے پرچم تلے

لیکن آزادی کی جنگ کا نعرہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

مخدوم کی نظم ـــ جانے والے سپاہی سے پوچھو، ہٹلر، مسولینی اور فرانکو جیسے آمروں کے سفلی جذبات کی نقاب کشائی کرتی ہے

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مخدوم کی شاعری نے ساگر کے کنارے پھر دیدۂ نمناک ... رتے رہے، سے لے کر جانے والے سپاہی سے پوچھو، تک ایک لمبی مسافت طے کی ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے میں مخدوم کو کن کن تجربوں سے نہیں گزرنا پڑا۔ آزادی کی جدوجہد کی تاریخ لکھنے والا مورخ ان نظموں کی اثر پذیری اور معقولیت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

مخدوم جس راستے پر چل پڑے تھے وہ خطرات سے پُر تھا اور انہیں اس کا پورا احساس بھی تھا۔ ویسے بھی وہ خطرات سے کھیلنے کے عادی ہو چکے تھے ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیّاد

عوام کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کا انعام مخدوم کو قید وبند کی صورت میں ملا۔ کی زندگی مجرموں کے تعلق سے دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو سماجی مجرموں کی زندگی ہے جو اپنی بداعمالی کی سزا بھگتنے کے لئے محبوس کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سزا کا مقصد ان کے کردار کی درستی ہوتی ہے۔ شاذ ونادر صورتوں ہی میں عادی مجرموں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ دوسری زندگی ان لوگوں کی ہے جو سماجی ناانصافیوں کے خلاف جہاد کرنے کے جرم میں محبوس کئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی عارضی تنہائی کو خیالات وافکار کی دنیا سجانے کا وسیلہ بناتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایسے جیالوں سے قید وبند کی زندگی نے لٹریچر کے شاہکار لکھوائے ہیں۔ تب مجھے دنیا سجانے والے دستوئفسکی " نصیب مردوں کی بستی کا خیال آتا ہے۔ میں سقراط، تو تجل، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، فیض اور مخدوم محی الدین کے بارے میں سوچنے لگ جاتا ہوں۔

مخدوم کی نظم 'قید' کو میں ان کی بہترین نظم شمار کرتا ہوں۔ رات کی خاموشی وتنہائی میں ظلم وجور کی شکایت کرنے والا شاعر گہرائی سے گھنٹوں کی آواز سنتا ہے۔ اس کا دماغ چونک جاتا ہے اور شمع شبستانی خیال جاگ اٹھتی ہے۔ تب اسے گذری ہوئی زندگی کی اک اک بات یاد آتی ہے۔ وہ جیل سے باہر سانس لینے والے سیکڑوں لاکھوں عوام کی غمگین آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے جو جورِ شاہی اور جبرِ سیاست سے نڈھال ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ یہی عوام ایک دن دھماکہ بن جائیں گے۔ تب نہ سلطانی وقیصری رہے گی نہ تخت شاہی۔ لیکن شاعر کی نظم کے آخری مصرعے اس کی اپنی سوزشِ غم کا پتہ دیتے ہیں ؎

مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

دسمبر ۱۹۵۲ء میں مخدوم دوسری بار جیل سے رہا ہوئے۔ ہندوستان میں پہلی بار عام انتخابات منعقد ہوئے۔ حیدرآباد میں کانگریس پارٹی کے خلاف ایک عوامی جمہوری محاذ قائم ہوا جس کی قیادت مخدوم نے کی تھی۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی میں بیک وقت مخدوم ہار گئے۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں کانگریس کا رول اور کچھ گاندھی اور جواہر لال جیسے لیڈروں

امکانات

کی وجہ سے کانگریس پارٹی کی جیت غیر متوقع نہ تھی۔ مخدوم کی ہار کو محنت کش عوام میں ان کی عدم ہر دلعزیزی پر نہیں کہا جانا چاہیئے کیونکہ مخدوم ضمنی انتخابات میں اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۵۶ء کے بعد ایک طویل عرصہ قانون ساز کونسل آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر رہے۔

اپنی پارٹی کے مصروف ترین رکن رہنے کے باوجود مخدوم نے تخلیقی ادب پیدا کیا۔ ان کی شاعری کا دوسرا دور آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام 'گل تر' ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

۱۹۵۰ء تک سرخ سویرا اور اس کے بعد کی نظمیں ہندوستان کے طول و عرض میں مقبول ہو چکیں تھیں۔ یہی سال جناب سردار جعفری کی اہم دستاویزی کتاب ترقی پسند ادب' کی اشاعت کا ہے۔ عجیب بات ہے کہ سردار جعفری صاحب دو ایک جگہ پر صرف مخدوم کے نام کی کی ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ ایک کتابچہ مخدوم کے تعارفی خاکے کے طور پر شائع کر چکے تھے۔ اس کے برخلاف پروفیسر عزیز احمد کی کتاب ترقی پسند ادب میں جو کہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے مخدوم کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد کہتے ہیں :-

مخدوم محی الدین کی شاعری تمام انقلابی شاعری کے مقابل اپنے خلوص' خوش کرداری اور انقلابی حدت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ ان کی نظمیں عشقیہ ہوں یا انقلابی' ایک آتش فشاں' اندرونی حرارت ایک سچا جذبہ ان کا محرک ہے۔

مخدوم کی کلیات بساط رقص سُرخ سویرا' گل تر اور ۱۹۶۱ء کی بعد کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جو شاعر کے حسن حیات شائع ہوا۔ مخدوم کی کل شاعری پر الہ آباد سے شائع ہونے والے ادبی جریدے 'شب خون' نے جو تبصرہ کیا تھا وہ تبصرہ نگار رائے کا غماز ہے۔
مگر انہیں صاحب نے مخدوم کی موت کے بعد ان کی ادبی عظمت کے تعلق سے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ میری یہ رائے کچھ لوگوں کو پسند نہ آئے۔ ہمارے اردو کے بعض نقاد کچھ زیادہ ہی علاقہ تعصب اور Bad Faith کا شکار ہیں۔ ایک مخدوم پر کیا موقوف زبانی بیان اور محاوروں کے تعلق سے انہوں نے اقبال کو بھی نہیں بخشا تھا مگر اقبال یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

اقبال لکھنؤ سے ہے نہ دلّی سے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اور تو اور مخدوم کے ہم عصر و دوست سکندر علی وجد جو زبان کے معاملے میں اپنی پیڑھی کے بہت سارے شاعروں کے مقابلے میں محتاط ہیں۔

ہمارے تمام نہاد تبصرہ نگار کی زد سے نہیں بچ سکے ہیں۔ (دیکھئے اوراق معدود شب خون کے مدیر کا تبصرہ) بات ہیر پھیر کر دہی دلی اور لکھنؤ کو بتا لوں تک پہنچتی ہے۔

مخدوم صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام 'گل تر' ہم کو ان کے فن کی نئی کروٹ سے روشناس کراتا ہے۔ مخدوم نے بعض کٹر ترقی پسندوں کے اس جنون کو توڑا ہے کہ غزل اردو شاعری کے دور جاہلیت کی یادگار ہے اور اس کو ترک کر دینے ہی میں اردو شاعری کی نجات ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بار پھر غزل نے اردو شاعری کی آبرو بچائی ہے۔ گل تر اور اس کے بعد بساطِ رقص کی اکثر غزلیں اپنی خوبصورتی اور بانکپن کی وجہ سے قاری اور سامع کو متاثر کرتی ہیں۔ مخدوم نے یہ جو کہا ہے تو سچ ہی کہا ہے کہ

دوسرے دور کی نظموں میں بھی مخدوم صاحب کی فکر نے نئے نئے امکانات کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ چاند تاروں کا بن' بھاگ متی' چارہ گر' اردو شاعری کی زندہ و تابندہ نظمیں ہیں۔ مخدوم صاحب کی نظم چاند تاروں کا بن' کا بہترین تجزیہ عالم خوندمیری نے کیا ہے جو صبا' کے مخدوم نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ عملی اور ذہنی دشواریوں سے گزرنے کے بعد مخدوم صاحب نے اپنے نظریہ عشق کو بھی مستقل کر لیا تھا۔ ان کے دوسرے دور کی شاعری اس نظریہ کی غماز ہے۔ سرخ سویرا اور گل تر کی شاعری کا فرق بتلاتے ہوئے خود مخدوم نے لکھا ہے ——

یہ فرق میری نظر میں نیا نہیں ہے جو عمر تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور ارتقار کی کی نشان دہی کرتا ہے۔ پھر بھی انسانی دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر مشترک ہیں۔

اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گذارتا ہے۔ سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ مہذب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حس انسان کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنون لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیب کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔ شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو روحانی کرب و اضطرار کی علامتوں کو اُجاگر کرتا۔ اور شعر میں ڈھالتا ہے اور اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تکمیل و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ شعر میں

(بقیہ صفحہ پر)

معین شاکر

مخدوم کی سیاسی شاعری

"ہماری نگاہ حسن عالمگیر ہو جائے گی۔ تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر کی غلامی کریں۔ تب ہماری خوددار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی۔ تب ہم صرف صفحۂ کاغذ پر تخلیق کر کے مطمئن نہ ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق، خودداری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادیب کا مشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے۔ وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے" پریم چند۔ (پہلی ترقی پسند کانفرنس کا خطبۂ صدارت)

مخدوم ترقی پسند تحریک کے چند بہترین نمائندوں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اس تحریک کو نہ صرف مالا مال Enrich کیا بلکہ اسے کئی نئے جہت بھی عطا کئے۔ ان کی رومانی شاعری ہو یا سیاسی، ان کا انداز بالکل منفرد ہے۔ ان کی رومانی شاعری کا رشتہ انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل کی رومانی اور روایتی شاعری سے جوڑنا مشکل ہے۔ اس میں نہ روایتی مسائل ہیں اور نہ پرانا لب و لہجہ اور نہ عشق اور حسن کو پرانے انداز میں دیکھنے کا ڈھنگ۔ اسے اپنے سماج کی سماجی، سیاسی اور معاشی الجھنوں سے فرار اور مستقبل پرستی Futurism کا ایک امتزاج کہا جا سکتا ہے۔

ترقی پسند تحریک سے قبل ہی اردو میں سیاسی شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اقبال کی شاعری صحیح معنوں میں فلسفیانہ مسائل اور سیاسی حقائق کی شاعری ہے۔ مغرب کے خلاف ردعمل، روس کے اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم، مشرق کی بیداری، مزدور سرمایہ کش مکش، سرمایہ دارانہ نظام کا زوال وغیرہ ایسے بنیادی مسائل پر نظمیں اور غزلیں لکھ کر اردو کی سیاسی شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اقبال سے قبل اردو میں سیاسی شاعری کی گئی کہ نہیں؟ یا یہ سیاست یا سیاسی شاعری کا کیا مفہوم ہوتا ہے؟ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال سے قبل اردو میں سیاسی شاعری موجود تھی۔ اردو کے شاعروں نے، بالواسطہ ہی سہی، اپنے عہد کے سیاسی مسائل کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ لیکن ایک جاگیردارانہ عہد، شہنشاہیت کے ادارے کی موجودگی، طبقۂ امراء کی حیثیت اور عام آدمی کی نارسائی ایسی پابندیاں تھیں جن کی وجہ سے سیاسی شاعری کا دائرہ محدود ہی رہا، لیکن یہ کہنا کہ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی غزلوں میں سیاست کے پیچ و خم کا اظہار نہیں ملتا، صحیح نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی سماج میں سیاست ایک آزادانہ category نہیں ہوتی، اس کا تعلق زندگی سے اتنے قریبی ہوتا ہے کہ اس سے فرار اور انحراف ناممکن ہو جاتا ہے۔ شعوری انکار کے باوجود، غیر محسوس طریقے سے سیاست کسی نہ کسی طرح سے شاعری میں در آتی ہے۔ اس لئے نہایت داخلی، یا عشقیہ یا غیر سیاسی شاعری میں بھی سیاست اور سیاسی حقائق کی جھلک مل جاتی ہے۔ اقبالؔ نے شعوری طور پر سیاسی موضوعات کا انتخاب کیا اور اسلام کے نقطۂ نظر سے اس کی تفسیر بھی کی۔ ان کی شاعری کی عظمت سے انکار نہیں لیکن اقبال کی مثالیت پسندی Idealism اور مذہبی نقطۂ نظر ضرور ان کی شاعری کی کمزوری ہے۔ اقبال کی مغرب دشمنی اور انگریز دوستی، حب الوطنی اور قومی تحریک سے اختلاف، اسلامی اتحاد اور قومیت کے تصوّر پر حملہ اقبال کی شاعری کے ایسے تضادات ہیں جو انہیں بڑے سیاسی مفکر ہونے کا اعزاز نہیں بخشتے۔ ترقی پسند تحریک نے شعوری طور پر شاعری میں سیاست کو داخل کیا۔ کسی بھی ترقی پسند شاعر نے سیاست کی اہمیت اور سیاسی موضوعات کی افادیت سے گریز نہیں کیا۔ لیکن تمام شاعروں کی سیاست کے بارے میں سوجھ بوجھ یکساں نہیں تھی۔ ان موضوعات کو برتنے کا ڈھنگ بھی یکساں

نہیں تھا۔ لب ولہجہ اور اندازِ بیان میں بھی واضح اختلافات موجود تھے۔ اس لئے مستند سیاسی شاعری اور اس کی نوعیت کا فیصلہ شاید ابھی ہونا باقی ہے۔ جوش ملیح آبادی کی رسمی نیشنل شاعری، سیاسی شاعری کی ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مثالیں فیض احمد فیض، سردار جعفری، نیاز حیدر وغیرہ کی ہیں۔ ن۔م۔ راشد نے ترقی پسند تحریک سے الگ رہ کر بھی سیاسی شاعری کی ہے۔ ایک مثال مخدوم کی شاعری کی ہے۔ یہاں غزل اور نظم کا بھی سوال پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی شاعری کے لئے کونسی ہیئت زیادہ موزوں ہے!

دوسری مشکل رومانیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ رومانیت کی چھاپ اردو شاعری پر اتنی گہری ہے، اس کا Idean اتنا غنائی ہے، اور روایت کا اثر اتنا شدید ہے کہ کئی بار سیاسی اور غیر سیاسی شعر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فیض کا یہ شعر ـــ

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اس لئے سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ فیض کا اصرار ہے۔ یہ دقّت اس اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ یہ غزل کا شعر ہے نظم میں بھی اس کا امکان رہتا ہے۔ مخدوم کی نظم "جز تیری آنکھوں کے" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے

تیرے رخسار کی دہکی ہوئی رنگین شفق
اور بھی سرخ ہوئی
تیرے سلگتے ہوئے ہونٹوں کے مہکتے شعلے
اور بھی تیز ہوئے
کب چھلک جائے نہ تیری لبریز وفا آنکھوں سے
مہر کی مئے
کب نکل آئے تیرے پیار کا چاند
توڑ دے حلقۂ زنجیر شب و روز
کہ یہ سلسلۂ کرب و الم ختم تو ہو
اور ہو جائے جنوں آوارہ
تو میرے حلقۂ آغوش میں آ

مخدوم کا خیال تھا کہ یہ ایک رومانی نظم نہیں بلکہ اس کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے ہے۔ ممکن ہے کمیونسٹ پارٹی کو موضوع سمجھ کر اس نظم کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا کوئی مطلب نکل آئے۔ لیکن بہتر ہوتا اس کا فیصلہ ادب کے نقاد ہی کریں!

تیسری مشکل خود شاعر کی شخصیت ہے۔ مخدوم کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا۔ وہ ایک سرگرم ٹریڈ یونین لیڈر تھے۔ لیکن بنّے بھائی اور مخدوم کی شاعری کا فرق یہ واضح کرتا ہے کہ سیاسی سوجھ بوجھ اور شاعری کا کوئی میکانکی رشتہ شاید ہو لیکن جدلیاتی تعلق ضروری نہیں ہے۔ مخدوم کی سیاسی شاعری کا جائزہ ان کی پارٹی میں پوزیشن کو نظر انداز کر کے بھی لیا جا سکتا ہے۔ صرف Approach یا روّیے کی بات اہم ہے اور کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی مارکسی نقطۂ نظر سے ادب اور اس کے مقاصد کا تعین کس طرح کیا جائے۔

اس مختصر مقالے میں بساطِ رقص کی صرف نظموں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان کی غزلیں سراسر رومانی ہیں۔ مخدوم کی غزلوں کے کئی شعر سیاسی واقعات سے متاثر ہو کر ہی لکھے گئے تھے۔ لیکن سہولت کے پیشِ نظر، ہم ان سے بحث نہیں کریں گے۔ "بساطِ رقص" میں رومانی اور غیر سیاسی نظموں کی تعداد سیاسی نظموں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اچھی سیاسی شاعری کرنا زیادہ مشکل ہے۔

مخدوم کی سیاسی شاعری کی بنیاد ہندوستانی سماجی نظام ہے، خوش قسمتی یا بد قسمتی کہیئے کہ ہندوستان میں قبائلی طرز زندگی سے لے کر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ نظام کے رشتے موجود ہیں۔ سامراجیت کی پھیلائی ہوئی ساری خرابیاں ہمیں ملتی ہیں۔ مخدوم کا سیاسی موضوع ویسے حیدرآباد کا جاگیردارانہ معاشرہ ہے۔ ان کو اس معاشرے کی اقدار کے کھوکھلے ہونے کا پورا اندازہ تھا۔ انہوں نے اس معاشرے کے لئے 'بوسیدہ حویلی' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اس کے نشانات کو وہ کھنڈر اور اس کی نوعیت کو اندھیرے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں اقتدار مہاجن اور امیر کے ہاتھ میں ہے، جنہوں نے اسے قاتلوں کی خوابگاہ بنا دیا ہے۔ اس میں ایمان اور انصاف کا سر کٹتا ہے۔ اس سماج کی کثیر آبادی جو بے زبان اور بے پوشش پر مشتمل ہے۔ ان کی تمنائیں پامال اور ان کا دل کچلا ہوا ہے۔ اس سماج کے کوڑھ کے دھبوں کو نہ ملبوس مہیا سکتا ہے اور نہ روحِ ابد میں بھوک کے شعلوں کو بجھا سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جو مشرقی ممالک میں سامراجیت کی ایک دین ہے، بحران اور انتشار کا شکار ہے۔ سامراجی ملکوں کا مفاد کبھی ان ممالک کی ترقی کا سب سے بڑا روڑہ ہے۔ اس لئے مشرق جہل، فاقہ، بھیک، بیماری اور نجاست کا مکان بنا ہوا ہے اسی سامراجی سیاست کی ایک اور دین جنگ ہے جو انسانیت کی بقا کے لئے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ اس کی تباہ کاری، زندگی کے بہترین اقدار کی پامالی، اور انسانیت کی زبوں حالی ہر حساس آدمی کو بغاوت پر اکساتی ہے۔

یہ سامراجی نظام جس کی بنیاد استحصال ہے، انسان کو

توجہات کا غلام بناتا ہے۔ سرمایہ دین کا سودائے خام پیدا کرتا ہے۔
یہ حریت اور مساوات کا دشمن ہے۔

مخدوم کی سیاسی شاعری ان ہی سماجی اور معاشی حقائق کی پروردہ ہے۔ ان سماجی رشتوں سے انکار اور بغاوت ان کی سیاسی شاعری کا مشن ہے۔ ان سماجی اور معاشی برائیوں کا حل صرف آزادی میں پوشیدہ ہے۔ آزادی کی لڑائی صرف متوسط طبقے کی لڑائی نہیں۔ یہ سارے محکوموں، مجبوروں، دہقانوں اور مزدوروں کی جنگ ہے۔ آزادی کی ضرورت صرف متوسط طبقے کو نہیں بلکہ پچھڑے ہوئے طبقات کو ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں سوراج کا مطلب مزدوروں کا راج ہے۔ اس کے بعد ہی سرخ سویرا طلوع ہوگا۔ اس ثانی کا Perspective بین الاقوامی، دنیا کے ہر ملک کی آزادی کی جدوجہد کا یہ ایک جزو لاینفک ہے۔ مخدوم نے آزادی اور انقلاب کا ذکر جس دل کش پیرائے میں اور جس خلوص کے ساتھ کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
تیرے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے
ابھی دماغ پہ قبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خوں کی دھار
شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے
(انقلاب)

نہ سلطانی تیرگی ہے نہ زاری
نہ تختِ سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری
چلا آرہا ہے
چلا آرہا ہے
سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے
چلا آرہا ہے، چلا آرہا ہے
(مستقبل)

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
(اندھیرا)

مخدوم کی سیاسی شاعری کے بنیادی عناصر اور عوامل حب الوطنی، آزادی کی تڑپ، فرسودہ سماج کو بدلنے کا عزم، انقلاب کی تمنا اور اشتراکیت کے خواب کو حقیقت بنانے کے لئے جدوجہد ہے۔ آزادی کا ذکر ہو یا قومی تحریک کی بات یا اسٹالن کی تعریف، مخدوم کو اصرار وطن کی محبت پر ہی ہے۔

وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا ستم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
کیا میں مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے میرے فردوس بدن کی خاطر (اسٹالن)

لیکن مخدوم کی یہ حب الوطنی کی حدود کی پابند نہیں ہے۔ اس کی نوعیت بنیادی طور پر طبقاتی ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان کے پہاڑوں اور دریاؤں کے پیار میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا موضوع لاکھوں غریب عوام کی محبت ہے۔

امتِ مرحوم ہو یا ملتِ زنار دار
ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچوں کی پکار

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

ہم بڑھے جائیں گے رستہ پر خطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائیں گے دشمن ہی کیوں نہ ہو
اپنی وردی خاک و خوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو
ایک ہو کر ۔۔۔۔

مخدوم کی سیاسی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی آزادی کی جنگ کو کمیونسٹ جدوجہد سے الگ نہیں سمجھا۔ ہماری قومی تحریک بنیادی طور پر متوسط طبقے کے ہاتھوں میں رہی۔ اور اس لئے یہاں کوئی لینن، کوئی ماؤزے تنگ اور کوئی ہوچی منہ پیدا نہیں ہوا۔ مخدوم کی بالغ نظری کا یہ ثبوت ہے کہ انہوں نے کمیونسٹ تحریک کو قومی تحریک کا ایک حصّہ سمجھا۔ ان کی دو نظموں کا یہاں حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ ایک تو جانبازان کیور اور دوسری "تلنگانہ" ہے۔ پہلی نظم انہوں نے اس وقت لکھی جب مالابار کے چار کمیونسٹ کسانوں کو پھانسی دی گئی تھی۔

ہاں بڑھے گا زندگی کا کاروان تیز گام ـ السّلام
لیں گے ہم لیں گے شہیدوں کے لہو کا انتقام ـ السّلام
عہد کرتے ہیں مٹا دیں گے یہ سولی کا نظام ـ السّلام
آل لینن آلِ اسٹالین کا زندہ ہے نام ـ السّلام
السّلام السّلام
السّلام اے سُرخ جانبازانِ کیور السّلام

اپنی نظم تلنگانہ میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ

دیارِ ہند کا وہ راہبر تلنگانہ
بنا رہا ہے نئی ایک سحر تلنگانہ
بلا رہا ہے بہ سمتِ دِگر تلنگانہ
وہ انقلاب کا پیغامبر تلنگانہ

امام تشنہ لباں خضرِ راہ آبِ حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
میرا ثبات میری کائنات، میری حیات
سلام مہرِ بغاوت، سلام ماہِ نجات

اُٹھے ہیں تیغ بکف یوں بصد ہزار جلال
وہ کوہ و دشت کے فرزند کھیتیوں کے لال
چمک رہی ہے درانتی اچھل رہے ہیں کدال
بنائے قصرِ امارت شکستہ و پامال

لرز لرز کے گرے سقف و بامِ زرداری
ہے پاش پاش نظامِ ہلاکو و زاری

پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری
حضورِ آصف سابع پہ ہے غشی طاری

...

سلام سرخ شہیدوں کی سرزمین سلام
سلام عزمِ بلند آہنی یقین سلام
مجاہدوں کی چمکتی ہوئی جبین سلام
دیارِ ہند کی محبوب ارضِ چین سلام

لیکن قومی تحریک کے رہناؤں "بہ سمتِ دگر" جانا منظور نہیں تھا۔ اس لئے اس تحریک کو کچل دیا گیا۔ لیکن تلنگانہ جیسی تحریکیں ختم نہیں ہوتیں ـ جب تک نا مساوات اور معاشی نابرابری موجود ہے مخدوم کی نظم ہمیشہ انقلاب پر اکساتی رہے گی۔

مخدوم کی شاعری کی تیسری خصوصیت تیسری دنیا کے مسائل سے دلچسپی اور نئی سامراجیت کی شاطرانہ پالیسی پر بھرپور تنقید ہے۔ چین کا انقلاب ہو یا ویت نام کی لڑائی ہو، افریقہ کی جنگ آزادی ہو یا عربوں کی اسرائیلی جارحیت کے خلاف جدوجہد، مخدوم ان سب کو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں سمجھتے ہیں۔ لومبا کا خون اور مارٹن لوتھر کا قتل انہیں قتلِ حسین اور قتلِ مسیحا لگتا ہے۔ ان سب کے پیچھے ایک ہی عنصر کارفرما ہے اور وہ ہے سامراجیت۔

وہ ہاتھ آج بھی موجود و کارفرما ہے
وہ ہاتھ جس نے پلایا کسی کو زہر کا جام
وہ ہاتھ جس نے چڑھایا کسی کو سولی پر
وہ ہاتھ وادیٔ سینا میں ویت نام میں ہے
ہر ایک گردنِ مینا ہر ایک جام میں ہے

مخدوم کی شاعری کی چوتھی خصوصیت، جو شاید انہیں دوسرے شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔ وہ آزاد ملکوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ہے۔ آزادی ملنے کے بعد بھی وہاں کے عوام کا مقدر غربت، جہل اور ناکامی ہے۔ جمہوریت بھی اچھے سماجی اور معاشی نظام کے قیام کی ضمانت نہیں دیتی۔ آزاد جمہوری سیاسی نظام کی بنیادی خرابی، وہاں کا طبقاتی ڈھانچہ ہے۔ اس معاشرے میں سماجی، سیاسی اور معاشی اقتدار اس طبقے کے ہاتھوں میں ہی رہتا ہے جو آلاتِ پیداوار اور قومی دولت کا مالک بنا ہوا ہے۔ وہ طبقہ غریب عوام سے خوشی اور خواب بھی چھین لیتا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کی قربانیاں رائیگاں ہو جاتی ہیں۔ مخدوم کی شاہکار نظم

(باقی صفحہ پر)

صدارتی خطبہ

خواجہ عبدالغفور

مخدوم ۔ احوالِ دیگر

آج کے اس سیمنار میں مقالہ نگار اور قابل مقرّرین نے مخدوم کی فنی شعری صلاحیتوں اور اس کی سیاسی زندگی پر بصیرت افروز تقریریں کیں اور شاید اس کی شخصیت کی عظمت اور اس کے مدبّرانہ اور شاعرانہ افتخار کے پیش نظر اس کی طالب علمی اور نوجوانی کے اس دور کو بالکل نہیں چھیڑا کہ جس میں ایک اعلیٰ درجے کا ظریف ہنسوڑ خوش باش خوش مزاج انسان کے روپ میں ہر جگہ چمکتا دمکتا رہا۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کچھ ایسی ہی باتیں آپ سے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

مخدوم کی جوانی کا احوال سبط حسن کی زبانی سنیئے :۔

آبنوسی رنگ کا ایک نہایت وجیہہ نوجوان۔ لمبے لمبے سیاہ بال۔ چوڑی پیشانی۔ ستواں ناک۔ دیوتاؤں جیسے ترشے نقوش

علی سردار جعفری مخدوم کے متعلق لکھتے ہیں :۔

بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، نظروں میں عتاب کی آنکھوں کی تیزی۔ آبنوسی چہرہ جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو۔ چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات۔ رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار۔ بلند پیشانی۔ زوردار ٹھوڑی اور بھینچے ہوئے ہونٹ۔ صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کرتی ہیں۔ ایک ہلکا تبسم دوسری اس کی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں کے گلابی ڈوروں سے ٹپک پڑے گی اور اس کی سرمئی رنگ کی شیروانی کو بھگو دے گی۔

آگے کے دور میں زینت ساجدہ نے مخدوم کو جیسا دیکھا اس کی عکاسی وہ اس طرح کرتی ہیں :۔

مخدوم نہ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتا ہے نہ لوگ اس کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے عین اس کی جوانی میں اس کا جشن منانا طے پایا ـــــ خدا جانے کب سے اس نے یہ ٹرک رکھی ہے کہ اس کی عمر کا پہیّہ الٹا گھوم رہا ہے ـــــ خدا معلوم اس نے مصری ممیوں کا کونسا نسخہ استعمال کیا تھا کہ اس میں کبھی تبدیلی نظر نہیں آئی۔

مخدوم پر عثمانیہ یونیورسٹی کی پوری چھاپ تھی اور رگوں میں حبدا مجد بلال حبشی رسول اللہ کے صحابی کا اصلی خون ـــ 'بلڈ بنک' کا لیا ہوا خون نہیں ـــ مخدوم کی سوانح حیات اس کے فکر و شعور حوصلہ صبر و تحمل، خیالات کی بلندی، رومان پروری اور سیاسی اپج کی آئینہ دار ہے۔ طالب علمی کا زمانہ بالعموم ہر انسان کی آئندہ زندگی کی بنیاد ہوتا ہے لیکن کالج کا طالب علم رومان پرور، خوش فکر، خوش کلام، لطیفہ گو، چٹکلہ ساز، شمع محفل، یار باش، چرب زبان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ خانہ بدوش، دن میں تیس چالیس پیالی کا عادی، لاابالی لیکن کردار، اصول اور فکر کی خود اعتمادی اس میں بھرپور تھی اسی لے تنگدستی نے اس کو ذہن، ضمیر اور اپنا کیریر بیچنے پر مجبور نہ کیا ورنہ آج ہم اُس کو شاعر، مدبر اور ایک خوبصورت انسان کی طرح یاد نہیں کرتے۔ آگے چل کر محفلوں، مجلسوں اور بڑے اجتماع میں سنجیدہ مُدبّر اور سیاسی رہبر بن گیا۔ عوام الناس اب اس کی جوانی کی زندگی کو بھلا بیٹھے ہیں۔

مخدوم کی شخصیت اس کے فن اور اس کے کردار کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے حلقۂ احباب کا جائزہ لیا جائے۔ ان میں ہیشی، ہیشی سکندر علی وجد، میر حسن، اشفاق، نورالہدیٰ، ظفر الحسن، یحییٰ، حسید یقی، شنکر جی، اکبر وفاقانی، شہریار، کاوس جی، جسونت راؤ، سبط حسن، غلام علی شکور بیگ، عاقل علی خاں وغیرہ ایسی بے شمار ہستیاں ہیں کہ جنہوں نے ہر اعتبار سے آگے چل کر علم و ادب اور عملی زندگی میں نام کمایا۔ سکندر علی وجد

نہ صرف اعلیٰ درجہ کے شاعر بنے بلکہ حیدرآباد کی سول سرویسز کے ممتاز رکن ۔اسی طرح یحییٰ اور غوث وغیرہ نے بھی سول سرویس میں نام کمایا ۔میر حسن، اشفاق، مظفرالحسن نے اردو ادب اور آل انڈیا ریڈیو میں سرخروئی حاصل کی۔ اکبر وفا قانی، سبط حسن نے صحافت کے میدان میں شہرت حاصل کی ۔غلام علی صاحب، شکور بیگ شعری ادب میں ابھرے اور اس دور کے صف اول کے طلبہ نے اپنا مقام پیدا کیا جیسے صاحبزادہ محمد علی، ایکش، صمد رضوی ساز شہزماری، نظر حیدرآبادی، سعادت علی خاں، عباس علی خاں، صاحب زادہ اشرف اور راقم الحروف نے بھی اپنے اپنے میدان میں کامیابی حاصل کی ۔یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ثابت ہوئے لیکن ان میں کوئی سٹے باز تھا نہ کوئی اور بازی کی علت میں گرفتار ۔جامعہ عثمانیہ کے علم پرور، باادب، مہذب اور شستہ ماحول میں ہر ایک کی صلاحیتوں نے جلا پائی ۔جن اساتذہ اور پروفیسروں کے آگے ان ہونہاروں نے زانوئے ادب تہہ کیا انہوں نے بھی ان کی زندگی بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا جن کی بہت لمبی چوڑی فہرست ہے اور جو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔

مخدوم فطرتاً کھلنڈرے، چلبلے، عملی مذاق کے جویا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپ بازی اور بچوں سے کھیلنے کے شائق تھے ۔اسی لئے جملہ ساتھیوں سے بڑھ چڑھ کر شرارتیں کیں ۔ہم جماعت اور ہم عصر طلبہ کو ستایا لیکن کسی کا دل نہیں دکھایا ۔

ہاسٹل کی زندگی میں اہم حادثے اور واقعات اس وقت ہوتے ہیں جب قدیم طلبہ نوواردوں کو طرح طرح سے ستاتے ہیں اور ان سے بطور تاوان احمقانہ حرکتیں کرواتے ہیں یا مٹھائی اور دعوت کی رشوت حاصل کر لیتے ہیں ۔اسی طرح کے ایک موقعے پر جب نئے طالب علم نے احتجاج کیا تو اس کا پیلا دوشالہ چرا لیا گیا اور جب اس نے مودب (وارڈن) سے شکایت کی تو دوسرے سینیر طلبہ جھنجھلائے لیکن مخدوم کی شرارت بھری ذہانت نے ایک مرصع چٹخارے دار نظم لکھ ڈالی ــــ اور یہی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے ابھرنے کا

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا — وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا پانس کا بھالا — وہ پیلا دوشالہ
وہ کون بلا ڈر تھا جو چٹ کر گیا تجھ کو — پٹ کر گیا مجھ کو
تو کون سے موئے کا بنا تازہ نوالا — وہ پیلا دوشالہ
او گرم کن پہلوئے من بازیبائی — گریم نجدائی
آں روز بیاد دار کہ من دبر تو بالا — وہ پیلا دوشالہ

یہ نظم جب تیار ہوگئی تو دوشالہ کے مالک سے اظہار ہمدردی بلکہ تعزیت کے لئے ایک جلسہ منعقد کیا گیا اور جب یہ نظم خاص لحن اور ترنم کے ساتھ بہت بڑے اجتماع میں سنائی گئی تو آناً فاناً اس کو ہمہ گیر شہرت نصیب ہوئی اور ہمارے نوجوان شاعر کو آن کی آن میں ہیرو کا مرتبہ مل گیا۔

پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ ہر اقامت خانہ (ہاسٹل) اور کالج کی ہر محفل میں روئداد اور کارروائی اسی نظم کی خوش الحانی سے شروع ہوتی۔

اس تاریخی نظم کے ساتھ ایک بہت بڑا تاریخی واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ جس کا کسی دور یا کسی عہد میں پھر سے وقوع پذیر ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں ایک اندوہناک زلزلہ آیا جس پر ساری دنیا والوں کے دل دہل گئے۔ جامعہ عثمانیہ کے نوجوانوں نے بھی اس زلزلے سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے ایک شو منعقد کرنا کرنا طے کیا۔ اس شو کی سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ اس کی سرپرستی شہزادہ معظم جاہ بہادر نے قبول اور وہ بھی اس گرم جوشی سے کہ ان کی یورپ سے واپسی کی خوشی کے موقع پر اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ نے ڈنر کی شاہی تقریب منعقد کی ہوئی تھی اور جب اس شو کے انعقاد کا علم ہوا تو فرمانِ خسروی جاری ہوا کہ ڈنر جلدی ہی ختم ہو جائے اور بندگان عالی ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام بہ نفس نفیس جلوہ افروز ہوں گے۔ ان کے جلو میں رزیڈنٹ بہادر، مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت وزیر اعظم خسرو دکن بار بار ہر ایک سے کہہ رہے تھے میرے بچے ڈرامہ کر رہے ہیں وہ بھی زلزلے کے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے اس شاندار موقع پر مولانا شوکت علی اور خواجہ حسن نظامی بھی تشریف فرما تھے ۔اس شو میں مخدوم کا لکھا ہوا ڈرامہ مرشد پیش کیا گیا جس میں مرشد کا رول مخدوم نے ادا کیا اور اس کا میک اپ خواجہ حسن نظامی کی طرح تھا جس کو خود خواجہ صاحب نے اور حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ اس ڈرامے کے سلسلے میں مخدوم کو ایکٹنگ کے انعام ملے

اس شو میں مخدوم کی معرکتہ الآرا نظم پیلا دوشالہ بھی ٹھیٹھ قوالی کے انداز میں اس کے سارے آداب و مراتب، تہذیب و تنظیم کے ساتھ پیش کی گئی۔ اسٹیج کے بیچوں بیچ مشہور شاعر غلام علی صاحب کو باوقار مرشد کے روپ اور بہروپ میں متمکن کیا گیا۔ سر پر زرین عمامہ، ہاتھ میں تسبیح، گلے میں رومال، شیروانی اور چہرہ پر مقطع داڑھی۔ مرشد کے حلقہ بگوش عقیدت مندوں کا گھیرا جو قوال بھی تھے اور ردادی بھی۔ خالق نظم مخدوم نے شانِ نزول اور پس منظر اپنے دل فریب انداز میں سنایا اور پھر قوالی کا دور شروع ہوا۔ مرشد کو

حال آتا اور کیفیت طاری ہوتا۔ وہ خود داد دیتے اور ان کے یاران طریقت جھومتے، سر دھنتے، سماں باندھتے کبھی کھڑے ہو جاتے اور کبھی حال کی وجہ سے بے حال ہو جاتے، داد دیتے اور بے داد کا منظر سج جاتا۔

اس قوالی میں مرشد کو حال آتا۔ وجد اور کیف کے عالم میں وہ رنگ جمتا کہ اس خاص مصرعہ کی تکرار ہوتی۔ وہ خاص مصرعہ تھا ـــــ

"وہ کون بلا وڑ تھا کر جو چٹ کر گیا تجھ کو   پٹ کر گیا مجھ کو"

اس پر مجمع چلّاتا "پھر بول، پھر سے بول"۔ کبھی "ارے پھر بول بلا وڑ"۔ فلک شگاف قہقہے اور ہر مصرعہ پر تکرار۔ عروج و کلائمکس آخری شعر تھا جس میں مخدوم پیلے دوشالے سے کہتا ہے ـــ

او گرم کن پہلوئے من بازیبائی   گر یم ز جدائی
آں روز بیا دار کہ من زیر و تو بالا   او پیلا دوشالہ

اسی فارسی زبان کو تمسخر کا ٹیکہ بنا کر مرشد کہتے ہیں "ارے اردو بول ارے اپنی اردو بچ بول۔" زبان کے چٹخارے۔ نظم کی ترتیب و تزئین محفل کا سماں۔ مخدوم جیسے گمنام طالب علم کا شاعر، نقال، مزاح نگار کے روپ میں ابھرنا، سب کچھ ہی تھا لیکن مرشد نے ایک اور دلچسپ حرکت کی۔ حالتِ کیف و سرور میں جہاں وہ بے دھڑک داد دے رہے تھے وہیں دانستہ طور پر بطور داد و دہش اپنے نذرانوں میں سے مختلف چیزیں قوال کو عطا کر دیتے تھے۔ جیب ہاتھ کا میل روپیہ ہاتھ سے نکل گیا تو اپنا عمامہ اتار کر قوال کو نذر کیا پھر اپنا رومال عطا کیا اس کے بعد جو شیروانی زیب تن تھی وہ بھی دان کر دی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ عطا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ ان کی شرارت کی رگ پھڑکی اور انہوں نے اپنی نقلی ڈاڑھی نکال کر قوال کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس پورے شو کا ماحصل یہی تھا اور مخدوم کی ساری صلاحیتوں کا کلائمکس۔ طنز و مزاح، لطف و لطافت، ظرافت اور عملی مذاق کی اس سے بہتر تمثیل نہ پیش ہوئی ہے نہ پیش ہو سکے گی۔ مخدوم ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ ایک کامیاب فن کار ہے، کاریگر یا کار پرداز نہیں۔

ویسے تو مخدوم کی ذہانت بھری شرارتیں کالج کے ابتدائی دور میں کلاس روم اور ہاسٹل سے شروع ہو چکی تھیں۔ لازمی مضمون دینیات کی جماعتوں میں وہ اپنے بہت سارے شرکا کے ساتھ یا تو حاضر نہ ہوتا یا الٹے سیدھے سوال کر کے استادوں کو تنگ کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں غیر حاضری کی پاداش میں امتحان سے روکا جا رہا تھا کہ وہ مضحکہ خیز استاد کو چھیڑنے سے باز نہ رہ سکا۔ مخدوم کی ایک اور معصوم شرارت ہم سب کو ہمیشہ یاد رہے گی کہ گاؤں سے آتے ہوئے ایک نو وارد طالب علم کو اپنے ہاتھوں میں ہمیشہ چھتری لئے گھومتے دیکھ کر سب ہی اکتا گئے کہ موسم کچھ بھی ہو یہ چھتری بردار رہتے بلکہ چھتری تنے بنے رہتے۔ ان کو لاکھ سمجھایا گیا لیکن یہ ماننے والے نہیں تھے۔ ان کے لئے چھتری اسٹیٹس سمبل تھا اور حیدر آباد میں اور وہ بھی جامعہ عثمانیہ کے ماحول میں گاؤدی پن کا علم۔ مخدوم نے اس کا نام چھتری رکھ دیا۔ سب ہی اس کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ مخدوم نے بالآخر اس کی چھتری چرا کر ہاسٹل کے صحن کے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر مضبوطی سے کھول کر باندھ دیا گیا۔ جس کی بھی نظر پڑتی وہ برخوردار کو خالی ہاتھ دیکھ کر مستادار جھوم اٹھتا اور ٹھٹھے لگاتا۔ اس شرارت کی وجہ سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ہاسٹل چھوڑ کر رفوچکر ہو گئے اور اساتذہ اور مودب سے پوچھ تاچھ کی پیشیاں ہوئیں، سزائیں تجویز ہوئیں لیکن شرارتیں کم ہوئیں نہ شوخیاں۔ ماحول دلگداز، خوشگوار اور حوصلہ افزا رہا۔

اسی طرح کی سیکڑوں شرارتوں کے موجد بہت سارے تھے لیکن مخدوم کو نت نئی سوجھتی تھی۔ ان کا محبوب مشغلہ تھا کہ ڈائننگ ٹیبل پر دو ایک ساتھیوں کے ساتھ ایک طرف بیٹھ جاتے درمیان میں کسی نو وارد طالب علم کو بٹھا کر اس کے آگے کچھ اور ساتھی بیٹھ جاتے۔ جب سب ہی کھانے میں مشغول ہو جاتے، میز پر بچھے موم جامہ والے میز پوش کو میز کی سطح سے نیچے تھوڑا الٹ دیتے اور ایک سرے سے پانی انڈیل کر اس کو وہاں تک بہنے دیتے کہ جہاں وہ غریب لڑکا بیٹھا ہوتا اور اس کے آزو بازو بیٹھے ہوئے لڑکے عین اس غریب کی گود میں اس پانی کو انڈیل دیتے کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ شرارت باقاعدہ اسکیم کے تحت کی گئی اور یہ اس کا نشانہ یہ غریب نیا طالب علم ہوتا۔

اب ساتھیوں اور ہم عصروں سے ہٹ کر اساتذہ پر بھی وار کئے جاتے۔ مودب مقیم رات گئے دیر سے آنے والے تھے۔ ان کے کمرے میں کسی طرح سڑک کے ایک گدھے کو پہنچا دیا گیا اور جب وہ تھکے ماندے لوٹے۔ اپنا کمرہ کھولا بجلی جلائی تو گدھے نے ہنکانا شروع کیا۔ اگر فی الحقیقت شیطان ہوتا تو شاید یہ اتنا نہ اچھلتے کودتے۔ چلا چلا کر کہنے لگا یہاں پر یہ گدھا کہاں سے آگیا۔ مخدوم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس ہنگامے کو دیکھنے موجود تھے۔ یک زبان ہو کر سب نے کہا صحبت یہ (بمعنی گدھا یعنی استاد موصوف) تو یہیں رہتا ہے۔
عملی مذاق کی سیکڑوں مثالیں دماغ میں تازہ ہیں لیکن ان سے بڑھ کر وہ خزانہ ہے کہ جو مخدوم نے اپنی جولانیٔ طبع سے لطیفہ گوئی

چٹکلہ سازی اور طبعی ظرافت بھر دیا۔ آپس کی چشمک حریفانہ وار گپ بازی یہ سب چنچل موڈ کے نتائج ہوا کرتے۔ ارزانی اور تن آسانی تھی۔ روزگار کی پریشانی تھی نہ مستقبل بھیانک دکھائی دیتا۔ سب آج کے جوان تھے۔ ہاسٹل میں پڑھنے والے کمرے کو کتب خانہ۔ بے کش کے کمرے کو مے خانہ نوبرو وڈ سے کی رہائش پری خانہ بلکہ اس سلسلے اور قبیل کے سب ہی نام جا چکے تھے۔

ان تفصیلات سے ہٹ کر مخدوم کی جولانیٔ طبع کے سب سے بڑے جوہر اس کی لطیفہ سازی اور لطیفہ بازی تھے کہ کسی کو بخشتے نہ خود کو اپنے مذاق کا نشانہ بنانے سے چوکتے۔ اپنی کمزوریاں مسکرا مسکرا سناتے اور دوسروں کو ہنساتے۔

شہر کے قدیم کالج اور ہاسٹل' حیدر آباد کے خوشنما باغ عامہ سے قریب تھے اور جب مخدوم اپنے ساتھیوں کے ساتھ کلاسوں کے درمیانی وقفۂ راحت کو گذار نے اس باغ کی روشوں پر کھیلتے تو اس کے مہتمم / ناظم کو شرارتیں بری لگتیں۔ کچھ ہی دنوں میں ان کی روک ٹوک نے زبردست محاذ تیار کر دیا اور اس کا بدلہ نت نئی شرارتوں سے نہیں بلکہ ایجاد و اختراع کے ذریعے لطیفے گھڑے جانے لگے۔ بارش ہو رہی ہے۔ سارے مالی مالن کسی سائبان کے نیچے کھڑے سستا رہے ہوں تو یہ ناظم صاحب کے پاس پہنچ کر شکایت کریں کہ دیکھئے آپ کا اسٹاف کا ہل اور سست ہے' کام چور ہے۔ درختوں کو پانی دینے کا وقت بیتا جارہا ہے اور یہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اور خود ہی تجویز کریں کہ بارش ہو رہی ہو تو کیا ہوا آپ انہیں چھتریاں دلا دیجئے" تاکہ چھتری تلے وہ پڑتی بارش میں درختوں کو پانی ڈالیں۔ یہ خود کہیں اور خود ہی سب میں مشہور کریں کہ دیکھئے ناظم صاحب اب چھتریوں کی حفاظت میں پانی ڈلوانے کی خاطر سب کو چھتریاں خرید کر دے رہے ہیں۔ کبھی یہ منسوب کیا جاتا کہ درخت لگانے کے لئے جب گڑھے کھودے جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دور کہیں کسی اور کھڈے میں یہاں کی نکلی ہوئی مٹی ڈالی جائے اور وقت ضائع ہو اسی گڑھے کے برابر دوسرا گڑھا کھود کر اس طرح نکلنے والی مٹی کو اس میں وہیں کے وہیں ڈال دیا جائے۔

یہ تو ہوئیں باغ عامہ کی شرارتیں۔ یہاں سے ہٹ کر بھی مخدوم نے شہزادہ معظم جاہ بہادر کے دربار میں ان ہی ناظم باغ عامہ کی حاضری پر لطیفے گھڑنے شروع کئے۔ چنانچہ اسکی شہرت دیہی کہ صاحب موصوف سر پر دستار اس طرح پہنتے ہیں کہ جو حصہ چہرے کے رخ ہونا چاہیئے وہ الٹی طرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سب کو یہ بتائی جاتی کہ کبھی کبھار اچانک طور پر اگر شہزادہ والا تبار پیچھے کے رخ سے آجائیں تو کم از کم ان کی دستار صحیح طور پر ان کا خیر مقدم کرے۔ چاہے ان کی پیٹھ اُدھر ہو۔ شہزادے کے محل ہل فورٹ سے حسین ساگر میں شام کے وقت ڈوبتے سورج کا منظر بڑا دلفریب ہوتا ہے اور اکثر شام میں پھولتی شفق کے رنگوں کی چمک دمک بڑی دیر تک دلچسپی سے دیکھی جاتی۔ غروب آفتاب سے کچھ پہلے شہزادہ والا تبار سے جب رخصت کی اجازت مانگی تو ان سے کہا گیا کہ کچھ ہی دیر میں سورج غروب ہونے والا ہے۔ اس دلفریب سماں کو دیکھنا چاہیئے۔ مخدوم نے یہ لطیفہ گھڑا کہ ان حضرات نے اپنی مصروفیت کا عذر کرتے ہوئے دست بدستہ معافی مانگی اور کہا۔ آج مجھے معاف فرمائیگا۔ کل صبح آن کر غروب آفتاب کا منظر دیکھ لوں گا۔

میں نے مخدوم کی زندگی سے ان کے کھلنڈرے پن اور ان کی شوخیوں اور شرارتوں کی کچھ جھلکیاں پیش کی ہیں کہ جو اس دور کی تہذیب اور زندگی کا بانکپن سمجھی جاسکتی ہیں۔

ان سے ہٹ کر مخدوم کو دیکھا جائے تو وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ جس کا مرغوب مشغلہ دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکنا اور بچوں سے کھیلنا تھا۔

اس کی شاعرانہ زندگی کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے عوام کے قریب رہنا چاہتا تھا تاکہ وہ ان کے دل کی دھڑکنیں سنے ان کے دکھ درد اور ان کے سکھ کا پاس کر سکے۔ مخدوم مشاہدات و تجربات کو دماغ میں محفوظ رکھ لیا کرتا اور اس کا کہنا ہے کہ یہی بعد میں شعر کی صورت میں ابھرتے تھے۔

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی   زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو
گاہ ہنستی ہوئی گاہ روتی ہوئی   میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

اب تک آپ نے مخدوم کو ایک کھلنڈرا' ہنسوڑ' بذلہ سنج' خوش دل' نقال' ایکٹر' لطیفہ ساز' شوخ و شنگ' شرارتی نوجوان کے روپ میں دیکھا۔ اس کی زندگی کے تین زاویئے ہیں ڈرامہ' شاعری اور سیاست آپ نے کہانیاں لکھیں پھول اور پتھر' آدم کی اولاد' کھوئے ہوئے تارے' پان وغیرہ۔

اس کی مزاحیہ شاعری کا نمونہ 'پیلا دوشالہ' بے مثال ہے۔ اس نے تین ڈرامے لکھے ہوش کے ناخن' مرشد اور پھول بن لیکن یہ شائع نہ ہوسکے البتہ اسٹیج پر بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے جس پر مخدوم نے بھی اداکاری کی اور بہترین اداکار کا انعام حاصل کیا۔ راقم الحروف نے اپنے تین بڑھیا سوٹ اداکاروں کو مستعار دیئے تھے۔ اس لئے مجھے بھی ایک خاموش رول ملا جو اعلیٰ حضرت ظل اللہ شہزادوں اور شہزادیوں مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم سر اکبر حیدری رابندر ناتھ ٹیگور اور مسز سروجنی نائیڈو کی حضوری میں پیش کیا گیا۔ مرشد کے متعلق علیحدہ لکھا جا

چکا ہے۔ مخدوم نے ہمزاد' ظاہر باطن عشرت الارض میں کامیاب اداکاری کی۔ لگتا ہے کہ مخدوم کی پوری زندگی ایک ڈرامہ تھی۔ ابتدائی دور کی مخدوم کی رومانوی شاعری' اس کی میٹھی آواز' رسیلا ترنم، آواز کا اتار چڑھاؤ جادو جگاتے۔ سامعین گم سم ہو جاتے اور کیف طاری ہو جاتا بالخصوص "طور" انتظار' ساگر کی رے اور تلنگن۔ یہ سب ہر نوجوان کے دھڑکتے دل کی پکار ہوتے اور سنگین سے سنگین دل بھی محبت کرنے کے لئے تڑپ اٹھتا

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پہ شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدوم کی غزل گوئی ۱۹۵۹ء میں شروع ہوتی ہے اور روایتی لہجہ اسلوب اور آہنگ ملتا ہے۔

مخدوم کے نجی خطوط کہانیاں، سفر کی جھلکیاں، مقالے' ڈرامہ نگاری، رومانی اور سیاسی شاعری سب ہی اپنی اپنی جگہ عظیم المرتبہ ہیں۔

رومانی اور حسن و عشق کی شاعری کے بعد مخدوم نے :—

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو' جیسی نظم لکھا اور اس کے بعد ہی اس کا رنگ نکھر گیا اور مخدوم نے جنگِ آزادی والی معرکتہ الآرا نظم لکھی اور سُرخ سویرا کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہوا :—

لو سُرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گل نار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اور پھر خود مخدوم سرخ سویرے کا شاعر کہلانے لگا۔

اس کے بعد گل تر' دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا :—

نکہت یار سے آباد ہے ہر کنج قفس مل کے آئی ہے صبا اس گل تر سے پہلے

بساط رقص نامی نظم ہی سے مخدوم نے اپنے تیسرے شعری مجموعے کا نام دیا۔

الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہے صدائے تیشہ کامران ہے کوہکن کی جیت ہے

الغرض مخدوم نے اپنی شعری زندگی کا آغاز مزاحیہ پیلا دوشالا سے ہوتا ہے پھر بھرپور رومان اور آخر میں سیاسی نظمیں۔ جنگ آزادی' سپاہی اسٹالن۔ انقلاب' باغی' مشرق وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے مقالہ نگاروں نے مخدوم کی فنکارانہ صلاحیتوں کا بڑی تفصیل سے احاطہ کیا ہے بالخصوص ان کی سیاسی زندگی کے دیرینہ ساتھی اور جگری دوست ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے سکندر علی وجد اور عمر ہی سے ساتھ رہے ہیں اور ان کا حافظہ اور بہت ساری حکایتوں کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے میں نے زیادہ تر ان کی شخصیت اور ظرافت کے نمونے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ ●●

بقیہ :- مخدوم "فن" اور "شخصیت"

ہم ماورائی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔

بعض اصحاب کو مخدوم صاحب کی شخصیت و فن کے تعلق سے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ان کے فن کو سیاست نے نکھرنے پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے نزدیک شخصیت کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کا یہ رجحان بالکل غیر نفسیاتی ہے۔ شخصیت کا تانا بانا تو مختلف عوامل کے عمل و خل سے تیار ہوتا ہے اور پھر شاعر خلاؤں میں تو پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنے اطراف کے ماحول سے سب کچھ لیتا ہے تو اپنی طرف سے ماحول کو سب کچھ دیتا بھی ہے۔

بہر حال جب تک مخدوم زندہ تھے تو دوریوں اور مسافتوں کے باوجود ان کا ہر نیا شعر ہم کو ان سے قریب کر دیتا تھا۔ اور اب جب کہ وہ عرصہ ہوا ہم سے بچھڑ چکے ہیں تو ان کی ایک ایک بات کی یاد آتی ہے۔ ان کے احباب اور ملنے والوں میں بشمول خورد و بزرگ' جداگانہ مشربوں کے لوگ ہوں گے اور ان کے ذہنوں میں مخدوم صاحب کی سیکڑوں باتیں محفوظ ہوں گی۔

مخدوم کی باتوں کا سلسلہ اس قدر دراز ہے کہ تمام عمر ختم نہ ہوگا اور یہ شعر انہوں نے شاید اسی لئے کہا تھا کہ ہم اس کو ثمہ دعا کی طرح دہراتے رہیں

تمام عمر چلی ہے' تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یار غمگسار کی بات



● دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت انگیز جد و جہد' قربانیوں اور عظیم الشان کارناموں اور نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت' خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا اور ان کے پاس جو گیا کچھ بن کر آیا۔

ادبی تبصرے ص ۶۳

ایشور راج ساگر

مخدوم

محرکات اور ماحول

میں نے شری مخدوم جی کو کافی قریب سے دیکھا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک بہت ہی جونیئر کی حیثیت سے' دھرم ونت ہائی اسکول کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنروں میں کوئی ڈنر مکمل نہ ہوتا جب تک کہ مخدوم کی نظم خود ان کی زبانی سنی نہ جاتی اور اس کے بعد جب میں انٹرمیڈیٹ میں سٹی کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت مخدوم صاحب ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے۔ تقریباً ہر روز ملاقات ہو جاتی تھی۔

مخدوم کی شاعری کی ابتدا کم و بیش ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان شروع ہوئی جب کہ ان کی عمر لگ بھگ پچیس ۲۵ سال تھی۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار نظم و نثر دونوں اسلوب میں بخوبی کر سکتے تھے۔ ان کی نثر میں بھی زیادہ تر شاعری ہی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مخدوم ابتدائی دور سے ہی انقلابی نظریات کے حامی تھے۔ شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے سے بہت پہلے انہوں نے اسٹیج کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے عقیدت کے پس منظر میں ان کی قلمی کاوش "ٹیگور اور ان کی شاعری" کتابی شکل میں سامنے آئی۔ جو مقبول ہوئی۔

مخدوم محی الدین ضلع میدک کے تعلقہ اندول (سابقہ ریاست حیدرآباد) میں ۴ فروری ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ مخدوم نے اپنی ابتدائی زندگی مسرّت اور پریشانی میں بسر کی۔ شروع شروع میں گذارے کے لئے انہوں نے تصویریں فروخت کیں جن سے انہیں پیسے مل جاتے تھے جو نا کافی تھے۔ کچھ دنوں بعد فلمی ستاروں کی تصویریں بیچنے لگے۔ پھر ایک اخبار میں ملازم ہوئے اور خالی اوقات میں ٹیوشن دیتے تھے۔ اسی عرصے میں انہیں ایک دل چسپ ذریعہ معاش مل گیا۔ انہیں ایک نواب کے لئے ان کی اینگلو۔ انڈین محبوبہ کو انگریزی میں خط لکھنا ہوتا تھا جس کا اچھا خاصہ معاوضہ ملا کرتا۔ اس کے لئے مخدوم کو انگریزی کے مشہور محبت بھرے خطوط کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ اسی مطالعے کے نتیجے میں ان کے ایک مضمون "گوئٹھ کے پریم پتر" نے جو کہ ایک مقامی رسالہ "مکتبہ" میں شائع ہوا' انہیں کافی شہرت دلائی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دکھوں کو قریب سے دیکھا جس پر ان کا دردمند دل تڑپ تڑپ اٹھتا۔ انہوں نے عام آدمی کے دکھ' درد کو دور کرنے کی زندگی بھر سعی کی۔ وہ فطرتاً شاعر تھے اس لئے انہوں نے اپنی شاعری کو ایک ایسا پیرہن عطا کیا جس میں کمیونزم کی بو باس تھی۔ مگر دراصل اس پیرہن کے نیچے جو جسم تھا اس میں ایک ایسا دل تڑپ رہا تھا جو یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح انسان کے دکھ' سکھ میں تبدیل ہو جائیں۔

مخدوم شاعر ہی نہیں بڑے جفاکش اور سرگرم عمل فرد تھے۔ مخدوم اس دور کی پیداوار ہیں جبکہ زمین داری نظام نے ہندوستان اور خاص طور سے حیدرآباد میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ اس زمین داری نظام میں ہونے والی حق تلفیوں کو ان کے ذہن نے دیکھا' سمجھا اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کو اکسایا۔ انہوں نے ہمیشہ یہ چاہا کہ محنت کشوں کو کم سے کم پیٹ بھرنے کو روٹی' سر چھپانے کو مکان اور تن ڈھانپنے کے لئے موٹا جھوٹا کپڑا مل سکے۔ انہوں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ ایک محنت کش' محلوں اور عشرت گاہوں میں شب گذارے اور صبح جب اٹھے تو اس کے پیروں تلے دبیز قالین ہوں اور نوکروں اور خادموں کی ایک فوج جمع ہو جو اس کے ہر حکم کو بجا لائیں۔ وہ خود اس جاگیردارانہ نظام سے بیزار تھے۔ انہوں نے کبھی بھی محلوں کے خواب نہیں دیکھے۔ انہیں ملک کی غربت نے بڑا احساس کر دیا تھا اور ہمہ وقت وہ یہی چاہتے تھے اور یہی کوشش کرتے تھے کہ غربت دور ہو اور کسی طرح ان لاکھوں' کروڑوں فاقہ کشوں کو روٹی میسّر ہو۔ ان کے یہ خیالات ان کی شاعری میں موجزن ہیں۔ اپنی نظم 'آزادیٔ وطن' میں نوجوانوں سے اپیل کرتے

چونکہ وہ ایک ایسے انقلاب کی بنیاد ڈالیں جو ہندوستان کی تقدیر بدل ڈالے آزادی کے جذبے کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں ۔

چپی خاموش آہیں شور محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشید خاور بن کے نکلی ہیں

دوسری جگہ کہتے ہیں :

بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

پھر قومیت کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

سارا سنسار ہمارا ہے
پورب پچھم اُتر دکن
ہم افرنگی ، ہم امریکی
ہم چینی جانبازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن
آہن پیکر فولاد بدن

اسی طرح زلفِ چلیپا' سولجر' اندھیرا نظمیں بھی ایسے ہی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں ۔ مشہور زمانہ فرنچ آرٹسٹ پیکاسو کی عالمی شہرت یافتہ پینٹنگ "گورے نیکا" کے مفہوم کو مخدوم نے "اندھیرا" میں پیش کیا ہے ۔

۱۹۴۲ء میں گریجویٹس کانفرنس کے دوران مخدوم نے اپنی نظم "حویلی" سنائی تھی جس میں انہوں نے "پرانی حویلی" کی تشریح کرتے ہوئے بوسیدہ جاگیردارانہ نظام پر چوٹ کی ۔ تنقید اتنی سخت تھی کہ اُس کی پاداش میں عام جلسوں میں ان پر نظمیں سنانے کی پابندی عاید کر دی گئی تھی ۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

اک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں کا خراج

ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہوں جس طرح عصمت پر فحبہ کا جمال

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

زیست کو درس اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے

'جہانِ نو' میں مخدوم ایک ایسے جہان کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کا اچھوتا نظام ہو اور جس کے نئے صبح و شام ہوں ۔ وہ ایسے عہد نو کے لئے بغاوت اور انقلاب کو ضروری سمجھتے ہیں اور انقلاب کو آواز دیتے ہیں انہوں نے نظم " انقلاب" اس زمانے میں لکھی جب آزادی کی قومی تحریک میں کچھ ڈھیلا پن پیدا ہو گیا تھا اور مایوسی اور بے عملی عام تھی ۔ کئی برسوں سے ملک کی آزادی کا انتظار تھا اور یہ توقع تھی کہ ملک جلد آزاد ہو جائے گا لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی ۔ مخدوم انقلاب کا انتظار اس بے چینی اور کچھ اپنے انداز میں کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب ہی ان کا محبوب ہے ۔

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اس نظم میں شاعر ہی نہیں بلکہ سارا ملک اور تمام لوگ سر راہ انقلاب کے لئے بے قرار کھڑے ہیں ۔

"ننگی بچے" بھی سب بچوں کی طرح اسی دھرتی کے بچے ہیں ۔ انہیں بھی حق پہنچتا ہے کہ کھائیں پیئں ، کھیلیں کو دیں ، جوان ہوں اور اس رنگا رنگ دنیا میں خوش و خرم رہیں ۔ مگر یہ موجودہ نظام ایسا نظام ہے جس میں صرف دھن والوں کو ہی زندگی کا عیش و آرام ملتا ہے اور وہ لوگ جو غریب ہیں ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں ۔ مخدوم اس نظام کے دشمن ہیں اور اس نظام کو اپنی پوری قوت و صلاحیت اور ولولہ انگیز شاعری کے زور سے بدلنا چاہتے ہیں ۔ اس طرح ان پر عموماً کمیونسٹ ہونے کا لیبل لگتا ہے ۔ مگر مخدوم نے کبھی یہ پروا نہیں کی کہ ان پر اس قسم کے لیبل لگائے جائیں ۔ اگر غربت و افلاس ملک سے کمیونزم کے ذریعے دور ہو سکتا ہے تو مخدوم کو اس سے کام لینے میں کوئی عار نہیں ۔

مخدوم کا "پیلا دوشالہ" پڑھنے والوں نے اپنے دل و دماغ میں متفرق تاثرات قائم کئے ہوں گے اور ہر قاری کو تو یہ حق حاصل ہے کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیق پڑھ کر اپنے تاثرات مختلف پیرائے میں بیان کرے ممکن ہے اس میں کوئی دو رائیں متفق نہ ہوں ۔ اگر ہوں بھی تو کچھ تضاد کے بعد ۔ "پیلا دوشالہ" ایک ایسی ہی نظم جس میں Symbolism کو بڑے پیمانے پر اجاگر کیا گیا ہے جیسی

سے ہے مخدوم کے کمیونسٹ خیالات پر مہر ثبت ہوتی ہے اور وہ کھل کر ایک کمیونسٹ نظام کے علم بردار نظر آتے ہیں۔

اپنی انقلابی نظم "باغی" میں غریبی بھوک اور بے روزگاری کے ماحول سے بیزاری اور جوشِ تقریب کے ساتھ ساتھ ایک نئے ماحول کی تعمیر اور ایک نئی دنیا بسانے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

برق بن کر بُتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
رسم کہنہ کو تہ خاک ملانے دے مجھے
تفرقۂ مذہب وملت کو مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ، آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ، آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ، آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

مارکسی نظریہ گو کہ ان کی شاعری میں نمایاں رہا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا دل رومان پرور خیالات، جذبات اور احساسات سے بھی خالی نہ تھا۔ ان کی چند نظموں میں رومانی اور انقلابی شاعری دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ "انتظار" مخدوم کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں انتظار صرف محبوب ہی کا نہیں بلکہ ان خوابوں کی تعبیر کا بھی ہے جسے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی اصطلاح میں نئی صبح کی آمد اور انسانی سماج کے خوش آئند دور کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ "انتظار" میں شاعر کس طرح سراپا انتظار ہے ملاحظہ فرمایئے۔ ؂

رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

نظریں نیچی کئے ہوئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے

بات کچھ کا یہ انداز اور ان کے کلام کی یہی دل نشینی مخدوم کے کلام کو ندرت بخشتی ہے۔ لیکن محبوب جب نہیں آیا تو شاعر کے دل میں یہ وسوسہ ابھرنے لگتا ہے کہ اب وہ آئے گا یا نہیں۔ اور یہ اندیشہ اس غم ناک تمنا کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

آ بھی جا تا کہ میرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا کہ ترے قدموں پہ میری جاں نکلے

اس طرح یہ شعر بھی کسی کے دل کو تڑپا دے گا۔

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

خواجہ احمد عباس نے مخدوم کے بارے میں لکھا ہے" وہ ایک جلتے ہوئے شعلے کی طرح تھے اور اسی کے ساتھ شبنم کے قطروں کی طرح خوش گوار طور پر ٹھنڈے بھی۔"

" وہ انقلاب کی گرج دار آواز تھے اور پائل کی جھنکار کی طرح شیریں بھی۔"

" وہ سراپا علم، عمل اور عقل تھے۔"

" وہ انقلابی سپاہی کی بندوق اور موسیقار کا ستار تھے۔"

" وہ بارود کی تیز بو اور چنبیلی کے پھول کی خوشبو تھے۔"

مخدوم ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ ایک انقلابی شاعر تھے۔ ایک بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر اور ایک اچھے آرگنائزر تھے۔ ایک سرگرم یونین لیڈر تھے۔ انتہائی سچے دوست، ایک محبت کرنے والے مشفق باپ، ایک اچھے ٹیچر تھے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک فرد نہ تھے بلکہ اپنی جگہ ایک (Institution) ایک ادارہ یا انجمن تھے۔

مخدوم تو رخصت ہو گئے لیکن ان کے اندر کا شاعر آج بھی زندہ ہے۔ ان کے خیالات زندہ ہیں، ان کا پیغام زندہ ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مخدوم کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ مخدوم جیسی ہستیاں صرف پیدا ہوتی ہیں، مرتی نہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہوتی ہیں۔

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے



”اردو شاعری میں میر کے بعد اگر کوئی بے پایاں درد و لامحدود یاس اور بے کراں غم کا مالک ہے تو وہ فانی ہے۔ ان کے یہاں غم کا ایک عرفان ملتا ہے جو زندگی اور موت دونوں کو گواہ بنا دیتا ہے۔ فانی موت سے گریزاں نہیں۔ وہ موت کا خیر مقدم کرتے ہیں“ (آل احمد سرور)

مقالات

١۔ افتتاحیہ — ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا
٢۔ کلام فانی کے بعض پہلوؤں پر سرسری نظر — فضیل جعفری
٣۔ فانی کا تصورِ مرگ — بشر نواز
٤۔ فانی۔ ایک تاثر — ڈاکٹر عبدالستار دلوی
٥۔ فانی کی شخصیت، ایک تجزیہ — رشید الدین
٦۔ فانی۔ ایک یاد — خواجہ عبدالغفور

ڈاکٹر اسحٰق جھنانہ والا

افتتاحیہ

داغ اور امیر مینائی کے بعد اردو غزل کا چراغ جو مدھم پڑ گیا تھا، اسے نئی روح اور روشنی دینے کے لیے جن شعراء نے کوششیں کیں ان میں حسرت، اصغر، جگر، فانی اور فراق کی شخصیتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ مذکورہ شعراء جدید اردو غزل کے وہ عناصر ہیں جنھوں نے اردو غزل کو طاقت اور توانائی عطا کی۔

فانی کی شاعری میں غم و الم کا تذکرہ کثیر ہے وہ غموں سے لذت بھی لیتے ہیں اور ان کی جستجو بھی کرتے ہیں وہ ایک خاص روحانی انقلاب، ایک خاص بصیرت کو ہی شاعری کا لازمی نتیجہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے خیال کے مطابق حقیقی شاعری کبھی نہیں بدلتی۔ ہاں زمانے کو کبھی کبھی بدل دیا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں شعریت پیدا کرنے کے لیے محض سوز و نیت، تشبیہات اور حسن و عشق سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے دلوں کے ٹکراؤ سے شعریت پیدا کی ہے۔ جس کے باعث ان کے اشعار دل پر فوراً اثر کرتے ہیں اور اپنی صداقت کا یقین بھی دلاتے ہیں۔ اور قاری کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے جو شاعر اور شاعری دونوں کا انعام ہے مثال ملاحظہ ہو ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ موج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

پھیلیں نہ پھر وہی نگاہ یار میں
تو نے آہ آتشیں یہ کیا کیا۔

یہ اشعار ان کے پُر خلوص جذبات اور پُر اثر الفاظ کے ضامن ہیں۔ ان میں چستی، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے اور فنکارانہ نظم و ضبط بھی۔

فانی کی زندگی کا غم و الم احساس طبع کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری یاس و حرماں۔ مایوسی اور ناکامی کا مضمون ہے زندگی ان کے نزدیک غم سے عبارت ہے اور غم کی جستجو میں ہی زندگی کا عرفان پنہاں ہے ان کے اشعار زندگی کی سچی اور بے لاگ تصویر کشی کرتے ہیں ان کے غم آشنا گہرائی نگاہ میں کشمیر جنت نظیر میں بھی دوزخ سموئی ہوئی دیکھتے ہیں۔ اسی لیے تو ان کا دل حزیں ایک ہی نظر میں بہت کچھ محسوس کر لیتا ہے اور بے ساختہ بول اٹھتے ہیں ؎

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی
مخلوق کی دلگداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر
دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

ان کی یاس و نامرادی دوسروں کی امید پروری اور بے خودی سے زیادہ وسیع ہے فانی کی زندگی کی مایوسیوں اور ناکامیوں نے ان کی شاعری میں قنوطیت سمودی ہے اسی لیے تو ؎

فانی کو وہ زندگی میں راس آیا کچھ
آئی تو ایک موت ہی راس آئی

فانی کی شاعری میں مکمل انفرادیت ہے۔ وہ زندگی اور منشائے زندگی پر گہری تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں حسن نے اپنا احساس اور ادراک فانی کو عطا کیا اور فانی نے یہی ادراک اور احساس دوسروں تک پہنچایا۔ انہوں نے احساسِ غم اور ادراکِ غم کو اصل حیات سمجھا ہے اسی غم میں وہ ابدی مسرتوں کے متلاشی تھے ان کے نزدیک ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

فانی کو ابتدائی عمر سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں انہوں نے شاعری کا آغاز کیا اور انیس سال کی عمر میں پہلا دیوان مرتب کر لیا۔ ابتدا میں ان کا تخلص شوکت تھا بعد میں فانی اختیار کر لیا۔ شاعری میں وہ میر اور غالب سے کافی متاثر تھے۔ اگر میر اور غالب کے درمیان کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ فانی

کا کلام ہے مگر ان کی نازک خیالی اور فلسفیانہ انداز بیانی دراصل انہیں فانی سے باقی بنا دیتی ہے ان کی شاعری کا دور جدید و قدیم کی کشاکش کا درمیانی وقفہ ہے مگر وہ پرانی روایات سے ہٹنا ہی نہ جانتے تھے۔ انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں وہ مشرقیت میں شرابور ہو کر۔ فانی کے اشعار پڑھ کر ان کی حسین، مدھم اور مخلص شخصیت کی تصویر سامنے آتی ہے اور ساتھ ہی ان کے ذہن و دماغ کی طرفگی متانت اور عمق کا پتہ چلتا ہے ؎

میری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ نقش پا ہوں جسے کوئی رہ گذر نہ ملا

میر کا عشق مجازی ہے۔ ان کے کلام میں انسانی پہلو زیادہ ہے اور اگر کسی لڑکی کے عشق میں ناکام ہونا بھی۔ مگر فانی کا عشق حقیقی ہے وہ اپنے جذبات کو مختلف انداز میں تمثیلی اور مثال کے انداز میں تصوف کا جامہ پہناتے ہیں ان کے یہاں عشق بہت زیادہ ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ جذبات و خیالات ارفع و پاکیزہ ہیں۔ اس ضمن میں وہ درد کے مشابہ ہو جاتے ہیں جنہوں نے تصوف کو اپنا مایۂ حیات اور سرمایۂ سخن بنا لیا تھا فانی کا خیال یہ ہے کہ :-

عشق عشق ہو شاید حسن میں فنا ہو کر
انتہا ہوئی غم کی دل کی ابتدا ہو کر
دل ہمیں ہوا حاصل درد میں فنا ہو کر
عشق کا ہوا آغاز غم کی انتہا ہو کر

فانی عشق اور غم میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ غم کی انتہا عشق ہے اور عشق کی انتہا یہ ہے کہ وہ حسن میں فنا ہو جائے۔ فانی کا غم مدعائے ہستی ہے ان کے نزدیک غم اس دنیا کی روح ہے۔ درد و غم کی گھٹا انسان کو محیط کیے ہوئے ہے۔ یہ وقتی نہیں بلکہ ازلی ہے۔ آدم کا خلد سے نکلنا غم والم کا سب سے بڑا حادثہ تھا گویا ثابت ہوا کہ انسان کا تخلیقی عنصر غم ہے غم اس کی سرشت ہے اور غم ہی اس کا ہیولیٰ ہے ؎

غم کو چھپا کے محرم اسرار کائنات
ہر نقش غم کو پیکر انساں بنا دیا

جہاں تک موت کا تعلق ہے فانی نے ہمیشہ موت کی آرزو کی۔ وہی ان کا پایا موضوع بھی تھا۔ فانی زندگی کی تلخی کو خوشی خوشی صرف اس لیے گھونٹ سکتے تھے کہ موت کا مژدہ حور و لوبیان کے پیش نظر تھا۔ پھر ہستی کی حقیقت چند روزہ ہو جاتی ہے۔ اس عالم بے ثبات میں رنج و الم اٹھا کر وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ موت کی آغوش میں پہنچ کر حقیقت لازوال اور وجود حقیقی سے ہم کنار ہو سکیں۔ یہی تخیل ان کے لیے [illegible] تسکین و اطمینان تھا ؎

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

فانی نے اپنی پوری روئداد زندگی صرف اپنے تخلص کے ایک لفظ میں پیش کر کے گویا آسمان کو آنکھ کے تل میں سمو لیا ہے شوکت علی خان کا خود کو فانی کہنا محض ایک اتفاقی امر نہ تھا بلکہ ان کی زندگی کا صحیح عکس تھا۔ وہ زندگی کے ایسے بھنور میں پھنس کر رہ گئے تھے جہاں فنا کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ خود کہتے تھے ؎

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

وہ زندگی کو معمّے سے زیادہ نہیں سمجھتے یا پھر جبر یا مسلسل کشمکش اور پیہم درد و کرب جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

ایک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

ہستی انسانی کو وہ حباب آب سمجھتے تھے جس کا عدم وجود دائرہ فنا سے باہر نہیں ہے ان کے کلام میں تقدیر کا ذکر جا بجا ملتا ہے لیکن وہ تدبیر کو تقدیر پر فوقیت دیتے ہیں ان کے نزدیک تقدیر نام ہے شکست تدبیر کا۔ اس دعوے کے ثبوت میں یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
جا رہا ہے ایک جنازہ دوش پر تقدیر کے

فانی کی عظمت و مرتبت سے اردو ادب کی دنیا واقف ہو گئی ہے ان کی زندگی میں نہ سہی، ان کے مرنے پر ہی سہی۔ بہر صورت فانی کی شاعری ایک زندہ حقیقت ہے اور ہمیشہ زندہ حقیقت رہے گی بالکل اسی طرح ؎

ہیں ابھی تیرے اشعار یاد ہے فانی
تیرا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا۔



فضیل جعفری

کلامِ فانی کے بعض پہلوؤں پر ایک سرسری نظر

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم، آخری دیدار میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

یہ ہیں شوکت علی خان فانی بدایونی کے وہ اشعار جو بیسویں صدی کے ابتدائی چالیس برسوں میں دیہاتوں اور شہروں میں، مدرسوں اور خانقاہوں میں، دل جلے عاشقوں کی محفلوں میں، شرفائے اودھ اور رؤسائے دکن کے دیوان خانوں میں، طوائفوں کے کوٹھوں اور حتیٰ یہ کہ تانگے والوں کی زبانوں پر بلا شرکت غیرے گونجتے تھے اور عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ اور ایسے ہی کچھ دوسرے اشعار ہیں جنھوں نے فانی کی زندگی میں ان کی تخلیقی قوتوں کو اور فانی کے مرنے کے بعد ان کی شعری ساکھ کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ فانی کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے فراق گورکھپوری نے ایک جگہ بڑی دلچسپ لیکن پتے کی بات کہی ہے یعنی یہ کہ فانی کی "تنگنائے غزل میں پہنچ کر دل بیٹھ جاتا ہے اگرچہ کہ اٹھنے کو کبھی جی نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شاعر جس کے یہاں

دل کے جلتی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا

جیسی غزل کے تیز اور نکیلے نشتر موجود ہوں اس کی محفل سے اٹھنے کا کس کا جی چاہے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فانی کی تنگنائے غزل میں پہنچ کر دل بیٹھنے کیوں لگتا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ فانی کی شاعری پر یا یوں کہیے کہ اس کے ایک بڑے حصے پر آشفتگی، بے دلی، غم گینی، بیزاری، مایوسی اور موت کی پرچھائیاں پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بسا اوقات یہ تاریک سائے اتنے سلیے اور گھنے ہو جاتے ہیں کہ ہم ان کے پیچھے موجود روشن نقطوں اور لکیروں کو نہیں دیکھ پاتے۔ یوں بھی ہماری تنقید اتنی پس ماندہ رہی ہے کہ ہم سطح سے نیچے اتر کر چیزوں کو پرکھنے اور کھنگالنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں ابھی تک ہم شعر کو ایک فن کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے متعلقہ شاعر کے یہاں موجود اخلاقی نظام اور فکری احساس پر زیادہ زور دیتے ہیں پچھلے سوا سو برسوں سے ہمارے ہاں یہی طرزِ تنقید غالب رجحان کے طور پر رائج رہا ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کے متعلق صاحبِ آبِ حیات یعنی محمد حسین آزاد کے چند جملے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔ لکھتے ہیں:

"میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط یا کامیابیٔ وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا، وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے، اس کا دکھڑا سناتے چلے گئے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں، وہ غم و درد کا پتلا نہیں، حسرت و اندوہ کا جنازہ ہے۔"

فانی پر میر تقی میر اور ان کے بعد مرزا غالب کے جو اثرات ہیں، وہ سب پر ظاہر ہیں۔ اردو تنقید انھیں کے گرد کولہو کے بیل کی طرح گھومتی رہی ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ ایک فانی پر ہی کیا منحصر ہے، ہمارے نقاد ہر شاعر کو میر اور غالب کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اب یا شاعر میر اور غالب سے مقابلہ کرے جو ممکن نہیں ہوتا یا پھر ان پر قربان ہو جائے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس رویے کے نتیجے میں ہمارے یہاں minor poets کی اصطلاح ہی رائج نہ ہو سکی۔ فی الحال اس مسئلے کی تفصیل میں نہ جا کر صرف یہ کہوں گا کہ فانی کو میر

تقی میر سے جو ذہنی قربت تھی اس نے نہ صرف ان سے میر کی زمین میں غزلیں کہلوائیں بلکہ ان پر اسی قسم کی تنقید بھی ہونے لگی۔ فانی پر غم نوازی، مرگ پرستی، روتے بسورتے رہنے اور زندگی سے بیزار ہونے جیسے الزامات کا ایک لامتناہی سلسلہ اردو تنقید میں جا بجا بکھرا نظر آتا ہے۔ ہما شما کی بات جانے دیجئے، ڈاکٹر سید عبدالستار جیسے غیر جانب دار نقاد اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے ابھی حال ہی میں فانی کو موت کا شاعر قرار دیا ہے۔ اسی طرح مجنوں گورکھپوری کے نزدیک "فانی زندگی کو کوئی اچھی چیز نہیں سمجھتے تھے اور اس کے تصور سے ان کے دل میں کوئی انبساطی لہر نہیں اٹھتی تھی۔ بلکہ وہ زندگی کو فتنہ و فساد سے تعبیر کرتے تھے۔ مجنوں صاحب کو یہ بھی شکایت ہے کہ "فانی اپنے اندر اتنی سکت نہیں رکھتے تھے کہ نئی قدروں کا ذہنی اور صحیح تصور پیدا کرتے اور اس کی تبلیغ کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی ہی کو ایک برائی سمجھنے لگے۔ قبل اس کے کہ اس سلسلے کو آگے بڑھاؤں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ فانی کے ان چند اشعار پر ایک نظر ڈال لی جائے جو بظاہر موت کے بارے میں ہیں اور جن کی آڑ میں فانی کو طنز کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ فانی پر جس قسم کی تنقید عموماً کی جاتی رہی ہے اسے دیکھ کر بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

۱۔ ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

۲۔ مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

۳۔ تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

۴۔ ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

ان چاروں اشعار میں موت کا ذکر ہے لیکن موت پرستی کا جذبہ یا خواہش مرگ کے وسیلے سے لذت کوشی کے عنصر مجھے کہیں نظر نہیں آتے۔ پہلے شعر کا تو انفرادی موت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں فانی کو نہ تو فلسفی شاعر سمجھتا ہوں نہ شاعر فلسفی، لیکن انھوں نے اس شعر میں یقیناً ایک پرانے فلسفۂ وقت کو شعری جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ انسانی زندگی میں ہر لمحہ جو گزر جاتا ہے وہ مر جاتا ہے اور وہ کبھی واپس نہیں آتا۔ اس طرح انسان لمحہ لمحہ مرتا ہے اور لمحہ لمحہ جیتا ہے۔ دوسرے شعر میں دراصل دوسرا مصرع ہی فنکارانہ احساس والا کلیدی مصرع ہے جو ہمیں زندگی کی بھرپور لذت اٹھانے کے لئے موت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس خیال کو فانی نے مختلف موقعوں اور مختلف ڈھنگ سے نظم کیا ہے۔

تیسرے شعر میں موت اور زندگی سے قطع نظر فانی دراصل محبوب کی شوخی اور قاتلانہ اداؤں کا جلوہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کر دوں کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی اپنی ایک نظم میں موت کو دلہن سے تشبیہہ دی ہے اور لکھا ہے کہ آدمی جب مرتا ہے تو دراصل اپنی بچھڑی ہوئی پریمیکا سے ملتا ہے۔

چوتھا شعر دراصل مرزا غالب کے ایک مصرعے

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ

کی سیدھی سادی توسیع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے تعلق سے لذت آمیز بیانات موت پر زندگی کے تمام آلام و مصائب کا خاتمہ اور موت کو بجائے خود ایک خوش گوار تجربے کے طور پر قبول کرنے کی شعری روایت اردو ہی میں کیا کم و بیش ہر زبان میں زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ موت کے سلسلے میں میر کا مشہور شعر،

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

ان کے دوسرے بہت سے اشعار کے ساتھ ساتھ ضرب المثل بن چکا ہے۔ یوں بھی میر کے یہاں غم و آلام کی شدت ہے لیکن مرزا غالب جنھیں ڈاکٹر سید عبداللہ نے فانی کا ذکر کرتے ہوئے زندگی کا شاعر کہا ہے ان کا دیوان مایوسی، نا امیدی، مرگ پسندی جیسے اجزا سے بھرا ہوا ہے مثلاً

لب خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ سردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

ہوگئیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

لیکن ظاہر ہے کہ محض ان اشعار کو سامنے رکھ کر غالب کی پوری شاعری پر نہ کوئی تنقید کرتا ہے نہ ہی کرنی چاہیئے۔

جہاں تک کلام فانی کا تعلق ہے، جن حضرات کو موضوعاتی تنقید سے دلچسپی ہے اور جو شعر کو محض اس کے زندگی کی طرف رونے کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں انھیں بھی اس سلسلے میں مایوسی نہیں ہوگی۔ فانی کے یہاں ایسے

ایک دو نہیں بلکہ درجنوں اشعار مل جاتے ہیں جن میں موت کو ہر جگہ کا دہلا نہیں سمجھا گیا بلکہ موت پر زندگی کو ترجیح دی گئی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ فانی کے بعض اشعار میں تاریکی سے روشنی کی جنگ مسلسل جدوجہد کی تلقین اور انسان کے لئے ایک خوش گوار مستقبل، نیز منزل کی بشارت بھی ملتی ہے۔ مثال کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:-

بند ہے بابِ قفس، ہو، سر تو پٹکے جایئے
ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا

وہ حرف صد یقیں سہی، حیات پھر حیات ہے
کہاں سے لاؤں اعتبار مرگ کامیاب کا

یعنی یہ کہ فانی کی شاعری محض غم و آلام کا دکھڑا نہیں ہے اور یہ کہ ان کی شاعری اذیت پسندی اور مرگ پرستی کے باقاعدہ فلسفے کی دریافت محض سعی لاحاصل ہے۔ بعض نفسیاتی نقادوں نے جو ہر چیز کو شعور اور لاشعور کی مدد سے سمجھتے اور بیان کرتے ہیں، انھوں نے فانی کی شاعری کے بظاہر اس غالب پہلو کے متعلق عام تنقیدی رویے کے مقابلے میں بالکل مخالف رویہ اپنایا ہے۔ ڈاکٹر آغا، کا خیال ہے کہ "فانی کو زندگی سے بے حد پیار تھا اور وہ مرنا نہیں چاہتا۔ جب فانی خود کو موت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا اور کفن، قبر، نعش اور مردنی کا ذکر کرتا ہے تو گویا نفسیاتی طور پر خود کو موت کے خوف سے نجات دلانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔" میرے نزدیک ڈاکٹر وزیر آغا کا رویہ دوسری طرح کا ایک انتہا پسندانہ رویہ ہے۔ میرے نزدیک فانی کی شاعری نہ تو مرگ پرستی کا نتیجہ ہے اور نہ موت کے خوف پر قابو پانے کی کوشش کا۔ پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ان دونوں میں سے کوئی ایک رویہ بجائے خود شاعری کو چھوٹی یا بڑی بنانے کی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں نہیں۔ عشق ہو، یا موت ہو، یا محبوب کی جوانی ہو یا اس کی ادائیں، یہ ساری چیزیں فانی کی شاعری کو اردو شاعری کی روایت کے ورثے کے طور پر ملی تھیں۔ شروع شروع میں تو یقیناً فانی نے اس روایت کو مشقِ سخن کی خاطر، یا اپنی طبیعت کی مناسبت سے اپنایا ہوگا لیکن آگے چل کر یہی روایت ان کی عادت اور ثانوی فطرت بن گئی۔ ان کی شاعری پر میر اور غالب کے جو اثرات تھے ان سے سب واقف ہیں۔ ذرا غور سے پڑھیں تو ان کے یہاں اردو کے کمزور شعراء کی کمزور شاعری کی روایت تک نظر آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ شعر پڑھتے ہیں

شب فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ فانی کی آواز نہیں بلکہ روایتی شاعری کی روایت کی آواز ہے۔ جہاں تک کسی شاعر کا اپنی زبان میں موجود بہترین شعری روایتوں کو جذب کرنے کا سوال ہے اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اچھے سے اچھا شاعر اس حد تک خود مکتفی نہیں ہو سکتا کہ وہ متقدمین کے اثرات سے یکسر آزاد ہو جائے۔ لیکن گڑبڑ اس وقت ہوتی ہے جب یہ اثرات آپ کی شاعری میں مکمل طور پر تحلیل ہو کر ایک نئی تخلیقی شکل اختیار کرنے کے بجائے آپ کی شاعری کی سطح پر تیرتے ہوئے نظر آنے لگیں۔ فانی نے جس کثرت سے میر اور غالب کی زمینوں اور بحروں میں غزلیں کہی ہیں اس سے انھیں خاصا نقصان پہنچا ہے۔ ان غزلوں میں بعض بہت اچھے اشعار بھی ہیں۔ لیکن یہ اچھے اشعار بھی اپنے بہترین لمحات میں فانی کو میر اور غالب سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ ان سے آگے نہیں لے جاتے۔ دوسری بات یہ غم اور موت وغیرہ کے تعلق سے بعض خیالات کو انھوں نے اتنا دہرایا کہ یہ خیالات خود انکی شاعری میں کلیشز (clashes) بن کر رہ گئے۔ ان باتوں سے میری مراد یہ ہے کہ فانی اپنی وقتی شہرت اور مقبولیت سے خود اتنے متاثر اور مطمئن ہو گئے کہ انھوں نے شعوری طور پر اپنی تخلیقی قوتوں سے پورا کام نہیں لیا یعنی یہ کہ وہ اپنے شعری کرافٹ کی طرف سے لاپرواہ سے ہو گئے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لئے کوئی ایسا منفرد اسلوب یا دلکش تخلیق نہیں کیا جو لازوال ہو۔ یہی وجہ ہے کہ معترضین سے قطع، فانی کے معتقدین بھی انھیں میر اور غالب کا امتزاج کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے۔ انھوں نے بعض خیالات کو دہراتے رہنے پر اکتفا کیا۔ اس طرح ان کے شعری جذبات میں ایک طرح کی خارجیت آگئی۔ اور ان کے لہجے میں لگاؤ یعنی passion کے بجائے جھلاہٹ آگئی۔ وہ اتفاقیہ حادثات کو بھی اپنی بدقسمتی کے تعبیر کرنے لگے۔ اپنی شاعری کے لئے وسیع تر تناظر مہیا کرنے کی لگن ان کے یہاں نظر نہیں آتی۔ دراصل فانی کی انفرادیت ان غزلوں میں نظر آتی ہے جن میں انھوں نے میر اور غالب سے اپنا دامن بچا لیا ہے۔ ان میں سے بیشتر غزلیں طویل بحروں میں ہیں اور نرم و سبک روغنائیت سے بھرپور ہیں۔

فصل گل آئی، یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے

کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

عجز اِدھر اُدھر غرور، دونوں غیور سے غیور
دامنِ مدعا سے دور، دستِ سوال رہ نہ جائے

اب جو ہوا ہوا مآل، چھوڑ خدا پہ اندمال
زخمِ جگر پہ خاک ڈال، تیر سنبھال رہ نہ جائے

غم کے ٹہوکے کچھ ہوں بلا سے، آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے، جاگتے ہی سو جاتے ہیں

تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

جیسا کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا ان اشعار میں لفظیات اور لفظیات سے صوتیات کا ایک ٹھوس نظام اور التزام ملتا ہے۔ ہم قافیہ اور ہم وزن الفاظ کا متواتر استعمال ان اشعار میں موسیقی اور رفتار پیدا کرتا ہے، پھر جا بجا کا برتاؤ جیسے اِدھر کے ساتھ اُدھر، جاگنے کے بعد فوراً سو جانے کی کیفیت جیسی چیزیں فانی کے اسلوب میں تازگی اور ندرت پیدا کرتی ہیں۔ ان اشعار میں حزنیہ موسیقی تو ہے لیکن آہ و بکا کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ ان طویل بحروں والی غزلوں کے علاوہ فانی کی وہ غزلیں دامنِ شعر، ذہن و دل ہیں جن میں انھوں نے اپنے خاص عشقیہ محسوسات و معتقدات رومانویت، عقلیت کے امتزاج سے ایک نیا اسلوب بنایا ہے۔ مثلاً ان کی ایک ہی غزل میں ایسے بے پناہ اشعار مل جاتے ہیں

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں، منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری
فانی ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

یہی وہ اشعار ہیں جنھوں نے ان کی ماتمی لے کو شکست دے کر ان کی شعری شخصیت کو جِلائے رکھا ہے اور یہی وہ شعری شخصیت ہے جو ہمیں فانی کی موت کے ۴۰ برس بعد بھی ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے اور خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

بقیہ: فانی - ایک تاثر

ایک زنداں کا منظر نظر ہے کوئی قید و بند میں مبتلا اس پر غور کر رہا ہے کہ آخر درِ زنداں کھلنے کی وجہ کیا ہے؟ کیا موسمِ گل آیا یا اجل کی آمد آمد ہے؟ کیا کسی قیدی کو چھوڑا جا رہا ہے یا کسی نوگرفتار کا خیر مقدم مقصود ہے؟ جو مطالب اس میں حذف کئے گئے ہیں اور وہ جو بیان کئے گئے ہیں ان دونوں کا مجموعی اثر تغزل کی اعلیٰ ترین معراج کو ظاہر کرتا ہے۔"

فانی نے اپنے مخصوص انداز میں معاملاتِ حسن و عشق کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ محبت کی ایک کیفیت کو اس شعر میں ملاحظہ فرمائیے ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں آتی

اس مضمون کو جگر نے بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

اس عشق کی تلافیِ مافات دیکھنا
رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

اگر عاشق اپنی دعاؤں میں اثر کا طالب ہو تو فانی اسے محبت کی توہینِ خیال کرتے ہیں۔ شعریت ہی نہیں اخلاقی حیثیت سے یہ شعر بلند شعر ہے ؎

ننگ ہے سعیِ غرضِ محبت فرضِ محبت پورا کر
اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے

مختصر یہ کہ فانی نے میر و غالب کی خصوصیاتِ شاعری کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور اکثر مومن و غالب کی تراکیب سے بھی مدد لی ہے — اس اکتساب نے فانی کے شعروں میں چاشنی اور رس گھول دیا ہے — دعوے میں جو خلوص ہوتا ہے وہ ہنسنے میں نہیں ہوتا اور اسی خلوص کی وجہ سے غم و اندوہ کی شاعری ابدی نغمہ بن جاتی ہے۔ دراصل فانی کا یہی خلوص ان کی شاعری کا ضامن ہے۔

بشر نواز

فانی کا تصوّرِ مرگ

پہلے کچھ شعر سنئے :۔

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق ؛ مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں ملی

طلبِ محض ہے سارا عالم ؛ کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

نقشِ موہومِ حیات افسانہ در افسانہ تھا
جب یہ نقش ابھرا تو اک حرفِ تمنا بن گیا

ہے فنا آبادِ غم اک معنیٔ لفظ آفریں
صورت آبادِ جہاں اک لفظِ معنی خیز ہے

یہ اشعار اسی شاعر کے ہیں جسے امام المتغزلین تو مانا گیا لیکن ساتھ ہی امامِ یاسیات کے لقب سے بھی نوازا گیا۔ نقادوں نے فانی کی شاعری میں موت کے قدموں کی واضح چاپ سنی اور انہیں زندگی بیزار کہہ دیا۔ معاصرین نے کچھ تو ہم عصرانہ چشمک کی وجہ سے اور کچھ سرِ فانی سے سطحی واقفیت کی بنا پر ان کی شاعری میں کافور و کفن کی بو محسوس کی۔ ان کی آواز کو بیوہ کا بین اور ان کی شعری فضا کو دم گھونٹنے والی فضا قرار دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان آراء کا جواز خود فانی کی شاعری سے پیش کیا جاسکتا ہے

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دُلہن بنائے ہوئے
تو کہاں تھی اے اجل، اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

لیکن اگر اسی طرح بکھرے بکھرے اشعار کے سرسری مطالعہ پر تنقیدی رائے کا انحصار ہو تو بڑی آسانی سے میر کو ہزل گو، غالب کو یاسیت پسند، درد کو معاملہ بند اور انشاء کو اردو شاعری کی دکھ بھری آواز کہا جاسکتا ہے کیوں کہ ان شعراء کا غالب رجحان کچھ ہی سہی، اس قسم کے کچھ اشعار تو ان کے ہاں مل ہی جائیں گے بلکہ کچھ تو ان کے منتخبہ اشعار میں بھی شامل ہوں گے۔ یہاں میں نقاد حضرات کی طرح نہ اردو تنقید کی تنگ دامانی کا شکوہ کروں گا نہ اس کے یک رخے پن کا گلہ، البتہ تنقید کے ایک بنیادی اصول کی یاددہانی کرتے ہوئے ایک سوال کروں گا کہ کیا مذکورہ شعراء کی روح کا عکس اور اصل سوچ کا پرتو اس قسم کے اشعار میں ملتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ادب کے سنجیدہ قاری کا جواب نفی میں ہوگا کیوں کہ ہر لکھنے والے کی انفرادیت کے باوجود اس کی تحریر میں اپنے زمانے کے عمومی رنگ، دور کے آہنگ، قریبی پیش روؤں کے اثرات اور وقتی و اضطراری جذبات و احساسات کا عکس ملنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ یہ عکس اس کی شاعری اور شخصیت کے آس پاس ہونے کے باوجود فن و شخصیت کا جوہر نہیں ہوتا اس لئے فن کار اور اس کے فن کی اصل روح کو سمجھنے سمجھانے میں مدد نہیں دے سکتا۔ فانی کی پرکھ میں یقیناً ایک حد تک تنقید کے اس بنیادی اصول کو برتا گیا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بڑی حد تک اس اصول کو نظر انداز بھی کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فانی کے فن کا ادھورا جائزہ تو لیا گیا لیکن بھرپور محاکمہ نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں داغ کی زبان اور لکھنوی صناعی کے نمونوں کے باوجود انہیں داغ کا پیرو یا دبستان لکھنو کا نمائندہ نہیں کہا جاتا ورنہ

من جائیں اگر تم ہمیں جھوٹوں بھی منالو
دعوے سے، تسلی سے، دلاسے سے، قسم سے

چرا کر دل پلٹنا، مسکرانا ؛ یہ چالیں سیکھ لیں تم نے کہاں سے

مشتاق خوددار رہیں دل سے جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر ان کی نظر سے

اور اسی قسم کے دوسرے اشعار انہیں داغ کے رنگ کا شاعر ثابت کر سکتے تھے۔ اسی طرح

کفن لے گرد لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کر بدلے

تربت کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے
دو روز کے صبح کی مری شمعِ مزار نے

تری لگائی ہوئی آگ حشر تک نہ بجھی
ہوئے نہ مر کے بھی ٹھنڈے ترے جلائے ہوئے

قسم کے اشعار انہیں خالص لکھنوی رکھ رکھاؤ کا شاعر کہلوانے کیلئے کافی تھے۔ اسے فانی کے نقادوں کی بالغ نظری کہیئے کہ انہوں نے اصل فانی کو اس قسم کے رسمی اشعار سے الگ رکھ کر پرکھنے کی کوشش کی۔ لیکن یہیں وہ فانی کے تصورِ مرگ کے سلسلے میں ایک مغالطے کا شکار ہو گئے جس کا ازالہ آج تک نہ ہو سکا اور اسی سبب سے فانی پر قاضی عبد الغفار اور رشید احمد صدیقی کے مقدموں اور ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر عبد الشکور کے مقالوں کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہو سکا ہے۔ ان کا محاکمہ صرف کچھ آرار کی روشنی میں ہوتا رہا۔ چنانچہ ان کے تصورِ مرگ کا تجزیہ کیا جا سکا نہ اس کے اصل محرکات معرضِ بحث میں آئے۔ البتہ ان چاروں نقادوں میں سے کسی نے بھی فانی پر "موت پرستی" کا الزام نہیں رکھا۔ اور یہی بات ہمیں فانی کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔

فانی کی شاعری کے بنیادی محرکات تک پہنچنے کے لئے ہمیں دو بنیادی باتوں پر بطورِ خاص غور کرنا پڑے گا۔ پہلی بات تو یہ کہ موت ان کے ہاں کیا معنی رکھتی ہے اور دوسری یہ کہ ان کا فنی رویّہ اور تکنیک کیا تھی؟ ان کے فنی رویّے کو سمجھنے کے لئے اس ماحول اور شعری فضا پر بھی ایک نظر ڈالنی ہوگی۔

فانی نے جب شعر گوئی شروع کی تب اردو غزل داغ کے چٹخارے دار بیان اور رواں دواں زبان کے رنگوں میں شرابور ہو چکی تھی۔ فانی کے قریبی پیش روشاد عظیم آبادی کی آواز، داغ و امیر کی نغمہ سنجیوں میں گم ہو رہی تھی ان حالات میں فانی کی انفرادیت نے جس کے بارے میں کبھی بھی دو رائیں نہیں رہیں۔ اپنے لئے ایک الگ راہ کا انتخاب کیا۔ یہ راستہ مشکل بھی تھا اور پر خطر بھی کہ اردو غزل کے دو بڑے تاجداروں میر و غالب کے دیاروں سے ہو کر گزرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فانی نے میر کی "شکستگی" اور غالب کے آہنگ کو یکجا کر دیا تھا۔ خیر، فی الحال اس موضوع کو چھوڑ دیئے، کہ اس کے لئے الگ دفتر درکار ہے البتہ یہ طے ہے کہ فانی کا شعری آہنگ کافی بلند، پرشکوہ اور پرپیچ ہے۔ اگر موضوع اور ہیئت شعری آہنگ اور شعری مواد ایک دوسرے کا تکملہ ہے تو فانی کا آہنگ اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ کیا

ع وہ بھی صرفِ کشمکش ہائے تماشہ ہو گیا
ع میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد
ع یہی ذرّے اڑا لے جائیں گے اک دن بیاباں کو

جیسا پرشکوہ آہنگ انفعالی ذہنی رویے کی عکاسی کر سکتا ہے؟ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ فانی کی فنکاری اور Craftmanship کا کوئی منکر نہیں۔ چنانچہ فانی کے بارے میں مروّجہ آرار پر از سرِ نو غور کرنے کے لئے پہلا مطالبہ ان کا آہنگ کرتا ہے۔ اس شک نہیں کہ ابتدا میں فانی نے یاس و اندوہ کے نغمے الاپے لیکن وہ اس منزل پر رکے نہیں۔ اس سے آگے نکل گئے۔ اور بہت جلد نکل گئے۔ لیکن یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ ان کی جس آواز نے دنیائے ادب کو پہلے پہل چونکایا وہ اتنی سحر انگیز تھی کہ سننے والے اسی میں الجھ کر رہ گئے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں صدائے فانی کے اولین سحر نے قاری اور نقاد کو یوں پتھرا دیا کہ وہ مغنّی کے فن کی اگلی منزلوں میں اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ شاعر تو

کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

اور

برپا تھا میری لاش پہ اک محشرِ سکوت

کہہ کر آگے بڑھ گیا لیکن نقاد گور کی تاریکی اور کافور کی بو سونگھتے رہ گئے مگر سنجیدگی سے کسی فنکار کا مطالعہ کرنے والا جب

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشہ نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

جیسے اشعار سے دوچار ہوتا ہے تو وہ کفن میں لپٹے فانی اور بے خوف و ہراس اپنی ذات پر اعتماد رکھنے والے 'موت کو زندگی کا ہوش سمجھنے والے اور اپنے آپ کو بزمِ تماشہ کا مرکز سمجھنے والے فنکار میں زمین آسمان کا فرق پاتا ہے اور یہیں سے پھر ایک بار اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں اور اس کے ذہنی سفر کے مختلف مرحلوں پر غور کرنا شروع کرتا ہے۔

اب میں اپنی بات کا سلسلہ مضمون کی ابتدا میں دیئے ہوئے اشعار سے جوڑنا چاہوں گا۔

ایک شعر تھا

ہے فنا آبادِ غم اک معنیٔ لفظ آفریں
صورت آبادِ جہاں اک لفظِ معنی خیز ہے

اس شعر کو فانی ہی کی ایک رباعی

یہ ارض و سما، یہ انس و جاں ہیں الفاظ
الفاظ کے معنیٰ بھی یہاں ہیں الفاظ
اک معنیٔ بے لفظ ہے عالمِ فانی
معنیٰ کی لطافت پہ گراں ہیں الفاظ

کے ساتھ ملا کر پڑھیئے۔ یہ بات روشن ہے کہ شاعر کے نزدیک اشیا و واقعات کی ظاہری شکل اور ان کے اندرونی مفاہیم میں نمایاں فرق ہے۔ فانی "صورتِ آبادِ جہاں" کو بہر حال ایک لفظ گردانتے ہیں۔ انہیں لفظ کے وجود سے انکار نہیں لیکن اس کی محدودیت سے گلہ ہے۔ برخلاف اس کے انہیں اس کا احساس ہے کہ غم اور فنا کے ہاتھوں آباد کی ہوئی دنیا، معنیٰ کی طرح تہہ در تہہ اور بے پایاں ہے۔ ان کے نزدیک تمام مظاہرِ کائنات، ارض و سما، انس و جاں الفاظ ہیں جو اپنی معنویت تو رکھتے ہیں لیکن ہیں محدود۔ ان کے حدود ظاہری شکل و شباہت کے علاوہ تعین زماں و مکاں بھی ہیں اور حصارِ جسم و سمت بھی جبکہ عالم یعنی زندگی کی وہ بے ہئیت قوت جو محدود پیمانے پر مختلف مظاہر میں اپنی نمود کرتی ہے، دراصل لامحدود ہے۔ اس پر مظاہر کی پابندی گراں ہے۔

اک معنیٔ بے لفظ ہے عالمِ فانی
معنیٰ کی لطافت پہ گراں ہیں الفاظ

چھلکوں کو چھوڑ کر مغز پر اور الفاظ سے گزر کر معنیٰ پر نظر رکھنے والا موت اور زندگی کے مروّجہ معنوں کا اسیر نہیں بلکہ وہ انہیں نئے اور وسیع تر معنیٰ دینے پر قادر ہوتا ہے۔ چنانچہ فانی کے ہاں موت بھی زندگی ہی کے ایک روپ میں ابھرتی ہے کہ وہ تمام کائنات کے پس پردہ محرک، زندگی اور ہر دم بدلتی ہوئی اس قوت سے آشنا ہو چکے ہیں جسے سہولت کے لئے ہم زندگی کہہ لیں۔

آج سے صدیوں پہلے یونانی مفکر فلاطینوس اپنے انداز میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا "ایک طرف تو وہ موجودات ہیں جو قابلِ تقسیم اور زماں و مکاں کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا جوہر ہے جو اجزاء میں منقسم ہوتا ہے نہ زماں و مکاں میں قید ہو سکتا ہے۔ یہ ہئیت و اشکال کی پابندیوں سے بھی آزاد ہے اور یہی جوہر قوتِ حیات ہے۔"

جو فنکار اس جوہر سے پوری طرح آشنائی پیدا نہ کر سکے ان کے ہاں موت ایک خوف بن کر مختلف شکلیں اختیار کرتی رہی لیکن فانی جو زندگی کے مزاج داں اور اس کی ہر شکل سے واقف تھے جو فلاطینوس کی طرح ناقابلِ تقسیم و تعیّن جوہر کو پرکھ چکے تھے اور قوتِ حیات کا مشاہدہ، مظاہر و اشکال سے پرے بھی کر سکتے تھے، موت سے خوف زدہ ہیں نہ بیزار۔ وہ موت کو زندگی ہی کی ایک شکل مان کر گلے لگانے کی جرأت رکھتے ہیں۔ موت ان کے ہاں کوئی ٹیبو نہیں، زندگی کی ضد نہیں بلکہ اس کا ایک زاویہ ہے۔ شکلوں اور اجسام سے ماورا، حدود کی پابندیوں سے بے نیاز ایک روپ ہے۔

دور سے جا اٹھا کے سرِ حدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز

جب دلِ آوارہ نے تمام حدود کو توڑ دیا تو فانی کے سامنے ایک وسیع تر منظر تھا جس کے منظر نامے میں موت و حیات کا فرق بے معنیٰ تھا کہ اس کی معنویت تسلسل اور تگاپو پر منحصر تھی اور اس مسلسل تگاپو کی لو کو اکسانے اور اکساتے رکھنے کی ذمہ داری طلب، خواہش اور تمنا پر تھی۔

طلبِ محض ہے سارا عالم
کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

نقشِ موہومِ حیات افسانہ در افسانہ تھا وغیرہ

اردو میں تمنا و طلب کی اس قوت سے غالب و اقبال کے بعد صرف فانی ہی واقف تھے۔ اب اس کو کیا کہیئے کہ غالب و اقبال شاعرِ حیات کہلائے اور فانی !!

یہ بالکل درست ہے کہ غالب و اقبال کے برخلاف فانی نے زیادہ پیچ دار اور دور کا راستہ اختیار کیا یعنی انہوں نے راست زندگی کو آواز دینے کے بجائے موت کو صدا لگائی حالانکہ یہ صدا بھی دراصل زندگی سے متعلق تھی۔ کیوں اور کیسے؟ اس سلسلے میں پہلے واضح ہو چکا ہے کہ فانی کے نزدیک ظواہر سے زیادہ اہمیت اندرونی رشتوں کی تھی اور موت محض ایک ظاہری ٹکڑا ہے جبکہ حقیقت وہ جوہرِ حیات ہے جس کے بل پر ہر مظہر اپنی نمود کرتا ہے۔ فانی عرفانِ ذات سے گزر کر عرفانِ حیات کی منزل پر آئے اسی لئے ان کے نزدیک نہ ذات محض پانچ عناصر کا مجموعہ اور مابعد خاکی کا نام ہے نہ حیات محض ایک جسم یا ایک شکل کی حد تک محدود ہے۔ وہ ذات کو اس کی صفات سے اور حیات کو اس کے بے ہئیت جوہر سے پہچان سکنے پر قدرت رکھتے تھے۔ اس لئے بدلتے ہوئے رنگ اور بکھرتی ہوئی ہیئتیں انہیں ہراساں نہیں کرتیں اور وہ غم و ملال کی حدود سے آگے نکل کر سوچتے ہیں

واہ رے شانِ یادِ ذات واہ رے احتیاجِ ذات
غم ہے نہ اب ملال ہے ڈر ہے نہ اب ہراس ہے

اور

بو سے خزاں سے مست ہیں یاد نہیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

چمن پرستی کی وہ منزل جہاں پھولوں اور کانٹوں کا فرق مٹ جاتا ہے یہاں

اور خزاں ایک ہو جائیں کتنے فنکاروں کے حصے میں آئی ہے؟ فانی کی یہ چمن پرستی یا حیات پرستی ذیلی اور مفروضہ حدود کو توڑتی ہوئی ہر اس شے سے رشتہ جوڑتی ہے جو اس کائنات میں موجود ہے اور موت کے وجود سے انکار کس نے کیا ہے؟

دراصل فانی قوتِ حیات کے عشق میں موت کو گلے لگاتے ہیں کہ موت ان کا خوف نہیں، جانا پہچانا نقاب پوش محبوب ہے۔ فانی اس نقاب کو الٹ کر دیکھتے ہیں تو وہاں زندگی ہے ....۔ لامحدود، ہر دم رواں پیہم دواں" زندگی .... روحِ حیات تک پہنچنے کی اس پیچ در پیچ اور لہو طلب راہوں پر سفر کی داستان فانی کی شاعری ہے

دل سراپا درد تھا وہ ابتدائے عشق تھی
انتہا یہ ہے کہ فانی درد اب دل ہو گیا

اس طرح فانی کے ہاں معنیٰ و مفہوم، دل اور درد، حیات اور موت ایک ہو جاتے ہیں اور وہ خود اپنی ابتدائی شاعری کی حدبندیوں کو توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نیشِ غم کے گوارا ہونے سے پہلے کا وہ شکوہ سنج جو

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

کی صدا لگاتا تھا۔ عرفان کی منزلوں سے گزر کر جب اس منزل پر پہنچا۔

جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں ایمائے اجل سے آگے بڑھو
منزل کا نشاں ہے ہر منزل آرام کی منزل کوئی نہیں

جو ہے وہ کیا ہے، سوال یہ ہے کہ اب نگاہوں کا حال یہ ہے

جدھر نگاہیں ذرا اٹھاؤ، ادھر تمہارا ہی نام دیکھو

یہ نام کس کا تھا۔ یہ نام اس قوتِ حیات کا تھا جو شکلیں بدل بدل کر فانی کے سامنے آتی رہی — اور

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق   مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں ملی

کی منزل تک پہنچا تو اس کے اس ذہنی سفر اور ردِ ظواہر میں کوئی اس کا شریک نہ تھا۔ اس طویل و دشوار راستے پر اس کے ساتھی تھک تھکا کر چھوٹ چکے تھے۔ لیکن وہ ان باتوں سے یوں بے نیاز تھا کہ

دل کا علاج کیجئے اب یا نہ کیجئے
اس کا جو کام تھا وہ غم یار کر گیا

زہرِ غم کو بچا کر یوں اکسیر بنانے کی ادا شاید فانی نے میر سے سیکھی تھی

دلِ پرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

میر کا دلِ پرخوں، فانی کے ہاں "مرگ" یا خواہشِ مرگ۔ میر خوش قسمت تھے کہ ان کے دور کو تہہ داری اور گہری معنویت تک پہنچنے کا حوصلہ بھی

تھا اور فرصت بھی لیکن فانی کے دور میں شاید کسی کو اتنی فرصت تھی نہ جرأت کہ وہ الفاظ کی نقابوں کو ہٹا کر لیلیٰ معنیٰ کے رخِ آتشیں کا نظارہ کر سکے۔ اس لئے فانی کی غم پسندی اپنے وسیع تر مفاہیم کو واضح نہ کر سکی۔

قاضی عبدالغفار راوی ہیں کہ جب فانی نے انہیں اپنی رباعی

او، از جہاں گذشت کہ آخر خدا نہ بود
او، ایں چنیں بہ زیست کہ گوی خدا نہ داشت
طغیانِ ناز بیں کہ بہ لوحِ مزارِ او
ثبت است سالِ رخصتِ فانی "خدا نہ داشت"

سنائی تو انہوں نے گھبرا کر کہا "ظالم آخر یہ کیا کہہ دیا" جس کا جواب فانی نے بڑے اطمینان سے دیا "خدا نہ داشت" سے گھبرا گئے اور طغیانِ ناز کو نہیں دیکھتے۔

کیا عجب ہے کہ آج بھی روحِ فانی مسکراتے ہوئے اپنے نقادوں سے کہہ رہی ہو "موت" کے لفظ سے گھبرا گئے اور زندگی کے اس جلال و جمال کو نہیں دیکھتے جو اس میں پوشیدہ ہے۔

میرا خیال ہے کہ فانی اور ان کا فن آج بھی باذوق حضرات اور نقادانِ ادب کے لئے ایک چیلنج ہے

کیوں اہلِ حشر، ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

• فانی کے مزاج کا شاعر داغ اور امیر کے رنگ پر قناعت کر کے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ وہ احساس و تاثر کی بڑی شدید صلاحیت اور فکر و تامل کا نہایت قوی میلان لے کر پیدا ہوئے تھے اور زمانے کے اسباب و حالات نے ان کی قوتوں کو اور بھی تیز کر دیا تھا چنانچہ داغ اور امیر سے بہت جلد طبیعت سیر ہو گئی۔ اب انہوں نے میر اور غالب کی طرف رجوع کیا جن سے ان کو فطری مناسبت بھی تھی۔ دوسرے دور کے شروع میں فانی کے یہاں میر کا مہذب اور سنجیدہ سوز و گداز بہت زیادہ نمایاں ہے لیکن آگے چل کر یہ سوز و گداز غالب کی حکیمانہ بالغ نظری اور مفکرانہ درک و بصیرت کے ساتھ حل ہو کر ایک بالکل نیا مرکب بن گیا جس کی مثال فانی سے پہلے اردو غزل میں نہیں ملتی۔

نقوش و افکار — مجنوں گورکھپوری

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

فانی ایک تاثر

داغ متقدمین میں اردو غزل کی آخری شمع تھے جس سے ہماری غزل کسب نور ہو رہی تھی۔ اور داغ کے بعد بظاہر گیسوئے غزل کو سنوارنے والے کم دکھائی دیتے تھے۔ حالی کی تحریک کے تحت نظم اپنی ساری توانائی اور جوش کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ نظم کے اس دور کو زیادہ پائیدار بنانے کے لئے میں اقبال، چکبست، سرور، کیفی وغیرہ کا زیادہ حصہ تھا اور نظم کی عام مقبولیت کی وجہ سے صنفِ غزل میں ایک ٹھہراؤ، دھیما پن اور سست رفتاری کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اور قریب تھا کہ غزل کا وہ چراغ جس نے عرصہ ہائے دراز سے اردو شاعری کے آسمان کو منور رکھا اور ولی اور میر سے لے کر داغ و امیر تک خواص و عوام کے دل و دماغ پر اپنا اثر جمائے رکھا، دم توڑتے جہاں آباد کے آخری شاعر کی خموشی کے بعد کتاب دل کی مفسرین اور خوابِ جوانی کی تعبیریں کرنے والے فکر نکتہ آرار کے فلک پیمائیاں اور تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کرانے والوں سے دل مایوس ہو چکے تھے کہ ؎

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ دل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

زمانے نے جوابًا شعر کے بت خانہ سے جن آذروں کو پیدا کیا، اور جن ساقیوں نے نئے پیمانے سے پلائی، ان میں فانی اپنی گوں ناگوں خصوصیات کی وجہ سے ایک عظیم غزل گو کی حیثیت سے سامنے آئے۔

اردو غزل کو میر سے لے کر داغ تک جو مختلف تیور ملے، ان میں اس شاعر کی شخصیت اور مزاج کو اور اس کے ماحول کو بڑا دخل رہا ہے۔ فانی نے جب آنکھیں کھولیں اور جب ان کا شاعرانہ شعور پختہ ہوا تو انیسویں صدی کا آخری زمانہ تھا۔ اور آغاز بیسویں صدی اپنی تمام تر جولانیوں اور عہد وکٹوریہ کی شاندار رسومات اور زہر آلود فضائے صنعتی، نہا بھی تہذیب کو آگے بڑھا رہا تھا، اور تام نہاد مروجہ تہذیب اور اس کی پرانی اقدار کا کار گرشیشہ گراں متزلزل ہو رہا تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شکست خوردگی کے جو آثار پیدا ہو گئے تھے اب آہستہ آہستہ دب چکے تھے۔ قومی تحریکات اور معاشرتی اصلاحات کا دور شروع ہو چکا تھا اور اب ہم نے مغربی افکار اور علوم کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے اصلاح کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

مندرجہ بالا سیاسی و معاشرتی ماحول نے فانی کے ذہن و فکر کی پرورش کی ہے ظاہر ہے کہ ان حالات کا اثر ان کے مزاج میں رچ بس گیا۔ اور ان کی زندگی کے وہ ناخوشگوار حالات جو ایک حد تک خود انہیں کے پیدا کردہ تھے ان کی قنوطیت اور غم پسندی کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ابتدا میں فانی نے داغ اور امیر کے رنگ کو نباہنے کی کوشش کی۔ مگر فانی کو جس قسم کا مزاج ملا تھا اس مزاج کے تحت امیر و داغ کے رنگ کو فروغ دینا مشکل تھا۔ چونکہ فانی کا مزاج میر و غالب کے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ ظاہر ہے ان کا اثر قبول کرنا فانی کے لئے ناگزیر ہو گیا۔ چاہے یہ تقلید ہو چاہے غیر شعوری۔ حسرت کے بعد فانی ہی وہ جامع و باوقار شخصیت ہے جس نے غزل کو حیاتِ نَو بخشنے میں پوری سعی کی اور اسے اپنے مخصوص انداز اور معنی میں فلسفیانہ رنگ عطا کیا۔ حسرت نے نسیم و مومن کی پیروی میں جس قدیم رنگ کو نکھار کر حسن تغزل اور نشاطیہ عنصر کو استحکام عطا کیا۔ اسی کے ہم عصر فانی نے میر و غالب کے فلسفہ کو گہرائی اور گیرائی عطا کرنے کی کوشش کی اور اس رنگ کو جو غالب اور میر کے کلام کی خصوصیت ہے، رواج دینے کی سعی بلیغ کی۔ جہاں انہوں نے میر و غالب کے رنگ میں ڈوب کر شعر کہے ہیں وہیں پر مومن کی بلند خیالی اور داغ و امیر کی شوخ نگاری پر بھی اپنے ابتدائی زمانہ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس سلسلہ میں چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کر بدلے ؎ ہے کفن گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے ؎ حیا سے آڑ کے خنجر کے منہ چھپائے ہوئے
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی ؎ تم کیوں لئے گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب

فانی کے یہاں مومن کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ مومن اپنی بلند خیالی اور تراکیب کی تراش خراش کے لئے ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کا محبوب بازاری سہی مگر ان کا عشق بازاری نہیں۔ اس میں وہی خودداری ہے جو مومن کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ فانی کے یہاں بھی مومن کی اس بلند خیالی کے نمونے مل جاتے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ مومن اپنی معنی آفرینی میں اکثر اوقات مفہوم کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ فانی اور مومن دونوں کو تراکیب کی تراش خراش سے دلچسپی ہے مگر مومن کی تراکیب میں جو مشکل پسندی اور پیچیدگی ہوتی ہے وہ فانی کے یہاں نہیں ملتی۔ مومن کے یہاں شاید ہی کوئی شعر عام فہم ہو۔ اس کے برعکس فانی کے یہاں بلند خیالی اور معنی آفرینی کے ساتھ سہل اور آسان تراکیب کے اشعار مل جاتے ہیں۔

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا + ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

یہ بھی ایک التفات ہے ورنہ + دعوتِ نالہ ہائے پیہم کیا

مومن اپنی تراکیب اور ندرت کے لئے جہاں مشہور ہیں وہیں پر مقطع بھی ہر شخص کی زباں زد ہے۔ یہی خصوصیت فانی کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔

خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں

کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا

آج روزِ وصالِ فانی ہے ؛ موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

کس کی کشتی تہہ گردابِ فنا جا پہنچی

شورِ لبیک جو فانی لبِ ساحل سے اٹھا

مومن اور داغ و امیر کے بعد جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں فانی پر سب سے گہرا رنگ میر و غالب کا ہے۔ میر نے اردو شاعری کو حسن یاس و حرماں نصیبی غم پسندی اور قنوطیت سے متعارف کرایا ہے اس روایت کو فانی نے اپنی بساط اور مزاج کے مطابق آگے بڑھانے کی کوشش کی اور میر و ظفر کے بعد اردو غزل کو "ابدی نغمے" عطا کئے۔ دونوں کی شخصیت کی تعمیر ایک ہی انداز میں ہوئی اور جن حالات سے میر کو گزرنا پڑا قریب قریب اسی قسم کے واقعات سے فانی کی زندگی کو بھی دوچار ہونا پڑا۔ میر کو ساکنان اکبر آباد کی بے مہریوں کی شکایت رہی تو فانی کو اپنے اہلِ وطن کے عناد سے شکایت، ایک کو معاشی تنگی اور عسرت نے آگرہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو دوسرے کو حالات نے حیدرآباد کی سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجتاً نہ میر کو دلّی میں چین نصیب ہوا نہ فانی کو حیدرآباد میں سکون قلب میسّر آیا۔ خودداری دونوں کی طبیعت کا مزاج اور وضعداری دونوں کی عادت ظاہر ہے ان حالات میں اگر دونوں کے مزاج اور تصورات میں ہم آہنگی نہ ہوگی تو کب ہوگی؟

میر کے یہاں جو غم پسندی، آہ و فغاں، محرومی و ناکامی۔ ایک کسک ایک تڑپ جو کچھ ہے وہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ساری کیفیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ چند اشعار ؎

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ہر صبح غموں میں شام کی میں نے

خونابہ کشی مدام کی میں نے

یہ مہلت کم جس کو کہتے ہیں عمر

مر مر کے غرض تمام کی میں نے

فانی کی زندگی بھی درد کسک، سوز و گداز اور حرماں نصیبی سے عبارت ہے۔ یہی نہیں بلکہ میر کے غم نے فانی کے یہاں شدت اختیار کی ہے اور اسی شدت نے فانی کو ایک منفرد جگہ دے کر اس کی آواز اور اس کے غم کو منفرد غم بنا دیا ہے۔ جگر کا مشہور شعر ہے ؎

دل گیا رونقِ حیات گئی

غم گیا ساری کائنات گئی

فانی نے بھی غم کو کائنات بنا لیا تھا اور اسے چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے غم میں وہ انشاطیہ عنصر نہیں ہے جو میر کے غم کی خصوصیت ہے۔ اس میں نالہ و شیون اور رونا بسورنا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رو کر اپنے غم کی آنچ کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکثر موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس میں حسن اور تخلیق کی جستجو کرتے ہوئے موت کی خوشی میں زندگی کے غم کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میر کا شعر ہے

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے

عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

تھا جسم کا ترک اوّلِ ایام میں پیری کے

جاتا تھا چلا ہر دم جامہ بھی پرانا تھا

فانی بھی موت کو زنجیر بدلنے سے تعبیر کرتے ہیں ؎

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات

مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

شعرائے متقدمین کے یہاں بھی موت کا آرزومندانہ انتظار، غم کی کثرت اور محض غم ہی غم کا ہو رہنے کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ لیکن غم کے جن تیوروں سے فانی نے اردو غزل کو روشناس کرایا ہے وہ فانی کا اپنا کارنامہ ہے۔ بقول مجنوں اس نے اپنی شاعری میں کلبیت پیدا ہونے نہیں

دیتا ہے نہ مرثبت، ہم فانی کو محض گورستانی مدرسہ کا شاعر نہیں کہہ سکتے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری دبستانِ عزیز سے بالکل الگ چیز ہو گئی ہے۔ فانی کے یہاں موت ایک حقیقت ہے اور غم ایک قوت اور دونوں یکسر خیر و برکت ہیں۔"

فانی کے فلسفۂ غم اور زندگی میں ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے وہ موت اور زندگی میں کچھ زیادہ فرق قائم نہیں رکھتے۔ فانی کے لئے موت زندگی ہے اور زندگی موت۔ وہ موت کو تخلیق کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ اس میں انہیں تعمیر کی خوبی نظر آتی ہے، تخریب کی نہیں۔ اور اسی لئے وہ انسان کو زندگی کے روگ سے نجات دلاتی ہے۔ فانی کو موت میں وہ ساری دلفریبیاں اور دلربائیاں دکھائی دیتی ہیں جس کی تلاش و جستجو ایک عاشق اپنے محبوب کے خد و خال میں کرنا چاہتا ہے۔ موت کا رویہ شاعر سے ہمدردانہ ہو یا نہ ہو مگر ہمارا شاعر خود موت سے ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے۔ حسنِ ازل کی ساری دلکشی اسے موت کی صورت میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

اے اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کر دیا
مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روز کا بہانہ چاہا

مژدۂ جنت وصال ہے موت
زندگی محشرِ جدائی ہے

فانی کا غم زندگی کا غم نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش و جستجو کا غم ہے۔ جو ابھی انہیں کیا بہت سوں کو حاصل نہیں ہوئی تھی ؎

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرے ہیں اک جہانِ حقیقت لئے ہوئے

فانی کے مطالعے سے جس چیز کا اندازہ ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کا غم بلند انسانیت کی تلاش ہے وہ ان کی فطرت کا ایک جزو تھا اور جس کے نہ ملنے پر وہ پریشان و سرگرداں تھے۔ دنیا جس چیز کو پاکر مطمئن ہو جاتی ہے فانی اس میں دلچسپی و انبساط محسوس نہیں کرتے شاید اس لئے کہ بقول اقبال ؎ عالمِ سوز و سازمیں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

چنانچہ فانی کہتے ہیں ؎

عشق جہاں باعثِ نشاط نہیں ہے
خندۂ تصویر انبساط نہیں ہے

فانی عالم موجودات کی چیزوں سے سرسری گزر جانے کے قائل نہیں بلکہ ان اشیاء کی گہرائی میں جانے کے قائل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

یہ تو معلوم نہیں کیا ہے یہ دنیا لیکن
صرف صد رقص ہے صورت کدۂ جاناں کوئی

فانی غم روزگار کا حل تلاش کرنے کی ہمت تو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں لیکن جو غم انہیں لاعلاج معلوم ہو رہا ہے وہ "درد محبت" ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ دردِ لاعلاج محبت دوا بھی ہے
تھا ورنہ کچھ علاج غمِ روزگار کا

فانی کو جس چیز کی تلاش و فکر ہے اس کا حصول مر جانے سے ممکن نہیں ؎

یہ دردِ محبت غمِ دنیا تو نہیں ہے
ایک موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی

فانی کی شاعری میں میر کے بعد جس شاعر کے نقوش زیادہ ابھرے اور نمایاں نظر آتے ہیں وہ غالب ہیں۔ غالب کی نکتہ رسی اور تراکیب و تغزل و غم پسندی جو بالترتیب عرفی، بیدل، نظیری اور میر سے ورثہ میں ملی تھی۔ فانی کے یہاں بھی موجود ہے ؎

غالب :- عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فانی :- قطرہ قطرہ رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک
جو تابِ جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

غالب :- ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

فانی :- ہو مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیل گمرہیٔ چشم و گوش تھا

غالب :- ہو غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فانی :- تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل

کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

فانی کے یہاں اکثر تصوف کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ انہیں بھی تصوف میں

فارسی اور متعدد اردو شعراء کی طرح تصوف اور بالخصوص وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر اپنے اشعار میں اکثر اشارے کئے ہیں۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

ہزار ڈھونڈتے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

تیری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں
دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

وحدۃ الوجود کے مسئلے پر فانی کے چند اشعار سنئے ؎

اس عالم تصویر کو دیکھا تو یہ دیکھا
میری ہی نظر مجھ سے خود میری نظر میں

آئینہ و دل دونوں کہنے ہی کی باتیں تھیں
تیری ہی تجلی تھی اور تو ہی مقابل تھا

تصوف ہی کے سلسلے میں اتنا اور کہنے دیجئے کہ فانی جبر پر ایمان ہی نہیں رکھتے بلکہ اسے جبر ہی سے تعبیر کرتے ہیں اور قرب کو اختیار میں نہیں سمجھتے ؎

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

دعویٰ یہ ہے کہ دوریٔ معشوق ہے محال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں

انسان کے وجود اور عدم وجود کے سلسلہ میں فانی بھی ذوق کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ذوق کے اس شعر کو ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

فانی بھی انسان کو حقیر اور بے کس و مجبور تصور کرتے ہیں۔ ان کے لئے کائنات کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ذوق کے مندرجہ بالا خیال کو دیکھئے کس انداز میں فانی پیش کر رہے ہیں ؎

دنیا میں حالِ آمد و رفت بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

میرا خیال ہے کہ فانی کے یہاں جو قنوطیت اور یاس انگیزی ملتی ہے اس کی وجہ ان کے شخصی حالات اور ماحول کے ساتھ ہی ساتھ تصوف بھی ہے، بعض پر اقبال نے سخت اعتراض کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فانی کے یہاں جہد مسلسل، عمل اور حرکت اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ دکھائی نہیں دیتا۔

فانی کے یہاں اثر آفرینی اور محاکات کے بے شمار نمونے مل جاتے ہیں۔ غم اور یاس انگیزی کے باوجود فانی کے یہاں جو اثر آفرینی اور سحر کی جو کیفیت ہے وہ ہمیں فانی سے دور ہونے کی بجائے قریب کر دیتی ہے۔ کیفیت پیدا کرنا بہت مشکل کام، فانی کو کیفیت پیدا کرنے میں خوب دسترس حاصل ہے۔ مندرجہ ذیل غزل محاکات، تغزل و شعریت اور اثر آفرینی کی بہترین مثال ہے:

مآلِ سوزِ غمِ ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

چلے بھی آؤ، وہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

غرورِ حسن کے صدقے کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدارِ میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

فانی کی ایک اور غزل سنتے چلئے جو اردو کی بہترین غزلوں میں سے ہے،

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیئے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

"فصلِ گل آئی" والا شعر بار بار پڑھئے۔ اس کی بلاغت اور طلسمی کا لطف اٹھائیے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقاش نے اپنے موقلم کی خفیف سی جنبش سے جہاں معنی پیدا کر دیا ہے۔ کچھ باتیں کہی گئی ہیں اور کچھ دیدہ دانستہ نہیں کہی گئی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں لطافت زیادہ ہے یا ان میں جو ان کہی چھوڑ دی گئیں۔

(باقی صفحہ پر)

رشید الدین

فانی کی شخصیت - ایک تجزیہ

فانی کا شمار اردو کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے غزل کی صنف کا انتخاب کیا تھا جو بلاشبہ ایک محدود اور مختصر صنف ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس میں ایسے شعر کہے جو یادگار بن گئے۔ ان سے پہلے اردو کے بے شمار غزل گو شعراء گذر چکے تھے لیکن اس جمگھٹ میں انہوں نے اپنا بھی ایک مقام متعین کر لیا۔ دراصل وہ جس قسم کی شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے وہ غزل کے لیے ہی زیادہ موزوں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غالب کی طرح غزل میں تنگیٔ داماں کی شکایت نہیں کی۔ فانی کا موضوع غم تھا اور اس کی کھپت اردو شاعری میں غزل سے زیادہ ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس صنف میں فانی نے بعض بڑے معرکے کے شعر کہہ ڈالے ہیں۔ اور جنہیں پڑھتے ہوئے ایک عام آدمی کچھ دیر کے لیے لہک جاتا ہے حالانکہ وہ ان کے نظریۂ زندگی سے متفق نہیں ہوتا۔

فن میں تاثیر بڑی چیز ہے اور آپ کو یہ فانی کے کلام میں ملے گی ان سے پہلے اردو کے بڑے باکمال اور عروض و بحر کے ماہر شاعر گذرے ہیں لیکن ان کے پاس وہ تاثیر نہیں جو فانی کے حصہ میں آئی۔ اس کی وجہ اگر آپ غور کریں تو ان کا موضوع معلوم ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خوشی انسان کو اتنی سرشاری عطا نہیں کرتی جتنی سرشاری اسے غم سے حاصل ہوتی ہے انسان لاکھ ہنسے بولے اور باتیں بنائے لیکن جب تک وہ خاموش نہیں رہے گا اس کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ فانی کے کلام میں تاثیر کی وجہ یہی ہے اور اسی لیے برنارڈ شا نے کہا ہے کہ دنیا کا عظیم ادب کامیڈی نہیں ٹریجڈی ہے۔

فن شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی بھی فنکار کے فن سے آپ اس کی شخصیت کو الگ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں شخصیت نگاری اور سوانح کی ایک الگ اہمیت ہے اور اس میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے فانی کی غزلوں کے دھیمے لہجے اور نرم الفاظ کو دیکھ کر پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ آخر اس کا خالق کیسا ہوگا۔ کیا وہ اپنی زندگی میں بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ شاعری میں ہے یا اصغر مرحوم کا شعر ہے ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہیں

مطلب یہ کہ کسی فنکار کی شخصیت اس کے فن کی عکاس نہیں ہو سکتی۔ آپ ہر فنکار کو اس کی شخصیت میں نہیں کھوج سکتے بلکہ اسے فن ہی میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ بعض فنکار اپنی شخصیت کو خول میں اس طرح بند رکھتے ہیں کہ آپ کہیں سے اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی شخصیت کے کواڑ صرف اپنے ہی اوپر وا کرتا ہے۔ کوئی اور اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن بعض فنکار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے وہ جو کچھ بولتے ہیں جو کچھ لکھتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس میں ان کی شخصیت کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اس پس منظر میں اردو کے ایک اہم شاعر فانی کی شخصیت کا مطالعہ ایک قاری کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

فانی جیسا کہ ان کے نام کے آخری جز سے ظاہر ہے۔ بدایوں کے تھے۔ اترپردیش میں واقع یہ چھوٹا سا شہر جو کبھی کٹھیر کہلاتا تھا عہد مغلیہ میں بڑی سیاسی اہمیت کا حامل تھا۔ شروع سے ہی زبان و ادب کے معاملے میں ممتاز رہا ہے۔ اس شہر میں فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء میں ایک پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بڑوں نے ان کا نام شوکت علی خاں رکھا لیکن دنیا میں وہ فانی کے نام سے مشہور ہوئے جس کے معنی ہیں فنا ہو جانے والا۔ یہ تخلص انہوں نے بعد میں شعری ضرورت کے تحت رکھا تھا کیونکہ غزل میں اصل نام کے علاوہ ایک تخلص بھی ضروری ہوتا ہے وہ اپنا تخلص اپنے نام کی مناسبت سے شوکت بھی رکھ سکتے تھے، یا پھر کوئی اور تخلص اختیار کر سکتے تھے لیکن تخلص کے اس انتخاب سے ان کی اس افتاد طبع کا پتہ چلتا ہے جو بعد میں انہیں ایک غم پسند شاعر کی حیثیت سے ہم سے روشناس کراتی ہے۔

فانی پٹھان تھے لیکن ان میں پٹھانوں کی کوئی خو بو نہیں تھی۔ وہ نہ بہادر تھے اور نہ جیالے۔ انہیں بندوق چلانے، گھوڑے پر بیٹھنے، دریا میں تیرنے سے بچپن سے

کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں وہ غیور ضرور تھے اور یہ غیرت مندی جو انہیں اپنے خاندان سے ورثہ میں ملی تھی مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی۔ ان کے خاندان میں کوسوں تک شعر و شاعری یا کسی اور فنون لطیفہ کا کوئی گذر نہیں تھا۔ ان کے دادا ایک جاگیردار تھے اور والد محکمہ پولس میں ایک عہدہ دار۔ لیکن فانی کو نہ کبھی اپنے جاگیردار ہونے پر فخر رہا اور نہ پولس آفیسر کے بیٹے ہونے پر۔ ان کی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ آپنے آپ میں گم رہنے کی دنیا۔ ظاہر ہے پٹھان خاندان میں یہ کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جا سکتی اس لیے ہمیشہ وہ اپنے بزرگوں کے ناپسندیدہ رہے۔

ان کے خاندان میں ان کی شاعری کو بھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا اس لیے ابتدا میں انہوں نے چھپ چھپ کر شاعری کی اور ایک اچھی خاصی بیاض تیار کر لی۔ لیکن جب یہ بیاض ایک دن اتفاقاً ان کے والد کے ہاتھ لگ گئی تھی انہوں نے اسے نذر آتش کر دیا۔ اور بیٹے کو سخت تاکید کی کہ وہ آئندہ شاعری کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لائے لیکن فانی کے منہ سے لگی ہوئی یہ کافر شاعری چھوٹی نہیں۔ جب وہ میٹرک کامیاب کر کے علی گڈھ یونیورسٹی میں انٹر میں شریک کرائے گئے اور ہاسٹل میں رہنے لگے تو گویا انہیں شاعری کی کھلی چھوٹ مل گئی۔ علیگڈھ یونیورسٹی کی فضاء نے ایک نوجوان شاعر کی ذہنی جلا میں اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۰۱ء میں انہوں نے بی اے کامیاب کیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں روشن خیالی عام ہو رہی تھی۔ سرسید کا لگایا ہوا ننھا پودا علیگڈھ یونیورسٹی کی شکل میں ایک تناور درخت بن چکا تھا جس نے پھل بھی دینے شروع کر دیئے تھے ان ہی حالات میں فانی نے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھا۔ فانی کی زندگی میں ٹھہراؤ، رکھ رکھاؤ، سنجیدگی، تنہائی اور اداسی بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عمل کے میدان میں وہ مشکلات کا شکار ہو گئے۔ چند سال سرکاری ملازمت کی لیکن اس میں دل نہیں لگا۔ اس عرصے میں اپنی جس رشتہ دار لڑکی سے انہیں محبت تھی اس سے ان کی شادی نہ ہو سکی۔ بزرگوں نے دوسری جگہ شادی کر دی۔ فانی کی بیوی کوئی ہوشیار اور سلیقہ مند عورت نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ بیوی سے انہیں ذہنی ہم آہنگی نہ مل سکی۔ چنانچہ انہوں نے ایل ایل بی کر کے وکالت کرنے کی ٹھانی اور ۱۹۰۸ء میں علی گڈھ یونیورسٹی ہی سے ڈگری لی۔ اس اثناء میں آبائی جائیداد سب فروخت ہو چکی تھی اس لیے لکھنؤ میں پریکٹس کرنے کی سوچی۔ لیکن وکالت فانی جیسے آدمی کے بس کا روگ نہیں تھی اس لیے اس میں بھی ناکام رہے ان ہی دنوں انہوں نے اپنا یہ مشہور شعر کہا تھا ؎

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

۱۹۲۳ء میں وہ مجبوراً لکھنؤ چھوڑ کر آگرہ چلے گئے لیکن یہاں دس برس گذارنے کے باوجود ان کی وکالت نہیں جم سکی اور ۱۹۳۲ء میں وہ نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان کے بڑے فرزند اعظم جاہ بہادر کے بلانے پر حیدرآباد آگئے اور اس طرح وکالت کے ناموزوں پیشہ سے ان کا پیچھا چھوٹا لیکن درباداری بھی کچھ ان کے لیے موزوں نہیں تھی جس سے انہیں حیدرآباد میں سابقہ پڑا پھر اس زمانے میں حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی کا قضیہ شروع ہو چکا تھا۔ شمالی ہند والوں کو غیر اور غاصب سمجھا جانے لگا۔ فانی جیسے حساس آدمی کے لیے یہ ایک تکلیف دہ امر تھا۔ حیدرآباد میں اس زمانے میں شمالی ہند والوں کو ہندستانی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ اس تکلیف دہ حقیقت کا اظہار فانی نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

اعظم جاہ کے بعد فانی مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار سے بھی وابستہ رہے لیکن وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے اس لیے ان لوگوں نے بہ عزت کہہ کر انہیں محکمہ تعلیمات میں ملازم رکھوا دیا اور وہ ناندیڑ میں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنا دیئے گئے۔ لیکن ناندیڑ میں ان کا دل نہیں لگا۔ اور وہ رخصت لے کر حیدرآباد آ کر بیٹھ گئے۔ بعد میں انہیں حیدرآباد سے بلا لیا گیا۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران ہی ان کی اکلوتی اور جوان لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ فانی اسے بہت چاہتے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ایسا دردناک شعر کہا تھا ؎

اپنے مظلوم پہ اتمام کرم یارب کر
در و دیوار دیئے اب انہیں ویرانی دے

فانی کے دو لڑکے بھی تھے لیکن انہوں نے پڑھا لکھا کچھ بھی نہیں اور نہ کوئی ڈھنگ کی زندگی گزاری ان کے ایک فرزند کو ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد میں میں نے بھی دیکھا تھا۔ علامہ حیرت بدایونی مرحوم کے پاس آیا کرتے تھے ان کے بچے انہیں فیروز بھائی فیروز کہا کرتے تھے۔ یوپی کے کچھ خاندان باری باری سے کھانا دے دیا کرتے تھے اور اس طرح ان کی گذر ہوتی تھی۔ فانی کو محکمہ تعلیمات سے وظیفہ ہو گیا تھا اور وظیفہ کے کچھ دن بعد ہی ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح وہ موت کی آرزو عمر بھر کرتے رہے۔ بالآخر وہ انہیں مل گئی۔ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ درگاہ یوسفین میں داغ اور امیر مینائی کے قریب جگہ ملی۔ جہاں بعد میں علامہ حیرت بدایونی بھی آسودہ خاک ہوئے۔

یہ تھی اس شاعر کی زندگی جسے دنیائے اردو فانی کے نام سے جانتی ہے اور جو اس شعر کا خالق تھا ؎

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

اگر فانی کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے زیادہ غم پسند تھے یا انہوں نے اپنے کو ایسا بنا لیا تھا کہ ایک نارمل انسان نہیں رہے تھے۔

انہیں خوشی سے نفرت اور غم سے رغبت ہو گئی تھی۔ یہ رباعی ملاحظہ فرمایئے ؎

دہر میں ہم ہاتھ آئے کھو دیتا ہوں
ساحل پہ سفینہ کو ڈبو دیتا ہوں
فانی میں غم آشنا ہوں ایسا کہ یہاں
سامان خوشی دیکھ کے رو دیتا ہوں

لوگ غم نشاں موت کو بھول کر گلفشاں زندگی کی بات کرتے ہیں لیکن فانی کو موت کے ذکر ہی میں لذت ملتی تھی ؎

فانی کو نہ زندگی میں راس آیا کچھ
آئی بھی تو اک موت ہی راس آئی

فانی ایک مسلمان تھے لیکن ان کا فلسفہ زندگی اسلام سے مطابقت نہیں رکھتی اس سلسلہ میں وہ بدھ مت سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے اور جب تک تم زندہ رہوگے یہ دکھ تمہیں جھیلنے ہوں گے۔ فانی کا بھی کچھ یہی خیال تھا ؎

زندگی یاد دوست ہے یعنی
زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

علامہ حیرت بدایونی مرحوم کہا کرتے تھے کہ فانی کو پریشانیوں میں لطف آتا تھا جو کچھ انہیں ملتا خرچ کر ڈالتے اور پھر محتاج ہو کر بیٹھ جاتے۔ ایک بار مہاراجہ کشن پرشاد نے انہیں ایک قیمتی موتیوں کا ہار دیا۔ اسے اونے پونے بیچ کر تین چار روز میں سب پیسہ خرچ کر دیا اور پھر قلاش ہو کر بیٹھ گئے۔ اپنے آخری ایام میں موت کی اس طرح حسرت کرتے جس طرح کوئی لب گور مریض زندگی کی حسرت کرتا ہے۔ ہر بار حیرت صاحب سے کہتے تھے کہ بھئی اب ہم اس دنیا میں زیادہ دن نہیں رہیں گے اس پر حیرت صاحب کہتے تو یہ کہیئے فانی صاحب کوئی اور بات کیجئے۔ مریں آپ کے دشمن۔ لیکن وہ ہیر پھیر کر وہی موت کا موضوع لے آتے۔

فانی کی زندگی کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع سے آخر تک انہوں نے ایک ناکام زندگی گزاری۔ یہ نہیں کہ انہوں نے کسی چیز کی خواہش نہیں کی۔ لیکن انہوں نے جو چاہا وہ انہیں نہیں ملا۔ انہوں نے عشق بھی کیا لیکن اس میں بھی ناکام رہے طوائفوں کے پیچھے بھی پھرے اور رسوائی مول لی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے تحقیقی مقالے فانی بدایونی۔ حیات اور ادبی خدمات میں ان کے مغنی سے کئی معاشقوں کے تذکرے تحریر کئے ہیں۔ ان حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ فانی ایک نفسیاتی مریض تھے جنہوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ دنیا کو جینے کا نہیں بلکہ مرنے کا درس دیا ہے۔ وہ بیمار غم تھے اور غم میں نشاط کا پہلو تلاش کرتے تھے لیکن لیکن اس میں فانی سے زیادہ خود ہمارے معاشرہ اور طرز زندگی کا قصور تھا۔ ہمارے ملک میں شاعر سے وکالت کرائی جاتی ہے۔ ادیب سے کلرکی کرائی جاتی ہے۔ مصور سے دربارداری کرائی جاتی ہے اور مغنی سے لیبر چلوائی جاتی ہے۔ جب ایسے بعد المشرقین پیشے فنکار اختیار کریں گے تو آپ ان سے کس طرح یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ زندگی سے بھرپور فن ہمیں دیں گے آج کے اس سیمینار میں دانشوروں کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔



اردو میں لسانیاتی تحقیق

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہے۔ یہ ہند آریائی علاقے سے باہر دراوڑی علاقے میں بھی یکساں طور پر بول چال کی زبان ہے۔ اردو کی اس ہندوستان گیر حیثیت کی وجہ سے اس کے مسائل بھی بے شمار ہیں۔ صحتِ زبان اور معیار کے مسائل کی بنیادی وجہ اس کی وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ اردو اس لحاظ سے بہت بدقسمت زبان ہے کہ اس قدر وسعت، پھیلاؤ اور علمیت رکھنے کے باوجود اس پر علمی اعتبار سے تسلی بخش کام ابھی نہیں ہو پایا ہے۔ اردو کا توضیحی مطالعہ، اردو کی مختلف بولیوں کے جائزے اور اسی قسم کے دیگر لسانی موضوعات پر لسانی تحقیقیں چند مضامین سے آگے نہ بڑھ سکی۔

پچھلے دو دہوں میں لسانیات نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یورپ کی زبانوں سے مقابلہ بے سود ہے اردو ابھی لسانیاتی تحقیق اور علمی بصیرت کے لحاظ سے ہندوستان کی دیگر زبانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جدید دور میں علم زبان نے تاریخی لسانیات کی سرحدوں سے باہر قدم رکھ کر فلسفۂ ریاضی کی اعلیٰ منزلوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان منزلوں تک پہنچنے کے معنی یہ ہیں کہ زبان علمی وقار اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی بنیادیں مستحکم کر رہی ہے۔

خواجہ عبدالغفور

فانی - ایک یاد

حضرات آپ نے ڈاکٹر اسحٰق جم خانہ والا صدر اردو اکادمی کا افتتاحی خطبہ سماعت فرمایا۔ دیگر مقالہ نگار اور مقررین نے حضرت فانی کی فکر ان کے اسلوب بیان ان کے طبعی قنوطیت پسندانہ جواہر پاروں پر فکر انگیز تقریریں کیں ان کے کلام کے بے شمار حوالوں سے فانی کے کلام کی عظمت کو سینچا اور سنوارا۔ اب میں اپنے ذاتی معلومات اور مشاہدوں کی بناء پر اپنی رائے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

فانی بدایونی کی شاعری کا اسلوب اور رنگ سب ہی غم واندوہ کے محور پر قائم دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے غم کے تصور کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے اور لگتا ہے کہ وہ خود ہی لذت غم کے جویا رہے حتیٰ کہ ہنسی خوشی بھی ان کے ذہن کی اپج میں ان کو غم کے پردہ دار دکھتے رہے ان کا شعر ملاحظہ فرمائیے :

ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے
گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے

اس موضوع پر جوش کا ایک شعر پیش خدمت ہے۔

تبسم ایک بڑی دولت ہے میں بھی اس کا قائل ہوں
مگر یہ آنسوؤں کا ایک شیریں نام ہے ساقی

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ظریف، مسخرہ، ہنسوڑ طنز واستہزاء کے وار کرنے والا لوگوں کو ہنسانے والا اندرونی طور پر ایک غم زدہ شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور اس کی بذلہ سنجی اس کی پردہ دار ہوتی ہے اور اسی میں وہ راہ فرار پاتا ہے تو کیا یہ بھی ایک اصولی بات ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو رُلانے والا اپنے اندر ایک خوش وخرم انفرادیت رکھتا ہے؟

ہمیں فانی کی شاعری کو دیکھ کر یہ لگتا ہے یہ خود ان کی اندوہناک زندگی کی چلتی پھرتی تصویر ہے جس میں انہوں نے خونیں رنگ بھرے ہیں۔

مہاتما گوتم بدھ نے بھی اپنے فلسفے میں خوشی نشاط اور آنند کو کرب معکوس بتایا ہے۔

فلابیر فرانسیسی ناولسٹ لکھتا ہے۔ "ہر مسکراہٹ کی اوٹ میں ایک آنسو چھپا بیٹھا رہتا ہے جاری طرح جن حیدرآبادیوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے" بخوبی جانتے ہیں کہ فانی باوجود ایک عظیم شاعر ہونے کے اپنے ابتدائی دور میں حیدرآباد کے ایک اسکول کے صدر مدرس تھے۔ پھر ضلع کے کسی مدرسہ پر ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔" یہ طویل چھٹی لے کر" شہر حیدرآباد کے محلہ پلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے لیکن ریاست حیدرآباد کے شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع اور وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کی ادب نواز نظر عنایت نے ان کو سوسائٹی میں خاصا اونچا مقام عطا فرمایا یہ وہ دور تھا کہ ہز ایگزالٹڈ ہائینس ایچ ای ایچ دی نظام نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع والئ قلمرو دکن خود ایک باوقار بلند پایہ شاعر اور علم دوست ہونے کی وجہ سے نواب فصاحت جنگ جلیل، جوش بلگرامی جوش ملیح آبادی وغیرہ وغیرہ جیسے شعرائے کرام کی سرپرستی کی اور انہیں شعری ادب میں اعلیٰ ترین مقام نصیب ہوئے۔

لیکن یہ علمی وادبی ماحول مصاحبی یا درباری تک محدود رہا بلکہ ان شاعروں نے خود اپنا دربار سجایا اور اردو کی خدمت کی۔

یہ فانی کی بدقسمتی تھی کہ وہ فطری رجحان اور اپنی طبیعت کے میلان کی وجہ سے اعلیٰ سوسائٹی میں رہتے ہوئے بھی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ اپنے مقام کی مناسبت سے انہوں نے موٹر بھی رکھی وہ آتی جاتی اور فرسودہ تھی کہ ان کے لیے موٹر اور موٹر ڈرائیور دونوں بھی وبال جان ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے کئی بار از خود یہ کہا ___" دوسرے تو موٹر پر سواری کرتے ہیں لیکن موٹر مجھ پر سوار رہتی ہے۔" شاید اسی بارے وہ اپنی حیثیت سے زیادہ زیر بار رہا کیے۔ دربار میں رات کی محفل شعر وسخن اور بے ترتیب زندگی نے ان کی صحت کو بھی متاثر کیا اور خانگی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔

بذات خود وہ بڑے شریف، مہذب پرخلوص دوستی کا دم بھرنے والے وسیع الاخلاق مروّت کے حامی تھے اور اسی وجہ سے وہ کسی نہ کسی مصیبت سے

نہ کا، رہا سکے۔ اکثر ساتھی شعراء سے ان کی چشمک تھی لیکن یہ کبھی پلٹ کر جواب دیتے نہ برا مانتے چنانچہ جوش ملیح آبادی نے اپنے مزاحیہ موڈ میں ایک مرتبہ ان پر "شاعر کی بیوہ" ہونے کی پھبتی کسی تھی۔ فانی دبی زبان سے شکایت کرتے لیکن انداز بیان شکوہ شکایت کا کبھی نہ ہوتا بلکہ ہلکا سا احتجاج ہوتا۔

ان کی ہنسی بھی غمگین اور مسکراہٹ غم آگیں ہوتی اور غم واندوہ ان کی دانست میں جمالیاتی قدروں کے حامل تھے۔

یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ شاعری کے میدان میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کر لینے اور ادبی ماحول میں وقار اور عزت کے حامل ہونے کے باوجود ان کی زندگی ابتدا سے کم یاس و نامرادی سے زیادہ بھرپور تھی۔ انہوں نے شرافت، ثقافت اور تہذیب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ زندگی کے نفیس لوازمات اور شائستگی کو پس پشت ڈالا نہ نظر انداز کیا۔ ان کی فطری شرافت کی دلیل یہ ہے کہ رندی، لاابالی پن یا کثافت کو اپنی شاعری میں کبھی جگہ نہ دی ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے کہ جس سے ان کا تفکر اور مسلک روشن ہوتے ہیں۔

وحشت بقید چاک گریباں روا نہیں
دیوانہ تھا جو معتقد اہل ہوش تھا۔

ان کی تنگی اور نامرادی کا ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے کہ شہزادہ معظم جاہ بہادر اور مہاراجہ کشن پرشاد کی نظر عنایت و کرم ہائے بے دریغ کے باوجود جب کوئی مناسب نوکری نہ مل سکی تو ان کے بہی خواہوں نے کوشش کی کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر ہو جائیں تاکہ اعلیٰ سطح پر شعر و سخن فہمی کا اچھا مزاج پیدا ہو۔ چنانچہ یونیورسٹی کے چانسلر قاضی محمد حسین سے ان کا تعارف کروا کر انٹرویو مقرر کیا گیا کہ وہ ان کی اہلیت کو بطور خود جانچ لیں۔ وائس چانسلر عالمگیر شہرت کے حامل ریاضی کے ماہر تھے اور عام فہم اور سوجھ بوجھ کے معاملے میں کورے تھے۔ سنئے بھی کم تھے اور اپنے مضمون کے غائب دماغ پروفیسر کی زندہ مثال تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے دفتر میں کسی کام سے ان کی انگریز بیوی وارد ہوئیں تو یہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا نشست کے لیے کرسی پیش کی اور تکلف کے ساتھ دریافت کیا "کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں اور میرے لیے کیا حکم ہے؟"

اس خاص موقع پر فانی سے جو گفتگو ہوئی اس کا لب لباب یہ تھا کہ آپ نے کیا ریسرچ کیا ہے کوئی ایجاد؟ جب فانی نے یہ بتایا کہ وہ شاعر ہیں شعر و ادب میں نام کمایا ہے غزلیں لکھتے ہیں۔ اور ریسرچ تو کچھ نہیں کیا تو وائس چانسلر نے پہلو بدل کر پوچھا کہ یہ فانی کیا تخلص ہے؟ بہرحال شعر و شاعری سے بے بہرہ محقق ریاضی کے ماہر اور ایڈمنسٹریشن میں کمزور وائس چانسلر نے ان کی قدر نہیں کی اور یہ زندگی بھر محروم رہے۔ افسوس ہے کہ اپنے لافانی فن اور خود باکمال ہونے کے باوجود زندگی میں ان کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی اور شاید یہی ہر حساس اور باشعور آدمی کے ساتھ ہوتا آیا ہے گو وہ فانی تھے ان کا تخلص فانی تھا لیکن ان کی شاعری فانی نہیں۔ ان کے دیوان کا نام "باقیات فانی" ہے اور اس کو بقائے دوام حاصل ہے۔

رگ رگ میں اب انداز بسمل نظر آتا ہے
ہر سانس کے پردے میں قاتل نظر آتا ہے
وہ وعدہ آسانی پر مائل نظر آتا ہے
اب کار تمنا بھی مشکل نظر آتا ہے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

جہاں انہوں نے مایوس نہ ہونے کی تلقین کی ہے وہیں پر ان کی عمیق نظری اور خیال کی گہرائی نے تہہ میں کنارا دیکھا ہے اس قسم کا فلسفہ ان کی شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے۔

اردو

اردو، اردو بولنے والوں کی ایک تہذیبی قدر بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اس زبان کا جنم مخصوص حالات میں ہوا ہے۔ یہ صدیوں کے تہذیبی عمل سے ڈھل کر نکلی ہے۔ اس زبان کی تشکیل میں رواداری، مفاہمت، لین دین کا جذبہ اور ہندوستانی قومیت کے خد و خال سب شامل ہیں۔ اردو ہماری ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کا شاہکار ہے۔ اس میں ہم صدیوں سے چاہ اور نباہ کرتے اور لڑتے جھگڑتے چلے آئے ہیں۔ اس میں ایک مخلوط زبان کی ساری توانائی، اظہار کی بے پناہ قوت، تکلف و آداب کی ساری وضاحتیں موجود ہیں۔ یہ ہماری ضرورت بھی ہے اس لئے کہ اس کے بغیر ہم گونگے، تو تلے اور ہکلے ہو جائیں گے۔

اردو زبان کا المیہ۔ مسعود حسین خان



۱۷ ستمبر:
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی ایک میٹنگ صوبیداری گیسٹ ہاؤس، اورنگ آباد میں منعقد ہوئی جس میں کئی ایک تجاویز پیش کی گئیں۔
غیر اردو داں حضرات کو اُردو سکھانے کے مختلف مراکز قائم کئے جائیں گے۔
اردو کتابت کا فن کئی وجوہات کی وجہ سے زوال پذیر ہے۔ لہٰذا ان حالات میں ضروری ہو گیا تھا کہ اردو اکادمی اس طرف خصوصی توجہ دیتی چنانچہ طے کیا گیا کہ اردو اکادمی کے مالی اشتراک سے کتابت کے مراکز قائم کئے جائیں۔
اردو کتب خانوں اور لائبریریوں کی زبوں حالی کے پیش نظر بورڈ نے ۵۰ کتب خانوں کو مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔
مسودوں کی اشاعت کے سلسلے میں اس سال ۴۰ ہزار کی رقم مختص کی گئی ہے اور ۸۹ مسودے موصول ہوئے جن پر جج حضرات کی رائے معلوم کی جائے گی اور رقم تقسیم کردی جائے گی۔
اراکین بورڈ نے نئی مسودے اور بچوں کے ادب کی کمی کی شکایت کی اور یہ طے کیا گیا کہ اردو اکادمی بطور خاص ایسی کتابوں پر توجہ دیگی اور خود شائع کرنے کی کوشش کرے گی۔
بورڈ نے اس سال جناب راجندر سنگھ بیدی کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں پانچ ہزار روپے پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔
اردو اکادمی مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کے لئے جدو جہد کرے گی۔

مشہور شاعر حسن نعیم کی بمبئی میں آمد کے موقع پر اردو اکادمی نے حسن نعیم کے ساتھ ایک تقریب کا اہتمام کیا جس کی صدارت جناب خواجہ عبدالغفور نے کی۔
جناب ظ۔ انصاری نے حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری پر مختصراً روشنی ڈالی اور جناب مجروح سلطانپوری نے حسن نعیم کی شاعری کی بعض خصوصیات پر اظہارِ خیال کیا۔
بعد ازاں حسن نعیم نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔



حسن نعیم کے ساتھ ایک نشست

حسن نعیم اپنے کلام سے سامعین کو نواز رہے ہیں ــــ جناب مجروح سلطانپوری، ظ انصاری
خواجہ عبدالغفور اور سلمٰی صدیقی شریک محفل ہیں۔ دوسری تصویر میں خواجہ عبدالغفور تقریر کرتے ہوئے



۲۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے چیئرمین اور حکومت مہاراشٹر کے وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ لیبر اوقاف و پروٹوکول نے اکیڈمی کے سہ ماہی مجلّے "نورس" کی رسم اجرا انجام دی۔ سہیادری گیسٹ ہاؤس (مالابار ہل بمبئی) میں اس تقریب میں نورس کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ یہ سہ ماہی مجلّہ اکادمی کی ایک ایسی کوشش ہے جو زبان و ادب کی خدمت انجام دے گا۔

ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب نے فرمایا کہ ویسے تو اس رسالے کو بہت پہلے شائع ہونا تھا لیکن چند وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ بہرحال جب سے میں نے بحیثیت چیئرمین اکادمی ذمہ داری سنبھالی مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ نورس کسی نہ کسی طرح اب ضرور شائع ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ جناب خواجہ عبدالغفور ممبر سکریٹری اردو اکادمی نے پرچے کی تکمیل اشاعت تک انتھک کوشش کی۔ اس کے علاوہ نورس کے مدیران و صلاح کاروں و معاونین کے تعاون سے بھی یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ سکا۔ امید ہے یہ کوشش پسند کی جائے گی۔

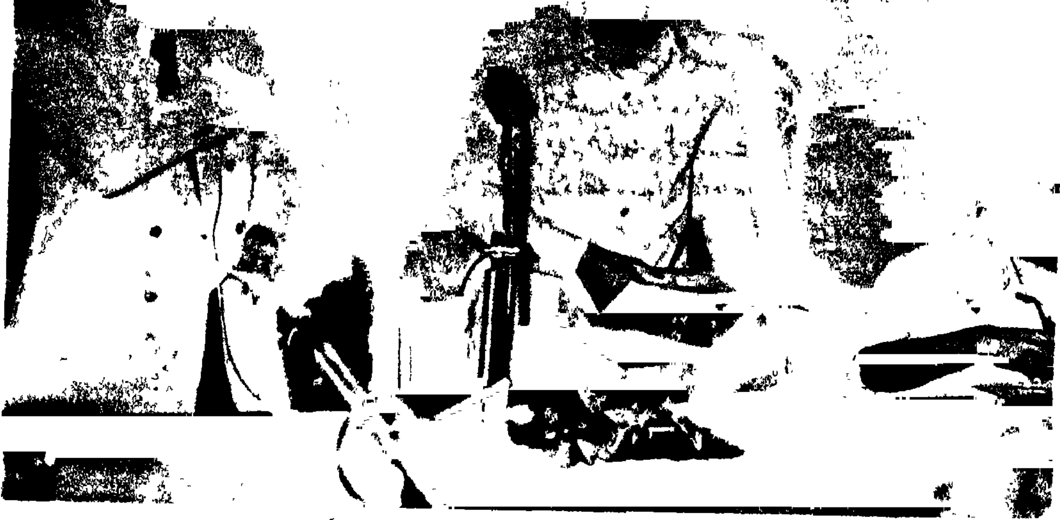
نورس کے مدیر اعلیٰ اور ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے چیئرمین و ممبران اکادمی اور شعرا، ادبا و صحافیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اکادمی نے اس جریدے کی اشاعت کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ ساری محنت رائیگاں جاتی اگر ہمیں چیئرمین ڈاکٹر اسحٰق صاحب کا بھرپور تعاون قدم قدم پہ نہ ملتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں دلچسپی لی۔

خواجہ صاحب نے حسن کمال، سلمیٰ صدیقی، فضیل جعفری، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ودیا دھر گوکھلے، عبدالسمیع بوبیرے اور شاہد ندیم کا تعارف و شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان تمام لوگوں کے تعاون سے یہ پرچہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے کامیاب رہا۔ آپ نے قلمکاروں سے معیاری تخلیقات نورس کو ارسال کرنے کی درخواست کی۔

نورس کے مدیر جناب حسن کمال نے کہا کہ ہم نے معیاری پرچہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ہم کہاں تک کامیاب رہیں یہ باذوق قاری ہی جان سکتے ہیں۔ ہماری آئندہ کوشش ہوگی کہ بہتر سے بہتر یعنی نقشِ اول سے نقشِ ثانی بہتر ثابت ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اچھے قلمکاروں کا تعاون ہمیں حاصل ہو۔

نورس کی رسم اجرا کی اس مختصر اور باوقار تقریب میں اکادمی کے اراکین کے علاوہ شعرا و ادبا و صحافیوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ آخیر میں چیئرمین اکادمی نے صحافی حضرات سے گفتگو کی۔ محترم ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب اور سکریٹری اردو اکادمی جناب خواجہ عبدالغفور نے فرمایا کہ اردو اکادمی کے لئے ۲۵ لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں جس میں سے آئندہ سال کے لئے سب سے زیادہ رقم آٹھ لاکھ روپے منظور ہوئی ہے۔ ہماری یہ پوری کوشش ہوگی کہ جو اسکیمیں فروغ اردو کے سلسلے میں ہم نے منظور کی ہے۔ اس کے علاوہ مزید اسکیموں کے ذریعہ اردو کا پھیلاؤ کیا جائے گا۔

وزیر موصوف نے فرمایا کہ اب تک اکادمی کے مستقر یا اردو سے دور علاقوں میں سیمینار ہوتے تھے لیکن اس سال یہ اردو علاقوں میں ہوں گے۔ موصوف نے اعلان کیا کہ اکادمی کا پہلا مشاعرہ الطیفی ہال بمبئی میں ہوگا اور سیمینار و مشاعرے اردو کے دیگر عوامی علاقوں میں ہوں گے۔ موصوف نے بمبئی یونیورسٹی میں اردو چیئر کے قیام کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ چانسلر اور



رسالہ نورس کی رسم اجراء : چیرمین اردو اکادیمی ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا
نورس کا اجراء فرما رہے ہیں ۔ تصویر میں اکادیمی کے ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور اور ستیو ما دھو راؤ
پگڑی بھی دیکھے جا سکتے ہیں ۔ دوسری تصویر میں خواجہ عبدالغفور ممبران سے خطاب کرتے ہوئے



وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی نے اسے منظور کر لیا ہے۔

سکریٹری اردو اکادمی جناب خواجہ عبدالغفور نے بتایا کہ بمبئی یونیورسٹی میں اردو چیئر کا قیام ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ پہلی مثال ہوگی کہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں اردو چیئر کا انتظام نہیں۔ اور بمبئی میں سو سال پہلے یہ چیئر قائم تھی۔ سو سال بعد تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ اردو کے دانش ور یونیورسٹی میں ارباب تحقیق کے لئے یہ چیئر ممد و معاون ثابت ہوگی۔ اردو چیئر کا قیام مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔

اس تقریب میں بتایا گیا کہ اس سال کا سب سے بڑا پانچ ہزار روپے کا ایوارڈ جناب راجندر سنگھ بیدی کو دیا گیا۔ یہ ایوارڈ بیدی صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک ہزار روپے کی مالی امداد شاعر، اظہار، فن و شخصیت اور ہم زبان ان ادبی پرچوں کو دی گئی۔

۲۴ر دسمبر ۱۹۷۹ء :

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام برلا کریڈا کیندر (چوپاٹی) کے خوبصورت حال میں اردو یک بابی ڈراموں کا دوسرا سالانہ فیسٹول منعقد ہوا۔ سال گذشتہ پہلی بار اس ضمن میں پیش رفت کی گئی تھی۔ اس سال کل دس ڈرامے پیش ہوئے۔ اردو ڈرامہ فیسٹیول میں اسکولوں کالجوں کے طلبا و طالبات نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس سے یہ امید گئی ہے کہ اکادمی کی اردو ڈراموں کو فروغ دینے کی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔

پروگرام کا آغاز شمع آرٹ انٹرنیشنل کے ڈرامے "کاغذ کے ٹکڑے" سے ہوا۔ ممی آرٹ نے "دو مردے" پیش کیا۔ کوہ نور آرٹس کا "پتھر بول اٹھے"، شاہین آرٹ اکیڈیمی کا "جو تری بزم سے نکلا"، شاہکار آرٹ کا "مہمان"، بسین اردو ایجوکیشن سوسائٹی کا "میں خونی ہوں"، شاہکار ڈرامہ ایسوسی ایشن کا "پورٹریٹ" اور آج کے کلاکار کا "کھیلتے کھیلتے" یہ تمام ڈرامے مقابلے میں پیش ہوئے۔

اردو اکادمی کے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے پہلے وقفہ کے دوران ڈرامہ فیسٹیول کی اہمیت اور اکادمی کی اس ضمن میں پیش رفت کا ذکر کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اچھے اردو یک بابی ڈرامے پیش کئے جائیں گے۔ خواجہ صاحب نے اپنی افتتاحی تقریر میں پروفیسر ایم کے شاذلی صاحب (ممبر اردو اکادمی) کی جانب سے مراٹھی کے مشہور مورخ پروفیسر این۔ آر۔ پاٹھک کے انتقال پر تجویز تعزیت کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا۔

فیسٹول کے دوسرے دن بھی بقیہ ڈرامے پیش ہوئے۔ دو روزہ فیسٹول کے جج حضرات بیگم اشیورا ج ماتھر، پروفیسر ایم کے شاذلی (ممبر اکیڈیمی) جناب ریاض احمد خان (مدیر قومی راج) اور جناب عبدالسمیع بوبیرے (مدیر صبح امید) تھے۔ دوسرے دن خواجہ صاحب نے جج حضرات کی محنت کا



ڈرامہ فیسٹول :

ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور حاضرین سے خطاب فرما رہے ہیں۔ دائیں سے بائیں۔ جناب بشیر نواز، صدیق عثمانی (مرحوم)، الیشوراج ماتھر اور بائیں طرف مسز ماتھر، ریاض احمد خان اور عبدالسمیع بوبیرے (جج صاحبان) دیکھے جا سکتے ہیں۔



ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور ڈراموں کے انعامی مقابلہ میں "پیلا سگوان" کے ہدایت کار کو پہلا انعام دے رہے ہیں

شکریہ ادا کیا اور ان کا تعارف کرایا۔ جج حضرات نے "پہلا بھگوان" اور "میں حق آگاہ" ان دو ڈراموں کو علی الترتیب پہلے اور دوسرے انعامات کا مستحق قرار دیا۔ اکادمی کے فیسٹول کے دوسرے روز مہاراشٹر حکومت کے ایڈیشنل ڈائرکٹر آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز جناب ایشورلج ماتھر مہمانِ خصوصی تھے۔ خواجہ عبدالغفور صاحب نے ماتھر صاحب سے درخواست کی کہ وہ طلباء کو انعامات سے نوازیں۔ ماتھر صاحب اور خواجہ صاحب نے مقابلے میں کامیاب ڈراموں پر انعامات دیئے۔ ترمیمی امداد بھی دی گئی۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ ڈرامے میں شامل ہونے والے تمام ڈراموں کو اکیڈیمی کی جانب سے حوصلہ افزائی کے طور پر سرٹیفکیٹ بھی دیئے گئے۔

اکادمی کے ممبر جناب بشر نواز نے مختصراً اردو ڈراموں سے متعلق کہا۔ جناب ایم اے عارف ممبر اکادمی نے آخر میں شکریہ ادا کیا۔ اکیڈیمی کے انڈر سکریٹری جناب صدیق عثمانی سپرنٹنڈنٹ اکادمی جناب عبدالعزیز کاپڑے۔ معاونین اکادمی جناب شاھد ندیم، جناب اسلم کرتپوری، جناب اقبال احمد، جناب امین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور انتظام و انصرام میں حصہ لیا۔

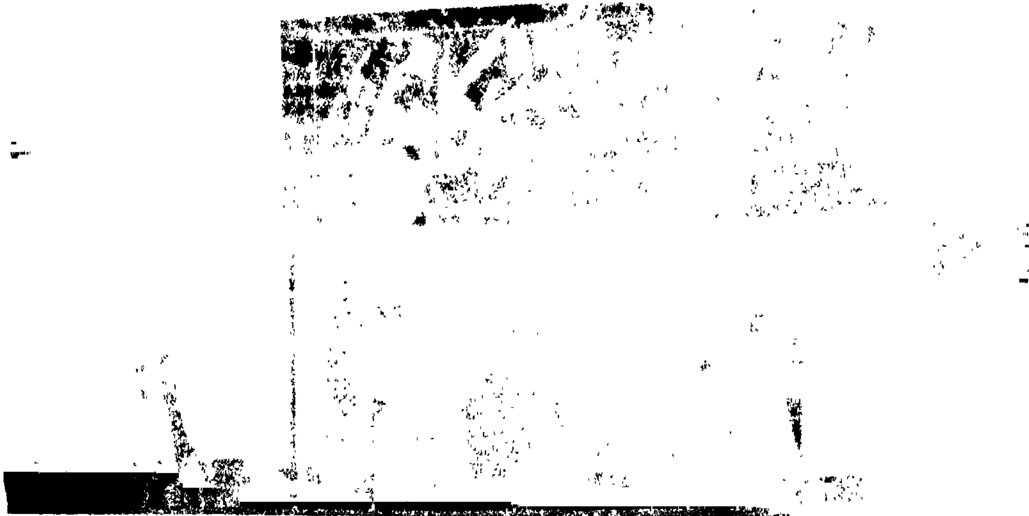
۱۲ جنوری ۱۹۸۰ء

منترالیہ کے خوبصورت آڈیٹوریم میں پریم چند پر سمینار اردو اکادمی کے زیر اہتمام اکادمی کے سکریٹری خواجہ عبدالغفور صاحب نے ادبی ہستیوں کا خیر مقدم کیا۔

چیئرمین ڈاکٹر جمنا نہ دالا صاحب نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ منشی پریم چند نے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور مشرقی اقدار کی عکاسی اپنی تخلیقات میں جس طرح کی ہے اس کی نظیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منشی پریم چند کی تخلیقات کو انفرادیت حاصل ہے۔

جناب خواجہ عبدالغفور نے کہا کہ ہم منشی پریم چند کی پیدائش کی صدی منا رہے ہیں۔ اکادمی کا یہ دو روزہ سیمینار منشی پریم چند جیسے عظیم افسانہ، ناول نگار کو خراجِ عقیدت کے طور پر پیش ہے۔ موصوف نے اس بات کا اعادہ کیا کہ اردو داں طبقہ اکادمی کی ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں تعاون کرے گا۔

علی سردار جعفری صاحب کی صدارت میں جناب آل احمد سرور، جناب باقر مہدی، اور جناب خواجہ احمد عباس نے مقالات پڑھے۔ بعد ازاں مباحثہ ہوا۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سردار جعفری، کالیداس گپتا رضا، باقر مہدی، فضیل جعفری، حسن کمال، سی ایل کاوش، ریاض احمد خان شہریار، محمود ایوبی، عبدالسمیع بوبیرے، ہارون رشید (علیگ) جاوید اختر، یوسف ناظم قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، معین الدین علا وغیرہ شریک رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بمبئی میں ہونے والے ایک ادبی سیمینار میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔



بمبئی میں منعقد پریم چند سیمینار کی ایک تصویر؛
جس میں ڈاکٹر قمر رئیس، آل احمد سرور۔ (صدر سیمینار) اور ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور دیکھے جا سکتے ہیں۔



حاضرین کا ایک منظر

دوسرے دن اسی موضوع پر سیمینار کا افتتاح اکادمی کے وائس چیرمین جناب وناتک راؤ پاٹل نے کیا۔ وزیر مملکت حکومت مہاراشٹر شری وناتک راؤ پاٹل نے سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد دی اور ادبا و شعراء سے اپیل کی کہ وہ اکادمی کی سرگرمیوں کو کامیاب بنانے میں مدد کریں۔

جناب آل احمد سرور کی صدارت میں ڈاکٹر قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی نے مقالات پڑھے۔ اس کے بعد مباحثہ ہوا۔ اس مباحثہ میں بیشتر حضرات نے حصّہ لیا۔ اس طرح دو روزہ پریم چند پر سیمینار بحسن و خوبی ختم ہوا۔

۱۳ جنوری ۱۹۸۰ء

صابو صدیق کے الملطیفی ہال میں اردو اکادمی کی جانب سے پہلی بار ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ چیرمین ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا صاحب نے مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی نے اپنے پروگرام اور منصوبوں کو بڑھایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ مشاعرہ پہلی بار اردو داں علاقے میں ہو رہا ہے۔ اکادمی کی یہ کوشش ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ پروگرام اردو علاقوں میں ہوں۔

ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے شعرائے کرام اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ موصوف نے اکادمی کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ سیمینار اور مشاعرہ میں اردو حلقوں نے جو دلچسپی لی ہے۔ اور ان پروگراموں کو کامیاب بنایا ہے۔ اس سے اکادمی کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔ اکادمی کی ممبر سلمیٰ صدیقی صاحبہ نے مشاعرہ کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ صدر مشاعرہ حضرت مجروح سلطانپوری تھے۔ باقر مہدی، ندا فاضلی، فضیل جعفری، انجم رومانی، افتخار امام صدیقی، گنیش بہاری طرز، سردار جعفری، جاوید اختر، عزیز قیسی، مرزا عزیز جاوید، سعید راہی، مجاز کانپوری، واجدہ تبسم اور دیگر مقامی شعراء کے بعد صدر مشاعرہ مجروح سلطانپوری صاحب نے کلام سنایا۔ اکادمی کا یہ پہلا مشاعرہ بے حد کامیاب رہا۔



مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے بمبئی میں منعقد مشاعرے کی دو تصویریں



۲۴ر جنوری ۱۹۹۰ء

حلقہ احباب صدر ناگپور کی جانب سے اردو اکادمی کی زیر نگرانی چلائے جانے والی اردو کوچنگ کلاس کے دوسرے بیچ کے تدریسی پروگرام کی افتتاح کے لئے ودربھ ساہتیہ سنگھ کے ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ایم آر آشتی کر ڈین فیکلٹی آف آرٹس ناگپور یونیورسٹی نے کی۔ ودربھ کے اردو دوست وار دلنواز کمشنر جناب ڈی این کپور صاحب اور مراٹھی کے مشہور و معروف کوی شری انیل دیشپانڈے مہمانانِ خصوصی تھے۔

ابتدا میں ڈاکٹر منشاء الرحمن منشار نے اردو کوچنگ کلاس کی گزشتہ کارگزاریوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کلاس کی اہمیت ضرورت پر روشنی ڈالی اور مہمانانِ خصوصی کا تعارف کرایا۔ نیز ڈاکٹر اسحٰق مجانہ والا صاحب کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر آشتی کر صاحب اور ڈی این کپور صاحب نے بڑی شستہ اردو میں اس زبان کی شیرینی و مقبولیت پر اظہارِ خیال کیا۔ شری انل دیشپانڈے کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملنے پر مبارکباد دی گئی۔ شری دیشپانڈے کی جوابی تقریر کے بعد ڈاکٹر مجانہ والا صاحب نے تقریر کی۔

چیرمین اکیڈمی ڈاکٹر مجانہ والا صاحب نے افتتاحی خطبہ میں اردو مراٹھی کے دیرینہ رشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اردو اکادمی کی ان تجاویز پر روشنی ڈالی جن کے تحت مہاراشٹر میں مراٹھی اردو کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان کے قریبی رشتۂ انس کو استحکام عطا کرنے کی کوشش جاری ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا مختلف اداروں نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی وزارت اور اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے باوجود بے پناہ مصروفیت کے اردو دوستوں کے مختلف پروگراموں میں شریک رہے اور اردو اکیڈمی کی کارکردگی کا تذکرہ کیا اور اردو داں طبقہ سے تعاون کی گزارش کی

۲۷ر جنوری

فون کی گھنٹی بجی ــــــ

دوسرے سرے پر ایک اندوہناک خبر ہماری منتظر تھی،

اردو اکادمی کے انڈر سکریٹری جناب محمد صدیق عثمانی رحلت فرما گئے۔

اکادمی اپنے ایک مخلص ساتھی اور رفیق سے محروم ہو گئی۔

عثمانی صاحب کی شرکت کے بعد اکادمی کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہو گئی تھیں ــــ اپنے حسنِ عمل اور اخلاق سے مرحوم نے بہت جلد اراکین اردو اکادمی، بمبئی نیز مہاراشٹر کے ادیبوں اور شاعروں میں وقعت حاصل کر لی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ مرحوم کے جنازے میں ان کے بہت سے عزیزوں اور احباب کے ساتھ جناب خواجہ عبدالغفور۔ جناب عبدالستار دلوی، جناب فضیم زبیری (انقلاب) جناب سعید احمد (اردو ٹائمز) جناب اشفاق حسین، جناب شاہد ندیم، شریک تھے

اکادمی مرحوم کے غم میں اپنا پرچم سرنگوں کرتی ہے۔

مرحوم محمد صدیق عثمانی

۲۷ جنوری ۱۹۸۰ء

بزم ادب کامٹی کی جانب سے دارالکتابت واقع منارام اردو پرائمری اسکول محمد علی گنج کامٹی میں ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد صاحب کے اعزاز میں ایک خصوصی نشست منعقد ہوئی۔ مختلف انجمنوں اور سوسائٹی کے نمائندوں نے چیئرمین اکیڈمی جگن ناتھ آزاد صاحب کی گلپوشی کی۔ ڈاکٹر نظیر رشیدی اور قمرالزماں صاحب نے بزم غالب کی سرگرمیوں اور دارالکتابت کی کارکردگی سے چیئرمین صاحب کو روشناس کرایا۔ جناب ظہیر وارثی نے اردو اخبارات کا قدیم تاریخی فائل ڈاکٹر صاحب کو پیش کیا۔ اور نایاب تراشے بتائے۔

جناب عبدالرحیم نشتر نے پندرہ روزہ نقیب کامٹی کے چند شمارے پیش کئے۔ دارالکتابت کے معائنے کے بعد ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد صاحب نے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو ہر شعبۂ حیات میں خصوصاً روزمرہ کے کاموں میں استعمال کی تلقین کی۔ استقبالیہ جلسہ کے بعد غنچۂ اسلام کلب کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشاء ممبر اردو اکادمی نے کی۔ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد صاحب نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی۔ موصوف نے کہا کہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی اپنے طور پر اردو کی خدمت کر رہی ہے لیکن عوام کے تعاون کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ آپ نے کہا کہ ودربھ میں اردو کی مقبولیت ہر دور میں رہی ہے۔ اردو کی ترقی اور بقا کے سلسلے میں تعمیری اقدامات کے لئے اکادمی کو اپنا بھرپور تعاون دیں۔ کامٹی کے کہنہ مشق صوفی مزاج شاعر شاطر حکیمی صاحب کے لئے چیئرمین اکادمی ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد صاحب نے وزیر اعلیٰ شرد پوار سے سفارش فرما کر چیف منسٹر فنڈ سے تین ہزار روپے کی گرانقدر رقم منظور کرائی۔

۸ فروری ۱۹۸۰ء

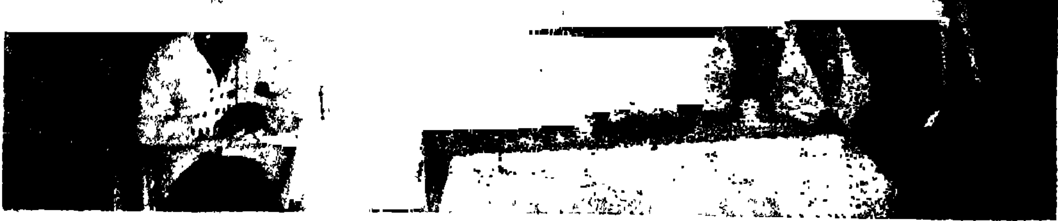
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر انتظام منعقد ہوا "یادِ مخدوم" کے تحت سیمینار، شبِ غزل اور مشاعرہ بے حد کامیاب رہا۔

۸ فروری ۱۹۸۰ء کی شام پانچ بجے "مولانا آزاد کالج لیڈیز سیکشن نوکھنڈہ جبڑ کال" میں سیمینار کا آغاز ہوا۔ اس سیمینار اور مشاعرے کے انعقاد اور کامیابی کے سلسلے میں کنوینر اور اردو اکادمی کے ممبر جناب بشر نواز، جناب مجید جمال (صدر استقبالیہ کمیٹی) اور ان کے رفقاء جناب مظہر محی الدین، جناب قمر اقبال، خواجہ طاہرالدین صاحب، ایڈوکیٹ کاشی ناتھ، جناب ہارون چندیکا پٹیا، جناب عزیز خسرو (ایڈیٹر اورنگ آباد ٹائمز)، جناب شکیل احمد (ایڈیٹر روزنامہ آج) جناب ناگناتھ پھٹالے (مراٹھواڑہ) ایڈوکیٹ چودھری، جناب رتن لال جھٹالیہ، ڈاکٹر سید عبدالجلیل اور رابطہ کمیٹی کے تمام اراکین کی پرخلوص کوشش کارفرما تھی۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

منشی پریم چند

سیمینار



مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے بمبئی میں منعقد پریم چند
پر سیمینار کی ایک تصویر

گنگا جمنی تہذیب کے شہر اورنگ آباد میں "یادِ مخدوم" سیمینار، شبِ غزل اور مشاعرے میں بڑی گہما گہمی تھی۔

۸ فروری کی صبح "یادِ مخدوم" سیمینار کا افتتاح مراٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر [illegible] نے کیا۔ سیمینار کے پہلے اور دوسرے روز صدارت کے فرائض اکیڈمی کے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے انجام دیئے۔

دو روزہ سیمینار میں جناب معین شاکر نے "مخدوم کی شخصیت اور شاعری"، جناب انور معظم نے "مخدوم ایک حسن پرست"، جناب راج بہادر گوڑ نے "مخدوم کی زندگی اور شعریت"، جناب سکندر علی وجد نے "مخدوم۔ کچھ یادیں"، جناب ایشور راج ماتھر نے "محرکات اور ماحول"، جناب عقیل جعفری نے "مخدوم محی الدین۔ سرسری مطالعہ"، جناب یوسف پٹھان نے "مخدوم محی الدین۔ تعارف و تبصرہ (مراٹھی میں) مقالات پڑھے اور مخدوم سے متعلق تاثرات کا اظہار کیا۔ جناب قاضی سلیم (ایم پی) نے جہاں مخدوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا وہیں اپنی پُرجوش تقریر میں کہا کہ اردو اکیڈمی کو ایک سرکاری تنظیم کا روپ ملنا چاہیئے۔ اور وہ سرکاری طور پر اردو کے سلسلے میں لوگوں کی مشکلات، مطالبات اور ضروریات کے حل کرنے کی کوشش کرے۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ اس کی سالانہ رپورٹ اسمبلی کے سامنے پیش کی جانی چاہیئے۔ اورنگ آباد جو اردو کا اہم مرکز ہے، اس تعلق سے قاضی سلیم صاحب نے کہا کہ یہاں ایک اردو ہال قائم کیا جائے جس کے لئے انہوں نے وعدہ کیا کہ اپنے رسوخ سے زمین دلائیں گے اور سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپے منظور ہونا چاہیئے۔

جناب سکندر علی وجد نے "مخدوم۔ کچھ یادیں" کے طور پر مخدوم محی الدین کے ساتھ اپنی یادوں کا تذکرہ کیا۔ شدّتِ جذبات سے ان کا گلا رندھ گیا۔ اس لئے زیادہ نہ کہہ سکے۔ صرف چند جملوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ وجد صاحب نے ان تحریکات کی تائید کی جو قاضی سلیم صاحب نے بیان کیں۔ البتہ راج بہادر گوڑ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ایسی مانگیں سرکار ہی سے کیوں کی جاتی ہیں۔ عوام خود یہ کام شروع کریں۔ اور بطورِ حق امداد مانگیں۔ گوڑ صاحب کی طویل مگر پُرزور تقریر اردو کی حمایت میں دلائل کے ساتھ تھی۔ موصوف نے کہا ہندوستان ہی اردو کی جنم بھومی ہے اور اس کے گنگ و جمن نے اس کی آبیاری کی ہے۔ گوڑ صاحب نے فرمایا کہ اردو میں اسلام سے متعلق لٹریچر ہونے سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ مسلمانوں کی ہی زبان ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں اور اسلام سے متعلق بہت سا لٹریچر تیلگو، مراٹھی اور دیگر زبانوں میں بھی ہے۔ یہ زبان سب کی میراث ہے جس کا دائرہ تہذیبی ہے۔ اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ نے کہا کہ اردو ہندی ایک ہیں، دونوں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہونا چاہیئے، البتہ اردو کا ایک نشاۃ الثانیہ RENAISSANCE ہونا چاہیئے۔ زبان کو معیاری بنانے اور اس کی حفاظت کے لئے اردو داں طبقے جد و جہد جاری رکھے۔ آپ نے فرمایا کہ آئینِ ہند نے دفعات ۳۴۵ اور ۳۴۷ کے تحت زبان کے بقا کی ضمانت دی ہے۔ اور اس پر عمل ہونا چاہیئے۔

صدرِ جلسہ جناب خواجہ عبدالغفور نے اورنگ آباد میں "یادِ مخدوم" سیمینار، شبِ غزل اور مشاعرہ کے انعقاد کے سلسلے میں اہلیانِ اورنگ آباد کے ذوق اور لگن کو سراہا۔ سیمینار کے دوسرے روز موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں مخدوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مخدوم سے وابستہ ان دلچسپ باتوں کا تذکرہ کیا جو مخدوم کے تعلق سے حیدرآباد، اورنگ آباد میں ہی نہیں بلکہ مخدوم کے ساتھیوں اور ان کے چاہنے والوں میں مشہور رہیں۔ مخدوم کا کھلنڈراپن، کالج میں شوخیاں، بات بات

قتیل شفائی کے ساتھ ایک نشست



پاکستانی مہمان شاعر قتیل شفائی اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ وائس چیئرمین جناب ونائک راؤ پاٹل، چیئرمین جناب اسحٰق جمخانہ والا اور ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور پوری طرح متوجہ ہیں۔

پر لطائف گھڑنا، مخدوم کی شخصیت کا ایک رنگین اور دل چسپ پہلو تھا۔ موصوف نے کہا کہ مخدوم کی شاعری میں جہاں سنجیدگی اور وقار پایا جاتا ہے، دوستوں میں وہ اتنی ہی شوخ اور زعفران زار شخصیت کے مالک تھے۔ مخدوم کے فن اور شخصیت اور مخدوم سے وابستہ دل چسپ یادوں کے تذکرے پر آپ نے اپنا مقالہ پڑھا۔

۸ ر اور ۹ ر فروری کے دو روزہ سیمینار میں مہمان مقررین کے علاوہ ممبر اکیڈمی جناب بشر نواز اور جناب مجید جمال نے خیر مقدمی تقاریر کیں۔ سیمینار، شبِ غزل اور مشاعرے کے یہاں بڑا جوش و خروش تھا۔ ۸ ر فروری کی شب میں محفلِ موسیقی میں مخدوم اور دیگر شعرائے کرام کی غزلیں فن کاروں نے سنائیں۔

۹ ر فروری کی شب میں ایک شاندار مشاعرہ "یادِ مخدوم" جناب سکندر علی وجد کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر یوسف عثمانی، جے پی سعید، اختر الزماں ناصر، فضیل جعفری، حسن کمال، نشاط الرحمن نشاط، عزیز قیسی، شبیر راہی، بشر نواز، قاضی سلیم، داور، قمر اقبال، رضا حیدری، جاوید اختر، ڈاکٹر انور معظم، انجم رومانی، محمود شیدا اور سکندر علی وجد نے کلام سنایا۔ بشر نواز کے شکریے پر سیمینار، شبِ غزل اور محفلِ مشاعرہ جو مخدوم کی یاد میں منعقد ہوتے اختتام کو پہنچے تیسرے روز مہمانوں نے رخصتِ سفر باندھا اور اورنگ آباد کے اہلِ ذوق نے ان ادبی محفلوں کی یادوں کو اپنے دل میں جگہ دی۔

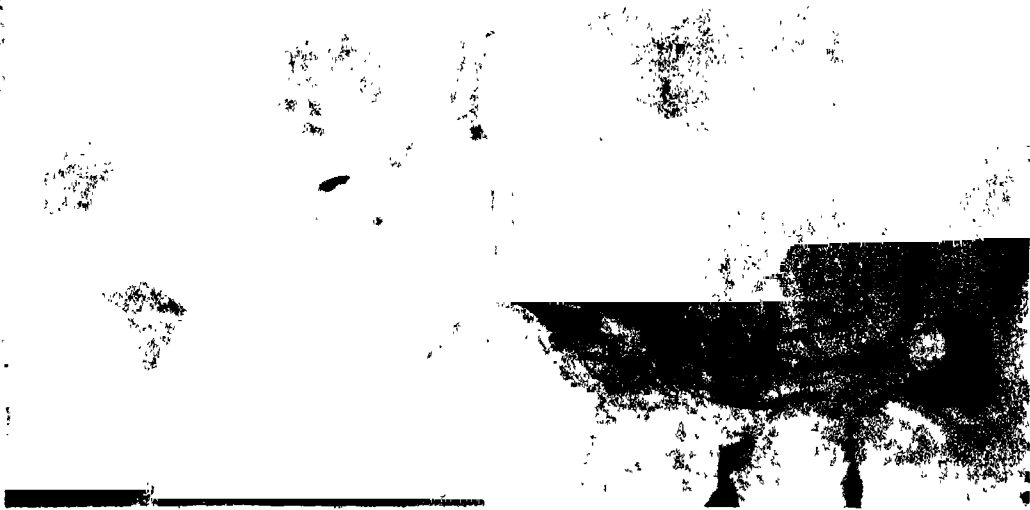
۹ ر فروری ۱۹۸۰ء

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے ایک عظیم الشان مشاعرہ "یادِ مخدوم" کے سلسلے میں ۹ ر فروری کی شب آزاد کالج لیڈیز سیکشن کے کھلے میدان میں منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت کے لئے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبد الغفور نے حضرت سکندر علی وجد کا نام پیش کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بھی شریکِ محفل تھے۔ اکیڈمی کے اس مشاعرے کے انعقاد کے لئے جناب بشر نواز، جناب مجید جمال صاحب اور استقبالیہ کمیٹی و رابطہ کمیٹی نے اہتمام کیا۔

مشاعرے کا آغاز ڈاکٹر یوسف عثمانی کی خوبصورت غزل سے ہوا۔ جناب عثمانی کے بعد صدر مدرس آزاد ہائی اسکول جناب جے پی سعید نے ایک غزل سنائی اور مشاعرہ کا سماں باندھ دیا۔ جیسے ہی اورنگ آباد کے جناب اختر الزماں ناصر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا ایک ایک شعر پر خوب داد حاصل کی۔ غزل کا یہ خوبصورت شعر آپ بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ فیض ہے کسی رہبر کے ساتھ چلنے کا   مجھے بھی آگیا فن راستہ بدلنے کا

صدر مشاعرہ نے اس محفل کے روحِ رواں شاعر جناب بشر نواز کے نام قرعۂ فال نکالا۔ بشر نواز صاحب نے جو سیمینار اور مشاعرے کے اہتمام میں تھکن سے چور تھے ایک آدھ غزل سنائی۔ غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎



سیمینار میں موجود
حاضرین

کہ تلخ و ترش ہو تو مزہ یاریوں میں ہے — دن رات کی مٹھاس ریاکاریوں میں ہے
سفینہ ساحلوں سے لگا کے کہاں گرداب جو بہاؤ [illegible]

اس کے بعد اورنگ آباد کے مشہور شاعر قمر اقبال آئے۔ قمر اقبال کے ایک ایک شعر پر خوب داد ملی۔ وہ کہتے ہیں ؎

تو ہے تنہا تو مرد کی شدت کو کیا ہوا — میں سوچتا ہوں تیری محبت کو کیا ہوا
اک بات جو کتاب مقدس میں درج ہے — آثار سب وہی ہیں قیامت کو کیا ہوا

ڈاکٹر یوسف عثمانی کی اہلیہ رعنا حیدری نے ایک غزل سنائی ان کے بعد محترمہ ظفر شاہین کی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

پھر یہ رہ رہ کے چھلک اٹھتی ہیں کیونکر آنکھیں
قلب خاموش میں طوفان اگر کوئی نہیں

صدر مشاعرہ وحید صاحب نے ناگپور سے آئے ہوئے شاعر اور اکادمی کے ممبر ڈاکٹر منشاء الرحمن منشاء کو دعوت سخن دی۔ آپ کے کلام پر خوب داد ملی ؎

غم ملا، درد ملا، سوز ملا، ساز ملا — اس کو سب کچھ ملا جس کو دل جانباز ملا
دے جو ٹھنڈک وہی قطرۂ شبنم اچھا — نہ بجھے تشنگی جس سے وہ سمندر نہ بنا

بمبئی سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب جاوید اختر نے مرصع غزل سنائی۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہ گرم دھوپ اڑی آئینوں کے صحرا میں
تمہاری یاد کو افسوس ہم بچا نہ سکے
ہوا بھی دیکھتی رہتی ہے ایک ہی منظر
شجر بھی ایسا کہ پتہ کوئی گرا نہ سکے

وحید صاحب نے جناب عزیز قیسی کا جیسے ہی نام لیا۔ حاضرین نے پرجوش استقبال کیا۔ عزیز قیسی صاحب نے خوب داد پائی ؎

اور کس کو میرے جینے سے علاقہ ہوگا
کوئی ہوگا سرِ آل تو مسیحا ہوگا
بھیڑ کی بھیڑ اسے ڈھونڈنے نکلی ہوگی
ایک وہ شخص جو ہر بھیڑ میں تنہا ہوگا

مہمان شاعر ڈاکٹر انور معظم نے "تیرا شخص" آزاد نظم سنائی۔ موصوف کے بعد اورنگ آباد کے مشہور شاعر اور ممبر پارلیمنٹ جناب قاضی سلیم نے علی گڈھ کے فساد پر نظم سنا کر لہو کی گرمی کو اور تیز کیا۔ محفل میں اس نظم سے جان آگئی۔ نامور شاعر اور اردو بلٹز کے ایڈیٹر جناب حسن کمال کے نام کا اعلان ہوا۔ پرتپاک خیر مقدم کا جواب انہوں نے اپنے خوبصورت کلام سے دیا۔ جناب کمال کا یہ کمال ملاحظہ ہو ؎

سب تھے معروف اندھیروں کی خریداری میں — ہم سجائے ہوئے شمعوں کی دکاں بیٹھے تھے
کیسے طے ہوں گے بھلا یہ روز و شب کے فاصلے — ہم تو سو جائیں گے تھک کر جاگ کر سوچے گی رات
دربدر کوچہ بہ کوچہ دیر تک بھٹکے گی رات — پھر تھکن سے چور ہو کر میرے گھر ٹھہرے گی رات



بمبئی میں منعقد مشاعرہ کی ایک تصویر —

جناب افتخار امام اپنا کلام سنارہے ہیں۔

اورنگ آباد کے شاعر ایمان اختر کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوا سے رات گئے سمیٹا نہیں جاتا
بکھر بکھر کے بھی یہ حوصلہ نہیں جاتا

بمبئی سے آئے ہوئے مہمان شاعر اور اکادمی کے ممبر جناب انجم عثمانی کو دعوتِ سخن دی گئی
انجم صاحب کے کلام پر خوب داد ملی ؎

شکارگاہ میں گھر جائے جیسے کوئی ہرن — یہ حال آج کے انسان کی زندگی کا ہے
ہر شام میرے دل میں کئی شمعیں جلتی ہیں — ہر صبح میں خوابوں کی طرح ٹوٹ گیا ہوں

پاکستان سے آئے ہوئے شاعر محمود شیدا سے بھی کلام سنانے کے لئے اصرار کیا گیا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

غضب ہے میرا دل لیکر نصیب دشمناں بدلے
زمانہ مجھ سے بدلا ہے جو تم اے مہرباں بدلے

بمبئی سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب فضیل جعفری نے اپنا کلام سنایا۔ دو شعر پیش ہیں

شورِ شمشیریں، دھواں، دستِ رفاقت بے نقاب
بم دھماکہ، چیخ، خاموشی، محبت بے نقاب

دن سنہرے خواب، چہرے، آرزو، نشتر، چبھن
رات، بستر، جسم، پانی، شوق، لذت بے نقاب

صدرِ مشاعرہ نے بمبئی کے شاعر میر ہاشم کو دعوتِ سخن دی۔ میر ہاشم نے مخدوم کی موت پر ایک نظم سنائی۔

مشاعرہ کی گرمی جب خوب بڑھی تو اخیر میں صدرِ مشاعرہ سکندر علی وجد نے اپنا کلام سنایا۔ ایک عرصے بعد وجد کا کلام ترنم سے سننے کو ملا۔ وجد صاحب کے کلام سے حاضرین کو بھی وجد آگیا۔

یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

شوق و سرشار دل وجد جواں ہے کہ جو تھا
آج بھی حسنِ بتاں آفتِ جاں ہے کہ جو تھا

دکن کی خدمات کا اردو غزل کے لئے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ؎

وجد اردو کی آبرو ہے غزل
یہ نوازش ترے وطن کی ہے

مخدوم کی زمین میں لکھی ہوئی ایک غزل سنائی۔ مقطع پیش ہے ؎

وجد مخدوم کی یادوں کے چمن میں اب تک
گونجتی ہے طرب انگیز نوا آخرِ شب

مشاعرہ حضرتِ وجد کے بعد اختتام کو پہنچا۔

مشاعرہ کی ابتدا میں جناب خواجہ عبدالغفور نے اورنگ آباد کے سخنوروں اور اردو زبان سے ذوق رکھنے والوں کا شکریہ ادا کیا جو فروغِ اردو میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ موصوف نے اکادمی کی کارکردگی اور مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اورنگ آباد

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے بمبئی میں منعقد مشاعرے
میں جناب مجروح سلطانپوری اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ
کرر ہے ہیں۔
صدر مشاعرہ جناب اسحٰق جمخانہ والا۔ سلمٰی صدیقی اور واجدہ تبسم
ہمہ تن گوش ہیں۔

جو اردو تہذیب کا ایک مرکز ہے یہاں سے ہمیشہ تعاون ملتا رہے گا۔
جناب بشر نواز کے شکریہ پر یہ محفل مخدوم کی یاد میں ختم [illegible]۔

۱۴ فروری ۱۹۸۰ء

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے ڈان ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام اردو کلاسوں کے کامیاب طلبہ وطالبات کو شریف آف بمبئی جناب دلیپ کمار (یوسف خان صاحب) کے ہاتھوں سرٹیفکٹ تقسیم کئے گئے۔

جناب رضی الرحمن صاحب سکریٹری ڈان ایجوکیشن سوسائٹی (حیدر آباد) نے اردو کلاسوں کے ذریعہ اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا ذکر کیا۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبد الغفور کی ایما پر اوران کی مساعی جمیلہ سے ڈان ایجوکیشن سوسائٹی نے اردو اکادمی کے پراجیکٹ جو اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں بمبئی میں اس کام کو شروع کیا ہے۔ اس ضمن میں اکادمی نے غیر اردو داں طبقہ میں بھی اردو کے ذوق کو دیکھتے ہوئے انھیں اردو سکھانے کے لئے خاص توجہ دی۔

ڈان ایجوکیشن سوسائٹی نے ناگپاڑہ نیبرہڈ ہاؤس میں اردو کلاسیز کے ذریعہ اردو داں اور غیر اردو داں طبقہ کو اردو سکھانے کا کام انجام دیا۔ اس سلسلے میں مذکورہ ایجوکیشن سوسائٹی کے فارغ طلبہ وطالبات کو سرٹیفکٹ تقسیم کئے گئے۔

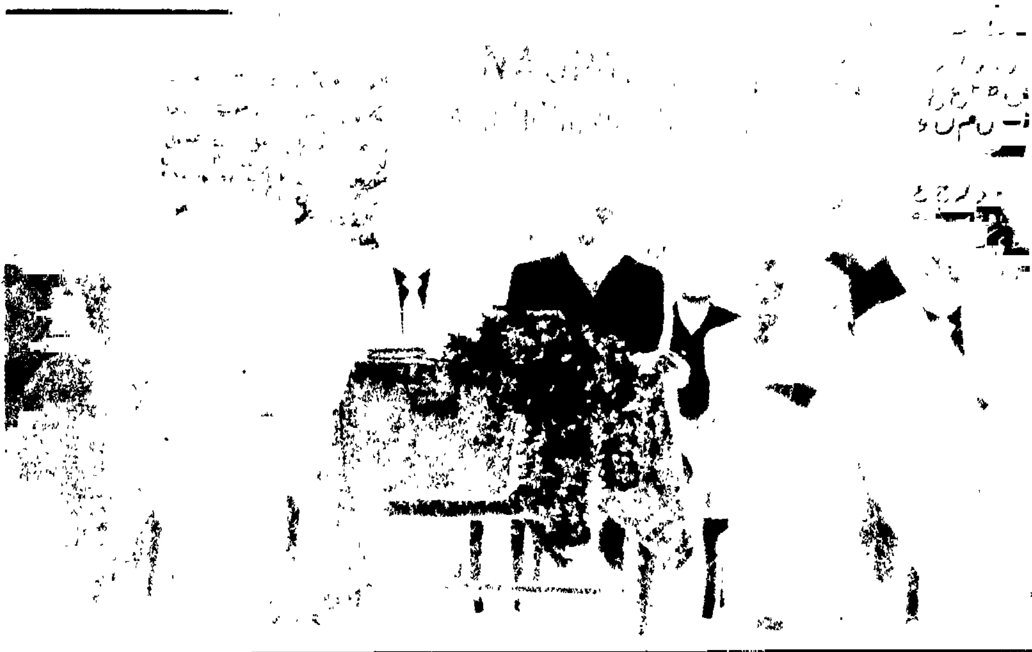
ناگپاڑہ نیبرہڈ ہاؤس کی پروگرام ڈائرکٹر مس شیلا پاٹل نے مہمانِ خصوصی دلیپ کمار کا خیر مقدم کیا اور ناگپاڑہ نیبرہڈ ہاؤس کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔ نیبرہڈ ہاؤس کے ڈائرکٹر مسٹر گاس مسٹر مڈگاونکر اور مس شیلا پاٹل کے تعاون سے یہ کلاسیز جاری ہیں۔ تقریباً پچاس طلباء کو نو یا چھ مہینے میں اردو کی تعلیم دی گئی۔

دادر بمبئی سے آئے ہوئے مراٹھی داں حضرات کے شوق کی مہمانِ خصوصی نے تعریف کی اور اردو سیکھنے پر مبارکباد دی۔ ممبر اکادمی جناب ودیا دھر گوکھلے نے اردو سے اپنے پریم کا ذکر کیا اور بتایا کہ بیس سال سے وہ لوک ستا (مراٹھی) کے مدیر کی حیثیت سے اردو ادب اور شاعری کو مراٹھی زبان میں منتقل کرتے رہے ہیں۔

صدر جلسہ جناب فاروق احمد چھوٹانی نے نیبرہڈ ہاؤس کی خدمات کا تذکرہ کیا۔ موصوف نے کہا کہ اردو کے سلسلے میں اس ادارہ کا ہمیشہ تعاون کیا ہے۔ دریائی مشاعرہ اور شکیل بدایونی مرحوم کی سرپرستی اور خواجہ عبد الغفور صاحب کی سرکردگی میں اردو سرکل کا قیام نیبرہڈ ہاؤس کا قابل ذکر کارنامہ ہے۔

شریف آف بمبئی جناب دلیپ کمار نے ودیا دھر گوکھلے صاحب کی تقریر کا مراٹھی میں ہی جواب دیا۔ اس دلنشیں انداز مخاطب پر مجمع عش عش کرنے لگا۔ اس کے بعد بعد فصیح وبلیغ اردو میں

ڈاٹن ایجوکیشن فری اردو کلاسس



ناگپاڑہ نیبر ہڈ ہاؤس میں اردو کلاسوں کے کامیاب طلبہ کو انعامات دیئے گئے۔ زیر نظر تصویر میں میاں احمد پرچینٹ مسس شیلا پاٹل شریف آف بمبئی جناب ولیپ کمار صدر جلسہ فاروق چھوٹانی صاحب ڈپٹی شریف سید صاحب اور نیبر ہڈ ہاؤس کے ڈائرکٹر مرمانگاس۔

اردو کی خوبصورتی، شیرینی اردو کی کسمپرسی، اردو کے ساتھ تعصب اردو کی بدولت آج انھیں جو معراج ترقی حاصل ہے، اردو زبان کی اہمیت، ایک عبرتکا مسئلہ، اردو شاعری اردو دیگر زبانوں کی شاعری کا تقابلی مطالعہ۔ اردو کا مشرقی کلچر اور مغربی کلچر، موازنہ، اردو ادب شاعری کے بلند معیار پر دلیپ صاحب کی یہ تقریر تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔
بیسوں اشعار سنائے۔ یہ ذو معنی تقریر اردو والوں کے لئے بھی اور اردو دشمنوں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت تھی۔

دلیپ صاحب نے کہا کہ اردو کو جتنا مٹانے کی کوشش کی گئی اتنی ہی پروان چڑھی۔ انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ جو اردو دہلی و لکھنؤ میں بے یار و مددگار رہی۔ آج وہ مہاراشٹر میں فروغ پا رہی ہے۔ مہاراشٹر میں ملکۂ اردو کو بائیں کا پیار ملا ہے۔ جس پر اہل مہاراشٹر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

تقسیم اسناد اور رسم شکریہ پر یہ تقریب ختم ہوئی۔ خواجہ عبدالغفور صاحب کی غیر موجودگی شدت کے ساتھ محسوس کی گئی۔ وہ اکادمیوں کے راجستھان کے کنونشن کی صدارت کے لئے جے پور گئے ہوئے تھے۔

۲۴ فروری ۱۹۹۰ء:

شولاپور جیسے چھوٹے صنعتی شہر میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں کے اردو داں طبقہ کے اصرار پر مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی نے "فانی بدایونی" پر ایک سیمینار منعقد کیا۔ اس سلسلے میں شولاپور کے پروفیسر محمد علی واڈوان نے جو اردو اکادمی کے ممبر بھی ہیں سیمینار کے انعقاد کے لئے بڑی دلچسپی سے کام لیا اور مذکورہ سیمینار کے وہ کنوینر بھی تھے۔ اکادمی کی سرگرمیوں کا مرکز پہلے بمبئی، اورنگ آباد، مالیگاؤں تھا، اب اس میں ناگپور، شولاپور اور بھیونڈی کا بھی اضافہ ہوا کہ اس سلسلے میں جو توجہ اور دلچسپی اکادمی کے چیئرمین جناب ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا لے رہے ہیں یہ ایک خوش آئند بات ہے۔
شولاپور کے دامانی ہال میں سیمینار کی ابتداء تلاوتِ کلام پاک سے ہوئی۔ ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا صاحب چیئرمین اردو اکادمی نے افتتاح کیا اور جناب خواجہ عبدالغفور ممبر سکریٹری نے صدارت کی۔ پروفیسر محمد علی واڈوان نے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ ہم نے سیمینار کے انعقاد و کامیابی کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ نیز اکادمی کا یہ اقدام بھی قابل مبارکباد ہے کہ یہ شرف شولاپور کو بھی بخشا گیا۔ موصوف نے امید ظاہر کی کہ اردو کے فروغ کے پروگرام میں یہاں کے اردو داں طبقے کو اکادمی کا تعاون حاصل رہے گا۔ واڈوان صاحب نے معزز مہمانوں کی گلپوشی کی اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ سیمینار میں شرکت کرنے والے اور دیگر مہمانوں و شعرائے کرام کے تعاون سے شولاپور سوشیل ایسوسی ایشن کے کالج کی تعمیر و ترقی کے لئے آج شب میں مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے یہ اہل شولاپور کے لئے باعثِ فخر ہے۔



پروفیسر ذوالمولان ڈاکٹر جمانہ والا کی گلپوشی کرتے ہوئے۔

فانی بدایونی سیمینار کے افتتاح کے موقعہ پر ڈاکٹر اسحٰق جمانہ والا کا افتتاحیہ خطبہ







[illegible] تقریر کے بعد جناب [illegible] صاحب نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر جہاں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد ہے [illegible] ریاست کا رویہ اس زبان سے ہمیشہ منصفانہ رہا ہے۔ اردو اکادمی کا قیام اسی رواداری کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ اس سال اکیڈمی کی سرگرمیوں کے لئے ساڑھے چھ لاکھ روپے حکومت نے دیئے ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی میں اردو چیئر کے قیام سے متعلق موصوف نے کہا "میں نے اپنی پوری کوشش کی ہے اور انشاء اللہ سال آئندہ سے یہ شعبہ قائم ہوگا۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کو ڈھائی لاکھ روپے کی پہلی قسط دی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا میری یہ بھی کوشش رہی کہ حکومت کے اشتہارات اردو کے اخبارات رسائل کو زیادہ سے زیادہ دیئے جائیں۔ یہی نہیں بلکہ اردو زبان میں پہلی بار کئی محکموں کی تشہیر کے لئے اشتہارات جاری کئے گئے۔ حکومت یا اکادمی جہاں اپنے طور پر خدمت اس زبان کی کر رہی ہے وہیں اردو داں طبقہ کا بھی کچھ فرض ہو جاتا ہے۔ اردو والے کسی احساس کمتری میں نہ رہیں۔ وہ دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ اردو میں خط و کتابت کریں۔ اردو میں سائن بورڈ لکھوائیں۔ اردو میں عرضداشتیں لکھیں۔ بچوں کو اردو تعلیم دیں۔ اردو ادب و صحافت کے معیار کو بڑھائیں۔

فانی سے متعلق موصوف نے فرمایا کہ وہ اردو کے منفرد شاعر تھے جن کے رنگ تغزل کو آج بھی زمانہ یاد کرتا ہے۔ فانی کے مختصر حالات، ان کی شاعری کا جائزہ اور چند اشعار پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فانی کے لافانی کلام اور کردار کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

سیمینار کے آغاز میں کلام فانی پیش کیا تھا۔ اردو اکادمی کے ممبر جناب شبیر احمد راہی نے اپنی تقریر میں اردو اکادمی پر کئے جانے والے اعتراضات کو جھٹلایا کہ اکیڈمی کے پروگرام منترالیہ کے بند کمروں میں ہوتے ہیں۔ موصوف نے کہا جب سے ڈاکٹر مجھانہ والا صاحب نے بحیثیت چیئرمین ذمہ داری سنبھالی ہے ہر وہ کام مکمل ہوا جو التوا میں پڑا تھا۔ پہلی بار اکادمی کا مشاعرہ الطیفی ہال بمبئی میں ہوا۔ بمبئی اورنگ آباد، مالیگاؤں، ناگپور، شولاپور میں ہونے والے سیمینار اور اب بہت جلد بھیونڈی میں ہونے والا سیمینار دراصل مجھانہ والا کی دلچسپی کے باعث اردو کے عوامی علاقوں میں ہو رہے ہیں۔

سیمینار میں پروفیسر فضیل جعفری (بمبئی) نے کلام فانی کے بعض پہلوؤں پر ایک سرسری نظر اس عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی (بمبئی) نے "فانی ــــ ایک تاثر" ــــ مقالہ پڑھا۔ جناب رشید الدین (حیدر آباد) نے "فانی کی شخصیت ــــ ایک تجزیہ" اس عنوان پر مقالہ پیش کیا اور بشر نواز صاحب نے "فانی بدایونی کی شاعری" پر ایک مقالہ پڑھا۔ فانی کی شخصیت اور شاعری پر مقالات پڑھے گئے اور مقامی حضرات نے اس کے بعد بحث میں حصہ لیا۔

سیمینار کے صدر جناب خواجہ عبدالغفور جیسے ہی تقریر کرنے کھڑے ہوئے اہل شولاپور نے پرجوش تالیوں کی گونج میں خیر مقدم کیا۔ خواجہ صاحب نے اس خلوص و محبت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ شولاپور میں یہ پہلا موقع ہے کہ اکیڈمی نے سیمینار منعقد کیا۔ اگر آپ لوگوں کا تعاون اسی طرح آئندہ بھی حاصل رہا تو وقتاً فوقتاً ادبی سرگرمیوں کے لئے شولاپور کو بھی ضرور یاد کیا جائے گا۔ موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ فانی ایک عرصہ تک حیدر آباد میں رہے۔ نظام حیدر آباد اور پرنس معظم جاہ کے یہاں فانی کی بڑی عزت تھی۔ فانی سے میری کوئی خاص ملاقات [illegible] محفلوں، مشاعروں میں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے اکثر تذکرے سنتا۔ فانی کی زندگی [illegible]



شولاپور کے مشاعرے میں : ڈاکٹر سجاد ملا افتتاحی تقریر کرتے ہوئے - دائیں سے بائیں پروفیسر راڈوان
خواجہ عبدالغفور، نوشاد علی نوشاد، ساحر لدھیانوی اور حسن کمال تشریف فرما ہیں -

بھری پڑی تھی۔ ان کی شاعری دردوغم کا آئینہ ہے لیکن فانی کے ہوش رکھنے کے شوق کا کیا عالم تھا [illegible] کے۔ فانی پر پڑھے جانے والے مقالات کی [illegible] فانی [illegible] کا مزہ بھی بدل دیا۔
آخر میں [illegible] دیگر حضرات جنھوں نے اکیڈمی کو اپنے تعاون سے نوازا ان کا شکریہ ادا کیا۔
سیمنار کی کامیابی کا اندازہ حاضرین کی دلچسپی [illegible] ہی نہیں ہورہا تھا [illegible] سیمنار کی کارروائی چلی یہ بھی کامیابی کی [illegible] دلیل تھی۔ [illegible] سیمنار [illegible] ان کی [illegible] ہوتی ہے لیکن شولاپور کی روایت [illegible] سے مقالات [illegible] چند اصحاب نے مباحثہ میں بھی حصہ لیا۔ آخر میں شولاپور سوشیل ایسوسی ایشن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایچ ایم شیخ نے مہمانوں کا مختصر تعارف کراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔
سیمینار سے ایک دو روز قبل مقامی مراٹھی کے پرچوں میں "فانی بدایونی" پر ہونے والے سیمینار کی تفصیلات اور ڈاکٹر ایچ ایم شیخ صاحب کا مضمون بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ سیمینار کی تشہیر بہترین انداز سے کی گئی۔
اب تک ہونے والے سیمناروں میں شولاپور کا یہ سیمینار بڑا کامیاب رہا۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اس سیمینار میں اکاڈیمی کے چیرمین ڈاکٹر مجانہ والا صاحب اکاڈمی کے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور کے علاوہ اکادمی کے ممبران پہلی بار بڑی تعداد میں شریک تھے۔ جن میں ساحر لدھیانوی، حسن کمال، فضیل جعفری، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، بشر نواز، شبیر احمد راہی، انجم رومانی اور پروفیسر محمد علی واڈوان تھے۔ پروفیسر واڈوان میزبان تھے۔ سیمینار کی کامیابی اور بہترین [illegible] دلچسپی کے لئے پروفیسر واڈوان صاحب، پرنسپل ایچ۔ ایم شیخ صاحب اور دیگر رفقا حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔
شام ۵ بجے سے ۷ بجے تک سیمینار میں مقالات کی گرمی رہی۔ سیمینار کے اختتام کا اعلان ہوا۔

۲۴ فروری ۱۹۸۰ء
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے ممبر اور شولاپور سوشیل ایسوسی ایشن کے صدر پروفیسر محمد علی واڈوان صاحب شولاپور کی ایک اور ہر دلعزیز شخصیت اور تاج محل ہوٹل کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر جناب شکور خان صاحب، ایسوسی ایشن کے سکریٹری پروفیسر ایم جی اے بیگ صاحب ایسوسی ایشن کے سرگرم ممبر حضرات جناب بی عبدالمالک، عبدالعزیز ارکارل صاحب، کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایچ ایم شیخ دیگر رفقا سوسائٹی، اسکول و کالج کا اسٹاف، طلبہ و طالبات کے باہمی تعاون سے ۲۴ فروری



دی شوالپور سوشل ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقدہ مشاعرہ میں جناب لو سا ملی نے اپنی غزل سے سامعین کو مایا

مورخہ ۔۔۔ کو شب دس بجے شروع ہو کر ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ آڈیٹوریم دامانی ہال میں ہر
لحاظ سے کل ہند مشاعرہ کامیاب رہا۔ یہ مشاعرہ [illegible] ایجوکیشن سوسائٹی ایشن کے تحت چلنے
والے آرٹس و کامرس کالج کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں [illegible] کے لئے کیا گیا تھا۔ جس میں
شعرائے کرام کے علاوہ ارباب اکادمی اور صحافی حضرات کو خاص طور سے مدعو کیا گیا۔
سابق وزیر مملکت حکومت مہاراشٹر اور اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا، موسیقار اعظم
نوشاد علی نوشاد اکادمی کے ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور اور حضرت ساحر لدھیانوی مشاعرہ اور دیگر
پروگراموں میں مرکز نگاہ رہے۔
تلاوت قرآن سے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ میزبان شاعر صابر شاہ آبادی نے نعتیہ کلام سنایا۔
پروفیسر ایم بی اے بیگ صاحب نے استقبالیہ نظم سنائی۔ پروفیسر محمد علی واڈیوان، عبدالعزیز ارکال،
پرنسپل ڈاکٹر ایچ ایم شیخ صاحب نے تمام مہمانوں اور شعرائے کرام کا خیر مقدم کیا اور گلپوشی کی۔
مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے
مذکورہ ادارہ کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے امید ظاہر کی کہ کالج کی تعمیر و توسیع کے لئے یہ پروگرام
یقیناً کامیاب ہوگا۔ موصوف نے مزید کہا کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو جن مشکلات کا سامنا ہے اس سے
ہر کوئی واقف ہے۔ بہر حال میرا تعاون آپ کے ادارہ کو حاصل رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات
پر مسرت کا اظہار کیا کہ شولاپور کے غیر ادبی ماحول میں بڑی لگن اور محنت سے سیمینار اور مشاعرہ کا انعقاد
کیا گیا۔ اردو کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ زبان کسی کی میراث نہیں۔ یہ ہمارے مشترکہ کلچر کی
زبان ہے۔ اردو اکادمی کی سرگرمیوں کے لئے حکومت نے چالیس لاکھ روپے مختص کئے ہیں۔ یہ ہماری
حکومت کی رواداری کا بے نظیر نمونہ ہے۔ موصوف نے مراٹھی بولنے والوں کی اس زبان کے تئیں رواداری
اور محبت کو سراہتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر میں ماضی میں بھی اس زبان کو فروغ کے اچھے مواقع حاصل رہے
ہیں اور مستقبل بھی مہاراشٹر میں اس کا تابناک ہے۔ آپ نے اکادمی کی ایک سالہ کارگزاریوں سے عدم
واقفیت رکھنے والے نقادوں سے اپیل کی کہ وہ صحت مند تنقید کا جذبہ پیدا کریں۔ انہوں نے اردو داں
طبقہ سے گزارش کی کہ وہ تعمیری تجاویز اکادمی کو ارسال کریں۔ شولاپور کے مشاعرے میں قدر دانوں
کے اس قدر ہجوم کو دیکھ کر انہوں نے کہا یہ مجمع یکجہتی کا مظہر ہے اور یہاں بھی دوسرے علاقوں کی
بہ نسبت اردو کے بہی خواہوں اور اردو کے جاننے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ ڈاکٹر جمخانہ والا نے اپنی
پرجوش تقریر کے آخر میں کہا کہ اردو اکادمی اچھی اور قابل عمل تجاویز کے پیش کئے جانے پر یقیناً شکر گذار
ہوگی اور اچھی اسکیموں پر ضرور عمل کیا جائے گا۔
خواجہ عبدالغفور صاحب نے مشاعرہ کی صدارت کے لئے نوشاد صاحب کا نام تجویز کیا۔ جس کی
تائید پرنسپل ڈاکٹر ایچ ایم شیخ نے کی۔ صدر مشاعرہ نوشاد صاحب کی اجازت سے مشاعرہ کی باقاعدہ
کارروائی شروع ہوئی۔ اکادمی کے ممبر جناب انجم رومانی نے نظامت سنبھالی۔ اپنی دلچسپ اناؤنسنگ
کے دوران وہ لطائف بھی بیان کرتے جاتے اور شعراء کا تعارف میں ذومعنی فقرے بھی ٹانکتے جاتے
انجم صاحب نے سب سے پہلے صابر شاہ آبادی کو زحمت دی۔ مقامی میزبان شاعر صابر شاہ آبادی
کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

جانے کس رنج میں ہم ترکِ وفا کر بیٹھے
شانۂ عشق سے گیسو بھی سنبھالے نہ گئے



اردو اکادمی کے بمبئی مشاعرے میں
بزرگ شاعر جناب مظفر شاہجہاں پوری
اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

اس کے بعد یکتا مدنی شولاپوری آئے۔ چند قطعات اور غزل سنائی۔ اورنگ آباد کی ایک شاعرہ سعیدہ ظفر شاہین نے کلام بہ ترنم نوازا۔ اورنگ آباد کے ایک شاعر قمر اقبال (مدیر اورنگ آباد ٹائمس) آئے اور یوں گویا ہوئے ؎

ہیں جو دنیا میں تو یوں چھوڑ کے دنیا نہ رہیں
ہم سے تنہائی بھی یہ کہتی ہے کہ تنہا نہ رہیں

قمر اقبال کے بعد محترمہ حسنیٰ سرور بنگلور سے تشریف لائیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کی ممبر ہیں۔

زخم ہی زخم ہے سرتا بقدم جسم میرا

پہلے دور میں یہ غزل سنائی۔

حسنیٰ سرور صاحبہ کے بعد بشر نواز مائک پر آئے اور اس طرح غزل چھیڑی ؎

کیسے پی جاتی ہیں تاریکیاں منظر منظر
آج شمعوں کو سرِ شام بجھا کر دیکھیں

بشر نواز نے بھی بڑی داد پائی انگریزی کے مقولے (charity begins from home) کے مصداق انجم رومانی اناؤنسنگ کی نشست چھوڑ کر کلام سنانے دوسرے مائک پر آئے۔ چند قطعات اور ایک غزل سنائی دورِ حاضر کی کیفیت خوب بیان کی ہے۔

کٹے گی رات نیا آفتاب دیکھیں گے
نہ جانے اور کہاں تک یہ خواب دیکھیں گے

پروفیسر فضیل جعفری آئے اور غزل کے اس شعر پر داد پائی۔

شورِ شمشیر دھواں دست رفاقت بے نقاب
بم دھماکے چیخ خاموشی محبت بے نقاب

حسن کمال کے نام کا اعلان ہوا تالیوں کی گونج میں استقبال ہوا۔ حسن کمال نے مجمع پر نظر دوڑائی کمال صحافت میں تو داد ملتی تھی، لیکن شولاپور والوں نے کمالِ حسن غزل پر بھی انھیں خوب داد دی۔ اور مشاعرے کے حاصل حسن کمال کا یہ رنگ ملاحظہ کیجیے

میں گنہگارِ غزل سہی
یہ طلب یہ آس یہ آرزو
میرے ذہن و دل کا مداوا ہی
اسے اپنی بادہ دلی کہوں
کہ تری نظر کا قصور ہوں
جو ہمیشہ راہ میں لٹ گیا

حسن کمال کے بعد صدرِ مشاعرہ محترم نوشاد علی نوشاد کو زحمت دی گئی۔ نوشاد صاحب ایک اچھے فنکار موسیقار ہیں وہیں ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شولاپور والوں سے بحیثیت شاعر ان کا تعارف ہوا۔ اپنے شاندار خیر مقدم پر موصوف نے شکریہ ادا کیا اور غزل کا یہ شعر مضراب کے تاروں کی طرح ایسا چھیڑ دیا کہ پہلے ہی شعر پر شورِ تحسین بلند ہوا۔



ایشوراج ماتھر ڈائرکٹر آف انفارمیشن
ڈرامہ کمپٹیشن میں انعامات تقسیم کر
رہے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

دوسرے شعر پر بڑی داد حاصل کی

ابھی نہیں نزاکتِ احساس اس قدر
گر شیشہ گر بنو گے تو پتھر بھی آئے گا

نوشاد صاحب کے ایک ایک شعر پر بے پناہ داد ملی۔ دوسری غزل کی فرمائش ہوئی۔ غزل کی تمہید کے ضمن میں نوشاد صاحب نے کہا کہ اس غزل کا پس منظر ہماری فلموں میں مغربی موسیقی کی تقلید اور اس رجحان کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی غمازی کرتا ہے۔ ہندوستانی موسیقار بلاتامل مغربی موسیقی کے اس اثر کو دیکھتے ہوئے فلمی موسیقاروں کی ایک نمائندہ انجمن میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا مغربی موسیقی کو فلموں میں پیش کرنے اور اس موقف کی تائید و حمایت پر میں بڑا مغموم ہوا۔ گویا کہ فکرِ سخن نے نوشاد صاحب کے دل کی بھڑاس طرح نکالی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ابھی سازِ دل میں ترانے بہت ہیں
ابھی زندگی کے بہانے بہت ہیں

یہ شعر بار بار انھیں سنانا پڑا

درِ غیر پر بھیک مانگو نہ فن کی
جب اپنے ہی گھر میں خزانے بہت ہیں

نوشاد صاحب حاصلِ مشاعرہ رہے۔ سامعین خوب محظوظ ہوئے آخر میں حضرتِ ساحر لدھیانوی تشریف لائے۔ ساحر صاحب نے "یہ زمین تیری میری نسل کی جاگیر نہیں" ایک طویل نظم سنائی۔ غزل کے ان اشعار پر کافی داد پائی۔

توڑ لیں گے ہر اک شئے سے رشتہ توڑ دینے کی نوبت تو آئے
ہم قیامت کے خود منتظر ہیں پر کسی دن قیامت تو آئے
ایک تہذیب ہے دوستی کی ایک معیار ہے دشمنی کا
دوستوں نے مروت نہ سیکھی دشمنوں کو عداوت تو آئے

مشاعرہ کا پہلا دور رات ساڑھے بارہ بجے ختم ہوا۔ اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا۔ رات بھیگتی رہی۔ شعراء کا سرور بڑھتا رہا۔ سامعین محظوظ ہوتے رہے۔ دوسرے دور میں چند ایک شعراء نے منتخب کلام سنایا۔ آخر میں ساحر لدھیانوی نے تاج محل، جشنِ غالب دو نظمیں اور کچھ اشعار سنائے۔ رات کے پچھلے پہر یہ کامیاب مشاعرہ ختم ہوا۔

خواجہ عبدالغفور سکریٹری اردو اکادیمی، شکور خان صاحب (پرسنل آفیسر تاج محل ہوٹل) ڈاکٹر عبدالستار دلوی (ڈائرکٹر مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر) نوجوان ہدایت کار رحمٰن نوشاد عبدالسمیع بوبیرے (ایڈیٹر صبحِ امید) اور جناب صلاح الدین عثمانی (رجسٹرار طبی و یونانی بورڈ)

اس شاندار تاریخی مشاعرے کے خصوصی مدعوئین تھے۔ ان مہمانانِ خصوصی کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا صاحب، نوشاد صاحب، ساحر صاحب اور تمام شعرائے کرام اور معاونین تقریب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ رسمِ شکریہ پر مشاعرہ کے اختتام کا اعلان ہوا۔



مشاعرہ میں جناب باقر مہدی اپنا کلام
سنا رہے ہیں

۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام راج بھون کے دربار ہال میں منعقدہ تقسیم انعامات کی تقریب میں گورنر مہاراشٹر جناب صادق علی صاحب نے انعامات تقسیم کئے۔ استقبالیہ تقریر میں ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور صاحب نے استقبالیہ تقریر میں اکادمی کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہندوستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں آٹھ اکادمی مختلف ریاستوں میں قائم ہیں سات اکادمی حکومت کی مالی اعانت کے باعث کارکردگی انجام دے رہی ہیں۔ اور مہاراشٹر کی یہ اکادمی حکومت کے زیر انتظام اور سرپرستی میں اردو کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہے۔

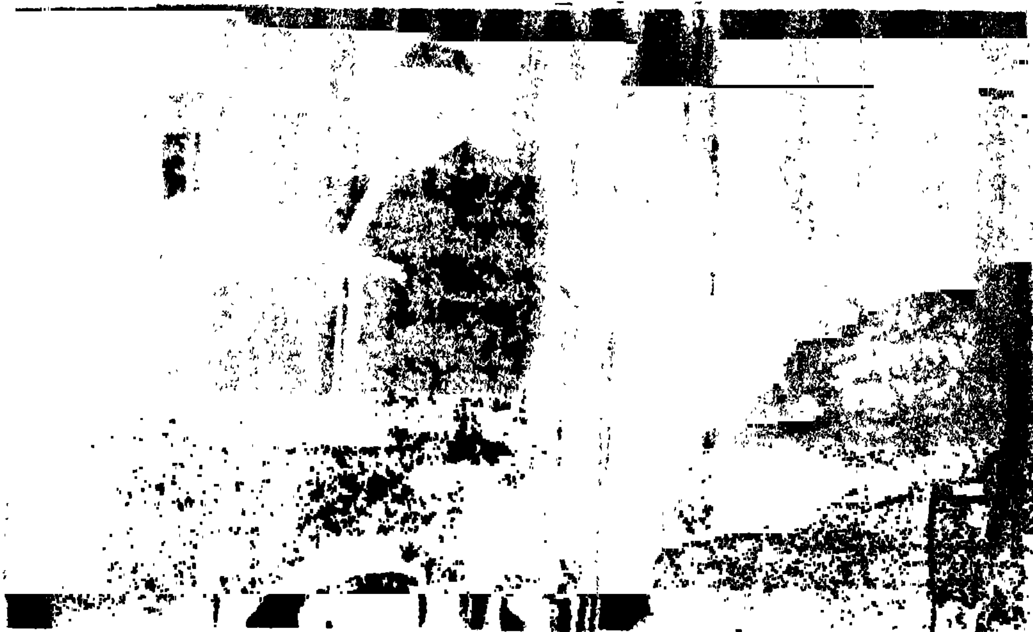
خواجہ صاحب نے کہا کہ جب اکادمی کی تاسیس عمل میں آئی اس وقت میری یہ کوشش رہی کہ اکادمی کا دائرۂ عمل وسیع رہے اور ہماری اکادمی ایک فعال ادارے کی صورت میں اردو کی ہمہ جہت ترقی میں میں ایک اہم رول ادا کرے۔ اس سلسلے میں موصوف نے کہا کہ یہ واحد اکادمی ہے جو بمبئی یونیورسٹی میں "اردو چیئر" کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔ اپنی انتھک کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے کہا کہ بمبئی یونیورسٹی میں اردو چیئر کے قیام کے سلسلے میں کئی بار چانسلر محترم صادق علی صاحب، وائس چانسلر پروفیسر رام جوشی صاحب اور یونیورسٹی کے دیگر ارباب حل و عقد سے ملاقات پر صرف وعدہ ہی نہیں کیا بلکہ ہمیں ان سب کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

اردو تصنیفات کی اشاعت کے لئے مالی امداد، اردو تصانیف پر انعامات، کتابت کے مراکز سیمینار اور مشاعرے کے ذریعے اردو کے ادبی ثقافتی ورثے کو قائم رکھنا، غیر اردو داں حضرات میں اردو کی ترویج، اردو کے کامیاب طلبہ کو انعامات، سنٹرل پریس میں اردو یونٹ کا قیام، اور دیگر سرگرمیاں حکومت کی سرپرستی اور انتظام میں کامیابی سے جاری ہیں۔ نورس کے پہلے شمارے کا اجرا۔ سے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ ہماری پہلی کوشش تھی لیکن رجسٹرار سے اِس نام کی منظوری آگے کے لئے نہ مل سکی اِس لئے نیا نام اسی پرچے کا "امکان" تجویز ہوا ہے اور عنقریب یہ امکان ہے کہ اکادمی کا سہ ماہی مجلہ "امکان" ایک نئی آب و تاب سے شائع ہوگا اور معیاری علمی ادبی صحیفہ ثابت ہوگا۔ موصوف نے کہا کہ اکادمی کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ عمل تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ خواجہ صاحب نے معززین کا استقبال کرتے ہوئے گورنر مہاراشٹر جناب صادق علی صاحب کی اکادمی کے پروگراموں میں دلچسپی اور تعاون پر شکریہ ادا کیا۔

خواجہ صاحب نے اعلان کیا کہ اس سال جون سے ہی یونیورسٹی میں اردو شعبہ قائم ہوگا۔

اس سال ایوارڈ گورنر صادق علی صاحب کے ہاتھوں ریاض احمد خاں (جی دار اور ننھا فرشتہ) ظفر گورکھپوری (سچائیاں)، منیر آرزو (عکس آرزو)، ہارون رشید (صحافت) فیروز اشرف (صحافت)، زرینہ ثانی (سیماب کی نظمیہ شاعری)، عبدالمجید سرور (صحافت) نظام الدین نظام (تتلیاں) اِن حضرات کو دیئے گئے۔ اس کے علاوہ ندا فاضلی، کالیداس گپتا رضا، ممتاز راشد کی تصانیف کو بھی انعامات دیئے گئے۔

تقسیم انعامات کے بعد حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے نہایت شستہ فصیح و بلیغ اردو میں محترم صادق علی گورنر مہاراشٹر نے ادبا، شعرا، صحافیوں کے اِس نمائندہ اجتماع سے خطاب کیا۔ موصوف نے کہا کہ آزاد ہندوستان میں اردو کی ترقی کے لئے حالات سازگار ہیں۔ دوسری زبانیں صوبوں تک محدود ہیں۔ اردو کسی خاص صوبے کی نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے۔ اس کے بولنے اور جاننے



راج بھون میں منعقد تقسیم انعامات کی تقریب کے موقع پر عالی جناب صادق علی گورنر مہاراشٹر حاضرین سے خطاب کر رہے ہیں۔ چیئرمین ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا اور سکریٹری خواجہ عبدالغفور تشریف فرما ہیں۔



چیئرمین جناب اسحٰق جمخانہ والا تقریر کرتے ہوئے

والے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

انہوں نے کہا اردو کی عوامی مقبولیت کے سبب ہی حکومت نے ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم کیں۔ صرف حکومت کی مالی امداد سے اردو کی ترقی آسان ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے اردو داں طبقے کو، ادبا، شعراء، صحافیوں کو جد و جہد کرنا ہوگی اور اردو کی مقبولیت کو اور بڑھانا ہوگا۔ اکادمی ایک ذریعہ ہے اظہارِ حوصلہ افزائی کا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اکادمی سے سراہا جائے بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہر شخص اکادمی کی کارکردگی کو اپنے تعاون سے بڑھائے اور سراہا کرے۔ مخالفانہ رویے سے جس قدر گریز کیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

سیاسی پارٹیاں، تمام ریاستیں، حکومتیں یہ صحیح ہے کہ اردو کے فروغ کے معاملے میں، بقا کے معاملے میں ایک خیال یا ایک مرکز پر متحد و متفق ہیں لیکن اردو جو کہ گزشتہ کئی سالوں سے بحث کا موضوع بنی رہی ہے، آپسی نااتفاقی کی بدولت صحیح ترقی نہیں کر پائی۔ آپ نے کہا ادب کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس لئے ہر ادیب اپنے آپ کو ایک حد میں یا ایک یا ایک حصار میں نہ رکھے بلکہ، اچھل کر بحرِ بیکراں ہو جائے۔

چیئرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے اردو اکادمی کے اغراض و مقاصد سے متعلق کہا کہ مہاراشٹر میں کبھی بھی اردو کے ساتھ متعصبانہ رویہ نہیں رہا۔ یہاں پر جو مواقع اور سہولتیں اردو کے لئے حاصل ہیں کسی ریاست میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔

موصوف نے کہا کہ اکادمی پر لگایا جانے والا یہ الزام بے بنیاد ہے کہ اکادمی کے انعامات ایک محدود طبقے کو دیئے جاتے ہیں۔ اکادمی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ اراکین اکادمی کے متفقہ فیصلے کے بعد ہی انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے اکادمی کے زیرِ اہتمام سیمیناروں اور مشاعروں کا ذکر کیا۔ ناگپور میں اردو کتابت اور اردو کلاسیز سے متعلق کہا کہ بھی اچھا کام اس ضمن میں ہو رہا ہے۔ شولاپور میں جو قابلِ قدر کام اردو کے فروغ میں ہو رہا ہے، اس کا بھی ذکر ڈاکٹر صاحب نے کیا۔

چیئرمین صاحب نے کہا کہ آپسی اختلافات اور گروہ بندی سے اردو کی خدمت ممکن نہیں۔ آپسی اختلافات دور کر کے زبان کے لئے بے لوث ہو کر کام کرنا ہوگا۔

موصوف نے اکادمی کے منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگلے سال سے بہترین طباعت پر پبلشرز کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

رکن اکادمی محترمہ سلمیٰ صدیقی نے رسمِ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی کے انعامات نہ ملنے سے، یا پہلے دوسرے تیسرے انعام کے اعلان سے ادیبوں کی حیثیت و اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اکثر ادبا، شعراء کو یہ اعتراض کہ وہی پہلے انعام کے مستحق ہیں اور اس سلسلے میں احتجاج کرنے سے وہ اپنی ادبی حیثیت و اہمیت کو بڑھاتے نہیں بلکہ گھٹاتے ہیں۔ محترمہ سلمیٰ صاحبہ نے کہا کہ ایسے بہت سے ہندوستانی ادبا، شعراء ہیں جنہیں بین الاقوامی طور پر مانا جاتا ہے مگر انہیں ساہتیہ اکادمی کے انعامات نہیں ملے۔ اس سے ان کی مقبولیت یا ان کے تخلیقی معیار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ دورانِ شکریہ سلمیٰ صاحبہ نے کہا کہ ادب کی دنیا وسیع ہے، ہم اس خیال میں اگر رہیں تو اپنے آپ کو ایک محدود دائرے میں بند کر دیں گے۔ میری یہ گذارش ہے کہ ان تمام روشن خیال ادبا، شعراء سے جنہیں اکادمی سے انعامات سے نوازا ہے کہ وہ اکادمی اور حکومت کے اِس اظہارِ خلوص و محبت کا احترام کریں۔

جناب خواجہ عبدالغفور نے آخر میں ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کیا کہ حکومت چاہتی ہے کہ اردو



جناب خواجہ عبدالغفور تعارفی تقریر کرتے ہوئے



گورنر بہار اخلاق الرحمان قدوائی جناب ڈاکٹر زرینہ ثانی کو انعام سے نواز رہے ہیں

کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے اور یہاں اس کے فروغ کی مہم کوشش جاری رہے۔ موصوف نے ڈائرکٹر پبلسٹی جناب ایشور ساہا ماتحرا اخبارات آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کا بھی شکریہ ادا کیا۔ راج بھون سے عملے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج اکادمی کی اس تقریب کے لئے بھی اور اس سے قبل بورڈ کی میٹنگ کے سلسلے میں جو اہتمام و انتظام کیا ہے، اس کے لئے میں اور پورا بورڈ ممنون ہے۔

تقریب کے بعد گورنر صاحب، ڈاکٹر سبحانہ والا چیئرمین اکادمی اور خواجہ عبدالغفور صاحب ممبر سکریٹری نے ادبا، شعرا، صحافیوں اور انعام یافتگان سے ملاقات کی۔ راج بھون کے خوبصورت لان پر عصرانہ کا اہتمام کیا گیا۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۰ء

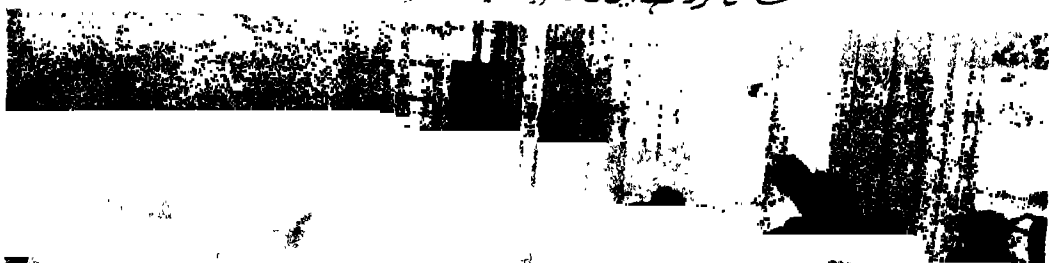
اردو اکادمی کے زیر اہتمام اور ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال کے تعاون سے انجمن اسلام بوری بندر میں ایک تعلیمی نمائش اور سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا۔ انجمن اسلام کے کریمی لائبریری ہال میں اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا صاحب نے نمائش کا افتتاح کیا۔ اور تعلیمی مجلس اکبر پیر بھائی ہال میں زیر صدارت ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب منعقد ہوئی۔ جناب خواجہ عبدالغفور ممبر سکریٹری اکادمی نے ابتدا میں کہا کہ اس تعلیمی نمائش و مجلس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ گزشتہ دنوں پونہ میں تعلیمی سیمینار، نمائش اور ورکشاپ کے افتتاح کا مجھے موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک اچھا کام ہے۔ اردو اکادمی بھی آئندہ اس ضمن میں اہم اقدام اٹھائے گی۔ اکادمی کی مختلف کارکردگی پر نظر ڈالتے ہوئے موصوف نے کہا کہ آج کا یہ پروگرام بہ عجلت ممکنہ ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ آپ نے تعارفی تقریر میں اساتذہ طلبا و طالبات اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ جناب عبدالسمیع بوبیرے (مدیر صبح امید) اپنے خیالات کے اظہار سے اس تعلیمی مجلس کی ابتدا کریں گے۔

جناب عبدالسمیع بوبیرے نے اپنی تقریر میں اکادمی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ پہلے کے مقابلے میں اکادمی نے نہ صرف اپنے دائرۂ کار کو وسیع کیا ہے بلکہ عملاً اس قسم کے پروگراموں کے انعقاد سے ایک سازگار فضا پیدا کر رہی ہے۔ ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب اور خواجہ عبدالغفور صاحب کی رہنمائی میں جہاں کہیں مفید اسکیمیں شروع کی گئی ہیں وہیں آج ایک خوش آئند روایت قائم کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کی ذاتی کوششوں سے ممکن ہو سکی ہیں۔ آپ نے کہا کہ خواجہ صاحب نے کچھ عرصہ قبل پہلی بار اردو ڈراموں کے فروغ کے لئے ریاستی سطح پر اردو ڈرامہ فیسٹول منانے کی بنیاد ڈالی۔ آج اکادمی کی ایک اور کارکردگی بڑھ گئی ہے۔

جناب عبدالسمیع صاحب نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ آج کی اس مجلس کا موضوع (TEACHING AIDS) تعلیمی امدادی وسائل ہے لیکن اس ضمن میں سکنڈری اسکولوں میں کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ کارپوریشن کے تحت اسکول



راج بھون میں منعقد انعامی تقریب کا ایک منظر
جناب منیر آرزو۔ گورنر مہاراشٹر عالی جناب صادق علی سے انعام
حاصل کر رہے ہیں۔ حاضرین کا ایک منظر ↓





میں اس پر بڑا کام ہو رہا ہے اور اکثر و بیشتر درسگاہوں کی سرپرستی کے ضمن [illegible]
میں سیمیناروں اور نمائشوں میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ کارپوریشن کی اردو [illegible] میں
کئی ایک موضوع پر سیمینار ہوتے رہتے ہیں۔ میری یہ تجویز ہے کہ اردو اکادمی اگر [illegible] تو
کارپوریشن یا کسی بھی تعلیمی ادارہ کے تعاون سے تعلیمی سیمینار، نمائش اور ورکشاپ کا اہتمام کرے
اکادمی کو جو بنیادی کام کرنے ہیں اس میں یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ اس اسکیم سے ہزاروں اردو
میڈیم کے اساتذہ و طلبہ (پرائمری) مستفیض ہوں گے۔ اس سلسلے میں ایک MASS پروگرام ہو
اور کارپوریشن یا کسی بھی تعلیمی ادارہ کو (SPONSOR) کیا جائے۔ پرائمری و سکینڈری
اسکول کے اساتذہ اور ٹریننگ کالجوں کے طلباء و طالبات کے لئے ایک چار یا پانچ روزہ سیمینار
نمائش اور ورکشاپ کا اہتمام ہو۔ اکادمی کے ذریعہ پیش کئے جانے پر بعض نصابی و تعلیمی مسائل
کو بھی دور کیا جا سکے گا۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہوا تو اکادمی کی سرپرستی میں بمبئی کے علاوہ مہاراشٹر
کے دیگر شہروں میں اس قسم کے پروگرام منعقد ہو سکتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے

جناب رضی الرحمن صاحب (ڈان ایجوکیشن سوسائٹی) نے کہا کہ حیدرآباد کے مقابلے
میں بمبئی میں اردو سکھانے کا بہترین موقع ملا۔ اور میں نے بے شمار غیر اردو داں حضرات
کو اردو کی تعلیم دی۔ اردو اکادمی سے متعلق تعریفی کلمات کہتے ہوئے رضی صاحب نے امید ظاہر
کی کہ تعلیم و تدریس کی دنیا کی طرف اکادمی جو توجہ دے رہی ہے۔ اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد
ہوں گے۔

محترمہ رضیہ نظام الدین پرنسپل انجمن خیر الاسلام ایجوکیشنل ٹریننگ کالج نے کہا کہ میں جناب عبدالسمیع
بوبیرے صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ میونسپل اسکولوں میں تعلیمی وسائل
سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے لیکن کارپوریشن کے پاس مالی وسائل زیادہ ہیں جبکہ ہمارے
پرائیویٹ تعلیمی ادارے اس کے متحمل نہیں۔ اگر اکادمی ہمیں مستقل میں خدمت کرنے کا
موقع دے تو یقیناً بہتر کارکردگی سامنے آئے گی۔ محترمہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ تعلیمی وسائل
کس قدر ضروری ہیں۔ اور اس کا استعمال کس طرح ہونا چاہیئے۔ مالی وسائل نہ ہونے کے
سبب بہت سی کار آمد باتیں یا چیزیں پیش کرنے سے رہ جاتی ہیں لیکن ردی اشیاء
WASTE MATERIAL سے بھی کار آمد تعلیمی وسائل تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اور ہم
نے ان تجربوں سے آج بھی کئی ماڈل اور چارٹ تیار کئے ہیں۔

ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب ڈائرکٹر آف پروگرام ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال (این
سی ای آر ٹی کے ماتحت) نے کہا کہ اردو اکادمی قابل قدر خدمت انجام دے رہی ہے
موصوف نے کہا بھوپال میں مہاراشٹر سے آنے والے اساتذہ جو کالج میں ٹریننگ پا رہے
ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کی کارکردگی دیگر علاقوں کے اساتذہ سے بہت ہی اچھی ہے۔
کالج کے نتیجہ میں سرفہرست مہاراشٹر کے اساتذہ ہیں۔ یہی نہیں موصوف نے کہا ہم بڑی عجلت
میں یہ نمائش پیش کر رہے ہیں لیکن ہمارا تعاون ہمیشہ تعلیمی وسائل و مقاصد کے لئے حاضر رہے گا

جناب خواجہ عبدالغفور نے بتایا کہ تعلیمی معیار ہماری ریاست میں [illegible] ہے اور بے شمار
پرائمری و سکینڈری اسکول میونسپل کارپوریشن ضلع پریشد اور گرام [illegible] کے زیر اہتمام
ہی نہیں بلکہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے تحت بھی اردو میڈیم کے [illegible] چلائے جاتے

جناب ریاض احمد خان گورنر مہاراشٹر عالی جناب صادق علی سے انعام حاصل کر رہے ہیں



چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا اور ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور تعلیمی نمائش کا معائنہ کر رہے ہیں

خصوصاً کراچی میں اسکولوں اساتذہ اور طلباء و طالبات کی ایک دو [illegible] کے ذریعے [illegible] مبنی
ہے۔

ڈاکٹر [illegible] جہانہ والا صاحب نے کہا کہ ہمارے تعلیمی اداروں کی مشکلات [illegible] ہیں لیکن
یہ پیچیدہ مسائل سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے لگن خلوص اور جذبہ کی انتہا چاہیئے۔ تعلیمی
اداروں کے اساتذہ ہوں یا پرنسپل حضرات ہوں یا انتظامیہ کے عہدیدار ہر ایک کی کی جلی
کوشش ہونی چاہیئے کہ کام نیک نیتی اور خلوص سے انجام پذیر ہو۔ محترم ڈاکٹر جہانہ والا
نے کہا کہ اگر ہم مل جل کر کام کریں اور نام و نمود سے پرہیز کریں تو دیگر قوموں کے تعلیمی اداروں
سے کہیں زیادہ بہتر کارکردگی پیش کر سکتے ہیں۔

جناب شبیر احمد راہی رکن اکادمی نے آخیر میں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی اپنے
اس پروگرام کو مزید آگے بڑھائے گی۔ آپ نے کہا کہ یہ تجویز معقول ہے کہ پرائمری و سیکنڈری
ٹیچنگ والوں کے لئے ایک علیحدہ پروگرام منعقد کیا جائے اور تعلیمی سیمینار و نمائش
کا اہتمام کیا جائے۔

اس مجلس میں جناب ریاض احمد خان (مدیر قومی راج) جناب ظہیر عباس رضوی
(خیابان پبلی کیشنز) ڈاکٹر محمود انجم شیخ، جناب سعید رضوانی، جناب یوسف کھتری، محترمہ زاہدہ
توفیق، ڈاکٹر شیخ فرید صاحب بھی شریک تھے۔

چیرمین اردو اکادمی تعلیمی نمائش کا معائنہ کرتے ہوئے
ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور اور دیگر حضرات کے ساتھ
ایک تصویر —

مخدوم - دوسروں کی نظر میں

مخدوم محی الدین کی شاعری میں بہت پُرخلوص جذبوں کی جھلکیاں موجود ہیں جس سے ان کی شاعری میں وزن اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بہت مضبوط قسم کا اشتراکی شاعر ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

فکرِ مخدوم کے مثلث کے تین زاویے خدا، انسان اور تشکیکِ فکر کی یہ تثلیث ان کئی عمروں کی جو ایک عمر میں گزری تھیں ، شیرازہ بندی کرتی ہے۔ خدا کی خدمت کو انسان کی خدمت بناتی اور مذہب سے شغف کو ایک سیاسی نظریے سے وابستگی کی شکل دیتی ہے۔ تثلیث مخدوم کی زندگی بھی ہے اور شاعری بھی

ڈاکٹر وحید اختر

مخدوم کی غزلیہ شاعری

"وہ ترقی پسند غزل کی نمائندگی کرتا ہے۔ روایت سے کہیں کوئی نمایاں انحراف نہیں، اساتذہ خصوصاً حافظ کی رومانیت کا عکس ملتا ہے، کلاسیکیت کا آہنگ موجود ہے، لہجہ تازہ کار ہے۔ زبان کی کچھ فروعی لغزشیں ہیں۔ ان کے یہاں غنائیت، شگفتگی، جذبے کی شدت، احساس کی نزاکت اور خیال کی لطافت اس طرح باہم دگر آمیز ہیں کہ ان کی غزلیں تغزل کے پیمانے میں مکمل طور پر ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔"

ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمہاری شاعری عصرِ حاضر کے اضطراب اور احساس کی آئینہ دار ضرور ہے تمہارے فنی شعور میں ہر جگہ سماجی شعور کی روح ضرور تڑپتی نظر آتی ہے۔

مخدوم کے نام ایک خط میں ــــ سبطِ حسن

اگر مخدوم کی اچانک اور قبل از وقت وفات ہوئی تو اس کا سبب یہی ہے کہ مخدوم نے اپنے جسم اور اپنی ذات کو ان کا وہ تھوڑا سا حق دینے سے انکار کیا جو صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا لیکن افسوس اب انہیں کیسے سمجھا اور اگر کوئی مخدوم کو سمجھا سکتا تب پھر وہ شاید یہ سول اٹھا دیتے کہ زندگی کو اس کی کمیت سے نہیں بلکہ کیفیت سے ناپنا چاہیئے۔

سجاد ظہیر

ڈائرکٹر آف لینگویجز

حکومت مہاراشٹرا

ریاست مہاراشٹرا میں مراٹھی بولنے والوں کی آبادی اکثریت میں ہے اس لئے یہاں کی دفتری زبان مراٹھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیگر اقلیتی زبانوں کے بولنے والوں کو حکومت کے اعلانات، فیصلے وغیرہ سمجھنے میں نیز مراسلے اور درخواستیں پیش کرنے میں دقت نہ ہو اس لئے مختلف زبانوں کے لئے لینگوئج آفیسروں کا تقرر کیا گیا ہے۔ اردو کے لئے بمبئی ناگپور اور اورنگ آباد میں ایک ایک ایسا افسر موجود ہے۔

حکومت کے محکمہ جاتی صدور، وزراء اور گورنر کے نام اردو میں آنے والی درخواستوں کے ترجمے کر کے پیش کئے جاتے ہیں۔

ٹاؤن پلاننگ اور پولس وغیرہ محکموں کے اعلانات اگر اردو زبان بولنے والوں کی اکثریت کے علاقوں کے لئے مخصوص ہوں تو وہ اردو میں شائع کئے جاتے ہیں۔

قانون دکانات و ادارہ جات، ایمپلائز پروویڈنٹ فنڈ، قانون اقل ترین اُجرت اور گریچویٹی ایکٹ جیسے عوامی دلچسپی کے قوانین کے خلاصوں کو دستی شکل میں پیش کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں مہاراشٹرا میں سیر و تفریح کے مقامات کے تعلق سے متعدد کتابچے اور ہالی ڈے کیمپوں کے لئے ریزرویشن کے قواعد اردو میں مرتب کئے گئے ہیں نیز مہاراشٹرا میں پھلوں کے درختوں اور کھیتوں کی فصلوں کو ٹھیک ڈھنگ سے پروان چڑھانے اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ڈائرکٹوریٹ آف ایگریکلچر کی معلوماتی کتابچوں کے اردو میں ترجمے ہو کر زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہے جا رہے ہیں۔

اورنگ آباد کے مقامی اخباروں کے لئے پریس نوٹ اردو میں مہیا کئے جاتے ہیں اور یہ کام لنگوئج آفیسر اردو کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

...zine Released

... quarterly magazine of ... Maharashtra State Urdu ... was released by Dr. Ishaq ... Minister of the State ... Labour, Auqaf and ... and Chairman of the Urdu ... at a function held at ... Guest House in Bombay ... 22

... on the occasion, ... Khanawala said, though the ... was rather belated, all ... of the editorial com... however deserved compli... He appreciated the interest ... Shri S. A. Sapre, Director ... Government Printing and Statio... and Shri G. D. Dhond, ... Government Central Press, ... in printing the magazine.

... Minister further said that by ... the Urdu Academy the ... Maharashtra Government has ... its desire to promote ... language. He also revealed ... sum of Rs. 8 lakhs out of ... grant under the budget of ... lakhs had been sanctioned to ... Academy for implementation of ... programme during the current ... year.

Referring to the Academy's ... programme, Shri Jamkhana ... announced that it would orga... the next All India Mushaira ... Central Bombay. The Academy

شگوفہ

نورس

URDU IS ...

MAHARSHI DAYANAND COLLEGE OF ARTS & SC.

(Founded in 1960 by Shri Mangaldas N. Verma)

Parel, Bombay

Date ...

اردو اکیڈمی مہاراشٹرا نے
نورس — جاری کرکے اردو زبان کو ایک قدم
اور آگے بڑھایا ہے ۔ اس پرچے کا نثری مواد
قابل قدر ہے ۔ چھپائی، طباعت اور گیٹ اپ کا تو
جواب ہی نہیں ۔ مہاراشٹر گورنمنٹ اور اردو اکیڈمی
کے ممبران کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

رفیق جعفر
5/2/80

Kamal Prasad Kamal
(Sahitya Charya)
Deputy Director of Tourism (Retd.)

Ref. ...

THE CULTURAL ...

MAHBOOB RAHI
M. A. (Gr. Scholar)

رام لعل - (لکھنؤ)

مکرمی خواجہ عبدالغفور صاحب تسلیم!

مہاراشٹر اردو اکادمی کا سہ ماہی رسالہ "نورس" ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ رسالے کی پیش کش میں ایک ایسا وقار ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ خدا کرے نقشِ ثانی نقشِ اول سے اور زیادہ اچھا ہو جس کا آپ نے وعدہ بھی کیا ہے۔

اس جریدے کی پیشکش کے ساتھ مہاراشٹر اردو اکادمی ہندوستان کی ساری اکادمیوں سے آگے نکل گئی ہے جو ابھی تک ایسے اقدام نہیں کرسکی ہیں۔

ادارتی انجمن کے سارے رفیقوں تک بھی میری مبارکباد پہونچادیں۔

آپ کا مخلص
رام لعل

ادیب مالیگانوی (مالیگاؤں)

جناب محترم!

سلام و نیاز

نورس کا اولین شمارہ ۴؍ جنوری کو ملا تھا۔ تاخیر کا وہ احساس جو خلش بنتا جارہا تھا، پہلی ہی نظر میں نشاط و طمانیت میں بدل گیا۔

یہ شمارہ ظاہری صورت کے اعتبار سے جتنا دلکش اور ضخیم ہے اس سے کہیں زیادہ شاندار اور عظیم ہے۔ معنوی لحاظ سے نورس کی ترتیب اور تکمیل میں جن دماغوں اور ہاتھوں نے اپنا کمال دکھایا ہے، بلاشبہ وہ سب کے سب تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔ میں اس شاہکار جریدہ کی اشاعت پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

غزل کو جس اعزاز سے نوازا گیا ہے اس کے لئے میں ادارہ کا ممنون کرم ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ نورس آئندہ بھی اسی شان و اہتمام سے شائع ہوا کرے گا جو ریاستی رسائل کے میدان میں ایک انفرادی اور امتیازی مقام رکھتا ہے۔

مخلص
ادیب مالیگانوی

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

گرامی قدر! تسلیم

مہاراشٹر میں ایک ایسے علمی جریدہ کی سخت ضرورت تھی جو اردو کی ہمہ جہتی ترقی کا ضامن ہو "نورس" کے پہلے ہی شمارہ کے من و عن مطالعہ کے بعد بلاخوفِ تردید عرض گذارِ خدمت ہوں کہ آپ کا یہ اردو مجلّہ اس کمی کو پورا کرسکے گا۔ بلکہ مہاراشٹر کے ادب کو بھی سربلند کرنے کا ذریعہ بنے گا۔ میری طرف سے اس کے اجراء پر ہدیۂ مبارکباد قبول فرمائیے — خدا کرے مزاج بخیر ہو۔

مخلص
عتیق احمد عتیق

محمود عشقی (ناندیڑ)

محترم خواجہ عبدالغفور صاحب! تسلیم۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا سہ ماہی مجلّہ نورس جاندار بھی ہے اور شاندار بھی۔ مقالے افسانے اور شعری حصّہ بھی پسند آیا۔ اس خوبصورت مجلہ کی اشاعت پر میں آپ کو حسن کمال صاحب اور فضیل جعفری صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں۔ شکریہ — مخلص
محمود عشقی

انقلاب بمبئی :

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی نے ریاستی وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ، لیبر، اوقاف پروٹوکول اور چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا، اور ریاستی وزیر مملکت برائے صنعت و ثقافتی امور اور وائس چیئرمین اردو اکادمی ونائیک راؤ پاٹل کی سرپرستی اور خواجہ عبدالغفور صاحب آئی اے ایس کی نگرانی میں "نورس" نامی جریدہ جاری کرکے ایک بہت بڑی ضرورت اور علمی و ادبی تقاضے کو پورا کیا ہے۔ یہ اقدام فی الواقع قابلِ ستائش و تحسین ہے۔

جناب حسن کمال اور سلمیٰ صدیقی کی ادارت میں نکلنے والے اس جریدہ کا نقشِ اوّل نگاہوں کے سامنے ہے اور بے ساختہ یہ دعا نکلتی ہے نقوشِ ثانی سے خوب سے خوب تر ہوتے رہیں اور تشنہ کامانِ شعروادب کو متمتع اور سیراب کرتے رہیں۔

مضامین و مقالات، افسانوں، غزلوں، نظموں اور انشائیے کے انتخاب میں ایک صاف ستھرے ادبی علمی ذوق کی عکاسی ہے۔

توقع ہے کہ "کتابوں کی دنیا" میں لائق مطالعہ جو بھی مواد موجود ہے یہ سہ ماہی مجلہ اپنی خالص ادبی و علمی خصوصیت و ماہیت کے سبب دن بدن مقبولیت حاصل کرتا جائے گا۔ آخر میں ہم یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ جریدہ کے آئندہ شماروں میں مواد و پیش کش لے آوٹ اور گٹ اپ ہر اعتبار سے نکھار پیدا کرنے کی ہر سطح پر کوشش جاری رہے گی تاکہ مستقبل قریب میں یہ علمی و ادبی جریدہ ایک قابلِ قدر مقام حاصل کر سکے۔ لائبریریوں اور دارالمطالعہ میں شوق کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی کو محسوس نہ کیا جا سکے جو ایسے اعلیٰ معیار کے جرائد کی قلت کے سبب عام طور پر محسوس ہوتی ہے۔

مجموعی اعتبار سے "نورس" اردو اکادمی کے عہدیداروں کی ایک مبارک کوشش کا نتیجہ ہے جو یقیناً قابلِ داد ہے اور یہ بھی کہ اپنی اتنی ساری خوبیوں کے باوصف اس سہ ماہی جریدہ کی قیمت زیادہ بھی نہیں کہی جا سکتی۔ کتابت اور طباعت میں بھی صفائی و پاکیزگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

شگوفہ : (حیدرآباد) ——

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور کی زیرِ نگرانی ایک ادبی جریدہ "نورس" کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جس کا پہلا شمارہ ۲۵۴ صفحات پر مشتمل جناب حسن کمال (مدیر ہفت روزہ بلٹز) کی زیرِ ادارت نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی جریدہ کی شریک مدیر ہیں۔ خوب صورت اور حسین ترین سرورق (عمدہ) کتابت و طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ بڑے سائز پر شائع شدہ ضخیم شمارہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا ایک اور کارنامہ ہے جس کے لئے اکادمی کے سکریٹری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جریدہ کو ملک کے اہم تخلیق کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ نظموں، غزلوں، افسانوں کے علاوہ مضامین کا حصہ بھی کافی وقیع ہے۔ مختلف النوع مضامین کے علاوہ آخر میں مہاراشٹر میں اردو افسانہ، اردو صحافت آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح اورنگ آباد میں اردو ادب پر ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، حیات اللہ انصاری، خواجہ عبدالغفور، سلمیٰ صدیقی اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے مقالے شریک ہیں جو شائد اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے۔ ان میں سے اکثر مضامین کو پڑھنے کے بعد تشنگی کا سا احساس ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ سیمیناروں کے لئے سینئر اور معروف ترین ادیبوں و نقادوں سے مضامین لکھوانے کی بجائے ان کی صدارت میں سیمینار منعقد ہوا اور مضامین ایسے ادیبوں سے لکھوائے جائیں جو وقت دے سکیں اور موضوع سے انصاف کر سکیں۔ نورس کے آخری حصہ میں مہاراشٹر اردو اکادمی کی سرگرمیوں اور آئندہ پروگراموں کا تعارف اور تصاویر شامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ نورس آئندہ بھی اسی معیار سے نکلتا رہے گا۔

(م.ک)

رام لعل ۔ رائکشن

مکرمی خواجہ عبدالغفور صاحب تسلیم!

مہاراشٹر اردو اکادمی کا سہ ماہی رسالہ "نورس" ملا ۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا ۔ رسالے کی پیش کش میں ایک ایسا وقار ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔ خدا کرے نقش ثانی نقش اول سے اور زیادہ اچھا ہو ۔ جس کا آپ نے وعدہ بھی کیا ہے ۔

اس جریدے کی پیشکش کے ساتھ مہاراشٹر اردو اکادمی ہندوستان کی ساری اکادمیوں سے آگے نکل گئی ہے جو ابھی تک ایسے اقدام نہیں کر سکی ہیں ۔

ادارتی انجمن کے سارے رفیقوں تک بھی میری مبارکباد پہونچا دیں ۔

آپ کا مخلص
رام لعل

ادیب مالیگانوی (مالیگاؤں)

جناب محترم!

سلام و نیاز

نورس کا اولین شمارہ ۴ر جنوری کو ملا تھا ۔ تاخیر کا وہ احساس جو خلش بنتا جا رہا تھا ، پہلی ہی نظر میں نشاط و طمانیت میں بدل گیا ۔

یہ شمارہ ظاہری صورت کے اعتبار سے جتنا دلکش اور ضخیم ہے اس سے کہیں زیادہ شاندار اور عظیم ہے ۔ معنوی لحاظ سے نورس کی ترتیب اور تکمیل میں جن دماغوں اور ہاتھوں نے اپنا کمال دکھایا ہے ، بلاشبہ وہ سب کے سب تحسین و آفرین کے مستحق ہیں ۔ میں اس شاہکار جریدہ کی اشاعت پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

غزل کو جس اعزاز سے نوازا گیا ہے اس کے لئے میں ادارہ کا ممنون کرم ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ نورس آئندہ بھی اسی شان و اہتمام سے شائع ہوا کرے گا جو ریاستی رسائل کے میدان میں ایک انفرادی اور امتیازی مقام رکھتا ہے ۔

مخلص
ادیب مالیگانوی

عتیق احمد عتیق (مالیگاؤں)

گرامی قدر! تسلیم

مہاراشٹر میں ایک ایسے علمی جریدہ کی سخت ضرورت تھی جو اردو کی ہمہ جہتی ترقی کا ضامن ہو "نورس" کے پہلے ہی شمارہ کے من و من مطالعہ کے بعد بلاخوف تردید عرض گذار خدمت ہوں کہ آپ کا یہ اردو مجلّہ اس کمی کو پورا کر سکے گا ۔ بلکہ مہاراشٹر کے ادب کو بھی سربلند کرنے کا ذریعہ بنے گا ۔ میری طرف سے اس کے اجراء پر ہدیۂ مبارکباد قبول فرمائیے ۔۔ خدا کرے مزاج بخیر ہو ۔

مخلص
عتیق احمد عتیق

محمود عشقی (ناندیڑ)

محترم خواجہ عبدالغفور صاحب! تسلیم ۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا سہ ماہی مجلہ نورس جاندار بھی ہے اور شاندار بھی ۔ مقالے افسانے اور شعری حصہ بھی پسند آیا ۔ اس خوبصورت مجلہ کی اشاعت پر میں آپ کو حسن کمال صاحب اور فضیل جعفری صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں ۔ شکریہ ۔۔ مخلص

محمود عشقی

انقلاب بمبئی :

مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی نے ریاستی وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ لیبر اوقاف پروٹوکول اور چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا اور ریاستی وزیر مملکت برائے صنعت و ثقافتی امور اور وائس چیئرمین اردو اکادمی ونائیک راؤ پاٹل کی سرپرستی اور خواجہ عبدالغفور صاحب آئی اے ایس کی نگرانی میں نورس نامی جریدہ جاری کرکے ایک بہت بڑی ضرورت اور علمی و ادبی تقاضے کو پورا کیا ہے۔ یہ اقدام فی الواقع قابلِ ستائش و مستحسن ہے۔

جناب حسن کمال اور سلمٰی صدیقی کی ادارت میں نکلنے والے اس جریدہ کا نقشِ اوّل نگاہوں کے سامنے ہے اور بے ساختہ یہ دعا نکلتی ہے نقوشِ ثانی سے خوب سے خوب تر ہوتے رہیں اور تشنہ کامانِ شعروادب کو متمتع اور سیراب کرتے رہیں۔

مضامین و مقالات، افسانوں، غزلوں، نظموں اور انشائیے کے انتخاب میں ایک صاف ستھرے ادبی علمی ذوق کی عکاسی ہے۔

توقع ہے کہ "کتابوں کی دنیا" میں لائقِ مطالعہ جو بھی مواد موجود ہے یہ سہ ماہی مجلہ اپنی خالص ادبی علمی خصوصیت و ماہیت کے سبب دن بدن مقبولیت حاصل کرتا جائے گا۔ آخر میں ہم یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ جریدہ کے آئندہ شماروں میں مواد و پیش کش لے آوٹ اور کٹ اپ ہر اعتبار سے نکھار پیدا کرنے کی ہر سطح پر کوشش جاری رہے گی تاکہ مستقبل قریب میں یہ علمی و ادبی جریدہ ایک قابلِ قدر مقام حاصل کرسکے۔ لائبریریوں اور دارالمطالعہ میں شوق کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کمی کو محسوس نہ کیا جاسکے جو ایسے اعلیٰ معیار کے جرائد کی قلت کے سبب عام طور پر محسوس ہوتی ہے۔

مجموعی اعتبار سے "نورس" اردو اکادمی کے عہدیداروں کی ایک مبارک کوشش کا نتیجہ ہے جو یقیناً قابلِ داد ہے اور یہ بھی کہ اپنی اتنی ساری خوبیوں کے باوصف اس سہ ماہی جریدہ کی قیمت زیادہ بھی نہیں کہی جاسکتی۔ کتابت اور طباعت میں بھی صفائی و پاکیزگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

شگوفہ: (حیدرآباد) ——

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور کی زیرِ نگرانی ایک ادبی جریدہ "نورس" کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا تھا جس کا پہلا شمارہ ۲۵۴ صفحات پر مشتمل جناب حسن کمال (مدیر ہفت روزہ بلٹز) کی زیرِ ادارت نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ محترمہ سلمٰی صدیقی جریدہ کی شریک مدیر ہیں۔ خوب صورت اور حسین ترین سرورق اچھی کتابت و طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ بڑے سائز پر شائع شدہ ضخیم شمارہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا ایک اور کارنامہ ہے جس کے لئے اکادمی اور اس کے سکریٹری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جریدہ کو ملک کے اہم تخلیق کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ نظموں، غزلوں، افسانوں کے علاوہ مضامین کا حصہ بھی کافی وقیع ہے۔ مختلف النوع مضامین کے علاوہ آخر میں مہاراشٹر میں اردو افسانہ، اردو صحافت آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح اورنگ آباد میں اردو ادب پر ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، حیات اللہ انصاری، خواجہ عبدالغفور، سلمٰی صدیقی اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے مقالے شریک ہیں جو شائد اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے۔ ان میں سے اکثر مضامین کو پڑھنے کے بعد تشنگی کا سا احساس ہوتا ہے۔ بہتر ہوتا کہ سیمیناروں کے لئے سینئر اور معروف ترین ادیبوں و نقادوں سے مضامین لکھوانے کی بجائے ان کی صدارت میں سیمینار منعقد ہوں اور مضامین ایسے ادیبوں سے لکھوائے جائیں جو وقت دے سکیں اور موضوع سے انصاف کرسکیں۔ نورس کے آخری حصہ میں مہاراشٹر اردو اکادمی کی سرگرمیوں اور آئندہ پروگراموں کا تعارف اور تصاویر شامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ نورس آئندہ بھی اسی معیار کے ساتھ نکلتا رہے گا۔
(م،ک)

ماہنامہ آہنگ (گیا)

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے کارناموں سے میں پوری طرح واقفیت تو نہیں رکھتا ہوں، مگر اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس اکیڈمی کا انتظامیہ نہ صرف نظم و نسق کا ماہر ہے بلکہ اسے ادب کا بھی اتنا ہی اچھا ذوق ہے، سرکاری کام، فرض ہو سکتا ہے اور فرض شناسی بڑی خوبی ہے۔ مگر یہ رسالہ صرف فرض شناسی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس سے کام کرنے والوں کا ادبی ذوق بھی ظاہر ہوتا ہے۔

حسن کمال کی ادارت، سلمیٰ صدیقی کی ادارت میں شرکت۔ صلاح کاروں میں فضیل جعفری، ڈاکٹر عبدالستار رسالے کی خوبیوں کے لئے داد کے مستحق ہیں۔ حسن کمال کے حسن ادارت اور سلمیٰ صدیقی کا رچا ہوا ذوق، فضیل جعفری کی صلاحیتیں اور نگران اعلیٰ خواجہ عبدالغفور کی محنت لگن اور اردو سے محبت ـــــ سب کچھ اس رسالہ سے آشکار ہے۔

بہت خوبصورت ٹائٹیل، بہترین کاغذ اور روشن کتابت، ان سب نے مل کر اسے حفاظت سے رکھنے اور رغبت سے پڑھنے کا پورا انتظام کر دیا ہے۔ دوسری ریاستوں میں بھی اردو اکیڈمیاں ہیں اور یہ سب بھی کام کرتی ہیں۔ اچھا کام کرتی ہیں، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ کرناٹک اور مہاراشٹر کی اردو اکیڈمیاں خاص امتیاز رکھتی ہیں ـــــ۔

مضامین بارہ عدد ہیں۔ ہر مضمون پر لکھنے کے لئے اس تبصرے میں گنجائش نہیں۔ مگر ایک دو کا ذکر تو کرنا ہی پڑے گا۔ اعجاز صدیقی پر راہی معصوم رضا کا مضمون حقیقت پسندانہ ہے اور ہر لفظ سے اس کی محبت ٹپکتی ہے جو اسے اعجاز صدیقی سے ہے اور ہونی چاہئے۔ لیکن راہی نے شاعری کی محبت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا ہے راہی فن کے معاملے میں بھی اتنا ہی مخلص ہے جتنا شخصیتوں کے سلسلے میں:

> "یگانہ اور اعجاز صدیقی کا ایک ساتھ نام لینے کا مطلب یہ نہیں کہ میں یگانہ کے پائے کا شاعر مانتا ہوں۔ یگانہ کے ہم پلہ تو اقبال اور حسرت موہانی بھی نہیں تو بھلا اعجاز صدیقی سے کوئی ان کا کیا مقابلہ کرے گا" مثلاً

میں اس مضمون کے اصل تنقیدی رویہ سے اپنے آپ کو متفق پاتا ہوں، سوائے اس کے کہ بعض باتیں جو راہی نے ضمنی طور پر چلتے چلاتے لکھ دی ہیں ہر چند کہ ان باتوں میں وزن کم نہیں ہے۔ شاعر اپنی نظم میں اگر اکیلا نہیں ہوتا تو پھر شاعر کو کئی خطرات گھیر لیتے ہیں ـــ راہی کی بات خلاقانہ ذہن ہی محسوس کر سکتا ہے۔ سردار جعفری اور ان جیسے بیرونی شاعروں کو شاعروں کی فہرست میں رکھنا بھی مشکل ہے۔

اقبال اور اس کا عہد، جگن ناتھ آزاد کا مضمون ہے۔ اقبالیات کو آزاد نے بہت کچھ دیا ہے۔ کبھی موقعہ ہوا تو اس گودام سے کام کا مال نکالا جائے گا۔ مثلاً گاندھی جی، محمد علی جوہر کو ترقی پسند کہنا آج مشکل ہے۔ کیونکہ گذرے ہوئے وقت نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑنے والوں کے اذہان کی جانچ پرکھ اب کافی کر لی ہے ـــ ابتدائیہ کے عنوان سے خواجہ عبدالغفور نے مہاراشٹر کی بڑی گٹھی ہوئی سماجی اور معاشرتی تاریخ لکھی ہے اور اس کے پس منظر میں اردو کی جگہ تلاش کی ہے اور اکیڈمی کی کوششوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون معلومات سے بھرا ہوا ہے اور محنت و محبت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

سلام بن رزاق، انور خان نئے مگر اچھے لکھنے والے ہیں۔ جیلانی بانو، رام لعل، آمنہ ابوالحسن کے بارے میں لوگ جانتے ہیں کہ یہ اچھے افسانہ نگار ہیں۔

سیمینار کے تحت سوائے ڈاکٹر محمد حسن کے اسٹیریو ٹائپ مضمون کے سبھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ خصوصاً قمر رئیس کا مضمون، مہاراشٹر میں اردو افسانہ، ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون کا پہلا جملہ ملاحظہ کیجئے ـــ "مختصر افسانہ صنعتی معاشرے کی تخلیق ہے"

رسالے میں زیادہ تعداد اچھی نظموں اور غزلوں کی ہے۔ غزلوں میں حسن نعیم، بشیر بدر، پرکاش فکری کی غزلیں ممتاز تر ہیں۔ نظمیں اچھی ہیں مگر قاضی سلیم، مینق حنفی اور بلراج کومل کی بات ہی الگ ہے۔
ہم مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کو اس رسالے کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں، خصوصاً جناب خواجہ عبدالغفور صاحب سکریٹری اردو اکادمی کو جنہوں نے اتنے اچھے ادیبوں اور شاعروں کو سمیٹ رکھا ہے۔ (کلام حیدری)

رفیق جعفر — (بمبئی)

اردو اکیڈمی مہاراشٹر نے "نورس" جاری کر کے اردو زبان کو ایک قدم اور آگے بڑھا یا ہے۔ اس پرچے کا نثری مواد قابل قدر ہے۔ چھپائی کتابت اور ٹائٹل کا تو جواب ہی نہیں۔ مہاراشٹر گورنمنٹ اور اردو اکیڈمی کے ممبران کو میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔
(رفیق جعفر)

تسنیم فاروقی:

مکرم و محترم!
تسلیمات!
نورس کا شاہکاری مجلہ ملا۔ اتنے خوبصورت جریدے کے اجراء پر میں مہاراشٹر اردو اکادمی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔
اردو صحافت اور ادب کی یہ عظیم کوشش خدا کرے کہ دوسری اردو اکادمیوں کے لئے مثال کا کام دے سکے۔ پرچے کے بارے میں کوئی رائے دینے سے میں اس لئے قاصر ہوں کہ خوبیوں اور تبصروں کے لئے بھی کم از کم اتنا ہی ضخیم ایک اور شمارہ تیار ہو سکتا ہے۔
اتنی سلیقے کی ترتیب اتنا پرشکوہ گٹ اپ اتنا معتدل اور ایسے جمال تحریر کے ساتھ۔ آفرین و مبارکباد۔
آپ کا خادم
(تسنیم فاروقی)

محبوب راہی (بارسی ٹاکلی)

واجب الاحترام خواجہ صاحب!
سوغاتِ کرم "نورس" کی شکل میں دستیاب ہوئی۔ سپاس گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس عنایت کا سزا وار سمجھا۔
رسمی نمائشی اور چاپلوسی پر مشتمل تعریفی کلمات کچھ ایسے بے روح اور اس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ آپ ہم جیسے حقیقت شناس اور ان کے اندر پوشیدہ ریاکاری کو فوراً تاڑ لیتے ہیں۔ لیکن نورس کا معاملہ ہی اور ہے کہ اس کے بارے میں تعریف و توصیف اور تحسین و ستائش کے جتنے عظیم، پرشکوہ اور باوقار الفاظ استعمال کئے جائیں گے نہ صرف یہ کہ صداقت پر مبنی ہوں گے بلکہ نورس کی شوکت و عظمت سے کمتر ہی ٹھہریں گے۔
خوبصورت، دیدہ زیب اور دلفریب سرورق۔ باوقار سائز، مضامین نظم و نثر کا بلند پایہ انتخاب ترتیب و تدوین کی نفاست۔ کتابت و طباعت کی دیدہ زیبی۔ ہر صفحہ ایک جدت کا آئینہ دار، ہر مضمون ندرت کا شاہکار جس پہلو سے دیکھئے جس انداز سے نظر ڈالئے بیساختہ کلمات داد و تحسین منہ سے نکلتے ہیں۔ مہاراشٹر اردو اکادمی ویسے بھی اپنی کارگزاریوں کی دھاک تمام اردو دنیا پر جما چکی ہے۔ "نورس" ایک اور روشن کارنامہ ہے اور لگتا ہے، "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کی مصداق اکادمی کا ہر قدم نئی منزلوں کی کھوج میں آگے بڑھ رہا ہے۔ "نورس" سامنے رکھتے ہوئے ہمارا سر فخر سے تن گیا ہے۔ آپ تمام قابل مبارکباد ہیں۔ میری جانب سے تمام اراکین اکادمی نورس کے ادارتی عملے کے تمام اراکین اور نورس میں شامل تمام فنکاروں کی خدمت میں پُرخلوص مبارکباد پیش کر دیجئے۔
طالبِ کرم
محبوب راہی

ارتضیٰ نشاط بمبئی

جناب خواجہ عبدالغفور صاحب!

نورس باصرہ نواز ہوا۔ شکریہ۔ کافی محنت کی گئی ہے۔ نثری حصہ منظوم حصے سے بہت بہتر ہے۔ منظومات میں مشتاق مومن، انور خان، ساجد رشید کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ کتابت اچھی ہے۔ کاغذ عمدہ نہیں ٹائیٹل بھی اچھا ہے۔ سائز قدرے چھوٹا ہو تو بہتر ہے۔ ویسے ادبی رسائل کی اس کساد بازاری میں نورس بہت غنیمت ہے۔ ضخامت اور بھی بڑھ سکتی ہے۔ نئے لوگوں کی ہمت افزائی کے لئے آپ مستحق مبارکباد ہیں

احقر: ارتضیٰ نشاط بمبئی

کلام حیدری کلچرل اکیڈمی گیا (بہار)

محترم خواجہ عبدالغفور صاحب

سلام علیک!

نورس ابھی ابھی ملا۔ دیکھا ہے اور دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ جس اکیڈمی کو آپ کی خدمات میسر ہوں۔ وہی اکیڈمی ایسا پرچہ نکال سکتی ہے۔ ورنہ رسالے کے لئے صرف ادیب ہونا کافی نہیں، ماہر انتظامیہ ہونا بھی ضروری ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں شریک فنکاروں کی چیزیں آپ نے حاصل کرنے کا کونسا طریقہ رکھا ہے مگر غالبا یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ نورس کب کب شائع ہوا کرتا ہے یا ہوا کرے گا یہ بات مشتہر ہونی چاہئے تاکہ آپ کے پاس پورے ہندوستان کے ادیبوں کی چیزیں براہ راست پہنچ سکیں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے — آپ کا

کلام حیدری (گیا)

والی آسی (مکتبہ دین و ادب لکھنؤ)

شفیق مکرم خواجہ صاحب،

سلام مسنون!

خدا کرے ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔

ذرا دیر پہلے 'نورس' ملا۔ یقین جانئے دل کھل اٹھا۔ آپ کی دوراندیشی کا تو میں پہلے ہی قائل تھا۔ مگر اس بار صورت یہ ہے کہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے حسن کمال کو اس کام کے لئے منتخب کر لیا۔ خوبصورت ترین ادبی جریدہ کے لئے میری دلی دعائیں ہیں کہ اللہ اسکو تادیر زندہ و پائندہ رکھے۔

نیاز مند

(والی آسی)

خورشید نعمانی (بمبئی)

مکرمی خواجہ عبدالغفور صاحب!

سلام مسنون۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ نورس کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا۔ کرم فرمائی کے لئے سراپا سپاس ہوں مجلہ میں شامل تخلیقات شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد مجموعی تاثر اس شعر کی صورت میں ظاہر ہوا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

مضامین اعلیٰ درجے کے اور افسانے غزلیں و نظمیں سب معیاری ہیں۔ صوری و معنوی لحاظ سے یہ رسالہ ایک قابل قدر دستاویز ہے۔ اس رسالے کی اشاعت سے مہاراشٹر اردو اکادمی نے اپنی فوقیت اس میدان میں بھی ثابت کر دی ہے۔

آپ کی نگرانی اور حسن کمال و سلمیٰ صدیقی کی ادارت اس پرچہ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

آپ کا مخلص: خورشید نعمانی

مہاراشٹر اسٹیٹ
اردو اکادمی کا سہ ماہی
جریدہ
رجسٹرار آف نیوز پیپرس رجسٹریشن نمبر [illegible]

اِمکان

جلد نمبر ۳
شمارہ نمبر ۲

قیمت: دس روپے

[illegible] اردو اکادمی نے گورنمنٹ [illegible]
[illegible]

۱۱۔ سحر سعیدی ۱۶۴

۱۲۔ صفدر سعید ۱۶۵

۱۳۔ اظہار مسرت ۱۶۵

۱۴۔ ارتضیٰ نشاط ۱۶۶

۱۵۔ شفیق عباس ۱۶۷

۱۶۔ یوسف خلش ۱۶۸

۱۷۔ شمیم طارق ۱۶۹

۱۸۔ ظہیر انور ۱۶۹

۱۹۔ کنول پرشاد کنول ۱۷۰

۲۰۔ ایم۔ آر۔ قاسمی ۱۷۰

۲۱۔ زاہد کمال ۱۷۱

۲۲۔ ہارون فراز ۱۷۱

۲۳۔ احسن نشاط ۱۷۲

۲۴۔ فصیح اکمل ۱۷۳

۲۵۔ ناصر شکیب ۱۷۴

۲۶۔ شہریار رحمٰن ۱۷۴

۲۷۔ ضیا اعظمی ۱۷۵

۲۸۔ حفیظ مومن ۱۷۵

نظمیں:

۱۔ جوش ملیح آبادی کے نام — جگن ناتھ آزاد ۱۷۷

۲۔ درسِ فراموشی	جوش ملیح آبادی	۷۸
۳۔ گوتم بدھ کا مجسمہ دیکھ کر	قمر ہاشمی	۸۰
۴۔ تسلسل	عزیز قیسی	۹۷
۵۔ تین نظمیں	سبحان انجم	۱۹۸
۶۔ فسادگاہیں	ملک ناسے	۱۹۹
۷۔ نظمیں	پدم پرکاش شرشٹھ پریمؔ	۲۰۰
۸۔ فرار	ارشد جمال فاروقی	۲۰۱

تبصرہ :

شہ رگ/شمیم طارق	عبدالسمیع بوبیرے	۲۰۲

اور

اکادمی ڈائری ۲۰۴

آغازِ سخن

قارئین کرام!

آپ کے خطوط سے ہمیں اندازہ ہے کہ آپ 'امکان' پسند کرتے ہیں، ایک معیاری اور باوقار جریدے کی شکل میں تعریف کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ 'امکان' وقت پر شائع نہ کرسکنے کی وجہ سے آپ کو انتظار کرنا پڑتا ہے، جسکا ہمیں بے حد افسوس رہتا ہے۔

بعض تکنیکی مجبوریوں اور ناگزیر اسباب کی وجہ سے ہم امکان کو صحیح وقت پر آپ تک پہنچانے میں ناکام رہے ہیں۔

اردو ریڈرشپ کو فروغ دینا امکان کا ایک اہم مقصد ہے جس کے تیئں ہم زائد اخراجات کے باوجود کم ازکم قیمت میں امکان آپ تک پہنچاتے ہیں۔ ہم امکان کو پھیلانے اور اس کو وسعت دینے میں آپ کے تعاون کے طلب گار ہیں جو آپ کی تخلیقات کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس کی نشر و اشاعت میں معاون ہونے کی شکل میں بھی۔

ہمیں اس کی خوشی ہے کہ ہم اس جریدے کے ذریعہ آپ تک اپنی کارکردگی اور کارگزاری کی اطلاع پہونچاتے رہتے ہیں اور ہمارے مذاکرات کی تفصیلات سے آپ کو آگاہ رکھتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

اردو میں گیتا کے منظوم ترجمے

گیتا کا ہندوستان کی مذہبی کتابوں میں بہت اونچا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان کی فلسفیانہ کتابوں میں بھی گیتا ایک بہت بلند مرتبے کی حامل ہے یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مشرق میں فلسفۂ مغرب کی طرح ایک الگ مضمون کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور زندگی کے بارے میں ایک نظریئے کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی بسر کرنے کے سلیقے کا نام ہے اور مطالعے کے لئے ایک الگ موضوع نہیں ہے بلکہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی روشنی میں ہر موضوع کا مطالعہ کیا جانا چاہیئے جن میں ہمارا مذہب یا دھرم بھی شامل ہے۔

گیتا نے قریب قریب دنیا کے ہر عظیم فنکار اور اہل قلم کو متاثر کیا ہے اور دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں اس کے منظوم اور منثور ترجمے ہوئے ہیں۔ یہ شرف اردو کو بھی حاصل رہا ہے چنانچہ اردو میں گیتا کے متعدد منظوم ترجمے شائع ہوئے جنھیں شہرت عام کا مرتبہ حاصل ہوا۔

شریمد بھگوت گیتا کو اردو نظم کا لباس پہنانے والے شعرا کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں پنڈت دینا ناتھ مدن مجبور دہلوی، یوگی راج نظر سند ھاوی، شنکر دیال نگار، منشی میدا لال عاجز، ترلوک چند محروم، جعفر علی خاں اثر، منشی مششد رشاد، منور لکھنؤی، خواجہ دل محمد، نفیس خلیل اور الم مظفر نگری۔

میرے دوست مبکش کاشمیری نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے بھی شریمد بھگوت گیتا کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اور شعرا نے بھی گیتا کے ترجمے کئے ہوں۔ اس لئے کہ یہ اتنی مقبول کتاب ہے کہ اور شعرا کا دل اس کی طرف اس طرح کھینچتا ہے کہ وہ بے اختیار اس کا ترجمہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب منور لکھنوی کا ترجمہ نسیم عرفاں کے نام سے شائع ہوا تھا تو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے سہ ماہی جریدے 'اردو' نے لکھا تھا۔

> جتنے ترجمے بھگوت گیتا کے ہوئے ہیں شاید ہی کسی سنسکرت کتاب کے ہوئے ہوں۔ اردو اس مقدس کتاب کی تبلیغ کے لئے غالباً بہترین آلہ مانی گئی ہے کیونکہ شاید ہی کوئی سال خالی جاتا ہوگا کہ اردو نظم یا نثر میں اس کا کوئی تازہ ترجمہ نہ شائع ہو۔

گیتا اور اس کی تعلیم نے مشرق و مغرب کے دانشوروں کو کس طرح متاثر کیا ہے اس کا اندازہ ایک اقتباس سے ہو سکتا ہے مغرب کے ایک عالم اور اہل قلم ولیم وان ہمبولٹ اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

> THE MOST BEAUTIFUL, PERHEPS THE ONLY TRUE PHILOSOPHIRAL SONG EXICTING IN ANY HUOMN TRIGUE

جہاں تک مغربی دانشوروں کا تعلق ہے میں انکی نمائندگی کے لئے علامہ اقبال کے چند جملے درج کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جو انہوں نے "اسرار خودی" کی طباعت اول کے وقت اس کتاب کے دیباچے میں لکھے تھے

> بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترک عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے متعلق دلبستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رامانج اسی رستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنیٰ کو سری کرشن اور سری رامانج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطق طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

یہاں اس مسئلے پر بحث کا محل نہیں ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن کے تحت سری شنکر آچاریہ کے فلسفے کے ساتھ ترکِ عمل کا غلط مفہوم بھی وابستہ کر دیا گیا۔ کیونکہ دراصل سری شنکر آچاریہ نے بھی ترک عمل کی تعلیم نہیں دی بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ علامہ اقبال کی نظر میں بھگوان کرشن کی تعلیم کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔

ہاں یاد آیا۔ میرے لڑکپن کی بات ہے پنڈت دینا ناتھ مدن مجز دہلوی کا ترجمۂ گیتا والد محترم پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ سارا ترجمہ مجھے زبانی یاد کرنے کو کہا تھا اور میں نے اس کے اکثر حصے زبانی یاد کر لئے تھے۔ اس کتاب کے آخر میں مختلف اکابر ملک کی آرا رتھیں۔ ان میں ایک رائے علامہ اقبال کی بھی تھی جسکی عبارت کچھ یوں تھی

> آپ کا کیا ہوا، بھگوت گیتا کا ترجمہ کیجئے اس وقت ملا جب مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔

اس جملے سے گیتا کے ساتھ علامہ اقبال کے تعلق خاطر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مختصر سے مقالے میں تمام ترجموں کے نمونے پیش کرنا تو مشکل ہے اور ان کا تقابلی مطالعہ بھی چند منٹ کی بات چیت میں نہ سما سکے گا لیکن "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"، کے پیش نظر گیتا کے ابتدائی حصے کے چند ترجمے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں

سب سے پہلے "مخزن اسرار" کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو مجھے لڑکپن کے زمانے سے یاد ہیں۔ دھرت راشٹر یہ سنجے سے کہتے ہیں

> سر زمین کورو کیشتر کا مجھے قصہ سنا
> جب ہوا سنجے ہمارا پانڈو سے سامنا

سنجے جواب دیتے ہیں

> دیکھتے ہی پانڈو کی فوج کو آراستہ
> راجہ دریودھن نے چھیڑا درون سے یوں تذکرہ
> لشکرِ جرار کو ان پانڈوؤں کے دیکھیے
> منتظم ہیں جس کے دانشمند شاگرد آپ کے
> بھیم اور ارجن کے ہمسر ہیں ادھر اتنے جواں
> یویودھان ویراٹ و درپد کا معزز خانداں

مقامِ حیرت ہے کہ قریب قریب یہی اشعار گیتا کے اس ترجمے میں بھی موجود ہیں جو دینا ناتھ مدن مجز دہلوی کے والد محترم پنڈت جانکی ناتھ مدن نے کیا تھا اور جو "فلسفۂ الوہیت" کے نام سے چھپا ہے کسی کسی شعر میں لفظی تغیر موجود ہے لیکن بحیثیت مجموعی اشعار وہی ہیں۔ ابھی میں نے "مخزنِ اسرار" کا پہلا شعر آپ کی خدمت پیش کیا ہے۔

> سر زمین کورو کیشتر کا مجھے قصہ سنا
> جب ہوا سنجے ہمارا پانڈو سے سامنا

یہ شعر "فلسفۂ الوہیت" میں یوں چھپا ہے۔

جنگ کورو چھیتر کا سنجے بیاں کر ماجرا
پانڈو کوروں نے اس بھومی میں جا کر کیا کیا

اس حصے کے بعد کے چند اشعار وہی ہیں جو مخزن الاسرار میں شامل ہیں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

پنڈت یوگی راج نظر نے اس حصے کو اپنے ترجمے کلام ربانی میں یوں لباسِ شعر پہنایا ہے

کور دیدہ راجۂ عالی گہر
سنجے سے بولا کہ اے نیکو سیر
کرکشتر کی زمین پاک پر
رزم گہ کی تشنۂ خوں خاک پر
یادگارِ پانڈوِ عالی دماغ
اور مجھ بے نور کے چشم و چراغ
جمع ہیں جو صف بہ صف بہرِ جدال
آشکارا مجھ پہ کر کچھ ان کا حال
سنجے بولا اے شہِ عالی وقار
تاجدار بے عدیلِ روزگار
راجہ دریودھن ترا لختِ جگر
بانیٔ پیکار آمادہ بہ شر
پانڈو کے بیٹوں کی فوجیں دیکھ کر
بحرِ بے ساحل کی موجیں دیکھ کر
یوں درون استاد سے گویا ہوا
یوں نگاہِ لطف کا جویا ہوا
اے یلِ سر آمد جنگ آوراں
ناوک افگن نازشِ ہندوستاں
پانڈوؤں کا لشکر جرار دیکھ
کس طرح ہیں مائل پیکار دیکھ
ورشٹ دیومن تیرا شاگردِ رشید
جس کے چہرے سے شجاعت ہے پدید
صف آرا ہے افواج سے
ہر جواں آمادۂ تاراج ہے

جمع ہیں اس کان میں دُرِ سینکڑوں
بھیم ارجن سے بہادر سینکڑوں

منشی ہیرا لال عاجز کی کتاب کا نام بھگوت گیتا منظوم ہے وہ یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

کہا کور دیدہ نے یوں بھر کے آہ
کہ کہہ مجھ سے اے سنجئے نیک جاہ
کرو چھیتر جو دھرم کا ہے مقام
پئے جنگ واں جائے با اعتشام
مرے اور پانڈوں کے نور نظر
کئے کام کیا کیا ہر اک نامور

سنا اس سے سنجے نے جب یہ سخن
تکلم کا اپنے وہ کھولا دہن
کہا سن یہ اے شاہ گیتی ستاں
سپاہِ عدو کی صف آرائیاں
نظر کرکے درجودھن درو غا
درونا کے نزدیک جا کر کہا

ذرا دیکھئے اس کو اے مردِ پیر
کہ نورِ نظر درو پد بے نظیر
وہ شاگردِ عاقل جو ہے آپ کا
عدو کی یہ افواج کو درو غا
کیا اس نے کیا خوب آراستہ
بہ ہر گونہ دانش سے پیراستہ

یہاں پہلوانان ہیں بے بدل
کماں دارِ اعظم بہ جنگ و جدل
ہیں بھیم اور ارجن کے ہمسر سبھی
وارث اور پھر درو پد رسا تکی
یہ سب زور بازو میں ہیں بے نظیر
عدو ہوں گر بزاں بمانندِ تیر

غالباً یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس ترجمے کی زبان کمزور اور بیان ناقص ہے۔

شنکر دیال نگار کا کیا ہوا ترجمہ جسکا نام گنجینۂ معرفت ہے مسدس کی صورت میں ہے انکے یہاں ابتدائی حصہ ان بندوں میں بیان ہوا ہے۔

کہا راجہ نے سنجے سے پریشاں میں ہوں — ہور ہا ان میں ہے کیا کیا کہوں حیراں میں ہوں
باہمی بھائیوں کی جنگ سے نالاں میں ہوں — کشت و خون میرے عزیزوں کا ہو گریاں میں ہوں

دھرم کے چھیتر میں سنجے کہو ہوتا کیا ہے
پانڈو کیا کرتے ہیں کوروں کا ارادہ کیا ہے

بولے سنجے کہ مہاراج یہ ہے حال رن — دونوں فوجیں ہیں برابر کی ہیں دونوں پُر فن
آپ کے سب سے بڑے بیٹے کنور دریودھن — ڈرتے دشمن کے ہیں لشکر سے جو ہے قلعہ شکن

اپنے مرشد سے درونا سے وہ یوں ہیں گویا
دیکھیے پانڈو کا لشکر ہے کھڑا خوب سجا

ان کے لشکر کی ہر اک سو سے صف آرائی ہے — ان کے ساتھی کو شجاعت میں بھی یکتائی ہے
ان کی جرأت سے میری عقل بھی چکرائی ہے — صف شکن گر نہ ہوا کوئی تو رسوائی ہے

یہی درشٹ دمنہ آپ کا جو چیلا ہے
یہی پانڈو کا مددگار ہے صف آرا ہے

ارجن و بھیم و دروپد میں سب انکے حامی — کنت بھوج اور یویو مان ہیں انکے ساتھی
دھرشٹ کیتو میں پر وجت ہیں یہ حامیوجوی — چیکتان او تموجا آور ہیں راجہ کاشی

ہیں وراٹ آور ہیں سو بھدر بھی مرد میداں
کیسے جانباز ہیں یہ لشکر پانڈو کے جواں

مذکورہ تینوں ترجموں کے مقابلے میں منشی بشیشور پرشاد منور کی زبان زیادہ صاف اور بیان رواں دواں ہے۔ یہ ترجمہ جو مثنوی "گلزار نسیم" کی بحر میں ہے ادبی محاسن سے بھی مالا مال ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اس بحر میں "گلزار نسیم" پہلے سے موجود ہے چنانچہ احوالِ واقعی میں لکھتے ہیں

کشتی اس بحر میں چلانا
ہے منہ پہ نسیم کا چڑانا
گیتا فرضی بیاں نہیں ہے
قصہ نہیں داستاں نہیں ہے
آئینہ یہ اک ہے فلسفے کا
گنجینہ یہ اک ہے فلسفے کا
دُرِ شہوار معرفت ہے
بحرِ ذخار معرفت ہے
نغمہ یہ نہیں ترانۂ شوق
نظم اس میں نہیں فسانۂ شوق
گیتا کا نہیں کوئی بھی حصہ
دشینت شکنتلا کا قصہ
جو یہ سحر زباں ہو جس کا
زیور حسن بیاں ہو جس کا

اس تمہید کے بعد پہلے ادھیائے ترجمہ شروع ہوتا ہے اور راجہ دھرت راشٹر یہ اپنے وزیر سنجے سے خطاب کرتے ہیں۔

میرے لائق وزیر سنجے
میرے قابل مشیر سنجے
سودر نام ہے کورو کیشتر
پاکیزہ مقام ہے کورو کیشتر
پانڈو دل ہے جہاں صف آرا
لشکر ہے پڑا جہاں ہمارا
ہیں آپ تو مخزن کمالات
فرمایئے کچھ وہاں کے حالات

سنجے کا جواب

دریودھن فخر دوماں نے
شہزادۂ منزلت نشاں نے
دیکھی پانڈو کی رن میں جب فوج
پایا اسے بحر موج در موج
درونا چاری کے پاس جاکر
سر پاؤں پہ عجز سے جھکا کر
لب تر کیے شربت سخن سے
جھڑنے لگے پھول یوں دہن سے

میرے مخدوم میرے سرتاج
پانڈو کی ملاحظہ ہوں افواج
فرزند دروپد کی کا ندار
سر لشکر جاں سپار و جرار
شاگرد حضور آپ کا ہے
اس فوج میں نور آپ کا ہے
حامی ہو کر غنیم کا آج
ہے مائل انتظام افواج

بھیم وارجن کی طرح جرار
ہے فوج عدو کا ہر کماندار
بازو یویودھان کے قوی ہیں
آئینۂ شانِ مقدری ہے

ویراٹ، جری، قوی توانا
پہنے ہے بہادری کا بانا
دروپد کے خاندان کا ممتاز
مشہور ہے اک جہاں میں جانباز

گویا منو صاحب نے ایک شلوک کا ترجمہ چار شعروں میں کیا ہے ایک شلوک کا ترجمہ چار اشعار میں کرنے سے منور صاحب کو غالبًا یہ آسانی بھی رہی ہوگی کہ مفہوم کی وضاحت ہوتی چلی گئی لیکن ساتھ ہی یہ مشکل بھی پیش آگئی ہوگی کہ ترجمے کو حشو و زوائد سے بچایا جائے۔

یہاں میں اپنی ایک طویل مثنوی "رجھو رنامہ" کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہیں سمجھوں گا۔ جس میں شریمد بھگوت گیتا کا ذکر میں نے تفصیل سے کیا ہے مذکورہ مثنوی کا یہ حصہ گیتا کا ترجمہ تو نہیں لیکن گیتا کا فلسفہ بلکہ گیتا کے فلسفے کے کئی پہلو اس حصے کے اشعار میں آگئے ہیں۔ میں انہی اشعار کے انتخاب پر اپنی بات چیت ختم کرتا ہوں

بشر ہے روح لیکن تو بشر قالب کو سمجھا ہے
جسے تو جلوہ سمجھا ہے وہی دراصل پردا ہے
یہ قالب ایک لفظ دلنشیں ہے جس کہانی کا
بشر کی روح پر ہے انحصار اس کے معانی کا
عرض ہے قالب آدم تو جوہر روح آدم ہے
اسی جوہر سے پیدا زندگی کی شاخ بھی نم ہے
یہ ظاہر ہے وہ باطن ہے یہ پیدا ہے وہ پنہاں ہے
یہ ہے رنگ گلستاں اور وہ کیف گلستاں ہے
حقیقت آدمی کی روح ہے قالب ہے افسانہ
یہ ہے دیوار خانہ اور وہ ہے صاحب خانہ
نہیں کوئی مقرر جسم کے اندر مقام اس کا
کہ گل میں بوئے گل کی طرح رہتا ہے قیام اسکا
یہ قالب میں ہے جیسے نور ہے خورشید تاباں میں
یہ قالب میں ہے جیسے ولولہ ہوتا ہے طوفاں میں
یہ قالب میں ہے جیسے ہو نمو جوشش بہاراں میں
نسیم صبح کی جیسے نمی شاخِ گلستاں میں
بشر ہی میں نہیں یہ ہے ہر اک جاندار میں ساری
یہ ہے ارض و سما کے عالمِ انفاس میں جاری

بشر کا جسم کیا ہے ایک میدانِ عمل ہے یہ
مگر کہتے ہیں جس کو روح سامانِ عمل ہے یہ
بشر کا جسم فانی ہے بشر کی روح باقی ہے
ہمیشہ جس کا مینا نہ رواں ہے یہ وہ ساقی ہے
نہ اسکی ابتدا کوئی نہ اسکی انتہا کوئی
تسلسل بے کراں ہے یہ نہیں اس کا سرا کوئی
یہ جوہر موت کے ہر بند سے آزاد جوہر ہے
چمک اس کی ازل سے ہے ابد تک جلوہ گر ہے
بھڑکتی آگ کا شعلہ جلا سکتا نہیں اس کو

کوئی صرصر کوئی طوفاں بجھا سکتا نہیں اس کو
کوئی تلوار اثر انداز اس پر ہو نہیں سکتی
قضا ہرگز قدر انداز اس پر ہو نہیں سکتی
یہ قالب کی ہے موت ارجن جسے تو موت کہتا ہے
کہ جو اس کا مکیں ہے موت سے آزاد رہتا ہے
جہانِ چند روزہ سے اس طرح قالب نکلتا ہے
بشر جس طرح پاکیزہ نیا جامہ بدلتا ہے
بھلا قالب کے دنیا سے گذرنے کا الم کیوں ہو
جو دانا ہیں انہیں جامے کی تبدیلی کا غم کیوں ہو



میر تقی میر کے متعلق کسی محفل شعر و سخن میں مرزا غالب سودا کے طرز بیان کی تعریف کر رہے تھے اور استاد ذوق مرزا محمد سودا کے انداز کلام کی۔ مرزا غالب نے طنزاً کہا، " استاد ہم تو آپ کو میری سمجھتے تھے مگر آپ تو سودائی نکلے "۔

منقول: ادبی لطیفے
(از خواجہ عبد الغفور)

محمد بدیع الزماں

اقبال اور فرنگی مدنیت

جغرافیائی لحاظ سے مشرق و مغرب روزِ ازل ہی سے کرۂ ارض پر دو الگ الگ خطے رہے ہیں اور ہیں۔ اسی کو انگریزی زبان کی اصطلاح میں علی الترتیب ORIENT اور OCEIDENT کہا جاتا رہا ہے۔ دونوں کی فکری اساس ہی نہیں بلکہ دونوں کا تمدن، دونوں کی تہذیب و معاشرت ہمیشہ سے متوازی خطوطِ مستقیم کی طرح قرونِ اولیٰ سے الگ الگ کارفرما رہے ہیں۔ اسی تضاد پر RUDYARD KIPLING کا یہ قول مشہور ہے

THE EAST IS EAST AND THE WEST
IS WEST
THE TWAIN SHALL NEVER MEET.

اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب نے مشرق ہی میں جنم لیا۔ سبھوں کے پیغمبروں کا ورود اسی خطے میں ہوا۔ ساری آسمانی کتابیں اور صحیفے اسی خطہ کے پیغمبروں کے ذریعہ سارے عالم میں پہنچیں۔ ہر مذہب کے مقدس مقامات سارے کے سارے مشرق ہی میں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کا اثر مشرق پر زیادہ رہا ہے ابھی بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ روحانیت قلب کی پاکی اور نظر کی بیباکی اور خیر و شر کی پرکھ ظاہر ہے کسی نہ کسی مذہب کی گرفت سے ہی آتی ہے۔ مغرب کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی شعاعیں مشرق ہی سے چھن چھن کر مغرب تک پہنچیں۔ بقول اقبال

ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

اقبال کے کلام میں مشرق و مغرب، شرق و غرب کے الفاظ بہت زیادہ آتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں ان دونوں کا تضاد برابر کارفرما رہا۔ اقبال نے مشرق و مغرب دونوں جگہوں کی سب سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مگر انکی دوربینی نے کھرے اور کھوٹے کی پہچان اوائل عمر ہی میں کر لی تھی۔ وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ یورپ کے بھی سب سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ بھی مشہور زمانہ کیمبرج یونیورسٹی میں یورپ کے تین سال کے قیام کے دوران انہوں نے مغربی علوم کا بہت گہرا مطالعہ کیا اور اسی لئے انکے کلام میں مغربی فلسفیوں کے نام بار بار آتے ہیں۔

اقبال کو شرابِ علم کی لذت ہی کشاں کشاں یورپ لے گئی اس تحصیلِ علم میں بھی انکی مقصدیت تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنی نظم بہ عنوان "التجائے مسافر" (بدرگاہ حضرت محبوب الٰہی۔ دہلی) میں کیا ہے جسکے چند اشعار یہ ہیں ؎

چمن کو چھوڑ کر نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجکو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے

شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجکو
نظر ہے ابرکرم پر، درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجکو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ تر زباں مجکو
مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کا رواں مجکو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجکو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجکو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کی اس نظم سے ہیں انکی صداقت، نیک نیتی، خلوص جذبات اور نیک ارادوں کا پتہ چلتا ہے۔ شرابِ علم سے وہ کیسا میخانہ آباد کرنا چاہتے ہیں اسکی نشاندہی ملتی ہے۔ یہ کہ ان کی زندگی کا کچھ مقصد ہے اس کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے قلبی واردات ایسے ہوں اس کی نظر ستاروں سے آگے کا جہاں ہی ہو سکتا ہے نہ کہ یہ جہانِ خاکی۔

مغربی مدنیت کے ان مضر اثرات کی طرف اقبال لوگوں کا خیال مبذول کرانا چاہتے تھے جو مشرقیت کو گھن کیطرح کھا رہے تھے اور جس سے ان کی روح کی پاکیزگی، خیال کی بلندی، ضمیر کی پاکی، روشن خیالی اور ذوقِ لطیف ختم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اردو شعراء میں نہ تو اتنی گہرائی تھی اور نہ اقبال جیسی تبحر علمی اور نہ ان کی طرح دیدۂ بینا کہ وہ مغربی تہذیب کے مضر اثرات کو اتنی دور رس نگاہوں سے دیکھتے۔ لے دے کر ایک اکبر تھے جو تہذیبِ حاضرہ کے خارجی اثرات سے لوگوں کو متنبہ کر رہے تھے مگر یہ اقبال کی مقصدیت پر پورے نہیں اتر رہے تھے۔ اسی لئے اقبال نے فنکاروں کو للکارا۔ ؎

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے!
شاعر! ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے!

اور پھر انہی خیالات کا اعادہ اپنی نظم "مصوّر" میں بھی کیا ہے ؎

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی
مجھکو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی

اقبال نے مشرق کے اسی سرورِ ازلی کو دوبارہ جلا دیکر اندیشۂ دانا کو جنوں آمیز کرنا اپنا مطمح نظر رکھا جو انکے سارے کلام کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتے ہیں۔ ورنہ ان کے پیام کی مقصدیت ہی فوت ہو رہی تھی۔ تعجب ہے فرنگی مدنیت کے مضر اثرات کیطرف لوگوں کا دھیان مبذول کرانے کی اس شخص کو سوجھی جو خود میخانۂ عرب سے لطف اندوز ہو چکا ہو۔ اس تضاد کو اقبال نے خود تسلیم کیا ہے

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی، مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ اقبال نے مشرق کے سرچشموں میں اتنی گہرائی تک ڈوب کر فیض حاصل کیا تھا کہ جب وہ مغربی علوم پر قادر ہو گئے تو انہیں مغرب کے کھوکھلاپن کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی اور اس کا کوئی اثر انھوں نے نہیں لیا ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اثر نہ لینے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ؎

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے!

چونکہ مغربی تہذیب کا تمسخر اکبر کے انداز میں زیادہ پسندیدہ ہو گیا تھا اس لئے اقبال نے بھی ابتدائی شاعری میں فرنگی مدنیت کا مذاق انہیں کے رنگ میں اڑانا شروع کیا۔ مثال کے طور پر اکبر نے اگر یہ کہا تھا ؎

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پہ جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اے اکبر
تم کیا ہو یہ خدا کے بھی تین ٹکڑے کر دیں

تو اقبال نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

یا اگر اکبر نے تہذیب حاضرہ پر اس طرح تیر اندازی کی کہ ہے

لباس و اتحاد و دین و غیرت ایک بقچے میں
نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یارب کہ مٹکا ہے

تو اقبال نے بھی انہی خیالات کا اعادہ الفاظ کے الٹ پھیر سے اس طرح کیا ہے

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

اقبال کی شدت احساس نے بہت جلد ایک تو یہ محسوس کیا کہ اکبر کے رنگ میں وہ اپنی قلبی واردات کو نہیں ڈھال سکتے۔ دوسرے یہ کہ کہیں اکبر کی طرح انکے اشعار بھی مزاح کے قہقہوں میں گم نہ ہو جائیں اکبر نے زیادہ تر اپنے طنز و مزاح کا نشانہ مغربی تہذیب کے صرف خارجی اثرات کو بنایا تھا جسے منفی طریقہ ہی کہا جا سکتا ہے جب کہ اقبال کا مطمع نظر باطن پر تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اکبر نے بڑھتی ہوئی مغربی زندگی کے خلاف آواز اٹھائی اور خوب اٹھائی جو اقبال کے لیے نشان راہ بنی اور ہم اکبر کی اس ضمن میں خدمات کو بڑی نگاہوں سے دیکھتے ہیں میرا خیال تو ہے کہ اگر حالی نہ ہوتے تو اکبر نہ ہوتے اور اگر اکبر نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے اور اگر اقبال نہ ہوتے تو بہت کچھ نہ ہوتا۔

یورپ سے لوٹنے پر اقبال کی فکر نے علمی اور نظریاتی سطحوں پر ایک منظم اور اثباتی صورت اختیار کر لی اور فرنگی مدنیت پر ان کے تاثرات منظم صورت میں پہلے پہل نظم "خضر راہ" میں سامنے آتے ہیں ہے

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہ اطلس قبایان تتاری ہے

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

"بانگ درا" کا دور ختم ہوتے ہوتے اقبال کی شدت احساس سوز دروں کی بھٹی میں تپ تپ کر ظہور پذیر ہونے لگی اور فرنگی مدنیت پر تیز نشانے لگنے لگے ہے

یارب یہ جہان گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنر مند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند!
حاضر ہے کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند
مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

اقبال کو فرنگی مدنیت کے اس فن شیشہ گری میں

ان کا سب سے موثر حربہ ان کی طرزِ تعلیم میں نظر آئی جو بہت جلد قلب کو مسخر کرتی اور ہر وہ چیز جو روحانی تسکین کا باعث ہو سکتی ہے اسے دل سے نکال پھینکتی ہے۔ مغرب زدگی کا سرور ان کی تعلیم ہی سے شروع ہوتا ہے اسی کو اقبال نے اس طرح کہا ہے ؎

میخانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

یہ تعلیم کیا قیامت ڈھاتی ہے، اقبال نے اس پر بسیط روشنی اپنی ایک نظم بہ عنوان "تعلیم اور اس کے نتائج" میں اس طرح ڈالی ہے ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
"تخمِ دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کآنچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو"

تعلیم کے ساتھ الحاد کے آنے کی وجہ خود اقبال نے یہ بتائی ؎

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی کا نفس

تہذیب حاضر اور اس کی تعلیم جدید کی سب سے بڑی دین سینوں کی بے نوری ہے اور جب دل الحاد کا خوگر ہو جاتا ہے تو اسلاف سے نسبت روحانی ختم ہو جاتی ہے اور یہی مغربی مدنیت کی سب سے بڑی فتحیابی ہے۔ انسانیت کا درد مٹ جاتا ہے اور اخوت و محبت کی جگہیں رقابت اور ہوسناکی لے لیتی ہے ؎

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

عہدِ نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے

ہر تحریک کے پیچھے کوئی فلسفہ ہوتا ہے تعلیم کے اس منصوبے کے پیچھے مذہب کا مغربی تصور کارفرما ہے جس کی وضاحت اقبال نے اپنی نظم "مذہب" میں اس طرح کی ہے ؎

تعلیمِ پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیٔ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش
"با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش"

تعلیم اور اس سے پیدا شدہ الحاد پر اکبر نے بھی کیا خوب کہا تھا۔

ترقی پاتے ہیں لڑکے ہمارے نورِ دیں کھو کر
یہ کیا اندھیر ہے بجھ لیتے ہیں یہ، تب چمکتے ہیں

یورپ میں مذہب کے اس فلسفہ اور تصور کے پیچھے کلیسا اور حکومت کی کافی لمبے عرصے تک کی خانہ جنگی پوشیدہ ہے جس کے نتیجہ کے طور پر مذہب کا دخل ملکی معاملات میں یکسر ختم کر دیا گیا اور دونوں الگ الگ مقامات پہ بٹھا دئے گئے اور آج تک ہیں۔ اور اس طرح زندگی کا تعلق یکسر مذہب سے ختم ہو گیا اور لادینیت نے جگہ لے لی۔ مغربی طرزِ فکر میں روحانی Spiritual اور دنیوی (Temporal) دو الگ الگ ادارے بن گئے، سیاست نے مذہب سے ایسا پیچھا چھڑایا کہ انگلینڈ کے بادشاہ وقت کو Defender of the Faith کے لقب سے نوازا گیا جو آج بھی ہے اور پاپائے روم کو انگلینڈ کے لئے out of bounds کر دیا گیا۔ اقبال مذہب اور سیاست کی اس

دوئی کو مسلم قائل سمجھتے تھے۔ دین و سیاست کی اس جدائی کی مذمت اقبال نے اپنی نظم " دین و سیاست " میں اس طرح کی ہے:۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے، یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و ملت میں جس دن جدائی
ہوس کی امیری! ہوس کی وزیری!
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ داری نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

مذہب سے پیچھا چھڑا لینے پر فرنگی مدنیت کیا ہو کر رہ گئی، روح انسانی کو کیا دھکے لگے، قلب و نظر کی عفت کس طرح ختم ہو گئی، اقبال کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں سے

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف
(نظم " مغربی تہذیب ")

تہی وحدت سے ہے اندیشہ غرب
کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادی ایمن نہیں شایان تجلی!

اس دین و سیاست کی جدائی کا پہلا شکار اقبال کی نظر میں خودی ہے۔ روح کی پاکیزگی اور عفت قلب و نظر کی ضامن صرف انسان کی خودی ہے۔ فرنگی تہذیب کی لادینیت کے شکار افرنگ زدہ شخص میں اقبال اس خودی کے وجود ہی کو یکسر غائب پا کر وہ اس افرنگ زدہ کے وجود تک سے منکر ہو جاتے ہیں سے

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
میری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

ہوا ہے بندۂ مومن فسونئ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

اقبال نے تہذیب حاضرہ کو دوسرے شعراء کے مقابلہ میں بذات خود اپنے تین سال کے یورپ کے قیام میں بہت نزدیک سے دیکھا اس لئے اس کے مضر اثرات کو ایک ایک کر کے فلسفیانہ استدلال کے ساتھ اپنے کلام میں جگہ دی ہے لوگوں کے دل و دماغ پر اس کا پائیدار اثر ہو سکے۔ گرچہ تجلی افرنگ نے انکی نظروں کو خیرہ نہ کیا مگر جن کے دل نور سے خالی ہیں ان پر اس تجلی سے جلد براقی آتی ہے جیسی تجلی کو اقبال بجلی کا چراغ کہتے ہیں۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے روشن اس جوہر کی براقی!

یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

مذہب کے اس تصور نے مغرب میں مادیت کو جنم دیا۔
اور اس کے برعکس مشرق میں مذہب سے گہرے تعلق نے روحانیت
اور قلب و نظر کی پاکی کو اولیت دی۔ اس مادیت نے جب
روحانی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیا تو ظاہر ہے مغرب فتنہ
و فساد کا آماجگاہ بن گیا اور ابلیسیت نے گھر کر لیا۔ اقبالؔ نے
فرنگی سیاست کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ بلقان کی جنگیں
اور سلطنت عثمانیہ کی تسخیر سارے ایشیا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ
میں سامراجی طاقتوں کی لوٹ کھسوٹ ان کی آنکھوں کے سامنے
ہوئی تھیں۔ ان کے مکر کے چالوں نے انکی شدت احساس کو اتنا
تپایا کہ اقبالؔ نے خدائے بزرگ کے حضور میں ابلیس سے یہ
عرضداشت بھجوائی۔

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے
پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب
دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک
تجھکو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی
ویرانیٔ جنت کے تصور سے ہیں غمناک
جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

"سیاست افرنگ" کے عنوان سے ایک نظم میں اس سیاست
کو ابلیس کی مجلس شوریٰ قرار دیتے ہوئے اقبالؔ نے فرمایا ؎

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس
اس سیاست کی مکر کی چال کیسے تانا بانا بنتی ہے دوسروں

کو غلام بنانے کا ان کا طریقہ کار MODUS OPERANDI
کیا ہے۔ اقبالؔ نے کیا لطیف پیرائے میں ایک نظم "لادین سیاست"
میں انہیں بیان کیا ہے ؎

جو بات حق ہے وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اسکی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسا کے سفیر

اس سیاست کے پیشواؤں کی صفت خاص ملاحظہ ہو۔

ہمیشہ مورو مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور سارا ایشیا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ
فرنگیوں کی ٹھوکروں میں آتا گیا ویسے ویسے اقبالؔ کے کلام میں تیکھی
تلخی آتی گئی اور بجائے رمز و ایما کی زبان میں بات کرنے کے وہ ان
جہان پیر کو کھری کھری سنانے لگے۔ سلطنت برطانیہ میں ۱۹۴۵ء
تک یہ کہاوت تھی کہ Britannia rules the waves
یعنی سمندر پر برطانیہ کی حکومت ہے۔ اقبالؔ نے برطانیہ کو
بحری قزاق قرار دیتے ہوئے سکندر اور قزاق کی گفتگو اپنی نظم
"ایک بحری قزاق اور سکندر" میں اس طرح رقم کی۔

سکندر
صلہ تیرا تیری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی
قزاق
سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی
ترا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی

جب حبشہ (ابی سینیا) پر مسولینی نے ۱۹۳۵ء میں راتوں رات
غاصبانہ قبضہ کر لیا جسے تاریخ میں Rape of Abyssinia

(حبشہ کا زنا بالجبر) کہا جاتا ہے تو اقبال نے ان مغربی سامراجیوں کو
جن میں برطانیہ سب سے آگے تھا یورپ کے کرگس سے موسوم کیا ؎

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینا کی لاش
ہونے کو ہے یہ پردہ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اور جب برطانیہ اور اس کے مغربی حریف فرانس نے اس زنا بالجبر پر شور و غوغا مچانا شروع کیا تو اقبال نے مسولینی کے ہاتھوں ان "معصومانِ یورپ" کے منہ پر یوں طمانچہ مارا ؎

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوبِ نَے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

۱۹۱۷ء میں روس کے اشتراکی انقلاب نے بہت حد تک فرنگی مدنیت کے فسوں کو توڑا۔ اس فسوں کی ایک جامع تصویر اقبال نے اپنی نظم "لینن" (خدا کے حضور میں) پیش کی ہے ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

جن علاقوں میں انھیں بہت آگے چل کر فتنہ و فساد کھڑا کرنا تھا۔ ان کو اپنی تحویل میں رکھنے کا ایک نیا نسخہ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۸ء کے خاتمہ پر سامراجیوں نے Mandated Territories کا نکالا۔ چنانچہ فلسطین انگریزوں کے زیرنگیں آیا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ ایک طرح کا کورٹ آف وارڈس Court of wards ہے جہاں نابالغوں کو سن بلوغ تک پہنچنے کے لئے تیار کیا جائے گا اور جب وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں گے تو ان کو خود مختاری دے دی جائے گی۔ ایسا ہی ایک علاقہ جنوب مغربی افریقہ جسے اب Namibia کہتے ہیں جنوبی افریقہ کی تحویل میں آیا جسے جنوبی افریقہ نے اب اپنی حکومت میں ضم کر لیا ہے۔ فلسطین اور نمیبیا میں عرصہ ساٹھ سال سے جو خونی جنگیں ہو رہی ہیں وہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اسی گارجین شپ پر اقبال کے تیر و نشتر ملاحظہ ہوں۔

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری

بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق
طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پر دم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیض مکاتب کا چشمۂ جاری
نظر وران فرنگی کا ہے یہ فتویٰ
وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

اس کو اقبال نے "دام تہذیب" سے موسوم کیا اور اسی نام کی ایک نظم میں فلسطین پر یہ آنسو بہائے

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
ترکان جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

اگر فلسطین انگریزوں کی سرپرستی میں آیا تو ادھر فرانس نے جنگ کے دوران ہوئے ایک خفیہ معاہدہ کے تحت شام پر قبضہ کر لیا جو ۱۹۴۵ء تک رہا۔ فلسطین کے معاملے میں حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۷ء میں دارالعوام میں یہ اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ فلسطین میں یہودیوں کی ایک آزاد مملکت قائم کئے جانے کی تجویز کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس اعلان کو تاریخ میں بالفور اعلان کہتے ہیں۔ اس اعلان نے فرنگیوں کے منصوبوں اور انکی مکر کی چالوں کا پردہ فاش کر دیا۔ اقبال تو انکی ریشہ دوانیوں سے متاثر تھے ہی چنانچہ اس اعلان پر ان کا ردعمل ایک نظم "شام و فلسطین" میں ملاحظہ ہو

رندان فرانسیس کا میخانہ سلامت
پر ہے مئے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاک فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیش کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

اقبال پر اس وقت مقصدیت ظاہر نہ ہو سکی۔ اس کا وقت ۱۹۴۸ء میں آیا۔ اگر پہلی جنگ عظیم کے بعد قائم شدہ "جمعیت اقوام" League of Nations نے جسے اقبال نے "داشتۂ پیرک افرنگ" سے موسوم کیا تھا۔ فلسطین کو انگریزوں کے زیر سرپرستی دوسری جنگ عظیم ۴۵-۱۹۳۹ء کے بعد قائم شدہ اقوام متحدہ United - Nations نے جو ابھی بھی "داشتۂ پیرک افرنگ" تھی ۱۹۴۸ء میں فلسطین کو "اسرائیل" کا نام دے کر یہودیوں کے لئے ایک الگ آزاد مملکت قرار دیا اور نتیجہ کے طور پر عرصہ ۳۵ سالوں سے جو کچھ مشرق وسطیٰ میں ہو رہا ہے وہ فرنگی مدنیت اور فرنگی سیاست کی دین ہے۔

اقبال پر ۱۹۳۰ء میں مقصدیت تو ظاہر نہ ہو سکی مگر ان کی شخصیت الہامی تھی اور ۱۹۴۸ء میں ہونے والے واقعات کا الہام انہیں ہو چکا تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک نظم "یورپ یہود" میں کیا اور آج دنیائے عیسائی کے مکہ کے متولی یہودی ہیں

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایان تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

حکمت مغرب کی زد میں زیادہ تر ملت اسلامیہ رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس حکمت نے نسب کے نام پر عربوں کو غیر عربوں سے لڑانے کا منصوبہ بنایا اور وہ کامیاب بھی رہے جس کا رونا اقبال یوں روئے

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

فرنگی مدنیت میں اخوت کا قیام نسب پر کیوں ہے۔ اس کی ایک مثال اقبال نے ایک نظم "اشاعت اسلام فرنگیان" میں دی ہے

ضمیر اس مدنیت کا دین سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبول دین مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

رنگ و نسل کے نام پر برطانیہ، جنوبی افریقہ اور دیگر مغربی

ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آج بھی اقبال کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔

الغرض اقبال نے فرنگی مدنیت کے مضر اثرات کو ہر پہلو سے نمایاں کیا اور اتنی سنجیدگی اور فلسفیانہ استدلال سے پیش کیا کہ غور و فکر کی راہیں کھل گئیں۔ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" اقبال نے اپنے سارے کلام میں اس مقولہ کا تقابلی جائزہ لے کر رچ بس دیا۔ اس لئے کہ

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ عومت
ہے حضرت انساں کے لئے اس کا ثمر موت

مگر اس کا علاج بھی انہوں نے بتایا

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

ہوا ہے بندۂ مومن فسونیٔ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک

اقبال کا یہ کارنامہ اجتہادی ہے۔ قوم و ملت کے لئے مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ پتھر کو پانی فرنگی شیشہ گروں نے بنایا تھا مگر اقبال نے پھر اس پانی میں پتھر کی سختی دی اور بجا فرما گئے

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
میری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

مجاز اور جذبی ایک مشاعرہ میں مدعو تھے دوسرے تمام شعرا مشاعرے کے شہ نشین پر جا چکے تھے لیکن یہ دونوں کھانے پینے میں مصروف تھے منتظمین نے ان کو اطلاع دی کہ محفل مشاعرہ سج گئی ہے اور سامعین بے چینی سے انکے منتظر ہیں، جذبی نے کہا۔ ابھی چلتے ہیں ذرا سا رائتہ کھا لیں۔

مجاز کے مزاح کی حس پھڑک اٹھی۔ ایکدم سنجیدہ ہو کر بولے ! جذبی اس رائتہ والی بات کو اقبال اپنے ہاں نظم کرتے تو کہتے :

حیف شاہین رائتہ پینے لگا۔

اور اختر شیرانی کا مصرع ہوتا۔ رائتہ جو رخ سلمیٰ پہ بکھر جاتا۔

جوش یوں کہتے — رائتہ کھا کر وہ شاہ کج کلاہاں آ گیا،

فراق کا اندازِ بیاں یہ ہوتا — ٹپک رہا ہے دھندلکوں سے رائتہ کم کم

فیض احمد فیض اس طرح گہر افشاں ہوتے

تیری انگشت حنائی میں اگر رائتہ آئے
انگنت ذائقے یلغار کریں مثل رقیب

اور مجاز نے کہا میں خود یوں رقم کرتا

بنتِ شب دیگ جنوں رائتہ کی جائی ہے
میری مغموم جوانی کی توانائی ہے

اور پھر جذبی سے مخاطب ہو کر بولے۔ تم کو اس طرح کہنا ہوگا۔

ابھی چلتا ہوں ذرا رائتہ کھا لوں تو چلوں

بات محض رائتہ کھانے کی تھی ادب نوازوں نے اسکو کہاں سے کہاں پہونچا دیا

منقول از ادبی لطیفے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

پریم چند اور اشاریت

پریم چند کے فن پاروں میں اشاریت کا جائزہ لینے سے قبل اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ اشاریتی افسانوں اور افسانوں میں اشارات اور اشاریت اور اسی طرح ادب کی دیگر اصناف کے اشاریتی ہونے اور ان میں اشارات اور اشاریت کے فرق کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے، ہم آج اشاریت سے جو مراد لیتے ہیں اور اردو کے جن افسانوں کو اشاریتی افسانہ قرار دیتے ہیں انکا رشتہ جدید افسانوں سے ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشاریت جدید افسانے کی ایک پہچان بھی ہے۔ یہ اشاریتی افسانے عصر حاضر کے نئے نئے علوم، سائنسی ایجادات، صنعتی ترقیات، سمٹتے ہوئے فاصلوں، پھیلتی ہوئی شہری زندگی اور انکے باعث زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات اور ان اثرات کے عمل اور ردعمل سے وقوع میں آنے والے معاشی اور معاشرتی مسائل اور زبان و بیان کی نئی تشکیل کے پس منظر میں تحریر کئے جا رہے ہیں۔ ایسے اشاریتی افسانے اور دیگر اشاریتی تحریریں اپنی شناخت آپ رکھتی ہیں — ظاہر ہے اس زاویہ سے ہم آج سے قبل کے شعر و ادب کا جائزہ نہیں لے سکتے ہیں یہ زاویہ عصری معاشرتی پیچیدگیوں اور انکی باہمی کشمکش کا لازمی نتیجہ ہے — لیکن اس سے قطع نظر بھی اشاریت اپنا ایک مفہوم رکھتی ہے جسکا رشتہ ہمارے کلاسیکی ادب سے بھی استوار ہے۔ آج اشاریت نے ایک نئی جہت اختیار کرلی ہو، لیکن اشاریت تو ہمارے عوامی ادب کی بھی روح رہی ہے، سیدھے سادے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ جب کوئی لفظ اپنے بدیہی معنوں کے علاوہ کسی اور عمیق اور وسیع اور تہہ دار مفہوم کو پیش کرتا ہے تو اس لفظ کی حیثیت اشارے کی ہو جاتی ہے لیکن یہ معنوی وسعت عمق اور تہہ داری اپنے آپ ممکن نہیں بلکہ لفظ یا اشارے کے معاشرتی اور تہذیبی پس منظر اور فنکار کی عصری حسیت پر اسکا انحصار ہوتا ہے۔ یہ معاشرتی اور تہذیبی پس منظر جسقدر وسیع اور اثباتی قدروں کا حامل ہوگا اشارہ بھی ایک مکمل اور بھرپور اشارہ ہوگا۔ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر کی طرح ہر اشارہ باطنی طور پر معنوں کے سمندر کا حامل ہوتا اور گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتا ہے۔ یوں شعر و ادب کے اساسی مقصد ترسیل و ابلاغ کا حامل بھی!

اشاریت ایک وقیع جامع اور اعلیٰ پیرایۂ اظہار ہے یہ فنکار سے گہری، مرتکز اور مسلسل فکر کی طالب ہوتی ہے۔ دو نیز جہاں غور و فکر کی کارفرمائی ہوگی۔ بات ایجاز و اختصار سے ہوتی ہوئی اشاریت تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ یوں بلاغت اور اشاریت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اشاریت بات کرنے کا نہیں، بات کو سلیقہ اور ہنرمندی سے کرنے کا نام ہے ادیب ہر کہہ و مہہ کے بس کی بات نہیں۔ بات تو سب کر لیتے ہیں لیکن کتنے ہیں جنکو بات کرنا آتا ہے، ہنرمندی اور طرحداری کا سوال تو بعد میں پیدا ہوگا اور یہ ساری چیزیں خون جگر چاہتی ہیں۔ اپنے دور کے ہر عالی مرتبت اور عظیم فنکار نے خون جگر کو کام میں لایا ہے اور اس قطرۂ خون جگر سے سیل کو دل بنا دیا۔ سچ بھی ہے کہ اس کے بغیر نقش ناتمام رہتا ہے اور نغمہ سودائے خام!

فنکار کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنے پیغام کو جہاں تک ممکن ہو پہونچائے۔ کفایتِ لفظی اور بلاغت سے کام لیتے ہوئے اپنے الفاظ میں معانی اور مفاہیم کی ایک دنیا آباد کردے۔ اسی لئے اپنے دور کے عظیم فنکاروں نے رمز و ایمار سے کام لیا ہے۔ یہ سمجھنا کہ الفاظ جو کہتے ہیں فنکار صرف وہی کہتا ہے درست نہیں۔ ہر عظیم فنکار کا پیغام الفاظ کی حدوں سے ماوراء بے حد و بے ثغور ہوتا ہے۔ الفاظ تو اس کے لئے محض اشارات ہیں اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ راست اور دو ٹوک اظہار اس قدر موثر نہیں ہوتا۔ عظیم ادب ایمائیت اور اشاریت کا مل ہوتا ہے اور رمز و ایمار سے فنکار کی ادبی قامت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

پریم چند نہ صرف اپنے دور کے عظیم فنکار تھے بلکہ آج بھی ان کی عظمت مسلم ہے اور آئندہ بھی، اردو، ہندی فکشن میں ان کی مرتبت بلند رہے گی۔ انہوں نے محض لکھنے کے لئے نہیں لکھا۔ ان کے پیش نظر ایک مقصد اور منہاج تھی، انہوں نے حقیقت نگاری سے کام لیا اور صداقت پسندی کا دامن تھامے رہے۔ پریم چند نے گرد و پیش اور اطراف و اکناف سے اپنے رشتے کو استوار رکھا۔ آزادی کی جد وجہد اور اپنے عہد کی معاشرتی اور تعلیمی تحریکات پر ان کی نگاہ بڑی گہری تھی، انہوں نے کسی نہ کسی طرح ان تحریکات سے خود کو وابستہ رکھا۔ سیاستدانوں کیطرح انہوں نے ان تحریکات میں حصہ نہ لیا ہو لیکن ایک دیانتدار ادیب اور دانشور کی حیثیت سے انہوں نے بھرپور کوشش کی، کہ آزادی کی جد وجہد اور ان عوام دوست تحریکات کو آگے بڑھانے میں ممکنہ اعانت کریں۔ یہ تحریکات جو ان کے ماحول کی پیداوار تھیں اور انکی مستقبل کا اشاریہ ا پریم چند کے مزاج پر انکے ایک خط سے بھی روشنی پڑتی ہے جو انہوں نے جون ۱۹۳۰ء میں بنارسی داس چترویدی ایڈیٹر "وشال بھارت" کے موسومہ تحریر کیا تھا لکھتے ہیں،

"میری تمنائیں بہت محدود ہیں اس وقت سب سے بڑی آرزو بھی یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ کھانے کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں، لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہو ...... میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔"

اس کا مفہوم یہ اخذ نہ کیا جائے کہ پریم چند نے ادب پر سیاست کی بالادستی کو گوارا کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی سیاسی زندگی کو اپنے ناولوں اور افسانوں کا موضوع ضرور بنایا ہے لیکن وہ سیاست پر ادب کی بالادستی کے قائل تھے۔ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے اپنے خطبہ صدارت میں یہ بھی تو کہا ہے کہ ادیب

"وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔"

انکے بیشتر افسانوں اور ناولوں میں اپنے دور کی سیاست کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن بہرکیف وہ اپنے دور کی سیاسی تاریخ نہیں لکھ رہے تھے انکے یہاں براہ راست سیاسی واقعات کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ایسا ملنا چاہیئے تھا۔ وہ تو سیاسی واقعات کی سمت کیطرف محض اشارہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس خصوص میں اس قدر غیر معمولی اشاریت سے کام لیتے ہیں کہ ان کی فنکارانہ مہارت اور غیر معمولی چابکدستی کا قائل ہونا پڑتا ہے —— اس زاویہ سے دیکھیں تو پریم چند نے صرف وہی نہیں لکھا جو انہوں نے لکھا ہے بلکہ اشاراتی انداز میں ماورائے سخن بھی وہ بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پریم چند کے بیشتر ناول اور افسانے انکے دور کی سیاست اور معاشرت کی اشاراتی دستاویز ہیں تو یقین ہے اس سے اتفاق کیا جائے گا۔

۱۹۰۸ء میں زمانہ پریس کانپور سے پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہوتا ہے۔ افسانوں کے اس مجموعہ کو حکومتِ وقت نے یہ کہہ کر ضبط کرلیا کہ "ان کہانیوں میں بغاوت بھری ہوئی ہے"۔ "سوزِ وطن" کی کہانیوں میں پیرایۂ اظہار قدرے راست تھا اس مجموعہ کی ضبطی —— یعنی اس شر میں خیر کا پہلو یہ ملتا ہے کہ پریم چند نے اپنے بعد کے ناولوں اور افسانوں

میں راست اظہار کم کر دیا۔ انہوں نے اب بھی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ہندوستان کے دیہات یہاں کی سیاست اور معاشرت کی تصویر کشی کی لیکن اب ان کی تصویریں کیمرے کی طرح من و عن نہیں، ایک مصور کی تصویریں ہوتی تھیں جنہیں مصور مختلف خطوط، رنگوں اور سیڈز کے ذریعہ اپنی شخصیت اور اپنے زاویۂ نظر کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہاں حقیقت نگاری اشاریت کے پردے میں اور زیادہ حسین اور زیادہ پرکشش اور زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے اپنی کئی تخلیقات میں مہاجنی نظام کو موضوع بحث بنایا ہے۔ لیکن آیا انکے یہاں یہ مہاجنی نظام صرف مہاجنی نظام ہے؟ نہیں! پریم چند نے اس مہاجنی نظام کو نو آبادیاتی اور استحصالی نظام کے ایک اشارے کے بطور استعمال کیا ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نظام آج بھی موجود ہے اور یہ اشارہ عصرِ حاضر میں کسی تشریح و تفہیم کا محتاج نہیں۔

"جلوۂ ایثار" پریم چند کے ابتدائی دور کا اہم ناول ہے جس میں انہوں نے سوامی و ویکانند کی شخصیت کو اشاریتی انداز میں پیش کیا ہے۔ "جلوۂ ایثار" کا ہیرو پرتاب چندر یا سوامی بالاجی، دراصل سوامی وویکانند ہیں۔ پریم چند نے سوامی وویکانند کی شخصیت اور شاعری کو اس ناول کا موضوع بناتے ہوئے عوام کو بالواسطہ طور پر سوامی جی کی تعلیمات سے متاثر کرنے کی سعی کی ہے پریم چند کے دلکش اور رواں دواں انداز تحریر کے باعث یہ اشاریت معنی خیز اور بھرپور ہو جاتی ہے۔

پریم چند کے ناولوں میں عورت اور اس کے مختلف روپ دلآویز اور موثر انداز میں ملتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے استحصال کی انہوں نے غیر معمولی عکاسی کی ہے۔ چنانچہ ناول "بیوہ" میں پورنا کا کردار اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں عورت بالخصوص بیوہ کی حرماں نصیبی، خستگی اور ناگفتہ بہ حالت کے موثر اشارے کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح "بازارِ حسن" کا موضوع طوائف کی زندگی ہے۔ لیکن ایک وسیع پس منظر میں عورت کی بیچارگی اور بے بسی ہی اشاریتی انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

"گوشۂ عافیت" پریم چند کے معرکہ آرا ناولوں میں شمار ہوتا ہے اور عمومی طور پر ہندوستان میں کسانوں کی بیداری کے اشارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کے کرداروں منوہر اور بلراج کی انقلاب روس سے دلچسپی کے بارے میں آیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ پریم چند نے اس طرح جواہر لال اور ان کے رفقا کی انقلاب روس سے دلچسپی کی آئینہ داری کی ہے؟

"گوشۂ عافیت" میں غوث خاں بورژوا طبقے کا اشارہ بن کر سامنے آتا ہے اور غوث خاں کا قتل اس امر کی علامت ہے کہ ہمارا کسان اب بورژوا طبقے کی بالادستی کو گوارا نہیں کرے گا۔ اب وہ اپنی عزت پر حرف آنے نہیں دے گا۔ پریم شنکر سے اس دور کے مصلحین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور وہ کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کا اشارہ بن جاتا ہے کسی حد تک گاندھیائی رویہ اور گاندھی جی کا بھی ——

"غبن" کے اور کرداروں سے بحث نہیں۔ میں یہاں اس ناول کے صرف ایک کردار دیبی دین کا حوالہ دینا چاہونگا۔ پریم چند نے دیبی دین کی بے مثال حب الوطنی اور انسان دوستی کا ذکر کرتے ہوئے اور اس وضاحت کے ساتھ کہ اس کے دو نوجوان لڑکے ملک کی آزادی کی خاطر جدوجہد میں حصہ لیکر جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے محنت کش طبقے کے ابھرتے ہوئے قومی شعور اور سوجھ بوجھ کی ترجمانی کی ہے یہ کردار بڑا اشاریتی ہے۔

"میدان عمل" کا موضوع قومی اور سیاسی جدوجہد ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں یہاں یہ جدوجہد بھرپور اشاریتی روپ نہیں اختیار کر پاتی۔ تاہم "میدان عمل" میں مندر کا پجاری مذہبی اجارہ داروں کا اشارہ بن جاتا ہے۔ جو مذہب کو اپنی اور صرف اپنی جائیداد غیر منقولہ متصور کرتے ہیں اور منی پر مقدمہ انگریزوں اور انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں موجود نفرت کا اشارہ ہے۔ اس مقدمہ کا خاص پہلو یہ ہے کہ ناول کے سارے کردار جو مختلف المزاج ہی نہیں ایک دوسرے کے مخالف بھی ہیں بالاتفاق منی کی تائید کرنے لگتے ہیں۔ پریم چند اس طرح یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے باہمی اختلافات خواہ کتنے ہی اور کیسے ہی ہوں۔ انگریزوں کی مخالفت میں

جسد واحد کیطرح ایک ہیں۔

"گئودان"، پریم چند کا شہرۂ آفاق ناول ہے، بعض نقادوں نے تو صرف یہ کہہ کر، "گئودان" کی قدر و قیمت کم کرنے کی سعی کی ہے کہ یہ ہندوستان کے ایک خاص دور اور ایک خاص طبقے سے متعلق ہے۔ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار کہنے کو ہوری ہے اور پریم چند نے ہوری کو ایک خستہ اور غریب کسان کے روپ میں پیش کیا ہے لیکن اگر یہی ہے اور "گئودان" ہوری کی زندگی پر مشتمل ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ایسے بیشتر کسان جب بھی ملتے ہوں گے اور آج بھی مل جائیں گے۔ ان کی زندگی کی داستانیں کم و بیش وہی ہیں لیکن "گئودان" کی مرتبت اس میں ہے کہ ہوری اس ناول کا صرف ایک کردار ہی نہیں، ہندوستان کی، خاص طور پر دیہی زندگی کی صبر آزما جد و جہد اور محنت کش طبقے کا مظہر ہے۔ ایک ہوری ہی قرضدار نہیں تھا۔ آج کتنے ہندوستانیوں کی زندگی کرب و بلا سے دوچار ہے۔ اپنی تشنہ آرزوؤں، سسکتے ارمانوں، ڈوبتی تمناؤں، بے منزل خوابوں اور بھٹکتی تعبیروں کی جنگل میں کون ہے جو کھویا ہوا نہیں۔ پرکاش چندر گپت نے لکھا ہے۔ "گئودان" میں پریم چند نے ہندوستان کے ابتلا و آلام اس کے ہیرو، ہوری کی ذات میں مجسم کر دیئے ہیں"۔۔۔ ہوری کو صرف ایک گائے کی آرزو رہی ہو لیکن آج ہم میں کتنے ہیں جو اپنی آرزوؤں، اپنی گایوں کے حصول کے لئے اپنے خون جگر کو قطرہ قطرہ ٹپکا رہے ہیں۔۔۔ جسطرح یہاں ہوری صرف ہوری نہیں۔ گائے بھی صرف گائے نہیں۔ ارمانوں اور آرزوؤں کا اشارہ ہے، ترلوکی ناتھ کھنہ نے صحیح لکھا ہے۔ "گائے کی آرزو قتل، خواہش اور گئودان کے بیچ کی کہانی وقت کے چکر کی آگاہی دیتی ہے۔ ایک جد و جہد کی زندگی اپنے وجود کی آگاہی کیا کر خود اسی نظام کا شکار بن جاتی ہے کہانی کے دائرے کے مرکز میں رسوم، نظم، سنسکار اور خواہش کی علامت میں گائے ہی بیٹھی ہے۔ اور گئودان کی کہانی کا چکر اسی دھرتی پر گھومتا ہے"۔۔۔ گوبر اور دھنیا کے کردار ان انقلابی طاقتوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو اس دور میں ابھی ابھر رہی تھیں

"گئودان" کے سلسلے میں یہ بات بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر اس کا خاتمہ المیہ کے بجائے طربیہ پر ہوتا تو یہ نہ صرف معاشرتی حقائق کے برعکس ہوتا بلکہ اسکو ہندوستان کی دیہی زندگی اور ہمارے کسانوں کا اشارہ کہنے میں بھی تامل ہوتا ہے۔

ناول "چوگان ہستی" کا تذکرہ مجھے "گوشۂ عافیت اور غبن" کے بعد اور بہرکیف "میدان عمل" اور "گئودان" سے پہلے کرنا چاہئے تھا لیکن میں اس کا ذکر عمداً آخر میں کر رہا ہوں کہ اشاریتی زاویے سے یہ پریم چند کا اچھوتا اور بڑا کارنامہ ہے اور بے حد کامیاب بھی! "چوگان ہستی" کو محض ناول کی حیثیت سے پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اسکی اشاریت اور معنویت سے آگاہی حاصل کرنا ہو تو پہلے اس دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ "چوگان ہستی"، لکھا گیا ہے ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۴ء۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہمارے ملک میں عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریکات زوروں پر تھیں۔ اور اس سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۲۱ء میں کانگریس نے احمد آباد کے اپنے تاریخی اجلاس میں عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریکات پر اپنے اٹل ایقان کا اظہار کیا تھا عام نافرمانی کی تحریک کو بھی اس دوران منظم کیا گیا۔ اور ایسے وقت جبکہ ان تحریکات کو انتہائی کامیابی کے ساتھ چلا رہے تھے چورا چوری کا وہ اہم ترین واقعہ ظہور میں آتا ہے جس میں بپھرے ہوئے دیہاتیوں نے پولس ظلم سے تنگ آکر پولس اسٹیشن کو آگ لگا دی۔ گاندھی جی اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوئے وہ اپنی جد و جہد کو صرف عدم تشدد کے خطوط پر آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ چورا چوری کے ہنگامے کے بعد گاندھی جی نے ۲۲ر نومبر ۱۹۲۲ء کو عام نافرمانی کی تحریک واپس لے لی۔ اگرچہ بعض رفقاء نے گاندھی جی کے اس اقدام کو ناپسند کیا لیکن اس سے عدم تشدد پر گاندھی جی کے عزم و ایقان کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔

۔۔۔ اس سیاق و سباق میں "چوگان ہستی" پڑھیئے ناول کے وسیع تر کینوس میں پریم چند نے ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد اور ملک کی ساری سیاست کو سمیٹ لیا ہے اور اس طرح "چوگان ہستی" کو ہندوستان کی سیاسی

جدوجہد کا اشارہ بنا دیا ہے۔ گاندھی جی کے فلسفہ عدم تشدد کو بھی اشاریتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا ایک اہم کردار سورداس دراصل گاندھی جی کی نمائندگی کرتا ہے اور انہیں کی طرح ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ سورداس ایک ایسا کردار ہے جو اہنسا پر کامل ایقان رکھتا ہے۔ انفرادی طور پر حکومت اور سرمایہ داری کا مقابلہ کرتا ہے۔ کسی جابرانہ طاقت کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا، دم آخر تک نبرد آزما ہوتا ہے۔ بیرو کو معاف کر دیتا ہے۔ انتقام نہیں لیتا اور اس کا انجام بھی کچھ گاندھی جی کی طرح ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سورداس اس کے ساتھی ہیں۔ نائک رام بجرنگی، اور سوبھاگی۔ جو غریب اور محنت کش عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر گنگولی اور اندر دت متوسط طبقے کی۔ اور راجہ بھرت سنگھ اور راجہ مہندر کمار جاگیردار طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جان سیوک اور مسز جان سیوک سرمایہ دار طبقے اور اس کے استحصالی مزاج کی علامت ہیں تو کلارک براؤن، سامراجی حکومت اور حکام کے جبر و استبداد کے اشارے بن جاتے ہیں۔ یوں "چوگان ہستی" ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے وقیع اور معنی خیز اشارے کی حیثیت سے پریم چند کا ایک کامیاب ناول بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

"منگل سوتر" ایک نامکمل ناول سہی تاہم پریم چند کے فن کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مکمل نہ ہونے کے باوجود، منگل سوتر سے فنکار کے فن کی پختگی اور جامعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار کوئی تعجب نہیں، خود پریم چند ہوں جیسا کہ امرت رائے اور بعض ناقدوں کا خیال ہے۔ غرض یوں پریم چند نے اپنی شخصیت کو بھی اشاریتی انداز میں پیش کر دیا ہے ان کی ہنرمندی لائق داد ہے۔

اور اب کچھ افسانے ــــــ سب سے پہلے وہ افسانہ کہ پریم چند اور کچھ نہیں صرف یہی افسانے لکھ دیئے ہوتے تو ہندوستانی زبانوں کے افسانوی ادب میں انہی کا چراغ سب سے زیادہ روشن ہوتا۔ یہ افسانہ ہے "کفن"! ــــــ کفن پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ میں اس خصوص میں مزید کچھ عرض کرنے سے گریز کروں گا۔

مختصر یہ ہے کہ "کفن" ملکی و قومی افلاس کا اشارہ ہے۔ "کفن" اشارہ ہے اس امر کا کہ اگر استحصال اپنے حدود سے آگے ہو جائے تو بے حسی عام ہو جاتی ہے۔ کفن کے کردار مادھو اور گھیسو اپنے عہد کی بے حسی کی علامت ہیں۔ پریم چند انسانی استحصال کو جس اشاریتی انداز میں اور جس عمدگی کے ساتھ کفن میں پیش کیا ہے اس کی مثال دنیا کی اور زبانوں کے ادب میں شاید ہی ملے۔

میں نہ یہاں پریم چند کے ان تمام افسانوں کا ذکر کر سکتا ہوں جن میں اشارات اور اشاریت کی جھلک ملتی ہے۔ اور نہ یہاں اس کی گنجائش ہے۔ جن افسانوں کی سمت مجھے توجہ دلانی ہے ان میں ایک "ایشور نیائے" بھی ہے۔ یہ افسانہ دراصل اشارہ ہے کہ انسان کا ضمیر مر نہیں سکتا۔ خیر و شر کی جنگ میں، حسینؑ و یزید کی جنگ میں، بالآخر خیر کی جیت ہوگی۔ اور حسینؑ کے حصے میں فتح آئے گی ــــــ اور اب جب حضرت امام حسینؑ کا نام آ چکا ہے تو میں پریم چند کے افسانہ "کربلا" کا حوالہ دیئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "کربلا" کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات ہیں جو عرصہ دراز سے ہندوستان کا مقدر اور وطن عزیز کے ماتھے پر کلنک ہیں۔ اس اشاریتی ڈرامے کے ذریعہ پریم چند نے برطانوی سامراج کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کو پیش کیا ہے۔ ہندو اور مسلمان، دونوں کا خون اس سرزمین پر ایک ساتھ بہہ رہا ہے۔ اس ڈرامہ کا حاصل یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ساہس راؤ میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی تائید میں لڑتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ تاریخی طور پر یہ درست ہو کہ نہیں، معاشرتی، تہذیبی اور انسانی نقطہ نظر سے یہ بات اسقدر اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن یہ ڈرامہ اشارہ ہے کہ مسلمانوں ہی کو نہیں غیر مسلموں کو بھی حضرت امام حسینؑ سے عقیدت ہے۔ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کربلا کو پڑھیئے۔ اس کی اشاریت اور واضح اور واضح ہو گی۔ اس کی اشاریتی اہمیت کا اندازہ پریم چند کے اس مکتوب سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۲۳ر جولائی ۱۹۲۴ء کو منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھا تھا یہ جملہ ملاحظہ ہو:

"یہ ڈرامہ تاریخی ہونے کے ساتھ پولیٹیکل ہے"

کوئی شبہہ نہیں کہ پریم چند کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی، امن آشتی اور قومی یکجہتی کے مسائل سے بیحد تعلق خاطر تھا۔ جوں جوں ان کا فن ترقی کرتا گیا۔ ان کی شخصیت کا دائرہ فنکار کے دائرے سے پھیل کر ایک مصلح اور ایک فلسفی کے دائرے کی شکل اختیار کرتا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اور مسائل کے ساتھ ساتھ، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ناول "پردہ مجاز" کا موضوع بھی یہی ہے نیز انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جہاں تہاں ہر دو مذہب کی اچھی اور اعلیٰ اقدار پر روشنی ڈالی اور ان کی ترویج کی سعی کی۔ اردو اور ہندی کو ایکدوسرے سے قریب لانے پر زور دیا۔

شہری اور دیہی زندگی کی بہتر خصوصیات کو ایک سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند اپنی ذات سے شہری اور دیہی زندگی کے امتزاج کے، اردو۔ ہندی لسانی، ہم آہنگی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور ہندو مسلم قومی یکجہتی کا دلآویز اور موثر اشارہ تھے۔ ان کی تصانیف صرف اپنے دور میں واقعیت اور حقیقت پسندی کی تفسیر نہیں تھیں۔ آج بھی اپنی اشاریتی روح کے باعث وزن ووقار کی حامل ہیں اور جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا بدلے ہوئے حالات میں بھی ان کے فن کی اشاریتی معنویت اور زیادہ گہری اور زیادہ دلکش اور زیادہ وقیع ہوتی جائے گی۔

نواب یوسف علی خان والئ رام پور کا انتقال ہوگیا تو مرزا غالب بھی تعزیت کے لیے گئے نواب کلب علی خان مسندنشین ہوئے تو مرزا غالب کی واپسی کے وقت رسمًا خدا حافظ کہا، مرزا غالب نے تنک کر کہا، حضور غضب ہے خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا اور آپ پھر مجھے خدا کی حفاظت میں دے رہے ہیں۔

کیلاش ناتھ کاٹجو جب ہوم منسٹر تھے ان کی صدارت میں مشاعرہ ہورہا تھا۔ انور صابری جب شہ نشین پر آئے تو کلام سنانے سے پہلے کہنے لگے۔ وقت وقت کی بات ہے کاٹجو صاحب آج ہوم منسٹر ہیں اور میں معنوز شاعر کا شاعر ہوں حالانکہ انگریزوں کے دور میں ہم ایک ہی جیل میں رہ چکے ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے پھبتی کسی، لیکن جرم یقینًا جدا جدا تھے۔

منقول: ادبی لطیفے
از: خواجہ عبدالغفور

اس طرح اگست ۱۸۵۲ء کے ڈیڑھ برس بعد جنوری ۱۸۵۴ء کے قریب یہ ڈراما پہلی بار اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد اندرسبھا کو اتنی زبردست شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی کہ اسے ڈرامے کا متبادل قرار دیا جانے لگا۔ جب کوئی ڈراما کیا جاتا تو اسے اندرسبھا کہا جاتا۔ امانت کے تتبع میں متعدد ڈرامے لکھے گئے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے اس سلسلے میں بیس مختلف ڈراموں کا ذکر کیا ہے۔ جو امانت کی "اندرسبھا" کی طرز پر لکھے گئے۔[۳۰]

۶ :۔ اس کے بعد اردو ڈرامے کی تاریخ میں سب سے اہم 'راجا گوپی چند' اور 'جالندھر' ہے جسے ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو پہلی بار ہندو ڈرامٹک کور نے بمبئی کے گرانٹ روڈ تھیٹر میں پیش کیا۔ اس ڈرامے کو 'امانت کی اندرسبھا' پر اس بنا پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔ اسکی پیشکش 'امانت کی اندرسبھا' سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ہوئی لیکن امانت کے متذکرہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جزوی اعتبار سے 'اندرسبھا' کئی بار پیش کی گئی لیکن فساد کی بنا پر پیشکش مکمل نہ ہو سکی۔

——— اس طرح ان ڈراموں کی پیشکش کی بنیاد پر اولیت عطا کرنے کے قبل اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر لینا ہوگا۔ اس ڈرامے کی زبان اور پیشکش معیاری اردو میں نہیں ہے [۳۱]

بمبئی میں اسٹیج کی سرگرمیوں کے ڈرامے کو خواص کی بزم سے نکالا اور اسے عوامی دلچسپیوں کا جوہر عطا کیا۔ ابتدائی مراحل پھر پارسیوں کے ڈرامائی شوق و ذوق نے ترقی کی منزلیں طے کرائیں۔ پارسی ناٹک منڈل کا قیام ۱۸۵۲ء میں ہو گیا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس کے خاتمے پر مختلف ناٹک کمپنیاں وجود میں آئیں۔ ۱۸۵۵ء میں زور اسٹرن کلب نے "فرنگی اور ہندوستانی طرز ہائے حکومت کا موازنہ پیش کیا۔ جو نثر میں تھا اس کی کامیابی سے متاثر ہو کر ۱۸۵۹ء میں وکٹوریہ کلب نے پہلی تحریک آزادی کے جانباز مجاہد نانا صاحب کے حالات پر مشتمل ایک ڈراما اسٹیج کیا۔ جس میں دور کے مزاج کے اعتبار سے نانا صاحب کو غدار وطن اور قوم دشمن کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا ۱۸۶۲ء میں الفرڈ ناٹک منڈلی نے 'اندرسبھا' پہلے گجراتی میں پھر اردو میں پیش کیا۔ اس کمپنی نے ۱۸۶۷ء میں گلرو زرینہ بھی پہلے گجراتی اور پھر اردو میں پیش کیا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:

> راجہ گوپی چند اور جلندھر سے گلرو زرینہ تک چودہ سال کا عرصہ ہے ان میں کا کوئی ڈراما اب نہیں ملتا۔ ڈاکٹر بھاو جی لاڈ کے علاوہ کسی ڈراما نگار کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ فرنگی اور ہندوستانی طرز ہائے حکومت کا موازنہ اور نانا صاحب تو غالباً پروپگنڈے کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ اندرسبھا کو امانت کے متن سے تیار کر لیا گیا ہوگا دگلرو زرینہ' کے نام سے بعد کو تو متعدد ڈراما نگاروں نے ڈرامے لکھے۔ لیکن ۱۸۶۷ء میں کھیلے جانے والے ڈرامے کا نہ کہیں متن ملتا ہے۔ اور نہ اس کے لکھنے والے کا نام ہی نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوششیں چند محدود حلقوں میں رہیں اور انہیں بمبئی میں کوئی شہرت نہیں حاصل ہوئی اسی لئے ۱۸۷۱ء میں ڈراما 'خورشید' کے دیباچے میں مرزبان نے لکھا ہے کہ اس وقت تک اردو کا کوئی ڈراما نہیں لکھا گیا[۳۲]

اس کے بعد کا اہم ترین ڈراما ایدل جی کھوری کا 'سونا نا مول نی خورشید (سونے کے مول کی خورشید) ہے جسے دادا بھائی سہراب جی پٹیل نے ۱۸۷۱ء میں بہرام جی فریدون جی مرزبان کے ذریعہ گجراتی سے اردو میں ترجمہ کرایا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا بیان ہے کہ "بہرام جی فریدون جی مرزبان کے بیٹے تھے . . . کہتے ہیں کہ میرے والد نے خورشید کا ترجمہ اردو میں نہیں کیا موصوف فرید لکھتے ہیں " اس کے باوجود کہ اردو ڈراموں کے مصنف اور مترجم پارسی تھے لیکن سوائے آرام کے اور کسی پارسی کے متعلق ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس نے اردو میں براہ راست ڈرامے لکھے ہوں، پارسی عموماً گجراتی میں لکھتے تھے۔ اور کسی منشی کے ذریعہ اس کا ترجمہ اردو میں کرا لیتے تھے"[۳۳]

خورشید کی اردو میں پہلی اشاعت نومبر ۱۹۶۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے امتیاز علی تاج کی ترتیب و مقدمہ کے ساتھ ہوئی۔

پھر ۱۹۷۱ء میں کتاب نگر سے ڈاکٹر مسیح الزماں کے مقدمہ و ترتیب سے شائع ہوئی۔ ان اشاعتوں پر متعدد زاویوں سے صاحبان نظر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس لئے اس کا اعادہ غیر ضروری ہے مجموعی اعتبار سے اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنے مقدمے میں کہیں بھی خورشید کو اپنی تلاش و دریافت نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کے مسودے تک اپنی رسائی کے ذریعے کا اظہار انتہائی فراخ دلی سے کیا ہے۔ اس دور میں ہند و پاک کے درمیان کتابوں کی آمد و رفت ممنوع ہونے کی بنا پر اگر انہیں پاکستانی ایڈیشن کے متعلق معلوم نہ ہو سکا تو اس میں حیرت کی بات نہیں ہے۔

اردو اسٹیج کی ابتدا کے اس اجمالی مطالعے میں اولین نقوش واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں پارسیوں کی خدمات نظر انداز کرنا بڑی احسان فراموشی ہوگی۔ اردو ڈرامے کی مقبولیت کا سہرا انہیں کے سر بندھتا ہے۔ ابتدا میں پارسیوں کو اردو ڈرامے پیش کرنے میں تکلف رہا۔ ان کا خیال تھا کہ پارسی اداکار اردو صحت مخرج کے ساتھ ادا نہیں کر سکیں گے۔ اگر انہیں اردو کی تعلیم دی جائے تو اس میں بہت وقت صرف ہوگا پھر یہ بھی سوال تھا کہ ان کے اسٹیج کے لئے خصوصی طور پر ڈرامے لکھنے والا کون ہوگا۔ لیکن خورشید کی شہرت و مقبولیت نے پارسیوں کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اس کے اداکار عوامی ہیرو بن گئے تھے۔ اور خورشید جی بالی والا اور پستن جی، فرام جی، ہیڈن نے خورشید میں سوداگر اور معشوقہ کے کردار ادا کئے تھے۔ ان کو متمول لوگ اپنی گاڑیوں میں بٹھلا کر سیر کراتے اور تحفے تحائف پیش کرتے

پارسیوں نے اردو ڈرامے پیش کرنے میں اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے نئی نئی جدتیں اور طرح طرح کے اضافے کئے۔ جس سے اردو اسٹیج میں تنوع اور ندرت پیدا ہوتی گئی۔ الفریڈ ناٹک منڈلی نے جہاں بخش گل رخسار پیش کیا تو اس کے مکالمے نثر میں تھے لیکن درمیان میں اشعار بھی آتے تھے جو ترنم سے ادا کئے جاتے تھے یہ ڈراما مشینوں کی مدد سے اسٹیج کیا گیا تھا۔ جس کا تجربہ اسٹیج کے متعدد مسائل کو مختلف زاویے سے دیکھنے کی دعوت دینے لگا۔ ڈرامے کی نشر و اشاعت کے لئے زرتشتی معبد مقرر کئے جاتے تھے، جو جگہ جگہ مخصوص انداز میں اعلان کرتے کہ فلاں وقت، دن اور مقام، فلاں ڈراما اسٹیج کیا جائے گا۔ ڈرامے کے اشتہارات اخباروں اور رسالوں میں شائع کرانے کے علاوہ مخالفت اور موافقت میں مختلف مضامین شائع کرائے جاتے تھے۔ اس سے لوگوں کا اشتیاق بے صبری منزلیں تجاوز کر جاتا۔ تھیٹر کھچا کھچ میں اتنا مجمع ہوتا کہ ان پر قابو پانا آسان نہ رہ جاتا۔ ڈرامے کے مکالمے عوام کی زبان پر چڑھ جاتے اور اس کے گانے چاروں طرف گائے جانے لگتے۔ ان گانوں کی مقبولیت سے متاثر ہو کر دادی پٹیل کی تحریک پر آرام نے ایک منظوم ڈراما "بے نظیر بدر منیر" لکھا۔ جسے ۱۸۷۲ء میں وکٹوریہ تھیٹر کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ جو انتہائی مقبول ہوا۔ اس کے بعد بڑی تھیٹریکل کمپنیوں الفنسٹن اور وکٹوریہ نے باہمی تعاون و اشتراک سے نورجہاں پیش کیا یہ ڈراما بھی انتہائی کامیاب ہوا۔ دونوں کمپنیوں کو بے پناہ دولت حاصل ہوئی۔ سر سالار جنگ نے ڈراما دیکھا اور بے حد متاثر ہوئے ان کی تحریک پر دادی پٹیل اپنی منڈلی کے ساتھ حیدرآباد گئے اور وہاں اپنی فنکاری کے سکے جمائے۔ ان ابتدائی ڈراموں کے ذکر میں احسن لکھنوی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ڈراما جہانگیر، جو 'خون ناحق' کے نام کاؤس جی نے کھٹاؤ پارسی الفریڈ ناٹک کمپنی کے زیر اہتمام اسٹیج کیا۔ یہ کمپنی رفتہ رفتہ اردو اسٹیج کی تاریخ میں ہر اول دستہ کی حیثیت حاصل کر گئی اس کمپنی نے ۱۸۹۹ء میں آغا حشر کو تیس روپے ماہوار پر ملازم رکھا۔ یہی آغا حشر مقبولیت کی سرحدیں عبور کرنے لگے تو انڈین شیکسپیئر بھی کہلائے گئے۔ آغا حشر سے اردو تھیٹر کی تاریخ کا زریں دور شروع ہوتا ہے۔ جس کا اجمالی تذکرہ بھی اس مطالعے میں طوالت کا باعث ہوگا۔

اردو زبان و ادب کے مزاج و کردار سے اردو ڈرامے اور اسٹیج کی روایتیں مختلف نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کے ابتدائی نقوش کی ترتیب شاہان اودھ کی سرپرستی میں ہوئی لیکن اس نے عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے بعد قومی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی اساس کی حیثیت حاصل کر لی۔ فن کو اجزائے ایمان بنانے میں قومیں اور ملتیں رہتی ہیں۔ اردو اسٹیج کے ذریعے مراٹھی، پارسی وغیرہ بھی اردو زبان و ادب کی تاریخ کا لازمی جزو بن گئے۔

جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ ان کی ڈرامائی تخلیقات ٹیکنیک اور تجربات کو نظرانداز کر کے اردو ڈرامے کی تاریخ کی ترتیب و تہذیب نہیں ہو سکتی۔

حوالے

ع۱ Introduction of the plays
Unpleasant - do -
ع۲
ع۳ مرزا لطف علی : تذکرہ گلشن ہند دیباچہ ص۷
ع۴ محمد حسین آزاد : آب حیات ص۹۱
ع۵ کریم الدین : طبقات الشعرائے ہند ص۲۱۴
ع۶ عبدالحیٔ : گل رعنا ص۲۷
ع۷ حافظ محمود شیرانی : پنجاب میں اردو ص۱۶۲
ع۸ رام بابو سکینہ : تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص۱۱
ع۹ برج موہن دتاتریہ کیفی : منشورات ص۲۳۳
ع۱۰ سلیمان ندوی : شعر الہند جلد دوم ص۱۹۹
ع۱۱ حامد حسن قادری : داستان تاریخ اردو ص۱۱۶
ع۱۲ نور الٰہی محمد عمر : ناٹک ساگر ص۲۳۹
ع۱۳ سید اعجاز حسین : مختصر تاریخ ادب اردو ص۲۹۱
ع۱۴ عبدالسلام خورشید : اردو ڈراما ص۱۷
ع۱۵ بادشاہ حسین : اردو میں ڈراما نگاری ص۵۷
ع۱۶ عشرت رحمانی : اردو ڈراما تاریخ و تنقید ص۱۳۲
ع۱۷ سید مسعود حسن رضوی ادیب : نگارشات ادیب ص۲۶۰-۲۶۱
ع۱۸ مسیح الزماں : کاظم علی جوان کی شکنتلا، نیا دور لکھنؤ مئی ۱۹۶۵ء
ع۱۹ عبدالعلیم نامی : اردو تھیٹر جلد اول ص۱۹
ع۲۰ مسیح الزماں : خورشید مقدمہ ص۶
ع۲۱ خواجہ احمد فاروقی : اردو کا قدیم ڈراما، اردوئے معلیٰ قدیم اردو نمبر
ع۲۲ سید مسعود حسن رضوی ادیب : لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ص۴۰
ع۲۳ عشرت رحمانی : اردو ڈراما کا ارتقا ص۹۳
ع۲۴ سید مسعود حسن رضوی ادیب : شرح اندر سبھا
ع۲۵ سید مسعود حسن رضوی ادیب : لکھنؤ کا عوامی اسٹیج
ع۲۶ نور الٰہی محمد عمر : ناٹک ساگر ص۳۵۵
ع۲۷ سید مسعود حسن رضوی ادیب : لکھنؤ کا شاہی اسٹیج
ع۲۸ سید آغا حسن امانت : شرح اندر سبھا
ع۲۹ ایضاً
ع۳۰ مسیح الزماں کی اندر سبھا
ع۳۱ راقم السطور کی زیر طبع کتاب اردو اسٹیج کا پہلا ڈراما میں اس کی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس لئے سر دست اس کا اعادہ کرنا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔
ع۳۲ مسیح الزماں : دیباچہ خورشید ص۱۰-۱۱
ع۳۳ عبدالعلیم نامی : اردو تھیٹر حصہ اول ص۲۲۵
ع۳۴ عبدالعلیم نامی : اردو تھیٹر حصہ اول ص۲۲۵
ع۳۵ اردو ڈراما ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۵ء تک اردو ادب علی گڑھ جون ۱۹۵۵ء

علی احمد جلیلی

اقبال کی مکتوب نگاری

احساسات و جذبات کے تحفظ کو مکتوب نگاری کے فن کا نام دیا جاتا ہے تحریر کی ایجاد ذہن انسانی کے دور ارتقاء کی ایجاد ہے جس میں ارادہ کو بہت کم دخل تھا پہلے ضرورتوں کی تکمیل تک محدود رہی۔ بعد میں فنون عالیہ کی ایک معتبر صنف بن گئی۔ ڈاکٹر سید علی شاہ کے بموجب خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر خطوط کامیابی کے ساتھ لکھے جائیں تو بڑی حد تک ملاقات کا مقصد بھی پورا کر سکتے ہیں۔ یوں تو خط و کتابت کی کئی قسمیں ہیں لیکن ان میں ایک وہ ہے جو افشائے عام کے لئے بھی ہو سکتے ہیں اسطرح کہ مکتوب نگار کسی ضرورت کے تحت مکتوب الیہ پر اظہار ما فی الضمیر کرتا ہے جو اپنی افادیت کے اعتبار سے جب منظر عام پر آجاتے ہیں تو ادب کا ذخیرہ بن جاتے ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ کسی انسان کی گفتگو اسکی شائستگی کی علامت ہوتی ہے لیکن سب سے بڑی علامت کسی کی شائستگی اور تہذیب کی یہ ہے کہ خط نگاری کا سلیقہ کہاں تک ہے۔ اس پس منظر میں اقبال کی مکتوب نگاری کا مطالعہ کیا جائے تو بڑے دلچسپ پہلوؤں کا انکشاف ہوتا ہے۔ لیکن تقابلی مطالعہ کے لئے اقبال کے مکتوب کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سے پہلے اور بعد کے مکتوب نگاروں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

اقبال سے پہلے اور بعد کے مکتوب نگار

غالب سے پہلے مستقل فن کی حیثیت سے خطوط نگاری کا پتہ نہیں ملتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم طرز نگارش جسے محمد شاہی روشس کا نام دیا جاتا ہے اس کا خاتمہ مرزا غالب کے خطوط پر ہوا۔ غالب نے مکتوب نگاری کو گفتگو کا مترادف قرار دیا اور اظہار خیال کا وہ طریقہ اختیار کیا جو عام طور پر باتیں کرتے وقت اختیار کیا جاتا ہے انہوں نے ایک نئے لہجہ کی طرز نگارش کی بنیاد ڈالی جسکی ایجاد کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ سر سید کا رنگ بھی مکتوب نگاری میں اپنا ملتا ہے۔ ان کی زندگی کیطرح ان کی خط نگاری بھی مقصدی ہے جو پیغام کی حدوں سے نکل کر تبلیغ و خطابت کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ شبلی کے مکاتیب زیادہ تر علمی اور موضوعی ہیں جو اپنی تازگی ندرت اور عالمانہ انداز بیاں کے باعث بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ان مکتوبات کی ایک بڑی خصوصیت ان کا اختصار وایجاز ہے۔ حالی کے خطوط میں مدعا نگاری کا پہلو زیادہ ہے۔ ان کے مکاتیب کی خصوصیات صاف بیانی قطعیت اور سادگی ہے رنگینی و دلکشی پر زبان و بیان کی خشکی غالب ہے۔ امیر مینائیؒ کے مکتوب اس اعتبار سے بہت وقیع ہیں کہ شاگردوں کے استفسارات کے جواب میں ایسے ایسے مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو کسی مستقل تصنیف میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اکبر الہ آبادی کے خطوط انہیں کی ذات کی طرح دلچسپ ہیں۔ ان کی خصوصیت اختصار ہے مگر اختصار کی خشکی کو وہ ظرافت سے بدل دیتے ہیں اور اپنے اشعار سے کام لیتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے مکاتیب اردو زبان میں اپنی قسم کی واحد چیز ہے۔ عبارت آرائی کا اسلوب منفرد اور ناقابل تقلید ہے ان کے خطوط کی عربیت اور فاضلانہ طرز تخاطب مخاطب کو حیران کر دیتے ہیں۔ ان کے خطوط میں وہی رنگینی اور رنگا رنگی ہے جو ان کی زندگی میں تھی۔ مولانا عبدالحق کے مکتوب خالص کاروباری اور پیغامی ہونے کے باوجود ادبی شان رکھتے ہیں جو اپنی سادگی پرکاری اور بلاغت کے لحاظ سے کسی ادب پارہ سے کم نہیں۔ مہدی افادی کا شمار صاحب طرز

مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے۔ بقول حبیب الرحمٰن شروانی، مہدی کے مزاج کیطرح ان کے مکتوب میں بھی یونان کے سنگتراشوں کی سی نزاکت و مصوری ہے۔ زبان کی دقت کے باوجود اس میں دلکشی بھی ہے اور رومانیت بھی۔ سید سلیمان ندوی کے خطوط اپنی نکتہ آفرینی کیلئے شہرت رکھتے ہیں۔ عبدالماجد دریا بادی کے مکتوب ادیبانہ شان کے لئے قابل ذکر ہیں جس کے اندر طنز کے نشتر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے مکاتیب کا مزاج جذباتی ہے جو شبلی اسکول کا خاص وصف ہے۔ چودھری محمد علی ردولوی بھی ایک منفرد مکتوب نگار ہیں۔ ان کے خطوط میں غالب کی سی بے ساختگی اور آمد ہے۔ وہ لکھتے نہیں، بات کرتے ہیں۔ بولی جانیوالی زبان میں انہوں نے کامیاب خط لکھے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے خطوط سادہ، کاروباری اور بے مزہ ہیں۔ لیکن نکتہ آفرینی کے سبب پڑھنے کے قابل ضرور ہیں۔ جوش کے خطوط میں بے باکی و صاف گوئی ہے جن میں ان کی اپنی ذات شریک رہتی ہے۔ فراق گورکھپوری اپنے خطوں میں فاضلانہ اور علمی شان پیدا کرتے ہیں۔ ان خطوط کا محور زیادہ تر ان کی اپنی شخصیت ہوتی ہے جسے وہ اپنے اشعار سے دو بالا کرتے ہیں۔

اقبال کے مکتوب الیہ

اقبال کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا جن میں ادیب و شعراء بھی تھے۔ محققین اور مورخین بھی تھے۔ بزرگان دین بھی تھے اور عقیدت مندوں کی ایک بڑی تعداد بھی۔ ان تمام شخصیتوں میں چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن سے اقبال کی اپنائیت بہت زیادہ تھی اقبال نے زیادہ تعداد میں انہیں کو خط لکھے ہیں اسلئے ان کا مختصر تعارف بھی ضروری ہے۔

سید نذیر نیازی جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ اور دہلی سے منسلک تھے۔ اقبال کے ایسے شیدائی تھے جنہیں اقبال سے بہت زیادہ نیاز حاصل تھا اقبال نے اپنی تصنیفات کی اشاعت اور علاج و معالجہ کے تعلق سے انہیں اتنے زیادہ خطوط لکھے کہ نیازی نے ان کو مکتوبات اقبال کی شکل دے کر اقبالیات میں اہم اضافہ کیا۔ سلیمان ندوی اقبال کے ہمعصروں میں علوم اسلامی کے عالم کے اعتبار سے انکی شخصیت مسلم تھی۔ اقبال ان کی دینی خدمات سے متاثر اور ان کی علمیت کے معترف تھے۔ قرآن و حدیث کے مفہوم نظم کرنے میں جب کبھی اشتباہ ہوا۔ اقبال نے ان سے مشورہ لیا۔ ڈاکٹر سر راس مسعود۔ راس مسعود اقبال کے دوست بھی تھے ان کے مشیر اور محسن بھی۔ جب تک وہ بھوپال میں تھے ان سے خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ اقبال کی علالت نے جب طول کھینچا تو راس مسعود ہی نے ان کے علاج کا بھوپال میں انتظام کیا۔ انہیں کی سفارش سے اعلیٰحضرت بھوپال نے ان کی آخری عمر میں ۵۰۰ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کیا۔ سر شیخ عبدالقادر اقبال کے خاص پرستاروں میں تھے جنہوں نے اپنے رسالہ مخزن میں سب سے پہلے اقبال کی نظمیں چھاپیں۔ علامہ کا پہلا مجوعہ "بانگ درا" انہیں کی کوشش سے منظر عام پر آیا۔ اقبال کے بعض مضامین کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا۔ عبدالماجد دریابادی۔ اقبال سے ان کی دوستی مذہبی مسائل اور فلسفیانہ استدلالات کے سلسلے میں قائم ہوئی جس کی توضیح اقبال کو مطلوب تھی۔ ان دونوں کے درمیان جو خط و کتابت تھی اس سے اقبال کی نظر میں آپ کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خان محمد نیاز الدین خاں جالندھر کے رئیس اور علوم و ادب سے شغف رکھنے والے بزرگوں میں تھے اپنا کلام بھی اقبال کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجتے تھے۔ ادبی موانست کے علاوہ ایک اور قدر مشترک کاتب و مکتوب الیہ میں یہ بھی تھی کہ دونوں اعلیٰ نسل کے کبوتروں کے ناقد تھے۔ اقبال نے نیاز الدین کو جتنے خطوط لکھے وہ مکاتیب اقبال کے نام سے شائع ہوئے۔ مولانا غلام قادر گرامی۔ فارسی کے مسلم الثبوت شاعر تھے وہ بھی ایسے کہ اقبال اپنے فارسی کلام میں بوقت ضرورت ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جالندھر اور حیدرآباد جہاں وہ رہے اقبال سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے پیشکار و مدارالمہام تھے۔ شعر و سخن سے خاندانی نسبت تھی۔ عربی و فارسی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ علامہ اقبال سے شاد کے مراسم کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب وہ حیدرآباد آئے تھے۔ مہاراجہ کی میزبانی اقبال کو ایسی پسند آئی کہ کئی مرتبہ حیدرآباد آئے۔ اس دوستی و یگانگت کا آئینہ وہ خطوط ہیں جس کا سلسلہ آخری وقت دونوں کے درمیان جاری رہا۔ اسلم جیراجپوری۔ اعظم گڑھ کے رہنے والے علوم مشرقیہ کے بڑے عالم تھے۔ کئی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ اقبال اور اسلم صاحب کے درمیان اسلامی اور تاریخی موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ تصوف کے مسئلہ پر بھی اقبال نے ان سے اپنے نظریہ کی وضاحت چاہی ہے۔ ظفر علی خاں۔ اپنے دور کے بڑے ادیب صحافی اور شاعر تھے اگرچہ ان کے طنز سے اقبال بھی نہ بچ سکے۔ باوجود اس کے ظفر علی خاں اقبال کے احباب میں تھے۔ "اسلام اور احمدیت" مضمون اقبال نے انگریزی میں لکھا تھا۔ اس کے ترجمے کا کام اقبال نے

ظفر علی خاں کو سونپا تھا۔ مسعود عالم ندوی۔ کئی گرانقدر اسلامی تصنیفات کے مصنف تھے جن میں اسلام اور اشتراکیت بہت شہرت رکھتی ہے اقبال کے بہت سارے خطوط ان کے نام ہیں۔ اسلامی۔ مذہبی اور دینی امور سے متعلق جو کچھ ان سے مل سکتا، فرمائش کر کے حاصل کرتے۔ اکبر الہ آبادی۔ ہمعصر شاعروں میں اقبال اکبر الہ آبادی سے بہت متاثر تھے، چنانچہ اقبال نے ابتدا میں بہت سی نظمیں اکبر الہ آبادی کے رنگ میں کہیں۔ خط و کتابت میں دونوں طرف سے کافی نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ محمد دین فوق۔ کشمیری افغان تھے عربی اور فارسی پر بڑی گہری نظر تھی۔ اچھے صحافی بھی تھے۔ اقبال کے مشورہ ہی سے انہوں نے تصوف کا رسالہ "طریقت" جاری کی۔ فوق تمام زندگی صوفیانہ اور ادبی رسالوں سے وابستہ رہے اور یہی اقبال سے خط و کتابت کا باعث بنا۔

ان کے علاوہ دیگر مکتوب الیہوں میں اور بہت سے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی۔ غلام بھیک نیرنگ۔ مولانا شوکت علی۔ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ۔ احسن مارہروی۔ شاد عظیم آبادی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا محمد عرفان خاں۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ قائداعظم محمد علی جناح۔ مولوی عبدالحق۔ نصیرالدین ہاشمی صوفی غلام مصطفٰی تبسم۔ رشید احمد صدیقی اور منشی سراج الدین وغیرہ

اقبال کے خطوط کے ماخذ اقبال کے جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں اور مختلف رسائل میں چیدہ چیدہ طور پر جن خطوط کا حوالہ ملتا ہے اس عنوان کے تحت ان کا مطالعہ بیک نظر کیا جا سکتا ہے۔

شاد اقبال۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے "شاد اقبال" پہلی بار ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ مرتب ڈاکٹر سید محی الدین قادری ہیں جنہوں نے سرزمین دکن سے اقبالیات میں وہ اضافہ کیا جو کسی اور مقام کے شخص سے ممکن نہ تھا۔ شاد اقبال میں وہ خطوط بھی ہیں جو اقبال نے مہاراجہ شاد کو لکھے ہیں اور ان خطوط کے جواب بھی ہیں جو شاد کی طرف سے اقبال کو لکھے گئے ہیں۔ اس التزام نے اس مجموعہ کی افادیت کو بڑھا دیا ہے اقبال کے خطوط کی مجموعی تعداد (۵۰) ہیں۔

اقبال نامہ: اس مکاتیب اقبال کے مرتب شیخ عطاءاللہ پروفیسر معاشیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ہیں۔ اس تالیف کو سر عبدالقادر کی سرپرستی حاصل ہے۔ مقدمہ صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی کا لکھا ہوا ہے۔ دیباچہ خود مرتب کا تحریر کردہ ہے۔ اقبال نامہ دو جلدوں پر مشتمل ہے جملہ (۲۶۷) مکاتیب ہیں۔ اس مجموعہ میں سب سے زیادہ خطوط مکتوب الیہ مولانا سلیمان ندوی کے نام ہیں جس کی تعداد (۷۵) تک پہنچتی ہے۔ علامہ کی تحریر کے (۱۲) عکسی خطوط بھی اس میں شامل ہیں

مکاتیب اقبال: بزم اقبال لاہور کی جانب سے اس کی اشاعت ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ (۵۵) صفحہ کی یہ تالیف ٹائپ میں چھاپی گئی ہے دیباچہ ایس۔ اے۔ رحمٰن چیف جسٹس ہائی کورٹ کا لکھا ہوا ہے۔ دیباچہ نویس نے "تصدیق" کے عنوان سے چند سطریں لکھتے ہوئے تصدیق کی ہے کہ خطوط شمولہ مجموعہ ہذا اصل خطوط کی صحیح نقل ہیں اس مجموعے کے سارے خطوط کے مکتوب الیہ خاں نیاز الدین خاں ہیں۔ خطوط تاریخ وار درج ہیں انکی تعداد (۹۷) ہیں۔ اس مکاتیب اقبال میں جتنے خطوط شائع کیے گئے ہیں ان میں سے صرف دو خطوط ہی ایسے ہیں جو شیخ عطاءاللہ کے مرتبہ مجموعہ اقبال نامہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

مکتوبات اقبال: یہ کتاب علامہ اقبال کے ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً نذیر نیازی کے نام لکھے گئے ہیں۔ اس تالیف کے مرتب خود نذیر نیازی ہیں۔ اقبال اکیڈمی کراچی کی طرف سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ تمہید میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ یہ سب مکتوبات اقبال اکیڈمی کراچی میں محفوظ ہیں ان سب کی عکسی نقلیں بھی حاصل کر لی گئی ہیں۔

مکاتیب نمبر (نقوش لاہور) اقبال کے خطوط کے جدید مآخذوں میں۔ نقوش لاہور کا مکاتیب نمبر بہت اہم ہے جسے محمد طفیل نے ۱۹۵۷ء میں مرتب کیا۔ یہ مکاتیب نمبر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کے وہ خطوط جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے تھے اس نمبر میں شائع کر دیے گئے ہیں۔ یہ خطوط تعداد میں (۹۴) ہیں جن میں صرف محمد دین فوق کے نام (۱۷) ہیں۔

خطوط نمبر۔ (نقوش لاہور) یہ مکاتیب نمبر سے زیادہ ضخیم تین جلدوں پر مشتمل ہے جس میں مختلف مکتوب نگاروں کے (۲۲۵۲) غیر مطبوعہ خطوط شامل ہیں ان میں اقبال کے نو دریافت خطوط (۸) ہیں جو سب کے سب مولانا گرامی کے نام لکھے گئے ہیں۔

اقبال مکاتیب کے آئینے میں: اقبال کے خطوط کا کوئی مجموعہ انکی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علامہ نے مکتوب نگاری کو اپنی شاعری کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دی۔ لہٰذا انہوں نے جو کچھ لکھا قلم برداشتہ لکھا اور برجستہ لکھا۔

عبارت آرائی، تصنع اور تکلف کیطرف کبھی ان کا دل بھی نہیں گیا۔ نذیر نیازی جن سے اقبال کو بڑی قربت حاصل تھی اور جن کے نام اقبال نے کثیر تعداد میں مکتوب لکھے ہیں، اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں کہ اقبال شاید ایک بار خط لکھکر پڑھتے بھی نہیں تھے۔ بعض الفاظ ان سے سہواً چھوٹ جاتے کبھی کبھی الفاظ کی تکرار بھی ہو جاتی[1]۔ اس حقیقت کے پیش نظر مکتوب اقبال کی اہمیت بہت بڑھجاتی ہے کہ انہوں نے جن خیالات کا بھی اظہار کیا وہ نیچرل ہیں۔

اکثر اچھے مکتوب نگاروں نے مکاتیب میں اپنی شخصیت کو بہت ابھارا ہے۔ مثلاً غالب، ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری وغیرہ لیکن اس کے برعکس اقبال اپنے مکاتیب میں مکتوب الیہ کی شخصیت کو زیادہ ابھارتے ہیں جس میں اقبال کی خود اپنی ذات بعض وقت دب کر رہ جاتی ہے یہ احساس برتری کا اخفا نہیں بلکہ قلب و نگاہ کی وسعت ہے اقبال جیسے شاعر کا اپنے ممتاز ہمعصروں سے داد پاکر اظہار خوشنودی کرنا یا کسی سچے ریمارک کو خندہ پیشانی سے قبول کر لینا حیرت انگیز ہے۔ جس سے اقبال کی سیرت بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

> آپ کا نوازشنامہ ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج
> مجھے ٹوٹے ہوئے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض
> بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے بالکل
> درست ہے۔ . . . . آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ
> ہم شعر کہنا ترک کر دیں[2]۔

مولانا تو خیر صاحب علم و فضل تھے لیکن ایک اور مکتوب الیہ منشی سراج الدین کی موسومہ تحریر دیکھئے جو ریزیڈنسی کشمیر کے گمنام میر منشی تھے۔ اس نامہ سے منشی موصوف کی شخصیت پھیل کر کتنی وسیع ہو جاتی ہے۔

> آپ ہندوستان کے ان چند لوگوں میں ہیں جنکو
> شاعری سے طبعاً مناسبت ہے۔ اگر نیچر ذرا فیاضی
> سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعرا میں
> پیدا کرتی[3]۔

اقبال اور مولانا سلیمان ندوی کے درمیان مذہبی علمی ادبی رشتہ کی جو گہرائی تھی اس کا پتہ کسی اور تحریر سے نہیں چلتا ہے۔ اقبال کے مکتوب ان کی شخصیت کو کیا مقام دیتے ہیں وہ اقبال کے الفاظ ہی میں ملاحظہ ہوں۔ "رموز بیخودی" نظم جب مکمل ہو گئی تو اس پر ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے علامہ نے مولانا کی خدمت میں نظم بھیجی اور اس کے بعد یہ خط لکھا۔

> "والا نامہ ابھی ملا۔ رموز بیخودی میں نے آپ
> کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لئے سراپا
> سپاس ہوں۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد کا خط آیا
> ہے۔ انہوں نے میری اس ناچیز کوشش کو بہت
> پسند فرمایا۔ مولانا شبلی کے بعد آپ استاذالکل
> ہیں۔ اقبال آپکی تنقید سے مستفید ہوگا۔"[4]

اس کے یہ معنی نہیں کہ اقبال اپنے مقام کو نہیں پہچانتے تھے۔ یا دوسروں کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ بلکہ مکتوب الیہ کے مرتبہ کا اعتراف کرنے میں انہیں عار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی خامیوں پر بھی ان کی نظر تھی۔ شعر و ادب کے مقامات ہوں یا حدیث و فقہ کے مسائل ہوں جہاں انہیں کہیں اشتباہ ہوا۔ اپنے ہمعصروں میں سے جو اس کے اہل تھے باصرار مشورہ و استفادہ کیا۔

غالب کی سوانح حیات اور ان کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن ادیبوں یا محققین نے غالب پر تنقید یں کیں۔ ان کو غالب نے اپنا حریف و مقابل سمجھا۔ انہیں اپنے تنقید نگاروں پر جھلاہٹ آتی تھی اور ایسے وقت وہ گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اسی نوعیت کے حالات میں اقبال کا ردعمل ان کے مکاتیب میں دیکھنے اور پڑھنے کی چیز ہے۔ اقبال کی بالغ نظری جب منظر عام پر آئی اور ان کی جدید طرز کی نظموں اور غزلوں نے شعر و ادب کے میدان میں ہلچل مچادی تو بہت سے قدامت پسند اور روایت پرست ان کی مخالفت میں صف باندھکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طوفانی مخالفت کا مقابلہ جس خندہ پیشانی اور ٹھنڈے دل سے اقبال نے کیا اس کی جھلک ان کے خطوط میں دیکھئے۔

---

[1] دیباچہ مکتوب اقبال۔ سید نذیر نیازی
[2] اقبال نامہ ص ۲۸ [3] اقبال نامہ ص ۲۴۳

[4] اقبال نامہ ص ۸۰

ایک بارکسی صاحب نے اقبال کی غزل پر اصلاح دیکر خود ان کے پاس بھیجدی - اقبال اس پر آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ انہوں نے راست مکتوب نگار کو جواب دینے کے بجائے اپنے ایک دوست کو جو شاید مکتوب نگار کے جاننے والوں میں ہوں ۔ اس واقعہ کے حوالے سے کچھ لکھا اور جس انداز میں لکھا اس سے ان کی سلجھی ہوئی سیرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔

بابو عبدالمجید صاحب ۔ یہ کوئی صاحب چھوٹے شملے سے میری غزل کی اصلاح کر کے ارسال کرتے ہیں ۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے اور عرض کیجئے کہ بہتر ہو آپ امیر و داغ کی اصلاح کیا کریں ۔ مجھ گمنام کی اصلاح کرنے سے آپ کی شہرت نہیں ہوگی ... [1]

اقبال مبلغ اسلام تھے ۔ انہوں نے بہت سے فرسودہ خیالات جو شریعت یا قانون الہٰی میں داخل ہو چکے تھے ان کی اصلاح قرآن و احادیث کی صحیح تفسیر کی روشنی میں کی ۔ ان کی فکر کی گہرائی کو نہ سمجھکر بہت سے لوگوں نے اسکی تعبیر غلط کی اور اعتراضات شروع ہوگئے ۔ اقبال کے ایک کرم فرما ظفر احمد صدیقی نے ایسے چند اعتراضات معترض کے نام کے ساتھ علّامہ کو لکھ بھیجے ۔ اور وضاحت طلب کی ۔ اقبال نے مکتوب نگار کو جو جواب میں بھیجا اس میں معترض پر اپنا غصہ جس انداز میں اتارا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔

" جناب من ۔ معترض قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے علیٰ ھذا القیاس ۔ اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور میری تحریروں سے ناواقف محض ہے ۔ آخر الذکر صورت میں اسے معذور جانتا ہوں ۔ آخر اس غلامی کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس کونسا ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کر سکیں ۔ " [2]

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۱

[2] اقبال نامہ ص ۲۳۸

جہاں تک علمی و ادبی نوعیت کے خطوط کا تعلق ہے ان خطوط سے اقبال کی وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے اور حق و صداقت کی تلاش ظاہر ہوتی ہے ۔ کہیں زمان و مکان سے متعلق مسائل ہیں ۔ کہیں فلسفیانہ مباحث ہیں ، کہیں اجتہاد کے متعلق تحقیق ہے ، کہیں تنقیدی کتابوں کے حوالے ہیں اور کہیں مذاہب و علوم دینیہ پر مستقل بحثیں ہیں بعض لوگوں کو " خضر راہ " میں جوش بیان کی کمی نظر آتی ہے ۔ سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مکتوب میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا ۔ اقبال تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

" جوش بیان کے تعلق سے جو کچھ آپنے لکھا صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لیئے ضروری تھا کم از کم میرے خیال میں جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث پر ان کی نظر ، ان سب باتوں کے علاوہ انکا انداز طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل انکے ارشادات میں داخل نہ ہو " [1]

ڈاکٹر صاحب کے مذہبی و علمی خیالات کے سلسلے میں یہ مسئلہ خاص طور پر اہم ہے کہ تصوف کے متعلق ان کا کیا خیال ہے ۔ اقبال تصوف کے مخالف نہ تھے جو کچھ اختلاف تھا تصوف کے بعض ان مسائل سے جنکو وہ مسلمانوں کی ترقی بلکہ خود اسلام کا مخالف سمجھتے تھے ۔ وہ اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا چاہتے ہیں ۔ محمد اسلم جیراج پوری کو لکھتے ہیں

" تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے ۔ " [2]

---

[1] اقبال نامہ ص ۱۱۹

[2] اقبال نامہ ص ۵۴

مذہب ہو، مذہبیات ہو، ادب ہو، شعر و سخن ہو، تنقید ہو، تفسیر ہو یا مشرقی و مغربی مفکرین کے علمی و تحقیقاتی نظریات ہو۔ اقبال سب پر بکمال یقین اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کر سکتے تھے اور بڑی سے بڑی شخصیت کو اعتقادی نقطہ نظر سے اپنی تنقید کا ہدف بنا سکتے تھے۔

خودی اقبال کا پسندیدہ موضوع ہے انکے بیشتر افکار و نظریات اسی نقطہ کے گرد گھومتے ہیں۔ خودی کا مثبت فلسفہ جو ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا وہ انقلابی تھا۔ مختلف استفسارات کے جواب میں اقبال نے اسکی تشریح کی ہے۔ ظفر احمد صدیقی کو لکھتے ہیں

" خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی، قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج میں حبشہ کی آزادی کو برقرار رکھا۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے بہر حال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔" [1]

عبدالماجد دریابادی نے انگریزی ترجمۃ القرآن کے سلسلے میں دریافت فرمایا تھا کہ لفظ " برزخ " کو انگریزی میں کیونکر منتقل کیا جائے۔ انھیں لکھا

"جہانتک مجھے معلوم ہے لفظ برزخ کا کوئی تصور انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ بعض مترجمین قرآن نے لفظ BARRIER لکھا ہے مگر یہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں موت، برزخ، حشر و نشر BIOLOGICAL اصطلاحات ہیں اور ان کی حقیقت کچھ نہیں معلوم۔ میرے خیال میں برزخی زندگی کا ترجمہ BURZUKH LIFE ہی کریں" [2]

---

[1] اقبال نامہ ص ۲۰۱

[2] اقبال نامہ ص ۲۴۳

کسی نے " نشان ہلال " کی تاریخ کے متعلق سوال کیا اس پر علمی بحث یوں کی ہے

" جہاں تک مجھے علم ہے یہ نشان نبی کریمؐ اور صحابہ کے عہد میں مروج نہ تھا۔ بعض مغربی مورخین نے لکھا ہے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاقی طور پر شروع ہوا۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں، لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کیا۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے۔" [1]

مولانا نیاز فتحپوری نے ایک ادبی بحث چھیڑی تھی۔ جس میں انہوں نے استدلال کیا تھا کہ " درّیکتا " بتشدید دال غلط ہے۔ علامہ سے اس کے بارے میں میر خورشید احمد نے استفسار کیا اور وضاحت چاہی۔ اقبال نے مدلل جواب دیا اور نیاز کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جواب میں لکھتے ہیں۔

" اصل عربی لفظ درّۃ (درۃ التاج) ہے جمع اس کی درر آتی ہے اور شاید درار ی بھی۔ فارسی میں بغیر تشدید بھی لکھتے ہیں۔ در یکتا۔ در ثمین۔ در مکنون، در یتیم۔ در شاہوار اور در نایاب، جہاں تک مجھے معلوم ہے سب درست ہیں۔ اگر ان ترکیبوں میں در یکتا وغیرہ مع التشدید لکھیں تو بھی درست ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے یقین ہے کہ در یکتا اور درّ یکتا دونوں درست ہیں۔ نیاز فتحپوری صاحب کا استدلال درست نہیں معلوم ہوتا۔" [2]

اقبال کے ملی اور مذہبی جو بھی نظریات و خیالات رہے ہوں۔ بدی کے نظام کو توڑنے کیلئے وہ سب سے پہلے آزادی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں

---

[1] اقبال نامہ ص ۳۳۶

[2] نقوش۔ مکاتیب نمبر ص ۳۰۴

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ملک کی جدوجہد آزادی سے خود کو الگ نہیں کیا
ایک طرف تو اپنے سیاسی نظریات کی ترجمانی انہوں نے اشعار میں
کی، دوسری طرف عملی طور پر ہندوستان کو آزادی دلانے والی جماعتوں
کے ساتھ خود کو وابستہ رکھا اور مسلمانوں کے حقوق و تحفظ کے لئے
کچھ ہندوستانی سیاست میں حصہ لینے کے لئے بھی نکالا۔ اقبال
کے بہت سارے مکتوبات سے انکی سیاسی مصروفیات و نظریات
کا پتہ چلتا ہے۔ غلام بھیک نیرنگ کو لکھتے ہیں ——

"میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت
تمام کاموں سے مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں
کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی
ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے
جیسا کہ آجکل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم
ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب
نہیں ہونگے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ بصیرت کہتا ہوں
اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے تجربے کے بعد۔
ہندوستان کی سیاست کی روش جہاں تک مسلمانوں
کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لئے ایک
خطرۂ عظیم ہے۔" ؎۱

جن دنوں اکثریت کے صوبوں میں مسلمان آبادیوں کے لئے ایک
مشترکہ سیاسی جماعت کا تصور ابھرا۔ اس وقت اقبال سے پوچھا گیا
کہ اسلامی ریاست کے بارے میں ان کی رائے مان لی جائے تو کیا
آبادیوں کا تبادلہ ضروری ہوگا؟ علامہ کا جواب نفی میں تھا

"آبادیوں کے تبادلہ کی تجویز میری نہیں ہے۔ لالہ
لاجپت رائے کی ہے۔" ؎۲

اقبال بہت دنوں تک پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر اور صدر رہے۔ پھر
نظریاتی اختلاف کے باعث اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اقبال اپنے
اس اقدام کی اطلاع سر راس مسعود کو دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میرا بھی یہی فیصلہ ہے جو تم نے کیا ہے۔ یہ واقعی
ادراک ہے۔ میں نے تو پارلیمنٹری بورڈ کی صدارت
سے بھی استعفا دے دیا ہے۔۔۔ بورڈ کے ممبر

؎۱ اقبال نامہ ص۲۰۱ ؎۲ مکتوبات اقبال ص۱۹۵

اصرار کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لئے اسے ملتوی کر دوں
بہرحال اس کے اختتام تک میں اس کی صدارت
سے دستبردار ہو جاؤں گا۔" ؎۱

مس نارفورہن نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی ایک ذمہ دار عہدہ دار
تھیں۔ انکو ایک طویل مکتوب لکھتے ہوئے اقبال نے مسئلہ فلسطین
پر اپنے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ نیشنل لیگ آف انگلینڈ
وقت شناسی کا ثبوت دے اور اہل برطانیہ
کو عربوں کے خلاف ناانصافی کے ارتکاب سے
بچائے۔۔۔ فلسطین انگلستان کی کوئی ذاتی جائداد
نہیں۔ فلسطین تو انگلستان کے پاس جمعیۃ الاقوام
کی طرف سے زیر انتداب ہے اور مسلم ایشیاء
لیگ آف نیشنز کو انگریزوں اور فرانسیسیوں
کا ایک ادارہ سمجھتا ہے جو انہوں نے کمزور مسلم
فلسطینوں کے علاقوں کو تقسیم کے لئے وضع کر
رکھا ہے۔" ؎۲

ان تحریرات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اقبال کی
زندگی کا میدان عمل سیاسیات نہ تھا۔ علمی اور فکری تھا۔ لیکن اس
کے باوجود وہ اسلامی ہند کی سیاسیات میں سرگرم حصہ
لیتے تھے۔

اقبال کے مکاتیب میں ایسے خطوط بھی بہت ملتے ہیں جو شخصی
نوعیت کے ہیں۔ نیاز الدین خاں سے اقبال کے مراسم بہت دوستانہ
تھے۔ انکے نام لکھے ہوئے نجی خطوط کو جب انہوں نے طبع کروانا چاہا
تو ایک خط میں اقبال نے نیاز الدین خاں کو لکھا۔

"عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی
ہے جسکو پرائیوٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں۔ مگر
اشاعت انکی نظر ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہئے اس
کے علاوہ پرائیوٹ خطوط کے طرز بیان میں خصوصیت
کے ساتھ لاپرواہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے

؎۱ اقبال نامہ ص۳۸۰ ؎۲ اقبال نامہ ص۲۲۵

خطوط اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہونگے۔ ؎۱

یہ خطوط اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں لیکن ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نذیر نیازی کے مرسومہ کچھ خطوط میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیماری کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں اپنی کیفیت اور غذا کا ذکر کرکے حکیم صاحب سے ہدایت چاہی ہے۔ لکھتے ہیں

"بعض باتیں فراموش کر گیا تھا اب لکھتا ہوں۔ حکیم صاحب سے دریافت کرکے فوراً مطلع کریں۔ میرا معمولی کھانا حسب ذیل ہے۔

(۱) صبح مکھن ٹوسٹ اور ایک انڈا نیم برشت یا نیم ہائل چائے۔

(۲) گیارہ بجے دوپہر کا کھانا۔ گوشت سبزی۔ کبھی کبھی پلاؤ۔ اس کے بعد آم بھی کھاتا ہوں۔

(۳) ۴ بجے کے قریب بادام مقشر کی کھیر

(۴) شام کو صرف نمکین چائے

دودھ آم اور لیمو کے تعلق سے ہدایت مل گئی۔ ان کے مطابق عمل کرونگا۔ یہ بھی معلوم کیجئے کہ کون کون سے پھل کھا سکتا ہوں۔" ؎۲

یہ مکتوب اگرچہ بالکل نجی ہے۔ لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی عام غذا کیا تھی؟ یہ معلومات کسی اور ماخذ سے شاید ہی مل سکے۔ اسی نوعیت کے اور خطوط میں انکے بعض مرغوب کھانوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک بار پروفیسر شجاع نے انہیں اچار بھیجا تھا۔ اسکے جواب میں لکھتے ہیں

"اچار کے لئے بہت بہت شکریہ۔ واقعی مجھے اچار شلغم سے بہت محبت ہے۔ خورجہ سے خود بھی ایک دفعہ منگوایا تھا۔ مگر وہ کچھ ایسا اچھا نہ تھا جیسا سنا تھا اس سے کم پایا۔" ؎۳

اقبال کی شخصیت اتنی معروف تھی کہ ہر شخص انہیں جانتا تھا اور انکی عزت کرتا تھا۔ انکا حلقہ احباب بیحد وسیع تھا۔ چنانچہ

؎۱ پیش لفظ، مکاتیب اقبال۔ ؎۲ مکتوبات اقبال ص ۱۳۷
؎۳ اقبالنامہ ص ۲۱۹

اہل غرض اپنا کام نکالنے کے لئے اقبال ہی کو زحمت دیتے تھے اور ان کا وسیلہ اختیار کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ لاہور کے ایک ملاقاتی ان کی سفارش لیکر حیدرآباد مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی خدمت میں رسائی پانا چاہتے تھے۔ ان کی خاطر مہاراجہ کو سفارشی خط یوں لکھتے ہیں۔

"سرکار والا۔ نیاز و تسلیم۔ حامل ہذا مولوی سید ابراہیم ہیں۔ یہ حیدرآباد جاتے ہیں اور مجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ سرکار کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے ان کو ایک معرفی نامہ دوں۔ آدمی ہوشیار ہیں اور قابل۔ فارسی کی لیاقت عمدہ ہے اور انگریزی بی۔ اے تک پڑھی ہے۔ آپ کے آستانے پر حاضر ہونے کا شرف حاصل کرنا انکی آرزو ہے امید کہ سرکار کا مزاج بخیر ہوگا۔" ؎۱

ڈاکٹر سر راس مسعود اور ان کی بیگم سے اقبال کے روابط نہ صرف دوستانہ بلکہ عزیزانہ تھے۔ ڈاکٹر راس مسعود کے اچانک انتقال پر ان کی بیگم کو یوں پرسہ دیتے ہیں۔

"مائی ڈیر لیڈی مسعود۔ میں آپ کو صبر و سکون کی تلقین کیونکر کروں جبکہ میرا دل تقدیر کی شکایتوں سے خود لبریز ہے۔ مرحوم سے میرے قلبی تعلقات تھے۔ جس کا حال آپ کو اچھی طرح معلوم ہے اسی بنا پر میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ غالباً مرحوم کے دوستوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس کے دل پر مرحوم نے اپنی دلنوازی، بلند نظری اور سیر چشمی کا گہرا نقش نہ چھوڑا ہو۔" ؎۲

اقبال کی مکتوب نگاری کی خصوصیات:

اقبال کے مکاتیب میں تنوع بہت ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ سارے کے سارے خطوط اقبال کی حیات و فکر کے کسی نہ کسی پہلو کے ترجمان ہیں ان کی خصوصیات کا تجزیہ مختلف عنوانات کے تحت کیا جاسکتا ہے

؎۱ شاد و اقبال ص ۷۹ ؎۲ اقبالنامہ ص ۳۹۱

حیات و فکر کی ترجمانی۔ اقبال نے اپنے مکتوبات میں زندگی اور ادب کے بڑے بڑے مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان سے اقبال کی شعر و شاعری، انکے مشاغل اور ان کی دلچسپیوں۔ سب کا پتہ چلتا ہے یہ خطوط ایک ایسے شاعر کی ترجمانی کرتے ہیں جو بہت بڑا شاعر ہونے کے باوجود محض شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

زبان و اسلوب۔ اقبال نے زبان کے مقابلہ میں ہمیشہ خیال کو ترجیح دی ہے۔ جس کا اظہار اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں

"زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے۔ بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلابات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔"

یہی سبب ہے کہ اقبال زبان کے استعمال میں محتاط نہیں۔ کہیں کہیں روایتی پابندیوں سے انحراف بھی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اقبال خطوط لکھنے کے لئے بہت کم وقت نکال پاتے تھے۔ ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"میں نے یہ خط بہت جلدی میں گھسیٹا ہے اس واسطے کہ روزہ کی وجہ سے طبیعت پریشان ہے اور شام کا وقت قریب ہے۔"

ڈاکٹر مسعود کو خط لکھتے ہوئے انہیں کہیں تم سے مخاطب کرتے ہیں کہیں آپ سے۔

"ایک خط پہلے لکھ چکا ہوں تمکو ملا ہوگا۔ جواب کا بھی انتظار ہے۔ امید ہے کہ آپ اور بیگم مسعود مع الخیر ہوں گے۔"

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کے خطوط میں زبان کی چاشنی نہیں۔ ایسی چند فروگزاشتیں انکے بعض بعض خطوط میں ہیں۔

مکتوب نگاری میں اقبال کسی پیش رو کے نقش قدم پر نہیں چلے اور انہیں فرصت بھی نہیں تھی۔ اس لئے انہوں نے ارادی طور پر کوئی خاص اسلوب اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوع کیطرح اپنے اسلوب تحریر بھی مختلف رکھے ہیں۔ زیادہ خطوط علمی، ادبی اور اسلامی موضوع پر ہیں جسکے لئے سیدھی سادھی زبان کام نہیں دیتی۔ اقبال کے ایک انگریزی خطبہ کے ترجمے کے سلسلے میں مولانا سورتی اور مولانا اسلم جے راجپوری کے درمیان آیۂ نور کی بحث آگئی۔ جب یہ بات علامہ تک پہنچی تو انہوں نے اس کا جواب دیا۔ جواب کی نوعیت چونکہ خالص مذہبی اور علمی تھی۔ اسلئے زبان کی بلاغت ملاحظہ ہو۔

"ڈیر نیازی صاحب ..... مولانا اسلم کا ارشاد بجا ہے مگر اس آیت کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ اس مضمون کی آیات قریباً کتب سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ خدا مادی معنوں میں نور ہے۔ نور محض ایک استعارہ ہے جیسے قدیم کتب سماوی میں PAUTHEISTICS سے استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی وجود باری کو ہمہ گیر ظاہر کرنے کے لئے۔ قرآن نے میری رائے ناقص میں اس قدیم استعارہ کو وجود باری کی مطلقیت پر اشارہ کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ عالم مادی میں زمانۂ حال کی تحقیق کی رو سے صرف نور ہی ایک ایسی چیز ہے جو اضافی طور پر مطلق ہے۔"[1]

اقبال نے جسطرح محض شاعری کو اپنا مطمح نظر کبھی نہیں بنایا۔ یہی روش ان کی نثر میں بھی ہے۔ خطاب، مضامین یا مکتوبات میں عبارت آرائی کا خیال انہیں کبھی نہیں پیدا ہوا۔ باوجود اسکے خیالات کے بہاؤ نے کبھی کبھی ان کے مکتوبات میں ادبی شان پیدا کر دی ہے اور عبارت میں چاشنی بھر دی ہے۔ مولانا گرامی نے ایک مکتوب میں اقبال سے دریافت کیا تھا کہ گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن۔ اس کے جواب میں اقبال نے تحریر کیا

"گرامی مسلم ہے اور مسلم وہ تودۂ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے۔ اگر سے چھو جائے تو ...... بن جائے۔ پانی اس ہیبت سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی۔

---

[1] مکتوبات اقبال۔

کہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں۔ پانی
آگ جذب کر لیتا ہے عدم بود کو کھا جاتا ہے۔ پستی
بلندی میں سما جاتی ہے۔"

یہ ادبی چاشنی اقبال کی مکتوب نگاری کی خصوصیت نہیں۔ بحیثیت مجموعی ادبی چاشنی کا عنصر کم ہے۔ پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو لکھتے ہیں۔

"مجھکو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو
کرتے وقت میں اپنی مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا
نہیں سکتا۔"

شاید یہی وجہ ہے کہ لکھتے لکھتے جب کسی مطلب کی ادائیگی کے لئے کوئی موزوں لفظ انہیں نہیں ملتا تو انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔ اسی سبب سے علامہ کے بعض مکتوبات میں انگریزی الفاظ ملتے ہیں مثلاً۔

"انکے Literary ideas بھی ایرانی ہیں اور
Social نصب العین بھی ایرانی۔"
"مولانا کی کتاب فیہ ما فیہ کو آپ tinde کریں"
"افغانستان والے معاملے کو Postpone کرنا چاہئے"
"میں نے کاتب کو Dictate کروایا تھا"
"فی الحال میری صحت ترقی کر رہی ہے آواز میں
بھی قدرے Improvement ہے"

روایت پسندی ۔ القاب وآداب کے معاملہ میں اقبال کافی روایت پسند ہیں۔ غالب نے جدت یہ کی تھی کہ بہت سارے خطوط میں القاب وآداب بھی ترک کر دیئے۔ لیکن اقبال کے کسی ایک خط میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ مکتوب الیہ کی ذات شخصیت اور علمیت کے اعتبار سے انہوں نے القاب وآداب کا انتخاب کیا ہے۔ وہی طرز تخاطب جو اسلاف کا شیوہ رہا ہے مثلاً۔ مکرم بندہ، مخدوم مکرم برادر مکرم، مخدومی، جناب من، مولانا، عزیزم وغیرہ۔ بہت زیادہ کہیں جدت کی ہے تو لفظ "ڈیر" کا استعمال کیا ہے۔ جیسے ڈیر سراج ڈیر عمر الدین، ڈیر میر صاحب اور ڈیر خواجہ شجاع صاحب۔

طوالت سے گریز۔ خط نگاری کے ذوق میں اقبال نے کوئی خط نہیں لکھا۔ ان کے خطوط ابوالکلام آزاد یا غالب کی طرح رفیق تنہائی کی حیثیت نہیں رکھتے۔ انکی خط نگاری وقت گذاری کا مشغلہ نہیں۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ ایک مکتوب الیہ کے جواب میں لکھا

"آپ کا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ نہ تو میرے پاس
وقت ہے اور نہ ہی ایک مختصر خط اس کا متحمل ہو سکتا
ہے کہ آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کے جوابات
قلمبند کر سکوں"

"آپ کا خط ملا۔ فی الحال اصلاح اشعار سے
معاف فرمائیے کہ فرصت بالکل نہیں۔ کسی فرصت
کے وقت دیکھوں گا۔"[1]

چنانچہ بعض خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجبوری سے لکھے گئے ہیں مثلاً ڈاکٹر لمعہ نے قرآن شریف کا ایک نسخہ بطور تحفہ بھیجا تو شکریہ کا خط ان مختصر الفاظ میں لکھا۔

"مکرمی بندہ۔ السلام علیکم۔ قرآن شریف کا تحفہ
جو آپ نے بکمال عنایت ارسال فرمایا ہے ابھی
موصول ہوا۔ اس مقدس تحفہ کے لئے میں آپ کا
نہایت شکر گذار ہوں۔ انشاء اللہ یہی نسخہ استعمال
کرونگا۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا" مخلص اقبال

مزاح کا عنصر۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی طبیعت میں ایک خاص ظرافت تھی اور یہ ظرافت اسی وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب وہ اپنے بے تکلف دوستوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ایسی مثالیں اقبال کے پاس زیادہ تو نہیں لیکن جو کچھ بھی ہیں وہ مزاح کا بہترین نمونہ ہیں۔ خاں محمد نیاز الدین نے اقبال کو جالندھر آنے کی دعوت دی تو اس کے جواب میں اقبال نے لکھا

"گاؤں کی زندگی واقعی قابل رشک ہے اور اگر
جالندھر کے افغانوں میں کچھ اپنے قومی و ملی خصائل
محفوظ ہیں تو اسی زندگی کی وجہ سے۔ مگر گنے کی کھیر
سے یاران ہمدم کی صحبت شریں تر ہے اور اس میں
اس قدر نقص ہے کہ ہر وقت میسر نہیں آتی۔"[2]

---

[1] اقبال نامہ ص ۲۶۶ [2] مکاتیب اقبال ص ۳

انہیں خانصاحب کو ایک اور مکتوب میں تحریر کرتے ہیں

" گرامی صاحب سے ملاقات ہو تو سلام کہہ دیجئے گا۔ ان کا کوئی خط مجھے نہیں ملا۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ وہ بڑے مقدمہ باز ہو گئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کسی دیوانی مقدمہ میں انہوں نے جواب دعویٰ نظم میں دیا ہے۔"

اقبال کو کبوتر پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک صاحب نے ایک بار کچھ جوڑے بھیجے تو کچھ دن بعد اسکی رسید یوں روانہ کی۔

" آپکے کبوتر بہت اچھے ہیں۔ مگر افسوس کہ زمانۂ حال کی مغربی تہذیب سے بہت متاثر نظر آتے ہیں مقصود اس سے یہ ہے کہ بچوں کی پرورش سے بہت بیزار ہیں۔" [1]

جہاں تک اردو نثر میں مکاتیب اقبال کے مقام کا سوال ہے ہمیں شک نہیں کہ انہیں جو شہرت ملی وہ شاعری کی بدولت ملی لیکن اس شہرت میں انکے خطبات، مضامین اور مکتوبات کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور نظم کیطرح نثر بھی اقبال کی شخصیت کا پرتو ہے دونوں میں اسٹائل کی وہ شان موجود ہے جسے مڈلٹن مرے "زبان کی فتح" کہتا ہے اور جو بڑی مشکل سے اور بڑی دیدہ وری کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جسطرح اقبال کی شاعری محض آب و رنگ نہیں اسی طرح ان کی نثر محض انشا پردازی، لطافت یا رنگینی کی حامل نہیں بلکہ اس میں بھی خون جگر کی جھلک ہے۔ [2]

اقبال کے خطوط اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان سے اقبال کو پہچاننے اور ان کے قریب آنے میں اور اقبال کے مقام کو متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے وہ ہمارے اسقدر قریب آ جاتے ہیں کہ ذرا سا فاصلہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اقبال کے خطوط علمی اور ادبی مباحث کا مآخذ ہیں۔ فاضلانہ طرز تخاطب، قرآن و احادیث کے اقتباسات اور اسلامی موضوعات نے ان کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے کوئی خاص طرز اختیار نہیں کیا۔ اقبال کی مکتوب نگاری اپنے ہمہ گیر پس منظر اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال کے مکتوبات اگر فراہم نہ ہوتے تو اقبال کی حیات و فکر کے بہت سارے گوشے ڈھکے چھپے ہی رہتے۔ اقبالیات کا مطالعہ اس وقت تک ناتمام و نامکمل ہے جب تک ان کے مکاتیب کو بھی ان میں شامل و داخل نہ کر لیا جائے۔

---

[1] مکاتیب اقبال ص۲۰۳ ۔ [2] اقبال کے خطوط ۔ آل احمد سرور۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

ہریندر بھائی دوے

جدید گجراتی شاعری کی ایک اہم آواز

بیسویں صدی کی ابتدا میں گاندھی جی کے اثرات گجراتی ادب پر گہرے تھے۔ ۱۹۴۰ء کے قریب یہ اثرات کم ہونے لگے اور رومانوی تحریک کے تحت ٹیگور کے اثرات گجراتی ادب پر رونما ہونے شروع ہو گئے۔ گاندھی جی کے اثرات کے تحت گجراتی ادب میں سادگی کی لہر دوڑی اور عمل پر زور دیا جانے لگا۔ رومانوی تحریک کے اثرات کے تحت پرہلا، پاریکھ، راجندر شاہ، نرنجن بھگت، مکرند دوے وغیرہ نے اس تحریک کے زیر اثر گجراتی ادب کو سمت و رفتار عطا کی۔ اس سے قبل ہیئت میں تجربہ نہیں ملا۔ لیکن ۱۹۴۰ء کے بعد میں پیدا ہونے والے ادبی موڑ میں ہیئت و لفظ و معنی پر تجربے بھی ہونے لگے اور معنی کے برخلاف جو گجراتی ادب کو بلونت ٹھاکر کی خاص دین تھی، لفظ کی طاقت اور اہمیت کا احساس پیدا اور اس طرح لفظ و معنی کے ملاپ سے ادبی حسن، تاثر اور فکری جہت دی گئی اور اس طرح لفظ، لے، حسن اور چھند پر زور دینے سے شاعرانہ باتوں سے متعلق زیادہ حساس ہو گیا۔ راجندر شاہ کے یہاں سماجی زندگی کو پیش کرنے کی ضرورت کا احساس ہے اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی حالات کا بھی۔ انہیں کے دیگر معاصرین مثلاً نرنجن بھگت اور راجندر نرنجن کے یہاں بھی سماجی تبدیلیوں کے مختلف النوع اثرات دکھائی دیتے ہیں بالکند دوے نے FOLK RYTHEM پر زور دیا اور وینی بھائی پروہت نے سادگی اور پرکاری سے ملو بھجن کے انداز کی نظمیں لکھیں۔ اس نئی ادبی تبدیلی میں جس میں مواد اور ہیئت دونوں شامل ہیں۔ ڈاکٹر سریش جوشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے جنھوں نے ادب کی ساری ہیت بدل کر رکھ دی۔ ان کے یہاں تجربے اور احساس کو بنیادی اہمیت دی گئی اور موضوع اور ہیئت دونوں لحاظ سے مغربی اثرات کو قبول کیا گیا۔

گجراتی زبان و ادب دیگر ہندستانی زبانوں کی طرح روایت پرستی اور جدید ادبی تحریکوں کی کشاکش سے دوچار رہا ہے۔ گجراتی زبان و ادب کو اپنی صحت مند روایات کے احترام کے ساتھ جدیدیت کی راہ دکھانے اور فکری اور فنی اعتبار سے قدیم و جدید میں توازن پیدا کرنے کے سلسلے میں ممتاز گجراتی شاعر اور ناول نگار شری ہریندر دوے کو گجراتی ادب میں امتیازی حیثیت حاصل ہے جو گجراتی ادب کے شائقین میں 'ہریندر بھائی' کے نام سے معروف ہیں۔

ہریندر بھائی ۱۹ ستمبر ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اور بمبئی یونیورسٹی سے انگریزی اور گجراتی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں آپ نے گجراتی کے مشہور اخبار "جن شکتی" کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کی ابتدا کی۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک بھارتیہ ودیا بھون سے شائع ہونے والے رسالے "سمرپن" کی ادارت کی۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۳ء تک بمبئی کے USIS کے گجراتی کے شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور پھر ۱۹۷۳ء میں "جن شکتی" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ہریندر بھائی ان دنوں "جنم بھومی" کے روزنامے "پرواسی" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء کا

ساہتیہ اکادیمی کا انعام ہریندر بھائی کو انکے مجموعۂ کلام "حیاتی" پرملا۔

اتفاقاً کبھی ہریندر بھائی سے اگر آپ کے راستے میں ملاقات ہو تو آپ لاکھوں کی بھیڑ سے انہیں الگ نہیں کر پائیں گے۔ وہ ایک سیدھے سادے، کم آمیز اور شرمیلے انسان ہیں۔ ان کی رگ و پے میں انسانیت جاری و ساری ہے۔ وہ شہرت اور تعریف سے کوسوں دور بھاگتے ہیں، لیکن جدو سخا میں وہ ہمیشہ پیش پیش نظر آتے ہیں یہی دراصل ہریندر بھائی کی تعریف ہے تعارف ہونے پر چند لمحوں میں وہ آپ کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں اور جب وہ کسی کو چاہتے ہیں تو وہ زندگی بھر اپنے تعلقات استوار رکھتے ہیں۔ ان کی خاموش طبیعت اور شگفتہ چہرہ ہمیشہ آپکا من موہ لے گا۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ اپنی طرف کھینچنے والی چیز ان کی خوابیدہ آنکھیں ہیں۔ لگتا ہے گویا انکی آنکھیں ہی شاعری کر رہی ہوں۔

شاعری ہریندر بھائی کا محبوب مشغلہ ہے، ان کا مزاج ہے۔ انکا کہنا ہے کہ سانس لینا جینے کے لئے جتنا ضروری ہے اتنا ہی ان کے لئے شاعری کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی شاعری کا محور مجازی عشق ہے اور عشق و موت انکی شاعری کے دو اہم موضوع۔ اس لحاظ سے انہیں اردو کے مشہور غزل گو جگر سے بڑی مماثلت ہے۔ ان کی شاعری میں روانی، دلکشی اور اپنی طرف کھینچنے والی کیفیت ہے انکی شاعری ہجر و وصال دونوں کی چاشنی سے لبریز ہے۔ وہ فکری اور فنی لحاظ سے مشرقیت کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور اپنے دل کے انسپریشن سے شعر کہتے ہیں اور کسی خارجی تاثر کو شعر کہنے کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ۔"کرشن کا دیہ" کی جو روایات نرسینہ مہتا (پندرھویں صدی) اور میرا بائی (سولھویں صدی) سے قائم ہوئیں۔ اس کا دلکش عکس جدید زمانے میں ہریندر بھائی کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ کرشن کا دیہ کی کوملتا اور نرمی جذبات کی دلکشی اور تشبیہوں اور استعاروں میں ندرت، ہریندر بھائی کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں کہ جنکی وجہ سے قاری ہر لحظ قریب سے قریب ہوتا جاتا ہے، میرا کے پدوں کی نرمی اور گداز ان کے پدوں میں رچا ہوا ہے۔ رادھا اور کرشن کی محبت کو ان کی شاعری میں علامت کی حیثیت حاصل ہے اگرچہ ہریندر بھائی نے گجراتی ادب کی روایت کو جلا بخشی۔ لیکن ادب میں نئے تجربوں کی ضرورت اور اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔

ہریندر بھائی نے بچپن ہی سے شاعری کی ابتدا کی۔ اسکول کے زمانے میں ہی ان کی پہلی نظم شائع بھی ہوئی۔ اگرچہ یہ واقعتاً شاعر ہی ہیں تاہم انہوں نے دیگر اصناف ادب سے بھی دلچسپی برقرار رکھی۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے گجراتی میں ناول، ڈرامے فلم اسکرپٹ اور تنقید بھی لکھی اور ترجمے بھی کئے۔ گجراتی میں شاعرے کی کہانی اور غالب پر بھی ان کی کتابیں ہیں۔

مختلف اصناف ادب میں ہریندر بھائی کی درج ذیل کتابیں مشہور و مقبول ہیں۔

شاعری۔

۱۔ آسو (شراب)	۱۹۶۱ء	غزلوں کا انتخاب
۲۔ مون (خاموشی)	۱۹۶۶ء	نظموں کا انتخاب
۳۔ سمے (وقت)	۱۹۷۲ء	نظموں کا انتخاب
۴۔ مدھون (مرتبہ)		گجراتی غزلوں کا انتخاب
۵۔ سُرپو پند		نظموں کا انتخاب
۶۔ ارپن		شعر اور رباعیات

۷۔ حیاتی (مون، سرپوپند، آسو، ارپن وغیرہ کتابوں میں سے منتخبہ غزلوں اور نظموں کا انتخاب، جسے ڈاکٹر سریش دلال نے مرتب کیا)

ناول۔

۱۔	اگن پنکھی	۱۹۶۲ء
۲۔	پل ناپرتی بمب (لمحوں کا عکس)	۱۹۶۶ء
۳۔	سکھ نام کا دیش	۱۹۶۶ء
۴۔	اناگت (نہ آیا ہوا)	۱۹۶۸ء
۵۔	مادھو (کرشن) کہیں نہیں	۱۹۷۰ء

انکے ناول "مادھو کہیں نہیں" "اناگت" (कहीं नहीं) اور "مون" (मौन) جدید گجراتی ادب میں بے انتہا مقبول ہوئے اور ادبی اعتبار سے گجراتی ادب میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ چنانچہ ادبی اور فنی حیثیت سے ان ناولوں کی قدر افزائی کے طور پر حکومت گجرات نے انہیں انعام سے نوازا۔ ہریندر بھائی نے اسکول اور کالجوں کی نصابی کتابوں کو بھی مرتب کیا ہے۔ ان کی نظمیں

بلبل ہند لتا منگیشکر نے گائی ہیں جنکے ریکارڈ بھی دستیاب ہیں۔

ہریندر بھائی کی شاعری میں بات کا جوشش نہیں، بلکہ شرمیلی نزاکت، گریز اور گداز ہے۔ نرمی اور ملائمت ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے اس میں عشق کا فوارہ اڑتا ہوا نظر آتا ہے، مثال کے طور پر ذیل میں چند نمونے پیش خدمت ہیں ؎

(۱)

ہونٹ ہنسے تو پھاگن گوری، آنکھ بھرے تو ساون
موسم میرا تم ہو ، جھوٹی دنت کی آون جاون

یہ شعر پڑھکر ہمیں جاں نثار اختر کی "گھر آنگن" کی رباعیات یاد آتی ہے۔

(۲)

تمھارا نشیمن دشمن نے توڑا
ہم اپنے نشیمن میں قید
ہم دونوں مل ہی نہ پائے

(۳)

عشق کے گماں سے بڑھتا ہیں جہاں کا گماں
چلو کہ منظور خدا ہو کر چلیں

(۴)

پتے ہیں تھوڑی سی دھوپ بھری
پھر نشیمن کے پرندے کو پلادی

(۵)

ممکن ہے کہ یہ پھول سچا نہ بھی ہو
لیکن چھونے سے اگر پنکھڑیاں جھڑ جائیں ـــــ تو کیا ہوگا

کبھی کبھی آس پاس کی زندگی کا تجربہ بھی شاعری میں دکھائی دیتا ہے ؎

(۶)

پرندخود کو آواز تھی
یہ بات بچوں سے کہہ رہے ہیں اور سمجھاتے ہیں
کبھی ضرورت ہوئی تو چہک سکتے ہو
چہک سکتے ہیں ؟
جیسے کبھی طلسمی پریوں کی کہانی سنی نہ ہو !
ویسے پرندے کے بچے نے چلاکر پوچھا ، کیسے چہکیں گے
لیکن چہکنے کی کوئی آواز گلے سے نہ نکلی

صیاد کے نشان بیتے تیر پر
نظر تھی اس لیئے

ہریندر بھائی کو پھول، پرندے، پرندوں کی چہچہاہٹ اور سمندر کی موجوں کی باتیں کرنا پسند ہیں، اسی لیئے انہوں نے اپنی شاعری میں مکانوں کی درختوں کا جنگل بنانا چاہا ہے، لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے انہیں بے انتہا تھکان محسوس ہوتی ہے، وہ فطرت کے حسین مناظر چاہتے ہیں اور انہیں کے قریب میں اپنی زندگی بتانے کے خواہشمند ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ سوچتے ہیں اگر لوگوں کی بھیڑ سمندر کی لہروں میں بدل جائے تو شاعر کی اداسی فوراً دور ہو سکتی ہے ؎

(۷)

خاموشی کا صحرا پار کرنے کے بعد زبان کی بستی آتی ہے
اور لوگوں کے گروہ کی سچائی تنہائی کے ساتھ صحرا کے پردے ہیں

شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ آدمی کو لوگوں کی بھیڑ ہی زیادہ تنہا بنادیتی ہے اپنی نظم " اے زمین " شاعر کہتا ہے ؎

(۸)

میں تجھے پیار کرتا رہا اے زمین
اور بلاتا رہ گیا یہ آسماں

(۹)

زہر کے پیالے سے پیاس اور بھی بڑھ جاتی ہے
اور امرت سے گلا خشک ہی رہ جاتا ہے

بنگلہ دیش میں شاعر اپنی نظم میں کہتا ؎

(۱۰)

ٹینکوں کے بل سے ہوتی ہے کھیتی
سن کے
یہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ کانپ اٹھے
میں ـــ تم ـــ وہ ـــ ہم
ہم سب
چلو اتنا تو طے کریں کہ
لہو کا رنگ سرخ ہے

(۱۱)
تم نے پوچھے عشق کے معنی
میں نے تمہیں باہوں میں سنبھالا

(۱۲)
ذرہ آفتاب بننے کا خواب
دیکھتا ہوا مشرق کیطرف اڑنے لگا
اور جا گرا مغرب میں

(۱۳)
پھول کہے بھنورے سے
بھنورا بات کرے گنجن میں
مادھو (کرشن) کہیں نہیں مدھوبن میں

ہریندر بھائی کی شاعری سے محاکات اور نزاکتِ خیال کے چند نمونے دیکھئے ؂

(۱۴)
جان بوجھ کر ہم لوگ چلیں
پھر بھی دامن کے چھو جانے کا مجھے
شبہ ہوا

(۱۵)
تم یکایک چونک پڑے
اور سنبھل پوچھا
کہ کیسے ہو

(۱۶)
پھول برف کے ہاتھوں کی گرمی سے پگھل گئے
درخت کو شبہ ہوا کہ شاید خزاں آگئی

(۱۷)
رات سے کہہ دو کہ آج اپنی
چمکتی بندی والی چنری اوڑھے ،

(۱۸)
کہاں ہوتے ہو تم جب نہیں ہوتے ۔ میرے اعتماد کے حلقے میں

(۱۹)
ایک ہی درخت کے دو پھول ۔ ہم اور تم ، مل نہ سکے

(۲۰)
راستے سے کہہ دو ، آہستہ آہستہ کھلتے
پھولوں کی پنکھڑی کیطرح وہ سامنے آئے
درخت سے کہو کہ وہ اپنے پتوں میں
کوئی عجب سی راگنی چھیڑے
آج کی رات میں اداس ہوں
اور مجھے سب کو مسرور کرنے والی
نظم کہنی ہے

(۲۱)
زندگی اور اجل ایک ساتھ کھڑے ہو کر
بالکل اجنبی اور الگ الگ
زبان میں باتیں کرتے ہیں
آج غروب ہوئے آفتاب کی قسم
میں کل پھر آفتاب بنکر طلوع ہونگا
خوفناک لپٹیں بن کر جلوؤں کا
ایک زبردست خلا میں
تنہا آگے بڑھوں گا
کڑی دوپہر ، نہیں سرخ شام تک
میری تنہائی اسی افق پر ڈوبے گی
تب کسی اور افق پر وہ طلوع ہوتی نظر آئے گی

ایک اور نظم ہے ؂

(۲۲)
اپنی بھرّائی ہوئی آواز سنتا ہوں
کھڑکی سے باہر کے پتوں کے
بیچ ہوئی دھیمی گفتگو سنتا ہوں
نوزائیدہ بلی کے بچے کا رونا
آدھی رات کو
اسپتال کے وجود کو چونکا دیتا ہے
راستے سے گذرتی

بس کی آواز سنائی دیتی ہے
لیکن ان سب کے بیچ
کہاں گئی
میری موت کی آواز
جو ابھی ابھی میں نے سنی تھی

گجراتی میں غزل ایک مقبول عام صنف سخن ہے اور گجراتی میں اس کی تاریخ تقریباً سو سال پرانی۔ یہ صرف تفنن طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ ادبی تاریخ میں صنف سخن کی حیثیت سے اس کی مستقل جگہ ہے۔ جدید زمانے میں گجراتی غزل کو آراستہ کرنے میں ہریندر بھائی نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ گجراتی غزل کی مشاطگی میں انہیں اردو غزل کے مطالعے اور اسکی وارفتگی سے طاقت و توانائی حاصل ہوئی۔ ہریندر بھائی کی ایک غزل کا نمونہ پیش خدمت ہے ؎

سمندر یا مینا میں بستے چلیں
چلو مثلِ باراں برستے چلیں

سُنا ہے فنا کا عجب دیش ہے
ذرا دیکھ آئیں، ٹہلتے چلیں!
کوئی راہ مانگے تو کیا حرج ہے
کسی طرز آگے سرکتے چلیں
وہ اِک شہر ہو یا بیاباں سہی
نئی کچھ فضا ہو تو بستے چلیں
ہر اِک تال سُر کا مزا اور ہے
کوئی لے بھی گائیں تو ہنستے چلیں

غزل کے ان اشعار میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں وہی دراصل ہریندر بھائی کی پہچان ہیں۔

ڈاکٹر حاتم رامپوری

اقبال اور گوئٹے

اقبال پر نطشے اور گوئٹے کے اثرات ضرور ہیں لیکن ان اثرات سے متعلق گفتگو کرتے وقت ہمارے تنقید نگاروں نے کہیں تو اجمالی اشاروں سے کام لیا ہے اور کہیں غلو اور غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بہت بعد تک یورپی مفکرین کا بے ضرورت ذکر بھی فیشن میں شامل تھا اس لئے بعضوں نے عقیدتمندی کے جذبات کے تحت اقبال کا قد بلند کرنے کی نیت سے انگریز اور جرمن مفکرین کے نام گنوائے ہیں۔ اقبال کا نام آتے ہی ہمارے بہت سے ناقدین بھی بغیر کسی ثبوت کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اقبال کی فکر تو نطشے اور گوئٹے سے مستعار ہے۔ اور پھر کس حد تک یہ اثرات ہیں اس کی نشاندہی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ خوش فہمی یا غلط فہمی اسی وقت سے پائدار ہوتی چلی گئی ہے جب اقبال کی زندگی میں ہی "اسرار خودی" کے انگریزی ترجمے پر لندن کے ادبی جریدوں میں تبصرے شائع ہونے شروع ہوئے۔ انگریزی داں تبصرہ نگاروں کے سامنے چونکہ اسلامی تعلیمات سے ابھرتے ہوئے انسان کی شباہت بہت واضح نہیں تھی اور ٹھیک اس کے برعکس نطشے کے فوق البشر اور گوئٹے کے فاؤسٹ کی بڑی دھوم تھی۔ اس کے علاوہ خود اقبال نے ان دونوں جرمن دانشوروں سے اپنی عقیدتمندیوں کا اظہار بزبان خود کیا تھا لہذا اردو کے بڑے ناقدین کے پاؤں بھی اس ضمن میں پھسل گئے اور انہوں نے تو بالاستیعاب مطالعہ کئے بغیر یہ فتوٰی صادر کر دیا کہ اقبال کا انسان کامل کا تصور نطشے اور گوئٹے کا رہین منت ہے یا تن آسانی سے کام لیتے ہوئے اس موضوع پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی حالانکہ اقبال نے اسی زمانے میں نکلسن کے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "اسرار خودی" کی اشاعت سے برسوں قبل انہوں نے "انسان کامل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو شائع بھی ہوا تھا بعد میں انہوں نے اسے اپنے تحقیقی مقالے میں ضم کر لیا اقبال نے اسی خط میں یہ اعتذار یہ بھی پیش کیا کہ اس زمانے میں انکے کانوں میں نطشے یا گوئٹے کی تعلیمات کی بھنک تک نہ پڑی تھی تصورات کی مماثلت یا مغائرت اتفاقیہ طور پر بھی ہوتی ہے اور کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بعد میں یورپ کے سفر میں اقبال کو ان دونوں فنکار دانشوروں کو براہ راست پڑھنے کا موقعہ بھی ملا اور اقبال متاثر بھی ہوئے اور اپنی اثر انگریزی کا برملا اظہار بھی کیا۔ لیکن متاثر ہونا اور بات ہے اور کسی سے مستعار لینا اور بات۔
اقبال کی فکر پر دنیا کے اکثر و بیشتر عظیم فنکاروں اور دانشوروں کی پرچھائیاں ملتی ہیں لیکن کسی کی حیثیت اقبال کے سامنے ایسی نہیں ہے کہ اسے مستعار کہا جائے بلکہ وسیع مطالعے کے لازمی نتیجہ کے طور پر عالمگیر سطح پر عظیم فنکاروں کے یہاں ایسے سائے اور پرچھائیوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اور یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام عظیم انسانوں کی فکر میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ مشابہت تو ملتی ہی ہے لہذا اقبال سے متعلق یہ کہنا کہ اقبال کی فکر مستعار ہے سراسر ناانصافی اور بد دیانتی ہے۔ اقبال کی فکر کا ایک مخصوص سانچہ اور ڈھانچہ ہے اور وہ قطعاً منفرد ہے اگر دوسرے مفکرین

کے اثرات ملتے بھی ہیں تو اقبال کے تخلیقی رویے اور انکے ذہن کے کیمیاوی عمل سے گذر کر اسی کے تصورات کا ناگزیر حصہ اور جزو لاینفک بن کر رہ جاتے ہیں اس کی فکر کی بنیادی اور مرکزی محور اسلامی الہیات ہے اور اس کی تاویل و تشریح میں بہت سے فکری دھارے آکر ملتے ہیں لیکن یوں ملتے ہیں جیسے کوئی چھوٹی سی آبجو کسی سمندر میں گر جائے اور اپنا وجود کھو کر سمندر بن جائے۔ اقبال کا اسلامی تصور بھی خالصتاً انفرادی عرفان کا حامل ہے جسمیں شعریت، رومانویت تجدید، تخلیق اور اجتہاد کے عناصر ملتے ہیں۔ اقبال کا ہر تصور شعر بن گیا۔ اور اس کے تمام اشعار میں حیات کے تازہ خون کی چہکار موجود ہے جہاں کہیں اقبال کے تصورات شاعری سے دور جا پڑے ہیں اقبال کا انداز پھس پھسا کر رہ گیا ہے۔ بہر حال اقبال گوئٹے سے متاثر ہیں اور آییئے ہم ان اثرات کا تجزیہ کر کے اس کے تناسب کا سراغ لگائیں۔

گوئٹے کی شہرہ آفاق تصنیف "فاوسٹ" سے خود نطشے بھی متاثر ہیں۔ دراصل فاؤسٹ ہو یا ڈون جون، ڈون کویکزوٹ ہو یا سوپرمین' یہ سب کے سب کردار، مخصوص حالات اور تاریخی عوامل کی پیداوار ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کی فکری، تہذیبی اور مذہبی عقائد کی کشمکش میں انسان کی شخصیت کے سنورنے اور بکھرنے کی متضاد کیفیات سامنے آئیں اور اسی زمانے میں ادب میں ایک رومانی تحریک بھی شروع ہوئی جس میں نئے زمانے کے تازہ تقاضوں سے نبرد آزما ہونے والے ایک ہیرو کا تصور پیش کیا جانے لگا۔ اس ہیروئی توانائی پسندی Heroic Vitalism کا خاتمہ اس وقت ہوا جب نطشے سوپرمین ہٹلر کی صورت میں سامنے آیا اور دنیا لرزہ براندام ہوگئی اس کے فوراً ہی بعد اسپنگلر کے یہاں سے ہیروئی توانائی پسندی کا رجحان تبدیل ہونا شروع ہوا اور قوت کی مرکزیت کے خوف نے لامرکزیت کا رخ کیا بقول ڈاکٹر عالم خوندمیری:۔

مغرب میں سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ کے علم برداروں نے انسانی نفس اور انسانی عقل کو خود مختاری کا اعلان کیا۔ دانتے کے "طربیہ خداوندی" میں انسان اپنے وجود کی تلاش کرتا ہوا پایا جاتا ہے اور خود دانتے انسانی عشق کو حقیقت کے عرفان کا ایک وسیلہ بنا دیتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے ہیروئی ادب میں پہلی بار انسان ایک نبرد آزما اور زور آزما کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ڈون کویکزوٹ کی صورت میں سہی، لیکن ماحول کے خلاف لڑتا ہے اور اپنے محدود وسائل کی پرواہ کیئے بغیر فتح و شکست سے بے نیاز اپنی لڑائی جاری رکھتا ہے"

اس دور کے آرٹ میں ہمیں عام طور پر انسانی عظمت کی تصویر نظر آتی ہے۔ مائیکل انجلو کے تاریخی نقش (تخلیق آدم) میں انسان پہلی بار ایک تاریخی ہیرو کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور پورے جوش و خروش اور جلال کے ساتھ ابھرتا ہے۔ رفائیل نے اپنے فن میں اینتھنز کا شکوہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ دور سائنس کے آغاز کا دور تھا۔ بیکن نے ماضی کے مردہ علوم کے خلاف بغاوت کی اور تسخیر حیات پر زور دیا "علم ایک قوت ہے" کے مقولے نے انسان کو اپنے لامحدود امکانات سے آشنا کیا، شیکسپیئر کے المیوں میں نئی دنیا کی بشارت کا نقشہ ابھرا بقول سنتیانا "شیکسپیئر کی نظروں سے خدا اوجھل ہوگیا ہے اور انسان سامنے آگیا ہے اور رفتہ رفتہ اس دور میں انسان اور خدا کے درمیان اطاعت اور نافرمانی کا رشتہ باقی رہ گیا، ایک مثلث جسکے تین اضلاع۔ انسان، خدا اور ابلیس رہ گئے۔ اس کی مزید صراحت فرانسیسی جولیس جیکس روئی کی زبانی سنئے:۔

"کسی بزرگ و برتر ہستی یا مرد فقیر کا تصور صدیوں سے انسانوں کے ذہن میں پرورش پاتا رہا اور عہد بعہد بدلتے ہوئے تیور کو اس نے اپنی ذات میں سمو لیا ہے یہ مختلف ادوار کے فلسفیوں اور فنکاروں کے یہاں متعلقہ عہد کے ثقافتی اور تاریخی تقاضوں کی دھند اپنے چہرے پر لپیٹا ہوا آج تک زندہ ہے اور رہتی دنیا تک انسانوں کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی زندہ رہے گا۔

یہ کیتھولک کٹرپن اور مغربی عقل پرستی کی چکّیوں میں
پس جانے کے بعد بھی ہزاروں سال سے انمٹ ہے"
Jaochion of Fiore کی پیشگوئیوں کیوجہ سے
اس نے ازسرنو توانائی حاصل کرلی ہے اور ان پیشگوئیوں کی
تلخیص ہے۔[1]

"ارواح پاک کی حکومت کا اعلان" مغربی
جرمنی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ہمیشہ ہمیں یہ یاد
دلانے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کی نجات بغیر
کسی غیر معمولی ہستی کی مداخلت اور تعاون کے
ناممکن ہے، ہر جگہ کساد بازاری ہے جنون اور
خبط انسانوں کا شعار بن گیا ہے۔ سات گناہ کبیرہ
کے داغ ہماری پیشانیوں پر موجود ہے جنکی حیثیت
بس ایک نقاب سے زیادہ نہیں۔ بھٹکتی ہوئی کشتیوں پر
سوار ہوکر اور احمقوں کے جہازوں میں لدکر طفلانہ
کجرویوں میں بری طرح منہمک ہے لہذا اب
اس کائنات کو جسکے اندر مغالطے اور ہوس رانیوں
کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بے وجود ہونے دو" ایک
روحانی دنیا کو عالم وجود میں آنے دو جہاں روح
کا ارتفاع ہوگا "مطمئن رہو اور منزّہ رہو" اس خطاب
نے اپنے دامن میں صدیاں سمیٹ لی ہیں۔ پندرہویں
صدی عیسوی میں بھی اسی طرح متضاد تمناؤں کے
ساتھ یہ نعرہ بلند ہوا تھا اور اس نے زاہدوں اور
بادشاہوں کی حیات طیبہ کے خدوخال پیش کئے
تھے۔ لیکن عہد وسطیٰ میں عبادت گذار لوگوں کے
ساتھ ساتھ ہم طالبان دنیا کو بھی پاتے ہیں۔ یہاں
امنگوں کا تلاطم اور ہوس کی شدتیں بھی موجود ہیں
سرداری کا خبط بھی ہے اور میدان کارزار کا احترام
بھی خطر پسندی کی تعلیمات یہاں تک پہنچتی ہیں کہ
جنگ کا میدان عبادت خانوں کا بدل ہوجاتا ہے

فتحیابی کے لئے محض لڑنا ہی ناگزیر نہیں بلکہ عظیم قربانیوں
کے لئے یقین کی رفاقت ضروری ٹھہرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔
غرض ان طویل صدیوں میں "فاتح" اور "فقیر"
کے تصورات ہمدوش سفر ہیں اور انہیں صدیوں
کے درمیان دور جدید کا انسان ابھرتا رہا ہے۔ ۔
نشاۃ ثانیہ میں جسم اور روح کی یہ کشاکش اور بھی
شدت اختیار کرلیتی ہے۔ عقل اور جذبہ حصول
اقتدار باہم دست وگریباں نظر آتے ہیں۔ عقل
کائنات پر حکمرانی کرنے کے رموز کے انکشافات
کی پاسداری کرتی ہے اور جسم کی توانائی پوری
کائنات کو اپنے قانون کے زیرنگیں کرنے کا حوصلہ
عطا کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چودہویں اور پندرہویں
صدی سے قریب کوئی دوسرا عہد ہمارے عہد
سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نشاۃ ثانیہ کے
اسی زریں عہد میں ذات بے ثبات اپنے اندر بھرپور
یقین پیدا کرلیتی ہے بلکہ خدا سے برگردہ ہوکر خود
اپنی خدائی کا اعلان کردیتی ہے "

یہ طویل اقتباس اس لئے پیش کرنا پڑا کہ آپ اقبال، نطشے اور
گوئٹے کے فکری رشتے کو آسانی سے سمجھ سکیں "فاوسٹ" کی روایت
جرمنی میں کم وبیش ساڑھے چارسو برس قبل سے موجود ہے اسکی
ابتدا ایک مجوسی کی کہانی سے ہوئی جس میں قویٰ فطرت کو معبود قرار
دیا گیا تھا۔ "فاوسٹ" ایک تاریخی شخصیت ہے جو فطرت کے
رازہائے سربستہ معلوم کرنے اور تسخیر جہاں کے عزائم اور عمل کرنے کے
لئے معروف ہے وہ ساحری اور ٹونا ٹوٹکا سے بھی بخوبی واقف تھا
اس کے اندر تمام ساحرانہ صلاحیتیں موجود تھیں حالانکہ ایسی کہانی
جرمنی میں اس سے قبل موجود تھی لیکن سولہویں صدی میں فاوسٹ
نامی ایک شخص موجود تھا اور اس میں چند غیر معمولی صفات بھی تھیں
اس سے متعلق اتنی روایات عوام میں عام ہوئیں کہ رفتہ رفتہ
اصل فاوسٹ کی شخصیت پس پشت پڑ گئی۔ کرسٹو فرمارلو نے
اس کہانی کی بحسن وخوبی منظوم ڈرامے میں پیش کیا صحیح معنوں میں
گوئٹے نے فاوسٹ کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔

[1] ماخوذ از "تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن" ص۲۲۔ راقم الحروف

ورنہ اس سے قبل اسے عموماً ایک مسخرہ جادوگر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا گوئٹے کا فاؤسٹ دنیا کا ایک مثالی کردار ہے جو بیحد پروقار اور حقیقی ہے اس کا ابلیس بھی بیحد جاندار ہے۔

نطشے کا "فوق البشر" گوئٹے کے "فاؤسٹ" اور اقبال کے "مرد مومن" کے اندر بھی بعض تشابہ موجود ہے۔

دراصل ہیرو دئی توانائی پسندی کی رومانی تحریک کا خاتمہ نطشے کے ساتھ ہوا، صدیوں سے دانشوروں اور فنکاروں نے ایک نیک خو، مضبوط، باعمل، فقیرانہ مزاج کے حکمراں کا خواب دیکھا تھا جو نطشے کے یہاں آکر خدا ناآشنا ہی نہ ہوا بلکہ اس نے تمام قدروں کو متبادل کر کے خود کو خدا بنالیا۔ نطشے کے زیراثر ہٹلر کا وجود وحشت اور بربریت کی تجسیم بن کر سامنے آیا تب جاکر اس تحریک نے دم توڑا یہ عین ممکن ہے کہ اقبال نے ابتداءً انسان کامل کا تصور اسلامی تاریخ خلفاء راشدین کی پروقار شخصیات اور رسول عربی کی ذات گرامی سے متاثر ہوکر پیش کیا ہو لیکن یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد نطشے اور گوئٹے کے زیراثر اقبال نے اپنے اس تصور کی رنگ آمیزی مزید دلچسپی اور نئے عزم کے ساتھ کی کیونکہ اس تصور کے بھیانک نتائج اور ہیرو دئی توانائی پسندی کے سیاق و سباق سے اقبال کا باخبر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اقبال کا مرد مومن اسی تحریک کی تکمیل اور معراج کی حیثیت رکھتا ہے اور اقبال کے لئے مغربی روایت ناقص تھی۔ بلکہ خود اسلامی تاریخ ایسی شخصیات کا حسین البم ہے جنکے اندر جسمانی قوت۔ اولوالعزمی، نیکی، انسانی ہمدردی، قوت تسخیر، یقین محکم اور عمل پیہم کے ساتھ ساتھ بے پناہ روحانی قوت بھی موجود تھی اور ہیرو دئی توانائی پسندی کے تمام ہیرو روحانی قوت سے عاری ہیں بلکہ روحانی جذبات کے شکار ہیں۔ اقبال نے انسان کامل یا مرد مومن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ وحشت اور بربریت کا غماز نہیں بلکہ شعلہ و شبنم، روحانیت اور جسمانیت رحم و کرم اور جنگ و جدال، ہمدردی اور محبت عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا امین ہے۔

اقبال نے بجائے خود گوئٹے کے "فاؤسٹ" کے بارے میں لکھا تھا کہ "گوئٹے نے انسانی نشوونما کی تمام امکانی مدارج کو اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھکر کمال فن کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔"

اقبال اور گوئٹے دونوں انسانی عظمت کے متلاشی ہیں گوئٹے اپنے تصورات کی تجسیم "فاوسٹ" کے کردار میں کرتا ہے / اور اقبال عظمتوں سے متعلق اپنے تمام خیالات کو مرد مومن کی پیکر تراشی میں۔

[1] "فاوسٹ" گوئٹے کا شاہکار ہے جسکے بطون میں اس المانوی فنکار نے اپنا فلسفۂ حیات بحسن و خوبی سمو دیا ہے۔ فاوسٹ کی دیرینہ حکایت گوئٹے کے یہاں نئی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ ایک حکیم، نکتہ داں، زاہد خشک، انسان دوست انسان ہے جو سوابیا کا باشندہ ہے اسے جادو کا علم بھی حاصل ہے اسکے چچا نے اس کے لئے خاطر خواہ جائیداد چھوڑی ہے لیکن فاوسٹ اپنی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں سے اسے برباد کر دیتا ہے۔ وہ سکون اور طہارت قلبی کے لئے مضطرب ہے۔ اس کی روح میں ایک خلش ہے اس خلش سے وہ بےچین ہے لہٰذا وہ ابلیس سے معاہدہ کرلیتا ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹوں تک بے اعتدال زندگی گذارے گا اور اس کے عوض اپنی روح ابلیس کے پاس گروی رکھدیگا لیکن ابلیس کے مکروفریب سے وہ اپنے تقدس، مآب بڑھاپے کو ہمیشہ کے لئے شر سے شرابور جوانی سے تبدیل کرلیتا ہے اور اپنی روح ابلیس (MOPHISOPHIUS) کے حوالے کردیتا ہے۔

فاؤسٹ ایک متبحر عالم ہے لیکن اس کا علم اسے اس کی جہالت کا احساس دلاتا ہے وہ جتنا زیادہ مطالعہ کرتا ہے اتنا ہی اس کی تشنگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور کافی مطالعے کے باوجود خود کو تاریکیوں میں محصور پاتا ہے، وہ فقہ، قانون، فلسفہ، الٰہیات کے علاوہ فن ساحری میں بھی طاق ہے۔ فاؤسٹ کو میفوسٹفلس زندگی کے تمام چوراہوں پر بہکاتا ہے۔ کرب و اضطراب سے پر زندگی کو فاؤسٹ ایک کتے کی زندگی کے مترادف سمجھتا ہے اسے اپنی گمراہی کا شدید احساس ہے اس طرح وہ نیک بننے کی آرزوؤں اور اپنی تردامانیوں کے خوفناک متضاد پیکر ہے۔ وہ اپنے حال پر قانع نہیں اور مستقبل سے خائف ہے۔

---

[1] ماخوذ از تصور بشر اور اقبال کا مرد مومن۔ راقم الحروف۔ ص ۹۶-۹۷

جب وہ اپنی روح کی سیاہی سے گھبرا کر کچھ ساحرانہ کلمات بولتا ہے، اس وقت اسکی روح حاضر ہو کر اس سے پوچھتی ہے کہ اسے کس بات کا خوف ہے اور کس لئے ہراساں ہے؟ فاؤسٹ اسے اپنا حال زار بتاتا ہے اسی درمیان واگنر آ جاتا ہے جسکے ساتھ فاوسٹ Easter Holidays کے موقع پر چلا جاتا ہے۔ واپسی میں فاؤسٹ کے ساتھ ایک کالا کتا لگ جاتا ہے جو بعد میں ابلیس یعنی میفوسٹفلس کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور فلسفیانہ مباحث کے بعد فاؤسٹ کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ اپنی روح کو نئی زندگی کے عوض بیچ دے۔ اس اثنا میں فاؤسٹ دنیا کی ہر طرح کی رنگ رلیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر اسے ایک نیک خو دوشیزہ مارگریٹ سے عشق ہو جاتا ہے اور اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے وہ مارگریٹ کے بھائی کا قتل کر دیتا ہے۔ دوسرے منظر میں فاؤسٹ مارگریٹ کو جرم طفلی کشی میں قید خانے میں مقید دیکھتا ہے۔ اخیر میں وہ اپنے محبوب سے ملنے کی خاطر میفوسٹفلس سے گڑگڑاتا ہے لیکن وہ اسے ترساتا ہے کسطرح وہ مارگریٹ کی دہکتی چتا میں داخل ہوتا ہے اور اسے آغوش میں لیکر محبت کی باتیں کرتا ہے۔ عشق کی آگ میں مارگریٹ کے لئے سلگائے گئے الاؤ میں فاوسٹ اپنی اصلی حالت (یعنی تقدس مآب بڑھاپا) میں جل جاتا ہے اور محبت کا والہانہ اقدام اسکی بخشش کا باعث بنتا ہے اور اسے میفوسٹفلس کے مکر و فریب سے نجات ملتی ہے۔

فاوسٹ کی زندگی کا المیہ کرب، کشمکش اور نجات کے تصور پر ختم ہو جاتا ہے۔ ابلیس فاوسٹ سے اس کا ایمان و عقیدہ لیکر اس کے دامن میں دنیا کی ساری رنگینیاں بھر دیتا ہے وہ بے جھجک شہزادیوں کے کمروں میں داخل ہوتا ہے اب وہ بہترین خوبصورت نوجوان ہے اس لئے خوب خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ پوری عمر شباب کی خوشہ چینی اور حسن کی رنگینیوں میں گذرتی ہے لیکن اسے اس کا احساس گناہ مزید بے قرار کرتا رہتا ہے وہ ہر بار گناہ کرتا ہے اور ہر بار پچھتاتا ہے اسے اپنے تقدس کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے تب وہ دیوانہ ہو جاتا ہے اور ابلیس سے لڑتا ہے۔ اپنی نیک چلنی اور اپنے بڑھاپے کی بھیک مانگتا ہے ...... وہ اپنے فعل کے اعتبار سے گناہ گار اور اپنے ضمیر کے اعتبار سے نکوکار ہے۔ خیر و شر کا یہ عجیب و غریب مرقع ہے جو بیحد فطری اور دلچسپ ہے۔

فاوسٹ کے نزدیک حصول مقصد سے کہیں زیادہ اہم بات جستجوئے منزل ہے، وہ بجائے خود اپنے کردار کے متعلق یوں کہتا ہے کہ

"میں نے دنیا کا نہایت سرعت سے سفر کیا ہے میں نے زہر تمنا کو گویا بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا ہے اور سیر ہو جانے پر چھوڑ دیا، جو نہیں مل سکا، اسکی پرواہ نہیں کی، میں نے ہر لمحہ کچھ نہ کچھ چاہا اور کچھ نہ کچھ پا لیا۔ تاہم اپنی جستجو برقرار رکھی۔ میں نے جوانی کو بگولے کی طرح گذارا، اور اب احتیاطاً اپنی رفتار سست کر دی"

فاؤسٹ کا کردار خیر و شر کا خوبصورت آمیزہ ہے۔ ابتداً وہ حد درجہ خدا ترس اور عبادت گذار ہے۔ زاہد خشک ہے لیکن اس کی متجسس طبیعت اسے ابلیس سے سودا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسانیت کا بیحد احترام ہے اور ابلیس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ انسانوں کا خون کرتا ہے، وہ جو کچھ پسند کرتا ہے اسے عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہے اور جو کچھ کرتا ہے اسے وہ خود پسند نہیں کرتا۔ انسانی نفسیات کی بہترین تاویل اس کا کردار عبارت ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین فاوسٹ کے اردو ترجمے میں اس ذیل میں رقمطراز ہیں

"گوئٹے نے فاوسٹ میں روح انسان کی جس کشمکش کا نقشہ کھینچا ہے اور اس کا جو حل بتایا ہے وہ یہی ہے کہ اس کے زمانے کی روحانی روح، جسے ایک طرف علم و عرفاں کی آرزو کھینچ رہی ہے تو دوسری طرف عملی زندگی اور مادی لذات کا شوق، اگر وہ اس کشمکش سے نجات پا سکتی ہے تو محض عقیدت و محبت

کے ذریعے سے۔ مگر اسے کٹھن منزلوں سے
گذرنا ہے۔ مدنی زندگی کی تشکیل اسطرح سے
کرنا ہے کہ قوت کے ولولے اور خدمت کے
جذبے میں توازن پیدا ہو، اگر روح انسانی
خلوص سے اپنے امکان بھر کوشش کرے
تو تائیدالٰہی اس کی عقیدت کو محبت کا جلوہ دکھاکر
عالم حقیقت میں پہنچادے گی... گوئٹے نے
روحانی ترقی کا زینہ دکھادیا ہے مگر اس کے
لئے تائید ایزدی بھی ضروری ہے۔"

فاؤسٹ ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ اپنے اچھے دنوں میں اپنی
بری حالت کے تصور پر رحم کھاکر اپنی کوششوں سے خود کو
سنوارنا چاہیئے اور جہد مسلسل میں نجات کا راز پوشیدہ ہے۔
خواہ یہ کوشش غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن جب کسی موڑ پر جذبہ محبت
اور عقیدت کا سامنا ہوتا ہے تو غلط کوشش بھی سلامت روی بن
جاتی ہے۔ فطرت کی خوش نصیبی ہمیشہ ہمیں دعوت عمل دیتی
ہے اور ہمارے در پر دستک دیکر کہتی ہے کہ "کبھی مایوس
مت ہونا"، اسی اصول پر عمل پیرا ہوکر فاؤسٹ خود کو امر بنالیتا ہے
فرانسیسی نقاد جیکس روٹی، گوئٹے کے اس رویے کو عیسائیت
کے خلاف تصور کرتے ہوئے اپنی کتاب "فوق البشر" میں
نطشے کے مقابلے میں وہ گوئٹے کو ترجیح دیتا ہے اور فاوسٹ
کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔

"گوئٹے اور فاوسٹ کے بنیادی مسائل
یہ ہیں کہ انسان کے بدترین دشمن، یعنی وسواس
اور تشکیک کے ساتھ شاید جنگ کی جائے
میفوسٹفلس کا پیکر اسی تشکیک کا مظہر ہے۔ جو
ابتدا سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں
عقائد کا موضوع سخن رہا ہے۔ دراصل یہ انسان
کا اپنا دل ہی تو ہے جو اپنی مریضانہ حرکات کے
ذریعے شبہات کی موہوم دنیا تخلیق کرتا رہتا ہے
کیا ہم اس سے محض تائید ایزدی کی وجہ سے
نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ یا مزید روشنی
حاصل کرنے کے لئے ہمیں عمل پیہم سے کام لینا ہوگا؟
یا یہ تاریکی ہمارا مقدر ہے؟ گوئٹے اس سوال کا جواب
دیتے وقت لوتھر اور ایراسمس دونوں کے بین
بین ایک راہ نکالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر مستقل
عمل پیہم کی بڑی اہمیت ہے تو عقیدے کی بھی
کم اہمیت نہیں ہے کیوں کہ اس سے جذبۂ عمل
کو سہارا ملتا ہے۔ انسان کا مطالعہ یہ ہے کہ وہ
کیا ہے؟ لیکن اگر کوئی اپنے وجود پر بھروسہ
کرتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ جہد للبقا کے
ذریعے خود کو متعارف کرتا ہے اور یہی جہد
مسلسل ذریعۂ نجات بھی ہے۔"

"فاؤسٹ" کی پوری تصویر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات
بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ خود نطشے کا "فوق البشر" بھی "فاؤسٹ"
کا ہی ترمیم شدہ ایڈیشن ہے۔ گوئٹے اخلاق حفظان صحت
کی تعلیم دیتا ہے اور اس کے لئے کوشاں نظر آتا ہے کہ تشدد آمیز
توانائی کو اخلاقی قدروں سے مزین کیا جائے اور ذات کے
متجاوز عناصر کو مذہب کے تابع کیا جائے اور زندگی کے
کچھ خطرناک کھیلوں کو زندگی سے خارج کیا جائے۔ جہاں نطشے
کو غیر معمولی کھیل ہی پسند ہیں وہاں گوئٹے ذرا محتاط ہے اور
وہ فرد کی انتہاپسندیوں کے پس منظر میں معاشرے کا بھی خیال
رکھتا ہے لیکن پھر بھی گوئٹے نے "فاوسٹ" کے ذہن سے
تمام تر انتہاپسندیوں کو خارج کرنے کے بجائے گناہ سے ثواب
اور ثواب سے گناہ کیطرف مراجعت کا عمل دکھایا ہے اور
وہ بھی اس امر کا مترادف آتا ہے کہ انتہاپسندیوں کے خمیر ہی سے
عظیم ترین انسان پیدا ہوتے ہیں، اس ذیل میں وہ امتیاز خیر و
شر کو برتتا تو ہے لیکن دونوں کو انسانی جبلت کا ناگزیر عنصر تصور
کرتے ہوئے کھل کر کھیلنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ البتہ اخیر میں
اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ گناہ گار انسان تمام آسائشوں کے باوجود
اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتا جب تک وہ محبت اور عقیدت
کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنے جرم کی سزا کے طور پر خود
کو آگ میں نہ ڈال دے۔ لہٰذا فاؤسٹ کی تمام برائیوں کے

پس منظر میں نیکی اور محبت کا جذبہ موجود ہے جو انجام کار سامنے آتا ہے ، ٹالسٹائی کے ،، جرم و سزا ،، کا انجام بھی کچھ ایسا ہی ہے ۔

اقبال کو گوئٹے سے اسقدر لگاؤ کیوں ہے دراصل اقبال کے لیئے اس کے ملک و قوم کے مسائل بھی نشاۃ ثانیہ کے مسائل سے مماثل ہیں اور اقبال بھی اپنے عہد کی زندگی کو اپنی ذات میں جذب کیئے ہوئے ہے، وہ بھی ملت بیضا کی عمرانیات پر بالخصوص اور بنی نوع بشر پر بالعموم گہری نظر رکھتا ہے اور نئے حالات سے پیدا شدہ زندگی کے نئے تقاضوں سے نمٹنے کے لیئے ایک ذہن میں انسان کی مختلف شبیہیں ابھرتی ہیں اور معدوم ہو جاتی ہیں لہذا وہ جس انسان کی تلاش میں ہے وہ نہ تو تشکیک کا شکار ہے اور نہ شتر بے مہار کیطرح ہر گلی کوچے میں ڈھونڈتا پھرتا ہے ۔ اس میں حد درجہ انانیت بھی ہے اور ضبط نفس کا ملکہ بھی۔ اس کے سامنے ایک واضح نصب العین ہے جہاں فرد کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن معاشرے کو کسی موڑ پر نظر انداز کرنے کی گنجائش نہیں ۔ اقبال کا مرد مومن بھی رومانی ہے لیکن اس کی رومانیت بہت جلد روحانیت میں بدل جاتی ہے وہ ابلیس کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے کی بجائے اسے قصہ آدم کی رنگینی کا موجب قرار دیتا ہے اور ،، خواجۂ اہل فراق ،، سے ڈرتا نہیں بلکہ اسے تو انسان کی ذہنی نشوونما کے مراحل کا ایک توانا چوکیدار تصور کرتا ہے جو ہر لمحہ مرد مومن کو گناہوں سے چوکنا رکھتا ہے اور ایک لمحہ کے لیئے بھی خواب غفلت میں پڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نطشے اور گوئٹے دونوں ابلیس کے شر سے بے تحاشا خائف ہیں لیکن مرد مومن سے ابلیس بجائے خود خائف نظر آتا ہے۔ مرد مومن کی سرشت میں فقیرانہ شان اور قلندرانہ مستی ہے وہ بھی طوفانوں سے کھیلنے کا عادی ہے لیکن عصمت دری کے لیئے کسی معصوم دوشیزہ کے بھائی کا قتل نہیں کرتا اور نہ خود کو خدا بتاتا ہے بلکہ وہ اگر تلوار اٹھاتا ہے تو امن کی خاطر جنگ کرتا ہے تو حق کی فتح کیلیئے، کسی سے پیار کرتا ہے تو خدا کی خوشنودی اور انسانیت کی بہبود کے لیئے کسی سے نفرت کرتا ہے تو اس لیئے کہ مقتول انسانیت کا دشمن ہے۔ مرد مومن ایک بندہ مولا صفات ہے جس کے اندر بے پناہ طاقت، حوصلہ، قوت عمل، جذبہ تسخیر پندار، خودی، خودنگری، خداپرستی، انسان دوستی، شجاعت دلیری اور بانکپن سب کچھ ہے لیکن وہ کسی موڑ پر شک و شبہہ کا شکار نہیں، فاوسٹ انسانی نفسیات کا زندہ مرقع ہے لیکن مرد مومن کی نفسیات مثالی ہے۔ اس کے اندر شر کی چنگاریاں اگر موجود بھی ہیں تو وہ سطح پر نظر نہیں آتیں وہ زندگی کا سارا زہر پی کر پختہ ترین ہو چکا ہے اور مجسم ایمان ہے جس میں کہیں سے کوئی دراڑ نہیں ہے ۔

،، فاوسٹ ،، کی ساری الجھنوں کا سبب اس کی جستجو کی خلش اور چبھن ہے اور اسکی تمام معذوریاں ابلیس کی زیرکی کے تحت ہیں جسے اخیر میں وہ عشق کی ایک ہی جست سے طے کر لیتا ہے اور یہ اقدام عقل کے بس کا روگ نہیں.

چونکہ اقبال کے یہاں بھی وہی عقل معتبر ہے جو وجدان کی سرحدوں کو چھو سکے ورنہ ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

اقبال کو بھی گوئٹے کی طرح عقل مشتبہ نظر آتی ہے خدا ناآشنا اور خودی نا آشنا عقل گمراہی کا موجب ہے لہذا اقبال نے گوئٹے سے اس ضمن میں اثرات قبول کئے ہیں لیکن یہ تصورات اسلامی تصوف میں بھی موجود تھے البتہ گوئٹے نے اس کی اثر انگیزی میں اپنی فنکاری سے اضافہ کیا ہے ورنہ "پیام مشرق" تو " در جواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے " ہے۔ اقبال نے "پیام مشرق" میں فاؤسٹ کی تشکک پسندی کو دور کیا ہے۔

اقبال کو گوئٹے کی انسان کی یہ نفسیاتی مصوری بہت پسند ہے۔ لیکن اسے گوئٹے کا یہ خیال بیحد پسند ہے کہ چالاکی اور مکر و فریب ابلیس کا شعار ہے اور آدم کی نجات عشق میں ہے عاشق کے سامنے زیرکی بے معنیٰ ہے محض عقل سے زندگی کا سفر طے نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ عقل تو ابلیس کے دام میں گرفتار کر دیتی ہے اگر اس پر عشق کا پہرہ نہ ہو۔ "جلال و گوئٹے" کے عنوان سے کل آٹھ اشعار پر مشتمل ایک چھوٹی سی فارسی نظم ملاحظہ ہو جس میں گوئٹے سے متعلق اقبال کے تاثرات بہت واضح ہیں:۔

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیر عجم
شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب
خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصہ پیمان ابلیس و حکیم
گفت رومی اے سخن را جاں نگار
تو ملک صید استی و یزداں شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید
ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جاں بہ پیکر دیدۂ
در صدف تعمیر گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان ایں درگاہ نیست
داند آں کو نیک بخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

گوئٹے رومی کی نگاہ میں (یعنی اقبال کی نظر میں) اس لئے پیغمبر بے کتاب ہے کہ اس نے "قصہ پیمان ابلیس و حکیم" کے وسیلے سے انسان کو ملک صید اور یزداں شکار کی شکل میں پیش کر کے فکر و نظر کے لئے ایک نئی دنیا کے دروازے کھولے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اس نے انسانی وجود میں "سوز و ساز جاں" کی کرنا کیوں کا صحیح مطالعہ پیش کیا ہے بلکہ اس نے "عشق و محبت" کی شکل میں وجود سے موتی چن لئے ہیں اور گوئٹے کیطرح سب کا مقدور نہیں کہ وہ عشق کے اسرار و رموز سے واقف ہو۔ کیونکہ عشق کی درگاہ کے لئے ہر کس و ناکس کے لئے راہ نہیں کھلتی۔ خوش نصیب اور محرم راز وہ لوگ ہی جو اس حقیقت آشنا ہیں کہ "زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"۔

اقبال گوئٹے کے شکوک و شبہات کو دور کرتا ہے اور اسے حیات کی تازہ شاہراہوں کے پتے بتاتا ہے لیکن اس کی فنکارانہ عظمت کا تہہ دل سے قائل ہے اپنا اور گوئٹے کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

او چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمین مردۂ
او چو بلبل در چمن "فردوس گوش"
من بصحرا چوں جرس گرم خروش
ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر صبح خند، آئینہ فام
او برہنہ من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تاب دار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار
او ز شوخی در تہ قلزم تپید
تا گریبانِ صدف را بر درید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

یعنی یہ کہ گوئٹے "در چمن زادہ" اور "چمن پروردہ" ہے اور میں مردہ زمین سے اٹھا ہوں، گوئٹے کی حیثیت لیے

بلبل کی ہے جسکی ہر چہکار فردوس گوش ہے اور میں صحرا میں ایک جرس گرم خروش کی حیثیت رکھتا ہوں ہم دونوں ضمیر کائنات کے شناور ہیں اور موت میں بھی ہمیں زندگی نظر آتی ہے۔ دونوں آئینے کیطرح چمکتے ہوئے خنجر ہیں۔ فرق یہ ہے کہ گوئٹے خنجر برہنہ ہے اور میں ابتک "اندر نیام" ہوں۔ دونوں دریائے ناپیداکنار کے گوہر تابدار ہیں لیکن وہ اپنی شوخئ طبع کے بل بوتے پر سمندر کی تہوں میں تپ چکا ہے تاکہ صدف کا گریبان چاک کر سکے اور میں ابھی آغوش صدف ہی پروان چڑھ رہا ہوں اور ابھی میں نے ضمیر بحر کو پایاب نہیں پایا ہے۔ اس عقیدتمندانہ اظہار میں اقبال کا قد گوئٹے کے سامنے بونا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ اقبال کی طبعی شرافت اور احترام فن کا لازمی نتیجہ ہے ورنہ آگے چل کر اسی نظم میں اقبال نے معلمانہ انداز اختیار کر لیا ہے اور گوئٹے کے فاوسٹ کی تمام الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے مختلف مواقع کے محض چند اشعار "فاؤسٹ" کے پس منظر میں میرے دعوے کی دلیل کے طور پر کافی ہونگے ؎

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا این خیر را بینی بگیر

گوئٹے کا فاؤسٹ ابتداء میں طاعون سے مرنے والی مالن اور پادری کی موت پر ٹھٹک جاتا ہے اور ابلیس کے دام فریب میں آجاتا ہے اور ساری زندگی شر میں شرابور رہتا ہے لیکن اقبال کے پاس اس مسئلے کا حل جذباتیت نہیں بلکہ زندگی عمل سے عبارت ہے اور یہ کوئی ذاتی حق نہیں ہے بلکہ انفس و آفاق کا صحیح ادراک ہی زندہ رہنے کی دلیل ہے۔ خدا کے حکم کے مطابق ساری حکمت کا خزانہ خیر کثیر میں پوشیدہ ہے لہذا جس موڑ پر جہاں کہیں نیکی ممکن ہو اسے عملی جامہ پہنانے سے ہی زندگی پختہ تر ہوتی ہے۔

"فاوسٹ" کو بھی سرداری اور سربلندی کا خبط ہے جسے وہ ابلیس کے ہاتھوں اپنی روح فروخت کر کے بھی حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اقبال کے یہاں اسکے طریقے جداگانہ ہیں ؎

سروری در دین ما خدمت گری است
عدل فاروقی و فقر حیدری است

آں مسلماں کہ امیری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند
مثل سلمان در مدائن بودہ اند
حکمرانے بود، سامانے نہ داشت
دست او جز تیغ قرآنے نداشت

خودی تعمیر کن در پیکر خویش
چو ابراہیم معمار حرم شو

اقبال نے فاوسٹ کی دینداری سے الحاد اور ابلیس پرستی کیطرف مراجعت کے اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے جذبات کی تادیب کے اشارے کئے ہیں،

"فاؤسٹ" نامرادیوں اور ناکامیوں سے گھبرا کر ہوس پرستی کو اپنی بے راہ عقل اور کمزور ارادے کیوجہ سے اپنا لیتا ہے لیکن بقول اقبال۔ آدمی اگر خدا کی تلاش کرے تو وہ یقیناً ملے گا کیونکہ وہ بجائے خود آدم کی تلاش میں ہے۔

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور
کہ جان تو زخود نا محرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے ہست

"پیام مشرق" کا بنظر غائر مطالعہ ہم پر یہ حقیقت منکشف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ اقبال کے ذہن میں "پیام مشرق" کی تکمیل تک "فاؤسٹ" کی ان تمام کجرویوں پر نگاہ ہے اور اس نے قدم قدم پر گوئٹے کو تمام شکوک و شبہات کا خاطر خواہ جواب دینے کی کوشش کی ہے اور فکری اعتبار سے اقبال کا قد گوئٹے سے بلند ہے۔ البتہ فنکار گوئٹے ابلیس اور "فاؤسٹ" کی خدا بندی میں عظیم تر ہے کیونکہ اس میں اس کا خلاقانہ ذہن ایک نئی دنیا کی تعمیر بہت ہی فنکارانہ انداز میں کرتا ہے

اقبال اور گوئٹے میں جہاں تک مشابہت کی بات ہے، وہ میرے خیال میں محض عقل و عشق اور عمل پیہم جستجو اور درد و داغ جستجو کی حد تک ہے۔ ورنہ دونوں کے یہاں معیار خیر و شر جداگانہ ہے اور دونوں کے سوچنے کا انداز بھی قطعی جداگانہ ہے۔

گوئٹے کا فاوسٹ عقیدے کے اعتبار سے عیسائی ہے اور تائید ایزدی کا منتظر رہتا ہے اس کے اندر خدمت خلق کا جذبہ بھی بحد شدید ہے۔ وہ حد درجہ جذباتی اور رومانی ہی نہیں، متلون مزاج بھی ہے۔

ابتداً اس کا تقدس اور وسیع مطالعہ اسے انسانوں سے دوستی کرنا سکھاتا ہے لیکن موت کے چند جھٹکوں سے متزلزل ہو کر وہ باؤ کی دیوار کیطرح ابلیس کی آغوش میں بیٹھ جاتا ہے اور تا عمر نفسیاتی مریض کی سی زندگی گذارتا ہے۔

اقبال اور گوئٹے کی مشابہت یا منافرت کا سوال حیات و کائنات سے متعلق ان دونوں دانشور فنکاروں کے نظریات کے تطابق یا تضاد کا سوال ہے۔ گوئٹے نے اپنے شاہکار "فاوسٹ" میں اپنے عہد کے ضمیر کی تجسیم فاوسٹ کی پیکرتراشی میں کی ہے اور متعلقہ عہد کے مزاج کے تذبذب کو مجسم کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں بھی ایک پیکر ابھرتا ہے جسے انسان کامل یا مرد مومن سے وہ موسوم کرتا ہے۔ یہ بھی عصری تقاضوں کے تحت منصۂ شہود پر آتا ہے لیکن دونوں کے مزاج میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔ فاوسٹ حقیقی زندگی کا مظہر ہے یعنی یہ کہ وہ اسی طرح کا ہے جسطرح کی زندگی ہے لیکن مرد مومن کی زندگی کا آغاز فاوسٹ کے سفر کے اختتام سے ہوتا ہے۔ مرد مومن ایک جہانِ تازہ کے نئے امکانات اور حیات کی تمام امکانی گذرگاہوں کا مسافر ہے۔ فاوسٹ گناہوں میں الجھا ہوا ابلیس کا آلۂ کار ہے، لیکن مومن کے سامنے ابلیس ایک "ہمدم دیرینہ" کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ فاوسٹ اپنی ذات کی تلاش میں امتیاز خیر و شر کی طنابیں توڑ دیتا ہے اور اپنی بے عنان آرزوؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مرد مومن کے پختہ عزائم، اسکی خود اعتمادی، اسکی وسعت فکر و نظر، اسکی روحانی قوت، اسکا جذبہ قرب الہٰی، اسکی قوت تسخیر، اس کا جذبۂ عمل، اس کی اطاعت اور اسکا عشق رسول اس کی فراست اور اس کا لامتناہی شعور، اس کی بے باکی اور اس کا قلندرانہ پن، اسکی درویشی، بے نیازی اور اسکا فقر، اس کی مستحکم خودی، اس کا جذبۂ نیابت الہٰی اور اشتیاق دیدار حق، اسکی شاہینی اور اس کا سوز و ساز، اس کی بے اطمینانی اور اس کا درد و داغ و جستجو، اس کے ہنگامے اور ذوق نمو، اس کی خداترسی اور بت شکنی، اس بے نیازی اور اس کے بے لوث اعمال اسے ابلیس سے خائف کرنا تو درکنار "یزداں بکمند آور" کی ترغیب دیتے ہیں اور وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ ؎

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

فاوسٹ کی نگاہیں انسانی دکھوں پر اجمالی طور پر ہیں جبکہ مرد مومن کی نگاہیں حد درجہ جزرس اور نکتہ آفریں ہیں وہ سیاست مدنیت، مذہب، تہذیب، تاریخ، عمل، عقیدہ، ایمان، ایقان حکومت، بغاوت، فقیری، امیری، اہرمن یزداں، معاشیات و عمرانیات غرض زندگی کے تمام پہلوؤں پر بھرپور نگاہ رکھتا ہے اور اس کا دائرۂ عمل ہمہ محیط ہونے کے ساتھ حد درجہ وسیع بھی ہے۔

اگر ہیرو ئی توانائی پسندی کے خمیر سے ابھرے ہوئے فاوسٹ کی ادبی اور تاریخی عمر تقریباً ساڑھے چار سو برس ہے تو مرد مومن کی تاریخی عمر چودہ سو سالہ عظیم الشان اسلامی تاریخ کے زیر و بم پر محیط ہے اور اس کا اندرونخانہ ساز ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی ذات کی تعمیر و تشکیل میں اقبال نے دوسرے تمام کرداروں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے نمایاں قد کیوجہ سے بہ آسانی سے پہچانا جاتا ہے فاوسٹ راہ کی نیرنگیوں میں کھویا ہوا ایک دوزخی انسان ہے جسے یزداں طلبی بھی ستاتی ہے اور اخیر میں اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر محبت کی آگ میں جل کر جنت کا حقدار بنتا ہے اور مرد مومن معصوم اور بے گناہ ہے، جنت اس کا ادنیٰ مقام ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جسطرح سے اسلام آخری اور مکمل مذہب ہے اور تمام نوع بشر کے لئے یکساں مفید ہے ٹھیک اسی طرح دنیا کے دانشوروں اور فنکاروں کے یہاں پائے جانے والے مثالی اور تخلیقی کرداروں کے درمیان مرد مومن اپنے آپ میں مکمل اور ہمہ جہت اور ابدی کردار ہے جو ہر زمانے میں

یکساں مفید اور دلچسپ ہے فاوسٹ کا ابتدائی تقدس اگلے زمانے کے تقدس کی نشاندہی کرتا ہے اور تقدس سے گناہ کیطرف مراجعت عصر حاضر کی غماز ہے پھر گناہ سے محبت اور عبودیت کا سفر آئندہ کے لئے ایک بشارت ہے، لیکن مرد مومن کا کردار زمانے کے ان مفروضوں سے بے نیاز ہی نہیں بلکہ تینوں زمانوں کو اپنے آپ میں ضم کئے ہوئے ہے اور لافانی ہے۔ لہذا اقبال کے بارے میں جو لوگ بہت آسانی سے یہ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ اقبال کے خیالات تو نطشے اور گوئٹے سے ماخوذ ہیں وہ اقبال کے ساتھ تو انصاف کرنے سے رہے خود اپنے ساتھ انصاف نہیں کر پاتے۔ ایسی غلط فہمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اقبال نے نطشے اور گوئٹے کی بیحد تعریفیں کی ہیں اور ان دونوں کے یہاں بھی انسان کی پیکر تراشی ملتی ہے اسی لئے بڑی آسانی سے یہ بات کہہ دی جاتی ہے اور اس پر دھیان نہیں دیا جاتا کہ اقبال نہ صرف نطشے اور گوئٹے کی شان میں رطب اللسان ہے بلکہ حلاج، بھرتری ہری، کالی مارکس، گوتم بدھ رام، کرشن، ہیگل، برگساں، کانٹ، گرو نانک، مزدک اور دیگر اکابرین کی شان میں بھی اس نے عقیدتمندانہ اظہار خیال کیا ہے۔ مولانا روم کو تو اس نے اپنا مرشد ہی بنا رکھا ہے لیکن صاحب نظر نقاد سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مرید ہندی ہر جہت سے پیر رومی سے بڑا دانشور فنکار ہے یہ تو اقبال کی عظمت ہے کہ اس نے ہر عظیم مفکر اور فنکار کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کیونکہ اس نے ان سب کا براہ راست مطالعہ کیا ہے اور متاثر بھی ہوا ہے۔ ورنہ حقیقت حال تو یہ ہے کہ اقبال ہر لمحہ "تراشیدم و پرستیدم اور شکستم" کے اصول پر عمل پیرا رہا ہے اور اقبال کو اپنی عفت قلب و نگاہ کا شدید احساس بھی ہے اور وہ بے ساختہ کہنا ہے اور بجا کہتا ہے کہ؎

میان آب و گل خلوت گزیدم
زافلاطون و فارابی بریدم
نہ کردم از کسے دریوزہ چشم
جہاں را جز بچشم خود نہ دیدم

O

جب مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد سے انجمن ترقی اردو کا دفتر دھلی منتقل کیا تو کسی نے ان سے کہا۔" اگر پانی پت میں کوئی جلسہ اردو کی ترویج تبلیغ اور اشاعت کے لئے منعقد ہو تو آپ تشریف لے جائیں گے، مولوی صاحب نے فرمایا اردو کے تعلق سے اس کی حمایت میں کوئی جلسہ جہنم میں بھی منعقد ہو تو میں ضرور پہونچ جاؤں گا۔

منقول: ادبی لطیفے
(از خواجہ عبدالغفور)

رشید الدین

مولوی عبدالحق اور اورنگ آباد

اگرچہ کام کرنے کے لئے کسی خاص جگہ اور زمانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ کام کرنے والا زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے، مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی خاص مقام یا خاص زمانہ کسی شخص کو بطور خاص راس آجاتا ہے اور اس مقام اور زمانے میں کیا ہوا، اس کا کام رہتی دنیا تک یاد رہ جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے تعلق سے نواب میر عثمان علی خاں سابق فرمانروائے حیدرآباد کے زمانے میں اورنگ آباد میں کیا ہوا مولوی عبدالحق کا کام ایک ایسا ہی کام ہے کہ ہم اس کام کو اس مقام اور زمانے سے علیحدہ نہیں کر سکتے، باوجود سرکاری ملازم ہونے کے اورنگ آباد میں مولوی صاحب نے اردو زبان و ادب کے لئے جو کام کیا اور اس زمانے کی حکومت نے جسطرح انہیں تعاون بہم پہنچایا یہ اپنی مثال آپ ہے۔

مولوی صاحب پیدا شمال میں ہوئے۔ پڑھے لکھے اور بڑے شمال میں ہوئے مگر رہے جنوب میں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام دکن اور خصوصاً اورنگ آباد میں گذارے۔ مولوی صاحب کی زندگی اور جد و جہد میں اورنگ آباد کو ایک خاص مقام حاصل ہے جسکا مولوی صاحب کو بھی اعتراف تھا، اس شہر کی پر فضا پرسکون اور تاریخی فضا میں مولوی صاحب نے اردو کا جو کام کیا اسے آنیوالی نسل کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ مولوی صاحب تقریباً پچیس برس اورنگ آباد میں رہے۔ یہ انکی زندگی کا بڑا تخلیقی دور رہا۔ اس سلسلہ میں حکومتِ وقت اور عہدہ دارانِ بالا نے انہیں خصوصی رعایتیں عطا کیں۔ اور انہوں نے حکومت کی ملازمت کرتے ہوئے اردو کیلئے بھی بہت کچھ کیا یہیں وہ ڈکشنری والے عبدالحق ہوئے اور اپنی شہرۂ آفاق اور اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری مرتب اور شائع کی۔ یہیں انہوں نے قدیم دکنی مخطوطات اور قدیم شعرائے دکن کے تذکرے مرتب اور شائع کئے۔ یہیں وہ اردو والے عبدالحق ہوئے اور انہیں نے ترقی اردو کا سہ ماہی ادبی اور تحقیقی رسالہ "اردو" جاری کیا اور یہیں وہ بابائے اردو بھی کہلائے۔ یہ خطاب مولوی صاحب کو کب اور کس نے دیا۔ کچھ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہ اورنگ آباد کے زمانے ہی بات ہے۔ غرض مولوی عبدالحق کی زندگی میں اورنگ آباد کو بڑا دخل رہا ہے اور انکا سوانح نگار ان کی سوانح حیات میں ہمیشہ اورنگ کے لئے ایک الگ باب مختص کرے گا۔

مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں اترپردیش کے ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ ہاپوڑ میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہاپوڑ اور پنجاب کے ضلع فیروز پور میں ہوئی جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ ہائی اسکول کے لئے مولوی صاحب علیگڈھ آ گئے اور علیگڈھ یونیورسٹی سے میٹرک اور بی۔ اے کیا۔ کالج میں ان کے مضامین انگریزی ادب، فلسفہ اور ریاضی تھے۔ ریاضی سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ مگر آگے قدرت نے ان سے کام اردو کا لیا۔ علیگڈھ کے دوران قیام میں اس زمانے کے سرکردہ لوگوں سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد

عمادالملک، مشتاق حسین، شبلی نعمانی، جسٹس سید محمود اور محسن الملک وغیرہ سے مولوی صاحب کو فیض صحبت رہا۔ اس طرح مولوی صاحب کی حیثیت اس نسل اور ہماری نسل کے درمیان ایک کڑی کی سی تھی، افسوس کہ یہ کڑی بھی اب ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکی اور کوئی ایسا نہیں رہا جو اس نسل کے لوگوں کا آنکھوں دیکھا حال ہمیں سنا سکیں۔

علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد محسن الملک نے مولوی صاحب کو انگریزی مراسلت اور مضمون نگاری کے کام کے لئے بمبئی بلا لیا۔ دو سال کے بعد انکی صلاحیتوں کو دیکھکر افسرالملک (جو اس زمانے میں حیدرآباد کی فوج کے سپہ سالار تھے) انہیں حیدرآباد لے آئے اور ان کی طبیعت کی مناسبت سے فوج کا رسالہ "افسر" ایڈٹ کرنے پر مامور کیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب مدرسہ آصفیہ حیدرآباد کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ چند سال کے بعد ملکت امور داخلہ میں اردو مترجم مقرر ہوئے۔ پھر سراج یار جنگ کے عہد نظامت میں تعلیمات میں مددگار مہتمم ہوئے اور میٹرک پر تقرر ہوا۔ اسکے بعد صدر مہتمم تعلیمات بنا دیئے گئے اور اورنگ آباد تقرر ہوا۔ صوبہ اورنگ آباد کے پانچوں اضلاع اورنگ آباد، عثمان آباد، بیڑ اور نانڈیڑ انکے تحت تھے۔

اس عہدہ پر عرصہ دراز تک فائز رہنے کے بعد جب اورنگ آباد میں کالج قائم ہوا تو یہ اس کے پرنسپل بنا دیئے گئے ۱۹۲۹ میں پروفیسر وحیدالدین سلیم کا انتقال ہو گیا تو جامعہ عثمانیہ کی اردو پروفیسری پر آپ سے زیادہ قابل کوئی نظر نہیں آیا تو لہذا بعد احترام آپ کو حیدرآباد بلا لیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے حیدرآباد میں اردو کی حالت مستحکم کر، دہلی کو اپنا مستقر بنا لیا تاکہ شمالی ہند میں اردو کے لئے کام کیا جا سکے۔ چنانچہ استعفیٰ پیش کر کے وہ دہلی منتقل ہو گئے اور انجمن کا پریس اور دفتر وغیرہ بھی جو اب تک اورنگ آباد میں تھا وہ بھی دہلی منگوا لیا۔ تقسیم ملک تک وہ دہلی میں رہ کر اردو کے لئے کام کرتے رہے اس کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں اردو کالج قائم کیا۔ کراچی میں ایک اردو یونیورسٹی قائم ہو جائے یہ مولوی صاحب کی عین خواہش تھی مگر یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور ۱۶ راگست ۱۹۶۱ء کی صبح وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

یہ تھے مولوی صاحب کے مختصر حالات زندگی، ان پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے کام کے مراکز چار رہے۔ اورنگ آباد، حیدرآباد، دہلی اور کراچی۔ مگر ان چاروں مراکز میں جو کام اورنگ آباد میں ہوا اور جو انس مولوی صاحب کو اورنگ آباد سے رہا۔ وہ پھر کسی دوسرے مرکز کو میسر نہیں آیا۔ دراصل اورنگ آباد ہی وہ مقام ہے جہاں مولوی صاحب کی زندگی کی کایا پلٹ ہوئی اور انہوں نے اردو کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

ہوا یوں کہ مولانا شبلی کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کو (جس کی بنا ۱۹۰۳ء میں پڑی تھی) کوئی اچھا معتمد نہیں مل رہا تھا۔ خود شبلی بھی اپنی زندگی میں دیگر مصروفیات کی بنا پر اس کے لئے زیادہ وقت نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ انجمن بیحد کسمپرسی کی حالت میں تھی کہ بعض لوگوں کی نظر انتخاب مولوی صاحب پر پڑی۔ اس وقت وہ اورنگ آباد میں صدر مہتمم تعلیمات تھے چنانچہ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب کو اعزازی معتمد بنا دیا گیا اور مولوی صاحب نے اپنی محنت اور لگن سے تھوڑے ہی دنوں میں اس کے تن مردہ میں جان ڈال دی۔ اس زمانے میں انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق لازم ملزوم ہو گئے تھے اسی لئے رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ "انجمن ترقی اردو ان کا تخلص ہے"

اورنگ آباد میں مولوی صاحب کا قیام شہر سے باہر رابعہ دورانی کے تاریخی مقبرہ کے کپاونڈ میں تھا۔ اسی بنگلے کے ایک حصہ میں وہ رہتے تھے اور دوسرے میں انجمن کا دفتر تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی میں جو باغ ہے اس کے بھی مولوی صاحب سرکاری طور پر نگران تھے۔ صدر مہتمم کی حیثیت سے مولوی صاحب کو دورے کرنے پڑتے تھے۔ مرہٹواڑہ کا ایک ایک شہر، ایک ایک قصبہ اور ایک ایک گاؤں انکا دیکھا ہوا تھا۔ سرکاری کاموں سے جاتے تو انجمن کا کام بھی کرتے۔ لوگوں میں اردو کی اہمیت کا احساس دلاتے۔ انجمن کی شاخیں قائم کرتے اور اس کے لئے فنڈ اکٹھا کرتے۔

مولوی صاحب روزانہ علی الصبح اٹھ جاتے تھے اور اٹھتے ہی سیر کے لئے مقبرہ کے پیچھے کی پہاڑیوں میں چلے جاتے تھے۔

وہاں سے آنے کے بعد ناشتہ وغیرہ کرتے تھے۔ ناشتے میں جب تک دو تین لوگ ان کے ساتھ نہ ہوں انہیں مزا نہیں آتا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر چلے جاتے اور کام میں مشغول ہو جاتے، یہ کام سرکاری ہوتا جس میں بعض اوقات انجمن کا کام بھی شامل ہو جاتا۔ شام میں چائے اور احباب کے ساتھ کچھ باتیں ہوتیں۔ اور رات میں کھانے کے بعد پھر کام شروع ہو جاتا۔ جو رات کے ایک دو بجے تک چلتا رہتا۔ یہ کام انجمن کا ہوتا۔ جس میں بعض اوقات اہم سرکاری کام بھی شامل ہو جاتا۔ اس طرح صبح سے شام اور رات کے ڈیڑھ بجے تک سرکاری کام چلتا یا انجمن کا۔ مولوی صاحب کا ذاتی کام ایک نہ ہوتا۔ مولوی صاحب نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ انکا اوڑھنا بچھونا سب کچھ اردو ہی تھی۔ اب اگر ایسے شخص کو "بابائے اردو" کا خطاب ملے تو یہ کوئی باعث لتعجب بات نہیں۔ مولوی صاحب نے واقعی اردو سے وہی محبت کی اور اردو کے لئے وہی کیا جو ایک باپ اپنی بیٹی کے لئے کر سکتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی ایسے بے لوث لوگ پیدا ہوتے ہونگے جنھوں نے کسی تحریک کے پیچھے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہو اور اس سے کچھ نہ لیا ہو۔ مولوی صاحب ایسے ہی اردو کے بے لوث خدمتگار تھے جنھوں نے تن من دھن سے اردو کی خدمت کی اور ہاتھ جھاڑے اس دنیا سے چلے گئے۔

اپنے قیام اورنگ آباد کے زمانے میں مولوی صاحب نے اردو کے تعلق سے اورنگ آباد میں کئی علمی اور ادبی تقریبات بھی منائیں جن میں حیدر آباد سے سرکردہ لوگ آکر شریک ہوئے ۱۹۲۶ء میں جب وہ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل تھے تو انہوں نے کالج میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا ڈرامہ، دلی کا ایک یادگار مشاعرہ بڑے اہتمام سے اسٹیج کروایا تھا۔ جس میں شریک ہونے والے حیدر آباد سے سر اکبر حیدری (وزیر مالیہ) اور مسعود جنگ (ناظم تعلیمات) بھی آئے تھے۔ حیدر آباد اور شمالی ہند سے جو بھی شخص ایلورہ اور اجنتا دیکھنے آتا وہ مولوی صاحب سے ملے بغیر نہ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک بار اس زمانے کے وزیر اعظم حیدر آباد سر کشن پرساد بہادر بھی اورنگ آباد آئے تو مولوی صاحب سے ان کے قیام گاہ پر جا کر بطور خاص ملاقات کی۔

ایک خاص عادت مولوی صاحب میں یہ تھی کہ ان سے کوئی بھی شخص کسی بھی وقت مل سکتا تھا۔ انکے پاس چھوٹے بڑے، امیر و غریب پڑھے لکھے، جاہل، ہندو مسلمان، اردو داں، غیر اردو داں کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ جب وہ صدر مہتمم تعلیمات تھے تو اکثر ان کی میز پر اضلاع سے شکایتیں لے کر آنے والے چپراسیوں کو چائے پیتے دیکھا گیا۔ انکی قیامگاہ پر ہمیشہ اورنگ آباد کے سرکردہ لوگوں کا ایک اجتماع رہتا تھا۔

۱۹۲۱ء میں مولوی صاحب نے اورنگ آباد سے انجمن کا سہ ماہی رسالہ "اردو" جاری کیا جسکے علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین آج بھی اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ تین سال تک یہ رسالہ لیتھو سے نکلتا رہا پھر اس کے بعد ٹائپ میں چھپنا شروع ہوا۔ اس زمانے میں اورنگ آباد میں انجمن کے پاس لیتھو اور ٹائپ دونوں پریس تھے اس زمانے میں مولوی صاحب نے دکنی مخطوطات کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور بڑی جستجو کے بعد شائع کیا۔ چنانچہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین" ملا وجہی کی "قطب مشتری" اور نصرتی کی "گلشن عشق" مولوی صاحب نے اسی زمانے میں مرتب اور شائع کیں۔ اس زمانے میں رسالہ "اردو" میں بھی مولوی صاحب کے بڑے بلند پایہ مضامین شائع ہوئے۔ انکی کتابیں مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر اور اردو کی ترقی میں صوفیائے کرام کا حصہ، اسی زمانے میں لکھی اور شائع کی گئیں۔ یہیں سے اسی زمانے میں مولوی صاحب نے آکسفورڈ کنائز ڈکشنری کا اردو ترجمہ اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری کے نام سے مرتب اور شائع کیا۔ اس کے علاوہ طالبعلموں کے لئے ایک ڈکشنری اسٹوڈنٹس انگلش، اردو ڈکشنری" اور ابتدائی طور پر انگریزی سیکھنے والوں، انگریزی کی زیادہ استطاعت نہ رکھنے والے کے لئے پاپولر انگلش اردو ڈکشنری مرتب اور شائع کی۔ غرض اورنگ آباد میں رہ کر مولوی صاحب نے اردو کے لئے جو کام کیا اسکی ایک طویل فہرست ہے۔

مولوی صاحب کو اورنگ آباد سے جو عقیدت تھی اس کی بنا پر وہ اسے کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور مستقل طور پر وہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں مقبرہ کے

پیچھے پہاڑیوں کے پاس وہ اپنا ذاتی بنگلہ بھی تعمیر کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے زمین بھی خرید لی تھی اور تعمیر کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں مگر وہاں قریب ہی پارسیوں کا قبرستان تھا۔ پارسیوں نے ان سے درخواست کی مکان بن جانے کے بعد سے انکے قبرستان کی بے حرمتی ہو گی۔ اس درخواست پر مولوی صاحب نے مکان بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور تمام تیاریاں جوں کی توں رہ گئیں۔ ۱۹۲۹ء میں جب پروفیسر وحیدالدین سلیم کا انتقال ہوا تو آپ بصد اصرار اورنگ آباد چھوڑنے پر راضی ہوئے۔ اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ بنے۔ پھر بھی انہوں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ وہ بیس دن حیدرآباد رہیں گے اور دس دن اورنگ آباد میں رہیں گے۔ چنانچہ ارباب مجاز نے اسے تسلیم کر لیا تاکہ وہ انجمن کا کام دیکھ سکیں۔ اس طرح انجمن کا دفتر اورنگ آباد میں چھوڑ کر مولوی صاحب اس کی نگرانی کرتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ ۱۹۳۸ء میں دِتی منتقل نہ ہو گئے۔

اورنگ آباد سے مولوی صاحب کو کتنی محبت تھی اس کا اندازہ ان نجی خطوط سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے آخری ایام میں اپنے بعض ساتھیوں کو کراچی سے لکھے تھے۔ مثلاً مولوی غلام ربانی کو وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "تمہارا خط پہنچا۔ یہ خط کیا ہے اس میں میری زندگی کا ایک باب پنہاں ہے۔ یہ مجھے پھر وہیں لے گیا جہاں سے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے لئے مجھے معلوم ہوا کہ میں مقبرے میں ہوں اور تم میرے ساتھ کام کر رہے ہو اور وہاں کے پر فضا اور دلربا ماحول کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ وہ مقام (مقبرہ رابعہ دورانی) آج بھی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے اور یہ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار اس کی زیارت کر لوں۔ میں نے اپنے کام کی بنا وہیں ڈالی تھی اور برا بھلا جو بھی مجھ سے بن پڑا وہ اسی پر سکون اور فرحت انگیز مقام میں ہوا۔"

ایک اور خط میں محمد علی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

> "میں نے بے شک تم سب کو ہدایت کی تھی کہ اورنگ آباد نہ چھوڑنا مگر انقلاب زمانہ ہے کہ پہلے مجھے ہی چھوڑنا پڑا۔ مگر اس کی محبت اب تک دل میں ہے۔ ہاشمی فرید آبادی کہا کرتے تھے کہ اورنگ آباد کے قدر داں، اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق۔ یہ بھی تم جانتے ہو کہ برا بھلا جو بھی مجھ سے بن پڑا ہے اس کا زیادہ تر حصہ اورنگ آباد میں ہی بیٹھ کر کیا۔ پھر میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

اورنگ آباد میں قیام کے دوران جہاں مولوی صاحب نے اردو کے لئے بہت سے بیش بہا کام کئے وہیں چند ایسے لوگ بھی تیار کئے جو مستقبل میں ہمیشہ اردو داں افراد کو مولوی عبدالحق کی یاد دلاتے رہیں گے۔ شیخ چاند۔ اشفاق حسین، غلام ربانی اور سکندر علی وغیرہ کو مولوی صاحب ہی کی دریافت کہا جا سکتا ہے۔

بہر حال مولوی عبدالحق کی زندگی میں شہر اورنگ آباد کا ایک خاص رول رہا ہے اور مستقبل میں جہاں بھی عبدالحق کا ذکر ہوگا وہاں اورنگ آباد کا بھی ذکر آئیگا۔ اور جہاں اورنگ آباد کا ذکر ہوگا وہاں عبدالحق کا تذکرہ بھی آئے گا۔

اشفاق انجم

مومن بنکر برادری اور مالیگاؤں

ماخذ: ہندوستان کے موجودہ مسلم بنکروں دو ماخذ کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) وہ عرب مسلم بنکر جو آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی کے دوران شمال مغربی اور جنوبی ہندوستان میں آکر آباد ہوئے۔

(۲) دوسرا طبقہ ان لاتعداد مقامی بنکروں کی جماعت سے ہے جنھوں نے ہندوستان میں ترک مسلمانوں کی ابتدائی دور میں رضاکارانہ طور پر اسلام قبول کیا۔

ہندوستانی مسلم بنکروں کی اصل کے تحقیقی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے دوران پارچہ بافی کے پیشے سے تعلق رکھنے والے عرب انصاروں کی ایک بڑی تعداد اپنی مصنوعات کی تجارت کے لئے عربستان سے ہندوستان آئی تھی، جن میں سے بیشتر اپنے تجارتی مفادات کی نگرانی کے لئے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو گئے۔ مقامی حکمرانوں نے ان عرب تاجروں کا فراخ دلی کے ساتھ استقبال کیا۔ انھیں تجارتی سہولتوں کے علاوہ زمینیں بھی عطا کیں۔ ان عرب تاجروں کو مذہبی فرائض کی ادائیگی اور مقامی سماج سے تعلقات استوار کرنے کی مکمل آزادی تھی جس کی بنا پر انھوں نے مقامی زبان (تامل) سیکھی اور یہاں کی عورتوں سے شادیاں بھی کیں۔ تاریخی کتابوں میں ان عرب تاجروں کے حالات ملتے ہیں جو آٹھویں صدی عیسوی کے بعد سے یہاں آباد ہوتے گئے۔

پیغمبر اسلامؐ کے وصال کے بعد پارچہ باف اور دیگر پیشوں سے تعلق رکھنے والے "مدنی انصاروں" کی ایک کثیر تعداد کو مکہ اور مدینہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ جب ان کے ہمدردوں کی تعداد میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تو انھوں نے عربستان سے باہر مسلم برسرپیکار فوجوں میں شمولیت اختیار کر لی اور اس طرح یہ انصار ہندستان، شمالی افریقہ، اسپین اور دیگر ممالک تک پہنچے اور اکثر انہیں علاقوں میں بس گئے۔

"انصار" دراصل اصطلاحی صفت ہے جو مدینے کے ان شہریوں کے لئے مخصوص ہے جنھوں نے حضرت محمدؐ اور آپکے ساتھی مہاجرین کو مدینے میں پناہ دیکر پہلی اسلامی حکومت قائم کرنے میں بھرپور تعاون کیا۔ ان انصاریوں میں سے بیشتر کا خاندانی پیشہ سوتی اور اونی کپڑے بننا تھا۔ لفظ "انصاری" انصار کی صفت اور نام کی جمع ہے جس کے معنی مددگار کے ہوتے ہیں۔

یوسف انصاری جو شیخ عبداللہ بن ایوب انصاری کے دوسرے بیٹے تھے اپنے خاندان کے ساتھ ۸۹ھ مطابق ۷۰۹، ۷۱۰ء میں ہندوستان آئے اور سندھ کے علاقے میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ محمد بن قاسم الثقفی کے ساتھ سندھ آئے جسے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے اُمیہ خاندان کے حکمران ولید بن عبدالملک کے دور خلافت ۷۰۵ء میں سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا تھا ۹۶ھ

مطابق ۷۱۵ء میں یوسف انصاری کا انتقال ہوگیا جنھوں نے وارثین میں بہت سی اولادیں چھوڑیں۔

عبداللہ بن ایوب انصاری کے بھتیجے یعقوب انصاری کی اولادوں میں سے یحییٰ بن زکریا انصاری اور منصور انصاری اپنے خاندان کے ساتھ اس وقت شمالی ہند آئے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے لاہور پر ۳۹۹ھ مطابق ۱۰۰۸-۹ء میں چھٹا حملہ کیا تھا۔ ۱۰۰۹ء میں جب پنجاب مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا تب ایوب انصاری کی نسل کے کچھ اور لوگ بھی یہاں آکر آباد ہو گئے۔

عبداللہ بن ایوب انصاری کے دو بیٹوں یعقوب انصاری اور یوسف انصاری کی اولادیں اور دیگر انصار بنکروں کی نسل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلنے لگی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کے ظلم وستم اور چیرہ دستیوں سے تنگ آکر بہت سارے انصار بنکر ہجرت کر کے شمالی اور جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آکر آباد ہو گئے گجرات کے کچھ انصار بنکر خاندان کے لوگ اپنا نسبی سلسلہ ہرات کے خواجہ عبداللہ انصاری ۱۰۰۵-۶۸۸ء کے فرزند محمد نامی ایک ولی سے بتاتے ہیں جو ایوب الانصاری کی اولادوں میں سے تھے۔ ایک روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ بزرگ (صوفی محمد) تبلیغ اسلام کیلئے گجرات آئے تھے۔

انصار مہاجرین جو ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے آہستہ آہستہ ان مسلم بنکروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج بھی ان کی نسلیں پنجاب، گجرات، بمبئی، راجستھان، مدراس، میسور، آندھرا پردیش، دہلی، اترپردیش، بنگال، بہار اور آسام شہروں اور انکے مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کی پہلی مسلم قوم بنکروں پر مشتمل تھی، بعد میں تاجر، ملازم پیشہ، سپاہی اور مذہبی مبلغین آٹھویں سے گیارہویں صدی دوران ہندوستان آکر آباد ہو گئے۔ لیکن یہ تمام مسلم بنکر برادری کا ایک حصہ تھے۔

مسلم بنکروں کی تعداد میں اس وقت بے انتہا اضافہ ہوا جس وقت ہندو بنکر اسلام کیطرف مائل ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا جس کی بنا پر ہندوستانی مسلمان بنکروں کی آبادی یہاں بہت بڑھ گئی یہ نو مسلم بنکر (جولاہے) شمالی ہند میں آریائی دراوڑی نسل اور جنوبی ہند میں دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے تھے جنکی جسمانی ساخت اور رنگ میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے شمالی ہند کے جولاہوں کی ایک کثیر تعداد جو بنکروں کے کسی خاص گروہ یا جماعت سے تعلق نہیں رکھتے انہوں نے بھی اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے اس پیشے کو اختیار کر لیا۔ انکی جسمانی ساخت ملک بھر میں پھیلی ہوئی نچلی ذات کے ہندو بنکروں کی دیگر مختلف جماعتوں سے بڑی مطابقت رکھتی ہے مثلاً اودھ کے کورس KORIS، مشرقی بنگال کے جوگی JOGIS، روہیل کھنڈ کے پرسوتیا PARSOTIYAS بہار اور بنگال کے تانتس یا تانتو TANTIS OR TANTWAS جسمانی ساخت کے اصول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کرشنا KOSHTA یا مہار MAHAR اور کپالی KAPALI لوگوں سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں جو چھوٹا ناگپور اور مشرقی بنگال کے بنکر اور کاشتکار ہیں۔

ان تمام امور سے انکا تعلق ہندوؤں کی مختلف بنکر جماعتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی مختلف بنکر جماعتیں ملک کے مختلف حصوں میں شاید اسی لیے وجود میں آئیں کہ انہیں ہر جگہ بہ لحاظ ضرورت مختلف اشیاء کی دستیابی میں آسانیاں تھیں۔

شمالی ہند میں ہندو بنکر جماعتوں کی تبدیلئ مذہب کے تاریخی شواہد موجود ہیں مشہور مورخ برنی BARANI نے اپنی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" میں دیسی بنکروں کے قبول اسلام کا ذکر کیا ہے اس نے چودھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے ایک نانک بنکر کے بیٹے شیخ بابو کا ذکر کیا ہے۔ ایک ہمعصر بنگالی مصنف وجے گپتا نے اپنی

"سکل ہند مذہبی بھکتی تحریک"، جو اسلام اور صوفی تحریک سے قبل شروع ہوئی تھی۔ اس نے بھی تمام قوموں کے درمیان مساوات پر زور دیا تھا۔ مسلمانوں میں مذہبی اور اصولی بنیادوں پر ذات پات کی تفریق کبھی نہیں تھی۔ جیسا کہ ہندو نظام میں تھی۔ لیکن اسلام ان نومسلموں کے اندر ایک بڑی تبدیلی لانے سے قاصر رہا۔ کیونکہ ہندوستان میں رہنے والے نومسلم طبقہ واری سماج کے عادی ہو چکے تھے اور اسی لئے اس سے جلد چھٹکارہ نہ پا سکے اور ایک عرصے تک ان میں یہ سماجی تفریق قائم رہی۔

ہندوستانی مسلم بنکروں کی نسل سے متعلق ایسا کوئی ماخذ نہیں ملتا جو بیرونی عوامل کو ظاہر کرتا ہو۔ جو بھی لوگ باہر سے آئے وہ مقامی باشندوں میں گھل مل گئے اور نہ صرف انہوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کی بلکہ خود کو ہندوستانی بنالیا اور اپنی مذہبی شناخت کھوئے بغیر زبان، خیال اور عمل میں خود کو آل انڈیا مومن تحریک کی رہنمائی میں قومی دھار سے میں شامل کر لیا۔

نام۔ اصطلاح

(APPELLATION)

پیشے کے اعتبار سے مسلم بنکر جماعت کا سب سے پہلا خطاب "جولاہا" تھا۔ قرون وسطی سے ہندوستان میں دیگر پیشہ ورانہ ناموں اور اصطلاحوں میں سے "جولاہا" بھی ایک پیشے کا مظہر ہے۔ اسکے لئے مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو ہم معنی ہیں جیسے "جولا JULAHA، جولاہا JULAHA، جولہے JULHE، جلاہ JULAH، جلہا JULHA اور جولاہ JULAH، جولاہا کی اصطلاح فارسی سے مستعار ہے۔ اسکے ثبوت میں دلائل اور شواہد بھی موجود ہیں فارسی میں جولاہا اور جلّاہ بنکر کو کہتے ہیں اور یہ لفظ جلّا JULLA یا جَلّا JULLA سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "دھاگے کا گولا"۔ سولہویں صدی سے تعلق رکھنے والے "حسن انجو" نے اسی سے متعلق بتایا ہے کہ یہ لفظ کیوں بنکر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "دھاگوں کے ڈھیر کو جالے کہتے ہیں JALE اور جلاہا JULAHA اسکی جمع ہے۔ اسی بنا پر بنکر جو دھاگے کے تانے بانے ملاتا ہے اسی نام سے منسوب کیا گیا۔"

دسویں صدی کے اوائل میں رودکی متوفی ۹۴۰ء کے ایک ہمعصر شاعر ابوالحسن شاہد بلخی نے جولاہ کا JULAH لفظ استعمال کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فارسی کے مشہور شاعر جو ۱۲۰۷ء میں بلخ میں پیدا ہوئے، نے بھی جولاہ JULAH لفظ استعمال کیا ہے خاقانی بارہویں صدی کے زبردست شاعر نے اپنی مثنوی "تحفتہ الاعراقین" TOHFATUL IRAQAIN میں اپنے دادا کے نام ایک باب منسوب کیا ہے جسکا عنوان ہے،

"در مدح جدّ خود کہ جلاہا است گفتی"

اپنے سلسلہ نسب سے متعلق لکھا ہے کہ وہ جلاہا برادری سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس کے دادا بننے کا پیشہ کرتے تھے خاقانی کی اس طویل مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جولاہا صرف ایک پیشہ ورانہ نام تھا کیونکہ وہ اپنے والد سے متعلق بالکل مختلف بات بتاتا ہے کہ اسکے والد بڑھئی، نجار یا درودگار NAJJAR OR DAROGAR، وہ لکھتا ہے کہ والد کے سلسلے سے وہ بڑھئی تھے۔

ہندوستان میں قرون وسطی سے یہ لفظ پیشہ ورانہ اصطلاح کے بطور ایک مخصوص طبقے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ایک مخصوص طبقے کے لئے ایک خاص اصطلاح مقرر کرنے کا یہ سلسلہ جاری ہی رہا، باوجودیکہ بعد میں انکا پیشہ تجارت اور سماجی درجہ تبدیل ہو جاتا تھا۔ ہندو بنکر جماعت جو جولاہا کہلاتی ہے اسکی آبادی بہت کم ہے اور فارسی لفظ جولاہا عام طور پر شمالی ہند کے ان مسلمانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بنکر طبقے سے متعلق ہیں۔ اس طرح ہندو طبقے اور پیشہ ور انجمن (جماعت) کا پرانا نام مسلم بنکروں کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ قدیم زمانے سے ہندو بنکر "تانتوا TANTUA یا تانتی TANTI" کہلاتا تھا جو "تانتو TANTU" سے بنا ہے جس کا مطلب ہے

"دھاگا" ، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بنکر طبقہ اسلام سے منحرف ہو کر دوبارہ ہندو ہو گیا ہو اور اپنے لئے اسی نام کو برقرار رکھا ہو

آندھرا پردیش میں بنکروں کی ایک جماعت "جولاہی JULAHI" کہلاتی ہے شاید یہ جولاہا کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ مسلم بنکروں کے لئے مومن کا لفظ انیسویں صدی کے قبل سے ہی رائج تھا۔ بچانن BUCHANAN "۱۸۳۸ء اس سے متعلق لکھتا ہے کہ" پورینا PURNEA کے جولاہا مسلم بنکر اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں۔ اسی طرح گرلسن GRIESON بنکروں کی قوم سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات کی ڈائری میں ۲۷ر جنوری ۱۸۸۰ء کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ مسلم بنکر جولہا JULHA یا مومن MOMIN کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں ڈبلیو کروک W-CROOK لکھتا ہے کہ" اودھ کے مسلم بنکر عام طور پر جولاہا کے نام سے منسوب ہیں اور خود کو مومن کہتے ہیں۔"

مسلم بنکر طبقے نے اپنے لئے "مومن" نام اختیار کیا۔ اسکی توجیہہ میں بچانن لکھتا ہے کہ بنکر جو کہ جولاہا نسل سے ہیں اپنے آپ کو اہل کتاب جان کر دوسروں سے متمیز کرنے کے لئے مومن کہتے ہیں، بچانن کی یہ رائے نا تجربہ ناقابل قبول ہے کیوں کہ ایف اسٹینگس F. STENGOUS کی مرتب کردہ لغت A COMPREHENSIVE PERSIAN ENGLISH DICTIONARY "میں عربی لفظ مومن کے دو معنی درج ہیں ایک" وفادار اور مثالی مسلمان' اور دوسرا مسلمان بنکر "۔

جامع اللغات مطبوعہ ۱۹۳۳-۳۵ء میں عربی لفظ مومن ایک سچے اور عقیدت مند مسلمان کو ظاہر کرتا ہے اور یہ خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے جسکے معنی ہیں" امن و سلامتی دینے والا" یہ لفظ ایک بنکر کی سادگی' برائی اور بدی سے آزادی، معصومیت اور اعتقاد کے لئے مستعمل ہے ان تمام وجوہات کے علاوہ مسلم بنکر جو صدیوں سے سماجی دباؤ اور اعلیٰ خاندان کے اپنے ہی ہم مذہب افراد کے ہاتھوں مصیبت میں گرفتار تھے۔ انہوں نے مومن کہلانا پسند کیا۔ کیونکہ آیات قرآنی میں اس کے معنی ہیں" ایک مثالی مسلم جو اسلامی شریعت کی پابندی کرتا ہے اور اس کے سماجی مساوات اور عالمی برادری کی تعلیم پر مضبوط اعتقاد رکھتا ہے۔

وسطیٰ ہند اور پنجاب کے علاقوں میں مسلم جولاہوں کو مومن MOMAN کہا جاتا ہے یہ میمن MEMAN برادری سے الگ ہے یہ قوم بمبئی کی ایک تجارت پیشہ مسلم جماعت ہے مومن MOMAN مومن MOMIN کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

بنکر طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمان کو خود کو "مومن انصار" یا صرف "انصار" بھی کہتے ہیں۔ آج کل یہ لفظ انکے ناموں سے پہلے استعمال ہوتا ہے۔ عربی لفظ" انصار" ناصر کی جمع ہے۔ بمعنیٰ دوست، مددگار اور معاون کے ہیں۔ یہ لفظ خاص طور پر مدینے کی شہریوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، جنھوں نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے ساتھیوں کی اس وقت مدد کی تھی جب انہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی ہندوستان میں مسلم بنکروں نے بھی اسے اپنا لیا۔ کیونکہ ہندوستان میں پہلے پہل آباد ہونے والے انصار قوم کے افراد کا آبائی پیشہ پارچہ بافی تھا۔

ہندوستانی مسلم بنکروں کی ایک بڑی جماعت "انصاری" کا لفظ بطور لقب استعمال کرتی ہے لفظ انصاری حضرت محمد مصطفےٰ کے ان مددگاروں سے نسبت کا اظہار کرتا ہے۔ جو انصار کہلاتے ہیں ہندوستان بنکروں نے پہلے پہل ہندوستان آنے والے خاندان کے فرد ہونے کی حیثیت سے یہ نام اختیار کیا۔ اسی لفظ کے تعلق سے روز ROSE لکھتا ہے کہ" انصاری ایک خطاب تھا جو مدینے کے لوگوں کو دیا گیا۔ جنھوں نے حضرت محمد مصطفےٰ کو مکہ سے ہجرت کر کے آنے پر خوش آمدید کہا۔ اور وہ لوگ جو ان سے اپنا تعلق بتاتے ہیں۔ اپنے آپ کو انصاری کہتے ہیں "۔

انصاری خاندانوں میں سے ایک خاندان پنجاب میں جالندھر کے انصاری شیوخ کا ہے جو اپنا سلسلۂ نسب شیخ یوسف اور شیخ سراج الدین درویش کے سلسلے کے خالد انصار

(ابوایوب) سے بتاتے ہیں۔ جنھوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔

یہ انصاری خود کو تازی TA JIK نسل سے بتاتے ہیں

مولانا سید شفیع دیوبندی اور سید سلیمان ندوی جو مسلمانوں کے بڑے مفکروں اور علماء میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے مسلمانوں کے بنکر طبقے کے لئے لفظ انصاری کے استعمال کو برا سمجھا ہے۔ کیونکہ اس نسبت یا نام نے مسلم بنکروں کو مسلمانوں کے اصلی گروہ کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا ہے۔ کیونکہ حضرت ابوایوب انصاریؓ حضرت محمدؐ کے ماموں تھے جن سے سید اپنا رشتہ جوڑتے ہیں مسلمانوں کی بنکر جماعت کبھی کبھی اپنے لئے "ایوبی" کا لفظ بھی استعمال کرتی ہے جو حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ان کی نسبت ظاہر کرتا ہے۔

ایک بنکر یا جولاہا طبقے کا مسلمان خود کو شیخ یا شیخ انصاری بھی کہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو فارسی لقب "نورباف" سے بھی ملقب کرتے ہیں کچھ مسلم بنکر جو شیخ یا شیخ انصاری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جنکا آبائی پیشہ کپڑا بننا تھا۔ ان مسلمان شیوخ سے تعلق کی بنیاد یہ خیال ہے کہ وہ مکہ سے تشریف لائے تھے۔ تو مسلم بنکروں کی جماعت نے تقریباً تغلق کے دور حکومت میں شیخ کا لقب اختیار کیا تھا عربی لفظ شیخ کے معنیٰ "سردار یا بزرگ" کے ہیں کچھ مسلم بنکر شیخ کا لفظ مومن اور نور باف سے ملا کر استعمال کرتے ہیں۔ جیسے شیخ مومن یا شیخ نور باف مسلمان جولاہوں کا ایک گروہ اسی بات پر مصر تھا کہ اسے جولاہا کے نام سے نہ پکارا جائے کیونکہ اسے تحقیر و تضحیک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ جولاہا فارسی سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ بنکر کے ہیں لیکن یہ لفظ اعلیٰ طبقے کے مسلمان بیوقوف کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جولاہا لفظ جہلا سے نکلا ہے جس کے معنیٰ ہیں "ان پڑھ" "بیوقوف" جولاہوں کے جذبات و احساسات کا خیال رکھتے ہوئے حکومت نے اسی بات کی اجازت دیدی کہ وہ اپنے آپ کو "مومن یا نورباف یا شیخ مومن یا صرف شیخ" کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء - ۱۹۲۱ء اور اسکے بعد کی مردم شماری بھی ہیں۔ جولاہوں کی ایک کثیر تعداد نے خود کو دوسرے مسلمانوں کیطرح "شیخ نورباف یا شیخ مومن" کے بجائے صرف "شیخ" لکھوایا۔

مسلم بنکر قہطانی QAHTANI لقب کا بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ بنکروں کے جدا مجد ابوایوب انصاری عربستان عربوں یا یمن کے اصل باشندوں سے تعلق رکھتے تھے جو قہطان جسے پرانی انجیل OLD TESTMENT میں جیکتان JECTAN یا جوکتان JUKTAN کہا گیا ہے، کے رہنے والے تھے لیکن ہندوستانی بنکر خال خال ہی اسے استعمال کرتے ہیں۔

بہار کے پٹنہ ضلع کے مانیر MA NER اور اسکے اطراف کے رہنے والے کچھ مسلم بنکر اپنے نام کے ساتھ "عارفی" لگاتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق بارہویں صدی عیسوی میں شیخ مومن عارف نامی صوفی نے اپنی پُرامن سماجی اور دینی سرگرمیوں کے لئے مانیر کو مرکز بنایا جو ایک بنکر خاندان سے تعلق رکھتے

فارسی لفظ بافندہ GAPENDA - بافکر BAFKER یا پارچہ باف عربی نساج NASSAJ اور حیک کا خطاب آجکل بہت کم استعمال ہوتا ہے اور صرف ہندی لفظ بنکر فی زمانہ زیادہ رائج و مستعمل ہے۔

شمالی مغربی سرحدی صوبے کے دیہاتوں میں فارسی لفظ بافندہ سے مختلف ایک پنجابی لفظ پاولی PAOLI بنکروں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بنکروں کے لئے مشرقی ہندوستان میں جولاہا کا لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

یہ تمام الفاظ بلا امتیاز پیشہ مسلم بنکروں کو ظاہر کرتے ہیں کیونکہ بنکر ہمیشہ بنکر ہی نہیں رہتا، بلکہ وہ ملازم، کاشتکار، محنت کش اور تاجر بھی ہو سکتا ہے۔

مختلف اصطلاحات جیسے سفید باف، (سفید بننے والا) قالین باف، شال باف، پشمینہ باف، زری باف، کناری باف، مسلم بنکروں کے لئے ان کی مخصوص صنعت کے لئے

استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح پٹنہ اور گیا کے علاقے میں فیتہ بننے والے مسلمانوں کو ہندو پٹوار PATWAR کے نام سے پکارتے ہیں جو پاٹوا PATWA کے پودے سے فیتہ بننے والوں کو ظاہر کرتا ہے۔

آجکل مسلم بنکروں کی ایک بڑی جماعت عام طور پر اپنے آپ کو انصاری کہتی ہے اور ان کا طبقہ مومن، مومن انصار یا صرف انصار کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔

مالیگاؤں میں مسلمانوں کی آمد اور مسلم بنکر

مسلمانوں کی آمد مغل بادشاہ عالمگیر شاہ ثانی نے ایک مراٹھا سردار نارو شنکر کو ناسک سمیت اٹھارہ پرگنے انعام میں دیئے تھے جن میں مالیگاؤں بھی شامل تھا۔ یہ بستی چونکہ مالی قوم کے افراد پر مشتمل تھی اس لئے "مالی گاؤں" کے نام سے موسوم تھی۔ نارو شنکر کی عمل داری اور زمینی قلعے کی تعمیر کے منصوبے کی بنا پر اسکی آبادی میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ راجہ نارو شنکر نے جب اپنی باقاعدہ فوج تشکیل دی تو اسی میں ایک دستہ مسلم سپاہ کا بھی رکھا۔ یہی وہ پہلے مسلمان تھے جنکے قدم اس سرزمین پر پڑے۔ یہ تمام سپاہی عرب النسل تھے۔ جنکی یادگاریں غریبد کی مسجد، یسین میاں کی مسجد و قبرستان اور قدیم عیدگاہ آج بھی موجود ہیں۔

حفیظ مالیگانوی نے اپنی تصنیف "نقوش" میں ان عرب سپاہیوں کو شمالی ہند کا باشندہ بتاتے ہیں جو "چاؤش" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن آپ نے اس ضمن میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ جبکہ درج ذیل شواہدان عرب سپاہیوں کا تعلق عربستان اور ریاست حیدرآباد سے ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) شمالی ہند کی سماجی کتب میں "چاؤش" لوگوں کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ایک گروہ قندھاری پٹھانوں کا ضرور موجود تھا جو شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے اور فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان پٹھانوں کی شجاعت، وضع قطع، اور سج دھج دہلی کے امراء اور رؤسا کو اسقدر پسند آئی کہ انہوں نے بھی اس کی تقلید میں ویسی ہی دھج اختیار کر لی اور بعد میں اس میں نت نئے اضافے ہوتے گئے جسکی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ میں ایک نیا طبقہ سماج میں ابھرا جو "بانکوں" کے نام سے موسوم ہوا۔

(۲) حیدرآباد کی نظام شاہی فوج میں ان عرب سپاہیوں کا ایک بہت بڑا دستہ موجود تھا جو "چاؤش" کہلاتے تھے۔ بزرگوں کی روایت سے معلوم ہوا کہ نظام نے خود نارو شنکر کو ان چاؤش سپاہیوں کا ایک دستہ تحفتاً عنایت فرمایا تھا۔

(۳) حیدرآباد کی قدیم بستی میں آج بھی ایک محلہ آباد ہے جو "چاؤش محلہ" کے نام سے مشہور ہے اس میں صرف انہی عربوں کے خاندان آباد ہیں جبکہ شمالی ہند میں اس نام کی کسی قوم کا سراغ نہیں ملتا۔

(۴) مالیگاؤں میں ایک "چاؤش" خاندان آج بھی موجود ہے جسکی آبائی جائداد عدن میں ہے۔ ان سے رجوع ہونے پر معلوم ہوا کہ چاؤش عربی النسل تھے جو ترک وطن کے بعد حیدرآباد آئے تھے۔ ان کا شمالی ہند سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

مندرجہ بالا شواہد اور دلائل کی بنا پر یہ کہنے میں کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ مالیگاؤں میں سب سے پہلے جو مسلم آئے وہ یہی چاؤش تھے۔ ان عرب سپاہیوں کے بعد کچھ تجارت پیشہ لوگ آئے جنکا تعلق بھی حیدرآباد ہی سے تھا۔ انکے بعد بعض خاندیسی مسلم خاندان بھی یہاں آکر آباد ہو گئے جن میں سے کچھ تو تجار تھے اور بعض راجہ نارو شنکر کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ منشی دادا میاں قطا کا تعلق ایسے ہی ایک سپاہی پیشہ خاندان سے تھا۔

مسلمانوں کا تیسرا بڑا قافلہ یوپی کے مہاجرین کا تھا جن کا ذکر آئندہ آئیگا۔

مقامی آبادی اور ہندو بنکر

راجہ نارو شنکر کے زینی قلعے کی تعمیر کے سلسلے میں تقریباً دس برس تک ہزاروں مزدور مصروف کار رہے جسکی بنا پر یہاں کی آبادی اور ضروریات زندگی میں یک لخت بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ان ضروریات کے پیش نظر مختلف پیشوں کے حامل اور دستکار اس بستی کیطرف متوجہ ہوئے جن میں بنکر بھی شامل تھے۔ یہ بنکر گون ناسک، ایولہ اور خاندیش کے بعض علاقوں کے ہندو بنکر تھے۔ جو عموماً کوشٹی KOSHTi کہلاتے تھے اسی علاقے کا مخصوص لباس مردوں کے لئے دھوتی، قمیص یا کرتا اور پگڑی تھا۔ عورتیں چولی اور ساڑی استعمال کرتی تھیں جنھیں لگڑا یا کاشٹا بھی کہتے ہیں۔ کاشٹا غالباً کوشٹی سے مشتق ہے ان لوگوں نے یہاں انھیں مصنوعات کی تیاری شروع کردی۔ یہی کوشٹی مالیگاؤں میں بنکروں کے سرخیل ہیں

مسلم بنکروں کی آمد

۱۹۵۷ء کی زبردست انقلابی تحریک کی ابتدا شمالی ہند صوبۂ متحدہ (اترپردیش) کے سرفروشوں نے کی جو بعد میں تمام شمالی علاقے میں پھیلتی چلی گئی۔ یہ مجاہدین وطن ایک امنڈتے ہوئے سیلاب کیطرح دہلی کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ لیکن شومئی تقدیر سے انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی اور انگریز ان پر غالب آگئے اس کے بعد ایک ایسا منحوس دور شروع ہوتا ہے کہ جسکی بنیاد مجاہدین کی خون آلود لاشوں پر رکھی گئی تھی۔

ان مجاہدین کا تعلق یو پی کی سرزمین سے تھا اسی بنا پر یہ علاقہ خاص طور پر انگریزوں کے انتقام اور غیظ و غضب کا نشانہ بنا۔ اور جہاں تک ان سے ہو سکا ظلم و ستم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی دار و گیر کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑا۔ باغیوں اور پرامن شہریوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ جو ہاتھ آیا سان پر چڑھا دیاگیا۔ چن چن کر   لوگوں کو قتل کیاگیا۔ اس بھڑکتی آگ میں بعض لوگوں نے اپنے ہاتھ بھی سینک لئے بقول مولوی محمد حسین آزاد

" ایسے عالم میں لوگوں نے اپنی ذاتی دشمنیاں بھی نکالیں اور جھوٹی شہادتیں اور مخبری کے ذریعے اپنے مخالفوں یا دشمنوں کو انگریزوں کے ہاتھوں قتل کروادیا"

یہ مصیبت قیامت سے کم نہ تھی۔ ہر طرف تباہی کا دیوتا تانڈو ناچ رہا تھا۔ ایسے عالم میں یہاں کے باشندوں کے لئے اپنی جانیں بچانے کا واحد راستہ "ہجرت" تھا۔

اس وقت شمالی ہند کے شورش زدہ علاقے کی بہ نسبت جنوبی ہند کا علاقہ خاصا پر امن تھا اور یہاں تک انگریزوں کے انتقام کے شعلے نہیں پہنچے تھے۔ اس لئے ان مہاجرین کی ایک بڑی جماعت نے جنوبی ہند کا رخ کیا اور اپنے وطن عزیز کو خیرباد کہتے ہوئے بے سروسامان کی حالت میں نکل پڑے۔ مہاجرین میں اعظم گڈھ۔ مبارکپور۔ مئو ناتھ بھنجن۔ بارہ بنکی۔ الہ آباد۔ بنارس کانپور اور لکھنؤ وغیرہ کے لوگ شامل تھے۔ جن میں اکثریت بنکروں کی تھی۔ بے انتہا تکالیف اور مصائب سہتے ہوئے یہ قافلہ بمبئی آگرہ روڈ کے ذریعے مختلف علاقوں سے گذرتے ہوئے کچھ لوگ گجرات کی سمت سورت اور احمد آباد نکل گئے۔ کچھ ناگپور اور کامٹی جا پہنچے۔ اور بقیہ شاہدہ، شیرپور، کاسودہ اور دھولیہ ہوتے ہوئے مالیگاؤں پہنچے۔ ان تمام متذکرہ بالا مقامات پر اس جماعت میں شامل خاندان قیام کرتے گئے۔ ان میں سے اکثر دھولیہ اور مالیگاؤں میں ٹھہر گئے بعض خاندان یہاں سے بھی آگے بڑھ گئے اور ایولہ، بھیونڈی ہوتے ہوئے بمبئی تک جا پہنچے۔ آج بھی ان تمام علاقوں میں ان مہاجرین کی اولادیں کم و بیش موجود ہیں۔ مالیگاؤں میں انکی آمد کا زمانہ ۱۸۵۸ءتا ۱۸۶۰ء کے درمیان کا ہے۔

مہاجرین اور مالیگاؤں

مالیگاؤں میں جو مہاجرین آباد ہوئے ان میں زیادہ تر اعظم گڈھ، مبارکپور، الہ آباد، بنارس، مئو ناتھ بھنجن، کانپور اور لکھنؤ کے باشندے تھے۔ جنکے خاندان آج بھی موجود ہیں اور جنکی رشتہ داریاں ابھی تک انکے آبائی وطن سے قائم ہیں اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

مالیگاؤں میں ٹھہرنے والے مہاجرین کو ماحول بڑا سازگار ملا۔ اول تو یہاں بنکر کم تھے۔ دوم ہندو بنکر کوشٹیوں سے انھیں رنگ سازی اور یہاں مستعمل کپڑوں کی اقسام کی معلومات اور

مزدوری اشیار کی فراہمی میں بڑی مدد ملی۔ سوم خام مال وافر مقدار میں اور سستے داموں میں ملتا تھا۔ کیونکہ خاندیش کا علاقہ کپاس کی پیداوار کا زبردست مرکز تھا۔

مہاجرین زیادہ تر کرتے اور پاجامے کے لئے سفید کپڑے پہنتے تھے۔ انہیں رنگ سازی سے واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی جبکہ مقامی لوگ رنگین کپڑوں کا استعمال بکثرت کرتے تھے۔ ان لوگوں نے مقامی غیر مسلم بنکروں سے رنگ سازی سیکھی۔ چونکہ یہ اپنے آبائی پیشے میں خود بھی زبردست مہارت رکھتے تھے۔ اس لئے بہت جلد رنگوں پر قابو پالیا اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے ساڑی میں بارڈر کے نام سے بیل بوٹے بننے شروع کئے جسکی بنا پر ساڑیوں میں ایک قسم کی کشش اور خوبصورتی پیدا ہوگئی جسکی وجہ سے مہاجرین کی مصنوعات بازاروں پر چھا گئیں۔ ان ہنر مندوں نے مختلف رنگ اور ڈیزائن تیار کئے جو بازار میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ انکی تیار کی ہوئی پگڑیاں، کپڑے، ساڑیاں اور چولیوں کے کپڑے، سنز، سنگم نیر، چاندوڑ، باگلان، مستانہ، ناسک اور اطراف و جوانب میں صارفین کی نگاہوں سے مرکز بن گئے، ان زبردست کامیابیوں نے ان کے دلوں کو نئے حوصلوں سے ہمکنار کیا۔ اس وقت تک تمام اقسام کے کپڑے ہنڈلوم پر تیار کئے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہاں کی صنعت نے اس قدر ترقی کی کہ ایولہ جیسا مشہور شہر جسکی پگڑیوں کی مثال نہیں ملتی تھی مالیگاؤں کے آگے بےبس نظر آنے لگا اور ایک وقت وہ آیا کہ ایولہ کی صنعت پارچہ بافی نے تقریباً دم توڑ دیا۔

یہ سب تو ہوا لیکن ان کی مصنوعات زیادہ منافع بخش ثابت نہ ہوسکیں اور ان کی اقتصادی حالت میں کو نمایاں تبدیلی اور سدھار نہ ہوسکا۔ اور معاشی اعتبار سے یہ کمزور ہی رہے۔

مالیگاؤں کی صنعت پارچہ بافی میں پاور لوم کی آمد سے ایک زبردست انقلاب آیا۔ سب سے پہلے محلہ اسلام پورے کے باشندے حافظ فقیر محمد مرحوم نے پاور لوم خریدا۔ یہ تقریباً ۳۳-۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ اس وقت شہر میں بجلی نہیں آئی تھی یہ لوم انجن سے چلائے جاتے تھے۔ بعد میں اسلام پورے ہی کے باشندے یوسف اگادی نے خریدے۔ اس کے بعد مشہور تاجر سلیمان سیٹھ نے اپنا کارخانہ لگایا اس زمانے میں ایک لوم کی قیمت پچاس روپے تھی۔ لیکن لوگوں کے معاشی حالات ایسی نہ تھی کہ اس قیمت میں بھی لوم خرید سکیں۔ ۱۹۳۴ء میں بجلی آئی اور ۱۹۳۵ء میں میونسپلٹی کی جانب سے اسٹریٹ لائٹس کا بندوبست ہوا۔ یہ پاور ہاؤس سرکاری نہ تھا۔ بلکہ ایک پرائیویٹ کمپنی لمیٹڈ کا تھا حالت یہ تھی کہ اسے کنزیومرس میسر نہیں تھے۔ اس کمپنی نے ایک اسکیم تیار کی اور لوگوں کو قرض دیکر لوم خریدنے پر آمادہ کیا تاکہ اسکی بجلی کی صارفین بڑھ سکیں۔ یہ اسکیم کہاں تک کامیاب ہوئی اس کا علم نہ ہوسکا لیکن رفتہ رفتہ پاور لوم بڑھنے لگے اور آج تقریبا ۳۰ ہزار کے قریب پاور لوم شہر میں دن رات چلتے ہیں۔ جن پر رنگین ساڑیوں کے علاوہ گرے کاٹن، پاپلین اور کچھ حد تک ٹیری کاٹ کی بنائی ہوتی ہے۔ یہاں کی مصنوعات نہ صرف سارے ہندوستان میں استعمال ہوتی ہیں بلکہ غیر ممالک کو بھی ایکسپورٹ کیجاتی ہیں

مسلم بنکر اور انکے القاب

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلم بنکر اپنے لئے مختلف القاب پیشہ وارانہ خطاب یا سرنیم استعمال کرتے تھے جن میں انصاری، مومن، شیخ اور انصار زیادہ مستعمل تھے۔

مالیگاؤں آنے والے مہاجرین مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جن میں مبارکپور کے بنکر اپنے نام کے بعد انصاری لگاتے تھے (یہ روایت آج بھی قائم ہے) مئو ناتھ بھنجن کے اکثر بنکر شیخ تھے۔ کانپور کے بنکر اپنے لئے ایوّبی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مومن کا لفظ استعمال کرنے والے بنکروں کا سراغ نہ مل سکا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں آکر بنکروں کے مزاج میں جیسے بے نکری اور اعتدال آگیا تھا اور انہوں نے ان القاب یا خطاب کے استعمال کے سلسلے میں کوئی

خاص رویہ نہیں بنایا اور نہ ہی پابندی کے ساتھ اپنے ناموں سے منسلک رکھا۔ اس وجہ غالباً یہ تھی کہ یہاں انہیں کی آبادی تھی انہیں کا سماج تھا لہذا ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہ تھی اور نہ پیشہ ورانہ شناخت کی ضرورت پیش آتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لوگ اپنے نام کے ساتھ شیخ استعمال کرتے تھے مثلاً شیخ مدار اللہ مدعا اور منشی شیخ شعبان وغیرہ جبکہ یہ خالص بنکر تھے ۔

القاب کیضرورت اور استعمال

انیسویں صدی کے اواخر تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ ان مسلم بنکروں نے القاب کا خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا ہو۔ اگرچہ اسی زمانے میں ہندو بنکر کوشٹی بھی موجود تھے لیکن وہ اپنے مذہب اور وضع قطع کے اعتبار سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ اسلئے شناخت قائم کرنیکا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن جب یہاں کی آبادی میں جنوبی ہند کے دیگر علاقوں مثلاً حیدرآباد، دکن اور خاندیش کے لوگوں کا اضافہ ہوا تو اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ مسلم بنکروں کو اپنی علیحدہ شناخت قائم کرنے کے لئے کسی لقب، خطاب یا سرنیم SIR NEME کا انتخاب کر لینا چاہیئے کیونکہ خاندیش اور دکن سے آنے والے افراد اپنے ناموں کے ساتھ "شیخ" یا "سید" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جیسے شیخ قمرالدین قمر تنبولی، شیخ عبدالکریم عطا اور شیخ محمد امیر میر وغیرہ۔ بعض خاندیش مسلمان اپنے لئے " خان" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ جیسے امیر خان قریشی، عبدالکریم خان شرر اور تاج خان جمیل وغیرہ۔ ان تمام نوواردوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی لفظ جڑا ہوا تھا۔ اور یہ تمام مسلمان ہونے کے ناطے خود کو مسلم یا مومن کہتے تھے اسی بنا پر مہاجرین بنکروں نے مومن اور شیخ کے الفاظ انکے لئے چھوڑ دیئے۔ "انصاری" کا انتخاب کیا۔ لیکن کچھ خاندان ایسے ضرور تھے جو خود کو شیخ ہی کہتے تھے ۔

اس سلسلہ میں ایک مسئلہ اور سامنے آیا کہ یوپی اور خاص طور سے مبارکپور کے بنکر اپنے ناموں کے بعد انصاری لگاتے ہیں اسلئے مالیگاؤں کے پہلے انصاری لگانا شروع کر دیا تاکہ مبارکپور اور مالیگاؤں میں انفرادی شناخت قائم رہ سکے۔

آج وہ لوگ بھی جو اس سے ناواقف ہیں اپنے ناموں کے پہلے ہی انصاری لگاتے ہیں ۔

بھیونڈی میں صورت حال اس سے مختلف تھی۔ وہاں خاندیسی شیخ، سید یا خاں نہ ہونے کے برابر تھے جبکہ وہاں انکے مقابل کوکنی مسلمان تھے جو دلوائی، پاٹل، فقیہ اور اسی طرح کے القاب سے ملقب تھے اسلئے یہاں کے بنکروں نے اپنے لئے "مومن" کا لفظ منتخب کیا اور آج حالت یہ ہے کہ بھیونڈی میں مسلم بنکروں کے لئے صرف "مومن" اور مالیگاؤں میں صرف "انصاری" کا لقب استعمال ہوتا ہے۔

غرض مالیگاؤں جو ابتدا میں مالی قوم کی ایک مختصر سی بستی تھی، راجہ نارو شنکر اور بعد میں مسلم بنکروں کی آمد سے ایک بڑے شہر اور صنعتی مرکز میں تبدیل ہو گئی جسے آج بھارت کا مانچسٹر بھی کہا جاتا ہے یہ انہیں بنکروں کے خون جگر کی نمود ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر بے سروسامانی کی حالت میں مہاجرین کی حیثیت سے یہاں آ گئے تھے۔

کتابیات

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں اور رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں خاص طور سے حسن نشاط انصاری صاحب کا بیحد مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنا بھرپور تعاون پیش کیا ۔

(1) ORIGIN AND APPEBLATION OF THE MOMIN
DR. HASAN NISHAT ANSARI
LEC. IN HISTORY MOGADH UNIVERCITY BIHAR
JOURNAL OF THE BIHAR RESEARCH SOCIETY
VOLUME L VII JAN. DEC 1971
PART I - IV P.P. 133 : 148

(۲) تاریخ شہر مالیگاؤں ۔ مصنفہ مولوی عبدالمجید وحید، مطبوعہ ۱۹۲۴ء

(۳) "نقوش" تذکرہ مالیگاؤں، مولفہ حفیظ مالیگانوی مطبوعہ ۱۹۷۹ء

(۴) مشرقی تمدن کی آخری جھلک ۔ از عبدالحلیم شرر ۔ مکتبہ جامعہ ایڈیشن

(۵) فسانہ آزاد از پنڈت رتن ناتھ سرشار " "

(۶) آب حیات کے لطیفے ۔ از مولانا حسین آزاد، دیباچہ از آغا محمد باقر۔

وہ مقامی بزرگ حضرات جنہوں نے گرانقدر معلومات ہمیں فرمائیں۔ مولانا محمد عثمان مدظلہ ۔ (۲) حضرت احسن مالیگانوی۔ (۳) حضرت ادیب مالیگانوی۔ (۴) حکیم چراغ حسن صاحب (۵) حضرت کوکب۔ (۶) ڈاکٹر محمد فاروقی صاحب (مرحوم) ●●

یوسف ناظم

چند مشاہیر عالم

[قسط دوم ــــ یہ قسط خود کفیل ہے اور اسے پڑھنے کیلئے ضروری نہیں ہے کہ پہلی قسط کا مطالعہ کیا ہی جائے ۔ بلکہ کیا تعجب کہ وہ لوگ جو پہلی قسط پڑھ چکے ہیں شاید اسے نہ پڑھیں]

ایڈولف ہٹلر : یہ جرمنی کے رہنے والے تھے ۔ صرف ۵۶ سال زندہ رہے اگر اور کچھ دن زندہ رہتے تو دنیا کا نقشہ وہ نہ ہوتا جو اب ہے ۔ (اب بھی کافی بُرا ہے لیکن یہ نقشہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہو سکتا تھا) ایڈولف ہٹلر کے والد کفش دوزی کا کام کرتے تھے اس لئے ہٹلر نے ساری دنیا کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھا ۔ انہوں نے پوری دنیا فتح کرنے کا پراجکٹ بنایا تھا ۔ اور بہت ساری دنیا فتح بھی کر لی تھی ۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ کارِ جہاں دراز ہے اور یہ کہ کارِ دنیا کسے تمام نکرد ۔ انہوں نے عین موقعہ پر خودکشی کر لی ۔ اپنی غیر منکوحہ بیوی کو بھی اس کام میں شریک رکھا ۔ (دونوں میں ہم خیالی بہت تھی ۔) ان غیر منکوحہ بیوی کا نام ایوابراِن تھا ۔ ہٹلر نازی پارٹی کے صدر تھے ۔ نازی پارٹی کے ذمّہ ان دنوں بہت کام تھے خاص طور پر یہودیوں کے قتل کی ذمّہ داری اسی پارٹی پر تھی ۔ ایڈولف ہٹلر اگر پیدا نہ ہوتے تو دنیا دوسری جنگِ عظیم سے محروم رہتی پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم میں صرف ۲۰ ، ۲۲ سال کا وقفہ تھا ۔ لیکن اب ۴۰ سال گذر گئے ہیں اور تیسری جنگِ عظیم کا پتہ نہیں ۔ دنیا میں قحط الرجال ہی قحط الرجال ہے ۔ جنگی مسائل پر گہری نظر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ اگر ہٹلر صرف انگلستان کو فتح کر کے گھر بیٹھ جاتا اور اسٹالن گراڈ کا رُخ نہ کرتا تو وہ خود اور اس کی غیر منکوحہ بیوی ایوابراِن دونوں ابھی اور زندہ رہتے (ہمیں اس خاتون کی وفات کا بے حد افسوس ہے) بیویوں کو شوہروں کے ساتھ ضرور تعاون کرنا چاہئے لیکن بس ایک حد تک)

ایڈولف ہٹلر بہت اچھے مقرر بھی تھے اور اگر یہ شعر و ادب میں دلچسپی لیتے تو مشاعروں کے بہترین اناؤنسر بن سکتے تھے ۔ کتابوں کی رسم اجراء کی تقاریب میں بھی یہ بہت کارآمد ثابت ہوتے ۔ ایڈولف ہٹلر کی ہر بات بڑی تھی ، بڑے ادارے ، بڑی فوج ، بڑے بول صرف مونچھیں چھوٹی تھیں ۔ یہ مونچھیں انہوں نے چارلی چپلن سے سیکھی تھیں ۔ اور سوتے وقت بھی ان مونچھوں کو علیحدہ نہیں کرتے تھے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایڈولف ہٹلر اور چارلی چپلن کا سنہ پیدائش ایک ہی ہے ۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر مسٹر مسولینی ان کے خاص دوست تھے ۔ لیکن انہیں خودکشی کا موقعہ نہیں ملا ۔ خودکشی سے پہلے ہی انھیں مار ڈالا گیا ۔

ایڈولف ہٹلر کے نام پر جتنے خون اور قتل لکھے گئے ہیں اتنا بڑا اسکور کسی اور شخص کا نہیں ہے ۔

چارلس ڈارون :

چارلس تو انگلستان میں بہت پیدا ہوئے اور اب بھی رُکے نہیں ہیں لیکن ان سب چارلسوں میں چارلس ڈارون بہت اچھے اور نیک آدمی تھے ۔ منکسر المزاج بھی مشہور تھے ۔ حالانکہ پڑھے لکھے آدمی تھے اور چاہتے تو بد دماغ یا کم سے کم بے دماغ ہو سکتے تھے ۔ (بے دماغی کے معنی سمجھنے کے لئے دیکھو کلیاتِ میر) انھوں نے نیچر کے مطالعہ میں اپنی زندگی گذار دی ۔ جگہ جگہ گھومے ۔ یہ بہت پرانے نہیں انیسویں صدی کے آدمی ہیں ۔ انہوں نے بن مانس دیکھے ، بندر دیکھے اور آدمی دیکھے ۔ جب آدمی میں انہیں دُم نظر نہیں آئی تو یہ چونکے اور غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے کہ آدمی ، بندر کی شکل میں یہاں آیا ہوگا ۔ لیکن چونکہ وہ اپنے دنیوی مشاغل کی وجہ سے اپنی دُم کی حفاظت نہیں کر سکا اس لئے اس کی دُم نے جواب دے دیا ۔ ان کا یہ نظریہ جب ، اخباروں اور رسالوں میں چھپا تو سائنسدانوں نے بالعموم اور اہلِ کلیسا نے بالخصوص ان پر بے تحاشہ حملے کئے ۔ (ایسے حملے نہیں جیسے کہ ان دنوں ریاستوں کے گورنروں اور چیف منسٹروں پر ہوتے ہیں ۔ کسی نے بھی ان کا کالر پکڑ

کر نہیں کھینچا اور نہ کسی نے ان سے دھول دھپہ کیا۔ کیوں کہ وہ لوگ سائنس داں تھے اور اہلِ کلیسا۔ ان کا کام پڑھنا لکھنا تھا۔ الیکشن ہارنا جیتنا نہیں تھا۔) ۔ ڈارون نے ان تنقیدوں کا کوئی بُرا نہیں مانا اور نہ اپنے نظریے کی تائید میں کوئی گروپ بنایا۔ وہ منکسر المزاج تھے اور آخر تک اسی مزاج کے رہے۔ (وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جن کا مزاج ہی نہیں ملتا۔) آدمی کا ڈپلی کیٹ یا متبنیٰ قرار دینے میں ڈارون سے ممکن ہے کوئی سہو ہوا ہو لیکن بیسویں صدی کے واقعات وحالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چارلس ڈارون سے اس موازنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ اکبر الہ آبادی اگر آج زندہ ہوتے تو شاید اپنے شعر پر نظر ثانی کرتے۔ شعر تو ہمیں یاد نہیں لیکن اس شعر میں ہے۔ بوزنہ کا ذکر اور وہ بھی ڈارون کے تعلق سے ـــــ آدمی کی دُم تو اس لئے ضائع ہوئی کہ اسے ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرنا تھا۔ کہاں کہاں اپنی دُم سنبھالتا پھرتا ـــ اور اگر بس میں چڑھتے وقت کسی کا پاؤں اس پر پڑجاتا تو ؟؟

لیڈی ہیملٹن : لیڈی ہیملٹن نے بھی ان مشاہیرِ عالم خواتین میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں ناولیں لکھی اور فلمیں بنائی گئی ہیں۔ (یہ ایک خاص قسم کا اعزاز ہوتا ہے)۔ لیڈی صاحبہ موصوفہ، نپولین کی ہم عصر تھیں لیکن ان کا معاشقہ، نپولین سے نہیں، نپولین کے حریف لارڈ نیلسن سے تھا۔ اور جب نپولین اور نیلسن دونوں کا مقابلہ، میدانِ جنگ میں ہوا تو فتح نیلسن کو ہوئی۔ (اس میں لیڈی صاحبہ کا ہاتھ تھا یا نہیں، ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا۔) یہ بہت خوبصورت خاتون تھیں۔ لارڈ نیلسن سے صرف ۴ سال چھوٹی تھیں لیکن بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔ (اپنی شادابی کی وجہ سے)۔ ان کا پہلا نام ایما تھا اور یہ لیڈی ہیملٹن اس لئے نہیں کہ ان کے چچا سر ولیم ہیملٹن تھے جن سے موصوفہ نے شادی کی تھی۔ (بھتیجیوں کا چچاؤں سے شادی کرنا منع نہیں ہے)۔ چچا نیپلز میں ایمبسیڈر تھے اور وہیں لیڈی موصوفہ لارڈ نیلسن سے ملیں۔ نیلسن بڑا قابل شخص تھا۔ معاشقے اور جنگ کا ماہر۔ یہ دونوں میدانوں میں کامیاب رہا۔ کمال یہ ہے کہ نیلسن کی دائیں آنکھ اور دایاں بازو، دونوں چیزیں نہیں تھیں۔ یہ میدانِ جنگ میں ضائع ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود لیڈی ہیملٹن سے معاشقے میں انھیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ (اسرائیل کے وزیر جنگ موشے دایان کی بھی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔ لیکن ہمیں ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ وہ دائیں آنکھ تھی یا بائیں لیکن ان دونوں کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا کیوں لارڈ نیلسن کی زاویہ نگاہ بہرحال بہتر تھا)

لیڈی ہیملٹن اداکارہ بھی نہیں اس لحاظ سے ان کے پاس کافی رقم ہونی چاہیے

تھی لیکن اپنے شوہر اور اپنے خیر خواہ لارڈ نیلسن کی وفات کے بعد، یہ بہت مقروض ہوگئیں (عادتیں ہی ایسی تھیں)۔ انہیں حراست میں لیا گیا۔ (ادھر کے ملکوں میں ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ آج کل صوفیہ لارین زیرِ حراست ہیں۔ یہ کوئی اچھی مثالیں نہیں ہیں۔) لیڈی ہیملٹن کی وفات بڑی کسمپرسی کی عالم میں ہوئی۔ ۵۵ کی بھی نہیں ہوئی تھیں کہ مر گئیں۔ اگر کسی دفتر یا کمپنی میں ملازمت کرتی ہوتیں تو ۵۸ سال تک تو سروس ہی کرتیں اور اس کے بعد بھی ان کی مدت ملازمت میں توسیع ہو جاتی یا کسی کارپوریشن میں بھیج دی جاتیں۔

ایڈورڈ فٹز جیرالڈ: انگریز تھے اور اپنی مادری زبان میں شاعری کرتے تھے لیکن اپنی شاعری کی وجہ سے یہ مشاہیرِ عالم نہیں بن سکے۔ یوں بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کی شاعری پسند ہی کی جائے۔ انگریز شاعری پسند کرتے ہیں لیکن ایک مناسب حد تک۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان کے اتنے شاعر نہیں ہیں۔ جتنے کہ اور زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اُردو میں تو ہر شخص کو شاعری کی اجازت ہے ـــ جب ایڈورڈ فٹز جیرالڈ اپنی شاعری کو ذریعہ عزت نہیں بنا سکے تو انھوں نے فارسی پڑھ لی اور اتنی پڑھی کہ عمر خیام کو سمجھنے لگے ـــ انہوں نے عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ کیا۔ اور پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ یہ مشاہیرِ عالم بن گئے۔ بارہویں صدی کے فارسی شاعر کو انیسویں صدی میں انگریزی زبان میں زندہ کرنے کا سہرا فٹز جیرالڈ کے سر ہے۔ (فٹز جیرالڈ کی تصویریں ہم نے دیکھی ہیں کافی وجیہہ شخص معلوم ہوتے ہیں۔) انہوں نے کئی اور فارسی شاعروں کا کلام بھی انگریزی زبان میں منتقل کیا ہے۔ لیکن عمر خیام کی رباعیوں کے ترجمے کی بات ہی اور ہے۔ یہ واقعی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی میں رباعیاں ہوتی بھی نہیں ہیں اس لئے ہاتھوں ہاتھ لی گئیں اور سر آنکھوں پر رکھی گئیں۔ فٹز جیرالڈ غالباً ہندستان نہیں آئے۔ لیکن وہ اگر آتے بھی تو انہیں اس وقت یہاں اچھی رُباعیاں نہیں ملتیں۔ (یہ بعد میں وضع ہوئیں)۔ فٹز جیرالڈ ترجمے کے فن میں اس لئے کامیاب ہوئے کہ فارسی اور انگریزی زبانوں میں سے ایک زبان ان کی مادری زبان تھی۔ اب کچھ لوگ اردو شاعری کا ترجمہ انگریزی میں کرتے ہیں۔ اور اسے لندن سے آفسیٹ پر چھپواتے ہیں لیکن ان کی مادری زبان نہ تو اُردو ہوتی ہے نہ انگریزی۔ ان کے ترجمے سے شاعری کی روح تلملا جاتی ہے اور اگر شاعر زندہ رہا تو مرنا پسند کرتا ہے۔

فٹز جیرالڈ، ورڈزورتھ، ٹینی سن اور جان میسفیلڈ کی طرح پوئٹ لارئیٹ (ملک الشعراء) نہیں بن سکے لیکن تھے وہ اسی مرتبے کے اہل۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کسی کوئن کی نظر ان پر پڑی نہیں ۔ پڑتی تو ٹھہر جاتی ۔

مادام کیوری : جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورتیں کبھی کسی دوسرے کے ساتھ مل کر کوئی کام نہیں کر سکتیں ۔ انہیں میڈم کیوری اور پیئری کی مثال سے عبرت حاصل کرنی چاہئے ۔ ان دونوں نے مل کر ریڈیم کی ایجاد کی ۔ اور مشترکہ طریقے پر نوبل پرائز حاصل کیا یعنی دونوں کو نوبل پرائز ملا (نوبل پرائز میں نصف بہتر نہیں ہوا کرتا ۔) نوبل پرائز اکثر و بیشتر موقعوں پر لوگوں میں تقسیم ہوتا رہا ہے ۔ (نوبل پرائز بھی کچھ کم نہیں ہوا کرتا) ۔ مادام کیوری کی طبیعت میں ضد کا مادہ زیادہ تھا ۔ وہ اس آدھے نوبل پرائز سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکیں ۔ سالم نوبل پرائز کی فکر میں وہ کبھی نچلی نہیں بیٹھیں اور آخر کار نوبل پرائز کمیٹی کو مجبوراً انہیں پورا انعام دینا پڑا ۔ اس طرح نوبل پرائز حاصل کرنے والوں کی فہرست میں مادام کیوری تنہا ہیں جنھیں ایک صحیح ایک بٹے دو نوبل پرائز ملا ہے ۔ انھوں نے طبیعات اور کیمیا کے میدان میں اتنا دماغی کام کیا کہ ۶۴ سال کی عمر میں ان کی وفات واقع ہوگئی ۔ فرانس میں شاعری ضرور ہوتی ہے کہ لیکن فرانسیسی شاعروں کو یہ توفیق کبھی نہیں ہوئی کہ نظم میں کسی کی تاریخ وفات کہیں ۔ (یہ بہت مشکل کام ہے) مغربی ممالک میں علم جفر پایا جاتا ہے لیکن یہ صرف غیر ضروری موقعوں پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ ہندستان میں اگر کسی اتنی بڑی خاتون کا انتقال ہوتا تو تاریخ ہائے وفات کا ایک دیوان مرتب ہو جاتا ۔ (یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کئی تاریخیں غلط ہوتیں)

خوبصورت خواتین کا اہلِ دماغ ضروری نہیں ہے لیکن مادام کیوری اس سے مستثنیٰ تھیں ۔ وہ طبیعات ، کیمیا اور حسن تینوں کی ماہر تھیں ۔ ریڈیم جیسی خوشنما چیز انھیں کی یادگار ہو سکتی ہے ۔

سیموئیل جانسن : انھیں ہم بہت مانتے ہیں ۔ بے حد قابل ، ذہین اور محنتی آدمی تھے کہتے ہیں بہت شریف اور رحمدل آدمی بھی تھے ۔ لیکن ان کی شرافت اور رحمدلی سے ہمیں کیا لینا دینا ہے ۔ (شریف آدمیوں سے تو آج کل صرف ہمدردی کی جا سکتی ہے) ۔ انہوں نے انگریزی زبان کی لغت تیار کی ۔ اس وقت انگریزی زبان میں اتنے الفاظ نہیں تھے لیکن پھر بھی بہت تھے ۔ لغت کی تیاری کے بعد وہ چاہتے تو چپ چاپ بیٹھ جاتے لیکن انھوں نے ایک نہیں ، دو نہیں ، پوری دس جلدوں میں تذکرۂ شعرائے انگلستان لکھا ۔ اس لئے ہم انھیں انگلستان کا شبلی نعمانی سمجھتے ہیں ۔ شبلی نعمانی کو ابوالکلام آزاد ملے اور سیموئیل کو بوسویل ۔ بوسویل کی وجہ سے جانسن کو بذاتِ خود یادداشتیں یا حالات لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ ان کے دوست نے ان کی سوانح عمری لکھی ۔ اور اتنی طویل لکھی کہ یہ سوانح عمری ایک جلد میں نہیں سما سکی (پچھلے زمانے میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں ایک جلد میں کبھی ختم نہیں ہوئیں ۔)

سیموئیل جانسن کے تعلق سے مشہور یہ ہے کہ ان کی قابلیت کی شہرت سن کر اس وقت کے شاہِ انگلستان ان سے ملنا چاہتے تھے ۔ (اس وقت ہمارے حساب سے دوسرے یا تیسرے جارج برسرِ حکومت ہوں گے) ۔ خود جانسن کو بھی شاہِ انگلستان سے ملنے کا اشتیاق تھا ۔ (یہ ہوتا ہے) لیکن دونوں اپنی جگہ مصر تھے کہ میں بلاؤں اور وہ نہ آئیں یا میں ملنے جاؤں اور وہ نہ ملیں (یہ بھی ہوتا ہے) اس لئے دونوں ہی اس فکر میں تھے کہ کسی جگہ اچانک ملاقات ہو جائے تو اس میں دونوں کی بہتری ہے ۔ ایک دن شاہ انگلستان کو یہ خبر ملی کہ اس وقت جانسن فلاں لائبریری میں موجود ہیں ۔ شاہ انگلستان نے فوراً لباسِ فاخرہ پہنا (یوں بھی شاہوں کا ہر لباس ، لباسِ فاخرہ ہی ہوا کرتا ہے) اور فلاں لائبریری پہنچ گئے ۔ لائبریری کے ریفرنس ہال میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا اور جب شاہ انگلستان جانسن کی طرف بڑھے تو جانسن تقریباً زمین بوس ہو گئے ۔ (زمین بوس ہونا ان دنوں منع نہیں تھا) اور شاہ انگلستان کو مخاطب ہو کر کہا کہ میں آپ سے مل کر اتنا مسرور ہوا ہوں کہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے انگریزی زبان میں مناسب الفاظ نہیں پاتا ۔ اس لئے آپ اجازت دیں تو میں لاطینی زبان کا سہارا لوں ۔ شاہ انگلستان مسکرائے اور بولے ۔ لاطینی زبان میں بول لو ۔ ہم سمجھتے ہیں ۔ (اگر یہ لطیفہ نہیں واقعہ ہے تو اس گفتگو کے بعد یقیناً دونوں نے لاطینی زبان ہی میں ایک دوسرے کی خوب خوب تعریفیں کی ہوں گی)

سیموئیل جانسن سر نہیں بنے لیکن جانسن جیسے لوگ دوسروں کے دئیے ہوئے خطابوں پر نہیں اپنی لکھی ہوئی کتابوں پر زندہ رہتے ہیں ۔ خطابوں اور کتابوں کے اس فرق کو پتہ نہیں کب سمجھا جائے گا ۔

سر ونسٹن چرچل : برطانیہ عظمیٰ کے وزیرِ اعظم تھے اور ایک مرتبہ ہی نہیں دو مرتبہ وزیرِ اعظم بنے ۔ جس زمانے میں یہ وہاں کے وزیرِ اعظم تھے ہمارا ملک برطانیہ کی ایک نو آبادی کی حیثیت رکھتا تھا (اتنی زیادہ آبادی کی نو آبادی ہندستان کے علاوہ کوئی تھی بھی نہیں) اس لحاظ سے سر ونسٹن چرچل ہمارے حکمرانوں میں سے تھے ۔ شروع شروع میں کسی اخبار کے نامہ نگار تھے اور جنگی معاملات کو قلمبند کیا کرتے تھے ۔ میدانِ جنگ پر حاضر رہنا ضروری تھا ۔ کسی جنگ میں یہ فلیسیم کے ہاتھ پڑ گئے لیکن حراست سے بھاگ کھڑے ہوئے ۔ (ان دنوں وہ دبلے رہے ہوں گے) ۔ وزارتِ عظمیٰ انہیں یونہی نہیں مل گئی ہوگی ۔ اس دوران کے

ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ رات میں کسی نے ٹیلی فون پر ہدایت دی اور وہ صبح سویرے کوٹ پتلون ڈال کر حلف اٹھانے چلے گئے۔ یہ وزارت ان کی محنت کی کمائی اور قابلیت کا اعتراف تھا۔ ونسٹن چرچل ایک مرتبہ الیکشن میں بُری طرح ہارے بھی لیکن انہوں نے پرواہ نہیں کی اور اسی کی رفتار سے سگار پیتے رہے جس رفتار سے پہلے پیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے سگار کی صنعت کو بہت نقصان پہونچا۔ کئی کارخانے تو بند ہی ہو گئے۔ انھوں نے سگار صرف پئے گنے کبھی نہیں۔ سگار نوشی میں دل وجان سے منہمک ہونے کے باوجود یہ لکھنے پڑھنے سے کبھی نہیں گھبرائے۔ پڑھتے تو خیر تھے ہی لیکن اس سے زیادہ لکھتے تھے۔

انہوں نے اتنا لکھا کہ نوبل پرائز کمیٹی کے اراکین پریشان ہو گئے۔ اور انہیں ادب کا ایک نوبل پرائز پیش کر دیا لیکن یہ نہیں مانے اور اس کے بعد بھی لکھتے رہے۔ کہا جاتا ہے جس لائبریری میں سر ونسٹن چرچل کی کتابیں نہیں ملتیں انہیں لائبریری نہیں، بک اسٹال کہا جاتا ہے۔ کم ضخامت کی کتابیں لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ کتاب کے حجم ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ چرچل صاحب کی تصنیف ہو گی۔ خوش مزاج آدمی تھے اور چرٹ کے تلخ تمباکو نے ان کے حس مزاج پر بُرا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اپنی استعداد کے مطابق مذاق کر لیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ہند: ستانیوں کو ابھی سو سال آزادی نہیں ملنی چاہئے۔ اخیر عمر میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ لیکن انھیں اپنے بوڑھے ہونے کا مطلق احساس نہیں تھا۔ خالص سیاسی آدمی تھے۔ سوٹ بہت اچھے پہنتے تھے اور دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ درزی کے سلے ہوئے ہیں۔ سوٹ پہن کر جب بھی پارلیمنٹ میں یا ہائیڈ پارک میں بولنے کھڑے ہوتے انھیں دیکھتے ہی رہ جاتے۔

کابلی خان : کابلی خان، الگ ہی قسم کے خان تھے۔ یہ نہ تو تحمل حسین خان قسم کے خان تھے اور نہ بڑے غلام علی خان کی طرح کے خان۔ یہ خان خطابی بھی نہیں تھے۔ (خان خطابی ہوتے تو گھر بیٹھے اور منصب پاتے) ان کی یاد ہمیں اس لئے آئی کہ کچھ دن پہلے ہمارے ہاں یہ بات مشہور ہوئی یا یوں کہئے کہی گئی کہ اُردو منگولوں کی زبان ہے۔ کابلی خان چونکہ منگولوی تھے۔ اس لئے ہم نے سوچا ان کے خاندان میں ضرور اردو بولی جاتی ہوگی۔ ان کا شجرہ خاندانی دیکھا تو معلوم ہوا چنگیز خان ان کے دادا جان تھے۔ ان کی زبان کے بارے میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ لوگ صرف بندوق سے بات کرتے تھے۔ اور اردو تو بالکل ہی نہیں جانتے تھے۔ (اتنی میٹھی زبان ان کی زبان پر کیسے چڑھتی۔) کابلی خان کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جنگجو ضرور تھے اور انہوں نے اپنے دادا جان کے نامکمل کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا۔ یعنی ملک چین کو فتح کیا تھا لیکن یہ علوم وفنون کی سرپرستی بھی کرنا جانتے تھے اور انھوں نے چین میں بدھ مذہب کو پھیلایا تھا۔ (ہماری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں اور اب تک بند نہیں ہوئی ہیں)۔

اردو اگر منگولوں کی زبان تھی تو منگولوی آپس میں ضرور لڑتے بھی ہوں گے اور اگر اردو منگولوں کی زبان نہیں تھی تو انہوں نے اتنی فتوحات کیسے کیں۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے اہم سوالات ہیں جو ہمارے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے جب تک ہم کسی منگولوی ادیب یا محقق سے مل کر ان سوالات کا جواب حاصل نہیں کر لیتے ہمیں چین نہیں آئے گا۔

یہ اور بات ہے کہ اگر اردو منگولوں کی زبان ہے تو اس سے زیادہ قبیح بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسے واپس کر دیا جانا چاہئے۔

آل رسول نقوی

جوتا

میں ایک جوتا ہوں۔ ادنیٰ۔ بے جان۔ ساری دنیا مجھکو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ برے نام سے یاد کرتی ہے۔ مگر میرا خمیر اس مٹی سے اٹھا ہے جس میں ایثار و منکسر المزاجی کی ایک عظیم روح پوشیدہ ہے دنیا میں مجھے کتنی ہی ذلت کیوں نہ اٹھانا پڑے مگر میں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے کسی کے خلاف ایجی ٹیشن نہیں کرتا، نعرے نہیں لگاتا، مرن برت نہیں رکھتا، گھیراؤ اور ہڑتال نہیں کرتا اور ہتک عزت کے دعوے کے لئے سپریم کورٹ کے دروازے پر دستک نہیں دیتا۔ عدم تشدد پر میرا ایمان ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ متشددانہ ذہنیت رکھنے والے دنیا میں کبھی فاتح اور کامران نہیں ہو پاتے۔

کیا امیر کیا غریب، کیا بادشاہ کیا فقیر، میں ہر ایک سے قریب۔ لوگ اپنی ٹوپی کی اتنی فکر نہیں کرتے جتنی کہ میری، تو وجہ کیا؟ یہی کہ میں انسان کی ضروریات زندگی کا ایک اٹوٹ انگ ہو کر رہ گیا ہوں۔

میری ذات سے ایسے ایسے محاورے وابستہ ہیں کہ جن کے بغیر ادب نامکمل ہے، کہیں دنگا فساد یا چھوٹی موٹی لڑائی ہو گئی تو لوگ کہتے ہیں "فلاں جگہ جوتا چل گیا"۔ خانہ جنگی کے لئے "جوتیوں میں دال بٹنا" محاورہ ہے۔ جبر و تشدد کے ذریعہ کوئی کام کرانا ہو تو جوتے کے زور پر کرایا جاتا ہے۔ کسی سے لڑائی ہو گئی ہو تو اسے تلوار یا بندوق مار دینے کی دھمکی نہیں دی جاتی ہے بلکہ دانت پیس کر صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ جوتا مار دونگا اور سامنے والا اپنا سا منہ لیکر رہ جاتا ہے وہ جانتا ہے کہ اگر واقعی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو سماج میں دو کوڑی کی بھی عزت نہیں رہ جائے گی کسی پر غصہ آیا کہدیا، مارے جوتوں کے کھوپڑی پلپلی کر دوں گا۔ سامنے والا دم دبا کر رفو چکر۔ آپ خود سوچئے اگر انسان کے قدموں میں رہنے والی چیز اس کے سر سے کھیلنے لگے تو کیا مرڈوب مرنے کا مقام نہیں ہوگا۔ آپ جب کسی کی اطاعت قبول نہیں کرتے تو کیا اسے جوتی کی نوک پر نہیں مارتے۔ کسی کو ذلیل و کمتر سمجھتے ہوئے کیا نہیں کرتے کہ فلاں شخص میری جوتی کے برابر بھی نہیں۔ کسی کی بہت زیادہ عزت و توقیر کرتے وقت آپ اس کی جوتیاں سیدھی کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ آپ کو جنت میں کم از کم وہی جگہ عطا فرما دے جہاں دوسرے جنتیوں کی جوتیاں رکھی جاتی ہیں (اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوا کہ انسان جنت میں جائے نہ جائے مجھے تو وہاں ضرور جگہ ملے گی) بے کار اور آوارہ پھرنے والوں کے لئے آپ کہدیتے ہیں کہ فلاں شخص جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہے۔ بہت ہی ہونہار طالب علم کے لئے

دنیا کہتی ہے "وہ لڑکا تو اپنے استاد سے بھی دو جوتے آگے ہے"۔ منزل مقصود کی تلاش میں لوگوں نے جوتے تک گھس جاتے ہیں۔ "میاں کی جوتی میاں کی چاند" یہ محاورہ آپ بھی دن میں ایک بار کم از کم ضرور استعمال کرتے ہونگے۔ کسی اچھے بھلے آدمی سے بس اتنا کہدیجئے کہ "تو تو پھٹی جوتی کے بھی لائق نہیں ہے" پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ لوگوں کو جوتا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا یا سنا ہوگا۔ کہاں تک گناؤں۔ ہر ایک ادب میرے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔

اب ذرا دوسرے پہلوؤں پر بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈال لیجئے۔ جاسوسی ناولوں میں آپ نے "جواہرات کا چور" کار چور، کتاب چور، کفن چور حتیٰ کہ مرغی چور کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا۔ مگر ان سب میں سب سے زیادہ اہمیت جوتا چور کی دی جاتی ہے۔ اگر کوئی جوتا چور رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے تو اسکی شامت ہی آجاتی ہے۔ پہلے تو ہر آیا گیا اس کے ایک دو ہاتھ رسید کرنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ پھر اس کا منہ کالا کیا جاتا ہے۔ اسکے گلے میں چرائے ہوئے جوتوں نیز محلے بھر کے پھٹے پرانے جوتوں (جو وزن میں تقریباً دس بیس کلوگرام کے ہو جاتے ہیں) کا ہار ڈالا جاتا ہے اور پھر اسے بقول انسان دنیا کی حقیر ترین سواری یعنی گدھے پر بٹھا کر شہر بھر کی سیر کرائی جاتی ہے تاکہ سند رہے اور دوسرے لوگ یاد کر کے عبرت حاصل کریں۔ ذرا غور کیجئے دس بیس روپئے کا جوتا چرانے کے جرم کی کتنی بھیانک اور عبرت ناک سزا ہے۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ لوگ آج بھی مجھ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور کسی رقیب یا دوسرے لفظوں میں جوتا چور کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

جدید فیشن پر کوئی بھی کتاب اٹھا لیجئے، فیشن ایکسپرٹ جہاں یہ بتائے گا کہ اس ساڑی کے ساتھ وہ بلاوز پہنا جائے۔ یہ لپ اسٹک لگائی جائے اس طرح کے بال بنائے جائیں وہاں یہ بھی بتائے گا کہ کون سے لباس پر کس قسم کا جوتا میچ کرے گا۔ اگر کوئی شخص دنیا کا بہترین لباس پہنے ہے لیکن ننگے پیر ہے تو آپ یقیناً اس کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کریں گے۔ کیا میری عدم موجودگی اسکے قیمتی لباس کی عظمت کو مٹی میں نہ ملا دیگی؟۔

امیر آدمی مگر مچھ کی کھال خریدتے ہیں۔ سینکڑوں روپے خرچ کرتے ہیں آخر کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس کھال کا جوتا پہن کر ان کی شان و شوکت دوبالا ہو جائے گی۔ قاتل کا سراغ لگانے کے لئے سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر کو اس کے پیر یا جوتے کا نشان مطلوب ہوتا ہے اور بالآخر جوتے کے نشانات قاتل کی گردن میں پھانسی کا پھندہ بن جاتے ہیں۔

مجھسے یعنی جوتے سے کئی شگون بیان کئے جاتے ہیں۔ جوتے پر جوتا سوار ہو تو اس سے لمبے سفر کی تعبیر لی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کی رسم میں بھی میرا کافی دخل ہے۔ دولہا کی سالیاں ازراہ مذاق اس کا جوتا چھپا دیتی ہیں اور پھر جبتک انھیں حق یا نیگ نہیں مل جاتا اس وقت تک جوتا واپس نہیں کیا جاتا۔ طالب علمی کے زمانے میں رات کو دیر سے گھر لوٹنے پر ماں باپ کی آنکھ کھل جانے کے ڈر سے آپ نے بھی کبھی اپنے جوتے بغل میں دبائے ہیں۔ پرانے زمانے میں بادشاہ جب کسی کو سزا دینا اور محض ذلیل کرنا چاہتے تھے تو حکم ہوتا تھا کہ مجرم کو شہر کے سب سے بڑے چوراہے پر بٹھا کر جوتے لگائے جائیں۔ مسافر خانے میں صبح کی گاڑی سے جانے والے دیہاتی بھائی سوتے وقت مجھے اپنے سر کے نیچے رکھکر سو جاتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں عالم خواب میں کوئی مجھے نہ لے اڑے۔ اور اس طرح پیر کی جوتی کو سر کا تاج نہ بناؤ والی پرانی کہاوت جھوٹی ثابت ہو جاتی ہے۔

نئی عمارت کے صدر دروازے پر مجھے لٹکانے کا

صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ وہ یہ کہ اس عمارت کو کسی کی نظر نہ لگنے پائے۔ دو سو روپے پانے والا کلرک ہو یا دو ہزار پانے والا افسر، صبح اٹھکر اسے ایک ہی فکر ہوتی ہے کہ اس کے جوتے پر پالش ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں ہے تو وہ خود پالش اور برش لیکر بیٹھ جاتا ہے اور دفتر میں احکامات جاری کرنے والا افسر میری نازبرداری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عید کا چاند دکھائی دیتے ہی والدین کو اپنے بچوں کے لئے جوتے اور کپڑے کی فکر لگ جاتی ہے بظاہر میں ایک بے ضرر سی چیز ہوں مگر کبھی کبھی میرا مزاج بھی گرم ہو جاتا ہے اور میری اس گرمئ مزاج کو جوتے کے کاٹ لینے کا نام لیا جاتا ہے۔ کیسے کیسے منہ بناتے ہیں حضرت انسان اس وقت۔ اور جب تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ مجھے اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔

میری ذات میں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان جوتا چاہے سو روپے ہو یا دو روپے کا، وہ ہمیشہ جوتا ہی رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری برادری میں کبھی فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہو پاتے۔ ایکدوسرے کے خون سے ہولی نہیں کھیلی جاتی۔ اور وہ تمام برائیاں نہیں ہوتیں جو صرف حضرت انسان کے حصے میں آئی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت پہچانتے ہیں کہ ہمارا کام صرف خدمت کرنا ہے اور ہمارا یہی جذبۂ فرض شناسی ہمیں ہر طرح کی برائیوں سے دور رکھتا ہے۔

بسمل شاہ جہاں پوری کا دیوان زیرِ طبع تھا۔ انہوں نے اپنے احباب سے کہا کہ کوئی اچھا سا نام تجویز کریں کسی نے کہا، قتیل کا دیوان قتیل، فانی کا دیوان باقیاتِ فانی، مخمور کا بادۂ مخمور، جوش ملیانی کا بادۂ سرجوش اسی طرح بسمل کا دیوانِ مرغِ بسمل ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر اقبال بچپن ہی سے حاضر دماغ اور حاضر جواب تھے کم عمری میں یہ اپنے مکتب دیر سے کیوں آئے؟ اقبال نے برجستہ جواب دیا۔ اقبال دیر ہی سے آتا ہے۔

منقول: ادبی لطیفے
(از خواجہ عبدالغفور)

سیمینار

مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح: (اکولہ)

۱۔ مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح کا ارتقاء — خواجہ عبدالغفور
۲۔ مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح نگاری، ایک جائزہ — صفدر
۳۔ ودربھ میں اردو طنز و مزاح کا آغاز و ارتقاء — شیخ رحمٰن اکولوی

اُردو صحافت: (پونے)

صدارتی خطبہ — خواجہ عبدالغفور
اردو صحافت اور اس کے مسائل — خلیل زاہد
مہاراشٹر میں اردو صحافت اور اس کے مسائل — عبدالسمیع بوبیرے
اردو صحافت اور اخلاقی قدریں — انیس چشتی

خواجہ عبدالغفور (آئی اے ایس)

مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح کا ارتقاء

ہیومر ایک لاطینی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "رطوبت۔ حرارت غریزی"۔ اور رطوبت کی ہم آہنگی انسان کے مزاج کو شگفتگی بخشتی ہے اور کبیدگی دور کرتی ہے۔ یہی عقلمندی کی علامت ہے اگر یہ خود بخود پیدا نہ ہو تو پھر اس کے محرکات کو ڈھونڈنا اور اسکو استعمال کرنا ضروری ہے۔ اس کا سب سے بڑا محرک وہ مزاح ہے جو تقریر اور تحریر میں ڈھکا چھپا ہوتا ہے۔

سوجھ بوجھ رکھنے والا اگر مذاق کو نہ سمجھے یا کسی لطیفہ کی باریکی اور نزاکت سے لطف اندوز نہ ہو تو یہ مسلم ہے کہ وہ نہ صرف مزاح کے حس سے محروم ہے بلکہ اس میں شئے لطیف کی بھی کمی ہے۔

اردو ادب میں جہاں شستہ مذاق کے ساتھ مزاح ظرافت، بذلہ سنجی، شوخ بیانی۔ خوش گپی، ضلع جگت، برجستہ گوئی، حاضر جوابی وغیرہ ہیں وہیں پر طنز و استہزا، ہزل، تضحیک، تعریض، پھکڑ بازی، کلاہ دوزی، ٹھٹھول، تمسخر، فحش کلامی جیسی اصناف بھی ہیں۔

سودا کے عہد سے اور غالب جیسی عظیم المرتبت ہستی کے توسط سے ہمیں ظرافت ملی ہے جسکو اودھ پنچ اور اسی قسم کے بیسوں پنچوں نے صحافت میں بھی چمکایا ہے۔

کہیں کہیں طنز و مزاح کو ادب کی صنف قرار دینے سے انکار اور گریز ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت اور لطافت نے خود اپنا مقام بنایا۔ چنانچہ کلاسیکی ادب کے سوا بھی گذشتہ ۴۰/۵۰ برس میں نامی گرامی ادیبوں نے ایسے اسلوب کو اپنایا کہ جو خوش مذاقی اور خوش کلامی کا حامل رہا ہے۔ اسکی گہرائی و گیرائی پر نظر رکھتے ہوئے ہم آج کے مہاراشٹر اور کل کے صوبہ بمبئی کا جائزہ لیتے ہیں کہ کس حد تک ظرافت نے گل بوٹے کھلائے۔

بمبئی، مہاراشٹر کا دارالخلافہ ہے اور عروس البلاد بھی۔ اسکے متعلق علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں۔
"نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را"

مولوی عبدالحق صاحب نے مولوی نذیر احمد کے شعر کو اسطرح پڑھا۔

خوشا بمبئی تجھ پہ اردو کا سایہ
تجھے جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا

چنانچہ بمبئی میں اردو پھلی پھولتی اور پروان چڑھتی رہی اور آج بھی مراٹھی کے بعد یہی دوسری تمام زبانوں سے بڑھ کر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اسکی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے جانچنے اور
پرکھنے کے لیے کسی پیمانے کی ضرورت ہے نہ اعداد و
شمار کی۔ ہر طرف ہر وقت اردو ہی اردو کانوں میں
شیرینی گھولتی ہے۔ نہ سمجھنے والے اسکی حلاوت
سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ سنجیدہ
ادب کے ساتھ ساتھ مزاح اور ظرافت بھی اپنا مقام
رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک صدی قبل جب پورے ہندوستان
میں طنز و مزاح کا دور دورہ تھا۔ بمبئی میں بھی بعض بلند
معیار شعراء اپنے کلام سے عوام الناس کو لطف اندوز
کرتے رہے۔

چنانچہ اسی زمانے میں عبدالکریم تبسم کا سخنورانِ
گجرات میں تذکرہ ملتا ہے یہ اپنے خاص انداز کے لئے مشہور
تھے۔

جھپک بتا کے مجھے دلربا نے لوٹ لیا
بچا نگہ سے تو شرم و حیا نے لوٹ لیا
ہزاروں ہیں صفِ مژگاں تیر کے گھائل
مجھے تو ابروِ کماں کی ادا نے لوٹ لیا
خدا کے واسطے کر رحم اے بتِ سنگدل
ترے تو روز کے جور و جفا نے لوٹ لیا

سعدی کی بوستاں کی طرز پر حافظ داؤد دلکش
نے فارسی مثنوی نہایت ہی دلکش انداز میں لکھی
تھی۔ انکے مزاحیہ اردو کلام کا نمونہ پیش ہے۔

یار کے ہاتھ سے مشاطہ نے پایا بیڑا
طاقت و ہوش کی رخصت کا یہ آیا بیڑا
دل سوں معنیٔ رنگین گذرتے ہیں آج
کہ عوض بوسے کے انعام میں پایا بیڑا
زلف و رخسار تو ہیں آفت جاں تیرے
خون کا اس لب دندان نے اٹھایا بیڑا
سرخرو مجھکو کیا اس نے جو ہم چشموں میں
کہ ترے ہاتھ سے کل مجھکو دلایا بیڑا

اس دور کی صحافت میں رمز و کنایہ نہیں ہوتے
تھے۔ جو بھی کہنا ہو بلا کم و کاست کھلے بندوں کہا جاتا اور
بے باکی سے طنز کے وار چلائے جاتے اور یہ دعویٰ کیا
جاتا کہ سوائے ترجمہ اخبار صداقت آیات انگریزی اور
معتبر کے کلام افواہی بلا تحقیق کا نام نہیں۔ کسی کی ہجو
اور خدمت زبان پر لانا اپنا کام نہیں۔ ایک خبر کا
عنوان تھا "خوش نصیب قاتل جو پاگل ہو کر چھوٹ
گیا"۔

حکیم محمد عبدالحمید فرخ، شیخ بہادر ابو الفیض، سلطان
الاخبار میں طنز و مزاح کے انداز میں مستقل طور پر لکھا
کرتے تھے۔

دل تھامے ہوئے جو ابھی بیٹھے تھے سرہانے
مٹی میں مجھے ہائے لگی وہ ہی ملانے
محراب سمجھ کر لگا ہیں سر کو جھکانے
دھوکہ دیا مجھکو ترے نقش کف پا نے

عبدالرحمن رسا نے بھی مزاحیہ شاعری کی ہے۔

نئے فیشن پہ جو اوقات بسر کرتے ہیں
وہ فرنگن کے لئے چاک جگر کرتے ہیں
قیس و فرہاد نے دی کوہ و بیاباں میں جاں
اور یہ مرنے کو لندن کا سفر کرتے ہیں
ہوگئی ہند کے بت خانے سے انکو نفرت
جا کے لندن کے پری خانہ میں گھر کرتے ہیں

چونکہ برطانوی سامراج کے خلاف تنفر اور حقارت
کے جذبات پرورش پا رہے تھے انکے اظہار کے
لئے طنزیہ شاعری اسی انداز سے کی جاتی تھی۔

۱۹۴۷ء کی صحافت میں بھی تاریخی اور ادبی مضامین
کے ساتھ لطیف اور دلچسپ تبصرے لکھے جاتے تھے
اور فصلی رپورٹیں بھی اسی اسلوب میں لکھی جاتی تھیں
۔ اے لیجئے گرمی نے ذرا سا سر جھکایا تھا
کہ آسمان پر گھما گھم کی آوازیں آنے لگیں

پانی ۔ کا تار بندھ گیا۔ زبان سے تو کچھ
کہتا نہیں چاہئے کیونکہ باران رحمت ہے
لیکن دل عجیب دغدغہ میں ہے کوٹھری
گر پڑتی ہے ۔ چھپر لیتا جاتا ہے کھیلے سوئے
جاتے ہیں چھت الٹی جاتی ہے ایک
ذرا پانی نے دم لیا تھا کہ ہیضہ خاں
بہادر صاحب نے اودھم مچایا ۔"

ایک مزاحیہ رسالہ" بمبئی پنچ بہادر" شائع ہوتا ہے جس میں معمولی چیزیں بھی فکاہیہ انداز میں درج ہوتیں اشتہار بھی ظریفانہ رنگ میں نکلا کرتے۔ اداریے بھی رنگین انداز میں لکھے جاتے تھے۔ بیشتر عامیانہ ،صوفیانہ انداز میں پگڑی بھی اچھالی جاتی اور عزت ریزی بھی کی جاتی۔

بمبئی کی زبان میں غزل بہت ساری خصوصیات کی حامل ہے اس میں شاعری کچھ اس طرح کی جاتی تھی۔

سے بھلا سر فوڑ لیگی کب تک مری تکدیر فتر کا
اپن مٹی کا ہے سالا بت بے پیر فتر کا
اگر ڈونگر کے نیچے سے میں پاؤں بوم جلا کر
فلک بولے لگا میرے کو آکر تیسر فتر کا
لگادے ایک فتر کھوپری ڈامس کی فتر کے
کہے جو کوئی تیرے کو بت بے پیر فتر کا
بیٹھلائیں گپ چپ باتاں چیتاں کچھ نہیں کرتا
ہے تو انسان فتر کا کہ تو تصویر فتر کا

اس دور میں اخبارات و رسائل کے اداریے بھی اس طرح لکھے جاتے تھے۔ سوڈانی گڑبڑ کے عنوان کے تحت "سوڈان میں گڑبڑ چلنے والی ہے اس لئے ٹڈی دل فوج ہندوستان سے روانہ کردی گئی ہے۔ ہم کو اس بات کی ادھیڑ بن لگی ہوئی ہے کہ بدنصیب کالے آدمیوں کو ہر جگہ سب سے پہلے کیوں بھیجا جاتا ہے مدت مدید کے بعد یہ عقدہ کشا ہوا کہ اگر نازپروردہ گوروں کی لڑائی میں بھیجا جائے تو وہاں کی سختیوں اور گرمی کی شدت سے ان کا رنگ بھی سیاہ بھونرا ہوکر چہرے ولایتی بوٹ بن جائیں۔ پھر کالے گوروں میں تمیز ہی کیا رہ جائے گی ۔"

رسالہ" ابوالبلیغ "نے اپنی سالگرہ کے موقع پر اس طرح پر اداریہ لکھا تھا۔

" سنہ دوم جلوس ظرافت مانوس اعلیٰ ۔
حضرت ابوالبلیغ بہادر دام ظرافتہ
دربار کی بہار ـــ عام منادی ۔
کرم، دھرم، کرم، دھرم ... خلق خدا کی ۔

ملک شہنشاہ اقلیم ظرافت حضرت ابوالبلیغ بہادر کا، حکم کار پردازان سلطنت کا۔ آج ہمارے شہنشاہ جہاں پناہ نے دوسرے سال کا جلوس فرمایا ہے لہذا ہر کہ ومہ جن وانس، وحوش وطیور، چیونٹی مچھر، پستو کھٹمل کتا، بلی چوہا ، چھچھوندر وغیرہ وغیرہ کو عام اطلاع دی جاتی ہے کہ ہمارے ظرافت پناہ کے زیر سایہ رہ کر تم کو ایک سلطنت سے زیادہ آرام ملے گا۔ چین سے دندناؤ خوشیاں کرو، رنگ رلیاں مناؤ ۔

بوڑھے گلیڈ سٹون کی لندن سے آئی خبریں مشہور ہیں کہ درد اعصاب کی وجہ سے کراہ رہے ہیں مع اپنے کنبے کے مقام کینس میں مقیم ہیں۔ صحت قابل اطمینان ہے خدانخواستہ مرنے والی آسامی نہیں ابھی تو یونان وروم کو رونا ہے اور مرثیہ پڑھنا ہے ۔

ان اخباروں میں اشتہار بھی ایک خاص انداز سے شائع کئے جاتے۔ ایک عنوان تھا" منگاتے کیوں نہیں" ارے بھائی ناظرین کی جانب سے ایک دفعہ طلب صادق کا اعلان دیا۔ ایک دفعہ کنڈ گیسو کا مگر تم کیسے شوقین ہو کہ کروٹ بھی نہ لی۔ گرہ میں پیسہ نہیں۔ ہمارا اشتہار جو سیدھے سادے لفظوں میں تھا قابل اعتبار نہ سمجھا۔

آزاد پنچ ۔ مولانا پنچ گرد گھنٹال ۱۹۰۲ء میں شائع ہوتے رہے اور مسٹر ٹھنچو ۱۹۰۵ء میں۔ ان کی

قیمت خریداری کچھ اس طرح ہوتی تھی -
٭ گورنمنٹ، والیان ملک، تعلقہ داران سے ۱۵ روپے، رؤسا حکام و اعلی امراد سے ۱۰ روپے، عوام شائقین سے پانچ اور کم آمدنی والوں سے ۴ روپیہ۔

اس تاریخی پس منظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کے بعد مہاراشٹر کے مختلف علاقے بالعموم اور بمبئی شہر بالخصوص اردو زبان کا گہوارہ بن گیا - فلموں کے لیے بمبئی فلستان ہو گیا اور یہیں ہندی اور (اردو) کی ساری فلمیں بننے لگیں جو ہر طرح سے قومی اور لسانی یکجہتی کی آئینہ دار ہیں چنانچہ کوکن کا ساحلی علاقہ جہاں کی ہندو مسلم ملی جلی تہذیب کو مرہٹی زبان اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ اردو کو ابھرنے اور پڑھنے میں فراخدلی سے حصہ لیا ساتھ ہی ساتھ کراچی اور سندھ سے آئے ہوئے سندھیوں نے بمبئی کو اپنی سندھی زبان سے مالا مال کیا - سندھی کا رسم الخط اپنی خصوصیات کے ساتھ اردو کا علمبردار ہے اور سندھ کے موفیانہ مزاج کو بمبئی اور اسکے نواح میں مقبول بنایا لیکن طنز و مزاح کا محولہ بالا مزاج بدلتا گیا اور اس اسلوب کو ترک کر دیا گیا - کہ زیادہ سنجیدہ مسائل سامنے تھے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مزاح کی جس فنا نہیں ہوتی۔ حالانکہ حیدر آباد میں بڑی حد تک اور کسی حد تک دلی لکھنؤ اور پٹنہ میں مزاحیہ ادب فروغ پاتا رہا۔

راجہ مہدی علی خاں نے مزاحیہ انداز میں پیروڈی سے اپنا خاص مقام پیدا کیا کہ جن کا ثانی کوئی نہیں بن سکا۔ غالب یا ٹاٹنو کمپنی میں سیلزمین " ملاحظہ فرمایئے

سہ کبھی تیرے نقش قدم دیکھتے ہیں
کبھی تیرے چپل کو ہم دیکھتے ہیں
تیرے سرو قامت سے چھ فٹ کم از کم
قیامت کے فتنے کو ہم دیکھتے ہیں
بھلا کیسے لیں گے وہ چپل کی قیمت
جو تیری طرف دم بدم دیکھتے ہیں
جنھوں نے نہ سجدہ کیا تھا خدا کو
تجھے ہو کہ وہ سر بہ خم دیکھتے ہیں
یہ مہندی رچا پاؤں چپل میں رکھ دے
ذرا آج اسے چھو کے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر چماروں کا ہم بھیس راجہ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

بمبئی میں جن شعرا نے مزاح میں نام کمایا اور داد و تحسین حاصل کی ان کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) سعید رضا علامہ درپن کے نام سے ایک عرصے تک روزنامہ ہندوستان بمبئی میں مزاحیہ شوشے چھوڑتے رہے -
(۲) علامہ بھچو نخ (نام معلوم نہیں - کلام بھی نہیں ملا - مزاحیہ شاعر)
(۳) علاء الدین صابر - طنزیہ و مزاحیہ - کلام پوربی زبان میں کہتے تھے۔
٭ ہم ہولڈرب الیکشن " ایک مقبول نظم ہے ۔
(۴) عبد اللہ ناصر - انقلاب کے کالم نویس مزاحیہ شاعر اور عین غین کے نام سے طنزیہ فیچر بھی لکھا کرتے تھے۔
(۵) ناظم انصاری -
(۶) یوسف انصاری
(۷) محمد جاوید (علامہ گنبد) روزنامہ انقلاب بمبئی میں ایک عرصہ تک انکا مزاحیہ کالم شائع ہوتا رہا -
(۸) ریاض جرولی (علامہ ہر فن)
(۹) مائل لکھنوی
(۱۰) ظریف کوکنی
(۱۱) انجم رومانی - علامہ بے نام - روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی
(۱۲) کیفی اعظمی - ہفت روزہ اردو بلٹز - طنزیہ مزاحیہ کالم " نئی گلستاں "

(۱۳) سارس لکھن پوری
(۱۴) چھیلا بدنام بلوری (چلو آج بابا کا صندل اٹھے گا۔
نفیری بجے گی نقارہ بجے گا۔ چلو آج بابا کا صندل اٹھے گا
یہ نظم بڑی مقبول ہوئی۔)
(۱۵) شرف کمالی۔
(۱۶) علامہ قطب مینار (روزنامہ انقلاب میں کچھ عرصہ
تک خان ارمان نے مینار کی بلندی کو چھونا چاہا تھا)
(۱۷) عبدالمجید لوہبرے۔ طنزیہ اصلاحی مضامین علامہ
بھاٹ کے قلم سے لکھتے رہے ،
(۱۸) اسحاق ایوبی۔ طنزیہ مضامین اور انشائیے لکھتے رہے۔
(۱۹) سید آل رسول نظمی مارہروی
(۲۰) فیروز تارا پورنادان
(۲۱) قاضی مشتاق احمد
(۲۲) ڈاکٹر قطب الدین احمد سوز

مزاحیہ نثر نگار اور شاعروں کی فہرست بہت ہی مختصر ہے۔ لیکن شخصیتیں ایسی قدر آور اور بلند پایہ ہیں کہ کمی سے مایوسی نہیں آتی۔ سر فہرست کرشن چندر ہیں کہ اپنی سنجیدہ سے سنجیدہ کاوشوں میں بھی سماج اور معاشرہ پر ہلکے وار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے کسی منفرد شخصیت یا کسی ادارہ یا تحریک کو نشانۂ ملامت نہیں بنایا۔ مگر پھر بھی ان کے نشتر کارگر رہے اور سماج کو نئے زاویئے نئی جہت کی سمت رہنمائی کرتے رہے اور طنز و مزاح نگاروں کیلئے ان کی تخلیقات مشعل راہ ثابت ہوئیں۔

کرشن چندر نے گدھے کی سرگزشت۔ گدھے کی واپسی کے علاوہ اپنے مضامین میں بھی سیاسی ہنگامہ پروری۔ بے اعتدالی، نظم و نسق میں بدحالی اور بدعنوانیوں کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔

تقسیم ملک کے خلفشار اور افراتفری کے دور میں اردو کے طنز نگاروں نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بے باکی کے ساتھ نشتر زنی کر کے ناسور کو ٹھیک کیا اور بے اعتدالیوں کو درست کرنے کی کوشش کی۔ کرشن چندر کی تصنیف "ہم وحشی" ہیں اسکی ایک مثال ہے۔

اسی طرح راجندر سنگھ بیدی نے بھی اپنے روزمرہ میں خود کو ڈبا کر جذباتی ہیجان، سماجی بے دردی، اور اس کے تیز و تند دھاروں کو اپنی تخلیقی چابک دستی اور مہارت سے اس طور پر موڑ کر تیز و تند طنز نے سدھار کے پہلو اجاگر کئے۔

اس دور کے ناول نگاروں جیسے مہندر ناتھ (آدمی اور سکے، رات اندھیری ہے) عصمت چغتائی (معصومہ) خواجہ احمد عباس (اندھیرا اجالا) نے اپنے ناولوں میں بھرپور طنز کے وار کئے جو معاشرہ کو ایک نیا رنگ اور نئی جہت دے گئے۔

سلمیٰ صدیقی، نہایت ہی ہلکا پھلکا اور سیدھا سادا مزاح بکھیرتی ہیں۔ شگفتگی ہے۔ اسلوب دلچسپ اور انداز بیان دلفریب ہے۔ سکندر نامہ ایسی ہی ایک تصنیف ہے کہ جس کے کردار بھلائے سے نہیں بھولتے۔

یوسف ناظم بیک وقت شاعر بھی ہیں خاکہ نگار بھی۔ مزدوروں کے مسائل کے حاکمانہ ماہر تنقید کے شانہ بشانہ انکی تحریر پر طنز و مزاح حاوی رہتی ہیں۔ سیدھی سادی بات کو بھی بطور اچنبھا پیش کرتے ہیں موضوعات میں تنوع ہے۔

پرویز یداللہ مہدی بھی نوجوان ادیبوں میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ مائل صاحب ہزل گو شعرا میں سے تھے اور سارس نے بھی اسی صنف میں بہت کچھ کلام کہا ہے۔

جشن ظرافت بمبئی میں منایا گیا تھا۔ صدارت کے فرائض کرشن چندر نے انجام دی تھی۔ اپنی نوعیت کا یہ واحد پروگرام بمبئی کے صابو صدیق گراونڈ میں ہوا تھا۔ طنز و ظرافت کا بھرپور مسالہ پیش کیا گیا تھا۔

نثار احمد (صحافی۔ ہندوستان) کچھ سال پیشتر اردو اکادمی نے
محفل تبسم منعقد کی جو لائق ستائش ہے جس میں ہندوستان
کے مشہور و مقبول مزاح نگاروں نے شرکت کی۔
سر سنگار سمد کے تحت بھی محفل قہقہہ ہوتی رہی
ہے جس میں ہندوستان کے ممتاز طنز و مزاح نگار شریک
ہوتے رہے ہیں۔

وہاب حیدر مرحوم حیدر آباد کو خیر باد کہہ کر بمبئی آئے
یہاں کی صحافتی دنیا سے منسلک ہوئے۔ روزنامہ انقلاب
بمبئی اور ماہنامہ صبح امید بمبئی میں غالب کے اشعار کارٹون
نے بڑی دھوم مچائی۔

ایک منفرد مجموعہ "شعر پہ شوشہ" انکی زندگی میں شائع
ہوا۔ غالبیات میں غالب کے اشعار میں وہاب حیدر کے
کارٹون کی ایک انفرادی حیثیت اور اچھا اضافہ ہے غالب
کے اشعار کو وہاب حیدر نے جسطرح کارٹونوں میں ڈھالا
ہے یہ انہیں کا خاصہ ہے۔

شہاب آرٹسٹ و کارٹونسٹ ایک عرصے سے فن
کتابت کے ساتھ ساتھ کارٹون بنانے میں بھی طاق ہیں
انگریزی، ہندی، اردو اخبارات و رسائل میں ان کے
کارٹونوں نے دھوم مچائی تھی "شمع" میں فلمی گیتوں کے بول
اور ان پر کارٹون "صبح امید" بمبئی میں اور "ٹائمز آف انڈیا"
کے پرچے "پراگ (पराग)" کے ٹائیٹل کور سے لیکر اندرونی
صفحات میں شہاب کے کارٹونوں کا کمال دیکھنے کے
لائق ہے شہاب کے پیش کردہ فلمی چہروں کے کارٹون
زیادہ مقبول رہے۔

ایس۔ آر۔ دراوڑ کے نام سے کئی کارٹون انگریزی
ہندی اخبارات و رسائل میں نظر سے گذرے ہوں گے۔
آر۔ ایس۔ دراوڑ دراصل ساجد رشید ہیں ابھرتے ہوئے
جوان سال فنکار اور اچھے افسانہ نویس انقلاب کے
سنڈے ایڈیشن کی زینت انکا "شعرٹون" کالم
تھا مختلف شعراء کے کسی ایک شعر پر کارٹون کچھ
اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بات دل میں جاگزیں ہو جاتی

عبداللہ ناصر کے کلام ناصر سے کچھ اقتباس پیش ہے۔

"آدھا"

وہ لنگڑا اور لولا ہے عمل ہے اسکے سب آدھا
قیامت میں یقیناً اس سے ہوگا احتساب آدھا
بٹھا کر مجھکو پہلو میں مخاطب ہیں وہ دشمن سے
ہے اس سے التفات آدھا تو مجھ سے اجتناب آدھا

فائر بریگیڈ —

بش شرٹ میری چھینٹ کے کپڑوں سے بنی ہے
مشہور زمانہ مری گل پیرہنی ہے
سرخی تیرے ہونٹوں پہ لپ اسٹک کی لگی ہے
ہر ہونٹ تیرا جیسے عقیق یمنی ہے
خالی ہے اگر جیب تو دنیا ہے جہنم
جنت یہی دنیا ہے اگر جیب بھری ہے

بیوی کلب چلیں، سوئے مسجد میاں چلے
جیسے زمیں اِدھر تو اُدھر آسماں چلے

ناظم انصاری کے مزاحیہ کلام کے مجموعہ "گوبھی کے پھول سے"
سے نمونہ پیش ہے۔

مجرم ہوں اگر میں تو سزا کیوں نہیں دیتے
لکھوا کے رپٹ مجھ کو پھنسا کیوں نہیں دیتے

ہو میری بھی مولانا تمہاری طرح دعوت
گر ایسا کوئی مجھکو سکھا کیوں نہیں دیتے
و کثرت اولاد سے اب مل گئی فرصت
اس دور گرانی کو دعا کیوں نہیں دیتے
فہرست جو دیوانوں کی کرتے ہو مکمل
ناظم کا بھی تم نام بڑھا کیوں نہیں دیتے

مالیگاؤں سے شبیر حکیم، شیخ رحمن آکولوی، سید صفدر راحل پوری،
اسداللہ اور بیسیوں نام ابھرتے ہیں جو کم عمری سے ہی ظرافت میں اونچا مقام حاصل کر چکے ہیں

صفدار

مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح نگاری
ایک جائزہ

کسی زبان کے ادب میں طنز و مزاح، ارتقائے شعور کے بلند ترین موڑ پر ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے ہر زبان کے ادب میں طنز و مزاح نگاری کی تاریخ دیگر اصناف سے مختصر ہوتی ہے۔ اردو میں بھی دیگر اصناف کے بالمقابل طنز و مزاح کی عمر کم ہے۔ اور اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں مہاراشٹر میں طنز و مزاح کی عمر اور بھی کم ہے۔ برصغیر میں یا علاقہ مہاشٹرا میں طنز و مزاح کا جائزہ، طنز و مزاح کی تنقید کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ یہاں یہ حال ہے کہ میدان ہنوز نا معلوم ہے۔ موروثیت پر مبنی ہمارے سماج میں طنز و مزاح کی تنقید کو بھی نقادوں کے یہاں جنم لینا ہے۔ اور نقادوں کا یہ حال ہے کہ بعض اب تک طنز و مزاح کو گالی کے مترادف خیال کرتے ہیں۔ خشکے کی اس دیگ سے میں ایک دانہ پیش کرنا چاہونگا۔ ڈاکٹر قمر رئیس رقمطراز ہیں،

> "یوں ایک بزرگ کا قول ہے کہ آج کے دور میں اردو میں جو شاعری معرض وجود میں آرہی ہے اس کا بڑا حصہ گر طنزیہ نہیں تو مزاحیہ شاعری میں ضرور شمار ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے طنز نگار مثلاً فرقت کاکوروی اور یوسف ناظم اسے شاعری ہی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ اسی لئے خوف ہے کہ وہ شاعری نہ رہ کر صرف مزاحیہ رہ جائیگی"[1]

اردو میں طنز و مزاح کی تنقید کے عدم وجود کا ایک بڑا سبب غالباً یہ بھی ہے کہ ہماری تنقید اختراعات کی عادی ہے اور اختراعات طنز و مزاح کا تقاضہ ہے یہاں ناقد کے لئے تخلیق کار سے دو گز بلند ہونے کے امکانات نہیں کے برابر ہیں۔ نقادیہ گھاٹے کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح کا یہ جائزہ ناقدانہ غرّے کے ساتھ نہیں۔ ایک طالبعلمانہ کوشش ہے۔

اردو طنز و مزاح کی مرکزی روایات کو مہاراشٹر کا Contribution خاصہ وقیع ہے۔ مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں غالباً پہلا اہم نام کرشن چندر کا ہے، کرشن چندر کی ادبی زندگی کا آغاز و اختتام طنز و مزاح ہے۔ انہوں نے ماسٹر بلاقی رام، لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا، اور عورتوں کا سال لکھ کر اسے انتہا کو پہونچادیا۔ گو ان کی عظمت ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے مانی گئی ہے مگر طنز و مزاح کے باب میں انکا کام ناقابل فراموش ہے۔ فن بنیادی طور پر تیسری آنکھ کا سفرنامہ ہے۔ وہ دنیا جو دو آنکھوں سے حیا کرتی ہے۔ فنکار کی تیسری آنکھ پر روشن ہوتی ہے۔ زندگی کے اس منظر کو گھیر لینا ہی فن ہے۔ کرشن چندر کے طنز و مزاح میں یہی تخلیقیت جلوہ گر ہے، وہ ایسے سطحی تضادات کے بیان سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو ہم رات دن مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ باتیں بظاہر مضحک نہیں معلوم ہوتیں، ان کے گرد ایسی فضا خلق کرتے ہیں جس میں ان باتوں کا مضحک پہلو روشن ہو جاتا

---

[1] ڈاکٹر قمر رئیس، عصر حاضر میں اردو طنز و مزاح، مطبوعہ ماہنامہ شاعری بمبئی، عصر اردو ادب نمبر، ۷۷ء۔ صفحہ ۲۵۸

یہ تخلیقی رویہ اردو طنز و مزاح نگاروں میں ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے مثلاً وٹامن غذا کا اہم جز ہے۔ مگر غذا کے ایسے حصوں میں پائے جاتے ہیں جو مصنف کے لئے پرکشش نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں،

"وٹامن سیب کے گودے میں نہیں، سیب کے چھلکے میں ہوتا ہے، ناشپاتی کے خول میں ہوتا ہے سنگترے کے ریشوں میں ہوتا ہے، آم کے روئیں میں، ڈاکٹر لوگ اصرار کرتے ہیں کہ روٹی پکاتے وقت گیہوں کے آٹے سے بھوسی کو الگ نہیں کرنا چاہئے..... چنانچہ میں اپنے مہمانوں کو جو اکثر وٹامن کے عاشق ہوتے ہیں بڑی آؤ بھگت کرتا ہوں خود سیب کا گودا کھاتا ہوں انہیں چھلکے کھانے کو دیتا ہوں۔ خود چاول کھاتا ہوں، ان کے لئے بھوسے کی روٹی میز پہ رکھتا ہوں، (وٹامن)

ایک اقتباس غسلیات سے سنئے جو نہانے کے دفاع میں لکھا گیا ہے،

"اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کتنے بجے نہاتا ہے تو میں وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے اسے ابھی کتنے مدارج اور طے کرتے ہیں — مثال کے طور پر — صبح چار بجے کون نہاتا ہے — پوربیا، بنیا، میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر۔
صبح چھ بجے — ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولس کا سپاہی۔
آٹھ بجے — پروفیسر، کالج کا لڑکا
دس بجے — صاحب، بہادر، لیڈر
بارہ بجے — منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم
اس طرح جوں جوں آپ مدارج طے کرتے جائیں گے آپ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے"[2] (غسلیات)

---

(۲) کرشن چندر غسلیات۔ مطبوعہ ماہنامہ، بیسویں صدی (دہلی)
کرشن چندر نمبر بابت مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۹۷۔

جا لکشمی کا پل، اور سوگز کی دوڑ، لکھنے والے کرشن چندر کے طنزیہ مزاحیہ مضامین اور کہانیاں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریے کے بر قعے میں بند قلمکار نہیں ہیں، دلیپ کمار کا ناک، وٹامن، غسلیات، ہوائی قلعے، خواتین کا سال اور ایک لڑکی بگھارتی ہے دال جیسی مزاحیہ تحریریں نہیں لکھ سکے تھے۔ یہاں کرشن چندر Relax ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں چنانچہ ان انشائیوں میں مزاح کا عنصر غالب ہے اور طنز کا عنصر بہت ہی کم ہے۔ خالص مزاح خلق کرنا بہت مشکل ہے۔ لطیفہ بناتے بناتے مزاح نگار خود لطیفہ بن جاتا ہے۔ مگر کرشن چندر نے اس میدان میں گھوڑے دوڑائے اور شہسوار ثابت ہوئے ممتاز مفتی 'حماقت' کو خالص مزاح کا منبع سمجھتے ہیں، کرشن چندر کا مزاح اس بات کی نفی کرتا ہے۔ ہاں وہ جو پیٹ بھر کر قہقہہ لگانا چاہتے ہیں وہ کرشن چندر کے یہاں Disoppinted رہتے ہیں۔ میں مزاح سے عاری خالص طنز کا ذکر اس لئے نہیں کروں گا کہ اس طور کوئی اہم قلم کار اس عنوان کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ ہم ایک ایسی سماجی صورتحال سے وابستہ ہیں کہ شاید کسی باشعور قلمکار کو طنز سے مفر نہیں۔

اس نسل کے دوسرے اہم قلمکار راجندر سنگھ بیدی ہیں۔ مگر ان کی شہرت 'ایک چادر میلی سی' اور گرم کوٹ جیسی کہانیوں سے ہے۔ طنز و مزاح سے شہرت کیسے مل سکتی ہے کہ یہاں نقاد کا ناطقہ بند ہے۔ بیدی کے انشائیوں میں وہ خالص عوامی اور بے ساختہ زبان اور لہجہ ملتا ہے۔ جو میری روح کے نہاں خانوں میں شور مچانے ہوئے ہیں۔ سر کی مانگ سے جوتے کی لیس تک مہذب آدمی بیدی کی خالص عوامی زبان اور جذبے کی کاٹ سے بیس جملوں کی مار کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ مہمان، بیوی اور بیماری۔ الہ آباد کے حجام' انکے طنز و مزاح کی آئینہ دار تحریریں ہیں، یہاں وہ بادشاہ سلامت کے رعب داب کا لحاظ کئے بغیر کہہ دیتے ہیں کہ بادشاہ تو ننگا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ابن انشاء کے لئے کہا ہے کہ،

"بچھو کا کاٹا روتا ہے، سانپ کا کاٹا سوتا ہے، ابن انشاء کا کاٹا سوتے میں بھی مسکراتا ہے"

یہی تجزیہ بیدی کے طنز و مزاح پر صادق آتا ہے۔ وہ عقل کے گدے نہیں چلاتے، تخیل سے مضحک ماحول پیدا نہیں کرتے احمق کردار خلق نہیں کرتے، ان کا طریقہ یہ ہے کہ نوٹس کے بغیر ہمارے آپ کے بیڈ روم پر دھاڑ مارتے ہیں۔ جہاں ہم اس حال میں پائے جاتے ہیں کہ بقول یوسف ناظم جوان ظریف، ظرافت سے کنارہ کش ہوتا ہے کھلے جاتے ہیں ڈھانپتے جاتا۔۔ آدمی کی بڑی کمزوری ہے، یہی بیدی کے طنز و مزاح کا منبع ہے دیگر اصناف میں اشہب قلم دوڑانے والے تیسری آنکھ سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ طنز و مزاح نگار تیسری آنکھ سے دیکھتا ہی نہیں رہتا۔ اس آنکھ کو پل بھر کے لئے دبا دیتا ہے اور ہم جھینپ کر رہ جاتے ہیں۔ بیدی کا رویہ اپنے معروض کے ساتھ کچھ اسی قسم کا ہے۔ ان کے انشائیے مہمان سے ایک اقتباس سنئے:۔

"آج کسی کے پاس ۱۰، ۱۰ فٹ سے بڑا کمرہ ہے؛ شامت اعمال اگر مہمان چھ فٹ کا آجائے تو آپ کو ٹانگیں سکیڑ کر انہیں چھاتی سے لگا کر باقی کے چار فٹ میں گذارہ کرنا پڑیگا۔۔۔۔۔ صبح اٹھیں گے تو آپ کی ٹانگیں چھاتی کے ساتھ ہی لگی رہ جائیں گی اور جب انہیں پھیلانے کی کوشش کریں گے تو یوں لگے گا جیسے آپ پھر سے پیدا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں"۔(۳)

ایک اور اقتباس ان کے مضمون "بیوی یا بیماری" سے سنئے:

"ہندوستان میں اپنی بیوی کے علاوہ ایک اور چیز ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اسے ہم دوسرے کی بیوی کہتے ہیں۔۔۔۔ آپ کسی کی بیوی کے بیمار ہونے کی خبر پائیں اور شامت اعمال عیادت کے لئے چلے بھی جائیں تو آپ صاحب خانہ سے پوچھتے ہیں ــــ کیسی طبیعت ہے گھر میں؟" اس پر (وہ) آپ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے آپ گھنٹہ گھر ہیں۔ میاں نہایت مکروہ صورت بنا کر کہتے ہیں "زنانہ تکلیف!" مطلب یہ کہ اس کے بعد بکواس بند کیجئے (۴)

انکے بعد کی نسل کے اہم طنز و مزاح نگار یوسف ناظم ہیں یہ حضرت یوں تو شاعری بھی کر لیتے ہیں۔ مگر انکا طنز و مزاح بڑھکر شاعری کو پس منظر میں ڈھکیل دیتا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ چنانچہ یوسف ناظم طنز و مزاح کی ملکیت میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یوسف ناظم انشائیہ نگار ہیں۔ کالم نویس ہیں۔ خاکے بھی لکھتے ہیں، ہر میدان میں اپنی مثال آپ ہیں، خاکہ نگاری ہو یا انشائیہ نگاری۔ پرکار سے دائرہ بنانے کا عمل ہے، انشائیہ نگار دائرے کے مرکز پر پرکار کی نوک رکھتا ہے اور محیط پر اس کی پنسل ہر نقطہ سے اس کی خیر خیریت پوچھتی ہے۔ یوسف ناظم بھی انشائیہ نگار ہیں مگر وہ پرکار الٹی پکڑتے ہیں۔ یعنی پنسل کی نوک دائرہ کے مرکز پر رکھتے ہیں اور محیط کے ہر نقطہ کو پرکار کی نوک سے زخمی کرتے ہوئے طنز و مزاح کی پرکار گھماتے ہیں۔ یوسف ناظم نے دور مار نظر پائی ہے اس لئے ان کی پرکار کا دائرہ ایک جہان مد تجربات کو محیط ہے۔ مثلاً وہ مردم شماری پر گفتگو کرتے ہیں۔ مگر دائرہ میں ادبی انجمنیں محلہ داری چپقلشیں، سیاسی بلوے، گھریلو جھگڑے، جائز بچوں کے ڈھیر، ناجائز بچوں کی قطاریں، فلسفی کا بھلکڑپن اور شاعروں کی جھوٹی انانیت، عبرت ناک سماجی حالات، حکومت کی غفلت اور مردم شماری کے مضحک پہلو ــــ آجاتے ہیں۔ اچھا شاعر مختلف چیزوں میں نقطۂ اشتراک پیدا کر کے شعری جمالیات خلق کرتا ہے۔ اچھا مزاح نگار اسی اصول پر مزاح خلق کرتا ہے۔ یوسف ناظم کے یہاں یہ صفت بہت واضح ہے۔ "مردم شماری" سے ایک اقتباس:

"جو ملک بہت ترقی کر گئے ہیں۔ وہاں لوگوں کے علاوہ جانوروں کی بھی مردم شماری ہوتی ہے بعض ملکوں کے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ دونوں مردم شماریاں ایک ہی ساتھ کی جاتی ہیں

(۳) راجندر سنگھ بیدی، مہمان مشمولہ مہمان دہلی۔ سن درج نہیں ص ۸

(۴) ایضاً ص ۲۸

کیونکہ وہاں آدمیوں اور جانوروں میں کچھ ایسا زیادہ
فرق نہیں ہوتا۔" (۵)

یوسف ناظم کا یہاں لطیفہ گڑھنے کی کوشش بھی نظر آرہی ہے اسی مضمون میں رقمطراز ہیں:

"کسی صاحب کا ہاتھ دیکھکر ایک نجومی نے کہا
آپ چالیس سال تک مفلس رہیں گے ان صاحب نے
بڑی امید سے پوچھا۔ اسکے بعد کیا ہوگا۔ نجومی
نے بتایا اس کے بعد آپ کو مفلسی کی عادت ہو
جائے گی۔ ان صاحب کی جب بھی مردم شماری
کی گئی، یہی معلوم ہوا کہ وہ اب بھی وہی کرتے ہیں
جو پہلے کرتے تھے۔" (۶)

یا بیسویں صدی کے انشا ء میں لکھتے ہیں:

ہمارے دوست ڈاکٹر حنان، جو موسیقی کے ڈاکٹر ہیں
اور ادب کے معاملات میں ہمیشہ دخل دیتے ہیں
ابن انشاء کے ذکر پہ ایک مرتبہ فرمانے لگے بھئی انشاء اللہ خاں کو گذرے
زمانہ ہوگیا۔ یہ ابن انشاء کون ہیں! بڑی مشکل سے انہیں چپ کرانا پڑا (۷)

ان کے خاکوں میں تعریف سے تضحیک کا پہلو نکالنے کا رجحان غالب ہے۔ وارث علوی کے لفظوں میں کہیں تو وہ دستار بندی کرکے سر کاٹتے ہیں۔ مثلاً باقر مہدی کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو انکا
روادارانہ مزاج ہے اور وہ سب کو یکساں طور پر
ناپسند کرتے ہیں۔" (۸)

یوسف ناظم کے یہاں بات میں بات پیدا کرنا، محض گوشوں کا انکشاف اور پردہ ڈال کر بے پردگی کو اجاگر کرنے کا عمل بھی ملتا ہے۔ یوسف ناظم مزاح نگاری کے میدان میں اپنا مقام الگ رکھتے ہیں ان پر تفصیل سے لکھنے کے لئے ایک علیحدہ مقالے کی ضرورت ہے۔ یعنی ضرورتِ مقالہ نگار کا اشتہار نکالنے کی ضرورت ہے۔

کرشن چندر کے بعد کی نسل میں دوسرے مزاح نگار خواجہ عبدالغفور ہیں، خواجہ صاحب کا لطیف مزاح لطائف کا مرہون منت ہے، لطیفے آبگینے ہوتے ہیں، ہر آبگینہ آپ اپنی ہستی اور آپ ہی اپنی پہچان ہوتا ہے۔ سماج کو ہنساتا ہے مگر آپ تن تنہا سفر کرتا ہے۔ خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ خیال کے سوئی دھاگے میں پرو کر ان آبگینوں کی بھی مالا بنانے پر قدرت رکھتے ہیں خواجہ صاحب کو شفیق الرحمن کی قبیل سے جوڑا جاسکتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ شفیق الرحمن موجود صورت حال کو لطیفے میں بدل دیتے ہیں جبکہ خواجہ صاحب موجود SITUATION میں لطیفہ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً وہ بحث کرتے ہیں اس کہاوت سے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" اور یوں دروغ گو دوسری بار اپنے پہلے بیان کی تردید کر دیتا ہے۔ یہاں خواجہ صاحب دروغ کا توڑ کرنے کے لئے یہ لطیفہ جوڑ دیتے ہیں:

"ایک صاحب اس طرح ڈینگیں مارا کرتے
تھے کہ پچھلے سال چھٹیوں میں وہ دارجلنگ گئے
تھے اور اس سے پہلے سال انہوں نے گرما اوٹی
میں گذارا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کتنا جھوٹ
بول رہے ہیں ــــ حاضر دماغ اور بذلہ سنج
دوست نے انکی تکذیب کی نہ ان کو جھوٹا
ٹھہرایا بلکہ اپنی کہانی اس
طرح پر سنائی کہ دوستو! اب آپ سے
کیا چھپانا ہے اس سال ہم گرمی کے موسم
پر لندن نہ جاسکے، گذشتہ سال سوئزرلینڈ
نہیں گئے اس سے قبل کی چھٹیوں میں ہم
جاپان نہیں جاسکے!" (۹)

درج بالا اقتباس اس افواہ کی بھی تردید کرتا ہے کہ خواجہ عبدالغفور صاحب لوگوں کو ہنساتے ہیں، مگر دوسرے ہنستے نہیں۔

---

(۵) یوسف ناظم "مردم شماری"، مطبوعہ ماہنامہ کتاب (لکھنؤ) شمارہ بابت جولائی ۱۹۷۵ء صـ۲۷ (۶) ایضاً صـ۳۳

(۷) یوسف ناظم "بیسویں صدی کے انشا" مطبوعہ، شاعر بمبئی شمارہ ۱۱، ۱۲ [illegible]

(۸) یوسف ناظم "باقر مہدی" مطبوعہ کتاب لکھنؤ شمارہ بابت جنوری [illegible]

(۹) خواجہ عبدالغفور "جھوٹ"، مطبوعہ ماہنامہ چودن (مالیگاؤں) شمارہ بابت فروری ۱۹۸۱ء ص ۹

آدمی آیا، اے، ایس ہوکر بھی اپنے ہم جنسوں سے لاتعلق نہیں ہوسکتا تعلق ہونے کی صورت میں معاشرے کی بدہیئتی سے آنکھ بند نہیں کر سکتا۔ خصوصاً طنز و مزاح نگار ہوکر۔ یہ بات ضرور ہے کہ عوام سے تعلق کی اس حد کو خواجہ صاحب نہیں چھوتے جہاں لیڈر کا ضمیر بیدار ہوتا اور مزاح نگار کا طنز نکھرتا ہے، اس کے باوجود خواجہ صاحب نے جو سمن زار ترتیب دیا ہے اس کی تحسین نہ کرنا ادبی کفر ہوگا۔

مہاراشٹر میں اردو طنز و مزاح نگاری کی تیسری پیڑھی کی نمائندگی شفیقہ فرحت کرتی ہیں۔ شفیقہ فرحت جس قدر طنز و مزاح میں بسی ہوئی ہیں۔ اسی قدر بھوپال میں بس گئی ہیں مگر میں یہ عرض کروں گا کہ بیٹی کہیں بھی رہے پرائی نہیں ہوتی۔ شفیقہ فرحت مہاراشٹر کی بیٹی ہیں۔ اردو طنز و مزاح میں نسائیت کی آمیزش شفیقہ فرحت کا عطیہ ہے۔ مرد طنز و مزاح نگاروں نے زنان خانوں میں جب بھی جھانکا ہے مرد کی نگاہ سے جھانکا ہے۔ عورتوں کی جن کمزوریوں کو عورتیں ہی گرفت کر سکتی ہیں۔ وہ شفیقہ فرحت کے یہاں مل جاتی ہیں خواتین کی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش، ان کی خفیہ ایجنسیاں، زیور، برتن، فرنیچر کا شوق، میاں کی پوزیشن اکڑ، تکڑ، اور فیشن کے بوجھ سے نڈھال طبقۂ خواتین، اپنے عہد کی خواتین کی نمائندگی کے لیے شفیقہ کے مضامین میں محفوظ ہے ان کا مزاح ان کے اسلوب تحریر میں ہے اس اسلوب پر بھی ان کی نسائیت کی چھاپ ہے۔ وہ ایک بات کہتی ہیں اور اس پر ایک غلاف چڑھاتی ہیں یا قافیوں کے نکھی گوٹے ٹانکتی ہیں اس لفظی بازی گری سے شگفتگی پیدا کرتی ہیں مثلاً "رانگ نمبر" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"عشق کے امتحانوں اور ستاروں سے آگے والے جہانوں میں بھی نمبروں کا سکہ چلتا ہے اور بڑا دھوم دھڑکے سے چلتا ہے، صحیح نمبر لگ جائے تو خانہ آبادی ورنہ خانہ بربادی"(۱۰)

ڈاکٹر حامد حسین کے خاکے میں رقمطراز ہیں:

"پینے کا ذوق اس درجہ معصومانہ بلکہ فرد د سانہ ہے کہ اسے شوق کا درجہ ہی نہیں دیا جا سکتا۔"

ایک اور مضمون "دعا دیتے ہیں رہزن کو" میں لکھتے ہیں:

"چور کے لیے تھا اچھا خاصہ لوٹنے کا فن، علی بابا کا کزن کہ جسے جدید ترین اصطلاح میں کامیاب ترین سیاستداں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہر تالے کو کھول لیا اور ہر کھلے تالے کو بند کر دیا۔"

طنز و مزاح کے دوسرے Tools جو شفیقہ فرحت استعمال کرتی ہیں وہ Irony ہندی، انگریزی الفاظ کا استعمال اور مختلف اور متضاد اشیاء کا موازنہ ہے۔

ادھر چار پانچ برسوں میں مہاراشٹر میں طنز و مزاح نگاروں کی جو نئی ٹولی عالم وجود میں آئی ہے ان میں دو نام خاصے اہم ہیں ایک شیخ رحمٰن آکولوی، دوسرے محمد اسداللہ۔ شیخ رحمٰن آکولوی نئی افسانے کو طلاق دے کر طنز و مزاح کی پناہ میں آئے ہیں، اسداللہ انشائیہ نگاری کے پس پردہ مراٹھی شاعری اور ڈرامہ کے اردو کرن کے کام میں جٹے ہوئے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی ابھی ابتدا ہے مگر پوت کے پانو پالنے میں پہچان لئے گئے ہیں۔

عام آدمی سالی سے ٹکراتا اور بیوی سے گھبراتا ہے مزاح نگار اس معنٰی میں عام آدمی نہیں ہوتا کہ وہ سالیوں سے چاہے نہ ٹکراتا ہو مگر بیوی سے گھبراتا نہیں، بلکہ ٹکراتا ہے اور بار بار ٹکراتا ہے۔ اس ہمت کی داد دینی چاہیئے، کرۂ ادب کے ملک صبا کے ایسے ہی شہ پاروں میں سے ایک شیخ رحمٰن آکولوی بھی ہیں۔ شیخ رحمٰن کو طنز و مزاح کی درآمد اور برآمد کے لئے دور دراز کا سفر کرنا نہیں پڑتا۔ وہ اپنا آپ اور اپنے آس پاس بکھری زندگی کو پار درشی آنکھوں سے دیکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ اکثر قوسین میں بند ہوکر طنز کا تیر چلاتے ہیں۔ فکر تونسوی، یوسف ناظم اور شفیقہ فرحت کے یہاں بھی یہ اسلوب مشترک ہے۔ وہ ایک تجربے کے آئینہ میں سابقہ تجربات کے انعکاس کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

---

(۱۰) شفیقہ فرحت "رانگ نمبر" مطبوعہ شاعر (بمبئی) شمارہ ۷، ۱۹۸۱ء صـ ۱۳

یہ ادب کی تقریباً سبھی اصناف میں تخلیق کی اساس ہے یہ چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ شوہر کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جسے پہلے گھڑ سواری اور بعد میں باربرداری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ (تعمہ ایک سنڈے کا)

۲۔ شیر خواری کی عمر ختم ہونے کے بعد یہ دانت (دودھ کے دانت) آہستہ آہستہ گر جاتے ہیں گویا انسان کی زندگی میں GUESTARTIST کا رول ادا کرتے ہیں

ہٹلری مونچھوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس قسم کے مونچھوں والے بظاہر مسخرے اور بے وقوف نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں بڑے ظالم اور مکار ہوتے ہیں (عورتوں کی زبان میں بڑے دہ ہوتے ہیں)

شیخ رحمٰن کے یہاں طنز و مزاح کے روایتی ہدف بھی موجود ہیں مثلاً بیوی، دودھ والا، لیڈر وغیرہ۔ مگر اختراعات بھی ملتی ہیں۔ جیسے دودھ کے دانت۔ یوسفی نے ابن انشاء کے بارے میں لکھا ہے:

میں آیا، میں نے دیکھا، میں مسکرا دیا۔

یہ ابن انشا ہی کی نہیں، طنز و مزاح نگار کی تعریف ہے وہ دراک تو ہوتا ہے سفاک نہیں ہوتا۔ یہ خوبی شیخ رحمٰن کے یہاں بھی موجود ہے اور ان کے فن کو اعتبار بخشتی ہے یہ خوب پہچانتے ہیں کہ کس قسم کی نزاکتیں، کثافتیں اور صداقتیں طنز و مزاح کی زد پر آتی ہیں کہ تخلیقی عمل جاننے کا نہیں پہچاننے کا عمل ہے میں شیخ رحمٰن اور انکے مقامی ہمعصروں سے یہی کہوں گا کہ آکولہ کا نادر آخری بلندی نہیں ہے۔ شیخ رحمٰن برابر سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں اور انہیں قطب مینار سے بھی آگے جانا ہے۔

محمد اسد اللہ کے یہاں پہلے طنز و مزاح کو پھوار پڑی پھر ان کے چہرۂ انور پر سبزہ اگا۔ اس سے عمر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اب ان کا چہرہ یہ بتاتا ہے کہ طنز و مزاح کی بارش خوب جم کر ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے انشائیے رشگوفہ، تعمیر، نگار، چورن، تحریک شاعر اور اوراق وغیرہ رسائل میں نظر آنے لگے اور انشائیوں میں یہ نظر آتا ہے کہ ان کو کیا کیا نظر آتا ہے۔ اسد اللہ خالص انشائیہ نگار ہیں۔ اپنے انشائیے میں اسد کو کہیں جانا نہیں ہوتا مگر وہ دنیا بھر کی سیر کر لیتے ہیں۔ وہ عنوان مقرر کر لیں تو اس کے محیط پر بہت کچھ چکر کھانے لگتا ہے۔ ان کے کچھ انشائیوں کے عنوانات یہ ہیں، آنسو، طوطے، پنگھٹ چہرے، پاکٹ، بظاہر یہ عنوانات، نقطہ جیسے ہیں۔ جن میں لمبائی اور چوڑائی کچھ نہیں ہوتی، مگر اسد کی نگاہ کا لمس پاکر یہ نقطے ہاتھ پاؤں نکالنے لگتے ہیں، بلکہ ان کے اعضائے رئیسہ و خبیثہ سب دریافت ہو جاتے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں سے کس پر وار کریں گے۔ طنز و مزاح کا ہدف بنانے کے لیے انہیں کسی الو کے پٹھے کو پکڑنے اور چپت لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ قارئین پڑھیں، ہنسیں اور داد دیں، بلکہ خوف محسوس ہوتا ہے کہ نامعلوم کس سطر میں طنز کا وار ہم پر ہوتا ہے ان کا طنز و مزاح منصوبہ بند نہیں ہے۔ اس لیے انکا کوئی بندھا ٹکا اسلوب بھی نہیں ہے انشائیے کی بے ہیئتی کی ہیئت پر اسد کی گرفت آج ہی سے مضبوط معلوم ہوتی ہے ان کے قلم کی کاٹ کے اظہار کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"اس دور میں چور کو اسکی سزا تک پہنچانے کے لیے اس کے پکڑے جانے سے پہلے چوری کا ثابت ہونا اور ثابت ہونے کے بعد اس کا پکڑا جانا ضروری ہے ان مراحل سے گذرے بنا قانون کسی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ قانون بھی دن بدن شریف ہوتا جا رہا ہے اور صرف شریفوں ہی سے واسطہ رکھتا ہے لچے لفنگے، غنڈے، جرائم پیشہ اور شر پسند عناصر اس کے لیے نامحرم کا درجہ اختیار کرتے جا رہے ہیں"[1]

---

(۱) محمد اسد اللہ "پنگھٹ"، مطبوعہ چمدن (مالیگاؤں) شمارہ ۷۔ ص ۳۱-۳۰

اہل وطن کھٹی میٹھی املیوں کے دلدادہ اور طنز و مزاح پر آمادہ پائے جاتے ہیں، آزادی کے بعد دکن اور برار کے تار بھی تہذیبی اور تخلیقی روابط ماضی کی یاد ہو کر رہ گئے تھے۔ اب وہاں سے شگوفوں کے سلام آنے لگے تو ایک بار پھر برار اور دکن کے اہلِ قلم طنز و مزاح کی سطح پر پیمان وفا باندھ رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے شگوفہ کے توسط سے ہمارے یہاں طنز و مزاح نگاروں کی ایک پلٹن تیار ہو گئی ہے۔ قلم کے یہ سپاہی اپنا سپاہیانہ کردار بنانے کے لئے قلمی ریاض میں جٹے ہوئے ہیں۔ ان میں ایس۔ ایس علی، مشہور مصور شکیل اعجاز، رحمت اللہ خاں مالوی، ڈاکٹر سمیع بن سعد، رفیق شاکر، شیخ محمد نیاز، محمد طارق کھولاپوری وغیرہم کے نام اہم ہیں، مہاراشٹر کے دیگر نو آمدہ طنز و مزاح نگاروں میں مختار یونس، علیم جہانگیر، احمد عثمانی، پرویز یداللہ مہدی اور انصاری اصغر جمیل وغیرہم کے نام آتے ہیں۔

اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ نئے لکھنے والوں نے طنز و مزاح کو ٹھٹھول کے مترادف سمجھ لیا ہے۔ اسی لئے فنکارانہ بصیرت Insight کے فقدان کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے زبان و بیان اور اسلوب کی سطح پر ادبی معیار نہیں بن پاتا۔

کچھ لوگ طنز کی سرحد کو پار کر کے ہجو کے قلمرو میں داخل ہو جاتے ہیں اور دو دو ہاتھ پر اتر آتے ہیں۔ نئے لکھنے والے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے پیش رو طنز و مزاح نگاروں کو ماڈل بنا لیتے ہیں اسلئے اپنی انفرادیت کا سراغ لگانے میں ناکام ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مواد اور اسلوب ہر دو سطح پر نئے لکھنے والے، نئے ابعاد کی تلاش پر زور دیں۔ میں جو بات محسوس کرتا ہوں وہ عرض کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے یہ بڑے بھائی کا مشورہ نہیں ہے۔

میں نے یہ جائزہ نثر نگاروں تک محدود رکھا ہے۔ راجہ مہدی علی خاں سے فیاض افسوس آکولوی تک طنز و مزاح نگار شعراء کا جائزہ ایک علیحدہ مقالے کا متقاضی ہے میں افسوس کے ساتھ افسوس صاحب اور ان کے رفقاء سے معذرت خواہ ہوں۔

آخر میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی، اس سیمینار کے کنوینر جناب محمد ابراہیم بسمل محترم صدر بزم اور سامعین کرام کا ممنون ہوں کہ مجھے اس اس عنوان پر اظہار خیال کا موقع دیا گیا اور صبر و سکون سے سنا گیا۔

بقیہ: مہاراشٹر میں اردو صحافت اور اس کے مسائل

اس وقت چند ایک تجاویز پیش کی تھیں۔ یہ تجاویز چند پرچوں میں شائع ہوئیں، جس کا مقصد تھا ہماری آواز دور دور تک پہونچے۔ کئی ایک حضرات نے تجاویز پیش کیں ان تمام تجاویز میں سے صرف چند ایک پر عمل ہوا۔ چھ سال کا عرصہ ہوا کوئی ٹھوس بات اس سلسلے میں سامنے نہ آسکی یا مکمل عمل درآمد نہ ہو سکا۔ موقع اگر ملا تو کسی اور وقت ان تجاویز کو پیش کرونگا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس مقالے یا مضمون میں کتابی علم اور لمبے چوڑے اقتباسات اور تاریخ کے وہی بار بار آنے والے حوالے دہرا نہ سکا، پیش نہ کر سکا۔ اس لئے کہ آج ہمیں کتابی حوالوں سے زیادہ عملی باتوں پر دھیان دینا ہے جس سے ہماری اور صحافت کا معیار بلند کیا جا سکے۔ جس سے اردو صحافیوں کی توقیر میں اضافہ ہو سکے۔ اور جس سے اردو صحافت کی جڑیں اور بنیادیں مضبوط ہو سکیں۔

شیخ رحمٰن آکولوی

ودربھ میں اردو طنز ومزاح کا آغاز وارتقاء

علاقہ ودربھ ناگپور۔ اکولہ۔ اراوتی۔ وردھا۔ ایوت محل بھنڈارہ۔ چندرپور۔ بلڈانہ ان آٹھ اضلاع پر مشتمل ہے، اس علاقے کی اپنی علمی وادبی تاریخ ہے۔ یہاں سے شعر وسخن، درس وتدریس تاریخ وتذکرہ اور سیاست وصحافت کی عظیم الشان ہستیاں اٹھی ہیں۔ قلمی نسخے، مخطوطات اور مطبوعات کی فہرست دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقے میں تاریخ نویسی، تذکرہ نگاری اور شعر وشاعری سب سے آگے رہی۔ اصناف نثر میں ناول نویسی اور افسانہ نگاری کیطرف بہت کم توجہ کی تھی۔ ودربھ میں طنز ومزاح کے ابتدائی عناصر یہاں کے ان لوک گیتوں میں ملتے ہیں جو شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ اس صنف ادب میں طبع آزمائی بعد میں ہوئی۔ افسوس کہ طنز ومزاح پر مشتمل قدیم ادب کا باقاعدہ کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں اور جو تھوڑا بہت ذخیرہ موجود ہے وہ بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ودربھ کی پہلی مزاحیہ نظم خواجہ محمد دہدار فانی سے منسوب کیجاتی ہے جو برہان نظام شاہ کے عہد میں مو بیدار ہوکر آئے تھے۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اپنی کتاب "تاریخ اقلیم ادب" (حصہ اول) میں لکھا ہے کہ انکی ایک چھوٹی سی مزاحیہ نظم حیدرآباد کے سعادت مرزا صاحب کی بیاض میں ملتی ہے۔ خواجہ محمد دہدار فانی ۱۵۴۱ء میں شیراز کے قصبہ دہرار میں پیدا ہوئے اور ۱۶۰۷ء میں سورت میں انتقال کیا۔ ان کی عمر کا طویل حصہ برار میں گذرا۔ اس طرح ودربھ میں اردو طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا آغاز گویا انہیں سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد عرصے تک ہمیں اس قسم کی شاعری کے نمونے دستیاب نہیں ہوئے۔ قدیم شعرائے برار کے کلام کے جو نمونے مولوی عبدالجبار ملکاپوری نے اپنے تذکروں میں دئیے ہیں ان میں کہیں کہیں روایتی انداز میں واعظ کے متعلق طنزیہ اشعار مل جاتے ہیں۔

ودربھ میں طنزیہ ومزاحیہ ادب کا فروغ غدر کے بعد شروع ہوا۔ جب ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "اودھ پنچ" جاری ہوا تو اس کی مقبولیت سے متاثر ہوکر ملک میں مختلف مزاحیہ رسائل و اخبارات جاری ہوئے۔ ان میں سے اکثر کا نام "پنچ" ہی تھا۔ برار کے شہر کھولاپور (ضلع اراوتی) سے مارچ ۱۸۸۶ء میں ایک مزاحیہ ماہنامہ "برار پنچ" جاری ہوا۔ اس کے مالک ایڈیٹر کرشن لال جوشی تھے، افسوس کہ اس ماہنامے کا کوئی نمونہ تادم تحریر ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ اگر یہ نمونے ہاتھ آجائیں تو ودربھ میں اردو طنز ومزاح کے ارتقاء سے متعلق تحقیق کی نئی راہیں کھل جائیں۔ جس زمانے میں مدھیہ پردیش ریاست کا کچھ علاقہ برار کا حصہ تھا۔ ہوشنگ آباد سے ۱۸۸۴ء میں "موج نربدا" اور ۱۸۸۶ء میں "ظرافت" نامی دو مزاحیہ اخبارات جاری ہوئے تھے۔ جنہیں ودربھ کے فنکاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو ملک کے دوسروں حصوں کی طرح علاقہ ودربھ بھی سیاسی وسماجی بے چینی کا مرکز بنا۔ تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت، کانگریس اندولن کے اثرات یہاں پڑے۔ اس دور میں اکبر اور ظفر علی خاں کی طنزیہ

مزاحیہ شاعری مقبول عام تھی، اس کی تقلید میں ودربھ کے شعراء نے بھی سیاسی وسماجی موضوعات پر طنزیہ ومزاحیہ نظمیں لکھیں۔ ماسٹر حمزہ جذبی نظامی ناندورہ اور جلگاؤں وغیرہ میں عرصے تک قیام پذیر رہے۔ انکے شعری مجموعے "شعلہ" میں طنزیہ ومزاحیہ اشعار کے نمونے ملتے ہیں۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا نمونہ ودربھ میں علمی وادبی لحاظ سے کافی اہم ہے۔ اس زمانے میں کامٹی۔ ناگپور، اچلپور، اکولہ امراؤتی اور دوسرے شہروں میں تعلیمی مراکز قائم ہوئے۔ اور اخبارات ورسائل جاری ہوئے یہ دور سیاسی اعتبار سے پرآشوب دور تھا۔ جدوجہد آزادی اپنے عروج پر تھی شعراؤ ادبا اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام میں حب الوطنی اور آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس دور کے شعراء میں امراوتی کے شرف الدین شرؔف، آزاؔد، آفتاؔب اور لعل خاں فردوؔسی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، آزاد کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

مجھے جلتے توے پر بٹھا کر
تحمل آزما یا جا رہا ہے

میرے دل کی وہ قیمت لگاتے ہیں
پیسہ دھیلا چھدام کیا کہنا

آفتاب کا ایک قطعہ ہے

وسمہ سے رنگ اپنا چھپانے لگے ہو تم
گویا کہ شب کو روز بنانے لگے ہو تم
داڑھی کو اب خضاب لگانے لگے ہو تم
گویا کہ دن کو رات بنانے لگے ہو تم

اسی دور میں ناگپور میں بھی کئی شعرا ظریفانہ شاعری کرتے نظر آتے ہیں، ان میں موجودہ نائب صدر جمہوریہ محمد ہدایت اللہ کے والد ماجد محمد ولایت اللہ حافظ کافی مشہور تھے۔ نمونہ کلام کے طور پر یہ قطعہ پیش خدمت ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ ہر جانب یہ ہوتی تھی پکار
بیبیاں پردہ میں ہو جائیں کہ مرد آتے ہیں یہاں
پھر یہ دیکھا لوگ کہتے تھے بآواز بلند
مرد کر لیں اس طرف منہ آرہی ہیں بیبیاں

دیولگھاٹ کے گل شیر خاں ہبرؔ بھی اسی دور کے شاعر ہیں ان کے علاوہ یہیں کے ایک اور شاعر تبرؔ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں شاعر مشاعروں میں ایکدوسرے پر چوٹیں کرتے رہتے تھے۔

آزادی کے بعد ودربھ میں طنزیہ مزاحیہ ادب کو کافی فروغ حاصل ہوا نثر میں بھی اور شاعری میں بھی۔ شعراء وادباء کی ایک نئی نسل سامنے آئی۔ ان نثر نگاروں میں شفیقہ فرحت، سید صفدر، محمد اسد اللہ، شکیل اعجاز، انصاری اصغر جمیل، رفیق شاکر، ایس ایس علی، رحمت اللہ خاں، ڈاکٹر نورالسعید اختر، محمد طارق، ڈاکٹر محمد سعداللہ، اظہر حیات، امتیاز خالق، عمر حنیف، ڈاکٹر سیح بن سعد حیات انور، ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد، وحید اللہ اور شیخ محمد نیاز کے نام آتے ہیں۔ اسی طرح ہزل گو شعراء میں علامہ گنبد، ناظم انصاری، فیاض افسوس، سرخاب، نایاب، راہی، فنی، فوجی، بیڈھب جلوا، غنی اعجاز، نقیب، فرماتوس، اور ضمیر الدین ساجد قابل ذکر ہیں۔

قابل وضاحت بات یہ ہے کہ محبوب راہی، غنی اعجاز، فصیح اللہ خاں نقیب، ڈاکٹر ایم۔ آئی ساجد، ضمیر الدین ساجد سید صفدر، اور رفیق شاکر کے ہاں مزاحیہ شاعری کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا اصل میدان غزل گوئی ہے۔ محمد طارق بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور ڈاکٹر نورالسعید اختر اور ڈاکٹر محمد اسد اللہ کا میدان تحقیق وتنقید ہے۔

آیئے لگے ہاتھوں ودربھ کے صف اول کے فنکاروں کے فن اور شخصیت کا سرسری طور پر جائزہ لیا جائے۔ شفیقہ فرحت کا تعلق عرصے تک ناگپور سے رہا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ انہوں نے ۱۹۵۰ء کے مابین لکھنا شروع کیا انکے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ "لو آج ہم بھی" ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ انکے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے سلمیٰ صدیقی لکھتی ہیں ؎

"شفیقہ فرحت کے مزاح پہ طنز کا پیر تسمہ پا ہمیشہ سوار رہتا ہے، اور بڑے تیکھے ترچھے اور چبھتے ہوئے فقرے ان سے لکھواتا رہتا ہے۔ خواتین بھی اتنے غور وفکر سے کام لیتی ہیں۔ مردوں کے اس شبہے کی شفیقہ فرحت تردید کرتی رہتی ہیں۔"

نمونۂ تحریر کے طور پر انکے مضمون "عہد نامہ جدید"

کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے ، " اگر کھانے کے لئے اناج نہ ملے ، اناج کے چھلکے نہ ملیں اور پھل ترکاریوں کے چھلکے نہ ملیں ، اور کیڈ بری چاکلیٹ (جسے تمہارا ریڈیو اسٹیشن سیلون پوشٹک خوراک کہتا ہے) بھی نہ ملے تو رنج نہ کرو کہ یہ رنج کا مقام نہیں بلکہ خوش ہونے کا ہے کہ تم مادیت سے دور اور روحانیت سے قریب ہو رہے ہو ۔ بس اور کوشش کرو ، روحانیت سے قریب تر ہونے کی ۔ اناج کے بدلے ہوا کھاؤ ، غم کھاؤ (کہ غم سے روح کو جلا ملتی ہے ، انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے) افسروں کے ڈانٹ کھاؤ اور دوستوں کی چغلیاں کھاؤ اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو کہ خدا بخشنے والا ہے ! "

سید صفدر بنیادی پر انشائیہ نگار ہیں ، مزاح میں ان کا قلم بڑا رواں دواں اور اسلوب بیحد شگفتہ ہے ۔ اپنے انشائیے "پوسٹ مین " میں لکھتے ہیں " پوسٹ مین سے محبت کے جراثیم کم و بیش سب ہی شاعروں اور ادیبوں میں پائے جاتے ہیں ۔ بلکہ میرا تو یہ نظریہ ہے کہ جس شخص کا دل پوسٹ مین کی محبت سے خالی ہو ، وہ شاعر یا ادیب ہو ہی نہیں سکتا ۔ ایک دوست کا ریمارک ہے کہ ہم بجائے شاعر کے شاعرہ ہوتے تو ہماری پہلی اور اور آخری محبت یقیناً پوسٹ مین سے ہوتی اور ہمارے بچے پوسٹ مین کے بچے کہلاتے "

محمد اسد اللہ بھی بنیادی پر انشائیہ نگار ہیں وہ اپنے انشائیوں میں ذاتی مشاہدات و تجربات کی غمازی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ بیتی " جگ بیتی " معلوم ہوتی ہے ۔ انشائیے 'برقی دستکیں' کا یہ اقتباس بطور دلیل پیش خدمت ہے ۔

" دروازے سے گذرتے ہوئے خواہ مخواہ کال بیل
کا بٹن دبانے کی عادت چھوت چھات کی بیماری
کیطرح جال بھر میں اس تیزی سے پھیلی کی ہم
خود بھی اس سے نہ بچ سکے ، چنانچہ دو ایک مرتبہ
خود اپنی ہی طلب میں بٹن پش کر بیٹھے مگر کوئی بھی
نہ آیا تب یہ جانا کہ اپنے آپ کو ڈھونڈ لینا آسان
نہیں ہے کہ کال بیل کا بٹن دبایا اور خود کو پا لیا "

انصاری اصغر جیل کا پہلا مزاحیہ مضمون " ہم اور ہماری ہوم منسٹر " روزنامہ انقلاب بمبئی کے ۱۰ر مئی ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ان کا ڈرامہ " فری اسٹائل مشاعرہ اور مضمون " میں کہاں کہاں سے گذر گیا مکان کی تلاش میں " آکاش وانی ناگپور سے نشر ہو چکے ہیں ۔ شاہد کبیر ـــ لمبا آدمی اور بانکا شاعر ـــ ناظم انصاری " انکے مقبول خاکے ہیں ۔ شاہد کبیر کے خاکے میں لکھتے ہیں ۔

چند مہینے پیشتر شاہد بھائی سے ملاقات ہوئی تو
دیکھا کہ وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں ۔ داڑھی بھی بڑھی
ہوئی تھی اور پریشان سے تھے ۔ میں نے پوچھا کہ شاہد
بھائی کیا بات ہے ؟ آپ نے اپنی حالت مجنوں سی
کیوں بنا رکھی ہے ۔ نہایت نحیف آواز میں فرمایا
کیا بتاؤں میرا دیوان شائع ہو رہا ہے "

شکیل اعجاز اپنی تخلیقات میں روزمرہ کے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں ۔ وہ واقعات سے زیادہ اپنے انداز بیان اور زبان و اسلوب سے مزاح پیدا کرتے ہیں ۔ بہترین قوت مشاہدہ اور حساس طبیعت کی کارفرمائی ان کی تخلیقات میں واضح طور پر نظر آتی ہے ۔ وہ طنز سے عموماً احتراز کرتے ہیں شائستگی ان کے مزاح کی اہم خصوصیت ہے ان کا خاکہ " جنی بھائی " آکاش وانی ناگپور سے نشر ہو چکا ہے " جنی بھائی " کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں

قسمت سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں سائیکل اسلئے
نہیں چلاتے کہ کہیں قسمت میں سائیکل ایکسیڈنٹ
نہ لکھا ہو ۔ ایک دوست نے خوب مذاق بنایا
تو دوسرے دن سائیکل پر سوار سارا شہر گھومتے
رہے (باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ اپنے
کمرے میں حمام تک جانے کے لئے بھی سائیکل کا
استعمال کیا) ایک بچہ اسکول جاتے وقت فٹ
پاتھ چھوڑ کر ان کی سائیکل کے نیچے آگیا اور رونے
لگا ۔ بھیڑ بڑھنے لگی تو دو روپے دیکر چپ کرایا
تب معلوم ہوا کہ جیب میں پیسے نہ ہوں تو سائیکل
کیوں نہیں چلاتے ؟

ایس ۔ ایس علی کا پہلا مزاحیہ مضمون " نوٹس بورڈ " روزنامہ انقلاب کے ۳۰ر نومبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ۔ ان کی تخلیقی قوت کا مرکز سماجی و معاشرتی انتشار ہے اس لئے انکی

تخلیقات میں ایک طنزیہ فضا کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی لگائی ہوئی چوٹیں دیرپا اثر رکھتی ہیں اور قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ پچھلی سات پشتوں میں ان کے یہاں
کوئی شاعر نہیں ہوا اور نہ اگلی سات پشتوں میں کسی
کے شاعر ہونے کا امکان ہے اور یہ کہ اس دشت
کی سیاحی ان کی پہلی ہی پشت ہے۔ لیکن شاعری
پر گفتگو کچھ انداز میں کرتے ہیں گویا سینکڑوں
پشتوں سے ان کا پیشۂ آبا شاعری رہا ہو۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے یہاں شاعری
(یا شاعر) پیدا کرنے کی روایت نہیں ہے تو پھر
شاعری کے جراثیم انکے دماغ میں کہاں سے
پہنچے۔

رحمت اللہ خاں نے اپنے مضامین میں بات کہنے کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ انکا اپنا ہے، اور قاری کی تمام تر توجہ اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔

"ایک نومولود ادیب کی تخلیق روانہ کر رہا ہوں۔
موصوف میرے شاگرد ہیں اور یہ میری ہی حوصلہ
افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجھے ایک تعارفی خط کے
ساتھ جو درپردہ سفارشی خط ہے، ان کی تخلیق
آپ کو روانہ کرنی پڑ رہی ہے۔ میرے یہ شاگرد اپنے
زمانہ طالبعلمی میں میرے مددگار رہے ہیں یعنی
جب کبھی مجھے Period نہ لینا ہوتا یا بہ الفاظ
دیگر کرسی پر بیٹھکر اونگھنے کو طبیعت چاہتی (اور
اکثر یہی ہوتا) تو میں انہیں اپنی تازہ ترین تخلیق
سنانے کے لئے کھڑا کر دیتا۔ پوری کلاس بظاہر
ہمہ تن گوش اور بہ باطن بے ہوش ہوتی۔ برا ہو
گردشِ ایام کا میرے اچھے دن اس سے دیکھے
نہ گئے اور یہ حضرت امتحان کے سیلِ رواں میں
خس و خاشاک کیطرح بہہ نکلے۔ اگر یہ دو تین
سال اور کالج میں رہ جاتے تو نہ صرف کالج میں
میری زندگی آرام سے گذرتی، بلکہ بازار جاکر دال

آٹے کا بھاؤ معلوم کرنے سے بچ جاتا۔"

علامہ گنبد کا شمار ملک کے صف اول کے ہزل گو شعرا میں ہوتا ہے وہ ۱۹۲۱ء میں اکولہ میں پیدا ہوئے اور یہیں ۲۸ اپریل ۱۹۸۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ابتدا میں انہوں نے مچھو براری کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ پھر علامہ گنبد کے تخلص سے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ وہ برسوں روزنامہ انقلاب بمبئی سے منسلک رہے ان کا مجموعۂ کلام "صدائے گنبد" ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ شاعروں اور ادیبوں کی موت کا گدھوں کیطرح انتظار کرنے والے ایڈیٹروں پر چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

واسطہ دور کا نہیں ہم کو
کون مرتا ہے کون کھپتا ہے
چھاپ دیتے ہیں بے تکے نمبر
اس سے اخبار خوب چھپتا ہے

یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے

خوب تجویز کیا ایک مسیحا نے علاج
جسکو ہو پیار کا آزار لگاؤ جوتے

پاور ہاؤس کھل رہے ہیں سینکڑوں
پھر بھی کم کم روشنی ہے آج کل

خدمتِ خلق سے گنبد نے رکھے کان پہ ہاتھ
آخری عمر میں بخشو، نہ کھلاؤ جوتے

ناظم انصاری بحیثیت ہزل گو شاعر ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "گوبھی کے پھول" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ حسن و عشق۔ واعظ۔ بیگم۔ فیشن پرستی۔ زر پرستی، رشوت خوری۔ گرانی اور سیاست کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور انگریزی الفاظ کا چابکدستی سے استعمال کر کے بڑی گل افشانیاں کی ہیں ——

چند اشعار پیش خدمت ہیں ——

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں

دروازے پہ ڈیل کم، یہ لکھا کسکے لئے ہے
اور ہاتھ میں یہ بانس پھٹا کسکے لئے ہے

سند ملی ہے مجھے جب سے گھپلے بازی کی
کئی اداروں کے منشی میری تلاش میں ہیں

فیاض افسوس نے اپنی پہلی ہزل ۱۹۴۴ء میں اکولہ کے ایک مشاعرہ میں احسان دانش کی صدارت میں پڑھی۔ ان کا مجموعۂ کلام "کفِ افسوس" منظرِ عام پر آچکا ہے۔ کفِ افسوس کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے عصمت چغتائی لکھتی ہیں۔۔۔

میں نے کفِ افسوس ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالی
خدا گواہ ہے میں نے زندگی میں آج سے پہلے اتنے
شاعرانہ صفحات نہیں پڑھے۔ روتے بسورتے خون
پیپ کے ادب کے سیلاب کے بعد میری جانب
سے زندگی کی اتنی حسین عکاسی پر دلی شکریہ
قبول کیجئے۔۔۔۔ میری معلومات کا زیادہ بھروسہ
نہیں، مگر اکبر الہ آبادی کے بعد اتنے نشتر اتنی
تند رفتاری سے ادب میں جلوہ افروز نہیں ہوئے"

نمونۂ کلام کے طور پر ہزل" ناگہانی موت" کے یہ اشعار سماعت فرمائیے

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہیں بے غیرتی
آج کے اس دور میں بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ
کیا غضب ناگہانی موت سے ڈرتے نہیں
ہو اگر دعوت کہیں تو ڈٹ کے کھا لیتے ہیں لوگ
شکر ہے اپنی بناوٹ کا انہیں احساس ہے
آئینہ ہو روبرو تو منہ چھپا لیتے ہیں لوگ

سرخاب کا اصل نام سعید الدین تھا۔ وہ ۳ر جنوری ۱۹۱۶ء میں اکولہ میں پیدا ہوئے اور ۲۶ر ستمبر ۱۹۷۷ء کو میں انتقال کیا۔ انہوں نے اشاعت کلام پر توجہ نہیں کی اس لئے انکا کلام مشاعروں کی حد تک رہا۔۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے

کتنے سر کاٹنے پڑتے ہیں غرض مندوں کے
تب کہیں جا کے کوئی آدمی سر ہوتا ہے

اتنے ذلیل ہو گئے اس عاشقی میں ہم
احباب تک بلاتے نہیں ہیں مکان پر
کل جیل سے بچانا تیرے ہاتھ ہے خدا
دفتر کا پیسہ اب تو میرے کام آگیا

مشہور غزل گو شاعر محبوب راہی آجکل مزاحیہ نظمیں اور غزلیں بھی سپرد قلم کر رہے ہیں۔ انکی مقبول عام مزاحیہ نظم" ماڈرن رخصتی" سماعت فرمائیے

کون سا دکھ ہے تجھے ایسا روتی کیوں ہے
یوں گلیسرین سے آنچل کو بھگوتی کیوں ہے
مشورے میرے اب تو دھیان لگا کر سن لے
میری ہر بات ذرا کان لگا کر سن لے
ساس کو اپنی تو خاطر میں نہ لانا ہرگز
دھونس میں تو کبھی بڑھیا کے نہ آنا ہرگز
بھول کر بھی کبھی کرنا نہ خسر کی خدمت
تجھکو اس بوڑھے سے خود لینی ہے گھر کی خدمت
اور جو نندیں ہیں کبھی منہ نہ لگانا ان کو
حال دل اپنا تو ہرگز نہ سنانا ان کو
اور برتاؤ رہے کچھ تیرا گھر بھر کے لئے
طور لیکن ہوں اور ہی شوہر کے لئے
اس سے کہنا کہ جو فرمائیں کر سکتی ہوں
آپ کے حکم پہ جی سکتی ہوں مر سکتی ہوں
اور بھی گر ہیں آگے تجھے سکھلا دوں گی
جانتی ہوں جو وہ سب کچھ تجھے بتلا دوں گی
میری طرح تو کبھی ہوگی دہاں کی رانی
راہی جیسے جو ترے آگے بھریں گے پانی

زین العابدین نایاب نے حسن و عشق اور سیاست کو موضوع سخن بنایا ہے

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ودربھ کے فنکاروں میں سے بیشتر کی حوصلہ افزائی ماہنامہ" شگوفہ" حیدرآباد نے کی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اگر یہ فنکار اسی طرح سنجیدگی سے ظریفانہ ادب تخلیق کرتے رہے تو تعجب نہیں کہ یہ سلسلہ اردو ادب میں قابل قدر اضافے کا باعث ہو۔

خواجہ عبدالغفور

صدارتی خطبہ، اردو صحافت سیمینار

اردو صحافت کی تاریخ

اردو صحافت کی عمر کوئی سو سوا سو سال سے زیادہ ہے سب سے پہلے فارسی اخبارات میں اردو ضمیمے شائع ہوتے رہے، پھر اسکے بعد مکمل اردو اخبار کی بنا پڑی۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے فارسی اخبار جہاں نما نے ۱۶ مئی ۱۸۲۲ء اور شمس الاخبار ۱۸۲۲ء نے سب سے پہلے اپنے اخباروں کے ساتھ اردو ضمیمے شائع کئے، ان دونوں اخباروں کے ایڈیٹر ہری ہردت اور منی ٹھاکر تھے جنکو ہم اردو صحافت کا جنم داتا کہہ سکتے ہیں۔

رسائل میں . فوائد الناظرین (۱۸۱۶) محب ہند (۱۸۱۷) ماسٹر رامچندر نے دہلی سے شائع کیا، اختر شہنشاہی، مولفہ اختر الدولہ اور تاریخ صحافت اردو مولانا امداد صابری نے ۱۹ ویں صدی سے متعلق صحافت کا سیر حاصل تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس دور میں اخبار انگریز سرکار والیان ملت اور رؤسا کی سرپرستی میں شائع ہوتے رہے۔ چندہ کے بھی درجے مقرر تھے۔ ۵۰ روپیہ والیان ریاست ۳۰ روپیہ رؤسا اور عوام سے ۷ روپیہ ماہانہ۔ نور الابصار آگرہ سے ۱۸۵۱ء مالوہ اخبار اندور سے، ۱۸۱۹ء اور کوہ نور لاہور سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئے۔

صحافت کی زبان

ابتدائی دور میں اخباروں کی کوئی اپنی زبان نہیں بن پائی تھی۔ سیدھی سادی صاف زبان استعمال کی جاتی۔ داستانوں، قصوں اور کہانیوں کے اسلوب اور زبان میں واقعات لکھے جاتے، مسجع اور مقفیٰ زبان کا رواج تھا بلکہ خبروں کے ساتھ ساتھ برمحل اشعار، مثالیں اور کہاوتیں بھی سجا دی جاتی تھیں، ان کا اثر یہ ہوا کہ سچائی اور واقعات کہیں گم ہو کر رہ گئے اور نثر کی رنگینی اپنا جادو بکھیرتی رہ گئی۔ بعض بعض جدت پسند تو اس روایت کو یہاں تک لے آئے کہ پورا پورا اخبار ہی منظوم کر ڈالا، ہر لفظ وزن اور بحر کی لڑیوں میں پرو دیا ہوا، ہر خیال، ردیف اور قافیوں کی ڈور سے بندھا ہوا، اس کے بعد سرسید احمد خاں اور انکے رفقاء کی کوششوں سے اردو نثر ہر قسم کے تکلفات اور بندھنوں سے آزاد ہوتی گئی۔ صاف ستھرے انداز بیان اور عام فہم زبان سے لوگوں کا ذائقہ بدلا اور ہماری اخباری زبان بھی دھیرے دھیرے مختلف رخ اختیار کرتی گئی، ایسے الفاظ اور اسلوب اپنائے گئے جن سے مناسب طریقہ پر اظہار رائے کیا جا سکے۔ غرض کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اخباری زبان منجھ کر بے حد صاف ہو گئی۔

اردو ماہناموں کی صحافت

اردو میں ماہنامہ رسالوں اور جریدوں کی روایت بھی کافی پرانی ہے، اپنے ابتدائی دور میں بیشتر ماہنامے صرف ادبی، علمی موضوعات تک ہی محدود تھے۔ جب دنیا پھیلی، لوگوں کا مزاج بدلا، علوم کے نت نئے پہلو سامنے آئے تو زندگی کے دیگر بہت سے پہلوؤں اور عام پسندیدہ موضوعات پر بھی رسالے اور جریدے شائع ہونے لگے۔

نوجوانوں، بچوں اور خواتین کے لیئے الگ الگ ماہنامے شائع ہونے لگے جن میں انکی عمر اور ذہن کے اعتبار سے ان کی دلچسپی کا مواد ہوتا۔ اور پھر ذہنی رجحان کے اعتبار سے مذہبی، دینی، علمی نیم ادبی، تعلیم، حکمت، تجارت، زراعت، انجینیرنگ سے متعلق اور عام دلچسپی کے مزاحیہ رسالے بھی شائع ہوتے لگے، تصوف سے لیکر جنسیات اور فلکیات، صحت اور طبی ماہنامے بھی شائع ہوتے رہے۔

علمی و ادبی ماہناموں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مدیران کے رجحان فکر، انداز نظر کے نمائندے ہوتے تھے۔ مگر ایسے رسالوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنے مدیران کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں یا اپنی تاب و توانائی کھو بیٹھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہر قسم کے رسالے شائع ہوتے رہے، گلدستہ شعراء، لکھنؤ، گلکدہ ریاض وغیرہ یہ شعراء کے کلام سے بھرے ہوتے تھے۔ مزاحیہ اخبارات پچاسوں ناموں کے پنج مختلف صوبوں سے شائع ہوتے رہے، اور ملا دو پیاز ظریف الہند، موج ظرافت، مزاح کا پتلا، جعفر زٹلی، سلطان الظرما شیخ چلی، چلتا پرزہ جیسے دلچسپ مزاحیہ ناموں سے مقبول ہوئے ان میں مزاحیہ اور منظوم اشتہارات بھی ہوا کرتے تھے۔

طب اور حکمت سے متعلق جریدے جیسے گلدستہ حکمت طبیب لاہور، معدن الحکمت، حافظ صحت، طب حیوانات گلزار حکمت مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ فنون حیدر آباد دکن زمیندار تجارت الاخبار۔ گلدستہ تجارت، انجینرنگ گائیڈ جیسے رسائل بھی پابندی سے اجرا ہوتے رہے۔ آئینہ انگریزی، سوداگری، برطانوی سامراج کی مصنوعات کو ہندوستانیوں سے متعارف کرنے کے لئے شائع کیا جاتا رہا۔ خیر خواہ اطفال، اسٹوڈینس گائیڈ، خادم طلبا، کلید امتحان وغیرہ بچوں اور طلبا کی دلچسپی کے جرائد تھے۔

عورتوں کے اخبار جیسے مفید عام، رفیق نسواں، تہذیب نسواں، اخبار النساء وغیرہ بھی بطور خاص طبع کئے جاتے رہے

اس طرح ہر مذہب اور ہر دھرم اور ان کے فرقوں کے لیئے علیحدہ علیحدہ رسائل دلچسپی کا باعث بنے رہے جیسے کائستھ سماچار، قومی کائستھ نگم، بہار گو پتر کائستھ، ریفارم کائستھ متر وغیرہ۔ آریہ درپن، آریہ سماچار، آریہ پتر، آریہ گزٹ، جیون دھرم، دھرم جیون وغیرہ

مسلمانوں کے عقائد کی تبلیغ کے لیئے مشعبہ مجمع البحرین، نامر الایمان لاہور، امامیہ، رسالہ ردتنی وغیرہ بالا لوام شائع ہوا کئے۔

فلمی صحافت اور فلمی رسں و رسائل

یہ فلمی کم ہوتے ہیں اور فلمی دنیا کو چکا چوند اس کے اسکینڈل اور اس دنیا کی افواہوں کو عوام الناس تک پہنچانے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ ہر فلمی فنکار کی کمزوریوں اس کی دانستہ نادانستہ خطاؤں پر نظر رکھتے ہیں اور انہیں اچھالنے میں ان کی کوشش یہ رہتی ہے کہ سنسنی خیز خبریں جلد از جلد لوگوں تک پہونچائیں اس کوشش میں صداقت اور سچائی کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ نیم برہنہ رنگین جاذب نظر تصویروں سے بھی یہ جریدے مقبولیت حاصل کرتے ہیں

صحافت کو اہمیت

اس عہد میں صحافت ایک اہم اور ناگزیر طاقت بن گئی ہے، ہماری سیاسی، تہذیبی، سماجی اور ثقافتی زندگی کے اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز کی مکمل روداد اخباروں کے ذریعہ ہی عوام تک پہنچتی ہیں۔ کسی ملت و قوم کے اجتماعی ذہن اور فکری رجحان کو سمجھنے میں اخبارات بہت مدد اور معاون ثابت ہوتے ہیں اس کے علاوہ عوامی رائے اور فکر کو ہموار کرنے کا ایک بڑا ذریعہ اخبارات ہی ہیں۔

آج وقت کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ انسان کو انسان بنایا جائے۔ اس کے پھیلتے ہوئے رشتوں اور دنیا کی لمحہ بہ لمحہ ترقی کی آگہی دی جائے۔ اسکے اسی عظمت و صلاحیت اور قابلیت سے باخبر رکھا جائے، اخبارات اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ دیتے آئے ہیں۔ تاریخی صحافت کے بغور مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اخبارات صنعت سے زیادہ مشن ہے، ایک ایسا نیک اور بامقصد مشن ہے جو انسان کی مثبت قدروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، سماج اور معاشرے

میں پھیلنے والی برائیوں اور بیماریوں کا انسداد کرتا ہے۔

ہندوستان جیسی ترقی پذیر ملک میں اخبار کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ جمہوریت اور سیکولزم کی بقا، اور تحفظ کے لیے اخبارات بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔

عوامی تنقید اور نکتہ چینی اخبارات کے ذریعہ حکومت کے ایوانوں میں پہونچتی ہیں اور حکومت کو صحیح راستہ اور مناسب رویے کی نشاندہی کرتی ہے ان بنیادوں پر حکومت، پریس اور عوام کا رشتہ بہت ٹھوس اور مستحکم بنتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہماری حکومت نے شخصی آزادی اور اظہار تحریر و تقریر کو بنیادی حقوق میں شامل کیا ہے۔

اخبارات قوم کی سیاسی و سماجی تربیت، قومی مسائل پر بحث و تمحیص حکام و عوام کے درمیان ضروری مفاہمت کا بڑا اہم اور ذمہ دار وسیلہ ہے۔ انگریزوں نے اپنے مسیحی مذہب کی تبلیغ کے لیے خیر خواہ ہند، خیر خواہ خلائق، مخزن مسیحی، مواعظ عقبیٰ، بڑے پیمانے پر شائع کئے۔

۱۹ صدی کے اواخر میں اخبار، رسائل و جرائد کی بھرمار تھی جنھوں نے کوئی عنوان نہ چھوڑا۔ اظہار خیال کی آزادی اور برطانوی سامراج کی مخالفت حب الوطنی کے جذبہ کے ساتھ اردو صحافت نے بخوبی کی، چنانچہ کلکتہ میں راجہ رام موہن رائے اور دہلی میں مولانا باقر نے "دلی اردو اخبار" کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کاوشوں سے قوم کو پیغام آزادی پہونچایا۔ مذہب تہذیب و ثقافت اور سیاست کے مسائل اور انکے حل بھی اردو صحافت نے خاطر خواہ طریق پر پیش کئے۔

اخبار دھرم پرچارد کے مالک امبا پرشاد اور ایڈیٹر صادق حسین نے تمام مذہبوں کی یکجہتی اسلامی اور ویدانت فلسفہ پر ساتھ ساتھ مضامین شائع کئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے ذریعہ انڈین نیشنل کانگریس کی آزادی کی جدوجہد سے اردو صحافت کو مقبول و مستحکم اور ہمہ گیر بنایا۔

مولانا محمد علی جوہر کا "ہمدرد"، مولانا شوکت علی کا "خلافت" ظفر علی خاں کا "زمیندار"، مولانا حسرت موہانی کا "اردوئے معلیٰ"، "پیام مدینہ"، "ہمدم"، بھی اس تحریک کے ترجمان اور رہنما تھے۔

آزادی کی جنگ میں پریس ایک کی زیادتی سے بمبئی کے لئے ہندوستانیوں نے بیرونی ممالک سے بھی اخبار نکالے چنانچہ تلوار برلن سے ہندوستانی اخبار سان فرانسسکو سے شائع ہوئے اور سید حسین نے یادوطن نیو یارک سے اجرا کیا۔

ہفت روزہ (پندرہ روزہ) اخباروں کی صحافت

عموماً ہفت روزہ اخبارات نظریاتی یا کسی مخصوص پالیسی مسلک یا جماعت کے ترجمان ہوتے ہیں اور سیاسی صورتحال اور حالات حاضرہ کا تجرباتی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

ایسے اخبارات اپنے نکتہ نظر کی روشنی میں واقعات اور حالات کی تصویر پیش کرتے ہیں اور ان پر تبصرہ یا رائے بھی دیتے ہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ رائے اکثر جانبدارانہ ہوتی ہے مگر کسی مخصوص ذہن اور فکر و نظر رکھنے والوں کی صحیح سوچ اور خیالات سے روشناس کراتے ہیں۔ اس طرح ہمیں اس جماعت یا نظریات رکھنے والوں کا براہ راست ردعمل معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک بات اور ضرور ہے کہ یہ اخبار بالعموم اپنے حلقہ اور خاص وسائل سے دلچسپی رکھنے والوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔

موجودہ اردو صحافت

آج کے حالات میں جبکہ صحافت کی وقعت اور اہمیت کافی بڑھ گئی ہے صورت حال مختلف ہوتی جارہی ہے۔ صحافت اب مشن سے زیادہ صنعت بنتی جارہی ہے مستحکم ٹھوس اور صحت مند پالیسیوں کا رویہ دھیرے دھیرے مفقود ہوتا جارہا ہے اور ذاتی مفاد کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

خبریں اطلاع یا آگاہ کرنے کے بجائے سنسنی خیزی چونکانے اور مشتعل کرنے کا ذریعہ بن گئیں ہیں اور اس قسم کی خبروں کو نمایاں مقام دیا جاتا ہے۔ صحیح خبریں اور صحیح صورت حال کو مسخ کرکے پیش کیا جاتا ہے آزادانہ صحافت کا تصور مٹتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی زندگی اور ذہن پر اخبارات وہ اثرات مرتب نہیں کر پا رہے ہیں جو ہونا چاہئے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ اخلاقی قدریں گرتی جارہی ہیں۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے مشہور واقعہ ہے کہ

اٹلی سے ایک نہایت ہی مقدس اور قابل قدر ہستی کا جب نیویارک ایرپورٹ پر شاندار استقبال ہو رہا تھا، کسی پریس رپورٹر نے ازراہ تمسخر ان سے سوال کیا "آپ یہاں کے کسی نائٹ کلب کو بھی دیکھنا چاہیں گے"؟ انھوں نے اس سوال کو مزاق میں ٹالنے کے لئے ویسے ہی پوچھا۔ کیا یہاں پر اچھے نائٹ کلب بھی ہیں۔ اس سوال کو اخبار نے اسطرح چھاپا۔ اٹلی کے پوپ کا ایرپورٹ پر پہلا استفسار کہ نیویارک میں اچھے نائٹ کلب ہیں!

اردو قارئین سے یہ شکایت ہے کہ اردو اخبارات و رسائل کو خرید کر پڑھنے اور ان کی پذیرائی کرنے کا رجحان بہت کم ہے۔ لہذا اخبارات کے مدیران اور مالکان کی بے مائیگی اور مالی وسائل کی دشواریاں انہیں مختلف سمتوں میں جھکنے پر مجبور کر دیتی ہیں یہ صورتحال جتنی افسوسناک ہے اتنی ہی سچ بھی ہے۔

اس کے علاوہ اخباروں کی اخراجات روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ حال ہی میں اخبارات و اشتہارات کی ایک انجمن انڈین اینڈ ایسٹرن نیوز پیپرس سوسائٹی نے اپنی رپورٹ میں اس طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے کہ اخباری کاغذ میں اضافہ تنخواہوں پر نظرثانی اور دیگر اشیاء کے لاگت کے باعث اخبارات بدترین معاشی مشکلات سے دوچار ہیں۔

ان حالات میں کم سرمایہ کے اخبارات دم توڑتے جا رہے ہیں اور صحافت سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھوں بکتی جا رہی ہیں۔ ایماندارانہ اور صاف ستھری صحافت اب خال خال میں نظر آ رہی ہے۔

حکومت ہند کی مقرر کردہ گجرال کمیٹی نے اپنی مبسوط رپورٹ میں صحافت کے باب میں وضاحت کے ساتھ یہ بات پیش کی ہے کہ اردو صحافت نہ صرف کمزور ہے بلکہ اس میں عصری تقاضوں اور نئی فنی اختراعات سے مستفید ہونے کی استطاعت بھی نہیں ہے۔ اسی بناء پر اردو صحافت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لئے حکومت کیطرف سے بہت ساری سہولتوں اور مراعات کی سفارش کی ہے۔ فلموں، مشاعروں، غزلوں اور قوالی محفلوں سے اردو مقبول ہے لیکن صحافت ہی اس کو دیرپا طاقت بخش سکتی ہے اس لئے اردو صحافت کی ترقی کے لئے ممکنہ اہتمام ضروری ہے۔

چند مشورے

۱۔ صحافت کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ان کو خود کفیل بنایا جائے تاکہ وہ ہر حالت میں آزادانہ پالیسی اختیار کر سکے اور ہر قسم کے بیرونی دباؤ کا مقابلہ کر سکے۔

۲۔ تمام اہم یونیورسیٹیوں میں صحافت کے علیحدہ شعبے قائم کئے جائیں۔ تعلیم یافتہ ذمہ دار صحافیوں کے ذریعہ ملک میں صحت مند رائے عامہ اور پر امن فضا پیدا کی جا سکے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ صحافیوں کو معاشی آسودگی حاصل ہو اور انہیں سماج میں مناسب مقام دیا جائے۔

۳۔ ہندوستان کے اخبارات خصوصاً اردو اخبارات تکنیکی اور سائنسی اعتبار سے بہت پچھڑے ہیں۔ آج جب دنیا بھر میں اخبارات کے معاملہ میں لے آؤٹ اور ڈیزائننگ کی اہمیت کافی بڑھ گئی ہے۔ اخبارات دیدہ زیب اور پرکشش بنانے پر توجہ نہیں دیتے۔

۴۔ اردو اخبارات میں سب سے بڑی رکاوٹ کتابت اور طباعت کی دشواریاں ہیں۔ کتابت نہایت دشوار اور وقت طلب عمل ہے جب کہ اخباروں کے لئے وقت کی کافی اہمیت ہوتی ہے۔ کتابت اور خطاطی کے مدارس زیادہ سے زیادہ کھولے جانے چاہئیں۔

حال میں پاکستان کے مشہور اخبار "جنگ" نے اپنے لاہور ایڈیشن کو فوٹو ٹائپ سیٹ کمپیوٹر کے ذریعہ طبع کرنے کا تجربہ کیا ہے اس اقدام سے کتابت اور طباعت کا کام جہاں آسان اور سہل ہو گیا ہے وہیں تیز رفتار بھی ہو گیا ہے۔ ہمارے اخبارات کو بھی طباعت کے جدید تکنکات پر توجہ دینی چاہئے اور پیش رفت کرنی چاہئے۔

۵۔ خبروں کے لئے اردو ٹیلی پرنٹر کی کوشش کی جا رہی ہے اور کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔ اس ایجاد سے ترجمہ کرنے کی محنت کم ہو جائے گی اور وقت بھی بچ رہے گا۔

خلیل زاہد

اردو صحافت اور اس کے مسائل

ماضی اور حال کے آئینے میں جب ہم اخبارات یا جدید اصطلاح میں 'اخباری صنعت' کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اخبارات نے ارتقائی مرحلوں سے گذر کر اب وہ مقام پالیا ہے کہ وہ زندگی کے معمولات میں داخل ہو چکے ہیں۔ اخبارات کا مطالعہ مہذب سوسائٹی کا لازمی جزو بن چکا ہے۔ ناشتہ کی میز پر صبح کسی اخبار یا کئی اخبارات کی موجودگی لازمی تصور کی جاتی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں دلکش اور جاذب نظر اخبار و رسالے صرف مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کا مقام بھی حاصل کر چکے ہیں انہیں معیار زندگی کے پیمانے کے طور پر بھی استعمال کیا جانے لگا ہے۔

اخبارات خواہ وہ کسی زبان کے ہوں' اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبانوں کی اصلاح و ترتیب افکار و خیالات کی تبلیغ و اشاعت عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا، نیز اس دنیا کے تقاضوں کی تکمیل کا شدید احساس پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم صرف اردو اخبارات کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں اس لئے دیگر زبانوں کا تذکرہ ضمنی طور پر ہی آئیگا۔ اٹھارویں صدی میں برطانوی عہد کے ساتھ ہندوستان میں باقاعدہ طبع شدہ اخبارات کا دور شروع ہوا۔ ابتدار میں کلکتہ کو اخبارات کی اشاعت میں سبقت حاصل رہی۔ جہاں تک انگریزی صحافت کا تعلق ہے مغربی بنگال کی صحافت آج بھی دوسروں سے آگے ہے۔ لیکن اردو اخبارات کے معاملہ میں اتر پردیش، دلی اور پنجاب کو ہمیشہ ہی فوقیت حاصل رہی۔ ابتدار میں انگریز تاجروں، عیسائی مشنریوں اور تاج برطانیہ کے محدود مفادات تک ہی یہ صنعت محدود رہی۔ مغربی بنگال سے شمالی ہند کی طرف انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کے ساتھ خبر رسانی کا یہ اہم ذریعہ بھی آناً فاناً سارے ملک میں پھیل گیا۔ ان حالات میں انگریزوں کی حکومت کا کام چلانے کے لئے انسانی کل پرزے تیار کرنے کی غرض سے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ ان اسکولوں پر عیسائی مشنریوں اور نصرانی عقائد کا تسلط تھا جو ملک کے پست اور پسماندہ علاقوں کی معاشی زبوں حالی کا استعمال کر رہے تھے۔ اور انہوں نے در پردہ عیسائی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اخبارات کی اشاعت کے ساتھ پوری ہندوستانی قوم پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگریزی صفحہ ہستی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس تبلیغ کا سلسلہ اس قدر باقاعدہ اور منظم تھا کہ ملک میں سماجی، معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، علمی و ادبی رجحانات

میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ دیسی زبانوں کے مقابلہ میں انگریزی زبان کو برتری حاصل ہو گئی۔ اور انگریزی اخبارات کو اولیت کا درجہ ملا۔ دیگر ہندستانی زبانوں حتیٰ کہ اردو کو بھی جو اس وقت تک ملک کی درباری اور سرکاری زبان اور عوامی رابطہ کی واحد مقبول زبان تھی ثانوی حیثیت حاصل ہوئی۔ اور اردو اخبارات کو نہ صرف ثانوی درجہ ملا بلکہ وہ معتوب بھی رہے اس عہد کی اخباری رپورٹوں سے صحافتی مزاج اور رائے عامہ کے رجحانات کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہ شکایت عام طور سے ملتی ہے کہ " جو اخبارات مغربی افکار کی تبلیغ کرتے ہیں انکی وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوتی جو دیسی عوام کے جذبات و احساسات کی براہ راست ترجمانی کرنے والے اخباروں کو نصیب ہوتی ہے۔"

اس زمانہ میں ہماری صحافت جس نازک دور سے گذر رہی ہے اس کا اندازہ اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ " تمام مسائل میں عموماً اور سرکاری مفادات کے معاملہ میں خصوصاً اظہار رائے میں اخباروں کے ایڈیٹر احتیاط برتتے تھے "

یہی بات آگرہ کے فارسی اخبار " زبدۃ الاخبار" کے بارے میں زیادہ واضح اور دلچسپ انداز میں بیان کی گئی تھی ۔

" ایڈیٹر کسی معاملہ میں نہ تو اپنی رائے ظاہر کرتا ہے اور نہ کوئی قابل گرفت بات لکھتا ہے۔ وہ بے حد محتاط ہے بے اطمینانی کے اظہار کی اگر کبھی نوبت بھی آتی ہے تو اپنے خیالات کو رنگین عبارت کا جامہ پہنا دیتا ہے "

متعلقہ سرکاری محکمہ دیسی اخباروں کا جتنا غائر مطالعہ کرتا تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جتنی گہری نظر رکھتا تھا اس کا ذیل کے بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کا بریلی کے اخبار سے تعلق ہے ۔

" ۷ر نومبر ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں انگریزوں کو ہندستان بدر کرنے کے خیال کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ لیکن مضمون نگار نے اپنے نقطۂ نظر کو اس بھونڈے انداز سے پیش کیا ہے کہ اس سے غلط فہمی پیدا ہونے کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ اگر احتیاط برتی جاتی تو اس تذبذب سے یقینا احتراز کیا جاسکتا تھا اور یہ اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ ان رپورٹوں میں میں جگہ جگہ یہ شکایت ہمیں ملتی ہے کہ "

یہ تمام اخبارات اگرچہ خوش اسلوبی و خوش کے حامل ہیں مگر حکومت کو نہ تو اپنے قوانین وغیرہ سے متعلق دیسی رائے عامہ کے رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ ہی دیسی عوام کے جذبات و احساسات کا، یا ان کی ضرورت ہی کا، ان کے ذریعے حکومت کو علم ہوسکتا ہے

اس زمانہ کے اخبارات میں محتاط ایڈیٹروں کے جھرمٹ میں ایسے منہ پھٹ ایڈیٹر بھی ملتے ہیں جو یہ لکھنے سے بھی نہیں ڈرتے تھے کہ:۔

"کسی نووارد ولایتی جج کے سامنے دلائل پیش کرنا ایسا ہی ہے کسی اندھے کے ہاتھ میں آئینہ دیدیا جائے یا بھینس کے سامنے سونا ڈال دیا جائے "

ایک اور سرکاری رپورٹ میں مولوی محمد باقر کے دہلی اردو اخبار کے متعلق لکھا گیا ہے کہ:۔

" یہ اخبار ذاتیات سے بھرا رہتا ہے۔ ذی اثر مقامی شرفا جو اس ایڈیٹر کے مذہبی خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں وہ ان کی پگڑی اچھالتا ہے اور اس حقیقت کا اندازہ " دہلی اردو اخبار کی ایک رپورٹ سے ہوتا ہے "

اس رپورٹ کا حوالہ دینے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ دہلی کی شعری زندگی دو گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔

ایک پارٹی استاد ذوق کی تھی دوسری پارٹی غالب کی۔ متذکرہ اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر استاد ذوق کے فدائیوں میں تھے۔ اس لئے قدرتاً انکا "دہلی اردو اخبار" غالب کی مخالفت اور ذوق کی ہمنوائی کے لئے وقف تھا۔ اخبار نے قمار بازی کے شبہہ میں مرزا غالب کی گرفتاری کی خبر "قماربازاں" کی سرخی کے ساتھ اس طرح شائع کی۔

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے۔ مثلاً ہاشم خان وغیرہ یہاں بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب وکثرت مرداں کے کسی طرح سے کوئی تھانے والا دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار جو قوم سے سیّد اور بہت جری سنا جاتا ہے۔ مقرر ہوا ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت سے رئیسوں کی سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانتداری کو قائم رکھا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ ہوا۔ مرزا نوشہ سو روپیہ نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید۔"

متذکرہ مثالیں پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اردو اخبارات ورسائل کے ایڈیٹروں اور مالکان پر سختیوں کا سلسلہ انیسویں صدی کے اوائل ہی سے شروع ہوگیا تھا اس طرح وہ سرکاری معاملات پر کم توجہ دیتے تھے اور آپسی مسائل میں زیادہ الجھے رہتے تھے اس کا ایک بڑا نفسیاتی سبب یہ تھا کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی تھی اس لئے انہوں نے سب سے زیادہ ضرب اردو اور مسلم کلچر پر لگائی۔ تبلیغ واشاعت کے اپنے ذرائع سے انہوں نے ہندستانی قوم کے تعلیم یافتہ افراد میں بھی یہ احساس پیدا کیا کہ اردو اخبارات ثانوی درجہ کے اور اردو صحافی واخبار نویس دوسرے درجہ کے ہیں۔ اس کا اثر مجموعی اعتبار سے اردو اخبارات پر پڑا۔ اور اردو اکثریت کے رابطہ کی زبان ہوتے ہوئے بھی حکمرانوں اور عوام کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کی صلاحیت سے محروم کردی گئی۔

اس طرح کی امتیازی کارروائی سے ملک کے مختلف طبقوں میں دوری پیدا ہوئی جس کے سنگین نتائج وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے۔ اس صورتحال کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ آزادی کے ۳۵ سال بعد بھی دستوری اعتبار سے تسلیم شدہ "قومی زبان" ہندی یا ہندی اخبارات کو بھی وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جو انگریزی اخبارات ورسائل کو ہے۔ جہاں تک دیوناگری رسم الخط اور فارسی رسم الخط میں شائع ہونے والے ہندی اور اردو اخبارات کا تعلق ہے۔ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں" مئی ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا۔ جبکہ ہندی کا پہلا اخبار "اودنت مارتنڈ" ۳۱ر مئی ۱۸۲۶ء میں شائع کیا گیا۔ یہ دیوناگری رسم الخط کا اخبار تھا۔ لیکن اردو الفاظ بکثرت استعمال کئے جاتے تھے۔ ہندی اخبارات اشاعت کے معاملہ میں آزادی سے قبل تک اردو اخبارات سے بہت پیچھے تھے۔ اردو صحافت کا ماضی کافی شاندار رہا ہے آزادی کی لڑائی میں اردو اخبارات کے سرگرم رول سے کون انکار کرسکتا ہے۔ آزادی کے بعد سرکاری پشت پناہی نے ہندی صحافت کو فروغ عطا کیا اور اردو اخبار عدم توجہی کے شکار رہے آزادی سے قبل انگریزوں کی اردو دشمنی اور آزادی کے بعد حکومت وقت کی بے اعتنائی کے نتیجہ میں اردو اخبار تمام کوششوں کے باوجود ترقی تو کیا کرتے مگر بہ اعتبار صنعت استحکام بھی حاصل نہ کرسکے۔ آئے دن نئے اخبارات ورسائل کا نکلنا اور اسی رفتار سے انکا خود اپنی موت مرجانے کا عمل اِس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اردو داں اور اردو نواز سرمایہ دار اردو اخبارات کے فروغ واستحکام کے لئے سرمایہ کاری سے خوف زدہ ہیں سرمایہ دار اور صنعت کار اپنے مخصوص کاروباری ذہن سے سب سے پہلے یہ غور کرتا ہے کہ کسی صنعت میں لگائے گئے اس کے سرمائے کی واپسی کتنے فیصد ہوگی۔

اگر یہ شرح دیگر کاروباری منافع کی شرح سے کم ہے یا صفر ہے تو پھر وہ کبھی بھی سرمایہ کاری کا حوصلہ نہیں کر پاتا۔ اس کاروباری دوڑ میں بھلا گھاٹے کا سودا کون کرے ہمارے سرمایہ دار اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد تو معقول ہے لیکن ان میں اخبارات کے تعلق سے قوت خرید صفر کے برابر ہے اور خیر سے بنیادی طور پر گھروں میں اردو بولنے اور سمجھنے والا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اردو اخبارات و رسائل خریدنا کسر شان سمجھتا ہے میں ان چوٹی کے اردو اسکالروں اور لیڈروں سے واقف ہوں جنکی روزی روٹی اردو ہے جن کی لیڈری اردو کے سہارے چلتی ہے لیکن وہ اخبارات کو مفت حاصل کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں جو اخبارات ورسائل خریدنا نہیں جانتے اور اعزازی کاپیاں حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ جب ممتاز شخصیتوں کی حالت یہ ہو تو دوسروں سے بھلائی کی کیونکر توقع کی جا سکتی ہے غور کا مقام ہے کہ جن لوگوں سے اردو کی بقا اور ترقی کی امید ہے وہی دغا دے رہے ہیں وہ اردو کو ایک داشتہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ داشتہ بھلا بیوی یا گھر کی مالکہ کی حیثیت کس طرح حاصل کر سکتی ہے۔

جہاں تک اردو کی اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا تعلق ہے اس کا دلنشیں اسلوب بیان۔ پرکشش لب ولہجہ، اثر آفریں انداز اور اسکی ہمہ گیر مقبولیت اردو اخبارات کی ضامن ہے۔ بشرطیکہ ان کی طباعت و اشاعت اور اخبارات کی ترقی کے لئے جدید تیکنک اور معلومات کو کام میں لایا جائے۔ ترسیل و تقسیم کا باقاعدہ نظام ہو کاروباری اعتبار سے بھی نفع ونقصان مد نظر رکھا جائے، فنی اور صحافتی اعتبار سے بھی معیاری ہو۔ عوام کے جذبات واحساسات کی بھی ترجمانی ہو لیکن جذباتیت اور چھچھوراپن غالب نہ ہوتاکہ عوام کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی ہوتی رہے اعلیٰ معیار کے بامقصد اخبارات کی نہ صرف گنجائش ہے، بلکہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت بھی۔ ایک بار اس ضرورت کا احساس ہوگیا تو اسے عملی جامہ پہنانا مشکل نہیں ہوگا۔

اردو اخبارات سے ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں اور فرقہ وارانہ نوعیت کی خبریں نمایاں طور پر شائع کی جاتی ہے۔ اگر ہندی یا انگریزی اخبارات کو مد نظر رکھا جائے تو وہ چند قدم آگے دکھائی دیں گے۔ جہاں تک قومی یکجہتی کا سوال ہے اردو اخبارات نے اس سلسلہ میں بیحد مثبت رول ادا کیا ہے۔

موجودہ اردو اخبارات کے ان مالکان اور بزعم خود "بڑے" اردو صحافیوں سے ہم کلام ہونے کی اجازت چاہونگا۔ جنہوں نے اخبار کی اشاعت سے اپنا تعلق صرف کاروباری حد تک قائم رکھا ہے۔ دراصل اردو صحافت کی پستی اور گراوٹ کے یہی لوگ ذمہ دار ہیں۔

اس صورت حال کی جس قدر ذمہ داری، بے حس اردو داں طبقہ پر عائد ہوتی ہے اتنا ہی ذمہ دار اردو صحافی بھی ہے بے حس اردو داں طبقہ اردو اخبارات ورسائل کی خریداری میں قطعی دلچسپی نہیں رکھتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محدود اشاعت کے باوجود اردو اخبارات کے قارئین کی تعداد کسی بھی طرح دوسری زبانوں کے قارئین سے کم نہیں لیکن وہ محض مانگے سے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا بمبئی کے انگریز صحافی پادری جے لانگ نے ۱۸۵۵ء میں اسی سمت اشارہ کیا تھا کہ

"ہندوستانی اخباروں کی ظاہری شکل حقیر سی ہوتی جا رہی ہے دوسری مطبوعات کے مقابلے میں دیسی اخباروں کی اشاعت کم ہوتی ہے لیکن ان کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے"

پادری جے لانگ کے یہ الفاظ آج انیسویں صدی کے اردو اخبارات کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

قومی سطح پر اردو صحافیوں کی تعداد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اردو کے باقاعدہ تربیت یافتہ صحافی عنقا ہیں۔

جبکہ اخباری برادری سے ہٹ کر خواص میں عالم یہ ہے کہ ہر بڑا ادیب، ہر بڑا شاعر بڑی ڈھٹائی اور بے خوفی سے خود کو ہی صحافی بتاتا ہے تاکہ وہ صحافت کے طفیل حاصل ہونے والی مراعات کا حقدار بن سکے۔

اس پس منظر میں ضروری ہے کہ صحافی کے اصل مفہوم کا جائزہ لیا جائے۔ عام طور پر ایک پیون یا چپراسی وہی شخص ہوتا ہے جو کسی دفتر یا کارخانے یا تجارتی ادارے میں چپراسی کی خدمات پر معمور ہو۔ کلرک اور افسروں پر بھی یہی بات پوری اترتی ہے اسی طرح ایک صحافی بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جو باقاعدہ کسی اخبار یا رسالہ سے وابستہ ہو۔ اکا دکا مضامین لکھنے والے اور جیسے کہ مراسلہ نگار بھی اردو صحافی بن بیٹھے ہیں۔ بدنام نہاد صحافی ہی مراعات کی خدمت میں نظر آتے ہیں۔ جبکہ بے چارہ حقیقی صحافی اخبار کے دفاتر کے گھٹے ہوئے ماحول میں ساری عمر قلم گھس کر دم توڑ دیتا ہے اسے تن ڈھانکنے کو کپڑا بھی میسر نہیں ہوتا۔ سر پر چھت تو دور کی بات۔ اس کے لئے پیٹ بھر کھانا ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔

اردو اخبارات کے دفاتر بھی اٹھارہویں صدی کے کسی عجائب گھر سے کم نہیں سائنس اور تیکنک کی معراج تک پہنچنے کے باوجود اردو اخبارات ابھی تک صدیوں پرانے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ زیر مشق ہاتھوں میں لئے اکڑوں، بیٹھے کاتب سائنس اور تیکنک سے اردو دنیا کی غفلت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کمپیوٹر کے عہد میں اردو اخبار ابھی تک ہاتھوں سے لکھی لکیروں کے محتاج ہیں۔

تحریر و تقریر کے آزادی کے باوجود ہر اخبار ایک محدود پالیسی میں جکڑا نظر آتا ہے۔ بلاشبہہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات بھی اس عیب سے پاک نہیں۔ لیکن وہ اپنا نظریہ اس خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ان پر گرفت ممکن نہیں۔ بیچارا اردو صحافی اس معاملے ابھی بہت پیچھے ہے۔

عام طور سے نجی ملکیت والے اردو اخباروں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سرکار وقت کی کھل کر حمایت کریں۔ جبکہ مخصوص جماعتوں سے وابستہ اخبار محض اپنے نظریات کا پروپگنڈہ کرتے ہیں اور وہ بھی اس بھونڈے انداز سے کیا جاتا ہے کہ پہلا ہی صفحہ ساری پالیسی بے نقاب کر دیتا ہے۔ نجی ملکیت والے اخبارات کی سرکار نوازی کی وجہ یہ ہے کہ ان میں احساس کمتری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ مالکوں کے ذہن پر سرکار اور سرکاری اشتہارات کا بھوت اسقدر سوار رہتا ہے کہ وہ اندھا دھند سرکاری حمایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اردو کی خدمت تو محض اردو والوں کو بیوقوف بنانے کا نعرہ ہے۔

اردو اخبار کا ایڈیٹر بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ اس کے لئے سوجھ بوجھ سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ہر فن مولا ہو۔ وہ ترجمہ بھی کرتا ہے اور خبروں کا انتخاب بھی۔ ترتیب و تزئین کا ذمہ دار بھی قرار پاتا ہے اور اداریہ بھی لکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اداریہ میں اظہار خیال نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ایک پورا واقعہ یا خبر لفظ بہ لفظ دہرا دی جاتی ہے۔ اس خبر کی حمایت یا مخالفت میں آخری جملہ ایڈیٹر کا ہوتا کہ فلاں معاملے سے وہ متفق نہیں یا اس سے وہ اتفاق کرتا ہے اور بس اداریہ اختتام کو پہونچا۔

اداراتی عملے میں اکثریت جز وقتی اسٹاف کی ہوتی ہے۔ مترجم پروف ریڈر پیسٹر اور کاتب ہر شخص مل جائے گا لیکن اخبارات کی جان تصور کئے جانیوالے نامہ نگاروں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ سارا کام انگریزی اخبارات کے ترجموں، ایجنسی کی خبروں سے چلا لیا جاتا ہے۔ اگر بالفرض کسی اردو اخبار سے کوئی نامہ نگار وابستہ ہو تو سمجھ لیجئے اسکی حیثیت محض اعزازی ہوگی۔ حد تو یہ ہے کہ اردو اخبار ریڈیو جیسی سہولت تک سے استفادہ نہیں کرتے۔

اخبار نویسوں کی اجرتوں کا تذکرہ نہ کرنا بے انصافی

(بقیہ صفحہ ۱۳۲ پر)

عبدالسمیع بوبیرے

مہاراشٹر میں اُردو صحافت اور اسکے مسائل

پونہ میں اکیڈمی کے زیر اہتمام اُردو صحافت پر سیمینار میں جناب علی سردار جعفری، جناب خواجہ عبدالغفور، عبدالسمیع بوبیرے، ہارون رشید (علیگ)
خلیل زاہد اور انیس چشتی نے مقالات پڑھے، جعفری صاحب اور خواجہ عبدالغفور صاحب نے صحافت اور تاریخی روایات کا حوالہ دیا۔ جبکہ عبدالسمیع بوبیرے نے عملی صحافت
کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ ہارون رشید (علیگ) نے بھی تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے صحافت میں اخلاقی قدروں کے فقدان کا حوالوں سے احاطہ کیا ہے —
خلیل زاہد نے تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ اخباری صحافت کی ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے باعث اخبارات آج بھی اپنی سطح سے بلند نہیں ہو پائے۔
انیس چشتی نے اخبارات کے مواد، خبروں اور کاروباری اشتہارات کا فیصد کتنا ہونا چاہیے۔ اس پر بحث کی ہے۔ عبدالسمیع بوبیرے کا سیمینار کا یہ انتہائی مقالہ صحافت میں
رہنے والوں اور نئے آنے والوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ——— مدیر ...

اس مقالہ یا میری یادداشت میں چند ایک بے ربط باتوں کو ایسے
مسائل کو، جو میں مضمون کی شکل میں پیش کرنے جا رہا ہوں، اس سلسلہ میں
آپ تمام حضرات سے پہلے اور جب یہ چھپ جائے
تو اپنی صحافی برادری سے معذرت چاہوں گا کہ بعض تلخ حقائق نے مجبور کیا
کہ آج بجائے تعریف و توصیف کے تنقیدی جائزہ پیش کروں۔ اپنے نام کے
برعکس کام کر رہا ہوں، اس سمع خراشی کے لئے امید ہے آپ معاف فرمائینگے،
مجھے خوشی ہوگی اگر یہاں ہم کھل کر باتیں کریں یہ ہمارے اور ہماری اردو صحافت
دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوگی —

ہمارے ملک کی اُردو صحافت کی تاریخ، ہماری ریاست
مہاراشٹر میں اردو صحافت کی تاریخ اور تذکرے ہم نے پڑھے۔ اور اس پر بہت
کچھ لکھا بھی۔ اب ہمیں کسی تاریخ یا جائزہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم نے
اپنی تاریخ بنالی، اپنی احساس قائم کی، قربانیاں دیں، اور آج اس قابل ہیں
کہ ہم دوسروں کے ساتھ مل کر چل رہے ہیں کہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نظر
آتے ہیں، اور کہیں کہیں تو ایک دوسرے پر آنکھیں نکالتے ہوئے بھی نظر آتے
ہیں، اور یہ اسلئے کہ تقریر و تحریر کی ہمیں آزادی حاصل ہے۔

برطانوی دورِ حکومت میں بھی اور آزادی سے لیکر آج تک مہاراشٹر
نے صحافت کے ضمن میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ صحافت ایک ایسا ہتھیار
ہے جو صحیح ہاتھوں میں لگا تو تعمیر کھدائی کرتا ہے اور غلط ہاتھوں میں لگا تو..
دوسروں کی قبریں کھودنے لگتا ہے۔ صحافت کا صحیح مفہوم، صحیح استعمال اور
صحافت سے کما حقہ واقفیت اور تجربہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صحافت
میں کورا ذہن رکھنے کی حالت دھوبی کے گدھے کی طرح ہوتی ہے جس کا کام
روزانہ بوجھ ڈھونا ہوتا ہے۔ یعنی ایک ROUTIN ہے جو پورا کرنا ہے۔
صحافت میں جہاں مزاج میں بات آئی سمجھ لیجیے صحافت کا بیڑہ غرق ہو
گیا۔ صحافت میں جتنا CONTRIBUTION یا حصہ ایک مالک یا ایڈیٹر کا
ہوتا ہے، اتنا ہی حصہ کمپوزیٹر، کیلی گرافر یعنی کاتب، پروف ریڈر، سب ایڈیٹر
حتیٰ کہ کاپی پیسٹر کا بھی ہوتا ہے۔ یہ سارے اگر مشین کے پرزوں کی طرح مل کر

ٹھیک سے چلیں تو اخبار یا رسالہ کامیاب ہوتا ہے ۔

" آیئے ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ ہماری طاقت ۔ یعنی STRENGTH کیا ہے، ہم اپنے موقف میں کتنے کھرے ہیں، ہم اپنی پیشکش میں کتنے پرخلوص ہیں۔ گذشتہ تین سالوں میں ہم نے صرف تعداد بڑھائی یا اپنا معیار بھی بلند کیا۔ ہمارا CONTRIBUTION آج کے زمانے کے مطابق اردو صحافت میں کیا ہے ؟

اردو حلقوں میں اس بات کا بڑا چرچا رہتا ہے کہ مہاراشٹر اردو کا بڑا مرکز ہے ۔ سینکڑوں اردو ادارے ہیں، اردو میڈیم اسکول کالج اور تعلیمی ادارے ہیں، علمی، ملی ادبی مرکز ہے ۔ بمبئی اور پورے مہاراشٹر میں کئی ایک اردو مراکز سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں ۔ ہم اس ضمن میں تعداد بھی پیش کرتے ہیں ۔ حکومت سے گذارشات بھی کرتے ہیں سفارشات کرتے ہیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں، کوئی فائدہ نہیں ۔

مہاراشٹر میں صحافت کی عظیم الشان روایتیں پوشیدہ ہیں اس علاقے کی سماجی اور سیاسی زندگی کے ارتقاء میں اخبارات و رسائل نے اہم رول انجام دیا ہے ۔ مرہٹی کے علاوہ مہاراشٹر سے عموماً اور بمبئی شہر سے خصوصاً ہندوستان کی ہر زبان میں پرچے شائع ہوتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ ملک کے تقریباً تمام عظیم ترین کثیر الاشاعت اور مقبول ترین رسائل و جرائد مہاراشٹر کے صدر مقام بمبئی سے شائع ہوتے ہیں ۔ طباعت، صحافت، تشہیر، نشر و اشاعت، کا ایسا کوئی شعبہ نہیں ہے جس کا مرکز بمبئی میں موجود نہ ہو ۔ اسلئے بمبئی ہندوستان کا صحافتی مرکز کہا جاتا ہے ۔

آپ تعجب کریں گے کہ بمبئی جب صحافت کا مرکز ہے اور خصوصاً اردو صحافت کا اہم قلعہ ہے، پھر پونا میں اردو صحافت پر سیمینار کا انعقاد کیوں ؟ اردو صحافت کا بڑا تعلق بمبئی سے ہی نہیں بلکہ پونا سے بھی رہا ہے ۔ لیکن اس تعلق کی کڑی کچھ اور ہی ہے ۔ پونا مراٹھوں کا قدیم تاریخی شہر ہے ۔ یہ مراٹھوں کا زبردست سیاسی گڑھ رہا ہے ۔ مراٹھوں کی شیرازہ بندی جب شیواجی نے کی تو اس کا ایک ہی مقصد تھا مراٹھا قوم کو بیدار کیا جائے ۔

مہاراشٹر کے اس عظیم سپوت نے مراٹھوں کو اس مقام پر لایا کہ جہاں سے وہ سر اٹھا کر دیکھ سکیں چل سکیں اور دوسروں کو بھی راہ بتا سکیں۔ شیواجی نے مراٹھوں کی جو شیرازہ بندی کی اسے مراٹھوں نے ہی بکھیر دیا ۔ اور شیواجی نے مراٹھا نسل اور مراٹھا حکومت کا سیاسی و قومی شعور اپنی رعایا میں پیدا کیا۔ لیکن جیسا عام طور پر ہوتا ہے قوم اپنے اپنے ہادی، اپنے رہبر، اور رہنماؤں کے قول و فعل پر عمل کرنے کے لئے کچھ اتنا آگے بڑھتی ہے کہ بعد میں اسے پیچھے لانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے شیواجی نے مہر و محبت کے پیغام کو عام کرنے کی تلقین کی ۔ اور ان ہی بل بوتے پر مراٹھا راج قائم کیا ۔

زمانہ بدلتا گیا۔ انگریز آئے ۔ برطانوی دورِ حکومت میں بھی ایک بار پھر پونا ملک کے نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ پونہ یوں تو سیاحوں کیلئے کشش کا باعث ہے لیکن سیاسی لیڈروں کیلئے کم کشش کا باعث نہیں ۔ انگریزوں نے جب ملک کے سیاستدانوں پر نظرِ ستم ڈالی ۔ سیدھا پونہ لے آئے اور یرودہ میں بند کر دیا۔

پونا کو زیادہ شہرت ایرودہ جیل سے ملی ہندوستان کے نامور، رہنماؤں کو بار بار یرودہ لایا گیا کبھی نظر بند کیا گیا ۔ قید و بند کی چہار دیواری نے جہاں ملک بھر کی دیواروں کو ہلا دیا وہیں اس شہر اور اس ریاست کو کچھ زیادہ ہی سیاسی بیداری عطا کی، گاندھی جی کو بار ہا یہاں لایا گیا کسے معلوم تھا کہ جس خاک پہ گاندھی قدم رکھیں گے اسی خاک سے ایک آندھی اٹھے گی جو گاندھی کے خوف کی پیاس ہوگی ۔

آپ اس بات سے اندازہ لگائیں کہ سیاسی بیداری اس شہر میں اس زمانہ میں کس طرح رہی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف طبقات مختلف نظریات جو ملک بھر میں اپنا سر اٹھا رہے تھے ۔ ان طبقات نے اور ان نظریات نے پونہ اور بمبئی کے صحافت کو متاثر کیا ۔ مذہب اور سیاست کی خون آشام دو دھاری تلوار نے تقریر کے ساتھ ساتھ صحافتی تحریروں کے ذریعہ بھی خبر کا بازار گرم رکھا ۔ صحافت میں کبھی ڈھکے چھپے، کبھی کھلے عام یہ سلسلہ پہلے بھی ہم نے دیکھا اور آج بھی دیکھ رہے ہیں، اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ محض کٹر سیاسی یا مذہبی اصولوں کے باعث مراٹھی اور اردو صحافت میں یہ بُعد المشرقین رہا ، لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ چند ایک انگلیوں پر گنائے جانے والے پرچے بھی، مراٹھی اور اردو میں ، اب نئی دشا میں نئی سمت میں اپنا تعمیری نظریہ پیش کر رہے ہیں، میں نے قومی پریس میں نئی نسل کو تخریبی صحافت میں کم اور تعمیری صحافت میں زیادہ دلچسپی لیتے دیکھا ۔

مذہب اور سیاست کا جو ہتھیار انگریزوں کے خلاف اٹھایا گیا تھا ، بدقسمتی سے آج بھی کچھ اخبارات اس ہتھیار کو اپنے ہی بھائیوں کے خلاف استعمال کرنے پر تلے ہوئے ہیں ۔ جسے نہ حکومت پسند کرتی ہے اور نہ عوام ، یہ اخبارات ایک مخصوص مکتبِ فکر کے افراد کی تسکین کا باعث ہو سکتے ہیں ۔ قومی نقصان ایسی صحافت سے ہوتا ہے ۔

مراٹھی اور مارڈو صحافت کا ماضی بڑا جاندار رہا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مراٹھی صحافت کی ریڈرشپ ، CLASSESS یا MASSES دونوں طبقوں میں بڑی زبردست رہی ہے لیکن اردو صحافت کی ریڈرشپ یعنی قارئین کا معاملہ قطعی برعکس ہے ، مہاراشٹر کی اردو صحافت یا ملک بھر کی اُردو صحافت کو درپیش مسائل کا جائزہ لیں تو ذاتی مسائل زیادہ نظر آئیں گے ، اور اجتماعی کم ، ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ اردو پرچوں کی مقبولیت محدود ہے لیکن اردو زبان کے سب سے کامیاب اور کمرشیل فلمی پرچے "شمع" کی مثال لیجیے ، جو کثیر الاشاعت پرچہ ہے ۔ اس پرچہ نے نہ صرف اپنے مالکان کو بام عروج پر پہونچایا بلکہ آج یہ ایک طاقتور اردو فلمی پرچہ ہے ۔ میں نے صرف ایک ہی مثال یہاں کمرشیل صورت کا پیش کی ہے ایسے بیسوں پرچے اور اخبارات گنائے جا سکتے ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ بعض پرچے کیوں کامیاب ہیں اور اس کی کیا وجوہات ہیں نئے نظریات اور نئی باتوں کو لے کر آنے والے پرچے کیوں بازار میں ٹکتے نہیں ، یا بکتے نہیں ، اسکی صرف ایک ہی وجہ ہے جسطرح بعض پیشہ ور سیاست دانوں نے اقتدار کے نشہ کا عوام کو عادی بنایا ہے —

اسی طرح اردو صحافت میں بعض پیشہ ور صحافیوں نے ایک ہی ڈگر ، ایک ہی محور پر اردو صحافت اور اردو کے قارئین کو لٹو کی طرح گھماتے رہنا اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے ۔ آپ جو میٹر MATTER یعنی مواد پڑھنا چاہیں گے وہ نہیں ملے گا ۔ اردو کا صحافی جو چاہے گا وہی آپ کو پڑھنے ملیگا ۔ ایسے ہی صحافیوں نے اپنے ریڈرشپ کی کسوٹی تین زمروں میں تقسیم کی ہے ۔

(۱) سیاست (۲) مذہب اور تیسرے متفرق موضوعات مثلاً فلم اور ٹ وغیرہ ، آیا پہلے زمرے کی صحافت اور صحافی کا حال کیا ہے معلوم کریں ۔ آج کل کہتے ہیں کہ سیاست میں عقل کی ضرورت نہیں ۔ پہلے سیاست عاقل لوگوں کے لئے تھی ، آج یہ جاہل لوگوں کا میدان کارزار ہے اسلئے بعض سیاست داں جاہل حضرات بھی اردو صحافت میں گھس آئے ۔

۱۹۴۷ء کے بعد بمبئی کے کئی ایک نامور اردو صحافی ادھر ادھر ہو گئے تو ان کی جگہ ان لوگوں نے جو بمبئی میں روزی روٹی کے چکر میں آئے تھے ۔ جب کچھ نہ بنا تو صحافی ہو گئے ۔ چند ایک کلاسوں اور کتابوں سے لیس صحافت میں ان آنے والوں نے صحافت کا کاروبار پر قربان کیا ۔ یہ صحیح ہے کہ زمانے کے بڑھتے تقاضوں کے مقابلہ آدمی کو زندہ رہنے کے لئے ، اپنی ساکھ قائم کرنے کے لئے ، اقتصادی تقاضوں کا خیال رکھنا ضروری ہے لیکن ہر ایک کا اپنا فرض ہے اپنا کچھ ... CONTRIBUTION ہوتا ہے ۔

سیاست سے دلچسپی رکھنے والے صحافیوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ روز آنہ اپنے سیاسی مرشد کا درشن اپنے اخبار میں کرائیں ۔ اسکی شان میں قصیدے پڑھیں ایسے صحافیوں کے اخبارات محدود خیالات کے باعث محدود دائرے میں ہی گشت کرتے ہیں ۔ لیکن سب سے کامیاب صحافی اس زمرے کے ہوتے ہیں ان کا ہاتھ جگن ناتھ ہوتا ہے ۔

اردو صحافت میں قدم رکھنے والے ایک رنگروٹ سے جب میں نے یہ دریافت کیا کہ ایسی کون سی چیز صحافت میں تم نے پائی جو اس خارزار میں قدم رکھا ۔ اس رنگروٹ نے جواب دیا تمہیں معلوم نہیں صحافی بننے کے بڑے فائدے ہیں ۔ بے کار آدمی کو گویا جنت مل جاتی ہے ۔ کہنے لگے پہلے میرا وقت کٹتا نہ تھا ، اب بڑے آرام سے کٹتا ہے ۔ یہ گر مجھے میرے استاد نے سکھایا ہے جو ایک ہی پرچے پر روز آنہ تیس دن میں گھسیٹ گھسیٹ کر کسی طور شائع کرتا ہے ۔ پرچہ بعد میں چھپے یا نہ چھپے لیکن نام رجسٹر ہو جاتا ہے اور فائدے بھی نام سے حاصل ہوتے ہیں ، اس رنگروٹ نے بتایا کہ مجھے صحافت میں قدم رکھے ابھی سال بھر نہیں ہوا کہ روز آنہ میری ملاقات وزیروں سے ہوتی ہے ۔ اعلیٰ حکام سے ہوتی ہے ۔ صنعت کاروں سے ہوتی ہے فلمی ستاروں سے ہوتی ہے رنگروٹ صحافی نے اپنا ٹائم ٹیبل بتایا کہ صبح کا ناشتہ پریس کانفرنس میں ہوتا ہے ۔ پھر کسی وزیر یا کسی کمپنی کی جانب سے کسی شاندار ہوٹل میں پریس لنچ ہوتا ہے ۔ شام کی چائے پھر پریس کانفرنس میں ۔ رات کا ڈنر البتہ شراب کے بغیر ہوتا نہیں ۔

اس رنگروٹ صحافی نے مزید بتایا کہ اب تک وہ سال بھر میں یعنی ۳۶۵ دنوں میں بلاناغہ اپنے گھر اور اپنے ہوٹل کا خرچ ان دعوت ناموں کی وجہ سے بچائے ہوئے ہے میرے استفسار پر کہ اس سے صحافت اور تمہارے CONTRIBUTION کا کیا تعلق ہے ۔ وہ حضرت بلبلا اٹھے کہنے لگے اُردو صحافت میں کہیں CONTRIBUTION لیا دیا جاتا ہے ۔ ہمارا تو سرمایہ یا CONTRIBUTION یہی چند ایک COCKTAIL PARTIES یا چند ایک پریس کی پارٹیاں ہیں ۔ اخبار یہ اتنا پیسہ دیتا نہیں ۔ کہیں سے گھر خرچ ملتا نہیں ، اسلئے ہم نے صحافت اور خدمت کا یہ درمیانی

راستہ نکالا ہے ۔ ایسے واقعات حالات اور افراد ہیں ہر جگہ ملیں گے ، روزآنہ دو چار نعلوتوں کی لانچ میں دفتر میں حاضری دی بغیر اڈیٹنگ کے خبریں شائع کیں ۔ انتخاب کے بغیر من وعن مضامین شائع کئے اور خود کے لئے بھی اور ادارہ کے لئے بعض اوقات مسائل کھڑے کئے ۔ ایسے صحافی کبھی ایک ، دفتر میں ٹکتے نہیں ۔ اضطرابیہ کا کام اگر ۔ FRUSTRATION پیدا کرنا ہے تو ملے کے ایسے صحافیوں کا کام مزید FRUSTRATION پیدا کرنا ہے ۔ ذہنی انتشار میں مبتلا - FRUST -RATED - صحافیوں کا ٹولہ ایک اخبار کے بعد دوسرے اخبار پھر اسکے بعد تیسرے اخبار میں نوکری کرتا ہے پھر جب تمام گھاٹ کا پانی پی لیتا ہے تو نئے گاہک کی گھات میں لگا رہتا ہے کہ نیا اخبار نکال کر یا نکلوا کر اپنی بھڑاس نکالیں اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اسکی قبر بھی کھود دیں ۔ اُردو صحافت میں ایسے صحافیوں کا حال برا ہوتا ہے ۔ یہ کبھی نہ اپنے گھر کے ہوتے ہیں نہ اپنے گھاٹ کے ـــ

آئیے اب دوسرے زمرے کا حال دیکھیں جسطرح سیاسی پرچوں (اخبارات وجرائد) کے صحافی ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا لاتے ہیں ،، اسی طرح مذہبی اخبارات ورسائل کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے اور اس تعداد میں اردو جاننے والوں کی بڑی تعداد ہے ۔ مسلمانوں کی جتنی بڑی تعداد ہے اتنے ہی فرقے اور مسلک ہیں ، اردو کے صحافی کو یہاں بھی قسمت آزمائی کا اچھا موقع ملتا ہے ۔

آپ چاہے کسی بھی عقیدہ یا مسلک کے پرچارک یعنی مبلغ بنئے ۔ پھر دیکھئے گھر میں دھن برسنے لگے گا ۔ گھر پیر کا تو بجلی کے چراغوں سے تو روشن ہے لیکن پیروں کے پیر یعنی مذہبی صحافی کے ہاں دین نہیں بلکہ دنیوی زر کے جھومر لٹکتے ہوئے آپ پائیں گے ـــ صحافی (صحافی دین و دنیا دونوں کی نظر میں) مذہبی پرچے کا ہوتا ہے ۔ ہاتھ ہاتھ چومنے والوں کے ہاتھ میں مذہبی مضامین (جو عام طور پر کیچڑ اچھال مذہبی مناظروں پر مشتمل ہوتے ہیں ۔) پر مشتمل جریدہ یا اخبار بلا قیمت (منہ مانگی قیمت پر) تھما دیا جاتا ہے مذہبی لٹریچر پر کوئی ٹیکس نہیں ہوتا ۔ نتیجۃً دیگر زبانوں کی طرح اردو صحافت میں ایسے پرچوں کے صحافیوں کی بھی چاندی ہوتی ہے عام طور پر مذہبی پرچے مذہب کی تبلیغ کے بجائے مذہب کی اچھی باتوں کے بجائے ، اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ اور دوسرے کے مسلک کی تضحیک کرتے ہیں ۔ مختلف عقائد اور گروہوں میں بٹے ہوئے افراد ایسے پرچوں کو ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں ۔ سیاسی اور مذہبی مکتب فکر کو مواد فراہم کرنے والے پرچوں کے مدیران یا صحافیوں کی جیب بھی بھاری رہتی ہے اور پرچے بھی بھاری بھر کم ہوتے ہیں ۔ اشتہارات اور خریداری کے معاملہ میں بھی پرچے کامیاب رہتے ہیں ۔

اب تیسرا زمرہ یعنی متفرقات فلم ادب وغیرہ کے ضمن میں صحافت کا حال اور صحافیوں کی چال کیا ہے ۔

اگر فلمی پرچہ ہے تو سیاست اور مذہب کی طرح یہاں کامیابی قدم چومتی ہے ۔ فلمی پرچے کے صحافیوں کا طریقۂ کار عجلانہ ہوتا ہے ۔ فلمی صحافی بائیڈ روم اور بیڈ روم ، سیکس اور اسکینڈل ان چٹپٹی باتوں کو مدنظر رکھتا ہے ۔ اور اسکا اظہار اپنی تحریر اور ستاروں کی تصاویر کے ذریعہ پیش کر کے اپنے پیسے کھرے کر لیتا ہے ۔ فلمی پرچوں کا پہلے یہ حال تھا کہ فلم سے دلچسپی رکھنے والوں کو پرچے کا مدیر یا صحافی مواد فراہم کرتا تھا اور پیسہ بناتا تھا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ فلم والوں نے ایک نیا ٹرینڈ یا طریقۂ کار فلمی صحافت کر دیا ہے ۔ اور ظاہر ہے بہتی گنگا میں اُردو کا صحافی کیوں نہ ہاتھ دھوتا ـــ

فلمی ستارے اپنی چمک دمک قائم رکھنے کے لئے چند ایک صحافیوں کو پالتے ہیں ان صحافیوں یا صحافی نما حضرات کا کام اخبار ورسائل کو اپنے اپنے فلمی ستاروں کی ہر خبر سے باخبر ہوتا ہے ۔ سیاست مذہب اور فلم ان تینوں میدانوں کے پرچوں سے اگر سکہ رائج الوقت شخصیتوں کا ذکر ایک دن بھی اخبار یا رسالہ سے غائب ہا سمجھئے اس شخص کی اسی دن موت ہو گئی ، ـــ

اب ادبی پرچوں کے صحافیوں کو لیجئے ۔ آج کے علمی ادبی پرچوں کا صحافی جیب کے معاملہ میں ہلکا اور ادب کے معاملہ میں پھلکا ہوتا ہے ـــ محدود وسائل اور محدود اشاعت اور محدود دائرہ کار میں پرچہ شائع کرتا ہے ۔ سیاست مذہب اور فلم ان تینوں میدانوں کے پرچوں کے صحافیوں کو لیجئے ـــ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ زیادہ مقناطیسی شخصیت کا مالک نہیں ہوتا ۔ اس لئے پرچہ بھی کمرشیل نہیں ہو پاتا ـــ اشتہارات اور خریداری کے معاملہ میں بڑا بدنصیب ہوتا ہے ۔ جبتک چولہا گرم ہوتا ہے پھولا پھولا سا بڑا اچھا لگتا ہے جیسے ہی ہاتھ پڑتا ہے اندر سے کھوکھلا نکلتا ہے ۔ ادبی پرچے کا صحافی اپنی تعریف

کی لالچ میں ہر بار ہلکا بنتا ہے اور جب مطبع کا بل آتا ہے تو یہ ہلکا ہوا گلستہ بھی ہلکا ہو جاتا ہے ان صحافیوں کے یہاں بھی کئی ایک مسائل ہوتے ہیں۔ کاروباری رسالوں کے ایڈیٹر عام طور پر مشہور و مقبول قلم کاروں کو ہی نوازتے ہیں کیونکہ انھیں طوائفوں کی عشوہ طرازیوں کے چٹخارے دار قصوں سے پرچے کو کامیاب بنانا ہوتا ہے۔ سرکاری جرائد عام طور پر مصلحتاً شائع ہوتے ہیں اور قطعی غیر موثر ہوتے ہیں۔

آخری زمرے میں مختلف موضوعات ہیں — مثلاً تعلیم، سائنس، آرٹ وغیرہ۔ اردو میں شاید ہی ایسے پرچے چھپتے ہیں اور وہ بھی ان اداروں سے شائع ہوتے ہیں جن کا فنڈ اس کے لئے مخصوص ہوتا ہے ورنہ اردو والے زمانے کے بڑھتے تقاضوں کے مقابلہ میں مختلف موضوعات پر پرچے نکالنے سے بھی، خریدنے سے بھی اور پڑھنے سے بھی قاصر ہیں۔

ان تین چار CATEGARIES کے ذکر کے بعد اب ہم دیکھیں اردو صحافت نے اپنے ٹیکنیکل تقاضوں میں کس قدر ترقی کی ہے۔

طباعت | لیتھو طباعت اور اردو صحافت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اردو صحافت ( ) اس تار تار چولی کو کب تک لپٹائے رہتی۔ پتھر کے زمانے سے نکل کر جب انسان نے ترقی کی ہے تو اردو صحافت بھی کیوں پیچھے رہتی، اس نے بھی پتھروں (لیتھو اسٹون) کو خیر باد کہنا شروع کیا۔ دراصل کمرشل پرچوں کی بہتات نے بازار میں مقابلہ آرائی کا بازار گرم کیا تو آفسیٹ نے جگہ پائی، لیتھو طباعت کے مقابلہ میں آفسیٹ کی چھپائی یقیناً مہنگا سودا ہے لیکن اسکا رزلٹ بھی اتنا ہی اچھا ہے آفسیٹ میں متن کے ساتھ تصویر بھی چھپتی ہے۔ چھپائی بڑی شارپ ہوتی ہے جبکہ لیتھو اور لیٹر پریس میں یہ سہولت نہیں۔

آفسیٹ کی وجہ سے ایک خوشگوار تبدیلی ضرور آئی کہ کچھ روزنامے، ہفت روزہ، اور علمی نیم ادبی جرائد خوبصورت طباعت سے مزین ہوتے ہیں، دہلی کے مقابلہ میں مہاراشٹر میں اردو آفسیٹ اور کتابت بے حد اچھی ہوتی ہے۔ بڑھے اخراجات کے پیش نظر اور سرمایہ نہ ہونے کے سبب چھوٹے پرچے والے لیتھو طباعت کو مجبوراً سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

کتابت | مہاراشٹر میں کتابت کا فن ماضی میں بڑا شاندار رہا ہے، بمبئی ایک زمانے میں اچھے خوشنویسوں اور اساتذہ فن کا مرکز رہا۔ ریاست میں کاتبوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ کچھ نامور اساتذہ فن بھی ہیں۔ حکومت ہند کے زیر اہتمام کتابت کا تربیتی مرکز بمبئی میں ہے اور مہاراشٹر اردو اکیڈیمی کی مالی اعانت سے کتابت کے مراکز مختلف علاقوں میں ہیں، لیکن ان تمام مراکز سے تربیت پانے والے کاتب طلبہ کو ایک ہی بات سکھائی جاتی ہے کہ خدا خوشخط لکھنا شروع کر دو، چند ماہ میں کالی روشنائی سے بٹر پیپر پر مشق کرنے کے بعد یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ کاتب ہو گئے۔ وہ اپنے آپ کو پروین رقم سمجھنے لگتے ہیں اور ہوتے ہیں دراصل فنکار قسم۔ ہمیں ان طلبا کتابت کی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ انھیں فنکار بننے کی بھی ترغیب و تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

اردو اخبار و جرائد میں کاتبوں کی یوں ہی قلت رہتی ہے۔ لیکن آج تک میری سمجھ میں اور صحافی برادری کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس قلت کی وجہ وہ کون سی علت ہے جو نہ کاتبوں کا پیچھا چھوڑتی ہے اور نہ ہی صحافیوں کا — اچھے خوشنویسوں کی قلت کے باعث رنگروٹ کاتب بھی اب رنگروٹ صحافیوں کی طرح اردو صحافت میں در آئے، ایک فنکار خوشنویس اپنے خط کے ساتھ ساتھ پرچے کے گٹ اپ کا بھی خیال رکھتا ہے لیکن آج کل ماڈرن اور اسٹائل کے تجربہ کو دیکھ کر غیر مشاق کاتبوں نے جو بھونڈا طریقہ اختیار کیا ہے اس سے پرچہ کے وقار کو بھی دھکا پہنچا ہے۔ مثلاً اداریہ نوٹ، یا فٹ نوٹ وغیرہ کو جاری خط سے ممیز رکھنے کے لئے کتابت جس اسٹائل سے کی جاتی ہے، نہ کاتب، نہ ایڈیٹر اور نہ ہی قاری کی سمجھ میں وہ عبارت آتی ہے کہ یہ اردو ہے یا عجوبہ —

تصحیح پروف ریڈنگ | صحافت کا یہ بھی ایک جزو ہے — کاتب، مترجم یا مدیر فرشتہ تو نہیں ہوتا غلطی ہر ایک سے ہوتی ہے، غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے پروف ریڈر رکھا جاتا ہے انگریزی پرچوں میں پروف ریڈنگ کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے مگر یہ شعبہ کم نہیں، اور زبان پر اچھا عبور رکھنے والوں کو ہی پروف ریڈر رکھا جاتا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارے ہاں کے بعض پروف ریڈر دیکھا حاتم طائی کے قصے اور چند گانے کی کتابیں پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ عربی فارسی اور اردو سے قطعی نابلد، مطالعہ صفر، اسلئے اپنے سامنے جو آئی ہوئی خبر یا مضمون کو وہ صفر ہی سمجھتے ہیں۔ اسلئے کہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

متن کی باریکیوں کو چھوڑیئے، شہ سرخی BANNER HEAD-LINES میں ایسی فاش غلطیاں رہ جاتی ہیں کہ جسکی تلافی ناممکن ہے مثلاً اردو کے ایک اخبار نے یہ سرخی لگائی کہ فلاں صاحب کا

لیڈری قبول کرلی، کاتب نے لکھا، پروف ریڈر نے جانچا۔ پھر بھی غلطی پر نظر نہ پڑی، صبح جب لوگوں نے اخبار اٹھایا تو اسطرح سرخی تھی ,, فلاں صاحب نے فلاں صاحب کی لیڈری قبول کرلی۔

اب اخبار کے دفتر میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کا ترجمہ کس نے کیا۔ کتابت کس نے کی، پروف ریڈنگ کس نے کی۔ کاپی پیسٹنگ کس نے کی۔ حتیٰ کہ آخری پروف کس نے دیکھا۔ ایک دوسرے پر الزام ڈالا جاتا ہے اصولی طور پر مدیر چاہتا تو واضح اور صاف تحریر کاتب کے حوالے کرسکتا تھا کاتب چاہتا تو احتیاط (کم ازکم شاہ سرخی کے معاملے میں) برت سکتا تھا۔ اگر پروف ریڈر (جو یقیناً اس معاملہ کا ذمہ دار ہے) چاہتا تو بڑی توجہ سے کام کرسکتا تھا لیکن انہیں اتنی یا تو لیاقت نہیں ہوتی (یا پھر اسے کم تنخواہ کی صورت میں) ایک ہی ہدایت معلوم ہے کہ آنکھ بند کرکے کام کیا کرو، اردو اخبار کے دفتر میں کام کرنا ہے تو آنکھ بند کرکے کرو۔ اور اردو رسائل میں کام کرنا ہے تو کان بند کرکے کیا کرو۔ بعض صحافیوں کے اسی رجحان طبع نے اردو صحافت کے معیار کو بلند ہونے سے روکا ہے۔

ترجمہ

چوں کہ اردو اخبارات میں ہمارے اہل اردو پرنٹ پریس نہیں ہے اسلئے عموماً انگریزی سے ترجمے کا کام لیا جاتا ہے۔ مرہٹی کے بیشتر اخبارات کا یہ کہنا ہے بھی اچھی اور کارآمد خبروں کا جو اس علاقے سے تعلق رکھتی ہیں، ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ کام کرتے کرتے اور دیکھتے دیکھتے اردو صحافت میں لوگ ترجمہ کرنے لگ گئے ہیں۔ بہت کم مترجمین دیکھے جو ہمارے اخبارات کے دفاتر میں دونوں زبانوں پر عبور رکھتے ہوں اور معیاری نظر ترجمے کی رکھتے ہوں۔ وہ صرف گھسا پٹا ترجمہ کرنا جانتے ہیں۔ بھارت ارتھ موورز یا بھارت ہیوی الیکٹریکل لمیٹڈ کا ترجمہ ہمارے مترجمین اکثر اخبارات میں ہندوستان ارتھ موورز اور ہندوستان ہیوی الیکٹریکل لمیٹڈ کا ترجمہ اسطرح کرتے ہیں۔ جب میں نے مترجم سے کہا کہ بھائی یہ کمپنی کا نام ہے اسکا ترجمہ نہیں ہوتا تو وہ صاحب کہنے لگے ہم اردو اخبار میں بھارت نہیں ہندوستان لکھتے ہیں مجھے نیوز ایڈیٹر کی یہ ہدایت ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں کیڑے نکالنے والے۔ فائیو اسٹار اور تھری اسٹار ہوٹلوں کا ہمارے مترجم پانچ ستاروں والا اور تین ستاروں والا ہوٹل ترجمہ کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اسی طرح چھپ بھی جاتا ہے۔

ایک نومشق مترجم نے انگریزی کے اس جملے، POLICE WAS PATROLLING THE READ کا ترجمہ اسطرح کیا۔ ,, پولیس راستے پر پٹرول کا چھڑکاؤ کر رہی تھی ,, ایسے اور اسی قبیل کے ترجمے دیکھ کر ہم اپنا سر پیٹ لیتے ہیں۔

مقامی سیاست، مقامی واقعات، و حالات، اور مقامی ناموں سے ہمارے اردو صحافیوں کے نابلد ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان کا یا تو مقامی نہ ہونا یا پھر مقامی زبان سے قطعی ناواقفیت ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں .. .. یہ اکثر شرد راؤ کو دسنت راؤ بنا دیتے ہیں، اور دسنت راؤ کو گلاب راؤ بنا دیتے ہیں۔ ترجمہ اور کتابت کی غلطیاں اکثر ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب ناموں میں کچھ یکسانیت ہو۔ مثلاً بنگلہ دیش کے مرحوم ضیاء الرحمٰن کی جگہ کئی بار ضیاء الحق دیکھا، اور ضیاء الحق کی جگہ ضیاء الرحمٰن کا نام خبروں میں پایا۔

گذشتہ دنوں ایک اخبار میں شاہ سرخی (ہیڈ لائن) میں ہم نے یہ معیاری زبان دیکھی کہ ,, عوام نے حزب مخالف کو ٹھینگا بتایا ,, اب آپ ہی بتلایئے کہ جب اخبارات ہی زبان کے معیار کو ٹھینگا بتائیں تو الفاظ بھی زبان زد عام ایسے ہی ہوں گے۔ زبان اور املا کی غلطیاں ایک نہیں بیسوں اخبارات میں آپ پائیں گے۔

بعض اردو اخبارات و جرائد میں ایک غلط رجحان اس زبان کے جاننے والوں کی برتری کا ہے کہ یوپی بہار کا ہے تو اردو جانتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یوپی اور بہار میں اردو کیا تھی اور آج کیا ہے۔ ہم نے مانا کہ ہم آپ کی زبان کے خوشہ چیں ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج اردو اپنی سرزمین پر نہیں بلکہ غیر اردو داں علاقوں میں غیر اردو داں لوگوں کے باعث زیادہ مقبولیت پا رہی ہے۔ یہاں احترام نہیں کیا جاتا بلکہ یہ بھی انتظام کیا جاتا ہے کہ اردو والوں کو ہر طرح کے مواقع حاصل رہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں فراخدلی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ اور اس ذہنیت اور انداز فکر کو بدلنا چاہیئے۔ اردو کے پرچے جو یہاں سے چھپتے ہیں ان کی نگاہ یا ان کے COVERAGE کا RANGE اب بھی دہلی لکھنؤ بہار ہے۔ حد یہ ہے کہ لاہور یا کراچی کی کسی کال گرل کے قتل کے چٹخارے دار قصے ہفتہ دو ہفتے زائد اخبار میں چھپتے رہتے ہیں۔ اور اپنے ہاں کی خبروں سے ہم زیادہ تر بے خبر رہتے ہیں مہاراشٹر کے مختلف علاقوں کے لوگوں میں اردو کے لئے محبت اور خدمت کا جذبہ ہے۔ مالیگاؤں، اور بھیونڈی کا بنگر طبقہ ہو یا۔

(۹)

کا بنکر طبقہ ہو یا کوکن کے گاؤں میں رہنے والے خلاصی ، ودربھ مرہٹواڑہ کے جفاکش مزدور ہوں کہ کولہاپور، شولاپور کے کسان ، جو بھی یہ زبان جانتے ہیں وہ اس زبان کے پرچوں کو بڑھتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنا تعاون دینا چاہتے ہیں لیکن ہمارے صحافی ایسے لوگوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے بھلا ان کا اخبار کس طرح مقبولیت پائے۔

چند ایک رہنما ، چند ایک سیاسی پارٹیوں ، چند اوقاف ، چند تعلیمی ادارے ، چند بااثر افراد کے تذکروں سے اخبار مکمل نہیں ہوتا۔ اخبار عوامی ترجمان ہوتا ہے۔ اس لئے ہر علاقہ ، ہر جگہ کے لوگوں کی نمائندگی ہونی چاہیئے۔ خبروں کے معاملوں میں ہم کتنا ہی اپنے آپ کو تیز رفتار سمجھیں ، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آج کی خبر ہم تیسرے روز پڑھتے ہیں۔ میں ایک صحافی ہونے کے ناطے اردو صحافت کی DEAD LINE کا مسئلہ اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن میں ان خبروں کے انتخاب کی بات کرتا ہوں جو DEADLINE سے پہلے موصول ہوتی ہے۔ اور نیوز ایڈیٹر کو آخر اس کے خبروں کے حسن انتخاب پر کہنا پڑتا ہے کہ خبروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے۔ بڑے اخبارات عموماً نیوز ایجینسی پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر لیتے ہیں۔ یہ سب نیوز ایڈیٹر کی کوتاہ فہمی یا اخبار کی خبروں کی ایک طرفہ پالیسی کے باعث ہوتا ہے۔

صحافت اور بلیک ملنگ

صحافت کو بعض گھٹیا افراد نے بدنام کرنے کی کوشش کی ، جس طرح ایک معلم ، ایک سائنس داں ایک ڈاکٹر کا پیشہ نوبل ہوتا ہے اسی طرح صحافی کا پیشہ بھی بڑا نوبل ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اس پیشے میں کچھ ایسے غیر نوبل افراد آئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ " نوبل پرائز " آج تک کسی صحافی کو نہ مل سکا۔

ایک جیب کترا جیب تراشی کے بعد کبھی پلٹتا نہیں لیکن ہمارے بعض صحافی ایسے ہیں جو جیب کتروں سے بھی زیادہ گئے گذرے ہیں۔ وہ آپ کی شخصیت اور آپ کی جیبوں کو ناپتے ہیں ان کا کام بلیک میلنگ کرنا ہوتا ہے وہ اپنا پہلا شمارہ آپکے نام آپکے قصائد پر مشتمل شائع کر سکتے ہیں اور فوراً ہی دوسرا شمارہ (کم ملنے پر یا کچھ نہ ملنے پر) آپکے حسب نسب پر مشتمل شائع کرتے ہیں بے وقوف حضرات اکثر انکے ہتھے چڑھتے ہیں۔

اور صحافت کے یہ تو ایسے مسائل ہیں جو کہیں بھی ہو سکتے ہیں ممکن ہے ان صورتوں میں یا کسی اور صورت میں ایک بات البتہ اردو پرچوں کے تعلق سے بڑی اہم ہے کہ عموماً یہ پرچے حکومت اور قومی یکجہتی کا جتنا فراخدلی سے دم بھرتے اتنا ہی یہاں کا قومی پریس اپنے وسیع اور کثیر الاشاعت پرچوں کے ذریعہ تنگ نظر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس قومی خدمت کا صلہ یہ ہے کہ اردو اخبارات و رسائل سرکاری نوازشات سے یا تو محروم ہیں یا پھر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

مہاراشٹر کے صوبے کے لئے ایک بات اور قابل فخر ہے کہ باہمہ بسیار خامیوں کے کوتاہیوں کے یہ اردو صحافت کا ایک مرکز ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرس کی ۱۹۷۸ء کی حالیہ رپورٹ کے مطابق صرف دہلی سے ۷۶ اور بمبئی سے ۲۸ اخبارات اردو کے شائع ہوتے ہیں۔

اس ریاست میں صحافت کی تدریجی رفتار کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ

۱۹۵۶ء میں ۱۰ روزنامے۔ ۱۵ ہفت روزہ ۱۳ ماہنامے۔ ۵ ششماہی۔ کل ۴۳ پرچے شائع ہوتے ہیں

۱۹۶۱ء میں ۹ روزنامے۔ ۲۱ ہفت روزہ۔ ۳ پندرہ روزہ ۱۸ ماہنامے۔ ۲ سہ ماہی۔ کل ۵۳ پرچے شائع ہوتے تھے

۱۹۷۱ء میں ۱۰ روزنامے۔ ۴۷ ہفت روزہ۔ ۱۱ پندرہ روزہ ۱۶ ماہنامے۔ ۳ سہ ماہی۔ ۲ ششماہی۔ ۳ سالنامے کل ۹۱ پرچے شائع ہوتے تھے۔

اور اب ۱۹۸۱ء میں ۱۲ روزنامے۔ ۷۸ ہفت روزہ ۱۷ پندرہ روزہ۔ ۲۹ ماہنامے۔ ۲ سہ ماہی۔ ۵ ششماہی ایک سالنامہ کل ۱۴۴ پرچے شائع ہوتے ہیں۔

اردو صحافت اب بھی کوئی بڑی انڈسٹری نہیں
دوسری زبانوں کی صحافت کے مقابلے میں میرا ذاتی تجربہ
یہ ہے کہ اردو کے صحافیوں نے اردو صحافت کو کبھی
انڈسٹری نہیں سمجھا۔ بلکہ یہ انکے لئے خارش ہے۔ اگر
یہ خارش نہ ہوتی تو اردو صحافت کی بنیادیں بہت ہی مضبوط
ہوتیں اور اس انڈسٹری سے کام کرنے والے بھی اور
فائدہ اٹھانے والے بھی فائدہ اٹھاتے۔

اردو صحافت کا معیار ماضی میں جتنا بلند تھا اور
قدریں جتنی عظیم تھیں آج بھی یہ بات ہوسکتی ہے
اگر ہم سب اچھی صاف ستھری اور اعلیٰ قدروں کو صحافت
میں نہیں بلکہ صحافیوں میں فروغ دینے کی کوشش کریں
انھیں اچھے بھلے کی تمیز بتائیں۔ ہم انتظامیہ کے افراد ہوں
یا تحری یا ٹیکنیکل شعبوں کے۔ ہماری سب کی اجتماعی
کوشش (COLLECTIVE EFFORTS) یہ ہو کہ اچھا لکھیں اور
اچھا پیش کریں۔

ہندوستان کا شمار DEVELOPING COUNTRIES
میں ہوتا ہے۔ مشہور صحافی لائڈ سومرلیڈ نے "صحافت
ترقی پذیر ملکوں میں اس موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے ایک
جگہ لکھا ہے کہ۔

In Developing Countries Newspapers Are Born in idealism and Live in Frustration.

سومرلیڈ نے ایک نہیں دنیا کی کئی ایک زبانوں کے اخبارات
اور خصوصاً ترقی پذیر ملکوں کے اخبارات پر ریسرچ کرنے
کے بعد یہ رائے دی ہے۔ اردو صحافت کا بھی یہی حال
ہے۔ ہماری صحافت میں اور صحافیوں میں FRUSTRATION
بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

بعض صحافی حضرات صرف سنسنی خیز باتوں،
جاسوسی کارناموں، فحش اسکینڈلز سے اپنے پرچوں
کو چٹ پٹا بناتے رہے۔ ایسے صحافیوں کا حال اس
بوڑھی نائیکہ کی طرح ہوتا ہے جب اس کے حسن کی
سحر طرازی ختم ہوتی ہے تو وہ خود بھی بھیانک لگتی ہے اور
اس کی حرکتیں بھی بھیانک ہوتی ہیں۔ ایسے پرچوں کی صحافیوں
کا بھی ادب سماج اور صحافت میں کوئی CONTRIBUTION
نہیں ہوتا۔

اردو صحافت میں ایک اور کمزوری بے باکی سے نہ
لکھنا، نہ لکھوانا۔ نہ چھاپنا اور نہ چھپوانا۔ دو چار پرچوں کی
بے باکی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمارے اردو کے بعض صحافی
تو سو کھے کو بھی ہریالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بالفرض اگر کسی
طور کسی صحافی نے کسی ادارے کی بدعنوانی کو اجاگر کیا تو پہلا
ہتھکنڈہ یہ استعمال کیا جاتا ہے کہ اس صحافی کو ممبر بنا لیا جاتا
ہے تا کہ دستور زباں بندی قائم رہے۔

اردو صحافت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کے
پڑھنے والوں کا مزاج ہے جسے بدلنا ضروری ہے۔ اردو کے
قاری کو مانگ کر پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ تیسری رکاوٹ
سرمایہ ہے۔ اردو صحافت میں سرمایہ کو لگانا گویا اپنے
آپ کو گروی رکھنا ہے۔ اس عاشقی میں عزت سادات
بھی چلی جاتی ہے۔ بعض اوقات صورت حال بڑی نازک
ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کسی نے سرمایہ دیا تو کوئی آکر کاغذی
آئینہ بناتا ہے۔ آئینہ کسے پسند نہیں۔ لیکن ایک آئینہ ابھی
بازار میں آیا نہیں کہ دوسرے آئینے کی تیاری کے بہانے
پیشہ گر سرمایہ دار کی کل پونجی لیکر چمپت ہو جاتا ہے۔
ایسے ہی چمتکاریوں کے باعث سرمایہ لگانے والے
اردو کے صحافیوں کو آئینہ دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ میاں
کہیں تم بھی وہ تو نہیں؟

اردو کے شعراء، ادباء، دانشوروں میں گروپ
بازی کی لعنت ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ اسی طرح اردو
صحافیوں میں نااتفاقی کی لعنت ختم ہوتی نظر نہیں آتی
یہی وجہ ہے کہ پچھلے تین سالوں میں ایک بھی طاقتور انجمن
اردو کے صحافیوں کی نہ بن سکی۔ یاران تیز گام نے
پتر کار سنگھ بنا لئے اور اردو کے صحافی صرف محو
جرس کارواں رہے۔

اخبارات و جرائد کی جان اشتہار ہوتے ہیں۔ سرکولیشن (تعداد اشاعت) اس کے بعد آتا ہے۔ اردو صحافت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس زبان کے پرچوں کو اردو والے کبھی اشتہار نہیں دیتے۔ سرپرستی یا خریداری قبول نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو لاکھ احسان جتانے کے بعد۔ میں نے غیر اردو داں حضرات کو مخلص پایا۔ وہ نہ صرف اشتہار دیتے ہیں بلکہ اچھے صحافیوں اور اچھے پرچوں کی قدر بھی کرتے ہیں ان میں کچھ تو وہ ہوتے ہیں جن کی اردو مادری زبان نہیں ہوتی لیکن پھر بھی اردو زباں جانتے ہیں اور اسے اپنی مادری زبان نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ لکھواتے ہیں۔ بعض وہ ہوتے ہیں جو قطعی غیر اردو داں ہوتے ہیں لیکن اردو سے محبت کرتے ہیں ایسے حضرات سرپرستی قبول کرتے ہیں کہ کسی طور پُرخلوص صحافیوں کے پرچے چھپتے رہیں۔

ایک اچھا صحافی جتنا پرخلوص اور صحافتی دیانتداری اور اصولوں کا پابند ہوگا اس کا پرچہ اتنی دیر چلتا رہے گا۔ ایک صحافی جتنا ساز باز کرنے والا جلد باز ہوگا۔ اس کا پرچہ کم سے کم مدت میں دم توڑ دے گا۔

نئی روشنی کا یہ تقاضہ ہے کہ دقیانوسی باتوں پر دھیان نہ دیں۔ لیکن اردو کے کچھ ایسے صحافی بھی ہیں جنھوں نے مجھے ہی نہیں بیشتر ہمعصر ساتھیوں اور بزرگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ دنیا میں کچھ لوگ سبز قدم مزدور ہوتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ایسے سبز قدم صحافیوں نے بیسوں پرچوں کو سپرد ڈاک کرنے سے پہلے ہی سپرد خاک کیا۔ جب کبھی کسی نئے پرچے کی خبر ملتی ہے تو بجائے اس کے کہ پیشہ کی رقابت کو بروئے کار لایا جائے اگر کسی ایک سبز قدم صحافی پہنچا کر نئے ادارے میں چھوڑ دیا جائے بس سمجھئے اس پرچہ کا بیڑا چند ہی دنوں میں غرق۔ پچھلے دنوں ایک ایسے ہی ابھرتے پرچے کے ڈوبنے کی خبر ملی لیکن خدا مسبب الاسباب ہے اس لئے خیریت گذری، اور اب وہ پھر پرچہ کسی طور چل نکلا ہے۔

حکومت کی نظر کرم اردو صحافت اتنی نہیں۔ حالانکہ حکومت کا دم بھرتے ہیں اور خصوصاً قومی قدروں کو بڑھاوا دینے میں اردو صحافت نے ہمیشہ زبردست رول ادا کیا ہے۔ حکومت ایک جانب تو اردو اخبارات کو سہولتیں دینے کا اعلان کرتی ہے اور دوسری جانب پالیسی کے برعکس اس قدر سختی سے کام لیتی ہے کہ چھوٹے پرچے ایک ایک کر کے دم توڑ دیتے ہیں۔ حکومت کے اشتہارات کا فائدہ بڑی زبانوں کے بڑے اخبارات کو زیادہ پہنچتا ہے اور جو کھرچن ہوتی ہے اس کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ اردو کے جو پرچے باقاعدہ چھپتے ہیں انہیں بے قاعدگی سے اشتہار دیتے ہیں اور جو بے قاعدہ چھپتے ہیں انہیں باقاعدگی سے اشتہار ملتے ہیں۔

اردو زبان کے صحافیوں کو حکومت سے یقیناً (ریاستی و مرکزی) کئی ایک باتیں منوانی ہیں لیکن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو ذرا پہلے سدھاریں اور پھر یہ مطالبہ کریں کہ عوام اور حکومت کو یہ کرنا چاہیئے وہ کرنا چاہیئے پھر بھی چند ایک باتیں جب ہم نے اپنوں کے گوش گذار کیں تو کیوں نہ حکومت کے گوش گذار کریں کہ جو ہمارے مفادات کی نگہبان بھی ہے اور سرپرست بھی۔ ظاہر ہے حکومت کی سرپرستی نہ ہو تو اخبار اور وہ بھی اردو کا، کس طرح پنپ سکے گا۔ آج کی اس نشست میں ایک تجویز کے ذریعہ ہم حکومت مہاراشٹر اور حکومت ہند کو توجہ دلائیں کہ اردو صحافت کے بعض ایسے مسائل ہیں جن پر حکومت کی فوری توجہ اور اقدام کی ضرورت ہے۔

۲۶ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اس وقت کے خصوصی معتمد اور پریس انفارمیشن حکومت ہند کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر جناب ایل دیال (آئی۔اے۔ایس) نے بمبئی کے اردو اخبارات و رسائل کے مدیران اور اردو صحافیوں سے اردو اخبارات و رسائل کے مسائل اور انکی دشواریوں سے متعلق تبادلۂ خیال کیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے

(بقیہ، صفحہ [illegible])

انیس چشتی

اردو صحافت اور اخلاقی قدریں

میں نے اپنے مقالے کے سرنامے کے لئے "صحافت اور اخلاقی قدریں" کا عنوان تجویز کیا ہے ـــــ اخلاقیات ایک علم کے طور پر نہیں بلکہ ایک ذمہ داری بلکہ زیادہ واضح الفاظ میں فرض کے طور پر برتا جانا زیادہ ضروری ہے۔ اخبارات، طبل ونقارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں جس میں قلم کا کام چوب کا ہے۔

آج کے اس زوال پذیر سماج میں جبکہ اخبارات ہماری روزمرہ کی زندگی میں اشیائے ضروری-COMMODI-TIES- کے روپ میں شامل ہو چکے ہیں۔ بستر سے اٹھنے کے بعد چائے کی پیالی سے پہلے انسان اپنا دن اخبارات کی سرخی سے شروع کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پہلے اس عالم کی سیر کرے جو شب خوابی کے دوران اس کی نظروں سے اوجھل تھا اور ان ملکوں اور افراد کے کوائف سے واقف ہو جو جاگ رہے تھے یا جہاں دن تھا اور اگر فرض کیجیے کہ انسان کی اس لاعلمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دن کا سب سے پہلا لقمہ جھوٹ یا فریب کی صورت میں دے دیا جائے تو اندازہ لگا لیجیے دنیا کی ایک بڑی آبادی کس قدر بڑی اور ہیبت ناک غارتگری کی نذر ہو جائے گی۔

دنیا کے ایک بڑے فاشسٹ حکمراں نے ایک بار کہا تھا کہ "جھوٹ اتنا بولو کہ وہ سچ لگنے لگے" اس امر کا غماز تھا کہ قلم کی طاقت "تلوار سے بھی زیادہ ہے آج کی دنیا نے اپنی پروپگنڈہ مشنری یعنی اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن نیوز ایجنسیوں اور دوسرے ذرائع ابلاغ پر سے "سچ" کی حکومت ہٹا کر "جھوٹ" کی حکومت مسلط کر دی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اردو صحافیوں کی کلکتہ کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "انسانیت اس وقت بہت خوش ہوئی تھی جب چھاپے خانے کی ایجاد ہوئی تھیں اور اخبار عالم وجود میں آیا تھا۔ لوگ یہ سمجھے تھے کہ چلئے آج ہمیں دکھ درد دنیا کے سامنے پیش کرنے اور اپنی نیک تعلیمات کو پھیلانے کا خوب موقع ملے گا۔ ممالک ایک دوسرے کے قریب آئیں گے۔ ان کی سیاسی سرحدیں مٹ جائیں گی اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا خوب موقع ملے گا۔ لیکن ہوا اس کے الٹ۔ تفرقے نفرت اور پھوٹ کی خلیجیں وسیع اور دیواریں اونچی ہوتی گئیں

بجائے اس کے کہ محبت اور اخوت کی کھیتی لہلہاتی، لوگوں نے نفرت کے بیج بوئے۔ ایکدوسرے کے خلاف گندہ پروپگنڈہ کیا۔ اور انسانوں کو ایک دوسرے کے مسائل میں دلچسپی لینے کے بجائے ایک دوسرے کے مسائل میں الجھنا سکھا دیا۔

سامعین کی دلچسپی کے لئے میں پونہ کا ایک حالیہ واقعہ بیان کرتا چلوں۔ چند دن پہلے ایک اجلاس سے لوٹتے ہوئے چند شرپسند غنڈوں نے ایک خاص طبقے (ظاہر ہے اقلیتی فرقے) کے خلاف گندے اور غلیظ نعرے لگائے۔ یہ عمل تھوڑے تھوڑے وقفے سے کئی بار کیا۔ فٹ پاتھ نشین چند افراد اس حرکت پر برہم ہوگئے اور انہوں نے اول الذکر غنڈوں کی پٹائی کردی۔ پٹنے والے اسپتال اور پیٹنے والے حوالات پہنچے۔ لیکن سارے شہر میں کہرام مچ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں زہر بھر گیا۔ یہ زہر اب تک باقی ہے۔ لیکن اس واقعے کے دوسرے دن اخبارات نے جو کارنامہ انجام دیا۔ وہ قابل ذکر ہے۔ نعرہ باز غنڈوں کا اس طرح ذکر کیا۔ جیسے وہ صرف معصوم ہی نہیں بلکہ مظلوم بھی ہیں۔ اور دوسرے فرقے کے لوگ جنھوں نے پٹائی کی تھی وہ نہ صرف مجرم بلکہ یزید وقت ہیں اس سے شہر کے فضا کی رنگت گہری سانولی ہوگئی اور امن پسند شہری پتے کے کھڑکنے اور اپنے دل کے دھڑکنے سے ڈرنے لگے۔

اس پرآشوب اور اخلاقی انحطاط میں مبتلا دور میں اخبارات نہایت صالح اقدار پر مبنی ٹھوس کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے گفتگو کے دوران ایک مرتبہ ایک بڑے سیاسی لیڈر سے جو خیر سے صحافی بھی ہیں پوچھا کہ دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ایٹم بم کو بھلے ہی سے رہنے دیجئے لیکن اخبارات بند کرا دیجئے ـــــ میں نے ایٹم بم اور اسکی کارستانیاں صرف سنی ہیں لیکن اخبارات دیکھے ہیں۔ سیاستداں کے اس جواب پر دنیا کے عظیم فاتح اور فوجی حکمراں پنولین کا جملہ ذہن میں گونج کر رہ گیا کہ "آگ اگلنے والی ۵۰۰ توپوں کے دہانے پر ۵ اخبارات بھاری ہیں"۔ یہ جملہ اس شخص نے کہا ہے جو توپوں کی طاقت سے واقف تھا۔ ایٹم بم ناگاساکی اور ہیروشیما پر گرانے کے لئے استعمال ہوتا ہوگا لیکن اخبارات کے بم روزانہ آپ کے ڈرائنگ روم سے کچن روم تک گرائے جاتے ہیں اور دنیا کی نبض غیر شعوری طور پر سامراجی اور غلط پروپگنڈہ کرنے والے مشاق افراد کے غیر محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔

میں نے اپنے حلقۂ احباب میں کئی بار یہ بات کہی کہ بھائی بی۔ بی۔ سی لندن کی خبروں میں ملاوٹ اور تبصروں میں جانبداری ہوتی ہے اس پر آپ لوگ آمنا و صدقنا کہیں لیکن میری آواز میں نقار خانے میں طوطی کی تو کیا چیونٹی کی بھی ثابت نہیں ہوسکتی۔

جب صحافت کی اخلاقیات کا ذکر ہی کرنا ہے تو میں اپنی اور سامعین کی سہولت کے لئے اپنے مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پسند کرونگا۔ ایک تو اخبارات کے داخلی انتظامیہ پر مبنی اخلاقیات دوسرے اس کے عوامی رابطے PUBLIC RELATIONS سے متعلق اخلاقیات سکہ رائج الوقت ہندی زبان میں یوں کہیں کہ اس کی داخلی اور خارجی اخلاقیت۔

اطلاعاً عرض کرتا چلوں کہ جب میں اخبارات و رسائل کہوں تو اس سے مراد باقاعدہ اخبارات سے ہوگی۔ گلی کے اخبارات سے نہیں۔ ان کی تعداد تو ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

ہمارے سیمینار کا موضوع چونکہ صرف اردو اخبارات سے متعلق ہے اس لئے JOURNALIST IN GENRAL کے دائرے کا محیط ذرا محدود کرنا پڑے گا۔ جہاں تک اردو اخبارات کا تعلق ہے آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اعداد و شمار کے اعتبار سے ہندوستان میں سب

زیادہ تعداد اردو اخبارات اور رسائل کی ہے لیکن اس کے
ساتھ یہ مایوس کن اطلاع بھی عرض ہے کہ ملک میں سب
سے چھوٹے اور غیر معیاری اخبارات کی سب سے زیادہ
تعداد بھی اردو میں ہی ہے۔ اپنی اشاعت اور طباعت
دونوں کے اعتبار سے۔

میں نے ایک روز اردو کے ایک نام نہاد معیاری
اخبار کا کاروباری تجزیہ کیا۔ جس کا شمار ملک کے اچھے اخباروں
میں ہوتا ہے۔ اس روزنامے میں اس روز چھ صفحے تھے۔
آپ یقین جانئے ان چھ صفحات میں سے تقریباً ساڑھے
چار صفحات اشتہارات کی نذر ہو چکے تھے۔ اداریہ
دوسرے صفحے کے دو آدھے کالموں میں اڑا سا ہوا تھا۔
میں نے اسکیل اٹھا کر اشتہارات سے ہونے والی آمدنی
کا حساب لگایا۔ جو تقریباً ۴۲ ہزار چھ سو دو روپیوں تک
پہنچی۔ اشتہارات بھی کیسے؟ اکثر فلمی یا پھر پیروں،
جنسی ڈاکٹروں اور جادو ٹونا کرنے والوں کے۔ اتفاق سے
چند دنوں بعد اس اخبار کے ایک ذمہ دار سے ملاقات
ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اس اخبار کی صرف روزانہ بکری
سے ادارہ کو تقریباً ایک لاکھ ۱۰ ہزار روپے دستیاب
ہوتے ہیں۔ فی پرچہ اس کی قیمت ۵۰ پیسے ہوتے ہیں۔
جہاں تک تعداد اشاعت کا تعلق ہے۔ عرض کرتا چلوں کہ
اشاعت کی مختلف تعداد بتائی جاتی ہے اخبار فلم کا کوٹا
حاصل کرنے کے لئے، ایک انکم ٹیکس کی فائیلوں کے لئے
الگ، مشتہرین کے لئے الگ اور ناظرین کے لئے الگ
صحیح تعداد کا اندازہ شاید پریس کے مشین مین کے علاوہ
ایڈیٹر صاحب کو بھی نہ ہوتا ہوگا۔ بہر حال میں نے جب اس
لمبی چوڑی روزانہ کی آمدنی کو اس اخبار کی اشاعت پر ہونے
والے خرچ یعنی ESTABLISHMENT پر تقسیم کرنا
چاہا تو ان صاحب نے یہ اطلاع دیکر چونکا دیا کہ آپ
زیادہ پریشان نہ ہوں پورے نظامیہ کی صرف ۸ تا ۱۲
فیصدی توانائی اس نامراد اردو اخبار کی اشاعت پر
صرف ہوتی ہے۔ کیونکہ اتنا بڑا اسٹاف، لوازمات

اور مشینیں روزانہ صرف ایک ہی اخبار تخلیق اشاعت
نہیں بلکہ اس ادارے کے کل چار اخبار ہیں جس میں اس
اردو روزنامے کی اشاعت سب سے کم ہے۔ لیکن منافع
کے اعتبار سے یہ اول نمبر پر ہے اس پریس میں چھپنے
والے دیگر کاموں کی آمدنی اس کے علاوہ ہے۔

اردو اخبارات کے لئے جتنے کم سرمائے اور لاگت
کی ضرورت ہوتی ہے اتنی شاید کسی دوسری زبان کی
نہیں۔ اردو میں ٹائپ نہیں۔ اشاعتی اداروں کے لئے یہ
ایک رحمت ہے اگر ٹائپ ہوتا تو ٹائپ ڈھالنے کی مشینری
سیسہ، کاریگر یا پھر فوٹو ٹائپ سیٹنگ مشین، پراونڈ
پرنٹ مشین، نگیٹو اور پازیٹو کی تیاری کے لئے
عکسانہ (کیمرہ) اور اسی کے ساتھ بعد میں پیش آنے والے
لامتناہی اخراجات کا سامنا کرنا پڑتا۔ جو فی الحال عام
سائز کے اخبار کے لئے کسی صورت میں ۲۵ سے ۳۰ لاکھ
روپے سے کم نہیں آتے۔ اردو اخبارات میں طباعتی مواد
کی تیاری کے لئے کاتب حضرات موجود ہیں فی یومیہ ۲۵ تا ۳۰
روپیہ پھینکئے اور ایک کاتب صاحب کو ۶ تا ۸ گھنٹے کے لئے
وقف کر لیجئے۔ ایک صفحے کی تیاری میں اردو کا معیاری ترین
اخبار صرف ۸۰ سے ۱۲۰ روپے تک خرچ کرتا ہے۔ جبکہ معمولی
درجے کا مراٹھی اخبار ساڑھے تین سو روپے، اوسط درجہ
کا مراٹھی اخبار تقریباً پونے تین ہزار روپے، جبکہ انگریزی
اخبارات ایک صفحے کی تیاری کے لئے تقریباً ۱۱½ ہزار
روپے صرف کرتے ہیں۔ اس میں ادارتی، خبر رسانی
اور دیگر صحافتی اخراجات شامل نہیں ہیں۔ یہ بات چل رہی
ہے صرف کمپوزیٹر یعنی ٹائپ جوڑنے کی۔

ہمارے اردو اخبارات کے صفحے اخلاقیات اور
مذہبیات کے واعظوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ لیکن بمبئی اور
دہلی اور کلکتہ اور حیدرآباد کے بڑے اخبارات کے دفاتر
میں لاتعداد ایسے کاتب حضرات دیکھے گئے جنکے رہنے کے لئے
بمبئی کی تنگ و تاریک کھولی تک میسر نہیں ہے ان میں سے
اکثر اخبار کے دفتر میں ردی بچھا کر ایک کونے میں پڑ رہتے ہیں

تنگ اور گندی بلڈنگوں کے زینوں کے نیچے طہارت خانوں کے پاس یا پھر مسجدوں میں قوم بسیرا کرتی نظر آتی ہے چلئے ان کی اور دیگر ملازمین کی اس حالت کو بھی ہم برداشت کر لیتے اگر واقعی مالکان بھی اسی حالت میں زندگی گذارتے لیکن ان کے سر پر پانچ پانچ ٹیلی فون رکھے ہوتے ہیں ٹیلکس کی مشینیں نصب ہیں۔ ہوائی جہاز سے سفر ہو رہا ہے۔ کئی کئی کاریں ملکیت میں ہیں۔ دعوتوں پر ہزاروں روپیہ خرچ ہو رہے ہیں —— معیار علم و صحافت نہیں تو کم از کم ان مالکان کا معیار زندگی تو مولانا ظفر علی خاں، سر سید احمد خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد یا مولانا عبد الماجد دریابادی جیسا ہوتا کہ کوئی ٹوٹی کرسی پر بیٹھا لکھ رہا ہے۔ لیکن ملکہ برطانیہ کا تخت لرز رہا ہے کوئی اپنا کتب خانہ بیچ کر لندن جا رہا ہے کہ اسلام کے خلاف انگریزوں کی زہر افشانی کا منہ توڑ جواب دیگا (میرا اشارہ سر سید احمد خاں کی طرف ہے) کسی کے جسم سے کھادی کا کھردرا کپڑا اخیر تک لگا رہا کہ وہ انگریزوں سے نفرت کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن ان کے چلے جانے کے بعد اب دل زندہ کا لباس فاخرہ ہے (میری مراد مولانا عبد الماجد دریابادی سے ہے) —— اپنے ملازمین کا استحصال کہاں تک جائز ہے؟ اردو اخبارات بڑی حد تک اس اخلاقی جرم کے شکار ہیں۔

اردو اخبار والوں کی ایک عام شکایت یہ ہے کہ اچھے لکھنے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔ غزلوں کی بھرمار ہے۔ مضامین کی قلت ہے۔ بھئی مضمون لکھنے کیلئے پہلے کچھ کھانا پڑتا ہے اور غزل میں داستان غم سناتے سناتے خود سو جانا پڑتا ہے۔ میں یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا کبھی اردو کے اخبارات نے لکھنے والوں کو کسی تخلیق کا معاوضہ دیا ہے۔ جیسے مراٹھی، ہندی یا انگریزی اخبارات والے دیتے ہیں۔ مفت کا مال مل تو سکتا ہے لیکن کتنے دن؟ ہمارے اخبارات کی یہ پالیسی تقریباً ایک صدی سے چلی آرہی ہے۔ شہرت کے حصول اور ضرورت کی تکمیل کے لئے یہ کام چند افراد چند دن تو انجام دے سکتے ہیں لیکن اس سے اہل قلم کا، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کا، اور عالمی حالات و مسائل پر ناقدانہ نظر رکھنے والوں کا کوئی مستقل کیڈر وجود میں نہیں آسکتا — پیسہ دیجئے۔ اس سے مستقبل کے لئے اچھے لکھنے والے پیدا ہوں گے۔

بات بڑھ جائے گی اس لئے اسے یہیں ختم کر کے اخبارات کے دوسرے پہلو یعنی عوامی رابطے سے متعلق اخلاقیات کی طرف آتا ہوں۔

جہاں تک ہمارے قومی پریس کا تعلق ہے وہ اپنے دو اصولوں پر سختی سے کاربند ہے۔ پہلا اصول، Black Out کا ہے اور دوسرا Black Maling کا۔ ہندوستان کی اقلیتیں تباہ ہو جائیں۔ پس جائیں۔ وہ آسمان سر پر کھڑا کر لیں لیکن غیر اردو صحافت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ خبروں کا Black Out کریں گے اور اگر جگہ دے بھی دیں تو کسی اندرونی صفحے پر کسی غیر اہم خبر کے قدموں میں۔ مجھے اقلیتوں کے مسائل کے سلسلے میں چھوٹے بڑے اجلاس بلانے اور بڑی بڑی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ لیکن دوسرے دن اخبارات کو فاقلے میں موٹے عدسے لگانے کے باوجود بھی خبر دیکھنے نہیں ملی۔ الحمد للہ اردو صحافت کم از کم اقلیتوں سے متعلق مسائل میں ہنوز دلچسپی رکھتی ہے اور معدودے چند، اردو اخبارات اس اخلاقی مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔

البتہ جو چیز ہماری صحافت اور ملت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہی ہے وہ ہے کسی واضح پالیسی کا عدم تعین۔ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کو" کے اصول پر ہمارے اکثر اخبارات اپنی ہی شاخ نازک پر تیر چلا رہے ہیں چاہے ملکی مسائل ہوں یا عالمی سیاست۔ ایسے اخباروں کی پہنچ نہ تو ماسکو تک ہے اور نہ ہی واشنگٹن تک۔ ان کو طہران اور بغداد کے جغرافیہ سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا تعلق دہلی کی سفارتوں اور بمبئی کے قونصل خانوں سے ہے۔

عوام کے جذبات سے کھیلنا، ہیجان انگیز سرخیاں اور اخبار کے گھٹے ہوئے دفتر میں بیٹھکر لکھے گئے جذباتی مضامین اردو صحافت کا مقدر بن چکے ہیں۔ جب تک فٹ پاتھ اور ہوٹلوں کے قارئین سلامت ہیں ان کی صحافت سرپٹ دوڑتی رہے گی۔ غیر واضح پالیسی کے بعض اوقات بڑے دلچسپ مظاہر دیکھنے کو ملے۔ ایک ہی شمارے کے ایک ہی صفحے پر ایڈیٹر صاحب ایران کے اسلامی انقلاب کی تعریف کر رہے ہیں تو اسی صفحے پر دوسرے مضمون میں پولینڈ اور افغانستان میں کمیونسٹوں کی استقامت پر رطب اللسان ہیں۔ افغانستان کو روسیوں کا قبرستان بھی کہا جا رہا ہے اور پولینڈ میں روس کی ناکہ بندی کو بھی سراہا جا رہا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام کا نام لے کر ٹیکے کے ڈانڈے ماسکو سے ملائے جا رہے ہیں۔ ان اخبارات نے اردو قارئین کا ذوق بگاڑنے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔

غیر اردو اخبارات بلیک میلنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ جب لڑانے پر آتے ہیں تو ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑا دیتے ہیں۔ لیکن اردو اخبارات تو خیر سے صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں وہ شیعوں کو سنیوں سے لڑا دیتے ہیں۔ دیوبندی کو دیوبند سے بھڑا دیتے ہیں۔ بھٹو کی موت پر اتنا واویلا مچاتے ہیں کہ کشمیر، یوپی اور بہار سلگ اٹھتے ہیں۔ دیوبند کے حالیہ تنازعے میں شمالی ہندوستان کے بعض سستے کاغذ اور لیتھو پر چھپنے والے اخبارات نے وہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ خدا کی پناہ۔ اپنی صحافت کی دوکان چمکانے کے لئے باقاعدہ گروہ بندی کروا ڈالی۔ پتہ نہیں ان میں خلوص کہاں تک تھا۔ البتہ ہمارے اکابرین کی شان میں وہ وہ باتیں پڑھنے ملیں کہ ہمارے تو نشے ہرن ہو گئے۔ بات سچ ہے اس لئے کہنے میں کوئی تکلف نہیں محسوس ہو تا کہ جب تک ہماری صحافت دیندار افراد کے ہاتھوں میں رہی اس کا رنگ ہی اور تھا۔ ضروری نہیں کہ اگلے وقتوں کی طرح تمام صحافی مولانا ہی ہوں۔ لیکن اخلاقیات کا بڑا گہرا تعلق مذہب سے ہے۔ جہاں آخرت کا تصور ہم سے جدا ہوا، اخلاقیت کے تشریف لے جانے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔ اقبال کی روح سے معذرت کے ساتھ اسے ایک مصرعے میں یوں ادا کریں کہ ؏

جدا ہو دیں صحافت سے تو رہ جاتی ہے مکاری

قلم ہاتھ بھی ہے زبان بھی اور ذہن بھی۔ وہ آگ بھی لگا سکتا ہے اور توپوں کے دہانے خاموش بھی کروا سکتا ہے۔ اس پر اخلاقیات کی گرفت کو کافی مضبوط ہونا چاہیئے۔ محبوب کے قدم تلے ہزاروں جانیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب صحافی کے قلم کے سائے میں ہزاروں جانیں ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہندوستان میں اردو اخبارات کی ۹۸ فیصدی ایڈیٹرشپ مسلمانوں میں ہے اور مسلمانوں کا تعلق اسلام سے ہے۔ اسلام امانتداری، سچائی اور صداقت کا مذہب ہے۔ یہ لوگوں کو ایمانداری کا درس دیتا ہے۔ اگر اردو صحافی ذرا توجہ دیں تو ان کے ہاتھ میں اردو صحافت کی قیادت آسکتی ہے۔ آج دنیا گم کردہ راہ ہے اسے صحیح رہنمائی درکار ہے۔ ملک بھر سے شائع ہونے والے اردو اخبارات اگر یہ فیصلہ کرلیں کہ سچائی اور صداقت کا سر کبھی خم نہ ہونے دیں گے اور دنیا کے سامنے امانتداری اور غیر جانبداری کی مثال قائم کرکے چھوڑیں گے تو میں نہیں سمجھتا کہ اردو اخبارات جو آج اپنی اثر انگیزی اور تاثر آفرینی کھو چکے ہیں انہیں اپنا مقام حاصل کرنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جنگ آزادی کے دوران اردو اخبارات نے بڑا مثبت رول ادا کیا ہے ان کی جرأت اور بے باکی نے عظیم تاریخ کی تخلیق کی ہے۔ ہمارے صحافی

اللہ کے شیر تھے اور روباہ مزاج انگریز کی شاطرانہ حکمت عملی پر شیران غلب کی طرح بڑھ کر وار کرتے تھے۔ الہلال اور البلاغ، ہمدرد اور زمیندار جب پریس میں چھپ رہے ہوتے۔ تو ان کی کاپیاں بازار میں بک چکی ہوتی تھیں۔ اور لوگ عید کے چاند اور محبوب کی چال کی طرح ان کا انتظار کرتے ہوتے تھے۔ ایک ایک اخبار کے کئی کئی بار پریس ضبط ہوئے دفتروں پر تالے اور قلموں پر مہریں لگیں۔ لیکن خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے کا کام صحافیوں نے برابر جاری رکھا اردو صحافت کی یہ تابناک تاریخ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ ہم اس سے اکتساب نور کر سکتے ہیں اور اعلیٰ و بلند اخلاقی اقدار کی روشن مثال اب بھی دنیا کے سامنے قائم کر سکتے ہیں ـــــ آپ یقین جانئے اردو اخبارات حکومت کے ایوانوں پر مکھی کے پر کے برابر بھی اثر نہیں ڈالتے حکومت جانتے ہیں کہ ملک کی ایک محدود اقلیت ہی ان سے متاثر ہو سکتی ہے۔ اکثریت کی زبان وہ نہیں جو یہ طبقہ بولتا ہے ـــــ لیکن ہمیں ناامید ہونے کی ضرورت نہیں سچائی کہیں ہو اور کسی مقدار میں ہو ضرور رنگ لاکر رہتی ہے سچائی کی آواز کو وقتی طور پر دبایا تو جا سکتا ہے لیکن کچلا نہیں جا سکتا ہے۔ ہم سچائی پر قائم رہیں اور پھر دیکھیں کہ اس میں کیا جادو ہے۔ ہم بکاؤ مال اور ابن الوقت نہیں۔ ہمارے دفاتر میں راتوں کے پچھلے پہر ساز و باز اور خرید و فروخت کی نذر نہ ہوں۔ بلکہ وہ لمحات نالۂ سحرگاہی کے مترادف بن جائیں اور قرطاس ابیض پر نعرہ انقلاب بن کر گونجیں۔ جس سے ملت بیدار ہو اور ہمارے مضامین اقبال کے اس شعر کی تفسیر بن جائیں کہ

؎ تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

بقیہ: اردو صحافت اور اس کے مسائل

ہوگی۔ اجرتوں کے سرکاری بورڈ کے قیام کے باوجود اردو اخبار کا بدنصیب عملہ معقول معاوضہ سے محروم ہے۔

اردو کی بقا اور ترقی کا نعرہ لگانے والوں کو یہ بات ذہن نشیں کرنا ہوگی کہ اخبار کسی زبان کی ترقی، اس کی نشوونما اور عوامی رابطہ کا اہم فریضہ انجام دیتا ہے کتابیں ایک طبقہ تک محدود رہتی ہیں۔ ان حوصلہ شکن حالات میں بھلا کوئی تعلیم یافتہ اور باصلاحیت شخص اس معزز پیشہ سے وابستہ ہونے کی جرأت کس طرح کر سکتا ہے۔ اردو اخبارات کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ باصلاحیت افراد کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ انہیں معقول اجرت ملے۔ تربیت کا بندوبست ہو۔ پتھر کے عہد سے آگے مشینی دور میں قدم بڑھایا جائے۔

فرحت جہاں

پناہ گاہ

کھڑکی سے آتے ہوئے ہوا کے جھونکوں نے ٹیبل پر رکھے خط کو بےچین بنا دیا وہ پھڑ پھڑانے لگا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ٹوٹو کی نظر سامنے رکھی ٹیبل پہ رکھے خط پہ گئی، وہ اس پہ جھپٹ پڑا امریکہ سے بھیجا ہوا اس کے ڈیڈی کے ایئرگرام کو کسی نے نہیں کھولا تھا۔ ڈیڈی کے خط کا اس کو بہت انتظار رہتا تھا وہ ممی سے خط پڑھوانے کے لئے بیچین ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئیں، ابھی وہ کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ اس کی نظر گیٹ پہ پڑی، ممی کار میں بیٹھی کہیں جانیوالی تھیں، وہ دوڑتا ہوا وہاں تک پہنچا ہی تھا کہ کار روانہ ہو گئی وہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بار بار خط کو دیکھنے لگا پھر اداس ہو کر تنہا کمرے میں گھومنے لگا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن وہ خالی نہ تھا۔ ڈیڈی بہت سے پیسے بھیجتے تھے اس لئے کمرہ قیمتی سازو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ صوفے، میز، کرسیاں، وارڈروب فرج، قالین بڑے بڑے فینڈیلر ــــ لیکن سب چیزیں خاموش و ساکت تھیں، تبسم و تکلم سے بے نیاز، جذبات سے خالی، احساسات سے بے گانہ، محض چیزیں قیمتی و امپورٹیڈ اشیاء، لیٹسٹ ماڈل، لیکن ٹوٹو کے خاموش لب کسی سے بولنے کے لئے بیچین تھے، وہ بولے کوئی سنے، کوئی بولے وہ سنے ــــ لیکن چیزیں کہاں بولتی ہیں۔ کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی تھی، نوکر چاکر اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ٹوٹو کی بیچینی پہ کسی نے دھیان بھی نہ دیا ــــ وہ گھبرا کے کوریڈور میں نکل آیا، لان میں چاروں طرف کیاریوں میں موسمی پودوں میں پھول بہار جانفزا دکھلا رہے تھے کلیاں تبسم ریز تھیں زیست حسیں پر، اور پھول خندہ زن تھے رنگ بے ثباتی پر، اس کی نگاہ یوکلپٹس کی پھیلی شاخوں پر گئیں۔ چڑیاں ٹہنیوں پر بیٹھی آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھیں، چوں، چاں چیں سے فضا گونج رہی تھی، اسے یہ شور بہت اچھا لگا، آواز کسقدر اہم ہے سنانے کے لئے۔ کرخت سہی، بے ہنگم سہی، بے معنی سہی لیکن آواز تو ہے اس میں وجود تو ہے اور ایک جاندار کو دوسرے جاندار کی کسقدر شدید ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا دل چاہا وہ چڑیوں سے ہی بولے، لیکن کیسے بولے چڑیاں اپنی اپنی بولی بول رہی تھیں ــــ بولی تو سب اپنی بولتے ہیں، چاہے جانور ہوں یا انسان، پھر انسانوں کے درمیان بولی پہ اتنا جھگڑا کیوں ہوتا ہے، آئے دن دنگا فساد، آتش زدگی، چھرے بازی، کٹے ہاتھوں کی انگلیوں سے کتابیں نکلتی ہوئی، نیلی نیلی چوڑیوں پہ خون کے دھبے، بابوجی کی چھڑی کے ساتھ لال پاپ مٹی میں ملا ہوا، مردہ جسم زمین پہ بکھرے ہوئے اور آسمان پہ منڈلاتے ہوئے چیل، کوّے، گدھ، اگلے یگ میں کہیں انسان جانور سے نہ بچھڑ جائے، بولی کی لڑائی نہ شروع ہو جائے۔ شاید ایسا ہو، شاید ایسا نہ ہو، اگلے لمحے کی بات کس کو علم، دنیا عجوبۂ روزگار ہے، نت نئے تماشوں کی آماجگاہ۔ ٹوٹو دوڑتا ہوا کیاریوں کے پاس گیا اور پھولوں کی پنکھڑیاں توڑ توڑ کے بکھیرنے لگا، کچی کلیوں کو نوچنے لگا۔ نوکرانی نے دیکھا تو دوڑتی ہوئی آئی ــــ

"ارے بابا ایسا مت کرو۔ میم صاحب ہم پہ ناراض ہوئیگا"

" ممی کب آئے گی بتاؤ "

" ابھی نہیں آئے گی "

" کیوں نہیں آئے گی "

لیکن جواب دینے کے بجائے نوکرانی نے گیٹ پہ کھڑے پٹھان کیطرف دیکھا، پٹھان نے نوکرانی کو آنکھ ماری اور دونوں قہقہہ مار کے ہنسنے لگے، سات سالہ ٹوٹو کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ جواب دینے کے بجائے یہ دونوں ہنسے کیوں؟ وہ خالی خالی نگاہوں سے انکو دیکھنے لگا۔ شام ہو گئی تھی وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ جا کے لیٹ گیا۔ کبھی پلکیں بند کر لیتا کبھی کھول لیتا۔ اسکا وجود اندر ہی اندر سکڑنے لگا۔ رنگ برنگے پروں والی چڑیاں، بادلوں کے ٹکڑے، ماچس کے پیکٹ، کاغذ کی ناؤ، رنگین گولیاں، اور لکڑی کا گھوڑا جیسے ہی خیالوں کی چلمن سے جھانکتے کہ ایک ڈراؤنا اور بارہ آنکھوں والے بھوت کا پاؤں پڑتا اور سب چیزیں کچل کر رہ جاتیں، ٹوٹ ٹوٹ کر لڑھکنے لگتیں، وہ خوف سے اپنے دانت بھینچ لیتا، روز اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا، وہ کتنی ہی دیر تک سو نہ پاتا۔ داخلی کرب اور تنہائی کی اذیت بھوت کا ہیولی بن جاتی بے رحم تنہائی اس کو سونے نہ دیتی۔ ٹوٹو اور خوف رات بھر ایکدوسرے سے گتھم گتھا رہتے، آج بھی وہ دیر تک نہ سو سکا۔ لیکن ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی تھی کہ ایک دم اس نے چیخ ماری۔ خوفناک بھوت اس کے سر پہ کھڑا تھا۔ آج کا بھوت تو بہت ڈراؤنا تھا۔ ممی ممی کہتا ہوا وہ ڈرائنگ روم تک پہنچا ہی تھا کہ اس کے کان میں باتوں اور قہقہوں کی آواز سنائی پڑی، وہ رک گیا اس نے اندر جھانکا۔ دھوئیں کے مرغولے، پلینگ کارڈس کی سرسراہٹ اور چٹ پٹی باتوں میں ممی اتنی گھری ہوئی تھی کہ ٹوٹو کی نرم نرم آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ پائی۔ بے خبری میں نہ جانے کب سے ساڑی کا پلو شانے سے ڈھلک کے ان کی گود میں آگرا تھا بہت اونچے اور کسے ہوئے بلاوز سے ان کا پیٹ اور پیٹھ سنگ مرمر کیطرح چمکتا ہوا بہت حسین لگ رہا تھا اکیلے کھڑے ٹوٹو نے سوچا کہ اتنے بہت سے لوگوں میں سے ممی کو کیسے بلاؤں۔ کہیں ڈانٹ نہ پڑے۔ کتنی ہی دیر تک چپ چاپ دروازے میں جالی کے پردے کو پکڑے سہا سہا سا کھڑا دیکھتا رہا، کسی کی نظر اس پہ نہیں گئی وہ اسی سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ کیسے بلائے۔ بلائے کہ نہ بلائے۔ لیکن سانس کے تیز زیر و بم پسینہ کی بوندوں اور گھٹی گھٹی چیخ پہ قابو رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آخر گھبراہٹ میں اس نے زور سے پکارا " ممی "

" کیا بات ہے ٹوٹو! سوتے سوتے کیوں جاگ پڑے "

انہوں نے پلٹ کے پوچھا۔

" میرے کمرے میں بھوت ہے ممی "

" بھوت کیسا بھوت "

" کہیں مدر ڈگوئن تو نہیں آگئے۔ کنول جیت نے پیسہ پھینکتے ہوئے کہا۔ اس بات پہ ارد گرد بیٹھے لوگوں میں زبردست قہقہہ پڑا ٹوٹو کو لگا جیسے بھوت پھر آگیا ہو۔ ہنسی کے گھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ بھوت بھی تو اسی طرح کئی آوازوں میں ہنستا ہے، زخمی وجود پہ ہنسی نشتر کیطرح لگی وہ اور سہم گیا۔ نوکرانی کو کمرے میں سلاؤ پلیز۔ گو۔۔۔ " یہ کہہ کر انہوں نے گلاس میں بھری شیمپین کے جھاگوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

مسٹر رائے نے تپائی پر سے بلیک بارس کی بوتل اٹھائی اور اپنے لئے دگنا پیگ بنانے لگا۔ یہ سنکر ٹوٹو مڑا۔ ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے کا فاصلہ اس نے بہت سست سست قدموں سے طے کیا، دل میں نہ جانے کونسا جذبہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ اس نے نوکرانی کو کمرے میں بلایا۔ اپنے بیڈ پہ لٹایا اور اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے سو گیا۔

خوشی کی مسکراہٹ، غم کی اداسی، رشک کی چبھن، محرومیوں کی بے بسی، تنہائی کی اذیت اور خمار ٹوٹنے کی بے کیفی سے لوگ اپنی اپنی صبح کا آغاز کرتے ہیں ــــ

صبح ہو گئی تھی، ٹوٹو اسکول جا چکا تھا اور ممی کی صبح خمار ٹوٹنے کی بے کیفی سے ہو رہی تھی، وہ جمائیوں پہ جمائیاں لے رہی تھیں جب نوکرانی نے چائے پیش کی تو وہ آہستہ سے بڑبڑائیں۔

" آج تو بڑی ٹھنڈک ہے۔ اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا "

اور ٹوٹو کو بھی اس وقت کلاس میں بڑی سردی لگ رہی تھی۔ اس کے پاس کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا تھا۔ پاس بیٹھی ہوئی

ڈمپی چپکے سے بولی۔

"ڈوڈو، اتنی ٹھنڈ میں تم نے سوئیٹر کیوں نہیں پہنا۔ تمہاری ممی تم کو ڈانٹتی کیوں نہیں۔ میری ممی تو بہت خفا ہوتی ہے جب میں سوئیٹر نہیں پہنتی۔"

"ممی کو کیا معلوم۔ جب میں اسکول آتا ہوں تو ممی سوتی ہوتی ہیں"، وہ بھولے پن سے بولا۔

"کیا باتیں کر رہے ہو تم دونوں Keep quiet، چلو پڑھو" ٹیچر نے ڈانٹ کی چھڑی دکھائی،

"M فار ماؤنٹین۔ ہمالیہ سب سے اونچا ماؤنٹین ہے"

"M فار منکی، منکی بہت چالاک جانور ہے"

"M فار ماؤس، ماؤس بلی سے ڈرتا ہے"

پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا ڈوڈو نہ جانے کس سوچ میں پڑا تھا کہ ایک دم کھڑے ہو کر اس نے پوچھا۔

"ٹیچر M سے ممی بھی تو آتا ہے اس کے کیا مینگ ہے"

"ممی تو مدر ہوتی ہے پیاری ماں۔ تم کو نہیں معلوم" ایک بچہ بیچ میں بولا، دوسرے بچے زور سے ہنس پڑے،

مس فیریا پڑھاتے پڑھاتے رک گئیں چشمے میں سے گھور کر انہوں نے سامنے کھڑے ڈوڈو کی طرف دیکھا..... بچوں کے ہنسنے پہ وہ گھبرا گیا تھا۔

ہونٹوں کے کناروں کو دانت سے کتر رہا تھا وہ سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"ممی کا مینگ ہے جو پیار کرے جو Kiss کرے اپنے بابا لوگ کو"

"ٹیچر! جو ممی Kiss نہیں کرتی تو کیا وہ ممی نہیں ہوتی؟"

"اسکی نیلی نیلی آنکھیں مس فیریا کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ اس سوال نے مس فیریا کو کسی گہری سوچ میں ڈبو دیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کچھ نہ بول سکیں۔ کتاب کا ورق ہوا سے پھڑ پھڑانے لگا، چیچک زدہ چہرہ اور کالی رنگت والی مس فیریا پیار کے بارے میں کیا بتلائیں ان کے تشنہ لبوں نے پیار کی شبنمی لمس کو محسوس ہی کب کیا تھا۔ وہ اس لذت سے خود ہی ناآشنا تھیں۔ کاسۂ دل تو کب سے خالی پڑا تھا بالکل واژگوں، کسی نے اس میں جھانکنے کی ضرورت کب سمجھی تھی۔

بے نیازی اور بے اعتنائی کی تمازت نے دل میں اگنے والی کونپلوں کو کب کا جھلسا کر رکھ دیا تھا، نہ کبھی مرد کے بازوں کو چھوا، نہ سوتے میں اٹھ جانے والے بچہ کو پیار کی تھپکی دی۔ نہ لبوں نے پیار کیا نہ لبوں پہ پیار کیا گیا۔ انہوں نے کچھ سمجھانے کے لئے ہونٹ کھولنا چاہے لیکن وہ ایکدم بند ہو گئے۔ ڈوڈو سوالیہ نشان بنا ان کے سامنے اپنی سیٹ پہ کھڑا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی اس کی ٹیبل کے پاس آئیں۔

ڈوڈو نے پھر پوچھا "ٹیچر: میری ممی تو مجھے کبھی پیار نہیں کرتی تو کیا وہ میری ممی نہیں ہے؟"

احساس کی خوابیدہ پرتوں میں پیار کرنے کی آرزو نہ جانے کب سے چھپی بیٹھی تھی، کب سے گھات لگائے بیٹھی تھی، لیکن ایک دم بیل بجنے کی آواز آئی اور وقت نے دونوں کو الگ کر دیا ــــ

فیاض رفعت

اس نے کہا تھا

محبوب کیمرج پہاڑوں کی بارش کا بھی یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ اس دن بھی اچانک بادل گھر آئے تھے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی، بارش اپنے ساتھ برف کی سوغات بھی لائی تھی۔ کشمیر میں یہ موسم کی پہلی برفباری تھی۔ بدلتے موسم کے منظر کو اپنی آنکھوں سے دل میں اتارنے کے لئے میں نے کھڑکی کے پٹ کھول دئیے۔ برف کے پھول شوخیاں کرتے ہوئے میرے چہرے سے لپٹ گئے۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر کھڑے کئے، اور جیب میں سگریٹ تلاش کرنے لگا لائٹر سے سگریٹ جلا کر ابھی میں نے پہلا کش ہی کھینچا تھا کہ برفباری کی سرگم پر جیسے ایک نغمہ گونج اٹھا۔

جو سفائن کوفی کے دونوں ہاتھوں میں برف کی سوغات تھی جیسے وہ پیار سے میری جانب اچھالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"مدثر! موسم کی پہلی برفباری مبارک ہو۔"

"ہیلو۔ لوکوفی۔ سیم ٹو یو۔ مائی پلیزر۔ پلیز بی کمفرٹیبل کرسی لے لو۔" میں نے بوٹے قد کی بیر بہوٹی۔ لڑکی کا گرمجوشی سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔ کوفی کے رخساروں پر کھلے سرخ گلاب تمتما رہے تھے میں نے اسکی سبز ازبکستانی ٹوپی کی برف جھاڑی۔ پھیرن اتارنے میں اس کی مدد کی اور بخاری میں دہکتے کوئلوں کو سلاخ سے کریدا۔ کوئلوں کا رنگ سرخ تھا اور ان کے ارد گرد پھیلی راکھ مجھے برف کے سفید پھولوں جیسی نظر آ رہی تھی۔

کوفی اپنی کرسی بخاری کے قریب لے گئی۔ سردی کی قیامت سے اسکی انگلیوں کی پوریں منجمد سی ہو گئی تھیں۔ میں نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ اسکی گلابی پنڈلیوں کے گھنگرو بج رہے تھے اس کے گیت گاتے گنگناتے بدن میں ہزار نغموں کا لوچ تھا۔ اچانک کوفی نے اپنا چہرہ میری طرف گھماتے ہوئے کہا۔

"مدثر! چلو تمہیں گھر لے چلیں، ہم لوگ ہاؤس بوٹ سے منتقل ہو کر جہانگیر ولا چلے گئے ہیں۔ آج شام کو ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ، میں تمہیں اپنے ہاتھوں کا بنا ہوا گشتابہ کھلاؤں گی، کشمیر کی یہ خاص ڈش میں نے بہت محنت سے بنانا سیکھی ہے۔ ڈرنکس بھی ہونگی، ہم لوگ رقص بھی کریں گے۔ کرس نے مجھے خاص طور سے تمہیں مدعو کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ دیکھو تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ۔ انکار نہ کر دینا ورنہ ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔"

"اچھا مجھے پانچ منٹ کی مہلت دو۔ میں کچھ فائلیں دیکھ لوں۔ پھر بات کرتے ہیں۔"

کوفی نے خوش دلی کے ساتھ مجھے کام کرنے کی اجازت دیدی اور فائلوں کے اوراق پلٹتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ "کرس کتنا خوش قسمت ہے جس کے حصے میں ایسی خوش دل طرحدار لڑکی آئی ہے۔ ہندوستان میں مرد عورت کی بے باکانہ دوستی کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں لوگ

آ بھی بھرتے ہیں اور عشق کی ناکامیوں کے سرمائے کو سینے سے لگائے سمجھوتے کی شادی کر لیتے ہیں۔ دفتروں میں عمریں ضائع کرتے ہیں، ریٹائر ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں ایک طرف مغرب کے یہ سیلانی لوگ ہیں جن کے دلوں میں ملکوں ملکوں گھومنے کا سودا سمایا رہتا ہے، کرس اور کوفی ہچ ہائکنگ کرتے ہوئے لندن سے کشمیر آئے تھے۔ ایران، افغانستان اور پاکستان ہوتے ہوئے ان لوگوں نے کشمیر کی وادی کا رخ کیا تھا۔ ان سے میری رسمی سی ملاقات تھی عام ہندوستانی کیطرح میں بھی جھوٹے آداب و اخلاق کے بندھنوں کا قیدی تھا۔ دفتری وقار کے پیش نظر میں اس جوڑے کے ساتھ ایک خاص دائرے میں رہ کر ہی ملتا جلتا تھا۔ شاید اس میں میری بزدلی اور تنہا پسندی کو بھی دخل تھا۔ مگر نہ جانے کوفی کی شخصیت میں ایسی کونسی کشش تھی۔ اسکی نیلی آنکھوں میں سامری کا کونسا جادو تھا کہ میں اسے دیکھکر بیچین سا ہو جاتا تھا۔ اصل میں کرس اور کوفی کو مغربی موسیقی سے گہرا شغف تھا۔ اور وہ ریڈیو پر اپنے کمپوز کئے ہوئے گیت لیکر آئے تھے۔ ان گیتوں میں ڈسکو کا شور نہیں تھا۔ بلکہ ایک ایسی موسیقی ریز نزاکت اور کیفیت تھی۔ جو روح کے خوابیدہ جذبوں کو خوابوں کی دیومالائی دنیا میں لے جاتی تھی محبت کے سرمدی جذبے کو موضوع بنا کر ان لوگوں نے بیحد لوچدار گیت ترتیب دیئے تھے۔ میں نے مغربی موسیقی کے لئے ان کی ریکارڈنگ کرنی تھی۔ پھر یہ لوگ اب سکی انگ (Skiiug) کے لئے گلمرگ چلتے گئے اور اب بہت دنوں کے بعد کشمیر آئے تھے۔

فائلوں سے میں نے سر اٹھایا تو کوفی کو منتظر پایا۔ اسکی بادام کے شگوفوں جیسی آنکھیں موسم کے رنگوں میں ڈوب کر شیلی ہو چلی تھیں میں نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

"مدثر! اب اٹھو بھی بنڈ سے ٹہلتے ہوئے جہانگیر چلیں گے۔ شام اپنے سنہرے پنکھ پھیلا رہی ہے۔ برف گرتی ہے تو مجھے گمان ہوتا ہے جیسے موسم کی مہربان دیوی مجھے میرے بچپن کی لوریاں سنا رہی ہے۔ اب تم جلدی اٹھو۔ ورنہ میں یہیں میز پر سر رکھکر سو جاؤں گی"۔ کوفی نے انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس کا شاداب سینہ کمان بن گئے میں نے جلدی سے فائلیں بند کیں اور کوفی کے ساتھ نکل پڑا سڑکوں پر برف کی سفید چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ چنار کے درختوں پر سجی ہوئی برف دیکھکر مجھے احساس ہوا جیسے موسم کی دیوی نے نئی رتوں کی سفید ابرقی پوشاک زیب تن کر رکھی ہے۔

زیرو برج سے بنڈ پر آتے آتے برف کی دوشیزہ نے اٹکھیلیاں شروع کر دیں۔ جو سفائن کوفی نے دریائے جہلم کے سنہری پانی پر نظریں گڑاتے ہوئے اپنی سانسوں کا دھواں میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مدثر! موسم کی پہلی برفباری کی بھاپ میرے جسم میں پیوست ہوئی جا رہی ہے تھوڑا نزدیک آجاؤ۔ اور نزدیک۔ تم اتنا شرماتے کیوں ہو۔ آخر ہم لوگ اچھے دوست ہیں"۔ "شاید مشرقی حجاب مانع ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا"

"آج مشرق مغرب سے آنکھیں ملا رہا ہے اور تمہیں مجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ٹھیک ہے ڈارلنگ شرماتے رہو لیکن مہربانی کر کے اپنے بازو میری کمر میں حمائل کر لو۔ تاکہ میں برفباری کا صحیح لطف اٹھا سکوں۔ تمہارے جسم کی خوشبو مجھے بہت بھاتی ہے کوفی نے میرے کان کی لوؤں پر اپنے نمکین ہونٹ رکھتے ہوئے سرگوشی کی اور کھکھلا کر ہنس دی۔

برفباری کا زور بڑھ گیا تھا۔ بنڈ کی کراسنگ پر ایک سائبان میں ہم ذرا دم لینے کے لئے ٹھہرے۔ سائبان کے نیچے مشکل سے دو لوگ کھڑے ہو سکتے تھے۔ میں کوفی کی گرم سانسوں کو اپنے چہرے پر بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر برف کی بوندیں لرز رہی تھیں میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کے ہونٹوں سے لگی ہوئی برف کی ساری شراب ایک گھونٹ میں پی جاؤں۔ کوفی نے شاید میرے دل کی زبان پڑھ لی تھی۔ وہ اچانک میرے

نزدیک آئی۔ میرے شانوں تک اچک کر اپنی صندلی باہنیں پھیلائیں اور میرے ہونٹوں پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیئے۔ اپنی بھرپور گرمی اور شدت کی حلاوت سے میرا سارا بدن تھرتھرا کے رہ گیا۔ اچانک مجھے کرس کا خیال آگیا۔ یہ صریحاً دوستی کے آداب کے خلاف تھا۔ اور میں آہستگی کے ساتھ کونی کے گرم جسم سے الگ ہوگیا۔ اس کے بعد جہانگیر ولاتک کا راستہ ہم لوگوں نے خاموشی سے کاٹا۔

کرس پورٹیکو میں کرسی ڈالے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ برفباری دیکھ رہا تھا۔ ہم لوگوں پر جیسے ہی اس کی نظر پڑی وہ ہنستا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے کونی کو بازوؤں میں لیکر اپنے بے شمار بوسوں کی بارش سے ڈھانپ دیا اور پھر بڑے والہانہ پن کے ساتھ مجھے چومنے لگا۔ کونی میری طرف دیکھ کر ہنستی رہی اور میں شرماتا رہا۔

پھر ہم لوگ ڈرائنگ روم میں آئے۔ کرس معذرت کرکے کچن میں چلاگیا۔ ابھی کھانے میں کچھ دیر تھی۔ میں آرام سے ایک صوفے پر دراز ہوگیا۔ آتش دان میں آگ روشن تھی۔ کونی تلی ہوئی مچھلی کے قتلے اور رم کی بوتل تپائی پر رکھکر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کالے رنگ کا شب خوابی ریشمی لبادہ پہن رکھا تھا جس میں اس کا جیسا جسم کندن کیطرح دمک رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے بال اسکے شانوں پر مچل رہے تھے جن میں شفاف موتی جیسے پانی کے قطرے اٹکے ہوئے تھے۔

"مدثر! گلمرگ میں SKiING کے علاوہ ہم لوگوں نے ٹریکنگ TREKKING بھی کی۔ کھلن مرگ تک پیدل گئے۔ بہت تھکن ہوگئی تھی۔ ٹھنڈے گرم پانی سے شرکنس باتھ لیا تو جسم کی تکان ٹوٹی ہے۔ مگر ابھی میٹھی میٹھی تکان باقی ہے ـــــ ارے یہ کیا، تم نے ابھی ایک اسمال بھی ختم نہیں کیا۔ جلدی سے پی جاؤ۔ پھر میں تمہارے لیئے لارج بناؤں گی۔ جسے ہم دونوں گھونٹ گھونٹ پئیں گے۔" یہ کہتے ہوئے کونی صوفے پر میرے نزدیک سمٹ گئی اور اس نے رم کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگادیا۔ جیسے ہی گلاس خالی ہوا کونی کے ہنسی کی سرگم ڈرائنگ روم میں سات سروں کا جادو جگا گئی۔ میرے کانوں کی لویں سرخ ہو رہی تھیں کونی نے میرے منہ کے نزدیک اپنا منہ لاتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہونٹوں پر شراب کے قطرے بہہ رہے ہیں مجھے انہیں جذب کرنے دو۔"

"کچن میں کرس ہے اگر اس نے دیکھ لیا تو میں۔ ۔ ۔"

"مائی ڈیر مدثر۔ بی بولڈ۔ بوتھ آف اس لو یو ہم دونوں تمہیں چاہتے ہیں۔ ہم تمہاری سوگوار تنہائی کو خوشیوں میں بدل دینا چاہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ٹھہرو۔ پہلے ایک بڑا پیگ شیئر کرتے ہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے کونی نے ایک لارج تیار کیا اور گلاس میرے ہونٹوں سے لگادیا۔ پھر میرے سینے کو سہلاتے ہوئے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "اب تم مجھے سرد کردو۔"

کونی نے دو لمبے گھونٹ بھرے اور اٹھ کر دروازے کے پردے کھینچ دیئے۔ میں نے اپنی نیم غنودہ آنکھیں اٹھائیں تو دیکھا۔ کونی ہسرس کے کسی زندہ مجسمے کیطرح اپنے گلابی بدن کی تمامتر شعلگی کے ساتھ میرے جسم پر جھکی ہوئی تھی۔

اور جب برفباری کا زور تھما تو میں نے کونی کے شاداب سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

"کونی آخر تم نے اپنے چاندنی جیسے بدن کی سوغات مجھ جیسے معمولی آدمی کو کیوں سونپ دی۔؟!؟"

کونی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ بھرتے ہوئے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنے سینے پر کراس کا نشان بناتے ہوئے شہادت کی انگلی آسمان کی جانب اٹھا دی اور سرگوشی کے لہجہ میں بولی۔

"اس نے کہا تھا"

ڈاکٹر ایم آئی ساجد

سوتیلا آدمی

آج وہ کہانی ایک المیے پر ختم ہو گئی۔ جو مسلسل پچیس برسوں سے رقم ہوتی آرہی تھی۔ وہ کہانی جو میرے جذبات کی سُرخ روشنائی سے لکھی جاتی رہی ہے۔ آج اپنے اختتام کو پہنچ ہی گئی!! سیٹھ جسپال میرے سامنے ایک لاش کی صورت میں بے حس و حرکت پڑا ہے۔ خوبصورت بنگلہ میں ایک کہرام سا مچا ہوا ہے۔ ابھرتی ڈوبتی سسکیاں، آنسوؤں کی ہلکی ہلکی نمی کے ساتھ بنگلہ کی فضا کو سوگوار بنا رہی ہیں۔ ہر ایک کے چہرے پر غم کا تاثر ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں کوئی آنسو ہے نہ چہرے پر غم کا کوئی شائبہ اور نہ ہی بیوگی کا وہ احساس مجھ پر طاری ہے جو عام حالات میں ایسے نازک وقت شدّت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ احساس تو مجھ پر برسوں سے طاری تھا۔ کوئی نئی بات تو نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ آج سے پہلے میں شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ جیسی تھی لیکن آج سند یافتہ بیوہ بن گئی۔

میرے سامنے سیٹھ جسپال کی لاش سفید کپڑے سے ڈھکی رکھی ہے جو دل کے تیسرے اٹیک کی تاب نہ لا کر ایک سرد لاش میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سیٹھ جسپال جیسے میرا شوہر ہونے کا اعزاز حاصل تھا، جو میرا مجازی خدا تھا، جس نے مجھے پوری مذہبی رسومات کے ساتھ مقدس آگ کے سامنے اپنی دھرم پتنی سویکار کیا تھا لیکن زندگی کی راہوں میں کچھ دور چل کر ایک معمولی حادثے کی طرح بھول گیا تھا۔ میرے لاشعور نے ہمیشہ اُسے سوتیلے آدمی کا نام دیا ہے کہ وہ اسی حیثیت کا حامل تھا۔ تعزیت کیلئے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ فون کی گھنٹیاں بار بار بج رہی ہیں۔ ڈرائنگ ہال اور بنگلہ کا باہری حصہ لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ سیٹھ جسپال کی لاش آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد شمسان کی طرف لے جائی جا رہی تھی۔ دردمیں ڈوبی رونے کی آوازیں، سوز بھری سسکیاں، آہوں اور کراہوں کا شور کافی بڑھ گیا ہے۔ میں گم سُم سی کھڑی یہ سب اپنی خشک آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ اب بھی اُن میں کوئی نمی نہیں ہے۔ لب خاموش اور جسم ساکت ہے۔ ارتھی ڈرائنگ روم سے گزر چکی ہے۔ میرا بیٹا انیل مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے ارتھی کے ساتھ جا رہا ہے کہ چِتا کو آگ تو اسی کو لگانا ہے۔ میری بیٹی کملا مجھے اپنے کمرے کی طرف آہستہ آہستہ لے جا رہی ہے۔ چند عورتیں ہمارے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں۔ یہ سب سمجھتی ہیں کہ مجھ پر جسپال کے مرنے کا زبردست اثر ہوا ہے۔ میں صدمے سے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہوں۔ جسپال کی موت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی ہے کتنی معصوم اور نادان ہیں یہ سب انہیں کیا معلوم میں سوچ کے کن زاویوں سے گزر رہی ہوں؟ انہیں کیا پتہ کہ جذبات و محسوسات کی ان دیکھی خاموش آندھی مجھے کہاں کہاں اڑائے پھر رہی ہے۔ میرا وجود مجھ سے بچھڑ کر کہاں کہاں بھٹک رہا ہے؟

اپنے کمرے میں اپنے ہی نرم و ملائم بستر پر کسی اجنبی کی طرح بیٹھ گئی ہوں۔ گم سُم، اداس، خاموش، نظریں نیچی کئے ہوئے۔ آج سے پچیس برس پہلے کی طرح جب میں سُرخ ریشمی کپڑوں میں ملبوس دلہن بن کر اس کمرے میں اسی طرح آئی تھی۔ اجنبیت کی وہ دیوار آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ صرف جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑ گیا ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ دیوار تو اپنی جگہ قائم ہے! جسپال اُس وقت بھی اسٹو جانڈی میں کھیلنے والا شاطر کھلاڑی تھا۔ اور کل تک بھی اس کا یہی مشغلہ تھا۔ ازدواجی زندگی کی پہلی ہی رات جسے سہاگ رات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جسپال نے میری جھیل سی شفاف آنکھوں میں وہ سہانے خواب سجا دیئے تھے۔ جو ہر لڑکی شادی کے بعد دیکھتی اور سوچتی ہے۔ وفا اور محبت کے نام پر اس نے میرے سارے جسم کو اپنے گرم گرم بوسوں سے داغ دیا تھا۔ میں جسپال کا اتنا ڈھیر سا پیار پاکر کسی بدمست شرابی کی طرح نشہ میں ڈوب گئی تھی۔ اور اسی بنگلہ کی در و دیوار سے ابھرنے والی ان سرگوشیوں کو بھلا بیٹھی تھی جو جسپال کی عیاشی، خودسری اور خود غرضی کا ذکر کیا کرتی تھیں لیکن دو ہی ماہ کے قلیل عرصے میں وہ مدھم مدھم سرگوشیاں گونجتی آوازوں کے ساتھ نہ صرف میری سماعت پر اثر انداز ہونے لگیں۔ بلکہ آنکھوں کے سامنے بھی رقص کرنے لگیں۔ اور پانچ ماہ کے اندر اندر جسپال مجھ سے سیراب ہوکر اس طرح دور دور رہنے لگا۔ جس طرح پھول کا رس چوس کر بھونرا کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔ راتوں میں غائب رہنا، شراب کے نشے میں میرے بدن سے وحشیوں جیسا برتاؤ کرنا اور تند مزاجی سے پیش آنا گویا جسپال کی عادت میں شامل ہوگیا تھا۔ میری آنکھوں سے وہ سارے خواب ایک ایک کر کے بکھرنے لگے۔ جو جسپال نے چند اولین راتوں میں محبت اور چاہت کے نام پر بڑی عقیدت سے سجائے تھے۔ ان سارے بوسوں میں سوزش سی ہونے لگی۔ جو جسپال نے میرے بدن کے کئی حصوں پر ثبت کئے تھے۔ اس صورت حال نے جس کے بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھ سے میرا آپ چھین کر تاریک گہرائیوں میں اچھال دیا۔ ان گزرتے ہوئے تاریک لمحات میں انیل میری زندگی میں امید اور اجالے کی کرن بن کر نمودار ہوا۔

جہاں انیل میرے لئے اجالے کی کرن ثابت ہوا۔ وہیں جسپال کیلئے راہ فرار کا مؤثر بہانہ بھی بنا۔ جسپال کا بہت بڑا بزنس تھا۔ سونے چاندی اور جیولرس کا بہت بڑا اور کامیاب تاجر تھا وہ۔ آئے دن کاروباری سلسلے میں ملک اور بیرون ملک کے خوبصورت شہروں میں اس کی آمد و رفت تھی۔ اور جہاں سونے چاندی اور ہیروں کی افراط ہو وہاں اکثر عیاشی بھی فطرت کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ تین ہی برسوں میں دھیرے دھیرے جسپال مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ دور ہوتے ہوتے بھی وہ مجھے کملا کی صورت میں مزید ایک اور نشانی دے گیا۔

اور پھر اچانک ایک دن صبح صبح معلوم ہوا کہ جسپال بنگلور کی ایک نوجوان طرحدار ڈانسر کی زلفوں کا اسیر ہوگیا۔ اس نے اسے ایک کار اور خوبصورت فلیٹ بھی خرید دیا۔ اور آئے دن اس کے ساتھ دادِ عیش دیتا ہے۔ پھر کچھ ہی دن بعد یہ بھی پڑھنے میں آیا کہ سیٹھ جسپال نے اس ڈانسر نیما سے کورٹ میرج بھی کر لی ہے۔

جسپال اب مجھ سے اتنی دور جا چکا تھا کہ اس سے بات کرنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔ پھر بھی ایک دن میرے بار بار پوچھنے پر اس نے کہا تھا۔ ”ہاں ساوتری! وہ مجھے پسند آگئی تھی!! کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“ میں کیا جواب دیتی۔ خاموش رہی۔ دل کے رستے ہوئے زخم دکھاتی بھی تو کیسے؟ پتھر کے اس دیوتا کو جسے میرے جذبات و احساسات کی کوئی پرواہ نہیں۔ زندگی لمحہ لمحہ گزرتی رہی۔ انیل اور کملا بڑے ہوتے گئے۔ جسپال بتدریج دور ہوتا گیا۔ اب تو ہفتوں میں کبھی کبھی اس سے ایک آدھ بات ہو جاتی۔ ورنہ سامنے سے گزرتے ہوئے بھی وہ نظر اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ رہا تھا۔ میں اپنے بچوں کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔ لیکن غضب تو اس وقت ہوا جب انیل کی بارہویں سالگرہ کے دوسرے ہی روز جسپال اپنے ہی آفس کی ایک خوبصورت ٹائپسٹ آشا کو اپنی محبوبہ بنا کر اسی بنگلہ میں لے آیا اور وہ یہیں رہنے بھی لگی۔ راتوں میں ان کے ہنستے بولنے اور جذبات میں ڈوبی ہوئی مدھم آوازیں میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح ٹپکتیں اور میرا وجود متزلزل ہو جاتا۔ مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی دونوں بچے الگ سہمے سہمے رہتے لیکن کچھ کہنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی لیکن چند ہی روز بعد بنگلور کی طرحدار ڈانسر نیما آن دھمکی۔ اور پھر جسپال آشا اور نیما میں ایک ہفتہ تک جو تکرار اور لڑائی ہوتی رہی وہ بیان سے باہر ہے۔ نیما نے کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے کی دھمکی دی تو اپنی عزت کی خاطر جسپال کو بہت بڑی رقم سے ہاتھ دھونا پڑا۔ نیما کے چلے جانے کے بعد جسپال ابھی اس حادثے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ آشا قیمتی زیورات اور تجوری صاف کر کے راتوں رات ایسی غائب ہوئی کہ لاکھ کوشش پر بھی اس کا پتہ نہ چل سکا۔ جسپال اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلنے لگا کاروبار سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ وہ شب و روز شراب میں غرق رہنے لگا۔ وہ شراب کو پیتا رہا اور آہستہ آہستہ شراب اسے پیتی رہی۔ اس سے کئی بیماریاں جونک کی طرح چمٹ گئیں۔ اور وہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔

کل کی رات اُس پر بہت بھاری تھی۔ ایک ایک کر کے شہر کے تمام نامی گرامی ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ اتنی سخت سردی میں بھی اس کا پورا جسم پسینے سے بار بار بھیگ جاتا تھا۔ جسے میں تولئے سے خشک کر دیتی۔ اسی رات اُس نے اپنے گناہوں کا اعتراف بھی کیا تھا اُس نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے میری کلائیاں تھامتے ہوئے کہا تھا "ساوتری! میں اب بچ نہ پاؤں گا ہیں..... میں تمہارا گناہگار ہوں۔ زندگی میں تمہیں بہت دُکھ دیئے ہیں میں نے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا ساوتری!! مجھے معاف کر دینا.. ... !!!"

میری آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشوں نے اُس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر اطمینان کی ہلکی سی لہر دوڑا دی تھی۔ لیکن میرے لب خاموش ہی تھے۔ صبح ہوتے ہوتے جسپال مر گیا۔ اپنی تمام برائیوں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اور پچیس برسوں سے جذبات کی آگ میں سلگتی ہوئی میری زخمی انا بھی بھسم ہو گئی۔ میری آنکھوں میں خوبصورت سپنے جگا کر انہیں جلانے والا، میری زندگی کا ساتھی اور رفیق، رنگین کھلونے کی طرح کچھ دیر مجھ سے کھیلنے والا، قدم قدم پر مجھے فریب اور دغا دینے والا کیا یہی جسپال نہیں تھا؟ جو معافی مانگتے مانگتے اس دنیا سے اُٹھ گیا؟ کیا پچیس برسوں سے متواتر لگنے والے گہرے زخم معافی کے ایک ہی لفظ سے مندمل ہو جائیں گے؟ یہ گھاؤ تو ابھی تازہ ہیں۔ ان پر ابھی مرہم کی ضرورت ہے اور یہ سب وقت کے ہاتھ میں ہے۔

پورا کمرہ خالی ہو چکا ہے۔ بس کملا ہے جو میرے زانو سے لگی چپ چاپ آنسو بہا رہی ہے۔ اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے اُس کے آنسو صاف کئے تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور اس عمل سے مجھے بھرپور طمانیت کا احساس ہوا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کے استاد شمس العلماء سید میر حسن شاہ تھے، ساگر چند نامی انسپکٹر آف اسکول جو بہت ہی سیاہ اور کوئلے کی طرح چلے رنگ کا تھا شاہ صاحب کی خدمت میں ایسے وقت آیا کہ جب آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ ساگر چند نے کہا آج موسم کیا سہانا ہے، شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا پھر آپ بھی تو کالی گھٹا بن کر وارد ہوئے ہیں۔

منقول ادبی لطیفہ

(از : خواجہ عبدالغفور)

جے کانتن
ایس۔ایم۔حیات

(تامل کہانی)

گُل فروش

شیومندر میں شام کے پوجا کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ راجا کنو گلی میں کھڑے اس نور کے درشن کر رہا تھا جو اس مقدس مندر میں چھائی تاریکی کو ضیا بار کر رہا تھا۔ پوجا کے اختتام تک وہ اپنی عقیدت میں گم وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس نے احتراماً اس ہی نکال رکھے چپل پہنے، اپنی کمر کے گرد لپٹا ہوا تولیہ کھولا اور شانوں پر ڈال دیا۔ تبھی اس کا ٹفن بکس کہنی سے ٹکرایا۔ اس ٹفن بکس کو صاف کئے چار دن سے زیادہ کا عرصہ گزر چکے تھے۔ اسے ان کاموں کے لئے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ کاش! وہ زندہ ہوتی۔ ایک دبی سی آہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ اور وہ چلنے لگا۔

"پھول والی! پھول والی! ۔ پھول نہیں خرید و گے بابو جی؟"

گل فروش عورت کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے کنپٹی پر جیسے ایک چھر آ لگا ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس سے مخاطب ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی آگے بڑھنے لگا۔ اس کا سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے اپنا رومال سر پر کس کے باندھا۔ گلی کے موڑ تک پہونچ کر اس نے اپنی رفتار کو سست کی اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگا۔ "پھول والی پھول والی! پھول نہیں خرید و گے بابو جی ۔۔۔؟"

اس کا گلا رندھ سا گیا۔ رومال سر سے اتار کر اس نے اپنے مونہہ میں ٹھونس لیا۔ گلی میں پھیلی ہوئی دھندلی سی روشنی میں اس کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو چمک اٹھے۔

راجا کنو شیومندر کے قریب گنڈک کے کارخانے میں ملازم تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے اچانک ظاہر ہوئی اس شیو کی مورتی کو وہ پندرہ سال سے پوجتا آرہا تھا۔ اس دوران راجا کنو میں اور اس مقدس مورتی میں ایک گہرا ربط سا قائم ہو چلا تھا۔ وہ پندرہ سال کا تھا جب اسے ملازمت ملی تھی۔ ملازمت کے پہلے دن سے وہ ہر روز بلا ناغہ اس دیوتا کے آگے اپنی تمامتر عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنی پیشانی پر مقدس راکھ ملے جذبۂ عقیدت میں ڈوبا کھڑا رہتا۔ اور اس کا پیتل کا ٹفن بکس اس کے شانے پر جھولتا رہتا۔ اس دیوتا کی قدرت پر اسے پورا اعتماد اور یقین تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسی دیوتا نے جو سراپا رحم و کرم ہے اسے اپنے الطاف و کرم سے ملازمت بخشی ہے۔ وہ اپنا یہ معمول بنا چکا تھا کہ کارخانہ جانے سے پہلے اپنے دیوتا کا آشیرواد لے لے۔

گھنے اور سیاہ بال، بند کالر کی قمیض، مدراسی وضع میں بمبئی کل کی دھوتی باندھے۔ ربڑ کے جوتے پہنے وہ ایک خوبرو اور شکیل نوجوان نظر آتا تھا۔ پہلے اس کی شوخ نگاہیں مندر کو پوجا کے لئے آئی ہوئی لڑکیوں کے خوبصورت اور مسحور کن خد و خال پر جم کر رہ جاتی تھیں اور وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے دیوتا کی پوجا نہ کر پاتا تھا۔ اس کے بعد اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہر جمعہ کو وہ اپنی بیوی منیا نمبا(؟) کے ساتھ مندر آتا۔ بے حد گرویدگی کے ساتھ پوجا کرتا پھول اور میوے بھگوان پر چڑھا دیتا۔ آج وہ گلی میں اکیلا کھڑا زندگی کے ہاتھوں پائی سوغات لئے اپنا ٹوٹا اور درد بھرا دل بھگوان کے چرنوں میں پیش کر رہا تھا۔ یہ صرف دیوتا کی ہر سمت اور ہر ایک دل میں جھانکنے والی آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھیں کہ کل کے خوشحال اور بے فکر راجا کنو اور آج کے حرماں نصیب اور کھوئے ہوئے راجا کنو میں کتنا فرق ہے۔ یہ صرف وہی جان سکتا ہے جو اپنے ہاتھوں میں انسانی زندگیوں کی زمام تھامے ہوئے ہے۔ تقدیر کے سنگدل ہاتھوں نے راجا کنو کی زندگی کو کیا سے کیا بنا دیا ایک گل فروش لڑکی اس حقیقت کو کیا سمجھے گی۔ اس کے لئے راجا کنو ایک مستقل گاہک تھا جو اس سے ہر روز پھول لیا کرتا تھا اور ٹفن بکس میں رکھ کر خوشی خوشی گھر لے جاتا۔ کئی دن ہو گئے وہ پھول نہ لیتا تھا۔

"کیا آج پھول نہیں خرید و گے؟" کئی بار اس گل فروش لڑکی نے راجا کنو سے پوچھا بھی تھا لیکن راجا کنو تھا کہ ہر بار بغیر مڑے آگے نکل جاتا۔ وہ سوچتی۔ شاید کوئی دوسری لڑکی اسے پھول دینے لگی ہے۔ اس کا پرانا گاہک اس سے چھن گیا ہے۔

"یہ تو خاص گلاب ہیں بابو جی! ۔ مہکتے اور تازہ گلاب۔ رنگین ملے جلے پھول بھی ہیں۔ گیندے کے پھول بھی ملا دوں گی۔ ساتھ میں ۔" اپنی ان باتوں

سے وہ اسے کبھی کبھی بہلا دیتی اور اپنے پھول بیچنے میں کامیاب ہو جاتی۔ اپنے پُرانے گاہک کے چھوٹ جانے کا غم اسے بُری طرح ستانے لگا تھا۔ وہ خود کو زخم خوردہ سمجھنے لگتی۔ وہ اس رقیب کو کوسنے لگتی جس نے اس سے اس کا پرانا گاہک بہلا پھُسلا کر چھین لیا۔

شام کو پوجا کے وقت بجتی مندر کی گھنٹیاں، مندر کے احاطے میں پھیلی لوبان کی خوشبو، گل فروش لڑکی کی مترنم آواز، دلوں کو مسحور کر دینے والے اس کے کلمات۔ گل فروش لڑکی سے خریدے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو — یہ سب راجا کنو کی زندگی کا اہم جز و بن چکے تھے — پھر — یکایک اس میں تبدیلی کیوں؟ بھگوان شیو کے سامنے کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح وہ کیوں کھڑا رہتا ہے۔ بے حس مشین کی طرح — بے بس — سماج کے ٹھکرائے ہوئے فرد کی طرح — اس سماج کے ٹھکرائے ہوئے فرد کی طرح جو اس کی مخلصانہ و غلامانہ اطاعت اور محنت مشقت کو واجبی تسلیم کرتا ہے۔ وہ بھگوان شیو کے سامنے آج بھی آکھڑا ہوتا ہے۔ لیکن ان دنوں اس کے ذہن میں یکسوئی نہیں۔ اس کے خیالات بے لگام گھوڑے کی طرح بہتے ہیں پُرسکون نہیں رہتے۔

دیوتا جو تاریکی میں گم ہو کر مجسم تاریکی بن بیٹھتا ہے۔ دیوتا جو نور کا ایک شعلہ ہے اور مجسم نور بھی ہے جو زندگی کی تخلیق کرتا ہے۔ خالق ہے اور خود زندگی بھی ہے۔ جو کسی ماں کے بچے کی شکل میں ظہور پاتا ہے اور پھر ماں کی شکل میں بھی آشکار ہوتا ہے۔ جو عورتوں کے لئے مرد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر عورت کا روپ بھی دھار لیتا ہے، عورت کا روپ دھارنے کے بعد اس دیوتا کا کیا ہو گا؟ اس طرح کے بے معنی سوالات اس کے دماغ میں رینگنے لگتے۔ عورت بننے کے بعد وہ راکھ بن جائے گا۔ اس نے مایوسی کے عالم میں سوچا۔ اور مندر میں رکھی ہوئی مقدس راکھ کو اٹھا کر ہوا میں پھونک مارا۔ وہ مندر کے مقدس ترین مقام کو بغور دیکھنے لگا۔ وہاں کے شعلہ کی روشنی دیوتا کی سیاہ رنگت کے مقابل پڑی اور تاریکی میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے پوجا ہی کی اور نہ جان بوجھ کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس پر سکتہ کا عالم طاری تھا اور وہ اسی عالم میں کھڑا رہا — پھر۔ کچھ وقفہ کے بعد — اس نے اپنا رومال شانے پر ڈالا۔ سلیپر پہنے اور گھر کی طرف چل پڑا۔ تبھی مندر کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان گھنٹیوں کی جھنکار میں اسے گل فروش لڑکی کی آواز سنائی دینے لگی۔ "کیا آج پھول نہیں خریدو گے بابو جی"؟ اس نے گل فروش لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے آج کوئی بات نہ کی۔ وہ خاموش کھڑی اسے گھورتی رہی۔ اس لڑکی کی نگاہوں میں دلوں کو چھوتی ہوئی نرمی سموئی تھی۔ ہلدی کے ہلکے سے رنگ نے اس کے چہرہ کو پُرکشش اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ زعفرانی تلک اس کے گورے ماتھے پر خوب سج رہا تھا۔ اس کے بالوں میں ٹنکے ہوئے چنبیلی کے پھولوں کی دلکشی بھی قابلِ دید تھی۔ مقدس منگل سوتر اس کی صراحی دار گردن کے گرد طلائی ہالہ بنائے ہوئے تھا۔ بے خودی کے عالم میں وہ گل فروش لڑکی کی دوکان پر پہونچا۔

"پھول چاہیئے بابو جی؟" اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے معمور آواز میں پوچھا۔

راجا کنو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اشفی کے دس دوں — بڑے گُلابی پھول خوب رہیں گے۔ شہر میں آپ کو ایسے پھول کہیں نہیں ملیں گے چنبیلی کے پھول بھی ہیں میرے پاس — ان میں سے دس دوں — کئی دنوں سے آپ مجھ سے پھول نہیں لے رہے ہیں۔ وجہ جان سکتی ہوں بابو جی؟" — اس کی آواز میں اشتیاق، مسرت اور تجسس کی آمیزش تھی۔

"ایک ہاتھ ملے گُلابی پھول اور ایک ہاتھ چنبیلی کے پھول، دے دو کافی ہیں!" اس کی آواز میں نہ جانے کیوں ارتعاش پیدا ہو چلا تھا۔

"اتنے دنوں سے کسی اور سے پھول خرید رہے تھے بابو جی؟"

"نہیں تو —"

"پھر —؟"

"بیوی یہاں نہیں تھی" — یہاں نہیں تھی — ہاں، شہر میں نہیں تھی!

"تو یہ بات تھی"؟

"اتنے زیادہ پھول کیوں دے رہی ہو؟"

"کوئی بات نہیں بابو جی! تم نے ابھی کہا ہے تمہاری بیوی گھر لوٹ آئی ہے۔ یہ پھول تمہاری بیوی کے لئے ہیں" — ہنسی کی آمیزش لئے آواز فضا میں گونج رہی تھیں

اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ہونٹ صرف کانپ کے رہ گئے۔

"کل جمعہ ہے تم مندر کو اپنی بیوی کے ساتھ آؤ گے نا؟"

اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے پھول لے لئے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

پھول اب اس کے لئے بوجھ بن گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا — میں آج اتنی تیزی سے کیوں چلنے لگا ہوں؟ — کیا مجھے اپنے گھر جلد نہیں پہونچنا ہے کیا وہ میری منتظر نہ رہے گی؟ — وہ؟ وہ کون؟؟

وہ گلی کے موڑ پر لیمپ کے نیچے کھڑا گلی کے اس پار اپنے مکان کو دیکھنے لگا۔ وہ تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔

ہاں — اس گھر کا اجالا چھن چکا ہے۔ اس کے دل کا نور بجھ چکا ہے۔

اس کی نیت کا نور ظلمت میں ڈوب گیا ہے۔ اس کی زندگی کا اجالا اندھیرے میں بدل گیا ہے۔

وہ ہنس پڑا۔

میں کیوں ہنسنے لگا ہوں؟

کیا رونے سے ہنسنا اچھا نہیں ہے؟

اس نے اپنا تھیلا جس کھولا۔ چنبیلی کے پھول تبسم نظر آئے۔ کیا وہ اس پر خندہ زن تھے یا اسے ستا رہے تھے۔ اس نے تھیلے کو بند کر دیا۔ تھیلی سے اپنا چہرہ پونچھا اور اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبانے لگا۔ اس ذہنی کشمکش میں اس کے آنسو نکل پڑے۔ وہ اپنے تیرہ و تار گھر کی طرف دوڑنے لگا تاکہ بلا جھجک کھل کر رو سکے۔

دوسرے دن ــــ

شیو مندر کے پاس وہی پرانا منظر۔ پوجا کی راعت، پجاریوں کا اژدھام، مندر کے گھنٹوں کی جھنکار، عقیدتمندوں کی والہانہ پرستش کا انداز۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لیکن ایک چیز کی کمی تھی۔ وہ تھی گل فروش لڑکی کی مترنم آواز ــــ اس آواز کی گونج آج وہاں نہ تھی۔ پھول بھی نہ تھے۔ گل فروش لڑکی بھی نہیں۔ سب کچھ جیسے نامکمل تھا۔

وہ گل فروش لڑکی کو دیوانہ وار ڈھونڈنے لگا۔ آج اسے پھولوں کی ضرورت نہیں۔ گل فروش لڑکی کی مسحور کن آواز جیسے اس کے تصورات میں گھر کر کے رہ گئی تھی۔ اس نے دیکھا کچھ ہی دور پرایک بوڑھا بیٹھا پھول بیچ رہا ہے۔

راجا کنور اس کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا "وہ لڑکی کہاں ہے جو یہاں پھول بیچا کرتی تھی"؟

"پتہ نہیں۔ لیکن میرے پاس بھی تو چنبیلی کے تازہ پھول ہیں دیدوں"؟

"چونکنے کی بات ہے"

گل فروش لڑکی کی آواز اس کے دل و دماغ میں گھر کر کے رہ گئی تھی۔ اس کی آواز کہاں کھو گئی ہے ــــ وہ لڑکی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اس کا دماغ پریشانیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اس دن وہ گلی کے موڑ پر بھی نہ رکا اور نہ اس نے اپنا تھیلا جس ہی کھولا۔ وہ اپنے گھر کی طرف بوجھل قدموں سے چلنے لگا۔ کھوئی ہوئی تمناؤں کے درد میں ڈوبی ہوئی ایک آہ اس کے سینے سے نکلی۔

کئی دنوں تک اس محلے میں اس گل فروش لڑکی کی آواز نہیں سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کا بوجھ بھی بڑھتا ہی گیا۔

اتوار کا دن تھا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ضروریات اور پھول خریدے۔ میں پھول کیوں خریدوں؟ کس کے لئے خریدوں؟ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں گل فروش لڑکی کی مانوس آواز گونجنے لگی۔

"پھول والی! ــــ پھول والی!!"

راجا کنور کا دل خوشیوں کے ہنڈولے میں ڈولنے لگا۔

وہ باہر دوڑا آیا۔

ہاں ــــ وہ وہی تھی ــــ لیکن اس کے چہرے پر ہلدی کی رنگت نہیں تھی۔ اس کے ماتھے پر سیندور بھی نہ تھا۔ اس کی ٹوکری میں پھول بھرے پڑے تھے لیکن اس کے بالوں میں پھول نہ تھے۔

راجا کنور کو دیکھتے ہی اس کی آواز رندھ گئی۔

"تمہاری یہ حالت کیوں ہے"؟ اس نے پوچھا۔

یہ ایک بے معنی سوال تھا۔

ساری کے پلو میں اپنا رونا سا چہرہ چھپا کر وہ بے اختیار رو پڑی۔

"میرا شوہر مجھے چھوڑ کر چلا گیا بابو جی"!

اس جوان عورت کا جسم غم کی شدت سے کانپنے لگا تھا۔

وہ بھی اس سانحہ سے بے حد متاثر ہوا۔

"دو دن کے بخار نے میری مانگ سے میرا سیندور چھین لیا۔ وہ مجھے دھوکا دے کر چلا گیا"۔

"سچ کہا تم نے محبوب اکثر دھوکا دے جاتے ہیں"۔ اس نے کہا۔

اس کی اس بات میں اپنے لئے تسلی تھی اور نہ اس عورت کے لئے۔

"میں اپنی دوکان چھوڑ چکی ہوں۔ آج سے میں ہر روز آپ کے گھر آ کر ماں جی کو پھول دیا کروں گی"۔

وہ گھر میں داخل ہوئی۔

اس نے اسے روکا نہیں۔

"ماں جی! پھول لو گی؟"

وہ ہنس پڑا۔ قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

"ہنس کیوں رہے ہو بابو جی"؟

"رونے سے اچھا ہے کہ ہنسا جائے"

"میں سمجھی نہیں"

"میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ میری تقدیر تمہاری ہی تقدیر جیسی ہے"!

بات کا مفہوم سمجھ کر وہ کانپ اٹھی۔ اس نے کمرے کے سونے پن کو

محسوس کیا۔ کمرے کے ایک کونے میں دو سلک کی ساڑیاں، چند چوڑیاں اور مخمل کو تہ کر رکھے تھے۔ دیوار پر اس کی بیوی کی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر کے نیچے اسٹینڈ پر پھولوں کی چند سوکھی پنکھڑیاں پڑی تھیں جنھیں عقیدت اور محبت سے تصویر پر چڑھایا گیا تھا۔ گل فروش عورت نے عقیدتمندی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ اس تصویر کے آگے جوڑ دیئے۔ "تم خوش قسمت عورت ہو!"

وہ کسی سنگین مجسمہ کی طرح مہر بہ لب کھڑا رہا۔

"جانے سے پہلے کچھ پھول دیتے جانا۔"

پھول لیتے وقت اس نے گل فروش عورت کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرگرمی اور جوش دیکھ کر اس عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس کے گالوں پر حجاب اور شرم کی کیفیت پیدا ہوگئی —— ان گالوں پر جن پر شفق کی لالی کبھی نہ پھولے گی۔

"تم سب کو پھول دیتی رہتی ہو لیکن تم خود ——"

"ہاں میں بدقسمت ہوں۔ میں ان پھولوں کو اپنے جوڑے میں نہیں ٹانک سکتی!"

"نہیں —— ان پھولوں پر تمہارا پورا اختیار ہے۔" اس نے کہا اور چند پھول اٹھا کر بہت پیار سے اس عورت کے بالوں میں ٹانک دیئے۔

وہ کانپ اٹھی ——

"یہ کیا کر رہے ہو بابوجی؟"

راجاکنو نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

گل فروش لڑکی باہر چلی گئی۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور گلی میں تیز گام چلنے لگی۔

جب راجاکنو باہر آیا تو وہ صرف یہ دیکھ سکا کہ اس کے لگائے ہوئے پھول گلی میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان پھولوں میں اس لڑکی کے بالوں کی ایک لٹ بھی الجھی ہوئی ہے۔

وہ وہیں گم سم کھڑا رہا۔

"پھول والی —— پھول والی — پھول نہیں خریدو گے بابوجی؟"

کہیں دور اور بہت دور سے آتی ہوئی آواز ہوا کی لہروں میں بکھر کر سنائی دی —— پھر —— وہ آواز —— فضا میں تحلیل ہوتی گئی —— اور آخرکار فضا میں ڈوب گئی۔

اس نے اس گل فروش لڑکی کو پھر کبھی نہ دیکھا اور نہ اس کی آواز ہی سنی!

(جے کانتن کی تمل کہانی سے)

جگر مراد آبادی کے رندی سے تائب ہونے پر جوش ملیح آبادی نے طنز کیا، آپ کی حالت عبرتناک ہے۔ شراب نے آپ کو رند سے مولوی بنا دیا ہے اور آپ اپنے مقام کو بھول گئے مجھے دیکھئے میں ریل کے کھمبے کی طرح اپنے مقام پر اٹل کھڑا ہوں، جہاں کا وہاں جگر صاحب نے کہا۔ اور میری زندگی ریل گاڑی کی طرح ہے جو آپ جیسے ہر کھمبے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہر مقام سے آگے اپنا مقام بناتی جا رہی ہے۔

منقول ادبی لطیفے

(از: خواجہ عبدالغفور)

مراٹھی کہانی

گ. وی مادگولکر
سلام بن رزاق

بجلی

تاتیا گرو بے حد چڑچڑے مزاج کا شخص تھا معمولی بات پر فوراً جنیو توڑ کر آپے سے باہر ہو جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارے گاؤں میں کسی بھی چڑچڑے شخص کو تاتیا گرو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

اسے مرے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا مگر اس کی چڑچڑاہٹ کے قصے آج بھی مشہور ہیں۔ ماروتی کے مندر سے سو قدم کے فاصلے پر دو کھولیوں کا اس کا چھوٹا سا مکان تھا۔ تین افراد پر مشتمل ایک مختصر سا خاندان۔ تاتیا۔ اس کی بیوی گیتا اور بیٹا تکارام۔ تاتیا مندر کی صفائی کرتا، دیا جلاتا اور روزانہ صبح ماروتی کی مورتی پر پھول چڑھاتا۔ اور باقی وقت پرساد کے لئے پلاس اور برگد کے پتّل سیتا رہتا۔

گیتا ہر سنیچر کو مندر کے سامنے کا کچا چوترا لال مٹی سے لیپتی۔ گاؤں میں جہاں کہیں کوئی تقریب یا کیرتن بھجن ہوتا، وہاں پتّل پہنچاتی، ماروتی کے سامنے نذرانے کے طور پر رکھے ہوئے سکّے چاول وغیرہ جمع کر کے لاتی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی گرہستی کو سلیقے سے چلانے کی کوشش کرتی۔

گاؤں میں گھر گھر بیل تلسی تقسیم کرنے کا کام البتہ تکارام کے ذمے تھا۔ گاؤں میں تقریباً سو سوا سو گھر تھے۔ وہ علی الصبح بلا ناغہ اٹھ کر کنویں پر جاتا۔ نہا دھو کر گھر سے باہر نکلتا، اور گھر گھر گھوم کر بیل تلسی تقسیم کرآتا۔ بیل تلسی کے بدلے عورتیں اس کے گلے میں پڑے جھولے میں مٹھی بھر آٹا، دال ڈال دیتیں۔ نو ساڑھے نو بجے تک گاؤں کے ہر گھر میں بیل تلسی پہنچ جاتی اور تکارام کی جھولی میں بھی اچھا خاصا آٹا جمع ہو جاتا۔ دوپہر میں گیتا اس آٹے کی روٹیاں سینکتی۔ دال چھونکتی۔ بڑے سکون اور اطمینان سے دن گذار رہے تھے۔ البتہ تاتیا دن میں کئی بار چڑتا، خوب چیختا، چلاتا، گالیاں بکتا۔ خواہ وجہ اس کی انگلی میں چبھنے والی معمولی سی پھانس ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے میں تکا یا گیتا دونوں میں سے کسی نہ کسی کی شامت ضرور آجاتی۔ جو بھی سامنے پڑتا اسی کو دو چار ہاتھ جڑ دیتا۔ گیتا اور تکا پر اب اس کے موقع بے موقع مار کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا وہ لوگ اس کی مار اور گالیوں کے عادی ہو گئے تھے۔ گاؤں والے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتے تھے کہ انکے لئے اب یہ روز کا معمول ہو گیا تھا

تکارام اٹھارہ برس کا تھا مگر وہ الف کا نام بھالا نہیں جانتا تھا۔ اس نے بیل کے پیڑ پر چڑھ کر بیل پھل توڑنے اور کانٹوں سے بچتے ہوئے درخت سے اتر آنے کے سوا کوئی کام نہیں سیکھا تھا۔ یوں ایک دو دفعہ وہ کوشنا ماسٹر کے مدرسے میں پڑھنے کی غرض سے گیا ضرور تھا۔ مگر بچوں نے اس کا ایسا مضحکہ اڑایا کہ بیچارہ پھر مدرسے کا رخ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ تاتیا نے بھی اس طرف خاص توجہ نہ دیا۔ کارن اس کیلئے کہ وہ خود کالا اکھر بھینس برابر تھا

دوپہر بیحد تپ رہی تھی کھنڈوبا کے مندر دھوپ میں اس طرح کانپ رہا تھا جیسے پانی میں عکس کانپتا ہے۔ پس منظر میں بیری کی شاخیں تصویر کی طرح ساکت تھیں۔ دھوپ اسقدر چمکیلی تھی کہ جدھر نظر اٹھتی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی ترمرے سے

تیرنے لگتے۔ کھنڈوبا کے مندر کے سامنے والا میدان ویران تھا۔ مندر کی شکستہ دیوار کی مختصر سی چھاؤں میں بھگوان کا بچھڑا جسم سکیڑ کر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف دھوپ اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔

دور سے تکارام گرم پتھروں اور مٹی کے ڈھیلوں سے ٹھوکریں کھاتا لڑھکتا، لڑکھڑاتا چلا آرہا تھا۔ اس کے پاؤں ننگے تھے اور سر پر ڈھاک کے پتوں کا ایک بڑا سا گٹھر تھا۔ کسی بیحد تھکے ہوئے ڈھور کیطرح وہ زور زور سے سانس لیتا، ہانپتا، کانپتا گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کی پیٹھ پر ایک بڑا سا کُبڑ نکلا ہوا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا وہ پیٹھ پر بڑے بڑے دو خربوزے لادے چلا آرہا ہے۔ اس کے سینے پر بھی گول کدو کیطرح کا ایک گوشت کا لوتھڑا لٹک رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے ان بدہیئت گومڑے عطا کرنے میں ایشور کی کونسی مصلحت پوشیدہ تھی۔ تکا جب بھی چلتا تو لگتا وہ ان غیر ضروری ماس کے گوؤں کے نیچے دبا جارہا ہے۔

اس کی عمر اٹھارہ برس کی ہوچکی تھی۔ مگر بیچارے کا قد ابھی صرف چار فٹ تھا، دھوپ میں جب اس کے وہ گوشت کے لوتھڑے تپ کر پلپلانے لگتے تو اس کی جان پر بن جاتی آج کی اس چلچلاتی دھوپ نے تو اس کے کس بل ہی نکال دیئے تھے۔

پاٹل کے گھر میں سیتہ نارائن کی پوجا تھی۔ تاتیا گھر و سویرے سے ہی بکری فروخت کرنے کے لئے بازار جاچکا تھا۔ پاٹل کے فرمائشیں پوری ذمہ داری لامحالہ گیتا اور تکا پر آپڑی تھی۔ گھر میں پلاس کا ایک پتا باقی نہیں تھا۔ پانچ میل دور جنگل تھا جہاں ڈھاک کے بیشمار درخت تھے۔ وہاں سے پتے توڑکر لانے کے لئے گیتا نے تکا کو روانہ کیا تھا۔ تکا صبح کا نکلا پتے لیکر لوٹتے لوٹتے یہ وقت ہوگیا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی، زمین انگ توا بنی ہوئی تھی۔ تکا کے پیروں میں چھالے پڑگئے تھے وہ پاؤں گھسیٹ کر گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کھنڈوبا کی ٹنکی پاس ہی تھی۔ ٹنکی کے ٹھنڈے جل کو دیکھتے ہی اس کے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ سر پہ دھرے اس نامعقول گٹھر کو زمین پر پٹک کر ٹنکی کے ٹھنڈے پانی میں اتر جائے۔

اس کے پاؤں کانپ رہے تھے، دہانے سے کف جاری تھا سینے اور پشت کے گولے الٹ ٹپ گئے تھے مگر وہ رکا نہیں۔ اگر گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی تو ماں پریشان ہوجائیگی، پٹیل وقت پر تیار نہ ہونگے پاٹل خفا ہوگا اور تاتیا ـــ تاتیا تو کچا ہی چبا جائے گا۔ ماں کو ڈھونڈ کیطرح پیٹے گا۔ تاتیا کے چابک کے تصور سے وہ کانپ گیا اور بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کھنڈوبا کی ٹنکی پر جانے سے روک سکا چلو بھر پانی بھی نہیں پیا بیچارے نے۔ ٹنکی کے پاس سے وہ اس طرح پاؤں گھسیٹتا گذر گیا جیسے ریگستان میں کوئی شتر بچہ بھٹک گیا ہو۔

ابھی ابھی مدرسے کی درمیانی چھٹی ہوئی تھی۔ املی کے نیچے میدان میں بچے اُچھل کود مچائے ہوئے تھے۔ کچھ بچے بیڈل، بیڈل کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکا سیدھے ہاتھ سے کان پکڑے بیٹھے بیٹھے کہنی سے گولی کھسکاتا گل تک لیجا رہا تھا اور باقی بچے اسکے پیچھے ناچتے چلاتے چل رہے تھے۔

اتنے میں کسی بچے کی نظر تکا پر پڑی اور وہ شرارت آمیز آواز میں چلایا

"اونٹ کا بچہ آیا رے، اونٹ کا بچہ آیا"
جیسے اس نے تکا کے روپ میں رام لیلا کا کوئی سوانگ دیکھ لیا ہو۔

تمام بچوں کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تکا کی حالت کتوں کے درمیان گھرے کسی سادھو فقیر کی سی ہوکر رہ گئی۔ بھویں سکوڑے، تھوک نگلتا وہ آگے بڑھنے لگا۔ بچے اس کے پیچھے پڑگئے۔ اس کے کُبڑ کو تھپتھپانے لگے۔ اس کے پتے کھینچ کھینچ کر ان کی پنگیاں بنا بنا کر بجانے لگے۔ تکا کی حالت دگرگوں تھی جیسے گھڑ سیت ابھی غش کھاکر گرپڑیگا اتنے میں گھنٹی بجی اور سارے ننھے شیطان مدرسے کی سمت بھاگ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے کسی لڑکے نے ایک ڈھیلا تکا کی ناک پر جادیا۔ ڈھیلا نشانے پر لگا اور بیچارہ تکا بلبلاکر رہ گیا۔ لڑکا تالیاں بجاتا اور زور زور سے ہنستا مدرسے کی طرف بھاگ گیا۔ تکا نے نجات کا سانس لیا۔

گھر میں گیتا اس کی منتظر تھی۔ جوں ہی تکا گھر میں داخل ہوا

اس نے لپک کر اس کے سر پر کا گٹھر اتارا اور۔"

" میرا لعل! پسینہ پسینہ ہو گیا رے!"
کہتی ہوئی دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی تبھی پسینے کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں سرخ خون بھی لگ
"ارے یہ کیا؟" گیتا نے گھبرا کر پوچھا۔

تکا کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ ہانپتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا، وہ بولنے میں ہکلاتا بھی تھا ایک جملہ ادا کرتے کرتے وہ تین چار دفعہ رکتا۔

" ارے کیا ہوا؟ کہیں گر گیا کیا" گیتا ساڑی کے پلو سے اس کا منہ پونچھتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

" پانی۔" تکا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا بڑی مشکل سے بول سکا۔

" ابھی لائی" کہتی ہوئی گیتا اندر کیطرف بھاگی۔

تکا نے زور سے سانس لی۔ بند مٹھی سے دہانے کے کناروں تک آئے تھوک کو پونچھا اور تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھینچے تان کر اپنا پھٹا کرتا اتار پھینکا اور دھڑام سے اسی کرتے پر منہ اوندھائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رونے میں بھی اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی، سانس اوپر چڑھ رہی تھی۔ دم الگ گھٹنے لگا تھا جلے ہوئے سیاہ جست کے ڈبے میں رکھے گرم پانی کے دو چار لوٹے اس نے اپنے سر پر ڈالے۔ ماں کی پرانی میلی ساڑی سے بدن خشک کیا۔ اور ماتھے پر تلک لگانے کی غرض سے دیوار پر ٹنگے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ بڑا ہیبتناک چہرہ تھا۔ سر پر جگہ جگہ سے اڑے ہوئے بال، تنگ پیشانی، بدوضع بھویں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چپٹی پھیلی ہوئی ناک، موٹے موٹے ہونٹ اور اس ساری بدصورتی پر ستم ڈھاتے چیچک کے بیشمار داغ، تکا نے دکھ اور نفرت سے منہ بنایا اور ماتھے پر کہیں تلک کا ٹیکا لگا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ آیا۔ آئینہ نندی بیل کی پیشانی پر لگے آئینے کی طرح بہت چھوٹا سا تھا، اس لیے تکا اپنے بھدے چہرے کے عکس کے سوا سینے اور پیٹھ پر اگے ان بدصورت گٹھڑوں کو نہ دیکھ سکا۔

گیتا نے پکارا۔ "تکارام بیٹے! اب جلدی سے مندر میں تھوڑا سا پانی چڑھا آؤ۔ پھر دو نوالے کھا کر آرام کرنا۔ آج بہت تھک گیا ہوگا۔ میرا راجا!"

ہاتھ میں پانی کا لوٹا۔ لوٹے پر صندل چوتھ اور چند مدار کے پھول لئے تکا مارد تی کے مندر کی طرف روانہ ہوا لگا مگر اس کے ذہن میں آئینے کا بدصورت عکس گھوم رہا تھا۔ پوجا! کیوں کروں میں ایشور کی پوجا؟ آخر کیا دیا ہے مجھے ایشور نے، یہ بگھ جسم بدصورت چہرہ، تس پر بات بے بات ڈھوروں کیطرح پیٹنے والا باپ۔ مندر میں ہونے والے کرتن پران میں ایشور کی اپرم پار کرپا کے کتنے قصے سنے تھے، سنتا رہتا تھا۔ سب جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ من بہلا دے کی باتیں۔ آخر میں نے ایشور کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ کیوں بار بار اسکول کے بچوں کے ذریعہ میری فضیحت کرواتا ہے، جب میں پلاس کے پتے لانے جنگل میں جاتا ہوں، تو آسمان سے آگ برساتا ہے۔ کیوں آخر کیوں؟ مندر کیطرف بڑھتے اس کے قدم اس خیال کے ساتھ ہی ٹھٹھک گئے۔ مندر کی سمت جانے والی پگڈنڈی کے کنارے کا ساجو دال کا گھر پڑتا تھا۔ اس کا پچھواڑا قریب قریب مندر سے لگا ہوا تھا پچھواڑے کے چاروں طرف ببول کی کانٹے دار جھاڑیوں سے گھیرا احاطہ تھا۔ جھاڑیوں سے اندر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ببول کی سوکھی جھاڑیوں کی آڑ میں جو دال کی بہو نہا رہی تھی۔ کھڑی دوپہری میں وہاں سے وہاں سے کسی راہگیر کے گذرنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ وہ ایک دم ننگی تھی۔ دیہاتی عورتیں اپنے پچھواڑے اسی طرح بے خطر ہو کر نہاتی ہیں۔ کسا ہوا جوان جسم، گورا رنگ تکا ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کو اس کے پورے بدن میں بجلی کی رو سی دوڑ گئی۔ جو دال کی بہو کھڑی ہو گئی اور تکا نے کسی ارنے بھینسے کیطرح زور کی پھنکار چھوڑا۔ آہٹ محسوس ہوتے ہی جو دال کی بہو نے چونک کر پگڈنڈی کیطرف گردن گھمائی۔ تکا سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ تکا سہم گیا مگر جو دال کی بہو کے چہرے پر کسی قسم کی برہمی یا شرم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ عورت مرد سے حیا کرتی ہے۔ تکا تو جانور تھا وہ اس کی طرف دیکھ کر حقارت سے مسکرائی، اور ایک ادا سے دوسری طرف مڑ گئی، اس کے بھیگے سیاہ ریشمی بال اس کی

پشت پر بکھرے ہوئے تھے اوران پر پانی کے قطرے جھلملا رہے تھے، تکا کی رگوں میں بجلی سنسنائی۔ اسے لگا۔ ان بھیگے گھنے بالوں میں اپنا چہرہ کھبو دے، اُف، سینے پر ابھرے ہوئے بیل پھل

تکا چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے کوئی دیکھ لیتا تو آفت آجاتی۔ اس کے کٹر کو پتھروں سے مار مار کچل دیا جاتا

مندر میں جاکر تکا نے ماروتی کی مورتی پر پانی چڑھایا اس کی بدہیئت شبیہ پر صندل کا ٹیکا لگایا اور اس کے چرنوں میں دو تین پھول رکھکر مندر کے باہر آگیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مستی چھائی ہوئی تھی اور قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے

وہ سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی تک نہا رہی ہو، ایک نظر بس ایک نظر اور دیکھنے مل جائے۔ اس کا گیلا بدن، ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہے کہ وہ مجھ سے شرماتی نہیں۔ کم سے کم آنکھوں کو تو ٹھنڈک مل جاتی ہے۔ اُف، گیلے کالے بال گورا بدن —— اس کے خیالات بھی اس کی گفتگو کیطرح بے ربط تھے۔ وہ چلتا رہا۔ جب وہ جو دال کے پچھواڑے پہنچا تو وہ گیلی ناگن اپنی گہری سبز ساڑی احاطے کی جھاڑی پر سکھا رہی تھی۔ اسکے بال کھلے تھے اور اس کا رسمساتا چہرہ تکا کی نگاہوں کے گھیرے میں تھا۔ کالی کٹورا جیسی آنکھیں، ستواں ناک دمکتے رخسار۔ ٹھوڑی پر گدا ہوا ننھا سا تل، تکا کی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے بال کھلے تھے مگر اب اس نے چولی پہن لی تھی۔

اس نے تکا کو رکتے دیکھ لیا۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر انتہائی سادگی سے پوچھا۔ "تکا رام ہوگئی پوجا؟"

تکا نے بڑی مشکل سے ہاں کہا اور چلنے لگا، اس کی رگوں میں دوڑتی بجلی منہ زور گھوڑے کی طرح اسے انجانی دشا میں کھینچ رہی تھی۔

وہ چل تو گھر کیطرف رہا تھا مگر تصور میں وہ جو دال کے پچھواڑے پہنچ گیا تھا۔ پھر اس بھری دوپہر میں اس نے اپنا بدصورت چہرہ ان گیلے بالوں میں چھپا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چہرے پر ابھرے مسے اور چیچک کے داغ غائب ہوگئے۔ رنگ کھل گیا۔ پشت اور سینے کے بدہیئت گولے گھل کر جڑ گئے اور پھر تکا رام اور وہ گیلی ناگن

—— ناگن اور تکا ——

وہ گھر پہنچا۔ گیتا پلاس کے پتّل بنا رہی تھی۔ اس نے اُٹھکر ان کے لئے کھانا پروسا۔ اس نے بمشکل دو چار لقمے حلق سے اتارے۔ ماں نے اٹکل لگائی۔

"دھوپ کے مارے میرا لعل ہلکان ہوگیا ہے۔ بھوک ہی مرگئی ہے میرے بچے کی۔"

ہاتھ دھونے کے لئے وہ باہر آیا۔ آنگن میں بیل کے درخت پر دو بیل پھل سبز پتوں کے جھرمٹ سے جھانک رہے تھے۔ تکا رام کے مستک میں پھر بجلی کوندی۔

ہری ساڑی، ہرے پتے، بیل پھل، اپنے بدہیئت گوشت کے گولے۔

وہ تھک کر چور ہوگیا تھا۔ دوپہر تپ رہی تھی۔ پھر بھی اس کی آنکھ نہیں لگی، وہ فرش پر بوریا بچھائے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ گیتا قینچی سے پلاس کے پتے کاٹ رہی تھی اس نے سوچا کاش کوئی اس قینچی سے اس کا وہ بھدے سے گوشت کے گولے کاٹ دیتا اور وہ بھری دوپہر میں کسی ہرن کی طرح جو دال کے باڑے میں کود کر ان گیلے بالوں میں اپنا چہرہ گڑا دے اور وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ دفعتاً وہ اٹھکر بیٹھ گیا۔

"کیوں بیٹا! نیند نہیں آرہی ہے کیا؟" گیتا پوچھ رہی تھی۔

"نہیں"

"آج ہوا بھی نہیں چل رہی ہے۔"

"ہم ——"

تکا دروازے کے باہر دیکھ رہا تھا۔ سامنے بیل کی جھکی ہوئی ایک ٹہنی پر دو چڑیاں بیٹھی تھیں۔ دو بیل پھل بھی لٹک رہے تھے۔ کالے پروں والی چڑیا، سرخی مائل پروں والی چڑیا کی پیٹھ پر بیٹھ کر پر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ نچلی چڑیا ایک ادا سے چوں چوں کرنے لگتی۔ کالے پروں والی چڑیا اترکر دور جاتی پر پھڑ پھڑاتی، پھر پلٹ کر آتی اور دوسری چڑیا کی پیٹھ پر بیٹھ جاتی، نچلی چڑیا اسی نخریلے انداز میں چہچہانے لگتی چڑیوں کے اس مستی بھرے کھیل سے سبز پتوں میں چھپے وہ بیل پھل بار بار چمک جاتے۔ تکا دوبارہ لیٹ گیا۔ اس کا بدن تپ رہا تھا۔ اس نے سوچا اٹھ کر جائے اور ٹھنڈ دبا کے

مندر والے حوض میں جاکر پڑ جائے، وہ تڑپ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں تھکے ہوتے بیل کی طرح زور زور سے فوں، فوں کرنے لگتا۔ باہر دھوپ قیامت ڈھا رہی تھی اور اندر آگ دہک رہی تھی۔ تکا کے لیے سونا مشکل ہو گیا۔ وہ اس طرح تڑپتا رہا دھوپ اس طرح چمکتی رہی۔ بیل کے جاڑ کا سایہ اسی طرح دھوپ میں آڑا ترچھا کانپتا رہا۔

تکارام پسینہ پسینہ ہانپتا ہوا دروازے کے باہر آیا دروازے پر قفل لٹک رہا تھا۔ اس نے پڑوس میں چابی کے بارے میں پوچھا مگر کنجی وہاں بھی نہیں تھی۔ تکارام بیحد چڑ گیا اس نے سوچا پتھر سے قفل کو کچل ڈالے۔ اس کا بس چلتا تو وہ اس قفل کو کھینچ کر توڑ ڈالتا۔ پھر سوچا نہیں، قفل تو کسی طرح ٹوٹ جائے گا پرتا تیا اپنی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیگا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ معاً اسے خیال آیا کہ اس کے جنیو میں بھی ایک کنجی بندھی ہے۔ وہ کنجی مندر کی تھی۔ وہ چڑا ہوا تو تھا ہی مشتعل ہو کر اس نے وہی کنجی قفل میں گھسیڑ دی اور لگا ادھر ادھر گھمانے۔ جانے کس کھٹکے سے تھوڑی دیر کی جد و جہد کے بعد قفل کھل گیا۔ تکا بیحد خوش ہوا۔ اسی لمحہ اسکے ذہن میں گھرنے والے خیالات میں مزید ایک بے تکے خیال کا اضافہ ہو گیا۔ کہیں قفل کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو اب دروازہ کھولنے کے بجائے وہ قفل کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا اتنے میں پیچھے سے گیتا بھی آگئی۔ اس نے تکارام — تکارام!"

تکارام کی آنکھ کھل گئی۔ گیتا کے ہتّن تیار ہو گئے تھے۔ ایک طرف پتلوں کا گٹھر بندھا پڑا تھا۔ گیتا جھاڑ و مارتی ہوئی بولی۔

"تکارام! اٹھ بیٹا — دن ڈوبنے کو ہے۔ منہ پر سے پانی کا ہاتھ پھیرا اور پتل پاٹل کی بیٹھک میں پہنچا دے۔ پرساد لینے میں چلی جاؤں گی۔"

خواب میں دیکھا ہوا وہ قفل والا واقعہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا یہ سچ ہے کہ وہ گہری نیند سو سکا تھا۔ جو دال کی بہو کا گورا بدن اس کی نیند میں گھل مل گیا تھا۔ اس کے لہو میں بجلی بن کر دوڑ رہا تھا۔ اور بجلی اس کی رگوں میں ناگن کی طرح لپلپا رہی تھی وہ اٹھا کلی کر کے چہرے پر پانی کے دو تین چھپاکے دیئے اور پتلوں کا گٹھر لیکر پاٹل کی بیٹھک کیطرف روانہ ہو گیا۔

وہ جان بوجھ کر پھر جو دال کے پچھواڑے سے گذرا۔ سبز ساڑی غالباً سو کھ گئی تھی مگر ابھی تک اس طرح جھاڑیوں پر پھیلی ہوئی تھی پچھواڑے دروازہ بند تھا [illegible] کا درخت ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھوم رہا تھا۔ مگر اس پر بیل پھل نہیں تھے اس ساڑی پر نگاہ پڑتے ہی تکا کے بدن میں ایک بار پھر بجلی سی دوڑ گئی۔ غیر ارادی طور پر وہ آگے بڑھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پتلوں کے گٹھر سنبھالتے ہوئے ڈری ڈری نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور آگے بڑھکر آہستہ آہستہ اس ساڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ بدن میں دوڑتی بجلی آنکھوں میں کوندی، دماغ جھنجھنا گیا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گیا۔ اسے لگا اس نے ساڑی کو نہیں چھوا ہے بلکہ جو دال کی بہو کی سخت ران میں چٹکی بھری ہے محض اس خیال سے وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ ایک بار پلٹ ساڑی کو دیکھا اور رگوں میں کوندتی بجلی کو رگوں میں ہی قید کئے وہ پاٹل کے باڑے کی طرف روانہ ہو گیا۔

پاٹل کے باڑے میں سیتہ کی نارائن کی پوجا شباب پر تھی کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ تکا سامنے کے دروازے سے داخل ہونے کی بجائے پچھواڑے کی طرف بڑھ گیا کہ کوئی اسے دیکھتے ہی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے۔ پچھواڑے دو جوان لڑکیاں رہٹ سے پانی کھینچ رہی تھیں۔ دونوں کے بال ان کے شانوں پر بکھرے تھے اور دونوں میں سے ایک کی ساڑی کا رنگ گہرا سبز تھا دونوں آپس میں بتیا رہی تھیں۔

شام کے دھندلکے میں تکا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں لہرتی بجلی اب رگوں میں تیزی سے گردش کرنے لگی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

رہٹ کی ڈولچی اوپر آئی۔ ہری ساڑی والی لڑکی اسے مٹکے میں پلٹنے کو جوں ہی جھکی تبھی اس کی نظر تکا پر پڑی۔

"اوئی ماں —" وہ ایک دم سے ڈر گئی۔ ڈر کر کچھ اس انداز سے ٹھٹھکی۔ اتنی پیاری ادا سے لچکی کہ تکا کے جی میں آیا اسے اسی طرح تھام کر دیر تک دیکھتا رہے۔

"اوئی ماں" — یہ کیسا آدمی ہے؟" لڑکی نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی۔ مگر لہجے میں ہمدردی غالب تھی "اسکی پیٹھ پر کیا ہے ری؟"

"مانس کا گولا" ـــــ پاٹل کی بہو اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی
"اتنا بڑا!" سہیلی اپنی ایک بھوں کمان کی طرح چڑھا کر بولی۔

"ایشور کی کرنی" پاٹل کی بہو بولی۔
"اس میں ہڈی نہیں ہوتی کیا؟"
"بھگوان جانے، دیکھنا ہے تو چھو کر دیکھ لے" پاٹل کی بہو لاپرواہی سے مسکرا کر بولی۔

اسکی سہیلی ڈھٹائی سے آگے بڑھی۔ اور منہ بچکا کر اس کا کبڑ ٹٹولنے لگی۔ جیسے کسی لیس دار گھونگے کو چھو رہی ہو اس کی انگلیوں کے لمس سے تکا کے بدن کی بجلی جیسے تڑپ کر سر سے پاؤں تک رقص کرنے لگی۔

"یہ ــــ یہ ــــ پلاس کے پتّل ہیں ــــ" کہتا ہوا تکا پچھواڑے کے راستے باہر نکل گیا۔ تکا کسی جلتے بجھتے جگنو کی طرح دائیں بائیں ڈورتا چلا جا رہا تھا اس کا دل چیخ رہا تھا

"ایشور کی کرنی ــــ ایشور کی کرنی ــــ ایشور کی کرنی میرے حق میں اتنی بدصورت کیوں؟ آخر کیوں؟ اس نے جودال کی بہو کی گیلی ہلدی کی گانٹھ سا رسیلا پن دیا۔ پاٹل کی بہو کی آنکھیں چندھیا جائیں۔ اتنا روپ دیا۔ اس کی سہیلی کو ہرنی کی سی مست آنکھیں دیں۔ اور مجھے ــــ مجھے یہ مانس کے گولے ــــ بے ڈول، نفرت انگیز اور بدصورت ــــ"

انہیں خیالات میں غوطے کھاتا وہ جودال کے باڑے کے قریب آ پہنچا۔ اس گیلی ناگن کی سبز ساڑی ابھی تک کانٹے دار جھاڑیوں پر سوکھ رہی تھی۔ ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس کے دماغ میں کوند گیا۔ جھٹ پٹا گہرا نے لگا تھا۔ جودال کے پچھواڑے کا دروازہ بند تھا۔ قریب و دور کوئی آدمی نہیں تھا۔ چادڑی کے پیچھے بنی باندھ پر بندھا بیل ڈکرا رہا تھا۔ ایک گائے سن کے بچھڑے ڈنٹھل چبا رہی تھی تکارام جی کڑا کر کے آگے بڑھا اور اس ساڑی کو جھاڑیوں پر سے اٹھا لیا۔ اسے لپیٹ کر بغل میں دبایا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔۔

گیتا مندر جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ تکارام کو دیکھتے ہی بولی۔

"آگیا بیٹا! چل اچھا ہوا۔ دیکھ میں دیوں جا رہی ہوں۔ دیا جلا کر وہیں سے پاٹل کے ہاں چلی جاؤں گی۔ رات میں کیرتن ہے۔ مجھے لوٹنے میں دیر ہو سکتی ہے دوپہر کی تھوڑی سی مٹھائی رکھی ہے تو کھا لینا۔

"اچھا" کہتا ہوا تکا جلدی سے اندر کے کمرے میں گھس گیا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ گیتا جا چکی تھی اس نے جلدی جلدی باہر کی کھولی میں ایک ٹاٹ بچھایا، ساڑی کو گھڑی کر کے اس پر احتیاط سے بچھا دیا دروازہ بند کر کے سنکنی چڑھا دی۔ اور آگے کی طرف ہاتھ پھیلا کر ساڑی پر اس طرح اوندھا لیٹ گیا۔ جیسے بھری دوپہری میں کھنڈوبا کے حوض میں غوطہ لگا رہا ہو۔

جودال کی بہو کا رسمساتا شباب، پاٹل کی بہو کا پیارا مکھڑا اسکی سہیلی کی انگلیوں کا نازک لمس اس کی کمان کی طرح کھنچی ہوئی بھوں۔ بیل پھلوں کی سختی۔ پکے سنگترے کی کھٹاس بیک وقت جانے کتنی یادیں گڈمڈ ہو گئیں۔ کتنی لذتیں اسے چھوتی گدگداتی گذر گئیں۔ جسطرح دھوپ میں تیہی چڑیا نرم مٹی میں پر پھیلاتی ہیں۔ پنکھ پھڑ پھڑاتی ہیں۔ اسی طرح وہ فرش پر اوندھا پڑا، آنکھیں بند کئے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ لیمو کے پھولوں کی خوشبو۔ گیہوں کی بالیوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوائیں۔ دیوالی کی صبح، اور ایسی ہی بہت سی فرحت بخش باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ اپنا بھاری اور بے ڈول جسم لئے وہ فرش پر نہایت آزادی سے لڑھک رہا تھا۔ جیسے کوئی سور کیچڑ میں لوٹ رہا ہو۔ دھیرے دھیرے اس کا لڑھکنا تھم گیا۔ اب اس کی نس نس ڈھیلی ہو گئی تھی پتوں میں چھپے بیل پھلوں کو اس نے مسل نچوڑ کر پھینک دیا تھا، تر ولا (وہ شاخ جس پر تین پتے ہوں) البتہ سینے سے لگائے لوٹا۔ اسے گہری نیند آگئی۔

صبح چادڑی پر اس خبر سے ہنگامہ مچ گیا کہ جودال کی بہو ساڑی چوری ہو گئی۔ گرام سیوک تلاش میں نکلے۔ گیلی ناگن تکا پر شک ظاہر کیا تھا۔

باپو راموشی تاتیا کے گھر آیا۔ تکا اب تک گہری نیند سو رہا تھا۔ تاتیا بازار سے لوٹ چکا تھا۔ وہ بکری کے چالیس روپے گن کر گیتا کو دے رہا تھا۔ اتنے میں راموشی نے ہانک لگائی۔

" تاتیا بابا!"

" کیا ہے؟"

" تکارام کہاں ہے ؟ "

" سو رہا ہے ـــ کیوں کیا بات "؟ گیتا نے پوچھا۔

" پاٹل نے اسے بلایا ہے "؟

" چلو میں چلتا ہوں " تاتیا اٹھتا ہوا بولا۔

" نہیں اسی سے کام ہے " راموشی نے تاتیا کو منع کرتے ہوئے کہا۔

" کتنا سوتا ہے یہ کبڑا ـــ تکا ! تکا اٹھ ! "

تاتیا کی کرخت آواز سے تکا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دروازے سے اندر رینگتی ہوئی دھوپ اسے بڑی پیاری لگی۔ جیسے سردی کے موسم میں الاؤ کی آنچ۔ اس نے اٹھ کر انگڑائی لی۔

" جلدی سے منہ ہاتھ دھو اور چاوڑی پر جا۔ پاٹل نے بلایا ہے "

حسب عادت تاتیا نے چڑ کر کہا۔

تکا چپ چاپ بستر سے اٹھ گیا۔ اور تبھی سامنے چبوترے پر بیٹھا۔

باپو راموشی ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

" یہی ہے۔ یہی ساڑی ہے وہ ـــ "

" کیا مطلب ہے "؟

" کل تمہارے بیٹے نے جو دال کی بہو کی ساڑی چرائی تھی، راموشی نے جھپٹ کر ساڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

تاتیا غصّے کی شدت سے کانپنے لگا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے لپک کر تکا کی بانہہ پکڑ لی اور اسے کھینچ کر زمین پر پٹک دیا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ جاری تھا اور لات گھونسے بھی برابر چل رہے تھے۔ تکا کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا اور ہچکیاں لیتا رہا تاتیا اسے ہاتھ اور پاؤں سے اس طرح روند رہا تھا جیسے کمہار مٹی روندتا ہے۔ وہ اسے مارتا رہا۔ مارتا رہا۔ حتیٰ کہ تکا بے دم ہو کر فرش پر گر گیا۔

تکا زخمی گدھے کی طرح چاوڑی کے ایک کونے میں پڑا تھا پاٹل گیتا سے بازپرس کر رہا تھا۔ شاید اسے بھی تکا کی حالت پر ترس آ گیا تھا۔

تکا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ مال بھی برآمد ہو چکا تھا گیتا کے چہرے کا رنگ فق تھا۔ پاٹل نے گیتا سے پوچھا۔

" کیوں گیتا ؟ تکا نے یہ کیا کیا ؟ "

رو رو کر آنکھیں سوجی ہوئی تھیں گیتا کی۔ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔

" ایشور کی کرنی "

چاند منی رگھوند
عزیز احمد جلیلی

(تامل کہانی)

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

فون کے ڈائل پر ریسیور رکھکر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وہ گنتی بھول گئی کہ کتنی دفعہ فون کی بیل بجی اور کسی نے دریافت کیا۔

"کیا میں شانموگم سے بات کرسکتا ہوں" اور اسنے جواب دیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں" اس کے دفتر کے ساتھی نے جب پوچھا تو بولی۔

"وہ وطن گئے ہوئے ہیں خانگی کام کے سلسلہ میں" اس کے ایک جگری دوست کو اس نے یہ جواب دیا۔

"دفعتاً ان کو کاروبار کے سلسلہ میں احمد آباد جانا پڑا"۔ اگر احمد آباد نہیں تو دہلی، بمبئی یا میسور جس مقام کا نام اسی وقت اس کے ذہن میں آیا، اس نے بلا تکلف کہہ دیا ایسے لہجے میں کہ سننے والا یقین کرلے اور اسکو جھوٹ کا گمان نہ ہو حالانکہ وہ خود کو دھوکہ دے رہی تھی اپنی بیٹی سے بھی جھوٹ بول رہی تھی۔

فون کی گھنٹی پھر بجی اس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔

"ہیلو یہ مسز شانموگم بات کررہی ہیں"

"ماں یہ میں ہوں دینا"

"کیا بات ہے دینا"

"میں پتاجی سے بات کرنا چاہتی ہوں"

"تمہارے والد ابتک واپس نہیں آئے"

"کیا وہ ابتک واپس نہیں آئے، کب تک آئیں گے"

"کیا کیا جائے دینا وہ سرکاری کام پر گئے ہیں اور اس وقت تک واپس نہیں آسکتے جب تک کہ کام ختم نہ ہو جائے، علاوہ اس کے آج کل فلائٹس کا کچھ بھروسہ نہیں۔ کیونکہ انڈین ایرلائن نے اسٹرائک کررکھی ہے۔ اگر وہ ٹرین سے آئیں تو دو دن سے قبل وہ یہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"دہلی" دینا نے کہا "اس سے قبل آپنے کرنول کہا تھا"

"ٹھیک ہے شاید میں بھول گئی تھی . . . . مگر دینا تم ہمیشہ اپنے والد کے ہی متعلق سوچتی رہتی ہو . . . . میں تمہاری ماں ہوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو تم میری آواز سنکر خوش ہوتی ہو اور نہ مجھ سے بات کرکے تمکو خوشی حاصل ہوتی ہے"

"نہیں نہیں یہ بات بالکل غلط ہے۔ پرسوں ہی میں نے فون پر آپ سے بہت دیر تک بات کی تھی لیکن مجھے بابا کا انتظار ہے"

"اچھا بابا کی بیٹی . . . . کہو تمہارا شوہر تو ٹھیک ہے۔ تمکو ستاتا تو نہیں"

"وہ ٹھیک ہیں اور میرے ساتھ ان کا برتاؤ بھی اچھا ہے"

"میں نے تم کو جو کچھ کہا تھا یاد ہے نا اب تم شادی شدہ لڑکی ہو تمہارا طرز عمل نہایت محتاط اور سلجھا ہوا ہونا چاہئے تاکہ کبھی کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ . . میں تمہارے بابا سے کہدونگی۔ وہ جب بھی آئیں گے خود تم سے بات کرلیں گے۔ تم کو فون کرنے کی ضرورت نہیں" یہ کہکر انجلی نے ریسیور ڈائل پر رکھ دیا یہ سوچکر اب اس کو اپنی لڑکی کے ساتھ بھی احتیاط سے گفتگو کرنا چاہئے۔ کیونکہ اب وہ ایک نئی دنیا میں ہے نئے ماحول میں۔

جانکنی کی تکلیف سے وہ بے حال ہوگئی اور بجائے اپنے سر کے

اس نے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لئے تاکہ ہچکیوں کو روک سکے۔
اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا شوہر اتنا بدل جائے گا۔ ۴۶ سال تک اسکا وفادار رہنے کے بعد اسمیں یہ تغیر پیدا ہو جائیگا۔ اس طویل عرصہ میں اس نے کبھی کسی دوسری عورت پر نظر تک نہیں ڈالی۔ دفعتاً وہ سب خواب و خیال ہو گئے اب وہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔
اس کے شوہر نے جاتے وقت کہا تھا کہ وہ مدھوری جا رہا ہے، انشورنس کے کاروبار کے سلسلہ میں، اس کا چھوٹا بھائی جو اسی رات اپنے گاؤں واپس جا رہا تھا۔ نے اطلاع دی تھی کہ شانو نگم تنہا نہیں گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر اس نے شانو نگم اور ان کے ساتھی کو دیکھا تھا۔ یہ خبر اس نے انجلی کو دی تھی۔ دوسرے دن وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔ صرف دو ہفتہ قبل دینا کی شادی ہوئی تھی۔ شنو نگم بہت مصروف رہے بڑی دلچسپی اور جوش و خروش کے ساتھ شادی کے ہنگاموں میں گم رہے۔ دینا انکی پہلی اولاد تھی جسکو وہ بہت چاہتے تھے وہ بھی دل و جان سے ان سے محبت کرتی تھی اس لئے تو اس کی رخصتی پر وہ بہت زیادہ غم زدہ ہو گئے تھے۔ ایک عرصہ تک تلاش و جستجو کے بعد ان کو ایک موزوں اور مناسب لڑکا اپنی چہیتی لڑکی کے لئے مل گیا تھا۔ شادی کے چوتھے دن دینا اپنا نیا گھر بسانے اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ . . . اور تب وہ بھی ایک نوجوان عورت کے ساتھ نیا ہنی مون منانے نہ معلوم کہاں چلے گئے تھے۔
انجلی کی ہچکیاں دیر تک سنائی دیتی رہیں۔ کچھ دیر بعد اپنے جذبات پر قابو پاکر وہ صوفہ پر لیٹ گئی۔
گھر میں ابھی تک شادی کی تقریب کے آثار پائے جا رہے تھے پھاٹک پر آموں کے پتوں کی مالا ابھی تک جھول رہی تھی اور بڑی میز پر شادی میں لئے گئے فوٹوؤں کا البم رکھا ہوا تھا۔ وہ شنو نگم اور بچے دیر تک ہنستے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے فوٹو دیکھتے رہے ان تمام باتوں کی یاد ابھی تک اس کے دماغ میں تازہ تھی۔
دفعتاً آخر اسکو کیا ہو گیا وہ کس طرح یکلخت بدل گیا، یہ حرکت اس نے کیسے کی، کیا اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے۔ نہ وہ اب جوان تھا اور نہ وہ جوانی کی امنگیں تھیں۔ پھر بھی اس نے کیا سوچ کر یہ سب کچھ کیا جبکہ اس کی ایک لڑکی کی شادی بھی ہو چکی ہے یہ کسقدر شرم کی بات ہے اگر کسی کو اس کی حرکت کا پتہ چل جائے دینا کا شوہر آخر کیا کہے گا۔ فون کی گھنٹی پھر بجی۔

" ھلو یہ مسز شانو نگم بات کر رہی ہیں "
" کیا میں مسٹر شانو نگم سے بات کر سکتا ہوں، میں ان کے بلیرڈ کے ٹیبل کا ساتھی ہوں "
" افسوس وہ یہاں نہیں ہیں "
" وہ کہاں گئے ہیں "
" وہ ناگپور گئے ہوئے ہیں سرکاری کام پر "
" رکب تک انکے واپس آنے کی توقع کی جا سکتی ہے"!
" میں اس کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی، اگر آپ چاہیں تو اپنا نام اور فون نمبر بتا دیں، وہ جب بھی واپس آئیں گے تو میں ان سے آپ سے ربط پیدا کرنے کو کہہ دوں گی۔ "
اسنے ریسیور ڈائل پر رکھدیا۔ دو منٹ بعد ہی پھر گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔
" ھلو میں مسز شانو نگم بات کر رہی ہوں "
" میڈم شانو نگم یہ میں ہوں دینا کا خسر "
" دینا کم صاحب تسلیم " وہ بولی " گھر میں تو سب خیریت سے ہیں "
" بھگوان کی دیا سے سب اچھے ہیں، شکریہ کیا آپ کو یاد ہے شادی کے موقع پر میں نے رنگین ٹرانسپیرنسی لئے تھے ان کے پرنٹ دھل کر آ گئے ہیں اگر آپ اور آپ کے صاحب گھر ہیں تو میں کیا اس وقت آپ کے گھر آ سکتا ہوں "
" میں تو گھر پر ہوں لیکن وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں "
" وہ کہاں گئے ہوئے ہیں اور کب تک واپس آئیں گے "
" وہ کرنول گئے ہوئے ہیں، اس نے سوچ کر کہا شاید دینا کو اس نے یہی کہا تھا "
" سرکاری کام پر "
" وہ یہاں سے کب گئے "
" ان کو یہاں سے جا کر ۱۰ دن ہو گئے "
" دینا کی شادی میں انہوں نے ایک ماہ کی رخصت کیوں نہیں لی، معلوم ہوتا ہے کہ شادی کے بعد ہی وہ جلد اپنی ڈیوٹی پر رجوع ہو گئے "
" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ . . . لیکن شادی سے قبل ہی انہوں نے لمبی رخصت لے لی تھی "

"تب تو ٹھیک ہی کیا انہوں نے کیا آپ جانتی ہیں وہ کب واپس آئیں گے "

" مجھے افسوس ہے کہ میں یقین کیساتھ کہہ نہیں سکتی وہ کب تک واپس آئیں گے، اُن کے واپس آتے ہی کیا میں ان سے آپ سے فون پر ربط قائم کرنے کے لئے کہوں "

" نہیں اس کی ضرورت نہیں، دو تین دن بعد میں خود ہی ان کو فون کر دوں گا " .... کسقدر اچھے لوگ ہیں ان سے ریسیور ڈائل پر رکھتے ہوئے سوچا کتنی شرم کی بات ہے اگر ان لوگوں کو معلوم ہو .... انکی کرتوت، باپ کی بری حرکتوں کا اثر کیا لڑکی کے کردار پر نہیں پڑے گا، ان کو اس کا تو خیال ہونا چاہئے تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور فرش پر ٹہلنے لگی، پھر خاموش کھڑی دیواروں کو گھورنے لگی، اس نے میرے ساتھ بے وفائی کیوں کی، شاید اسلئے کہ اب میں عمر رسیدہ ہو گئی ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ آخری بچے کی پیدائش پر وہ بالکل نڈھال ہو گئی تھی، اپنی جوانی کو خیر باد کہتے اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ گویا وہ ایک دیرینہ قدیم دوست سے بچھڑ رہی ہے۔

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں گئی اور قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے سر دپا کو دیکھنے لگی۔

کھلے ہوئے نقوش اور صاف رنگت والی وہ ایک درمیانی قد کی خوبصورت عورت تھی۔ اس کا دبلا جسم تھا انجلی نے آئینہ میں اپنی ان جھریوں پر نظر ڈالی جو عمر نے اس کے چہرے پر ڈال دے ہیں آنکھوں کے حلقوں کے نیچے بھی وہ نقوش ابھر آئے ہیں، پیشانی اور رخساروں پر بھی ان کے اثرات نمایاں ہو چکے تھے نہ صرف یہ بلکہ اس کے گھنے سیاہ بالوں میں سفیدی کی کرنیں بھی اپنا جلوہ دکھانے لگی تھیں۔ تکلیف اور دکھ کی فضاؤں میں وہ ڈوب گئی۔

چہرے پر پڑی جھریاں اس نے مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی کریم اور پینٹ اس نے لگایا اور نہ اپنی چیز کا استعمال کیا جس کی مدد سے زائد عمر کی نشانیاں چھپائی جائیں، جوانی سے رخصت ہونے پر بڑھاپے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی جا سکتی وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی اسی لئے تو وہ زندگی کی ہر تبدیلی کو خوش آمدید کہنے کو تیار تھی اگرچہ یہ ایک دکھ کی بات تھی، لیکن حقیقت تو پھر بھی حقیقت ہے کہ وہ زندگی کے ہر قدم پر جوانی سے دور ہوتی محسوس کر رہی تھی تو کیا اس کے شوہر نے اس بات کو جان لیا ہے اس کی اور کمزوری کو پہچان لیا ہے اسی سلئے تو وہ شاید اس سے بیزار ہو کر اور تھک کر ایک جوان عورت کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ یہی اطلاع اس کے بھائی نے دی تھی کہ وہ ایک نوجوان عورت کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔

فون کی گھنٹی پھر بجی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور فون کرنے کے لئے بڑھی، آخر اب یہ کس کا فون ہو گا شاید دینا کا فون ہو، وہ دن میں کتنی بار فون کرے گی،

" ھلو یہ مسز شانو نگھم بات کر رہی ہیں "،

" کیا یہ میڈم شانو نگھم ہیں "

اسکی سانس تیز ہو گئی " یہ تم ہو " اس نے ایک بیوقوفی کا سوال کر دیا کیونکہ اسی وقت اس کی زبان سے اور کچھ نکل نہ سکا۔

" ہاں یہ میں ہوں، ریلوے اسٹیشن سے بات کر رہا ہوں، مجھے یہاں آکر تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے۔ گھر میں تو سب کچھ ٹھیک ہے نا انجلی کیا تم ہو .... " وہ چونک پڑی اپنے حواسوں میں آگئی۔

" کیا کہا آپ نے میں ہوں انجلی "

" کیا تم اتنا بھی میرا سوال سمجھ نہیں سکیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا گھر میں سب خیریت ہے "

" ہاں یہاں سب اچھے ہیں "

" اور بچے کیسے ہیں؟ "

" وہ بھی اچھے ہیں، دینا نے اس دس دن میں بیس مرتبہ آپ کو فون کیا تھا وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے "

" اس نے مجھ سے بھی یہی کہا "

" آپ سے کب کہا تھا "

" تم کو فون کرنے سے پہلے میں نے اسکو فون کیا تھا "

" آہ آپ نے یہ بھی کر لیا "

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسکو اطلاع دی تھی کہ میں ہلی گیا ہوا ہوں "

" ہاں میں نے یہی کہا تھا "

" کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں مدھوری جا رہا ہوں "

" ہاں میں نے ایسا ہی کہا تھا "

" تب اس کا کیا مطلب کیا ہے اس غلط بیانی کا کیا سبب ہے "

" کچھ بھی نہیں ... اچھا کیا آپ گھر آ رہے ہیں "

" میں اور کہاں جا سکتا ہوں "

" میں کیا جانوں آپ کہاں جانے والے ہیں "

وہ کچھ دیر خاموش رہا تب اس نے کہا

" اور کے میں ۱۵ منٹ میں گھر پہنچ رہا ہوں میرے لئے کھانا تیار رکھا جائے "

جب وہ گھر آیا تو انجلی نے دیکھا کہ باوجود سفر کی تھکان کے وہ بہت پھرتیلا اور چاق و چوبند نظر آ رہا ہے، شاید تھم دیر تک بچوں سے غپ شپ لڑاتا رہا اور کھانا کھاتا رہا جو اس کی بیوی نے تیار کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اب میں نہا لینا ہوں تا کہ تھکاوٹ اور گندگی دور ہو، یہ کہہ کر وہ حمام میں گھس گیا شاور کی آوازیں بھی اس کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی یہ اس کی عادت تھی وہ ضرور نہاتے وقت گایا کرتا، وہ جب نہا دھو کر صاف شفاف کپڑے پہنکر باہر نکلا، اس وقت تک بچے اپنے دوستوں کے ساتھ سینما دیکھنے کے لئے جا چکے تھے، اس وقت شام کے سات بجے تھے وہ دونوں گھر میں تنہا تھے وہ اور اسکی بیوی، پہلے تو انجلی نے سوچا اس خاص موضوع پر صاف صاف بات کی جائے، لبعد میں اس نے یہ خیال ترک کر دیا اس نے سوچا کہ وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس واقعہ کا ذکر تک کرنے پر وہ خود کو آمادہ نہ کر سکی، زخموں کو تازہ کرنے سے کیا فائدہ، جو کچھ گذرا گذر گیا، جب تک کہ خود اسکو اس بات کا احساس نہ ہو کہ اس نے غلط کام کیا ہے وہ جو کچھ بھی کہے گی بیکار جائے گا اس کی اپنی خودداری اس امر پہ مانع ہوئی کہ وہ اس سے بحث کرے اور اپنے حقوق اور انصاف کا تقاضا کرے۔

لیکن اسکا آخر مطلب کیا ہے وہ ڈرائنگ رُوم میں آیا اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا کر بولا،

" انجلی سنو مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے "

کیا وہ اس واقعہ سے متعلق بات کرنا چاہتا ہے اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا خطرے کو محسوس کر کے اس نے کہا "

" تم اس وقت کیا بات کرنا چاہتے ہو، تم سفر سے آئے ہو اپنے بستر پر جاؤ اور آرام کرو، گفتگو کرنے کے لئے تو ساری زندگی پڑی ہے بعد میں بات کی جا سکتی ہے "

" نہیں نہیں میں بالکل تھکا نہیں ہوں، بیٹھو اور میری بات سنو "

" لیکن میں تو تھکی ہوں شادی کی گہما گہمی کی وجہ سے اور مصروفیت کی وجہ سے ابھی تک میں پہلی حالت میں نہیں آئی، ابھی تک جو عزیز و اقارب شرکت کے لئے آئے تھے ان کی سربراہی میں میں بہت مصروف رہی اس لئے مجھے نارمل ہونے کے لئے کم از کم دو ماہ لگیں گے "

" لیکن میں تم سے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں لے رہا ہوں اس لئے براہ کرم میرے سامنے خاموش بیٹھو اور سنو میں کیا کہنا چاہتا ہوں "

" آہ ڈیر میں تو کہنا بھول گئی کہ دینا کے خسر نے فون کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ رنگین فوٹو تیار ہو کر آ گئے ہیں کیا ہم انہیں دیکھنے چلیں گے مگر پہلے ان کو فون کر لو اس کے بعد میں دیکھا جائیگا، پہلے تم میرے سامنے خاموش بیٹھ کر مری بات سنو "

وہ سانس روکے اس کے سامنے بیٹھی رہی، اس کے لب خشک ہو رہے تھے، فوراً ہی ایک نیا خیال اس کے دل میں آیا، شاید وہ اس واقعہ کی توجیح کسی اور صورت میں کرنا چاہتا ہے جسکی بدولت اس کے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوں، کیا کوئی شوہر اپنی مرضی سے ایسے واقعات اپنی بیوی سے بیان کر سکتا ہے۔

اسلئے نئی امیدیں لئے اس نے سوال کیا

" کیا مدھوری میں آپ کی مصروفیت سرکاری کام کے سلسلہ کی ختم ہو چکی ہے؟ کیا ایسے وہاں پھر جائیں گے؟ "

" میں وہاں سرکاری کام کے سلسلہ میں نہیں گیا تھا "

بند ٹوٹ چکا تھا اس کے بچانے کی تمام کوششیں رائیگاں ہو گئی تھی اب جو کچھ اس کو سننا پڑیگا ممکن ہے کہ یہ کوئی بری خبر نہ ہو اور جو کچھ اس نے سنا تھا غلط ہو، وہ ایکدم بدل بھی کیسے

سکتے ہیں، اتنے عرصہ تک اس کے وفادار رہنے کے بعد ۔
" نہیں ایک دوست کے ساتھ گیا تھا بالکل خانگی حیثیت سے ،
میں آج مدھوری سے واپس نہیں آیا ، ہم دونوں نہ صرف مدھوری
بلکہ دیگر کئی مقامات کی سیر کر کے واپس ہوئے ہیں "
اس دوران انجلی کی نظریں مسلسل اس کے چہرے پر تھیں ۔
" میرا ساتھی ایک عورت تھی ایک جوان عورت وہ میرے دفتر
میں کام کرتی ہے اور ہمیشہ مجھ سے لگاوٹ کا اظہار کرتی تھی، میں نے
یہ دن اس کے ساتھ گذارے، تم سمجھ رہی ہو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں "
اس کو گھورتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ جیسے جیسے وہ
اس موضوع پر گفتگو کرتا گیا ۔ اس کی ساری امیدیں خاک میں مل
گئیں ، اور کچھ دیر کے لئے وہ یہ بھی بھول گئی کہ آخر ہے کون جو اس
جرأت اور بے باکی سے یہ سب کچھ بیان کر رہا ہے شاک اور صدمہ
اس قدر شدید تھا جس کا اظہار ممکن نہیں ۔
لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کی ہچکچاہٹ کی کوئی علامت
نظر نہیں آئی اور نہ کسی قسم کے حجاب کی علامت دکھائی دی، وہ
بالکل نارمل حالت میں گفتگو کر رہا تھا نہ اس میں شرمندگی کا شائبہ
تھا اور نہ کسی جرم کے اقرار کا۔ اسکی حیرانی بڑھتی گئی۔ یہاں تک
اس کو اپنے دل کی دھڑکنوں کا احساس جاتا رہا اور وہ تعجب
اور بے بسی سے اسکو گھورتی رہی ۔
" میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں انجلی کہ میرا یہ عمل درست تھا لیکن مجھکو
توقع ہے جب تم پورا واقعہ سن لوگی تب یقینی تم کو میرے دل
کا حال معلوم ہو جائیگا کہ میں کیا چاہتا تھا "
وہ بالکل خاموش بیٹھی رہی بت بنی ہوئی، پتھر بنی ہوئی،
برف کا ایک سرد تودہ بنی ہوئی ۔
" تم اسقدر خاموش کیوں ہو، اتنی چپ کیوں ہو ۔ مجھے
امید ہے کہ تم غور سے سن رہی ہوگی جو کچھ میں یہاں کہہ رہا ہوں "
اس کے ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی، مگر کوئی آواز نہیں نکلی
پھر اس کا منہ کھلا اور وہ دھیمی آواز میں بولی ۔
" میں کیا کہہ سکتی ہوں جبکہ آپ میرے منہ پر کہہ رہے ہیں
کہ دوسری عورت کے ساتھ رات دن گذار کر آپ نے مجھ کو
دھوکہ دیا ہے ۔ میرے ساتھ شرمناک بے وفائی کی ہے "

اس نے بگڑ کر غصہ میں کہا ۔
" اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی ہے یا تمہیں
دھوکہ دیا ہے تو تمہیں یہ نتیجہ نکالنا چاہئے اور یہ سمجھنا پڑیگا کہ تم نے
تو میری بات بھی نہیں ، میری بات پر غور کرو کیا آج تک میں نے
سوائے تمہارے اور سوائے تمہاری امانت کے کیا اور عورت پر نظر
ڈالی تھی " اس نے انکار میں سر ہلایا ۔
جیسے سب لوگ رہتے ہیں میں بھی رہتا تھا صدر خاندان کی
حیثیت سے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ان میں گھرا ہوا بغیر اس
خیال کے کہ وقت گذر رہا ہے اس کے ساتھ عمر بھی زیادہ ہو رہی ہے
لیکن دفعتاً ایک شاک سا لگا اس تصور کے ساتھ کہ میں بوڑھا
ہو رہا ہوں، شاید ایک عورت کو یہ احساس کم ہی ہوتا ہے کیونکہ
میک اپ اور سنگار میں یہ بات چھپ جاتی ہے "
" نہیں نہیں آپ کا خیال غلط ہے میں بھی بعض وقت سوچتی
ہوں کہ جوانی کو میں نے پیچھے کیطرف چھوڑ کر آگے اور بہت آگے
نکل گئی ہوں "
" تب تو تم مجھ کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو، جب وینا دلہن بنی
ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی تھی ، اس وقت گویا کوئی مجھ سے
کہہ رہا تھا " شانو نگم اب تم خسر بن گئے ہو آئندہ سال تم نانا بھی
بن جاؤ گے ۔ وقت گذر رہا ہے اب تم بوڑھے ہو رہے ہو "
" میں سمجھ گئی آپ کا مطلب " اس نے نیچی نظریں کرکے کہا ۔
شانو نگم کھڑا ہو گیا کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا پھر اس نے
سگریٹ کیس لائٹر اور ایشٹرے لیکر صوفہ پہ بیٹھ گیا اور ایک
نیا سگریٹ سلگا کر دو تین کش لئے اور کہا
" میرے سر کے بال ابھی سیاہ ہیں ان میں سفیدی ابھی نہیں
آئی تب ایک دن ڈاڑھی بناتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کنپٹی کے
چند بال سفیدی کیطرف مائل ہیں اسی لئے میں نے سوچا بہت
دیر ہونے سے قبل میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں اب بھی جوان
ہوں، اس لئے میں نے .... "
" اس لئے آپ نے ایک جوان عورت کو لیکر جوانی کی تلاش
میں گئے تھے " اس کے جھکے ہوئے سر سے یہ آواز نکلی ۔
" آہ انجلی تم نے کس قدر صحیح طور پر مجھکو سمجھا ہے "

جھکے ہوئے سر میں ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا پورا جسم شاک سے کانپ گیا، اتنے دنوں کے رکے ہوئے اشک رواں ہو گئے شانوگم نے حیرت سے اسے دیکھا اور کہا

" اب رو کیوں رہی ہو، تم کو کیا ہو گیا ہے دیکھو انجلی تم کتنی بیوقوف ہو " تب اس نے بیقرار ہو کر اپنا سگریٹ ایشٹرے میں رگڑ دیا اور کہنے لگا۔

" یہ تمام واقعات جو میں نے تم سے کہے ہیں، کیا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، تمکو یہ سوچ کر خوش ہونا چاہیئے بجائے تم اس کے اشک فشانی کر رہی ہو جیسے کہ آسمان تم پر گر پڑا ہے۔ تم اب بھی میری محبت ہو اور میری بیوی ہو نہ کہ وہ عورت تمہارا ایک مرتبہ ہے ایک پوزیشن ہے ایک وقار ہے علاوہ اس کے میں آئندہ پھر یہ حرکت نہ کرونگا، اس بات کا میں یقین دلاتا ہوں مجھے اپنی ہوس پرستی کا جواب مل گیا اور میری غلط فہمی دور ہو گئی اب کوئی معاملہ نہیں رہا۔ میری بیچین طبیعت کو قرار آگیا، اب میں بوڑھا ہونے کو تیار ہوں اب جبکہ میں نے اپنے دل کی بات تم سے بیان کر دی ہے۔ میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک بڑا بوجھ میرے دل سے اتر گیا ہے اب تمہارے رونے اور فکر مند ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے "

اس پر بھی وہ سسکیاں لیتی رہی

" خاموش ہو جاؤ اور یہ رونا دھونا بند کر دو، ایک منٹ بھی میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، سنا تم نے .....،

اس تمام عرصہ میں ان تمام بیتے ہوئے دنوں میں وہ اس آواز کی پابند رہی تھی اس لئے دکھی دل کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی اور اپنے آنسو پی لئے۔

" اب ٹھیک ہے بیشک تم ایک اچھی عورت ہو میری نصف بہتر " یہ کہتے ہوئے آگے بڑھکر اس کی پیٹھ تھپکی، پھر اس نے دونوں بازو پھیلا کر صوفے پر ٹیک لگا کر کہا " دنیا میں گھر سے بہتر کہیں آرام نصیب نہیں ہوتا اب میں وینا سے بات کر دوں گا اسٹیشن سے میں اس سے زیادہ بات نہ کر سکا، کیا لڑکی نے کہا ہے کہ وہ خوش ہے "

جواب کا انتظار کرنے سے قبل ہی وہ فون پر اپنی لڑکی سے بات کرنے لگا،

انجلی بالکل تنی ہوئی بیٹھی تھی اسکی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اگرچہ آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ گہری سانس لے رہی تھی

" ہاں ہاں تم نے ٹھیک سنا تھا صرف مدھوری ہی نہیں آندھرا کے کئی علاقوں کی میں نے سیر کی" یہ کہتے ہوئے شانوگم نے اپنی بیوی کیطرف شرارت سے دیکھکر آنکھ ماردی اور پھر بڑے جوش کے ساتھ کہا لڑکی سے " بغیر تمہارے گھر بالکل سونا ہو گیا ہے لیکن شاید تمہارے شوہر کو میرا یہ کہنا پسند نہ آئے میں نے سنا ہے کہ رنگین فوٹو تیار ہو کر آگئے ہیں تمہاری تصویر تو بہت خوبصورت ہوگی، میں تم سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہوں اگر میں وہاں آؤں تو کیا تم گھر پر رہوگی .... اچھا اچھا یہ تو شاندار پروگرام ہوگا ..... کوئی ہرج نہیں اگر تم دیر سے بھی آؤ تو مضائقہ نہیں، میں تم سے ملنے کے لئے جاگتا رہوں گا۔ باقی سب حسب معمول چل رہا ہے کوئی خاص بات نہیں ہے میں بھی ہمیشہ کیطرح گذار رہا ہوں ..... "

کسقدر نرمی سے وہ گفتگو کر رہے ہیں کتنی دلجمعی سے جیسے کوئی نئی بات ہوئی ہی نہیں انجلی نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے چہرے سے اپنی نظریں نہیں ہٹائیں، اس نے محسوس کیا کہ واقعی ایک بڑا بوجھ دل سے اتر گیا، کیا اس نے یہ بات نہیں کہی تھی کہ جیسے ہی اس نے اپنے غلط قدم اٹھانے کی غلطی کا اعتراف اپنی بیوی کے سامنے کر لیا اسی وقت اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا

شانوگم اپنی لڑکی سے فون پر بات کر کے واپس آیا اور انجلی کے بازو صوفے پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا " وینا اور اس کا شوہر ڈانس دیکھنے جا رہے ہیں لیکن اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھ سے ملتی ہوئی اپنے گھر جائے گی، اس وقت غالباً ۱۰ بج جائیں گے یا اس سے بھی زیادہ دیر ہو جائے، اور وہ بیوقوف لڑکی کہتی ہے کہ کیا بہت دیر ہو جانے پر مجھکو تکلیف ہوگی، میں نے جواب دیا ہرگز نہیں، تم دونوں ضرور گھر آؤ جب بھی کھیل سے واپس ہو "

انجلی خاموش رہی ـــــ

"گرم دودھ تیار رکھوان کے لئے"، اس نے کہا
انجلی لب بستہ بیٹھی رہی، ساکت اور بیحد سنجیدہ
"تم اسقدر سنجیدہ کیوں نظر آرہی ہو اور اس طرح کیوں مجھکو گھور رہی ہو کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ اس بات کا اعادہ پھر کبھی نہیں ہو گا، میں نے اس کا تلخ تجربہ کرلیا ہے اور اپنی لاحاصل جستجو کا خمیازہ بھی بھگت چکا ہوں اور اب میں خوش ہوں، مطمئن اور شرمسار بھی، تمکو بھی اب یہ واقعہ بھلا دینا چاہیئے، آج رات کے کھانے میں کیا پکا ہے، جب سب بچے آجائیں گے تب ہم سب مل کر کھائیں گے۔
انجلی اس پر بھی خاموش رہی، بالکل لب بستہ
"کیا تم مجھ سے بات نہ کرو گی، میرا خیال ہے کہ میری اس طویل گفتگو سنکر بھی تم مطمئن نہ ہوئیں، غالبا تم نے میری بات سمجھی ہی نہیں مجھے اس کا افسوس ہے" یہ کہتے ہوئے مجگر کر اس نے ایک نیا سگریٹ سلگایا، انجلی کے چہرہ پر ایک نئی علامت ظاہر ہوئی جو سنجیدگی اور مسکراہٹ سے لبریز تھی تب اس نے کہا
"میں یہ نہیں سوچ رہی ہوں جس کا تم نے ذکر کیا ہے"
"پھر تم کیا سوچ رہی ہو" سگریٹ کا کش لگا کر اس نے سوال کیا۔
"گذرے ہوئے دنوں سے متعلق اور بیتی ہوئی جوانی کے بارے میں جو میرے خیالات تھے وہی خیالات آپ کے دل میں بھی ضرور آئے تھے مگر اس کا تجربہ اور اس کا تجزیہ جس طرح آپ نے کیا ہے وہ میں نے نہیں کیا...." انجلی نے ہنستے ہوئے یہ ریمارک کیا
اس نے جلدی سے اس کی طرف دیکھا اور اس کو گھورا مگر فوراً ہی شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

فراق کے گھر مجاز گئے اور گھنٹی بجائی تو ایک کالی کلوٹی سی عورت نے دروازہ کھولا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی فراق کے برآمد ہونے پر مجاز نے سوال کیا۔ یار یہ تمہاری بیوی ہیں یا نوکرانی۔ فراق نے تنک کر کہا بیوی
تم سمجھتے ہو کہ میں ایسی بد شکل نوکرانی رکھوں گا۔

○

کسی شاعر نے نثار احمد فاروقی سے کہا آپ کی توجہ چاہوں گا اپنی اس غزل میں یہ شعر مجھے خاص طور پر پسند ہے، شعر سن کر فاروقی نے کہا آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ شعر کس قابل ہے۔

منقول ادبی لطیفے
(از خواجہ عبدالغفور)

(مراٹھی کہانی)

• شریمتی شیلجا راجے
ترجمہ۔ محمد حسین پرکار

ڈھلتا وقت

کیوں، کس لئے، کس کے لئے، کتنے سوال!

ان سوالوں کے بھنور میں چکرا رہی ہوں، دماغ جیسے بے حس ہوگیا ہے، چونٹیوں کا سارا جتھا میرے سر سے ڈس گیا ہے، من میں صرف طغیانی اٹھ رہی ہے۔ سوالوں کی اور واقعات کی۔ کیوں آیا ہے تو؟ اتنے سالوں بعد؟ جس وقت تو آئے ایسا لگتا تھا اس وقت تو دم سادھے بیٹھا تھا، کتنی باولی بنی بھٹک رہی تھی میں۔ کتنی تڑپ رہی تھی اس وقت، صرف تیری پرچھائیں بھی نظر آتی تو سنبھل جاتی قرار پاجاتی، تیری اس پرچھائیں کا سہارا ابھی کافی ہو جاتا ہے اس پرچھائیں کو پکڑ لیا ہوتا اور پلو تھام لیا ہوتا اور قدم اٹھائے ہوتے۔ لیکن اب کیا اس کا؟ اب سچ کہا جائے تو طغیانی رک گئی تھی۔ خوب بربادی آئی تھی اور اب اس کی تلافی بھی ہوچکی ہے۔ گذرا واقعہ پہچان میں نہ آنے والی۔ پرانے بنگلے کی ایک نئی عمارت تعمیر کی جائے اس طرح سارے جینے کا، حیات کا ہوگیا تھا۔ سارا روپ ہی بدل گیا تھا، دراصل سمجھ میں نہ آنے کی حد تک۔ پت جھڑ آئی اور صرف تنا رہ گیا، لیکن اب اس تنے پر بھی کچھ رنگ برنگ نظر آرہا ہے۔ میرے ہال ہی میں نے ایسا ہی تنا کھڑا کیا ہے اس پر پلاسٹک کی بیل چھوڑ دی ہے۔ بیل پر خوشنما خوبصورت پھول لٹک رہے ہیں دیکھنے والا پل بھر کے لئے دھوکا کھا جاتا ہے اسے وہ بیل اصلی لگتی ہے۔ زندہ!

میں بھی ویسی ہی لگتی ہوں دنیا کو۔ پُر نور، شگفتہ مسکراتی کھلی ہوئی، کتنی بہترین پلاسٹک سرجری کی ہے میں نے ساری زندگی پر، بالکل نامعلوم۔ کہیں کوئی دھندلا سا نشان تک دکھائی نہ دے، لیکن!

تو کیوں آیا رے ایسے بے وقت؟ کیا سب کچھ کھرد بچنے والا ہے؟ ڈھایا ہوا ظلم کافی نہ تھا کیا؟ کسی معصوم کی طرح کیسے بے فکر آکر یہاں کھڑا ہو گیا ہے۔

کسے کچھ کہنے جاؤں تو ٹھیک سے کہہ نہ پاؤنگی۔ کیا کہوں گی کس سے؟ پہلے تجھ سے کیسے ملاقات ہوئی یا کیسے باتیں کیں؟

پرسوں تو آیا بالکل معصوم بنکر۔ یہ میرے تنہا گھر میں رہنے کا وقت رہتا ہے یہ تو کیسے جان گیا۔ تو آیا۔ گھنٹی بجائی کسی روزمرہ آنے والے شخص کیطرح۔ میں نے سستی سے ہی دروازہ کھولا۔ بال کھلے ہوئے، پلو شانے سے ڈھلا ہوا، ان باتوں کیطرف میرا دھیان ہی نہ تھا، شاید پوسٹ مین ہوگا یا گھر کتابیں بیچنے والا، لائبریری والا۔ پر سامنے تو کھڑا تھا۔ تو اور تو ہی، مسکراتے ہوئے گویا درمیانی پانچ پچیس گذرے ہی نہ تھے۔ کچھ بربادی آئی ہی نہ تھی، سب کچھ وہی تھا پچیس سال پرانا! تجھے ویسا ہی لگتا ہوگا۔ اس کے بناپر تیری وہی مسکراہٹ یوں نظر نہ آتی جس کی وجہ سے میں نے تجھے فوراً پہچان لیا۔

تو گر نہ مسکراتا تو سچ مچ میں تجھے پہچان نہ پاتی۔ کیسا سڈول ہو گیا ہے تو۔ تیری بولتی ہوئی آنکھوں میں خوب موٹے شیشوں کی عینک آگئی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے میں باؤلا گئی لیکن تو مسکرا ہی رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے ہی تو نے کہا پہچانا نہیں۔

کیا کہوں سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک بار لگا صاف کہہ دوں نہیں پہچانا، لب کھل گئے بند بھی ہوئے لیکن تو فوراً آگے بڑھا مجھے اپنے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے تو اندر داخل ہوا، کہنے لگا یہ کیا گھر میں بھی نہیں بلاؤگی؟

سچ مچ بلانے والی نہیں تھی رے! کیسی حالت بنادی ہے میری اس کا احساس بھی نہیں تجھے۔ یہی کچھ ہوگا۔ اس کا اندازہ تو تھا ہی۔ لیکن تیرے سامنے کچھ نہ چلا۔ اس وقت بھی نہیں اور اب بھی نہیں۔

ایسا ہی تھا تو ابتدا ہی سے کسی آندھی کیطرح میری زندگی میں آیا تو ۱۹۴۲ء کا سال تھا وہ۔ میں کالج جاتے آتے تجھے روز دیکھا کرتی تھی۔ کھادی پاجامہ، نہرو شرٹ اور اس پر کھادی کا جیکٹ تر و تازہ مسکراتے چہرے والا تو، ہمیشہ ہی کسی نہ کسی سے بولتے ہوئے نظر آتا۔ بیچ ہی میں تیرا ایک آدھ لفظ اونچی آواز میں سنائی دیتا تھا نا۔ اور کبھی گردن مڑ جاتی لفظوں کی نئی سمت کیجانب۔ نہ جانے کیسے تو اسی طرح دیکھ لیتا۔ گھور کر دیکھنے کی جیسے تیری ادا ہی ہو۔ دیکھتا اور مسکراتا۔ جیسے پُرانی پہچان ہو۔ کھسیانی ہو کر میں چل پڑتی لیکن چلتے ہوتے احساس ہوتا رہتا۔ تو اب تک میری پشت پر ٹک لگائے دیکھ رہا ہے۔ میرا نشانہ لے رہا؟

یہ ایسی نظروں کی ملاقات ہی کتنے دنوں تک ہوتی رہی۔

ایک بار کسی نے کہا۔ ارے وہ جیکٹ والا خوبرو جوان ہے نا...

میں بلاوجہ ہی تھرا گئی۔ کانوں کی لو میں حرکت ہوئی۔ نظر خود بخود جھک گئی۔ لفظ کیسے کانوں میں گونج رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ وہ ہماری دَل کا لیڈر ہے۔ آواز کیسی سریلی ہے اس کی۔ گیت کیسے باوقار آواز میں گاتا ہے "یہ گھر جاچنے جنے کار کرانتی چا" اتنا خوبصورتی سے گاتا ہے لگتا۔ تھا پوچھ لوں نام کیا ہے ری اس کا؟۔

پر کیسے پوچھوں؟ وہ کیا سوچیگی۔ وہ اس کی پہچان کا۔ شاید!

ہاں! اتنے اچھے نوجوان پر کسی کا بھی دل آجائیگا!

اور خود سے ہی سہم گئی۔ چھی! ناحق، بیکار سی بات من میں آرہی ہے پاگلوں جیسی۔

سہیلیاں بول رہی تھیں۔ وہ دو چار اسی دَل میں جایا کرتی تھیں میں نے باولے پن سے پوچھا۔ کیسا دَل ری؟

اور سب ہنس پڑیں۔ راستے کا دھیان بھول کر، میں شرمندہ ہوگئی وہ ہنس رہی تھیں اسی صبح تو سامنے آیا۔ تجھے یاد بھی ہے یا نہیں

کون جانے۔۔ سب کچھ یاد آتا ہے وہ مجھے، وہ سب یاد کرنے کا روگ سا لگ گیا ہے مجھے

تو سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور میں پریشان ہو گئی، تو نے سدھا سے پوچھا کیوں ہنس رہی ہے اتنی۔ کیا ہوا سمجھنے دو

سدھا نے میری طرف اشارہ کیا۔ کہا اری یہ شششی باؤلی پن سے پوچھ رہی ہے کیسا دَل؟

ارے وہ ہا کر میں نے اس سے کہا کچھ بھی سمجھ لے۔ کمل دَل بلوٗ دَل۔ تلسی دل۔

واہ بہت خوب۔ تیری شاعری امڈ آتی ہے وہ بھی ایسے بے وقت۔ پر ادشا تیرا بلوٗ دَل یا تلسی دَل کا تصور بالکل پسند۔ سچ مچ آج ہمیں اپنی زندگی کو اس تلسی دَل کیطرح ہی جان لینا چاہئے بلوٗ دَل کیطرح سمجھ لینا چاہیئے۔ وطن کے قدموں پر نثار ہونے کے لئے دیش ہی ہمارا دیوتا، وہی ہمارا مذہب ہے۔

تو کہہ رہا تھا اور میں پانچوں حواس کانوں میں بسا کر سن رہی تھی۔ بولتے ہوئے ہوئے تیری کالی بھوری چمکتی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا بڑی دیر تک تو ہمارے گروپ میں بیٹھا تھا۔ ہم سب سمندر کے کنارے ریت پہ بیٹھے تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ریت کا گھر بنایا۔ اطراف خوبصورت دیوار کھڑی کی۔ تیری اور اس سہیلی کی باتیں میں صرف سن رہی تھی اور ہاتھوں سے یہ کھیل جاری تھا۔

تیری نظر مجھ پر تھی کیا کون جانے۔ تو نے وہ گھر دیکھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس عمر میں ایسا خوبصورت گھر۔ ایسا ہر کوئی چاہتا ہے۔ لیکن آج ہمیں صرف گھر ہی نہیں تعمیر کرنا ہے، آج ہمیں آزادی کا مندر کھڑا کرنا ہے، اس کے لئے شاید ایسے سینکڑوں، لاکھوں گھر مسمار کرنے ہونگے۔ خواب بکھر جائیں گے لیکن اس کی پرواہ کرتا کون ہے۔

تیری ساری باتیں ایسی ہی تھیں۔ اس وقت میں نے تجھے بہت قریب سے دیکھا۔ تیرا گورا چہرہ گفتگو میں سرخ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں کچھ نرالی ہی چمک پیدا ہوتی۔ تیرے اس سارے جوش و خروش پر ہی میں اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔

صرف تیری خاطر میں نئے دَل میں آنا شروع کیا۔ او سچ کہتی ہوں تیری وجہ سے ہی وہاں میرا دل لگا۔ تیرے کاموں میں حصہ لینے لگی۔

تو بلیٹن نکالتا تھا۔ اس کے سائکلو اسٹائل ہمارے گھر میں آکر رکھا کرتا۔ ہمارا گھر یعنی سرکاری بنگلہ، آرتھر روڈ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا۔ انکی طرف کیوں پولیس کی نظر بد کا گذر ہوتا۔ بلیٹن کا گٹھرا سرکاری فائیل کیطرح خاکی رومال میں باندھے، کسی کو اور خود ابا (ابا جی) کو بھی کبھی اس کا علم نہیں ہوا۔ سرکاری وردی پہنے کوئی بنگلے کے احاطے میں داخل ہوتا۔ ساری سرکاری عمارتوں کے اطراف چکر لگا کر سیدھے گھر میں داخل ہوتا۔ سب کچھ کیسے سلیقے سے تہہ ہوا تھا۔ میں اس کی راہ روکتی، گٹھرا ہاتھوں میں لیتی اور پھر اگلا انتظام تیرا۔ کالج میں جانے والی سہیلیاں ٹیڑھی راہ کر کے گھر آتی تھیں اور پھر تقسیم کیا جاتا۔

کئی دنوں تک یونہی چلتا رہا۔ پوشیدگی سے۔ لیکن ایک روز ابا ٹھیک سامنے آئے صرف بیٹی کی خاطر ایکشن نہیں لی۔ لیکن اپنی راہ بند ہو گئی۔ صرف تیری نہیں میری بھی۔ مجھے کالج لانے لیجانے کے لئے گاڑی آئی۔ تیری ملاقات بند ہو گئی۔ اور تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ تیری ملاقات بند یعنی میرے سارے دلی جذبات پہ بندھن۔

اور تو؟ تجھے میرے دل کی کچھ خبر تھی بھی یا نہیں کون جانے، تجھ پہ دھن سوار تھی حب الوطنی کی۔ ۱۹۴۲ء کے غدر کی۔ تیرا سارا دھیان لگا تھا۔ وہ صرف تجھ پر سونپے گئے فرض پر۔ تجھے میری دل کی حالت کا اندازہ ہو تو کیسے؟ میری یاد بھی نہ آتی ہو گی تجھے۔

تو اپنے کاموں ہی میں معروف تھا۔ بڑے بڑے لیڈروں سے ملاقات کر رہا تھا۔ سچے سپاہی کا رول باقاعدہ ادا کر رہا تھا۔ میرے لئے سارے در بند ہو چکے تھے۔ تیری خاطر میں نے سب کچھ کیا تھا۔ کرنے کی تیاری تھی، چاہیئے تھا صرف تو ہی، کم از کم صرف ایکبار تجھ سے ملنے کی خواہش تھی۔ جس کے لئے تیری ملاقات کے لئے میں ہر آزمائش کے لئے میں تیار تھی۔

پر وہ تو کیسے جانے؟ تجھے کیا سچ مچ اس کا علم نہیں؟ بالکل کچھ بھی نہ لگتا ہو گا تجھے میرے بارے میں؟ ایسے سوالات خود ہی سے کرتی رہتی تھی میں۔ پھر دل میں دہراتی تھی تیرے کہے ہوئے لفظ۔ ایک بار تو نے کہا تھا اس شششی کیطرح کوئی ساتھی مل جائے، تو لوگ جو چاہے ہمت کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ایک بار تو نے کہا تھا ششی پر کوئی کام سونپا جائے اور بے فکری سے اپنی راہ پہ لگ جائیں۔

وہ سب مجھے یاد آتے رہتا۔ لگتا کبھی تو تو آئیگا ضرور آئیگا کہ پکارے گا ششی، اور سچ مچ اس دن نصف شب تیری دھیمی، دھیمی آواز سنائی دی۔ لمحہ بھر کی بھی تاخیر نہ کرتے ہوئے میں نے فوراً کھڑکی کھول دی۔ تجھے دیکھکر میں چکرا گئی وہ تو تھا اور اور نہیں بھی تھا۔ کیونکہ آواز تیری تھی لیکن لباس؟ ارے کوئی گورکھا میرے سامنے کھڑا تھا میں کچھ گھبرائی سی طرف دیکھنے لگی اور تو نے برسوں کی طرح ہی ہنستے ہوئے مجھے پوچھا پہچانا نہیں؟ میں...

کیا ہو رہا ہے یہ سمجھنے سے پہلے ہی میں نے تیری گردن میں بانہیں ڈالدیں۔ میرے حلق میں ہوک سی جم گئی۔ اس کھڑکی سے تو تیزی سے کود پڑا۔ مجھے قریب لیتے ہوئے تو نے کہا۔ لگا ہی تھا مجھے اس لئے اتنی ہمت کی۔ صرفا تیری خاطر۔

اور ہنستے ہنستے تیری آنکھوں میں کبھی نہ آئے، آنسو امڈ آئے میری زلفوں پہ تیری ٹھوڑی ٹکی ہوئی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا تو ٹھوڑ میری زلفوں پر پھرا رہا تھا۔ لگتا تھا گردن اٹھا لوں۔ تیری آنکھوں میں ایکبار خود کو دیکھ لوں۔ لیکن اس وقت وہ ممکن نہ ہو سکا۔ تیری آنکھوں میں کبھی جھانک نہ سکی۔ اتنی ہمت کبھی ہو نہ سکی۔

میں تھرائی ہوئی تجھ سے لپٹ کر کھڑی تھی۔ تجھ سے کچھ پوچھنا تھا۔ پر لفظ نکل نہیں رہے تھے۔ آخر تو ہی بول پڑا۔ مجھے ہلکے ہاتھوں سے دور ہٹایا اور کہا ششی میں آج خاص کر تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ میں یہاں آؤنگا یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں صرف تجھ سے ملنے کے لئے آیا ہوں، اب اس کے بعد اپنی ملاقات پھر کبھی ہو نہ ہو...

میں نے فوراً تیرے منہ پہ ہاتھ رکھدی، تڑپ کر بول اٹھی نہ رے ایسا مت کہہ۔ تیرے بغیر میں جی نہیں سکونگی یہ کیسے کہوں تجھے؟

تو مسکرا دیا۔ ایکبار ہی تو نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور پھر پل بھر میں مجھے ہٹا دیا۔ کہنے لگا ششی میری زندگی ایسے ہی طوفانی ہے تیرا نباہ نہ ہو سکے گا۔

تجھے ایسے لگتا ہے تیرے لئے میں چاہے جو کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بول نکل پڑوں ابھی تیرے ساتھ باہر؟

پاگل ہو، لیکن سچ کہوں تو یہ تیرا پاگلپن ہی مجھے بہت بھا گیا۔ سچ کہتا ششی۔ بچپن سے میں نے میں نے بہت برداشت کیا ہے۔

سوتیلی ماں کا ظلم سہا ہے، ماں کی بچی جھوٹی شکایت سنکر والد نے جسم پر نیل پڑنے تک مارا ہے، پانی پی کر میں نے دن گذارے ہیں، لیکن نہ کبھی دل ہلا اور نہ ہی تلملایا۔ پر آج ایسے روپوشش ہوتے ہوئے تیرے لئے تڑپ اٹھا۔ یہ ہمت کی، میں کبھی کہیں جو نہیں وہ تجھ میں گھو گیا بندھ گیا۔

تیری باتوں سے اس حالت میں بھی میرا روم روم کھل اٹھا تھا۔ تو میرا تھا میرا ہو گیا ہے۔ میں اس تصور ہی سے شرابور ہو گئی، تجھ سے پھر سے لپٹ گئی اور بول اٹھی میں آؤنگی، تیرے ساتھ آؤنگی۔ تیرا سایہ بن کر رہوں گی۔

لیکن تو نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے مناتا رہا، مجھے بار بار کہتا رہا۔ میں تجھے نہیں بھولونگا ششی۔ موقع پاتے ہی پہلے تجھ سے ملنے آؤنگا۔ یقین رکھ مجھ پر۔

اور تو چل پڑا، جیسے آیا تھا ویسے ہی، گردش کرنے والی ہوا کے ایک جھونکے کیطرح آیا اور چلا گیا، میرا دل تو جان چکا تھا اور تیرے دل میں بھی میرے لئے کچھ جذبات پیدا ہوئے تھے بس اتنا ہی جان لیا تھا اس ملاقات میں۔ فائدہ بس اتنا ہی۔ کاجل سی گہری اندھیاری رات سامنے پھیلی تھی، اس میں چاند کی کرنوں کا احساس ہوا تھا وہ صرف اتنا ہی تو مجھ سے بندھ چکا تھا یہ کیسے کہہ سکتی ہوں میں، پھر بھی وہ تیری انوکھی سرسری ملاقات میں نے سینے میں سنبھال رکھی تھی۔

تو چلا گیا اور میں رہ گئی۔ جہاں تھی وہیں پر۔ لیکن وہ رہنا تھا صرف نام کا۔ میرا سارا تن من تیری طرف لگا تھا، دل کے سارے روؤں میں گونج تھی وہ تیری، تو روپوش ہو گیا، غدر کا شور وغل ہوا، ہمارے قیدخانے کا احاطہ قیدیوں سے ہی بھرا رہتا، لیکن اس میں تو کبھی نظر نہ آیا، کبھی کبھی لگتا شاید انہیں میں تو کہیں ہوگا، مجھے ویسے ہی چوری چھپے دھیرے سے آواز دیا۔ ششی۔

مہینے بیتے، سال گذرے، وقت گذاری کے لئے پڑھتی رہی، ایم اے ہوئی، پی۔ ایچ۔ ڈی بھی ہو گئی لیکن تیری آہٹ نہ ملی، تیری راہ تک رہی تھی، تو آنے والا تھا، آنے پر براہ راست تجھ سے خود کو باندھ لینے والی تھی، اب کسی کے رعب میں آنے والی نہیں تھی، کسی کی پرواہ کرنے والی نہیں تھی، رہ گئی تھی وہ تیری صرف تیری۔

سارے قیدی چھوٹ گئے۔ پونا کے سنی وار واڑے کے صحن میں کتنا بڑا استقبالیہ ہوا۔ دوڑتے ہوئے پہنچی گئی۔ لگتا تھا تو ان میں کہیں دکھائی دیگا۔ اسٹیج پر دیکھ رہی تھی سب کو۔ مولانا آزاد بیرسٹر آصف علی، پنڈت نہرو سارے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ میری نظر تیرے لئے متلاشی تھی۔ بھاری قدموں سے واپس آئی۔ کتنی مانوس ہو گئی۔

پھر ایکبار امید نظر آئی، آزادی نصیب ہوئی، خوشی کے تہوار پر شباب چھایا۔ میں بھی شگفتگی سے کھل اٹھی، لاکھ دیئے جلائے رنگولی سجائی، مالائیں باندھ دیں، اب تو ضرور آنے والا تھا، مجھے جو چاہئے تھا وہ مل گیا تھا، اب کوئی بھی روپوش رہنے والا نہ تھا سارے کھلے سر ابھر رہے تھے، تیرا استقبال کرنے کے لئے میں بالکل تیار تھی۔

اور پھر سے میں نڈھال ہو گئی، تیرا سایہ بھی میں دیکھ نہ سکی یہ مایوسی جسم کو آئی تھی رے۔ میں بالکل تھک ہار گئی کتنی راہ دیکھوں! راہ دیکھنا ہی کیا نصیبوں میں لکھا ہے؟ جی تلملا رہا تھا۔

اور آخر مجبوری کے تحت ایک نئی زندگی کو اپنانا، کتنا نامعلوم مکھوٹا بدل لیا تھا میں نے، اتنی خوبصورت پلاسٹک سرجری اپنی میں نے ہی کی تھی کہ کسی کو بھی زخموں کے نشاں کا پتہ بھی نہ چلے، گویا نئی زندگی ہی پائی تھی میں نے، کبھی کبھار پرانے زخموں کی چبھن محسوس ہوتی کہ فوراً اس پر مصنوعی ہنسی اور باتوں کی مرہم پٹی تیار ہی رکھی تھی میں۔ یہ ویران سپنا ختم ہو چکا تھا، رہ گئی تھی صرف بادلوں سے گھری صبح، ٹھیک سے روپ پہچان میں نہ آنے والی۔

پھر سے سب اپنی اپنی جگہ رہ گیا تھا، تو جو کہیں ملا نہ تھا اب مل سکے گا یہ امید بھی ٹوٹ گئی تھی، کبھی دل میں خیال آیا کہ میں خود ہی جھٹک دیتی تھی، کہا کرتی کہیں کسی وجہ سے گاڑی اڑاتے ہوئے سرکاری عمارت کو جلاتے ہوئے کچھ ہوا اور .....!

تیرے نام سے گوداوری میں ایک بار چھوڑ دیا تھا، ساتھ میں میرا سمیدھ تھا، اس نے پوچھا ماں یہ کس کا دیا ہے، ہر ایک دیئے کو نام دیا جاتا ہے نا؟

میں جواب نہیں دے پا رہی تھی، اتنا ہی کہا ہر کسی کو نام ہوتا ہے ایسا نہیں۔ یہ دیا، بے نام ہی سہی۔

وہ تیرا دیا تیز تیز آگے بڑھ رہا تھا، تیری طرح ہی اُس کا جانا تھا

سارے دیئے پیچھے چھوڑکر وہ آ کے نکل پڑا، میں آنکھیں بھر کر دیکھ رہی تھی وہ نظروں سے غائب ہونے تک اس کی جوت تھرتھرا رہی تھی، وہ نہ اٹھا اور نہ ہی پلٹا، صرف بڑھ ہی رہا تھا۔ اسے صرف بہاؤ تھا، دلیں کیا تو بھی ویسا ہی، تجھے بھی صرف رفتار، کسی وقت رکیگا بھی یا نہیں، بھگوان جانے اور رک بھی جائے تو کہاں؟ کہاں رُکا ہوگا، کہاں پہنچا ہوگا۔

اس وقت وہ سوال حل ہی نہیں ہوئے تھے، حل کی امید ہی میں نے چھوڑ دی تھی، تو یعنی میرا ایک خواب تھا، دھندلا سا اور خوبصورت سا، اس خواب میں پھر مگن نہ ہونے کا ارادہ کر رہی تھی، ابھی ابھی کہیں ساری باتوں کی عادت ہوگئی تھی۔

اور تو آیا، ایسا اچانک سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ کچھ زیادہ فرق نہیں ہوا تھا، وقت نے بالکل ہلکے ہاتھوں سے ملمع کیا تھا، تیرے رنگ و روپ میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی، تیری پتلی قامت پر کچھ موٹاپا آگیا تھا، اور آنکھوں پر عینک آگئی تھی اتنا ہی فرق، باقی سب کچھ ویسا ہی، ہنسا بھی اور بولا بھی، میں نے سالوں سال اپنے دل میں سنبھالا ہوا۔

تو آئے، باتیں کرے، کم از کم دکھائی دے ایسا کیا کیا لگ رہا تھا کیا بتاؤں، یہ دن زندگی میں کبھی تو طلوع ہو اس امید پر جی لگائے بیٹھی تھی پر آج......؟

آج تو آیا، ہنسا، باتیں کیں، بالکل معمول کیطرح، اس پہلی ملاقات میں جیسی باتیں کیں، اسی طرح باتیں کرتا رہا، میرا پتہ کس طرح حاصل کیا یہ تفصیل سے بیان کرتا رہا اور آخر میں کہنے لگا، دیکھو میں نے کہا تھا نا کہ موقع پانے پر پہلے تجھ سے ہی ملنے آؤنگا، آیا نا؟ کیا نا میں نے اپنا وعدہ پورا؟

ہاں بابا ہاں! تو نے تو تیرا وعدہ پورا کیا لیکن میں نے؟ میرا کیا! یا مجھے شرمندہ کرنے کے لئے تو نے ایسا کہا؟ لیکن ایسا لگتا نہیں، تیری آنکھیں ویسی ہی پاک ہیں، تو ہنستے ہوئے ویسی ہی مٹھاس محسوس ہوتی ہے، تیری باتوں میں کہیں بھی کڑواہٹ نہیں، میری تعلیم، میرے اس نئے گھر کو تو نے دل سے سراہا، کہنے لگا " تو سکھی ہے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا، خوشی ہوئی، یہ ایسی ہی زندگی تجھے راس آنے والی تھی۔ ہر کسی نے اپنے آپ سے سنبھال جائے۔ اسی راہ سے چلنا چاہیئے۔ ہے نا؟ "

بولتے ہوئے آخر دوسروں سے سوال پوچھنے کا یہ تیرا طریقہ مجھے نیا نہ تھا، پر تیرے کسی بھی سوال کا اب میں جواب نہیں دے سکتی کیوں کہ میں خود ان سوالوں کے بھنور میں پھنس گئی ہوں، جوابات نہیں ملیں گے اور مل بھی جائیں تو وہ صحیح ہونگے ایسا میں کہہ نہیں سکونگی، سچ نہیں رہے میں بالکل مجبور ہوگئی ہوں۔

تو نے تیرا وعدہ پورا کیا اور میں نے؟ کہہ دینا اب میں کیا کروں میں نے تجھے کہا تھا تو واپس آجائیں تیرا سایہ بن کر رہونگی۔

اور اب؟ میں کسکا سایہ بن کر رہوں؟ کہتے ہیں کہ پرچھائیں کا رنگ و روپ نہیں ہوتا، سچ مچ مجھے بھی نہیں تھا میرے سارے جذبات اس وقت تجھ میں سماگئے تھے، سارے رنگ و نقش تیری ہی تصور بنا رہے تھے، لیکن اب پاس کا سب کچھ ختم ہوچکا ہے، سائے کو روشنی کا سہارا چاہیئے، میرے پاس تو اب صرف اندھیرا ہی رہ گیا ہے، اندھیارے میں کیا کہیں پرچھائیں نکل آتی ہے؟ بتا سکے گا کیا اس کا مطلب؟

تو کچھ بھی نہ جان سکے گا، مطلب اور غلط مطلب، اس کا فرق تو سمجھ لینا چاہیئے، تو توان ساری باتوں سے پار نکل گیا ہے گویا، تو ثابت ہے مستحکم ہے اور اٹل ہے میں لیکن بالکل بکھر گئی ہوں۔ نہیں چاہیئے ایسے وقت تو آکھڑا ہوگیا ہے، یہ وقت ایسا ہے کہ نہ میں اس پار آسکتی ہوں اور نہ اس پار جاسکتی ہوں، ایسی یونہی درمیان میں ہچکولے لے رہی ہوں، دھیان تیری طرف لگا ہوا ہے، آہٹ پر تیری کان ہیں اور یہ بندھن عزت کے، اس گھر کی ایک پتھر کے، یہ سب مجھے یہیں باندھ کر رکھتے ہیں، کیا کروں میں اس سوال کا جواب نہ تیرے پاس ہے اور نہ میرے پاس ہے میں محض بھنور میں چکرا رہی ہوں پاگل سی، اور میرا سمیدھ پوچھ رہا ہے، ماں تجھے کیا ہوگیا ہے؟

کیسے کہوں رے اسے، کیوں آیا ایسے غیر وقت؟ اس عین سہ پہر۔

حسن نعیم

ملا نہ کام کوئی دہر میں جنوں کے سوا
تمام عیش میسر رہے سکوں کے سوا

لگی وہ آگ کہ دیوار و در بھی چل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

میں اس کے جسم کی بے کل پکار سن بھی چکا
اب اس آنکھ میں رکھا ہے کیا فسوں کے سوا

پڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے
بچا نہیں ہے کوئی سرخ میرے خوں کے سوا

تمام فن کی بنا مدو جزر دل ہے نعیم
کہ شعر و نغمہ ہیں کیا موج اندروں کے سوا

مرے ضمیر کا شعلہ، ہنر کا جوہر تھا
وہ ایک شعر جو فریادیوں کے لب پہ تھا

سبھی عزیز مری کھوج میں گئے ہوں گے
میں جب گیا ہوں تو کتنا ہرا بھرا گھر تھا

ہمیں نے آئینۂ دل کا اٹھا کے یوں رکھا
کبھی وہ مہر، کبھی بے رخی کا منظر تھا

کسی کے بخت میں گوہر بھی عیش ساحل بھی
مرے حساب میں بس اک بھنور کا چکر تھا

رئیس نقد کہاں مجھ کو ڈھونڈتا کہ حسن
کوئی دکان تھی اپنی نہ کوئی دفتر تھا

حرمت الاکرام

خوش ہیں بنا بنا کے ہیولے غبار کے
رستے جو منتظر تھے کسی شہسوار کے

وہ بھی کماں سے تیر کی صورت نکل گیا
لمحہ جو ہاتھ آیا تھا صدیاں گذار کے

کیا آزماؤ گے کہ ہوں پروردۂ زیاں
کھیلا کیا ہوں کھیل سدا جیت ہار کے

صحرائے بیکسی میں ملے گا بھی کیا جواب
رہ رہ گئے ہیں کتنے مسافر پکار کے

آؤ دعا کریں کہ خزاں بھی نہ روٹھ جائے
کہتے نہ تھے کہ بیت گئے دن بہار کے

جانے کسے ڈسے گی کہ یہ زہرناک رات
ناگن کی طرح بیٹھی ہے کینچل اتار کے

شکنیں ہیں اس قدر چھپائے نہ چھپ سکیں
دیکھا ہے میں نے وقت کا چہرہ نکھار کے

خود اپنا ساتھ دے نہ سکا ورنہ کیا کہوں
کیا کیا تھے حوصلے دلِ ناکردہ کار کے

جھنکار اٹھ رہی ہے تو دل کا قصور کیا
کیسے کہیں کہ گیت نہ گائیں گے پیار کے

دیکھیں یہ کاروبارِ طلوع و غروب کیا!
مشعل طراز وادیٔ لیل و نہار کے

حرمتؔ جنہوں نے گھر نہ بنایا نہ سائبان
کیا جانے رہنے والے تھے وہ کس دیار کے

کچھ کہو، رنگِ شب و روز ادھر کیسا تھا
چھوڑ آئے جسے پیچھے، وہ نگر کیسا تھا

جوت ایسی تھی کہ تھا قافلۂ شب نازاں
آگے آگے جو تھا نیزے پہ وہ سر کیسا تھا

تھا مدد کیسا کہ تھا ساتھ محافظ کی طرح
یہ عجب کھیل سرِ راہگزر کیسا تھا

روز بڑھتا ہی گیا فاصلۂ شام و سحر
جانے وہ سلسلۂ شام و سحر کیسا تھا

رک گئے ہم تو کہا، یہ نہیں آئینِ سفر
موڑ پر سر کو جھکائے وہ شجر کیسا تھا

روز آتی تھی صبا پوچھنے احوالِ چمن
فصل وہ کون سی تھی، وہ گلِ تر کیسا تھا

کن مراحل میں ہے انساں کا مذاقِ پرواز
لوٹنے والو! خلاؤں کا سفر کیسا تھا

محل بننے سے گریزاں رہی خود جس کی انا
کس کو سمجھائیں کہ مٹی کا وہ گھر کیسا تھا

ڈھونڈتے پھرتے تھے حرمتؔ یہ کسے موج بموج
سیرِ دریا یہ چراغوں کا سفر کیسا تھا،

عزیز قیسی

وفا نہ اُن کے نہ اپنے ہی بس میں کیا کیجیے
اسیرِ بحر میں تنکوں سے کیا گلہ کیجیے

حِصارِ سنگ سے ٹکرا کے مر تو سکتے ہیں
نجات سامنے ہے کچھ تو حوصلہ کیجیے

بہت دنوں سے نہیں زندگی کا کوئی جواز
بدل کے لفظ وہی وعدہ پھر عطا کیجیے

پہاڑ کاٹنے والوں کو کوئی سمجھا دے
کہ ہو سکے تو کسی دل میں راستہ کیجیے

پلک پہ ٹھہری ہوئی شب پگھل کے بہہ جائے
کسی اُداس فسانے کی ابتدا کیجیے

نہ یوں ہو لاش کے پُرزے خلا میں کھو جائیں
زمیں کا خاتمہ بالخیر ہو دعا کیجیے

اِسی کو اپنا کفن کیجیے اور سو رہیے
یہ شب نہ گذرے گی قیسیؔ خدا خدا کیجیے

صباؔ اکرام

ورق الٹتے ہو اکرام کیوں کتابوں کے
لکھے ہوئے نہیں تعبیر ان میں خوابوں کے

اندھیری رات میں احساس رہ دکھائے گا
مہک اٹھیں گے جو سائے ہوئے گلابوں کے

یہ عمر جمع و تفریق کرتے گذرے گی
کہ دن تو زیست کے ہیں مسئلے حسابوں کے

صدائیں دیتا ہے پر سامنے نہیں آتا
یہ کون شخص ہے پیچھے چھپے حجابوں کے

صدائیں دیتی تھی بچوں کو راہ پھولوں کی
مگر وہ گم تھے صباؔ دشت میں نصابوں کے

بشیر بدر

چمک رہی ہے پروں میں اڑان کی خوشبو
بُلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو

خدا کا شکر ہے میرے جوان بیٹے کے
بدن سے آنے لگی زعفران کی خوشبو

بھٹک رہی ہے پُرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

سُنا کے کوئی کہانی ہمیں سُلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

دبا تھا پھول کوئی میز پوش کے نیچے
گرج رہی تھی بہت پیچوان کی خوشبو

عجب وقار ہے سوکھے سنہرے بالوں میں
اُداسیوں کی چمک زرد لان کی خوشبو

عمارتوں کی بلندی پہ کوئی موسم کیا
کہاں سے آگئی کچے مکان کی خوشبو

قیصر الجعفری

آسیب رہگزر کی کہانی طویل ہے
چھوڑو! مرے سفر کی کہانی طویل ہے

مٹی کی دیکھ ریکھ سے چولہے کی آگ تک
سوکھے ہوئے شجر کی کہانی طویل ہے

فرصت کسے کہ آکے پڑھے میرے بام و در
سب کے اداس گھر کی کہانی طویل ہے

پل بھر میں زخم، کوششِ درماں تمام عمر
قاتل سے، چارہ گر کی کہانی طویل ہے

سمٹوں تو ایک لمحے میں ہو جاؤں گوشہ گیر
پھیلوں تو بال و پر کی کہانی طویل ہے

غالب کا عہد ہو کہ مری شاعری کا دور
ناقدریِ ہنر کی کہانی طویل ہے

بھٹکا ہوں کتنی دیر تو پہنچا ہوں اپنے پاس
قیصر مرے سفر کی کہانی طویل ہے

فضا ابنِ فیضی

لفظ ہوں، تو نے مجھے بخشے معانی اے خدا
ہر ورق میرا ہے لوحِ آسمانی اے خدا
میں بھی ہوں صاحب کتاب اتنی اجازت دے مجھے
بات کرلوں تجھ سے تیری ہی زبانی اے خدا
رو برو تو آ! کہ ابھرے آئینے میں کوئی عکس
اپنے ہونے کی تو دے کوئی نشانی اے خدا
شعلہ شعلہ رکھ، مگر کچھ یوں، کہ پژمردہ نہ ہو
ہے جو پلکوں پر یہ برگِ خوش گمانی اے خدا
سخت ہیں موسم کے تیور، اور ایسے میں یہاں
میرے ذمے دشتِ جاں کی باغبانی اے خدا
میں عدم ہوں، تو وجود، اب جاکے یہ عقدہ کھلا
میری ہستی لامکانی، تو مکانی اے خدا
بندگی کا وہ تقاضہ تھا، کہ سب کچھ سہہ گئے
پوچھ مت، بارِ مشیت کی گرانی اے خدا
لوگ سوکھی ریت پر اب کشتیاں کھینے لگے
یہ بیاباں، اور دریا کی روانی اے خدا
آدمی ہے نخلِ ماتم یا بشارت کا شجر
چند سانسیں اور اتنی سرگرانی اے خدا
ہے تری حرف آفرینی سے فضاؔ بھی با ہُنر
ورنہ کیا اس کی زباں، کیا خوش بیانی اے خدا

میرے لئے بھی وہ کھُلے چہرے کی طرح تھی
کب آگہی اک بند صحیفے کی طرح تھی
میں جل کے ہوا راکھ، تو کیا پھول سا نکلا
کیا دُکھ کہ رفاقت تری شعلے کی طرح تھی
میں نیند میں تھا، پھر بھی سفر تھا تری جانب
دیوار بھی خوابوں کی، دریچے کی طرح تھی
کیا راستہ خوشبو کو دکھاتی، کہ ہوا بھی
خود شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح تھی
رکتا بھی کہاں میں کہ نئے دور کی منزل
سو موڑ بدلتے ہوئے رستے کی طرح تھی
لہجہ تو بہت روشن و شفاف تھا اس کا
صورت، کسی الجھے ہوئے فقرے کی طرح تھی
کیا شخص تھا، جب بولتا، لَو پھوٹنے لگتی
آواز، چمکتے ہوئے تیشے کی طرح تھی
اِک میری بصیرت ہے، کہ ہے گردشِ پرکار
اِک اس کی روایت تھی، کہ نقطے کی طرح تھی
میں اس سے بھی گزرا، جو غزل کی حدِ ابلاغ
تیرے لئے، ممنوعہ علاقے کی طرح تھی
قاری کوئی جس کا، نہ فضاؔ کوئی خریدار
ہستی مری اردو کے جریدے کی طرح تھی

عالتاب تشنہ

کبھی تو ختم یہ راہوں کے پیچ و خم ہونگے
وہ دن بھی آئیں گے جب منزلوں پہ ہم ہونگے

ہمارے ساتھ چلیں گے ہواؤں کے لشکر
سفر میں ہم بھی بگولوں کے ہم قدم ہونگے

ہنر ہمیں بھی تو آئے گا پیش بینی کا
ہمارے جام سفالیں بھی جامِ جم ہونگے

کبھی تو ہم بھی چلیں گے اٹھا کے سر اپنا
علم سپاہ ستم کے کبھی تو خم ہونگے

وہ انجمن ہو کہ مقتل وہ دار ہو کہ دیار
تمہارا ذکر رہے گا جہاں بھی ہم ہوں گے

چراغ جلنے نہ دیگی ہوائے تیرہ نژاد
یہ لگ رہا ہے اندھیرے کبھی نہ کم ہونگے

یہی پڑھا ہے کتابِ حیات میں تشنہ
قلم ہے جن میں وہی ہاتھ بھی قلم ہونگے

حدِ سفر کو سدِ سکندر کہا گیا
مجبوریٔ عمل کو مقدر کہا گیا
پانی کی وحشتوں کا بھنور نام پڑ گیا
دریاؤں کی لحد کو سمندر کہا گیا
سورج لہو ہوا تو شفق کی قبا کھلی
آغازِ شب کو شام کا منظر کہا گیا
ڈالے گئے شگاف دریچوں کے نام پر
دیوار کا تھا زخم جسے در کہا گیا
ذوقِ نمو کو صبح ازل نام دے دیا
جشنِ ظہور ذات کو محشر کہا گیا
تھی اپنی عیب پوشی کہ پوشاک بن گئی
تہذیب کا تھا جبر جسے گھر کہا گیا
خوش رفتگی کو سب نے قیامت سے دی مثال
پابستگاں کو سرو صنوبر کہا گیا

تشنہ تری غزل پہ یہ دادِ سخن شناس
سن کر ہر ایک شعر مکرر کہا گیا

ظفر گورکھپوری

میں جو کچھ چاہتا ملتا، سبھی کچھ مری خاطر تھا
مری خامی کہ نقلی زندگی جینے سے قاصر تھا

مجھے بستی کے سناٹے میں اکثر یاد آتا ہے
وہ بوڑھا شخص جو افواہ پھیلانے میں ماہر تھا

تو پھر یہ قاتلانِ وقت کس کو مار کر خوش ہیں؟
سُنا ہے وہ نہیں، اس کا بدن مقتل میں حاضر تھا

مجھے اِس جرم پر بدکار آوازوں نے پھانسی دی
میں کانوں سے پلٹ جانے والے سچ کا مُنکر تھا

اب اُس کا وقت ہے سونا بٹے گا کھاٹے کا موتی
غریبی اُس کی مجبوری تھی ورنہ کب وہ صابر تھا

ترازو جس کے قبضے میں تھا وہ تو خود غرض تھا ہی
یہاں جس کو طلب تھی منصفی کی وہ بھی شاعر تھا

ظفرؔ شیشہ گروں کو کس طرح میرا پتہ ملتا؟
میں وہ نایاب جوہر تھا جو چٹانوں میں مضمر تھا

دل کی زبان جاننے والے کے پاس جا
جو فلسفی نہ ہو کسی ایسے کے پاس جا

مقصد عزیز ہے تو سُلگ دل کی آگ میں
تشہیر چاہتا ہے تو چہرے کے پاس جا

بھائی! خلش بھی ملتی نہیں کچھ دیئے بغیر
ہو انگلیوں میں خون تو کانٹے کے پاس جا

قسمت کے ایک کھیلنے والے ہیں مختلف
تو میرے پاس آ کہ کھلونے کے پاس جا

آیا ہے جنم دن یہ اوڑھانے ہزار سال
مجھ میں کراہتے ہوئے لمحے کے پاس جا

آدرش پر جما ہوا گرد و غبار دیکھ
چوراہے پہ کھڑے ہوئے پتلے کے پاس جا

جب ہونٹ منجمد ہوں تو مسکان سیکھنے
چٹان پہ اُگے ہوئے سبزے کے پاس جا

سانپوں نے ڈس لیا نہ بالآخر تجھے ظفرؔ
کس نے یہ رائے دی تھی دفینے کے پاس جا

سیف ز بسارلی

اب تو خواب راحت سے کوئی دیدہ ورجاگے
باغ میں کھلی نرگس، سیپ میں گہر جاگے

دل دماغ دونوں ہی شب سے تا سحرجاگے
کچھ سوال آنکھوں میں رات رات بھرجاگے

اس حسین لمحے کو نام کیا دیا جائے
لے کے جب اک انگڑائی فکر معتبر جاگے

یک بیک ہوا سنکی، رات کا فسوں ٹوٹا
صبح کی کرن پھوٹی تتلیوں کے پر جاگے

کون آج گذرا ہے کیوں زمیں کا دل دھڑکا
دیر تک فضا مہکے ساری رہ گذر جاگے

تھک کے سو رہے تھے جو فکر وفن کے دیوانے
میرے نام پر چونکے مجھ کو دیکھ کر جاگے

ہے یہی دعا میری منزلِ فرائض میں
قلب ناتواں میرا سیف عمر بھرجاگے

سحرسعیدی

املاک وزر بڑھائیے تب پوچھتے ہیں لوگ
ورنہ فقیرِ شہر کو کب پوچھتے ہیں لوگ

وہ پاس تھے تو مجھکو زمانے کا ڈر نہ تھا
اب دور ہو گئے تو سبب پوچھتے ہیں لوگ

کرب و بلا میں کون مرا ہمرکاب تھا
کس منہ سے مجھ سے جینے کا ڈھب پوچھتے ہیں لوگ

کس کس کو اب میں اپنے غموں کا حساب دوں
پرسش نئی سوال عجب پوچھتے ہیں لوگ

ماضی کی چھان بین کی عادت نہیں مجھے
کیوں مجھ سے میرے غم کا سبب پوچھتے ہیں لوگ

اب کیا بتاؤں دل پہ گزرتی ہے کیا سحر
غمگین کیوں ہے شام طرب پوچھتے ہیں لوگ

صفدر سعید

بیتی صدی کی یہ بھی روایات ہو گئی
ناکامیوں کی شام مرے ساتھ ہو گئی

جلتے ہوئے نگر کی کہانی سناؤں کیا!
ہونٹوں پہ دل کی آہ مناجات ہو گئی

رشتہ تھا گہری پیاس کا ہم سے بندھا ہوا
پھر راستے الگ تھے جو برسات ہو گئی

اس نے جو پوچھا حال تو آنسو نکل پڑے
کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا مگر بات ہو گئی

بھٹکا ہوا سراب تھا جامد تھی ہر نگاہ
صحرا کو کیا خبر کہ کیسے مات ہو گئی!

نشے کی دھند راہ میں آکر بکھر گئی
یہ زندگی بھی جیسے خرافات ہو گئی

کھڑکی دریچے بند کئے سو رہے ہیں لوگ
شاید کہ دن یہ ختم ہوا، رات ہو گئی

مل کر بھی اس سے مل نہ سکا مات ہیں سعید
رخصت ہوئے تو جیسے ملاقات ہو گئی

اظہار مسرت

کون منزل کا پتہ دے گا مجھے
یہ سفر شاید تھکا دے گا مجھے

بغض و نفرت، سختیاں دار و رسن
جذبۂ بے باک کیا دے گا مجھے

جس نے قتل عام بستی میں کیا
کیا وہ قاتل خوں بہا دے گا مجھے

آئے گا اک دن فرشتہ موت کا
زندگی کا واسطہ دے گا مجھے

ٹھوکریں کھانا، سنبھلنا، دوڑنا
وقت خود ہی سب سکھا دے گا مجھے

مصلحت کی آندھیاں زوروں پہ ہیں
ظرف کب تک آسرا دے گا مجھے

رنج و غم، جذب مسرت، بے حسی
جانتا ہوں کون کیا دے گا مجھے

ارتضیٰ نشاط

جب کبھی سوچئے خدا کیا ہے
ابتدا ہے نہ انتہا کیا ہے

ہے زمیں آسماں کے نیچے کیوں
آسماں اس زمیں پہ کیا کیا ہے

اک پریشان موج اِک چٹان،
یہ سمندر بہت بڑا کیا ہے

رنگ کی ایک لہر کیا شے ہے
ایک جھونکا ترنگ کا کیا ہے

کیوں ہے رسّی بٹی ہوئی سن کی
ریشہ ریشہ بندھا ہوا کیا ہے

کس نے رکھا ہے زندگی میں حساب
لفظ کتنے کہے، سُنا کیا ہے

ڈھونڈتی ہے نظر عدالت کی
چور عجلت میں چھوڑتا کیا ہے

شعر وہ جو نیا لگے ہے مجھے
وقت پر کچھ کہا لگے ہے مجھے

ختم ہوتا ہوا لگے ہے مجھے
آج پھر دن بڑا لگے ہے مجھے

کیسی بھگدڑ مچی ہے دنیا میں
ریت میں سر چھپا لگے ہے مجھے

آ گیا ہوں بہت بلندی پر
بس مخالف خدا لگے ہے مجھے

جیسے کولہو کا بیل چکرائے
ہر قدم ایک سا لگے ہے مجھے

جیسے دنیا جہان سے بیزار
جیسے سب کچھ بُرا لگے ہے مجھے

دانت پیسوں مگر نہ بولوں کچھ
حد نہیں انتہا لگے ہے مجھے

شفیق عباس

یہ موت کرتی مجھے مات، کہاں مشکل تھا
کہ زندگی میں ہمیشہ میں خود سے غافل تھا
بدل دی شکل تمنا کی تیشہ گاہی نے
بڑھے قدم تو سمندر تمام ساحل تھا
تڑپنے والا تماشا بھی بن نہیں پایا
کہ ایک لمحۂ مہلت بھی کس کو حاصل تھا
بلا سبب تو نہیں کائنات زندہ تھی
ہر ایک شے میں دھڑکتا ہوا مرا دل تھا
مگر وہ شخص مجھے کتنا اجنبی سا لگا
کوئی تو اور نہیں آئینہ مقابل تھا

شفیق تھا سبھی کل دعوے ہمہ دانی
پڑھے لکھوں میں وہی ایک شخص جاہل تھا

میں نہیں تنکا کہ مجھ کو یوں بہالے جائے گی
ہاں مگر آوارگی کچھ اور ابھی بھٹکائے گی
اب بھی موقع ہے کہ مت اظہار کے چکر میں آ
اے تمنا دیکھ ساری عمر تو پچھتائے گی
لے صف آرا ہو گیا تیرے مقابل زندگی
ایک لمحہ بھی سکوں کا اب نہیں تو پائے گی
مت ہراساں ہو جو میں نے دم نہیں توڑا تو کیا
گھر پہ تیرے نام کی تختی بگر لگ جائے گی
میں تو ہوں موجود لیکن خود کو کر آیا ہوں گم
دل کی دھڑکن سانس کا میری پتہ کیا پائے گی
میں نہ کہتا تھا زیادہ قرب بھی اچھا نہیں
پھینک آئی دور دونوں کو ہی یہ ہمسائیگی
زندگی تیرا مقدر رونا ہی ہے فقط
کیا کوئی میرا مقابل عمر بھر تو پائے گی

سانپ ہے بیٹھا ہوا دل کے خزانے پر شفیق
کیفیت کوئی نہ اب سینے سے باہر جائے گی

یوسف خلشؔ

عجب اِک شعبدہ دِکھلا گیا ہے
مداری شہر پہ چھایا ہوا ہے

جہاں سے سوچ کے رستے بھی گم ہیں
کوئی اس موڑ پہ ٹھہرا گیا ہے

نشاں قدموں کے چھوڑے جا رہا ہوں
مرے پیچھے بھی کوئی آ رہا ہے

دعائیں عمر کی اور آفیت کی،
خدا کے نام پہ کیا کیا ملا ہے

تصوف کے مسائل میرے آگے
گماں لوگوں کو مجھ پہ کیا ہوا ہے

اگر ہو گئی بحث جھوٹا پڑوں گا
ہمارے درمیاں بس اِک خدا ہے

لہو تھوکا خلشؔ نے شعر کہہ کر
کہ جوئے شیر جھوٹا واقعہ ہے

غزل کی جان تک میں بھی گیا ہوں
نئے رجحان تک میں بھی گیا ہوں

مری فطرت برائی جھوٹ قسمیں
خدا قرآن تک میں بھی گیا ہوں

علاجِ درد کی خاطر نگر میں
ہر اک دوکان تک میں بھی گیا ہوں

تعقب میں مرے پیچھے رہ روی تھی
حدِ امکان تک میں بھی گیا ہوں

خطا لوگوں کی ہنس کر بخش دی ہے
خلشؔ عرفان تک میں بھی گیا ہوں

شمیم طارق

ابھی سوال کی منزل میں ہے جواب کی راہ
غلام ذہن سے پھوٹے گی انقلاب کی راہ

اگرچہ راہ سے واقف نہیں ہے پورا ہا
اسی کے بیچ سے نکلے گی انتخاب کی راہ

تو اپنے عہد کا سقراط ہے تو زہر بھی پی
کہ تلخ گھونٹ کو کہتے ہیں احتساب کی راہ

خرد کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے کیسے
پلٹ چلو، جو ملے کوئی اجتناب کی راہ

حضورِ حسن میں دامن بچا بچا کے نہ چل
کہ چھیڑ چھاڑ سے کھلتی ہے انتساب کی راہ

نیاز و ناز کے ہر موڑ سے گذرتی ہے
شباب و شعر کی دنیا خیال و خواب کی راہ

ہمارے بیچ نہیں قدرِ مشترک طارق
الگ الگ ہے زمیں اور آفتاب کی راہ

ظہیر انور

وہ موم بن کے یوں تو پگھلتا ہے آج بھی
اک خوف دل کے گوشے میں پلتا ہے آج بھی
اترے تھے ہم جو گہرے سمندر میں ایک دن
صحرا میں یاد کے وہ ابلتا ہے آج بھی
آنگن وہ اور ہوگا جہاں ہنس رہا ہے چاند
سورج تو میرے گھر میں نکلتا ہے آج بھی
ملبوس خواہشات کا پہنا تھا جو کبھی
وہ ساتھ میری روح کے جلتا ہے آج بھی
جو ہر شناس کوئی نظر ہی نہیں رہی
ورنہ وہ سانپ ہیرے اگلتا ہے آج بھی
سب کچھ ہوائے تند اُڑا لے گئی، مگر
آنکھوں میں ایک خواب مچلتا ہے آج بھی

کیا کیا نہ کہہ گیا تھا ظہیر اختلاف میں
لیکن وہ ہاتھ اکیلے میں ملتا ہے آج بھی

کنول پرشاد کنولؔ

کہاں کہاں نہ اُسے ڈھونڈتا خیال گیا
وہ پات پات چھپا ہے یہ ڈال ڈال گیا

تھا ڈھیر راکھ کا دل عشق کی تپش کے بغیر
تمہارا غم اسے کندن میں جیسے ڈھال گیا

کل ایک قطرہ سرِ بزم آ کے پلکوں پر
وفورِ درد میں پگڑی مری اچھال گیا

نہ پھینک طنز کے پتھر خلوص کے دل پر
وہ آئینہ ہے یہ، آیا جو اس میں بال گیا

ہمارے بعد عدو بھی کہیں گے مل کر ہاتھ
دکن کی خاک سے اک صاحب کمال گیا

نظر ملی تھی تو طوفاں بھی گر رہے تھے کنولؔ
نظر چرا کے وہ کس بل مرا نکال گیا

ایم۔ آر۔ قاسمی

رفتہ رفتہ یار سارے دور ہوتے جائیں گے
ہم بھی اوروں کی طرح بے نور ہوتے جائیں گے

جن دنوں آغاز ہوگا میری آنکھوں کا زوال
شہر کے منظر بڑے بھرپور ہوتے جائیں گے

ان چراغوں کا مقدر چند ساعت روشنی!
آندھیاں آئیں گی یہ بے نور ہوتے جائیں گے

جب بڑھے گی قحط سالی اور سوکھیں گے گلاب
ابر جاں پرور ہمیں منظور ہوتے جائیں گے

"لوحِ امکاں" پر نظر آئیں گے کچھ مبہم خطوط
حرف روشن آنکھ سے مستور ہوتے جائیں گے

زاھد کمال

عقل کی انتہا کر دے نہ سمندر خالی
مچھلیوں سے کہیں ہو جائے نہ منظر خالی

اپنے خوابوں کو اجازت دے کہ آنکھیں ہوں نہال
دیکھ کب سے ہے مری نیند کا بستر خالی

شاخ سے مصلحتاً رشتہ ہے ہر پنچھی . . . کا
جب خزاں آتی ہے کر دیتے ہیں یہ گھر خالی

کامیابی نہ ہوئی اسکے بھلانے میں مجھے
کر دیئے کتنے مئے تند کے ساغر خالی

نئے سنگ ملامت سے ہیں اس کی خوشی
اُسکو افسوس نشانہ گیا کیونکر خالی

اک ادھورے سے بھی سپنے کی نہ خیرات ملی
چشم امید کا کاسہ رہا شب بھر خالی

ھارون فراز

خاروں سے چبھن لے کر زخموں سے جلن لیکر
ہم آئے ہیں منزل تک صدیوں کی تھکن لیکر
اڑ جائیں گے پل بھر میں رنگوں کا بھروسہ کیا
اِتراؤ نہ محفل میں تتلی سا بدن لیکر
صحرا کی تپش پی لیں جلتے ہونٹوں سے
بے سایہ درختوں کا کیا ہوگا چمن لیکر
اغیار کے قدموں پر کرتے ہیں وہی سجدے
جو آئے تھے دنیا پہ چھا جانے کا فن لیکر
ساحل کا پتہ دیگی ہر موج سمندر کی
کشتی کو بڑھاؤ تو سینوں میں لگن لیکر
کچھ لوگ بصارت کے بازار سجائیں گے
دہلیز سے سورج کی دھندلی سی کرن لیکر

آئینہ صفت لوگو! اے کاش بتا دیتے
کس وقت فراز آئے ماتھے پہ شکن لیکر

احسن نشاط

ہر ایک ذرہ یہاں کیوں گہر سا لگتا ہے
مجھے یہ اپنا زوالِ نظر سا لگتا ہے

مٹا رہا ہوں سبھی ہاتھ کی لکیروں کو
نہ جانے کیوں مجھے اب ان سے ڈر سا لگتا ہے

وہ آئے گا مری تنہائیوں کی باہوں میں
یہ آسرا ہی مجھے اپنا گھر سا لگتا ہے

یہ کھو ہی جائے گا خوش فہمیوں کے جنگل میں
مرا وجود بھی بے بام و در سا لگتا ہے

میں سوچتا ہوں کہیں میرا ساتھ چھوڑ نہ دے
یہ راستہ جو تمہاری ڈگر سا لگتا ہے

اسے بھی دیکھا ہے خنجر خریدتے میں نے
وہ آدمی جو بہت معتبر سا لگتا ہے

وہ لمحہ خون کے آنسو رلائے گا اک دن
جو لمحہ تم کو ابھی بے ضرر سا لگتا ہے

نشاطؔ جس میں کسی خوبرو کا عکس پڑے
وہ آئینہ مرے دل کا نگر سا لگتا ہے

شعلے نہ کہیں نکلیں لفظوں کے دہانوں سے
تم آگ نہ برساؤ کاغذ کے مکانوں سے

کیوں وعدوں کی سولی پہ مجھکو بھی چڑھاتے ہو
خود قتل نہ ہو جاؤ اپنے ہی نشانوں سے

امیدوں کے بادل سے رم جھم کی صدا آئی
شاید کہ گرے جھمکے اس شوخ کے کانوں سے

جذبات سلگتے ہیں جب بھیگتے لمحوں میں
وہ سامنے آتے ہیں کتنے ہی بہانوں سے

جگنو کی چمک لائی، پھولوں کی مہک لائی
کچھ ایسی دعا اٹھی تسبیح کے دانوں سے

مشہور فسانوں میں کیا ڈھونڈھ رہے ہو تم
نکلیں گے حسیں خاکے گمنام فسانوں سے

سچ کہہ دے نشاطؔ آخر کس آگ میں جلتا ہے
اک آنچ سی آتی ہے کیوں تیرے بیانوں سے

فصیح اکمل

وہ حرف رنگ ہے اور اسکی جستجو میں ہوں
تو وہ نہیں ہے خود اپنے ہی روبرو میں ہوں

یہ تشنگی کا سفر بھی عجب سفر نکلا
سراب جسم میں تیغ لہو لہو میں ہوں

وہ لفظ لفظ کو پیکر کا رنگ دیتا ہے
وہ خواب خواب تماشائے آرزو میں ہوں

جو ہو سکے تو زمانے پہ مجھکو ظاہر کر
ترے لئے تو ابھی نغمہ در گلو میں ہوں

ترے بدن کو مرا لمس کھول دیتا ہے
تو صاف کہہ کہ تری صبح آرزو میں ہوں

کبھی تو دل کے دریچے کو نیم وا کر دے
ترے ہی نام پہ آواز کو بہ کو میں ہوں

یہ عہد کافی ہے بس آنکھ بند ہونے تک
تو میرا ذہن ترے جسم کی نمو میں ہوں

دل میں کوئی چور نہیں تو ہم سے کیوں شرماؤ ہو
آنکھوں سے آوازیں دو ، ہو پاس آتے گھبراؤ ہو

کیسے کیسے خواب دکھائے ترک طلب کی الجھن بھی
خود ہی ہم سے چھیڑ کرو ہو خود ہی پھر پچھتاؤ ہو

پیروں میں زنجیر تعلق آنکھوں میں پرواز کے خواب
کھلی فضا میں اڑتے کبوتر دیکھ کے بس رہ جاؤ ہو

چہرے کی رعنائی سلامت، حسن اور غمخوار بہت
مجھ سے تعلق ٹوٹ گیا تو سب سے کیوں کتراؤ ہو

اکملؔ صاحب دل کو تمہارے جلنے کیا روگ لگا
دن بھر محفل محفل چمکو شام پڑے بجھ جاؤ ہو

ناصر شکیب

ہوا میرے لئے اک بار جانا
مجھے لے کر سمندر پار جانا

ہوا داخل تو دیکھا سب عجب تھا
بدن کے دست کو بے کار جانا

جہاں لگنے لگی ہے مہر تصدیق
وہیں پر لمحۂ انکار جانا

اُداسی عمر بھر دیکھی نہ میں نے
کہ اک لمحہ نہ تھا بیزار جانا

کوئی موقعہ نہیں ہے جینے کا
طلب کے کھیل میں بس ہار جانا

سمجھ میں آ رہی ہیں ساری چالیں
نہیں دشوار سب کچھ ہار جانا

بس اتنی اہمیت لہجے کو دی ہے
بیاں میں اس کو اوچھا وار جانا

غزل اِک آگ کا دریا ہو ناصرؔ
ضروری ہے مرا اس پار جانا

ثریا رحمٰن

کوئی جادہ ہی نہیں منزل جاناں کیلئے
کیا مداوا کریں اب گردش دوراں کیلئے

کیا درِ توبہ کھلے گا کہ تری رحمت آج
خود بھٹکتی ہے مرے دامنِ عصیاں کیلئے

خود بخود اب تو سنور جائے گا حسنِ گیتی
جانے کب جھوم کے برسے گا ترا ابر کرم

کتنے گلزار ترستے ہیں بہاراں کیلئے
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ بھلا کیا سمجھیں

کس قدر الجھنیں ہیں آج کے اِنساں کیلئے
تشنگی کم نہ ہوئی رہ کے سمندر میں بھی

کیوں صدف پیاسا ہے اِک قطرۂ نیساں کیلئے

کون کہتا ہے کہ منہ دیکھے سے آئی رونق
ہم لہو روئے ہیں اِک چہرۂ شاداں کیلئے

نیاز اعظمی

جب سبھی اہلِ نظر عکسِ نظر کھو جائیں گے
حادثوں کی دھند میں دیوار و در کھو جائیں گے

تتلیوں کا رنگ پینے جب خزاں آ جائے گی
دیکھتے ہی دیکھتے شاخ و ثمر کھو جائیں گے

رقعۂ نفرت پہ جب اک نام لکھا جائے گا
تب ہر اک تحریر کے زیر و زبر کھو جائیں گے

اونچی اونچی بلڈنگوں کے سائے بڑھتے جائیں گے
رفتہ رفتہ شہر کے سارے کھنڈر کھو جائیں گے

زندگی کے بحر کی لہریں فنا ہو جائیں گی
وقت کی باہوں میں کتنے ہی بھنور کھو جائیں گے

کچھ نشانی چھوڑ دیں راہِ وفا میں اے نیاز
ہم نہ جانے زیست کے کس موڑ پر کھو جائیں گے

حفیظ مومن

لہو کا ذائقہ زہراب میں ہے
ہمارا تذکرہ ہر باب میں ہے

ابھی چھایا ہے آنکھوں پر اندھیرا
ابھی تک ایک عالم خواب میں ہے

کسی آسیب کا سایہ ہے اس پر
کنول کا پھول جس تالاب میں ہے

ادھر کچھ سوچ میں سفاک سارس
ادھر چالاک مچھلی آب میں ہے

کسی نے چوٹ کی ناگن پہ ایسی
کہ سارا جسم پیچ و تاب میں ہے

بھلے کہتا ہے مجھ سے شعر مومن
مرا دشمن مرے احباب میں ہے

اِمکان

کے بارے میں، آپ کی
رائے کا ہمیں انتظار
رہے گا

اِمکان
مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادیمی
۱۸واں منزلہ نیو ایڈمنسٹریٹیو
بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۳۲ -

جگن ناتھ آزاد

جوش ملیح آبادی کے نام

جانے والے! تیری بزمِ دوستاں تیرے بغیر
ایک کشتی ہے کہ ہے بے بادباں تیرے بغیر

اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ہے آئی ہوئی
نغمہ آرائی کے گلشن میں خزاں تیرے بغیر

تو کہاں ہے اے امیرِ کاروانِ ذوق و شوق
کس طرف کو جائے تیرا کارواں تیرے بغیر

کیا کہوں دہلی میں کتنی نامکمل رہ گئی
محفلِ شعر و سخن کی داستاں تیرے بغیر

رات کی اِک محفلِ یاراں کا قصہ کیا کہوں
بن گئی پانی شرابِ ارغواں تیرے بغیر

جانے والے! آج تیری محفلِ شعر و سخن
ایک محفل ہے کہ ہے بے روح و جاں تیرے بغیر

اپنی منزل کی طرف کیسے چلے کیونکر چلے
کارواں تیرا امیرِ کارواں تیرے بغیر

تیرے ہونے سے کبھی جس کا خیال آیا نہ تھا
اب مکمل ہے وہ احساسِ زیاں تیرے بغیر

آشنا جو شادمانی سے ہوئی تیرے طفیل
ہو نہیں سکتی وہ محفل شادماں تیرے بغیر

میں کہ تھا بزمِ سخن کی جان، اب میرے لئے
شرکتِ بزمِ سخن ہے امتحاں تیرے بغیر

اب ہماری نثر کی تصحیح فرمائے گا کون
مطمئن کیسے ہو یہ شوقِ بتاں تیرے بغیر

شعر کے کتنے محاسن تھے برافگندہ نقاب
اب وہی جلوے ہیں پھر سرِ نہاں تیرے بغیر

تیرے جانے سے دلِ شعر و سخن افسردہ ہے
نثر کے لب پر ہے آوازِ فغاں تیرے بغیر

کھولتی رہتی تھی جس کو تیری گفتارِ جمیل
کون کھولے گا وہ اب رازِ نہاں تیرے بغیر

اے ہمائے اوجِ معنیٰ! طائرِ شاخِ خیال
آج ہے ویران تیرا آشیاں تیرے بغیر

تو بھلا بیٹھا ہمیں، ہم کو نہیں شکوہ مگر
ہم نہیں دلشاد یارِ مہرباں تیرے بغیر

جوش ملیح آبادی

درسِ فراموشی

جوش کی نظم غیر مطبوعہ ہے اور تبرکاتِ جوش کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم نہ ان کے کسی مطبوعہ مجموعہ کلام میں شامل ہے اور (غالباً) نہ ان کی کسی بیاض میں ۔ یہ نظم یکے از نوادرِ جوش ہے۔

(جگن ناتھ آزاد)

جو کڑکتی تھی سرِ دیو شقاوت پر کبھی
اے رفیقِ سرو قامت! اُس کمال کو بھول جا

لرزہ براندام تھا جس سے غرورِ خسروی
اُس بہادر شاعرِ ہندوستاں کو بھول جا

جس کی ہر موجِ نفس تھی صد پیامِ انقلاب
بن پڑے تو اب اُس آشوبِ جہاں کو بھول جا

اے جگن ناتھ! اے جوانِ مخلص و آزادہ رو
ایک دور افتادہ پیرِ ناتواں کو بھول جا

اے گلِ شاداب! برگِ زرد کا ماتم نہ کر
اے بہار آسودہ پامالِ خزاں کو بھول جا

اب کلاہِ ناخدائی کج کر اپنے فرق پر
بازوے ملاح و موجِ بادباں کو بھول جا

اپنے سر پہ باندھ دستارِ امیرِ عود و چنگ
تاجِ میر حلقۂ رامش گراں کو بھول جا

شمعِ ایوانِ طرف کو گل ہوئے مدت ہوئی
سوزِ حرفِ جشن و سازِ نغمہ خواں کو بھول جا

یاد محرابِ گل افشاں میں نہ ہو یوں اشکبار
زلفِ لیلائے سخن کے سائباں کو بھول جا

اب جسے ٹھہرا چکے ہیں جرم اربابِ جفا
تجھ سے ممکن ہو تو اُس اردو زباں کو بھول جا

شہریارِ کشورِ اشراق دستی کو نہ ڈھونڈ
خوابِ کیف و خیمۂ روحانیاں کو بھول جا

الاماں احساسِ بربادیٔ آل و خاندان
اس ہلاکِ صید و آلِ خانداں کو بھول جا

دیکھ ان نوخاستہ زندوں کا سودِ مستقل
اے مرے دوست! ایک مردِ بے زیاں کو بھول جا

باغ کی ان تازہ دم چٹکی ہوئی کلیوں کو دیکھ
باغباں کی زندگی کیا باغباں کو بھول جا

اب نہ رکھ امید سیرِ معجزاتِ زندگی
شامِ خور افشان و شیبِ نوجواں کو بھول جا

نوعِ انسانی کے مل جائیں گے صدہا خیرخواہ
اک رفیقِ دوستاں و دشمناں کو بھول جا

حسن کی جو کان تھا اُس دیدہ ور کو محو کر
باغ کی جو آن تھا اس آشیاں کو بھول جا

شمع پر خود فرض تھا جس کا طواف متصل
اپنے اس پروانۂ آتش بجاں کو بھول جا

حسنِ یوسف خود خریداری کو آتا تھا جہاں
رنگ ہائے نوبہ نو کی اس دکاں کو بھول جا

حسن کو ملتا تھا رنگِ خواب جس کی تاب سے
عشق کی اس قوس کو، اس کہکشاں کو بھول جا

بخشتی تھی قامتِ خوباں کو جو تشریف ناز
شعر کی اس کارگاہِ پرنیاں کو بھول جا

جس میں جولاں تھا سرودِ زندگی کا سوز و ساز
اُس حدیثِ نفس کو اُس داستاں کو بھول جا

جس پہ رقصِ دلبراں تھا جس پہ لحنِ مطرباں
اُس زمیں کو بھول جا اُس آسماں کو بھول جا

سینۂ ہندوستاں میں جو دھڑکتا تھا کبھی
اے دلِ آفاق! اس قلبِ تپاں کو بھول جا

شام جب ژولیدہ موتھی صبح جب آئینہ رو
اُن دلوں کو، اُس فضا کو اس سماں کو بھول جا

عکس جس پر ڈالتا تھا مہ وشوں کا بانکپن
جوئے دل کی اس خمِ آبِ رواں کو بھول جا

جانتا تھا جو مقاماتِ حدیثِ دیگراں
اُس امانت دارِ سترِ دلبراں کو بھول جا

خوش نواں مرغانِ دہلی کی نواسنجی پہ جھوم
لکھنؤ کے طوطیِ شکر فشاں کو بھول جا

اپنے دیپک سے جلاتا تھا جو کعبے کے چراغ
دیر کے اُس روح پرور نغمہ خواں کو بھول جا

گوش بر آواز رہتا تھا خدا جس کے لئے
اپنے اس آوارہ کوئے بتاں کو بھول جا

طاقِ زر! اپنے چراغِ مردہ کا ماتم نہ کر
ہند! اپنے شاعرِ جادو بیاں کو بھول جا

دیدۂ یعقوب! جنسِ رفتہ پر گریاں نہ ہو
شہرِ کنعاں! یوسفِ بے کارواں کو بھول جا

اے درخشاں میکدے! جام و سبو کو توڑ دے
اے گل افشاں مغ بچے! پیرِ مغاں کو بھول جا

اب جو گہوارہ ہے تیرے دشمنانِ نطق کا
جوش تو بھی اُس دیارِ دوستاں کو بھول جا

(فروری ۱۹۵۶ء)

قمر ہاشمی (پاکستان)

گوتم بدھ کا مجسمہ دیکھ کر

مہاتما گوتم بدھ پر طویل و فکر انگیز نظم "نروان ساگر" سے اقتباس



وہ ایک برگد کا پیڑ جس کی
گھنی گھنی سایہ دار شاخیں
غصیلے سورج کی برچھیوں کے
ہزارہا وار سہ چکی تھیں
یہ اپسراؤں کی طرح ٹھنڈی
ہزار بے خواب آنکھیں
جن سے تھیں نزہہریری
یہی درختِ خجستہ سایہ ہے
جس کے سائے میں
روح کو شانتی ملی تھی

عظیم اپدیشک آدمی کی سمانتا کا
اسی پرانے درخت کی چھاؤں میں
بدن کی طلب کے سارے عذاب تج کر
مہیب آفات سال و سن
موسمی شدائد کی شکل میں
جھیلتا رہا تھا

پیمبرانہ شکوہ میں بھی
وہ آدمی تھا
وہ اک صداقت کی روشنی تھا
وہ اک حقیقت اگر نہ ہوتا
تو آج لاکھوں کروڑوں آنکھوں کا
نور بن کر نہ یوں دمکتا

مجسمے پر نگاہ ڈالو

وہ زندگی کی لچکتی بانہوں میں
پتھروں کا لباس پہنے
فنا کو روکے ہوئے کھڑا ہے
وہ اک تبسم
جو من مدھرتا کی چاندنی تھا
لبوں پہ آکر ابد ہوا ہے

یہ زندگی اک عذابِ جاں ہے
جو راس آئے تو پھول ہی پھول
روٹھ جائے تو
سخت بھاری چٹان، مشکل سے اُٹھنے والی
کبھی تو محسوسِ جاں کچھ ایسی
بنفشئی سُرمئی بسنتی
دھنک دھنک پیکروں میں ڈھلتی
کبھی خود اپنے وجود سے آدمی کو
نفرت دلانے والی
کچھ اتنی مبہم ——— فضائے مبرم

ہزار گرہیں نہ کھلنے والی
گزرتے لمحات شب کی تاریکیوں میں
دیوانہ خواب دیکھے تو چونک جائے

شریر[1] مٹی ہے
اور مٹی سے کیسی نفرت
یہ آدمی کا ازل سے رشتہ
ازل روایت ہے آدمی کی
شریر چھیلے تو بوئے گل ہے
شریر بکھرے تو
لالہ و گل میں ہو نمایاں
انھی بہاروں سے ایک دوجا شریر اُبھرے

بدن ہی دنیا بدن ہی دیں ہے
بدن ہی اس کائنات کا روز اوّلیں ہے
بدن ہی عادی ہے کلفتوں کا
بدن ہی موجد ہے لذتوں کا
بدن ہے زہراب کا پیالہ
بدن ہے تریاق کا نوالہ
بدن کو کاغذ پہ جب اُتارا
تو اس کی باقی رہی ہے مستی
بدن نے پتھر کا روپ دھارا
تو اور دونی ہوئی ہے شکتی

---

[1] جسم

ترا وشِ فکر ہو تو دنیا کی اس حقیقت سے
کون صرفِ نظر کرے گا

بدن وہ کشور ہے
جس کا سرتاج بھی بدن ہے
کبھی ہمالہ کی گود کسے
'سوریہ ونشی'، لوگوں کو تم نے دیکھا
کہ ہر بدن جشنِ آفتابی

چھٹی صدی[1] پیش ابن مریم کی دھول
میری نظر کے آنگن میں
ناچتی ہے
یہ دھول جس کا ہر ایک ذرہ تھا
روکشِ آفتابِ ہستی
یہ ذرہ مہر و مہ ستارہ کو آب دیتا
یہ ذرہ ہر دستِ آگہی کو کتاب دیتا
گھروں کی تابانیاں اسی سے
وجود کی شادمانیاں اسی سے
یہی اگاتا رہا سکون و طرب کی فصلیں
اسی نے کاٹی ہیں کتنی صدیوں تک
ظلمتِ روز و شب کی فصلیں
خرد کے ناقوس پر اسی نے
بہت سنی ہے نوائے گوتم

---

[1] ۵۶۳-۴۸۸ ق م (از منۂ گوتم)

یہی پشیمانیوں کے لمحے میں بن گیا تھا اشوک[1] کا غم

وہ سرد لاشے
جو زندگی کی امنگ رکھتے تھے
زعم شاہی کے راستوں پر
زمیں کی خوراک بن چکے تھے
اگرچہ گوتم کا فلسفہ تھا
کہ بطنِ گیتی سے جو بھی آئے
وجود اس کا ہو فخرِ گیتی
ہزار عزّ و شرف کا مالک
حیات کی چیرہ دستیوں کا شکار کیوں ہو
حسب نسب (ذات پات) بھارت میں
جبرِ تاریخ بن گئے تھے
زمیں کے روئیدہ خاک در خاک
نسلِ برتر کے مدّعی ہو کے
آسماں زاد بن رہے تھے

وہ دیوتاؤں کے نام پر بھی
دکاں اساطیر کی سجائے رہے ہمیشہ
کبھی خداؤں کے نام پر
خواجگی کی غیرت جھنجوڑتے تھے
کبھی وہ اگنی کی بھینٹ لیتے تو آتما اور شریر کے
شہد و سم کی ساری حلاوتیں زہرناکیاں بھی

---

[1] سمراٹ اشوکِ اعظم

بجُوڑ لیتے
کبھی وہ انسان کی عقیدت سے کھیلتے تھے
کبھی وہ عورت کے جذبۂ مہر و حسّ نفرت سے کھیلتے تھے
کبھی خود اپنے عناد کی آگ وہ جلاتے تو
سالہا سال تک بھڑکتی
شجر حجر اور شجر حجر کے تمام عقیدے
جو ذہنِ انساں میں کتنی صدیوں سے پل رہے تھے
اسی الاؤ میں راکھ کا
ڈھیر ہو رہے تھے

ضعیف العمری تھی ایک پھندا
برہنگی، بھوک، شامِ غربت، عذابِ جاں تھیں
مشقّتِ جسم احتیاج و طلب کے بدلے
شدید ضربوں کے نیل پاتی
شقاوتوں کے یہ مُستبد ضابطے
غرورِ شہی کی پیشانیوں سے پھوٹے
عدالتِ خسروی کا زندانِ مردم آزار بے کراں تھا

اک آدمی جو محل کی آسائشوں کا خوگر تھا
تخت و تاجِ شہی کو ٹھکرا کے
آدمی کے سکوں کی خاطر
محبّتوں کی شفیق نورانی چادر اوڑھے
برابری، عدل شوقِ، ایثار کی کرامات لے کے اُٹھا
وہ روشنی تھا تو روشنی پھیلتی تھی اس سے
ادائے مہر و محبت و سر نہادگی نے

بنا دیا اُس کو ایک طاقت
وہ ناصبور آدمی کے صبر و شکیب کی
بن گیا علامت

سنا ہے اک رات
خوابِ راحت سے گوتم اٹھا تو اس نے سوچا
نجات کا راستہ یہی ہے کہ
عارضی راحتوں کو تج دوں
محل کی یہ رات واپسیں ہو
اب آنِ واحد میں عشرتوں سے کنارا کر لوں
قدم اٹھائے تو لغزشِ پائے راہ روکی
فرار چاہی تو جادۂ شوق نے صدا دی
نظر اٹھائی تو راہل[1] آغوشِ مہرِ مادر میں سو رہا تھا
قدم بڑھاتا وہ خوابگاہِ شہی سے نکلا تو
اس نے ماں باپ کی محبت سے منہ کو موڑا
بہار آغوشِ نازنیں[2] کو بستر پہ چھوڑا
محل کے دروازے خود بخود کھل گئے
نگہدار چشمِ حیراں بنے ہوئے تھے

محل سے نکلا تو چترِ شاہی ـــــ نہ لاؤ لشکر
وہ اپنے افکار و فلسفہ کا
بس ایک تنہا رفیق و رہبر
نہ خواہشیں ہم رکاب اس کے

---

[1] گوتم کا بچہ [2] گوتم کی دھرم پتنی یشودھرا (یاشودا)

نہ کامناؤں کی کوئی داسی
برہنہ پا خار آشنا ہمسفر اندھیرے
گزرتے لمحوں نے آنکھ کھولی
وہ نوکِ خار اب دمک اٹھی تھی
جو آبلوں کے لہو سے سیراب ہو چکی تھی
وہ ریگِ پا جس کا ذرّہ ذرّہ
سکوں کی منزل کا راہرو تھا
ہوائے تازہ کا منتظر ہے

وہ ایک عظمت پناہ ٹیسو کا پھول
جس پر جمی تھی صحرا کی دھول
کتنی مسافتوں کی تکان
پلکوں سے چن رہا تھا
تمام رستے جو فکر گوتم کی روشنی سے نہا اٹھے تھے
پیمبر آشتی کے قدموں کی آہٹوں سے مہک رہے تھے
وہ آدمی کی شکستہ پائی پہ غور کرتا
مگدھ کی جانب رواں دواں تھا
کہ روشنی کی ہزار ہا بے قرار کرنیں جلو میں آئیں
مہک اٹھے راستوں کے پامال
خار و خس بھی

وہ گیان آسن جمائے بیٹھا ہے
سوچ کی مشعلیں جلا کر
ادا میں سوز و گدازِ مریم
صدا میں اِک سازِ آشتی کا

سمانتا (مساوات)

گوتم کی آواز

میں زندگی کے طویل و کج راستوں سے گزرا ہوں
بارِ کربِ وجود لے کر
مجھے خبر ہے کہ آدمی زندگی میں
شمشان کی کڑی دھوپ سہہ رہا ہے
میں کل بھی ان راستوں سے گزرا
شکستہ کشکول (ریزہ ریزہ تھا رزق جس میں)
یہ راستے جانے کب سے
مکتی کے منتظر ہیں۔
یہ راستے جانے کتنی صدیوں سے
آدمی کے
قدم کی آہٹ کے منتظر ہیں
وہ آدمی جو
برہمنی یُگ میں
آبرو کھو چکا ہے یکسر
نہ شیو نے انساں کو شانتی دی
نہ وشنو جی آدمی کو نروان دے سکے ہیں
خود آدمی ہی کرم[1] کے بھیدوں کو
جان جائے گا
گیان پاکر

منش کی اونچائی ناپنا ہو تو

---

[1] عمل فعل — گوتمی عقیدہ

اُس کو دیوتا نہیں ہمالہ کے قد سے ناپو
مری نظر
میری بھاؤنا میں
مُنش مُنش ہے
مُنش مُنش ہے



دینوی لذّتوں کی یورش

پیمبرانہ شکوہ کے ساتھ
ایک انساں
سُرور و عرفان کی خنک بارگاہ میں ہے
وہ روح کی رفعتوں پہ میزان ہو کے
دنیا کی لذّتوں سے کنارہ کش ہے
یہ سوچ کی وہ گپھا ہے جس پر
نہ خواہشوں کی ہے خوابنا کی
نہ لذّتوں کی ہے کوئی دستک

یہ کون من کے دُوار
شہنائیوں کے جھرمٹ میں
رقص و رَم کا جگا کے جادو
سوادِ عرفان میں مخل ہے
ہوس کدوں کے سفیر
آلودگی کے ہتھیار پھینکتے ہیں
خیالِ ترکِ طلب کا ٹوٹے حصار کیسے
ہوس کدوں کے پھریرے

ہاتھوں میں لے کے بڑھتی ہیں
رنگ و رامش کی ویشیائیں
تو گوتم اِک شان بے نیازی سے دیکھتا ہے

افق پہ سینے کے عفو کا تابناک سورج
سرورِ عرفاں کی لبوں پر خفیف موجیں
یہ تمکنت یہ گریز پائی
(ریاضتِ روز و شب کا ثمرہ)
عظیم لوگوں کو راس آتی ہے زندگی میں

O

اُپدیش دھارا

اسے یہ احساس ہو گیا تھا
کہ جسم پر نشٹ جھیلنا یا
بلکتی جنتا سے کٹ کے
کٹیا میں بیٹھ جانا
نہ زندگی کا ہے کوئی مقصد
نہ میری تعلیم کا ہے حصّہ

چلوں تو لوگوں کے دُکھ سمیٹوں
زبان کھولوں تو میرا اُپدیش
حرف کے دائروں میں پھیلے
یہ دائرے اپنی روشنی کا سفر نہ روکیں تو
آتما آتما سے شکتی کی جوت پھوٹے

اندھیرے اننیائے کی زبانوں سے چاٹتے ہیں
لہو سمے کا
کرودھ کے جال میں ہے
سُکھ شانتی کی مایا
ہمارے سینوں میں ساگر اُبلے
تو جیون اپنی بدل دے کایا
دکھوں کو آپس میں بانٹ لو
ہر ڈگر پہ جیون کے
سُکھ سویروں کی چھاؤں پھیلے

مہان وہ ہے جو کُشت و خوں کو گناہ سمجھے
مہان وہ ہے نفرتوں کو معاف کر دے
مہان وہ ہے جو آدمی کو برابری کا
وقار بخشے
مہان وہ ہے جو آدمی کو مسرتوں کا
خمار بخشے
مہان وہ ہے جو روتے بچے کو صوتِ مانوس و دل دہی کا
کنار بخشے
مہان وہ ہے جو پرسشِ غم میں آدمی کو
قرار بخشے
مہان وہ ہے جو خشک پتوں کو سوکھے چہروں کو
تازگی کی بہار بخشے
یہ حرفِ آخر ہے میرے لوگو!
اُمر وہی ہے کہ جس سے ذی روح کو نہ پہنچے گزند کوئی



آواگون[1]

عمل کروا یسے پھر نہ آؤ یہاں عذاب حیات سہنے
بہت سے چوپائے جن میں لومڑ ہے اور ہاتھی
کئی پرندے کہ جن میں اُلّو بھی ہے چڑا بھی
بہت سے کیڑے جو مار و کژدم ہیں
اپنے اگلے جنم میں بدکار و آبرو باختہ رہے ہیں
چڑا یتیموں کا مال کھاتا تھا
لومڑ اگلے جنم میں سارق رہا ہے لوگو!
وہ دیکھو خرگوش کتنا کومل ہے کتنا سُندر
ابھی ابھی جھاڑیوں سے نکلا ہے
خار آلود و خون چکیدہ

---

[1] تناسخ (TRANS MIGRATION) ایک صورت سے دوسری بدلنا، مگر دوسری صورت اول صورت سے بدتر، کسی چیز کا فرہ جاتا رہنا (لغات کشوری مطبوعہ ۱۹۲۶ء مطبع نولکشور لکھنؤ صفحہ ۴۶۳

مہاتما گوتم بدھ کا یہ کہنا تھا کہ انسان اپنے افعال و اعمالِ بد کی وجہ سے دوبارہ جب پیدا ہوا تو اس نے مختلف جانوروں کی شکل (مسخ شدہ) اختیار کرلی۔ اور یہ جیون پاپ (جس کی مخصوص گومتی اصطلاح کرم یا کرنا کا پھل ہے) مسخ شدہ صورتوں میں ظاہر ہوا (مگر دوسرے جنم میں) مثلاً بچھو، لومڑ، ہاتھی خرگوش، چڑا، اُلّو، سور، ریچھ (۲۳ یا بعض روایات و تعلیمات بدھ کی رو سے ۲۴ جانور) اپنے پہلے جنم میں انسان تھے، لیکن اپنے قبیح اعمال کے سبب جب دوبارہ آئے تو یہ صورتیں اختیار کرلیں، جو ان کے گناہوں کی سزا تھیں۔

لہٰذا اس دوسرے سے جنم سے نجات پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان ایک دوسرے کے کام آکر آپس کے دکھوں کو بانٹ لیں۔ کسی ذی روح (حیوان) کو تکلیف نہ دیں، نفرتوں کو معاف کردیں، ظلم کی قوتوں کا جواب علم و صبر سے دیں اہنسا یا (فلسفۂ گوتم) کو ایک مستحکم قوت سمجھیں (للت وستر، مستند سوانح گوتم، جسے گوتم کے اولین متبعین نے گوتم کی زندگی ہی میں مرتب کیا)۔

یہ اپنے اگلے جنم میں ناپاک رہ چکا ہے
اسے کرم کا یہ پھل ملا ہے
کہ یہ جگر سوختہ ہمیشہ لہو لہو ہے ۵

مری نگاہوں کے سامنے
اِک پہاڑ ہاتھی کی شکل میں ہے
یہ شرمساری سے سر جھکائے ہوئے کھڑا ہے
کہ اپنے (اگلے جنم میں تھا ایک مردِ لوٹی
اسی طرح اور جانور ہیں
سورشریفوں کا محتسب تھا
زنا کا عادی رہا ہے کچھوا
انھیں یہ کرما کا پھل ملا ہے کہ
اس جنم میں وہ دشت و صحرا کی ٹھوکریں کھائیں
خواہشوں کے غلام بن کر

بدی ہمیشہ ہی من کے اندر کا کھوٹ ہوتی ہے میرے لوگو!
میں تم سے اک بار پھر یہ کہتا ہوں
جیون آکاش کے ستاروں کی نرم چھایا
بڑی ابھاگن

اساڑھ کی دھوپ جلتی بجھتی
یہ جیون آشا کی ڈال دیکھو تو اونچی نیچی

---

۵ یہ زن فاحشہ تھی اور کبھی پاک صاف نہیں رہی تھی۔ روایت اس کے لئے یہ ہے کہ نہائے بغیر ہم بستری کی عادی تھی، چنانچہ اب ہر وقت خون ٹپکاتی رہتی ہے اور ہمیشہ حیض سے رہتی ہے۔

مگر کبھی ہات میں نہ آئے
یہ پیار کی امر بیل
سر و عمرِ رواں پہ پھیلے تو
اس کی رعنائیاں ہوں خاشاک و سرخمیدہ
مگر یہی زہر
جس لوگوں نے پیار کا نام دے رکھا ہے
خود اپنا تریاق بھی ہے لوگو
اسی سے مرتے ہیں لوگ
جیتے بھی ہیں اسی سے
یہ ایک احساں ہے زندگی کا
یہ اپنی تاریخ آدمیت کا اِک سبق ہے
اسے نہ بھولو کہ
اس میں تاب و تواں ہے
قرنوں کی زہرناکی بیٹنے کی

آیۂ وجدانی

پیمبر امن و آشتی اس زمیں پہ
آتے رہیں گے اکثر
محبتوں کے صحیفے لے کر
وہ اپنی سچائیوں کی تقدیس
مدتوں تک لیے پھریں گے خود اپنے ہی دوشِ بے اماں پر
علیں دنیا نے ظلمتوں کو گلے لگایا حرزِ جاں سمجھ کر
جو روشنی کے پیامبر تھے
اُنھیں اندھیروں کے سانپ ڈستے رہے ہمیشہ
جو روشنی عقل کی کسوٹی پہ ہو فروزاں

وہ دائمی ہے
دلوں کی نیکی افق افق ذہن کا اجالا
اَنا خود اپنی شکست کے غم کی خودسری ہے
حقیر نفسی و انکساری ہماری وجدانی آیتیں ہیں
ہم اپنی پیدائشوں سے مرنے کی منزلوں تک
دکھوں کے طوفان میں گھرے ہیں
یہی ہے سب سے بڑی صداقت
دوبارہ تخلیق کی تمنّا
خود اپنی محرومیوں کا ردّعمل ہے
ناچار زندگی کی ہے تشنہ کامی
تسلسلِ زندگی کی یہ آرزوئے بے جا
شکوہ و ثروت کے تاجداروں
غرور و نخوت کے خواستگاروں کی
لغزشِ فکر ہے مگر
تم اس تصور کو راہ دینا نہ اپنے دل میں
اسی ہدایت کا نام ہے تیسری صداقت

مرے لیے تم نے دُکھ اٹھائے ہیں
مشکلوں میں گھرے ہوئے نندا ؎
جو راز تنہائیوں میں
گوتم کے ذہن پر منکشف ہوئے ہیں

؎ گوتم کا چچازاد بھائی آنند (تعلیماتِ گوتم کا پہلا بڑا مبلغ اور معتمد جانشین، جس نے بدھ کے بعد بھی بدھ کی تعلیمات کے فروغ و اشاعت کے لیے زبان، تقریر و تحریر کے ذریعہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

تمھیں وہ گوتم بتا رہا ہے
شرافتِ نفس کی اگر جستجو کرو تم
تو وہ مکارم کی روشنی ہے
جو دل کی صبحوں سے پھوٹتی ہے
یہ چوتھی اور آخری صداقت ہے
میرے بھکشو ہ

ہ FOUR TRUTH OF GREAT BUDHA !

عزیز قیسی



بہاؤ کی ضد پہ تیرنے کا یہی ہے انجام
میں گھڑی دو گھڑی میں لڑ لڑ کے تیز دھارے سے
ڈوب جاؤں گا

میں نے دیکھا ہے
مجھ سے پہلے بھی کوئی ڈوبا ہے
اب جو میں مڑکے دیکھتا ہوں
وہاں ——— مری ڈوبتی نگاہوں میں —— میرے پیچھے
بہاؤ کی ضد پہ کوئی پھر سے اُبھر رہا ہے

ارے !!
یہ پھر میں ہوں !
تو کیا ذرا دیر مجھ سے پہلے جو شخص ڈوبا تھا
وہ بھی میں تھا؟

سبحان انجم

میں نے —

اپنے بچھڑے ہوئے
راہ رو کے لیے
لفافوں میں لپٹے ہوئے
ثوابوں کے تحفے
ڈاک گھر کے حوالے کیئے
جہاں سے
جوابوں کی امید کم ہے

بوڑھی کرنیں

اپنے احساس کی
بوڑھی کرنیں
پہلی فرصت میں جگا دیتی ہیں.
پھر کسی کام سے
سورج کی طرح
میں بھی ہر سمت بکھر جاتا ہوں

مسائل کا حل

ڈھونڈ کر
شہر کے
کچھ مسائل کا حل
مطمئن تھا بہت
مگر
راہ میں
ایک بچہ کی فریاد سے
مجھے اپنے گھر کا خیال آگیا ....

ملک تارہ

فسادگاہیں

دور اونچے سے ایک ٹیلے پر،
جگمگاتی ہے اِک عبادت گاہ
اُجلی آغوش مرمریں اس کی
سمجھی جاتی ہے آشتی کی پناہ

لوگ کہتے ہیں اک مخیّر نے..
شہر والوں کو دی ہے یہ سوغات
تاکہ قائم رہے زمانے میں...
اُس کی دولت کی 'جاوداں' خیرات

جانے ارضِ وطن کے سینہ پر
ایسے کتنے نقوش چسپاں ہیں
جسم اِن کے ہزار اُجلے ہوں
روحیں لیکن سیاہ داماں ہیں

کالی دولت کو اہلِ ثروت نے
خوش نما معبدوں میں ڈھالا ہے
عمر بھر کی سیاہ کاری پر
یوں تقدّس کا پردہ ڈالا ہے

راہ گم کردہ ان شوالوں میں
خود پرستی کے دیپ جلتے ہیں
کم نگاہی فروغ پاتی ہے....
فتنے دیر و حرم کے پلتے ہیں

پھوٹ کا اِن میں ورد ہوتا ہے
فرقہ بندی کی بات چلتی ہے
بربریت کا جنم ہوتا ہے
روحِ انسانیت کچلتی ہے

یوں تو یہ آشتی کے مظہر ہیں
اصل میں یہ فساد کے گھر ہیں

پدم پرکاش شریشٹھ پریم

بسم اللہ

"چل اے خامہ بسم اللہ"
لکھتے نامہ بسم اللہ
گیان کماری بسم اللہ
نذر ہے مانا بسم اللہ
پریم کا میں ہوں! پریمی بھی
عشق کا چرچا بسم اللہ
کامنا ہے سو شبھ ہے
کامنا تیری بسم اللہ
سب سے پہلے بسم اللہ
سب سے آخر بسم اللہ

شکستِ دل

آپ کو نہیں معلوم
ٹوٹتا ہے دل کیسے
اس پہ کیا گذرتی ہے
ٹوٹ کر کوئی تارا
آسماں سے گر جائے
تند و تیز لہروں میں
جیسے کشتی گھر جائے
ایک شیشہ نازک سا
ٹوٹ کر بکھر جائے
زندگی کی راہوں پر
دھول سی بکھر جائے
آپ کو نہیں معلوم
ٹوٹتا ہے دل کیسے
اس پہ کیا گذرتی ہے

ارشد جمال فاروقی

فرار

میں اپنی بستی سے بھاگ آیا
وہاں کئی تلخ تر مسائل
بڑی ڈھٹائی سے تک رہے تھے
کئی نوکیلے سوال رگ رگ میں چبھ رہے تھے
میں گھر کے اندر تھا
اور باہر سے تالے لگے ہوئے تھے
زمیں بہت سخت تھی وہاں کی
اور آسماں کی بھویں تنی تھیں
میں ایک سہما ہوا پرندہ
نہ جانے کس طرح آسکا ہوں
یہ قہقہوں، ولولوں سے بھرپور شہر تیرا
"مجھے بھی تھوڑی پناہ دے گا؟"

عبدالسمیع بوبیرے

تبصرہ تبصرہ

شہ رگ
شمیم طارق

شہ رگ اور وہ بھی شمیم طارق کی ــ ہاتھ رکھے تو کون ؟

علم و ادب کے قدیم سرمایہ میں دھنس کر صحیح سلامت نکلنا اور پھر فکر و نظر کی جدید شاہراہوں پر کھلی آنکھ کے ساتھ گھومنے کے بعد " شہ رگ " کا اتہ پتہ ملتا ہے۔

شعری مجموعے چھپتے تو بہت ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے۔ لیکن یہ جو شمیم طارق نے " شہ رگ " پیش کی ہے۔ وہ ہماری رگوں میں نیا خون دوڑائے بغیر نہیں رہے گی۔ ؎

پیمبروں کا پڑھایا ہوا سبق ہوں میں

کہنے والا شاعر " شہ رگ " میں جگہ جگہ پیمبری کی جھلک دکھاتا ہے۔ لیکن اس جھلک کا دیدار کرنے کے لئے وہ آنکھ چاہیئے جو انسانیت سے لیکر عصر حاضر کے ہر موضوع تک، ہر مکتبِ فکر کی شناسا ہو۔

" شہ رگ " شاعر کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ لیکن فکر و نظر کے جتنے چراغ اور چراغوں میں جتنی لو یہاں ملتی ہے۔ وہ اُردو شاعری میں منفرد ہے نئی نسل بجا طور پر اس شاعر پر فخر کرے گی۔ زبان و بیان ہو یا فکر و خیال ہر جگہ اس نو عمر شاعر نے کہنہ مشقی کے کئی ایک اعلےٰ نمونے پیش کئے ہیں۔

کتاب کھولتے ہی، " پہچان " کے عنوان سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون، یہ جتاتا ہے کہ شمیم طارق اپنی عمر سے بہت آگے کی شاعری کرتا ہے۔ عمر اور نسل سے آگے دیکھنے اور پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھنے کی خصوصیت ہی اس نو عمر شاعر کو ممتاز کرتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری جیسے " جرّاح " نے بھی شمیم طارق کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

واجدہ تبسم نے بھی شاعر کا تعارف کرایا ہے۔ واجدہ کا اپنا منفرد اندازِ بیان ہے۔ اور خوب ہے۔ مگر خود شاعر نے " میری شہ رگ " کے عنوان سے جو لکھا ہے۔ وہ اس مجموعہ میں ہی نہیں بلکہ اُردو ادب میں بھی منفرد اور اچھوتا مضمون ہے۔

قدامت و روایت میں ڈوب کر قنوطیت اور رجعت سے پاک رہنا۔ جدیدیت میں گم ہو کر، زندگی کے تقاضوں سے جڑے رہنا ترقی پسندی سے رشتہ توڑے بغیر کمیونسٹ نظام حیات کی جکڑ بندیوں پر چوٹ کر جانا، شمیم طارق ہی کا حصّہ ہے۔

کرب میری روح کا چہرے سے وا ہوتا گیا
منظرِ تصویر خود ہی آئینہ ہوتا گیا

یہ شعر مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد ہی کہا گیا ہے۔ جو سیدھا دل سے نکلتا ہے اور دل میں سماتا ہے۔ اور دل سے ہی نکلی ہوئی یہ بات

کوئی مقیم ہو چھاؤں میں ان کو عذر نہیں
خدا کے بعد ہمیں بے غرض درخت ملے

ہمیں شاعر کے بے پناہ احساس کا پتہ دیتی ہے۔ ایک دو اچھے شعر ہوں تو اُن کا انتخاب بھی کیا جائے۔ یہاں تو انبار لگا ہوا ہے۔ لیجیے ایک غزل ملاحظہ فرمایئے۔

مجھ کو ترا یقین بھی ہے اشتباہ بھی
میری سرشت خیر بھی ہے اور گناہ بھی

پردے جو سرائے میں سجھا وہ آ گئے
مقتل بنی ہوئی ہے مری خواب گاہ بھی
شہرِ انا میں آپ سے کٹ کے نکل گیا
بارِ گراں ہے میرے لئے رسم و راہ بھی
دِل کی شکست و ریخت کا ملتا نہیں سُراغ
ترکِ تعلقات بھی مشکل، نباہ بھی

اس شعری مجموعہ کے مطالعہ کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے
کہ خدا اِس خوبصورت اور نو عمر شاعر کو نظرِ بد سے بچائے۔ اگر
حسد اور حد بندیوں سے اوپر اُٹھ کر اس کا مطالعہ کیا گیا تو بلا شبہ
یہ شعری مجموعہ اُردو شاعری میں اعلیٰ اور بیش بہا اضافہ ہے۔
نظر کی منزلِ مقصود مہر و ماہ نہیں۔ اس لئے شعر و سخن کی دنیا
کے اس ننھے سے شاعر نے اپنے قد اور اپنی عمر کے برخلاف فکر و
نظر کی کمندیں حدِّ لامکاں میں اچھالی ہیں۔ کہ جہاں دوسروں کی پرواز
تخیّل ابھی پہنچی نہیں۔
کتابت، طباعت صاف ستھری، سرورق گوارا۔ قیمت بارہ
روپیہ۔

ملنے کے پتے، مکتبہ جامعہ۔ دہلی
علیگڑھ۔ بمبئی
مکتبہ الفاظ، علی گڑھ
مکتبہ حفاظ، بمبئی ۳
اردو سینز بکڈپو، بمبئی ۵۴
محب بکڈپو، بمبئی ۳

مجروح سلطان پوری راشد تھانوی کا واقعہ سناتے ہیں کہ
کسی اجنبی نوجوان سے اُن کی ملاقات ہوئی اور فوراً ہی کلام
سنانے لگے راشد تھانوی نے تاڑ لیا کہ یہ انہیں کا کلام ہے جو
شاعر اپنے نام سے سنا رہا ہے۔ اس بات کو انہوں نے شاعر
سے اس طرح کہی۔ " ارے صاحب یہ کلام تو راشد تھانوی کا لگتا
ہے۔ نوجوان شاعر نے اکڑ کر کہا، ہاں! چرالیا ہوگا انہوں نے
اور جب انہیں بتایا گیا کہ راشد تھانوی یہی ہیں تو ایک بار پھر سے
اکڑ مکڑ کے ساتھ اس نے کہا، اچھا تو آپ ہی ہیں جنہوں نے میرے
اشعار چرا کر اپنے نام سے چھپوالئے ہیں۔

منقول، ادبی لطیفے
(از: خواجہ عبدالغفور)

اکادیمی ڈائری

۷ر فروری:

اردو اکادمی کے زیر اہتمام، عوامی محاذ، پونہ کے تعاون سے اینگلو اردو ہائی اسکول پونہ کے اسمبلی ہال میں اردو صحافت پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ پروگرام کی پہلی نشست صبح گیارہ بجے سے دوپہر دو بجے تک جاری رہی۔

سیمینار کے کنوینر اور اکادمی کے ممبر پروفیسر عبدالمجید نقیبہ نے استقبالیہ تقریر کی اور اردو صحافت سے متعلق پونہ میں مذکورہ سیمینار کی ترتیب و تیاری سے متعلق اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر عبدالرزاق شیخ صدر عوامی محاذ پونہ نے بمبئی سے آنے والے مہمان صحافیوں اور اکادمی کے عہدیداران و ممبران کا خیر مقدم کیا اور مہمانوں کی گل پوشی کی۔ ابتدا میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی جوائنٹ سکریٹری اکادمی نے اردو صحافت سے متعلق اظہار خیال کیا۔

چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر اے۔ اے منشی نے اختتامی تقریر میں صحافت سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ اردو صحافت کا ماضی بڑا شاندار رہا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو صحافت اپنے شاندار ماضی کو دیکھتے ہوئے اپنے مستقبل کو بھی سنوارے۔

پہلی نشست کے افتتاحی کلیدی مقالہ جناب عبدالسمیع بوہیرے (مدیر صبح امید) نے پیش کیا۔ موصوف نے کہا کہ اردو صحافت میں دراصل نئے آنے والوں نے صحافت کے وقار کو بجائے بلند کرنے کے اور پست کر دیا ہے۔ مہاراشٹر کی اردو صحافت کے تعلق سے اہم اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پرچوں کی تعداد پر ہمیں خوش فہمی ہوتی ہے لیکن پرچوں کی مالی حالت خستہ دیکھ کر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو صحافت یہاں پیٹ بھرنے کا ذریعہ نہیں۔ اپنے اس تنقیدی مقالہ میں انہوں نے کہا کہ اردو صحافت کا معیار ماضی میں جتنا بلند تھا آج اردو کے بعض پیشہ ور صحافیوں کے باعث گرتا جا رہا ہے۔

پہلی نشست کے آخر میں صدر جلسہ جناب علی سردار جعفری نے اردو صحافت کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہوئے موجودہ صورت حال کا تذکرہ کیا۔ موصوف نے کہا کہ آج کے ترقی یافتہ مشینی دور میں اردو صحافت کو جدید صحافتی تکنیک سے لیس کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم نے جدید وسائل کا سہارا نہیں لیا تو اردو صحافت کی الکٹرانی سائنسوں پر تابو نہیں پا یا جا سکتا۔

دوسری نشست ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور کے زیر صدارت سہ پہر ۲ بجے شروع ہوئی۔

ہارون رشید (علیگ) بلٹز بمبئی کے سب ایڈیٹر نے اپنے تنقیدی مقالے میں صحافت میں اخلاقی قدروں کے فقدان کے حوالے دیئے۔ ہارون رشید نے اردو صحافت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی صحافت اور قومی صحافت میں اخلاقی قدروں کی کسوٹی پر کئی واقعات گنوائے۔

خلیل زاہد (مدیر قومی آواز بمبئی) نے تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ اخباری صحافت کی ان باتوں کی طرف اشارہ کیا جس کے باعث اخبارات آج بھی اپنی سطح سے بلند نہیں ہوئے۔ مدیران کاتبوں اور انتظامیہ کے مسائل پیش کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ کبھی کبھی ایک اجتماعی فلاحی کوشش اس ضمن میں ہونی چاہیے۔

انیس چشتی (پونہ) نے اخبارات کے مواد، خبروں اور کاروباری اشتہارات کا فیصد کتنا ہونا چاہیئے اس پر بحث کی۔ موصوف نے اخبارات کے اشتہاری کالم اور خبروں کے کالم کا تجزیہ کیا۔

سیمینار کے صدر جناب خواجہ عبدالغفور نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ اردو صحافت کی اپنی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ موصوف نے کہا کہ اردو صحافت کا ایک زمانہ یہ بھی تھا کہ مزاح کو موضوع پر بھی علیحدہ معیاری پرچے شائع ہوتے تھے جیسے اودھ پنچ وغیرہ خواجہ عبدالغفور صاحب نے کہا کہ آج ہمیں صحافت کے مختلف پہلوؤں پر بھی توجہ دینی چاہیئے کہ جس سے زبان و بیان، ٹیکنک، انداز پیش کش اور لے آؤٹ، گیٹ اپ وغیرہ کے باعث اچھے پرچے اردو میں آسکیں۔

اکادمی کی جانب سے آخر میں ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے اہل پونہ کا اور اہل پونہ کی جانب سے کنوینر عبدالمجید بقیعہ اور ڈاکٹر اے آر شیخ صدر عوامی محاذ پونہ نے شکریہ ادا کیا۔ اسی شب عوامی محاذ نے بمبئی سے آنے والے مہمانوں علی سردار جعفری، پرنسپل اے اے منشی، خواجہ عبدالغفور، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، عبدالسمیع بوبیرے، ہارون رشید علیگ خلیل زاہد، منشاء الرحمن منشا، ایڈوکیٹ ابراہیم بسمل ان حضرات کے اعزاز میں ایک شاندار

مشاعرہ اسی ہال میں منعقد کیا۔ پونہ اور بمبئی کے شعراء حضرات نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس طرح ایک یادگار دن کی یاد پونہ والوں نے اپنے دلوں میں محفوظ کی۔

۲۷ فروری
۲۸ فروری

اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام دو روزہ کل مہاراشٹر اردو تعلیمی کانفرنس الی لطیفی ہال بمبئی، میں منعقد ہوئی جس میں مہاراشٹر کے مختلف علاقوں کے ہائی اسکولوں اور کالجوں کے ممتاز اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم نے حصّہ لیا

کانفرنس کے آغاز سے قبل مختلف اسکولوں کی جانب سے منعقد تعلیمی نمائش کا افتتاح نائب وزیر اوقاف حکومت مہاراشٹر وقار احمد مومن نے کیا۔ موصوف نے تعلیمی نمائش کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی پسندیدگی اور خوشی کا اظہار کیا اور اساتذہ کی کاوشوں کو سراہا۔

تعلیمی کانفرنس کی صدارت چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر ایم لے منشی نے فرمائی۔ آپ نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد اردو کے تعلیمی ترقی اور اس کے مسائل کا جائزہ لینا ہے، اردو کے متعلق ٹھوس اور بنیادی کام اسکولوں اور کالجوں میں ہی ہو رہا ہے۔ یہ کانفرنس ان کاموں پر روشنی ڈالے گی اور ان کے مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش کرے گی۔

اس سے پہلے، ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے اپنی استقبالیہ تقریر میں حاضرین، پوری ریاست سے آئے مندوبین اور ماہرینِ تعلیم کا خیر مقدم کیا اور اردو اکادمی کی تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جناب وقار احمد مومن نے اپنی تقریر میں کہا کہ ادبی اور تعلیمی امور کو سیاست سے دور رکھنا چاہئے، ورنہ ہمارا ادبی اور تعلیمی معیار ایک بڑے بحران سے دوچار ہو جائیگا۔ آپ نے امید ظاہر کی کہ جب ماہرانِ تعلیم اور اساتذہ حضرات ان مسائل پر غور کرنے بیٹھیں تو کچھ نتائج اخذ کریں



۲۷/ ۲۸ / فروری کو منعقد تعلیمی کانفرنس سے ڈاکٹر اے منشی اور خواجہ عبدالغفور (ممبر سکریٹری) خطاب کرتے ہوئے

کنوینر تعلیمی کانفرنس و ممبر اردو اکادمی محترمہ فاطمہ انیس نے کانفرنس کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی اور کانفرنس کے باضابطہ آغاز سے قبل شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اور محترمہ زرینہ ثانی کے انتقال پر ایک تعزیتی قرار داد منظور کی گئی۔

تعلیمی کانفرنس کی مختلف نشستوں میں ماہرین تعلیم نے حسب ذیل تعلیمی موضوعات اور مسائل پر پرمغز مقالے پیش کئے گئے۔

۱۔ اردو ہائی اسکولوں کو درپیش مسائل اور امور کا جائزہ۔

۲۔ جونیر اور ڈگری کالج پر اردو ذریعہ تعلیم کے طلبا۔

۳۔ اردو اسکولوں اور اساتذہ کے مسائل۔

۴۔ اردو ذریعہ تعلیم اور پیشہ ورانہ کورس

۵۔ اردو پرائمری ایجوکیشن اور ٹریننگ کالجس

۶۔ اردو اسکولوں میں مراٹھی کی تدریس، اردو اسکول اور ایس ایس سی بورڈ۔

بعد ازاں ان موضوعات پر پڑھے جانے والے مقالات کی روشنی میں مندوبین نے کئی اہم تجویزیں بھی منظور کیں۔

۲۴ر مارچ:

اردو کے تین عظیم المرتبت شعراء، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فراق گورکھپوری اور احسان دانش کے وقفہ وقفہ سے سانحہ ارتحال پر المالطیف ہال صابو صدیق میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسے کی صدارت ممتاز شاعر مجروح سلطانپوری نے فرمائی۔

ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے جلسے کے آغاز میں فرمایا کہ آج ہم اردو والے یہاں اپنے بزرگ قابلِ احترام جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور احسان دانش کے غم میں جمع ہوئے ہیں۔

آپ نے مزید فرمایا کہ ان تین بزرگ اور اہم شاعروں کی موت اردو کے لئے ایک المناک سانحہ ہے

جوش کا بمبئی اور پونے میں ایک عرصہ تک قیام رہا ہے اس لئے اہل بمبئی کے لئے ان کی موت کا غم اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔
چیئر مین اردو اکادمی جناب اے اے منشی، خواجہ احمد عباس، شیام کشن نگم، سلمیٰ صدیقی اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ جوش اور فراق کے تعلق سے بہت سی باتیں کی گئیں اور ان کی زندگی فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی، اور خراج عقیدت پیش کیا۔

۱۱/ اگست:

اردو کی ممتاز افسانہ نگار خدیجہ مستور کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد مہاراشٹر کالج ہال میں کیا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب علی سردار جعفری نے فرمائی۔ ڈاکٹر محمد رضا نے خدیجہ مستور کے افسانوں اور ناول کی روشنی میں ان کے فن کا جائزہ لیا۔ آپ نے فرمایا کہ خدیجہ کا فن جزئیات فن ہے وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے گوشوں کو بھی اپنے قلم سے بے نقاب کر دیتی ہیں۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی نے خدیجہ مستور سے اپنے ذاتی تعلقات کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ خدیجہ مستور اور ان کی بہن ہاجرہ مسرور نے نہایت ماحول میں پرورش پائی تھی۔ تعلیم کے لئے انھیں کافی جدوجہد اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کا ایک عرصہ تک بمبئی میں بھی قیام رہا ہے۔ مجھے لندن میں ان کی بیماری کی اطلاع ملی تھی، مگر چند مجبوریوں کی وجہ سے میں ان تک نہیں پہنچ سکی۔
آخر میں صدر جلسہ علی سردار جعفری نے اپنی تعزیتی تقریر میں فرمایا کہ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں بہنیں لکھنؤ کے قدامت پسند ماحول میں پیدا ہوئیں۔ مگر اپنی لگن اور محنت اور صلاحیتوں سے ادب میں بلند مقام حاصل کیا۔ ترقی پسند تحریک کی میٹنگوں

میں وہ اکثر شریک ہوتیں اور مباحثہ میں بھرپور حصہ لیتی تھیں۔ ان کے بیشتر افسانے ہندوستان نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اس لئے ان کی حالیہ کہانیاں اور افسانے ہم تک نہیں پہنچے ہیں۔ ان کی مشہور ناول 'آنگن' کو پاکستان میں آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ آنگن۔ تقسیم ہند کے موضوع پر ایک متاثر کن کہانی ہے۔

۱۷ر ستمبر :

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ (وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر) کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ ۱۷ر ستمبر شام ۵ بجے علی برادران میموریل ہال، خلافت ہاؤس میں منعقد کیا گیا، اردو کے مشہور ادیب اور صحافی خواجہ احمد عباس نے جلسہ کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

جلسے کا آغاز کرتے ہوئے ممبر سکریٹری مہاراشٹر اردو اکادمی خواجہ عبدالغفور نے فرمایا کہ شیخ صاحب کا مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے آغاز سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔

۲۰ر اپریل ۱۹۷۵ء کو جب اردو اکادمی کا قیام صدر جمہوریہ ہند مرحوم فخرالدین علی احمد کے ہاتھوں عمل میں آیا تو شیخ صاحب اس جلسے میں بطور خاص شریک تھے۔ اور انہوں نے اپنی دعاؤں سے نوازا تھا۔ آج نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان کے شیخ و برہمن سوگوار ہیں کہ ایک ایسی شخصیت کہ جس نے کشمیر کو فی الواقعی جنت نظیر قائم رکھا اور اس کی وادیوں کو سبز پوش اور گل وگلزار بنایا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا کہ مشہور ادیب اور فلم ڈائرکٹر راما نند ساگر کے ذریعہ بیگم شیخ عبداللہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اس جلسہ کے لئے اہل مہاراشٹر اور بمبئی کا شکریہ ادا کیا ہے اور درخواست کی ہے کہ جب آپ شیخ صاحب کی مغفرت اور ان کے لئے دعا کریں تو ساتھ ساتھ میرے لئے بھی دعا کیجئے کہ میں شیخ صاحب کی اعلیٰ روایتوں کا صحیح جانشین بن سکوں اور ان کے نقش قدم پر چل سکوں۔





شیرکشمیر شیخ عبداللہ کے سانحہ ارتحال پر منعقد جلسے میں صدر جلسہ خواجہ احمد عباس اور ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور خطاب فرما رہے ہیں۔

چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر ایل اے منشی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مجھے شیخ صاحب سے ملنے کی سعادت حاصل رہی ہے ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلو تھے۔ بیباکی حق گوئی ان کا شیوہ تھا۔ ان میں رہنمائی کی بھرپور صلاحیت تھی آنے والی نسلوں کو ان سے سبق لینا چاہیئے۔

ڈوگری کی مشہور شاعرہ محترمہ پدما سچدیو نے اپنی جذباتی تقریر میں فرمایا کہ ۱۹۵۲ء میں میں جب ایک اسکول کی طالبہ تھی تو شیخ صاحب کو اپنے اسکول میں دیکھا تھا، کشمیر کے عوام شیخ صاحب پر بھرپور اعتماد اور یقین رکھتے تھے۔

میں نے تقسیم ہند کے موقع پر اپنے والد کو کھو دیا تھا، مگر شیخ صاحب کی شخصیت میں مجھے اپنے باپ کی تصویر نظر آتی تھی۔ شیخ صاحب کے انتقال کے وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں آج ایک بار پھر یتیم ہو گئی ہوں۔

مشہور صحافی انجم رومانی نے فرمایا کہ شیخ صاحب کی زندگی اور ان کی شخصیت سیکولرزم کا روشن مینار ہے۔ کشمیر کے مسائل اور وہاں کے حالات دوسری ریاستوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہیں۔ شیخ صاحب ان مسائل کو حل کرنے میں ساری زندگی منہمک رہے۔ انہوں نے ریاست کشمیر میں تعلیم کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا اور تعلیم عام کی۔

مشہور ادیبہ محترمہ سلمیٰ صدیقی نے شیخ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ شیخ صاحب جب بھی بمبئی تشریف لاتے اپنے پرستاروں اور عقیدت مندوں کے لئے ضرور وقت نکالتے، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر جی سے ان کو خاص تعلق تھا۔ شیخ صاحب علی گڑھ کے طالب علم رہے ہیں، علی گڑھ میں ان کو خاص طور پر عزیز رکھا جاتا تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں ڈاکٹر ذاکر حسین، عابد حسین اور مجیب صاحب جیسے عالموں اور عظیم المرتبت شخصیات سے شیخ صاحب کی تعریف سنی ہے۔ ان کے لائق فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ شیخ صاحب کی روایات کے بہترین علم بردار ہیں۔

ماہر قانون حیدر خان پٹھان نے کہا کہ شیخ صاحب کی شخصیت میں مقناطیسی کشش تھی۔ وہ ہماری اخلاقی، سماجی اور تہذیبی تسلسل کی آخری کڑی تھے۔ ان کی اچھی روایات کو زندہ و قائم رکھنا شیخ صاحب کو بہترین خراج عقیدت ہے۔

حج کمیٹی بمبئی کے ایگزیکیٹو افسر قاضی محمد امین نے فرمایا کہ شیخ صاحب کی رحلت سے ہماری قومی زندگی خصوصاً کشمیر میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر کرنا مشکل ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر جب سارا ہندوستان فرقہ وارانہ آگ میں جل رہا تھا، کشمیر کی فضا میں کسی قسم کا تناؤ یا خوف نہیں تھا، اس لئے مہاتما گاندھی کو شیخ صاحب کی شخصیت میں روشنی کی کرن نظر آئی تھی۔

شیخ عبداللہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، بیک وقت مفکر، مدبر، سیاسی رہنما اور سب سے بڑھ کر بڑی انسانی شخصیت تھے۔ وہ چاہے جیل میں رہے ہوں یا بیرون ملک، اپنی ریاست اور اپنے عوام سے کبھی غافل نہیں رہے۔ انہوں نے باطل کے خلاف صف آرا ہونے کا سبق دیا۔

جناب یوسف ناظم نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں صدر جلسہ خواجہ احمد عباس نے شیخ صاحب سے اپنی چالیس سالہ پرانی یادوں کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہر حال میں خوش و خرم رہنا ہی شیخ صاحب کا مذہب تھا۔

اپنے عوام کی ترقی کے لئے ان کے دل میں بے پایاں جذبہ موجود تھا۔ انہوں نے غریب کشمیریوں میں تعلیم کی روشنی پھیلائی اور آج بیشتر کشمیر تعلیمی ترقی کے راستے پر گامزن ہے، نئے کشمیر کا منصوبہ روبہ عمل ہے۔ توقع ہے کہ اس کے لائق فرزند فاروق عبداللہ ان کے باقی ماندہ ارادوں کو بحسن خوبی عملی جامہ پہنائیں گے۔

تعزیتی قرارداد

مہاراشٹرا سٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ یہ تعزیتی قرارداد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی رحلت پر اپنے گہرے صدمے اور دکھ کا اظہار کرتا ہے۔

شیخ صاحب کی زندگی میں جس بے باکی اور بے مثال جدوجہد کا اعلا نمونہ تھی، انہوں نے قوم اور ملک کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے جس تندہی اور جانفشانی سے جہدوعمل کی راہ اپنائی وہ اپنی مثال آپ ہے ـــــ ہماری قومی زندگی میں شیخ صاحب کی شخصیت سیکولرزم کا ایک بلند روشن مینار تھی، جس کی روشنی آئندہ بھی ہمیں راستہ دکھاتی رہے گی۔

حاضرین جلسہ دعاگو ہیں کہ خداوند شیخ صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، اُن کے جانشین اور لائق فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ان کی اعلیٰ روایات اور کاوشوں کو بحسن وخوبی انجام دینے کی صلاحیت وحوصلہ عطا فرمائے تاکہ وہ اہلیان وادیٔ کشمیر کے لئے اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چل سکیں۔

۲۱ر دسمبر۔

پاکستانی شعراء اور صحافی جناب رئیس امروہوی جناب بزم انصاری، جناب یاور عباس پر مشتمل ایک خیر سگالی وفد بمبئی پہنچا تو اردو اکادمی، کاربانب سے انھیں خوش آمدید کہا گیا اور ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس میں بمبئی کے ممتاز شعراء اور دیگر حضرات نے شرکت فرمائی، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، عزیز قیسی، آغا جانی کاشمیری، افتخار امام گنیش بہاری طرز نے اپنا کلام سنایا۔

ڈاکٹر اے۔ اے منشی، خواجہ عبدالغفور، سلمیٰ صدیقی، علی رضا، بیگم نمی علی رضا، شیام کشن نگم اور ہارون رشید (ملیگ) نے اس محفل میں شرکت کی۔ مہمان شعرا نے اپنے کلام سے حاضرین کو نوازا۔

مشہور شاعر جناب رئیس امروہوی، مہاراشٹر کے ضلع بیڑ میں ۴۰ سال قبل رہ چکے ہیں اور اب روزنامہ جنگ کے قطعہ نگار (کالم نویس) اور ہند پاک پریم سبھا کے صدر ہیں۔ جناب اختر فیروز اسی سبھا کے سکریٹری ہیں۔





خیر سگالی کے دورے پر آئے ہوئے پاکستانی مہمانوں کے استقبالیہ کے دو منظر

۲۴ر نومبر :

ممتاز صحافی و ادیب عبدالحمید بوبیرے کی یاد میں اردو اکادمی کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں علی سردار جعفری، سلمی صدیقی، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا، مصطفٰے فقیہہ، شیام کشن نگم، انیس فاطمہ، علی ایم شمسی، یوسف حافظ، انجم رومانی، سید آل رسول نے مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور نے فرمایا کہ مرحوم بوبیرے کے مفید مشوروں سے ہم نے ہمیشہ فیض اٹھایا ہے۔ وہ بے غرض، بے لوث خادم اور ایک اچھے صحافی تھے، اکادمی کی جانب سے ان کی صحافیانہ خدمات اور اردو مراٹھی تراجم کی کاوشوں کی وجہ سے دوبار انعام سے نوازا گیا تھا۔ آپ نے مختلف مقررین کی جانب سے پیش کردہ تجاویز پر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

صدر جلسہ ڈاکٹر اے اے منشی چیئرمین اردو اکادمی نے اپنی اختتامی تقریر میں فرمایا کہ بوبیرے صاحب جیسی شخصیت ایک عرصے میں جنم لیتی ہے ۔ ان کی موت کو ہم اردو زبان و ادب، صحافت اور ثقافت کا ناقابلِ تلافی نقصان تصور کرتے ہیں۔ آپ نے مقررین کی تجاویز کو غور و خوض کے لئے بورڈ میٹنگ کے سامنے پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

۲۵ر نومبر:

اردو اکادمی کے زیر اہتمام کمیونل ہارمونی فورم بمبئی ، کے زیر نگرانی کلا مندر گوالیار کی جانب سے "دلّی تیری بات نرالی" فل لینتھ ڈرامہ، برلا ماتوشری سبھاگھر میں اسٹیج کیا گیا۔ قومی یکجہتی کے موضوع پر یہ ڈرامہ پریم کیشپ سوز نے تحریر کیا ہے اور ہدایت کار بی ایم شاہ ہیں۔

ڈرامے میں شہر کی بہت سی ممتاز شخصیتوں ادیبوں اور شاعروں نے شرکت فرمائی۔



بزرگ صحافی عبدالحمید بوبیرے کے سانحہ ارتحال پر منعقد تعزیتی جلسے کی تصویریں۔ جناب شام کشن نگم ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا۔ عبدالسمیع بوبیرے، یوسف حافظ، مصطفےٰ فقیہ۔ ڈاکٹر اے۔ اے منشی (چیئرمین) سلمیٰ صدیقی اور سردار جعفری دیکھے جا سکتے ہیں ــ ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور حاضرین سے خطاب فرما رہے ہیں۔

کتب خانوں کو امداد

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادیمی نے ہر سال بیس ہزار کی رقم کی کتابیں اردو کتب خانوں لائبریریوں کو بطور امداد دیتی ہے۔ اس سال امداد کے لئے جن کتب خانوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ اردو لائبریری - ۴۴، سوموار وارڈ، مالیگاؤں، ضلع ناسک

۲۔ پنچ منڈل پی۔ایم ناظانی لائبریری - سہادول مسجد، پنچ منڈل چوک، نندوربار ضلع دھولیہ۔

۳۔ جمعیت اہل سنت - والگاوات لائبریری - ۱۵ سوداگر محلہ، انصاری واڑہ، بھنڈارہ

۴۔ مسلم لائبریری - سوداگر محلہ انصاری واڑہ پربھنی۔

۵۔ انجمن ترقی اردو ہند (دیگلور) ضلع ناندیڑ

۶۔ فری لائبریری - مسلم سوشیل ویلفیر سینٹر، بی آئی ٹی چال ۱۳، بلاسس روڈ بمبئی ۸

۷۔ ساروجنک مسلم لائبریری - بمقابل ایچ۔پی۔او ماڈرن روڈ، بھساول ضلع جلگاؤں

۸۔ مولانا محمد علی جوہر لائبریری - پاچورہ، ضلع جلگاؤں۔

۹۔ راشٹریہ ایڈماتا پبلک لائبریری ۴۲۔ بھوانی پیٹھ، جلگاؤں

۱۰۔ مومن لائبریری۔ ۹۲۔ بنگالی پورہ بھیونڈی ضلع تھانہ

۱۱۔ مولانا آزاد میموریل لائبریری - آزاد کالج روضہ باغ۔ اورنگ آباد

۱۲۔ پبلک لائبریری - انجمن خیال ناگپور گیٹ امراوتی۔

۱۳۔ عوامی ادارہ، محمد صدیق انصاری مارگ مومن پورہ بمبئی ۱۱

۱۴۔ صدر مسلم لائبریری، صدر بازار ناگپور

۱۵۔ مسلم لائبریری - مولانا آزاد روڈ، منماڑ۔ نادگاؤں

۱۶۔ سبھاش ساروجنک لائبریری، سبھاش پیٹھ، ناسک

۱۷۔ اظہریہ اردو پبلک لائبریری، وارڈ نمبر ۱ محلہ ڈاگڈالی، شئے گاؤں، بلڈانہ

۱۸۔ نیشنل لائبریری، آزاد پارک روڈ، اولڈ سٹی، آکولہ ۴۴۴۰۰۲

۱۹۔ انصار لائبریری انصار روڈ اسلام پورہ مالیگاؤں، ضلع ناسک

۲۰۔ مہاراشٹر کالج ۲۴۶، اے، بلاسس روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۸

۲۱۔ گرام پنچایت لائبریری تال پنھاڈ، ضلع ناسک ۴۲۲۳۰۹

۲۲۔ ہمدرد لائبریری ۱۴ بی/او کھڑکی پونا ۴۱۱۰۰۲

۲۳۔ شری شیوا کالج پربھنی

۲۴۔ شولا پور سوشیل ایسوسی ایشن کالج لائبریری ۲۷۰ مسلم پاچھا پیٹھ، شولاپور

۲۵۔ بھارت نگر ٹینیٹ سوسائٹی ۲۸۴ بھارت نگر باندرہ (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۱

۲۶۔ انجمن جونیئر کالج، کھامگاؤں

۲۷۔ ادارہ اسٹار لائبریری کسالی محلہ وارڈ نمبر ۲۳ تلاتی وارڈ ایلسر ضلع جلگاؤں

۲۸۔ پیرا ماؤنٹ لائبریری خان عبدالغفار خاں مارگ اکولہ ۴۴۴۰۰۱

۲۹۔ انوار اردو لائبریری گلی نمبر ۳ اسلام پورہ دیوپور دھولیہ

۳۰۔ حسن بشیر پبلک لائبریری وروڈ، ۴۴۴۰۰۶ امراوتی

۳۱۔ کتاب خانہ مدرسہ محمدیہ، ۴۶ جنجیکر اسٹریٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۲

۳۲۔ انجمن فروغ اردو ڈاکٹر شفیق دواخانہ موتی گنج، دھولیہ

۳۳۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس آرٹ کامرس اور سائنس کالج۔ ناندیڑ

۳۴۔ مولانا آزاد تعلقہ پبلک لائبریری چھوٹا بازار ملکاپور (بلڈانہ)

۳۵۔ ادارہ غالب ریڈنگ روم گجری بازار معرفت ڈاکٹر ذاکر حسین ہائی اسکول پربھنی

۳۶۔ اردو لائبریری معیاری محلہ نزد اردو اسکول چپلون۔ رتناگری

ادیبوں اور شاعروں کو انعامات

شاعری (جونیئر گروپ 'اے')

پہلا انعام	۲۰۰۰ روپے	سلیم شہزاد	دعا پر منتشر
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	قمر اقبال	تتلیاں
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	ارتضیٰ نشاط	ریت کی رتی
تیسرا انعام	— نہیں دیا گیا —		

سینئر گروپ (بی)

پہلا انعام	— نہیں دیا گیا —		
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	ظفر کلیم	طلسمِ غزل
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	عروج احمد عروج	بیتے دنوں کا موسم
تیسرا انعام	۵۰۰ روپے	صوفی بانکوئی مرحوم	بادۂ صافی
تیسرا انعام	۵۰۰ روپے	فیاض افسوس	کفِ افسوس

نثر (ناول، افسانہ وغیرہ (جونیئر گروپ 'اے')

پہلا انعام	— نہیں دیا گیا —		
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	احمد عثمانی	رات کا منظر
تیسرا انعام	— نہیں دیا گیا —		

سینئر گروپ (بی)

پہلا انعام	۲۰۰۰ روپے	یوسف ناظم	البتہ
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	جگدمبا پرشاد دکشت	مردہ گھر
دوسرا انعام	۱۵۰۰ روپے	ساجد رشید	ریت گھڑی
تیسرا انعام	— نہیں دیا گیا —		

تنقید، تحقیق و متنی تنقید (جونیئر گروپ، اے)

پہلا انعام دوسرا، تیسرا انعام ـــــ نہیں دیا گیا۔

سینئر گروپ (بی)

پہلا انعام	۲۰۰۰ روپے	ڈاکٹر عصمت جاوید	جدید اردو قواعد
دوسرا انعام	ـــــ نہیں دیا گیا ـــــ		
تیسرا انعام	۵۰۰ روپے	میوہ رام گپتا	ہندوستان کی جنگ آزادی کی امر کہانیاں

بچوں کا ادب (جونیئر گروپ، اے)

پہلا انعام	ـــــ نہیں دیا گیا ـــــ		
دوسرا انعام	ـــــ نہیں دیا گیا ـــــ		
تیسرا انعام	۵۰۰ روپے	عبدالوہاب مرتضی پوری	اُردو رہنمائے تعلیم
خصوصی انعام	۷۵۰ روپے	نرسری کتاب کی تربیت کیلئے ذکیہ ضمیرالدین خطیب ـ "پہلا قدم"	

سینئر گروپ (بی)

پہلا، دوسرا، تیسرا انعام نہیں دیا گیا

ترجمہ (جونیئر گروپ اے)

پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام نہیں دیا گیا۔

سینئر گروپ (بی)

کوئی انعام نہیں دیا گیا

صحافت، کوئی انعام نہیں دیا گیا۔

مسودوں کی طباعت کیلئے مالی امداد برائے ۱۹۸۱-۸۲ء

الف: شاعری -

نام	مسودہ	امداد
۱- جناب عبدالوحید طرفہ قریشی	فانوسِ حرم (۱۰۰ صفحات)	۲۳۰۰ روپے
۲- جناب محبوب راہی	تردید (۱۶۰ صفحات)	۱۶۰۰ روپے
۳- جناب ناصر شکیب	دلہیز (۱۱۱ صفحات)	۱۲۰۰ روپے
۴- جناب ابراہیم فیض	نگارس (۱۶۰ صفحات)	۱۸۰۰ روپے
۵- جناب اعجاز سہدی	کچے پتوں کی بوباس (۱۹۲ صفحات)	۱۲۰۰ روپے
۶- جناب غلام صوفی حیدری	کفِ گل فروش (۱۹۲ صفحات)	۲۰۰۰ روپے
۷- جناب قیصر الجعفری	آب دیدہ (۲۲۰ صفحات)	۲۵۰۰ روپے
۸- جناب ظفر گورکھپوری	ریزہ ریزہ (۱۱۲ صفحات)	۱۲۰۰ روپے
۹- جناب حفیظ اللہ مومن	ورق ورق لمحے (۱۱۲ صفحات)	۱۲۰۰ روپے

ب: تحقیق، تنقید، متنی تنقید، سماجی علوم:

نام	مسودہ	امداد
۱- جناب انور احمد خان	آپ بیتی نگاری (۱۸۰ صفحات)	۲۰۰۰ روپے
۲- ڈاکٹر خواجہ محمد حامد	امام بخش صہبائی (۱۶۲ صفحات)	۳۰۰۰ روپے
۳- محترمہ زرین تاج	احتساب (۱۰۰ صفحات)	۱۰۰۰ روپے
۴- جناب یوسف انصاری	تلوک چند محروم (۱۶۰ صفحات)	۱۶۰۰ روپے
۵- جناب صفدر	شاعری شیوۂ پیغمبری (۱۰۰ صفحات)	۱۰۰۰ روپے
۶- جناب ابراہیم اختر	ہندو فلسفہ (۱۵۰ صفحات)	۱۸۰۰ روپے
۷- جناب خلیل اللہ خلیل	تعلیم و تنقید (۱۱۰ صفحات)	۱۵۰۰ روپے
۸- جناب علی احمد اشرفی	علم عروض (۶۲ صفحات)	۷۰۰ روپے

ج: تعلیمی ادب -

نام	مسودہ	امداد
۱- محترمہ نسیمہ اختر سعید	جدید کشیدہ کاری (۲۰۰ صفحات)	۲۰۰۰ روپے

۲۔ جناب اے۔ ایم قادری — دس دن میں اردو (۶۰ صفحات) — ۸۰۰ روپے

۳۔ جناب امان اللہ شیخ — آؤ اردو سیکھیں (۵۰ صفحات) — ۷۰۰ روپے

د : نثر (افسانہ ۔ ناول وغیرہ)

۱۔ جناب رفیق مرزا شاکر کھام گانوی — ہیومر سیکنڈ ہینڈ (۱۰۰ صفحات) — ۱۱۰۰ روپے

۲۔ جناب خلیل انصاری — آنچل آنچل خوشبو (۱۶۰ صفحات) — ۱۸۰۰ روپے

۳۔ جناب غفور اسحاق — خاک کے رنگ اور برش (۷۲ صفحات) — ۷۵۰ روپے

۴۔ جناب سید نصیر الدین اعلیٰ — لڑکی کی قربانی (۱۵۰ صفحات) — ۱۶۰۰ روپے

س : سائنسی ادب :۔

۱۔ ڈاکٹر عبد المبین — علم المقابلہ (۱۰۰ صفحات) — ۳۰۰۰ روپے

ص : بچوں کا ادب :۔

۱۔ جناب غنی غازی — ریت کے گھروندے (۱۱۲ صفحات) — ۱۴۰۰ روپے

۲۔ جناب محبوب راہی — رنگا رنگ (۱۲۵ صفحات) — ۱۱۰۰ روپے

۳۔ جناب ارشد مینا نقوی — دھرتی کے تارے (۷۰ صفحات) — ۷۰۰ روپے

۴۔ جناب حیدر بیابانی — ننھی منی باتیں (۷۲ صفحات) — ۷۰۰ روپے

۵۔ ابراہیم عمادی — بچوں کی کہانیاں (۱۱۰ صفحات) — ۱۱۰۰ روپے

ھ : ترجمہ :۔

۱۔ جناب انیس چشتی — مراٹھی کی دس منتخب کہانیاں (۱۲۰ صفحات) — ۲۰۰۰ روپے

۲۔ پروفیسر م۔ خ شازلی — آنند مٹھ (۱۲۰ صفحات) — ۲۰۰۰ روپے

۳۔ پروفیسر امانت شیخ — وینس کا سوداگر (۱۰۰ صفحات) — ۱۵۰۰ روپے

۴۔ غلام صوفی حیدری — بیسویں صدی کے قاتل (۸۰ صفحات) — ۱۱۰۰ روپے

و : متفرق :۔

۱۔ جناب نسیم محمود — مرقع فیض (خطاطی) — ۵۰۰۰ روپے

۲۔ اردو کے ایک نابینا شاعر جناب کوثر یزدانی مرحوم — کلام کوثر — ۳۰۰۰ روپے

سرپرست
ڈاکٹر اسحٰق جم خانہ والا (چیئرمین)
دنائک راؤ پاٹل (وائس چیئرمین)

مجلسِ ادارت

نگرانِ اعلیٰ
خواجہ عبدالغفور (آئی اے ایس)

مدیر
حسن کمال

شریکِ مدیر
سلمیٰ صدیقی

صلاح کار
فضیل جعفری
ڈاکٹر عبدالستار دلوی
وِدّیا دھر گوکھلے

معاون مدیر۔ عبدالسمیع بوبیرے
مدد گار مدیر۔ شاہد ندیم

جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۳

قیمت:
دس روپئے

کتابت:
محمد اسلم کرتپوری
احمد اللہ خاں

سرورق:
ایم۔ حسین

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے گورنمنٹ سنٹرل پریس بمبئی نمبر ۴ سے چھپواکر دفتر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نیو ایڈمنسٹریٹیو بلڈنگ ۱۸ واں منزلہ بمبئی ۳۲۔۴۰۰ سے شائع کیا۔

ترتیب

مضامین:

۱۔ شامِ اودھ	کرشن چندر	۱۰
۲۔ افسانے کا ماضی اور حال	خواجہ عبد الغفور	۱۳
۳۔ سرزمین کوکن اور اردو لوک گیت	ڈاکٹر میمونہ دلوی	۱۶
۴۔ دکنی اردو اور پھول بن پر ایک نظر	ڈاکٹر عبد الستار دلوی	۲۳
۵۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش	صابرہ سعید	۴۴
۶۔ ستم ظریف	خواجہ عبد الغفور	۴۶
۷۔ مجنوں جو مر گیا ہے ...	حسن عباس فطرت	۴۹
۸۔ قابل اجمیری	ممتاز راشد	۵۳
۹۔ خواجہ وزیر لکھنوی	مطرب نظامی	۵۸
۱۰۔ امام غزل اور مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی	خواجہ عبد الغفور	۶۱
۱۱۔ شاہد صدیقی - ایک مطالعہ	حمیرہ جلیلی	۶۳
۱۲۔ ہمزاد بہادر	قسیم الحق گیاوی	۶۵
۱۳۔ جامعہ بمبئی میں اردو تحقیق کی رفتار	ڈاکٹر نظام الدین گوریکر	۷۱
۱۴۔ اردو صحافت کا ارتقائی جائزہ	سلمان ماہمی	۷۴
۱۵۔ کیا خوب ہے احساس ندامت	رام لال نابھوی	۸۶
۱۶۔ فیاضی اور سخاوت	ضمیر کاظمی	۸۸

افسانے:

۱۔ دو پرانے پاپی	خواجہ احمد عباس	۹۰
۲۔ چھول واٹکا	کنور سین	۹۲
۳۔ کالا سورج	سید آل رسول	۹۵

علاقائی ادب:

۴۔ گاندھاری	ڈاکٹر عبد الستار دلوی	۹۷
۵۔ خاص ترکیب	بدیع الزماں خاور	۱۰۰
۶۔ آہیں	یونس اگاسکر	۱۰۵
۷۔ نیا دور (ڈرامہ)	مشتاق جلیلی	۱۰۸
۸۔ کتنے بجے	علیم جہانگیر	۱۱۸

غزلیات ۱۲۱ سے ۱۴۵

۱- سکندر علی وجد
۲- عالمتاب تشنہ
۳- شمس فریدی
۴- شوکت نظمی
۵- وقار خلیل
۶- نور محمد یاس
۷- شہپر رسول
۸- محشر منظری
۹- اشفاق انجم
۱۰- رام لعل ندیم
۱۱- آزاد گلاٹی
۱۲- سیدہ نسیم چشتی
۱۳- مطرب نظامی
۱۴- تابش سلطانپوری
۱۵- انجم جے پوری
۱۶- تمکین الرحمٰن
۱۷- مصطفےٰ مومن
۱۸- قرار برہانپوری
۱۹- غلام رسول اشرف
۲۰- ظفر کلیم
۲۱- کرشن کمار طور
۲۲- صابر زاہد
۲۳- شمیم طارق
۲۴- امان اختر
۲۵- شمیم عباس
۲۶- رفیعہ شبنم عابدی
۲۷- خسروی
۲۸- مالوک سہسرامی
۲۹- سعید راہی
۳۰- ناظم انصاری
۳۱- آئی. ایم. ساجد
۳۲- شاہین بدر
۳۳- سید ارشاد حیدر

۳۴- یوسف جمال

۳۵- گوہر امروہوی

۳۶- سوز ملیح آبادی

۳۷- ابراہیم مقبول

۳۸- شمس قمر

۳۹- راہی قریشی

۴۰- عبدالحئی انجم

نظمیں :-

۱- دو ہے	بھگوان داس اعجاز	۱۴۶
۲- اندیشۂ فردا	حرمت الاکرام	۱۴۷
۳- یادش بخیر	نیاز حیدر	۱۴۹
۴- ترک تعلق	شاذ تمکنت	۱۵۳
۵- آخری دور کے انسان	عبدالاحد ساز	۱۵۴
۶- کوہ رواں	رشید عبدالسمیع جلیل	۱۵۵
۷- لاعلمی	فیاض رفعت	۱۵۸
۸- طوفان کے آنسو	بانو طاہرہ سعید	۱۵۹
۹- ایک خواہش	دو مصرا	۱۶۰
۱۰- تبدیلی		

گوشۂ جلیل:

۱- فصاحت جنگ جلیل ۔ فن اور فنکار	خواجہ عبدالغفور	۱۶۱
۲- فصاحت جنگ جلیل کے مختصر حالات	شبیر احمد راہی	۱۶۳
۳- والد محترم کے اشعار اور میں	مشتاق جلیلی	۱۶۶
۴- حیات جلیل کے چند پہلو	علی احمد جلیلی	۱۶۸
۵- جلیل مانکپوری ۔ عہد اور کلام ۔ ایک تجزیہ	راج بہادر گوڑ	۱۷۴
۶- فصاحت جنگ جلیل کا ادبی مقام	عبدالخالق انصاری	۱۷۷

تبصرہ :-

مشعل آزادی	عبدالسمیع بوبیرے	۱۸۵

انتظاریہ:

۱- تلخیوں اور پرچھائیوں کا شاعر ۔ ساحر لدھیانوی	رفیعہ شبنم عابدی
۲- کانچ کا آسمان (افسانہ)	اقبال مسعود



- اکادمی ڈائری
- رشتۂ تحریر

آغازِ سخن

نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں ؛

بے رنگ بہر رنگ ہر اک شان میں آیا
جب آنکھ کھلی دل کی تو پہچان میں آیا
تب حسنِ ازل پردۂ اِمکان میں آیا

ہم حسنِ ازل کو اپنی اکادمی کے علمی و ادبی جریدہ "امکان" میں لانے کے دعوے دار تو نہیں لیکن بہر رنگ اور بہر روپ اسکو نثری، شعری، تنقیدی اور افادی طور پر پورے اہتمام سے پیش کر رہے ہیں۔ اس جریدہ کے محاسن اور خوبیوں کو جن لوگوں نے سراہا ہے اور اس کو شرفِ مقبولیت عطا کیا ہے ان سے یہی عرض کریں گے کہ اس کا سہرا اُن دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے سر ہے کہ جنہوں نے اس کو اپنی تخلیقات اور شاہ کاروں سے نوازا ہے۔ بہت سوں نے تو اپنی کاوشِ قلم سے اتنا سنوارا ہے کہ حضرت داغ کا یہ شعر موزوں ہوتا ہے ؎

لیجیۓ دیتا ہوں میں دل کے سوا
اور بھی کچھ ہے مِرے اِمکان میں

بہرکیف جو کچھ بھی ممکنات سے تھا اسکو اِمکان بھر یا نہیں مقدور بھر پیش کیا جا رہا ہے ۔

اس بار ہم نے اپنے علاقہ کی زبان مرہٹی اور ساتھ ساتھ کوکنی کے علمی و ادبی خزانوں سے استفادہ کیا ہے اور آئندہ بھی ہماری یہ سعی جاری رہیگی اور یقین واثق ہے کہ یہ گوشے پسند کیۓ جائیں گے ـــ ہمیں اس بات کے اعلان کی بھی خوشی ہے کہ علمی و ادبی بلند معیار کے قائم رکھتے ہوۓ معاشی و اقتصادی مسائل پر ایسے مضامین اور انشائیے شائع کیۓ جائیں گے کہ جن سے اردو زبان کی افادیت حصول معیشت روزگار و ملازمت، تجارت صنعت و حرفت اور تکنیکی تربیت کے استحصال میں اردو داں طبقہ کو مدد ملے ان کو ایسا مواد ملے کہ جو ان کو معاشی طور پر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت اور حیثیت نصیب ہو۔

مہاراشٹر میں اردو کے لئے فضا ہمیشہ سازگار رہی اور اب تو ہم یہ بخوشی اعلان کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہر دلعزیز اور مقبول وزیرِ اعلیٰ شری عبدالرحمٰن انتولے کی سرپرستی میں یہ زیادہ ہی سازگار ہے ۔ اردو بولنے سمجھنے والے تو بے حساب ہیں ہی اب اکادمی کی کاوشوں سے پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد میں قابلِ قدر اضافہ ہو رہا ہے ۔ علمی ادارے، کتب خانے اور ریڈنگ روم مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات آپ کی خدمت میں علیحدہ پیش ہیں۔

البتہ نورس اور امکان کے زیورِ طباعت سے آراستہ اور پیراستہ ہونے کا سہرا حکومت مہاراشٹر کے سنٹرل پریس کے سر ہے چنانچہ صدرِ جمہوریہ نے ۲۹ / نومبر ۱۹۸۰ء کو نورس کو علاقائی زبانوں کے زمرہ اردو میں امتیازی قرار دیتے ہوۓ انعام سے نوازا ہے۔ جس کے لئے ہمارا ادارہ اور سارا اردو داں طبقہ شکر گزار ہے

اپنی بات

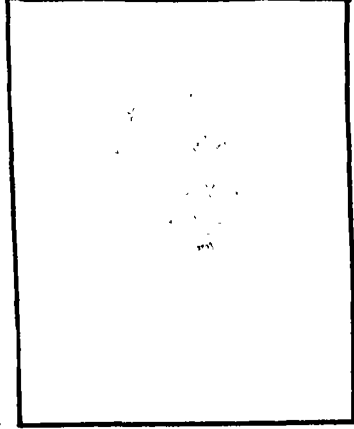
'امکان' کا تیسرا شمارہ ملاحظہ فرمایئے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ اُسے بہتر سے بہتر بنا سکیں۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے مواد ومتن میں اور زیادہ وزن اور وقار پیدا ہو۔ لیکن یہ کام اردو کے مقتدر ادیبوں ناقدوں اور صاحبانِ قلم کا تعاون کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ چوتھے شمارہ میں ہمیں ملک بھر سے ادیبوں کے رشحات قلم جلد از جلد مل جائیں گے۔

'امکان' کو یہ افتخار تو بہر حال حاصل ہے کہ وہ اس وقت ملک کا ضخیم ترین اور شائد حسین ترین سہ ماہی ہے۔

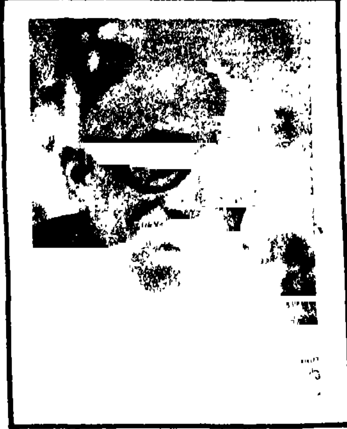
"ایں سعادت بزور بازو نیست"

اس شمارہ میں محترمہ سلمیٰ صدیقی نے جو محنت اور کاوش کی ہے، میں اس کے لیۓ ان کا بے حد شکر گذار ہوں۔ خواجہ عبدالغفور صاحب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پیش پیش رہے۔ میں اکادمی کے دیگر اراکین کا شکریہ ادا کرنا بھی فرض گردانتا ہوں۔ ان تمام افراد کی محنتوں کا نتیجہ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ آپ ہمیں مشوروں سے بھی نوازیں گے کہ اسے خوب سے خوب تر کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ آپ نے اب تک جو تعاون کیا ہے اس کا بھی بے حد شکریہ

اس شمارے کے
قلمکار



سکندر علی وجد



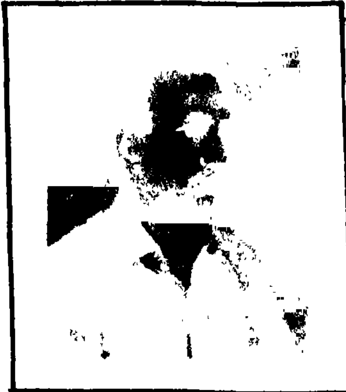
خواجہ احمد عباس



ڈاکٹر نظام الدین گوریکر



روی مصرا

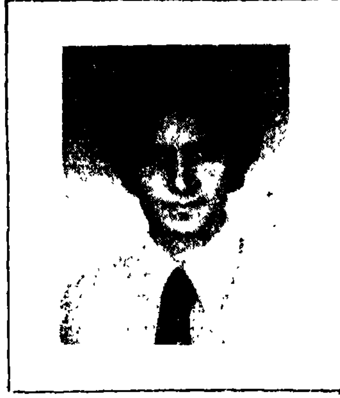


کنور سین

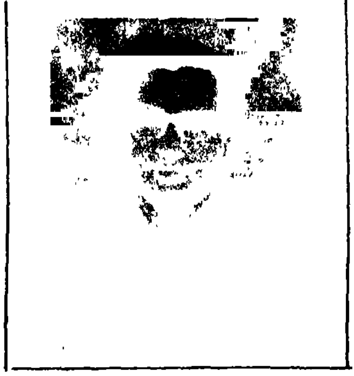


ڈاکٹر میمونہ دلوی


ڈاکٹر عبدالستار دلوی

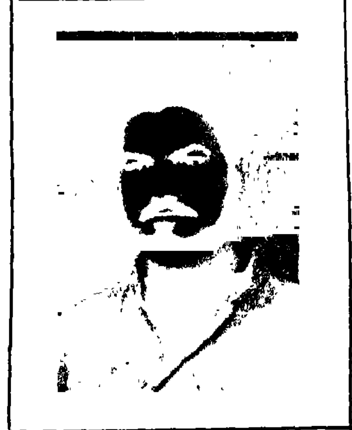

یونس اگاسکر


بدیع الزمان خاور

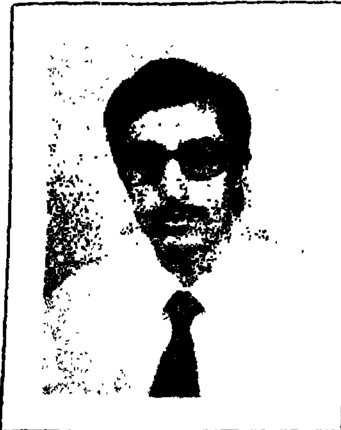

آزاد گلاٹی


سید آلِ رسول


ممتاز راشد


حسن عباس فطرت


مشتاق جیلی


عبدالسمیع بوبیرے



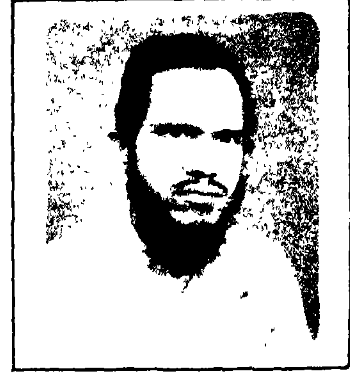
رفیعہ شبنم عابدی



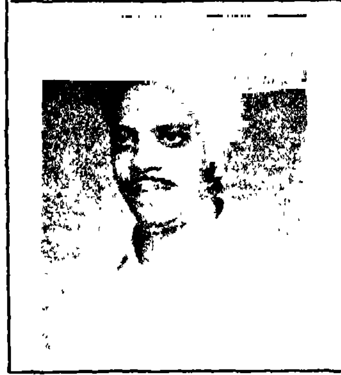
محشر منظری



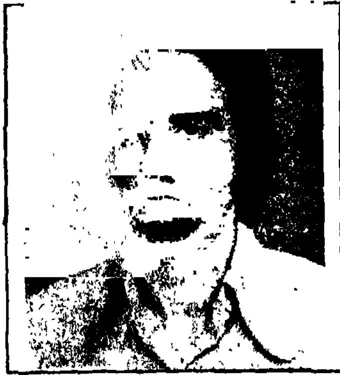
تابش سلطانپوری



قسیم الحق گیاوی



سلمان ہاشمی



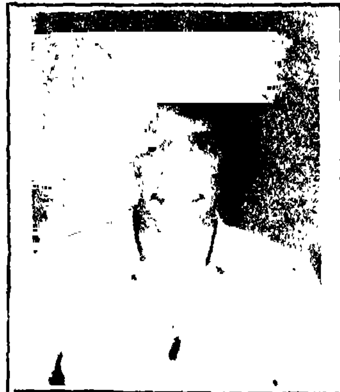
تمکین الرحمان



شمیم عباس



سعید راہی



شمس قمر

کرشن چندر

شامِ اودھ

شامِ اودھ کے موقع پر ہم لوگ موجود نہ تھے۔ ہم لوگ تو ایک نئے چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی لیکر آئے ہیں۔ لیکن جو کچھ بزرگوں سے سنا ہے یا جو کچھ کتابوں میں پڑھا ہے اس سے شامِ اودھ کی سانولی سلونی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں تو ہر شام سانولی سلونی ہوتی ہے۔ جب سورج چھپ جاتا ہے اور افق کے گلے میں شفق کی مالا چمکنے لگتی ہے اور املی کے گھنیرے پیڑوں پر تھکے ماندے طائر پھڑپھڑاتے ہوئے گھونسلوں پر گرتے ہیں۔ اور فضا میں ایک عجیب سی حسرت ناکی اور ویرانی برستی ہے اور آدمی نہیں جانتا کہ وہ روئے یا ہنسے، شامِ اودھ یا تو ایک ایسا آنسو ہے جس میں تبسم گھلا ہوا ہے۔ یا وہ ایک ایسی مسکراہٹ ہے جو اپنی پنہائی میں ہزار آنسو چھپائے ہوئے ہے۔ اس کے سانولے چہرے پر کم ہوتی ہوئی شفق کی سرخی ہے۔ دو ہزار برس پرانی تاریخ کی بلاوت ہے۔ آنے والی رات کا سوز ہے۔ اور زلف بکھری بکھری ہے کیوں کہ تاج لٹ چکا ہے اور وہ ہاتھ قلم ہو چکے ہیں جنہوں نے ہندی تلوار کو عظمت بخشی تھی۔

جب ایک عہد جاتا ہے اور دوسرا عہد آتا ہے تو ہر قوم کی تاریخ میں ایک ایسی شام ضرور آتی ہے۔ جس میں درد اور گداز ویرانی اور حسرتناکی گھلی ہوتی ہے۔ اودھ کی شام بھی تاریخ کا ایک ایسا ہی منظر ہے جب ہندی تلوار نے انگریزی رائفل کے آگے سر جھکا دیا۔ اور تاریخ کے ایک لمبے پُرعظمت اور پُرشکوہ باب پر آخری پردہ کھینچ دیا۔ چونکہ یہ ڈرامہ ہماری اپنی قومی زندگی کا ایک المیہ ہے۔ اس لئے ہم اس پر تالی نہیں بجائیں گے۔ حالانکہ جب پردہ گرتا ہے تو تالی بجتی ہے۔ مگر اپنی قوم کے ڈوبتے ہوئے سورج پر کون تالی بجاتا ہے۔ یہ شام سر جھکانے اور گھٹنے ٹیک دینے کی داستان ہے۔ اس پر کوئی غدار ہی شادیانے بجا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں آج ظاہر ہے شامِ اودھ پر شادیانے بجانے والا کوئی نہیں رہا۔ آج ہم اس قسم کے سستے جذبات سے الگ ہو کے یہ ضرور سوچ سکتے ہیں کہ یہ شامِ اودھ کیسی تھی؟ اس میں کون سے رنگ گھلے ہوئے تھے؟ اس کی سلونی کیفیت کی اساسی کہانی اس کی سندرتا کی چمک کہاں سے آئی تھی؟ اس کی اداسی ویرانی اور حسرتناکی کا دھارا کدھر سے پھوٹتا تھا؟

زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شامِ اودھ ہندوستان میں مغلئی جاگیرداری دور کی آخری شام ہے اس شام کا آنا اتنا ہی لازمی اور ناگزیر تھا جتنا سانڈنی سوار کی بجائے ریل گاڑی کا تھا۔ یا نامہ بر کبوتر کے بجائے ڈاک کے ہرکارے کا آنا۔ ناگزیر ہونے کے باوجود ذہنی کوفت اس لئے ہوتی ہے کہ ریل گاڑی سانڈنی سوار سے کہیں زیادہ تیز رفتار رہے۔ لیکن زندگی کے اس دور میں جو شامِ اودھ پر ختم ہوا۔ سانڈنی سواروں نے ملکوں، تہذیبوں، دلوں، گاؤں شہروں امیدوں اور گیتوں کو ایک دوسرے سے ملانے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے۔ میں شامِ اودھ کے واپس لانے کے حق میں نہیں ہوں، لیکن میں اس کی خوبصورتی کا احساس تو کر سکتا ہوں۔ افق کی آخری حد پر سے گذرتے ہوئے سانڈنی سوار، اور گلے میں کسی نامراد عاشق کا پیام تعویز کی طرح لٹکائے ہوئے نامہ بر کبوتر چلے جا رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ حدِ افق پر سے ریل کا انجن دھواں اڑاتا ہوا فاتحانہ انداز میں داخل ہوتا ہے۔ اور ہرکارہ دوڑتا ہوا میرے پاس آتا ہے "بابوجی آپ کا خط ہے!" اس تصویر کے بعد یہ دوسری تصویر اُبھر آتی ہے۔ افسوس دوسری تصویر کے ابھرنے کا نہیں ہے، افسوس اتنا ضرور ہوتا ہے کہ تاریخ پرانے خدمت گذاروں کو پنشن نہیں دیتی۔ انھیں ختم کر دیتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے یہ تو تاریخ کا دستور ہے۔

اودھ کی شام کا آخری منظر لکھنؤ میں ملتا ہے۔ جو اودھ کے تاجداروں کا آخری مسکن تھا۔ یہیں پر اس شام کی ساری رعنائی اور ساری اداسی عود کر آتی ہے۔ جس نے شامِ اودھ کو ہماری تاریخ میں ایک محاورے کا رتبہ دیا ہے وہ شرافت و نجابت میں گھلا ہوا لب و لہجہ کہ شہد کو بھی اس سے رشک محسوس ہو، وہ فراخ سینے اور تنگ کمر والی اچکنیں پہن کر

جب عورتیں چلیں تو یوں معلوم ہو گویا سمندر کی لہریں اٹھلا کے چل رہی ہوں۔ وہ آداب کرنے کا بانکا سلیقہ، وہ گلوری پیش کرنے کا انداز، وہ نفیس کھانے اور گھرے ہوئے گھر میں کھلے کھلے آنگن اور چھوٹے چھوٹے ستون اور محرابیں اور دھیمی دھیمی ہنسی، نہ بہت تیز نہ بہت مدھم، مگر درست اور مہذب اور باسلیقہ یہ گھلا ہوا رچا ہوا انداز تہذیب اور ہمارے تمدن میں ہزاروں برس کی مسلسل کاوش کے بعد آیا ہے۔ اور یہ رکھنے اور پرکھنے اور آگے بڑھنے کی چیز ہے۔ اور گو اس میں شبہ نہیں کہ ہر شام دوسری شام سے الگ ہوتی ہے اور ہر دن دوسرے دن سے الگ ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہر شام شفیق کی سرخ چن لیتی ہے۔ اور ہر دن سورج کی روشنی قبول کر لیتا ہے۔ تاریخ کا ادراک رکھنے والوں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔

میں نے ابھی کچھ دیر پہلے شام اودھ کے سلسلے میں آنسوؤں کے درمیان تبسم اور تبسم کے بیچ میں آنسوؤں کا ذکر کیا تھا۔ میرا اشارہ دراصل اس خارجی تواتر (Formalism) سے تھا جو ہر مٹتی ہوئی تہذیب کے موقع کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ شام اودھ بھی ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور سماج کا ایک مرقع تھا۔ اس خارجی تواتر میں آج بہت سی چیزیں مضحک معلوم ہوتی ہیں۔ گو اس وقت وہ باتیں مضحک نہیں تھیں، لکھنؤ کے بانکے اس وقت بالکل مضحک نہیں تھے۔ وہ اس وقت کی سماجی زندگی کا ایک ضروری حصہ تھے، آج ان کی بہادری جرأت اور فیاضی کے قصے پڑھ کر کبھی ہنسی آتی ہے، کبھی رونا آتا ہے۔ کیونکہ جب سماج اندر سے سڑنے لگتا ہے تو صرف اوپر کی چمک دمک اور پالش رہ جاتا ہے۔ اور کوئی سماج صرف اوپر کی چمک دمک کے سہارے کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک دن یہ خول بھی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔ شائد لکھنؤ میں آج بھی تلاش کرنے سے اس خول کے ٹکڑے کہیں کہیں سے مل جائیں گے۔ انھیں جھاڑ پونچھ کر، ان کی گرد اُتار کر دیکھیئے تو آج بھی شفاف اور چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر یہ ٹکڑے ہیں۔ اور خول کے ٹکڑے ہیں۔ گودا غائب ہے! جیسے شام اودھ کی شاعری میں بھی گودا غائب ہے۔ اس کی چمک دمک تو ایسی ہے کہ آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ مگر گودا غائب ہے یعنی معشوق کی کمر غائب ہے اور عاشق کی پسلیاں! اب اس بے پسلی کے عاشق اور بے کمر والی معشوق والی شاعری اگر لفظی ہیر پھیر اور تصنع سے بھری ہوئی نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ اس دور کی شاعری میں بالعموم معشوق کے کمر نہیں ہوتی۔ گلے میں آواز نہیں ہوتی، اور دماغ میں عقل بھی نہیں ہوتی۔ اس شاعری سے ہمیشہ آہوں کا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ اور جگر محبت کی سیخ پر کباب ہوتا رہتا ہے۔ شاعری کیا ہے اچھی خاصی کبابیے کی دکان ہے!

یہ خارجی تصنع صرف شاعری میں ہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ اس دور کی عمارتوں ہی کو لے لیجئے۔ اور پھر اس کا مقابلہ فتح پور سیکری یا تاج محل سے کیجئے تو خود بخود ہنسی آجائے گی۔ شام اودھ کے چھوٹے چھوٹے روضے اور مقبرے، جاگیرداروں کی چھوٹی چھوٹی بالکنیوں، تنگ چوکور کھڑکیوں، بھدی جالیوں، شہ نشینوں اور محرابوں کے محل جن کے دروازے پر مٹی کے ہاتھی یا لنگور کھڑے نظر آتے ہیں۔ یا پتھر کے سپاہی تلواریں سونتے ایک عجیب بے ہنگم سی پگڑی باندھے نظر آتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ لوگ لڑتے وقت اپنی پگڑی سنبھالتے ہوں گے یا تلوار چلاتے ہوں گے۔ ان عمارتوں سے ایک ایسی تنگ دلی، رذالت کا اظہار ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عمارت نہیں ہے۔ ایک ساہوکار ہے، جو آلتی پالتی مارے اپنا ہی کھاتہ کھولے سامنے بیٹھا ہے۔ نہ ان میں وہ جمالیت ہے جو تاج اور جہانگیر کے مقبرے میں ہے نہ وہ قوت اور شوکت جو فتح پور سیکری کے دروازے میں ہے۔ ان عمارتوں کا افق نیچا ہے۔ اور دل گھٹا ہوا ہے۔ کیونکہ جب شام اودھ آئی تھی، اس وقت ہماری زندگی کا افق بہت نیچا تھا۔ اور دل گھٹا ہوا تھا اور اس لئے یہ حسرتناکی اور ویرانی اور گھٹن اس دور کے بیشتر شعبوں میں جھلکتی ہے۔

آج شام اودھ ہم سے بہت دور پیچھے رہ گئی ہے۔ آج اس کی یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔ ایک ایسی پرانی خوشبو کی طرح جس میں اس کی بہت سی خامیاں اور خوبصورتیاں گھلی ہوئی ہیں۔ اور جب یادیں خوشبوئیں بن جاتی ہیں تو ان کی تلخی بھی گوارہ ہو جاتی ہے۔ اسی لئے تو آج اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود شام اودھ کی تصویر اور دن کی زندگی کا محاورہ اور پیرائیہ ہمیں اس قدر دلچسپ اور حسین معلوم ہوتا ہے مگر شام اودھ کی ملی جلی متنوع خوشبو کا احساس کرتے ہوئے یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ شام اودھ ایک شہری زندگی کی شام تھی، اور جب اودھ کے بہت سے شہروں میں شام ہو رہی تھی اودھ کے بہت سے دیہاتوں میں سویرا ہو رہا تھا۔ اور ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ گندم کے خوشے گاؤں کی دھرتی سے سر اٹھاتے ہیں!!



خواجہ عبدالغفور

شامِ افسانہ کی افتتاحی تقریر

افسانہ کا ماضی اور حال

انسان نے جب اپنے ارتقاء کی منزلوں کی طرف قدم بڑھانے شروع کئے تو دماغی صلاحیتوں اور جسمانی قوت سے اپنے گرد و پیش کے [illegible] مخالفین۔ جاندار اور بے جان سب ہی سے نبرد آزمائی کی اور برسرِ پیکار ہو کر ان پر قابو پانے لگا۔ اس کشمکش حیات اور تنازع للبقاء کی مسلسل جدوجہد میں مشغول رہا لیکن جب تک باقاعدہ نطق اور قوتِ گویائی اس کو نصیب ہوئی وہ اپنے آپ کو تنِ تنہا محسوس کرتا رہا۔ لیکن جیسے ہی اظہارِ خیال اظہارِ واقعہ اور اپنی خواہشات کو دوسروں کے سامنے رکھنے کی طاقت اس کو میسر ہوئی اس نے اپنی بیتی اور بپتا کو اپنے ساتھیوں کو سامنے رکھنا شروع کیا۔ جولانئ طبع اور دماغی اپج نے اسکو حقائق اور وقائع سے ہٹا کر کبھی زبان چلانا سکھایا۔ یہیں باتیں کہانیاں بنتی گئیں اور داستان سرائی کا آغاز ہوا۔

جیسے جیسے انسان قدرت عناصر اور اس کے دشمنوں پر قابو پاتا گیا اس کی زندگی سعی پیہم اور مسلسل جدوجہد باقی نہیں رہی اب اس کے پاس اتنا وقت اور دماغی سکون تھا کہ وہ اپنی کشمکش کو بہلانے سہلانے اور رومان کی لذتیت میں محو ہو جانے کے لیے اس شغل کو مستقل طور پر اپنایا کہ جو آج بھی روایت و حکایت، کتھا، داستان۔ قصہ کہانی، افسانہ، آپ بیتی، پر بیتی، جگ بیتی ناول اور اس قسم کے بے شمار اصناف کو استعمال کر رہا ہے۔

بنیادی طور پر انسانی دماغ محض وقائع نگاری کو قبول نہیں کرتا کہ وہ سپاٹ ہو جاتی ہے اس کے ساتھ کچھ حاشیئے مبالغے لطافت رومان پروری کے اضافے مقبولیت عطا کرتے ہیں، اس طرح پر ہمارے کہانی کار یا افسانہ نگار، بڑی حد تک دو حصوں میں بٹ گئے، ایک تو وہ محض حقیقت پسند اور حقائق نگاری کے قائل رہے۔ انھوں نے تجربات مشاہدات اور حقیقی محسوسات کو ضبطِ تحریر کیا، دوسرے وہ کہ جو رومانیت تصور اور تخیل کے چٹخارے شریک کرنے لگے، کہانیاں بھی پیچ در پیچ ہوتی گئیں دلچسپ کردار نمودار ہونے لگے، شجاعت اور برتری کے لوازمات نے دلچسپی میں اضافے کئے۔

یہاں پر یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ابتدائی دور میں کہانی ایک نہایت ہی پرلطف مشغلہ رہا اس لیے کہ اس میں انسان کی اَنا ہر جگہ اجاگر تھی اس کی کامیابی اور کامرانی اس کی تسکین کا ذریعہ رہی وہ جہاں جہاں نہیں پہونچ پاتا اور جو منزلیں اس کے دل و دماغ پر حاوی تھیں وہ تک وہ اپنی کہانیوں کے اڑن کھٹولے میں پہونچ جاتا، گو اس کے پر نہیں تھے لیکن طاقتِ پرواز تھی۔

ہندوستان کی تاریخ میں رامائن، مہابھارت کی رزمیہ کہانیوں سے کہانی کاری کی ابتداء ہوتی ہے لیکن اس دور کی رزمیہ اور بیانیہ، حکایتوں کو کتھا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور کتھا کہنا سننا یا کتھا باچنا ایک دلچسپ مشغلہ رہا ہے جس میں بڑی حد تک مذہبی رنگ شریک رہتا ہے۔ اردو ادب میں جن تصانیف یا تخلیقات کو باقاعدہ داستان سرائی کہا جا سکتا ہے وہ انیسویں صدی کی بالکل ابتداء میں ملتی ہیں

اب ہم داستان گوئی یا کہانی کاری کے فن کو ان کے اسلوب طرز نگارش انداز بیاں اور تکنیک کی باریکیوں کے اعتبار سے کئی اصناف و اقسام میں بانٹ سکتے ہیں حالانکہ بالعموم ان کو قصہ کہانی افسانہ کے مرکب عنوان کے تحت ایک ہی زمرہ میں شریک کر دیا جاتا ہے تکنیک کی بنیاد پر وجہی کی سب رس اردو کی پہلی داستان ہے لیکن فی الواقعہ اردو کی پہلی کہانی سید انشاء اللہ خان انشاء کی رانی کیتکی ہے۔ (۱۸۰۳ء) اس کے بعد میر امن کی باغ و بہار،

حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل اور طوطا کہانی ، خلیل علی خاں اشک کی
داستانِ امیر حمزہ ، مظہر علی ولا اور للو لال کی بیتال پچیسی کاظم علی جوان
اور للو لال کوی کی سنگھاسن بتیسی ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۲ء کے درمیان لکھی گئیں
اور مقبول ہوئیں ۔ ہم اسکو داستان گوئی کا دور کہتے ہیں لیکن فی الحقیقت
یہ تصنیفات کتھاؤں کی صنف میں جن میں دیو مالا بھی شامل ہیں ،

داستان کی تعریف ہم کچھ اس طرح کر سکتے ہیں پر حجم اور ضخامت کے
اعتبار سے مختصر متوسط اور کچھ طول طویل ہونیکے باوجود بھی اس میں تنظیم
ترتیب ساخت جذباتی اور غیر منطقی مبالغہ اسلوب اور طرزِ بیان کی یکسانیت
پائی جاتی ہے کہ جو شوق و ذوق کو اجاگر رکھتی ہے اور پھر ایک حکایت کے
شاخسانے اور ضمنی قصے بھی جڑے ہوتے ہیں جیسے الف لیلہ یا داستان
امیر حمزہ طلسم ہوشربا وغیرہ

ابتدائی دور میں داستاں نویسی سے زیادہ داستان گوئی بہت
زیادہ رائج اور مقبول عام تھی اور یہ بھی ایک اچھا خاصا فن رہا ہے
اسی لیے کہتے ہیں ،

زمانہ بہت غور سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

انیسویں صدی کے ختم پر جعفر علی شیون کی طلسم حیرت محمد عسکری و آغا
جحو کی بوستانِ خیال ، حامد علی خاں کی ہزار داستان مرزا حیرت دہلوی کی
شبستان حیرت اور رتن ناتھ سرشار کی الف لیلہ نے داستان گوئی کو
غیر معمولی مقبولیت عطا کی ۔

بادشاہوں ، شہنشاہوں ، رئیسوں ، راجوں مہاراجوں کے دربار
میں مصاحبوں نے داستان گوئی کو باقاعدہ فن اور لطف و انبساط کا ذریعہ
بنا کر پیش کیا اور پھر اجنہ ، دیوی دیوتا پری ، دیو ہیکل انسان غیر مرئی
اجسام آسمانوں پر رہنے والے کردار ان داستانوں کو بے حد مرغوب
بنلتے رہے ، طلسمات مادہ ، روح سحر فسوں کی نیرنگیاں زیبِ داستاں
رہیں ۔ داستان سرائی کی ان ہی روایتوں اور سج دھج کو لے کر نذیر احمد
عبدالحلیم شرر اور سرشار جیسے ناول نویسوں نے تخیل تصور شعریت رومانیت
طباق کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کی مصوری ترجمانی ، نقاشی تغیر بلکہ
عکاسی کو بھی اپنایا اور ایک نئی ڈگر کی بنیاد ڈالی ۔

کہیں کہیں ان قصائص میں معاشرہ کی خرابیاں اور اصلاحی پہلو بھی
شریک کیے گئے چنانچہ علامہ اقبال نے کہہ ڈالا ۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

داستان کے ساتھ ساتھ ہم قصہ گوئی کی صنف کو بھی ایک
علیحدہ مقام دینا چاہتے ہیں پر یہ بھی مذہبی کتابوں میں بڑے اہتمام
سے پیش کی گئی ہے مثلاً انجیل کی تمثیلات ، کلام مجید میں سورہ یوسف
کے احسن القصص ، قصص الانبیاء اور مولانا حفظ الرحمٰن کے مرتبہ قصص القرآن
وغیرہ وغیرہ بھی پند و نصائح سے بھرے پڑے ہیں اور بے حد دلچسپ
اور جاذب ماغ ہیں ، ہندو میتھالوجی میں دیو مالائیں اساطیری انداز میں پیش
کی گئی ہیں ۔

شاعرانہ انداز اور مزاج میں جو قصہ پردازی کی گئی وہ اظہار عشق
کا ذریعہ رہی ۔

کچھ ماجرائے دل تو نہ اتنا دراز تھا
زلفوں کا ذکر چھیڑ کے قصہ بڑھا دیا

کسی ماجرہ اور واقعہ کو حکایت کا روپ دینا اور روایتی انداز میں
احوال بیانی بھی ایک فن رہا ہے اور ان کے لوازمات فرصت اور وقت کی
فراوانی تھے اور مقصد نشاط خاطر اور ذہنی عیاشی رہے ہیں اور ان میں
کوئی ترتیب یا ترکیب نہیں تھی اس لیے راوی یا حکایت پیش کرنے والے
اپنا مقام برقرار نہ رکھ سکے ۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم

ان ہی کتھاؤں داستانوں ، قصص اور حکایات کی طوالت اور
ہوش ربائی نے انگریزی لفظ نوول کے لغوی معنیٰ "جدیدیت" کے اعتبار
سے ناول کا نام پایا جو آج بھی ان ہی کے الف کا مظہر اور آئینہ دار ہے ۔
دنیا کے کونہ کونہ میں انقلاب برپا ہوتے رہتے ہیں کہیں تباہی
تو کہیں نشاۃ ثانیہ ، اس لیے سوچ بچار فکر اور تخیل کی پرواز بھی معاشرہ
سماج اور ماحول سے متاثر ہوتے رہے اور ان کا پرتو ہر داستان ہر قصہ اور
ہر کہانی میں نظر آتے ہیں لیکن اردو ادب کے نشاۃ الثانیہ میں ہم داستان گوئی
کے فوری بعد کہانی کی صنف کو ابھرتے دیکھتے ہیں کہ جو محض تخیل رنگینی ،
رومانیت ، مبالغہ مضحکہ تصور اور خیالی بلند پردازی سے ہٹ کر حقیقت
اور روزمرہ کی دنیا کی طرف عود کر آئی ۔

نذیر احمد شرر اور سرشار نے عبوری دور میں داستان کو کہانی کی
طرف موڑ دیا اور ان کی تخلیقات میں امتزاج ملتا ہے جس کی وجہ سے

ترقی کے مدارج طے کرنے میں بڑی مدد ملی۔ کہانی اور پھر اس کے دوسرے روپ افسانہ نے اردو ادب میں ناول کو بھی ایک بڑی زبردست اور منفرد صنف کی شکل میں پیش کیا۔ اس کی ابتداء نذیر احمد سے ہوئی ان کے بعد شرر اور سرشار محمد علی طبیب راشد الخیری وغیرہ وغیرہ کے نام ابھرتے ہیں۔ اس ادبی سفر کی ابتداء کو منزل تک پہونچانے کا سہرا منشی پریم چند کے سر ہے کہ انھوں نے نہ صرف سماجی بلکہ معاشی اور سیاسی زندگی کے مسائل کا مشاہدہ کیا بلکہ اپنی فکر اور اپنے جذبات کی صحیح آمیزش کو ایک فنکارانہ جلا کے ساتھ اعلیٰ مرتبہ دیا۔ اس میں جذباتی اصلاح کے پہلو بھی شریک ہیں۔

ان ہی عوامل اور محرکات نے جب قارئین کی نگاہوں کو بصارت کے سوا بصیرت بھی عطا کی تو یہ تقاضا پیش ہوا کہ رومان ہیجان تخیل کو چھوڑ کر زندگی کی سادہ اور پر پیچ حقیقتوں اور ساتھ ہی ساتھ الجھنوں کو تفکر کی گہرائی اور گیرائی کے پس منظر میں اس طرح پیش کیا جائے کہ جو نفسیات احساسات، تاثرات کو چھوئے اور اس لمس سے بیداری فکر و خیال پیدا ہو اس کو ہم کہانی کاری کا دور کہہ سکتے ہیں کہ جس میں ناول کی طوالت سے گریزاں ہو کر اختصار کی طرف مائل ہو گئے

گو کہانی اور افسانہ آج کے ادبی دور میں ہم معنیٰ ہو کر رہ گئے ہیں لیکن میری رائے میں ان دونوں میں کسی حد تک واجبی حد بندی ہے کہانی نما داستانوں کے وجود ہمیں اعتراف نہیں اس لیے کہ رانی کیتکی کی کہانی طوطا کہانی وغیرہ بہت پہلے لکھی جا چکی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک کہانی سے دوسری کہانی جڑتی جاتی تھی، ان کہانی نما داستانوں کا لامتناہی سلسلہ ضمنی کہانیوں سے سسپنس اور تصنع سے جڑا ہوتا اس ہیئت ترکیبی کو کہانی کی اٹھان یا کہانی کا ابھار کہا جا سکتا ہے۔

لیکن بہت جلد ہمارا ادب اس عبوری دور سے بہت آگے کی طرف چل پڑا اور ایک بار قاری حقیقی دنیا میں لوٹ آئے اور کہانی کو محض دلچسپی اور تفریح طبع کا ذریعہ بن کر رہنے نہ دیا، معاشرہ سماج زندگی اور منفرد شخصیتوں (کرداروں) کے احساسات اور تاثرات کی تصویر کشی کہانی کار کا مقصد بن گئی اور یہ مان لیا گیا کہ کہانی میں کہانی پن ہونا چاہئیے اس کے بغیر محض ہیئتی تجربے کی بنیاد پر کہانی مرغوب ہوتی ہے نہ مقبول۔ اور کہانی کار کا قاری تک پہونچنا لازمی قرار دیا گیا۔ یہ بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے ہر موڑ پر ایک کہانی کھڑی ہوتی ہے اور کہانی بچپن کو جوانی اور بڑھاپے سے جوڑتی ہے اور شخصیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سب سے بڑا کہانی کار وہ ہے کہ وہ اپنی کہانی کی ترتیب کیلئے لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ اسکی شوخئ تحریر ہر پیکر تصویر کو کاغذی پیرہن دیتی ہے اور جہاں کہانی کار بہت زیادہ حقیقت پسند ہو جاتا ہے وہ خود کہانی بن جاتا ہے اور آئندہ نسلوں کو اپنی کہانی سونپ دیتا ہے، اس لیے کہ ہر انسان کی زندگی ایک مکمل کہانی ہے چاہے اس کو لفظی جامہ پہنایا جائے کہ نہ پہنایا جائے، کہانی میں ژولیدہ بیانی، بے یقینی، بے نامی کہانی کو کبھی کبھی کامیاب نہیں بناتے اور نہ ہی لایعنیت یا ابہام کے پردے کہانی کو دلچسپ بناتے ہیں

ہے آج جو سرگذشت میری
کل اس کی کہانیاں بنیں گی،

کہانیوں کی حقیقت آفرینی کو زیادہ باریک بینی سے دیکھنا ہو تو پھر لوک کہانیاں بہت ہی زیادہ قدرت قدرتی ماحول تہذیب تمدن کی جکڑ بندیوں سے آزاد لوگوں کی کہانیاں ہیں کہ جن میں کوئی تصنع یا خیالی اپج نہیں ہوتے یہ معصوم لوگوں کی زندگی اور ان کی فکر کا چربہ ہوتی ہیں۔ زماں و مکاں دن اور تاریخ وقت اور اسکی روانی نیز کاروبار کی ہنگامات سے تھکا ہارا انسان داستان ناول تو کجا کہانی سے بھی گھبرانے لگا ہے اور اسکی تفریح طبع کے لیے منی کہانیاں بھی لکھی جانے لگی ہیں کہ جو لطیفہ یا چٹکلہ کے برابر ہوتی ہیں لیکن اس حد تک مختلف کہ اول الذکر میں سنجیدہ باتیں اور وقائع بیان کیے جاتے ہیں اور موخر الذکر میں محض ہنسانے والی چٹکیاں لینے والی گدگدانے والی باتیں ہوتی ہیں کہ وقتی طور پر لطف و انبساط پہونچاتی ہیں۔

کہانی کا روپ آپ بیتی پر بیتی اور جگ بیتی بھی ہو سکتا ہے اور مکالمہ کے اسلوب پر بھی ظریفانہ انداز میں کبھی کبھی تو کسی کی آپ بیتی کو باپ بیتی بھی کہا جا سکتا ہے جیسے کہ جوش ملیح آبادی کی یادوں کی برات اور جو غیر دلچسپ ہو اور محض کٹھنائیوں کا دکھڑا ہو اسکو رام کہانی کا نام دیا جاتا ہے، حضرت غالب کو شکایت تھی۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہانی اور افسانہ میں کوئی خاص فرق نہیں لیکن افسانہ کو ماضی قریب سے وابستہ دیکھا جاتا ہے کہ جسکی ابتداء پریم چند کے مختصر افسانوں سے ہوتی ہے، سجاد حیدر یلدرم

سلطان حیدر جوش ، نیاز فتح پوری ان کے ہم عصر ہیں لیکن ان کی تخلیقات میں داستانی رنگ اور شاعرانہ حسنِ بیان کی باقیات ملتی ہیں جو داستانی روایت سے حاصل کی گئی ہیں ، افسانوں میں زندگی کے نقش ۱۹۲۱ء کے بعد سے نسبتاً زیادہ گہرے نظر آتے ہیں جن کی ترجمانی جذباتی لگاؤ سے منسلک ہے ہمارے افسانوں کو اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں تراجم بھی بڑی حد تک دخیل رہے ۔ مختصر افسانے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۵ء کی مختصر سی مدت میں فنی اور تیکنیکی تجربوں کے سہارے بڑی زبردست ترقی کی اور اس فن کو تکمیل تک پہنچا دیا ۔ اس دور کی خصوصیات یہ ہے کہ ان افسانوں میں مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کی لطیف و پرکشش آمیزش ہے اور پھر مغرب کا فن ہمارے افسانہ نگاروں کے مطالعہ کی وسعت کی وجہ سے غیر محسوس طریقہ پر باغیانہ انداز میں ہماری روایت میں دخیل ہو گیا ۔

اس کی سب سے پہلی اور اولین مثال منشی پریم چند کا افسانہ کفن ہے اور دوسری مثالیں افسانوں کے اس مجموعہ میں ملتی ہے کہ جو انگارے کے نام سے چھپا ۔

اسی زمانے میں اس نئے اسلوب تحریر اور فکر کے مشترکہ نمونے ترقی پسندی کی تحریک کی بنیاد بن گئے اور اگلے دہے میں بعض تخلیقات اپنے فنی عروج کے ساتھ دنیا کی بہترین افسانوی تخلیقات کے ہمسر ہو گئے اس دور کے افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری ، منٹو ، حجاب امتیاز علی ، کرشن چندر ، اپندر ناتھ اشک ، احمد علی ، سہیل عظیم آبادی ، راجندر سنگھ بیدی ، احمد ندیم قاسمی ، عصمت چغتائی ، بلونت سنگھ ، قراۃ العین وغیرہ کے نام ابھرتے ہیں ، اس دور کے لکھنے والوں نے ترقی پسندی کے نام سے اس فن میں بڑے تجربے کئے اپنی شخصیت کے پرتو اپنے طرز تخیل اور جذبات کو بھی نئے اسلوب کے ساتھ بیدھڑک پیش کیا ۔

عین اس وقت کہ جب ہمارا افسانہ فن کی ان منزلوں پر پہونچ چکا تھا کہ جہاں حقائق اور فنکار کی شخصیت اور اس کے فن کا حسن ممیز ہو چکے تھے ملک کی تقسیم نے ایک بار پھر سے اسکو دھکا دیا کچھ انتشار پیدا ہوا خلش اور الجھنیں آگے آئیں لیکن ہمارے ادیبوں نے معیار کو قائم رکھا البتہ موضوعات متنوع ہو گئے ۔ علامتی پیرائے استعمال ہونے لگے ، رمزیت اور امیجری کا دخل ہو گیا پس منظر بھی بدل گئے ۔ کرداروں کو نام دینے کے بجائے ان کی صفات کی توجیہہ کی گئی بلکہ صفت کو ہی نام دے دیا گیا ۔

اور کردار کے دل و دماغ میں گزرنے والے خیالات ، احساسات ، تاثرات کی عکاسی کی جانے لگی ۔ کہیں کہیں خود کلامی کو اسلوب نگارش کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ۔

افسانہ کو شعور اور احساس کا مرقع بنایا گیا ۔ حتیٰ کہ افسانے اور شعر میں امتیاز باقی نہ رہا اِلّا اسکے کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو شروع سے آخر تک چلتی ہے ۔ کچھ افسانہ نگاروں نے اپنی ہی ذات کو محور و مرکز بنا کر تخلیقی عمل کا رُخ ایک نئی سمت موڑ دیا اور فکر کی آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ یہ محض تلازمہ خیال کا انشائیہ بن کر رہ گیا جو جمالیاتی بصیرت سے معرا بھی ہو جاتا ہے اور پھر ان افسانہ نگاروں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ وہ قاری کے لئے نہیں لکھتے ہیں بلکہ خود اپنے لیے لکھتے ہیں اور جو یہ باتیں قاری کے پلے نہیں پڑتی ہیں تو وہ اسکی نااہلیت پر محمول کرتے ہیں ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ادب کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی کی سمجھ میں آئے ۔ ان کے متعلق پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں ۔

" عام قاری پچھلے چند سالوں سے اردو افسانہ نگاروں کے ہاتھوں ستایا جا رہا ہے ۔ قاری کو مرعوب کیا جاتا ہے ۔ بکھرے جملوں میں بھاری بھرکم اصطلاحوں منتشر تاثر پاروں جملوں فقروں آڑھی ترچھی ترکیب سے چونکا دینے کی کوشش ہوتی ہے ، ادبی رویوں اور روایتوں میں تبدیلی فطری عمل اور ردّ عمل ہیں چنانچہ یہ تبدیلی سب سے پہلے میراجی اور ان کے ساتھیوں کی شاعری میں رونما ہوئی اور پھر افسانے نے بھی ترقی پسند تحریک سے منسلک نہ ہوتے ہوئے نئے افسانے کا روپ دھار لیا ۔ اس میں ایک فراریت ہے ۔ روایت کے خلاف بغاوت ہے سماجی اخلاقی مذہبی حد بندیوں کی توڑ پھوڑ اور بے راہ روی وطیرہ بن گیا ۔

کچھ نئے افسانہ نگاروں نے اپنے تجربات کی سچائی اور کھرے پن کو کامیاب اور مرغوب طریقہ پر پیش کیا لیکن ناتجربہ کار اور نومشق لکھنے والوں نے قاری سے دغابازی کی ۔

فی الحال پھر سے یہ حق بجانب صدا بلند ہو رہی ہے کہ افسانہ نگار متوازن رویہ اختیار کریں روایتی تانے بانے کے تحت کہانی پن کو برقرار رکھیں اور اس شعر کی تعبیر پیش کریں

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے بیٹھے ہیں ۔۔ نازک سی نگاہوں میں نازک سا افسانہ

ڈاکٹر مسز میمونہ عبدالستار دلوی

سرزمینِ کوکن اور اردو لوک گیت

ہندوستان اپنی وسعت اور گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ایک ملک کی نہیں بلکہ ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ طویل و عریض سرزمین مختلف صوبوں میں منقسم ہے۔ جن کی طبعی ساخت، جغرافیائی حالات، سیاسی و تہذیبی پس منظر اور معاشی اقتصادی کیفیات مشترک بھی ہیں اور مختلف بھی۔ ہندوستان کی تہذیب نے زمانہ قدیم سے لیکر موجودہ دور تک ـــ مشہور ریاضی داں آریہ بھٹ کے زمانے سے آج کے خلائی سیارے آریہ بھٹ تک، دنیا سے اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ اقبال نے کیا صحیح فرمایا ہے:

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

ہندوستانی تہذیب کی تاریخ کے مختلف ابواب میں سے اگر ایک باب علوم و فنون کے ارتقا سے مدوّن ہے تو دوسرا انسان کی فطری و بنیادی جذبات کی عکاسی کرنے والے عوامی مظاہر سے مرکب ہے۔ ان عوامی مظاہر کو دیکھنا ہو تو کسی ملک کے لوک ناچ اور لوک گیتوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں انسان اپنے تخلیقی اور اکتسابی رنگ میں سرشار نظر آتا ہے۔ یہ لوک ناچ اور لوک گیت چاہے اتر پردیش کے ہوں یا گجرات کے، بنگال کے ہوں یا کرناٹک کے، بہار کے ہوں یا مہاراشٹر کے، ان کی خصوصیات ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود کافی مماثلت اور یکسانیت کی حامل ہوتی ہیں۔

گانا اور ناچنا انسان کی جبلت میں داخل ہے۔ ناچنے کا فن نہ جانتے ہوئے بھی خوشی کے مارے انسان ناچ اٹھتا ہے۔ ناچنے کے مصدر سے کئی محاورے بھی اردو میں داخل ہیں۔ خوشی سے ناچ اٹھنا، نگنی کا ناچ نچانا، انگلیوں پر نچانا وغیرہ ـــ اسی طرح گانے کی اہمیت بھی اپنی جگہ قائم ہے گُن گانا، خوشی سے گنگنانا، جیسے محاوروں سے انسانی فطرت اور گیت کا رشتہ اجاگر ہوتا ہے ـــ کسی مخصوص موقع پر ایک آدمی جذبات کی شدت سے متاثر ہو کر گانے لگتا ہے اور اس کے ساتھی آواز میں آواز ملا کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ انھیں نہ سر کی پرواہ ہوتی ہے نہ تال کی۔ نہ گیت کی بحروں کو پرکھتے ہیں نہ فن کو۔ انھیں تو بس اپنے دل و دماغ میں اٹھنے والے جذبات و کیفیات کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ بس یہیں سے لوک گیت کی شروعات ہوتی ہے۔ اگر انھیں ڈھول یا تاشہ، طبلہ یا ڈرم مل گیا تو ٹھیک ورنہ ٹین کا کوئی ڈبہ اٹھا کر موسیقی کے لوازمات کی قائم مقامی کر لیتے ہیں۔

ہندوستان کے گاؤں اور دیہاتوں کی کھلی اور آزاد فضا میں لوک گیتوں کا عروج کوئی تعجب خیز بات نہیں ـــ قبائلی قومیں، پہاڑی قبیلوں اور خانہ بدوشوں کے لوک گیتوں اور ناچوں کا تو کیا کہنا۔ ! شہروں میں بسنے والے لوگوں میں بھی زندگی کے اہم اور معمولی موقعوں پر اور تقریبوں پر لوک گیتوں کا رواج ہنوز باقی ہے۔ بلکہ آج کل لوک گیتوں اور لوک ناچوں کا احیاء، تہذیبی ارتقا کی علامت میں داخل ہے۔ اور شہر میں مختلف موقعوں پر ہونے والی تقریبوں اور جلسوں میں ہندوستان کے قدیم قبائلی اور دیہاتی رقص و سرود کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔

لوک گیتوں کے خالق اور ان کے تخلیق کا عہد متعین کرنا دشوار ہے۔ مگر لوک گیتوں میں بیان کئے جانے والے الفاظ، ہتھیار، زیورات، لباس اور دوسری چیزوں کے ناموں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ گیت کس عہد کی یادگار ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح لوک گیتوں سے کسی مخصوص

علاقے کے رسم ورواج، اعتقادات اور ماحول کا اظہار ہوتا ہے۔ لوک گیت گوش بگوش اور سینہ بسینہ، نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ کسان اپنے کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کرتے وقت، گاڑی بان اپنی گاڑیاں ہانکتے ہوئے یا بارش کے دیوتا کو منانے کے لئے اپنے گیتوں کو کام میں لاتے ہیں عورتیں چکی پیستے ہوئے اور ساون میں جھولوں کی پینگیں بڑھاتے وقت اپنے نازک گلوں سے فضا میں نغمے بکھیرتی ہیں، گھروں میں بچہ کی پیدائش سے لیکر شادی بیاہ کی مختلف تقریبوں میں بھی گیتوں کی مدد سے محفل کا رنگ دوبالا کرتی ہیں۔ ان گیتوں کی حکمرانی کے لئے زماں ومکاں کی کوئی قید نہیں — چنانچہ جب ہم ہندوستان کے ایک مشہور علاقے کوکن کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں کے رہنے والے کوکنی مسلمانوں کے لوک گیت جو اردو اور کوکنی دونوں زبانوں میں گائے جاتے ہیں، سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

کوکن — ریاست مہاراشٹر میں شامل ہے۔ طبعی ساخت کے اعتبار سے مہاراشٹر کے دو اہم طبعی حصوں میں سے مشرقی حصہ سطح مرتفع مہاراشٹرا کہلاتا ہے اور مغربی حصہ کوکن۔ بحیرۂ عرب سے متصل تاپتی تک اور نشیبی علاقہ عام طور سے کوکن پٹی کہلاتا ہے۔ بعض جگہ یہ علاقہ نوے کیلومیٹر اور بعض جگہ پینتالیس کیلومیٹر چوڑا ہے۔ شمال سے جنوب تک پٹی کی لمبائی تقریباً سات سو بیس کیلومیٹر ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی تقریباً پندرہ میٹر ہے۔ مشرق کی سمت اس کی بلندی بڑھتی جاتی ہے اور زمین زیادہ ناہموار ہوتی جاتی ہے۔ یہاں کی بلندی پندرہ سے دو سو پچاس میٹر کے درمیان ہے۔ کوکن کا اہم پہاڑ کوہ سہادری ہے جس کا سلسلہ بحیرۂ عرب کے متوازی شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی کا نام کلسوبائی کی چوٹی ہے۔ کوکن میں پہاڑی سلسلوں کی درمیانی گذرگاہوں کو گھاٹ کہتے ہیں۔ کوہ سہادری میں چھ اہم گھاٹ ہیں — تھل گھاٹ، بھور گھاٹ، کھمبا گھاٹ، پھونڈا گھاٹ اور امبولی گھاٹ ہیں۔ سہادری کی بلندیوں پر واقع شیونیری، سینہ گڑھ، رائے گڑھ اور پرتاپ گڑھ نامی قلعے شیواجی کے سیاسی عروج کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے کوکن کا زمینی علاقہ تنگ ہے۔ اسی لئے یہاں کی ندیاں چھوٹی اور ان کا بہاؤ تیز ہے۔ یہاں کی مشہور ندیوں میں دمن گنگا، ویترنا، الہاس، ساوتری، وسشٹھی اور تیرے کھول کے نام اہم ہیں۔ کوکن کی ایک اور اہم شئے یہاں کی کھاڑیاں ہیں۔ جوار بھاٹا کے وقت سمندر کا پانی دریا کے دہانے سے اوپر زمین کی طرف چڑھ جاتا ہے۔ اور نشیبی علاقے پانی سے بھر جاتے ہیں۔ ساحلی زمین کے اس حصہ کو کھاڑی کہتے ہیں۔ مغربی کنارے پر کئی کھاڑیاں ہیں۔ ان میں دھرمتر، ہرنئی، راجپوری، دابھول، جے گڑھ، وجے درگ اور تیرے کھول بڑی کھاڑیاں ہیں۔ جسطرح بعض قلعے پہاڑوں پر تعمیر کئے گئے تھے۔ اسی طرح سمندر کے کنارے یا سمندر میں واقع چٹانوں پر بنائے گئے بحری قلعے بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ان میں دابھول مروڈ جنجیرہ، سوورن درگ، وجے درگ، سندھو درگ اور دابھول کے قلعے آج بھی زندہ ہیں۔ کوکن میں گرم اور معدنیاتی پانی کے چشمے بھی پائے جاتے ہیں جن میں سیکڑوں لوگ غسل کرتے ہیں اور کئی بیماریوں سے شفا پاتے ہیں۔ ان میں سے چند چشموں کے نام یہ ہیں۔ کونڈی وائٹے ساؤ اُنہالا، ارادلی، راجواڑی۔ سنیگمنشور اور راجاپور کے چشمے۔

کوکن کا علاقہ تین اضلاع میں منقسم ہے — تھانہ، قلابہ اور رتناگیری۔ ان تینوں اضلاع میں جغرافیائی حیثیت سے معمولی طور پر تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ ورنہ تہذیبی اور سماجی اعتبار سے بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ضلع تھانہ کوکن کے شمالی جانب واقع ہے۔ انتظامی امور کی خاطر مندرجہ ذیل تعلقوں یا سب ڈویژنوں میں منقسم ہے:

دھانو۔ بسین۔ بھیونڈی۔ شاہ پور سالسٹ

کلیان۔ مرباد۔ پنویل۔ کرجت۔ تھانہ

تعلقہ سالسٹ ۱۸۰۸ء تک سات جزیروں پر مشتمل تھا۔ سالسٹ، ٹرامبے، جوہو، ویساوا، دھاراوی اور رائے مردھا۔ یعنی سالسٹ کی سرحد موجودہ شہر بمبئی کے علاقہ باندرہ اور دھاراوی سے شروع ہوتی تھی — ۱۸۴۳ء میں بمبئی کا جو نقشہ مرتب کیا گیا تھا اس کی روسے بمبئی سات جزیروں سے مرکب تھا۔ قلابہ، اولڈ اومن آئی لینڈ، اپالو بندر، مجگاؤں، سائن ماہم اور ورلی — اس نقشہ کی رو سے باندرہ کرلا اور دیگر مضافات سالسٹ کے علاقے میں شامل تھے۔

ضلع تھانہ کے جنوب میں قلابہ کا ضلع واقع ہے۔ جو تین ڈویژنوں علی باغ، پنویل اور مہاڑ پر مشتمل ہے۔ ضلع قلابہ کافی سرسبز و شاداب اور زراعت کے اعتبار سے عمدہ ہے۔

ضلع رتناگیری، نہ صرف کوکن کا بلکہ ریاست مہاراشٹر کا سب سے آخری جنوبی ضلع ہے اسے کوکن کا کشمیر کہا جاتا ہے۔ یہاں کے ہاپوس آم

(الفانسو) اپنے مخصوص ذائقہ کی بنا پر ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ اس ضلع کے چار ڈویژنوں — رتناگیری، چپلون، داپولی اور ساونت واڑی میں متعدد تعلقہ یا سب ڈویژن واقع ہیں۔

کوکن کے ان تینوں اضلاع، تھانہ، قلابہ اور رتناگیری میں مسلمان کثیر تعداد میں آباد ہیں، جو مختلف طبقوں اور فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً میمن، قصائی، مولانے، بوہرہ، خوجہ، کُراتی، کچھی، دکنی، مغل اور پٹھان وغیرہ جو تجارت اور دیگر معاشی ضروریات کی وجہ سے مختلف علاقوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ جو مقامی مسلمان ہیں وہ کوکنی مسلمان کہلاتے ہیں ان لوگوں کے کوکن میں وارد ہونے اور قیام کرنے کی تاریخ کافی قدیم ہے۔

ملک عرب اور ہندوستان کے تعلقات زمانہ قدیم سے قائم ہیں ظہور اسلام سے قبل بھی عرب تاجروں اور ملاحوں کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوتے رہے ہیں۔ اسی طرح ایران سے ایرانی النسل باشندے بھی ہندوستان آتے رہے۔ ۷۰۰ء میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کے جور و ستم سے بچنے کے لئے کئی مسلمان کوفہ سے فرار ہو کر ہندوستان پہنچے اور مغربی ساحل پر گوا سے کھمبایت تک آباد ہو گئے۔ ساحل کارومنڈل پر آباد ہونے والے مسلمان نوائط، گجرات میں نائطی اور ساحل مالابار پر قیام کرنے والے ھشکلی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ کوکن میں رہائش پذیر کوکنی مسلم کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ۹۲۳ء اور ۹۲۶ء میں کئی عرب خاندان کرمانیوں کے مظالم سے بچ کر ہندوستان آئے اور مغربی ساحلی علاقوں پر قیام پذیر ہوئے ان لوگوں نے یہاں کے نومسلم ہندوؤں سے بھی شادیاں کیں۔ اور ان کے کئی رسم و رواج بھی اختیار کئے۔ دسویں صدی میں مسلم حکومت کی وسعت کی بنا پر بڑی تعداد میں عربی باشندے، ملاح، تاجر اور سپاہیوں کی حیثیت سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ ایک قدیم عرب سیاح سلیمان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نویں صدی کے وسط میں کوکن کے حکمراں بلہارا عربوں کے گہرے دوست تھے۔ دیگر حکمرانوں میں عربوں کی اس قدر حمایت کرنے والا بلہارا[1] کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اس کے جانشینوں نے بھی اس کی پیروی کی ہے چودھویں، پندرھویں اور سولہویں صدی میں جبکہ کوکن کے ضلع رتناگیری کی سرزمین بہمنی اور بیجاپور کے حکمرانوں کے زیرنگیں آگئی تو اندرون ملک میں تبدیلی مقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کی ایک اور وجہ دابھول اور دیگر تجارتی شہروں کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور عرب و ایرانی سپاہیوں کی مانگ تھی۔ مرہٹہ دور حکومت میں عرب ملاحوں کی بھی زبردست اہمیت تھی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۱۶۹۳ء میں کمپنی کے تاجروں کے صدر پرسنگیشور سے کچھ دور جن بحری جہازوں نے حملہ کیا تھا، ان کے جہاز راں عرب تھے اور سنبھاجی کی ماتحتی میں برسرروزگار تھے۔

تاریخ کے کسی ریکارڈ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذہب اسلام کو رتناگیری کے مقامی باشندوں پر زبردستی مسلط کیا گیا ہو۔ یوسف عادل شاہ (۱۴۸۹-۱۵۱۰ء) اور ابراہیم عادل شاہ دوم (۱۵۸۰-۱۶۲۶ء) کے دور حکومت میں کسی کے مذہب میں دخل اندازی نہیں کی گئی تھی[2]۔ ان حکمرانوں کے منصفانہ رویہ کے باوجود چند مقامی باشندوں نے مبلغین سے متاثر ہو کر، یا جاگیریں حاصل کرنے کی غرض سے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ رتناگیری کے مسلمان، خالص نومسلم ہندوؤں کی نسل سے نہیں بلکہ عرب اور ایرانیوں سے مخلوط النسل ہیں۔

ضلع قلابہ کے اولین مسلمان مہاجرین وہ لوگ تھے جو ۹۲۳-۹۲۶ء میں کرمانیوں کی وجہ سے اور ۱۲۵۸ء میں ہلاکو تاتار کے ظلم و ستم سے تنگ آکر یہاں آئے تھے۔ احمدنگر کی سلطنت (۱۴۹۰-۱۶۳۶ء) کی ایک اہم بندرگاہ چیول کا رخ کرنے والے بیرونی تاجر ایرانی اور عرب ہی تھے۔ یہاں انہوں نے اپنی مسجدیں تعمیر کیں اور اپنے باہمی مقدمات اور اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لئے ایک قاضی مقرر کیا تھا۔ احمدنگر کے مسلم حکمراں نے بھی مقامی باشندوں کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں کیا اور چونکہ اس کے بعد کوئی مسلم حکومت ضلع قلابہ میں قائم نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ یقین کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت بیرونی باشندوں کا ایک حصہ ہے۔

کوکنی مسلمان عام طور پر دو بڑے فرقوں میں منقسم ہیں۔ ایک جماعتی یعنی کوکنی جماعت کے اراکین اور دوسرے دالدی یعنی ساحلی ماہی گیر۔ آج کل اعلیٰ تعلیم اور دولت کی فراوانی سے کئی اختلافات اور امتیازات ختم ہو گئے ہیں۔ ورنہ پہلے دونوں فرقے کے لوگ اپنی روزانہ زندگی میں ان کی بڑی پابندی کرتے تھے۔ جماعتی اپنے بچوں کی شادی دالدیوں میں نہیں کرتے تھے۔

---

[1] بلہارا۔ حیدرآباد کے نزدیک مال کھیت کے راجپوت تھے۔ بحوالہ رتناگیری ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۶۲ء ص ۲۹۲
[2] فرشتہ II ۱۲۸۔ بحوالہ رتناگیری ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۶۲ء ص ۲۹۳

یہی نہیں بلکہ اپنے خاندان سے باہر شادی کرنا بھی معیوب سمجھتے تھے۔ کوکن کے تینوں اضلاع کے مابین بھی شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ شکر ہے اب جدید تعلیم اور تہذیب کی بدولت یہ بندشیں ختم ہوگئیں۔

دالدی مسلمانوں کا پیشہ ماہی گیری اور ملاحی ہے۔ رسّیاں بٹنا، جال بننا اور کاشتکاری بھی ان کا مشغلہ ہے۔ ضلع کے باشندوں میں ان کی حیثیت کمتر درجے کی ہے مجموعی طور پر یہ طبقہ محنت کش ہے۔ اگرچہ اکثریت غریب ہے لیکن بہت سے آسودہ حال ہیں۔ ایک حوالے کے مطابق یہ لوگ سب سے پہلے آباد ہونے والے عربوں کی نسل سے ہیں۔ جو ساتویں یا آٹھویں صدی میں مغربی ساحل پر آباد ہوئے اور ملبار کے ماپلا قوم سے تعلقات استوار کئے[ط]

کوکنی مسلمانوں کی اکثریت قصبوں میں رہتی ہے۔ ان کی خاص خوراک چاول ہے جو کئی طرح سے استعمال کیا جاتا ہے۔ چاول کے آٹے کی روٹیاں پکاتے ہیں اور طرح طرح کے میٹھے پکوان بھی۔ چاول کی کھیر۔ فیرنی۔ ساون، بھالوزی۔ سیتولے۔ گھاونے۔ پولے۔ مودک۔ پوریاں۔ یولے۔ کنڈولے بھاکو رچا۔ گھاری۔ ڈھیرا وغیرہ

چاول کے ساتھ مچھلی بہت مرغوب اور لازمی ہے۔ مقامی سبزیاں جو دستیاب ہوں۔ دالیں اور گوشت بھی خوراک میں شامل ہے۔ گیہوں کا استعمال پہلے صرف عید یا تہواروں پر ہوتا تھا۔ راشننگ سسٹم رائج ہونے سے اب ہر گاؤں میں گیہوں کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ ساحلی علاقوں میں روزانہ تازہ مچھلی دستیاب ہوتی ہے۔ مگر اندرونی، پہاڑی علاقوں میں سال بھر، اور دیگر علاقوں میں سخت بارش کے موسم میں سوکھی مچھلی کا استعمال زیادہ ہوتا ہے چونکہ مچھلی کو زیادہ نمک لگا کر خشک کیا جاتا ہے اس لئے اسے عام طور پر کھاری مچھلی بھی کہتے ہیں۔ آجکل تو کوکن کے ساحلی علاقوں میں مچھلی کا کاروبار بہت زوروں پر ہے۔ بیرونی ممالک کو مچھلی درآمد کر کے زرمبادلہ حاصل کرنے کا اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ ساحلی علاقوں کی وجہ سے ناریل بکثرت ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے کوکنیوں کے روزانہ کھانوں اور میٹھے پکوانوں میں تازہ اور سوکھے ناریل کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ سپاری بھی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ لوگ عام طور سے پان اور سپاری کے عادی ہیں۔ ساتھ ہی تمباکو کے بھی شوقین ہیں ناس کا استعمال بھی عام ہے۔ تمباکو کے متعلق ایک کہاوت ہے :-

" نہ مانگے بھیک تو تمباکو کھانا سیکھ "۔ نشہ آور چیزوں میں تاڑ کے درختوں کا رس یعنی تاڑی مقامی نشہ آور کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

کوکن کے مسلمان مختلف گھرانوں یا خاندانوں میں منقسم ہیں۔ اپنے خاندان کی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے ہر ایک خاندان الگ الگ لقب استعمال کرتا ہے۔ یہ لقب مختلف وجوہ سے اختیار کئے جاتے ہیں۔ مولف تاریخ النوائط کا خیال ہے کہ لوگوں نے القاب کی ضرورت کو یا بندش کفو کی غرض سے تسلیم کیا تھا[ل]

کوکنی مسلمانوں کے خاندانی لقب کئی قسم کے ہیں۔ جو آبائی، معاشی تخصصی اور رہائشی حیثیت سے اختیار کئے گئے ہیں:

(۱) صدیقی عباسی۔ العسکر۔ نقیبہ۔ قاضی۔ خطیب، قریشی۔ رئیس۔ سوائل۔ عیدروس۔ سید۔ مکی۔ بصری۔ کوفی۔ بغدادی۔ باربیڑا جیسے لقب عرب خاندان کی وراثت سے ہیں۔

(۲) بعض کوکنی مسلمانوں نے افغانی اور مغل نسل سے ہونے کی بناپر خان، پٹھان، کھوکھر اور مغل جیسے لقب اختیار کئے ہیں۔

(۳) معاشی اعتبار سے چند القاب دلیسائی، پٹیل، ادھیکاری، ملا، سرکارے کھوت، بیع نویس، دلوی، نقیبہ، خطیب، پیش امام، مقری، حافظ فوجداری، سرگروہ، اپادھیائے، درزی، جہانگیردار، موٹلیکر تاناجی، چوگلے، خلیفے، غزالے۔ مقدم ہیں۔

(۴) عام رہائشی لقب جو ہندوؤں کے القاب کے نمونوں پر اختیار کئے گئے ہیں "کر" کے سابقے سے بنائے گئے ہیں۔ ٹھانیکر، اورنکر، تنگیکر، جیتکر، مہاپکر، بیونیلکر، کھوپیکر پینکر، کیتیکر، کولابکر، جنجیرکر۔

(۵) کوکنی مسلمانوں کے بعض مخصوص اور اہم لقب یہ ہیں۔ بھاریر، بھایجی، بھینکر، بنٹو، ہنڈسے، لونڈسے، مرکھے اندورسے، واگھمارسے، انتولے، گھٹے، کرکرے، لاتنے وغیرہ

اکثر کوکنی مسلم جو سید یا شیخ ہونے کا افتخار رکھتے ہیں۔ اپنے ان خاندانی القاب کے ساتھ سید یا شیخ کا بھی اضافہ کرتے ہیں ۔۔۔ مثلاً شیخ محمد صالح دلوی فوجدار (کیونکہ موصوف گاؤں میں فوجدار کے عہدے پر فائز تھے) ہمارے والد محترم

ط : بحوالہ مہاراشٹرا اسٹیٹ گزیٹیڑ آف رتناگیری ڈسٹرکٹ ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۶۴۔

ل تاریخ النوائط مولفہ نواب عزیز جنگ بہادر

کو آخری عمر میں اصرار تھا کہ ان کا پورا نام اس طرح لکھا جائے۔ پٹیل علی میاں مقدم کولتھار کر۔ اپنے محلہ کی جماعت کے پٹیل کا عہدہ، خاندانی لقب مقدم اور اپنے آبائی گاؤں کولتھار کی مناسبت سے کولتھار۔

کوکنی مسلمان اکثر مغل یا پیشوائی لباس پہنتے تھے۔ لمبی یا چھوٹی سی شیروانی، سر پر صافہ اور پیروں میں جوتی۔ کبھی چوڑی دار پاجامہ یا شلوار، کرتا یا پیرہن جامہ، اور سنگی کا بھی استعمال کرتے تھے۔ بعض لوگ سر پر برہمنوں کی طرح پگڑی باندھا کرتے اور بعض میمن یا خوجہ اسٹائل کا سلک کا پٹھا سر پر باندھتے۔ گاؤں کے لوگوں میں ہندوانہ کوٹ، دھوتی اور سفید پگڑی پہننے کا رواج عام تھا۔ آج بھی معمر حضرات اپنے اسی قسم طرز کے لباس میں نظر آتے ہیں۔ درمیانی دور میں خلافت تحریک کے زیر اثر ترکی ٹوپی، شیروانی یا کوٹ اور پتلون معہ انگریزی جوتے پہننے کا رواج عام ہوگیا تھا۔ قمیض پر واسکٹ یا جیکٹ بھی پہنا جاتا تھا۔ آج تو مغربی تہذیب کے تحت لباس کا مخصوص طرز باقی نہیں رہا، بش شرٹ اور پتلون کا فیشن مقبول ہوگیا ہے۔

زنانہ لباس میں عورتیں ہندوانہ طرز کی ساری چولی پہنتی تھیں۔ آج بھی یہ لباس مروج ہے۔ چولی کے ساتھ بلاؤز کا رواج زیادہ ہوگیا ہے۔ گاؤں میں چھوٹی لڑکیاں لہنگا اور چولی پہنا کرتی تھیں۔ آج فراک نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ اور لڑکیوں میں کرتا پاجامہ، شلوار، قمیض اور دوپٹوں کا فیشن بڑھ گیا ہے۔

چھوٹے لڑکوں کو بمبئی میں تیار کئے ہوئے کرتے اور پاجامے کے ساتھ زری کی کشیدہ کام کی ہوئیں واسکوٹ اور مخمل گول ٹوپیاں پہنائی جاتی تھیں۔ یہ پرانا فیشن اب شہروں میں پھر سے مقبول ہو رہا ہے۔

شادی بیاہ میں دولھا کے لئے زریں شیروانی اور زریں پگڑی یا دستار کا رواج عام تھا۔ بعض امیر گھرانوں میں یہ لباس بنوا کر رکھا جاتا اور برادری کے دیگر گھروں میں شادی کے موقعوں پر مستعار دیا جاتا۔

کوکن کے مسلم سماج میں بیوہ عورتوں کو رنگین کپڑے پہننے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ سفید رنگ کا لباس لازمی تھا۔ لیکن آج یہ پابندی بھی رفتہ رفتہ کم ہوگئی ہے۔

کوکن کے ہندو اور مسلمان گھرانوں میں تقریباً یکساں وضع یا ڈیزائن کے زیورات مقبول ہیں۔ پہلے وزنی اور موٹے قسم کے زیورات پسند کئے جاتے تھے۔ اب وزن میں ہلکے سبک اور نازک جدید وضع کے زیورات کا فیشن ہوگیا ہے۔ شادی کے موقع پر لڑکیوں کو زیورات دیئے جاتے ہیں۔ دولھا والوں سے بھی حسب حیثیت زیورات طلب کئے جاتے ہیں۔ مثل مشہور ہے سکھ کا ساج دکھ کا بھوجن۔

مردانہ زیورات میں :- بھیک بالی، سونے کی بالی جس میں موتی اور زمرد لگا ہوتا ہے، جو سیدھے کان کے اوپری لو میں پہنائی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں بھی اس کا رواج ہے جب منت مرادوں کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی سلامتی کی خاطر پہناتے ہیں۔ گلے میں گوپھ، کنٹھی۔ کلائی میں، سال کڑی، کڑی اور پہنچی۔ بازو میں ڈنڑ کڑے۔ کمر میں، کرگوٹھا۔ اور انگلیوں میں انگوٹھیاں

لڑکوں کے لئے :- گلے کے لئے گوپھ، چین۔ پیروں کے لئے والے جھانجری۔

کان کے لئے۔ بھیک بالی، موڑی، ڈول۔ کمر میں کرگوٹھا ساکھل ہاتھوں میں کڑے اور توڑے۔

آج جدید اور خوشحال دولت مند گھرانوں کے ساتھ متوسط گھروں میں بھی لڑکوں اور مردوں میں بٹن اسٹڈ کالر پن، ٹائی پن ہاتھ گھڑی، سونے یا چاندی کی زنجیر مستعمل ہیں۔

زنانہ زیورات کی فہرست ذرا طویل لیکن دلچسپ ہے۔

سر کے لئے۔ اگر پھول، گلاب پھول، چین پھول، سیس پھول جالی، موڑ، ناگ، پھرکی کے پھول، چاند، کیگت لاکڑی۔

چوٹی کے لئے۔ تعویذ، پھتے، لاکڑی

ماتھے کے لئے۔ مانگ پٹی، جھومر، ٹیکہ

کان کے لئے۔ بگڑیاں، بالیاں، کڑی، ڈول، کرن پھول، بالیاں، چاند بالیاں، چکریاں، چولا پھول، لونگ کے پھول جھلی پنکھے، جھمٹے، اوراج، جھمکے، مختلف قسم کے ایرنگ

ناک کے لئے۔ نتھ، چنکی، پھلی، بلاق، بیسر، دال۔

گلے کے لئے :- چندن ہار، گلسر، گوپھ، کولھاپوری ساج، موہن مالا
پینڈے، پٹیاں، پتلیاں، سری، تن منی، ٹھسی، کالر، چوکڑی
وجٹیک، بورمالا، گیہوں مالا، چمپاکلی، چندن ہار، مالا، ہار، ہنسلی
تلسی، جگنی، چنتاک، ستلڑا، دولڑی، گنٹلہ، لپھا
بازو کے لئے - والی، بازوبند، ڈنڈکڑے، نورتن، تعویذ،
کنگنی بیٹڑی۔
ہاتھ کے لئے - بنگڑیاں، بلور، گوٹھا، ٹپلیاں، توڑے، کنگن
پہونچی، حتر، گوٹ، کڑے جوز، بجر بٹو، سمرن -
انگلیوں کے لئے - انگوٹھی، چھلا، آرسی
کمر کے لئے - کمر پٹہ، کمر بند، بگلوس
پاؤں کے لئے - سانکھلیاں، توڑے، پازیب، پایل، گجرے، ھنگ
رم جھول، بیجن، والے، چھڑے، بیٹری، لول، پازیب، پٹیاں،
انگلیوں کے لئے - چاندی کے چھلے، گہول،

پرانی وضع کے مذکورہ زیورات اب بہت کم نظر آتے ہیں - لیکن لوک گیتوں میں ان کے نام ہنوز زندہ ہیں خاص طور سے ان گیتوں میں جو شادی بیاہ اور دیگر خوشی کی تقریبوں میں گائے جاتے ہیں۔

چونکہ کوکن مہاراشٹرا کا ایک خطہ ہے اور یہاں کی سرکاری و علاقائی زبان مراٹھی ہے اس لئے کوکنی مسلم مراٹھی سے اچھی طرح واقف ہیں - تحصیل علم کے دوران اردو کے ساتھ مراٹھی کا بھی رواج ہے - کوکنی مسلم اپنے گھروں میں اردو اور کوکنی زبان کا استعمال کرتے ہیں - یہ اردو ادبی اور تحریری اردو سے دور اور دکنی اردو سے زیادہ قریب ہے - کوکنی زبان دراصل مراٹھی کی ایک شاخ ہے جو عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب سے مملو ہے، اور اس کا لہجہ اور قواعد مراٹھی سے تھوڑی مختلف ہے کوکن کے تینوں اضلاع، تھانہ، قلابہ اور رتناگیری کی کوکنی ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ یہاں کے ہر گاؤں اور قصبے میں مستعمل کوکنی زبان میں معمولی ردوبدل اور چند صوتی اختلافات نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے اس زبان کی کئی ذیلی بولیاں بن گئی ہیں -

کوکن کے کئی باشندے شہر بمبئی میں قیام پذیر ہوگئے ہیں انیسویں صدی کے اوایل میں بمبئی کے ایک بڑے حصہ پر کوکنی نیوں کا قبضہ تھا - اور یہ لوگ نہ صرف ہندوستان کے دیگر حصوں سے بلکہ بیرونی ممالک سے بھی تجارت کرتے تھے - علم و ادب کی دنیا میں بھی ان کا سکہ چلتا تھا - بمبئی کے کوکنی بھی اپنے گھروں میں اردو اور کوکنی دونوں زبانیں استعمال کرتے ہیں - مختصر یہ کہ کوکنی عام طور سے ذولسان BI - LINGUAL ہیں - چنانچہ کوکن اور بمبئی میں پہلے بھی اور آج بھی لوک گیت اردو اور کوکنی دونوں زبانوں میں سنائی دیتے ہیں [1]

لوک گیت کا یہ موضوع بہت بسیط ہے - اس مضمون میں، صرف چند گیت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ضمنی طور پر ان رسومات کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، جن سے متعلق متعدد گیت کوکن کی خواتین میں مقبول ہیں - یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کئی گیت ایسے بھی ہیں جو الفاظ / لب و لہجہ اور صوتی تغیر کے ساتھ دیگر علاقوں مثلاً حیدرآباد، اورنگ آباد، پونہ، ناگپور اور امراوتی اور شمال ہند کے چند خطوں میں بھی مستعمل ہیں -

شادی کی تقریب سے قبل منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے جس میں نسبت کا اعلان اور شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی ہے دولھا والوں کی طرف سے دولھن کو، اور دوسرے دن دلہن والوں کی جانب سے دولھے کو چڑھاوا - کپڑے، انگوٹھی، مٹھائی وغیرہ، دیا جاتا ہے - دونوں گھروں میں اس موقع پر دلچسپ گیت گائے جاتے ہیں - اور رشتہ دار شکایتوں کے دفتر کھول دیتے ہیں -

بیٹی کس گھر دیئے جی   بیٹی کس گھر دیئے ؟
اس کے چاچا کونئیں نا خبر   ”   ”
اس کے بادا نے کھائے شکر   ”   ”
اس کی پھوپھی کونئیں نا خبر   ”   ”
اس کی خالہ نے کھائے شکر   ”   ”
بیٹی پٹیل گھر دیئے جی   بیٹی پٹیل گھر دیئے

[1] تفصیلات کیلئے دیکھئے "بمبئی میں اردو" از مضمون نگار۔

اس کے ماموں نے کھائے شکر ” ” ”

منگنی کے چڑھاوے کی مزید تفصیلات :-

لال صدرے منگنی آئی — منگنی بھی آئی - کیا کیا لائی

تاراں کی بگی جی - اماں تہیں دیکھیں جی

لال صدرے منگنی آئی — منگنی بھی کیا کیا لائی

حلوے کی بگی جی - خالہ تہیں دیکھیں جی

لال صدرے منگنی آئی — منگنی بھی آئی کیا کیا لائی

شکر کی بگی جی - پھوپھو تہیں دیکھو جی

لال صدرے منگنی آئی — منگنی بھی آئی کیا کیا لائی

پاپڑوں کی بگی جی - ممانی تہیں دیکھو جی

پالوں کی بگی جی - چچانی تہیں دیکھیں جی

جب شادی کی تاریخ نزدیک آتی ہے تو ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے - یعنی گھر میں پانچ سہاگنیں مدعو کی جاتی ہیں - چکی ڈال کر اس کو سندل لگاتے اور ہار باندھتے ہیں - یہ پانچوں سہاگنیں اس چکی پر بھات دلتی ہیں :-

بھرا نازی پانچوں بیبیاں جو مل کر — بی بی فاطمہ کے ہاتھوں سے مہورت کیے
بھرا نازی پانچوں بیبیاں جو مل کر — بی بی خدیجہ ” ” ” ”
بھرا نازی پانچوں بیبیاں جو مل کر — بی بی آمنہ ” ” ” ” ”

بھات دلنے کے جو چاول نکل آتے وہ گاؤں کی مسجد کے ملا صاحب کی نذر کئے جاتے - ایک پرانی رسم "بھانڈا بھرنے" کی ہے جس میں ایک تھال میں مختلف قسم کے کھانے رکھے جاتے، سبزی، بھاجی اور پیالوں میں ناریل کا دودھ اور دیگر چیزیں بھی شامل ہوتیں - ایک اور رسم کراپھول کہلاتی ہے جس میں چار پان اور ایک سپاری، ایک پان میں لپیٹ کر ناڑے سے باندھ کر ہاتھوں میں دیئے جاتے

بنی در میں سے لیو جی بیبیاں لو

آیا دمان پان لیو جی ” ”

پان سپاری لیو جی ” ”

دودھ تیل لیو جی ” ”

موزنگرمل تیل لیو جی ” ”

جانپستل لیو جی ” ”

کاجل عبیر لیو جی ” ”

دستیر دستی لیو جی بیبیاں لو

کراپھول خاص طور سے لڑکیوں کے ہاتھوں میں دیا جاتا اور گیت ہی گیت میں تاکید ہوتی:

یہ کراپھول شیروں میں رکھنا

یہ کراپھول بھانگوں میں رکھنا (مانگ)

شیروں کے موتیاں میرے رب نے بنایا

بھانگوں کا بھانگ ٹیکہ میرے رب نے بنایا

کاناں کے بالیاں میرے رب نے بنایا

ناکا کا موتی میرے رب نے بنایا

اس کے بعد پانچ سہاگنیں مل کر چکی پر ہلدی پیستیں - اس کے بعد چکسہ پیسا جاتا ساتھ ہی اس رسم کے گیت بھی گائے جاتے

چکسا میں پیسوں گی اللہ چکسے میں گیہوں لے سیئو منڈوے میں لوٹے
یہ لوٹ میں گائی چکسا میں پیسوں گی اللہ ”
چکسے میں لے چاول - سیئو منڈوے میں دل ”
یہ لوٹ میں گائی چکسا میں پیسوں گی اللہ ”
چکسے میں لے کھجور - سیئو منڈوے میں چیتور ”
یہ لوٹ میں گائی - چکسا میں پیسوں گی اللہ ”
چکسے میں لے ہلدی سیئو منڈوے میں جلدی ”
یہ لوٹ میں گائی، چکسا میں پیسوں گی اللہ ”

شادی کے دوران رت جگا منایا جاتا ہے - گھروں میں یا منڈپ میں جھولے باندھے جاتے ہیں اور عورتیں اس موقع کے لئے مخصوص جھولے کے گیت گاتی ہیں - ان کے موضوع مختلف ہوتے ہیں مذہبی گیتوں سے ابتدا کی جاتی ہے - پھر روزمرہ کے معمولات، شادی کی مختلف رسومات اور دولہا دلہن کی تعریف اور آرائش وغیرہ سے متعلق گیت گائے جاتے ہیں -

اللہ نے محمدؐ کو مبارکبادیاں دیئے

مولا نے محمدؐ کو مبارکبادیاں دیئے

حضرت علی کا ٹیکا صندل میں بھیگا دیئے

جی عطر میں بھیگا دیئے

حضرت علی کو سنوار کے جنت میں لے چلے

حوراں و پریاں سنوار کے جنت میں لے چلے

بنے پھول پان تیرا منڈوا چھایا — ناڑے کو صندل لگایا
بنے چنیا زری تیرا منڈوا چھایا — کنے تیرا کاج سنوارا
بنے باوا تیرے بادشاہ جیسے — اونے تیرا کاج سنوارا
بنے اماں تیری ملکہ جیسی — " " "
بنے چچا تیرے امراؤ زادے — " " "
بنے چچی تیری امراؤ زادی — " " "

ڈھولک کے مخصوص گیت شادی کی تیاریوں، میزبان کی کنجوسی کا مذاق اڑانے اور دل لگی کے طور پر گائے جاتے تھے۔

بالا بنڑا نظر نہیں آیا کہ میری جان زلفوں میں عطر لگایا
چن چن چاول کی کھچڑی پکائی اس نے قورمے بغیر نہیں کھایا
کہ میری جان زلفوں میں عطر لگایا
اس نے دالچے بغیر نہیں کھایا۔ کہ میری جان . . . . . .
اماں پیارا نظر نہیں آیا کہ میری جان زلفوں میں عطر لگایا
کورے سے کوزے میں پانی بھرائی۔ اس نے برف بغیر نہیں پیا
کہ میری جان زلفوں میں عطر لگایا
اس نے لیمن بغیر نہیں پیا کہ میری جان زلفوں میں عطر لگایا
باوا پیارا نظر نہیں آیا کہ میری جان . . . . .
پان پچاسوں کے بیڑے بنائی اس نے الچی بغیر نہیں چبایا۔ کہ میری جان..
اس نے لونگ بغیر نہیں چبایا۔ کہ میری جان . . .
گوٹوں والا نظر نہیں آیا کہ میری جان زلفوں میں عطر لگایا
سولے روپے کا میں چوسر بچھائی۔ اس نے روپے بغیر نہیں کھیلا۔ کہ . . .
اس نے گنی بغیر نہیں کھیلا۔ کہ . . .

شادی سے آٹھ یا دس دن قبل ہلدی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ یہ وہ رسم ہے جسے دکنی اور پنجابی میں مینجے کی رسم کہتے ہیں۔ اس دن دولھے اور دلہن کو غسل کروا کے زرد لباس پہنایا جاتا۔ اب دونوں میں سے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں۔ رشتہ داروں کے گھر سے خوان آتے۔ جن میں ہلدی چکسہ، صندل، تیل، مٹھائی اور پھولوں کا چھوٹا سا ہار ہوتا ہے۔ خواتین تھوڑی سی شکر کھلانے کے بعد ہاتھ چہرے پر تھوڑی سی ہلدی چکسہ، صندل اور تیل لگاتیں۔

مکہ شاداں سے ہلداں جو لائی
اللہ لو ہلداں نوشو صاحب کے انگوں لگائی۔ دوستی نبیاں کی نبھائی
مدینہ شاراں سے چکسا جو لائی
اللہ لو چکسا نوشو صاحب کے انگوں لگائی۔ دوستی نبیاں کی نبھائی
بمبئی شاراں سے صندل جو لائی
اللہ لو صندل نوشو صاحب کے انگوں لگائی۔ دوستی نبیاں کی نبھائی
راجھول شاراں سے تیلاں جو لائی
اللہ لو تیلاں نوشو صاحب کے انگوں لگائی۔ دوستی نبیاں کی نبھائی
سورت شاراں سے شکر جو لائی
اللہ لو شکر نوشو صاحب کے انگوں لگائی۔ دوستی نبیاں کی نبھائی
کولھار شاراں سے پانی جو لائی
اللہ لو پانی جمال دین صاحب کو نہلائی۔ دوستی نبیاں کی نبھائی

ہلدی لگانے سے قبل ایک سفید چادر بچھائی جاتی ہے۔ پانچ یا سات سہاگنیں اردگرد بیٹھ کر، سفید کھڑے ہوئے چاول ہاتھ میں لئے، چادر پر چوکور ڈیزائن بناتی ہیں اسے چوک بھرنا کہتے ہیں اس موقع پر یہ گیت گایا جاتا ہے۔

پہلی بسم اللہ فرمائی۔ گھر کے ولیوں کو منائی
چوک دردو سے بھرائی گے سہاگنوں
دوسری بسم اللہ فرمائی۔ پانچوں پیر کو منائی
چوک موتیاں سے بھرائی۔ گئے سہاگنوں
تیسری بسم اللہ فرمائی۔ دستگیر صاحب کو تی منائی
چوک مانک سے بھرائی۔ گئے سہاگنوں
چوتھی بسم اللہ فرمائی۔ مخدوم صاحب کو منائی
چوک ہیرے سے بھرائی۔ گئے سہاگنوں
پانچویں بسم اللہ فرمائی۔ حاجی علی پیر کو منائی
چوک چاول سے بھرائی، گئے سہاگنوں

شادی سے ایک یا دو دن قبل مہندی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ عورتوں کے جھرمٹ میں دولھن کو مہندی لگائی جاتی ہے۔ اسی دن یا دوسرے دن دولھے کے لئے مہندی لے جاتے ہیں۔ دولھا چاہے ہاتھ میں مہندی لگائے یا انگلی کی پوریں۔ بس رسم ادا کرنے سے مطلب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گیت گانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

مہندی تیری رنگ سے بھری۔ کہاں سے لگائی مہندی

گل چمن چھوڑ کے ، باغوں سے منگائی مہندی
کیا بڑے دھوم سے بنڈرے کو لگائی مہندی
اماں پیارے کو لگائی مہندی ، باوا پیارے کو لگائی مہندی
مہندی تیری رنگ سے بھری۔ کس پہ لپسائی مہندی
سنگ مرمر کے ، سلوں پہ لپسائی مہندی
کیا بڑے شان سے بنڈرے کو لگائی مہندی
ہریالے کو لگائی مہندی، بھائیوں پیارے کو لگائی مہندی
مہندی تیری رنگ سے بھری کس میں دھرائی مہندی
سونے چاندی کے خوانوں میں دھرائی مہندی
کیا بڑے شوق سے بنڈرے کو لگائی مہندی
نھے لاڑے کو لگائی مہندی ، بہنوں پیارے کو لگائی مہندی
مہندی تیری رنگ سے بھری کس کو لگائی مہندی
دولھے میاں کے ہاتھوں کو لگائی مہندی
بنڈرے جوگے کو لگائی مہندی
خالہ پیارے کو لگائی مہندی۔ خالو پیارے کو لگائی مہندی
چھوٹے بڑے طاق میں عطروں کی دھری ہے شیشی
عطر مل مل کے وہ ہاتھوں کو لگائی مہندی
دونوں دستوں کو لگائی مہندی
کیا بڑے دھوم سے بنڈرے کو لگائی مہندی
گوتوں والے کو لگائی مہندی۔ بنڈری والے کو لگائی مہندی

دولھے کو اپنے گھر میں تیار کیا جاتا ہے۔ سسرال سے آیا ہوا جوڑا پہن کر ، ہار طرہ لے کر ، اور سہرہ باندھ کر دولھا نکلنے کو تیار ہے۔

بنی سے بنا مزیدار ــــــ ہریالے بنے
دلہن سے دولھا مزیدار ــــــ 〃 〃
بنے تیری ساس نے طرہ جو بھیجی
طرے میں بیگو مزے دار ــــــ ہریالے بنے
دلہن سے دولھا مزیدار ــــــ 〃 〃
بنی سے بنا . . . .
بنے تیری ساس نے رومال جو بھیجی
رومال میں گوٹے مزیدار ــــــ ہریالے بنے
دلہن سے دولھا مزیدار ــــــ 〃 〃

بنے سے بنا مزیدار ہریالے بنے
بنے تیری ساس نے انگھوٹی جو بھیجی
انگھوٹی میں ہیرا مزیدار ہریالے بنے
دولھن سے دولھا مزیدار 〃 〃

دولھا بارات کے ساتھ ، دلہن کے گھر جا رہا ہے۔ بارات کے لوازمات ملاحظہ ہوں۔

کیا خوب نکلی برات بنا رنگ محلوں میں آیا
گھوڑے پہ تیری برات 〃 〃
باجے سے تیری برات 〃 〃
تاشے سے تیری برات 〃 〃
رستوں پہ تیری برات 〃 〃
جھومر سے تیری برات 〃 〃
تو حجامت بھی لایا سنگات 〃 〃
تو قاضی بھی لایا سنگات 〃 〃
تو دوستاں بھی لایا سنگات 〃 〃
اپنے باوا کو لایا سنگات 〃 〃
کیا دھوم سے تیری برات 〃 〃

اور جب دولھے میاں دلہن کے گھر پہنچتے ہیں تو ان کا استقبال اس طرح ہوتا ہے :۔

آیا میرا ہریالا بنا ماں ــــ چھوٹا بنا سردار بنا ماں
سر رے تیرے سلطانی سہرا
لڑیاں لگیں گل ہزار ــــ بنا ماں ،
ــــ آیا میرا ہریالا . . .
کمرے تیرے گجراتی پٹکا
خنجر لگے گل ہزار ــــ بنا ماں
آیا میرا ہریالا . . .
انگ رے تیرے کارچوبی جامہ
بند لگے گل ہزار ــــ بنا ماں
آیا میرا ہریالا
سر رے تیرے زرتاری چیرا
کلغی لگی گل ہزار ــــ بنا ماں

آیا میرا ہریالا بنا ماں . . .

. . . .

ایک لاکھ کا تیرا سہرا مالن جو گندھائی
آئیں گے تیرے باوا کریں گے سہرے کا مول
دو لاکھ کا تیرا سہرا، مالن جو گندھائی
آئیں گے تیرے بھایا کریں گے سہرے کا مول

ادھر دلھن کو سنوارنے کی ساری تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پہلے سسرال سے آئے ہوئے کپڑے پھول، زیورات اور سہرا پہنانے کا کام بھی ہو رہا ہے اور موقع کی مناسبت سے گیت بھی محفل کی رونق بڑھاتے ہیں۔

دلی شہر کی چنڈری جانی — رنگ سے بھری
سسرے گھر کی چنڈری جانی — دل سے بھلی
بڑے گھر کی چنڈری جانی — مان سے بھری
بابا دیکھو چنڈری جانی — کیا خوب بھلی

. . . .

گھنگھر والے بال، جھنا پہنی لال۔ اوپر اوڑھی شال۔ کیسے کا بہار
دیکھو جی بنڈری کے گھنگھر والے بال
اماں پیاری کے گھنگھر والے بال
گلے بنی کے مالا بھی سو بھے۔ گلے ہاروں کا، کالر، لڑیوں کا سنگھار
دیکھو جی بنڈری کے گھنگھر والے بال
خالہ پیاری کے گھنگھر والے بال
ہاتھ بنی کے چوڑا بھی سو بھے۔ حسر پہونچیوں کا، توڑے گجروں کا سنگھار
دیکھو جی بنڈری کے گھنگھر والے بال
چاچی پیاری کے گھنگھر والے بال
کان بنی کے بالیاں بھی سو بھے۔ کان جھمکوں کا، مرلیوں بگڑیوں کا سنگھار
دیکھو جی بنڈری کے گھنگھر والے بال
گوتوں والی کے گھنگھر والے بال
سر بنی کے سیس پھول سو بھے۔ پیشانی ٹیلے کا، جھالر موتیوں کا سنگھار
دیکھو جی بنڈری کے گھنگھر والے بال
پاؤں بنی کے پائلاں بھی سو بھے۔ توڑے والے کا، بٹی چھروں کا سنگھار
دیکھو جی بنڈری کے گھنگھر والے بال

بسم اللہ میں بول کے تجھے ہاتھ لگائی
اللہ رکھے جیتا تجھے اماں کی جائی
گے بٹی، مہریاں گندھا دلیو نگی پیاری
بسم اللہ میں بول کے تجھے ہاتھ لگائی
ہاتھوں میں نے کنگئی تیرے بال پھرائی
گے بٹی مہریاں گندھا دلیو وں گی پیاری
مہریاں گندھا لے بیٹھیا بیبیاں پڑھ کے تبارک
اللہ رکھے جوڑا تیرا تجھ کو مبارک
گے بٹی . . . .

جس وقت دلھن دیکھو کیا مہریاں گندھائی
خالہ پھوپھی پیاری سے صندل منگائی
گے بٹی . . . .

تیلیاں پہنی / پیزن پہنی توڑے سے ہوکا
ریشم کی ساڑی اوپر داب سولنے کا
گے بٹی . . . .

گلوں تیرے لچھا سا جھے پانچ سروں کا
ناریل کے جھاڑ نیچے پلنگ سونے کا
گے بٹی . . . .

کیا ہے بٹی صورت تیری دودھ سے اجلی
خالہ پھوپی تجھے پالے پالوں سے پتلی
گے بیٹی . . . .

کیا ہے بٹی صورت تیری دادر داور
اوپر اوڑھی دلھن دیکھو پھولوں کی چادر
گے بیٹی . . . .

لوگ کہتے دولھا آیا دیکھو دلھن کا
ساس نے بھیجے زرکا رومال پانچ رنگوں کا
گے بیٹی . . . .

کیا ہے بیٹی صورت تیری چاند لیوئم کا
اللہ رکھے جوڑا تیرا تجھ کو جنم کا
گے بیٹی . . . .

نکاح کے بعد سہاگ کی نشانی کے طور پر ہری چوڑیاں اور سلے

پوت کا لچھا دلھن کو پہنایا جاتا ہے ۔ اس موقع پر چوڑیوں کے گیت گائے جاتے ہیں ۔

بمبئی شہر سے آیا منیار ۔ کیرو امیں بہنوں گی
کنگنیاں بھی پہنی ، پیتلیاں بھی پہنی
میری حسرمیں رہ گئی ارمان ۔ کیروامیں بہنوں گی
میری پہنچی میں رہ گئی ارمان ۔ کیروامیں بہنوں گی

. . . .

اللہ، نبیوں کی دعا سے ۔ گے پہن گوری چوڑ دلا
گورے ڈنڈوں پہ پڑا اجالا ۔ " " "
تیرے سسرے لائے کریلا " " "

نکاح کے بعد دولھے کو زنانہ مجلس میں بلایا جاتا ہے اور جلوا (جلوہ) یا آرسی مصحف کی رسم ادا کی جاتی ہے ۔ اس وقت جلوے کے گیت گائے جاتے ہیں ۔ جن میں حضرت علیؓ اور بی بی فاطمہ رضی کا ذکر ضرور ہوتا ہے

جنت میں سے سرور جو اتری تو پہنیں گے حیدر کے لال
یہ جلوا گاؤں علی کا تو بہنا مل کے پکار
جنت میں سے جامہ جو اترا تو پہنیں گے حیدر کے لال
یہ جلوہ گاؤں علی کا تو اماں مل کے پکار

بعد میں ذرا رومانی طرز کا گیت بھی سننے میں آتا ہے ۔

میرے دولھے کے ہاتھ میں سونے کے توڑے رہ گئے
بازو سے جوڑے مل گئے
جانی رنگ تیرے کار چوبی جامہ بندوں میں برما گئے
بولی میں برما گئے
میرے من رباکے ہاتھ میں سونے کے توڑے رہ گئے
محبت سے جوڑے مل گئے
جانی سر پہ تیرے زرتاری مندیل کلغی میں برما گئے
گونڈوں میں برما گئے

دولھے کو اس کی سسرال سے سلامی کے طور پر طرح طرح کے تحفے دیئے جاتے ہیں ۔ جن میں سونے کی انگوٹھی اور رومال نہایت لازمی سمجھی جاتی ہے ۔

بنا سونے کی انگھٹی رومال مانگے
سا سو بی بی کا سنگھار اتار مانگے
سسر میاں کا گھوڑا سوار مانگے
بنا سونے کی انگھٹی رومال مانگے
بنا ہیرے کی انگھٹی رومال مانگے
سالی بی بی کا سنگھار اتار مانگے
سالے میاں کا گھوڑا سوار مانگے
بنا ہیرے کی انگھٹی رومال مانگے

شادی کی مبارکباد اور اپنی نیک خواہشات کو گیتوں میں ڈھال کر اس طرح پیش کرتے ہیں ۔

شادی کی آج میں مبارکبادی دینے آئی
خوشیوں کی آج میں مبارکبادی دینے آئی

. . . .

مچی ہے دھوم انگنوں میں ہمارے دولھا دلہن کی
دولھے تیرے باوا کو یہ خوشیاں مبارک ہو ۔ مبارک ہو ۔ مبارک ہو
مچی ہے دھوم منڈوے میں ہمارے دولھا دلہن کی
دولھے تیری اماں کو یہ خوشیاں مبارک ہو ۔ مبارک ہو ۔ مبارک ہو

دولھن کی رخصتی کا منظر بھی بڑا دردناک ہوتا ہے رشتہ دار اور اقربا، دولھن سے گلے مل کر اپنے جذبات کا اظہار آنسو بہا کر کرتے ہیں ۔ بچپن اور لڑکپن جس گھر میں گزارا وہ اب پرایا ہوگیا ۔

میری نادان بنی میری انجان بنی
چھوڑو بابا کا بنگلہ میری انجان بنی میری دلگیر بنی
چلو جا عتاں کے سنگات " " " "
چھوڑ دامی کا قرآن " " میری نازک بنی
چلو ساساں کے سنگات " " " "
چھوڑو بھاناکی بازو " " میری لاڈو بنی
چلو ننداں کے سنگات " " " "

. . . .

سر سیس پھول پہناؤ رائی لون اتارو
اس کی اماں کو بلاؤ رائی لون اتارو
گلے لچھا ؤ پہناؤ رائی لون اتارو
اس کے باوا کو بلاؤ رائی لون اتارو

اپنی پیاری کو بلاؤ۔ رائی لون اتارو

اس کی ساس کو بلاؤ۔ رائی لون اتارو

اور بیچاری سمدھنوں کا تو خوب سواگت ہوتا ہے

مبارک قدم سے تو آئی میری سمدھن

سلامت قدم سے تو آئی میری سمدھن

سمدھن کی خاطر میں کھانے پکائی

بھٹیاری کے لانان تو کھائی میری سمدھن

ڈھولک پر کئی مزاحیہ گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ جن میں کبھی تقریب کے میزبان کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور کبھی بعض سماجی مسائل کی پردہ دری کرتے ہوئے ہنسی ہنسی میں نشتر چبھو دیتے ہیں۔

کاج والی ہم کو قہوہ پلا

کلثوم بی تیری ساڑی تو بھی بیچ

ہم کو قہوہ پلا

او بجھبڑ والی ہم کو قہوہ پلا

کاج والی ہم کو قہوہ پلا

شریف بی تیری چولی بھی تو بیچ

ہم کو قہوہ پلا

او لبورسی ہم کو قہوہ پلا

. . . .

کیسے بولوں رے بنے جائے نگوڑی

ٹھنڈی سے جانگڑی - نل کا پانی نگوڑی

کلثوم بی کی لوٹی ٹنگڑی

جناب جی ڈالے پھوگوڑی

جب ڈھولک پر عورتیں مندرجہ ذیل گیت گاتی ہیں تو ساری محفل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور ارد گرد کوئی دو جورو والا موجود ہوا تو بیچارے کا شرم سے برا حال ہوتا ہے

یاروں میں دو جورو والا

ایک کو آتی بخار دوسرے کو کھانسی

دو جورو والے بیچارے کو دو بچے پھانسی

یاروں میں دو جورو والا

ایک نے پکڑی ہاتھ، دوسرے نے پکڑی ٹانگ

دو جورو والے بیچارے کی بیچ میں ٹانگم ٹانگ

اور ایک جورو والے بیچارے کی بھی تو کبھی خیریت خطرے میں ہوتی ہے۔ جب گھر میدان کارزار بن جاتا ہے۔

اماں نے پہنائے سو جوڑا میرے ہاتھ میں

جورو مرد لڑنے لگے جا بیٹھے چولھے کے پاس

چپ بیٹھو جی چپ بیٹھو، چمٹا میرے ہاتھ میں

تلی میرے ہاتھ میں

اماں نے پہنائے سو جوڑا میرے ہاتھ میں

جورو مرد لڑنے لگے جا بیٹھے موری کے پاس

چپ بیٹھو جی چپ بیٹھو۔ جھاڑو میرے ہاتھ میں

بالٹی میرے ہاتھ میں

خالہ نے پہنائے سو جوڑا میرے ہاتھ میں

جورو مرد لڑنے لگے جا بیٹھے کھٹیا کے پاس

چپ بیٹھو جی چپ بیٹھو۔ تکیہ میرے ہاتھ میں

گودڑی میرے ہاتھ میں

پھوپھو نے پہنائے سو جوڑا میرے ہاتھ میں

معلوم نہیں یہ لڑائی کیوں ہوئی شاید اس کی وجہ اس گیت میں نظر آجائے:۔

جی کا جنجال موا باجرا لایا

جب باجرا میں پیسنے کو بیٹھی

آٹا اڑ اڑ جائے۔ بہن باجرا لایا

جی کا جنجال موا باجرا لایا

جب باجرا میں چھاننے کو بیٹھی

بھوسہ اڑ اڑ جائے۔ بہن باجرا لایا

جی کا جنجال موا باجرا لایا

جب باجرا میں گوندھنے بیٹھی

آٹا کھسک کھسک جائے۔ بہن باجرا لایا

جی کا جنجال موا باجرا لایا

جب باجرا پکانے کو بیٹھی

روٹی ٹوٹ ٹوٹ جائے۔ بہن باجرا لایا

جی کا جنجال موا باجرا لایا

. . . .

اور جب بالم پیارے گھر سے دور دور رہنے لگے تو بیوی بیچاری باہر نکل کے دیکھتی ہے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

اور راجہ بالم اکیلی میں گھبرا گئی

باہر نکل کے دیکھوں بندر پہ جا کے دیکھوں
وہ کونسی کولن تمہارے من میں آ گئی

اور راجہ بالم اکیلی میں گھبرا گئی

باہر نکل کے دیکھوں باغوں میں جا کے دیکھوں
وہ کونسی مالن تمہارے من میں آ گئی

اور راجہ بالم اکیلی میں گھبرا گئی

باہر نکل کے دیکھوں سڑکوں پہ جا کے دیکھوں
وہ کونسی مڈم تمہارے من میں آ گئی

مہاراشٹر میں بمبئی اور پونہ میں ہر سال گھوڑ دوڑ (ریس) کا اہتمام ہوتا ہے۔ سینکڑوں لوگ سہل الحصول کی خاطر روپیہ لگا کر ریس میں حصہ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی روپیہ حاصل ہوتا ہے اور کبھی آدمی کنگال بن کر واپس آتا ہے۔ اگر کسی حاجی میاں کو ریس کی لت لگ جائے تو کس سے شکایت کی جائے

آج داخل ہو رہا ہے عربی گھوڑا ریس میں
بی بی پوچھے حاجی میاں کیا لائے جیت کے
ایک ایرنگ۔ ایک بالی وہ بھی ہارا ریس کے
آج داخل ہو رہا ہے عربی گھوڑا ریس میں
بی بی پوچھے حاجی میاں کیا لائے جیت کے
ایک پٹلی، ایک بنگڑی، وہ بھی ہارا ریس میں
آج داخل ہو رہا ہے عربی گھوڑا ریس میں
بی بی پوچھے حاجی میاں کیا لائے جیت کے
ایک بیٹی، ایک جھمرا وہ بھی ہارا ریس میں
آج داخل ہو رہا ہے عربی گھوڑا ریس میں

یعنی بیچاری بیوی کے پاس صرف ایک ایک عدد زیور تھا وہ بھی میاں ریس میں ہار کے آ گئے۔ ایک دوسری بیوی کی کل کائنات لوٹا اور تھالی، جھمرا اور ساڑی پتہ اور بالی تھے وہ بھی میاں جی جوئے میں ہار آئے اور دوسری مرتبہ قسمت کی یاوری سے جیت کے لے آئے:۔

میں ڈری رے میرا سیاں جگاری
پہلی باری سیاں لے گئے پتہ اور بالی
میں ڈری . . . .
دوسری باری سیاں لے گئے لوٹا اور تھالی
میں ڈری . . . .
تیسری باری سیاں لے گئے جھمرا اور ساری
میں ڈری . . . .
چوتھی باری سیاں لے گئے سوکن ہماری
میں ڈری . . . .
پہلی باری سیاں جیتے لے آئے پتہ اور بالی
میں ڈری . . . .
دوسری باری سیاں جیتے لے آئے لوٹا اور تھالی
میں ڈری . . . .
تیسری باری سیاں جیتے لے آئے جھمرا اور ساری
میں ڈری . . . .
چوتھی باری سیاں جیتے لے آئے سوکن ہماری

شادی اور دیگر تقریبوں میں عورتیں مذہبی نوعیت کے گیت ضرور گاتی ہیں۔ بلکہ ہر رسم کی ابتدا مذہبی گیت سے کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد، رسول اکرم کی نعت کے ساتھ مقامی پیر اور اولیائے کرام کے حضور میں اظہار عقیدت پیش کرتی ہیں۔

دیئے جی حق نے محمدؐ کو مبارک باد۔ بسم اللہ
سلامت باد ۔ بسم اللہ
محمدؐ نام ناموں میں محمد چاند تاروں میں
محمدؐ کی پیشانی پر چمکتا ہے قطب تارا
دیئے جی رب نے محمد کو مبارک باد بسم اللہ
سلامت باد بسم اللہ

. . . .

دستگیر صاحب کے ہاتھ گلاب کی چھڑی
ان کے بیبیاں کی مانگ موتیاں سے بھری

اللہ، دلیو نامراد، بندی کب سے کھڑی
پانچ پیر صاحب کے ہاتھ چھپے کی چھڑی
ان کے بیبیاں کی مانگ موتیاں سے بھری
اللہ، دلیو نامراد، بندی کب سے کھڑی
باوا بسم اللہ کے ہاتھ سیوتی کی چھڑی
ان کے بیبیاں کی مانگ موتیاں سے بھری
اللہ، دلیو نامراد، بندی کب سے کھڑی

. . . .

اس تلاؤ پہ حوض بنائی   تلاؤ پہ لگی امرائی
سعد سلمان دونوں بھائی   وضو کرتے دونوں بھائی
اشراف زادے دونوں بھائی   نماز پڑھتے دونوں بھائی
اس تلاؤ پہ حوض بنائی   تلاؤ پہ لگی امرائی
باوا پیارے دونوں بھائی   تلاوت کرتے دونوں بھائی
اماں پیارے دونوں بھائی   درود اں پڑھتے دونوں بھائی
اس تلاؤ پہ حوض بنائی   تلاؤ پہ لگی امرائی
شاہ زادے دونوں بھائی   بارھویں پڑھتے دونوں بھائی
گوتوں پیارے دونوں بھائی   گیارھویں پڑھتے دونوں بھائی

. . . .

شادی کے بعد سے ہی دولھن کو ـ "اللہ کلیجہ ٹھنڈا رکھے" دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو" کی دعائیں دی جاتی ہیں ـ خدا خدا کر کے جب وہ نیک گھڑی قریب آتی ہے تو میکہ اور سسرال دونوں گھروں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے ـ اس موقع سے متعلق گیتوں میں خود عورت کے جذبات، اس کی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ گھر کے ماحول اور دیگر افراد کی کیفیات کا بھی ذکر ملتا ہے جن کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے ـ

زچہ گیری کے گیتوں میں اس دور کی مختلف رسموں مثلاً چوملسا لزماسا، چھٹی، چھلا، بچے کو جھولے میں ڈالتے وقت کئی گیت گائے جاتے ہیں ـ ان میں سے چند درج کئے جاتے ہیں

حمیدہ بائی کے کھٹے میٹھے بیر   بیر مجھے بہت بھائے
سسر ہمارے بڑے من موجی   لوٹی میں لے آئے بیر
بیر مجھے بہت بھائے   حمیدہ بائی کے . . . .

ساساں ہمارے بڑے جل ککڑے   لوٹی سے چھین لئے بیر
بیر مجھے بہت بھائے   حمیدہ بائی کے . . . .
نندوئی ہمارے بڑے من موجی   کھیسوں میں لے آئے بیر
بیر مجھے بہت بھائے
نندان ہمارے بڑے جل ککڑے   کھیسوں سے چھین لئے بیر
بیر مجھے بہت بھائے   حمیدہ بائی کے . . . . .

. . . .

اس جمنا کو پہلا مہینہ	چیلوں کے کیلے منگا ـ	رے نواب، جمنا زبھری
اس جمنا کو دوسرا مہینہ	رتناگری کے آم منگا ـ	〃 〃 〃
اس جمنا کو تیسرا مہینہ	دابھول کے نرمل منگا ـ	〃 〃 〃
اس جمنا کو چوتھا مہینہ	گولکنڈے کے چیکو منگا	〃 〃 〃
اس جمنا کو پانچواں مہینہ	کالستہ کے کاجو منگا	〃 〃 〃
اس جمنا کو چھٹا مہینہ	داپولی کے پان منگا	〃 〃 〃
اس جمنا کو ساتواں مہینہ	شرلوپردھن کی سپاری منگا	〃 〃 〃
اس جمنا کو آٹھواں مہینہ	جنجیرہ کا میوہ منگا	〃 〃 〃
اس جمنا کو نواں مہینہ	پیٹھنی ساڑی منگا	〃 〃 〃

بیٹے کی تمنا کتنی شدید ہوتی ہے :-

پان سپاری سے گود بھرائی   پورائی میرے من کی مراد
اللہ اماں پیاری کو بیٹا دلائے

ساتویں مہینے میں گود بھرائی کی رسم ہوتی ہے تب سات قسم کی چیزوں سے گود بھرتے ہیں ـ اس وقت بیٹے کی دعا کی جاتی ہے اس طرح جب بھائی کے گھر بیٹا ہونے کی خبر بہن کو ملتی ہے تو اس کی خوشی اور بے تابی قابل دید ہوتی ہے ـ

بھائی گھر بیٹا ہوا ـ میں نے خبر سنی
کوئی گودی میں اٹھالاؤ ـ بھائی کا بیٹا
بھائی گھر بیٹا ہوا ـ میں نے خبر سنی
کوئی جھبلے لوٹ پہ سلالاؤ ـ بھائی کا بیٹا

اس میں مختلف کپڑوں اور زیورات کے نام گنائے جاتے ہیں ـ مغل یا پٹھان جیسا بیٹے کا تصور !!

بیٹا جنی چاند جیسا ـ مغل پٹھان لو
آئیں گے تیرے سسر باوا ـ اٹھالیں گے گود

اور زچہ بی بی کے ٹھاٹھ کیا کہنے۔ اس کے اور بچے کیلئے خاص طور سے
کاجل بنایا جاتا ہے۔

کاجل کے خاطر میں چندن کٹائی
گھوم رہی اس کاجل میں اماں پیاری گے
کاجل کے خاطر میں گھی منگائی
گھوم رہی اس کاجل میں بہنیا پیاری گے
دولہن کے خاطر میں کاجل کالائی
گھوم رہی اس کاجل میں بچہ والی گے

کبھی زچہ کا یہ حال ہے کہ :-

زچہ نے کھائی چھچھوریا تیرے ساساں نے چاٹے چھچھے
بڑے گھر کی البیلی زچہ

. . . .

لال پلنگ جو رس پائے ہمارے زچہ کو پائل بھی سوہے
ٹھمک ٹھمک پاؤں رکھ گئے - زچہ رانی

بچے کی پیدائش کے چالیسویں دن چھلہ کی رسم ادا کی جاتی ہے بچے
کو جھولے میں ڈالا جاتا ہے اور ماں باپ اور بچے کو تحفے تحائف دیئے
جاتے ہیں۔

بی بی فاطمہ نے مانگے پالنا
حضرت علی نے خرچے دام - جی
میرا لاڈلا جھولے پالنا
بچے کی دادی نے مانگے پالنا
اس کے دادا نے خرچے دام - جی
میرا لاڈلا جھولے پالنا

. . . .

اللہ اللہ اللہ ھو اللہ
پہلے جو دن سے زچہ ہے جنی
دوسرے جو دن سے بالک ہے نورانی - اللہ اللہ
چوتھے جو دن سے کاجلا ہے گھری
چھٹے جو دن سے چھٹی ہے کھڑی - اللہ اللہ
نویں جو دن سے پالنا بندایا
کاریشمی ڈوریاں اس کو بندھایا - اللہ اللہ

مخمالی گادی اس میں بٹھایا
ریشمی گونڈے اس میں لگایا - اللہ اللہ
باریک چاول میں چھوہارے منگایا
آ گوری نار سے جو کھیر پکایا - اللہ اللہ
پانچ بیبیاں نے وہ کھیر پکائے
ساتوں سہیلیاں نے کھیر کھلائے - اللہ اللہ

. . . .

جب بچے کا عقیقہ کیا جاتا ہے تو بال مونڈتے وقت بھی
گیت گایا جاتا ہے :-

سونے کی کٹوری رے بابا   روپے کا دسترا
اماں بیسیا را مونڈن بیٹھا   کارا گیسیرا بلاؤ
سونے کی کٹوری رے بابا   روپے کا دسترا
دادا بیسیا را مونڈن بیٹھا   کارا گیسیرا بلاؤ

چار سال، چار مہینے اور چار دن کا ہونے پر بچے کی بسم اللہ کی
رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر مبارکباد کا ایک گیت اس طرح
کا ہے۔

محلوں سے دادا جو نکلے نام لے لے پکارے
میرے رحمانی بنڈ رے

تجھے بسم اللہ مبارک   تجھے کلمہ مبارک
تجھے جامہ بھی مبارک   تجھے سرو ریشمی مبارک
تجھے منزل بھی مبارک   تجھے سہرہ بھی مبارک

. . . .

بچے کو سلاتے وقت لوریوں کی شکل میں ماں کی ممتا گنگناتی ہے۔

بالا رے تو پالنا سو جا
اللہ رسول کی سایہ تجھے
تو پالنا سو جا ------!
تیرے بزرگوں کی دعا تجھے
بالا رے تو پالنا سو جا
حبیب اللہ کی سایہ تجھے
تو پالنا سو جا -!
تیرے ابا نے دعا مانگے تجھے   بالا رے تو پالنا سو جا -!

آ کر چندن کا میں جھولا بندھائی

اسے ریشمی رسیاں لگا جا رے

سو میرے تالنے سو جا رے

تیری اماں جھولائے تیرا پالنا

سو میرے تالنے سو جا رے

تیری دادی رنگائے تیرا پالنا

سو میرے تالنے سو جا رے

آ کر چندن کا . . . .

اس میں موتی جھالراں لگا جا رے

سو میرے تالنے سو جا رے

تیری پھوپی جھلائے لو رنگ پالنا

سو میرے تالنے سو جا رے

آ کر چندن کا . . . . . .

اس میں ارشا کے کٹہرے لگائی

سو میرے تالنے سو جا رے

تیری خالہ جھولائے تیرا پالنا

سو میرے تالنے سو جا رے

آ کر چندن کا . . . .

اگرچہ آج کوکن کے بڑے شہروں میں تو کیا، گاؤں میں بھی چکی پیسنے کا رواج ختم ہو رہا ہے۔ مگر بعض پکوان کیلئے چکی پر پیسا ہوا آٹا ہی کام میں لایا جاتا ہے۔ چکی کے گیت اب صرف بڑی بوڑھیوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ مندرجہ ذیل گیت سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح اس کام کو ایک عورت اپنی زندگی کا محور اور سہارا سمجھ کر اپنے جذبات گیت کی صورت میں ادا کرتی ہے

چکی سگے میری مائی — کھونٹا سگے میرا بھائی

دونوں کی کمائی — میں نے بازو بند گھڑائی

آئی گی جمعرات تو — میں نے پکائی کھیر

میرے گھر کے ولی پیر — ختم دلو میرے اوٹلے

بڑی سگے میری چکی — سگن آتی جی اکیلی سو

ہاتھ لگا گے عزیزہ بی گوری — سالونے ڈنڈے پر ہری چولی

کلے کو گفن کی چولے — نہیں آتی جی میرے دل کو

موتی پراؤ جی کھن کو — کشیدہ کراؤ جی کھن کو

کوکن کے وسیع و بیکنار سمندر میں ذریعہ معاش تلاش کرنے والے ماہی گیر جو گیت گا گا کر کشتیاں کھیتے ہیں انھیں "چکوتے" کہتے ہیں جو مراٹھی، کوکنی اور اردو زبانوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک اردو گیت ملاحظہ ہو:۔

اللہ میاں بندے تیرے — اچھالوں میں جائیں گے سویرے

لے تال کیشور باوا سائیں ہمارے — " " "

لے بال پیر صاحب سائیں ہمارے — " " "

اللہ میاں بندے تیرے — " " "

لے پیر باؤ۔ سلامت زاؤں

پیران جی شیرنی بانٹ کر کھاؤں

ولیا دال ہوئیل — ہو دار سنبھال

. . . .

اللہ میاں سے شروع ہو کر مقامی پیروں سے گہرے اعتقادات پر ختم ہونے والے یہ گیت کوکن کی زندگی کے ہر شعبہ میں سنائی دیتے ہیں نہ جانے کس علاقے سے اور کس زمانے میں ان گیتوں کا سفر ہوا۔ کن کن بیبیوں کے رسیلے ہونٹوں سے نکل کر، سینہ بہ سینہ اور گوش بہ گوش ہم تک یہ گیت پہنچے ہیں۔ آج کل فلمی گیتوں کی مقبولیت سے متاثر ہو کر نئی نسل کی کئی عورتیں اور لڑکیاں فلمی دھنوں پر مختلف موضوعات کے گیت گاتی ہیں، اور گیتوں کے قدیم سرمائے میں جدید اور نئے رنگ کا اضافہ کرتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی

دکنی اردو اور "پھول بن" پر ایک نظر

دکن میں اردو زبان کی پرداخت اور ادب کی ترقی میں سلاطین بیجاپور (سلطنتِ عادل شاہیہ ۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ) اور سلاطینِ گولکنڈہ (سلطنتِ قطب شاہیہ ۹۱۸ھ تا ۱۰۹۸ھ) کی خدمات اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شمالی ہند میں اردو کے عہدِ قدیم کے بعد گو مہاراشٹرا اور پنجاب کے سنتوں اور صوفیوں کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ انہوں نے گیسوئے اردو سنوارے۔ تاہم عرصہ تک ان صوفیوں اور سنتوں کی خدمات منظرِ عام پر نہ آسکیں۔ اور شاید اب بھی اس کی طرف بہت کم محققین کی نظریں گئی ہیں۔ اردو ادب کے مؤرخ ادب کی تاریخ کا نقطۂ آغاز دکن کو ہی قرار دے کر آگے بڑھتے ہیں جس میں سلاطینِ گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار اور جلسے جلوسوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان سلاطین نے نہ صرف یہ کہ خود شعر کہے بلکہ شعر فہموں کا ایک ماحول بھی پیدا کیا۔ اور اپنے دربار میں شاعروں کی قدر افزائی کی جس سے زبان اور فن عوام میں رائج ہو گئے۔

سلاطینِ گولکنڈہ میں سلطان محمد قلی ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) سلطان محمد ۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۵ھ) اردو کے صاحبِ دیوان شاعر ہو گذرے ہیں۔ ان سلاطین نے احمد، فیروز، محمود اور ابن وجہی کی خاص طور سے قدر افزائی کی۔ اور اپنے دربار سے انھیں منسلک رکھا۔ عہد قطب شاہی کے شاعروں میں ملاّ احمد، ملاّ فیروز، ملاّ محمود، ملاّ وجہی اور ابن نشاطی کے علاوہ غواصی اور سید میران حسینی، ملاّ قطبی، جنیدی طبعی، نوری، فائز اور شاہی و ابوالقاسم مرزا نے بڑا نام پایا۔ یہ دور مجموعی حیثیت سے اردو میں بزمیہ مثنویوں کا دور ہے جس میں ملاّ احمد کی "لیلیٰ مجنوں"، وجہی کی "قطب مشتری"، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال اور طوطی نامہ۔ طبعی کی مثنوی بہرام و گل اندام، فائز کی قصۂ رضوان شاہ و روح افزا اور ابن نشاطی کی "پھولبن" اور طوطی نامہ نے شہرت پائی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں تک ہمارے محققین کی توجہ صرف شمالی ہند کی اردو خدمات تک مرکوز رہی۔ ولی کا ذکر شمال اور جنوب کے واسطے سے ہماری ادبی تاریخوں کا جز بنا۔

لیکن اردو ادب کی تاریخوں اور تذکروں میں دکن کو اس سے زیادہ نمائندگی نہ مل سکی۔ غالباً پہلی مرتبہ حکیم شمس اللہ قادری نے سنہ ۱۹۱ء میں "قدیم شعرائے اردو" کے عنوان کے تحت مضمون لکھا۔ اور اس کے ذریعہ دکن کے اردو . . . شاعروں کو ادبی حلقہ سے متعارف کرایا۔ دوسری مرتبہ

؎ مرتبہ شری دیوی سنگھ چوہان سابق ممبر مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن بزبان ہندی۔

صاحب "گلِ رعنا" نے شعرائے دکن کے مستقل باب سے اس دور کی ادبی و تاریخی اہمیت پر صاد کیا۔ اور ۱۹۲۵ء میں پھر حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے "اردوئے قدیم" کے نام سے اپنی معروف کتاب مرتب کی جو اس دور پر کام کرنے والوں کے لئے آج بھی بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردوئے قدیم کی روشنی میں دکنی اردو کے شاعروں اور فن پاروں کی تلاش کا کام اس تیزی سے شروع ہوا کہ مرحوم ڈاکٹر عبدالحق کی رہنمائی میں، ڈاکٹر زور، سخاوت مرزا۔ پروفیسر سروری۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، پروفیسر سیّد محمد سے لے کر جدید نسل اور نئی نسل میں پروفیسر اکبر الدین صدیقی مبارز الدین رفعت، ڈاکٹر محمد عمر، زینب ساجدہ، سیّدہ جعفر، شیخ چاند وغیرہ انگنت علم کے پرستاروں نے قدیم اردو کو اپنا موضوع بنا کر پرانی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا اور وہ جنسِ گرانمایہ جو قلمی کتابوں کی صورت میں مختلف کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی تھی۔ تلاش و تفتیش کے بعد مرتب ہو کر محفوظ ہو گئی۔ انھیں کتابوں میں ابن نشاطی کی "پھولبن" بھی ہے۔ جیسے پروفیسر عبدالقادر سروری اور پھر شیخ چاند نے انجمن ترقیٔ اردو کراچی سے مرتب کر کے شائع کیا۔ اسی طرح قدیم اردو یا دکن کے ادیبوں اور شاعروں سے متعلق ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی اور سخاوت مرزا وغیرہ نے مستقل مضامین اور کتابیں لکھ کر سارا بنیادی مواد اکٹھا کر دیا جس کی وجہ سے قدیم اردو پر کام کرنے والوں کیلئے بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ نئے محقق کے لئے صرف محتاط رہ کر اس مواد کو چھان پھٹک کر دیکھنا ہی رہ جاتا ہے — اس لئے کہ قدیم مواد کو محفوظ رکھنے کے جذبے سے ہمارے محققین کے یہاں ہلکی سی کمزوریاں بھی رہ گئیں ہیں۔

ادبی لحاظ سے موجودہ ہندی کی عمر زیادہ سے زیادہ ایک سو سترہ سال ہوتی ہے اردو اس لحاظ سے بہت قدیم ہے اس کی جڑیں شمال اور جنوب میں یکساں گڑی ہوئی ہیں۔ جدید ادبی ہندی کی اٹھان فورٹ ولیم کالج سے پہلے نہیں ملتی۔ لہٰذا جب جدید ہندی کی تاریخ مرتب کرنے کا خیال اہلِ ہندی کو ہوا تو کسی قسم کے ادب کی غیر موجودگی میں اودھی، بھوج پوری، برج غرض کہ ساری شمالی ہند کی بولیاں جن کی آزادانہ حیثیت ہے جدید ہندی کے چنگل میں پھنس کر اپنی انفرادی حیثیت کھو تی گئیں اور اس طرح جدید ہندی کا تاج محل تعمیر ہوا۔ جب اہلِ ہندی کی نظر قدیم اردو یا دکنی پر پڑتی ہے تو اپنا دامن وسیع کرنے کے لئے انھوں نے اردو کتابوں کے سہارے انھیں تحقیقات کو دیوناگری رسم الخط میں "دکھنی ہندی" کے نام سے رائج کرنا شروع کیا اور اس طرح "دکنی ہندی" کے محققین میں جگہ بنانے کی کوشش بھی شروع ہو گئی۔ یہ اس لئے بھی زیادہ آسان ہو گیا کہ اردو ابتدا میں ہندی / ہندوی کے نام سے بھی موسوم رہی ہے۔ جدید ہندی کے کے آغاز سے پہلے ہندی اور اردو مترادفات کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ زبان علاقائی اعتبار سے گجرات اور دکن میں گجری اور دکنی بھی کہلاتی تھی۔ اور دو چیزوں کو ہندی کرنا اس لئے بھی زیادہ آسان ہے کہ زبان میں زیادہ فرق نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام صرف رسم الخط کی تبدیلی سے ہو جاتا ہے۔ تحقیق کم کرنی پڑتی ہے اور نام ناکمال محققین کی صف میں آجاتا ہے اور مانگے کے اُجالے سے اپنی دکان سجتی ہے۔ اس میں زیادہ بُرائی بھی نہیں۔ اپنے چراغ سے اگر دوسروں کے گھر روشنی ہوں تو اس سے خوش ہونا چاہیئے۔ البتہ ان پر جو دوسروں کے چراغ سے اپنا گھر روشن کرتے ہیں۔ کھل کر اس کا اعتراف کرنا چاہیئے۔

سطورِ بالا میں قطب شاہی دور کے بلند پایہ شاعر ابن نشاطی کی "پھولبن" کا ذکر ہو چکا ہے جسے پروفیسر… عبدالقادر سروری اور شیخ چاند نے مرتب کیا۔ اسے ۱۹۶۶ء میں مہاراشٹر بھاشا سبھا پونا نے دیوناگری بھی شائع کیا ہے جو جناب دیوی سنگھ چوہان کی مرتبہ ہے۔

اردو ریاستِ حیدرآباد کی سرکاری زبان تھی اور اس لحاظ سے حیدرآباد کا ہر باشی اردو سے واقف تھا۔ سرکاری ملازمین کے لئے دفتری کاروبار کے لئے اسی حد تک اردو سے واقفیت ضروری تھی۔ چنانچہ وہ لوگ بھی جو مراٹھی یا دیگر علاقوں سے تعلق رکھتے تھے لازماً دفتری اردو سے آشنا ہوئے اور چونکہ وہ دکن سے متعلق تھے اس لحاظ سے بول چال کی دکنی اردو اور اس کے مزاج سے بھی متعارف رہے۔ کول جیسے زبان و ادب جنھیں سند کے طور پر ہم پیش کرسکیں۔ ریاستِ حیدرآباد کے اس لسانی اور ادبی پس منظر میں دیوی سنگھ چوہان مرتب "پھولبن" بزبانِ ہندی کے ذوق و شوق کی آبیاری بھی ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دفتری اردو محض جاننے سے تحقیق کے ہفت خواں طے نہیں ہو سکتے۔ تحقیق کے اس پل صراط پر زبان و بیاں کے ماہر اساتذہ اور ہنرمندوں کے پاؤں بھی اکثر لڑکھڑا جاتے ہیں جن کی طرف چوہان صاحب نے بھی اکثر ایسے مضامین میں اشارے کئے ہیں۔ "پھولبن" کے دو مطبوعہ نسخوں کے پیشِ نظر چوہان صاحب کی جدید ترتیب کو زیادہ اچھا اور غلطیوں سے پاک ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ مصنف اور کتاب کے بارے میں ضروری مواد مرتبین اکٹھا کر چکے ہیں اور مخطوطہ شناسی (paleography) میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اور ان کے جو اپنے مسائل ہیں انھیں سلجھے علماء کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود کہ چوہان صاحب نے ترتیب کتاب میں زیادہ سہولت ہوئے ہوئے قرارت اور لفظ و معنی کی غلطیاں کی ہیں۔ اور اکثر اوقات یہ غلطیاں ایسے الفاظ کے ساتھ ہوتی ہیں جو حقیقتاً بہت آسان لفظ ہے اور جن کی وضاحت کے لئے بہت زیادہ فارسی و عربی دانی کی ضرورت نہیں تھی۔ اردو کے محققین عام طور سے سنسکرت اور مراٹھی سے واقف نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے سنسکرت الاصل یا مراٹھی لفظوں کی صراحت میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ چوہان صاحب عام طور سے اسی قسم کے لفظوں کو بالصراحت بیان کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ خود سنسکرت اور مراٹھی سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ قدیم اردو کے محققین کو اس لحاظ سے چوہان صاحب کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ جن معنی و مطالب پر ان کی نظر نہیں جاتی چوہان صاحب اپنی نگارشات میں اس کی اصلاح کر دیتے ہیں۔ تاہم معمولی قسم کے عام فہم فارسی عربی الفاظ اور اصطلاحوں سے متعلق چوہان صاحب کی عدم واقفیت پر تعجب ہوتا ہے۔ چوہان صاحب اگر محنت کرتے تو یقیناً ان غلطیوں کا شکار نہیں ہو سکتے تھے جو ان سے سرزد ہوئی ہیں۔ ان غلطیوں پر افسوس اس لئے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ فاضل مرتب دوسروں کی باریک غلطیوں کو سختی سے گرفت میں لئے ہیں اسی طرح مقدمہ میں بھی کئی بیانات یک طرفہ ہیں۔ اور ایماندارانہ تحقیق کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتے اسی طرح متعدد مواقع پر غیر ضروری تفصیلات کا بھی شکار ہو گئے ہیں۔ تحقیق میں زیبِ داستان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ چوہان صاحب کی مرتبہ "پھولبن" کے سرسری مطالعے کے بعد جو مقامات اور جو اشعار چوہان صاحب کی تحقیق کی گرفت میں نہ آسکے۔

ذیل کے سطور میں صرف چند سے بحث کی جاتی ہے۔ اگر کبھی موقع ہوا تو آئندہ اس پھولبن پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

پھولبن کی ابتدا میں مشہور عالم اور ماہر لسانیات ڈاکٹر بابو رام کا پیشِ لفظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دکنی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندی کے تعلق سے چوہان صاحب کی اس کوشش کو سراہا ہے کہ انھوں نے قدیم اردو کی اس معرکۃ الآرا مثنوی کو دیوناگری کے ذریعے ہندی ادب کے قارئین تک پہنچایا اور یہ واقعہ ہے کہ قدیم اردو ہی نہیں بلکہ جدید اردو شاعری اور ادب کو بھی دیوناگری رسم الخط کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچایا جائے اس سے یہ زبان و ادب اپنے حلقہ سے باہر بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے گی۔ اہلِ اردو کو چوہان صاحب کا شکر گذار ہونا

چاہئے کہ انھوں نے قدیم اردو کے اس شہ پارے کو نئی ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ اس کی علمی افادیت سے انکار ناممکن ہے
ابتدائیہ میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، نصیر الدین ہاشمی (مرحوم) کی معروف کتاب " دکن میں اردو "، کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ " اردو لپی میں لکھا ہوا اس وانی کا ایک پری چیا تمک دن ہے، اسے میں نے غور سے پڑھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ وانی جسے ہاشمی صاحب اردو کہتے ہیں وا ستو میں ہندی ہے۔ اس میں کافی ساہتیہ ہے اور اس ساہتیہ کے سارے لیکھکوں نے اسے کبھی اردو نہیں کہا " ہندوی یا ہندی کہا ہے "، جوہان صاحب نے بھی اپنے مقدمے میں اسی خیال کو دہرایا ہے اور اسے عام طور سے " ہندی کے ودوان دہراتے رہے ہیں۔ ان خیالات پر چھاپ " علم کی کم اور سیاست "، کی زیادہ ہے۔ ورنہ وہ لوگ جن کی ہندوستانی کے لسانی وادبی سرمایہ پر نظر ہے بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ ہندی اردو ہندوستانی زبان دہلی وغیرہ مختلف نام ایک ہی مشترکہ زبان کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ہندی یا ہندوی اس کا قدیم ترین نام ہے۔ اور اُردُو جدید ترین اس میں کسی قسم کے فرق یا بھید بھاؤ کی گنجائش نہیں۔ اس کی سب سے اعلیٰ مثال اردو کے عظیم ترین شاعر مرزا غالبؔ ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کی زبان کو ہندی اور اردو دونوں ناموں سے یاد کیا ہے۔ اور اپنے خطوط کے رنگا رنگ مجموعے عودِ ہندی اور اردوئے معلّٰی کے نام سے موسوم کئے۔ اردو ہندی میں اختلاف کا باعث نئی ہندی ہے جو ہندو کے بغیر پیدا ہوئی ہے جس کے پشت پر فرقہ وارانہ ~~ہماری~~ سیاست کی چھاؤں ہے۔ ہندی اور اردو جو مترادفات کی حیثیت رکھتے ہیں " دیوناگری "، یا سنسکرت لفظوں کی کمی بیشی یا عدم وجود سے نہیں پہچانی جاتی بلکہ اپنے مزاج سے اور اپنے لباس سے پہچانی جاتی ہے جو زبانوں کی تاریخ میں وسیع المشربی، رواداری۔ حبّ الوطنی کی نادر مثال ہے جس کے صوتی نظام میں دیسی اور بدیسی دونوں آوازیں سموئی ہوئی ہیں جس کے ذخیرۂ الفاظ میں دیسی بدیسی شبد ہیں اور جو دیسی و بدیسی تہذیبی اور فکری تصوّرات سے سج دھج کر ہندو مسلم ایکتا کی علامت کے طور پر سامنے آئی جس کے عاشقوں میں وجہی [illegible] غواصی، ولی، میر تقی۔ میر غالب و اقبال تھے تو [illegible] طرف للّو لال، سدا سکھ لال، دیا شنکر نسیم، رتن [illegible] پریم چند، سرور، شفق، رگھو پتی سہائے، فراق، تلوک چند محروم، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جیسے ان گنت ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ اگر انصاف اور ایمانداری سے قدیم اردو جسے اس کے شاعروں اور ادیبوں نے ہندی اور ہندوی کے نام سے یاد کیا ہے موجودہ ہندی سے مقابلہ کیا جائے تو جسم اور روح دونوں اعتبار سے ان میں کوئی قدر مشترک نہیں ملے گی اور اگر اس کا اردو سے مقابلہ کیا جائے تو جسم اور روح و مزاج میں آپ کوئی فرق نہیں پائیں گے سوائے اس کے کہ وہ بچپن کے دن تھے اور یہ جوانی کا عالم ہے۔ لہٰذا یہ بات صحیح نہیں کہ نام کی وجہ سے دکنی کو موجودہ ہندی کے مماثل قرار دے کر اس کے اردو ہونے کی حیثیت سے انکار کیا جائے دکنی بہر حال اپنے وسیع معنوں میں اردو ہی ہے اور جدید ہندی عالموں کا یہ اصرار کہ قدیم اردو دراصل ہندی ہے مرغ کی ایک ٹانگ کے مترادف ہے اردو کو ہندی کہنا لسانی استعماریت کی مثال ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد شدت سے ابھرا۔

ابتدائیہ کے آخری سطروں میں بابو رام جی لکھتے ہیں کہ آج بھی دکنی کے ادب کو اردو ادب سے الگ ہی سمجھا جائے۔ اسے سوائے " ہندی ہٹ "، کے کیا کہا جائے؟ وسیع معنوں میں ہندوستانی کو قبول کر کے اردو اور ہندی کو اس کے دو اسالیب ماننے کے بعد اہلِ ہندی کے لئے اس کی گنجائش ہے کہ وہ دکنی اردو کو اپنا لیں۔ لیکن بہر طور " اپنانے "، اور " اپنا ہونے "، میں فرق لازمی ہے۔ قدیم اردو (دکنی) اور جدید اردو غیر فرقہ وارانہ ماحول

میں پلی اور بڑھیں اور سیکولر مزاج کو اپنا اور ہندی (جدید معنوں میں) منافرت، تصنع اور مذہبی جنون کی علامت بن گئی۔ اس میں سیکولر کی کہیں بو باس نہیں۔ چنانچہ ہندی دکنی اور اردو کے فرق میں ان اقدار کا خیال ضروری ہے بھارتیتا یا ہندوستانیت قدیم اور جدید دونوں اسالیب کی خصوصیت ہے۔

جدید لسانیاتی اصولوں کے پیشِ نظر زبان اور بولی میں افہام و تفہیم
ضروری ہے۔ اسی اصول کے تحت بولی کسی زبان سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے اس لحاظ سے جو رشتہ دکنی سے اردو کا ہے وہ ہندی سے نہیں۔ اردو کے بمقابلہ اہلِ ہندی سے اگر وہ دکن کے علاقہ سے متعلق اور بنیادی اردو سے واقف نہ ہوں تو اردو کے دکنی لہجے کو نہیں سمجھ سکتے پھر دکنی کو بقول بابو رام جی ہندی اور اردو سے غیر متعلق کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ جو افہام و تفہیم دکنی اور اردو میں ہے وہ زبان کی ارتقا کی کسی بھی سطح پر "ھندی" سے نہیں رہا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندی اور اودھی، بھوج پوری، میتھلی وغیرہ دیگر زبانوں میں عام افہام مفقود ہے۔ اودھی، بھوج پوری سے میتھلی وغیرہ زبانوں کو ہندی کہنا بالکل ویسے ہی ہے جیسے اسپینی، اطالوی، پرتگیزی اور سوِس کو فرانسی کہنا۔ تحقیق میں کسی بات کو ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ دورانِ تحقیق کوئی بات ثابت ہو جاتی ہے۔

میں نے سطورِ بالا میں قدیم اردو (دکنی یا ہندی) اور آج کی زبان کے جسم اور مزاج میں اشتراک کی بات کی تھی۔ اس کی مختصراً صراحت یوں ہے۔ موضوع کے اعتبار سے قدیم اردو (دکنی) اور اردو میں موضوعات کی مماثلت ہے دونوں کی اصناف مشترک ہیں۔ مثلاً غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، قصیدہ اردو کے قدیم اور اردو کے جدید دونوں کا سرمایہ ہے۔ اور علامتیں دکنی اور جدید اردو میں یکساں ہیں۔ الرحمٰن و رحیم کے ساتھ حیدرِ کرار، کعبہ کے ساتھ کاشی و ہردوار، گنگا جمنا کے ساتھ دجلہ و فرات، گل و بلبل کے ساتھ چاند اور چکور، بلبل کے نالوں کے ساتھ پپیہے کی "پی پی" اور دیوی دیوتاؤں، میل سرسوتی اور کام دیو کے ساتھ آدم و ابراہیم اور عیسیٰ و موسیٰ کی تلمیحیں و علامتیں دکنی اور اردو میں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہندی میں رام اور رحمٰن ہیں۔ عیسیٰ و موسیٰ نہیں ملتے، کرشن کی بانسری ہے۔ بلال کی اذان مفقود ہے۔ سومنات اور کاشی ہے کعبہ نہیں ملتا۔ گنگا اور جمنا کی روانی ہے لیکن دجلہ و فرات نہیں ملتے۔ دکنی اور اردو میں رام بھکتی اور کرشن بھکتی کے ساتھ وحدت الوجود اور وحدت الشہود ہیں۔ ہندی صرف رام بھکتی کے سہارے آگے بڑھتی ہے تو در اصل کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اپنے ناموں سے زیادہ اپنے جسم اور روح سے پہچانی جاتی ہے۔ اردو اور ہندی کا فرق تہذیبی پس منظر میں ہوتا ہے ناموں سے نہیں۔ اور اس لحاظ سے قدیم اردو جسے اس کے شاعروں نے ہندی یا ہندوی کہا ہے۔ اپنے لہجے، اپنی علامتیں، اپنے افکار اپنی اصناف اور اپنی سیکولر مزاج کے لحاظ سے اردو اور صرف اردو ہے ھندی نہیں۔

زبان کے اعتبار سے بھی دکنی اردو ہی ہے جس قدر مماثلت دکنی اور اردو میں ہے اس کا عشر عشیر بھی ہندی میں نہیں۔ دکنی کا ذخیرۂ الفاظ مجموعی حیثیت سے اردو کا ذخیرۂ الفاظ ہے سوائے اس کے چند فیصد الفاظ دکنی نے مراٹھی کے اثر کے تحت اپنائے جو اس کے لسانی مزاج کے عین مطابق ہے "پھولبن"، مرتبہ چوہان صاحب سے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہنر کے گوہراں سے دل ہے پور
ہر یک فن کے وہ موتیاں سوں ہے معمور
زباں دن رات اس کی باتیں تھی
قلم کے ناؤ اس کے ہات میں تھی
کہے زاہد شکایت روز تازا
دیوے شر کوں ہر یک شب سوں تازا

جو وہ درویش قصہ جس گھڑی کے
تو ہوتا تھا شہنشاہ مست بن کے[1]

مجھے یقین ہے کہ مندرجہ بالا اشعار ہندی کا کوئی طالب علم سمجھ نہیں سکتا اگر وہ اردو کلچر یا بالفاظ دیگر ہندوستانی کلچر سے واقف نہ ہو۔ "دربیانِ عاشق شدن فیروزشاہ" سے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کنے یک شہر میں تھا شاہ زادہ
اتھا صورت میں یوسف سے زیادہ
سکھ اس کا تھا نکاں جوں شمع خوباں
تھے پروانے لس اوپر جمع خوباں
نزاکت میں رُخ اس کا جوں یک پھول
وہ ملکہ پھول نے تھا خوب مقبول
بڑے مکھ شمع کا اس کے اوجالے
اتھا روغن جگت کا اس سوں تھالا
صفت اس قد کی کرنے کوں کیے حد
بلند تعریف سوں تھا وہ بلند قد
اسوں تھی نیت سرگ کی کارسازی
اسی نے سرو کی جم سرفرازی

مجموعی حیثیت سے "پھولبن" کی ساری زبان مذکورہ مثالوں کی بازگشت ہے جو اردو سے میل کھاتی ہے۔ ھندی اس سے بہت دور ہے صرفی (Morpho logical) اعتبار سے بھی اردو کے افعال، اسمار، ضمیریں، صفات، (Preposition) اسم استفہام، حروف عطف، جنس سب ہندی الاصل ہیں اور ہندی اردو (بشمول قدیم اردو یا دکنی) کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ لہٰذا اس کی بنیاد پر کسی بھی زبان کو ہندی یا اردو کہنا صحیح نہیں۔ جہاں تک اردو ہندی کے ذخیرۂ الفاظ کا تعلق ہے ان کی ایک بڑی تعداد.. سنسکرت الاصل ہے۔ سنسکرت کے تت سموں کو جنھیں "ھندی" اپناتی ہے۔ اردو تدبھو بنا لیتی ہے۔ اور اس لحاظ سے عوام الناس کے لئے وہ شدید ادائیگی کے لحاظ سے آسان ہو جاتے ہیں۔ دکنی کی خصوصیات جیسے لفظوں کی "ان" بڑھا کر جمع بنانے کا طریقہ۔ جیسے عورت سے عورتاں، مرد سے مرداں، چراغ سے چراغاں وغیرہ صرف اردو کی خصوصیات ہیں۔ جو دکنی دور اور شمالی دور میں بعہدِ میر و مصحفی تک پائی جاتی ہیں۔ جمع کے لئے لفظ میں "ان"، کا لاحقہ بھی دکنی کو فارسی ہی کی دین ہے۔ جیسے مردم سے مردماں، بت سے بتاں مسافر سے مسافراں، نگار سے نگاراں، یار سے یاراں، وغیرہ، ابتدا ہی سے اردو فارسی سے ذخیرۂ الفاظ اور صرفی خصوصیات سے متاثر رہی ہے۔ الفاظ کی جمع کا یہ قاعدہ دکنی اور اردو میں اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا دکنی (ہندی یا ہندوی) کے اردو ہونے کے لئے . . . یہ بھرپور ثبوت ہے۔

فارسی لغت، محاوروں اور امثال کا اردو زبان پر جدید ہندی کے مقابلے میں گہرا اثر ہے۔ یہ اثر بے کم و کاست دکنی پر بھی ہے جس طرح اردو فارسی اسلوب اور روزمرّہ سے سیراب ہوتی رہی اسی طرح یہ اثر دکنی پر بھی نمایاں ہے یہاں تک کہ اگر ہم فارسی محاوروں سے واقف نہ ہوں تو دکنی کو سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ صوتی اعتبار سے بھی ع، ق، خ، ح وغیرہ منفرد صوتی علامتیں اردو اور دکنی دونوں میں ملیں گی۔ اس لحاظ سے بھی دکنی کو ہندی کہنے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ ذخیرۂ الفاظ میں بھی جہاں تک مرٹھی الفاظ کا تعلق ہے۔ جہاں پر وہ عام اردو والوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ وہیں پر وہ ہندی کی دسترس میں بھی نہیں آتے۔

ہندوستانیت (بھارتیتا) :-

مندرجہ بالا ذیلی سرخی کے تحت چوہان صاحب لکھتے ہیں کہ آج کی اردو شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی فضا ہندوستانی نہیں ہے۔ اس کی روح ہندوستانی نہیں ہے اردو پر غیر قانونی ہونے کا الزام خود چوہان صاحب نے

---

[1] "پھولبن" صفحہ 15

بھی لگایا ہے ۔ دیکھئے جب وہ بھی اردو شاعری کے غیر ہندوستانی ہونے کے سلسلے میں بھی معترضین کے ہم خیال ہیں ۔ اوّلاً یہ کہ بھولبن کو صرف دکنی کے سیاق و سباق ہی میں رکھ کر اس میں جو ہندوستانی فضا ہے اس پر روشنی ڈالی جاتی ۔ اور جب جدید اردو شاعری کا ذکر چھیڑ دیا تھا تو معترضین کی موافقت یا مخالفت میں مزید کچھ لکھتے ۔ ان کے خاموش رہنے سے عام ہندی قارئین میں یہ خیال فرور بختہ ہو سکتا ہے کہ فی الحقیقت جدید شاعری کی فضا غیر ہندوستانی ہے ممکن ہے فاضل مرتب بھی اپنے مطالعے کی بنا پر جدید اردو شاعری اور ادب میں ہندوستانیت کے بارے میں مشکوک ہوں ۔ لہٰذا جدید اردو شاعری کے غیر ہندوستانی کردار کے بارے میں چند ضروری باتیں ہیں تاکہ شکوک رفع ہو جائیں ۔ اردو میں جدید شاعری اصطلاحی معنوں میں نظیر اکبر آبادی اور بعد میں انجمنِ پنجاب کی اس تحریک سے شروع ہوتی ہے جس کے ائمہ آزاد اور حالی ہیں ۔ تاہم غیر اصطلاحی معنوں میں جدید شاعری کا نقطۂ آغاز ولی کی شاعری ہے اور ولی سے لے کر جدید دور کی غزل از سرتا پا اپنے مزاج ، طرز فکر علامات اور تشبیہات کے لحاظ سے غیر مذہبی اور خالص ہندوستانی ماحول کی پروردہ ہے ۔ اردو کا شاعر ذاتِ الٰہی کے بجائے بتِ کافر کو پوجتا ہے ۔ قشقہ کھینچ کر ترکِ اسلام کر کے دیر میں پناہ ڈھونڈتا ہے ۔ ہندی کی ادبی روایتوں کے شیخ اور ملّا کے درپے ہوتا ہے ۔ اور زاہد کا جامۂ احرام پھاڑنے کے لئے بروقت تیار رہتا ہے ۔ اردو شاعری میں بھی یہاں کی تلمیحیں ، یہاں کی اصطلاحیں ۔ یہاں کے پھول اور پتے ، یہاں کی نسبت ہولی ۔ دیوالی ، کرشن ، رام ، جلسے جلوس ، پان اور مسی یہاں کی سبزیاں ، مرچوں کی دھانس ، کھپریل ، ہل غرضکہ ساری ہندوستانی ، مذہبی و نیم مذہبی ۔ سماجی اور نیم سماجی ، تہذیبی و نیم تہذیبی ۔ ساری علامتیں اور سارے اشارے جاری و ساری ہیں ۔ جدید اُردو شاعری کی ہندوستانی فضا اور دکنی کی ہندوستانی فضا میں ۔ جدید اردو شاعری کے طرزِ فکر اور طرزِ اسلوب میں اور دکنی کے طرز فکر اور اسلوب ۔ پچھلے ساڑھے چار سو سال کی تاریخ میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ بلکہ یہ زبان اور ادب اپنے طرزِ فکر اور مزاج کے لحاظ سے ۔ زیادہ سے زیادہ سیکولر اور سماج وادی رہا ہے ۔ اس میں بلبل کے نغمے کے ساتھ کوئل کی "کوک" ، اور پپیہے کی "پی" ، بھی ہے ۔ اور گل کے ساتھ چمپا اور چمبیلی بھی ہے ۔ آہوئے رم خوردہ کے ساتھ رقصِ طاؤس بھی ہے ۔ مؤذن کی اذان کے ساتھ ناقوس کی آواز اور صبحدم گجر کی صدا بھی سنائی دیتی ہے ۔ صبحِ اودھ اور شامِ بنارس سے اس کا حُسن نکھر آتا ہے اور تاج محل کے حسن کے ساتھ قدیم ہندوستانی تہذیب کے ایلورا اور اجنتا میں انسانی تخیل کی پتھروں پر بے پناہ شاعری کی تہہ در تہہ پرچھائیں بھی موجود ہیں ۔ دکنی اور جدید اردو شاعری ایک ایسی زنجیر ہے ایک ایسا سلسلہ ہے کہ اسے ہندی یا اردو ناموں کے سہارے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ جدید اردو شاعری اور نثر میں وہ تمام ما فوق الفطرت ہندوستانی عناصر بھی ملتے ہیں جن کا ذکر چوہان صاحب نے ص۲۲ پر "کچھ اور پہلو" ، کے تحت کیا ہے اور جسے غالباً "سہواً" صرف دکنی ادب سے مخصوص کر رہے ہیں ۔

چوہان صاحب نے اپنے مقدمہ کو کئی حصّوں میں تقسیم کیا ہے ان میں وہ "خاموشی کے رنگ روپ" کے تحت عام لسانی حقیقت کے بارے میں کہ فارسی ہند آریائی زبان ہے ۔ لکھتے ہیں کہ "بہت تھوڑے لوگوں کو معلوم ہے کہ فارسی بھاشا کیوں آریہ بھاشا ہے" ، تعجب ہے کہ فاضل مرتب ایک عام بات کو جو پچھلی ڈیڑھ صدی سے دہرائی جا رہی ہے اور جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے نہ جانے کیوں اور کس بنیاد پر صرف اپنے علم سے مخصوص کر رہے ہیں اس سے بھی زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ انھوں نے ... فارسی پر سنسکرت کا اثر دکھانے کے لئے (یا شاید ...

زیبِ داستان کے لئے تقریباً چار صفحہ سپرد دیئے ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات سے بچنا ضروری تھا۔ فارسی اور سنسکرت کے رشتے سے سنسکرت کا اثر ایک کھلی کتاب ہے جس سے کوئی بھی علم دوست انکار نہیں کر سکتا۔

کتاب یا شعر سے متعلق پسند یا ناپسند میں انفرادی تصوّرات، رجحانات اور علم کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس پر بھی مخصوص نعروں کی چھاپ ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد سے ہمارے ملک میں ایک وبا پھیلی۔ یہ وبا تمام ان قدروں کا جو ادبی ہوں، لسانی ہوں، مذہبی ہوں سماجی و ثقافتی ہوں اور جن کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اگر مسلمانوں کی تہذیب سے تعلق ہو تو اس کی نفی کرنا ہے اس لئے ایک طریقہ جو اپنایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ بجائے بیرونی اثر دکھانے کے دیسی اثر دکھایا جائے) دوسرا طریقہ حقیقت سے انکار یا واقعات کو مسخ کر کے انھیں اپنی طبیعت کو جولانی سے مطابق کرنا ہے اس کی ایک مثال ڈاکٹر ہردیو بہاری کی انگریزی کتاب "ہندی پر فارسی کا اثر" ہے جو ۱۹۶۰ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی۔ یہاں پر اس کتاب پر تبصرہ مقصود نہیں تاہم وہ لوگ جو اردو ہندی کی یکساں لسانیات سے دلچسپی رکھتے اور دوسری طرف عہدِ وسطیٰ کے تاریخی حقائق پر بھی نظر رکھتے ہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ کتاب علمی اعتبار سے کذب وافترا اور حسد و عناد کا مجموعہ ہے اس میں نہ دقتِ نظر ہے نہ طالبعلمانہ خلوص۔ لہٰذا اردو ہندی کا طالبِ علم جب اس قسم کی کتابوں کا سہارا لیتا ہے تو انتہائی خطرناک آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے اس سے ہٹ کر کہ فارسی زبان نے بالواسطہ یا بلا واسطہ ہندی کو کتنا متأثر کیا ہے چوہان صاحب نے بھی ہردیو بہاری کے سہارے اردو ادیبوں اور شاعروں پر غیر ہندوستانی اور غیر قومی ہونے کا الزام عائد کیا ہے۔ اردو کے ہندوستانی اور قومی یا حب الوطنی کردار پر یہ اعتراض اردو زبان وادب سے لاعلمی کا باعث ہے۔ یہ لاعلمی ادب، تحقیق اور علمی فتوے صادر کرنے میں بہت بڑا گناہ ہے۔ تحقیق میں تخیل کی بے پناہ اڑان ساتھ نہیں دیتی جبکہ ریاضی کا فارمولہ ۱ + ۱ = ۲ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو کے ہندوستانی قومی اور غیر مذہبی (سیکولرزم) کردار کے بارے میں پچھلی سطور میں چند اشارے کئے گئے ہیں۔ اردو زبان وادب میں اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ آنکھیں ہوتے ہوئے ہم دیکھنا نہ چاہیں، کان ہوتے ہوئے ہم سننا نہ چاہیں، اور حقیقتوں کو سمجھنے جاننے کے بجائے اگر ہم شروع سے منفی طریقۂ کار اختیار کر کے حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں تو یہ قصور ہمارا ہے حقائق کا نہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ "پھولبن" از شیخ محمد مظہر الدین ابن شیخ فخر الدین معروف بہ ابن نشاطی کو پروفیسر عبدالقادر سروری اور جناب شیخ چاند صاحب نے بالترتیب اردو میں مرتب کر کے شائع کیا۔ ابن نشاطی کا پورا نام ثانی الذکر ترتیب سے سامنے آیا جو شاعر کے بارے میں ایک اہم معلومات ہے۔ پروفیسر سروری اور جناب شیخ چاند صاحب کے مرتبہ "پھولبن" میں قرارت میں... اختلافات پائے جاتے ہیں اور اشعار میں کہیں کہیں اختلاف اور کمی بیشی بھی ملتی ہے۔ ان دو مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر اور شاید چند مخطوطوں کی مدد سے دیوی سنگھ چوہان صاحب نے ناگری میں اسے دوبارہ مرتب کیا۔ دیوناگری پھولبن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرتب کی اپنی بڑی خواہش تھی کہ قرارت اور معنی کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ وارفع متن پیش کرے اور ان غلطیوں کو اجاگر کرے جو اس کے پہلے مرتبین نے اپنے اردو نسخوں میں کی ہیں۔ افسوس ہے کہ چوہان صاحب اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اور قدم قدم پر لفظ و معنی اور دکنی تلفظ میں ناکام رہتے ہوئے ان گنت غلطیاں دیوناگری نسخہ "پھولبن" میں بھی راہ پا گئیں ہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اردو نسخوں کی صحیح قرارت کو ہندی میں غلط کر دیا ہے جس سے قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ شاید مرتب کا ذخیرۂ الفاظ

بہت محدود ہے اور اگر اردو میں اعراب نہ ہوں تو مرتّب سے اس قسم کی غلطیاں ہونے کا ہر وقت احتمال ہو سکتا ہے۔ اردو جاننے کی صورت ہی میں ان غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ قرارت اور معنی کی یہ غلطیاں بھی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ دکنی اردو ہے ہندی نہیں جس کا چوہان صاحب اور بابو رام جی نے دعویٰ کیا ہے۔ ذیل میں ہم قرارت اور معنی کی چند کمزوریوں کی طرف اشارہ کریں گے جو اردو نسخوں کے برخلاف ہندی ترتیب میں راہ پا گئی ہیں۔

اردو میں "کو" علامت مفعولی ہے۔ دکنی میں یہ "کوں" (Kun) ہے۔ دیوناگری نسخہ میں اسے Kon/ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ دیوناگری میں कों کی بجائے कूं ہونا چاہیئے تھا۔ ص۱ شعر ۲۔ اسی طرح اسی شعر میں لفظ کبریائی کو کبربائی कबरबाई لکھا ہے۔ اصل لفظ ۔۔۔ ۔۔۔ किबरयाई ہونا چاہیئے تھا۔ ص۱ شعر ۲ میں پھر کوں (Kun) اور (Kon) کی غلطی۔ اسی طرح دَھرت धरत کے بجائے دَھرَت धरत ہونا چاہیئے۔ धरत سے شعر ساقط الوزن ہو جاتا ہے۔ شعر ۵ میں نازنیں नाज़नीन کے بجائے نازنیں नाजनी نون غنہ کے ساتھ ہے۔ پہلی قرارت غلط ہے۔ یہی حال اسی شعر کے دوسرے مصرعے عنبریں کا ہے۔ نون کا اعلان اس میں بھی صحیح نہیں۔ شعر ۸ کا مصرعہ ثانی یوں ہونا چاہیئے۔ "دیا لب کے نصیباں میں نون نابات"، نسخہ ہذا میں "کے" نہیں ملتا۔ اسی طرح "نابات" کے معنی چوہان صاحب نے "دانت" دیئے ہیں۔ جو صحیح نہیں۔ نابات دراصل نبات ہے جس کے معنی مصری کے ہیں۔ شعر ۹ میں چرخ بمعنی گھمانا استعمال ہوا ہے۔ فارسی میں بھی چرخ کے معنی گھمانے کے ہیں۔ جیسے چرخ گردوں۔ اسی طرح آسمان کے بجائے اسماں ہونا چاہیئے۔ دکنی کے لحاظ سے الف ممدودہ غلط ہے۔ شعر ۱۲ میں कदहा قد کی جمع "قدان" ہے قد کے معنی قامت اور اونچائی کے ہیں۔ بلند قامت محبوب کو

"سرقد" کہا جاتا ہے۔ چوہان صاحب نے कदहा کے معنی "کبھی" لکھے ہیں۔ جو کسی طرح صحیح نہیں معلوم نہیں چوہان صاحب نے कदहा کے معنی "کبھی" कधी کس طرح دیئے اور وہ اسے کس زبان کا لفظ سمجھتے ہیں۔ مرہٹی میں بھی یہ لفظ نہیں ملتا۔ البتہ مرہٹی کی بولی کو دکنی میں قداں بمعنی کبھی مستعمل ہے لیکن اس کا یہ محل نہیں۔ شعر ۱۴ میں کیتا कयता صحیح نہیں۔ یہاں پر کیتا कैता ہونا چاہیئے۔ ص۲ پر پہلے شعر میں لفظ ادب بمعنی عزت، لحاظ یا آدر کے आदर کے مستعمل ہے۔ چوہان صاحب نے اس کے معنی ادب ۔۔۔ ۔۔ (साहित्य) کے لکھے ہیں جو بالکل غلط ہے۔

دوسرا حصّہ " مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات" میں مناجات اضافت کے ساتھ صحیح نہیں۔ چوہان صاحب نے اسے اضافت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اسی حصّے کے دوسرے شعر میں "شاہد" بمعنی معشوق استعمال ہوا ہے۔ چوہان صاحب نے اس کے معنی साक्षी گواہی دینے والا کے لکھے ہیں۔ اس موقع پر یہ معنی قطعاً ناموزوں ہیں۔ آٹھویں شعر ۸ گرم गरम کی بجائے گرَم गरम مع تشدید خوشوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ شعر ۱۲ میں "سدا حت کی راہت سوں چلاتوں" میں چوہان صاحب نے راحت کی مناسبت سے بمعنی آرام لکھے ہیں۔ یہ لفظ راہ سے راہت ہے بمعنی راستہ۔ اسی طرح "صحت" کا راستہ بمعنی صحیح راستہ۔ صراط مستقیم مراد ہیں۔ چوہان صاحب کے معنی "تندرستا" निरोगीता میں چوہان صاحب صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں اسی حصّہ کے چودہویں شعر میں "زبونی" سے مراد نقصان ہے۔ مرتب نے اس کے معنی بیکار لکھے ہیں جو صحیح نہیں۔

تیسرے حصّے میں "در نعت حضرتِ سرورِ عالم محمد مصطفیٰ" (ص۳) میں مصطفیٰ کے معنی منتخب اور چنے ہوئے کے ہیں۔ چوہان صاحب نے اس کے معنی لیڈر یا نیتا کے لکھے ہیں۔ یہ مرادی معنی ہو سکتے ہیں لفظی معنی یقیناً نہیں۔ شعر ۷ میں دین اور عالمین میں نون غنہ ہونا چاہیئے۔

نون کا اعلان غلط ہے اسی طرح عالمین आलमिन دوہرے
معوتے کے ساتھ صحیح نہیں۔ اس کی قرارت आलमीन ہونی
چاہئے۔ شعر ۷ کے مصرعۂ ثانی میں ارواح آدم اضافت کے
ہونا چاہئے۔ بغیر اضافت کے "ارواحِ آدم" بے معنی ہے
شعر ۹ میں "مرسل" کا معنی چوہان صاحب نے "روانہ"
لکھے ہیں۔ درحقیقت اس کے معنی "بھیجا گیا" مرادی معنی
رسول یا کتاب، نبی کے ہیں۔ شعر ۱۲ میں "لفظ قرآن"
कुरआन ہونا چاہئے نہ کہ कुरान۔ شعر ۱۷ مشرف
मशरफ غلط ہے۔ اسے مُشَرَّف मुशर्रफ होना چاہئے
ص۷ پر "منقبت حضرت امیر المومنین علیؑ" کے تحت دوسرے
شعر کے مصرعۂ ثانی میں لفظ ولایت کے معنی مرتب نے
دیش لکھے ہیں देश یہ سراسر غلط ہیں۔
یہاں ولایت کے معنی "ولی ہونے کی حالت" کے ہیں
اس کے لئے کسی گہرے علم کی ضرورت نہیں تھی۔
جبکہ اردو ادب اور اس کے مزاج کی سوجھ بوجھ
شعر ۱۲ میں خم کے معنی جھکاؤ کے ہیں۔ چوہان صاحب
نے اس کے معنی نچلا پن تحریر کئے ہیں۔

ص۸ پر 'در مدح امام حسینؑ' کے تیسرے شعر میں
ہنرمند کی جمع ہنرمندوں لکھی ہے۔ یہ قرارت غلط ہے۔ دکنی
میں جمع بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں 'ان'
بڑھا دیا جاتا ہے اس لحاظ سے اسے ہنرمنداں ہونا چاہئے۔
دکنی روزمرّہ میں جمع بنانے کا یہی قاعدہ آج بھی عام ہے۔
شعر ۶ میں सतर کے بجائے सत्र ہونا چاہئے تھا۔
اسی طرح مصرعۂ ثانی میں "فی احسنِ تقویم" دراصل
آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ مرتب انھیں سمجھ نہیں سکے۔
شعر ۷ میں جدول بمعنی حاشیہ ہے مرتّب نے اس کے
معنی تختہ لکھے ہیں۔ جو قطعاً غلط ہے، شعر ۱۳ طرح، طرح
ڈالنا۔ بنیاد کے معنی رکھتا ہے۔ چوہان صاحب نے اس
کے معنی पद्धति دیتے ہیں۔ شعر ۱۴ میں رقم بمعنی لکھنے
کے ہیں۔ بیان کے نہیں ص۹ پر تیسرے شعر میں फरात
غلط ہے۔ یہ لفظ فُرات ہے (फ़ुरात) ہے جو عراق میں

ایک دریا کا نام ہے۔ مصرعۂ ثانی کی قرارت بھی بالکل غلط ہے
چوہان صاحب کی قرارت کے مطابق یہ شعر اس طرح ہے ؎

فُرات اپنے دو نیناں کر کو دکھلاؤں
ہور وکربلا تن کر کو دِکھلاؤں

اس شعر کی صحیح قرارت یوں ہوگی ؎

فُرات اپنے دو نیناں کر کو دکھلاؤں
ہور وا کربلا تن کر کو دِکھلاؤں

معنی:- اپنے دونوں آنکھوں کو فُرات کی ندی اور سارے جسم
کو کربلا (میدانِ کربلا) کر کے دکھاؤں۔ فُرات کی مانند آنکھیں
جو روئیں گی وہ خون ہوگا جو جسم پر بہے گا اور اس سے
میدانِ کربلا کے خونیں واقعہ کی یاد تازہ ہوگی۔

ص۸ پر چھٹے حصّے کے اٹھارویں شعر میں لفظ کسریٰ
میں زبر کی بجائے زیر ہونا چاہئے۔ یہ لفظ किसरा ہے نہ کہ
कसरा۔

شعر ۲ میں अदहम غلط ہے دراصل یہ ابراہم
ادہم अदहम ہے۔

ص۹ کے تیسرے شعر میں ؔ बरसाती کی تفصیلی
صراحت ضروری تھی یہ ایک فارسی مثنوی ہے۔

ص۱۲ شعر ۱ میں خار کانٹوں کے معنی میں ہے۔
چوہان صاحب نے اس کے معنی अपमानित دیئے ہیں جو
غلط ہیں۔

ص۱۳ پر دسویں حصّے کے تیسرے شعر میں تہلیل کے
معنی تعریف کے ہیں۔ मेल पर ईश्वर का नाम लेना
کے معنی صحیح نہیں۔ تہلیل کی ایک نیم مذہبی اسم ضروری ہے
جس میں خدا کی ثنا اور تعریف اور توصیف کی جاتی ہے لیکن
یہاں یہ بے موقع ہے اسی صفحہ پر آٹھویں شعر میں "اندیشہ
کرنے" سے مراد سوچنے کے ہیں۔ چوہان صاحب کے معنی
आशंका करना صحیح نہیں۔

ص۱۴ پر اٹھارویں شعر کے ثانی مصرعے "کیے ہیں
مولوی جوں مثنوی میں" کی صراحت ضروری ہے چوہان صاحب
شاید یہ اشارہ نہیں سمجھ سکے کہ مثنوی مولوی معروف بہ مثنوی

مولانا روم کی طرف اشارہ ہے ۔ چوہان صاحب نے صرف لفظ مثنوی کے معنی پر اکتفا کی ۔ اتفاق سے مثنوی کے دیئے ہوئے معنی بھی غلط ہیں ۔ مثنوی کے معنی کتھا نہیں ہیں ، اسے وہ کتھا کا دیہ काव्य कथा کہہ سکتے تھے ۔

اسی صفحہ پر انیسویں شعر کو چوہان صاحب سمجھ ہی نہیں سکے ۔ اس شعر میں حدیقہ کے معنی چوہان صاحب نے ... मदीना के समीप का एक गाँव دیئے ہیں ۔ یہ صحیح نہیں ۔ سنائی सनाई کو بھی فاضل مرتب सनाई پڑھ گئے ۔ شاید اس سے انھوں نے کوئی معنی بھی نکالے ہوں لیکن اس کے معنی واضح ہیں ۔ مدینہ کے قریب حدیقہ نام کا کوئی گاؤں نہیں ہے ۔ حدیقہ عربی لفظ ہے اور اس کے معنی باغ کے ہیں ۔ دراصل یہاں پر فارسی کی مشہور مثنوی حدیقت الحقیقت معروف بہ حدیقہ سنائی کا ذکر ہے ۔ یہ مثنوی ابوالمجد مجدود بن آدم معروف بہ حکیم سنائی نے لکھی تھی ۔ حکیم سنائی بارھویں صدی عیسوی کے شروع میں پیدا ہوئے ۔ آپ فارسی کے صوفی مثنوی نگار شعراء عطّار اور رومی کے پیش رو تھے ۔ اور افغانستان کے غزنہ یا بلخ سے تعلق رکھتے تھے ۔ آپ بہرام شاہ کے دربار سے وابستہ تھے ۔ حکیم سنائی نے سات مثنویاں اور دیوان یادگار چھوڑا ہے جن میں مثنوی حدیقۃ الحقیقت معروف بہ حدیقہ سنائی نے بہت شہرت پائی ۔ یہ مثنوی بہرام شاہ کے نام معنون ہے یہ دس حصّوں میں منقسم گیارہ ہزار اشعار پر مشتمل متصوفانہ اور اخلاقی نظم ہے [1]

اسی صفحہ پر دو اور جگہ فاضل مرتّب نے متن سمجھنے کی کوشش نہیں کی ۔ اس میں ایک وقت یہ بھی ہے کہ وہ اردو کے مزاج سے ذرا کم واقف ہیں ۔ تیئیسویں شعر میں گلشن راز کا حوالہ ہے مرتب نے اس کی صراحت نہ حاشیے میں کی اور نہ ہی تعلیقات میں ۔ یہاں بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سرسری گذر گئے ۔ "گلشن راز" دراصل فارسی مثنوی کی طرف اشارہ ہے ۔ اس کے مصنف تیرھویں صدی عیسوی کے سعد اللہ محمود شبستری تھے جو اپنے گاؤں شبستر کی مناسبت سے شبستری کہلاتے تھے ۔ آپ نے ۱۳۲۰ء میں وفات پائی ۔ یہ اپنی مثنوی "گلشن راز" کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے "گلشن راز" تقریباً ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور صوفیانہ شاعری میں بہت وقیع سمجھی جاتی ہے ۔ اس مثنوی میں امیر حسینی خراسانی کے پندرہ سوالوں کے جواب دیئے گئے ہیں ۔ "گلشن راز" کو جناب ای وہن فیلڈ نے ۱۸۸۰ء میں مرتب کر کے حواشی کے ساتھ انگریزی میں لندن سے شائع کیا [2] اسی صفحہ پر چوبیسویں شعر میں "لمعاتِ عراقی" کا ذکر ہے ۔ فاضل مرتّب کو "لمعات" پڑھ گئے اور اس کے معنی دیئے इच्छा ۔ یا شاید وہ لمعات کو سمجھ نہیں سکے اور اندازہ لگایا کہ یہ لفظ صرف لمحات ہی ہو سکتا ہے ۔ عراقی کے معنی انھوں نے "ملک خاص" देशविदेश دیئے ہیں ۔ بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ چوہان صاحب نے اپنی عمر اور تجربہ سے تحقیق میں فائدہ نہیں اٹھایا ۔ اور کچھ کا کچھ پڑھ گئے اور اس سے زیادہ جو جو ہا معنی نکالے اس شعر میں حدیقہ سنائی اور گلشنِ راز کی طرح مشہور فارسی شاعر عراقی کی کتاب معروف بہ "لمعات عراقی" کی طرف اشارہ ہے ۔ یہ کتاب فارسی نثر میں لکھی گئی ۔ اس کے مصنف فخر الدین ابراہیم ہیں ۔ عراقی آپ کا تخلص تھا ۔ آپ ہمدان میں پیدا ہوئے عراقی نے محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم پر شیخ صدرالدین کی تقاریر سننے کے بعد لمعات جس کے معنی شعاع اور روشن کے ہیں ۔ لمعات لکھنے کے بعد مولانا عراقی نے اسے شیخ صدرالدین کو دکھایا جو اپنے زمانے کے علماء میں سے تھے ۔ شیخ نے اسے بہت پسند فرمایا "لمعات عراقی" نسبتاً چھوٹی کتاب ہے اور سات سے آٹھ ہزار الفاظ پر پھیلی ہوئی ہے ۔ گو یہ نثر میں لکھی گئی تاہم اس میں بیشمار اشعار بھی ہیں ۔ ۔ ۔

---

literary History of Persia. vol.II, by E.G.Brown Cambridge 1964 pages 317-319
literary History of Persia. vol.III,by E.G.Brown Cambridge 1964 pages 146-149

مولانا جامی نے "لمعات کی "اشعۃ اللمعات،، کے نام سے شرح بھی لکھی۔ لمعات عراقی ۲۸ لمعات (Flashes) میں منقسم ہے جو غالباً عربی زبان میں ۲۸ حروف کی مناسبت سے ہے۔ [۳۵]

صفحہ ۱۶ پر چوتھے شعر میں تفاوت तफावुत ہونا چاہئے तफावत صحیح نہیں۔

صفحہ ۲۲ پر پانچویں شعر میں تلخ तल्ख होना چاہئے۔ तलख صحیح نہیں۔ اسی طرح اٹھارویں شعر میں کوہ کن کोहकन غلط ہے कोहकन ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۵ پر آخری شعر میں ضعیف بمعنی کمزور ... (कम ज़ोर) استعمال ہوا ہے یہاں پر اس کے معنی بوڑھا موزوں نہیں ہے۔ صفحہ ۲۶ پر چھٹے شعر میں दिकदिक کی جگہ ڈگ ڈگ डग डग بمعنی قدم قدم ہونا چاہئے۔ دِک دِک بے معنی ہے۔ صفحہ ۲۷ پر ساتویں شعر میں औरत ہونا چاہئے۔ औरत غلط ہے۔ اسی طرح پندرہویں شعر میں सद کی جگہ "سو،، صحیح ہے۔ صفحہ ۳۰ پر بہرحل बहरहल کی جگہ बहरहाल ہونا چاہئے۔ اسی طرح سولہویں شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں थेद کی جگہ "بید،، बेद صحیح ہے

صفحہ ۳۱ پر آہنگ بمعنی ارادہ استعمال ہوا ہے گو آہنگ کے معنی آواز کے بھی ہیں لیکن آواز یہاں موزوں نہیں ہے صفحہ ۳۲ پر حمل بُرج کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مرتب نے اس کے معنی گربھ गर्भ लिखे ہیں جو سراسر غلط ہیں صفحہ ۳۹ پر حُور کے معنی فاضل مرتب نے عورت کے لکھے ہیں یہ صرف مرادی معنی ہیں ورنہ حُور اور عورت میں بہت فرق ہے صفحہ ۶۳ پر حجت Proof کے معنوں میں ہے "جرچا،، غلط ہے صفحہ ۶۷ پر سے

کہیں نالے، ندیاں، حوضاں، النگتی
چھلیاں سوں پاؤں کے گاہے اولنگتی

میں دوسری مرتبہ اولنگی کے معنی او = وہ اور لنگتی لنگڑاتی وہ لنگڑاتی نتی کے ہیں (؟) صفحہ ۶۹ پر پہلے شعر میں لفظ "منبت بمعنی منبّت کاری کے ہیں۔ جوہان صاحب نے نہ جانے کیسے ایسے مراٹھی لفظ मोमबत्ती کا اردو روپ سمجھ لیا۔ یہ نالے کو رسا باندھنے کی عمدہ مثال ہے۔

منشی پریم چند کو چینی ادیبوں کا خراج تحسین

چین کے ادیبوں نے مشہور ناول نگار منشی پریم چند کو اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چین کے نائب وزیرِ خارجہ مسٹر ساؤ نانگ کے زیرِ صدارت ملک کے دوسو سے زائد ادبی تنظیموں کے منعقدہ اجلاس میں منشی پریم چند کی کہانیوں اور ناول "رنگ بھومی" کے چینی زبان میں اشاعت کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ پیکنگ میں متعین ہندوستانی سفیر مسٹر کے ایس باجپئی بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔

A literary History of Persia vol.III, by E.G.Brown Cambridge 1964 page 124.

ڈاکٹر صابرہ سعید

اردو ادب میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کا قطعی طور پر تعین ممکن نہیں۔ شاعری جو نثری ادب کی بہ نسبت زیادہ کہنہ اور قدیم ہے۔ اس صنف کے ابتدائی نقش بکثرت ملتے ہیں خصوصیت سے مرثیوں، مثنویوں، قصیدوں اور ہجو وغیرہ میں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اور نثری ادب کی حد تک اس صنف کے ابتدائی نمونے تذکروں میں ملتے ہیں۔ تذکرے کب اور کس طرح وجود میں آئے اس ضمن میں قطعی طور پر تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ جب اردو میں باضابطہ شعر گوئی کا رواج ہوا تو مشاعرے ترتیب دیے جانے لگے اور پھر اہل ذوق نے بیاضوں میں اپنی اپنی پسند کے اشعار لکھنے شروع کیے۔ بعض لکھنے والوں نے منتخب اشعار کے ساتھ شاعر کا نام بھی لکھ دیا اور اس کے کچھ حالات بھی درج کر دیے اس طرح تذکرہ نگاری کی ابتداء ہوئی چونکہ اردو شاعری کے رواج کے کافی عرصہ بعد تک بھی تصنیف و تالیف کی زبان فارسی ہی تھی اس لئے ان بیاضوں اور تذکروں میں شعرا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا فارسی ہی میں ہے۔ میر کا نکات الشعراء ۱۱۶۵ء میں لکھا گیا۔ نکات الشعرا اور اس کے بعد کے تذکروں میں ہم کو خاکے نگاری کے اولین ہلکے پھلکے نقش ملتے ہیں لیکن یہ نقوش اتنے مکمل نہیں ہیں کہ ہم انہیں خاکہ کہہ سکیں تذکروں میں شخصیات کی جو جھلکیاں خاکوں سے مشابہ ملتی ہیں ان کو لکھتے وقت شخصیت نگاری کے فنی اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور نہ ہی تذکرہ نگاروں نے اس کو ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے برتا ہے شخصیت کو پیش کرتے وقت بڑے ہی اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے۔ تذکرہ نگار چند الفاظ یا فقروں کے ذریعے شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے ہیں جیسے میر کے 'نکات الشعرا' میں یہ الفاظ یا ترکیبیں یار باش، خوش ارتباط، دیر آشنا وغیرہ جن کے ذریعے میر نے موضوع کی سیرت و کردار کو واضح کیا ہے۔ بعض تذکروں میں شاعروں کے متعلق نسبتاً زیادہ تفصیل سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جیسے قدرت اللہ قاسم کا 'مجموعہ نغز' یا سعادت یار خاں کا تذکرہ 'خوش معرکہ زیبا' وغیرہ لیکن ان تذکرہ نگاروں کی نامکمل خاکہ نما تحریروں کو ہم خاکہ کا عکس ضرور کہہ سکتے ہیں۔ لیکن خاکہ کی شرائط کی عدم موجودگی کے سبب اس کو خاکہ کی صنف میں شمار نہیں کر سکتے۔ تذکروں کے بعد انشاء کی 'دریائے لطافت' میں کردار نگاری کی جھلکیاں نسبتاً واضح ملتی ہیں۔ انشاء نے میر ظفر عبنی، لی لوزان، مرزا صدرالدین اصفہانی اور ملّا عبدالفرقان کی کامیاب تصویریں اتاری ہیں۔ لیکن ان میں حلیہ اور ہیئت نگاری زیادہ اور شخصی فطرت کی عکاسی کم ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے تاثرات کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے جس کے سبب ان کے پیش کردہ خاکے Proto type خاکے کہے جا سکتے ہیں۔ خاکہ نگاری صنفِ ادب کی حیثیت سے چند انفرادی خد و خال اور خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کی سیرت کی دھوپ چھاؤں، اس کے عادات و اطوار اس کے کردار کے سیاہ و سفید کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس سے شخصیت کے اہم گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے خاکوں کی جھلک ہم کو 'محبوب الزمن' اور 'تذکرہ گل رعنا' میں بھی کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن آزاد کی 'دربارِ اکبری' 'نیرنگ خیال' اور 'آبِ حیات' میں بعض معلومات ایسے انداز میں فراہم کئے گئے ہیں اور کرداروں کے مخصوص زاویوں پر اس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ قلمی تصویریں خاکے سے بہت قریب

نظر آنے لگتی ہیں۔

محمد حسین آزاد پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے مختلف افراد کا حلیہ، عادات و اطوار، نظریات و عقائد، ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پوری شخصیت ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ خاکہ نگاری کے لئے صرف شخصیت کو جان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے تمام تر حالات جمع کر کے اپنی قوت تخیل کے ذریعہ ان میں ایک نئی روح پھونکنا ضروری ہے۔ جن افراد سے ہمارا تعلق ہوتا ہے ان کی بابت تو ہم سب ہی کچھ جانتے ہیں مگر خیالی کردار مکمل طور سے سمجھے اور جانے جا سکتے ہیں۔ اگر خاکہ نگار ان کو اچھی طرح ظاہر کرے تو یہ کردار ہمارے دوستوں سے زیادہ دوست، عزیزوں سے زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ہر قسم کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور خاکہ نگار اپنی تخلیقی قوت کے ذریعہ کردار کی ان حرکات اور صفات تک پہنچ جاتا ہے جو ان کی مکمل ہستی کا کامل نقشہ کھینچنے کے لئے ضروری ہے اور ان ہی چیزوں کا سہارا لے کر وہ اپنے خیالی کردار کو عام زندہ لوگوں کے کردار سے زیادہ زندہ اور جاندار بنا دیتا ہے۔

محمد حسین آزاد نے چند تمثیلی انشائیے لکھے تھے ان مضامین میں بھی کہیں کہیں خاکہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا مضمون "شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار" پیش کیا جا سکتا ہے۔ دربار شہرت میں جگہ پانے والوں کا انتخاب کرنے میں آزاد نے کئی برس کے زمانے کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں آزاد نے جن اشخاص کا انتخاب کیا ہے ان کی زندگی کے حالات پیچ و خم سے انہیں ذاتی دل چسپی تھی۔ ان بیانات میں جاذبیت کے پہلوؤں کو نمایاں کر کے انہوں نے قاری کو بھی متاثر کیا ہے، اور لفظوں کے ذریعے بہترین مصوری کر کے مشاہیر عالم میں چند لوگوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کر دیں۔ محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف "دربارِ اکبری" میں بھی خاکہ نگاری کی کچھ جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ اس میں بھی ہم کو خصائل و عادات، حلیہ نگاری کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔

خاکوں کی سرحد سے زیادہ قریب آنے والی کتاب "آبِ حیات" ہے جس میں محمد حسین آزاد نے ہر شاعر کا حلیہ، عادات و اطوار، نظریات اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پوری شخصیت ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس میں پیش کردہ شخصی تصویروں کو خاکوں کے واضح نمونے کہہ سکتے ہیں۔ نقادوں نے بھی اس جواہر پارے کو تاریخ، تذکرہ، سوانح اور قلمی مرقعوں کی بہترین پیش کش قرار دیا ہے۔ خود آزاد اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیاتِ جاوداں حاصل ہے۔"

شاید اسی وجہ سے آبِ حیات میں نہ صرف شعراء کا حلیہ، لباس، صنائع و اطوار اور طرزِ بود و باش، اندازِ گفتگو وغیرہ کا ذکر ملتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ماحول کا مشاہدہ، اس دور کی معاشرت اور زندگی کے نقشے اور معیار اخلاق تہذیب کا علم، ادبی اور علمی شخصیتوں کے مشاغل اور تفریحیں، علمی مجلسیں، مشاعرے، اخلاقی کمزوریاں، رقابتیں، کشمکش وضعداریاں و پاس داریاں، توہمات و تعلقات، بازدید کے طریقے باہمی سلوک و مراعات، ان کے رد و قبول اور ان کے پسند و ناپسند کے معیار۔ غرض سارے نظام معاشرت کا روشن عکس ہم اس میں موجود پاتے ہیں۔ جس کو آزاد نے اپنے مخصوص اندازِ بیان کے ذریعے ہماری نظروں کے سامنے سینما کے مختلف مناظر کی شکل میں بکھیر دیا ہے۔ آزاد کلام کے ساتھ شعراء کی شخصیتوں کو بھی زندہ رکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے پرانی روش کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ منتخب کیا اور اس طرح آبِ حیات نہ صرف تذکرہ و تاریخ بلکہ خاکہ نگاری اور انشاء پردازی کا مجموعہ اور مرکب بھی بن گئی۔ اس کا اسلوب ایسا اچھوتا اور قلمی تصویریں اتنی جاندار ہیں کہ اس کی دل چسپی ہر دور میں باقی رہے گی اور اس قسم کی پیش کش میں اولیت کا سہرا ہمیشہ آزاد کے سر رہے گا۔

ان کے بعد رسوا اور شرر نے ان کی رکھی ہوئی بنیاد پر اس صنف کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ شرر نے "سیر رجال و نسواں" کے علاوہ چیدہ شخصیتوں کے تین اہم سلسلے بھی لکھے ہیں۔ ان میں بھی ہم کو شخصی مرقعوں کے زیادہ واضح نمونے ملتے ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے "وضع دارانِ لکھنؤ" کے نام سے شخصیتوں پر مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ ان کی پیش کش کے انداز میں جدت، خلوص اعتماد اور قطعیت ضرور ہے لیکن انہوں نے شخصیتوں کی سیرت کے کسی ایک پہلو ہی کو اجاگر کیا ہے۔ اس حیثیت سے ان کے پیش کردہ مضامین

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

خواجہ عبدالغفور (آئی اے ایس)

ستم ظریف

کنہیا لال کپور کی یاد میں

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

۵ رمئی ۱۹۸۰ء کو اردو کا منفرد اور اعلیٰ ترین مزاح نگار دارِ فانی سے کوچ کرگیا۔ اس منحوس دن سے کچھ پہلے ان کی زبان پر غالب کا یہ شعر بار بار سنا گیا۔ نہ معلوم وہ کون سی حِس تھی جو ان کو یہ شعر پڑھنے پر اکساتی رہی۔ ہم سب تو ان کی مزاح کی حِس سے واقف ہیں جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی انشاء نگاری سے سبھوں کے دل موہ لئے تھے اور اردو ادب میں اپنا مقام پیدا کیا تھا۔

انتقال سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان قلم کاغذ، بیاض سب ہی بند کرکے رکھ دیا تھا۔ ان کا آخری مضمون "زندگی اور موت" ہند سماچار میں شائع ہوا۔

گھر والوں کا کہنا ہے کہ ویسے تو وہ کئی دن سے اپنے لاہور کے دوستوں کو اور وہاں کی زندگی کو بہت یاد کرنے لگے تھے لیکن مرگِ ناگہانی سے ایک دن قبل انہوں نے نام بنام اپنے دوستوں کو یاد کیا اور ۲۴ سال بعد اپریل ۱۹۸۰ء میں جب وہ بمبئی آئے تھے اس کی یاد بڑی محبت سے تازہ کرتے رہے۔ اور اس بات پر بہت خوش تھے کہ نئے قلم کار اور ادیبوں کے سوا اپنے پرانے مخلص ساتھیوں سے بازدید کا موقع ملا۔

۱۵، ۱۶ ر اپریل ۱۹۸۰ء کو مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے اردو افسانہ پر منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کے لئے میں نے دعوت دی تھی اور منت سماجت بھی کی تھی کہ اب آپ موگا سے پونا آ ہی گئے ہیں اور ہم سے اتنے قریب ہیں تو ہمارے اس انڈو پاک سیمینار میں ضرور حصہ لیں۔ چنانچہ یہ اطلاع دیئے بغیر کہ وہ کب پہونچ رہے ہیں پھر گھر قدم رنجہ فرمائے۔ اور ہم نے انھیں دیگر ادیب و شعر کار کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ بڑے خوش تھے اچھی صحت اور معیت تھی اور دن رات ہنسی خوشی ظرافت اور لطافت کے دریا بہاتے رہے۔ بات بات پر لطیفہ، ہر دو جملوں کے بعد دلچسپ مزاحیہ شعر اس انداز سے سناتے رہے کہ سننے والے پھڑک جاتے۔

خواجہ احمد عباس سے بغلگیر ہوئے تو بولے "چلو اچھا ہوا ایک خواجہ (خواجہ عبدالغفور) نے دوسرے خواجہ (خواجہ احمد عباس) سے ملنے کا بندوبست کیا۔"

یاد ہوگا کہ کنہیا لال کپور کو خواجہ احمد عباس سے بڑا پیار تھا اور انہوں نے اپنی کتاب "بال و پر" کا انتساب ان کے نام سے کیا تھا اور اس مناسبت سے کہ ان کے سر پر بال نہیں ہیں۔ انہوں نے لکھا —

"کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں"

راقم الحروف کی کتاب "گل و گلزار" کے تعلق سے بھی ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے: "آپ خواجہ لوگ غضب کے ہوتے ہیں۔ ایک خواجہ پانی پت سے اٹھا اور بمبئی میں آکر سارے ہندوستان پر چھا گیا۔ دوسرا حیدرآباد سے اٹھا اور اس نے بمبئی جیسے بیاباں کو گل و گلزار میں تبدیل کردیا۔ اب اگر تیسرا خواجہ کہیں سے بھی نہ اٹھے تو کسی کو افسوس یا گلہ نہیں ہونا چاہیئے۔"

اپریل ۱۹۸۰ء کے اسی سیمینار میں ان کی ملاقات نئے پرانے ادیبوں سے ہوئی تو وہ بے حد خوش تھے ہر ایک سے کھل کر بات کر رہے تھے اور حسبِ معمول دریائے لطافت رواں دواں تھا۔ مجتبیٰ حسین نے ان کو کافی صحت مند دیکھ کر کہا، کپور صاحب آپ خواہ مخواہ اتنے دنوں پنجاب

K. L. Kapur M.A.

29.1.77

پیارے خواجہ عبدالغفور صاحب!

کی محبت میں گرفتار رہے۔ پونا آنے کے بعد ماشاء اللہ آپ کی صحت بہت اچھی ہوگئی ہے۔" قہقہہ لگا کر بولے۔ "مرحبا حسین چراغ گل ہونے سے پہلے اسی طرح بھڑکتا ہے۔"

اسی سیمینار میں پاکستان سے آئے ہوئے ہر دلعزیز ادیب اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے بتایا کہ گذشتہ سال لاہور میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ کنہیا لال کپور کا انتقال ہو گیا ہے اور وہاں تعزیتی جلسوں کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ اس خبر کی تردید ہو گئی۔ اس پر ہم نے کہا کہ بالعموم یہ فالِ نیک ہوتا ہے اور اس کا شگون یہی نکالا جاتا ہے کہ عمر دراز ہو گئی اور ہم نے یہ دعا کی کہ خدا آپ کو سو سال کی عمر عطا کرے۔ اس دعا پر وہ خوش ہوئے اور نوجوان ادیبوں سے مخاطب ہو کر بولے کہ "آپ لوگ ضرور صد سالہ حیات والے جشن میں شریک ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اپنی زندگی ہموار رکھیں اور صحت بنائے رکھیں۔"

اس اپریل کے سیمینار میں شرکت کے لئے ہم ان سے جو مراسلت کر رہے تھے اس کے جواب میں قیل و قال کرتے رہے لیکن ۱۸ر مارچ ۱۹۸۰ء کے خط میں لکھا کہ وہ ضرور شریک ہوں گے اور سوالیہ انداز میں لکھا کہ آپ لوگ ۲۷ر جون ۱۹۸۰ء کو میری ستر سالہ سالگرہ کا جشن منا رہے ہوں گے اور ہیں نذرانہ بھی پیش کرنے کی سوچ رہے ہیں تو مناسب یہ ہوگا کہ نذرانہ کی رقم مجھے پیش کر دیں تاکہ میں پونہ میں اپنا مقبرہ بنالوں۔ سالگرہ کے جشن کے تعلق سے کہا کہ پنجاب میں یہ طریقہ ہے کہ جب کوئی ادیب ستر بہترا ہو جاتا ہے تو اس کے چاہنے والے اس کو ستر جوتے لگاتے ہیں اور پوچھتے جاتے ہیں کہ بتاؤ اب لکھنا پڑھنا ترک کروگے کہ نہیں۔"

ہم نے ان کو یقین دلایا تھا کہ مہاراشٹر میں ایسی کوئی روایت ہے نہ بدعت۔ اور ہم ان کی سترہویں سالگرہ بمبئی میں بڑے اہتمام سے منائیں گے۔

زندگی نے اس بری طرح دغا کیا کہ مہینہ سوا مہینے کی مہلت بھی نہ دی کہ اتنے بڑے ادیب کی زندگی میں ان کا جشن ہوتا۔

ان کے مزاج میں شئے لطیف کی اس قدر افراط تھی کہ بات بات میں چٹکلے گھڑے جاتے تھے۔ اور دوسری طرف کسی نہ کسی طرح سے بات شمع زندگی کے بجھ جانے کی بھی کرتے رہے۔ نہ معلوم وہ کون سا اندرونی احساس یا لاشعور تھا کہ جو بات ان کے منہ سے بار بار نکلتی رہی۔ اور تو اور ۲ر جون ۱۹۶۰ء کو انہوں نے اپنی رحلت کا دن مقرر کر کے ایک نوحہ لکھا "اپنی یاد میں"۔ انھیں ترکِ وطن اور لاہور چھوڑنے کا بڑا قلق تھا اور اسی کے حوالے سے لکھا "ان کی (کنھیا لال کپور) وفات اسی دن واقع ہوگئی تھی جب آج سے تیرہ برس پہلے انھیں لاہور چھوڑنا پڑا تھا لیکن جسمانی

طور پر وہ آج انتقال کر لیے۔ اس طرح ان کی موت دوبارہ ہوئی۔ بڑی خامیاں تھیں مرحوم میں۔

ویسے تو کہا جاتا ہے کہ جو خوش مزاج، خوش گفتار اور بظاہر ہشاش بشاش لوگ ہوتے ہیں اور جن کا پیشہ لوگوں کو ہنسانا اور خوش کرنا ہوتا ہے ان کے حساس دل میں چبھن ایک طرح کی کسک اور کھٹک ہوتی ہے ایک درد پنہاں ہوتا ہے کہ جس کا وہ خود کوئی درماں نہیں چاہتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ بات ہر ایک پر صادق آئے یا ایک اٹل کلیہ ہی بن جائے پھر بھی یہ بات ضرور سچ ہوتی ہے کہ انسان مجمع الضدین ہوتا ہے کبھی تو باطن کچھ ظاہر الگ۔ نرم گرم۔ شاداں فرحاں تو یاسیت اور قنوطیت سے بھرے کنھیا لال کپور اپنے متعلق کہتے ہیں: "میرا نظریہ حیات قنوطی ہے، رجائی نہیں۔"

کنھیا لال کپور نے اپنے ہفتہ وار کالم "دیکھتا چلا گیا" میں اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے اپنے طنز و مزاح سے بھرپور انشائیوں سے ہمیشہ اپنے قارئین اور سامعین کو رجھایا۔

پیروڈی اتنی با مذاق اور شائستہ لکھی کہ وہ ہمیشہ کے لئے انشائے لطیف کا جز بنی رہیگی۔

"غالب جدید شعرا کی مجلس میں" ان کا شاہکار ہے۔ جس میں انہوں نے جدید شعرا کی ذہنیت ان کے تفکرات اور بے معنی اشعار کی ہیئت ترکیبی کا مضحکہ اڑایا ہے۔

الفاظ کو نئے معنوں کا جامہ پہنانا اور ان کو لغات کپور کے تحت جمع کرنا ان کی فراست، زبان پر قدرت اور باذوق ہونے کی علامات ہیں۔

اپنی تحریروں اور تقریروں میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کے لئے اچھے اشعار دہراتے اور کہتے کہ آج کل کوئی نئی بات کہنا محال ہے پلٹ کر دیکھئے تو کسی نہ کسی نے وہی بات کہہ رکھی ہے۔ البتہ خرد مندی کے ساتھ سلیقہ چاہیئے کہ انھیں باتوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھنے پر جو مزاح پیدا ہوتا ہے اسکو "گبھا رکھا تر پنڈت اَب ُل کلام آجاد سے ماجرت کے ساتھ" والے مضمون میں کنہیالال کپور نے بڑے دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔

ایک مزاح نگار طنز نگار میں اتنی ساری ادبی خوبیاں ہونا محال ہے۔ اس لئے ان کی شخصیت ہمیشہ منفرد رہے گی ان کا اسلوب اور انداز بیان لاثانی۔ انھیں غالب ایوارڈ ضرور ملا۔ لیکن وہ محض ایک غالب ایوارڈ کے نہیں بلکہ ساہتیہ اکاڈیمی ایوارڈ اور اس قسم کے اعلیٰ ترین اعزاز کے مستحق ہیں جو ابھی بھی انھیں پس از مرگ عطا کئے جا سکتے ہیں۔

K. L. Kapur
M.A.
Principal D. M. College, MOGA
(GALIB AWARD WINNER)

PARVATI SERVICE STATION
Indian Oil Dealers,
SINGHAD ROAD
POONA-30

18th March, 1980

ہنسنے والے خواجہ تجھ پہ لاکھوں سلام

آپ کا دوسرا نوازش نامہ ملا۔ پہلا جناب رام لال نابھوی کے نام تھا۔ جو غلطی سے یا جان بوجھ کر مجھے بھجوایا گیا تھا۔ کہ مزاح نگار اصلاح ہی مزاح پیدا کیا کرتے ہیں۔

آپ کا دوسرا [illegible] عنایت نامہ پڑھکر باچھیں کھل گئیں۔ خاص کر یہ فقرے پڑھ کر دم خم پھر آیا کہ "جشن کپور کا اہتمام کیا جائیگا۔ جہاں ایک معقول نذرانہ بھی پیش کیا جائیگا اور سوچا کہ آپ کی خدمت میں عرض کیا جائے" حضور! نذرانہ بھجوا دیجئے۔ جشن رہنے دیجئے۔ میں اِنہوں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے مسٹر سریندر کپور کے یہاں پونا میں ہوں۔ اور یہاں ہی اب مقبرہ بنوانے کا ارادہ باندھا ہے اگر مناسب نذرانہ مل جائے۔ تو مقبرہ کی تعمیر شروع کر دی جائے۔ آپ نے فرید کوٹ کے پتے پر خطوط لکھے ہونگے۔ مگر میں موگا سے رخصت ہوتے وقت ڈاکخانہ والوں کو ہدایت کر آیا تھا "میرا کوئی خط مجھے ری ڈائرکٹ نہ کرنا"۔ ممکن ہے اسی لئے جواب نہ دینے کے گناہ سے بچ سکوں۔

میں اب کسی دن بھی بمبئی آ سکتا ہوں۔ ویسے 27 جون کو میں ستر سال کا ہو جاؤنگا۔ ہمارے پنجاب میں تو یہ رواج ہے۔ جب آدمی ستر ابہترا ہو جاتا ہے۔ تو اسکو ستر جوتے لگائے جاتے ہیں۔ اور پوچھا جاتا ہے "کیسے ہو" یا "اور لگائے جائیں"۔ خدا جانے مہاراشٹر میں کیا رواج ہے۔

میرے آپ کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا تھا۔ وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ یعنی میں نے [illegible] کہی تھی۔ آپ پر احسان نہیں کیا تھا۔

آپ کبھی کسی کام سے پونا آئیں۔ تو غریب خانہ پر ضرور تشریف لائیں۔ مجھے آپ سے مل کر از حد مسرت ہوگی۔

بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

عزیزان کو پیار۔

خدا آپ کو ہمیشہ اچھے حال اور بمبئی میں رکھے۔

نیازمند
کنہیالال کپور

حسن عباس فطرت

مجنوں جو مرگیا ہے

ژاں پال سارتر

ژاں پال سارتر کی موت ایک مایہ نازِ فلسفی اور ادیب ہی کی نہیں بلکہ ایک کھنکتی ہوئی صداقت کو دیتی ہوئی حقانیت کی دائمی گم شدگی ہے۔ شاید وہ اس صدی کا یا جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی ہے۔ اس وقت کا سب سے زیادہ ہر دل عزیز، نڈر، آزاد و روشن فکر آدمی ثابت ہو۔ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوتھی اور پانچویں دہائی میں اس نے دنیا بھر کے امنگ بھرے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں پر راج کیا ہے اور ادب اور فن کا ہر گوشہ اس کی شخصیت و تخلیقات سے متاثر ہوا ہے۔ سارتر وہ واحد فرانسیسی مصنف تھا جس کی تحریروں کو پڑھنا مہذب دنیا کا ہر انسان اپنا فرض سمجھتا تھا جب کوئی مشہور مصنف کچھ لکھتا تو اس کے دل میں یہ خیال ضرور آتا تھا کہ سارتر اسے پڑھ کر کیا سوچے گا، کیا کہے گا؟

سارتر کو اکثر لوگ سارت بھی کہتے تھے جو ایک قدیم ترکی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں بڑا سوداگر یا قافلہ سالار، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اسم بامسمٰی تھا اس نے بازارِ علم و دانش میں ایسی متاعِ بے بہا رکھی جس کی عرصے سے ہر آنکھ متلاشی تھی۔ اسکی تصانیف سے لوگوں نے زندگی کی طرف ایک نئے رویّے کی کھوج پائی جسے دوسری عالمی جنگ دور میں بہت سے افراد محسوس کرتے تھے۔ اس نے زندگی بھر ظلم، جبر، اور منافقت سے جنگ کی چاہے اس کے حریف ہم وطن رہے ہوں یا دور دیس کے باسی۔ فکر و عمل کی ایسی ہم آہنگی بہت مشکل سے اس قسم کی شخصیتوں میں جمع ہوتی ہے۔ اس کا فلسفہ وجودیت اس کی زندگی تھی اور ہر حرکت و سکون اس کا فلسفہ۔ عالمی جنگ کے میدان میں وہ ایک نڈر جانباز سپاہی ثابت ہوا اور فرانس کی پولیس و نظام زندانی کا کٹر دشمن بھی۔

اگرچہ فرائڈ اور نطشے کی طرح سارتر نے بھی اپنی فکر کا آغاز ایسی دنیا کے تصور سے کیا جس کا کوئی خدا نہیں لیکن اس کے افکار و اعمال کی صلاحیت اور سچائی اپنی جگہ پر پرکشش و لائق توجہ رہی۔ پوری نصف صدی تک اس کے نظریات و عقائد ہر محفل میں زیرِ بحث رہے۔

سارتر کی دنیا بنیادی طور پر انسان کی مخالف تھی اس کا کہنا تھا کہ انسان کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے بلکہ یہ صرف فرد ہیں جن کو زندگی کی لہریں چھوڑ دیا گیا ہے۔ سارتر نہ صرف یہ کہ انسان کے فرائض کے بارے میں تسلیم شدہ نظریات کے خلاف جدوجہد کرتا رہا بلکہ وہ دوسرے انسانوں کے اثر و رسوخ کے خلاف بھی عزم کامل رکھتا تھا۔ تاکہ انسان آزاد رہ سکے اور اسی فلسفے پر وہ سختی سے عامل رہا یہاں تک کہ ۷۷ سال کی عمر میں ۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء کو اس کی موت واقع ہو گئی۔

سارتر کا نام وجودیت کے فلسفہ سے جڑا ہوا ہے۔ اس فلسفہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اس کی بازگشت عصری انسان کو دل کی آواز معلوم ہوئی، جس کی وجہ سے عصری ادب و فن پر اس کی چھاپ بلا واسطہ یا بالواسطہ بالکل عیاں ہے۔ وجودیت اپنے مکمل و آزاد وجود کی تمام ذمہ داریوں کو تنہا سنبھالتے ہوئے حال کے ہر لمحے کو پرمسرت بنانے کی جدوجہد کرتا اور تمام مایوسیوں اور بحران پر وجدان کے ذریعہ فتح پاتا ہے۔ اس فلسفہ کا سفر ڈنمارک سے شروع ہوا اور جرمنی اور فرانس ہوتا ہوا اٹلی تک پہنچا۔ لیکن سارتر

ڈنمارک کے کارک گارڈ اور فرانس کے مارسل رو نکا موکو دوسری جنگ عظیم کے بعد کہیں مات کے آگے بڑھ گیا اور اس کا قافلہ سالار بن گیا۔ اس کے ڈراموں اور ناولوں نے طالب علموں اور دانشوروں کو امید کی نئی راہ دکھائی اور یہ پیغام دیا کہ اگر ہم کو روایت کے بے معنی ہونے کا احساس ہو جائے، تو ہم ایک بامعنی زندگی کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ "ہر انسان کی قدر و قیمت اور اہمیت قطعی ہے وہ کسی اور وجود یا حقیقت سے ماخوذ نہیں بلکہ ہر قسم کی صفت سے بالاتر ہے۔ معاشرہ اور سماج کے قوانین اگر وجود انسانی کی نفی کرتے ہیں تو انسان کو اپنی شخصیت کے تحفظ و دفاع کے لئے ان اصولوں سے اختلاف لازمی ہے۔" اس کے برعکس کارک گارڈ کا خیال تھا کہ انسان میں عمل کی ترغیب اس کے اپنے وجود کے باہر سے یعنی خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ سارتر نے اس میں ترمیم کی کہ عمل کی قوت ارادی ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ اسے صرف تلاش کرنا ضروری ہے وہ بنیادی طور پر ان گنت تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے لیکن یہ صلاحیت کسی خلا میں نہیں ابھرتی بلکہ اس کا اظہار اسے ایک معاشرے میں کرنا ہوتا ہے اور جب تک وہ اچھی طرح یہ نہ سیکھ لے کہ اسے کسی اور پر نہیں بلکہ خود اپنی ذات پر بھروسہ کرنا ہوگا وہ کوئی عمل کر ہی نہیں سکتا۔ سارتر اپنے منکر خدا و مادہ پرست فلسفے سے انسان کو دائمی ظلم و ستم اور عدم مساوات سے نجات دلانا چاہتا تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کا پیغام اس قدر بلند آہنگ تھا کہ عام آدمی کی فہم و عقل اس کا ادراک نہ کر سکی اور جس طبقے کی قدروں سے اس کو نفرت و جھلاہٹ تھی جس کا وہ خود ایک فرد تھا وہی متوسط طبقہ اس کے فلسفے سے متاثر ہوا۔

ژاں پال سارتر کی ساری زندگی مکمل جد و جہد ہے۔ وہ ۱۹۰۵ء میں پیرس میں پیدا ہوا مگر بہت جلد یتیم ہو گیا اور اس کی پرورش و تربیت کا پورا بار اس کی بیوہ ماں پر آن پڑا۔ لیکن اس کا تعلیمی کیریر بہت شاندار تھا اور ۱۹۳۴ء میں وہ پڑھ لکھ کر اتنا قابل ہو گیا کہ فلسفہ کا پروفیسر بن سکے کئی برس اس نے خلوص و تندہی کے ساتھ اس پیشے سے انصاف کیا اور اسی دوران اس کی مشہور کتاب LAN AUSEE شائع ہوئی، جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، کیونکہ اس میں فلسفہ کو حقیقی زندگی کے تجربات کی روشنی میں بہت خوبصورت زبان میں پیش کیا گیا تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے افکار و نظریات کو عملی زندگی میں دیکھنے کی عادت سی ڈال لی۔ تھوڑے دنوں بعد جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو اپنے ملک کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا موڑ ثابت ہوا۔ اس پر سول جنگ اور نازیوں کی بہیمانہ روش نے اس کے اندر نیا جوش و خروش بھر دیا۔

نازیوں کی قید سے رہا ہونے کے بعد اس نے ان کی شقاوت و ظلم کے خلاف قلمی جنگ کا محاذ کھول دیا۔ جس میں ایک ڈرامہ THE FLI - کو غیر معمولی شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ اگرچہ وہ عمر بھر محنت کش طبقے کے انقلاب کا مبلغ رہا اور نوآبادیاتی نظام سے برسر پیکار رہا مگر وہ اس راستے میں تشدد سے انکار کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ جلد ہی روس سے بدظن ہو گیا اور ماؤ وادی فلسفہ کا حامی بن گیا۔ اس نے جس طرح کھل کر کوریا و ویت نام میں امریکی قتل و غارت کو جرم عظیم سے تعبیر کیا۔ اسی طرح روس کے ہنگری و چیکوسلاواکیہ کے حملے کو ایک جارحانہ کاروائی قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ انتہائی خوف و دہشت کے ماحول میں اس نے الجیریا کے آزادی پسندوں کی حمایت کی اور حکومت فرانس کو سخت تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔

جن لوگوں نے سارتر کو دیکھا اور اس سے ملاقات کی ہے ان کا بیان ہے کہ وہ نہایت سادہ اور معمولی حیثیت کی زندگی گزارتا تھا۔ لیکن اپنی انا کا تحفظ اور انفرادیت کا نقش ہر جگہ موجود تھا۔ اس نے زندگی بھر سوائے لکھنے اور پڑھنے کوئی کام نہ کیا۔ اس کے چھوٹے سے مکان میں ٹوٹی کرسیاں، کتابوں، رسالوں کا انبار اور سگریٹ و سگار کے ٹکڑے بکھرے پڑے رہتے تھے، اس نے شادی بیاہ نہیں کیا نہ بچے پیدا کئے۔ مگر ساری زندگی ایک عورت سے وابستہ رہا، چاہے کوئی اسے بیوی جانے یا دوست یا داشتہ اس نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی، گھر پر مستقل رہنے والوں میں جانداروں میں صرف اس کے دو خونخوار کتے تھے اور نہ اس کے پاس سواری تھی نہ ڈرائیور دن بھر وہ اپنے گھر میں کام کرتا اور شام کو پیرس میں ادی ماگو کے کیفے میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ بازی کرتا۔ مسائل حاضرہ پر۔۔

اظہارِ خیال، ہنسی مذاق کرتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ کیفے پکاسو، گولڈ بین قسم کے عصری نباض فن کاروں وادیبوں کا اڈہ تھا۔ جن میں سب سے زیادہ مقبول و محبوب شخصیت سارتر کی تھی۔

سارتر کے فلسفے میں اس کی جبلت، جسمانی ساخت ماحول زندگی کے تجربوں کو بڑا دخل ہے بعض وقت اس کی باتیں بظاہر "فلسفے کے خشک فارمولے لگتے ہیں مثلاً وہ کہتا ہے کہ یہ کوئی اہم شئے نہیں کہ انسان کون سے حالات میں محصور ہے کیونکہ انسان آزاد ہے اسے اس کا حق دیا چاہیئے اور عمل کا ایک راستہ بنا لینا چاہیئے کیونکہ انسان کا وجود اسی حد تک ہے جس حد تک وہ اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ اپنے اعمال کے علاوہ انسان کچھ ہے ہی نہیں۔ لیکن اس نے یہی اصول اپنے لئے بھی مرتب کیا تھا اور جب اس کے آزمائش کا وقت آتا تو وہ پہاڑ کی طرح اٹل بن جاتا تھا پستہ قد، نحیف اور منحنی انسان ہونے کے باوجود اخلاقی مسئلے پر وہ بے خوف و خطر بحث کرتا تھا۔ ایک دو دن کی بات نہیں سالہا سال سارتر نے پیرس میں الجیریا کے عوام کی حمایت اس وقت کی جب فرانس کی گلی گلی میں فوجی راج تھا اور دائیں بازو کے فرانسیسی لوگ الجیریا کے حمایتوں کو ختم کر دینے پر تلے رہتے تھے۔ جلسہ جلوس پر پابندی، ٹیک وتوپ کے حلقے کو توڑ سارتر نے الجیریائی عوام کی حمایت میں زبردستی تقریر کی اور جب تک الجیریا کو آزادی نہ ملی وہ حکومت فرانس سے الجھتا رہا حتیٰ کہ ڈیگال کی کیبنیٹ میں بار بار یہ سوال اٹھایا گیا کہ سارتر کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے مگر ڈیگال ہمیشہ ایک ہی معنی خیز جواب دیتا "کہ ہم آپ سارتر کو گرفتار نہیں کر سکتے"۔

سارتر کے سلسلے میں یہ بات خاص طور سے نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ نوجوانوں نے اس کے ناول، ڈرامے پڑھے تو ٹوٹ ٹوٹ کر مگر پوری طرح اس کے مقصد و پیغام کو سمجھ نہ پائے اور بہتوں کو یہ گمان ہو گیا کہ سارتر اپنی کہانیوں، ڈراموں میں ذہنی، ... اخلاقی و سماجی انتشار کی تعلیم دیتا ہے اس کے نتیجے میں فرانس میں عجیب و غریب قسم کے کلب قائم ہو گئے، جیسے وحشیانہ ڈراؤنی قسم کی اشیاء سے سجایا جاتا تھا اور حماقت آمیز حرکات کے ذریعے یہ سمجھا جانے لگا کہ اس طرح ہم سارتر کے پیغام پر عمل کر رہے ہیں۔ ان نادانوں کی خرافات و واہیات حرکتوں نے سارتر کے فلسفے کی کشش کو کم کرنا شروع کر دیا اور ۱۹۴۵ء کے بعد معاشرے کی ساخت کا مسئلہ غور و خوض کا خاص موضوع بن گیا اور پھر ایسے فلسفی جنم لینے لگے جو انسان کی شخصیت پر کم زور دیتے تھے اور معاشرے میں اس کے رول پر زیادہ ساتھ ہی مابعد الطبعاتی مسائل کو بھی انسانی زندگی پر اثر انداز جان کر فلسفہ میں نمایاں مقام دیا جانے لگا، بہرحال یہ سب کچھ ہوتا رہا لیکن سارتر کی شخصیت ابھرتی ہی رہی اور جب ۱۹۶۴ء میں نوآبادیاتی نظام کے وجود کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اس نے نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا تو ایک بار پھر اس کے نام کا سکہ چلنے لگا۔

آزادی، انفرادیت، تنہائی، داخلیت، کشمکش، اضطراب بحران، امید، مجبوری و مختاری، جبلت و وجدان فلسفہ وجودیت کے اجزائے ترکیبی رہے ہیں۔ اکثر وجودی بحران کی فضا میں زندگی اور وجود سے ناامید ہونے لگتے ہیں۔ انتخاب عمل میں ایک غیر یقینی حالت کا ملنا وجودیوں کا خاصہ ہے اس لئے وجودیوں کے یہاں، "خودکشی" ایک اہم موضوع ہے لیکن سارتر کی وجودیت اسی بات پر اصرار کرتی ہے کہ وجود کو ہمیشہ امید و یقین کی منزل میں ہونا چاہیئے کیونکہ موت کے علاوہ کوئی شئے غیر یقینی نہیں اور موت کو بھی اس وقت موت آجاتی ہے جب انسانی آزادی، اس کی انفرادیت اور خود مختاری پر فتح پا جاتی ہے۔ ایک خوشحال وامیر سماج میں جدید ٹکنالوجی کی وجہ سے جو مایوسی پیدا ہوتی سارتر کے فلسفے میں اس کا جواب ملتا دکھائی دیتا ہے وہ صاف صاف کہتا ہے۔

" وجودیت کو انجماد کا فلسفہ یا انسان کی قنوطی دستاویز نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس سے زیادہ رجائی نظریہ کوئی نہیں اور اسے انسانی عمل کو پست کرنے کی کوشش سے تعبیر نہیں کیا جاتا کیونکہ امید صرف عمل میں ہے اور عمل ہی تنہا وہ شئے ہے جو انسان کو زندہ رہنے کے قابل بناتی ہے"۔ اور یہیں سے اس کا رشتہ وجودیت سے کٹ کر ہم وجودیت سے مل جاتا ہے۔

سارتر کے فلسفہ کا بنیادی مقصد انسان کے وجود کے

اہمیت و اس کی اندرونی آزادی کو بیدار کرنا ہے اس نے فرد کے وجود کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس عمل سے اس نے نوجوانوں کو لاقانیت کی طرف مائل کر دیا مگر آزادی کا بول بالا کرنے اور مظلوم انسانوں کی مدد اور نو آبادیاتی نظام کے خاتمے میں اس کا جو اہم رول ہے اس کو دیکھکر یہ الزام کوئی وقعت نہیں رکھتا ہے شخصیت کے تحفظ میں اسے کائنات کا بناؤ سنگھار دکھائی دیتا ہے اور اگر ہر شخص اس کی قدر پہچانے تو امن و مساوات کا پرچم ساری دنیا میں لہرانے لگے وہ کہتا ہے کہ

"ظالم و مظلوم دونوں اپنی شخصیت کو مسخ کرتے ہیں"

ایک منکرِ خدا اور دہریے کا قول ایسا ہے جیسے بہت پہلے الہامی کتابوں اور اولیاء کے ملفوظات میں طرح طرح سے بار بار کہا گیا ہے اس کے اقوال و افکار میں ایسے بہت سے مقام آتے ہیں جہاں مجھے اس کے الحاد و کفر پر تعجب ہوتا ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے ہر ادیب نے کسی نہ کسی انداز میں وجودیت کے فلسفے کو اپنایا، فرد کی انا، ذات کا تحفظ، اقدار کی شکست احساس کا جبر اور آزادیِ فکر کی ہوا چلی گئی "ہم کیا ہیں؟" کا جواب وجودیت کے فلسفے نے ہی دیا اور اس کی بازگشت جدیدیت کے روپ میں ہماری شعری دنیا میں ظاہر ہوئی جس کا سفر جاری ہے ۱۹۶۷ء کے آس پاس کی اردو شاعری منزل بہ منزل ایک جادے کی تلاش میں رواں ہوئی ن۔م راشد کی شاعری، محمد حسن عسکری کی تنقید افسانے سے لیکر خلیل اعظمی، شمس الرحمن فاروقی اور سریندر پرکاش تک فکر و فن کے سانچوں میں تبدیلی ہوتی رہی ہے لیکن وجودیت کا فلسفہ سب پر اپنا عکس ڈالتا رہا ہے اور آئندہ بھی مدتوں تک جب تک اس موجودہ بحرانی نظام کا خاتمہ نہیں ہوتا آدمی اپنی تلاش کرتا رہے گا اور جہاں وہ تھکنے لگے گا یا تھک کر چور ہو جائے گا سارتر کی سارتر اور فلسفہ وجودیت کے تعلق سے یہ ایک سرسری ہے جسے میں مضمون کی تمہید قرار دے کر قلم رکھ رہا ہوں، ورنہ اس بحرِ بیکراں کے لئے سفینہ بھی کافی نہیں ہو سکتا

اُردو

پُورب اُردو بولے سارا پچھم اردو بولے
اتر دکھن کی اردو تو کاناں میں رس گھولے
سداں لڑاکو پنڈت ملاں محبت پو جب آتیں
غزا غزٹ کونوی اداں سے اردو کے گن گاتیں
اک گھٹ ہوکو دونوں جنسے اردو میں یہ بولے
پورب اردو بولے سارا پچھم اردو بولے

آندھرا کی پلا ہو یا منجولا مرہاٹن ۔۔۔!
کرناٹک کی ناگ منی یا گلشن بی کی سوکن
چاروں سیلیاں پوتی نامہ اردو ہی بیچ کھولے
پورب اردو بولے سارا پچھم اردو بولے

سادھو ہو یا سائیں ہو یا پیر پروہت چھیلا
رائے رایاں جنگ بہادر یا کوئی نہلا دھلا
اردو کے موتیاں کو یارو سونچ مل کو رولے
پورب اردو بولے سارا پچھم اردو بولے

غلام سرور ڈنگا

ممتاز راشد

قابل اجمیری

پیدائش ۲۷ اگست ۱۹۳۱ء موضع چرلی ضلع اجمیر (ہندوستان)
وفات ۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء حیدرآباد سندھ (پاکستان)
تصنیفات ۱۔ قابل کے سو اشعار ۲۔ دیدہ بیدار

فراق گورکھپوری نے اختر الایمان کی شاعری کو خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری کہا ہے۔ فراق کے جس مضمون میں یہ جملہ شامل تھا اُسے میں نے بہت پہلے پڑھا تھا اور اس وقت پورے مضمون کو ہی بہت سرسری طور پہ پڑھا تھا کسی خاص جملے کی اہمیت سمجھنے یا اُسے اہمیت دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ برسوں کے بعد فراق کے خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری والے جملے کی معنویت مجھ پر آشکار ہوئی۔ ریڈیو نے چند برسوں پہلے ایک ہفت روزہ نشریاتی سلسلہ صدائے رفتگاں شروع کیا تھا اس پروگرام میں پاکستان کے مرحوم نامور فنکاروں کی تخلیقات انہیں کی ٹیپ کی ہوئی آواز میں پیش کی جاتی تھیں

ایک بار میں صدائے رفتگاں سن رہا تھا۔ اچانک اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب آپ کے سامنے جدید شعر و ادب کے ایسے ممتاز و منفرد شعراء کا کلام انہیں کی آواز میں پیش کیا جائے گا جو اب ہم میں نہیں رہے ہیں۔ یہ فنکار ہیں مرحوم ناصر کاظمی، یوسف ظفر، باقی صدیقی اور مرحوم قابل اجمیری۔
اوّل الذکر تینوں شعراء کو بہت دلچسپی اور احترام کے ساتھ سنا گیا۔ آخر میں، قابل مرحوم کی آواز سنائی دی۔ کلام کے ساتھ قابل کی آواز ہی کچھ ایسی جلتی اور سلگتی ہوئی سی تھی یا پھر ان کے کلام اور آواز میں ایسی تاثیر تھی کہ اچانک " خون کی دھار میں ڈوبی ہوئی شاعری " کے معنی اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ ذہن میں روشن ہوتے چلے گئے۔ قابل کی وہ غزل (جسے اناؤنسر نے مرحوم کی آخری غزل کہا تھا) اور انکی آواز آج بھی جیسے ذہن میں گونج رہی ہے

کوئے قاتل میں ہمیں بڑھ کے صدا دیتے ہیں
زندگی آج ترا قرض چکا دیتے ہیں

تیرے اخلاص کے افسوں ترے وعدوں کے طلسم
ٹوٹ جاتے ہیں تو کچھ اور مزا دیتے ہیں
کوئے محبوب سے چپ چاپ گزرنے والے
عرصۂ زیست میں اک حشر اٹھا دیتے ہیں
ہم نے اس کے لب و رخسار کو چھو کر دیکھا
حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

لیکن قابل اجمیری کے فکر و فن سے بہت پہلے تعارف ہو چکا تھا ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں میں نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ مصرعے موزوں کرنے کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں شریک ہونے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ ادبی رسائل ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ ایک دن پاکستان کے کسی ادبی جریدے میں ایک غزل نظر سے گزری۔ شاعر کا نام تھا قابل اجمیری۔ نام کے ساتھ اجمیری کی نسبت دیکھ کر فوراً غزل پڑھنا شروع کر دی۔

ہونٹوں پہ ہنسی آنکھ میں تاروں کی لڑی ہے
وحشت بڑے دلچسپ دوراہے پہ کھڑی ہے
چاہا بھی اگر ہم نے تری بزم سے اٹھنا
محسوس ہوا پاؤں میں زنجیر پڑی ہے
دل رسم و رہ شوق سے مانوس تو ہو لے
تکمیل تمنا کے لیے عمر پڑی ہے
کچھ دیر کسی زلف کے سائے میں ٹھہر جائیں
قابل غم دوراں کی ابھی دھوپ کڑی ہے

غزل پڑھنے کے بعد قابل کے لیے ایک تجسس پیدا ہو گیا۔ یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ اتنے اچھے شاعر ہونے کے باوجود اجمیر کے مشاعروں میں نظر کیوں نہیں آتے؟ وقت کے ساتھ یہ تجسس بڑھتا رہا۔ اتفاق سے

انہیں دنوں محترم احمد رئیس صاحب علی گڑھ سے آ گئے۔ احمد رئیس صاحب قابل اجمیری کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ ان کے اور کچھ دوسرے معتبر حضرات کے ذریعہ قابل اجمیری کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم ہوا۔

قابل اجمیری حیدرآباد (سندھ پاکستان) میں قیام پذیر تھے اور تپ دق کے موذی مرض کا شکار تھے۔

قابل اجمیری کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ سات سال کی عمر میں والدین کے سایے سے محروم ہو گئے تھے۔ قابل کے دادا امیر بخش صاحب نے ان کی پرورش کی۔

قابل کے آباؤ اجداد پٹھانوں کے دورِ حکومت میں اجمیر آ کر آباد ہوئے تھے۔ اعلیٰ فوجی خدمات کے عوض حکومت وقت نے انھیں بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں لیکن انتشارِ زمانہ کی وجہ سے قابل کے والدین کے حصے میں صرف دو مکان آئے تھے (پاکستان میں قابل کو ان میں سے کسی مکان کا معاوضہ نہیں ملا) قابل نے ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ میں حاصل کی۔ اس زمانے میں مدرسے کے اساتذہ ملک کے بلند پایہ اصحابِ علم و فضل تھے۔ جنھیں نظام دکن ہندوستان کے طول و عرض سے منتخب کرتے تھے۔ قابل کا بچپن اسی علمی و ادبی اور روحانی ماحول میں گذرا۔

چودہ پندرہ سال کی عمر سے قابل شعر موزوں کرنے لگے تھے، پہلے انہوں نے حضرت ارمان اجمیری سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں قابل مولانا عبدالباری معنی سے رجوع ہوئے۔ مولانا معنی ایک جید عالم دین تفسیر حدیث اور تاریخ کے بلند پایہ محقق تھے۔ مولانا معنی کے فیضانِ صحبت نے قابل کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی مولانا معنی کی معیت میں قابل نے پہلی بار اجمیر میں منعقد ہونے والے ایک آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کی۔ اس وقت کے بعض مشاہیر شعراء شریک مشاعرہ تھے جن میں ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی وغیرہ کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

دروغ برگردن محمود سعیدی جگر صاحب کو اگر کسی نئے شاعر کے اشعار پسند آئے تو وہ اس سے یہ ضرور دریافت کرتے کہ میاں ابھی تک کسی کو مرکز تخیل بھی بنایا ہے یا نہیں؟ شاعر کا جواب اثبات میں ہوتا تو جگر صاحب اطمینان کا اظہار فرماتے بصورت دیگر شاعر کو نصیحت فرماتے "بغیر کسی مرکزِ تخیل سچی شاعری ممکن نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ پتہ نہیں جگر صاحب نے مشاعرے کے بعد قابل سے بھی ان کے مرکز تخیل کے بارے میں دریافت کیا یا نہیں۔ لیکن اس وقت تک قابل ایک "ہستی" کو اپنے تخیل کا مرکز بنا چکے تھے، ان خاتون کا تعلق ایک خوشحال مذہبی و علمی خاندان سے تھا۔ انھوں نے بھی یقیناً قابل سے کسی نہ کسی طرح اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہوگا، "کسی نہ کسی طرح" اس لیے کہ چھوٹے شہروں کے مسلم معاشرے میں شادی سے قبل جوان لڑکے لڑکی کا آزادانہ میل جول آج بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے تو اس طرح کی ایکسپوژر کا تصور بھی ناممکن تھا۔ یہی سوچا جا سکتا ہے کہ ان خاتون سے قابل کی وابستگی محض دیدار سرِراہ جلوۂ پس چلمن یا کبھی کبھی نامہ و پیام تک محدود رہی ہوگی۔ بہرحال ایک دن یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ گھر والوں کے دباؤ، بدنامی کے خوف یا کسی اور وجہ سے قابل سے نظریں پھیر لیں۔

کس کروٹے وقت میں بدلی ہیں نگاہیں اس نے
جب مجھے حوصلۂ ترک تمنا بھی نہیں۔

"حوصلہ ترک تمنا" نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قابل تپ دق کا شکار ہو گئے تقریباً اسی زمانے کے لگ بھگ قابل کے چھوٹے بھائی محمد شریف بھی اچانک تپ دق کا شکار ہو کر چل بسے۔

ملک تقسیم ہوا۔ مملکت خداداد پاکستان وجود میں آیا۔ کچھ دنوں کے بعد قابل بھی ترک وطن کر کے کراچی پہنچ گئے۔ مہاجرین کلیم داخل کر کے مکان دکانیں، زمینیں اپنے اپنے نام الاٹ کروا رہے تھے لیکن اس قسم کے مادی فوائد حاصل کرنے کے لیے جس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قابل اُن سے یکسر محروم تھے۔ ماہر القادری مرحوم نے اپنے رسالے "فاران" کے دفتر میں سر چھپانے کی جگہ دیدی اس زمانے میں جگر صاحب کراچی تشریف لائے۔ "فاران" کے دفتر ہی میں ماہر القادری کے توسط سے قابل کا تعارف جگر صاحب سے ہوا۔ حسب معمول جگر صاحب نے شعر سنانے کی فرمائش کی، قابل کے اشعار سنکر جگر صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ قابل کو اپنے ہمراہ حیدرآباد سندھ کے مشاعرے میں لے گئے۔ حیدرآباد سندھ میں اجمیر سے ترکِ وطن کر کے جانے والے مہاجرین کی اکثریت ہے۔ مشاعرے میں قابل کا تعارف خود جگر صاحب نے کروایا جگر صاحب کے شاندار تعارف اور پھر قابل کے کلام نے جیسے اہل حیدرآباد سندھ کو (سابقہ اہل اجمیر) کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔

قابل نے حیدرآباد سندھ کو وطن ثانی بنا لیا۔ دن گذرتے رہے۔ ادبی حلقوں میں قابل کی شہرت پھیلتی رہی۔ وفات سے دو سال پہلے قابل کی زندگی میں انتہائی خوشگوار موڑ آیا۔ اس خوشگوار موڑ کے پیچھے ایثار کی انتہائی عظیم الشان مثال ہے

[illegible]ء میں قابل کوئٹہ (بلوچستان) کے ریلوے سینی ٹوریم میں زیرِ علاج تھے اسپتال کی ایک اسٹاف نرس قابل کی زندگی میں داخل ہوئیں اور کچھ دنوں کے بعد بیگم نرگس قابل بن گئیں۔ شادی سے پہلے بیگم قابل تمام حالات سے بخوبی واقف تھیں کہ قابل شاعر ہے اور وہ بھی اردو زبان کا، قابل کا مرض جان لیوا ہے۔ قابل کے پاس کوئی سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ نہیں، جاگیر نہیں کوئی بینک بیلنس نہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے قابل کا ہاتھ تھام لیا۔ اپنی پرخلوص رفاقت نے قابل کی زندگی میں اجالے بکھیر دیئے، اسمیں جینے کا حوصلہ پیدا کیا۔ یہاں تک کہ شاعر ایک بار پھر پکار اٹھا۔

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

اکتوبر ۱۹۶۲ء کی بات ہے میں اور احمد رئیس صاحب اودے پور میں تھے وہیں ۴ / اکتوبر کی شام کسی دوست نے ریڈیو پاکستان کے حوالے سے یہ خبر سنائی کہ قابل اجمیری کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے دن انجمن ترقی اردو اودے پور کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ جلسے میں احمد رئیس نے مضمون پڑھا اور میں نے قابل کی چند غزلیں سنائیں۔

قابل کی پہلی برسی کے موقع پر احمد رئیس نے "یوم قابل" کا اہتمام کیا۔ "یوم قابل" کے مشاعرے میں۔ شہاب جعفری، کمار پاشی اور رفعت سروش وغیرہم شریک ہوئے تھے۔ "بزم مقالات" میں قابل کے فکر و فن پر مضامین پڑھے گئے۔ ان میں سب میں سے اہم مقالہ مشہور جدید نقاد محمود ہاشمی کا تھا۔

قابل کی تخلیقی صلاحیتوں اور منفرد شاعرانہ شخصیت کا اعتراف کرنے والوں میں ہر مکتبۂ فکر کے نمائندہ حضرات نظر آتے ہیں لیکن قابل کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب ایک خاص گروہ نے ان کی شاعرانہ شخصیت کو داغدار کرنا چاہا۔ اس گروہ کے سرخیل تھے مشہور ترقی پسند شاعر حمایت علی شاعر، معاصرانہ چشمک اور ادبی تنازعہ کو حمایت علی شاعر اور ان کے حواریوں نے کیا روپ دیا تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے۔

"ایک زمانہ میں حمایت علی شاعر سے ان کی ہم عصرانہ چشمک چل تھی۔ قابل فن کے پرستار اور ادبی حلقوں میں مقبول۔ حمایت علی شاعر ریڈیو سے وابستہ اور ادبی حلقوں سے باہر بھی عزیز لیکن ظاہر ہے جو شخص دس سال تک موت سے لڑتا رہا ہو وہ حمایت علی شاعر سے کیا ہار مانتا، جیت قابل کی ہوئی۔ اس کی زندگی میں نہ سہی موت کے بعد تو مجموعہ شائع ہوگیا۔"

("وادی مہران کی تین آوازیں" قمر الزماں، فردوس نشرہ "قابل نمبر"

طالب علم ڈائجسٹ مطبوعات، حیدرآباد سندھ پاکستان)

"مجھے اچھی طرح یاد ہے مشاعرہ شباب پر تھا اچانک صدرِ مشاعرہ نے مائک سنبھالا اور ایک رندھی ہوئی آواز نے فضا میں سوگواری کی سی کیفیت پیدا کردی" حضرات میری صدارت پر میرے ایک ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے اس لیے میں صدارت سے دستبردار ہوتا ہوں" قابل اجمیری اسٹیج سے اتر کر بھاری قدموں کے ساتھ مشاعرہ گاہ کے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جیسے یہ میری توہین ہوتی ہے۔ قریب ہی مرزا عابد عباس بیٹھے تھے میں نے ان سے کہا" یہ سخت زیادتی ہے قابل صاحب کو روکنا چاہیئے عابد صاحب کی تائید پاکر میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور کوشش کرکے قابل صاحب کو اسٹیج پر لے آیا۔ اب میری باری تھی۔ مائک پر آکر میں نے کہا "حضرات یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس ادبی محفل میں سیاست در آئی ہے لیکن ادبی محفل میں سیاست کا کیا کام میری درخواست ہے کہ قابل صاحب صدارت جاری رکھیں آپ حضرات امید ہے کہ تائید فرمائیں گے، مجمع میں جیسے جان پڑ گئی۔ چاروں طرف سے تالیوں کی آواز آنے لگی اور اس طرح مشاعرہ دوبارہ شروع ہوا۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک رات کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا، سوسائٹی کے نزدیک قابل صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ قابل صاحب افسردہ لہجے میں بولے اب تو مجھے شاعر ماننے سے انکار کیا جارہا ہے" میں نے ادھر ادھر کی باتوں میں ان کے ذہن کو الجھا دیا۔ کوئی ایک بجے وہ مجھ سے جدا ہوئے۔ اور میں دیر تک سوچتا رہا۔ تپ دق کا مریض یوں بھی حساس ہوتا ہے اگر وہ شاعر ہو تو اور بھی زیادہ حساس ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قابل صاحب ذرا ذرا سی باتوں کو بھی اہمیت دینے لگے تھے۔ مجھے وہ نشست بھی یاد ہے جہاں حیدرآباد سندھ کے منتخب ادیب شعراء جمع تھے۔ قابل صاحب نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ ایک شاعر اور ان کے حمایتیوں نے بے معنی اعتراضات کی بوچھار کر دی، جوشِ تنقید میں نہیں بلکہ جوشِ تنقیص میں وہ شاعر قابل صاحب کے ایک شعر کو باقی صدیقی کا شعر بتانے لگے۔ حالانکہ بعد میں تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ باقی نے اس زمین میں کبھی کوئی شعر نہیں کہا"

(چند یادیں، محسن بھوپالی)

مندرجہ بالا واقعات اس وقت بھی میرے ذہن میں بالکل تازہ تھے جب برسوں کے بعد مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے میری پہلی ملاقات

ہوئی۔ ڈیڑھ دو سال پہلے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اپنی فیملی کے ساتھ اجمیر آئے ہوئے تھے، ان دنوں میں بھی اجمیر میں تھا۔ پی۔ این۔ ٹی گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں فاروقی صاحب سے جدید شاعری اور جدید شعراء پر گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران میں نے اچانک پوچھ لیا

" فاروقی صاحب! آپ قابل اجمیری سے بھی واقف ہیں"؟

فاروقی صاحب نے بے ساختہ فرمایا " آپ بھی کمال کرتے ہیں اردو ادب کا ایسا کون سا سنجیدہ طالب علم ہوگا جو قابل سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ راجستھان کے شعر و ادب سے بالعموم اور اجمیر کے ادب سے بالخصوص میرا پہلا تعارف ہی قابل اجمیری کے توسط سے ہوا تھا۔

میں نے چٹکی لی" لیکن قابل جدید شاعر تو نہیں تھے"!

فاروقی نے کہا" جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں اچھی اور سچی شاعری ہمیشہ جدید رہتی ہے"۔

شمس الرحمٰن فاروقی جیسے کٹر نقاد کو قابل اجمیری کے بارے میں یہ بے لاگ رائے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ اگر شاعر میں واقعی دم خم ہے تو، اسکی آواز کو بہت دنوں تک نہیں دبایا جا سکتا۔

قابل کی تخلیقی کاوشیں پہلی بار ایک مختصر سے کتابچے کے ذریعۂ منظر عام پر آئی تھیں۔ اس مختصر سے کتابچے کا نام تھا۔" قابل کے سو اشعار" جس کے دیباچے میں جگر مراد آبادی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا

قابل کے کلام سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے اور یہی خوبی شاعر کے لیے اہم اور اہم تر ہے کہ خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بیان بھی شگفتہ و پاکیزہ اور تغزل کا حامل ہے"

ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے مضمون "جوہر قابل" میں رقم طراز ہیں۔

" قابل کے یہاں تقلید کا شائبہ تک نہیں ہوتا وہ نئی بات کہتے ہیں اور نئے انداز سے کہتے ہیں۔ غزل کی روایت سے پوری واقفیت رکھنے اور اس سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کرنے کے باوجود وہ کبھی لکیر کے فقیر نہیں بنتے۔ ان کے یہاں خاصا تنوع ہے لیکن اس تنوع کے ہاتھوں ان کی انفرادیت کو ٹھیس نہیں لگتی ان کا مخصوص زاویۂ نظر اس تنوع میں بھی ایک یک رنگی پیدا کرتا ہے"

جانے کس عالم میں آئیں آنے والے قافلے
سایۂ دیوارِ جاناں جاوداں کرتے چلو

کتنے روشن ہیں وہ عارض کتنے شریں ہیں وہ لب
راستہ کٹ جائے گا ذکرِ بتاں کرتے چلو

زمانے سے شکایت کیا زمانہ کس کی سنتا ہے
مگر تم نے تو آوازِ جنوں پہچان لی ہوتی

رضائے دوست قابل میرا معیارِ محبت ہے
انھیں بھی بھول سکتا تھا اگر ان کی خوشی ہوتی

آج ہی شکوۂ بیداد کا آیا تھا خیال۔
آج ہی تیری مدارات بہت یاد آئی

ہمارے نقشِ قدم سے چمک اٹھے شاید
فضائے منزلِ جاناں دھواں دھواں ہے آج

رکا رکا سا تبسم جھکی جھکی سی نظر
تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

ہمارے پاس کہاں آنسوؤں کی سوغاتیں
کسی کو اپنا بنا کے بڑی ہنسی آئی۔

بڑی ہو کہ التفات اے دوست
تیری ہر بات پہ ہنسی آئی

مجھکو تلقین صبر فرما کر
کیوں تیری آنکھ بھیگ جاتی ہے

ہمیں بھی شہر نگاراں میں لے چلو یارو
کسی کے عشق کا آزار ہم بھی دیکھیں گے

یہ اور بات کہ تقدیر سو گئی قابل
وگرنہ دیدۂ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

کسی کی زلفِ پریشان کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشہ بنائے پھرتے ہیں

درد چمکا رہی ہے تیری یاد
نور برسا رہی ہے تیری یاد

دل کی وادی میں چاندنی کی طرح
پھیلتی جا رہی ہے تیری یاد

زندگی کتنی تیز رو ہے مگر،
ساتھ ساتھ آ رہی ہے تیری یاد

نہ جانے زندگی کیسے گذر گئی اے دوست
کہیں ٹھہر کے تیرا انتظار بھی نہ کیا

ہوس کے دور میں قابل یہ عظمت فن ہے
غزل سرا بھی رہا ذکر یار بھی نہ کیا

وصالِ یار تو ممکن نہیں مگر ناصح
رخِ حیات اسی آرزو سے روشن ہے

یہ تابشِ لبِ لعلیں یہ شعلۂ آواز
تمام بزم تری گفتگو سے روشن ہے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنے مضمون "قابل۔ تجدد کی ایک مثال" میں فرماتے ہیں" قابل اجمیری میں نکتہ سے نکتہ پیدا کر لینے اور روایت سے تازہ روایات کو جنم دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی جدت اور احساس میں غضب کی تازگی و انفرادیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی بعض حد درجہ فرسودہ اور ناموافق زمینوں میں بھی وہ ایسے آبدار نشتر نکال لیتے ہیں کہ خدا کی توفیق یاد آجاتی ہے"۔

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھوگے۔
خدا کرے کہ تمہیں مجھ سے دشمنی ہو جائے

لطف صبح نشاط مجھ سے پوچھ
میں نے شامِ الم گذاری ہے

دل کی دھڑکن کا اعتبار نہیں
ورنہ آواز تو تمہاری ہے

اپنے لب ہی نہیں سئے ہم نے
آپ کی زلف بھی سنواری ہے

کتنی شمعیں بجھا کے اے قابل
دل میں ایک روشنی اتاری ہے

ہم چراغِ یقین جلاتے رہے ۔ وقت کو راستہ دکھاتے رہے

زندگی کتنی مختلف تھی مگر ہم ترے ساتھ مسکراتے رہے

ایک دن پر چھپتی پھرے گی حیات اہلِ دل کس نگر میں رہتے ہیں

لاکھ ہم خانماں خراب سہی حادثوں کی نظر میں رہتے ہیں

جلوہ گاہِ یار سے بھی تشنہ کام آئے ہیں لوگ جانے امیدیں زیادہ تھیں کہ جلوے کم رہے

کٹ گئے ہجر کے پہاڑ سے دن وقت کو تیرا انتظار نہ تھا

مرحلے زیست کے بھی کم تو نہیں اے دوست

اور جی لیں گے تیری زلف کے سنورنے تک

سحر انصاری رقم طراز ہیں :

" حسرت موہانی نے تہذیب رسم عاشقی کی جو بنیاد غزل میں رکھی تھی اُسے قابل نے بھی اپنایا ہے ۔ تہذیب میں عموماً تصنع کا رنگ آجاتا ہے ۔ لیکن قابل نے تصنع کی اس منفی کیفیت کو اپنے دائرہ احساس سے خارج کر دیا ہے ان اشعار میں آپ کو قابل کے مزاج کی مخصوص ساخت کا اندازہ ہو جائے گا "

خود تمہیں چاکِ گریباں کا شعور آجائے گا ۔ تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آ گئے

حُسنِ ترتیب ہے وسیلِ چمن ورنہ صحرا میں کیا بہار نہیں

بے نیازی کو اپنی خو نہ بنا یہ ادا بھی کسی کو پیاری ہے

ہم بدلتے ہیں رخ ہر آفت کا آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

مقاماتِ فکر و نظر کون دیکھے یہاں لوگ نقشِ قدم رکھتے ہیں

ان کی زندگی میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور آن بان تھی ۔ وہ دریوزہ گرِ آتش بیگانہ نہیں ہونا چاہتے تھے ، دوستی کے پردے میں کسی احسان کو قبول کرنا ان کے لیے سزا سے کم نہیں ۔

بے کسی سے بڑی امیدیں ہیں ۔ تم کوئی آسرا نہ دے جانا

کوئی احسان کر کے قابل پر دوستی کی سزا نہ دے جانا

نامرادی نے کر دیا خوددار اب سرِ شوق خم نہیں ہوتا

وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو زندگی کتنی خوبصورت ہے

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ زندگی کو مری ضرورت ہے

ادارہ سماجی بہبود (لاہور) کی جانب سے قابل اجمیری کی چوتھی برسی منائی گئی تھی ۔ اس موقع پر شاہد احمد دھلوی نے اپنے تحریری پیغام میں قابل کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا تھا ۔

" قابل مرحوم بڑے خددار اور وضعدار آدمی تھے ۔ انھوں نے اپنی تکلیفوں کا کسی سے ذکر نہیں کیا اور نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ۔ خاموشی کے ساتھ سرد چراغاں کی طرح دھڑ دھڑ جلتے رہے اور ایک روز یہ شعلہ افشانی اچانک ختم ہو گئی ۔ اندھیروں نے اعلان کیا کہ ایک اور جوہر قابل اٹھا لیا گیا ۔

قابل اجمیری واقعی ایک جوہر قابل تھے ۔ مگر جوانی میں ہی بیماری نے ان پر غلبہ پا لیا تھا ، بھری جوانی میں نیم جاں جئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بے جاں ہو گئے غزل ہماری شاعری کی سب سے محبوب صنفِ سخن ہے مگر غزل کہنا بظاہر جتنا آسان ہے بباطن اتنا ہی مشکل ہے ۔ بلا مبالغہ روزانہ ہزاروں غزلیں کہی جاتی ہیں مگر ان میں سے ایک فی صد بھی زندہ نہیں رہتی ۔ خوش نصیب ہیں وہ شاعر جن کی غزلیں زندہ رہتی ہیں ۔ وقت خود بڑا بے رحم نقاد ہے انہیں خوش نصیبوں میں جن کی غزلوں پر دست بُردِ زمانہ کا اثر نہ ہوگا قابل اجمیری بھی ہیں ۔

مطرب نظامی

خواجہ وزیر لکھنوی

خواجہ وزیر صاحب لکھنو کے ممتاز شاعروں میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب خواجہ محمد وزیر۔ خواجہ محمد فقیر۔ خواجہ بہاالدین نقشبندی کی اولاد میں سے تھے۔ پہلے آتش کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد استاد ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔

حکیم ناطق لکھنوی اپنی منظوم تاریخِ شعرائے نظم اردو میں تحریر فرماتے ہیں۔

موجد اپنے رنگ میں تھے شاعرانِ بے نظیر
بات میں بے باک جرأت فکر میں آزاد اسیر
بندشِ مضمون میں ناسخ اور بنوٹ میں وزیر
عشق میں سرگرم آتش جامعیت میں امیر

حضرت ناطق کے خیال میں خواجہ صاحب نے علمی اور ادق الفاظ سے گریز فرما کر سلیس اور سادہ الفاظ میں اپنی شاعری میں تصنع پیدا کیا۔ اصل حقیقت تو کچھ اہم نہ ہوتی تھی مگر بندش حسین ہوتی تھی۔ جہاں تک بندش کا تعلق ہے مجھے ناطق صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔ لیکن خواجہ وزیر کے کلام میں کوئی مقصد اور حقیقت نہیں ہے محض بنوٹ ہی بنیاد شاعری ہے۔ تو یہ ناطق صاحب کی رائے ہے جو ان کے خیال تک محدود ہے۔

خواجہ صاحب کے کلام کا حسن بیک وقت کئی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ ایک تو جذبۂ دل دوسرے کائنات کا صحیح مطالعہ۔ آپ کے کلام دلی جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ کائنات کا گہری نظر سے جائزہ بھی لیتا ہے اور دنیائے شاعری میں یہی وہ نازک بات ہے جو ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

شعر کے لئے سوز و گداز درکار ہے اور مقصدی شاعری کے لئے فکری اہتمام، سوز و فکر کی حریفانہ کشمکش سے حقیقی شاعری وجود میں آتی ہے لیکن مقصدی شاعری کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر مقصد کا کوئی مرکز بنائے۔ مقصدی شاعری کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ مقصد میں ایک عملی پہلو اور مسلسل تحقیقاتی ربط ہو۔۔۔۔ ارنلڈ کا قول ہے کہ شاعری نام ہے نقدِ حیات کا۔ اور نقدِ حیات کا صرف یہی مطلب نہیں کہ کسی معمولی سے جذبے کا اظہار ہی محض شاعری ہے بلکہ شعبۂ حیات کے ہر پہلو کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ حیات کا صحیح خاکہ اُبھر آئے۔

کائناتِ زندگی اور زمانے کے پُرپیچ حقائق کا ادراک ایک فلسفی جس تحقیقی اور تجرباتی نقطۂ نظر سے کرتا ہے اس کے باعث اکثر اس کی نظر مظاہر اور روابط میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ حقیقی تصور اور ارتقا کی جھلک اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے لیکن شاعر اس گم کردہ حقیقت اور اس کے ارتقا کا آئندہ مقصدی پہلو دیکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی دور کے تمدنی تاریخ اور تمدنی رجحانات معلوم کرنے کے لئے اس دور کے فلسفیوں اور تاریخ مرتب کرنے والوں سے زیادہ اس دور کی مقصدی شاعری سے مدد ملتی ہے۔ خواجہ صاحب کی شاعری میں ماضی کی پرستش کے بجائے مستقبل کے جو رجحانات ملتے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ فرماتے ہیں:

اَبر کیا کیا گھر کے آیا کھل گیا
بس ثباتِ بحرِ دنیا کھل گیا

کائنات پر تنقیدی حقیقت پسندی کا نقطۂ نظر کس قدر لطیف ہے۔

آپ کی فکرِ تخیل صرف دل کی سطح پر نہیں بلکہ ذہنی افق پر بھی فروزاں ہے حقیقت کی کشمکش تغیرات کی اضطرابی کیفیت کا ایک عکسِ لطیف ہے ۔ خواجہ صاحب نے اپنے تصوّرات کو اپنی فنّی تخلیق کا رہبر بنانے کے بجائے دارِ دات اور حقیقت کو اپنے فن کا مقصد بنایا ہے ۔ اس شعر میں منظرِ فطرت اور حقیقت پسندی کی ایک زندۂ جاوید تصویر پیش کی ہے ۔ تخلیقی رجحان آپ کے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے ۔ تجزیے کے یہ نئے خاکے جو آپ کی شاعری میں نمایاں ہیں وہ دنیاوی حقیقت کا لازمی نتیجہ ہے ۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔

صدمۂ موجِ نفس سے ٹکڑے ٹکڑے دل ہوا
کیوں یہ اے گردِ سبک روحی بنایا جامِ رُوح

جبریت کے نقطۂ نظر کی پوری پوری تفسیر ہے ۔ کہیں آپ قوتِ حیات کے علمبردار بن جاتے ہیں اور کہیں پر آپ کا فکری احساس ایک درسِ عمل بن جاتا ہے ۔ آپ نے فطری شعور کے ساتھ ساتھ حقیقت کا گہرا اور حکیمانہ ادراک کرتے ہوئے زندگی اور کائنات کے درمیان ایک مخصوص شکوہ کیا ہے لیکن زندگی اور کائنات کا تجزیہ پہلو بھی نمایاں کیا ہے ۔ جامِ روح پر تنقید کرتے ہوئے گردِ سبک روحی سے ایک حریفانہ کش مکش کا مظاہرہ کیا ہے ۔ صدمۂ موجِ نفس دل ٹوٹنا... یعنی ..... تلخئ حیات اور مصائب کا احساس ہوتے ہوئے بھی زندگیوں کی تلخیوں سے دامن کشاں نہ ہونے کے تقاضے ایک اعلیٰ ہمتی کی دلیل ہیں ۔ زندگی کی حقیقت کو تو واضح کیا ہے ۔ لیکن اس عارضی زندگی میں ایک استحکامی پہلو بھی پیش کیا ہے ۔ جامِ روح کی کم مائیگی کا تو شکوہ کیا ہے ۔ لیکن ناکامیوں کی پرچھائیں کا عکس بھی نہیں ۔ آپ نے زندگی کے انحطاط پذیر رجحان کو بے نقاب نہیں کیا بلکہ تجربہ آمیز رجحانات کو اُبھارا ہے ۔ کائنات کے تجربات کے ساتھ زندگی کا بھی تجزیہ کیا ہے اور زندگی کا تجربہ ایک زیادہ جامع تجربے کا شاہکار ہے ۔ آپ کی نظر زندگی کی مجموعی حقیقت پر رہتی ہے ۔ اور صحت مندانہ انداز میں ارتقا کے آثار نمایاں ہیں ۔ صدمۂ موجِ نفس سے زندگی کے معیار کو سمجھا ہے اور احتجاج کیا ہے کہ جامِ روح کو جو بظاہر اتنا قوی ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی گرد بھی نہ پا سکی ۔ اس کو یہ باطن سبک روح کی گرد کیوں بنایا جو ایک صدمۂ موجِ نفس سے رشتۂ حیات کو منقطع کر دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں عملی پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے ۔ اس لئے آپ کی فکرِ تخیل زندگی کے انحراف کا سبب نہیں بنتی

خموش نے کی طرح ہوں میں دوریِ لب سے
جو منہ لگاؤ تو سُن لو میری فغاں فریاد

خواجہ صاحب کے تجزیۂ حیات کی بلندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں غم و خوشی کے ماحول کو ایک نئے انداز سے پیش کرتے ہیں کیونکہ زندگی کی ہر روش خام اور ہر نفس ہنگامۂ رنگیں سے آراستہ ہے اور ہنگامۂ رنگیں ہے ایک تضاد سے انسان دامن کشاں ہوتا چاہتا ہے ۔ غم و خوشی سے خموش نے کی طرح یعنی یکسوئی کی خواہش ہر انسان کی فطرت ہے ۔ جیسا کہ شہیدی کہتے ہیں

اندوہِ دائمی میں کٹے کس خوشی سے عمر
گر مجھ کو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

فغاں کی یکسوئی کے لئے ۔ نئے کو منہ کا حریف بنایا ہے ..... شاعر کے نزدیک زندگی غم و خوشی سے الگ ماورالذّت کا نام ہے ۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں

عین بے ہوشی ہے ہشیاری نہ سمجھا چاہیئے
اہلِ غفلت کی تو بیداری بھی کہلاتی ہے نیند

حیات ایک سازشِ آہنگ ہے ۔ اور جمود موت ۔ زندگی نام ہے جہدِ مسلسل کا فقط ساحل سے رزم خیز شد کا تماشا دیکھتے رہنا زندگی نہیں ۔ مسلسل تگ و تاز جوش کردار ضروری ہے ۔ وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن کے ارادوں میں عملی پہلو ہوتا ہے جن کے کردار کا سیل ہمہ گیر اور جو زمانے کے نشیب و فراز کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں ۔ انہیں لوگوں کا عمل کمزور طاقتوں کی قسمت بدل سکتا ہے اور جسے پیہم شکستوں کی خنکی بھی سرد نہیں کر سکتی ۔ خواجہ صاحب نے صالح عمل کی ہشیاری سے تعبیر کیا ہے ۔ لیکن کس سلیقہ سے تاکید و تحریص فرمائی ہے کہ اگر انسان ذرا بھی اپنی زندگی سے غفلت برتتا ہے تو غفلت ہی ہشیاری کا رنگ بھر کر شکستِ آخر ہو جاتی ہے جہاں زندگی سے بھاگے ہوئے معذور رہ جاتے ہیں ہو سکتے ہوں وہاں ریشم کے نرم بستروں پر بھی نیندیں خوابِ پریشاں بن جاتی ہیں ۔

گر پڑا اشک مری آنکھ سے بے تابانہ
اب جو دنیا میں گہر ہوگا وہ غلطاں ہوگا

اس شعر میں زندگی کے کرب کو نئے عنوان سے واضح کیا ہے جو اشک آنکھ سے بے تابانہ ٹپک گیا ہے ۔ اس میں مجبوری کا عالم ہے اور جو آنسو ضبط و تحمل کی منزل میں سرگرداں ہے اس کی کیفیت مثالِ گوہرِ غلطاں ہے ۔

حیات نام ہے ایک حرکت کا ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں آنا یہی حرکت ہمیشہ صورت بدلتی ہے ۔ مادّہ نہیں بدلتا ۔ اور صورت بدلنے سے نام بدل جاتا ہے اور مادّہ اپنی خاصیت کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے ۔ اس لئے

اس کی تمام تحریکیں جو مشاہدہ یا احوال پیش کرتی ہیں۔ ان میں طاقت احساس اور بنوئے تاثیر موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح آنسو مادّہ ہے اور بے تابی اس کی خاصیت، آنسو ٹپک کر اپنی شکل بدل دیتا ہے اور دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ آنسو ٹپک کر رائیگاں نہیں ہوتا کیونکہ مادّہ زمین میں جذب ہوکر اپنے مرکز سے مل جاتا ہے اس لئے بے تابی دوسری شکل میں یہ رنگ لائی ہے کہ دریا میں ہر گوہر کو بے تاب کر دیا ہے اور گوہر غلطاں ایک مسلسل اضطرابی کیفیت کا فطری طور پر آئینہ دار ہوگیا ہے۔

بہت جس نے اٹھایا سرگرمی نظروں سے قدر اس کی
نہ دیکھا کوئی پروانہ چراغِ ماہِ کامل کا

اگر یہ حقیقت ہے کہ شاعر زندگی اور فطرت کا ترجمان ہے اور محاکاتی منظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نقاد بھی ہے تو نقد و نظر کے تمام مناظر شاعری کے توسّل سے زندگی اور اس کی ارتقاء پذیری و زوال آمدگی کا تجزیہ اور اظہار کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ دنیا میں کوئی شئے ابتداء میں کمال تک نہیں پہنچتی بلکہ وہ شروع ہی میں وسطی اور انتہائی منازل طے کرتی ہے۔ کسی چیز کو دیکھ کر اس کا معیار جانچنے کے لئے یا اس کے ماضی و مستقبل کو پرکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی کبھی قدیم اور اور وسطی ترقی کے زینوں پر گامزن ہوتے ہوتے بامِ عروج تک پہنچی ہے۔ شاعرانہ تخیل کی حدیں جب مجاز کی منزل سے جدا ہوتی ہیں تو خلوص و معیار قائم ہوجاتا ہے لیکن حقیقت کا ادراک کئے بغیر عارفانہ فکر کا معیار پیدا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت کا پروانہ ہونے کے لئے ایک ایسے معیار کی ضرورت ہوتی ہے جسے شاعر کی نظر میں ایک خصوصیت اور توازن حاصل ہو اور جو کم و بیش حقیقت اور توازن میں فرق پیدا کرسکتا ہو۔ انسان کو چراغِ ماہِ کامل کا پروانہ ہونے کے لئے الگ ایک روحانی آپریشن درکار ہے جو روح کی قوتوں کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔ انسان بیک وقت دو رجحانات کا حامل ہوتا ہے۔ ایک خودی کا اثبات دوسرے اس کی نفی۔ نفی کو حقیقی ربط بھی کہتے ہیں اور حقیقت کا مقصد یہ ہے کہ اپنی خودی کو برتر خودی میں گم کر دیا جائے اور اثبات کا تقاضا ہے کہ خودی کو قائم رکھا جائے تصوف اور خودی کے درمیان جو ایک فرق ہے خواجہ صاحب نے اس کی وضاحت فرمائی ہے اور رازِ دروں خانہ برملا کہنے کی صلاحیت پیدا کی ہے

میخانہ یادِ ساقیِ کوثر میں خلد ہے
اسے میکشو حلال ہے پینا شراب کا

شرابِ حیات و کائنات کی ہم آہنگی کی آئینہ دار ہے۔ اس سے متاثر ہوکر میخانۂ حیات کا صحیح جائزہ لیا جاسکتا ہے اس کے سرور کو اگر دل میں جگہ دی جائے تو یہی شراب کائنات کے ذرّے ذرّے سے تراوش پاتی ہے اور آنکھوں کی راہ سے روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ خواجہ صاحب نے میخانۂ ہستی کو ساقی کوثر کی یاد سے آراستہ کیا ہے۔ یہاں یاد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یاد کرنا دوسرے یاد دلانا۔ یاد کرنا وہ جس میں کوئی شریک نہ ہو اور یاد دلانا وہ جس میں کوئی شریک ہو۔ یہاں یاد کا تعلق یاد دلانے والے سے ہے۔ اور یہ یاد۔ یادِ ساقیِ کوثر کی یاد دلا رہی ہے۔ اس لئے میخانہ ہستی خلد بن گیا ہے۔ خواجہ وزیر کے چند مختلف اشعار۔

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہوکر

مٹ گیا لیکن نہ میں منّتِ کش گردوں ہوا
خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مدفوں ہوا

چھپایا جام جو ساقی نے گر پڑے مرے اشک
ستارے آئے نکل آفتاب ڈوب گیا

دل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یاں جدا اشکِ رواں رقص میں واں یاد جُدا
تارے سیّار جدا ماہ ہے سیار جُدا

یہ مجھ کو شیوۂ افتادگی پسند ہوا
غبار بھی نہ صبا سے مرا بلند ہوا

بزمِ جہاں میں ہے کوئی دم یہ مئے سُرور
ہے ساغرِ نشاط پیالہ شراب کا

بگوشِ دل سنے بلبل تو دَم پھڑک جائے
ہے موجِ نکہتِ گل اپنی باغباں فریاد

میں وہ بلبل ہوں تصور پیشہ
آنکھ کی بند گلستاں دیکھا

وزیر نالے صدائے شکستِ رنگ نہ کر
وہ بے دہن ہے کہ اب تو ہی بے زباں فریاد

خواجہ عبدالغفور، آئی اے ایس

امامِ غزل اور مجاہد آزادی

مولانا حسرت موہانی

ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت موہانی کی شخصیت اور ان کے فن کے تعلق سے کچھ بھی کہتے ہوئے یہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے کہ ان کی باغیانہ سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی جائے یا ان کی شاعری کے کمال کو اُجاگر کیا جائے۔ وہ دونوں ہی میدان کے شہسوار تھے۔ اور حیرت واستعجاب کی بات یہ ہے کہ انہوں نے سیاست کو شاعری سے اور شاعری کو سیاست سے ہمیشہ الگ رکھا۔ ورنہ شاعر کتنا ہی رومانی اور حسن پرور دہ ہو جب سیاست میں کودپڑتا ہے تو اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اس کا حساس دل جہاں اپنے محبوب کے لئے تڑپتا ہے وہیں پر اپنے سیاسی مسلک کو اُبھارنے کے لئے بے قابو ہو جاتا ہے۔ لیکن حسرت کی زندگی میں کہیں compromise کا شائبہ ملتا ہے اور نہ انہوں نے ان دونوں کو خلط ملط کیا۔

ان کی سیاسی زندگی پاکیزہ اور بے لوث رہی۔ خلافت، کانگریس، لیگ اور دوسری سیاسی تحریکوں میں حصّہ لیتے رہے لیکن انہوں نے کبھی ایک مسلک یا ایک جماعت کو دوسری پر ترجیح دے کر اپنے آپ کو کسی سے بھی وابستہ نہیں کیا اور حسبِ موقع بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی اس کی خامیوں کے پیشِ نظر ادھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ کبھی کسی راہبر کے پیچھے نہیں چلتے بلکہ جس جماعت یا تنظیم میں مقصدیت کا عنصر دیکھا وہ نہ صرف اس کا ساتھ دیتے رہے بلکہ اس کے راہبر بھی بن گئے۔ ایک طرح سے وہ انقلابی تھے۔ انہیں اصلاحی تحریکیں اور حکومتِ برطانیہ سے مراعات طلبی بالکل پسند نہ تھی۔ سیاسی میدان میں وہ مردِ مجاہد تھے۔ ۱۹۱۷ء میں فیض آباد میں رہے لیکن ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کے کانگریس اجلاس میں کامل آزادی کا نعرہ لگایا جو مسترد کر دیا گیا۔ ۱۹۴۱ء کے پرآشوب زمانہ میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت قائدِ اعظم محمد علی جناح کر رہے تھے اور اس میں کرپس تجاویز زیرِ بحث تھیں۔ حسرت موہانی یہ بانگِ دہل ان تجاویز کی مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں یکلخت مسترد کر دیا جائے۔ ان کی شنوائی نہ ہوئی بلکہ ہوٹنگ ہوگئی۔ یہ اپنی ضد پر اڑے رہے ان کی آواز پتلی تھی۔ نحیف و لاغر، داڑھی چھتنار لیکن یہ خود بے باک نڈر اور بے لاگ ساتھ ہی ساتھ منکسر المزاج۔ حلیم مہذب پیکر صداقت۔ وہ بارہا جیل گئے مصائب و افلاس میں عمر گزری۔ اشتراکیت کے معترف اور مبلغ بھی رہے ایک عرصۂ دراز تک ریاست حیدرآباد میں بھی مقیم رہے اور ایک جیّد عالم اور معرکتہ الآرا شاعر کی حیثیت سے ان کی تعظیم و تکریم بھی ہوئی لیکن سازگار ماحول کے باوجود دربار کی سرپرستی امراء و روساء کی عنایات کو انہوں نے کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور ان کی سرپرستی قبول نہ کی

لکھتا ہوں نہ مرثیہ نہ قصیدہ نہ مثنوی
حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقانہ

یہ ان کی شاعری اور شاعرانہ فکر کا لب لباب ہے اور اپنی شاعرانہ بلندی کو کچھ اس طرح سے خود اعتمادی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تو نے حسرت یہ نکالا ہے عجیب رنگِ غزل
اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

غزل اس دور میں گھٹ کر ایک ادنیٰ صنف بن رہی تھی۔ حسرت موہانی نے غزل کو وہ مقام اور مرتبہ عطا کیا کہ جو اس کا جائز مقام تھا غزل کی آبرو بڑھا کر اس کی اہمیت اور عظمت کو چار چاند لگا ئے۔ قدیم رنگِ سخن کی روایات کو تازہ کیا اور توانائی بخشی فصاحت، سلاست جدت اور ندرت عطا کی اور اس طرح امام غزل کا درجہ حاصل کیا۔ ان کی شاعری عاشقانہ اور جذبات حسن و عشق کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ حسرت کی دانست میں نہ تو عشق دماغ کا خلل ہے اور نہ یہ انسان کو نکما بناتا ہے۔ حسن و عشق کی واردات بیان کرتے ہیں تو نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ۔ ہوس ناکی جنسی ہیجان سے پرہیز کرتے ہیں۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
تیرے ترکِ محبت کی حقیقت کھل گئی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

مولانا حسرت موہانی نے جہاں جذبات عشق رومان پروری اور واردات قلب کی ترجمانی کی ہے وہیں پر اپنی رنگین مزاجی اور عشق حقیقی کی بناء پر انہیں کرشن کنہیا سے بھی خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں کرشن کنہیا اور بانسری کا ذکر بارہا ملتا ہے۔
حسرت کی غزلوں میں حسین چھل، ذہنی گدگدی اور چھیڑ چھاڑ کے ساتھ مست قلندری بھی ملتی ہے۔

دل مرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا
سیر کرنے کو بام پر آیا
سامنے وہ کھڑی تھی ماہ منیر
چپ کھڑا تھا میں صورتِ تصویر

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

بام پر آنے لگا وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ از خود اظہارِ عشق یا مدعائے دل کے اظہار کے قائل نہیں تھے۔ کہتے ہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت
ان سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنّا کرنا

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدّعا نہ ہوا

اور پھر ان کی بے چارگیٔ عشق کو ملاحظہ فرمائیے

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنّا کر دیا

سادگی اور روانی کے ساتھ حسرت نے ایک نئے شعور کو جگایا ہے جو ہندوستانی عاشق کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ یہ واسوخت سے ملتا جلتا ہے لیکن اس میں چلے پھپھولے نہیں پھوڑے گئے ہیں بلکہ اپنے عشق کی بلندی کو اور جذبہ برتری کو اچھالا گیا ہے

ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کر لیں
کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

وہ محبوب کی جفا شعاری اور اس کی غفلت کا ماتم نہیں کرتے بلکہ اپنی خودداری کو اونچا کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حسرت کا دعویٰ ہے کہ ان کی زبان لکھنوی اور فکر و دانش دہلوی ہے۔ یہ ان کے عمیق مطالعہ اور اساتذہ کے کلام سے استفادہ کا نتیجہ ہے کہ ان میں سب کی خوبیاں مشترک نظر آتی ہیں۔
جرأتؔ، میرؔ، داغؔ اور دیگر نامی گرامی شعراء کے کلام سے استفادہ کر کے انہوں نے دلی اسکول اور لکھنوی اسکول کے فرق کو بڑی حد تک مٹا کر ایک نیا رنگ اور دلچسپ روپ اپنایا جو انہیں غزل کی صنف میں یکتا بناتا ہے اور دبستان دلّی اور دبستان لکھنؤ کے عناد اور مستقل چشمک کو مٹا ڈالتا ہے۔ غزل کی دنیا میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔
دیارِ عشق میں ماتم بپا ہے مرگ حسرت کا وہ وضع پارسا اس کی وہ عشق پاکباز اس کا

ڈاکٹر حمیرا جلیلی

شاہد صدیقی

ایک مطالعہ

غزل کو روایتی چنگل سے آزاد کرانے میں حسرت، فانی اور جگر کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ حسرت نے غزل کو نئے نئے موضوعات سے واقف کرکے اس کے دامن کو وسعت دیا۔ فانی نے دنیائے غزل کو شائستگی و تہذیب کے ساتھ غم انگیز فضا سے دوچار کیا اور جگر نے والہانہ محبت کی ابدیت عطا کی۔ گو کہ ان شعراء کے ساتھ شاہد صدیقی کا تقابل کسی بھی طرح نہیں کیا جاسکتا مگر انہیں بھی اس صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ شاہد بھی غزل کو روایتی اور تصوراتی حسن و عشق اور گل و بلبل کے پارینہ طلسم سے آزاد کر کے اسے زندگی کی حقیقتوں کے روبرو لا کھڑا کیا۔ حقیقتیں جو شیریں بھی ہیں اور تلخ بھی۔

شاہد صدیقی نے اُس وقت اِس فانی دنیا سے اچانک کوچ کیا جب کہ اُن کا کلام فن کی ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اُن کا مختصر سا دیوان "چراغ منزل" اُن کے فکر و فن کو جانچنے اور سمجھنے میں پوری طرح ممد و معاون ہوتا ہے۔

شاہد صدیقی کی منفرد شخصیت کی طرح اُن کا کلام بھی اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس پر اُن کا اپنا شخصی رنگ چھایا ہوا ہے۔ شاہد صدیقی نے ایسے مضامین کو جو نظم کے لئے زیادہ موزوں سمجھے جاتے ہیں بڑی خوبی سے غزل کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ غزل کی تمام مخصوص علامتوں اور غنائیت کو قائم رکھتے ہوئے شاہد نے حالات حاضرہ کے مسائل، ذہنی کشمکش، نئے تشکیل پاتے ہوئے سماج میں انسان کے مستقبل کی غیر یقینی صورت حال، نئی نسل کی ذہنی ناآسودگی، سماج اور معاشرے کی اہم نشستوں پر ظالم اور ناانصاف افراد کی اجارہ داری مظلوموں اور حق داروں کی بے بسی اور کس مپرسی کو نہایت سلیقے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرتے ہوئے شاہد اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ جذبات کی لَے اتنی بلند نہ ہوجائے کہ جوش کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کا گمان ہو اور نہ آواز اتنی پست اور غم انگیز ہو کہ وہ وقت کا مرثیہ بن جائے۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں غزل کی مخصوص روایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے ہی نپے تلے انداز میں کہتے ہیں اور یہی اِن کے فن کا کمال ہے ؎

سحر ہوتے ہی اہلِ انجمن کو نیند سی آئی
اندھیرے اور گہرے ہوگئے جب روشنی آئی

اب حیات انسان کا حشر دیکھئے کیا ہو
مل گیا ہے قاتل کو منصبِ مسیحائی

اس نے ایسی حکمت سے انجمن سجائی ہے
گیت دل میں گھٹتے ہیں لب تک آنہیں سکتے

کبھی میخانہ انہیں کا تھا وہی ساقی تھے
آج جن کا کوئی حصہ نہیں میخانے میں

اِس کو دعوئ تعمیر اُس کو دعوئ تعمیر
اور اس کشاکش میں بڑھ رہے ہیں ویرانے

لیکن اس کے باوجود شاہد صدیقی انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ اِن کے دیوان میں ایسے اشعار بڑی تعداد میں موجود ہیں جو مضمحل ذہنوں اور نڈھال جسموں میں زندگی کی نئی رو دوڑا سکتے ہیں۔ بلاشبہ ان کے کلام میں وہ عناصر موجود ہیں جو انسان کو اُس کے وجود کی قوت سے آگاہ کرسکیں اور دامنِ دل سے افکار کی گرد جھاڑ کر گرے ہوؤں کو پھر میدانِ عمل کی جانب راغب کرسکیں۔

آدمی کی نظروں میں اک نیا اُجالا ہے
آدمی اندھیروں پر فتح پانے والا ہے

ماضی کی فسردہ یادوں سے کیوں خون کریں مستقبل کا
اُمید پہ دنیا قائم ہے اُمید کا کچھ حاصل نہ سہی

ہیں دنیا کی طوفانی ہواؤں میں بھڑکنے دو
نہیں ہوں گے نہیں ہوں گے چراغِ زیرِ داماں ہم

راہِ غم کی ٹھوکریں لاتی ہیں منزل کا پیام
ٹھوکریں کھا کر قدم آگے بڑھانا چاہیئے

غمِ زندگی میں اب تک بہت اشک بہہ چکے ہیں
اسی غم پہ مسکراؤ کہ بہار آ رہی ہے

یوں تو شاہدؔ کے یہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا مِلا جُلا رنگ نظر آتا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے ؎

ہر نفس غمِ جاناں ہر قدم غمِ دوراں
اس طرح نکھرتی ہے زندگی کی رعنائی

لیکن کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے غمِ زندگی کو غمِ دوست پر ترجیح دے دی ہے اور اس طرح وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے اور بھی قریب آجاتے ہیں کیوں کہ اب سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسان کو نہ صرف اس کے ماضی کی اخلاقی قدروں سے دور کر دیا ہے بلکہ لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے حالات نے مستقبل کے خوش آئند تصوّر سے بھی گریز پر مجبور کر دیا ہے۔ وقت کے مصلحت اندیش ہاتھوں نے انسان کو ایک مشینی ذہن تو ضرور عطا کر دیا ہے لیکن دوسری جانب نازک ولطیف احساسات کو بُری طرح مجروح بھی کیا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ غمِ جاناں کو بھی غمِ دوراں میں ضم کر دیا جائے اسی لئے شاہدؔ کہتے ہیں ؎

غمِ جاناں کو غمِ دہر سے بہلاتا ہوں
زندگی مصلحت اندیش ہوئی جاتی ہے

رفتہ رفتہ یاد اُن کی بن گئی غمِ دوراں
زندگی کا سرمایہ زندگی کے کام آیا

لیکن جہاں کہیں شاہدؔ نے غمِ دوست کے پہلو کو نمایاں کیا ہے وہاں سوز و گداز کے ساتھ ایک ضبط اور ٹھہراؤ تہذیب وشائستگی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اُن کے اس قسم کے اشعار میں معاشرے کی اخلاقی حد بندیاں ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اسی حد بندی میں اس طرح سنبھل سنبھل کر کہتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے ذاتی وقار کے ساتھ ساتھ مخاطب کی شخصیت اور رُتبے کا بھی پاس ہو ؎

اُن کو منظور نہیں درد کا رسوا ہونا
آہ کرتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے

یہ کیوں کہوں کہ انہیں دل کبھی سنا نہ سکا
نظر میں تھا وہ فسانہ جو لب تک آ نہ سکا

آپ سے جدا ہو کر میرا تجربہ یہ ہے
زندگی کی ہر ساعت زندگی نہیں ہوتی

شاہدؔ صدیقی نے مجاز کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں حقیقت کو بھی پیش کیا ہے اِس لئے اُن کے کلام میں تصوّف کے چھینٹے بھی مل جاتے ہیں لیکن خال خال کیونکہ یہ اُن کا خاص موضوع نہیں اس کے باوجود چونکہ شاہدؔ بلا کے ذہین ہونے کے علاوہ فن اور زبان پر مضبوط گرفت رکھتے تھے اس لئے ان کے اندازِ بیاں کی یہی پختگی انہیں اس میدان میں بھی کامیاب ہی ٹھہراتی ہے۔ چنانچہ اس رنگ میں بھی انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ "بہت خوب" نہ ہونے کے باوجود درخورِ اعتنا بھی نہیں۔

صورت یہ ہے کہ مجھ میں وہ جلوہ نما ہوا
حیرت یہ ہے کہ میری نگاہوں کو کیا ہوا

کب روح کی آنکھیں کھُلتی ہیں احباب کو کیوں کر سمجھاؤں
میں نے جسے اکثر دیکھا ہے افسوس وہ جلوہ عام نہیں

عاجز تری تلاش میں کون و مکاں رہے
اب جو تجھے تلاش کرے وہ کہاں رہے

شاہدؔ صدیقی کے دیوان "چراغِ منزل" کا دیباچہ لکھتے ہوئے جگرؔ مرادآبادی یہ امید افزا پیش گوئی کی تھی کہ

"حیدرآباد واقعی قابلِ فخر ہے کہ اِسے آج بھی شاہد جیسا شاعر حاصل ہے نہ صرف حیدرآباد بلکہ حقیقتاً پوری دنیائے ادب کو شاہدؔ صدیقی پر فخر کرنا چاہیئے آج وہ ہمارے سامنے ہیں لیکن آنے والا زمانہ بتائے گا کہ اردو ادب پر اُن کے احسانات کتنے عظیم ہیں۔"

لیکن افسوس کہ شاہدؔ کی وفات کے بعد رفتہ رفتہ اُن کو بالکل ہی فراموش کر دیا گیا۔ حالانکہ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ اُن کی شاعری کا کما حقہ جائزہ لیا جاتا، تاکہ اردو شاعری کی تاریخ میں اُن کے صحیح مقام کا تعین ہو سکے۔

**

قسیم الحق گیاوی

ہمزاد بہادر

شاعر
صحافی
لیڈر
ایکٹر
کاتب
ڈرامہ نگار
شکاری
پہلوان
ہیچ

ہمزاد بہادر بیک وقت سب کچھ تھے اور ہر میدان میں یکتا ئے روزگار نظر آتے تھے یوں تو ہمزاد بہادر ہر صنف سخن میں طبع آزمائی فرماتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہزل گوئی اور ہجونگاری کا جواب نہیں نظر آتا۔ ان کی شاعری اسی میدان میں زیادہ نکھرتی تھی اور ان کی نثر بھی اسی افق پر مہر و ماہ کی طرح جگمگاتی تھی۔

کسی سے خفا ہوکر جب وہ اس کی ہجو لکھتے تھے اسی وقت ان کی طبیعت زیادہ رنگ پر آتی تھی اور یہی ان کی شاعری کا فطری مزاج تھا اور خفا ہونے میں ہمزاد بہادر ماہر تھے خفگی کی صورتیں بھی بہت سی پیدا کر رکھی تھیں انہوں نے۔ غصہ ان کی ناک پر اور قلم ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔۔۔

اس سے پہلے کہ میں ہمزاد بہادر کے اوصاف جمیلہ پر روشنی ڈالوں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے ان سے آپ کا تعارف کرا دوں۔

آپ ہیں ہمزاد بہادر

یعنی

مصور جذبات علامہ سید ظفیرالدین شمس مبنائی گیاوی ایڈیٹر ہفتہ وار "ہمزاد"، ہفتہ وار "جلاب" ہفتہ وار "لال مرچ" وغیرہ وغیرہ (بقلم خود)

آپ شیرگھاٹی ضلع گیا کے رہنے والے ہیں۔

آپ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے (غالباً)

اور ۱۹۷۵ء میں انتقال فرما گئے (یقیناً)

آپ کی جائے پیدائش بھی شیرگھاٹی ضلع ہے۔

اور آپ کا مزار شریف بھی شمالی محلہ شیرگھاٹی ضلع گیا میں موجود ہے۔

اگر آپ کی نگاہ کمزور ہے تو آیئے میں کچھ ان کا خدوخال بھی بیان کر دوں۔

ہمزاد بہادر حسین و جمیل آدمی ہیں۔

گورا چٹا سرخ و سفید رنگ، خوبصورت چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جو ہمیشہ دنبالہ دار سرمہ سے سجی ہوئی رہتی ہیں۔ صحت اچھی بلکہ خطرناک حد تک اچھی ہے۔ باقاعدہ پہلوان رہ چکے ہیں۔ اب آیئے ان کے اوصاف جمیلہ کا سلسلہ وار کپتان کر دیا جائے۔

شاعری

شمس صاحب عرف ہمزاد بہادر، درحقیقت بے مثال ہجونگار تھے اور اس میدان میں ان کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ ان کی ایک نظم حکیموا بہت مشہور تھی۔ ایک لیڈر قسم کے حکیم صاحب ان کے ہمعصروں میں تھے۔ ان سے ہمزاد بہادر خفا ہوئے تو یہ بے مثال نظم لکھی جس کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

یٰسین پڑھی جائیگی سرہانے ہیں اس کے — کاٹے گا نہ اسہال کی برسات حکیموا
داڑھی جو نظر آتی ہے دھوکا ہے نظر کا — ٹھڈی پہ جلائے ہے نباتات حکیموا
سالا تو خدا نے نہ کیا اس کو عنایت — کھاتا ہے فقط سالیوں کی لات حکیموا

علامہ سرر کابری گیا کے مشہور و معروف شاعر اور ہمزاد بہادر کے معاصر تھے ان سے خفا ہوئے تو ایک لمبی نظم ان کے خلاف کہی۔ اس کا صرف ایک مصرعہ آپ کو بتا دے گا کہ وہ نظم کتنی شعلہ بار ہوگی، مصرعہ ملاحظہ ہو

اے سرر بے حیا الوٓ صفت

ہمزاد بہادر کو استادالشعرا دکھلانے کا بہت شوق تھا اور سنجیدہ شاعری میں غزل اور رباعی کا شاعر خود کو منوانا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمس صاحب عرف ہمزاد بہادر غزلیں بھی فرماتے تھے اور رباعیاں بھی۔ مگر سنجیدہ شاعری کا ملکہ کم تھا۔ اس بات کو ہمزاد بہادر خوب سمجھتے تھے مگر اپنی چرب زبانی کے زور پر لوگوں سے اپنا لوہا منواتے رہتے تھے۔ اور جب محض چرب زبانی سے کام نہیں چلتا تھا تو دیکھ بھال کے کسی مشہور استاد کی غیر معروف غزل اپنی کہہ کر پڑھ دیا کرتے تھے حتی کہ دوسروں کی غزلیں انہوں نے خود اپنے اخبار میں اپنے نام سے شائع کیں۔ اس سلسلہ میں ان کے اخبار "ہمزاد" کی فائل خود گواہ ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ چند ماہ قبل انہوں نے ایک رباعی اپنے نام سے شائع کی اور چند ماہ کے بعد وہی رباعی مولانا شفق رضوی عمادپوری کے نام سے شائع کر دی۔ اصل میں یہ معاملہ " دروغ گو را حافظہ نباشد" کے تحت ہوتا تھا۔

مولانا شفق رضوی عمادپوری گیا کے بڑے ہی اونچے درجے کے صاحب علم و فن، استاد شاعر گذرے ہیں۔ شفق صاحب بسیار گو تھے اس لیے ان کے واسطے اپنے سارے کلام کی حفاظت و اشاعت مشکل تھی۔ گیا کے مشہور شاعر علامہ سرر کابری بھی انہیں کے شاگرد رشید تھے۔ اور ہمزاد بہادر بھی ان کی شاگردی میں رہے تھے اس لیے شاگردی کا حق سمجھ کر انہوں نے خاص طور پر شفق صاحب کے کلام پر ہاتھ صاف کیا اور اس بے باکی اور غیر محتاط انداز میں کیا کہ خود ان کے اخبار کی پچھلی فائل دیکھنے سے ان کی ہوشیاری کھل جاتی ہے۔

ایک غزل کا معاملہ تو اس وقت آشکار ہوا جب پاکستان سے "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" شائع ہوا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک غزل، دین لیا۔ ایمان لیا۔ جاودستان لیا۔ وغیرہ کے قافیہ ردیف میں ہمزاد بہادر اکثر مشاعروں میں پڑھتے تھے اور بڑی زور دار انداز میں پڑھتے تھے۔ غزل اچھی تھی اور اور جب کراچی (پاکستان) سے مولانا احمداللہ ندوی کی کتاب "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" آئی تو اس میں بھی غزل مع مقطع کے شفق صاحب کے نام سے چھپی ہوئی ملی اور ہمزاد بہادر ہوشیاری یہ کرتے تھے کہ اس غزل کو ہمیشہ بغیر مقطع کے پڑھا کرتے تھے۔

معاملہ یہ ہوا تھا کہ مولانا احمداللہ ندوی نے پاکستان جانے سے قبل آج سے تیس ۳۰ پینتیس ۳۵ سال قبل خود شفق صاحب سے یہ غزل اپنے "تذکرہ" کے لیے حاصل کی تھی۔ اب بے چارے ندوی صاحب کو کیا علم کہ شفق صاحب کے انتقال کے بعد یہ غزل ہمزاد بہادر کی ملکیت بن جائے گی۔ اور ہمزاد بہادر کو بھی اطمینان تھا کہ شفق صاحب کی یہ غزل چونکہ ان کے کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے اس لیے کوئی بھی ان پر انگلی نہ اٹھا سکے گا۔

بہرحال "تذکرہ مسلم شعرائے بہار" پڑھ کر ہم لوگوں کو بہت ہنسی آئی اور ہم لوگوں نے خاص طور پر ہمزاد بہادر کو یہ غزل ایک محفل میں دکھلائی، وہ تو خود کتاب دیکھ چکے تھے۔ جواب تیار تھا۔ نہایت خفا ہو کر بولے کہ" ندوی صاحب بھی عجیب تذکرہ نگار ہیں کہ انہوں نے میری غزل شفق صاحب کے نام سے شائع کر دی ہے" یعنی وہ اتنے بڑے واقعہ پر تھوڑی دیر کے لیے بھی شرمندہ نہ ہوئے۔ اگر مقطع والا معاملہ نہ ہوتا تو ہم لوگ بھی مان لیتے کہ ندوی صاحب سے ہی غلطی ہوئی ہے۔ مگر تذکرہ والی غزل میں مقطع موجود تھا، اور ہمزاد بہادر نے جب بھی یہ غزل سنائی بغیر مقطع کے سنائی۔

یہ احوال تو ان کی سنجیدہ شاعری کے تھے مگر ہجو نگاری میں تو وہ بے مثال صلاحیت کے مالک تھے۔ آپ کو لطف لینا ہو تو یہ اشعار بطور نمونہ مشت از خروارے ملاحظہ فرمائیں ؎

مسجد کے بھی چندے کو سمجھ لیتا ہے میراث	اللہ سے بھی کرتا ہے اب گھات حکیموا
لنگور کا سر، اونٹ کا قد، بوم کی آنکھیں	اس شکل و شباہت کا ہے بدذات حکیموا
یٰسین پڑھی جائے گی اب اس کے سرہانے	کاٹے گا نہ اس سال کی برسات حکیموا

جھولی میں چار پیسے نظر آ رہے ہیں آج	کل پھر رہے تھے ہاتھ پسارے حکیم جی
مر کر مریض ان کا جو پہنچا مسان میں	نکلے نہ گھر سے شرم کے مارے حکیم جی
انگور کی طرح تر و تازہ تھے یہ کبھی	اب سوکھ کر ہوئے ہیں چھوارے حکیم جی

— o —

صحافت

ہمزاد بہادر اپنے اخبار کے پروپرائٹر، ایڈیٹر، کاتب، مضمون نگار، منیجر، ہاکر سب کچھ تھے۔ ان کا اصل اخبار "ہمزاد" تھا اور زندگی کے بیشتر حصے میں اسی کے ایڈیٹر رہے۔ اپنے مزاحیہ کلام میں تخلص بھی "ہمزاد" ہی کرتے تھے اور خود اپنے مضامین میں اپنے کو ہمزاد بہادر لکھا کرتے تھے۔ انتقال سے چند سال قبل انہوں نے اپنا قدیم اخبار "ہمزاد" جناب کلام حیدری کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور نیا اخبار "لال مرچ" کے نام سے نکالا۔ پھر ایک اور اخبار انہوں نے "جلاب" کے نام سے نکالا۔ ان اخباروں کے علاوہ وہ مختلف اخباروں کے نکالنے کا اعلان اپنے اخبار میں کرتے رہتے تھے۔ مثلاً " فتنہ، لنگورچہ " وغیرہ ۔ اخباروں کا نام رکھنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

ہمزاد بہادر اپنے اخبار کے فونٹین پن سے سادہ کاغذ پر مضامین نہیں لکھا کرتے تھے بلکہ اخبار کے سارے مضامین نظم و نثر کتابت کی روشنائی سے پریس کے خاص مصالحہ دار کاغذ پر براہ راست کتابت کر دیا کرتے تھے اور

جب کتابت مکمل کر لیتے تھے تو کتابت شدہ کاپیاں لے کر پہلے شمسی پریس اور پھر تاج پریس گیا میں بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ جاتے تھے۔ ان کی خواہش رہتی تھی کہ سارا کام روک کر اسی وقت ان کا اخبار چھاپ دیا جائے۔ اور اکثر ان کی خواہش پوری بھی کر دی جاتی تھی۔ پریس کے مالک اور منتظم زین العابدین صاحب مرحوم ہمزاد بہادر کا احترام کرتے تھے۔ پھر بھی اپنی جلد بازی میں شمسی صاحب عرف ہمزاد بہادر زین العابدین صاحب پر خفا ہو جاتے تھے۔ ایک دو بار پریس کے خلاف بھی نظم و نثر میں اپنے اخبار کے صفحات پر لکھا۔ زبانی خفا ہوتے رہنا تو ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ان کی خفگی کا بھی خاص انداز تھا۔ مثلاً ایک دفعہ وہ پریس میں پہنچے اور کہا کہ "زینو! لو یہ اخبار جلدی سے چھاپ دو۔ مگر تم نے دیر کی تو گرم پانی سے آبدست کرادوں گا"

ایک دفعہ پریس سے خفا ہوئے تو اپنے اخبار میں یہ مضمون نظم و نثر میں لکھا کہ تاج پریس کی آمدنی بہت بڑھ گئی ہے انکم ٹیکس کے محکمہ کو خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔

پریس کے مرحلہ سے فارغ ہو کر ہمزاد بہادر اپنی اخبار اپنی بغل میں داب کر بازار میں نکل جاتے تھے۔ دکانوں میں تو اخبار دیتے ہی تھے۔ اخبار دیتے جاتے تھے اور پیسے نقد وصول کرتے جاتے تھے۔ کس کی مجال تھی کہ انکار کرتا۔ راستہ میں جو بھی مل جاتا اس پر سلام داغتے اور اخبار کچھ اس طرح بڑھاتے جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کر رہے ہوں۔ ہر عقلمند آدمی ان کا احسان چپ چاپ "مول لے لیا کرتا تھا۔ جو بے عقل ان کا احسان مول لینے میں آنا کانی کرتا تھا۔ اس کی وہ زبانی تو خبر لیتے ہی تھے۔ آئندہ شمارے میں تحریری جماعت بھی بناتے تھے۔ اور اس بیچارے کو ہمیشہ کے لئے "عقل مند" بنادیا کرتے تھے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی تھی کہ یا تو ہمزاد بہادر سے راستہ میں نہ ٹکراؤ، اور اگر ٹکراؤ ہو جائے تو ان کا اخبار ضرور "زہرمار" کرو۔

اشتہار حاصل کرنے کا بھی انھوں نے نرالا اختیار کیا تھا۔ جس دکان کو انھوں نے دیکھا کہ اچھی خاصی چل رہی ہے اور اس کا مالک بل ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کا اشتہار وہ بے تکلف بلا فرمائش چھاپنا شروع کر دیتے تھے۔ چند شماروں میں اشتہارات چھاپنے کے بعد اس دکان میں اشتہار کا بل اور اخبار لیکر پہنچ جاتے تھے جو دکاندار عقلمند ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ ان کے اشتہار کا بل ادا کرتا تھا۔ البتہ جس دکاندار کی شامت آتی تھی وہ اشتہار کا بل ادا کرنے میں تاخیر یا انکار کرتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ زبانی تو جو کچھ سنانا ہوتا تھا سناتے ہی تھے دوسرے شمارے میں اس دکاندار کے خلاف ڈھائی سو شعر کی ہزل لکھنے کا اعلان کر کے اس ہزل کے چند شعر بطور نمونہ چھاپ دیتے تھے۔ دکاندار کو ان چند اشعار سے ہی پسینہ آجاتا تھا۔ اور وہ چپ چاپ ان کے بل کی رقم بھجوا دیا کرتا تھا لہٰذا ہزل کی تکمیل کی نوبت آتی ہی نہیں تھی۔

سڑکی خریداری اور اشتہارات کا تذکرہ تو آپ پڑھ چکے۔ بذریعہ ڈاک بھی شمس صاحب عرف ہمزاد بہادر اخبار بھیجا کرتے تھے اور ہر اس شخص کو بھیجتے تھے جس کو بھیجنا چاہتے تھے۔ وی، پی وغیرہ بھیجنا ہمزاد بہادر کو پسند نہیں تھا چند شمارے ڈاک سے بھیجنے کے بعد وہ براہِ راست بہ نفس نفیس خریدار کے پاس پہنچ جاتے تھے اور خریداری کے ساتھ ہی رقم وصول کر لیا کرتے تھے اب اگر خریدار "خریدار" رہنے پر رضامند نہ ہوا تو موصوف چپ چاپ واپس آکر دوسرے شمارے میں "نادہندوں کی فہرست" میں اس کا نام شائع کر دیا کرتے تھے۔ "نادہندوں کی فہرست" میں نام شائع کرنے کی دھمکی وہ اکثر اخبار میں شائع کیا کرتے تھے۔

عقلمند لوگ تو دھمکی پڑھ کر ہی رقم بدست حاضر ہو جا یا
کرتے تھے جن لوگوں کو عقل دیر میں آتی ہے ان کے نام
"نادہندوں کی فہرست،، میں عجیب وغریب انداز سے
شائع ہوا کرتے تھے ۔

ایک دفعہ ہمزاد بہادر اپنا اخبار لے کر گیا کہ ایک
مشہور ہوٹل میں چائے پینے گئے شمس صاحب اپنے زمانہ
عروج میں کبھی کسی ہوٹل میں پیسے دے کر چائے نہیں پیا
کرتے تھے ۔ اس ہوٹل والے کی شامت آئی تو اس نے
چائے کے پیسے مانگ لئے ۔ موصوف نہایت رعب سے بولے
کہ "کیا تم مجھے نہیں پہچانتے ، میں ہمزاد بہادر ہوں،، وہ پھر
بھی نہ مانا تو اچھا خاصا میدان جنگ تیار ہو گیا اور "ہمزاد،،
کے دوسرے شمارے میں سرورق پر ایک کارٹون شائع
ہوا کہ فلاں ہوٹل کی نہاری کی دیگ میں سے مردہ چھپکلی نکلی
دیگ اور چھپکلی کا ایسا نقشہ اور مالک ہوٹل کی ایسی تصویر
بنائی گئی کہ ہر دیکھنے پڑھنے والے کو ہنسی آئے ۔ اور پھر
اس کارٹون کے ساتھ ایسا زبردست مضمون ہمزاد بہادر
نے لکھا کہ اس ہوٹل میں لوگوں کی آمد ورفت کم ہو گئی ۔
بالآخر مجبور ہو کر ہوٹل والے نے ان سے معافی مانگی ۔ جرمانہ
ادا کیا اور زندگی بھر مفت چائے پلانے کی قسم کھائی ۔

ہمزاد بہادر اپنے اخبار کو ہندوستان کا سب سے
کثیر الاشاعت اور مقبول اخبار ثابت کیا کرتے تھے ۔
ایک مرتبہ وہ اسی طرح اپنے اخبار کی تعریف کر رہے
تھے کہ کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ آپ کا اخبار کتنا چھپتا
ہے ؟ وہ بڑے زور دار انداز میں بولے کہ میرے اخبار
کی جتنی مانگ ہے اتنا کاغذ سرکار مہیا ہی نہیں کرتی ۔۔
ہزاروں ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے پھر بھی مانگ باقی رہ
جاتی ہے ۔ اس پر ایک سوال پھر کیا گیا کہ آخر آپ کا اخبار
کہاں کہاں جاتا ہے کسی بھی اسٹال پر آپ کا اخبار
دکھائی نہیں دیتا ۔ وہ گرج کر بولے کہ میرا اخبار ہندوستان
و پاکستان میں جاتا ہے اب جہاں تک اسٹال پر نظر آنے کا
سوال ہے تو آپ نے میرے اخبار کو کیا عام اخباروں کی
طرح سمجھ لیا ہے کہ اسٹال پر ٹنگا ہوا ملے گا ؟ اجی جناب اس
اخبار کی مقبولیت کا تو یہ عالم ہے کہ ادھر ایجنٹ نے اخبار کا
بنڈل کھولا ادھر لوٹ مچ گئی ۔ جس خریدار کو پہنچنے میں دیر
ہو گئی وہ محروم رہ گیا ۔ ایجنٹ لوگ ہمیشہ تعداد میں اضافہ
کا مطالبہ کرتے ہیں مگر میں اتنا کاغذ کہاں سے لاؤں کر
ان کا مطالبہ پورا کروں ؟

وہ اپنے کے سرنامے پر اپنے قلم سے اپنا نام"...
ادیب العصر، مصور جذبات علامہ سید ظفر الدین شمس
بنائی گیا وی لکھا کرتے تھے ۔ اور مضامین میں خود کو اپنے
قلم سے ہمزاد بہادر لکھا کرتے تھے ۔" ہمزاد،، اخبار کا
سرنامہ بھی پڑھنے کی چیز تھا ۔ سالانہ چندہ کی تفصیل وہ
اس طرح لکھتے تھے ۔

سالانہ چندہ

عام خریداروں سے	پانچ روپے
سیٹھوں اور رئیسوں سے	پچیس روپے
ایکٹرسوں اور حسینوں سے	ایک دلنواز مسکراہٹ
پولیس والوں کے لئے	مفت

شمس صاحب عرف ہمزاد بہادر اپنی صحافت کے
آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم تھے کسی کے خلاف لکھنے میں
ان کا ذہن برق تھا ۔ اس میدان میں وہ طرح طرح کے
نکتے پیدا کرتے تھے ۔ اس قسم کی تحریروں میں جدت و ندرت
کے ساتھ خطرناک تیزی اور عجیب کاٹ ہوا کرتی تھی انھوں
نے بعض لوگوں کے خلاف جو باتیں لکھدیں وہ عرصہ تک زبان زد
خاص وعام رہیں ۔

ہمزاد بہادر بڑے ہی حسین وجمیل آدمی تھے عورتیں
ان کے مردانہ حسن پر قربان ہوا کرتی تھیں جس زمانہ میں

وہ آغا حشر کے ساتھ تھے اور بقول خود ڈرامے لکھا کرتے
تھے ۔ (اتنے ذہین کا آدمی "بقول خود" ہمیشہ غلط ہوتا ہے
اس لئے حقیقت یہ ہے کہ وہ ڈرامے میں ایکٹنگ کیا کرتے
تھے) اس زمانہ میں انھوں نے کیا کیا گل کھلائے وہ تو
ایک الگ داستان ہے ۔ ڈرامے کی دنیا سے نکل کر جب
وہ صحافت کے میدان میں آئے تو بھی ان کی عاشقانہ طبیعت
کے لئے میدان ہر طرف ہموار تھا ۔

ہمزاد بہادر نے شادی بھی کی تھی مگر وہ بیوی کی سے
طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے ۔ اسی غم میں ان کی اہلیہ کا بہت
جلد انتقال ہوگیا ۔ ان کے ایک صاحبزادے بھی ہیں وہ جوان
ہوکر اسی شہر گیا میں کچہری میں ملازم ہیں مگر باپ بیٹے میں
برسوں برسوں ملاقات نہیں ہوتی تھی اس لئے اکثر لوگ
ان کو غیر شادی شدہ آزاد منش سمجھتے تھے اور وہ بھی مرتے
دم تک اپنے کو ایک کنوار نوجوان کی طرح سمجھے بنے رہے ۔

لباس کے معاملہ میں ہمزاد بہادر غالباً ہندوستان کے
پہلے ہستی تھے اس لئے کہ آج ہپی جس قسم کا بھڑکدار رنگین لباس
پہنتے ہیں ۔ وہ اس سے بھی بھڑکیلا لباس آج سے چالیس پچاس
برس پہلے سے پہنتے رہے تھے ان کا خاص پسندیدہ لباس ہری
یا لال لنگی اور بھڑکدار شوخ رنگ چھینٹ کی قمیص تھی ۔ طرح
طرح کے شوخ رنگوں کے کپڑے سلوانے اور پہننے کا شوق
انھیں بڑھاپے تک بلکہ مرتے دم تک رہا ۔ ہاں ہمزاد بہادر
ہپیوں کی طرح بے ترتیب کبھی نہیں رہے ۔ اپنے کو سجانے اور
سنوارنے میں وہ کافی وقت صرف کرتے تھے وہ اپنے
بالوں کو ہمیشہ خوشبودار تیل سے تر اور سنوارے ہوئے
رکھتے تھے ۔ آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ، چم چم جوتے،
پاؤں کے جلد ہی کے رنگ کے موزے وہ ہمیشہ استعمال
کرتے تھے ۔

بات چیت میں ان کا جواب نہیں تھا، گھڑی میں ہنس
دیں ہنسا دیں، گھڑی میں رو دیں رلا دیں، یہ اُن کا خاص
کمال تھا، وہ جب باتیں کرتے تھے ہنستے تھے اور روتے تھے
ڈینگیں مارتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈرامے کے
کامیاب ایکٹر رہے ہوں گے، اجنبی لوگ، چاہے وہ کتنے
ہی زمانہ شناس، اہل علم اور ہوشیار ہوں، ہمزاد بہادر
کی باتیں سن کر اُن سے مرعوب و متأثر ہو جایا کرتے تھے
وہ جب بھی کسی مشاعرے میں گئے اپنی خوبصورت شخصیت
جامہ زیبی، بات چیت کرنے کے خاص انداز اور شعر
پڑھنے کے بے مثال طرز سے میزبانوں اور مشاعرے کے
سامعین سب کو اپنا مدّاح بنا کر آتے تھے ۔ وہ اپنے
زوردار الفاظ اور طرزِ گفتگو اور خاص اندازِ بیان کے
بل پر ہمیشہ خود کو استاذ الشعرا اور اردو کا سب سے
قابل ایڈیٹر ثابت کیا کرتے تھے اور ہم جیسے چند
گھر کے بھیدیوں کو چھوڑ کر سارے ہی لوگ ان کی ہاں
میں ہاں بھی ملاتے تھے اور مرعوب و متأثر بھی ہوتے
تھے ۔ ویسے ہاں میں ہاں تو ہم لوگوں کو بھی ملانا ہی پڑتا
تھا، نہ ملاتے تو مجلس کا رنگ ہی درہم برہم ہو جاتا ۔

بقول ہمزاد بہادر، انھوں نے سینکڑوں ڈرامے
لکھے تھے مگر کسی کو ان کے کسی قابلِ ذکر ڈرامے کا سراغ
نہ مل سکا ۔ البتہ ایک ڈرامہ "نشترِ حیات" کے نام سے
انھوں نے ۱۹۷۴ء میں شائع کرایا جس کا تعارف قسیم الحق
گیاوی نے لکھا تھا ۔ اس ڈرامے کی اشاعت کے وقت
ہمزاد بہادر کی عمر تقریباً ۸۵ برس تھی اور اب وہ واقعی
بوڑھے ہونے لگے تھے ۔ ورنہ ۱۹۷۴ء سے پہلے تک وہ اپنی
عمر تو ۹۲ سال بتاتے تھے مگر خود کو کسی طرح بوڑھا ماننے
کو تیار نہ تھے ۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ کسی طرح بوڑھے
نہیں ہوئے تھے ۔ آخر آخر تک ان کی آواز بڑی ہی کراری
اور بلند تھی ۔ سماعت میں کچھ فرق نہیں آیا تھا ۔ ہاتھ پاؤں
آنکھیں سب صحیح سالم، آنکھوں کی روشنی تو اتنی قابلِ رشک
تھی کہ اسّی پچاسی سال کی عمر میں بھی وہ خود ہی اپنے پورے

اخبار کی کتابت کیا کرتے تھے ۔ بال ان کے البتہ سفید ہو گئے تھے ۔ ۱۹۴۲ء سے پہلے پہلے وہ جب غصّہ میں آتے تھے تو جوانوں سے پنجہ لڑانے کو تیار ہو جایا کرتے تھے ۔

ہمزاد بہادر کی عمر کا بیشتر حصہ گیا میں گذرا ۔ وہ گیا کے مشہور نواب "سیّد ظفر نواب،، کے مصاحبین میں تھے ۔ ظفر نواب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے سید علی مظفر نواب بھی ان کی پرورش کرتے رہے ، ظفر منزل کے قریب ہی کے ایک کمرے میں " ہمزاد ،، کا دفتر تھا جسے وہ نہایت سلیقے سے سجائے ہوئے رکھتے تھے ۔ بڑی بڑی چوکیوں پر گدّوں کے اوپر سفید چاندنی بچھی رہتی تھی ۔ کمرے کے خادم دیواروں پر ابکر ملیوں کی تصویریں ٹنگی ہوئی رہتی تھیں ۔ آخر عمر میں بھی وہ ع رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے ، کے قائل تھے ۔

آخر عمر میں جب بیمار رہنے لگے تو ان کی کس مپرسی کا عجیب عالم تھا ۔ ظفر منزل کا وہ حصّہ بھی فروخت ہو چکا تھا جس میں ان کا دفتر تھا ۔ زندگی بھر کسی سے نباہ نہ سکے مگر ہم لوگوں نے حتّی المقدور ان کی مالی خدمت کی ۔ بہار اردو اکاڈمی میں ان کی طرف سے درخواستیں دے کر قسیم الحق گیاوی نے ان کو مالی امداد دلوائی ۔ پھر وہ جب زیادہ بیمار ہوئے تو ان کے بھتیجے انھیں شیر گھاٹی لیگئے اور ان کی ہر طرح خدمت کی ۔ شیر گھاٹی جانے کے بعد ہمزاد بہادر باوجود دِلی تمنّا کے گیا نہ آسکے اور ۱۹۷۵ء میں شیر گھاٹی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ قسیم الحق گیاوی نے قطعۂ تاریخ لکھا ؎

ایک کہنہ مشق ایڈیٹر ، صحافی بے نظیر
شاعرِ بے مثل تھے سیّد ظفیر الدین شمس
آپ نے "ہمزاد،، برسوں اس طرح شائع کیا
جاودانی بن گئے سیّد ظفیر الدین شمس

آپ تھے دونوں پہ قادر وہ غزل ہو یا ہزل
صاحبِ دیوان تھے سیّد ظفیر الدین شمس ۔
اب انھیں کیا ڈھونڈھتے ہو اب کہاں دنیا میں وہ
اب جہاں سے چل بسے سیّد ظفیر الدین شمس
جشن کا سر کاٹ کر لکھ دو یہ سالِ غم قسیم
اب عدم کو جا بسے سیّد ظفیر الدین شمس

بقیہ :- اردو ادب میں خاکہ نگاری کے اولین نقوش

گو نیم شخصی مرقع کہنا درست ہوگا ۔ رسوا کے بعد خواجہ حسن نظامی نے دلّی کی اکثر بڑی شخصیتوں کی تصویر کشی کی ہے جنہیں وہ قلمی چہرے کہا کرتے تھے لیکن ان کی تصاویر میں شخصیت کی مکمل عکاسی نہیں انہیں صرف حلیہ کہہ سکتے ہیں ۔ البتہ "محرم نامہ" میں کربلا سے متعلق مختلف شخصیتوں کے حلیئے ان کی سیرت کے نقوش اور متعلقہ واقعات کو اپنے منفرد اسلوب میں پیش کیا ہے ۔ ان کے ہاں ہم کو خاکے کے اہم لوازم یعنی حلیہ نگاری ، سیرت کی عکاسی ، منظر نگاری ، واقعہ نگاری سبھی کچھ ملتے ہیں ۔ لیکن انہیں مکمل خاکہ کہنا ممکن نہیں البتہ خاکے کے ابتدائی نقوش میں حسن نظامی کی اس تصنیف کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی ۔ اردو میں جدید خاکہ نگاری کی ابتدا مرزا فرحت اللہ بیگ کے خاکوں سے ہوتی ہے ۔ ان کے علاوہ خاکہ نگاری کی صنف میں جن ادیبوں نے اہم کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سے کچھ قابلِ ذکر نام یہ ہیں ۔ محمد شفیع دہلوی ۔ آغا حیدر حسن ۔ عبدالحق ۔ شبّیر احمد ہاشمی ۔ خواجہ غلام السیدین عبدالرزاق کانپوری ۔ عبدالماجد دریابادی ۔ رشید احمد صدیقی ۔ عصمت چغتائی سعادت حسن منٹو ۔ اشرف صبوحی ۔ دیوان سنگھ مفتون ۔ شوکت تھانوی ۔ مالک رام ۔ اعجاز حسین ۔ چراغ حسن حسرت ۔ غلام احمد فرقت کاکوروی ۔ محمد طفیل ۔ رئیس احمد جعفری ۔ عبدالمجید سالک ۔ شاہد احمد دہلوی ۔ مینا را لدین احمد برقی ۔ علی جواد زیدی ۔ عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی ۔ معین الدین دردائی ۔ الطاف حسین قریشی ۔ نریش کمار شاد وغیرہ

ڈاکٹر نظام الدین گوریکر

اردو تحقیق کی رفتار
جامعہ بمبئی میں

تحقیق نام ہے ادب پاروں کے پوشیدہ خزانوں کی تلاش کا ہی نہیں بلکہ معلوم حقائق کے نامعلوم زاویوں کا عصری میلانات ورجانات اور معاشی و معاشرتی حالات اور کیفیات کی روشنی میں تجزیہ کر کے صحیح درجہ تعین کرنا۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق ایک ایسی مسلسل جستجو ہے جو نہ صرف گم شدہ تخلیقات کی بازیافت کرتی ہے بلکہ ان کی قدر و قیمت کی دریافت بھی۔ تحقیق تنقیدی بھی ہوسکتی ہے اور تاریخی بھی، بہرصورت، تحقیق میں نہ تنقید سے اور نہ تاریخ سے گریز ممکن ہے۔ تحقیق کے لئے دونوں کا عمل لازم و ملزوم ہے۔ تنقیدی تحقیق میں تخلیقات کی افادیت اور ان کے اسلوب نگارش اور افکار و خیالات کی صراحت ہوتی ہے اور تاریخی تحقیق میں واقعات کی اہمیت اور ان کی تاریخی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے۔ بہرکیف، دونوں حالتوں میں محقق کو ادب پاروں کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ ہی نہیں بلکہ خارجی نفوذ کا جائزہ بھی لینا پڑتا ہے اور اس طرح محقق اپنا تنقیدی شعور اور اپنی فنی بصیرت و ادبی مہارت کو بروئے کار لاکر فن اور فن کار کی پہلو دار شخصیت کو اُجاگر کرتا ہے اور ادب پاروں کی بازیافت کو نئے زاویوں سے نقد اور تبصرے کی کسوٹی پر رکھ کر ادبی ذخیرے میں اضافے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے اردو میں تحقیق کا آغاز ہوچکا تھا اگرچہ اس میں شک و شبہ کا شائبہ نہیں کہ اردو میں اس کی بنیاد نہ تحقیق کے جدید اصولوں پر تھی اور نہ اس کی حیثیت معاصرین کے سوانحی حالات کی ترتیب و تالیف سے زیادہ تھی۔ بہرحال دیگر اقسام ادب کی طرح اردو میں تحقیق کے تجربات کی شروعات ہوچکی تھی اور اس زمانے کے شعرائے اردو کے تذکرے بزبان فارسی اگرچہ تنقید و تبصرے کے لحاظ سے ادبی اہمیت کے حامل ہیں، اردو تحقیق و تاریخ کے اعتبار سے بھی ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دبستانِ سرسیّد کے ارکان ثلاثہ یعنی مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی میں اپنی معرکۃ الآرا تصانیف کے ذریعے اردو تحقیق کو جدید اصولوں کی روشنی میں پیش کرکے اولیت کا شرف حاصل کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی کاوشیں اردو تحقیق میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو تحقیق کی اس شاندار روایت کو مولوی عبدالحق، پروفیسر محمود شیرانی اور مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی جیسے قابل قدر محققین نے گیرائی اور گہرائی بخشی اور حصولِ آزادی سے قبل ہی سے مولانا امتیاز علی عرشی، شیخ محمد اکرم، قاضی عبدالودود، مولوی مہیش پرشاد اور سیّد غلام رسول مہر جیسے مایۂ ناز مخدومین ادب نے اردو تحقیق کی طرف خصوصی توجہ کی اور اس کو علمی طریقے پر اور منطقی پیرائے میں پیش کر کے اس صنفِ ادب کو پروقار مقام عطا کیا۔

زمانے کے ساتھ نئی آگہی اور نئے علوم کے احساس نے اردو میں تحقیق کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کا احساس پیدا کیا اور دن بہ دن یہ احساس شدّت کے ساتھ ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ، الہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی اور بمبئی یونیورسٹی وغیرہ میں اردو تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ

تنقید وتبصرہ اور تاریخ وتحقیق کی طرف توجہ کی گئی اور ڈاکٹر مسعود حسن رضوی، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محی الدین زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر مسعود حسین خان، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، مالک رام صاحب، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، پروفیسر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے قابلِ ادب اساتذۂ اردو نے تحقیق پر نہ صرف خصوصی توجہ کی بلکہ طلبا کو تحقیق کی رغبت دلائی اور اس خوبی کے ساتھ اس صنفِ ادب کی طرف مائل کیا کہ ان کا ذوق وشوق ہی برقرار نہ رہا بلکہ ان کے تحقیقی کارنامے اردو ادب کا قیمتی سرمایہ تصور کئے جانے لگے۔ اس امر سے بھی انکار نہیں کہ ہماری دانش گاہوں میں اس وقت جو تحقیقی کام ہو رہے ہیں انہیں منزل تک پہنچنے کی ایک کوشش کہا جا سکتا ہے منزل کے نام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

مسرت کا مقام ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں آج کل تحقیق کے موضوعات، تذکروں اور تواریخ کے دھندلکوں سے نکل کر نقد وتبصرہ اور بصیرت ومہارت کی تجربات کی راہ پر گامزن ہیں، اور اس طرح ادب کے مختلف اصناف کے عصری میلانات کا سماجی اور معاشرتی حالات کے پیشِ نظر جائزہ لیا جانے لگا ہے جس سے تحقیق کے موضوعات میں نہ صرف تنوع پیدا ہوگیا ہے بلکہ ہمہ گیری بھی نظر آنے لگی ہے۔ تاہم ضرورت ہے اس بات کی کہ ان فنکاروں کی نامعلوم کاوشوں کو منظرِ عام پر لایا جائے جو گردشِ زمانے کا شکار بن کر مورخین کی نارسائی اور محققین کی بے اعتنائی کی مرثیہ خواں بنی ہوئی ہیں۔ جہاں دنیائے ادب کی معروف شخصیتوں اور ان کی تحریکات کو موضوعِ تحقیق بنایا جائے وہاں نامعلوم ہستیوں اور ان کی نگارشات کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

ہندوستان کی پہلی تین یونیورسٹیوں میں بمبئی یونیورسٹی بھی ایک قدیم یونیورسٹی ہے۔ اس کے قیام کو آج تقریباً سوا سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ ریاستِ مہاراشٹرا کی ایک ممتاز یونیورسٹی تصور کی جاتی ہے۔ ریاست کی دوسری یونیورسٹیاں ناگپور، پونا، شیواجی، مراٹھواڑہ اور ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہیں۔ موخرالذکر کے سوائے ریاست کی تمام جامعات میں اردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس کا اہتمام ایم۔ اے تک ہے اور ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی مقالہ لکھنے والے طلباء کے لئے ہر ممکن سہولتوں کا معقول انتظام بھی ہے۔

جامعہ بمبئی کے الحاق شدہ دانش گاہوں بالخصوص بلدیۂ بمبئی کے سینٹ زیویرس کالج (دھوبی تالاب)، اسمٰعیل یوسف کالج (جوگیشوری)، سدھارتھ کالج (فلورا فاؤنٹین)، صوفیہ کالج (بریچ کینڈی)، مہارشی دیانند کالج (پریل)، نیشنل کالج (باندرہ)، مہاراشٹر کالج (بلاسس روڈ)، برہانی کالج (مجگاؤں)، اکبر پیر بھائی کالج (بمبئی سینٹرل) اور اضلاع کے دانش گاہوں میں گوگٹے کالج (رتناگیری)، داتار کالج (چپلون) اور بھیونڈی نظام پور نگر پالیکا کالج (بھیونڈی) میں اردو زبان وادب کی درس وتدریس کا اہتمام ہے اور ایم اے کی تعلیم کے لئے جامعہ بمبئی سے ملحق شدہ کالجوں کے اساتذہ اردو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (وکٹوریہ ٹرمینس) پر تشریف لاتے ہیں لیکن ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تیاری کے لئے اسمٰعیل یوسف کالج، سینٹ زیویرس کالج، برہانی کالج اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے خاطر خواہ اہتمام وانتظام ہے۔

ذیل میں ان تحقیقی مقالوں کا ذکر ہے جن پر جامعہ بمبئی، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر نے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عنایت کی ہے۔

مقالہ	مقالہ نگار	دانش گاہ	نگراں
۱۔ گجرات کے اردو شعراء (مارچ ۱۹۴۸ء)	سید ظہیر الدین مدنی	اسمٰعیل یوسف کالج	پروفیسر اشرف ندوی
۲۔ امین گجراتی مثنوی یوسف زلیخا (دسمبر ۱۹۴۸ء)	محمد عبدالحمید فاروقی	ایضاً	آزادانہ
۳۔ اردو تھیٹر (اپریل ۱۹۵۳ء)	عبدالعلیم نامی	ایضاً	پروفیسر نجیب اشرف ندوی
۴۔ اکبر الہ آبادی حیات اور کارنامے (جنوری، ۱۹۵۰ء)	عقیلہ نذیر احمد خان	ایضاً	ایضاً
۵۔ میاں خوب محمد چشتی مثنوی خوب ترنگ (فروری ۱۹۵۹ء)	علی نقی جعفری	ایضاً	پروفیسر ظہیر الدین مدنی
۶۔ بمبئی شہر میں اردو (جولائی ۱۹۶۱ء)	میمونہ عبدالستار دلوی	ایضاً	ایضاً
۷۔ مرزا رسوا حیات اور ناول نویسی (دسمبر ۱۹۶۲)	آدم غلام حسین شیخ	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر

مقالہ	مقالہ نگار	دانش گاہ	نگراں
۸۔ محمد حسین آزاد حیات اور کارنامے (ستمبر ۱۹۶۲ء)	عبدالستار اسمٰعیل دلوی	اسمٰعیل یوسف کالج	پروفیسر ظہیر الدین مدنی
۹۔ دبستانِ دبیر (جنوری ۱۹۶۲ء)	ذاکر حسین فاروقی	ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	پروفیسر نجیب اشرف مدنی
۱۰۔ نظیر اکبر آبادی حیات اور شاعری (اپریل ۱۹۶۳ء)	منیر احمد خان	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر
۱۱۔ قائم چاندپوری حیات اور فن (اگست ۱۹۶۵ء)	سید عبدالحی رضا	ایضاً	ایضاً
۱۲۔ وجہی کی تاج الحقائق جنوری ۱۹۶۹ء)	نور السعید اختر	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر
۱۳۔ آرزو لکھنوی حیات اور کارنامے (نومبر ۱۹۷۱ء)	سیّد مجاہد حسین	اسمٰعیل یوسف کالج	پروفیسر علی نقی جعفری
۱۴۔ نوح ناروی حیات اور شاعری (جنوری ۱۹۷۲ء)	ظفر الاسلام ظفر	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر
۱۵۔ سردار جعفری حیات اور شاعری (دسمبر ۱۹۷۳ء)	داؤد کشمیری	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر
۱۶۔ دار المصنفین کی ادبی خدمات (فروری ۱۹۷۶ء)	خورشید مظہر الحق نعمانی	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	پروفیسر ظہیر الدین مدنی
۱۷۔ جلیل مانک پوری حیات اور فن (اگست ۱۹۷۷ء)	عبدالخالق انصاری	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر
۱۸۔ بیجاپور کی اردو مثنویاں (جنوری ۱۹۷۸ء)	شیخ محمد قیوم صادق	سینٹ زیویرس کالج	پروفیسر نظام الدین گوریکر
۱۹۔ اردو ناول میں عورت کا کردار (اگست ۱۹۸۰ء)	فاطمہ مومن	گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر	عبدالستار دلوی
۲۰۔ اردو میں ہندوستانی اساطیر۔ ۱۹۷۶ء	جی ڈی دیویکر	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر	عبدالستار دلوی

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مقالوں میں سے اردو تھیٹر (ڈاکٹر عبدالعلیم نامی)، بمبئی میں اردو (ڈاکٹر میمونہ دلوی)، مرزا رسوا کی ناول نگاری (ڈاکٹر آدم شیخ)، دبستانِ دبیر (ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی)، ملّا وجہی اور ان کی تاج الحقائق (ڈاکٹر نور السعید اختر)، نوح ناروی ـــ حیات اور کارنامے (ڈاکٹر ظفر الاسلام)، دار المصنفین کی ادبی خدمات ـــ (ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی) اور آرزو لکھنوی۔ حیات اور شاعری (ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی) اور بیجاپور کی اردو مثنویاں، جلیل مانک پوری۔ حیات اور فن (ڈاکٹر عبدالخالق انصاری ذکی) کے مقالے کتابی صورت ـــ میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ تحقیق سے دل چسپی رکھنے والے طلبہ اب ایسے موضوعات کو ترجیح دیں گے جن سے اردو کی نشوونما اور اس کی مختلف کیفیات کو منصۂ شہود پر لایا جا سکے اور جن سے نہ صرف تاریخ کے گم شدہ اوراق کی بازیافت ہوگی بلکہ تحقیق کے لئے نئی راہیں بھی فراہم ہوں گی۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کے سلسلے میں سات لاکھ روپے تین قسطوں میں بطور عطیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کی پہلی قسط یونیورسٹی کے حوالے کر دی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد جلد سے جلد اچھے اساتذۂ اردو کا تقرر کر کے شعبہ کے قیام کا اعلان کر دیں گے اور اس طرح کالجوں کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی تحقیقاتی کاموں کا آغاز ہوگا۔

سلمان ہاشمی

اُردو صحافت کا ارتقائی جائزہ

صحافت کی بنیاد خبروں کی ترسیل پر ہے۔ قدیم ہند میں صحافت کا وجود نہیں تھا' لیکن خبر رسانی اور اس کی ترسیل کا نظام رائج تھا' اس کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی قدیم حکومتیں ان کی اہمیت سے واقف تھیں اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر انہوں نے خبر رسانی کا ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جو اس زمانے کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔

"منوسمرتی" کے ساتویں باب میں خبر رسانی کے نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "قدیم بھارت میں — اگر ایک گاؤں میں کچھ واردات
> تو اس گاؤں کا مالک دس گاؤں کے مالک کو اہل کارواں
> کے ذریعے اطلاع بھجواتا' وہ بیس گاؤں کے مالک کو۔
> یہ مالک سو گاؤں کے مالک کو اور سو گاؤں کے مالک کو اور
> سو گاؤں کا مالک ہزار گاؤں کے مالک کو خبر روانہ کرتا تھا۔"

اس طرح مسافر اور تاجر بھی خبر رسانی کا کام کرتے تھے۔ قدیم راجاؤں کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے اسی قدیم کتاب کے نویں باب میں لکھا ہے کہ ' راستوں کے چوراہوں' اناج کی منڈیوں اور شراب خانوں میں جاسوس مقرر کئے جاتے تھے جو عوام کی سرگرمیوں اور ان کی شکایتوں سے راجا کو مطلع کرتے رہتے تھے۔'

راجہ چندر گپت نے اس نظام کو مزید وسعت دے کر اس میں بازاری عورتوں کو بھی شامل کیا تھا۔ اس طرح فوج کے سرداروں' شاہی دربار کے افسروں اور دیگر وزیروں کی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے جو جاسوس مقرر کئے گئے تھے انہیں "پلسانی" کہا جاتا تھا۔ ان جاسوسوں کو کئی زبانیں آتی تھیں۔ ان کا اپنا ایک کوڈ بھی مقرر تھا جن میں وہ خبروں کی ترسیل کرتے تھے۔

طبقاتِ اکبری میں سلطان علاؤالدین خلجی کے جاسوسی نظام پر تفصیلی معلومات ملتی ہے۔ اس نے محکمۂ جاسوسی کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ عوام سے خبریں حاصل کرنا اور عوام میں خبریں پہنچانا۔ اس طرح ڈاک لانے' لے جانے کے لئے بھی پیادے اور گھڑ سوار مقرر کئے تھے۔

مغلیہ دور میں خبر رسانی پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ انہوں نے نیوز ایجنسی کے بطور ایک محکمہ الگ سے قائم کیا تھا۔ اس محکمہ کے لئے ایک الگ وزیر مقرر تھا جسے "بریدالملک" کہتے تھے جبکہ اس کے تمام معاونوں کو برید کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مختلف صوبوں' ریاستوں اور رئیسوں کے درباروں اور ان کی حویلیوں میں مختلف حیثیتوں سے کام کرنے والے برید نوابوں' رئیسوں' تاجروں اور فوجی سرداروں نیز سرکاری عہدوں کی سرگرمیوں سے بریدالملک کو مطلع کرتے۔ پھر بریدالملک ان رپورٹوں کی توثیق کر کے مختلف عنوانات کے تحت بادشاہ کے حضور پیش کرتے۔ شہنشاہ اکبر نے اس محکمہ کو وسعت دی تھی۔ اس نے اہم شہروں میں اخبار نویس مقرر کئے تھے۔ انہیں "چگیچی" کہا جاتا تھا۔ یہ اہم واقعات کو ترتیب وار لکھ بادشاہ کے سامنے رکھ دیتے۔ جب یہ خبریں بادشاہ دیکھ لیتا تو دربار کا چگیچی شاہی مہر لگا کر انہیں ذخیرہ خانوں میں روانہ کرتا۔ اس طرح ڈاک لانے اور لے جانے کے لئے خصوصی نظام قائم کیا تھا جس کے تحت آگرہ سے احمد آباد تک صرف پانچ دن میں ڈاک پہنچتی تھی جبکہ پیدل ڈاک لے جانے والے ہرکارے دس روز کے اندر سات سو میل کا سفر کرتے تھے۔

کبوتروں کے ذریعہ پیغام رسانی کا سہرا شہنشاہ جہانگیر کے سر بندھتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ خلفائے بغداد ڈاک کے لئے بغدادی کبوتروں کا استعمال کرتے ہیں۔ تو اس نے بھی کبوتروں کو تربیت دی اور اُن سے آگرہ، دہلی، برہان پور وغیرہ کے درمیان خبر رسانی کا کام لینے لگا۔

شہنشاہ عالمگیر نے محکمۂ جاسوسی میں اہم تبدیلیاں کر کے اپنے زیر نگرانی رکھا تھا۔ اس نے راجاؤں، فوجوں، سرکاری افسروں کے علاوہ سیاحوں اور مسافروں کی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھنے کے لئے جاسوس مقرر کئے تھے۔ اس طرح شہزادوں کی حرکتوں اور علامات کے شب و روز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے مختلف جاسوس مقرر کئے تھے۔ عالمگیر نے محکمۂ خبر رسانی کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

۱- واقعہ نگار یا واقعہ نویس
۲- خفیہ نویس یا کار خاص نویس
۳- جاسوس

۱- واقعہ نگار یا واقعہ نویس روزانہ کی خبریں۔ بازار بھاؤ اور عوام کی گپ شپ سے اہم باتیں اخذ کر کے بادشاہ کو مطلع کرتے۔
۲- خفیہ نویس یا کار خاص نویس، شہزادوں، سرکاری افسروں فوجی سرداروں وغیرہ کی سرگرمیوں سے بادشاہ کو آگاہ کرتے۔
۳- جاسوس، دوسرے ملک کے راجاؤں، نوابوں اور رئیسوں کی فوجی طاقت، نظام حکومت اور وہاں کے عوام کے رجحانات کی بادشاہ کو اطلاع دیتے۔

مغل فرمانرواؤں کے علاوہ شیر شاہ سوری، نواب حیدر علی، نواب سراج الدولہ وغیرہ نوابوں اور راجاؤں نے بھی محکمۂ جاسوسی کا نظام قائم کیا تھا۔ ان کی تفصیل قدیم تاریخ عثمانیہ میں ملتی ہے۔ ان حکمرانوں نے غیر ملکی حملہ آوروں کے عزائم سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے خبر رسانی کا تیز ترین انتظام کیا تھا۔ ان کے جاسوس دشمنوں کے کیمپ میں جا کر وہاں کی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کرتے اور پھر ان کی ترسیل کا انتظام کرتے تھے۔

چھترپتی شیواجی کے محکمۂ جاسوسی اور انتظام محکمۂ خفیہ کی تعریف.. انگریزوں نے بھی کی ہے۔ شیواجی خود اس محکمہ کے انچارج تھے — نیو ہسٹری آف انڈیا اور لالہ جیت رائے کی۔ شیواجی ان کتابوں میں اس کی تفصیل اور طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شیواجی مہاراج نے اپنے جاسوس دور دراز کے علاقوں میں تعینات کئے تھے جو بڑی مہارت اور چالاکی کے ساتھ دیگر راجاؤں اور قلعداروں کی فوجی طاقت معلوم کر کے شیواجی کو باخبر کرتے تھے ان جاسوسوں اور خبر رسانوں میں۔ ہیرجی نائیک۔ ناناجی پربھو۔ سندرجی پربھو۔ انتاجی پنڈت کیشو رام وغیرہ کا نام سر فہرست ہے۔ اس طرح سلطان بیجاپور کے ساتھ معاہدہ کے لئے جانے والے وفد میں قاضی حیدر علی کا نام شامل ہے۔

جس طرح خواص اور صوبے داروں سے خبریں حاصل کرنے کے لئے شیواجی نے معقول انتظام کیا تھا۔ اسی طرح اپنے احکامات عوام تک پہنچانے کا بھی بندوبست تھا۔ گاؤں اور دیہات کے پاٹل یا نمبر دار ایک پیتل کی تھالی بجا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے پھر لوگ اکٹھا ہونے پر شاہی احکام سناتے جاتے۔ اس طریقہ کو "ڈونڈی" کہا جاتا ہے۔ مہاراشٹر کے بعض علاقوں میں یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔

ان جاسوسوں کے علاوہ شیواجی نے بھجن گانے والی گوالیاں کھیل تماشے، پوواڑے وغیرہ سنانے والے کلاکاروں کے ذریعہ بھی جاسوسی کا انتظام کیا تھا۔

آخری مغل تاجدار شاہ ظفر کے دور میں ہمیں اخبار کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ بہادر شاہ نے اہم واقعات کو احاطۂ تحریر میں لا کر مطبوعہ شکل میں خواص کے سامنے پیش کرنیکا انتظام کیا تھا۔ اگرچہ یہ اخبار صرف ایک عدد اور مخصوص طبقہ کیلئے ہی تھا۔ پھر بھی عوام میں اس کی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی۔

اس اخبار کا نام ابتدا میں اخبار قلعۂ معلیٰ تھا۔ بعد میں اس اخبار کو روزنامچہ کی شکل میں سراج الاخبار کے نام سے شائع کیا جانے لگا۔ لیکن یہ اخبار انتہائی محدود تھا اس لئے تاریخ صحافت کے ماہرین کے نزدیک اس کا شمار صحافت کے زمرہ میں نہیں ہوتا۔

اگرچہ تصنیف و تالیف کا کام شاہجہانی دور (۱۶۲۷ء ۱۶۵۸ء) سے بھی قبل سے جاری تھا اس کے علاوہ دکن میں قطب شاہی دور ۱۵۱۲ء ۱۶۸۷ء) میں بھی اردو تصانیف کا ثبوت ملتا ہے لیکن یہ بات حیرتناک ہے کہ کسی اخبار کے وجود کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس طرح فورٹ ولیم کالج جس کے قیام کا بنیادی مقصد انگریزوں میں اردو سے رغبت پیدا کرنا تھا سینکڑوں کتابوں کو سلیس اردو میں تالیف کرنے کے باعث تاریخ ادب اردو میں ممتاز اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

مگر افسوس کہ اُس نے بھی اپنے قیام ۱۸۰۱ء سے لے کر ایک طویل عرصہ تک اردو اخبار شائع کرنیکا ارادہ نہیں کیا اور نہ مغل فرمانرواں نے فارسی اخبار کی اشاعت پر توجہ دی۔ اخبارات اپنے دور کے نقیب اور حالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

مگر فارسی رسم الخط کے کاتب کی موجودگی کے باوجود اٹھارھویں صدی کے اختتام تک کسی بھی اخبار کے وجود کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ اس طویل خاموشی سے دو ہی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں یا تو عوام و خواص اخبار کی اہمیت سے واقف نہیں تھے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے دور میں نتائج کے پیشِ نظر حوصلہ افزائی نہیں ہوسکی ہو۔

بہرکیف ہندوستان میں صحافت کے قیام یا اس کی ابتدا کا سہرا ایک انگریز کے سر بندھا ہے۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھا۔ مگر وہاں سے مستعفی ہوکر جب وہ جیل پہنچا تو اُسے اخبار کی اشاعت کا خیال آیا وہاں رہتے ہی اُس نے کلکتہ سے ایک ہفتہ روزہ اخبار "ہکیز گزٹ یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر" ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو جاری کیا۔

مولانا امداد صابری مؤلف تاریخ صحافت اردو نے جلد اوّل میں بنگال انبول ۱۸۵۳ء اور انڈین میل ۱۸۳۱ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہندوستان سے شایع ہونیوالا پہلا انگریزی اخبار انڈین گزٹ یا انڈیا گزٹ تھا جو ۱۷۴۲ء میں جاری ہوا۔ مولوی عبدالرشید نے بھی رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۳۵ء میں انڈیا گزٹ کو ہندوستان کا پہلا اخبار قرار دیا ہے مگر اس اخبار کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں ملتی اور نہ اس کے ابتدائی پرچے کسی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ ناکافی شواہد کی بنا پر صحافت کے تمام محققین نے ہکیز گزٹ کو ہندوستان کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہکیز گزٹ کے اجراء سے بارہ، تیرہ سال قبل ایک ولندیزی مسٹر ولیم بولٹس نے اخبار نکالنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اُسے ملک بدر کئے جانے کے باعث اخبار نکالنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔

ولیم بولٹس ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھا۔ ملازمت کے ساتھ اس کا اپنا کاروبار بھی تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قوانین کے مطابق ملازمت پیشہ شخص اپنا کاروبار نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

کمپنی کے اس رویّہ کے خلاف اُس نے صدائے احتجاج بلند کی علاوہ ازیں کمپنی کے عہدیدار ذاتی اغراض کے بندے بن گئے تھے۔ مطلب پرستی اور مال و زر کی ہوس نے تمام عہدیداروں اور افروں کو اندھا کر دیا تھا۔ وہ لوگ ہندوستانیوں سے ناراض سلوک کر رہے تھے جسکی وجہ سے مقامی لوگ بھی کمپنی سے ناراض تھے۔ چنانچہ کمپنی کی دھاندلیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کیلئے اس نے ایک اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ کے تحت اس نے ایک اشتہار کونسل ہاؤس کلکتہ کے صدر دروازے پر آویزاں کیا جس میں لکھا تھا ـــ

کلکتہ میں چھاپہ خانہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہے۔ انگریزوں کو ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہونے کے لئے پریس کا قیام اور اخبار کی اشاعت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جو لوگ قدم اُٹھانے کیلئے تیار ہوں۔ ان کی ہر قسم کی مدد کا وعدہ کرتا ہوں۔ نیز میرے پاس دستاویزی شکل میں ایسی معلومات موجود ہے جسے عوام تک پہنچنا چاہیئے۔ جو لوگ ان دستاویز کو دیکھنا چاہیں یا ان میں سے کچھ نقل کرنا چاہیں وہ میرے مکان پر آسکتے ہیں "

اس اشتہار کو دیکھتے ہی انگریز افسران سمجھ گئے کہ ولیم بولٹس اخبار نکالنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ان کے راز طشت ازبام ہوجائیں گے۔ چنانچہ کمپنی کے خلاف نفرت پھیلانے اور رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے الزام میں کونسل نے اُسے فوراً ہندوستان چھوڑنے کا حکم دیا۔ اس فیصلہ کے تحت اُسے ۱۸ اپریل ۱۷۶۸ء کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

ہندوستان سے انگلستان پہنچتے ہی اُس نے پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی جس میں کمپنی کی دھاندلیوں اور عہدیداروں کی لوٹ مار کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔

اس واقعہ کے ۱۲ سال بعد کم و بیش انھیں حالات سے متاثر ہوکر جیمس اگسٹس ہکی نے اخبار جاری کرکے ولیم بولٹس کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔

جیمس اگسٹس ہکی بھی ولیم بولٹس کیطرح ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھا۔ ملازمت کے علاوہ اسے ریس اور سٹے کا بھی شوق تھا۔ جس کی وجہ سے اُسے مستعفی ہونا پڑا۔ سٹے اور جوے میں گرفتار رہنے پر وہ جیل میں پہنچا تو وہاں اُسے اخبار کی اشاعت کا خیال آیا۔ وہ فنِ طباعت سے واقف تھا اس لئے رہا ہوتے ہی دو ہزار روپے لگاکر اپنا ایک پریس قائم کیا اور ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو اپنا ہفت روزہ ہکیز بنگال گزٹ "کلکتہ ایڈورٹائزر" جاری کیا۔

اس اخبار کے چار صفحات تھے۔ سائز ۸ × ۱۲ تھا۔ جس میں اگسٹس ہکی خود پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر تھے۔ اس ہفتہ وار میں زیادہ تر اشتہارات رہتے تھے جو جگہ بچ رہتی اس میں ایسی خبریں دیجاتی تھیں۔

BENGAL GAZETTE

Calcutta General Advertiser

کوہ نور لاہور

دہلی اردو اخبار

سراج

جس میں کمپنی کے استحصال کے خلاف شدید تنقید کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کی دُکھتی رگوں کو چھیڑا جاتا تھا جنھوں نے ہکی کو جیل روانہ کرنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

الغرض مسٹر ہکی نے اس اخبار کے ذریعہ خفیہ رازوں کو طشت از بام کرنے اور عہدیداروں کا مفاد پرستوں کو بے نقاب کرنیکا ایک سلسلہ جاری کیا کہ کمپنی کے تمام عہدیدار اس کے خلاف ہو گئے۔ ایک مرتبہ تو اس نے چرچ کے پادری کے خلاف لکھا کہ انجیل کی چھپائی کیلئے جو ٹائپ لندن سے آرہا تھا وہ پادری نے ایک کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا اور یہ کہ پادری نے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر چرچ کی زمین ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ فروخت کی ہے۔

اس خبر کی اشاعت کے بعد پادری نے عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اس مقدمہ میں ہکی کو چار مہینے کی قید اور چار سو روپے جرمانہ ہوا۔ جیل سے رہا ہوتے ہی اُس نے مزید زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ وارن ہیسٹنگز کے خلاف بھی مضمون شائع کیا اس حرکت کے خلاف گورنر نے کونسل کا معرفت نوٹس دے کر ڈاک کے ذریعہ اخبار کی تقسیم کا پروانہ منسوخ کر دیا۔ مگر ہکی پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ جون ۱۷۸۱ء میں کمپنی نے وارنٹ گرفتاری جاری کیا۔ گرفتاری کے بعد عدالت نے ایک سال اور پانچ ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی۔ بعد ازاں مارچ ۱۷۸۲ء میں اس کا پریس بحکم سرکار ضبط کر کے ہکی کو جلاوطن کیا گیا۔

اس طرح ہندوستان میں صحافت کی بنیاد رکھنے والا یہ اخبار جو ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں جاری ہوا تھا ٹھیک دو سال بعد بند ہو گیا۔

ہکیز گزٹ کی ایک قدیم فائل کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں آج بھی موجود ہے اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس اخبار کا نام

" HICKY'S BENGAL GAZETE OR
CALCUTTA GENERAL ADVERTIZER "

تھا۔ انڈین پریس نے لکھا ہے کہ وارن ہیسٹنگز کے خلاف لکھنے پر جون ۱۷۸۱ء میں ہکی گرفتار کر کے اس کا پریس ضبط کیا گیا۔ جنوری ۱۷۸۲ء میں سزا سنائی گئی۔ اس سزا کے خلاف مسٹر ہکی نے کلکتہ کی عدالت میں اپیل دائر کی اور خود بحث کی۔ بعد ازاں اس کا ضبط شدہ پریس واپس کر دیا گیا لیکن کمپنی نے اُسے جلاوطن کر کے اخبار کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

بہرکیف یہ بات ظاہر ہے کہ اقتدار وقت اور حاکموں کی دھاندلیوں اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے پر اس اخبار کا وہی حشر ہوا جو ولیم بولٹس کے عزائم کا ہوا تھا۔

ہکیز گزٹ کے اجراء کے ۹ ماہ بعد ایک اور انگریزی ہفت روزہ انڈین گزٹ مسٹر میسرنک اور مسٹر پیٹر ریڈ نے جاری کیا۔ یہ اخبار سنجیدہ مزاج کا تھا۔ ہکیز گزٹ کی طرح اس میں سنسنی خیز خبریں نہیں ہوتی تھیں۔ غالباً یہ عوام و خواص نیز کمپنی کے عملہ میں اسی لئے مقبول تھا کہ وہ ہنگامہ آرائیوں سے گریز کرتا تھا۔

تیسرا ہفت روزہ کلکتہ گزٹ بقول انڈین پریس فروری ۱۷۸۴ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر مسٹر فرانسیس گلیڈون علم دوست اور باصلاحیت صحافی تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے ذاتی طبیب حکیم محمد عبداللہ کی کتاب 'الفاظ الادویہ' کا انھوں نے میڈیکل ڈکشنری کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس طرح شرح محمدیؐ کا ترجمہ، ڈکشنری آف محمڈن لا، کے نام سے مرتب کیا تھا۔ (عتیق صدیقی آجکل جنوری ۸۰ء) اس کے ابتدائی شماروں میں فارسی، بنگلہ اور عربی میں اشتہارات بھی نظر آتے ہیں۔ اس طرح "خلاصہ دربارِ معلّٰی بہ دارالخلافہ شاہ جہاں آباد" کے زیرِ عنوان فارسی رسم الخط میں انگریزی ترجمہ کیساتھ خبریں بھی دی جاتی تھیں۔

اگر کلکتہ گزٹ کو فارسی انگریزی کا پہلا اخبار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا مگر مکمل فارسی کا پہلا اخبار "مراۃ الاخبار" راجہ رام موہن نے ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء میں جاری کیا۔ اس ہفت روزہ اخبار کا مقصد رسم ستی کا خاتمہ اور ہندو سماج سے غلط رواجوں کو ختم کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں قوم کی صلاح اور بیداری کے حامل مضامین بھی شائع کئے جاتے تھے لیکن افسوس کہ یہ اخبار ۱۸۲۳ء میں بند ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ہندوستانیوں کے استحصال کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی روش پر جب اخبارات نے صدائے احتجاج بلند کی تو کمپنی نے نئے قوانین وضع کئے۔ اس قانون کے تحت مسٹر گلیڈون نے پریس ایکٹ نفاذ کا حکمنامہ جاری کیا۔ اس ایکٹ کے مطابق کوئی بھی شخص بغیر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجازت کے اخبار رسالہ یا کتابچہ تک شائع نہیں کر سکتا تھا۔

گورنر جنرل کے اس پریس آرڈیننس کے خلاف سب سے پہلے راجہ رام موہن نے آواز بلند کی اور اپنے دیگر رفقاء کے ساتھ عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی۔ اس مقدمہ میں راجہ کے وکیل مسٹر کٹلن

فارکیو من تھے۔ مگر عدالت نے اپیل خارج کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے شہنشاہ برطانیہ سے اپیل کی کہ ہندوستانیوں کو تحریر و تقریر کی آزادی لوٹا دی جائے مگر افسوس کہ یہاں بھی وہ ناکام رہے چنانچہ اس دھاندلی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے ۱۸۲۳ء میں مراۃ الاخبار بند کر دیا (انڈین پریس)

فارسی کا دوسرا اخبار "سلطان الاخبار"، ۲ اگست ۱۸۳۵ء کو کلکتہ سے جاری ہوا اس کے ایڈیٹر مولوی رجب علی تھے۔ تیسرا اخبار "گلشن نو بہار"، یکم فروری ۱۸۵۱ء کو جاری ہوا اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالقادر، موہن رائے اور مولوی رجب علی کی طرح حریت پسند اور بیخوف صحافی تھے۔

ان اخبارات سے قبل اردو اور فارسی کا مشترکہ اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء بروز بدھ کلکتہ سے بنام "اخبار جہاں نما"، جاری ہوا۔ اس کے مالک لالہ ہری ہر دت، پرنٹر ولیم ہوپ کنگ اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ یہ اخبار ۲۰ × ۳۰ کے بارہ صفحات پر مشتمل ہر بدھ کو ۱۱ سرکل روڈ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ ہر صفحہ کے دو کالم ہوتے تھے ایک میں اردو اور دوسرے کالم میں فارسی خبریں ہوتی تھیں۔ پہلے صفحہ کے دونوں سرے پر تاج برطانیہ کی تصویر ہوتی تھی۔ ابتدا میں یہ اخبار انگریزوں کا ہم نوا تھا مگر یہ عرصہ نہائی مختصر رہا۔ منشی سدا سکھ کے بعد لالہ ہری ہر دت نے ادارت سنبھالتے ہی پالیسی میں تبدیلی کی اور بے باکی کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کے خلاف لکھنے لگے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے انگریزوں کے بہی خواہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک مضمون شائع کیا۔ لالہ ہری دت کی یہ جرأت انگریزوں کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے انھوں نے اُن سے معافی کا مطالبہ کیا۔ دیگر صورت مالی اعانت بند کرنے کی دھمکی دی۔ اُس وقت اخبارات کی زندگی کمپنی کے ہاتھ میں تھی۔ خریداروں کے قلیل چندے پر اُن کا جاری رہنا محال تھا اس کے باوجود انہوں نے معافی کے مطالبے کو پایۂ حقارت سے ٹھکرا دیا۔

جام جہاں نما پر تبصرہ دہلی کے نصرۃ الاخبار مورخہ یکم اگست ۱۸۷۶ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا یہ پہلا ہفت روزہ تقریباً ۵۵ سال تک جاری رہا تھا۔

خالص اردو کا اخبار دہلی سے ۱۸۳۶ء میں بنام "دہلی اخبار"، جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر و مالک مولانا سید محمد باقر علی تھے آپ ایک جید عالم، معروف مصنف اور بے باک صحافی تھے۔

ہندوستان کی صحافت میں یہ اعزاز آپ کو حاصل ہے کہ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

اس اخبار کی قدیم فائل نیشنل ارکائیوز آف انڈیا میں محفوظ ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۰ مئی ۱۸۴۰ء تک دہلی اخبار کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۷ مئی کا شمارہ "دہلی اردو اخبار"، کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ۲۰ × ۳۰ کے بارہ صفحات پر مشتمل اس ہفتہ وار کا سالانہ چندہ بیس روپے تھا۔ اس کے مستقل عنوانات دو تھے (۱) صاحب کلاں کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی اور گورنر کے احکامات شائع ہوتے رہتے۔ بعض اوقات انتظامات کے تعلق سے تنقید و تبصرہ بھی ہوتا رہتا۔ جبکہ حضور والا کے تحت شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے شب و روز اور قلعۂ معلیٰ کی سرگرمیوں کو شائع کیا جاتا تھا۔

ان کے علاوہ دیگر ریاستوں اور رئیسوں کے درباری حالات اور انتظامات، اسکولوں، مدرسوں اور تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں کو نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ بدانتظامی کی حالت میں سنجیدگی کے ساتھ تنقید بھی کی جاتی۔ اس طرح علمی و ادبی مضامین اور شعر و شاعری کو بھی جگہ ملتی تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس اخبار نے مجاہدین کی بھرپور مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں میں جذبۂ حریت پیدا کر کے انھیں آمادۂ پیکار کیا تھا۔ اس لئے جنگ کا فیصلہ ہوتے ہی مولانا باقر دہلوی کو گرفتار کر کے شہید کیا گیا۔

مولانا باقر کے اجداد ہمدان (ایران) کے رہنے والے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سلمان فارسیؓ سے ملتا ہے۔ عہد نادری میں آپ کے بزرگ کشمیر آئے۔ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ فارغ التحصیل ہونے پر یہیں ملازمت ملی۔ تعلیمی صلاحیتوں کی بنا پر گورنر جنرل نے خلعت سے نوازا تھا۔ کالج کا پرنسپل مسٹر ٹیلر ہندوستانی نوجوانوں کو عیسائیت کی ترغیب دینے میں لالچ سے کام لیتا تھا۔ اس لئے مولانا نے بطور احتجاج ۷ سال بعد استعفیٰ دیدیا۔ بعدۂ تصنیف و تالیف کے کام میں لگے۔ ہندوستانیوں کے حالات کے پیش نظر آپ نے اخبار جاری کر کے صحافت میں وہ مقام حاصل کیا۔ جو آج تک ہندوستان میں کسی بھی زبان کے صحافی کو حاصل نہیں ہوا ہے۔

دہلی اردو اخبار کے ہم عصروں میں سید الاخبار "سراج الاخبار"، عمدۃ الاخبار کوہ نور صادق الاخبار وغیرہ کا نام سرِ فہرست ہے۔

جنھوں نے اس جنگ میں حصہ لے کر ملک کو غیر تسلّط سے آزاد کرانے میں اہم رول انجام دیا ہے ۔ نتیجتاً، اس دوران شائع ہونیوالے اکثر اخبارات انگریزوں کی قہرِ انگریزی کا شکار ہو گئے ۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کی ناکامی کے بعد انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو کر مغلیہ سلطنت جو بہادر شاہ ظفر کے عہد میں قلعۂ معلّٰی کے حصاروں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، مکمل طور پر فرنگیوں کے قبضہ میں چلی گئی ۔

یہاں سے اردو صحافت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے ۔ پہلا دور جو ۱۸۲۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا تھا، اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس عرصہ میں شائع ہونے والے اکثر اخبارات نے عوام میں غیر ملکی تسلّط کے خلاف جد و جہد کا جذبہ پیدا کرنے میں ناقابلِ فراموش رول ادا کیا تھا ۔ اس دوران کم و بیش ۱۰۶ اخبارات و رسائل کی اشاعت کا ثبوت ملتا ہے جن میں ہفتہ واروں کی تعداد ۳۷، پندرہ روزہ ۱۵۰ اور ماہناموں کی تعداد ۱۸ تک پہنچ گئی تھی ۔

ہندوستانی صحافت کے ایک محقق گارساں دتاسی نے اپنے ایک مضمون میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کو ہوا دینے میں اردو اخبارات نے اہم رول ادا کیا تھا "

(تاریخ صحافت اردو جلد ۲)

نتیجتاً اس دور کے اکثر اخبارات انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو کر بند ہو گئے یا اُن کے پریس ضبط کر کے ایڈیٹروں کو سزائے قید دے دی گئی ۔

اس دور میں شائع ہونیوالے اخبارات کی تعداد اشاعت کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی تعداد انتہائی محدود تھی، بعض کی اشاعت نو ۵۰ کے بھی اندر تھی اس کے باوجود انہوں نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ تحریکِ آزادی کا ناقابلِ فراموش باب ہے ۔

دہلی اردو اخبار = ۸۰ — صادق الاخبار = ۱۳۱ — کوہ نور = ۱۸۹ دریائے نور = ۱۰۷ — اسعد الاخبار = ۱۲۵ — نور الاخبار ۲۴۴ — سید الاخبار = ۳۹ — فتح الاخبار = ۴۲ ۔ آفتابِ ہند ۱۷ — مالوہ اخبار = ۹۰ — جام جمشید = ۱۷ ۔

ان اہم اخبارات کے علاوہ دیگر اخبارات کی اشاعت بھی محدود رہی تھی ۔ جن کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے حریت پسندانہ صحافت کی بنیا د رکھ کر اپنے فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے ۔

اردو صحافت کے اس ابتدائی دور کے جائزہ کے بعد اگر اس کی بتدریج ارتقاء پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اردو صحافیوں اور اخبار نویسوں نے زمانہ کے نبض پر ہاتھ رکھ کر اپنے قلم کو استعمال کیا ہے ۔

جس طرح اردو ہفت روزہ کی اشاعت کا فخر سرزمین کلکتہ کو حاصل ہے اسی طرح اولین اردو نامے کے اجراء کا اعزاز بھی کلکتہ ہی نے حاصل کیا ہے ۔

اردو کا پہلا روزنامہ ۱۸۵۸ء میں کلکتہ سے جاری ہوا اس کے قدیم پرچے اسٹائک سوسائٹی کلکتہ میں ہیں ۔ ان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے مالک مولوی کبیر الدین احمد خاں بہادر جسٹس آف دی پیس تھے ۔ مقام اشاعت منشی ولی اللہ لین مکان ۲/۶ ۔ روزانہ چار صفحات پر نکلتا تھا ۔ سالانہ قیمت بارہ روپے مطبع مظہر العجائب میں طبع ہوتا تھا ۔ گارساں دتاسی نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ اس میں انگریزی خبریں بھی چھپتی تھیں ۔

نصرۃ الاخبار، دہلی یکم اگست ۱۸۷۶ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ شائع ہوا ہے جو اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ یہ اخبار اندازاً ... ۲۰ سال تک جاری رہا ہو گا ۔ مولانا صابری نے تاریخ صحافت جلد دوم میں لکھا ہے کہ یہ آخری سالوں میں ہفتہ وار ہو گیا تھا ۔ اور ہر جمعہ کو اشاعت پذیر ہوتا تھا ۔

دوسرا روزنامہ سرزمین لکھنؤ محلہ حضرت گنج سے بنام "اودھ اخبار" جاری ہوا اکثر مؤرخوں اور ناقدوں نے سنِ اجراء ۱۸۵۸ء قرار دیا ہے مگر مولانا امداد صابری نے عبد الرزاق راشد کی تحقیقات سے اتفاق کرتے ہوئے اسے ۱۸۵۹ء میں جاری ہونا تسلیم کیا ہے ۔

ابتداء میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا ۔ چودہ سال تک ہفتہ روزہ شکل میں اشاعت پذیر ہونے کے بعد ہفتہ میں دو بار ۔ بعدۂ سہ بار اور ۱۸۷۶ء میں ہر دوسرے روز شائع ہونے لگا ۔ البتہ ۱۸۷۷ء میں یہ روزنامے کی شکل میں منظرِ عام پر آیا ۔ اس طرح ابتداء میں چار صفحات پر اور پھر ۴۸ صفحات کا شائع ہونے لگا ۔ اس میں بعض اوقات دیوناگری رسم الخط میں بھی مضامین شائع ہوتے تھے ۔

تاریخ صحافت اردو میں اس اخبار کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس کے لکھنے والوں میں نامور اہلِ قلم اور مصنفین شامل تھے جن میں مولانا عبد الحلیم شرر ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ۔

یگانہ جنگیزی۔ حسن عسکری بشیو پرشاد اور بہارے لال شاکر وغیرہ کا نام سرِفہرست ہے۔

ان روزناموں کے علاوہ ملک کے مختلف ریاستوں اور شہروں سے روزنامے شائع ہونے لگے۔ مثلاً لاہور سے روزنامہ پنجاب ۱۸۷۵ء۔ خادم ہند بمبئی۔ (۱۸۸۳) ہزار داستان حیدرآباد (۱۸۸۳ء یہ روزنامہ پہلے ماہنامہ تھا)۔ روزنامچہ عالم الٰہ آباد (۱۸۸۴ء) وکٹوریہ پیپر سیالکوٹ (۱۸۵۲ء) انیس بہار پٹنہ (۱۸۷۶ء) ملح کل گورکھپور (۱۸۸۵ء) وغیرہ وغیرہ۔

ذولسانی اخبارات:۔ جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ چکے ہیں اردو کے پہلے روزنامے اردو گائیڈ میں اردو کے ساتھ انگریزی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس سے تقریباً ۵۷ سال قبل کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار "کلکتہ گزٹ" (مارچ ۱۷۸۴ء) میں فارسی رسم الخط میں انگریزی خبروں کا ترجمہ شائع کیا جاتا تھا اسی بات کے پیشِ نظر عبداللہ یوسف علی نے اس اخبار کو ہندوستان کی مروّجہ زبان کا پہلا اخبار قرار دیا ہے۔ اس طرح اندور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ " مالوہ اخبار " میں اردو اور مراٹھی میں خبریں دی جاتی تھیں۔ یہ ہفتہ وار ۱۸۴۹ء میں مہاراجہ ہولکر کی سرپرستی میں جاری ہوا اس کے ایڈیٹر دھرم نارائن تھے۔

اردو، ہندی کا مشترکہ اخبار گوالیار سے اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ہفت روزہ مہاراجہ جیاجی سندھیا کی سرپرستی اور پنڈت او ماچرن کی ادارت میں ۱۸۵۲ء کو جاری ہوا تھا۔

تاریخ صحافت اردو کا یہ دوسرا دور (۱۸۸۵ء تا ۱۹۰۰ء) اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں روزنامے اشاعت پذیر ہوتے جبکہ پہلے دور میں (۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۷ء) روزنامے شائع نہیں ہوتے تھے۔ دوسرے دور میں ذولسانی اخبارات کے وجود یا ان کی اشاعت کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اس کے برعکس ہفتہ وار اور ماہناموں کی تعداد میں بھاری اضافہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اس دور میں ۲۲ روزنامے ۔۔۔۴ ہفتہ وار۔ ۲۷ پندرہ روزہ اور ۲۶۲ ماہناموں کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کے علاوہ سہ روزہ اور عشرہ وار اخبارات بھی اشاعت پذیر ہوتے تھے۔

۱۹۰۱ء اور اس کے بعد میں شائع ہونے والے اخبارات کے متعلق ہمیں تفصیلی معلومات نہیں ملتی مگر یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں ایسے اخبارات وجود میں آئے تھے جنھوں نے فرنگی سامراج کے خلاف قلمی جہاد کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔ ان اخبارات میں سرِفہرست پنجابی (لاہور) انڈیا اخبار (گوجرانوالا) اردوئے معلّٰی (علی گڑھ) سوراجیہ (الٰہ آباد) الہلال (کلکتہ) ہمدرد (دہلی) جمہوریہ (کلکتہ) نقاش (کلکتہ) پرتاپ (لاہور) زمیندار (لاہور) مظلوم دکن (حیدرآباد) توحید (میرٹھ) سیاست (لاہور) ملاپ (لاہور) الجمعیۃ (دہلی) وطن (دہلی) پیغام (کلکتہ) اتحاد (دہلی) اور ملت (پٹنا و ...) کرزن گزٹ (دہلی) ہمدم (لکھنؤ) انقلاب (لاہور) وحدت (دہلی) ساقی (دہلی) ماہنامہ 'اردو' اور ماہنامہ 'سائنس'۔ (حیدرآباد) رہبر اسری نگر) احسان (لاہور) برہان (دہلی) نوائے وقت (دہلی) ہندوستان (بمبئی) وغیرہ وغیرہ ہیں جنھوں نے سیاسی بیداری، علمی دلچسپی، دینی علوم کے پھیلاؤ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ مولانا امداد صابری نے اپنے ایک مضمون سوینئر آل انڈیا اور ایڈیٹرس کانفرنس لکھنؤ نومبر ۱۹۷۳ء میں اہم اخبارات کی معلومات دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ " اس وقت اردو کے اخبارات و رسائل جاری ہیں۔ ان کی تعداد قریب تیرہ سو ہے۔ "

مہاراشٹر میں صحافتی دور کا آغاز بمبئی سے اشاعت ہونے والا سب سے پہلا اخبار بومبے ہیرلڈ ہے جو بزبان انگریزی ۱۷۸۹ء میں جاری ہوا دوسرے سال "کوریئر" جاری ہوا۔ اس میں انگریزی خبروں کے ساتھ بزبانِ گجراتی اشتہارات بھی دیئے جاتے تھے ۱۷۹۱ء میں بومبے گزٹ جاری ہوا۔ اس طرح گجراتی اخبار "بمبئی نا سماچار" یکم جولائی ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا۔

انگریزی اور گجراتی اخبارات کے بعد مراٹھی اخبارات جاری ہوئے۔ بزبان مراٹھی سب سے پہلا ہفتہ وار "درپن" ۶ جنوری ۱۸۳۲ء میں جاری ہوا۔ درپن کا دوسرا نام ڈی بومبے درپن بھی تھا۔ درپن کے ایڈیٹر بال ڈامبھیکر شاستری نے "دِگ درشن" نامی ماہنامہ ۱۸۳۷ء میں جاری کیا اس طرح انھیں دوہرا اعزاز حاصل ہوا ہے

درپن کے بعد مراٹھی کا دوسرا ہفت روزہ "ممبئی اخبار" ۳ جولائی ۱۸۴۰ء میں جاری ہوا۔

مہاراشٹر سے پہلا روزنامہ بزبانِ مراٹھی "گیان پرکاش" ۱۲ فروری ۱۸۴۹ء کو اشاعت پذیر ہوا۔ یہ ابتدا میں ہفتہ وار تھا ۱۸۵۴ء کے بعد ہفتہ میں دو بار اور پھر ۱۵ اگست ۱۹۰۴ء سے روزانہ ہوگیا۔ اخبار کے مالک کرشناجی ترمبک رانڈے تھے جبکہ ایڈیٹر کرشناجی شاستری چپلونکر تھے۔ اس روزنامہ کا ضمیمہ ہر اتوار کو اشاعت پذیر ہوتا تھا۔

بمبئی سے پہلا روزنامہ "انڈو پرکاش" ۱۸۶۲ء میں جاری ہوا۔ اس اخبار میں مراٹھی کے ساتھ انگریزی خبریں بھی شایع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کے علاوہ ایک انگریزی اخبار بنام "انڈو آف بومبے" روزانہ بھی جاری ہوا تھا۔ مگر چند ماہ بعد اس کی اشاعت بند کرنی پڑی۔ یہ اخبار ۱۹۲۰ء تک نکلتا رہا۔ بعد میں اسے نیشنل ڈیموکریٹک کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔

کیسری کا اجراء

مہاراشٹر کا معروف روزنامہ کیسری جنوری ۱۸۸۱ء میں جاری ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ اس اخبار کو "اودھ" لکھنؤ کی طرح نامور عالموں اور مصنفوں کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ ابتداء ہی سے اس میں وشنو شاستری، بال آگرکر اور لوکمانیہ تلک نے قلمی تعاون دیا ہے۔ اس وجہ سے یہ اخبار ہر طبقہ میں ۱۸۸۲ء میں مدیران کے اختلافات کے باعث تلک اس سے الگ ہوگئے۔ یہ اخبار پونا سے آج بھی شائع ہوتا ہے۔

مراٹھی اخبار کا اجراء

مراٹھی کے اولین اخبار کے اجراء کا اعزاز بمبئی کو حاصل ہے۔ اس شہر سے شائع ہونیوالے پندرہ روزہ "درپن" نے مراٹھی صحافت کے بانی ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ درپن کی اشاعت سے قبل ایک گجراتی اخبار "بمبئی نا سماچار" اور دو انگریزی اخبارات جاری تھے۔ اس دور میں بھی مراٹھی گجراتی اخبارات کی اشاعت کے وقت یہاں سے اردو اخبارات کے اجراء کا ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔ مگر یہاں کی خبروں کی تفصیل کلکتہ اور شمالی ہند کے اخبارات میں ملتی ہے

بہرحال یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مراٹھی انگریزی کا پہلا اخبار The Bombay Darpan ۶ جنوری ۱۸۳۲ء کو بال گنگا دھر شاستری ڈامبیکر نے جاری کیا۔ آپ ایک جید عالم اور سماجی مصلح تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، گجراتی اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں آپ کا جنم ۱۸۱۲ء میں بمقام "رتناگری" ہوا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد عمر کی بیسویں سال دنیائے صحافت میں قدم رکھا اور مراٹھی صحافت کے بابا آدم کا اعزاز حاصل کیا۔

یہ پندرہ روزہ اخبار ۱۱×۹ کے آٹھ صفحات پر مشتمل... اشاعت پذیر ہوتا تھا۔ ہر صفحہ کے دو کالم ہوتے تھے۔ ایک کالم میں مراٹھی اور دوسرے کالم میں انگریزی ترجمہ شائع ہوتا تھا مراٹھی کالم کا نام "درپن" اور انگریزی حصے کا نام .... The Bombay Darpan تھا۔

بمبئی کے اس اولین اینگلو ورناکیولر اخبار کے ابتدائی شمارے پندرہ روزہ شکل میں اشاعت پذیر ہوتے تھے۔ ...بعد یعنی اپنی اشاعت کے چار ماہ بعد ٹھیک ۴ مئی ۱۸۳۲ء کو ہفتہ روزہ شکل میں اشاعت پذیر ہونے لگا۔

اس اخبار کا آخری شمارہ ۲۶ جون ۱۸۴۰ء میں نکلا۔ اس حساب سے یہ ۸½ سال تک جاری رہا۔ بعد اسے یونائیٹڈ سروس گزٹ اینڈ لٹریری کرانیکل میں ضم کر دیا گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ۶ جنوری ۱۸۳۲ء کو یہ اخبار جاری ہوا جس کی مناسبت سے آج بھی ہر سال ۶ جنوری اکھل بھارتیہ مراٹھی پترکار پریشد کی ہدایت پر "پترکار دن" منایا جاتا ہے۔ اس روز کسی معروف صحافی کے ساتھ نشست رکھ کر صحافتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مگر یہ ثبوت فراہم ہوگیا ہے کہ درپن کی اشاعت سے قبل یہاں سے ایک مراٹھی اخبار جاری ہوا تھا۔ جس کا حوالہ "بومبے گزٹ" نامی انگریزی اخبار کے ۲۳ جولائی کے شمارہ میں ملتا ہے اس اخبار نے لکھا ہے کہ ۲۰ جولائی ۱۸۲۸ء میں یہاں سے ممبا پور ورتمان (मुंबापुरवर्तमान) نامی اخبار جاری ہوا تھا مگر اس کے متعلق مزید معلومات نہیں ملتی۔ اور نہ اس کے ابتدائی پرچے ہی محفوظ ہیں۔ چنانچہ عدم معلومات کے دبیز بادلوں میں جا چھپنے کی بنا پر مراٹھی کے اولین اخبار ہونے کا اعزاز درپن کو مل گیا۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ درپن کی اشاعت سے قبل بمبئی سے

دوانگریزی اخبارات جاری تھے۔ بومبے کیریئر اور بومبے گزٹ اس طرح ایک گجراتی اخبار "بمبئی تاسماچار" بھی شائع ہونے لگا تھا۔ ان اخبارات کے ساتھ درپن کے ابتدائی سال کے پرچے حکومت مہاراشٹر کے پاس محفوظ ہیں۔ مگر ممبئی درتمان کا ایک بھی پرچہ کسی کے پاس موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود صحافت کے محققین نے اس کے وجود کو تسلیم کرلیا ہے۔ ممکن ہے ماہ وسال کی گردش سے گھنے بادل ہٹ جائیں اور مراٹھی صحافت کا مطلع صاف ہو جائے تاکہ ابتدائی پرچے کے وجود پر روشنی پڑنے سے اس کے حقیقی نقش ونگار واضح ہو جائیں۔

بہرکیف درپن کے اغراض ومقاصد تحریر کرتے ہوئے ....اس کے فاضل مدیر رقمطراز ہیں:

"ہندوستانیوں میں ولایتی علوم کا پھیلاؤ
اوراس کے ذریعہ یہاں کی عوام کی فلاح و
بہبود کی خاطر آزادانہ سوچ بچار ہمارا
مقصد ہے"

اپنی ادارتی پالیسی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:—

"دلچسپی کا سامان فراہم کرنا، حالات حاضرہ
سے باخبر رہنا، اور صلاحیتوں کے نکھار
کے مواقع فراہم کرنا درپن شائع کرنے
والوں کا مقصد ہے۔ اس لئے ان امور
کے حصول کیلئے ہر ممکن کوشش کرنا، کسی
فرد کی بیجا طرفداری اور سطحیت پسندی
سے درپن کو بچائے رکھنا ہمارا کام ہوگا۔
نیز عوام کو مفید لگنے جیسا ہر کام کیا جائیگا۔

اس ادارتی پالیسی کے پیش نظر درپن نے اپنے سفر کی شروعات کی۔ اس کے ابتدائی پرچے کاوس جی خورشید جی کے مسینج پریس واقع کالبا دیوی میں طبع ہوتے تھے۔ بعد میں یہ آخر تک کرشناجی جگنا تھ کے کیریئر پریس واقع بیل لین سے اشاعت پذیر ہونے لگا۔ اس کا دفتر فورٹ میڈوز اسٹریٹ میں واقع تھا۔ سالانہ زرخریداری ۲۴ روپے تھا جو کہ اس زمانہ کی مناسبت سے زیادہ قیمت تھی اس کے باوجود اس کے خریداروں کی تعداد تین سو تک تھی۔ جبکہ بومبے کیڑیرا اور بومبے گزٹ کی اشاعت چار پانچ سو تک تھی۔

درپن کے دوسرے شمارہ میں اشتہارات کا نرخ دیا گیا ہے۔ اشتہار کی پہلی طباعت کا نرخ ۵ ۷ ریس فی سطر اور دوبارہ کی ۵۰ ریس فی سطر ہے (ریس یعنی ایک روپے کے چار سوکوں میں سے ایک سکہ) اس طرح اس شمارہ میں قارئین کے خطوط کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔

العرض یہ کہ درپن میں وہ تمام خوبیاں موجود رہتی تھیں جو ایک عام قاری پسند کرتا ہے۔

مہاراشٹر کے اُردو اخبارات

یہ بات محتاج تعارف نہیں کہ لسانی بنیادوں پر مہاراشٹر اور گجرات کی تقسیم ۱۹۶۰ء میں عمل میں آئی۔ اس سے قبل یہ علاقہ جس میں بمبئی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سورت تک پھیلا ہوا تھا۔ آج بھی گوناگوں خصوصیتوں کی بنا پر بمبئی کو وہی اہمیت حاصل ہے جو اس سے قبل تھی۔ اسی اہم اور تاریخی شہر یعنی بمبئی میں اردو کا پہلا ہفت روزہ "کشف الاخبار" ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔ البتہ گارساں دتاسی نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے کہ "بمبئی ہرکارہ" سب سے پہلا ہفت روزہ تھا۔ لیکن امداد صابری نے تاریخ صحافت اُردو جلد ۱ میں مجمع الاخبار" کے متعلق لکھا ہے کہ اسعد الاخبار آگرہ کے ۱۳ مارچ ۱۸۴۹ء کے شمارہ میں مجمع الاخبار کی خبریں شائع ہوتی ہیں — اس حقیقت کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ بمبئی کا سب سے پہلا اخبار 'مجمع الاخبار' تھا۔

لیکن افسوس کہ اس اخبار کے متعلق تفصیلی معلومات نہیں ملتی۔ البتہ "کشف الاخبار" کو بمبئی کا پہلا ہفتہ وار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ معلومات ملتی ہے کہ یہ اخبار گھوگھاری محلہ سے ہر جمعہ کو اشاعت پذیر ہوتا تھا۔ ایڈیٹر منشی امان علی لکھنوی تھے۔ چھوٹی سائز کے آٹھ صفحات پر شائع ہونیوالے اس اخبار کو عوام و خواص دونوں پسند کرتے تھے۔ اس ہفت روزہ کیساتھ ایک ضمیمہ بھی نکلتا تھا جس کا نام 'کاشف الاسرار' تھا۔

اس اخبار میں بے باکی کے ساتھ انگریزوں پر تنقید یں کی جاتی تھیں۔ اسی کے ساتھ مفید و کارآمد، علمی و سائنسی مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس اخبار کے متعلق انجمن پنجاب لاہور کی اشاعت مورخہ ۳۰ فروری ۱۸۷۶ء۔ بعد

نامہ الاخبار دہلی یکم مارچ ۱۸۷۶ء میں نمبرے شائع ہوئے ہیں جس سے اس اخبار کے اعلیٰ معیار اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منشی امان علی لکھنوی کے بعد مرزا شہاب الدین ثاقب دہلوی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بعض اسباب کی بناء پر ۱۸۹۷ء میں بند ہوا۔ بعد دوبارہ سنہ ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا۔

پہلا روزنامہ

بمبئی میں سب سے پہلے جو روزنامہ شائع ہوا اس کا نام "خادم ہند" تھا۔ یہ روزنامہ کمہار واڑہ دوسری گلی مکان ۶۷ سے ۱۷ مارچ ۱۸۸۳ء میں جاری ہوا۔ مالک منشی کشن سروپ۔ مہتمم لالہ اندر سروپ تھے۔ جبکہ ایڈیٹر کا نام لالہ دیپ نرائن تھا۔ ہر روز چار صفحات پر شائع ہونیوالے اس روزنامے کا سالانہ چندہ سات روپے تھا۔

جس طرح درپن میں مراٹھی اور انگریزی خبریں اشاعت پذیر ہوتی تھیں۔ اسی طرح محمڈن ہیرلڈ میں اردو۔ انگریزی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ محمڈن ہیرلڈ ہر اتوار کو نکلتا تھا۔ اس کا سنہ اجراء ۱۸۹۰ء ہے۔ محمد یوسف صاحب مالک تھے سالانہ چندہ پانچ روپے تھا۔

قومی یکجہتی کا علمبردار

۱۸۵۰ء کے بعد بمبئی سے متعدد اُردو روزنامے ہفتہ وار اور ماہنامے اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ اس طرح انگریزی، مراٹھی، گجراتی وغیرہ کے بھی اخبار باقاعدگی کے ساتھ نکلتے رہے۔ جو اپنے دور کے ترجمان اور حالات کے آئینہ دار تھے۔ مگر ان تمام اخبارات میں یہ اعزاز صرف مسلم ہیرلڈ کو حاصل تھا کہ اس نے عین اسوقت جبکہ انگریزوں نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دیکر اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر عملی قدم اُٹھایا تھا۔

روزنامہ مسلم ہیرلڈ بائیکلہ سے ۱۸۹۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ چار صفحات پر مشتمل اس روزنامے کا سالانہ چندہ صرف چھ روپے تھا۔ اتنا کم چندہ رکھنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ عام آدمی بھی اسے پڑھ سکیں۔ اس کے مالک و مدیر منشی محمد امیر مالک تھے۔ مطبع محمودی میں طبع ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کی آخری تین دہائیاں ملک کے عوام کے لئے انتہائی آزمائش کی حامل تھیں۔ فرنگی سامراج کے خلاف عوام متحد ہو رہے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ جس نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کر کے جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ یہ اتحاد انگریزوں کے لئے زہر ہلال سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی روایتی پالیسی کے مطابق فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کیلئے اتنی بدگمانیاں پھیلائی کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان فسادات کی زد میں بمبئی بھی آگیا۔ چنانچہ یہاں فسادات کی آگ اتنی تیز بھڑکی کہ اس کے بجھنے کے کچھ آثار نہیں تھے۔ ان آزمائشی دنوں میں مسلم ہیرلڈ ہی وہ واحد اخبار تھا جس نے قلمی جہاد شروع کر کے نہ صرف قومی منافرت ختم کرنے پر زور دیا بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر اُس نے اپنے صفحات میں یہ اعلان کیا کہ:۔

"جو شخص ہندو مسلم کے اتحاد کے فائدے"
پر مضمون لکھے گا اُسے پچیس روپے انعام دیا جائے
گا۔"

مسلم ہیرلڈ کا یہ جرأت مندانہ اعلان اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اردو اخبار نویسوں اور صحافیوں نے ہر دور میں اور ہر موقعہ پر ملک کے استحکام اور اس کے ایمان کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اردو کے اولین ہفتہ وار اخبار جام جہاں نما کے ایڈیٹر نے انگریزوں کے حمایتی کے غلط حرکتوں کے خلاف مضمون لکھ کر معافی مانگنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح مولانا باقر دہلوی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مجاہدین کی اعانت کے جرم میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اسی طرح انگریزوں کی پالیسی کے خلاف ہندو مسلمانوں کو متحد کرنے کی خاطر مسلم ہیرلڈ نے یہ اعلان کر کے اپنے پیش روؤں کے تابندہ نقوش پر چلتے رہنے کا عزم ظاہر کیا تھا۔

بہرکیف یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اردو اخبارات نے ہر دور میں قومی یکجہتی کے لئے اپنے صفحات کو دریادلی کے ساتھ وقف کیا تھا۔

ہم صراحت کیساتھ لکھ چکے ہیں کہ اکثر اردو اخبارات نے تحریکِ آزادی کے دوران اپنے فرائض ادا کرنے کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ اس کے باوجود اردو کو اس کا حق نہیں مل سکا اور نہ کسی ریاست میں (سوائے جموں کشمیر) میں اسے ریاستی زبان کا درجہ دیا گیا۔

البتہ بعض ریاستوں نے اردو اکاڈمیاں قائم کرکے نیز مرکزی وزارت کے تحت ترقی اردو بورڈ کے قیام کے بعد کسی حد تک اشک شوئی ہوتی ہے انھیں اسباب کی بنا پر اگر ہم ۱۹۷۱ء کے سروے کے مطابق ریاستی سطح پر اردو اخبارات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں کل پندرہ زبانوں میں ۷۷۲ روزانہ اخبارات اشاعت پذیر ہو رہے تھے جن میں اردو روزانہ اخبارات کی تعداد ۱۰۲ تھی۔ جبکہ قومی زبان ہندی کے ۲۲۲ اخبارات جاری تھے۔ انگریزی کے ۸۷ اخبارات نکل رہے تھے۔ اس طرح ۱۹۷۱ء کے اعداد کے مطابق ریاستی سطح پر جملہ اردو اخبارات کی تعداد درج ذیل ہے۔

آندھرا = ۱۰۴ — بہار = ۳۵ — ہریانہ = ۳۲
میسور = ۱۷ — اڑیسہ = ۱ — جموں کشمیر = ۸۷
مہاراشٹر ۸۳ — مدھیہ پردیش = ۱۶ — تامل ناڈو = ۹
یوپی = ۱۸۰ — مغربی بنگال = ۳۷ — پنجاب ۱۳۳
راجستھان = ۵ — دہلی = ۱۵۲ — ہماچل پردیش = ۹ — چنڈی گڑھ ۷

یہ تعداد حوصلہ افزا تو ضرور ہے مگر تعدادِ اشاعت کے نقطۂ نظر تشویشناک ہے اب ہم "پریس اِن انڈیا" کے جائزے کے تحت اردو صحافت کے اعداد و شمار دیکھیں گے ۱۹۷۶ء میں ملک کی تقریباً بیس زبانوں میں کل ۶۰۲ روزانہ اخبارات شائع ہوئے جنمیں سب سے زیادہ تعداد ہندی روزناموں (۱۷۵) کی تھی دوسرا نمبر اردو (۱۰۰) کا ہے تیسرا نمبر پر مراٹھی اخبارات (۶۵) ہیں جبکہ انگریزی روزناموں کا نمبر چوتھا (۶۴) ہے۔

اب تعداد اشاعت کے نقطۂ نظر سے اُن کا جائزہ لینگے تو تصویر کا بھیانک روپ سامنے آئیگا (تعداد ہزار میں) اشاعت کے لحاظ سے پہلا نمبر انگریزی اخبارات (۳۵ و ۲۲) ہندی کا دوسرا (۱۸ و ۱۹) ملیالم کا تیسرا (۴۲ و ۱۰) مراٹھی چوتھا (۶۱ و ۸) گجراتی کا پانچواں (۹۷ و ۷) ٹامل کا چھٹا (۲۷ و ۶) بنگالی کا سالواں (۸۶ و ۵) اور اردو کا آٹھواں (۷۶ و ۳) ہے۔ جبکہ کنڑ کا نواں (۵۷ و ۳) اور تیلگو کا دسوا ں (۱۶ و ۲) آتا ہے۔

ملکی سطح پر مختلف زبانوں کے ہفتہ وار، ماہنامے وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان کی جملہ تعداد ۱۲۳۷۱ ہے (جبکہ ۱۹۷۵ء میں ۱۱۵۱۸ تھی) ان میں اردو رسالوں کی تعداد ۸۷۵ ہے۔ تعداد اشاعت کے لحاظ سے ان کا نمبر سالواں ہے جبکہ پہلا نمبر انگلش ہے۔ دوسرا ہندی۔ تیسرا ٹامل۔ چوتھا ملیالم۔ پانچواں بنگالی۔ چھٹا گجراتی۔ ساتواں اردو۔ آٹھواں مراٹھی نواں تیلگو اور دسواں کنڑ کا آتا ہے۔

ریاستی سطح پر اردو اخبارات و رسائل کی تعداد درج ذیل ہے۔

آندھرا پردیش = ۲۰۹ — بہار = ۳۶ — ہریانہ = ۱۸
ہماچل پردیش = ۵ — جموں و کشمیر = ۱۰۱ — کرناٹک = ۴۴
مدھیہ پردیش = ۱ — مہاراشٹر = ۸۴ = دہلی = ۱۴۵
چنڈی گڑھ = ۴ — مغربی بنگال = ۳۵ — اترپردیش — ۱۷۶
تامل ناڈو = ۶ — راجستھان = ۶ — ناگالینڈ = ۱
(آسام۔ گجرات۔ کیرالہ۔ میگھالیہ۔ تریپورہ۔ میزورم دادرا نگر حویلی۔ گوا۔ پانڈیچری سے ایک بھی رسالہ شائع نہیں ہوتا ہے)

جیساکہ ہم لکھ چکے ہیں، جموں و کشمیر کے علاوہ کسی بھی ریاست میں اردو کو ریاستی زبان کا درجہ نہ ملنے کے باوجود اخبارات و رسائل کی تعداد میں ہونے والا اضافہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اس عوامی زبان کی جڑیں ملک کے ہر حصہ میں مضبوطی کے ساتھ پھیل چکی ہیں

اردو کی ترقی کی صحافت کے لئے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے خصوصاً اشتہارات کے سلسلے میں اکثر ریاستوں نے جانبداری کا بدترین مظاہرہ کیا ہے۔ اگرچہ پریس کونسل آف انڈیا کے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ :-

"اختلافات رائے کی بنا پر کسی اخبار کے اشتہارات روکنا قطعی بیجا بلکہ پریس کی آزادی کے لئے ایک خطرہ ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ اخبارات کو خود کفیل ہونے میں مددگار ثابت ہو اور اپنے اس موقف کو پورا کرے کہ وہ جمہوری نظام میں عوام کی نگراں ہے۔"

اُردو داں طبقہ کا فرض

جیساکہ ہم لکھ چکے ہیں، روزانہ اخبارات میں یہ لحاظ تعداد اردو اخبارات دوسرے نمبر پر ہیں، مگر کھپت کے لحاظ سے اُن کا نمبر آٹھواں ہے، اگرچہ اردو کے اخبارات ۱۵/۱۶ ریاستوں سے شائع ہو رہے ہیں مگر ان کی کھپت ریاستی زبان کے اخبارات جیسے ملیالم، مراٹھی، گجراتی ٹامل و بنگالی سے بھی کم ہے۔ یہی حال رسائل و ہفتہ روزہ اخبارات کا ہے۔ تعدادِ اشاعت کے لحاظ سے ان کا نمبر ساتواں ہے مگر کھپت کے لحاظ سے تعداد انتہائی افسوسناک ہے۔

اُردو قارئین انگریزی اور دیگر زبانوں کے اخبارات خرید کر اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں، اس تضاد اور ردِ عمل کو ختم کئے بغیر اُردو اخبارات و رسائل کی ترقی نہیں ہوسکتی اور نہ اُردو صحافت کو بلند مرتبہ مل سکتا ہے۔

رام لعل نابھوی

کیا خوب ہے احساسِ ندامت

ندامت لفظ عربی زبان کا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں۔ پشیمانی۔ ایسا فعل جس کے صادر ہونے پر عوام یا خواص معترض ہوں اور فاعل اس اعتراض کو معقول سمجھ لے اور اپنے فعل پر پشیمان ہو اُسے احساسِ ندامت کہا جاتا ہے کبھی کبھی معترض اپنی برتری جتانے کے لئے اعتراض کرتا ہے کہ دوسرا نادم ہو لیکن اگر اعتراض غلط ثابت ہو جائے تو ندامت معترض کے ہی گلے پڑ جاتی ہے۔

ندامت کے تین پہلو کیے جا سکتے ہیں۔ گہری ندامت۔ خاصی ندامت۔ ہلکی ندامت۔ یہ تینوں واقعاتی ہیں۔ احساسِ ندامت، ندامت کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اس کا تعلق نفسیات سے ہے۔ سخت مزاج، اکھڑ، لا پرواہ۔ منہ پھٹ۔ چالاک۔ نڈر اور بے حیا شخص پر ندامت کا اثر کم ہوتا ہے اور نازک طبع، کم گو، کمزور اور شریف پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

گہری ندامت کا احساس ہوتے ہی جسم کے اعضا اینٹھ جاتے ہیں۔ گردن بالکل جھک جاتی ہے۔ جسم پانی پانی ہو جاتا ہے۔ سوچ اور فکر میں ڈوب جاتا ہے پاگل پن سوار ہو سکتا ہے۔ خودکشی کی نوبت تک آسکتی ہے۔ پنچایتیں۔ عدالتیں جب کسی ملزم کو مجرم قرار دے کر بھرے کمرے میں سزا سناتی ہیں تو مجرم کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ کسی باعزت شہری کو بلا قصور دانستہ یا نادانستہ ہتھکڑی لگا کر عدالت کے کٹہرے تک لے جایا جائے اور عدالت اسے باعزت بری بھی کر دے تو بھی ندامت کا احساس اُسے عمر بھر تک نہیں چھوڑتا۔

گہری ندامت کا اثر زائل نہیں ہوتا۔ خاصی ندامت کا اثر بہت دیر تک قائم رہتا ہے۔ ہلکی ندامت کا اثر جلد ختم ہو جاتا ہے۔

پہلے ایک مختصر واقعہ سنئے۔ ایک طبعاً ظریف اور چھیڑ چھاڑ میں ماہر اپنے ایک دوست کو جو ایک اعلیٰ آفیسر تھا، ملنے کے لئے اس کے دفتر گیا۔ باہر چپراسی بیٹھا تھا۔ اُسے کہا۔ "جاؤ! افسر کو بتاؤ کہ ایک شخص ملنے آیا ہے۔" چپراسی نے نام پوچھا۔ چٹ مانگی مگر کچھ نہ دے کر دباؤ سے چپراسی کو اندر بھیج دیا۔ افسر چپراسی کو ناراض ہو کر بولا "جاؤ نام پوچھ کر آؤ" تب اس شخص نے چپراسی کو وہ نام بتایا جو افسر کے مرحوم والد کا نام تھا۔ افسر نے نام سُنا اور محسوس کیا کہ یہ تو کوئی لنگوٹیا یار ٹھہرا۔ ندامت محسوس کی۔ خود باہر آیا۔ دوست سے گلے ملنے سے پہلے ندامت کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی نظر آئی۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ ملک کی تقسیم سے پہلے ریاستیں خود مختار تھیں لیکن راجاؤں مہاراجاؤں کی حکومت برائے نام تھی۔ سکہ ایجنٹ گورنر جنرل کا ہی چلتا تھا۔ ایک جہاں دیدہ بزرگ ایک مہاراجہ کی خدمت میں پیش ہوئے اور عرض کی "مہاراجہ میں اپنی بات تب بیان کروں گا اگر آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ کو فیصلہ دینے کا اختیار ہے کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ آپ برائے نام مہاراجہ ہیں اور حکومت کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ مہاراجہ نے رعب سے جواب دیا "نہیں۔ ہم فیصلہ کریں گے۔ تکلیف بیان کرو۔" جب مہاراجہ نے بات سن لی تو کہا۔ "جاؤ۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" بزرگ نے فوراً کہا۔ "حضور۔ یہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں نے اپنا وقت خواہ مخواہ ضائع کیا۔" مہاراجہ یہ بات سن کر بہت نادم ہوا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

آئیے اب آپ کو شاعروں، مشاعروں اور ادبی محفلوں کی دنیا میں لے چلیں۔ ایک شاعر اپنا کلام سنانے کے لئے اٹھے۔ پہلا شعر پیش کیا۔ شعراء اور حاضرین میں سے کچھ کو محسوس ہوا کہ یہ تو مال مسروقہ ہے۔ دوسرا شعر سن کر یقین پختہ ہو گیا۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرع ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ ایک شاعر نے شعر مکمل کر دیا۔ شاعر سمجھ گیا کہ اس کی چوری پکڑی گئی۔ نادم ہوا لیکن ندامت کا تاثر چہرے پر آنے نہیں دیا۔ حالت غیر تب ہوئی جب کسی نے اٹھ کر فرمایا "حضرت یہ غزل کتنے میں خریدی" شاعر صاحب بیٹھ گئے اور ندامت کے مارے کسی سے آنکھ تک نہ ملا سکے۔

ایک مشاعرے میں ایک نئے شاعر کو دعوتِ سخن دی گئی۔ ڈائس پر پہنچے۔

غزل شروع کی۔ کلام میں زور ڈالنے کے لئے قدم جو اٹھایا تو دھڑام سے گرے۔ محفل قہقہہ زار بن گئی۔ شاعر کو ندامت کا احساس ہوا۔ پھر اُٹھے۔ آنکھیں بند کیں۔ دایاں ہاتھ اٹھا تو صدرِ محفل کی ناک پر پڑا۔ اِدھر ناک سے نکسیر پھوٹ رہی تھی۔ اُدھر اشعار کا پھوارہ چھوٹ رہا تھا۔ صدر اپنی معنی خیز ندامت کو رومال سے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ناظم مشاعرہ نے اشارہ کیا۔ وہ کب سمجھنے والے تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اشعار سنائے جا رہے تھے۔ صاحبِ صدر نے فہمائش کی تو ادھورا شعر یہ کہہ کر چھوڑ دیا "اُستاد سچ کہتے تھے۔ اچھے شعر کی پرکھ صرف انہیں ہی ہے۔" ناظم مشاعرہ ندامت کے جوہڑ میں غوطہ زن تھے۔

ایک واقعہ اور بھی سُن لیجئے۔ ایک شاعر مشہور فارسی شاعر الوری کا کلام جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے اور لوگوں سے بے پناہ داد لے رہے تھے۔ الوری بھی وہاں پہنچ گئے۔ کچھ دیر تو خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر نہ رہا گیا تو داد دیتے ہوئے پوچھنے لگے کہ یہ شعر کس شاعر کے ہیں۔ جواب ملا۔ "الوری کے۔" پھر پوچھا گیا کہ الوری کہاں ہیں۔ کہنے لگے "وہ ہم ہی تو ہیں"۔ جب کلام ختم ہوا تو ایک صاحب جو الوری کو جانتے تھے اُٹھے اور الوری کو مخاطب ہو کر کہنے لگے "الوری صاحب۔ آپ جتنے عظیم شاعر ہیں اتنے ہی حلیم بھی ہیں اور آپ کے تحمل کا کوئی جواب نہیں۔" اندازہ کیجئے اس ندامت کا جس میں شاعر غرق ہو رہا تھا۔

ایک مقرّر نے ایک بھاری مجمع میں تقریر شروع کی۔ تقریر طویل اور بے معنی تھی۔ اندازِ بیان بھی پُر اثر نہ تھا۔ سامعین سننے کے لئے تیار نہیں تھے اور مقرّر ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ہلکی ہوٹنگ شروع ہو گئی۔ مقرّر کو احساسِ ندامت ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ شاید مزید ہوٹنگ نہ ہو۔ وہ اپنا مضمون سُناتے رہے۔ ہوٹنگ پھر شروع ہو گئی۔ اب مقرّر نے فیصلہ کر لیا کہ ہوٹنگ تو ہو ہی گئی۔ مضمون ختم کئے بغیر بیٹھنا سبکی ہو گی۔ ہوٹنگ اور تقریر مسلسل چلتی رہی۔ محفل کا یہ حال کہ ناظم محفل نادم حاضرین نادم اور سبھی بے بس۔

آخر میں ایک داستان اور سنیئے۔ ایک بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک مستند شاعر کو جو بہت دور سے تشریف لائے تھے سامعین سننے کے لئے بے قرار تھے۔ انہیں سب سے آخر میں سُنا جاتا تھا۔ جب ان کی باری آئی تو فرمانے لگے "شعر سُنانے سے پہلے میں شاعری کی اصناف بتاتا ہوں۔" شاعری کی اصناف ختم کیں تو فرمانے لگے "لگے ہاتھوں نثر کی اصناف بھی سن لیجئے۔" وہ بھی سُنا دیں اور پھر کہا۔ "میں بات طویل کرنا پسند نہیں کروں گا ورنہ بتاتا کہ میں نے ان اصناف میں کتنا نام کیا ہے۔"

حاضرین میں سے کسی نے کہا "حضرت کلام سنائیے۔" جواب ملا۔ "جی ضرور۔ آیا ہی اسی لئے ہوں۔ لیکن ۔۔۔" محفل کا رنگ بگڑتے دیکھ کر ناظم مشاعرہ کو ایک ترکیب سوجھی اور وہ مائک پر پہنچے اور فرمایا کہ حضرت ایک غلطی ہو گئی۔ ایک شاعر کا کلام رہ گیا" مستند شاعر سے اجازت لے کر انہیں پیش کیا۔ اُنہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ اب مستند شاعر کو پھر اسٹیج بلایا گیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ اپنا کلام شروع کرتے حاضرین ایک ایک کر کے جانے لگے اور شاعر صاحب کے دیکھتے دیکھتے پنڈال خالی ہو گیا۔

"واللہ۔ کیا خوب ہے۔ احساسِ ندامت۔"

بقیہ:- فیاضی اور سخاوت ۔۔۔۔۔

بلند تر ہے نہ امارت اس کا راستہ روک سکتی ہے نہ غربت اس کے پیروں کی زنجیر بن سکتی ہے۔ فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ ایک لکھ پتی بھی کرتا ہے اور چائے خانے کے سامنے بھیک مانگنے والے ایک فقیر بھی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جب یہ جذبہ اُبھرے تو ہم اس کی مکمل طور سے تسکین کر سکیں۔ اِسے تشنۂ تکمیل نہ چھوڑیں۔ خراب حالات کے تحت اُسے دبانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ انسانیت کی عظیم خدمت ہے۔ ہر وہ جذبہ لائق مبارکباد ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی کے لئے ابھرے اور رُوح پر ایک نقشِ جاویداں چھوڑ جائے۔

مستقبل میں فیاضی و سخاوت کا انجام کیا ہو گا۔ انسان کا یہ عظیم جذبہ ابھرے گا یا سرد ہوتا چلا جائیگا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مشینوں نے انسانی جذبات کو Commercialize کر دیا ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ وقت کے ساتھ دنیا کی ہر شے بدل جاتی ہے۔ مگر کچھ آفاقی حقیقتیں کبھی نہیں بدلتیں اس بات کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان فنا ہو سکتا ہے لیکن انسانی جذبات فنا نہیں ہوں گے یہ جذبات ازل سے ابد تک تابندہ و روشن رہیں گے یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے موجودہ یا گذشتہ رُوپ بدل لیں۔ انسان جذبۂ خیر و شر کا مجموعہ ہے جب تک تخریبی عناصر انسانی فطرت میں موجود ہوں گے۔ اس وقت تک یقیناً تعمیری عناصر بھی فطرت کا توازن برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ انسانی وحشت و بربریت کو کنٹرول بھی کرتے رہیں ہے۔ اس طرح سماج انتشار سے محفوظ رہے گا اور معاشی شکست و ریخت مایوس کن حدوں تک نہ پہنچ پائے گی۔ اس لئے یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں ایٹم و آہن کے دور کے اور خلائی زمانے کے انسان سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ انسان کا جذبۂ ضمیر ہر دور میں ممتاز رہا ہے۔ اور آئندہ بھی دور کے ہر انتشار پر غالب رہے گا۔

ضمیر کاظمی

فیاضی اور سخاوت

انسانی جذبات ازل سے نگارخانۂ قدرت میں فطری حسین گل کاریاں کرتے آئے ہیں، غصّہ، نفرت، محبت، رحم، ہمدردی، غم، عزائم متعدد جذبات مختلف کارنامے انجام دیتے ہیں۔ اور دُنیا کی تاریخ میں کبھی نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ انسانی فطرت ان جذبات سے الگ ہٹ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ انھیں جذبات نے عظیم المرتبت لوگوں کی عظمت تخلیق کی، انھیں جذبات نے دنیا کی تاریخ میں روشن صفحات کا اضافہ کیا۔ انھیں جذبات نے انسانوں کی درندگی کو خون کی ندیاں بہانے پر اُکسایا یہی جذبات کہیں کہیں موت سے بدل کر زندگی کا جیتا جاگتا پیکر بن گئے۔ انھیں جذبات نے بڑے بڑے طوفانوں کا رُخ موڑ دیا۔ پہاڑوں کے پرخچے اُڑا دیئے۔ تنکوں کی طرح حقیر انسان نے قدرت سے جنگ کی اور جگہ جگہ اپنی فتح و نصرت کے پرچم لہراتا ہوا صدیوں کے سفر میں کامران وظفریاب رہا۔ کہاں تک ان انسانی جذبات کی وسیع و عریض... آفاقی کارکردگی کا ذکر کیا جائے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا دیا۔ انھیں جذبات میں ایک عظیم جذبۂ خیر بھی ہے۔ ایک دوسرے کے کام آنے کا مقدس جذبہ، امداد و تعاون کا پاکیزہ تصوّر، جسے ہم "فیاضی اور سخاوت" کہتے ہیں۔

اب آیئے ہم دیکھیں کہ فیاضی و سخاوت کی مذہبی، معاشی، تاریخی و معاشرتی اہمیت کیا ہے؟

مذہب نے فیاضی اور سخاوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ کہ یہ بنی نوعِ انسان کے لئے ہر زاویہ سے افضل، سودمند، لائقِ ستائش اور خیر و برکت کا موجب ہے۔ اس جذبے کی ستائش کرتے ہوئے مذہب کہتا ہے کہ یہ وہ انسانی جبلّت ہے جو ہر بشر میں موجود ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر چمکیلی کرنوں کی طرح اُبھرتی ہے۔

ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ اگر انسان میں ختم ہو جائے تو انسانیت چیختی چلاّتی عفریت میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کرّۂ ارض پر مروّت، محبّت، ہمدردی، تعاون، مدد اور ایک دوسرے کے کام آنے کے جذبات فنا ہو جائیں گے۔

انسان چلتی پھرتی مشینوں کی طرح ہر قسم کے احساسات سے عاری ہو جائے گا۔ اور زندگی اندھی، گونگی اور بہری ہو جائیگی۔

تقریباً تقریباً دنیا کے تمام مذاہب نے فیاضی اور سخاوت کو سراہا ہے اور انسانیت کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ کہیں دان پُن کہیں ثواب اور کہیں بے بس و مجبور انسانوں کے کام آنے کی ہدایت ہر مذہبی کتاب میں ملتی ہے۔ خصوصاً اسلام نے سخاوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ پڑوسیوں کی خبرگیری، بھائی چارگی، مساوات، غلاموں سے بہتر سلوک اور انھیں آزاد کرنے کا مطالبہ، امداد و تعاون، زکوٰۃ، قربانی، یہ تمام درس قرآن حکیم نے متعدد بار دیا ہے۔ قرآن نے سرمایہ داری کا استحصال کیا ہے اور دولت کو فرعون و قارون کا ورثہ قرار دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انسانی اقدار عظیم و برتر ہو سکیں نہ کہ دولت و حشمت جنھوں نے انسانیت کو ہر دور میں ذلیل کیا ہے۔

تاریخ کے سینے پر بھی فیاضی و سخاوت کے پرچم لہراتے نظر آتے ہیں جب ہم ایک الف لیلوی اور ایک اساطیری کردار۔۔۔

حاتم طائی کا ذکر پڑھتے ہیں جو سخاوت کے ساتھ ضرب المثل بن گیا۔ جب بھی سخاوت کا ذکر ہوتا ہے حاتم طائی کا تصور ضرور اُجاگر ہوتا ہے۔ گویا سخاوت اور حاتم طائی لازم و ملزوم ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہجہ سقہ کی کہانی بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ جسے بادشاہِ وقت ہمایوں نے ایک احسان کے عوض دو دن کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ اور بہجہ سقہ نے دو روز کے لئے تخت و تاج حاصل کر کے ملک بھر میں اپنے نام کے چمڑے کے سکے رائج کر دیئے تھے سکندر اعظم نے جنگی قوانین اور اصول و آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پورس کو معاف کر کے اس کی سلطنت اُسے لوٹا کے فیاضی کی ایک شاندار مثال قائم کی تھی۔ ہندوستان، عرب، یورپ اور دوسرے ممالک کے راجہ، مہاراجہ، نواب، جاگیردار، لارڈس اور ڈیوکس ذرا ذرا سی باتوں پر خوش ہو کے سخاوت کے دریا بہا دیا کرتے تھے۔ تاریخ نے عظیم و برتر انسانوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ

فیاضی اور سخاوت نے تاریخ کے دھارے بدل دیئے ہیں۔ انسان کے مقدرات کا فیصلہ کیا ہے۔ اور نسل در نسل حالات کا رُخ موڑ دیا ہے۔

معاشی محاذ پر بھی فیاضی و سخاوت کی بڑی اہمیت ہے انسانوں کے اس دورِ سیاہ میں بھی جب دولت کی غلط تقسیم نے معاشی دور سماجی انتشار اور بدنظمی پھیلائی۔ پورا معاشرہ غیر متوازن تھا فیاضی و سخاوت نے معاشی توازن برقرار رکھنے میں بڑی مدد کی تھی۔ اور سماجی ناہمواریوں کو پھولنے پھلنے کا موقع نہیں دیا تھا اور اُس پُرآشوب دور میں بھی اس جذبے نے کمال دکھایا تھا۔ جب دنیا کے بیشتر حصے ایک طویل عرصے تک انقلابات کے دھاروں سے کٹے رہے علیحدہ رہے اور سارا سماج بے حس و حرکت اور جامد ہو گیا۔ یہ قوموں کے زوال کا بدترین سیاہ دور تھا لیکن انسانی جذبات نے فیاضی و سخاوت کی جبلتوں کے تحت سماج کو مایوسیوں کے اندھیروں سے نہ صرف بچائے رکھا بلکہ تاریخ کے جمود کو بھی کہیں کہیں سے ٹوٹنے پر مجبور کر دیا معاشی بحران میں فیاضی و سخاوت نے بنی نوع انسان کی بہترین خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم سماجیات میں یہ جذبہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہی ہے کہ اس دور میں انسانی قدریں اپنے عروج پر تھیں۔ مذہب کو فروغ اور سرپرستی حاصل تھی۔ اخلاقی قدریں زندہ تھیں اور معاشرہ بہت ہی تر و تازہ تھا۔

آج کا موجودہ عہدِ انسانی تاریخ کا بدنصیب دور ہے جب انسانیت کا فقدان ہے جذبات تیزی سے مُردہ ہوتے جا رہے ہیں — اخلاقی اور سماجی اقدار تنزل پذیر ہیں۔ مذہب روبہ زوال ہے۔ مشینوں نے انسانی جذبات کو بڑی حد تک سرد خانوں میں تبدیل کر دیا ہے آج عام طور سے فیاضی اور سخاوت کے جو معنیٰ اخذ کئے جاتے ہیں۔ وہ لُٹنا اور لُٹانا ہیں۔ تباہی و بربادی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے اور نہ کبھی ایسا تھا۔ فیاضی اور سخاوت انسان کی رُوح کو تر و تازگی، فرحت و مسرت اور شادمانی بخشتے ہیں کسی مجبور، بے کس اور معذور شخص کی مدد کر کے اچانک طور سے بڑی توانائی محسوس ہوتی ہے۔

دورِ حاضرہ میں بھی فیاضی اور سخاوت کی مثالیں عام ہیں۔ جیسے عبادت گاہوں کی تعمیر، ہسپتال، یتیم خانے، مدرسے، مذہبی اخراجات فلاحِ عام کے کام وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے برِصغیر ایشیا کے چند ممالک میں مذاہب ابھی زندہ ہیں جب تک مذاہب زندہ ہیں اخلاقی اقدار بدستور روشن اور تابناک رہیں گی۔ اکثر و بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں البتہ سخاوت اور فیاضی کا تناسب تشویشناک حد تک گھٹ گیا ہے بلکہ انسانی جذبات کو بھی میکانکی کر دیا گیا ہے۔

آج کی مشینی زندگی میں ضرورت ہے کہ کراہتی ہوئی انسانیت کو تھوڑا سا سہارا دیا جائے اور فیاضی و سخاوت کے جذبات کو فروغ دے کر دکھی انسانیت کی خدمت کی جائے۔

میں یہ بات واضح کرنا چاہوں کہ فیاضی و سخاوت کے لئے دولت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اِس ضمن میں مجھے وہ فقیر یاد آتا ہے جسے میں ایک عرصے سے اپنے گھر کے قریب والے ہوٹل کے سامنے بھیک مانگتا دیکھ رہا ہوں۔ ایک روز شدید سردی میں ریل کے پُل پر سے گذر رہا تھا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ہوٹل والا وہ بھکاری پل پر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دوسرے بھکاریوں کو گرم گرم چائے پلا رہا تھا۔ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ دن بھر چائے خانے کے سامنے بھیک مانگنے والے کا جذبۂ سخاوت اس قدر اُبھرا کہ اُس نے ازراہِ کرم اپنے ہم پیشہ بھکاریوں کی خدمت کر کے اپنے انسانی فطری جذبات کی تسکین کر لی جو انسان کو جانور سے افضل کرتا ہے۔ یہ جذبۂ فیاضی و سخاوت بلا امتیازِ مذہب و ملت دُنیا کی ہر شئے سے

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

خواجہ احمد عباس

دو پرانے پاپی

وہ پُرانے دوست تھے

مگر واگھا کی سرحد پر تینتیس برس کے بعد ملے تھے، آدھی رات کو، ایک زمانے میں ان کی اتنی دوستی تھی کہ بغیر گالی کے کوئی بات نہ کرتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ ایک دوسرے کی ماں بہن کو کبھی نہیں بخشتے تھے۔

جب شائستہ سوسائٹی میں ہوتے تب بھی ایک دوسرے کو "پُرانا پاپی" کہہ کر پکارتے تھے۔

آج بھی جب ملے تو پہلے تو ایک دوسرے کو نہیں پہچانا۔ تینتیس برس میں کتنی ہی تبدیلیاں ان میں آچکی تھیں۔ ایک بہت موٹا ہو گیا تھا۔ دوسرا بہت دُبلا۔

چہروں پر جھریاں پڑ چکی تھیں، مگر آنکھوں میں پُرانی جوانی کی چمک آج بھی تھی۔

جب ایک دوسرے کو پہچانا تو ایک نے دوسرے سے کہا "کیوں بے پُرانے پاپی۔ تو ہی ہے نا؟"

دوسرے نے جواب دیا "اور کون سمجھا تھا تو۔ اپنا باپ؟"

پھر دونوں لپک کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایک نے دوسرے کی آنکھوں میں اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "ابے تُو تو آنسو بہا رہا ہے، عورتوں کی طرح"

دوسرے نے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا "چل بے سالے تو میرا کون لگتا ہے جو میں تجھے دیکھ کر آنسو بہاؤں؟"

"بند کر یہ رونا دھونا۔ وہ سب ہم پر ہنس رہے ہیں"

جدھر اس نے اشارہ کیا تھا ادھر ہندوستانی بارڈر گارڈ دونوں کی حرکتوں پر مُسکرا رہے تھے۔

"تُو ادھر بھی تو دیکھ!"

ادھر دیکھا تو پاکستانی بارڈر گارڈ کے سپاہیوں کو ہنستے ہوئے پایا۔

"ہنستے ہیں تو ہنسنے دو۔ بھول گیا وہ کہاوت کہ ہنستے ہی گھر بستے ہیں"

"اور پھر یہ جگہ تو نہ ہندوستان میں نہ پاکستان میں یہ تو NO MANS LAND ہے۔"

"تو کیا ہم MAN نہیں ہیں۔ عورتیں ہیں؟"

"MAN INCLUDS WOMAN" ایک نے جو وکیل تھا قانون کا ایک نکتہ بتایا،

اے مگر میں ڈاکٹر ہوں، وہ بھی GYNOCOLOGY کا، روز دیکھتا ہوں کہ WOMAN INCLUDES MAN"

تو پھر اگر یہ NO MANS LAND ہے اور WOMAN INCLUDES MAN تو پھر ہم کیا زنخے ہیں؟

قہقہہ مار کر دوسرے نے کہا "زنخے نہیں، ہیجڑے ہیں"

"زنخے اور ہیجڑے میں کیا فرق ہے؟"

"وہی فرق ہے جو تجھ میں اور مجھ میں ہے؟"

"کوئی فرق نہیں ہے"

"تو وہی فرق ہوگا جو ہندوستان اور پاکستان میں ہے!"

"ہاں یہ فرق ہو سکتا ہے، ایک ہیجڑا ہے دوسرا زنخا"

"نہیں ایک زنخا ہے دوسرا ہیجڑا"

"میں کہتا ہوں ایک ہیجڑا ہے دوسرا زنخا"

"اور میں کہتا ہوں ایک زنخا ہے دوسرا ہیجڑا ہے"

"ابے تجھے تو بکواس کی عادت ہے۔ یاد ہے وہ سوڈا لیمن کسٹرڈ کی بات جو ہم نے بمبئی کے ایک ریسٹوران میں ایک بار ساتھ ہی پیا تھا؟"

"اچھی طرح یاد ہے۔ مگر وہ سوڈا لیمن مکسڈ نہیں تھا، لیمن سوڈا مکسڈ تھا"

"میں کہتا ہوں سوڈا لیمن مکسڈ تھا"

"اور میں کہتا ہوں لیمن سوڈا مکسڈ تھا"

"ابے سالے۔ سوڈا لیمن مکسڈ تھا کہ لیمن سوڈا مکسڈ تھا مگر ہم نے دونوں بوتلوں کو ملا کر دو گلاسوں میں ڈال کر پیا تھا"

"اور آدھا پی کر گلاسوں کی ادلا بدلی کر لی تھی"

"اور دونوں کو مزا ایک ہی آیا تھا"

"ابے سالے وہ تو پیار کا مزا تھا"

"تو وہ مزا اب کہاں گیا؟"

"جہاں پیار گیا۔ وہیں مزا گیا؟"

"کہیں بھی جہاں مزا گیا۔ وہیں پیار گیا"

"پیار پر پیاری یاد آگئی، یاد ہے اس کا کوٹھا جہاں ہم دونوں گانا سننے کو جایا کرتے تھے؟"

"اب تو سنا ہے بیچاری پوپلی ہو گئی ہے۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت"

"اور کیا حال ہے تمہارے بازار حسن کا؟ گانے والیاں تو اور بھی کئی آئی ہوں گی"

"ہاں۔ مگر گاتی کم ہیں۔ بجاتی زیادہ ہیں"

"ہا... ہا... ہا یہ اچھی کہی تو نے۔ پرانے زمانے کی یاد آگئی"

"کون سی یاد؟"

"ایک رات میں گانا سننے پیاری کے ہاں گیا تھا۔ وہاں خاموشی تھی، سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا آج گانا بجانا نہیں ہو رہا۔ کیا بات ہے؟ کہنے لگی" بابو جی جب گانے کے قدردان نہیں رہے تو بجانا ہی ہوتا ہے ہا ہا"

"ارے یار۔ تیرا پیار تو اس کمّو کے ساتھ چل رہا تھا کیا ہوا اس کا؟"

"ہوتا کیا؟ چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں، تیس برس ہو گئے ہماری شادی کو۔ پانچ برس ہو گئے اس کی موت کو بھی!"

"بیچاری کمّو! کم بخت تو نے اس سے بچے پیدا کرا کرا کے اس غریب کو مار ڈالا نا؟"

"ابے بڑی ہمدردی ہو گئی تجھے کمّو سے، تیری "اُس" کا کیا ہوا جسے تو تاج محل کہا کرتا تھا کیونکہ وہ آگرے کی رہنے والی تھی، شادی ہوئی نہ آخر تمھاری؟ کتنے بچے ہیں تمھارے؟"

"نہیں یار میں تو ابھی تک کنوارا ہوں"

"ڈاکٹر ہو GYNOCOLOGY میں اور شادی نہیں کی، بچے پیدا نہیں کئے؟"

"نہیں۔ اس کا بیاہ ماں باپ نے کسی دوسرے رقیب روسیاہ سے کر دیا پھر اپنے کو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں"

"ارے واہ رے مجنوں! تو نے تو دیوداس کو بھی مات کر دیا۔ یار وہ نہ ملی۔ کوئی چندا تو ملی ہوگی۔"

"نہیں یار اس بازار میں تو میں کبھی گیا ہی نہیں۔ تیرے چھٹنے کے بعد"

"ارے میرا کیا تعلق تھا اس بازار سے؟ تو کیا وہاں مجھ سے عشق لڑانے جایا کرتا تھا؟"

"نہیں۔ مگر دوست ساتھ ہو تو گانا سننے میں مزا آتا تھا۔ چھڑے دم گانا سننا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ آدمی گراموفون یا ریڈیو پر ہی گانا سن لے"

"ہاں یار یہ تو ٹھیک کہتا ہے۔ تیرے چھٹنے کے بعد مجھے بھی اس بازار سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے کمّو سے دو سال بھر کے اندر شادی کر لی۔ میں نے سوچا یار نا ہو تو بیوی تو ہو"

"ابے مجھے بھی اپنی بیوی کا ALTER NATIVE سمجھتا تھا کیا؟ سالا کہیں کا"

"سالا تو تو ہے۔ کمّو ہمیشہ تجھے بھائی صاحب کہا کرتی تھی"

"یہاں تو تو بازی لے گیا۔ تجھے سالا بنانے کے لیے مجھے بھی کوئی بیوی ڈھونڈنی چاہیئے تھی"

"ابے تیرے ساتھ جس کی قسمت پھوٹتی یہ سوچ کر ہی اُس بیچاری پر رحم آتا ہے تو ٹھہرا زنخا۔ بیوی کے قابل ہی نہیں ہے"

"زنخا نہیں۔ ہیجڑا گالی دینے کے لیے بھی سلیقہ چاہیئے"

"ہیجڑا نہیں زنخا ہے تو"

"تو ہیجڑا ہے"

"تو زنخا ہے"

"ہیجڑا!"

"زنخا!"

یہ بحث نہ جانے کب تک چلتی رہتی کہ ایک گرجدار آواز آئی

"اے زنخا یا ہیجڑا، دونوں اپنے اپنے ملک واپس جائیں" سنتری نے ایک سرحد کے پار سے پکارا

"اے پرانے پاپیوں" دوسری سرحد کے پار سے بھی آواز آئی۔

باقی صفحہ ۱۰۳ پر

کشور حسین

پھول واٹکا

پھول واٹکا اداس ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے غبار چھایا رہتا ہے۔ منظر دھندلا... دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے سب بے سواد ہو گیا۔ جیسے آکاش نے رنگ اور دھرتی نے روپ پہننا چھوڑ دیا۔

رات دن بھیانک سپنے دیکھتی ہے پھول واٹکا۔ شاید اسے یقین ہو گیا ہے کہ وہ وقت آ پہنچا۔

وقت کے قدموں کی مدھم آہٹ اسی دن سنائی دینے لگی تھی۔ جس دن بنجر کوکھ والی منیرا پلاسٹر کے بچوں اور میوزیم کو بھول بیٹھی۔ اس نے لوک لاج ایک طرف دھر عرب کے کاتب رشتے سے شادی کر لی۔

پھول واٹکا کو یاد ہے پلاسٹر کے ماڈل اور میوزیم منیرا کو جان سے زیادہ پیارے تھے۔ وہ اس کی لمبی ویران اور کٹھن یاترا کا حاصل تھے۔ اب اس کی نظر میں ان دونوں کے بغیر زندگی بے معنی تھی اور دنیا بے کار۔ زندگی اور دنیا سے گھبرا کر ہی اس نے پلاسٹر کے بچوں اور میوزیم میں پناہ لی تھی۔ اپنی بیتی زندگی کی کڑوی چھپا لی تھی اپنے فن کی نامراد مراد پالی تھی۔

پھول واٹکا نہیں بھولی:

منیرا شام ڈھلتے ہی رنگین بگھی کو دھکیلتی ہوئی اس کے پاس سے گزرتی۔ اس میں کھلے پھولوں کو افسردہ نظروں سے دیکھتی ان کا مقابلہ بگھی میں سجے پلاسٹر کے بچوں سے کرتی۔ لدی پھندی باٹکا جانتی تھی کہ منیرا کے دل پہ کیا گزرتی ہے۔ لیکن وہ اسی میں فخر محسوس کرتی کہ منیرا اس کی گود میں مچلتے پھولوں کو کس تمنا سے دیکھتی ہے۔

پھول واٹکا واقعی اداس ہے۔

لوگوں کی طرح واٹکا کو بھی یقین تھا کہ منیرا کی لگن سچی ہے۔ دنیا بھر کے فقیروں اور ڈاکٹروں کو آزمانے کے بعد اس نے جو راہ اپنائی ہے وہ اسے نہیں چھوڑے گی، زندگی بھر بانجھ کوکھ کا سوگ منائے گی۔ آئندہ کسی مرد کے پاس نہیں جائے گی۔ پلاسٹر کے نت نئے ماڈل بنا کر میوزیم میں سجائے گی۔ مرے گی تو قصبے میں ایک مثال چھوڑ جائے گی۔ پلاسٹر کے بچوں اور میوزیم والی منیرا ایک دن دیومالائی کردار بن جائے گی۔

واٹکا نے کبھی یہ سپنا بھی دیکھا تھا۔

لوگ منیرا کی سمادھی بنائیں گے۔ اسے پھول پتوں سے سجائیں گے۔ سمادھی پر کنواریاں ہر شکروار جوت جلایا کریں گی۔ سہاگنیں پرساد چڑھائیں گی۔ کنواریاں ور مانگیں گی اور سہاگنیں اولاد۔

اس کو یقین تھا ہجر کی آگ میں جل کر راکھ ہو جانے والے کی دعا جیت کرنے والوں کا وصال کرا دیتی ہے اور زندگی بھر بانجھ کوکھ کا سوگ منانے والی عورت کا آشیرواد ممتا کی گود ہری کر دیتا ہے۔

قصبے کی مٹیاروں کو منیرا سے اتھاہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے اس کی آتما کو رجھانے کے لئے گیت بن لئے تھے۔ گیتوں او ہتاں میں ڈھال دیا تھا۔ وہ تو منیرا کے پرلوک سدھارنے کے انتظار میں تھیں۔ کب یہ شریر کے بندھن سے مکت ہو۔ کب ہم اس کی آرتی اتارنا شروع کریں۔ انہوں نے اس کی سمادھی بنانے کے لئے رقم بھی اکٹھی کر لی تھی۔ ستی ساوتری کی کیرتی اس کے مرنے کے بعد پھیلتی ہے۔ گلی کی پاروچاچی اکثر کہتی ہے۔ منیشہ دیہہ میں جیسی ہم ویسی وہ ——

لیکن منیرا اچانک اپنی راہ چھوڑ بیٹھی - سب کچھ بھول کر کلنے شیخ سے ناطہ جوڑ بیٹھی - اس نے اپنا اجاڑ چہرہ، ویران ارمانوں سے سجا لیا - جو اس کا اپنا تھا اسے کھو دیا - جو اس کا نہیں اسے اپنے سے لپٹا لیا -

اب منیرا واٹکا کے پاس سے گزرتے وقت اس پر نظر تک نہیں ڈالتی - وہ شیخ کی چھدری داڑھی کو دیکھتی ہوئی اپنی مردہ مسکراہٹ سے اپنے کو بہلانے اور شیخ کو لبھانے کا جتن کرتی - ہوئی گذر جاتی ہے - اسے واٹکا میں پھیلی ہریالی کا خیال آتا ہے نہ وہاں کی جھومتی رنگوں کی بہار کا -

بات منیرا تک رہتی تو بات نہ تھی -

کاشی بائی مندر جانا بھول بیٹھی - کچھ بھی باقی نہ رہا، نہ وہ مندر کی مرمریں سیڑھیاں نہ کاشی بائی کی پازیب سے پھوٹتا مدھر سنگیت - ایک فضا تھی جو مٹ گئی، سرسراہٹ، گنگناہٹ، مسکراہٹ ؟

کاشی بائی کو پھولوں سے محبت تھی اور دیوتا میں عقیدت - وہ صبح سویرے واٹکا کی مخملی گھاس پر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چلتی تو آس پاس جھوم اٹھتا - شاخیں مہکنے لگتیں، پھول مچل پڑتے - ان کی یہی تمنا کہ شاخ کی گود سے کود کر کاشی بائی کے ہاتھ میں پکڑے چاندی کے کٹورے میں جا بیٹھیں — دیوتا کے چرنوں میں پہنچنے کا راستہ۔

پھول واٹکا سٹ پٹانے لگی -

منیرا بانجھ تھی، کاشی بائی بے اولاد نہ تھی -

سانولی سلونی بڑی بڑی آنکھوں والی سدابہار جوانی ! لوگ کہتے کاشی بائی دو جن بھر بچے جن کر بھی بوڑھی نہ لگے، صاف ملائم چہرہ تنا ہوا بدن، کسا ہوا سینہ - اپنے سے باہر نکلتا ہوا وجود — جو بھی دیکھتا اس کی آنکھ انگ انگ پھیلتی ہوئی کاشی بائی کے جوبن کو اپنے میں پورے کا پورا سمو لینے کے لئے بے چین ہو اٹھتی -

کاشی بائی کے بچے بھی کم پیارے نہ تھے - اڑوس پڑوس والے انہیں دلارتے نہ تھکتے - ان کی موہنی صورتوں میں کھو کر رہ جاتے - انہیں اپنے گھر لے جا کر مٹھائی اور پھل کھلاتے، دودھ اور شربت پلاتے -

نگوڑی کا مرد اپنی قسمت کو سراہتا نہ تھکتا - کاشی بائی — صبحِ بنارس، شامِ اودھ، — واسنا اور پوترتا کا سنگم ! رات بھر نشے کی بوتل بنی رہنے کے بعد صبح ہوتے کاشی بائی ہاتھ میں چاندی کا کٹورا پکڑے واٹکا کی طرف چلتی تو اس کے مرد کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا۔ حسن کی دیوی — وفا کی پتلی — .

واٹکا کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کاشی بائی بہک جائے گی -

ایک صبح وہ کاشی بائی کا انتظار کرتی رہی - بائی نہ آئی — دوپہر ہو گئی وہ نہ آئی - شام پڑنے تک اس نے اپنی صورت نہ دکھائی - نراش ہو کر واٹکا نے آنکھیں موند لیں - اور رات کی سیاہی اوڑھتے ہوئے سونے کی تیاری کرنے لگی - شاید بائی بیمار ہو گئی —

لیکن آدھی رات بیتتے ہی واٹکا چونک اٹھی - ناگن اپنے مرد اور بچوں کو ایک طرف رکھ بوڑھے مرلی دھر کے ساتھ ایک کیاری کے پاس بنچ پر بیٹھی کسمسا رہی تھی -

"بائی تو اداس نہ ہو -"

مرلی دھر کی آواز سن کر واٹکا تڑپ اٹھی -

"میرے پاس کس چیز کی کمی ہے - تو منیرا اور شیخ کو دیکھ کر دل چھوٹا نہ کر - میرا سب کچھ لے لے - بس مجھے اپنی دیہہ کا سکھ اور ایک آدھ ......"

واٹکا کو اپنے کانوں پر یقین آیا نہ اپنی آنکھ پر :

کہاں کاشی بائی کا گرو کہاں پولا پلپلا مرلی دھر !

تبھی مرلی دھر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور جیب سے کنگن نکال کر کاشی بائی کی کلائیاں سجا دیں - اس نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا اور بائی کے گلے میں چندن ہار جگمگا اٹھا -

"سنہری تپتی پر ہیرے موتی نہ چمکیں تو دھات گہنا نہیں کہلاتی کسی کا من نہیں بہلاتی - تم سب سمجھتی ہو — روپ اور سنگار !

تھوڑی دیر بعد مرلی دھر کاشی بائی کی کمر میں ہاتھ ڈالے، واٹکا کے چوکیدار کی کوٹھری کی طرف جا رہا تھا - چوکیدار کوٹھری میں بچھے میلے بستر کو سجانے کے لئے ادھ کھلے پھول توڑ رہا تھا - واٹکا کے جی میں آیا وہ مالی کو پکارے، لیکن اس وقت مالی کہاں، وہ تو کب کا رخصت ہو چکا - اب تو وہ صبح کو آئے گا — مالی اور چوکیدار !

نراش ہو کر واٹکا مرلی دھر کو کوسنے لگی -

حرامی کی دھوتی کے نیچے کوڑھ پھوٹا پڑا ہے - اس کی اپنی بیوی سے

ہولی اولادمیں سے کوئی بچا نہیں - اس بیچاری کے چہرے پر گھناؤنے داغ اور بھیانک چکتے ابھر آئے ہیں - مردوداب کاشی بائی کی کندن کایا کو داغدار کرنے لگا - لیکن کاشی بائی - !

اسے کیا ہوگیا - اپنے دیوتا سے وشواس گھات کر بیٹھی -

وائکا چیخ اٹھی -

ماں متا کے سرخ لہو میں پیلاہٹ کیوں لہرا اٹھی - ؟

وہ کاشی بائی کی کھوج میں دور نکل گئی - اس کے ماں باپ تک پہنچتے ہی ٹھٹک گئی -

ابھاگن کے اندر ابھی تک مائیکا زندہ ہے -

وائکا کا گلا رُندھ گیا :

بھروسے اور عقیدت کا زمانہ لد گیا -

آس مراد والی کاشی بائی، نامراد منیرا دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہو گئیں -

وہ رات اور آج کی بات - وائکا کے کانوں میں ہر پل نزدیک آتے وقت کی آہٹ - آہٹ جو دھمک میں بدلنے لگی - وائکا کے وجود میں دہشت بن کر ڈھلنے لگی - ان چاہے سپنے کی صورت پلنے لگی

اب غبار نہیں چھٹتا، منظر نہیں بدلتا - وائکا دیکھتی ہے -

وائکا بدستور دیکھتی ہے -

صبح ہوئی تو پودے پھولوں سے خالی تھے - پتے ہریالی سے عاری، شاخیں اپنی لوچ کھو چکی تھیں - تنے کی کھال ادھڑ گئی تھی اور کیاری کا سینہ پھٹ گیا تھا - چاروں کونوں میں کھڑے درختوں پر بسیرا کرنے والی چڑیاں پتہ نہیں کہاں چلی گئی تھیں - ان کی جگہ بیٹھے کوّے آنکھ کا منکا گھما گھما کر وائکا میں پھیلی ویرانی کو دیکھ رہے تھے

وائکا دیکھتی ہے :

چوکیدار نے مالی کو اندر آنے سے روک دیا - وہ ڈنڈا اٹھائے اس کی طرف لپکا - اُسے دھکیلتا ہوا جنوبی دیوار کے ساتھ کھدی کھائی کی طرف لے جانے لگا - مالی کے کندھے پر رکھا توڑا پھٹ گیا - اس میں بھری کھاد پتھریلی سڑک پر بکھر گئی -

وائکا بند آنکھوں سے دیکھتی ہے -

مشرقی دروازہ پر چتکبرا سانڈ کھڑا ہے - وہ دم اٹھائے ہنکار رہا ہے - وائکا میں موج منانے کے لئے آنے والے بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو للکار رہا ہے - اپنے ملیے نوکیلے سینگ دکھا کر ڈرا رہا ہے ادھر ادھر ہلتا ہوا اپنا ڈیل ڈول دکھا رہا ہے -

مغربی دروازے پر کھڑا بھینسا بند کواڑوں کو سرخ آنکھوں سے گھور رہا ہے - جیسے ابھی ٹکر مارے گا - وائکا کے در و دیوار اکھاڑ دیگا

وائکا نے دیکھنا بند نہیں کیا -

شام کی کالکھ چاروں طرف بکھر گئی ہے - بچوں کے منہ پر چھا گئی ہے - جوانوں کے دلوں میں بس گئی ہے - لوگ اداس اداس لوٹ رہے ہیں — دوشیزائیں اپنی کھلکھلاہٹ کو مارے، گرہ لئے قہقہوں کو دبائے، بچے معصومیت کو جیب میں چھپائے — ایک خوف ہے جو ہر کسی کو ہانکے جا رہا ہے — ایک دہشت جو ہر کسی کو گھر میں دُبک جانے کو کہتی ہے - وائکا سے پرے رہنے کو کہتی ہے —

دیکھتے ہی دیکھتے سانڈ اور بھینسا وائکا میں گھس گئے چوکیدار نے اُن کے سینگوں میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے - سانڈ بچوں کے لئے گڑے جھولے کے ساتھ اپنا جسم رگڑنے لگا - بھینسا کیاریوں کو روندتا ہوا پودے چبانے لگا - تبھی درختوں پر بیٹھے کوّے پھڑ پھڑا کے - انہوں نے پھول وائکا میں اترتے الّو کے لئے جگہ چھوڑ دی —

آل رسول نظمی

کالا سورج

"رشک ارم" اپنے نام کی ساری خوبیوں کا حامل ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ واقع یہ خوبصورت باغیچہ گویا یہاں کے باشندوں کی زندہ دلی کا نشان ہے۔

رنگ و بو، تازگی و فرحت، جسے ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ ہر دل محسوس کر سکتا ہے۔ باغ کے وسط میں ایک بڑا سا حوض ہے جس کا پانی دن میں نیلا اور رات کو مونگیا ہو جاتا ہے۔ سفید پتھر کا ہشت پہل فوارہ یوں لگتا ہے جیسے آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹا ہے اور پانی کی سطح پر آکر تھم گیا ہے۔ پانی سے چمٹے ہوئے بڑے بڑے بیضوی پتے جن پر ٹیکے ہوئے سفید اور گلابی کنول گویا میخانے کی بلوریں میز پر خالی جام رکھے ہوں ——— حوض کے چاروں طرف چکنے سنگریزوں سے بنی ہوئی بنچیں جن کے پائے زمین میں پیوست ہیں۔ ان بنچوں کے پیچھے دونوں طرف سبزہ زار جن کی ہری دوب سورج کی گردش کے ساتھ اپنا رنگ بدلتی ہے۔ ان کے کنارے کنارے بھی ہے رنگ و بو کی محفل۔ اُتر کی طرف بیلے موگرے کا تختہ ہے جس سے لگی ہوئی چمیلی کی باڑھ ہے۔ جنگلی پھلواری کی کیاریاں ذرا ہٹ کر ہیں جن میں جا بجا رات کی رانی لگی ہوئی ہے۔ سفید گچھے جب مہکتے ہیں تو لگتا ہے بغیر خوشبو کے یہ سارے رنگ برنگے جنگلی پھول بھی مہک اٹھے ہیں۔ ایک طرف پتلے پتلے بانسوں کے سہارے "دن کے راجا" کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ لمبے پتّوں والی یہ بیل صرف رات کے وقت پھلتی پھولتی اور مہکتی ہے۔ پھر بھی جانے کیوں اسے "دن کا راجا" کہا جاتا ہے دکھن کی طرف گلاب کے تختے ہیں۔ دور سے دیکھئے تو لگتا ہے کسی نے ہری چادر میں رنگ برنگے ستارے ٹانک دیئے ہیں۔ ان تختوں کے کنارے مور پنکھی کے خوشنما پودے لگے ہوئے ہیں۔ "رشک ارم" کی دیواریں مہندی کی باڑھوں سے بنائی گئی ہے۔ اندر کی طرف دس دس فٹ کے فاصلے پر چکنے تنے والے یوکلپٹس کھڑے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ہر لان میں گل مہر کے پانچ پانچ پیڑ لگائے گئے ہیں۔ پتوں سے بے نیاز ان درختوں پر جب جوبن آتا ہے تو لگتا ہے آسمان سے لالی برس رہی ہے۔ "آتش گل" کی تشبیہ شائد اسی درخت سے لی گئی ہے۔

گل مہر کی ننگی ٹہنیوں پر اکثر و بیشتر مکڑیاں جالے تان لیتی ہیں۔ بڑے بڑے گول جالوں کے تار سورج کی روشنی میں سات رنگوں میں چمکتے ہیں۔ پھول کی کیاریوں کے اوپر منڈلاتی چھوٹی بڑی تتلیاں ایک عجیب سماں باندھ دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے نازک پنکھڑیوں کے پر لگ گئے ہوں۔ سیاہ چمکتے ہوئے رنگ کے بھونرے گنگناتے ہوئے کیاری کیاری تختے تختے گھومتے رہتے ہیں۔

سورج اپنا سفر پورا کر کے مغرب کی جانب جھکتا گیا۔ تتلیوں کی پرواز مدھم پڑتی گئی۔ سفید کنول کے پیالے کی تہہ میں ایک بڑا سا بھونرا نہ جانے کب سے گم سم بیٹھا ہوا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ اس کے گرد پنکھڑیوں کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی لذت ایسا سرور کس کام کا جس کے لئے آزادی قربان کرنی پڑے۔ مگر نادان بھونرا اس وقت کنول کے حسن میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنے مستقبل کی کوئی فکر ہی نہیں تھی۔

سورج گردن تک زمین میں غرق ہو گیا۔ رشک ارم میں بلبلوں کے

چہچہے خاموش ہوگئے۔ حوض کے سارے کنول اپنی آنکھیں موند چکے۔ انھیں میں سے ایک کنول میں وہ بھونرا ابھی بند تھا جو پل بھر کی مسرت کے لئے اپنی آزادی کھو بیٹھا تھا۔

سورج کی پہلی کرن دبے پاؤں زمین پر اتر آئی۔ ہلکی ہلکی ہوا میں پودے اور پھول جھوم اٹھے۔ کلیوں نے اپنی پلکیں کھول دیں۔ رشک ارم میں بلبلوں کی سیٹیاں گونج اٹھیں۔ کسی بڑے درخت کے گھنے پتوں میں چھپی ہوئی کوئل نے "اٹھو اٹھو" کی صدا لگائی۔ حوض کی سطح پر ننھی ننھی لہریں کنول کے پتوں کو جھولا جھلانے لگیں۔

اجالے نے پھولوں کی اس دنیا میں چاروں طرف سونا سا بکھیر دیا سورج کی کرن نے بڑھ کر کنول کے ہونٹ چوم لئے۔ روشنی کا بوسہ پا کر کنول نے آنکھیں کھول دیں۔ اور خوابیدہ سی انگڑائی لی۔ رات کے قیدی بھونرے کو تازہ ہوا اور روشنی نے آزادی کا پیغام دیا۔ اجالے کو چھو لینے کے جوش میں سیہ فام بھونرے نے بڑے زور کی اڑان بھری مگر دوسرے ہی لمحے اس کا آزادی کا خواب چکنا چور ہوگیا۔ گل مہر کی ننگی ٹہنی میں تنے ہوئے ایک بڑے سے جالے میں اس کے ننھے ننھے پر الجھے تو الجھتے ہی چلے گئے۔ مکڑی کے جالے کے سارے تار جھنجھنا اٹھے۔ دہشت زدہ بھونرے نے اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ وہاں تو چھوٹے بڑے بہت سے قیدی موجود تھے۔ کچھ قید و بند کی تکلیفوں سے آزاد ہوکر ابدی نیند سو چکے تھے اور کچھ میں ابھی حرکت باقی تھی۔

بڑا شکار پھنستے دیکھ کر مکڑی اپنی ٹانگیں پھیلا کر ان پر خوشی سے جھولنے لگی۔ بھونرے نے اپنے قریب کے قیدی سے سرگوشی کی۔

"کب پھنسے اس جال میں؟"

"پھنسا نہیں، دو دن پہلے قسمت نے پھنسا دیا۔"

"تو آزادی کی جد و جہد کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسے کروں؟ پورا بدن تو تاروں میں جکڑا ہوا ہے اور پھر میں اکیلا ہی تو نہیں دوسرے قیدی بھی یہاں ہیں۔"

بھونرے نے دوسرے قیدیوں کو آواز دی۔ آزادی کی آواز مگر وہ سب اپنی اپنی جگہ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ مکڑی نے بڑی مہارت کے ساتھ ان کی بندش کی تھی۔ بھونرے نے نظریں پھیر کر پہلے تو دور ٹانگیں پھیلا کر ان پر خوشی سے جھولتی ہوئی مکڑی کو دیکھا اور پھر ان قیدیوں کے سوکھے ہوئے لاشوں کو جو آزادی کی حسرت میں زندگی کی قید سے آزاد ہوگئے تھے۔ اسی وقت نسیم سحر کا ایک تیز جھونکا بھونرے کو پھولوں کی خوشبو سے معطر کر گیا۔

زندگی، آزادی، خوشبو.....!

بھونرے نے اپنی ساری طاقت کو مجتمع کر کے یکبارگی جو زور لگایا تو قید خانے کے تار بکھر گئے۔ سارے قیدی چھوٹ نکلے۔ ان کے لئے آج آزادی کا نیا سویرا طلوع ہوا تھا۔ آزادی کا تابندہ سورج تھا سیہ فام بھونرا درخت کی ٹہنی پر بیٹھی ہوئی مکڑی اپنی ٹانگیں سیکڑے خاموشی سے اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھ رہی تھی۔

مراٹھی افسانہ

و۔ پ۔ کالے
ڈاکٹر عبدالستار دلوی

گاندھاری

اُس کی کمر کے گرد حلقہ ڈالتے ہوئے وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ وہ خوش تھا کہ اسے اپنی مرضی اور دلی خواہش کے مطابق بیوی مل گئی تھی۔ لیکن وہ ناراض ہی تھی کہ اس کی شادی اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق نہیں ہوئی۔ وہ اس بات کا اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ جتنی چاہیے اتنی خوش نہیں تھی۔ لیکن اسے اس کی فکر نہ تھی، اس کا روٹھنا وہ دور کرسکتا ہے۔ اس کا اسے پورا یقین تھا۔ اگرچہ اس نے اب تک یہ نہیں کہا تھا لیکن اس کی ناراضگی کے سُر وہ سمجھ سکتا تھا۔ چھونے کی خواہش نہ ہونے کا جذبہ بغیر کہے بھی جانا جاسکتا ہے۔ باوجود اس کے وہ مزے میں تھا۔ پہلی رات کی چند گھنٹوں کی تنہائی ملنے پر اس کا یہ روٹھنا کہیں سے کہیں چلا جائے گا۔ اس کا اسے پورا یقین تھا۔ اس لئے اس کی ناپسندیدگی اس کا تمسخر اڑا رہی تھی۔

اس نے اسے پلنگ پر بٹھایا۔ پھولوں کی لڑیوں سے سجے سجائے پلنگ نے اس پر خوشبو کی بارش کر دی پھر اس نے دروازہ بند کرلیا۔ شمع گل کر دی اور وہ اس کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔

وہ دور کھسک گئی جس وقت اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت وہ ناراض بھی نہ ہوئی۔ یہ بات جوں ہی اس کے ذہن میں ابھری تو وہ ہنس پڑا۔

"تیرا غصہ ابھی دور نہیں ہوا ؟" اُس نے سوال کیا۔ صاف صاف جواب دیا جائے یا نہیں، وہ پس و پیش میں پڑ گئی، لیکن جو کچھ محسوس ہو رہا ہے وہ کہہ دینے کا بھی یہی موقع تھا۔ شاید آئندہ ساری زندگی میں اس نے اگر یہ سوال نہیں پوچھا تو ؟ کسی سوال کا جواب دینے کا موقع ایک ہی مرتبہ آتا ہے ایسا لمحہ ہاتھ سے نکل جانے دیا نہیں جاتا۔ یہ خیال آتے ہی وہ جواب دینا چاہتی تھی۔ اسی اثنا میں اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ صاف صاف جواب دیکر اب میں کیا حاصل کرلوں گی ؟ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو گی۔ پھر انہیں ٹھیس پہنچا کر کیا کر دوں ! اب قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتا ! قسمت میں نابینا شوہر ملنا لکھا تھا، سو مل گیا! اب زندگی بھر اس کا ساتھ ہے۔ اب بھاگ کے کہاں جاؤں گی ؟ کیسے جاؤں گی ؟

اس کے خیالات کا سلسلہ درمیان ہی میں ٹوٹ گیا۔ وہ پوچھ رہا تھا

"تجھے میری طرح اندھا شوہر نہیں چاہیئے تھا اس کا مجھے اندازہ تھا تو اب صاف صاف نہ بھی کہہ دے تو میں سمجھ چکا ہوں۔ لیکن اگر تو میرے دل کی پوچھے، تو مجھے تیری ہی طرح کی بیوی چاہیئے تھی۔"........ اس کی پیشانی پر ہلکا سا بل آگیا۔ اس طرح بل آنے میں کوئی دھوکا نہ تھا۔ کمرے میں کوئی تیسرا نہ تھا اس کے علاوہ وہ اندھا تھا اور پھر اس نے کچھ دیر پہلے دیا بھی بجھا دیا تھا............ اسے اس حالت میں بھی ہنسی آگئی۔ اس نے دیا بجھا دیا اندھے شخص کے لئے کیا روشنی اور کیا اندھیرا ؟ جنم کے وقت سے اس کا تنہا ساتھی، وہ یعنی اندھیرا۔ ساتھی !!۔ اس کے خیالات کا چکر اس لفظ کے پاس آکر رک گیا ! یہ کیسا ساتھ ؟ اس اندھے کا ساتھ مجھے۔ اور میرا اسے......

کیا مجھے یہ سمجھنے کی کوشش کرے گی ! تجھ سے مجھے آج بے حد بات کرنی ہیں۔ لیکن کچھ دیر تو اپنا غصہ الگ رکھ۔ میرا نظریہ کیا ہے، وہ سن۔ تجھے اگر ایسا لگے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سو فیصدی سچ ہے۔ تو آج اتنا میرے لئے کافی ہے سُن رہی ہو نا ؟ اس نے بے صبری سے پوچھا۔ میں اس کی بات سن رہی ہوں یا نہیں یہ جاننے کی اسے کس قدر بے چینی ہوتی، وہ یہ جان گئی۔ ایسی بھوک تو بینا آدمی کو ہوتی ہے، لیکن وہ تو دراصل اندھا۔

.........اسے اس لمحے اس پر ترس آیا۔ اس کا ہاتھ ہاتھ میں آنے کیلئے بڑی دیر تک وہ ٹٹولتا رہا۔ آخر ہاتھ میں ہاتھ آگیا۔ اس کے مس کرنے سے، جوش سے، اس کی مجبوری کا اسے اندازہ ہوگیا، بالکل جانے انجانے۔ اور مدد سے اٹھی ہوئی ہوک سے اس کا جسم لرز گیا ؟

.... اس نے اسے بالکل اپنے قریب کھینچ لیا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے اس کا

سر اس نے اپنے سینے سے دبائے رکھا اور ہلکے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں پونچھنے کی کوشش کی۔ اسے سکھ مل گیا۔ اس کا جسمانی نقص وہ کچھ دیر کے لئے بھول گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ خود کو بہت بڑا سہارا مل گیا۔ اس کی امید بندھ گئی کہ اپنا بھی اب سلسلہ چل سکے گا۔

چھو لینے کا جادو اپا ممتا کی کیمیا۔ کئی سال سے اسے اتنے پیار سے کسی نے قریب نہیں لیا تھا۔ یعنی ماں کے انتقال کے بعد سے تو نہیں، بالکل نہیں۔ دو بھائی تھے۔ لیکن تھے وہ اپنے آپ ہی میں مگن! چاہت کے نام کے لفظ سے وہ دونوں ناآشنا تھے۔ ورنہ اندھے سے میرا رشتہ جوڑتے ہوئے انہوں نے سوچا ہوتا۔ والد کا اچانک انتقال ہو گیا اور دونوں بھائیوں کو اپنی من مانی کرنے کے لئے پوری آزادی مل گئی۔ اندھے کے گلے بہن کو باندھتے ہوئے وہ ذرا بھی جھجکے؟

.... یہ کیسے کون جانے، یہ دکھ درد اور یہ لاپرواہی انہیں اب یہاں... نہیں تھی۔ اس کا شو لیتے ہوئے مس کرنا، اس سے گویا تھا۔ جس کا آنکھوں سے اس نے اظہار کیا ہوتا۔ وہ جو کہے کہہ رہا تھا اس کے چھونے کی قوت کا اسے اندازہ ہوا۔ انگلیوں کا ہنر، ہاتھوں کا گداز وہ سمجھ گئی۔

.... ستار پر آسانی سے رواں دواں یہی وہ ہاتھ، سُروں کے جھولے پر مجبور کرنے والی یہی انگلیاں، آواز کی بے کراں عظیم دنیا آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دینے والا یہی وہ اس کا ہاتھ!

میں اچھے ہاتھوں آ گئی، اسے لگا اور وہ اس سے لپٹ گئی۔

اسے یوں محسوس ہوا گویا کوئی نئی چیز اس کے ہاتھ لگ گئی۔ وہ اس طرح سکھ سے ہمکنار ہوا۔ بے چین ہو کے وہ کچھ کہے کہ وہ بول اٹھی، تم بڑی قابلیت کے مالک ہو۔ میں ہی تمہیں زیب نہیں دیتی۔ مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں تمہیں مل سکتی تھیں۔ وہ بھی بینا۔ مجھ جیسی نابینا کو تم نے کیوں قبول کیا؟ خود کو تم نے دھوکا کیوں دیا۔؟

.... وہ ہنس کر کہنے لگا۔

دھوکا مجھے نہیں ہوا۔ دھوکا تمہارے ساتھ کیا میں نے۔

.... وہ چونک پڑی اور اس سے تھوڑی دور ہٹ گئی۔ وہ اسی لے میں آگے کہہ پڑا۔

"تجھے اندھا شوہر نہیں چاہئے تھا، میں جانتا تھا، تجھے آنکھوں والا شوہر چاہئے تھا اور وہ تجھے یقیناً مل جاتا"

.... اس تذکرے سے اسے بے حد دلی صدمہ پہنچا۔ کسی زمانے میں بنے ہوئے خواب اسے یاد آئے۔ ان خوابوں میں ایک بے حد امیر اور لکھ پتی شخص اس سے نسبت جوڑتا ہے۔ اس کی شادی ہو جاتی ہے، اسے وہ بہت دور کہیں پردیس میں لے جاتا ہے۔ پانی کی طرح روپیہ بہا کر اس کی آنکھوں کی جراحی کراتا ہے اور اس سے محروم دنیا اس کے اپنے حسن کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کر دیتا ہے۔

.... وہ آگے کہہ رہا تھا، تو بے حد حسین ہے یہ میں جانتا ہوں۔ میں نے تیرے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور جب سے وہ سنا ہے اس وقت سے ٹھان لی تھی کہ تیرے ہی ساتھ شادی کی جائے۔"

.... حسین بیوی کا شوہر بننے کی خواہش اندھے آدمی کے دل میں بھی موجزن ہوتی ہو گی کیا؟..... یہ خیال بلاوجہ اس کے ذہن میں پیدا ہوا۔ اس خیال کی سچائی کو آزمانے کی خواہش سے بے بس ہو کر اس نے پوچھا

"ایسا فیصلہ تم نے کیوں کیا؟ میں اگر حسین ہوں تو اس کا سکھ دکھ تمہیں کیا؟

"اس کے آگے تمہارا جو پچھتاوا ہوتا اسے روکنے کا اطمینان"

اسے اس جواب سے بے حد تکلیف ہوئی۔

میرا پچھتاوا؟ کون کرنے والا تھا؟

"اب تک جو کرتے آئے وہ"

کون؟

"آنکھوں والے لوگ"

اس کا وہ جواب جس قدر غیر متوقع تھا اتنا ہی حقیقت پر مبنی بھی تھا۔ لیکن اسے عجیب لگا کہ اسے یہ جواب اپنی ہی طرح ایک اندھے سے ملا شاید اس کے پیچھے آنکھوں والے لوگوں میں رہنے والا..... تعصب بھی ہو۔ ایسا تعصب دراصل اس میں ہونا چاہئے تھا دونوں بھائی اُس کے ساتھ عادساز رویہ رکھتے۔ اسی لئے اسے ایک اندھا شوہر نہیں چاہئے تھا لیکن اسکی قسمت میں وہی تھا۔ اب وہ بھائیوں کو نیچا نہیں دکھا سکی تھی۔ وہ اب مزید کچھ بولی اسی لے میں اس نے پوچھا

"آنکھ والوں پر تمہارا اسقدر غصہ کیوں؟"

تیرا بھی تو ہے ہی۔ مجھ جیسے کے گلے باندھ کر تیرے بھائیوں نے تجھے آخر پھنسایا یا نہیں؟

.... اس نے بات الٹ دی۔ وہ پھر خاموش ہو گئی۔ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اس نے کہا۔

"درست تیرا پچھتاوا (دھوکا) ختم ہو چکا ہے۔ تیرے گھر میں تو محفوظ رہے گی۔ تجھے دھوکا دینے کا خیال میرے سپنوں میں بھی نہیں آ سکتا تیرا حسن میں دیکھ نہیں پاؤں گا۔ لیکن اس لئے میں تجھے دھوکا بھی نہ دے سکوں گا۔ کسی لکھ پتی نے تجھے قبول بھی کر لیا ہوتا۔ لیکن کسی وقت ایسی ہی کوئی عورت تیرے سامنے نچائی ہوتی، پھر تو کیا کرتی؟ تیرا دکھ تو نے کس سے کہا ہوتا؟ گنتی کہاں ہوتی؟ سوچ لے۔ اس گھر میں ویسا نہیں ہو گا کیونکہ ایسا کچھ کرنے کے لئے میرے پاس نظر ہی نہیں"

"......... اسکے کہیں شدید درد کبھی اٹھا، لیکن وہ سکھ بھی پا گئی" اس نے کہا۔

"تیرے ساتھ بہت ساری باتیں کرنی ہیں   میں

میرا نظریہ تجھے سمجھانے والا ہوں۔ اگر وہ تیری سمجھ میں آ گیا تو سنسار میں ہمارے لئے کسی بھی چیز کی کمی نہ ہوگی۔ تیرے میرے سنسار میں دکھ نام کی کوئی بھی چیز نہیں رہے گی۔ جہاں زندگی سے متعلق مختلف پہلو ہیں، وہیں دکھ بھی ہیں جہاں فریب ہیں وہاں ناکامیاں بھی ہیں۔ جہاں ایک دوسرے کو دیکھنے والی نظر پاک نہیں وہاں بے اطمینانی ہے۔ اپنے سنسار میں وہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم دونوں بھی ہیں ایسے! ہماری آنکھیں نہیں ہیں اس لئے غلط انداز نظروں سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بہت بڑی موہ لینے والی دنیا ہم سے کوسوں دور ہے اور اسی لئے ہم سکھی ہیں۔ تجھے معلوم نہیں رہی، پر پہلا دکھ آتا ہے وہ آنکھوں ہی کی راہ سے۔ پہلی چاہ نظر کی۔ یہ نظر ایک بار بگڑ جائے کہ آدمی بگڑا گیا کام سے گیا۔ آنکھ والے لوگوں سے دوسروں کا سکھ دیکھا نہیں جاتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پاپ نظر کا ہوتا ہے وہ غلط نہیں۔ ظاہری دنیا کی کشش و سجاوٹ پر بھولا ہوا شخص خود میں جھانک کر دیکھ ہی نہیں سکتا۔ پاپ کی طرف تیزی سے لے جاتی ہے وہ نظر۔ کہتے ہیں آدمی کا کیا ہوا ظلم آدمی ہی سے نہیں دیکھا جاتا۔ تیرے میرے راج میں اس کشش کے لئے جگہ نہیں یہاں اپنے سنسار میں جو حسن ہے وہ حرف لے اور سُر کے روپ میں۔ سُروں کی دنیا سُر انسان کو کبھی دھوکا نہیں دیتے بشرطیکہ ہمیشہ ہی سچے ہوتے ہیں۔ ہم نے اسے ٹھیک ترتیب دیا کہ وہ سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ سُروں کو مرتب کرنے یا جانے والا شخص جتنا سچا، جس قدر ایماندار جتنا مستحکم ہو اتنا ہی مستحکم اس کا سُر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھے میری طرح ایک اندھی بیوی کی ضرورت تھی۔ اندھوں کا سکھ دکھ اندھا ہی جان سکتا ہے۔ بینا لوگ اندھے پر صرف ترس ہی کھا سکتے ہیں۔ اور ہم پر مسلسل ترس کھایا جائے اس سے زیادہ افسوس ناک کوئی بات نہیں۔ مجھے وہ دکھ ٹالنا تھا۔ کسی بھی عورت نے میرے ساتھ شادی کی بھی ہوتی۔ آج میرے پاس دولت ہے، دروازے پر موٹر ہے اور سات ہجری کی میوزک کے کنٹریکٹ بھی ہیں۔ کس بات کی کمی ہے؟ اس وقت مجھے بیوی مل جاتی، لیکن مجھ پر ترس کرتے اس نے میرے ساتھ دنیا بنائی ہوتی۔ وہ مجھے نہیں چاہیے تھا۔ مجھے صرف تو چاہیئے تھی۔ اس لئے کہ میرے اندر کی آنکھ کو فقط تو نظر آتی ہے۔ جس طرح ستار کے تاروں کا ارتعاش مجھے نظر آتا ہے، سُر نظر آتا ہے، راگ نظر آتا ہے راگنیاں نظر آتی ہیں، ویسی ہی تو نظر آتی ہے۔ کسی راگنی کی طرح پاک و صاف! بتا مجھے کس بات کی کمی ہے؟ اور تجھے بھی کیا کم ہے؟

وہ اس سے لپٹ گئی، جوش سے، سکون و اطمینان سے، جس طرح گیت کے کسی لفظ سے سُر لپٹ جائیں یا معنی اس میں سمو جائے اس طرح۔

اسے کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی، وہ اچھے ہاتھوں میں آ گئی تھی "گاندھاری"، دھرت راشٹر کی بیوی تھی۔ شادی کے وقت اسے معلوم ہوا کہ دھرت راشٹر پیدائشی اندھا ہے۔ اپنا شوہر اگر دیکھ نہیں سکتا تو نصف بہتر کی حیثیت سے مجھے بھی دیکھنے کا حق نہیں پہنچتا، یہ سوچ کر اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنی آنکھیں باندھ رکھیں

مراٹھی افسانہ

ہری نارائن آپٹے
بدیع الزماں خاور

خاصی ترکیب

صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ دفتر جانے کے لئے نکلنے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ وامن راؤ باہر سے آئے تو سیدھے باورچی خانے میں گھس گئے اور آنندی بائی سے غسل کے لئے پانی نکالنے کو کہہ کر جلدی جلدی میں بالاخانے کی طرف لپکے آخری سیڑھی پر سے ان کا پاؤں پھسلتے پھسلتے رُک نہ جاتا تو ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ گئی ہوتی۔ انہوں نے پگڑی کھونٹی پر لٹکا دی اور دھوتی الگنی پر رکھ کر انگرکھے کے بند کھولنے شروع کئے تھے کہ آنندی بائی نے اوپر آ کر بتایا کہ پانی تیار ہے۔

"اوہ — اتنی جلدی نکال بھی دیا۔ ذرا میرے نیچے آنے تک رکھا رہنے دیا ہوتا — اب تو وہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔"

آنندی بائی وامن راؤ کے مزاج سے خوب اچھی طرح واقف تھیں اگر پانی نہ نکالوں تو یہ ادھر سے بھی بولیں گے، یہ سوچ کر انہوں نے آدھا پانی خالی کر کے باقی گرم پانی ویسا ہی چولہے پر رکھ چھوڑا تھا۔ وامن راؤ کی بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے وہ خاموشی کے ساتھ کوٹھی پر سے اتر آئیں۔ اُن کے پیچھے وامن راؤ بھی زینہ دھڑ دھڑاتے ہوئے نیچے آئے انہوں نے کسی طرح دو لوٹے پانی بدن پر ڈال لیا۔ دھوتی لپیٹی اور جا کر چولہے پر بیٹھ گئے۔ آنندی بائی نے تھالی لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔

"یہ کھانا کون کھائے گا؟ مٹھّے کے جیسا ٹھنڈا لگ رہا ہے — اور یہ گھر میں کتنا دھواں پھیلا رکھا ہے،" عادت کے مطابق وامن راؤ نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ پھر شاید یہ خیال کر کے کہ محض آواز چڑھانے سے کام نہیں چلے گا، انہوں نے آنکھیں نکالنے کی بھی کوشش کی مگر دھوئیں کی وجہ سے وہ اپنی آنکھوں کو بڑا نہ کر سکے۔

"ابھی کھانا پکے کوئی دیر بھی تو نہیں ہوئی ہے۔" آنندی بائی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "یہ لکڑیاں پھونکتے پھونکتے تو ناک میں دم آ جاتا ہے۔ سب گیلے گٹھر اٹھا کر دیئے ہیں۔ اس موئے لکڑی والے سے تو — ذرا اس سے کہہ کر سوکھی دیکھ لیا ہوتا ...."

"ایک، کیا ہزار بار کہہ چکا ہوں۔ مگر اس کی وہی رفتار ہے۔ ٹھہرو اب کی بار اس کے پیسے ہی کاٹ لیتا ہوں، نہیں تو کوئی نئی ٹال دیکھنی پڑے گی۔ حرام خوروں کو بس دیتے رہو پیسے دیتے جاؤ — اُف یہ آلو تو سب کے سب کچے ہیں۔ میرے سامنے رکھنے سے پہلے ذرا ان کو خود چکھ کر دیکھ لیا ہوتا تو کیا بگڑ جاتا۔ آپ بڑی موٹی ہو گئی ہو مگر کھانا پک کر تیار ہوا ہے یا نہیں، یہ بھی دیکھنا نہیں آتا ہے تم کو۔"

"بات یہ ہے کہ آلو بالکل خراب نکلے۔ کافی دیر سے میں نے چولھے پر چڑھا رکھے تھے مگر......"

"چپ رہو! اوپر سے باتیں کر رہی ہو۔ جب پکے نہیں تھے تو ان کو اور کچھ دیر چولہے پر ہی رہنے دینا چاہئے تھا..." "اچھا ڈاکیئے نے آج کوئی خط لا کر تو نہیں دیا۔ مگر شاید وہ کمبخت ابھی ادھر سے گذرا ہی نہیں ہوگا اسے بھی کیسا سیدھا کئے دیتا ہوں دیکھ لینا۔ ذرا آنے تو دو۔"

—— اتنے میں ڈاکیئے نے آ کر ایک خط چھوڑ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ وامن راؤ اُسے سیدھا کرنے کی نیت سے اس پر لفظوں کی بوچھار کرنے وہ وہاں سے آگے بڑھ چکا تھا۔ آنندی بائی نے وہ خط اٹھا لیا اور اسے وامن راؤ کے ہاتھ میں تھما کر یہ جاننے کے اشتیاق میں کہ خط کس کا ہے خود وہیں کھڑی رہیں۔ اور وامن راؤ کا منہ تکنے لگیں۔ وامن راؤ نے ایک نظر میں پورا خط دیکھ لیا اور اسے بیوی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بھائی کی طرف سے آیا ہے۔ بعد میں راگھو سے پڑھوا لینا چاہے تو۔"

آنندی بائی نے خط ایک کونے میں رکھ دیا — اسی اثنا میں گنو روتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے باورچی خانے ہی میں سے 'ٹھہر بیٹا — آتی ہوں —— مت رو —' کہہ کر چپ کراتی ہوئی وہ وامن راؤ کو کھانا کھلانے میں جٹی رہیں۔

"اسے یہ چلانے کے لئے کیا ہو گیا ہے؟" زرد زرد کر میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔" دامن راؤ برس پڑے۔

"اس کے بدن میں حرارت ہے" کہہ کر آنندی بائی نے گنو کو اٹھا لیا اور جس کپڑے پر اسے اٹھایا تھا وہی اس کے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر اسے لئے ہوئے آہستہ آہستہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہلنے لگیں۔

ذرا بدن گرم ہوا تو اس میں چلانے کی کونسی بات ہے تم عورتوں کے اس حد سے زیادہ لاڈ پیار ہی سے تو بچوں کی عادتیں بگڑ جاتی ہیں۔ ایسا کہہ کر دامن راؤ نے گنو کو سدھارنے کے ارادے سے اسے ایک زوردار ڈانٹ پلائی مگر وہ ڈھائی سال کا ننھا سا بچہ اپنی اصلاح کے لئے کھوج نکالی ہوئی اپنے باپ کی اس انوکھی ترکیب کو کہاں سے سمجھتا۔ وہ اور بھی زور زور سے رونے لگا۔ آنندی بائی کے دل کو بہت برا لگا۔ انھیں یاد آیا کہ دامن راؤ کو ایک بار پہلے بخار آیا تھا، تب کیسے انہوں نے سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ مگر وہ سمجھدار تھیں اس لئے منہ سے کچھ نہ بولیں۔ گنو کو گود میں رکھ کر اسے تھپتھپاتی ہوئی باورچی خانے میں بیٹھ گئیں۔

دامن راؤ کھانے سے فارغ ہوئے تو انہوں نے انگرکھا پہن لیا اور پگڑی سر پر چڑھا لی۔ مگر دوشالہ ان کو کھونٹی پر نظر نہیں آیا تو وہ پھر بگڑ گئے۔

"کیا واہیات بچہ ہے یہ! کوئی چیز ٹھکانے سے رہنے نہیں دیتا جب دیکھو تب گھر میں اودھم مچائے رہتا ہے ---- دامو! میرے دوشالہ کس نے اٹھایا یہاں سے؟"

دامن راؤ دوشالہ ڈھونڈتے ہوئے ایک طرف منہ سے بڑبڑا رہے تھے اور دوسری طرف ایک ایک کپڑا اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینک رہے تھے اس لئے بچے گھر میں کس طرح گڑبڑی پھیلاتے ہیں اس کا ایک عمدہ نمونہ دیکھنے کا موقع دامو کے ہاتھ آ گیا تھا۔

"یہ رہا آپ کا دوشالہ، آپ باہر سے آئے تب آپ نے ہی اسے روزانہ کی طرح یہاں کرسی پر رکھ دیا تھا۔ کسی نے ہاتھ تک لگایا نہیں ہے بالکل ویسا ہی پڑا ہوا تھا۔" دامو نے دوشالہ دامن راؤ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کتنا زبان دراز ہو گیا ہے رے تو؟" دامن راؤ دامو کو گھورتے ہوئے بولے "ویسا ہی پڑا ہوا تھا" نالائق کو اتنی بھی عقل نہیں آئی کہ اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتا۔"

دامن راؤ کرتے کے بٹن لگاتے ہوئے تیزی سے زینہ اترنے لگے ایک بٹن غائب دیکھا تو انھیں یاد آیا کہ کل شام انہوں نے بیوی سے کرتے میں بٹن لگانے کو کہا تھا۔

"تم کو تو کرتے میں بٹن ٹانکنے کیلئے وقت ہی نہیں ملا ہوگا۔"

"صبح لگانے والی تھی۔ مگر گنو رات بھر کھانستا رہا اس لئے سویرے ذرا آنکھ لگ گئی تو اٹھنے میں دیر ہوئی اور جلدی جلدی سب کام نپٹانے پڑے۔ آج شام ----"

"تم کو تو بہانے تراشنا خوب آتا ہے کاش کبھی کوئی کام تم نے وقت پر بھی کر دکھایا ہوتا۔" دامن راؤ بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے اور خدا خدا کر کے مصیبت ٹل گئی۔

دامن راؤ کے آخری الفاظ آنندی بائی کے نرم و نازک دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئے اور وہ بے اختیار رو پڑیں۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر کو کوئی تکلیف نہ ہو اور وہ ہمیشہ خوش رہے یہی ان کی دلی خواہش تھی وہ دامن راؤ کے آرام و اطمینان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتی تھیں مگر دامن راؤ تھے کہ ان کے ہر کام میں کیڑے نکال کر ان کو تڑپایا کرتے تھے۔ دامن راؤ کو اپنی بیوی سے محبت نہیں تھی ایسی بات نہیں تھی یا یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی کو جان بوجھ کر تکلیف دیا کرتے تھے۔ بلکہ وہ اپنے طور پر تو یہ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی بیوی کو عام قاعدے اور ضرورت سے زیادہ سکھ پہنچا رہے ہیں۔ کھانے پینے، کپڑے لتے اور زیور گہنے کے معاملے میں وہ آنندی بائی کو ہر طرح سکھی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ان کی کچھ عادتوں سے آنندی بائی بہت پریشان تھیں۔ ایک تو وہ قدم قدم پر دوسروں کی غلطیاں ڈھونڈتے اور دوسرے یہ کہ ان کو معمولی معمولی باتوں پر گرم ہو جانے اور چراغ پا ہونے کی عادت پڑ گئی تھی۔ اور ان کی ان عادتوں کی وجہ سے ہی اکثر و بیشتر ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی آنندی بائی کا دل دکھنے لگتا تھا۔ آنندی بائی اپنے شوہر کی عادتیں جانتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے کبھی دامن راؤ کے سامنے اپنے کسی دکھ کا اظہار نہیں کیا تھا سب دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھیں اور جب ان کے دل میں بہت سے دکھ جمع ہو جاتے تو وہ رہ رہ کر آنکھوں کے راستے باہر نکلنے لگتے تھے۔

آنسوؤں کی ایک موج آ کر گذر گئی تو آنندی بائی کو کونے میں رکھے ہوئے اپنے بھائی کے خط کی یاد آئی۔ انہوں نے خط پڑھنے کے لئے دامو کو آواز دی

آنندی بائی کے میکے کا گاؤں کافی دور تھا ان کی شادی کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں ان کے باپ کا انتقال ہوا تھا اور پھر جلدی ہی ان کی ماں بھی چل بسی تھی۔ گاؤں میں ان کے چچا رہتے تھے مگر ان کا اور آنندی بائی کے باپ کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ اس لئے ان کی موت کے بعد سے خود آنندی بائی کو میکے جانے کے کوئی خاص مواقع نہیں ملتے تھے

ان کے میکے کے خاندان میں صرف ایک ہی فرد ایسا تھا جسے آنندی بائی سے سچی محبت تھی اور وہ تھے ان کے بڑے بھائی جن کا نام کیشو راؤ تھا۔

کیشو راؤ کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بے حد ذہین اور دور اندیش آدمی تھے۔ انہوں نے دامن راؤ کے مزاج کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور دو سال پہلے، آنندی بائی کی ایک بیٹی کی موت پر جب وہ اپنی بہن سے ملنے آئے تھے تب انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھ لیا تھا انہوں نے بہت چاہا اور کوشش بھی کی کہ وہ جس شہر میں نوکری کرتے تھے آنندی بائی وہاں اُن کے ساتھ رہ کر کچھ دن صبر و سکون سے گذاریں۔ انہوں نے اس سلسلے میں دامن راؤ کو کئی بار خط بھی لکھا تھا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ آنندی بائی لیے پی کے مزاج سے خوب واقف تھیں۔ ان کے گھر میں رہتے ہوئے بھی دامن راؤ کسی لازم کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور کوئی ان کے پاس ٹک نہ پاتا تھا تو نہ جانے ان کی غیر موجودگی میں کیا ہوتا؟ ــــــ اس لئے خود آنندی بائی کا دل بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ دامن راؤ کو چھوڑ کر کہیں چلی جائیں۔ انھیں اس طرح کے تصور ہی سے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔

خط کچھ زیادہ طویل نہیں تھا۔ بہت اختصار کے ساتھ چند باتیں لکھی تھیں اس میں جیسے "بہت دنوں سے خط نہیں آیا اس لئے میں فکر مند ہوں ہمارے چچا زاد چچا کاشی ناتھ کاکا جو کاشی میں رہتے ہیں، شائد جس دن یہ خط ملے گا اسی روز وہاں پہنچ جائیں گے۔ وہ آنکھوں کی تکلیف اور سردی بخار سے بیمار ہیں اور علاج کی غرض سے آرہے ہیں۔ ممکن ہے وہ چار چھ روز وہاں قیام کریں۔ اُن کا خیال رکھیئے۔ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے وہ چڑ چڑ کریں تو بُرا نہ مانیئے۔ پانچ چھ دنوں کے بعد میں خود بھی وہاں آنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں" وغیرہ وغیرہ۔

آنندی بائی کو اپنے بڑے بھائی کے آنے کی خبر سن کر تو بے حد خوشی ہوئی مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کاشی ناتھ کاکا کون ہیں؟ انہوں نے کاشی میں رہنے والے اپنے کسی چچیرے چچا کا نام اس سے پہلے کبھی سنا نہیں تھا۔ اس لئے یہ خیال کر کے کہ وہ کوئی دور کے رشتے کے چچا ہوں گے انہوں نے اپنے سوئے ہوئے بچے کو بستر پر لٹا دیا اور خود کھانا کھانے کے لئے اٹھیں۔

دامو کی عمر کوئی نو دس سال کی ہوگی مگر عمر کے لحاظ سے وہ کافی سیانا اور سمجھدار تھا۔ وہ کئی بار اپنی ماں کو روتا دیکھ چکا تھا۔ جب وہ خط پڑھنے کے لئے آیا تب آنندی بائی اپنی آنکھیں پونچھ چکی تھیں پھر بھی دامو ان کے چہرے سے یہ تاڑے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے آنے سے پہلے وہ کافی دیر تک روتی رہی ہیں اور جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے خط پڑھتے وقت دامو کے دل میں بھی ماں کے رونے کا سبب جاننے کی معصوم خواہش بار بار چٹکیاں لیتی رہی۔ اور آخر جب آنندی بائی کھانے کے لئے بیٹھیں تو اس نے پوچھ لیا۔ "ماں! کیا آج بابا نے پھر بہت ڈانٹا ہے تم کو؟ کیا آج میں دفتر سے آنے پر بتا دوں کہ تم دوپہر میں بہت رو رہی تھیں۔"؟

"پگلا کہیں کا! اس میں اُن کو بتانے جیسی کیا بات ہے"۔ آنندی بائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہے کیوں نہیں! تم ہمیشہ اسی طرح روتی رہی ہو ماں۔ میں آج بابا سے کہہ دوں گا کہ آپ ماں کو ڈانٹتے ہیں تو ماں کو بُرا لگتا ہے اور وہ مسلسل روتی رہتی ہے۔"

"ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا ہاں! ورنہ تیرا کیا بھروسہ؟ سچ مچ بتا بھی دے گا ـــــ ارے تجھ سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو کیا تیرے ماسٹر جی تجھے ڈانٹتے نہیں ہیں؟ ـــــ اور ہاں، یہ تو بیٹھا کیا ہے، تجھے اسکول جانا ہے نا؟"

اسکول جانے میں دیر ہو رہی ہے، دامو یہ بات خط پڑھنے کی دھن میں بالکل بھول گیا تھا۔ وہ ماں کے یاد دلانے پر فوراً دوڑا دوڑا بالاخانے پر گیا اور ایک ہاتھ میں بستہ اور دوسرے ہاتھ میں ٹوپی لئے اسکول جانے کے لئے اتنی تیزی سے بھاگا کہ شائد اس نے آنندی بائی کے یہ الفاظ کہ "بیٹا دوڑنا نہیں ورنہ گر جائے گا"۔ صاف سُنے بھی نہیں ہوں گے۔

آج دامن راؤ کو گھر لوٹنے میں رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ بج گئے۔ اتفاق سے ان کے دفتر کا ایک کلرک بیمار رہنے کے باعث رخصت پر تھا۔ مجبوراً اس کے حصے کا کام بھی دامن راؤ ہی کو دیکھنا پڑا۔ اس لئے وہ جب گھر آئے تو بے حد تھکے ہوئے تھے آتے ہی بالاخانے پر گئے مگر وہاں پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کسی کا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔ اور اسی میں ہوا یہ کہ فرش پر کوئی چیز گری ہوئی تھی جس کی وجہ سے انھیں ٹھوکر بھی لگی۔ بس پھر کیا تھا۔ اُن کا ماتھا ٹھنک کر رہ گیا۔ وہ ایک دم بھڑک کر بیوی بچوں کو صلواتیں سنانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ کاشی ناتھ کاکا جو لحاف اوڑھے گدی پر لیٹے تھے یکبارگی چیخ اُٹھے؛ ـــ "دامن راؤ! ذرا دروازہ تو بند کر لو ـــ ہا ہا ہا کتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ مگر اس گھر میں کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ذرا دروازہ لگا لے ـــــ ہُو، ہُو ہُو ـــ کتنی سردی لگ رہی ہے۔ اور یہ نیچے نہ جانے کون بڑ بڑا رہا ہے۔" پھر انہوں نے آنندی بائی کو ان کے میکے کے نام سے پکارتے ہوئے کہا: "سیتھو! ذرا اس گنو کو تو چپ کرا دو ـــ اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ میں یہاں رہوں تو صاف طور پر سن لو کہ مجھ سے یہ شور و غل برداشت نہیں ہو سکتا۔ جب دیکھو تب ہیں ہیں، ریں ریں چلتی رہتی ہے اور ہاں کاڑھا تیار ہوا یا نہیں۔ مگر تو نے تو اب تک بنایا ہی نہیں ہوگا۔ اگر بنایا ہے تو لے آ دیکھوں۔ ذرا گرم گرم پی لوں۔ شائد اسی سے پسینہ نکل آئے

وامن راؤ نے یہ سب سنا تو بالکل ہکا بکا ہوکر رہ گئے اور سوچنے لگے کہ آخر یہ سبز عینک پوش داڑھی والا بڈھا کون ہو سکتا ہے؟ انہوں نے آنندی بائی سے پوچھنے کے لئے نیچے جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ آنندی بائی کارٹھا لئے ہوئے اوپر آئیں۔ انہوں نے وامن راؤ کو بتایا کہ "نیچے پاؤں دھونے کا پانی رکھدیا ہے"۔ کاشی ناتھ کاکا کو تو کھانا کھانا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے پہلے ہی ساگو دانے کی کھیر خوب سیر ہوکر کھالی تھی۔ رامو نے بھی اسکول سے آتے ہی کھانا کھالیا تھا۔ اس لئے وامن راؤ اکیلے ہی فوراً نیچے چلے گئے۔

"یہ بڈھا کون ہے ؟" وامن راؤ نے نیچے آتے ہی ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"کاشی ناتھ کاکا ہیں۔ اور کون ہے؟ صبح دادا کا خط آیا تھا نا۔"

"ہوں۔ تو یہی تمہارے چچا زاد چچا ہیں۔ کتنا بدتمیز اور بدمزاج ہے یہ بڈھا!"

آنندی بائی پہلے ہی سے خوف زدہ تھیں کہ ان کے شوہر گھر آئے مہمان سے کوئی جھگڑا نہ کر بیٹھیں۔ اب جو انہوں نے وامن راؤ کی تیوری چڑھی ہوئی دیکھی تو ان کا یہ خوف اور بھی بڑھ گیا۔ اور انہوں نے اس متوقع ہنگامے کو ٹالنے کے ارادے سے سرگوشی کے انداز میں وامن راؤ کو سمجھایا: "بوڑھے آدمی ہیں اور دادا نے بھی تو لکھا ہے اس لئے ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیجیے۔"

"بڈھا ہے تو کیا ہوا؟ آخر یہ کیسا چڑچڑا پن ہے کہ دوسروں کی تکلیف کا بھی احساس نہ رہے۔"

آنندی بائی آگے کچھ نہ بولیں۔ وامن راؤ نے کھانے پر کوئی خاص ہنگامہ نہیں مچایا۔ انہیں رہ رہ کر کاشی ناتھ کاکا کے مزاج پر تعجب ہو رہا تھا دوسرے کے گھر میں اور ایسی کچ کچ۔ توبہ توبہ۔ یہ آدمی ہے یا کچھ اور۔ یہ بڈھا چار پانچ روز یہاں رہے گا تو اس کی دوا دارو اور کھانے پینے پر کچھ نہ کچھ خرچ کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے یہ جلدی چلا جائے تو اچھا ہے۔ اس قسم کا کوئی بیہودہ خیال تو وامن راؤ کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ ان کی مالی حالت کافی اچھی تھی البتہ یہ سوچ کر وہ بے حد پریشان ہوئے کہ ایسے چڑچڑے اور بدمزاج مہمان کی وجہ سے ان کو اور ان کی بیوی کو چند روز خواہ مخواہ تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

وامن راؤ آج خوب تھکے ہوئے تھے اس لئے رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ بالاخانے پر چلے گئے۔ ابھی وہ ایک آرام کرسی سرکا کر اس پر دراز ہوئے ہی تھے کہ کاشی ناتھ کاکا کی بکواس شروع ہوگئی: "وامن راؤ یہ تمہاری کرسی بھی کتنا شور مچارہی ہے — ؟ —— ہاں اب کیسے ٹھیک بیٹھ گئے — ! ہچ ہچ .... ایک آواز بند نہیں ہوئی کہ دوسری سنائی دینے لگتی ہے۔ ارے دامو! یہ تو کتنے زور زور سے چلّا رہا ہے کہیں پڑھائی بھی ایسے کی جاتی ہوگی ؟ اور یہ گنو! اس کمبخت کو تو معلوم ہوتا ہے رونے کے سوا کچھ اور آتا ہی نہیں ہے۔ میں آنکھوں کی تکلیف اور سردی کے علاج کے لئے یہاں آیا ہوں۔ مگر نہ جانے اس گھر میں رہ کر میرا کیا حشر ہونے والا ہے؟"

"گنو کچھ زیادہ تو روتا نہیں۔ آج اُسے بخار ہے۔ اس لئے ذرا بے چین ہے۔" وامن راؤ اپنے بچے کی حمایت کرتے ہوئے بولے۔ دامو نے چونکہ اسکول سے آتے ہی کھانا کھالیا اس لئے آنندی بائی اس سے یہ کہنے کے لئے کہ "اگر بھوک لگ رہی ہے تو چل کر دو لقمے اور کھالے" اوپر کی سیڑھی پر آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بچے کے بارے میں اپنے شوہر کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سن لئے تو انھیں صبح کا واقعہ یاد آیا۔ اور وہ دل ہی دل میں ہنس پڑیں۔ وہ دروازے کے باہر آکر کھڑی ہوئی ہی تھیں کہ ان کا ہاتھ لگنے کی وجہ سے دروازہ بج اٹھا۔ کاشی ناتھ کاکا کو تو بس یہی چاہیئے تھا۔ وہ فوراً برس پڑے۔ "یہ دروازہ بھی کتنا بج رہا ہے۔ اس کے قبضوں میں کبھی تیل بھی دیا جاتا ہے یا نہیں کون جانے ؟ مجھے سکون اور خاموشی کی ضرورت ہے۔ یہاں تو شور و غل کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہوتا ہے۔ دراصل گھر کے ان سب چھوٹے موٹے کاموں کی نگرانی عورتوں کو کرنی چاہیئے۔ مگر اس گھر میں کسی کام کا سر ہے نہ پیر۔ لگتا ہے میتھو بہت سست ہوگئی ہے۔"

"نہیں تو! وہ بیچاری تو یہ بھی نہیں جانتی کہ سستی کس چڑیا کا نام ہے؛ گھر کا کام کاج کرتے کرتے ایک دم نڈھال ہو جاتی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے گنو بھی بیمار رہنے لگا ہے۔ اس لئے ذرا بھی فرصت نہیں ملتی۔ کبھی سکون سے بیٹھنا تک نصیب نہیں ہوتا۔" وامن راؤ نے محبت سے بیوی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔

رات کافی گذر چکی تھی مگر کاشی ناتھ کاکا کی بکواس بدستور جاری تھی وامن راؤ اسی انتظار میں تھے کہ کاکا کی زبان بند ہو تو سویا جائے۔ دو ایک بار تو انہوں نے بگڑنے کا عزم بھی کیا مگر مروت کے مارے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ آخر کچھ بھی ہوا تو کاشی ناتھ کاکا اُن کے سسر لگتے تھے۔ آدھی رات گئے کاشی ناتھ کاکا کو نیند آنے لگی تو انہوں نے سب کو سونے کی اجازت دی مگر سوتے سوتے یہ تاکید کرنا نہیں بھولے کہ گنو کو کسی صورت میں رونے نہیں دیا جائے۔

آنندی بائی کے کمرے میں آنے کے بعد ان کے اور وامن راؤ کے درمیان پھر اس بوڑھے کے بارے میں بات چیت ہوئی تب وامن راؤ محبت آمیز لہجے میں بولے۔ "یہ بوڑھا! اسی طرح دن رات تمہارا دماغ چاٹتا رہے گا تو تم اس کی خدمت کیا خاک کر سکو گی۔؟"

میرے لئے یہ کونسی نئی بات ہے؟ عورتوں کو شادی کے بعد تو

ان باتوں کی عادت پڑ جاتی ہے۔" آنندی بائی کے منہ سے یک بہ یک، یہ الفاظ نکل تو گئے مگر انہوں نے فوراً جھجکیاہٹ میں اپنی زبان کاٹ لی۔

"میرے لئے یہ کونسی نئی بات ہے۔" آنندی بائی کے یہ الفاظ سنتے ہی دامن راؤ جیسے ہڑبڑا کر چونک اٹھے اور سوچنے لگے کہ آخر ایسا کہنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے! کیا میں بھی اسی بوڑھے کاکا کے جیسا ہوں! دامن راؤ کے لئے تو خواب میں بھی یہ سوچنا مشکل تھا کہ ان کی وجہ سے آنندی بائی کو کوئی تکلیف ہوئی ہوگی۔ مگر اب وہ مسلسل بس یہی سوچنے لگے کہ آنندی بائی کوئی ایسی عورت نہیں ہے کہ یوں ہی ترنگ میں آکر ایسے الفاظ کہے۔ کچھ بھی سہی ان کا دل اس رات بہت بے چین رہا۔ اور انہوں نے آئندہ خود ہی بیوی کے ساتھ اپنے برتاؤ پر کڑی نظر رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

دو تین دن ہو گئے کاشی ناتھ کاکا بستر پر ہی پڑے رہتے تھے مگر اس کے باوجود ان کی وجہ سے سارا گھر عذاب اور تکلیف میں مبتلا تھا۔ دامن راؤ ان کے برتاؤ سے اپنے سلوک کا اندر ہی اندر موازنہ کرتے رہتے۔ آہستہ آہستہ خود انھیں اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگا۔ اور اس خیال سے دل ہی دل میں پشیمان ہوئے کہ وہ اپنی غریب بیوی کو اب تک بیکار تکلیف دیتے آئے۔

پانچویں دن کاشی ناتھ کاکا نے اپنی گٹھری سنبھالی اور آنندی بائی سے کہا "میرے یہاں رہنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ ایسے میں رہ کر میرا تندرست ہونا تو دور کی بات ہے کہیں میں اور زیادہ بیمار نہ پڑ جاؤں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔" آنندی بائی نے بہت اصرار کیا اور چاہا کہ وہ چند دن اور رہ کر بالکل اچھے ہو لیں تب چلے جائیں۔ مگر کاشی ناتھ کاکا اب کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ بس گٹھری اٹھائی اور تڑاق پڑاق گھر سے نکل کر چل دیئے۔ دامن راؤ تو دل سے یہی چاہتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ انہوں نے کوئی اصرار نہیں کیا۔ ان کو تو کاشی ناتھ کاکا کے جاتے ہی لگا، چلو اچھا ہوا سر سے بلا ٹل گئی۔

جس دن کاشی ناتھ کاکا گئے اسی دن شام کو کیشو راؤ آئے جب انھیں کاکا کے جانے کی بات معلوم ہوئی تو بولے: "اچھا تو کاکا آج صبح ہی چلے گئے۔"

"ہاں۔"

"مگر وہ جب تک یہاں رہے آپ لوگوں کی خوب دل لگی رہی ہوگی۔"

دامن راؤ یہ سنتے ہی بول اٹھے۔

"ہاں ہاں بہت دل لگی ہوئی! اجی جناب وہ آپ کے چچا ہوتے ہیں اور آپ نے لکھا تھا اس لئے اتنے دن یہاں رہ پائے۔ مگر آئندہ میں ان کو اپنے گھر میں قدم تک نہ رکھنے دوں گا۔"

"گھر میں قدم تک نہ رکھنے دیں گے آپ ان کو؟" کیشو راؤ نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"جی ہرگز نہیں ـــــ انھیں دوسروں میں کیڑے نکالنے اور چیخنے چلانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ میں نے ان کے جیسا بد مزاج اور چڑچڑا آدمی دنیا بھر میں نہیں دیکھا ہوگا۔"

"مگر میرے خیال سے تو یہ عیب عام ہے اور ہر کسی میں ہوتا ہے۔" کیشو راؤ نے مسکرا کر آنندی بائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہر کسی میں ہو یا نہ ہو مگر مجھ میں یہ عیب ضرور تھا۔ کاشی ناتھ کاکا کے آنے سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے اپنے عیب کا پتہ چل گیا اور میرے مزاج میں تبدیلی آئی۔" دامن راؤ نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"تب تو یہ بہت اچھی بات ہوئی ـــ"

"ارے، یہ آواز تو کاشی ناتھ کاکا کی جان پڑتی ہے۔" دامن راؤ یہ کہکر حیرت سے کیشو راؤ کا منہ تکنے لگے۔ انھیں کچھ شک سا محسوس ہوا۔ اور جب کیشو راؤ ذرا عجیب انداز سے ہنس پڑے تو ان کا شک یقین میں بدل گیا۔ اور بولے "لگتا ہے کاشی ناتھ کاکا ہی کیشو راؤ بن کر آئے ہیں" ـــــ کیشو راؤ یہ بات سن کر خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے ـــــ "معاف کیجیے۔۔ دو سال پہلے یہاں آیا تھا۔ اسی وقت میں نے آپ کی اصلاح کے خیال سے یہ ترکیب سوچ نکالی تھی۔ مگر اب تک کچھ ایسا مصروف رہا کہ بار بار ارادہ کرنے کے باوجود اسے عملی جامہ پہنا نہ سکا۔ بہرحال میں نے آپ کو جو تکلیف دی، اس کا برا نہ مانئے ... اور مجھے اپنے گھر میں قدم رکھنے دیتے رہیئے۔ یہی آپ سے میری التجا ہے۔ مجھے اس بات کی واقعی خوشی ہے کہ میری یہ ترکیب خاصی کارگر ثابت ہوئی۔"

کیشو راؤ کو ان کی محبت اور محنت کا پھل مل گیا تھا۔ ان کے لئے چونکہ دوسرے دن بہن کے یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں تھا اس لئے دامن راؤ نے اسی رات ان کی شاندار ضیافت کا اہتمام کرایا اور انھیں اپنے مزاج کی تبدیلی کا یقین دلا کر خوشی خوشی رخصت کر دیا۔



نارائن گنیش گورے
یونس اگاسکر

آہیں

جس لمحے کا خوف میرے ذہن پر عمر بھر سوار رہا وہ لمحہ آج میرے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔ لیکن میں نے اس لمحے کو جتنا بھیانک سمجھا تھا، اتنا بھیانک آج نہیں لگ رہا ہے۔ ایسا کیوں ؟ شاید خوفناک لمحات درحقیقت اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنا ہمارا تصور انہیں بنا دیتا ہے۔ لیکن اس سچّائی کو کیسے جھٹلا دوں کہ میری امیدوں کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مُرجھاتے رہے ہیں اور پندرہ سال تک چلنے والا یہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ عمر بھر میرا من آنسو بہاتا رہا اور اب آخری بار ہچکیاں لے رہا ہے۔ اب میں نہیں روؤں گی۔ جب تک تم رہے میرے ساتھ، تب تک امّیدیں اور آشائیں رہیں اور اسی لئے شکوے گلے ہوا کئے۔ اب کیسی آشائیں اور کیسے گلے ؟ اب کس کے خلاف شکایتیں ہوں گی ؟ آج جو میرے دل سے آہیں اٹھ رہی ہیں وہ تمہارے خلاف شکایت کے طور پر نہیں۔ میں تمہیں اس آخری لمحے میں کیسے دکھ پہنچا سکتی ہوں ؟ عورتوں کا یہ رونا تو ازلی ہے۔ اُرمِلا نے لکشمن، یشودھرا نے سدھارتھ کے لئے انہیں جذبات کا اظہار کیا تھا نا ؟ اس کا ان پر کیا اثر ہوا ؟

یہ لمحہ کتنا نازک ہے۔ دھوپ کی تیزی کم ہو چکی ہے اور سردیوں کے پیغامبر نرم ہوا چل رہی ہے اور اس کے جھونکے کھیتوں میں والی بیلوں کو کہنیاتے، ندی کے سینے پر کپکپی پیدا کرتے شوریشور کے مندر کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ سفید براق پھولوں کی مالاؤں سے ڈھکا ہوا تمہارا جسم کتنا لاغر نظر آ رہا ہے۔ آج صبح جب موت کی دیوی نے تمہارے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو تم مسکرا دیتے تھے۔ وہ مسکراہٹ، اب تک تمہارے چہرے سے چمٹی ہوئی ہے۔ تمہارے سنگِ مرمر جیسے سفید اور سرد ماتھے پر بکھرے بال ہوا سے ہل رہے ہیں۔ یہ شام کی ہلکی کرنیں، یہ ہوا کے نرم جھونکے، یہ تمہارا سرد جسم، تمہارے چہرے کی یہ مسکراہٹ، سامنے تیار ہو رہی چتا اور یہ سارا منظر حیران نگاہوں سے دیکھنے والے شہری کے ننھے ننھے ہاتھوں کا میرے کاندھوں کو محسوس ہونے والا لمس، ان سب باتوں کی وجہ سے میری آنکھیں نم ہوتی جا رہی ہیں۔

۔۔۔۔۔ لو وہ آخری لمحہ بھی آ پہنچا۔ اب تم چتا پر سو رہے ہو۔ اب لکڑیوں سے نہ صرف تمہارا جسم بلکہ چہرہ تک ڈھک گیا ہے۔ اب آگ کی لمبی لمبی زبانیں تمہیں اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں۔ یہ اگنی مجھ سے کہہ رہی ہے کہ آج سے تقریباً بیس برس پہلے میں نے اس کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دیا تھا، اب میں ہی اسے لے جا رہی ہوں جس وقت آگ کی پہلی لپیٹ نے تمہاری چتا پر سر ابھارا اور کالا دھواں اُوپر اُٹھا اس وقت میرے اندر ــــ میرے من میں ایسی ہل چل مچی جیسے سمندر میں طوفان آیا ہو۔ اس وقت آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور ان کی تپش سے میرے من کا سوگ بھاپ بن کر اُڑتا جا رہا ہے اور میں اندر سے خالی اور خشک ہوتی جا رہی ہوں۔ پہلے اُٹھنے والی درد کی لہریں ناقابلِ برداشت تھیں۔ لیکن اس خیال سے بڑی تسکین پہنچاتی تھی کہ یہ درد کا احساس میرے جذبات کے زندہ ہونے کی دلیل ہے ۔۔۔۔۔ لیکن اب اس اطمینان کی جگہ خوف لے رہا ہے۔ کسی اجاڑ مندر کے اندرونی حصّے میں داخل ہوتے وقت جیسا خوف محسوس ہوتا ہے ویسا ہی مجھے اپنے دل سے خوف آ رہا ہے۔

اب میں سچ مچ اکیلی ہو گئی۔ گذشتہ پندرہ سال سے میں تنہا ہی تھی لیکن ایک چاتک کی طرح چونچ کھولے تمہاری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ میں تمہیں سورج مان کر سورج مکھی کی طرح رخ پھیرتی رہی۔ مزاج تمہارا فراخ دلی سے تم اوروں کو پیار بانٹتے ہو وہ ... تمہارا پریم میرے حصّے میں بھی آنے کا۔ نوکری پر جاتے ... بورڈ پر پارٹی کے جلسے کی اطلاع اور تمہارا نام دیکھ کر ایک عجیب سی مسرت ہوتی ــــ ... آج شام کو جب تم گھر لوٹو گے

تو گھر ضرور آؤ گے۔ دوسرا من کہتا، تم کیسے آسکو گے بھلا؟ پھر بھی شام سے دیا بجھا کر تھکا ماندہ جسم بستر پر پھینکنے تک بیسوں مرتبہ دہلیز تک جاکر واپس آجایا کرتی تھی لیکن تمہیں یہ کب یاد رہتا تھا کہ دنیا میں کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ تمہیں لیموں کا شربت پسند تھا۔ آنگن کے لیموں کے پیڑ سے رس بھرے لیموں توڑتے وقت خیال آتا کہ آج تم آجاؤ تو کتنا لطف آئے گا۔ ہاں تم کبھی کبھار آبھی جایا کرتے تھے۔ آنگن میں آکر جب تم "کہیئے تاتیا" کہہ کر آواز لگاتے تو چولہے پر ابلتا دودھ چھوڑ کر میں اوپری منزل کی گیلری میں آکھڑی ہوتی تھی۔ میری خواہش ہوتی کہ پڑوس کے تاتیا کے یہاں اخلاقاً جھانک کر تم فوراً اوپر آجاؤ اور شریر شری کی دونوں باہیں تھام کر اسے اوپر اٹھالو اور مصنوعی غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہو "کیوں رے شریر! بہت بدمعاشیاں کرنے لگا ہے تو۔" پھر میری طرف دیکھ کر کہو۔ "اس کی خوب پٹائی کیا کرو۔" اور پھر میں جواب دوں "میری دھمکیوں کا کہیں اثر ہوسکتا ہے اس پر۔ بالکل آپ پر گیا ہے وہ۔" اور تم جواب دو "کس پر پڑا ہے یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے کھانا لگاؤ۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح سے پیٹ میں اناج نہیں گیا ہے۔" اور میں کھانا پروسنے میں لگ جاؤں۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ شری کے ساتھ ہم دونوں کی تصویر کھنچوائی جائے۔ تم نہیں تو تمہاری تصویر تو ساتھ رہا کرے گی۔ کبھی خواہش ہوتی کہ تینوں مل کر چند روز کے لئے کہیں رشتے داروں کے ہاں چلے جاتے۔ یہ نہیں تو کم از کم کسی شام کو گھر سے باہر سیر کو نکل جاتے۔ راستے میں کوئی دوست تمہیں روک کر چھیڑتا "آج یہ انقلاب کیسا؟ آج فرصت کیسے نصیب ہوگئی؟" یا مجھے کوئی سہیلی ستانے لگتی "آج دیوکاجی بہت خوش نظر آرہی ہیں۔" اور میں لاج کے مارے منہ چھپانے لگتی۔ خوشی سے مدہوش ہوجاتی۔ لیکن یہ سب ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ کتنی سادہ سی مانگیں تھیں میری لیکن ایک بھی پوری نہ کر سکے تم۔ میرے من کی بیل اوپر چڑھنے کے لئے سہارے ڈھونڈتی تھی۔ لیکن ہمارے جیون میں ایسے سہاروں کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا کہ تم صرف مجھ ہی سے اتنی رکھی کیوں برتتے ہو؟ کیسے برت سکتے ہو؟ کیا میں تمہاری بیوی تھی اس لئے؟ اگر میں کسی اور کی گھر والی ہوتی تو؟ کوئی بیوہ ہوتی تو؟ کوئی مطلقہ بلکہ کسی کی ہوس کا شکار بے سہارا عورت ہوتی تو کیا ہوتا؟ تم مجھ سے بڑے خلوص سے پیش آتے۔ مجھے نہ جانے کتنے پیرائے سے سمجھاتے اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے پر اکساتے۔ تن من پتھر کی سل بن کر پڑی ہوئی اہلیا کو نجات دلانے والے رام چندر جی نے گھر کی سیتا کو ایک پتھر کے سمان سمجھا اور دھتکار دیا۔ وہی کہانی دہرائی جارہی تھی۔

آج میرا تمہارے پیچھے بھاگنا ختم ہوگیا ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود بھی جسمانی اور ذہنی طور پر اس تعاقب سے تھک چکی تھی۔ تھک گئیں تم؟ یہ سوال تم ہرگز کرنے والے نہ تھے۔ اس لئے تھکن اور ٹوٹنے کا احساس اور شدید ہوگیا تھا۔ تمہارا سایہ بننے کی کوشش میں نے گزشتہ پندرہ سال سے مسلسل جاری رکھی تھی۔ مگر لوگ اس تعاقب کو تمہیں اپنے پنجۂ ہوس میں گرفتار کرنے کی کوشش قرار دیتے تھے۔ اور پھر کیوں تم خود بھی تو ایسا ہی محسوس کرتے تھے نا؟ جب تمہیں بھی اس کا یقین ہو چلا کہ تمہارا اور میرا رشتہ صید اور صیاد کا رشتہ ہے تو میرا دل گھائل ہو کے رہ گیا۔ تیر تو مجھے لگا تھا، تمہیں کون سا ضرر پہنچا؟ اپنا گھر سنسار سنوارنے کی خواہش میرے من میں تڑپ رہی تھی لیکن تمہیں تو ساری دنیا کا بگاڑ ختم کرنے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ تمہاری اس جدوجہد میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے اس لئے میں نے تم پر بوجھ نہ بننے کا فیصلہ کرلیا۔ سوچا میں پنکھ ٹوٹنے تک اڑتی پھروں گی۔ ایک ایک تنکا لاکر اپنا گھونسلا بناؤں گی اور پھر چہچہا کر تمہیں پکاروں گی۔ "میرے راجا آؤ نا۔ تم تھک گئے ہوں گے کچھ دیر سستا لو۔ چونچ سے چونچ ملاکر اور پروں میں پر ڈال کر کچھ دیر بیٹھیں آؤ۔ پھر تم دوبارہ کھلے آسمان کی سیر کرنے نکل جانا۔" بڑی مجنونانہ خواہش تھی میری۔ بھلا تمہیں کیوں اچھی لگنے لگی یہ خواہش۔ تم تو آشیاں کا سہارا لینا کھلے آسمان سے غداری کے مترادف سمجھتے تھے۔ پھر گھر تمہارے لئے قید خانہ کیوں نہ ہوتا۔

ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ مجھے ایسا لگا کہ میں کامیاب ہورہی ہوں جب میں تمہارے بازوؤں میں سماگئی تو مجھے ایسا لگا ساون میں آم پھل کر بور آیا ہے، بے تحاشا لٹا ہوا دھن مجھے واپس مل رہا ہے۔ اس روز تمہاری قربت سے میں اس طرح آسودہ ہوگئی تھی جیسے گرمیوں میں تپتی ہوئی دھرتی جو بارش کی جھڑی لگنے پر آسودہ ہوجاتی ہے لیکن صبح کو تمہارے سامنے چائے کی پیالی رکھتے وقت میں نے غور آنکھوں سے تمہاری آنکھوں میں جھانکا تو مجھے پتا چل گیا کہ میرا یہ اندازہ غلط تھا کہ تم میرے ہو چکے ہو۔ وہ ایک بھیانک خود فریبی تھی جس وقت میری آنکھوں میں اُنماد کے رنگ جھلک رہے تھے، تمہاری آنکھوں میں اپرادھ کی پرچھائیاں تھیں۔ میرے جسم میں خود سپردگی بجلی بن کر دوڑ رہی تھی۔ لیکن تمہارے جسم نے بھاری دان دے چکنے کے بعد طاری ہونے والی اداسی ٹپک رہی تھی۔ واقعی تم نے عرصے تک بچایا ہوا دان مجھ پر نچھاور کر دیا تھا اور بھاری اندوختہ کھو جانے پر اداس ہو بیٹھے تھے۔ اسی لمحہ مجھے پتہ چل گیا کہ جب آپس میں سچا پیار نہ ہو، ایک دوسرے کے جسم، ہاں گوشت پوست کے جسم کے لئے کشش نہ ہو، پیاس نہ ہو تو پتی پتنی کا سمبھوگ بھی گناہ ہوسکتا ہے، نہ ناٹھہر سکتا

ہے۔ جب اس بات کا احساس مجھے ہوا تو میرا من کرچی کرچی ہو کر رہ گیا۔
میں سچ کہوں۔ تمہارے دل میں جو خوف کا احساس سمایا ہوا تھا۔ اس کا بیج تمہارے اس عقیدہ میں پوشیدہ تھا کہ بھوگ ایک زہر ہے۔ اور استری بھوگ سب سے تباہ کن ہے۔ کبھی کبھار میرے من میں وچار پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں عورت پن کی جتنی توہین کی گئی ہے، اتنی دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوئی ہوگی۔ کوئی تمام عورتوں کو ماتا سمان ماننے کا اپدیش کرے گا تو کوئی ہر عورت کو فاحشہ تصور کرے گا۔ تم چونکہ سچے، نرم دل تھے جذباتی تھے، اس لئے میرے بشمول تمام عورتوں کو ماتا سمان سمجھنا چاہتے تھے لیکن اس کوشش میں تم میرے عورت پن کی توہین کر رہے تھے۔ اس کا خیال تم نے کبھی کیا تھا؟ میں پوچھتی ہوں ایسا کیوں سوچا جاتا ہے؟ مجھے کوئی بتائے کہ جائز سمبھوگ میں کون سی ناپاکی ہے۔ جہاں بلاتکار نہیں خود سپردگی ہے، فریب کے بجائے آپسی سمجھوتا ہے، جہاں صرف کشش نہیں بلکہ پریم کا آتم لوپ کر دینے والی تیزی ہو وہاں سمبھوگ کو نفرت انگیز کیوں سمجھا جائے، گناہ کیوں ٹھہرایا جائے؟ عورتوں کے پستان ہوتے ہیں، سُرین ہوتے ہیں، ان میں گربھ دھارن کرنے کی شکتی ہوتی ہے — یہ سب ان کا اپرادھ ہے کیا؟ مرد کے دل میں عورت کے لیے جو فطری خواہش ہوتی ہے اسے گناہ کیوں قرار دیا جائے؟ احتیاط میری سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ نیچ کنی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک مرتبہ میں نے غاروں میں مسخ شدہ حسین مورتیاں دیکھیں تو مجھے خیال آیا کہ تمام شکستہ مورتیاں بُت شکن مسلمانوں نے ہرگز نہ توڑی ہوں گی۔ اس توڑ پھوڑ میں نسوانی جسم اور نسوانی حسن کا خوف دل میں رکھنے والے تم جیسے لوگوں کا ہاتھ بھی ضرور ہے۔ جب عورت ایک جال ٹھہری تو اس کی کشش کے بندھنوں کو توڑے بغیر مرد کے فریضۂ عمل کا راستہ کھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن عورتوں کے موہ جال میں مرد پھنس جاتا ہے، اس بات کا کیا مطلب ہوا؟ وہ گھر بساتا ہے، بال بچوں کے ساتھ محبّت سے پیش آتا ہے، اپنی زندگی کا کچھ حصّہ خاندان کی پرورش پر خرچ کرتا ہے — بس یا اور کچھ؟ افسوس تم جیسے نیک مرد جو غیروں کے ساتھ اپنایت کا برتاؤ کرتے اور اپنوں کو غیر سمجھتے ہیں، اتنا سا ایثار کرنے سے قاصر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا تمہارا یہ طرزِ عمل، آج تک نہیں سمجھ سکی ہوں میں اور اسی لیے شکوہ کرنے پر مجبور تھی۔
لیکن اب سارے شکوے گلے بھی ختم ہو چکے دن بھی ڈوب رہا ہے۔
تمہاری چِتا پر راکھ جم رہی ہے اور تمہاری خاطر جمع ہونے والے دوست احباب آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ شام کے سائے گہرے اور لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔ صبح سے گھبرایا ہوا اور تھکا ماندہ شہری میری گود میں سو رہا ہے۔ جلد ہی وقت گزر جانے پر اور نئی مہمات کی تکمیل کی جدوجہد میں تمہاری یاد سب کے ذہن سے محو ہو جائے گی۔ دوست احباب بھی تمہیں بھلا دیں گے — صرف اکیلی میں تمہیں نہ بھلا سکوں گی — کیوں کہ تم میرے ساتھی نہ تھے، نیتا نہ تھے — میرا سب کچھ تھے۔

■■

بقیہ:- دو پرانے پاپی

"چلو وقت پورا ہوگیا۔ رات بھی ہو رہی ہے"
پو پھٹ رہی تھی روشنی آسمان پر پھیل رہی تھی۔ اور بندوقیں اٹھائے ہوئے سنتری اس روشنی کے سامنے مہیب کالے دیو لگ رہے تھے۔
"پرانے پاپی"
"پرانے پاپی"
ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ دونوں کی آوازیں نکلیں۔
پھر دو بوڑھے بغل گیر ہوئے اور آنکھوں میں آنسو لئے ایک شمال کی طرف چلا ایک جنوب کی طرف۔
اگلے لمحے ان دونوں کی پرچھائیاں بھی صبح کے دھندلکوں میں کھو گئی تھیں۔ اب ایک نیا آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور دونوں سرحدوں کے درمیان NO MAN'S LAND سنسان پڑا تھا۔ مگر دو دوستوں کے پیار کی خوشبو فضا میں گھلی ہوئی تھی۔

مشتاق جلیلی

(ڈرامہ)

نیا دور

سین نمبر ۱

منظر:

مسلم گھرانے کا ماحول۔

ایک دیوان خانہ جس میں تین دروازے ہیں اور ان تینوں دروازوں پر چلمنیں پڑی ہوئی ہیں بیچ میں تخت اور اس پر کی چادر۔ ایک آدھ جگہ سے ذرا پھٹی ہوئی ہے۔ نقشی دار پاندان اور اگالدان ایک طرف رکھے ہوئے ہیں۔ دیواروں کا رنگ ہر طرف اڑا اڑا ہے۔ ان کی زندگی کے رنگ کی طرح لگتا ہے۔ کسی زمانے میں بڑے ٹھاٹ باٹ۔ آج ان دنوں کو نبھایا جارہا ہے۔ اور معاشی حالات کی پریشانیاں درو دیوار سے ٹپک رہی ہیں۔

احمد حسین پریشان حال باہر کی طرف سے دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں۔

احمد:- (اندر آتے ہوئے) نجمی کی شادی نہیں ہوسکتی، ہرگز نہیں ہوسکتی ... بیگم او بیگم ....

بیگم:- (دور سے آواز) آرہی ہوں۔ کیوں کیا ہوا؟

(اور وہ دیوان خانے میں آجاتی ہے)

احمد:- وہی مایوسی، کچھ نہیں ہو سکا۔ نجمیؔ کو ایسے ہی پڑی رہنے دو، شادی وادی کچھ نہ ہوگی۔

بیگم:- خدا نہ کرے کیسی بات منہ سے نکال رہے ہو؟

احمد:- یہ شادی میری عزت کا سوال بن گئی ہے۔ آج رسول خان نے بھی قرض دینے سے انکار کردیا۔

بیگم:- انکار کردیا!

احمد:- اب کہیں سے قرض ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

بیگم:- مگر تاریخ تو رکھ دی گئی ہے۔

احمد:- ایک دو ہزار کی۔ پانچ دس ہزار کی بات ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ چالیس پچاس ہزار کون دے گا مجھے؟

بیگم:- سلمیٰ کی شادی میں اس سے زیادہ ہی لگ گیا تھا۔ اور کپڑے لتے کا خرچ الگ سے۔

احمد:- اس وقت کی بات چھوڑو، ابا مرحوم زندہ تھے۔ اور پھر ان کا دبدبہ، ان کا اثر کچھ ایسا تھا کہ یہ خود ان لے اس

چل کر آتا تھا۔ اب وہ گئے، وقت گیا۔ اب میں ہوں اور یہ بُرا وقت ہے۔ میں کیا کروں؟

بیگم:۔ وہ سیٹھ جھنگڑ مل کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ کیا اب اس کو بھی ہم پر بھروسہ نہیں رہا۔

احمد:۔ خدا خدا کر کے میرے گلے سے ابھی تو اس کی رسّی چھوٹی ہے۔ پوری تنخواہ چھ مہینے ہی سے تو گھر آ رہی ہے۔ تم پھر اس کے پاس گردن پھنسا رہی ہو میری۔

بیگم:۔ مگر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے! یہ ہمارے گھر کا آخری کاج ہے۔ نجمی کے بعد تو کوئی بوجھ ہی نہیں رہ جاتا۔ شکیل اور انور کا کیا ہے وہ تو مرد بچے ہیں مار تو لڑکی کی ہی پڑتی ہے ماں باپ پر۔

احمد:۔ تو تمہارا مطلب ہے میں پھر پھانسی پر چڑھ جاؤں۔ گروی رکھ دوں اپنی زندگی اس کے پاس۔ میں کہتا ہوں کچھ سود کا بھی اندازہ ہے تمہیں!

بیگم:۔ لو شادی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے اور تمہیں سود کی پڑی ہے۔

احمد:۔ تمہیں کیا، تم تو گھر میں آرام سے بیٹھی رہتی ہو، باہر کی ساری مار مجھ پر۔ اِدھر مہینے کی پہلی تاریخ آئی اُدھر قرض داروں کی لائین لگ گئی۔ کس کس طرح سے عزت بچانی پڑتی ہے۔

بیگم:۔ اور تاریخ ٹل جائے تو کونسی ناک لگی رہے گی۔ ذرا یہ بھی تو سوچو، یہ تیسری جگہ نجمی کی بات ٹھہری ہے۔ خدا نہ کرے کچھ بات الٹ پلٹ ہو گئی تو چپکے سے زہر کھا کر سو رہوں گی۔ پہاڑ سی لڑکی کب تک میرے سینے پر جلتی رہے گی۔

احمد:۔ نجمی کی ماں یہ سب کچھ سہی مگر تاریخ بڑھوانے میں ہرج ہی کیا ہے۔

بیگم:۔ اس سے کیا ہوگا۔ تاریخ کے ٹلنے سے روپیہ کی بات تو نہیں ٹلے گی۔ اور آج نہیں تو کل تمہیں کو انتظام کرنا پڑے گا۔

احمد:۔ (سوچتے ہوئے) وہ تو ٹھیک ہے ـــ انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ مگر۔۔۔۔ ؟؟

بیگم:۔ مگر وگر کچھ نہیں ـــ اگر یہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا تو لڑکی پر عیب لگ جائے گا۔ کنویں کا منہ تو بند کیا جا سکتا ہے مگر دنیا کا منہ کون بند کرے گا ـــ دیکھ لینا۔ ساری عمر لڑکی گھر بیٹھ مرے گی۔

احمد:۔ (گھبرا کر) بس بس بیگم ایسا مت کہو۔ عجیب الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟

بیگم: تمہیں تو پریشانی میں سامنے کی بات بھی نہیں سوجھتی۔ اکّو بھیّا کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔۔ چلے جاؤ۔۔ آخر وہ نجمی کے چچا ہیں۔ تمہارے سگے بھائی ہیں۔

احمد:۔ تو کیا ہوا۔ میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔

بیگم:۔ نہیں جاؤ گے تو کیا کرو گے۔ ایک دفعہ تو جا کر دیکھ لو!

احمد:۔ تم بھی کس کے پاس مجھے بھیج رہی ہو بیگم! جو ایک در پہ بیٹھ جائے تو گھنٹوں اٹھنا نہیں جانتا۔ ان کی بیٹھک کی طرح اُن کی سنگ دلی بھی مشہور ہے۔

بیگم:۔ یہ تو نجمی کا معاملہ ہے۔ خاندان کی لاج ہے اور پھر چالیس پچاس ہزار تو کچھ بھی نہیں ہے اُن کے لئے۔ اور ہم ان سے مانگ تھوڑے ہی رہے ہیں کل ہمارے پاس پیسہ آئیگا تو دے دیں گے۔ بس اُن سے فائدہ یہی ہوگا ہم ساہوکار کے سود سے بچ جائیں گے۔

احمد:۔ تم نے ابھی اکّو بھیّا کو پہچانا نہیں ہے۔ پیسہ ان کی جان کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔

بیگم:۔ تم تو اپنی ہی ہانکتے رہو گے۔ دوسرے کی سنیں گے نہیں۔ میں کہتی ہوں۔۔۔۔

احمد:۔ بیگم جس کی حیثیت اپنے باپ کے لئے ہمیشہ مندری وہ بھائی بھتیجی کے لئے کیسے کھل سکتی ہے۔

بیگم:۔ جب بھی کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے تو تم پرانی باتوں کو لے بیٹھتے ہو۔ بڑی غلط عادت ہے تمھاری۔۔۔ ارے یوں کھڑے کھڑے ہو آنے میں جاتا کیا ہے کوئی عزت گھٹ جائے گی۔

احمد:۔ نہیں بیگم نہیں۔

بیگم:۔ ٹھیک ہے اکو بھیّا سے نہ سہی اپنی بھابی سے تو کہہ دیکھو۔

احمد:۔ بھابی! (ہنستا ہے) وہ تو اکو بھیّا کے آئینہ کا عکس ہے۔ دونوں چہرے ایک سے ہیں۔

بیگم:۔ ایک ہوں کہ دو۔ میں کچھ نہیں جانتی، صرف اتنا جانتی ہوں کہ نجمی کی شادی ہونی ہی چاہیئے۔ چاہے قرض ملے نہ ملے۔ جہیز ملے نہ ملے۔ میں تو دو بول نکاح کے پڑھوا ہی دوں گی۔

احمد:۔ نجمی پہ کیا گذرے گی، ذرا سوچو تو، سلمیٰ کی شادی تو اس دھوم دھام سے ہوئی تھی کہ آج تک اس کے چرچے ہیں اور نجمی کی شادی بس یونہی خاموشی سے ہو جائے، اس بیچاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔ کیا وہ میری بیٹی نہیں ہے۔

سین نمبر ۲:۔

نجمی کا کمرہ: ایک طرف مسہری ہے۔ ایک الماری دائیں طرف، سفید فرش آدھے کمرے میں بچھا ہے۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے ہیں۔

نجمی:۔ کیا میں اُن کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ میرا بیاہ ابا جان کے لئے ایک مصیبت بن جائے۔

شمی:۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر باپ پر یہ وقت آتا ہی ہے۔

نجمی:۔ گویا بیٹی باپ کی دشمن ہوتی ہے۔ اسے اپنی خوشی کے لئے سارے خاندان کی تباہی منظور ہوتی ہے۔

شمی:۔ ہر گھر میں شادی بیاہ کا یہی ناٹک کھیلا جاتا رہا ہے۔

نجمی:۔ عورت کا یہ روپ کتنا گھناونا اور کتنا گرا ہوا ہے۔

شمی:۔ نہیں یہ گھناونا اور گرا ہوا روپ سماج کا ہے۔

نجمی:۔ یہ سماج پر الزام ہے۔ عورت کا کمزور پہلو مجھ سے چھپانے کی کوشش مت کرو شمی! میں پوچھتی ہوں، کیا عورت شادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی؟

شمی:۔ سماج جینے دے تب نا۔ بڑی اور موٹی موٹی کتابیں پڑھ لینے سے عورت بہک تو سکتی ہے کچھ بن نہیں سکتی۔ عورت کو اپنا ساتھی جبراً ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے اور اس کے لئے بھی سماج نے چند اصول بنا رکھے ہیں۔

نجمی:۔ چند اصول بنا رکھے ہیں!

شمی:۔ ہاں! جب تک عورت سر سے پاؤں تک سونے چاندی کی نہ بن جائے اس وقت تک وہ کسی اچھے گھر کی بہو نہیں بن سکتی ایک گھر ہو، ایک موٹر ہو اور موٹر کے پیچھے ماں باپ کا عمر بھر کا اثاثہ دور تک پھیلا ہو۔ قرض کے ہاتھوں پر قرض کی ہڈیاں دور تک نظر آتی چلی جائیں۔ بجلی کی روشنی میں دلہن کا سارا جہیز جگمگاتا چلا جائے۔ تب ہی عورت بھینٹ چڑھ سکتی ہے۔

نجمی:۔ تمھارا مطلب ہے عورت بیاہی نہیں جاتی۔ جہیز بیاہا جاتا ہے۔

شمی:۔ اور کیا۔ عورت میں دھرا ہی کیا ہے۔ ایک خوشنما پتنگ سے ڈر جانے والی ہستی، سولہ سترہ برس تک ماں باپ کا خون چوستی رہی اور پھر ساری عمر کسی مرد کے گلے میں لٹک گئی۔

نجمی:۔ عورت کی اتنی ہی تاریخ ہے۔

شمی:۔ نہیں! ابھی کچھ اور بھی ہے۔ صبح سے شام تک چولہے میں گھس کر رہے رات کے کسی حصے میں پل بھر کے لئے

شاعر کا تخیل اور مصور کا خواب بن جائے اور جب اس خواب سے چونکے تو کوئی بچے جونک بن کر اس کی چھاتی سے لپٹے نظر آئیں۔

نجمی:۔ یہی عورت ہے۔

شمی:۔ ہاں! یہی ہے عورت کون اس بلا کو ہنسی خوشی خریدے گا۔ تب ہی تو اس کے گرد سونے چاندی کے پھول جڑ دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ شائد کوئی اس بہانے اس سامان کو اپنے گھر ڈال لے۔

نجمی:۔ یہ عورت نہیں لعنت ہے۔ زمانے کی پھٹکار ہے۔ دھرتی کا بوجھ ہے۔

شمی:۔ ایسا نہ کہو نجمی، تم حوا کی توہین کر رہی ہو۔ تم نے مصور کی آنکھوں کی بینائی چھین لی ہے۔ تم نے شاعر کے دل کا خون کر دیا۔ تم نے لاکھوں شعر اور افسانوں کے گرد آگ لپیٹ دی۔ ادب آرٹ، زندگی ان سب میں عورت ہے مگر آہ، عورت میں کچھ نہیں۔

نجمی:۔ شمی!

شمی:۔ آج تم جس منزل پر کھڑی ہو، عرصہ ہوا میں گزر چکی ہوں۔ مجھے بھی ایک سمجھدار تعلیم یافتہ ساتھی کی تمنا تھی۔ مگر ہر تعلیم یافتہ گھر لڑکی کی آڑ میں جہیز کا شکار کھیل رہا ہے۔ اور میرے ماں باپ غریب تھے۔ غریب مفلس ماں باپ جہیز میں موٹر گھر دینے سے مجبور۔ اور میری پڑھی لکھی زندگی کی ڈور ان پڑھ اور جاہل ہاتھوں میں تھما دی گئی اور میں چلنے لگی۔ میرے سامنے کوئی منزل نہیں ہے۔ میں چلتی چلی جا رہی ہوں۔

نجمی:۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو!

شمی:۔ (مسکرا کر) یہ تو خوشی کے آنسو ہیں نجمی، کتنی خوشی نصیب ہے میری سہیلی، تسلیم اور دولت دونوں سے مالا مال ہے۔

نجمی:۔ یہ آنسوؤں سے لپٹی ہوئی خوشی مجھ پر پھینک رہی ہو شمی! میں بھی ایک عورت ہوں، میں بھی تمہاری طرح ہوں، میرا باپ میرے لئے در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ آج اکو بابا کے پاس فقیر بن کر ہاتھ پھیلانے گیا ہے۔

شمی: اکو بابا!

نجمی: ہاں اکو بابا جس کی چھوٹی گول نسیس آنکھوں میں کسی نے آج تک ایک آنسو نہ دیکھا۔ نہ آنسو، نہ رحم، نہ محبت، بے نور آنکھیں خود کے لئے بھی اندھی ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج میرا باپ اسی کے گھر کے زنجیر کھٹکھٹانے گیا ہے۔

سین نمبر ۳

ایک بڑا سا کمپونڈ۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی سیدھے طرف گارڈن ہے سامنے بڑا سا مکان۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے احمد حسین نے آواز دی

احمد:۔ اکو بھیا ہیں؟

(بھابی اندر سے دروازے پر آتی ہے)

بھابی:۔ کون احمد حسین ہو! ارے بھئی اندر آجاؤ۔

(احمد حسین اندر آتے ہیں، بڑا سا ہال ہے ہر چیز ترتیب سے ہے بھابی ایک کرسی سے کپڑے اٹھا لیتی ہے)

بھابی:۔ بیٹھو۔

احمد:۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

بھابی:۔ کچھ نہ کچھ تو لگا ہی رہتا ہے۔ تم سناؤ۔ تمہارے بچے کیسے ہیں۔ اور دلہن تو اچھی ہیں؟

احمد: خدا کا شکر ہے۔ ابا اکو بھیا آج گھر میں نہیں ہیں؟
بھابی:۔ ہیں کیوں نہیں۔ اب بھلا کہاں جائیں گے۔ جب سے پنشن ہوئی ہے گھر ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ یا پھر ان کے مکانوں کا حساب کتاب چلتا رہتا ہے ۔۔ یہ لو تمھارے بھیا آ گئے۔
(اکو بھیا کی انٹری)
احمد: آداب عرض کرتا ہوں۔
اکو:۔ (موٹی اور بھاری آواز میں) آداب آداب! کون احمد!! بیٹھو بیٹھو!
احمد۔ کہئے آپکی صحت کا کیا حال ہے؟
اکو۔ غنیمت ہے۔ صرف نظر کمزور ہوتی جا رہی ہے۔
احمد:۔ پھر علاج کی طرف توجہ نہیں کی آپ نے۔
اکو۔۔ علاج تو ہو رہا ہے۔ مگر اخراجات کا کوئی حساب نہیں، ہر مہینے ایک معقول رقم نکل جاتی ہے۔
احمد:۔ اس کی فکر زیادہ نہ کیجئے۔ صحت بہرحال ضروری ہے۔
اکو:۔ اس میں کوئی شک نہیں اور سناؤ کیا خبریں ہیں؟
احمد: ویسے سب خیریت ہے۔ ہاں شمس الدین خان کے یہاں نجمی کی بات طے ہوگئی ہے
اکو:۔ شمس الدین خان! میں اچھی طرح واقف ہوں ان سے۔ کیا کہنے۔ بڑے وضعدار آدمی ہیں اور ان کا لڑکا سلیم الدین نے بھی بڑی نیک طبیعت پائی ہے۔
احمد:۔ جی اور کافی پڑھا لکھا لڑکا ہے۔
بھابی: تاریخ واریخ رکھی گئی کہ نہیں۔
احمد:۔ ساری باتیں طے ہو چکی ہیں مگر ابھی تک روپیوں ہی کا بندوبست نہیں ہوا بھابی۔
بھابی:۔ زیور، جہیز تو پہلے ہی سے تیار ہوگا؟
احمد:۔ کہاں بھابی! سلمٰی کی شادی کے قرض سے ہی ابھی ابھی پیچھا چھوٹا ہے۔ دو سو روپے ہر ماہ قسط ادا کرتا رہا ہوں۔ اس پر گرانی نے الگ نچوڑ رکھا ہے۔ کچھ بچنے بچانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اکو:۔ توبہ کرو۔ کبھی روپیہ بھی بچتا ہے کہیں۔ ادھر آیا ادھر نکل گیا۔
احمد:۔ جی ہاں۔ ویسے کئی جگہ قرض کی کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا۔ رسول خان سے بڑی امید بندھی تھی۔ مگر آج اس نے بھی جواب دیدیا۔
اکو:۔ رسول خان وہ عدالت کا ناظر کھوسٹ جس نے اپنی چالاکیوں سے ہزاروں روپیہ بنا لیا۔ ازل کا خسیس وہ کیا دیگا۔
احمد:۔ اب میرے جاننے والوں میں کوئی رہا ہی نہیں۔ اور شادی کی تاریخ الگ سر پر کھڑی ہے۔
اکو:۔ میں کیا راستہ بتا سکتا ہوں تمھیں۔ جب سے پنشن ہوگئی ہے مجھے بیکار ہوگیا ہوں۔ نہ کہیں آنا نہ ہی جانا۔ جن لوگوں سے تھوڑے بہت تعلقات رہ گئے تھے۔ وہ بھی ختم ہوگئے۔
احمد:۔ مگر اکو بھیا! بات تو نجمی کی زندگی کی ہے۔ پھر خاندان بھر کی عزت کا سوال الگ، بڑی مشکل سے بات پکی ہوئی ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ لڑکا بھی ہاتھ سے نکل گیا تو نجمی کی ماں کی جان ہی پہ بن جائے گی۔
اکو:۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مان ہ وں ہے آ ر مگر اب کیا صورت نکالی جائے، کیا تدبیر کی جائے۔ میری عقل تو کام

نہیں کر رہی ہے۔

احمد:۔ اب ایک ہی راستہ ہے اکو بھیا۔ آپ اپنے پاس سے تیس ہزار روپے دید یجئے۔

اکّو:۔ تیس ہزار

احمد:۔ جی ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا اس رقم میں۔ اور میں ہر مہینے چار سو روپیہ دے جایا کروں گا، آپ کو۔

اکّو:۔ بھائی احمد! تم میری حالت سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہو۔ ارے ابھی میرے پاس کیا دھرا ہے۔ تمھیں حیرت ہوگی۔ حسن کی بیماری کا قرضہ ہی اب تک ادا نہ ہو سکا۔ میں خود ہی قرض میں جکڑا ہوا ہوں۔

احمد:۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! اکو بھیا۔ ہر محلے میں جس کا ایک نہ ایک مکان ہو وہ مقروض کیسے ہو سکتا ہے۔

اکّو:۔ تم کاروباری دنیا کو نہیں سمجھ سکتے۔ کام لاکھوں تک پہونچ جاتا ہے مگر ایک طرف سے ایک رقم آئی اور دوسری طرف سے نکل گئی۔ تجارت کا یہی اصول ہے۔ روپیہ گھر میں رہنے والی شئے نہیں ہے۔

احمد:۔ مگر روپیہ نہ ہوا تو شادی بھی نہ ہو سکے گی بلکہ نہ کچھ تو.....

اکّو:۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے روپے کی میرے پاس کمی نہ تھی۔ میں ضرور دے دیتا مگر میں نے وال کیشور پر جو بلڈنگ بنانی شروع کردی۔ سارا روپیہ اسی میں لگ گیا۔ یاد رکھو۔ ایک مقدمہ اور ایک مکان بس ان دونوں کے بچھڑ جانے کی دیر ہے۔ پھر یہ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

احمد:۔ میں تو پھر یہی سمجھوں گا کہ آپ سے میری مدد نہیں ہو سکتی۔

اکّو:۔ تم میرے بھائی ہو۔ بخدا اگر میرے بس میں ذرا بھی ہوتا تو ایک مصیبت کو ٹال دیتا۔ مگر کروں کیا۔ مجبوری ایسی ہے.....

احمد:۔ مطلب یہی کہ میں کوئی امید نہ رکھوں۔!

اکّو:۔ اب میں تم سے کیا کہوں کہ مجھے کتنا دکھ ہو رہا ہے۔ ایسے وقت آئے ہو کہ ہاتھ بالکل خالی ہے۔ ورنہ میں تو تمھارا بھائی ہوں۔

احمد:۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے!

بھابی:۔ ارے ابھی تو آئے ہو اور ابھی چلے، کچھ چائے وائے پیو گے نہیں!

احمد:۔ شکریہ بھابی۔ پھر آؤں گا کسی دن۔ اب دو چار جگہ اور ہولوں۔

اکّو:۔ ضرور جانا چاہیئے۔ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو گھر اپنا ہے۔ جب جی چاہے گا چلے آئے گے۔

احمد:۔ آداب عرض ہے۔

اکّو:۔ آداب عرض ہے۔

(احمد حسین کے جاتے ہی دروازہ بند ہوتا ہے)

اکّو:۔ تیس ہزار روپئے۔ چھوکڑی کی ماں! ایک دو نہیں تیس ہزار روپئے۔ میں کس امید پر دے دیتا احمد کو۔ پیسے کوئی کنکر پتھر نہیں۔

بھابی:۔ اتنی بڑی رقم کوئی کیسے اٹھا کر دے دے۔

اکّو:۔ اور پھر دے کہاں سے دیتا۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہیں .... او نہہ تیس ہزار روپئے۔ احمد کے لئے ایک ہی جگہ رہ گئی ہے۔ والد مرحوم کا پرانا کھاتیدار جھگڑو مل۔

سین نمبر ۴

جھگڑمل کی دکان کا اندرونی حصہ۔ چھوٹی بڑی مندوقچیاں رکھی ہوئی ہیں۔
ایک طرف گدا اور ایک طرف سفید چادر اور دو گاؤ تکئے لگے ہوئے ہیں۔ ایک
طاق پر بھگوان براجمان ہیں اور ایک چھوٹا سا دیا جل رہا ہے۔

احمد:۔ بھئی سیٹھ جھنگڑ مل، اب تم ہی میری عزت بچا سکتے ہو۔

جھنگڑمل:۔ مگر چھوٹے سرکار! اتنی بڑی رقم تو میں نے آنکھوں سے بھی نہیں دیکھی کبھی، مطلب یہ ہے آج مٹھی گرم نہیں ہے ورنہ رام قسم .....

احمد:۔ خدا کی قسم ذرا میری مصیبت کو تو دیکھو، بیاہ کی گھڑی سر پر، ہاتھ خالی اور بات ہے لڑکی کی۔

جھنگڑ مل:۔ سب کچھ ٹھیک ہے مگر چھوٹے سرکار!

احمد:۔ یہ اگر مگر چھوڑو جھنگڑ مل، پہلے یہ بتاؤ تم سے تو ہزاروں کا برسوں سے لین دین ہے۔ کبھی الٹا سیدھا ہوا میری طرف سے ....

جھنگڑ مل:۔ نہ نہ نہ .... دھرم سے بالکل کچے ہو زبان کے ... کبھی ایک پیسہ ادھر کا ادھر نہیں ہوا۔ مگر دس بیس ہزار رام قسم بڑا بول ہے۔

احمد:۔ تم تو میرے خاندان کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر میں نے معمولی سی شادی کر ڈالی تو پھر کونسا منہ لیکر گھر سے باہر نکل سکوں گا۔ پھر مجھے دولہا والوں کو بھی دیکھنا ہے وہ بھی گھر کے رئیس ہیں۔

جھنگڑ مل:۔ یہ شادی بیاہ کا معاملہ ہی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ ایک لڑکی کی شادی کیا ہوتی ہے سارے گھر میں جھاڑو پھر جاتی ہے۔ لڑکی بھی دو اور لد لدا کر دو۔

احمد:۔ اسی لئے تو کہتا ہوں میرے گلے سے پھانسی کو ہٹاؤ۔ میری مصیبت تو تمہیں دور کرنے والے ہو، یاد رکھو سیٹھ جی میں تمہاری بیٹھک سے یوں اٹھنے والا نہیں۔

جھنگڑمل:۔ مگر چھوٹے سرکار!

احمد: میں ایک نہ سنوں گا تمہاری، ذرا سوچو تو یہ میری عزت کا سوال ہے۔

جھنگڑ مل:۔ تم بھی اپنی ضد کے پکے نکلے، تو پھر رہن میں کچھ زمین گھر وغیرہ ....

احمد:۔ لو بھلا تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ اتنا کچھ ہوتا تو تمہارے پاس آنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

جھنگڑ مل:۔ رام قسم تو پھر اکڑ معاملہ ہے۔ اب تمہارے لئے اپنی گردن سولی پر دینی ہی پڑے گی۔ کیا کروں تمہی بی بی کی بات ہے زیادہ دل سخت نہیں کیا جاتا۔ تو پھر کیا ٹکٹ کا کاغذ لائے ہو!

احمد:۔ ہاں ہاں ... یہ ..... یہ رہا۔

جھنگڑ مل:۔ رام قسم تو تم سوچ کر ہی آئے تھے کہ اس بڈھے بنئے کو پھانس کر ہی رہوں گا۔ (ہنستا ہے) دیکھو چھوٹے سرکار اب معاملے کی بات ہے ... میں بھی ذرا صاف صاف دو دو باتیں تم سے کر لوں۔ پہلے تو یہ سمجھ لو اس زمانے میں نہ کوئی ایک پیسہ قرض دیتا ہے اور نہ لیتا ہے۔ مگر تمہارے باپ بڑے سرکار کی صورت میری آنکھوں میں گھوم رہی ہے ہزاروں روپیہ ان ہی ہاتھوں نے ان سے لیا ہے۔ آنکھ میں مروت ہے۔ تم سے انکار کرتے نہیں بنتا۔ مگر رام قسم یہ جو تمہاری ڈیوڑھی ہے نا ....

احمد:۔ مگر وہ میری نہیں سب بھائیوں کی ہے۔

جھنگڑ مل:۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ تم اس کے ایک حصے میں رہتے ہو نا۔

احمد:۔ ہاں۔

جھنگڑ مل:۔ تو بس وہ حصہ گروی رکھ دو میرے پاس۔

احمد:۔ گروی!

جھنگڑ مل: ماہانہ چار سو روپیہ اسے سود سمجھو یا کرایا۔ ہر مہینہ تم کو دینا پڑے گا۔ جس دن پوری رقم لے آؤ گے مکان تمہارا۔

احمد:۔ مگر جھنگڑ مل

جھنگڑ مل:۔ نہ نہ نہ بھئی، ایک بات اِدھر ہو گی نہ ایک بات اُدھر، اگر تم کو منظور نہیں ہے تو میرا ہی فائدہ ہے۔ میری اتنی بڑی رقم بچ جاتی ہے اور اگر منظور ہے تو (اسٹامپ پیپر نکالتے ہوئے) یہ لو کاغذ اور دستخط کر دو۔

(احمد حسین دستخط کر دیتے ہیں۔)

جھنگڑ مل:۔ پھانس ہی لیا بوڑھے بنئے کو۔ یہ لو بھئی اپنی رقم، اچھی طرح گن لو۔ سود کاٹ کر دیا ہے۔

احمد:۔ جھنگڑ مل!

جھنگڑ مل: یہ تو سبھی کا قاعدہ ہے۔ ایسے بنتے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں یہ لو اٹھاؤ رقم اور بڑھو یہاں سے۔

احمد:۔ تم نے بڑی مہربانی کی ہے مجھ پر سیٹھ جی!

جھنگڑ مل:۔ وہ تو تمہیں لوگوں کی مہربانی ہوتی ہے جو کبھی کبھار چلے آتے ہو، اچھا اب جاؤ۔ چھوٹی بیگم تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ میری طرف سے سلام کہنا۔ چھوٹے سرکار، کیا نیک بخت بی بی ہے رام قسم۔

سین نمبر ۵ دیوان خانہ

(سین نمبر ایک کا ہی ماحول)

بیگم:۔ (اپنے آپ) ہر جگہ سے تو امید ٹوٹ گئی۔ اب یہ ان کی آخری امید ہے، اگر جھنگڑ مل نے بھی قرض دینے سے انکار کر دیا تو نجمی کے ابا سچ مچ پاگل ہو جائیں گے۔

(نجمی دیوان خانے میں آتی ہے)

نجمی:۔ امی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

بیگم:۔ کہو بیٹی۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟

نجمی:۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔

بیگم (حیران ہو کر) شادی کرنا نہیں چاہتی۔ کیا کہہ رہی ہو؟

نجمی:۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں شادی نہیں کروں گی۔

بیگم:۔ کیا بات ہو گئی۔ کیا لڑکے کے بارے میں کچھ سنا ہے تم نے؟

نجمی:۔ نہیں

بیگم:۔ تو پھر سسرال والوں کی بات ہے کوئی؟

نجمی:۔ جی نہیں ۔۔ بس میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔

بیگم:۔ کچھ کہو گی بھی یا یونہی کہتی چلی جاؤ گی۔

نجمی :- میں اپنی خوشی کے لئے سارے گھر کی خوشی نہیں چھین سکتی ۔ وہ انسان جس کی خودداری نے خاندانی محل کی ایک اینٹ
بھی کسی قیمت گرنے نہیں دی وہی باپ آج اپنی ایک ادنیٰ سی لڑکی کے لئے اپنی وضعداری ایک ایک کی چوکھٹ پر
لٹائے دے رہا ہے میں یہ برداشت نہیں کر سکتی ۔

(احمد حسین کی انٹری)

احمد :- اس کا جواب تمہاری ماں نہ دے سکے گی ۔ میں دے سکتا ہوں ۔

نجمی :- کون ابا جان !

احمد :- ایک بادشاہ ، ایک سپاہی ، ایک امیر ایک غریب جب باپ کے روپ میں آجاتا ہے تو صرف باپ بن کر رہ جاتا ہے ۔
اولاد کا زخم جسم کے کسی حصے میں درد نہیں کرتا ۔ سارے جسم کو درد بنا دیتا ہے ۔

نجمی :- اور باپ کا دکھ بھی بیٹی کے لئے سکھ نہیں دکھ ہی ہوتا ہے ۔ میں آپ کے گھر قرض کا چراغ جلا کر سہاگ کی روشنی
نہیں خرید سکتی ۔

احمد :- شادی بیاہ کا لین دین صدا سے اسی روپ میں ہوتا چلا آرہا ہے ۔ عورت کل کی طرح آج بھی بے سہارا ہے نجمی ۔

نجمی :- مجھے ایسا سہارا نہیں چاہیئے جو میرے ماں کے گھر کی چار دیواری کو ڈھاکر میرا آسرا بن جائے ۔

احمد :- ہر گھر میں عورت کے لئے یہی شرط ہے ۔ جب تک سونے چاندی کے تاروں بالوں میں اس کا جسم جکڑا ہوا نہ ہو ، اس
وقت تک اس کا اپنا ساتھی کوئی نہیں ہوتا ۔

نجمی :- ساتھی ، جہیز ، قرض ، شادی ، یہ شادی نہیں خودکشی ہے ۔

احمد :- اور اس خودکشی کے بعد ہی عورت کو زندگی ملتی ہے ۔

نجمی :- یہ زندگی موت سے بدتر ہے ۔ آج عورت کے تیور بدل رہے ہیں ۔ آج خاموشی میں آواز ، آنسوؤں میں ہنسی ،
تاریکی میں روشنی جنم لے رہی ہے ۔

احمد :- تم بھول رہی ہو ۔ جن ہاتھوں میں نئے وقت کی شمع جل رہی ہے وہی ہاتھ اندھیرے میں لپٹے ہوئے ہیں ۔ ایک ہاتھ
سے تالی بجانے کی کوشش نہ کرو نجمی ۔ لباس بدل جانے سے انسان نہیں بدل جاتا ۔ تم جس دنیا کا خواب دیکھ رہی
ہو وہ تم سے ابھی بہت دور ہے ۔

نجمی :- نہیں بہت قریب ہے ۔ آج عورت کو دھمکا کر پھسلا کر ، بہلا کر جیتا نہیں جا سکتا ۔ آج عورت مرد کی جوتی اور بیوی
شوہر کی جوتی بن کر نہیں رہ سکتی ۔ آج ہندوستانی بیٹی جاگ رہی ہے ۔

احمد :- مگر ہندوستان کا بیٹا ابھی سو رہا ہے ۔

(سلیم کی انٹری)

سلیم :- نہیں ہندوستان کا بیٹا بھی جاگ رہا ہے ۔

نجمی :- آپ !

احمد :- سلیم تم !

بیگم :- نوشہ میاں !

سلیم :- ہاں نوشہ بنئے دور کا نیا دولہا ، اب نئے راج میں پرانے رسم و رواج زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکتے ۔ اب
مرد کی نظر میں عورت ایک کھلونا ، بیوی ایک خادمہ نہیں رہی آج عورت مرد کے دوش بدوش اور بیوی شوہر کی زندگی

کی ساتھی ہے۔ انسانیت کی بدلتی ہوئی تاریخ نے مرد کی بند آنکھیں کھول کر رکھ دیں۔ اب آج کے ہندوستان میں بیاہ بیوپار نہیں بنے گا۔ دل و نظر کا یہ رشتہ، اب سونے چاندی کے تاروں میں نہیں بندھے گا۔ آج ہیرے سے لڑنے والے دولہے کا جہیز دلہن کی سیرت ہے، محبت ہے۔ محنت ہے جس کے ایک ایک پل میں بے شمار دولت چمک رہی ہے۔ مجھے بھی چاہیے جہیز نہیں۔

(سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں اور بیک گراؤنڈ سے آواز آتی ہے)

کچھ لوگ تھے جو وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے
کچھ لوگ تھے جو وقت کے سانچے بدل گئے

(اسٹیج کا ماحول میوزک کی لہروں پر آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔)

علیم جہانگیر

کتنے بجے؟

"جب لوگ مجھے ریکو گھڑی باندھے دیکھتے ہیں تو میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا" سری لنکا یعنی سابقہ ریڈیو سیلون سے ہر روز اور بار بار یہ اشتہار سن کر ہمیں گھڑی نہ ہونے کا بے حد ملال ہوا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے بازار سے دو رقم کاری گری اور صحیح وقت کی انوکھی شان "ریکو" گھڑی خرید ہی لی۔ "ریکو گھڑی کی ٹِک ٹِک" ہمارے "دل کی دھڑکن ٹِک ٹِک بن گئی"۔

عام روش سے ہٹ کر یعنی "بائیں" ہاتھ کی کلائی پر گھڑی باندھنے کے بجائے ہم "دائیں" ہاتھ کی کلائی پر باندھنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا خاطر خواہ فائدہ یہ ہوا کہ جب بھی کسی جان پہچان، دوست احباب یا رشتہ دار سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہم علیک سلیک کے بعد بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی آستین کو ذرا سا اوپر کھسکا کر جھٹ مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیتے جس میں گھڑی کی "نمائش" زیادہ اور "مصافحہ" کی اہمیت کم ہوتی۔ ہمارے مہربان گھڑی دیکھ کر اس کی خوب خوب تعریف کرتے اور ہم بقول ریڈیو سیلون" خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔"

اس پر بھی اکتفا نہ کرتے ہوئے ہم نے گھڑی کی مزید پبلسٹی کے مدِنظر اس کی چین ڈھیلی کر کے چھوڑی تھی۔ مزید برآں ہم نے "فل آستین" شرٹ کو "ہاف آستین" میں بدل دیا۔ غرض ہم نے ریکو گھڑی کی اتنی پبلسٹی کی کہ شاید ہی اس "کمپنی" نے کی ہو۔

آپ تفریح کے موڈ میں ہوں یا شاپنگ کے بہانے بازار میں گھوم پھر رہے ہوں۔ ہوٹل یا کسی سینما ہال میں بیٹھے ہوں۔ بس کے انتظار میں یا تھیٹر کے ٹکٹ لائن میں ایستادہ ہوں۔ غرض آپ جہاں کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں ہوں آپ پر "بجا" یا "بجے جا" کتنے بجے کا بم ضرور پھینکا جائے گا۔ خواہ آپ کے ہاتھ میں پھر گھڑی ہو یا نہ ہو۔

ہم دفتر جانے کی عجلت میں ایک قدم گھر کی دہلیز میں اور دوسرا قدم میونسپل نالی کی فرشی پر ٹھیک طرح رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہماری بارِ سماعت سے یہ صدا ٹکرائی "کتنے بجے" ہم اونٹ سی گردن گھما کر جو دیکھے تو معلوم ہوا کسی کے نورِ نظر گولیاں، کھیلنے سے فراغت پا کر ہم سے مخاطب ہیں۔ ہم نے جھنجھلا کر کہا "برخوردار بھلا آپ کو وقت سے کیا مطلب؟" بچہ معصوم سی صورت بنائے بولا۔ "اماں جان گھر میں بیٹھی وقت پوچھوا رہی ہیں۔"

ایک دفعہ ہم جاڑوں کی یخ بستہ رات میں گرم کپڑوں میں ملبوس ہوٹل میں گرم گرم کافی کی چسکیاں لینے بھی نہ پائے کہ دفعتاً کسی نے پوچھا "آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہے" ہم نے کافی کا مزہ کرکرا محسوس کرتے ہوئے اور کچھ کافی جھنجھلاہٹ میں کپڑوں پر گراتے ہوئے بے رخی سے کہہ دیا "اس وقت ہماری گھڑی میں رات کے ٹھیک نو بجے ہیں" یہ سن کر وہ ہمارے مقابل خالی کرسی پر بغیر اجازت بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "اوہ تو ابھی کافی وقت ہے" ہم گویا ہوئے "کیا سیکنڈ شو دیکھنے کا ارادہ ہے" وہ کہنے لگے "جی نہیں! مجھے کاچی گوڑہ جانا ہے اور کاچی گوڑے کی ٹرین ساڑھے نو بجے پلیٹ فارم چھوڑتی ہے" ٹرین کا نام سنتے ہی بڑبڑا کر ہم نے جونہی گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ اس سے قبل کہ ہمارا پول کھل جائے اور وہ ہمیں شریف بدمعاش جان

کر پٹائی کر دے ہم بنا رکا ئی پئے بل ادا کر کے ایسے بھاگے کہ پیچھے ہٹ کر دیکھنا تک گوارا نہ سمجھا۔

کچھ عرصہ بعد ہم پھر اسی ہوٹل میں چائے نوشی کر رہے تھے۔ ایک صاحب جن کے سامنے چائے کا ٹرے رکھا جا چکا تھا ہم سے مخاطب ہوئے "کیا ٹائم ہو رہا ہے؟" ہم نے سادہ لوحی سے کہہ دیا۔" دن کے دو بجے ہیں۔ ان صاحب نے جھٹ برف منگوا کر چائے میں ڈالی اور ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے پی لی۔ ہم آج تک چائے میں برف ملانے کی وجہ نہ سمجھ سکے۔

ہمیں فلم بینی کا بہت شوق ہے۔ ہر چھٹی میں ساڑھے گیارہ بجے کا مارننگ شو دیکھنا ہمارا ہی رہا ہے۔ میٹنی شو اس لئے نہیں دیکھتے کہ مارننگ سے میٹنی شو تک کا انتظار قیامت کے انتظار سے کم نہیں۔ فرسٹ شو میں بالفرض محال ٹکٹ نہ ملنے کی صورت میں منہ لٹکائے گھر آنیکا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ سکنڈ شو سے ہماری نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے

جس دن دفتر کی چھٹی ہو اس سے ایک دن قبل ذہن میں کچھ ایسا پروگرام مرتب کر لیتے ہیں کل چھٹی کا دن ہے گھر سے ٹھیک نو بجے نکل کر خلیل خاں سے ملاقات کرینگے چائے پان، غپ شپ میں فلم کا وقت ہو جائے گا فلم دیکھ کر گھر آکر آرام کریں گے۔ دوسرے دن ترتیب شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی نیت سے ٹھیک 9 بجے گھر سے نکل کر خلیل خاں کے گھر کا رُخ لیتے ہیں۔ چونکہ ہمارا پروگرام خود ساختہ ہوتا ہے جس سے ہمارا دوست قطعی طور پر لاعلم ہوتا ہے جب ہم اس کے گھر پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بہ نفس نفیس ہمارے گھر چائے پانی بلکہ ناشتے کے لئے علی الصباح روانہ ہو چکے ہیں۔ مجبوراً ہمیں وہاں سے تھیٹر کی راہ لینی پڑتی ہے اور ہم تھیٹر اس وقت پہنچتے ہیں جبکہ اس کا پھاٹک تک بند رہتا ہے۔ ہم لاچار پھاٹک پر ہی دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں بس پھر کیا ہر آنے جانے والا پوچھتا رہتا ہے۔ "ٹائم پلیز"، کیا وقت ہے، کتنے بجے، سمے کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور ہم وقت بتاتے بتاتے آدھ موے سے ہو جاتے ہیں۔ بعض تو یہ تک کہتے سُنائی دیتے ہیں" فلم شروع ہونے میں ابھی کافی دیر ہے۔ یہ سُن کر ہمارے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ دوست کو خیر صلواتیں بھیجتے ہی ہیں لیکن ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا کہ ابھی بلکہ اسی وقت یہیں پر خودکشی کر لیں تاکہ حکومت فلم کی نمائش ہی بند کر دے مگر ہمیں فلم دیکھنا ہوتی ہے بلکہ ڈھیر ساری نئی نئی فلمیں دیکھنے کی تمنا میں اس ارادے سے باز آتے اور ہر پوچھنے والے کو وقت بتاتے۔

ہم ایک دوست کی پارٹی میں مدعو تھے، پارٹی ایک وسیع اور شاندار باغ میں انجام پا رہی تھی۔ اس باغ کا ہر پیڑ، پیڑ کی ہر شاخ اور شاخ کے ہر پتے چھوٹے چھوٹے قمقموں سے جگمگا رہے تھے دعوتی پانچ پانچ، سات سات کے گروپ میں کھڑے ایک ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ تھامے دوسرے ہاتھ سے انصاف کر رہے تھے۔ ہم بھی ایک کونے میں پلیٹ لئے کھانے میں منہمک تھے کہ کسی نے پوچھا "ٹائم پلیز"، ہم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا" پونے دس بجے ہیں۔" دوسرے نے جھٹ کہا "میری گھڑی میں ساڑھے نو بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں"

تیسرے نے بات بڑھائی۔ "ہمارے پاس دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔"

چوتھے نے ہانک لگائی "میرے پاس نو بج کر پینتالیس منٹ ہوئے ہیں" ہم ہر بار اُلّو کی طرح دیدے مٹکاتے ہوئے کبھی اپنی گھڑی اور کبھی وقت کہنے والے کی صورت تکتے۔

ایک دن ہم مسرت میں مگن بازار میں گھوم پھر رہے تھے کہ کسی نے پوچھا " کتنے بجے"، ہم نے برجستہ کہا:۔

"صبح کے، دوپہر کے، شام کے، آج کے یا کل کے۔

"کیا مطلب ان صاحب نے گرجدار آواز میں کہا۔

" ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ گستاخی معاف، لفظ "کتنے بجے" میں زمانے کا تعین مشکل ہے۔ اس لئے ہم احتیاطاً پوچھ رہے ہیں تاکہ آپ کو صحیح وقت بتانے میں کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہ رہے۔

وہ صاحب تو ناک بھوں چڑھاتے آگے بڑھ گئے۔ ہم خراماں خراماں ان کے پیچھے چلے جا رہے تھے کہ پھر کسی نے پوچھا " کتنے بجے"، ہم نے اپنا وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ موصوف شرمسار ہو کر کہنے لگے "جی ابھی کے"، ہم نے کہا کہ:۔۔

"افسوس کہ اس وقت ہماری گھڑی بند ہے۔ ہم ابھی دس قدم بھی نہ چلنے پائے تھے کہ ہمارے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی۔

" کتنے بجے "

" ہم، کب کے "

" وہ۔ کل کے "

" گزرا ہوا کل یا آنیوالا "

" وہ۔ گزرا ہوا "

" ہم، گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔"

وہ: آنے والا وقت:

ہم: آنے والا وقت کس نے دیکھا ہے:

ایک دن ہم دفتر میں بڑے انہماک سے فائلوں کا مطالعہ میں غرق تھے۔ اچانک سر اٹھا کر جو دیکھا تو محسوس ہوا دوسرے کرمچاری اپنا اپنا کام سمیٹ کر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم نے گھڑی دیکھا تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ہم نے بھی جھٹ کام بند کر کے گھر کی راہ لی۔ دوسرے دن حسب معمول جب دفتر پہنچے تو ہمارے ٹیبل پر میمو رکھا ہوا تھا۔ جسے پڑھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ جس وقت ہماری گھڑی ساڑھے پانچ بجا رہی تھی اس وقت دوسری گھڑیوں میں دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ اور بابو لوگ انٹرول میں کھانا کھانے اور چائے پینے جا رہے تھے۔

ہم گھڑی کی بغاوت کی سرکوبی کے لئے گھڑی ساز کے پاس جا پہنچے وہ اس کا ایک ایک پرزہ الگ کرتا جاتا اور ہمیں دکھاتے ہوئے کہتا "یہ بال کمان ہے جس میں بال آگیا ہے کمان سیدھی ہوگئی ہے۔ چابی گھس گئی ہے۔ گھڑی میں پانی جانے کی وجہ سے اس کے پرزوں پر زنگ آگیا ہے۔ ڈائیل، دن اور تاریخ کے وہیل خراب ہوگئی ہے" خدا جانے اور کیا کیا گھڑی ساز ہمیں دکھاتا جاتا اور ہم آنکھیں پھاڑے ہوں ہوں کرتے دیکھے جاتے۔ گھڑی ساز نے خرید بتایا کہ ہماری گھڑی چونکہ بدیسی ہے اور اس کے پارٹس نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے جس کی فراہمی کے لئے اسے ہندستان کے مشہور و معروف شہروں کے دورے کرنا ہوں گے جس کا سفر خرچ اور رہنا ہمارے نیز دکان کے چکرالگ۔

ہم نے موقعہ غنیمت جان کر اور کتنے بجے کی لعنت سے سدا کے لئے چھٹکارا پانے کے لئے گھڑی ساز کو گھڑی اونے پونے داموں میں فروخت کر دی۔ اس دن سے ہم نے دوسری گھڑی نہ خریدنے کی قسم میں کانوں کو کنکر لگا لئے ہیں۔

وقت سے باخبر رہنے کے لئے ہر روز سری لنکا سے فلمی نغمہ سننا ہمارا معمول بن گیا ہے۔ جب اناؤنسر یہ اناؤنس کرتا ہے "اس سمے دن کے ٹھیک دس بجے ہیں۔ ہماری دوسری سبھا دوپہر ٹھیک بارہ بجے آرمبھ ہوگی تب تک ہمیں کو آگیا دیجئے۔" ہم ریڈیو کا بٹن آف کر کے اس کو آگیا دیتے ہیں اور بیگم سے آگیا لیتے ہوئے چھٹی ہو تو تھیٹر ورنہ دفتر کی راہ ناپتے ہیں۔

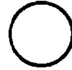
بدقسمتی سے اگر کسی دن ہمارے گھر کی بجلی فیل بھی ہو تو ہم ہر پانچ دس منٹ بعد گھر کے صدر دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ہر راہ گیر سے پوچھتے ہیں۔ "کتنے بجے"؟

سکندر علی وجد



دلکشی رنگ پیرہن کی ہے　　گل میں خوشبو ترے بدن کی ہے
میرے افکار ئے شبستاں ہیں　　روشنی تیرے انجمن کی ہے
کج کلاہوں کی سادگی پہ نہ جا　　اک ادا یہ بھی بانکپن کی ہے
ہوش میں آرہا ہے دیوانہ　　کیا دھنک زلفِ پُر شکن کی ہے
حُسنِ عاشق مزاج زندہ باد!　　کس کو اب فکر جان و تن کی ہے

وجد اردو کی آبرو ہے غزل
یہ نوازش ترے وطن کی ہے



رکھا گلوں کی یاد کو دل نے جتن کے ساتھ　　خوشبوئے دلبری ہے شمیم سخن کے ساتھ
صیاد کو تمیز نہیں خوب و زشت کی　　شاہیں بھی زیر دام ہے زاغ و زغن کے ساتھ
مدت ہوئی کہ طوق و سلاسل پگھل گئے　　اب چھیڑ چھاڑ ہے دار و رسن کے ساتھ
اہل کمال، اہل زباں، اہل دل گئے　　اپنا معاملہ ہے اب اہل وطن کے ساتھ
حسنِ وفا شعار نے ذوقِ جنوں دیا　　چشمک رہی ہے ہر نگہ تیغ و زن کے ساتھ
اللہ رے تیرے چاہنے والے کا مرتبہ　　سولی پہ سر بلند ہے کس بانکپن کے ساتھ

ظاہر میں وجد کوئی تعلق نہیں تو کیا
دل کو ہے ربط حیدرآباد دکن کے ساتھ

عالمتاب تشنہ

کراچی، پاکستان

زیرِ آب بھی اک صحرا تو میں نے دیکھا   دھوپ میں دریا خشک ہوا تو میں نے دیکھا
پس منظر میں کتنے منظر ہوتے ہیں   مجھ پہ طلسم دید کھلا تو میں نے دیکھا
جال مچھیرے کشتی سب ناپید ہوئے   دریا ساحل سے اُترا تو میں نے دیکھا
تاریکی میں ایک دیا سرِ بام ہوا   روشنیوں کا سر اونچا تو میں نے دیکھا
سب راہیں تیرے ہی گھر کو جاتی ہیں   میں اپنے گھر سے نکلا تو میں نے دیکھا
موسمِ گل کی آمد کا ہر شاخ پہ رقص   ہوا کا اک جھونکا آیا تو میں نے دیکھا
رات کے سارے منظر میرے اپنے تھے   میرے آنگن چاند اترا تو میں نے دیکھا
عذرِ حیا تو محفل تک کا قِصّہ تھا   پیچ زلفِ یار کھلا تو میں نے دیکھا
شاخِ گلاب پہ موسم گل کا حسنِ نمو   جب وہ پہلی بار ملا تو میں نے دیکھا
اک سایہ سایہ گہری نیلی آنکھوں میں   اس نے میرا نام لیا تو میں نے دیکھا
کنول کی صورت کھِل اٹھے مہتاب بدن   جھیل میں چاند کا رتھ اترا تو میں نے دیکھا
کوئی بتائے کس کس کے کیا ہاتھ لگا   قافلۂ جاں لُٹا ہوا تو میں نے دیکھا
بیٹھی تھی یہ دنیا آنکھیں بند کئے   دیواروں کا لکھا ہوا تو میں نے دیکھا
اپنی گردِ قافلۂ جاں رقص میں تھی   ایک بگولہ جب گزرا تو میں نے دیکھا

عشق کی راہ میں چلنا کتنا مشکل ہے
تشنہ میں دو قدم چلا تو میں نے دیکھا

عالمتاب تشنہ

کراچی پاکستان



سفر میں راہ کے آشوب سے نہ ڈر جانا
پڑے جو آگ کا دریا تو پار کر جانا

یہ اک اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

یہ انتقام ہے دشتِ بلا سا بادل کا
سمندروں پہ برستے ہوئے گذر جانا

طلوعِ مہر درخشاں کی اِک علامت ہے
جلائے شمع یقیں میرا دار پر جانا

تمہارا قرب بھی دوری کا استعارہ ہے
کہ جیسے چاند کا تالاب میں اُتر جانا

عجب ہیں رزم گہِ زندگی کے یہ انداز
اُسی نے وار کیا جس نے بے سپر جانا

ہم اپنے عشق کی اب اور کیا شہادت دیں
ہمیں ہمارے رقیبوں نے معتبر جانا

ہمارے دم سے ہی آوارگی شب تھی ہمیں
عجیب لگتا ہے اب شام ہی سے گھر جانا

زمانہ بیت گیا ترکِ عشق کو تشنہ
مگر گیا نہ ہمارا اِدھر اُدھر جانا

شمس فریدی



ایک ہی پل میں نظر سے ہوئے منظر غائب
ریت ہی ریت رہی اور سمندر غائب

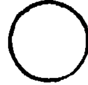
کون ہیں لوگ یہاں کن کی پڑی ہیں لاشیں
جسم ہی جسم نظر آتے ہیں اور سر غائب

سب کے چہرے پہ ہنسی کھیل رہی ہے لیکن
سب کے چہرے ہی نظر آتے ہیں پیکر غائب

کون وشواس کریگا میں بتاؤں کس کو
میرا میں ہوگیا ہے میرے ہی اندر غائب

لوٹ کر اپنی ہی چٹان سے اے شمس ابھی
گر کے پاتال میں وہ ہوگیا پتھر غائب

شوکت نظمی



چائے، سگریٹ پان، باقی ہے
یہ تواضع کی شان باقی ہے

گوشہ گوشہ کھنڈر ہوا دل کا
نام کو یہ مکان باقی ہے

اب بھی بادِ مخالفت ہے تیز
اب بھی میری زبان باقی ہے

پھر بڑھے گا نشان خطرے کا
ہر ندی کا گمان باقی ہے

پرِ پرواز کٹ گئے لیکن
حوصلوں کی اڑان باقی ہے

دوست احباب سارے کہتے ہیں
نظمی صاحب کی شان باقی ہے

وقار خلیل



چاند نکلا زہ جدھر سے نکلے
کتنے افسانے نظر سے نکلے

ہم نے دیکھی ہے سرکتی ہوئی بھیڑ
شعبدے جب بھی ہنر سے نکلے

یوں بھی کھلاتے ہیں یادوں کے افق
اشک بوں دیدۂ تر سے نکلے

عکس ٹوٹے ہیں تمناؤں کے جب،
رنگ کتنے ہی شرر سے نکلے

ہم بھی آوارہ ہیں بادل کی طرح
آپ کے شہر میں برسے، نکلے

کوئی آسیب چھپا ہو گھر میں
لوگ سہمے ہوئے گھر سے نکلے

کیا مزہ دیتے ہیں اشعار وقار
تارِ پیراہنِ زر سے نکلے



دھواں دھواں سی لگے شام آؤ سچ بولیں
پگھلتی رات سے کیا کام آؤ سچ بولیں

جنوں گنوا کے بھی عرفان آگہی نہ ملا
یہ زندگی ہے کہ دشنام آؤ سچ بولیں

دروغِ مصلحت آمیز کے خرابے میں
کبھی کے ٹوٹ چکے جام آؤ سچ بولیں

فصیلِ شہر تمنّا صلیب جیسی لگے
ابھی خرد ہے تہہ دام آؤ سچ بولیں

اسے نہ جان سکے ذات سے الگ ہو کر
وہی سخن کہ ہے اک نام آؤ سچ بولیں

روایتوں میں نہ الجھیں، جنوں شمار کریں
یہی ہے وقت کا پیغام آؤ سچ بولیں

وجود آگ نہ بن جائے اتنا ہوش رہے
جھلس رہے ہیں در و بام آؤ سچ بولیں

نور محمد یاس



سفر عجیب تھا لمحاتِ خواب کا میرے
ندی کی دھار پہ ابھرے نقوشِ پا میرے

بہاؤ تیز ہے احساسِ ذات کا میرے
اڑا نہ دے کہیں پرزے یہی ہوا میرے

ابھی تو شوق سے نفرت کے سنگ برساؤ
جب آئے پیار تو ریزے سمیٹنا میرے

حصار میں لئے بیٹھا تھا ذہن کو خالی
خود اپنا عکس بھی ادراک میں نہ تھا میرے

نجانے کون سی قوت تھی اس کی آنکھوں میں
کتابِ رخ سے خیالات لے اُڑا میرے

اندھیرے بند کواڑوں کو توڑ کر آئے
اُجالا کیوں کھلے در سے پلٹ گیا میرے

اٹھائے گا کوئی جب بھی کتابِ عالم یاس
ورق ورق پہ نشانات پائے گا میرے

شہپر رسول



زندگی شوق سے بے رنگ زمانے دے مجھے
صبر کا آخری امکاں بھی اٹھانے دے مجھے

مسندِ ضبط سے اے "آس کے عفریت" اتر
میرے ہی کمرے کی زنجیر ہلانے دے مجھے

ہجر کے زرد مناظر بھی میں کیسے دیکھوں
قرب کی دھند تو آنکھوں سے ہٹانے دے مجھے

اُس سے برسوں کو بچھڑنا بھی ہے منظور مگر
اس سے ملنے کے بھی دو چار بہانے دے مجھے

ہوگئیں بند تو کھل پائیں گی کب اے شہپر
اور کچھ دیر ان آنکھوں سے نبھانے دے مجھے

محشر منظری مصطفےٰ آبادی



خود اپنے ہی ہاتھوں ہے یہ مائل بہ تباہی
اس دور کے انسان کا حافظ ہے خدا ہی

بے نور نہیں ہوتی کوئی صبح جہاں میں
درپیش ہے اپنے ہی مقدر کی سیاہی

کیا جلوہ گہہِ حسن میں جلوؤں کی کمی ہے
طالب کو میسر ہو اگر پاک نگاہی

محفل بھی وہی شمع کے جلوے بھی وہی ہیں
ہے آج میسر کسے پروانہ نگاہی

محشرؔ ہو کہاں پاک حسد سے دلِ حاسد
ہوتی ہے بھلا رات سے کب دور سیاہی

اشفاق انجم



بس بھی کر قاتل کہ ان نیزوں پہ سر دیکھے گا کون
سب اگر کٹ جائیں گے تیرا ہنر دیکھے گا کون

گھات میں دشمن ہیں مت رکھو فصیلوں پر چراغ
پڑ گیا شب خوں تو لاشوں کا نگر دیکھے گا کون

دار پر چڑھ جاؤ یا آنکھیں بچھا دو راہ میں
اٹھ گئے ہیں شہر سے اہلِ نظر دیکھے گا کون

صرف میری ذات سے ہیں گھر کی ساری رونقیں
ورنہ میرے بعد یہ دیوار و در دیکھے گا کون

لوگ رکھتے ہیں کتابوں میں نشانی کے لئے
کس نے بے دردی سے نوچے بال و پر دیکھے گا کون

دست و بازو ہیں سلامت اور زمیں قدموں میں ہے
جب نکل آئے چمن سے لوٹ کر دیکھے گا کون

ساری بستی جل رہی ہے خود کوئی تدبیر کر
ایسے ہنگامے میں انجمؔ تیرا گھر دیکھے گا کون

رام لعل ندیم



تاریکیوں کا ساتھ ہے جاؤں جدھر کو میں
کب سے ترس رہا ہوں طلوعِ سحر کو میں

چھوٹا جو گھر تو زخم کی لذت نہ پھر ملی
صحرا میں ڈھونڈھتا ہی رہا بام و در کو میں

سمٹا غبار تو کئی چہرے نکل پڑے
گلیوں میں دیکھتا ہوں تری رہگذر کو میں

پیروں کے زخم ریت کی گرمی سے جل گئے
کھوتا رہا سفر میں متاعِ سفر کو میں

مجھ کو ہوس نہیں ہے بہاروں کی اے ندیمؔ
ویرانیوں کے ڈر سے سجاتا ہوں گھر کو میں

آزاد گلاٹی



عذاب کم نہیں یہ، اور کچھ عذاب نہ دے
دیئے ہیں خواب تو مجھکو شکستِ خواب نہ دے

جہاں نگاہ نہ ٹھہرے شعور سو جائے
کتابِ جسم سے پڑھنے کو ایسا باب نہ دے

مہک کے خود ہی بکھرنے کا دھیان آئے گا
تو اُس کے ہاتھ میں کھلتا ہوا گلاب نہ دے

گھنے درختوں کو سائے نہ بخش بادل کے
سلگتی ریت کے ہونٹوں کو آفتاب نہ دے

خود اپنی پیاس سے سلگا ہوا ہے وہ آزادؔ
اسے تو اپنی تمناؤں کے سراب دے

سیدہ نسیم چشتی



چٹان کے سینے کا دھواں دیکھ کے روئے
پتھر کے پگھلنے کا سماں دیکھ کے روئے

ہر برگِ گل و لالہ پہ، ہر حسنِ جبیں پر
ہم وقت کے قدموں کے نشاں دیکھ کے روئے

اڑتی تھی پریشان سی اِک خاک چمن میں
گرتی ہی تھی بجلی تو کہاں دیکھ کے روئے

ہم اپنے تصور میں بہت دور سے جاکر
خالی تری الفت کا جہاں دیکھ کے روئے

جب چاک گریباں تھے بہاروں کا جنوں تھا
اب ہوش میں آئے تو خزاں دیکھ کے روئے

چہروں سے تبسم کی نقابوں کو ہٹا کر
تحریرِ غم و دردِ نہاں دیکھ کے روئے

روتا تو ہے خود اپنے غموں پر ہر اک انساں
انساں کو ہم اشک فشاں دیکھ کے روئے



گلاب آگ کے کھلتے ہیں برف کے بن میں
بھڑک اٹھے نہ لو احساس کی بجھے تن میں

کبھی تھا نیزہ و تلوار جس نگہ کو جہاں
عجیب لوچ سا تھا آج تو اس آہن میں

کوئی حبیب، کوئی دوست یا کوئی ہمدم
کسی کے لمس کی لذت تھی دستِ رہزن میں

وہ قاتلوں میں ترا نام تا رقم نہ کریں
ہم اپنے سر کو چھپا لائے اپنے دامن میں

نواحِ دل سے لہو کی ندی سی بہتی ہے
اُبل پڑے نہ یہ طوفاں سے مل کے ساون میں

غموں کے ساتھ عجب سلسلہ تھا چاہت کا
مہک رہا ہے ابھی تک دماغ درپن میں

تلاش رہتی ہے جس سائے کی ہمیں دن بھر
وہ رات ہوتے ہی آ بیٹھتا ہے روزن میں

مطرب نظامی



میرے اشعار تو چپ ہیں بتِ آذر کی طرح
آج کل آئینہ خانے بھی ہیں پتھر کی طرح

ذہن و احساس میں اک جنگ ہوئی ہے جب سے
آرزوئیں بھی ہیں ہارے ہوئے لشکر کی طرح

میری ہر سانس میں کیونکر نہ ہو خوشبوئے وفا
میرا احساس ہے اک شاخِ گلِ تر کی طرح

آج چہروں کی کتابوں پہ جمی ہیں نظریں
فکر خاموش ہے سنجیدہ سخنور کی طرح

حاشیئے چھوڑ دیئے تشنگی نو کے لئے
میں سرابوں سے بھی گذرا ہوں سمندر کی طرح

لبِ سقراط کی توجیہہ ضروری تو نہیں
زندگی آج بھی ہے زہر کے ساغر کی طرح

کوئی تحریکِ تبسم ہے، نہ آوازِ شکست
شیشہ و گل بھی ہیں کیا میرے مقدر کی طرح

عکس تک آنہ سکا شیشۂ خودداری پر
ہاتھ پھیلایا بھی میں نے تو، تونگر کی طرح

کیسے پیراہنِ قسمت میں رفو ہو مطرب
یادِ ماضی تو میرے دل میں ہے نشتر کی طرح

تابش سلطانپوری

دوپہر گذری دن ڈھلا بھائی
دور جانا ہے، میں چلا بھائی

میں جہاں ہر نفس شہید ہوا
میرا گھر تھا وہ کربلا بھائی

میں بہت ہی بُرا بجا صاحب
تم بہت ہی بھلے بھلا بھائی

کیوں جھجکتا ہے بات کرتے ہوئے
کہہ جو کہنا ہے برملا بھائی

اب یہ رکھتا ہوں پھونک پھونک قدم
تھا کبھی میں بھی منچلا بھائی

تو نہ اپنا بُرا، اگرچہ لے
دوسروں کا نہ کر بھلا بھائی

اپنے تھوڑے سے فائدے کے لئے
کاٹ دے تو مرا گلا بھائی

اتنی اونچی عمارتیں نہ بنا
آنے والا ہے زلزلہ بھائی

تھی جوانی بلائے جاں لیکن
جب گئی تو بہت کھلا بھائی

انجم جے پوری



داستاں پیار کی لے پیرِ مغاں چھوڑ چلا
میں ہر اک جا پہ ہونٹوں کے نشاں چھوڑ چلا

یاد کر لینا مجھے بھی جو کبھی دور چلے
تشنگی روح کی لے دوست یہاں چھوڑ چلا

تم نے دیوانے کو کیا کہہ کر اٹھایا در سے
ایسا شرمایا کہ بس دونوں جہاں چھوڑ چلا

ہمسفر تیری تمنا ہی مری منزل ہے
ڈھونڈ لینا تو وہیں مجھ کو جہاں چھوڑ چلا

کوئی آہٹ بھی نہیں ہے مری دھڑکن کے سوا
اے غمِ عشق مجھے لا کے کہاں چھوڑ چلا

مجھ کو ڈھونڈھے گی مرے بعد یہ دنیا انجم
اپنی غزلوں میں محبت کا بیاں چھوڑ چلا

تمکین الرحمٰن



کوئی آہٹ، کوئی نغمہ کوئی آواز نہیں
کان دستک پہ لگے ہیں گھر کا دروازہ نہیں

جو دھڑکتا ہے مرے اندر وہ مرا دل نہیں
منتشر مجھ میں جو ہے وہ مرا شیرازہ نہیں

مجھ کو اب کس جرم کی دینگے سزا آخر جناب
کربِ غم سہنا ہی کیا چاہت کا خمیازہ نہیں

تم ہی اے خاموشیو، پتھر اٹھا کر پھینک دو
دل کی سونی رہگذر پر کوئی آوازہ نہیں

مدتوں سے مبتلا ہوں، خواہشوں کے کرب میں
زندگی اک زخم ہے اور زخم بھی تازہ نہیں

تم مرے ہمراہ شاید دور تک چلتے مگر
خود مجھے بھی میرے مستقبل کا اندازہ نہیں

مصطفیٰ مومن



لفظوں کو آسرا دے معانی کا پاس رکھ
عریاں بدن کے واسطے دل کا لباس رکھ

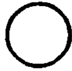
ہمدم! نہ سوکھ جائے یہ تالاب جسم کا
قطرہ اگر ہے تو، تو سمندر کی پیاس رکھ

تجھ سے ترا وجود یہ سورج نہ چھین لے
اِک سائبان دشت کا تو اپنے پاس رکھ

نقطے کی روشنائی بکھر کر نہ پھیل جائے
الفاظ کے مکان کی محکم اساس رکھ

حرفِ غزل پگھل گیا آئینے کی طرح
دل کی کتاب کا بھی کوئی اقتباس رکھ

شبنم کے واسطے کوئی سورج تلاش کر
شیشے کا آدمی ہوں چٹانوں کے پاس رکھ



دل کی ہونٹوں سے کوئی بات چرالی جائے
فال اس شخص کے چہرے سے نکالی جائے

ہو نہ جائے کہیں جسموں کا لہو خاکستر
دیکھنا! آج کوئی وار نہ خالی جائے

دکھ کا احساس مٹاؤں نہ تو جاؤں گا کہاں
کیوں نہ جی کھول کے اک بزم سجالی جائے

آہی جائیں گے نئے لوگ کہ ہے رسم یہی
اک نئے شہر کی بنیاد تو ڈالی جائے

دھوپ اور سائے میں کیوں فاصلہ رہنے پائے
بہتے پانی میں کوئی راہ نکالی جائے

نہ سہی رنگ کسی طرح منالو ہولی
آؤ، رہگیروں پہ کیچڑ ہی اچھالی جائے

قرار برہانپوری



غریب گاؤں کے سر سے گذر گیا پانی
بچھا کے پھر صفِ ماتم اُتر گیا پانی

بہا کے لے گیا محنت، اُگا گیا آنسو
مہکتے کھیتوں کو نم ناک کر گیا پانی

خدا کی یاد کہیں سے بہا کے لایا تھا
ہر ایک گھر کو دعاؤں سے بھر گیا پانی

مرا قلم کبھی شبنم اُگل نہیں سکتا
نفس نفس کو دھواں دار کر گیا پانی

ہزاروں ہاتھ دعا کر کے ہو چکے مایوس
تو یہ گمان بھی گذرا کہ مر گیا پانی

لہولہان محلوں سے کیوں نہیں گذرا
قرار کام کی باتیں بسر گیا پانی

غلام رسول اشرف



میں وہی سختیٔ حالات کا سہنے والا
درد کے شہر میں ہنستے ہوئے رہنے والا

مبتلا کرتے ہیں احباب تو خوش فہمی میں
ایک آئینہ ہے سچ بات کا کہنے والا

چل دیا وہ بھی گناہوں کے جزیرے کی طرف
شہرِ تقدیس میں دن رات کا رہنے والا

بیتے موسم میں لہو پی گیا سارا سورج
اب کی برسات میں دریا نہیں بہنے والا

نام اشرف ہی کا مشہور ہوا تھا لیکن
سیلِ دریا میں کوئی اور تھا بہنے والا

ظفر کلیم



حالات جب بھی شہر کے ابتر گنے گئے
شیشے کے ہر مکان میں پتھر گنے گئے

بستر کھلا تو نیند کی راحت ہوئی نصیب
آنکھیں کھلیں تو شہر کے منظر گنے گئے

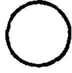
ہم بیکسوں کے قلب و جگر پر ہی کیوں ظفر
لفظوں کے تیر طنز کے نشتر گنے گئے

اٹھے کچھ اس طرح نہ کہ قاتلوں کے ہاتھ
دار و رسن گنے نہ گئے سر گنے گئے

ٹوٹے ہوئے مکان ٹپکتی ہوئی چھتیں
ہم مفلسوں کے کیسے مقدر گنے گئے

دنیا بھی اک بڑا سا جزیرہ لگی مجھے
چاروں طرف زمیں کا سمندر گنے گئے

زخموں کا کاروبار کی ترویج میں ظفر
کچھ دوستوں کے نام بھی اکثر گنے گئے



ہر قدم حادثوں کی بصارت میں ہوں
ہر نفس میں عذابوں کی حالت میں ہوں

زندگی اک مسلسل سفر ہے مگر
تھک گیا ہوں کہ پیہم مسافت میں ہوں

قید ہوں زندگانی کی زنجیر میں
مختصر یہ کہ اپنی حراست میں ہوں

غور سے پڑھ رہا ہے زمانہ مجھے
یاد رہ جانے والی عبارت میں ہوں

کم نہیں یہ شرف بھی کہ اس شہر میں
خیر سے اہل فن کی سماعت میں ہوں

اس خطا پر کہ میں بے خطا ہوں ظفر
شہر کی سب سے اونچی عدالت میں ہوں



کرشن کمار طور



تماشہ دیکھوں کہ عکس نہاں آئینہ لکھوں
ہوائے کلس کو گنج گراں آئینہ لکھوں

نظر پہ بار ہے آب تعلق، سخن کیا ہو
صدائیں دوں کہ شگافِ زباں آئینہ لکھوں

ہر ایک لمحہ رسی، نارسی کا تماشا ہے
نہ آسماں نہ کفِ آسماں آئینہ لکھوں

ہر ایک زخم تعلق کروں اب نمک آلود
تمام چہروں پہ رنجِ جہاں آئینہ لکھوں

شریک ہو کے بھی خود سے میں طور اب علیحدہ ہوں
نہ لامکاں نہ متاعِ مکاں آئینہ لکھوں

صابر زاہد



مت بجھا شمعیں کہ رس تک ہوا
روشنی ہے رطب و یابس تک ہوا

کوئی اندر ہو تو دروازہ کھلے
دے رہی ہے دیر سے دستک ہوا

شہر میں آواز کے پتھر سے اب
پھر رہی ہے پھوڑتی مستک ہوا

پیش منظر ہے، نہ پس منظر کوئی
چشمِ بینا ہے اگر بس تک، ہوا

بھیڑ میں تجھکو بھلا دیکھے گا کون
تو ہے جو کر تیری سرکس تک ہوا

بھینی بھینی سی مہک ہے ہمسفر!!
چھوڑنے آئی مجھے "بس" تک ہوا

پھر ابال آئے گا زاہد خون میں
بھر گئی ہے آگ نس نس تک ہوا

شمیم طارق



شرحِ ہنگامۂ دل پر مرا قابو بھی نہیں
رونا اس بات کا ہے رونے کو آنسو بھی نہیں

آرزو اتنی بڑھی روح پہ چھالے آئے
دل کی تسکیں کے لئے نرگسِ جادو بھی نہیں

دل جسے کہتے ہیں، آزاد پرندہ ہے وہ
جس کی تسخیر پہ قادر کوئی سادھو بھی نہیں

اپنے اعمال کا آئینہ ہے اپنی قسمت
عکسِ کیتو بھی نہیں پرتوِ راہو بھی نہیں

سانس کے گہرے سمندر میں پڑا ہوں طارقؔ
موت سے پہلے کوئی زیست کا ٹاپو بھی نہیں

امان اختر



ریت ساحل پہ اس قدر دیکھوں
کیا سمندر کھنگال کر دیکھوں

تھک گیا در پہ دستکیں دے کر
سنگِ دیوار میں اگر دیکھوں

کس دریچے سے ہے صبا اُتری
ہے کہاں خوشبوؤں کا گھر دیکھوں

موسمِ گل کہاں کہاں مہکا!
ساری بستی سمیٹ کر دیکھوں

آئینہ بن گئی کھُلی کھڑکی
چاند اِک اور بھی ادھر دیکھوں

دوست بچھڑے سبھی امانؔ اختر
میں بھی اب دوسرا نگر دیکھوں

شمیم عباس



کچھ دولتِ الفاظ تھی کچھ فکرِ رسا تھی
کچھ ورثہ تھا اجداد کا کچھ اپنی ادا تھی

اِک ہم کہ کبھی ہو نہ سکے شور کا حصّہ
حالاں کہ ترے نام پہ اپنی بھی صدا تھی

کیا جانئے آنکھوں کا تماشا تھا کہ سچ مچ
ہر شئے تھی بجز اس کے مگر تھی تو ہوا تھی

یاد آتی ہے اچھی سی کوئی بات سرِ شام
پھر صبح تلک سوچتے رہتے ہیں کہ کیا تھی

کچھ شعر گوارہ ہوئے آخر ترے عباس
یہ شرف یہ عزت تو بڑی بیش بہا تھی

رفیعہ شبنم عابدی



اک بار بھول ہو گئی پھر سے نہ بھول کر
اب طور پر نہیں مرے دل میں نزول کر

خوابوں کی پیاس، کرب کا خنجر، انا کا خون
میں بھی قتیل ہوں، مرے سجدے قبول کر

ہر نقش تاکہ صاف ابھرتا دکھائی دے
اذہان پر جمی ہے، ذرا دور دھول کر

اپنے گناہ "اجنبی چادر" میں ڈال دے
یوں اپنی پاکبازی کی قیمت وصول کر

باقی رہے نہ اِک رگِ جاں کا بھی فاصلہ
آسیب بن کے جسم میں ایسے حلول کر

شبنم سے سادگی و تقدس نہ چھن سکے
یارب اُسے کنیزِ جنابِ بتول کر

خسروی

پاکستان



کہاں تک یادِ عہدِ وصل میں آنسو بہائیں گے
وہ روز و شب الٰہی کیا کبھی پھر اب نہ آئیں گے

زمانہ ہو گیا دیکھے ہوئے بھی گو اُسے لیکن
نہ بھولے آج تک بھی جب، تو کیا اب بھول پائینگے؟

بہار آئے نہ آئے، یہ جنوں تو اب نہ جائے گا
وہی ایامِ گل ساری خزاں میں یاد آئیں گے

گذر تو جائیں گے یہ دن بہرحالت سبھی لیکن
جو اس کے ساتھ گذرے تا دمِ آخر رُلائیں گے

رہی باقی نہ اپنی یاد بھی، کوئی گر اب پوچھے
ہمارا نام بھی ہم سے، تو اس کا ہی بتائیں گے

ملیں دونوں جہانوں کی خوشی بھی گر مقدر سے
نہ ہوگا ساتھ جب وہ ہی، یونہی آنسو بہائیں گے

یہ مانا خسروی اب وہ ستمگر تو نہ لوٹے گا
مگر یہ زخم تو جو دے گیا بھرنے نہ پائیں گے

مانوس سہسرائی



خود اپنی قید میں ہر آدمی ہے
خداوندا یہ کیسی زندگی ہے

کچھ ایسے دور میں ہم جی رہے ہیں
ہر اک امید کی صورت نئی ہے

کبھی آسان تھی شام و سحر یہ
مگر اب اک معمہ بن گئی ہے

نکلنے کو تو نکلا چاند لیکن
کہاں آسودگی کی چاندنی ہے

وہ سنتے ہی نہیں تو کیا کریں ہم
ہزاروں مرتبہ آواز دی ہے

نہ جانے دل پہ کیا مانوس گذری
درِ احساس پر اک بیکلی ہے

سعید راہی



خاک میں مل کے آسماں کی کہی
ہم نے ہر دل کی ہر زباں کی کہی

میرے سجدوں کا ذکر کرتے ہوئے
اس نے اپنے بھی آستاں کی کہی

سارے عالم میں ڈھونڈ آیا اُسے
جانے اس نے بھی کس جہاں کی کہی

زندگی کچھ تو بار یوں بھی تھی
اور کچھ تم نے اس جہاں کی کہی

مژدۂ جاں فزا ہے راہی کو
آج رہزن نے کارواں کی کہی



خوش رہے یا بہت اُداس رہے
بیتے رشتوں کا تجھ کو پاس رہے

ایسا کچھ کر کہ تیرے جانے پر
تیرے آنے کی دل کو آس رہے

وہ بھی اب پوجنے کے قابل ہیں
دو گھڑی جو تمہارے پاس رہے

تو بھی کب چین سے رہا ہوگا
مدتوں ہم اگر اُداس رہے

آشنا تجھ سے کس طرح ہوتے
ہم تو خود سے بھی ناشناس رہے

ناظم انصاری



بچوں جیسی خدمت کیجئے قبلہ آدھی رات کے بعد
میخانے کا در نہیں اوپن ہوتا آدھی رات کے بعد

جانے کیا کیا کا ناپھوسی دونوں گھنٹوں کرتے ہیں
جب ہوتے ہیں پنڈت و ملا یکجا آدھی رات کے بعد

رات سے پہلے مولوی صاحب خوب دبا کر کھاتے ہیں
اور عشا عنٹ پھر پیتے ہیں ملکا آدھی رات کے بعد

اپنے بارے میں بولو تو بتلا دوں گا لے لٹو ز یڈر
میں کیا جانو کیا کرتے ہیں قبلہ آدھی رات کے بعد

شام سے پہلے کہہ دیتے تو سوجاتا نٹ پاتھ پہ میں
لیکے بھلا اب جاؤں کہاں میں کھٹیا آدھی رات کے بعد

تم کیوں بیٹھے جاگ رہے ہو تم کو کیا بیماری ہے
ہم شاعر ہیں ہمکو تو ہے سونا آدھی رات کے بعد

اپنی اپنی گھڑیاں دیکھو کتنے بجے ہیں اے یارو
رہتے نہیں ہیں گھر سے باہر شرفا آدھی رات کے بعد

بھوک سے بچے جاگ رہے تھے بیگم بھی تھیں نے دیدہ
بزمِ سخن سے ناظم جب گھر لوٹا آدھی رات کے بعد

ایم آئی ساجد



میری آنکھوں سے وفاؤں کو چرانے والا
خود بھی روئے گا مجھے ساتھ رلانے والا

میرے اندر ہی کہیں لاش کی صورت ہے پڑا
لحظہ لحظہ وہ مرے دل میں سمانے والا

اشک بنتے ہیں گہر درد نکھر جائے اگر
کوئی محسن تو ملے زخم لگانے والا

ٹوٹ جائے گا کسی روز کھلونے کیطرح
خواب شیشے کی نگاہوں سے چرانے والا

وقت آیا تو چڑھائے گا مجھے بھی سولی
دار کرنے سے نہ چوکے گا زمانے والا

میری چاہت کو سرِ عام کرے گا نیلام
میرا کردار بنائے گا فسانے والا

جانے کیا مانگتا رہتا ہے دعائیں ساجد
مجھ کو احساس کی سولی پہ چڑھانے والا

شاہین بدر



ہے زمیں حیرت زدہ اور آسماں بھی دنگ ہے
ایک آئینہ بدن جو پاسبانِ سنگ ہے

بھیگے ساون کی دھنک بن کر نکھر آئی ہے یاد
آج تنہائی کا منظر کس قدر خوش رنگ ہے

میں وہ قطرہ ہوں کہ جس سیپ کی بجھتی پیاس
تم سمندر ہو تو پھر کیوں دل تمہارا تنگ ہے

ناچتی ہے وقت کے بازیگروں کے ہاتھ میں
زندگی بھی تاش کے پتوں سے ہم آہنگ ہے

چیختے ہیں پیڑ کی شاخوں پہ پتے خوف سے
جانے کیسا موجۂ بادِ صبا کا رنگ ہے

آئینے کو جھوٹ کی عادت نہیں شاہیںؔ بدر
میرا چہرہ میرے احساسات کی فرہنگ ہے



جسم کے شیشے پہ تپتی دھوپ کا پتھر لگا
میں گھنی چھاؤں میں پہونچا تو وہاں بھی ڈر لگا

وقت کی گردش کی سرد آغوش میں سب سو گئے
شیریں لہجوں کا جزیرہ بھی ہمیں بنجر لگا

جس طرح سے نیلگوں گہرے یہ سناٹوں کے زخم
میرے احساسات پر بھی وقت کا نشتر لگا

بے اماں لمحوں کے پربت سے اٹھا وہ زلزلہ
نقشِ فریادی ہمارے شہر کا منظر لگا

زندگی اس جگ میں شیشے کا کھلونا بن گئی
ایستادہ آدمی شوکیس کے اندر لگا

یوں تو سارا شہر تھا آباد اے شاہینؔ بدر
وقت کے سیلاب کو پیارا مرا ہی گھر لگا

سید ارشاد حیدر



مٹا مٹا سا پُراسرار نقش کس کا ہے
غبارِ فکر کے اس پار نقش کس کا ہے

چھٹے جو دھند تو میں دیکھ لوں دریچے سے
پسِ نظارہ شرر بار نقش کس کا ہے

کٹے ہیں ہاتھ لبوں پر ہے مہرِ خاموشی
بتاؤں کیسے کہ شہکار نقش کس کا ہے

مکاں میں گونج رہی ہے یہ سرد سرگوشی
کھنڈر میں بے در و دیوار نقش کس کا ہے

یہ لمحہ لمحہ اترتے سفید منظر میں —
بتا اے چشمِ گرفتار نقش کس کا ہے

یوسف جمال



کیا خاک سمجھتے ہم، گونگی سی لکیریں تھیں
چہرے پہ تھکن کی جو دیوانی لکیریں تھیں
خندق کے پرے کیا ہے بس ایک تجسس تھا
چاہت کے تناظر میں تحقیقی لکیریں تھیں
آگے تھا ابھی گونگے موسم کا سفر باقی
لیکن مرے چہرے پر شیائی لکیریں تھیں
رنگوں کا یہ کوئی بھی پرکار اشارہ تھا
رنگوں کی تماشائی بے چاری لکیریں تھیں
تن سرد ہوئے کالے انگاروں کی گودوں میں
روحوں کے تلاطم میں فریادی لکیریں تھیں

یہ بوڑھی روایت تھی تاریخ میں گاؤں کی
برگد کی ضعیفی میں آسیبی لکیریں تھیں

گوہر امروہوی



گذر رہے ہیں ابھی بحرِ آفتاب سے ہم
تراشتے ہیں بھنور ایک موجِ آب سے ہم

ہم احتیاط کی شاخوں پہ کھلنے والے ہیں
بکھر نہ جائیں ترے ہاتھ میں گلاب سے ہم

مہک نصیب نہیں تھی نصیب ہو نہ سکی
گلاب چنتے رہے وقت کی کتاب سے ہم

ہمیں نہ روک خزاؤں کے بے رحم عفریت
گذر کے آئے ہیں تجدید انقلاب سے ہم

ترس گئی ہیں نگاہیں بھی دیکھنے کے لئے
پڑے ہیں کتنے ہی ذہنوں میں خواب خواب سے ہم

گذرتے رہتے ہیں طوفان و ساحل و باراں
یہ موجِ آب ہے ہم سے تو موجِ آب سے ہم

صدف کو یاس کا گوہر نہ مل سکا ورنہ
بہت قریب رہے ان کے اضطراب سے ہم

سوز ملیح آبادی



کعبہ نہ کہیں اور نہ بت خانہ کہیں اور
سب کچھ درِ جاناں پہ ہے جانا نہ کہیں اور

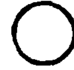
ہر رنگ کی پریاں ہیں بھری شیشے میں دیکھو
اڑ جائے نہ لیکر یہ پری خانہ کہیں اور

جس طرح کہ تم نے ہمیں برباد کیا ہے
اس لطف سے مرنے کا مزہ تھا نہ کہیں اور

کس بات کا پردہ تھا جو ہر بات میں کہتا
بندہ تھا کہیں اور خدا تھا نہ کہیں اور

بیکار سرِ بزم پریشان ہوئے سوز
اب ڈھونڈیئے جاکر درِ جاناں نہ کہیں اور

ابراھیم مقبول



کب تک جھوٹے سچے قصے سنتا اور سناتا وہ
نفرت شعلہ بن جاتی تو کیسے آگ بجھاتا وہ

ہو کا عالم، بھاگتے سائے، خوفزدہ سناٹے تھے
کس کے در پہ جاکے آخر اپنا سر ٹکراتا وہ

وہ تو کہو پتھراؤ میں اس نے شہرت پالی تھوڑی سی
شیش محل میں بیٹھے بیٹھے چپکے سے مرجاتا وہ

اپنے ہاتھوں میں لوگوں نے دل کو چھپا کے رکھا تھا
دل کا کاسہ ہاتھ میں لے کر کس کے در پہ جاتا وہ

گلیاں، کوچے، کانٹے پتھر، چوٹ، جلن، اندھیاری رات
کون سے پتھ پہ چل کے آخر اپنی منزل پاتا وہ

پھول بنا مقبول تو اس کو سر سے کچلا لوگوں نے
ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا چٹان اگر بن جاتا وہ

شمس قمر



کان دیوار سے لگاتا ہوں
تب کہیں کوئی بھید پاتا ہوں

آپ گھر بار پر نظر رکھئے
کھڑکیوں کو میں آزماتا ہوں

تم حقیقت سے اوب جاؤ گے
میں کہانی تمھیں سناتا ہوں

وہ بھی ہشیار ہے نہیں آتا
میں بھی نادان ہوں بلاتا ہوں

ایک برسات شمس کٹ جائے
کوئی فٹ پاتھ پھر بساتا ہوں

راہی قریشی



جراحتوں کو سلگنے دے، کم نہ ہونے دے
بس اتنا صبر دے، آنکھوں کو نم نہ ہونے دے

بچا ضمیر فروشوں میں آبرو میری
میں آبجو سہی، دریا میں ضم نہ ہونے دے

غبار بن کے بکھرنے دے تو مجھے، لیکن
کسی کی راہ کا نقشِ قدم نہ ہونے دے

نباہ لے یہی طرزِ ستم سلیقے سے
نہیں کرم کی تمنا، کرم نہ ہونے دے

جھکا دے صرف انا کے حرم میں سر میرا
کسی کے در پہ جبیں میری خم نہ ہونے دے

یہی بہت ہے کہ سایہ رفیق ہے راہی
سفر کے واسطے ساماں بہم نہ ہونے دے

عبدالحی انجم۔



وہ ہاتھ زخمِ تمنا کو چھو گیا جیسے
گلاب سا مرے سینے میں کھل اٹھا جیسے

میں اپنا دردِ جدائی کسی سے کہہ نہ سکا
ہر ایک شخص لگا تیرا آشنا جیسے

ترے جمال سے بڑھ کر ترے خیال کی لو
اس آئینہ میں تو سورج اتر گیا جیسے

وصالِ یار کا ہر پل نئے جنم ایسا
فراقِ یار ہے صدیوں کا فاصلہ جیسے

عجب اداس خوشی کا اسیر ہوں انجم
کسی مزار پہ جلتا ہوا دیا جیسے

بھگوان داس اعجاز

دوہے

میرے ایک سوال پر سب بیٹھے ہیں مَون
دُرلبھ ہے مانُش جنم دنیا میں خوش کون

آخر مجھ پر کھُل گیا میرے دل کا راز
آئی ہے ہنستے سمے رونے کی آواز

دنیا کا دستور بھی رہا ڈھول کا پول
جس وستو میں گن گھنے اس کا سستا مول

اہنکار وش لُٹ گیا چھایا مایا جال
سب کچھ پاکر بھی رہا میں پگلا کنگال

کس کس کا حل ڈھونڈیئے کہاں بنے کی بات
پرشن قطاریں باندھ کر کھڑے اٹھ کر ہاتھ

سب بیوپاری مر گئے ایسی ڈوبی ناؤ
افواہوں میں بک گیا سونا ماٹی بھاؤ

ہاتھ بڑھا کر دے رہے ہیں لوگ مجھے اُپہار
میرے سواگت کے لئے میرے گھر کے دوار

حرمت الاکرام

اندیشۂ فردا

گپھاؤں سے نکل کے
آدمی کی فطرتِ نمو
بنی فروغِ کاخ و کو
اٹھی صدا یہ چار سو
کہ آدمی عظیم ہے
بصیر ہے فہیم ہے
یہ فاتحِ حیات ہے
یہ فخرِ کائنات ہے
گزرتے ماہ و سال سے
کھیل کھیلتے رہے
چراغ ـــ قمقمہ بنا
زمیں جگمگا اُٹھی،
وفورِ جہد سے بچی
نہ خلوتِ نجوم بھی
[رموز کو زباں ملی]
علوم کی صلابتیں
فنون کی جلالتیں
شناورِ خلا بنیں
ورائے کہکشاں گئیں

شعور سرخرو ہوا
مگر سرور ارتقا
بنا حریفِ آگہی،
فراستوں کا نطق
شیر سا دہاڑنے لگا
کتابوں کے دہن کھلے
نہنگیاں لئے ہوئے
علوم کی زبان کا
جوہرِ غفی کھلا تو
ناگنوں کو رشک آگیا
فنون کے لباس پر
گمان کھال کا ہوا
برہنگی مچل اٹھی
درندگی مچل اٹھی
سجے سجائے پیکروں میں
قافلے وحوش کے
ملے رباب چھیڑتے
شرافتیں، شرارتوں
بصیرتیں، رعونتوں

لطافتیں، کثافتوں
کی غمگسار بن کے
شاد ماں ہوئیں —
خلوص، مکر کے لبوں
میں شہد ڈھونڈنے لگا،
سیہ شبی کی وسعتوں میں
جاگ اٹھی وہ روشنی
کہ ناگ گھومنے لگا
بغیر من کی جوت کے
نظر نواز — دل نواز
جاں نواز بستیاں
پکار اٹھیں "اماں! اماں!"

چراغِ جاں کی آرزو
ڈگر ڈگر — نگر نگر
حشیش کے دھوئیں سے
بوتلوں کی سرد آگ تک
دقیق فلسفوں، بلیغ
نظریوں کی ریت میں
سراب در سراب
جسم و روح کو لئے پھری
[ملی نہ ایک بوند بھی]

مگر، تہوں سے ریت کی
نقاب الٹ کے دفعتاً
خزینۂ نہفتہ سا
زمانِ رفتہ کا فراغ
پاؤں سے لپٹ گیا
پھر ایک بار آدمی
سنبھالے نازِ کاغ و کو
کھڑا ہوا تھا سانس
لیتے جنگلوں کے درمیاں
اماں طلب۔ پناہ جو



نیاز حیدر

یادش بخیر

(۱)

یاد کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں وہ چہرے
جن سے تھا نگاہوں کا اور دل کا یارانہ
مسکراہٹیں، شمعیں، نشہ، نوجواں آنکھیں
ہر اشارا ہر لمحہ زندگی کا پیمانہ

(۲)

سوچتا ہوں میں اکثر اس زمیں کے بارے میں
زندگی کی جنّت، اور زندگی سے بیگانہ!؟
یہ حسین سیّارہ خالقِ بشر بھی ہے، شائقِ گلستاں بھی
اور ایسی جنت کا ہر خیال ویرانہ!
چاند کی شعاعوں میں ناچتے ہوئے ذرّے
دلنواز، دلکش جسم، جن کا رقص دیوانہ
محفلوں کے ہنگامے، قہقہوں کی راتوں کو، صبح تک جگاتے ....اور....
.... اور سنہری کو تاروں کی، ڈھانپ لیتی دامن سے، اٹھ کے خاکِ پروانہ

(۳)

یاد کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں وہ چہرے
جاں نواز چہروں پر زخم ہیں خراشیں ہیں
نفرتوں کے ہیں آثار، انتقام کے جذبات
قتل کے ارادوں پر دستِ قاتلانہ رقص ہے
دوستِ آدمیت کے، جن کی دوست لاشیں ہیں
جاں نواز چہروں پر زخم ہیں خراشیں ہیں
یاد کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں وہ چہرے

(۴)

بہتی خموشی سے،
گونجتی فضاؤں میں
ہے سکوت کا عالم!
ایٹمی دھماکوں کے گھاؤ تابکار ایسے
جن سے ہر جہنم کم ——!
تابکار غاروں سے
مادرِ زمیں کا دل
زندگی کا سرچشمہ
کہکشاں کی گنگا پر
معجزے دکھاتا ہے
مشرق اور مغرب کی سرحدیں مٹاتا ہے۔

(۵)

یاد کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں وہ چہرے
شکل کے بغیر اک شکل
بے نگار و نقش اک بت
سنگ و خشت [illegible]

اک عجب ہیولا سا!
اِک جھلک دکھاتے ہی یک بہ یک ہوا اوجھل
اک صدائے بے پایاں،
اک ندائے ہیبتناک، چھا گئی زمانے پر
انتڑیوں کے خنجر کی، مذہبوں کے دھموں کی آسمان سے بارش
گولیاں، دھواں، بارود
کعبہ ہو کہ بت خانہ
ہر خدا، خدائی کا زور آزماتا ہے
اور زمیں کی مٹی کا تیل بیچ کھاتا ہے

(۶)

اسلحے، نئے ہتھیار،
موجدوں سے ہیں بیزار
تھے جدید ابھی سب تھے
اب کہ اب ہوئے بیکار!؟
سرحدی کباڑی جو لڑتے اور لڑاتے ہیں
چور منڈیوں میں آج ان سبھوں کی ہے بھرمار —

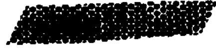
(۷)

یاد کے جھروکوں سے جھانکتے ہیں وہ چہرے
بند کردو یہ سودا
منفعت کے دیوانو
یہ جنونِ صیہونی
ہے زوال آمادہ
مصر کی بغاوت ہے جو جہاں آمادہ

انقلابِ ایراں پر کیا کہا تھا حافظ نے

"وقت را غنیمت داں، آں قدر کہ بتوانی
حاصلِ حیات اے جاں، ایں دم است تا دانی
زاہدِ پشیماں را ذوقِ بادہ خواہد کشت
عاقلا! مکن کارے، کاورد پشیمانی"

اتنے سارے چہرے ہیں
ہم نے ان کو کیا دیکھا؟
ہم نے ان کو کیا جانا!
یاد کے جھروکوں سے
جھانکتے ہیں وہ چہرے
جن سے تھا نگاہوں کا اور دل کا یارانہ



شاذ تمکنت

ترکِ تعلق

پا بہ گِل رات ڈھلے گی نہ سحر آئے گی
کوئی سورج کسی مشرق سے نہ نکلے گا کبھی
ریزہ ریزہ ہوئے مہتاب زمانے گذرے
بجھ گئے وعدۂ موہوم کے سارے جگنو !
اب کوئی برق ہی چمکے گی نہ ابر آئے گا
چار سو گھور اندھیرا ہے گھنا جنگل ہے،
تو کہاں جائے گی پھنکارتے سنّاٹے میں
سرحدِ یادِ گذشتہ سے پرے کچھ بھی نہیں
دیکھ اصرار نہ کر، مان بھی لے، لوٹ بھی جا
میں تری راہ کا پتھر ہی یہ بات تو سُن
آگے کھائی ہے اگر راہ کا پتھر ہٹ جائے

عبد الاحد ساز

آخری دور کے انسان

حشر بپا ہے !
دور تلک پھیلے میداں میں
گرمی شور، تپش، ہیجان ــــ ہنگامہ سا جاری ہے
ہر اک دور کے لوگوں کے
لاکھوں گروہ استادہ ہیں'
اپنے چہروں پر لئے
اپنے اپنے دور کے ان گنت نقوش
سہمی سہمی آنکھوں میں
ــــــــ ایک تجسس،
سانسیں تیز،
دل میں اندیشوں کا ہر دم پیچ و تاب
ہر جنبش میں اضطراب
بے چینی اور انتشار کا عالم ہے !

دور مگر........
حشر کے دور تلک پھیلے میداں کی آخری صف میں
حال عجب ہے،
کوئی تذبذب ہے نہ ہراس

.... نفسا نفسی نہ بے چینی
———— رکی ہوئی مشینوں کی سی خاموشی ہے۔
انسانوں کے گروہ کھڑے ہیں
ایسے گویا دھرے ہوئے ہیں
چہرے — بے اظہار سپاٹ
آہنی پیکر، میکانیکی حلیے:

بند کھلی پلکیں
—— "آن" اور "آف" سوئچ
نتھنے — گیسوں کے دو پائپ
—— جن سے آکسیجن اندر جایا کرتی تھی
کان کے پردے — مقناطیسی ڈرم
بربط پر شور بھری آوازیں بے ہنگم لہریں محفوظ کیا کرتی تھیں
ہونٹ — کہ جیسے "ٹیپ رکارڈر" کے "اسپیکر"
ہاتھوں کی دس انگلیاں — بجلی کے "کنڈکٹر"
دل کی جگہ — "پاور کنٹرول"
———— سرخ تیل کی سپلائی کا مرکز
ذہن کے خلیے
———— "کمپیوٹر" کے خانوں جیسے
جن میں اعصاب کی برقی حرکت سے
مبہم نقش، منقش ہو رہے تھے

سب کے ہاتھوں کے انگوٹھوں کے ناخن کی "چپ" میں
پھنسا ہوا ہے۔

اِک سادہ سا کاغذ —— اعمال کا کورا صفحہ —— دونوں کالم خالی
کوئی گنہ نہ کوئی ثواب ——!

نیچے کراماً کاتبین نے بس اتنا ہی سا لکھا ہے
کوئی عمل تحریر کے قابل تھا ہی نہیں
لکھنے کا کچھ کام نہیں ہوتا تھا
ہم ان لوہے کے کاندھوں پر بیٹھے اکتایا کرتے تھے

یزداں —— کرب آلود غم و غصّے سے پریشاں
بے معنی، تضحیک رُبا صورت پہ حیراں!
اِن کو کس زُمرے میں ڈالے
—— سزا جزا کا کون سا نکتہ ڈھونڈھنے
کیا فیصلہ دے؟

یا اِن کو کھڑا رہنے دے یہیں
کہ یونہی سوا نیزے پر اترے سورج کی گرمی سے پگھل کر بہہ جائیں
یا حکم تردید کرے
تاکہ تانبے اور لوہے کے یہ بدصورت ڈھانچے
یک لخت فنا ہو جائیں ——!



رشید عبدالسمیع جلیل

کوہِ رواں

میں کہ اِک کوہِ رواں
چلتا ہوں سیارے کی چال
گڑ چکا ہوں اپنے محور کی تہوں میں
کتنے یگ بیتے زمیں پر
ناپتا ہوں زرد مٹی کی سرنگیں
اپنے سائے کی حدوں سے
میری بے رنگی کے سر پر
نیلے احکاموں کا بوجھ
لال دریاؤں کا خوف
پی رہا ہوں
موسموں کی ریت سے ٹپکی ہوئی
مجرم ہوا
میں چلوں تو گونج کا دریا چلے
لفظ چمکے ۔ رنگ بکھرے
آنکھ آسودہ نہیں
کب سے جی میں ہے کہ پھٹ کر پھیل جاؤں
اور اگلوں کائنات
اپنے لاوے میں بہا دوں سارے آثارِ حیات

فیاض رفعت

لاعلمی

یہ کیسی لاعلمی ہے
کہ جسم کی تکان
ٹوٹتی سانسوں کی طرح
شجر سایہ دار کی تلاش میں
ادر چھور تکا کرتی ہے
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ شہروں کی بھیڑ میں
شجر کھو گئے
اپنے پرائے ہو گئے
جسم سائے ہو گئے

بانو طاہرہ سعید

طوفان کے آنسو

سالت فضا میں غبار چھا گیا
رفتہ رفتہ دنیا گہرے زرد رنگ میں تبدیل ہوگئی
آسمان اور زمین کے درمیان ہواؤں کی
گونج اٹھی۔
ہولناک تیزی سے طوفاں رقصاں تھا
آسمان پر بادل چھا گئے
زرد رنگ اب غائب ہوچکا تھا
ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ
بڑے بڑے ٹھنڈے قطرے گرنا شروع ہوگئے
لوگ انھیں کہتے ہیں "مینھ کی بوندیں"
میں انھیں
"طوفان کے آنسو"
کہتی ہوں!!

روی مصرا (آئی اے ایس)
(جوائنٹ سکریٹری انڈسٹری)

ایک خواہش

پنکھڑیاں
گلابی
ریشم سی ملائم
مجھے پالنا جھلاتی ہیں
مجھ میں ہی
ہولے ..... ہولے ...
جب کبھی
خود سے سہی
میں اپنے میں دیکھتی ہوں
تو کبھی کبھی
سہم کر
کھلکھلا پڑتی ہوں۔
بالوں کو پکڑ پاتی
تو ان کے بالوں کو سنوارتی
پنکھڑیوں کی خوشبو مہکتی
اور میں
کسی کو نہ جانے دیتی
کہ
مجھے اچھا لگ رہا ہے۔

تبدیلی

میری باہنوں میں
میرے گالوں سے اپنا ماتھا ٹکائے
میری بیوی
شام کو میرے سسترہویں جملے پر
مسکراہٹ چھوٹی کر کے
آنکھیں بند کر لیتی ہے
اور ہچکیوں پر
چپ چاپ سو جاتی ہے
تو یکایک مجھے ہنسی آجاتی ہے
کہ کبھی
تین سو میل دور سے بھیجے
میرے نو نغموں پر
اس لڑکی نے
دس دن آنسو بہائے تھے
اور ٹھیک سے نہ کھانے پینے کا دعویٰ کیا تھا۔



خواجہ عبدالغفور

فصاحت جنگ جلیل ـ فن اور فنکار

فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری کے فکروفن، شخصیت عروض زبان وبیان اورحیات جلیل کے دیگر پہلوؤں پرڈاکٹر مجنانہ والا، ڈاکٹر عبدالخالق انصاری، پروفیسر علی احمد جلیلی، مشتاق احمد جلیلی ان حضرات کی تقاریر و مقالات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔

حضرت جلیل مانکپوری پرسیمینار کا انعقاد شبیر احمد راہی صاحب نے کیاہے۔ موصوف نے بتایا کہ حضرت جلیل اوران کے خاندان کا تعلق مہاراشٹر کے اس علاقہ بھیونڈی سے اب بھی ہے۔ خانوادہ جلیل کے چشم وچراغ حیدرآباد بمبئی اور بھیونڈی میں ہیں۔

حضرت جلیل مانک پوری نے حیدرآباد میں اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ گزارا آپ کو دکن کے فرمانرواؤں کی اُستادی کا شرف حاصل تھا۔ آپ استاد الشعرا تھے۔ حضرت جلیل کی شاعری میں لطافتِ بیان اور ندرت بیان دبستان لکھنؤ کے بابت ملتا ہے۔ جلیل مصحفی سلسلہ کے شاعر ہیں اور مصحفی کے شاگرد رشید حضرت امیر سے شاگردی کا رشتہ جوڑا اسی لئے وہ بجا طور پر فخریہ انداز میں کہتے ہیں ؎

اس سخن کا جلیل کیا کہنا
مصحفی کی زبان ہے گویا

جلیل استادالشعرا تھے اوران کو دبستان لکھنؤ کی آخری شمع بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات کو جلا تلم رہئے دکن یعنی حیدرآباد میں ملی اور یہ نواب میر عثمان علی خاں خلداللہ ملکہٗ کے باوقار قابل احترام وتعظیم ایسے استاد مانے گئے کہ جن کا کلام بغیر 'رائے استاد جلیل' کے شائع نہیں ہوتا تھا۔ کلام بھی ایسا کہ جس کو بجا طور پر محققانہ اور ناقدانہ معیار سے کلام الملک، ملوک الکلام کہا جاتا تھا۔

ایک زبردست خوشحال اور شاہراہ ترقی پر گامزن ریاست کا والی جسکو استادمان لے اس کا لوہا تو ساری دنیا مانے گی۔ یہ اس نشاۃ الثانیہ کی بات ہے اوراس درخشاں وتابندان عہد کی سرگزشت ہے جبکہ نہ صرف جملہ علوم کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اوران کو بڑھاوا دیاجارہا تھا بلکہ اردو زبان کو بطورِ خاص ایک اعلیٰ مقام ایک حیطہ اقتدار اور ایک جامعہ کے روپ میں علمی ادبی سائنسی تحقیقاتی سلسلہ مل چکا تھا۔ اردو نہ صرف ذریعۂ تعلیم کی زبان تھی بلکہ انتظامی اور کاروباری بھی۔

جلیل کو بچپن ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ تیرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور مانک پور کے مشاعرے میں معصومانہ آن بان سے شرکت کرتے رہے۔ امیر کی شاگردی نے انھیں جو کچھ دیا سو دیا۔ بعد میں انھیں امیر مینائی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا جو خود اسیر کے شاگرد تھے جلیل کا رشتہ امیر مینائی سے کچھ اس طرح جڑا کہ وہ ان کے عزیز واقارب سے بھی کہیں زیادہ قریب ہوگئے۔ اس زمانہ میں فی الواقعی استادی کا رشتہ بھی کچھ ایسا گہرا اور اٹوٹ ہوتا تھا۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں مانک پور سے رام پور چلے گئے اور امیر اللغات کی تدوین کے کام کو سنبھالا۔

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے والد بزرگوار نواب سر محبوب علی خاں بھی اپنے دور اور وقت کے شاعروں میں اپنی بادشاہی طمطراق کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی علمی ادبی استعداد اور شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے بھی ارفع واعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں مصرع طرح کے ساتھ مشاعرے منعقد کئے جاتے تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں غفراں مکاں نے کل ہند اساس پر ایک مصرع طرح تجویز کیا۔

" یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے "

اس دور میں زلفیں اور کاکلیں کم ہوتی تھیں۔ بالوں کا گھنا ہونا اور
لمبا ہونا سب سے زیادہ خوبصورتی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ اس موقع
پر جو غزل سب سے زیادہ پسند کی گئی اور جس کی داد شاہ وقت نے دل
کھول کر دی وہ حضرت جلیل کی تھی اس کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

دھڑکتے دل کو رکھ لو جیب میں تم
کوئی پوچھے تو کہہ دینا گھڑی ہے
ڈری ہے کیا تمہاری چتونوں سے
یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

شعری فکر نازک بیانی کی یہ اعلیٰ ترین مثال قرار دی گئی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سلطنت دکن کا ماحول ادب اور علم کی سرپرستی کے لئے بہت ہی سازگار ہو رہا تھا اور بیسویں صدی کے اوائل میں دانشور ادیب شاعر محقق سائنسداں اور کارپرداز کارگزار سب ہی لوگ کھچے کھچے جوق در جوق حیدرآباد فرخندہ بنیاد کو ہجرت کر کے اس کو اپنا وطن بنا رہے تھے۔ انھیں حسب مراتب سرپرستی جاہ و اکرام مناسب جلیلہ عزت شہرت سب ہی کچھ مل رہا تھا۔ ایسے وقت حضرت امیر مینائی طباطبائی بھی کشاں کشاں ستمبر ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد آئے ان کے ساتھ جلیل بھی آئے کہ اب وہ اور ان کے استاد ایک جان دو قالب تھے۔

چونکہ سرپرستی اور ذرہ نوازی کا دور دورہ تھا آپس میں رشک و حسد اور درباری رقابتیں بھی زوروں پر تھیں۔ حضرت داغ سلطنت حیدرآباد میں اپنا سکہ جما چکے تھے اس لئے حضرت امیر مینائی کے قدم مشکل سے ٹک سکتے تھے مگر یہ حضرت داغ کی فراخدلی اور علم و ادب کی لگن تھی کہ انہوں نے دونوں کو اپنا ہی مہمان بنا کر رکھا۔ قبل اس کے کہ درباری بغض و کنایہ سے بات بگڑتی حضرت داغ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو انتقال کر گئے۔

جلیل مانکپوری کو شاہانہ دربار میں اور علم و ادب میں مقام مل گیا اور وہ جانشین قرار پائے۔ حضرت جلیل کو وسط شہر افضل گنج میں رہائش ملی۔ دربار میں قرب نصیب ہوا اور شہر کے مشاعروں میں داد تحسین۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں بادشاہ وقت ہی نہیں بلکہ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت وزیر اعظم بھی سرپرستی فرماتے تھے۔ ان سے ہٹ کر شیخ عزیزالدین عبدالرزاق ابراہیم خان تجلی وغیرہ جیسے علم نواز ادب شناس امراء رؤسا بھی مشاعرے منعقد کرتے جو ہر لحاظ سے شاندار اور کامیاب ہوا کرتے آخر الذکر ابراہیم خان تجلی کے مشاعروں کو بہت زیادہ اہمیت نصیب ہوا کرتی

ایسے ہی ایک مشاعرے میں جلیل کا ایک شعر اتنا محبوب و مقبول ہوا کہ اس پر کئی دیوان نثار کئے گئے ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یہیں سے حضرت داغ کے ساتھ حضرت جلیل کی بھی دربار میں آؤ بھگت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور انہیں شہرت دوام نصیب ہوتی ہے۔ الغرض کے ساتھ ساتھ وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی مشورہ سخن کے لئے حضرت جلیل کو منتخب کیا اور عزت بخشی۔

جب حضرت داغ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ تو نواب میر محبوب علی خاں نے داغ کی جگہ جلیل کو مشورہ سخن کے لئے منتخب کیا اور آخر تک جلیل کی شاگردی کو باعث فخر سمجھتے رہے۔

۱۹۰۹ء میں میر محبوب علی خاں کا انتقال ہوا۔ اور میر عثمان علی خاں تخت نشین ہوئے۔ عنان حکومت سنبھالا۔ انہوں نے انتظامی اور اصلاحی امور میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ سلطنت میں رفاہ عامہ کے کام شروع کئے اور بہ نفس نفیس خود حکومت چلاتے رہے۔ لیکن اپنے فطری شعری شوق اور ادبی صلاحیت سے کنارہ کش ہوئے نہ غفلت برتی۔

استاد اور شاگرد کا رشتہ یہاں بھی اتنا گہرا اور مضبوط تھا کہ وہ حضرت جلیل کو ہر جگہ اپنے ساتھ لئے لئے پھرتے تھے۔ درگاہ اجمیر شریف پر حضور نظام نے حاضری دی تو نعت، حمد اور منقبت کا سلسلہ رہا۔ حضرت جلیل نے جو منقبت کہی وہ اس قدر پسند کی گئی کہ سونے کے حروف میں اس کا ایک مصرعہ درگاہ شریف پر چڑھایا گیا۔

" یہی وہ در ہے جہاں لطف جبیں سائی ہے "

جلیل مانک پوری جب حیدرآباد کے ماحول میں رچ بس گئے اور یہاں کی علم دوستی نے ان کو بے مثال عزت عطا کی تو نواب میر عثمان علی خاں نے فصاحت جنگ جلیل اور امام الفن کے خطابات عطا کئے۔

جلیل کی غزلیں ہر محفل میں ہر دربار میں گائی جاتی رہیں اور یہ تہنیتی قطعے، تاریخ وغیرہ کے ماسوا تمام اصناف سخن میں استادانہ اور عالمانہ کلام لکھتے رہے۔ فصاحت جنگ کا خطاب محض اس لئے دیا گیا کہ ان کے کلام میں فصاحت اور بلاغت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے۔ عیش و نشاط کیف اور مستی کے ساتھ ساتھ زبان کی شیرینی لطف و حلاوت سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے ؎

(باقی صفحہ ۱۸۰ پر)

شبیر احمد راہی

فصاحت جنگ جلیل کے مختصر حالات

مانک پور ضلع پرتاب گڑھ (اودھ) میں ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں مانک پور کو اس حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل تھی کہ وہ صنعتِ پارچہ بافی کا نہایت اہم مرکز تھا۔ خاندانِ غلاماں کے دورِ حکومت میں اس صنعت کو کافی ترقی ہوئی۔ خلجی خاندان کے بعد محمد تغلق نے پارچہ بافی سے دلچسپی لی اور بہت ترقی دی۔ مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ مانک پور سے متعلق اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں، تُصْنَعُ بِهَا الثِّيَابُ الرَّفِيعَةُ وَمِنْهَا تُجْلَبُ إِلَى دهلى وَ بَيْنَهُمَا مَسِيْرَةُ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ يَوْماً ٥ [رِحْلَةٌ - ابن بطوطہ] ان علاقوں میں نہایت اعلیٰ قسم کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں اور دہلی جو یہاں سے اٹھارہ دنوں کی مسافت پر ہے، بھیجے جاتے ہیں۔ [ایشوری پرشاد]

فضل اللہ عمری نے مالک الابصار میں لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے دورِ حکومت میں مانک پور کے کارخانوں میں چار ہزار پارچہ باف ریشم اور دوسرے اقسام کے کپڑے تیار کرتے تھے۔ [تذکرۂ علمائے مبارکپور۔ قاضی اطہر مبارکپوری] مندرجہ بالا حوالوں سے مانک پور کی صنعتی اہمیت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔

مانک پور صوفیائے کرام کا بھی مرکز رہا ہے۔ اُسے علمی و ادبی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور اس کی خاک سے بڑی نامور شخصیتیں اٹھتی رہی ہیں۔ شیخ حسام الدین اپنے وقت کے جیّد عالم، زہد و اتقا میں نہایت ارفع مقام رکھنے والے صوفی منش تھے۔ ان کے ایک لائق شاگرد نے "گلزارِ ابراہیم" کے نام سے ان کے خطوط کو یکجا کیا ہے۔ "رفیق العارفین" شیخ موصوف کے مجموعۂ ملفوظات کا نام ہے۔ "انیس العاشقین" تصوف پر ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔

قاضی یعقوب علمِ فقہ کے زبردست عالم تھے لیکن اسی کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ علم و فضل کے علاوہ اپنی شگفتہ مزاجی کی وجہ سے بڑی شہرت اور مقبولیت کے مالک تھے۔ وہ اس حیثیت سے بڑے عجیب و غریب شاعر تھے کہ ہندی بحروں میں عربی کے اشعار کہتے تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بڑے مضحکہ خیز ہوتے تھے۔ مانک پور کے مشہور و مقبول شعراء میں میر پرورش علی سخیؔ، مولوی وحید الدین وحیدؔ، سید بے نظیر شاہ وارثیؔ اور حسرتؔ مانک پوری کے نام بار بار آتے ہیں۔ مانک پور کے رؤسا شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور شعراء کی قدر و منزلت کرتے تھے جس کا عملی اظہار مشاعروں کے انعقاد کی صورت میں ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں بہت سے شعراء شرکت کرتے تھے اور اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔

راجا تعشق حسین تمام امراء و رؤسائے مانک پور میں خاص طور پر مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے۔ راجا صاحب موصوف کی شعری محفلوں میں حافظ خلیل حسن خلیلؔ برادرِ بزرگ حضرت جلیلؔ اور خود حضرت جلیلؔ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ دونوں ایک ہی استاد یعنی حضرت امیرؔ مینائی کے شاگرد تھے۔ خلیل حسن خلیلؔ درباری شاعر تھے اور مہاراجہ بلرام پور ضلع گونڈہ سے منسلک تھے۔

حضرت جلیلؔ کے والد بزرگوار کا نام عبدالکریم تھا اور دادا کا عبدالرحیم۔ دونوں حضرات حافظِ قرآن تھے۔ حافظ عبدالکریم نہ صرف عالم و فاضل ہی تھے، زہد و ورع میں بھی بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ اپنی برادری کے رہنما، پیشوا اور سردار کہلاتے تھے۔ آپ نے سلطان پور محلہ میں ایک مسجد بھی بنوائی جس سے آپ کے گھر سے رجحان کا پتہ چلتا ہے ــــ حضرت جلیلؔ کے چھ بھائی تھے اور ایک بہن تھیں جن کا نام سکونت بی تھا۔ یہ جلیلؔ سے عمر میں چھوٹی تھیں۔ ان کا بیاہ مالیگاؤں ضلع ناسک میں ہوا۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ سکونت بی کے پوتے اور نواسے بقیدِ حیات ہیں۔ پوتے عبدالحمید کیفی ہیں اور نواسے کا نام محمد حنیف ہے۔ جلیلؔ جب حیدرآباد سے مانک پور جاتے تو سکونت بی منماڑ اسٹیشن پر ان سے ملاقات کرنے کے لئے جایا کرتی تھیں۔

پیدائش :- فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ مانکپور، ضلع پرتاب گڑھ (اودھ) میں ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء

میں پیدا ہوئے۔ وہ حافظ عبدالکریم کے بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے گیارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی تھی۔ عربی فارسی کی تکمیل لکھنؤ میں کی۔ آپ نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے پانچ بچے ہوئے۔ دوسری بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ عزیز احمد جلیلی، علی احمد جلیلی، مختار احمد جلیلی اور مشتاق احمد جلیلی فرزندوں کے نام ہیں۔ عزیز احمد صاحب ڈاک اور تار کے محکمے میں ملازم تھے۔ علی احمد جلیلی محبوب نگر کالج میں پروفیسر تھے، صاحبِ تصنیف و تالیف ہیں۔ صاحبِ مجموعۂ کلام بھی ہیں۔ ہمارے لئے یہ انتہائے مسرت کا مقام ہے کہ آج جناب علی احمد صاحب جلیلی اور مشتاق احمد صاحب جلیلی، چار لائق فرزندوں میں سے دو ہمارے درمیان موجود ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے مشتاق احمد صاحب جلیلی بمبئی میں عرصۂ دراز سے مقیم ہیں اور فلمی کہانیاں، مکالمے اور منظرنامے لکھتے ہیں۔ اس تقریب کے سلسلے میں مجھے متعدد بار ان سے ملاقات کرنی پڑی اور ہر بار مجھے افسوس ہوا کہ خاندانی شرافت اور اخلاقی رکھ رکھاؤ پر موجودہ ماحول اپنا اثر نمایاں نہ کرسکا۔

فصاحت جنگ حضرت جلیل حسن جلیل کے خاندان کی ایک روشن، مقدس اور قابلِ تقلید روایت رہی ہے کہ جس کے مطابق بھائیوں میں سے کسی ایک بھائی کا حافظِ قرآن ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ اس خاندانی روایت کے مطابق تیسرے بھائی جناب مختار احمد صاحب جلیلی نے قرآن حفظ کیا تھا۔ ان کے حفظِ قرآن کی تکمیل پر گھر میں بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ خدا کرے کہ اس علمی و مذہبی خانوادہ میں یہ روایت آج بھی باقی ہو۔

رشتۂ تلمذ :- فصاحت جنگ حضرت جلیل حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ آپ کے بڑے بھائی جناب خلیل حسن خلیل کو بھی انہی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ دونوں بھائی ساتھ ساتھ ۱۸۸۳ء میں ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ حضرت امیر مینائی منشی سید مظفر علی خاں اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور اسیر لکھنوی غلام ہمدانی مصحفی کے تلامذہ میں شامل تھے۔

حضرت جلیل کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ چنانچہ انہوں نے دس سال کی عمر ہی میں شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالخالق انصاری صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی نے اپنے مقالے میں چند ابتدائی اشعار نقل کئے ہیں۔ حضرت امیر مینائی اپنے لائق شاگرد سے بہت محبت کرتے تھے جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ جلیل کو رام پور بلانے سے متعلق انہوں نے جو خط لکھا ہے اسے خاص طور پر اس ضمن میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ۱۸۹۰ء میں امیراللغات کے ناظمِ اول وسیم خیرآبادی اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ ان کی جگہ منشی ممتاز علی آئے۔ یہ بھی کچھ عرصہ کے بعد چلے گئے۔ اب حضرت امیر مینائی کی خواہش پر یہ اہم ذمہ داری حضرت جلیل مانک پوری کے حصے میں آئی۔

جلیل کا اخلاق و کردار :-

ہم ابھی ذکر کرچکے ہیں کہ حضرت جلیل حافظِ قرآن تھے۔ ساتھ ہی وہ نہایت درجہ متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔ ساری زندگی تہجد کا اہتمام کیا۔ صرف آخری ایام میں جبکہ اٹھنے بیٹھنے سے مجبور ہوگئے تھے، اس اہتمام اور پابندی کو قائم نہ رکھ سکے۔ گھریلو ماحول غایت درجے مذہبی تھا۔ امیر مینائی کی صحبت نے ان کے مذہبی رجحانات کو اور جِلا بخشی۔ جلیل اپنے استاد کو اپنے والد کی جگہ تصور کرتے تھے۔ امیر مینائی کا تاثر بھی ان کے متعلق بہت ارفع تھا۔ چنانچہ اپنے ایک شاگرد کو سید عابد علی کوثر کو لکھتے ہیں :-

"آدمی ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں۔ میں ان کی جدائی کو اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں مگر مجبوری گوارا کرتا ہوں۔"

جلیل کی سی نیک طبیعت رکھنے والے اور خدا ترس انسان کے متعلق بھی اس زمانے کے لوگ الزام تراشی سے باز نہ آئے۔ اگرچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن دکھ کی ضرور ہے۔ خلفِ امیر مینائی جناب اختر مینائی کے حضرت جلیل سے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ لیکن بدخواہوں نے محض عداوت پیدا کرنے کی غرض سے یہ بات پھیلادی کہ جلیل نے اختر مینائی کا کوئی لحاظ نہیں کیا جبکہ اُستاد کا بیٹا ہونے کے ناتے انہیں ان کا حق نہیں مارنا چاہیئے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جلیل نے اختر کے معاملے میں کسی قسم کی حق ماری نہیں کی بلکہ یہ حقیقت ہے کہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے جس کی ایک مثال پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

اس تاریخی واقعہ سے کافی لوگ واقف ہوں گے کہ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کی مشہور موسیٰ ندی میں زبردست طوفان آیا تھا۔ اس طوفان میں دونوں حضرت جلیل اور حضرت اختر مینائی کی قیام گاہیں سیلاب کی نذر ہوگئیں۔ اختر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر باہر نکل آئے۔ اگر کچھ اپنے ساتھ لائے تو وہ حضرت جلیل کا پہلا دیوان "تاج سخن" تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس واقعہ سے دونوں حضرات کے پُرخلوص تعلقات کا ناقابلِ انکار ثبوت ملتا ہے اور اس خیال کی تردید ہوتی ہے جو غالباً بربنائے مخاصمت پھیلایا گیا تھا۔

تذکرۂ محبوب الزمن کے مؤلف مولانا ابوتراب لکھتے ہیں کہ آپ خوش اخلاق اور مقبول آفاق ہیں "سیرۃ فرشتہ اور صورۃ انسان" برگزیدہ ہیں۔ متقی و پرہیزگار، صوم و صلوٰۃ کے پابند، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند۔ حضرت جلیل علی الصبح ہی اٹھ بیٹھتے اور فرداً فرداً تمام لڑکوں کو بیدار کرتے۔ ان کی ہوں ہاں سے مطمئن نہ ہوتے تو ایک لوٹا پانی لے آتے اور سب

کے منہ پر چھینٹے مارتے اور کہتے جاتے ۔ اٹھو بھی چکو ۔ نماز کا وقت بھاگا جا رہا ہے ۔ پرندے بھی بیدار ہو چکے ہیں اور خداوند کی حمد و ثنا کر رہے ہیں اور تم ہو کہ تمہاری نیند ہی پوری نہیں ہوتی ۔ جب سب بیدار ہو جاتے تو وہیں ہال میں نماز با جماعت ادا کی جاتی ۔

حضرت جلیلؔ متعدد عورتوں کے کلام کی اصلاح کرتے تھے ۔ وہ ان کے بہت سے تلامذہ میں شامل تھیں ۔ لیکن حضرت اس قدر متشرع بزرگ تھے کہ کبھی ان سے ملتے نہ تھے ۔ کلام کی اصلاح کر کے بھیج دیا کرتے تھے ۔

آپ کے احتیاط اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ نواب حیدرآباد میر عثمان علی خاں کی ایک مجلس میں کسی نے مشروب میں نشہ آور چیز کی ملاوٹ کی بات کہی ۔ حضرت جلیلؔ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا ۔ بالآخر نواب صاحب نے خود ان کی غلط فہمی دور کی ۔

حضرت جلیلؔ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق تھا ۔ چنانچہ اپنے نعتیہ کلام کو سرمایۂ حیات تصور کرتے تھے ۔ وضو کے بغیر نعت نہیں کہی اور اصلاح دیتے وقت بھی وضو کر لیا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر عبدالخالق انصاری صاحب نے جلیلؔ کا غیر مطبوعہ منتشر کلام اکٹھا کیا ہے جو کم و بیش ڈیڑھ دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔

عزیز و اقارب :- جیسا کہ ہم اوپر ابن بطوطہ وغیرہ کے حوالے سے بتا آئے ہیں کہ مانک پور پارچہ بافوں یا آج کل کی اصطلاح میں بُنکروں کی بستی تھی ۔ اور خود حضرت جلیلؔ کا خاندان اسی برادری یا طبقہ سے تعلق رکھتا تھا ۔ البتہ ان کا خاندان علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں بہت بڑھا ہوا تھا جس کا سب سے بڑا ثبوت ایک یہ بھی ہے کہ فرمانروائے دکن کی نظرِ انتخاب ان پر پڑی اور انہیں اپنا استاد بنا لیا ۔ آج بھی حضرت جلیلؔ کے عزیز و رشتہ دار پارچہ بافی کے دو مرکزوں مالیگاؤں اور بھیونڈی میں موجود ہیں ۔ ان کی چھوٹی بہن سکونت بی کی اولاد سے جو خاندان چلا وہ آج بھی مالیگاؤں میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے اور محمد حنیف صاحب جو ان کے نواسے ہیں ، اچھے جانے پہچانے آدمی ہیں ۔

ہمارے اس شہر بھیونڈی میں بھی حضرت جلیلؔ کے اعزہ موجود ہیں اور اعلیٰ درجہ کے تجارت پیشہ ہیں ۔ جناب انیس احمد صاحب جو ۲۰۳ چوڑی محلہ میں رہتے ہیں اور ابھی ان کو یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے ، حضرت جلیلؔ کے نہایت قریبی عزیز ہیں انیس احمد کے دادا محمد ابراہیم عبدالرشید کی بہن جناب علی احمد جلیلی اور جناب مشتاق احمد جلیلی کی والدہ تھیں ۔

تصانیف :- حضرت جلیلؔ نے اپنی زندگی میں معبودِ حقیقی کی بہت عبادتیں کیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت کچھ لکھتے بھی رہے ۔ تاجِ سخن ، جانِ سخن ، روحِ سخن ، معراجِ سخن نعتیہ کلام کے مجموعے ہیں ۔ سرتاجِ سخن قصائد پر مشتمل ہے ۔ گلِ صد برگ میں رباعیات ہیں ۔ عطرِ سخن مثنوی ہے ۔ مبتدیوں کے لئے " اردو کا عروض " لکھی ۔ نماز کے متعلق " تعلیم الصلوٰۃ " تحریر کی ۔ تذکیر و تانیث پر بھی آپ نے مستند کتاب لکھی ۔ " معیارِ اردو " محاورات کی لغت ہے ۔ آپ نے سوانح امیر مینائی لکھی اور تاریخ دکن اختر مینائی کے ساتھ مل کر لکھی ۔

غرضیکہ فصاحت جنگ حضرت جلیل حسن جلیلؔ نے اپنی پاکیزہ زندگی میں خالقِ حقیقی کی عطا کردہ تمام تر صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر انداز میں استعمال کرنے کی سعیِ جمیل کی ۔ کسی انسان کی پیدائش کا اس سے اچھا کون سا مقصد ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس دنیا سے چلا جائے تو کچھ ایسے نشان چھوڑ جائے جن کی پیروی میں انسان قلبِ مطمئن اور سکونِ حقیقی پا سکے ۔

مشتاق جلیلی

والدِ محترم کے اشعار اور میں

میں اُن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں جب ریاست حیدر آباد (دکن) کی ایک الگ اپنی شان تھی۔ ایک اپنی خاص خصوصیت تھی۔ ایک اپنی زندگی تھی۔ ہر طرف علم وادب کے چرچے تھے۔ گھر گھر شعر وشاعری کے تذکرے تھے۔

دکن کی اسی سرزمین پر میری آنکھ کھلی۔ وہیں پلا بڑھا۔ وہیں کے ماحول میں میری تعلیم وتربیت ہوئی۔ جب شعور جاگا اور سوچ سمجھ کی صلاحیت پیدا ہوئی تو میں نے دیکھا والد محترم جلیل کی شہرت دکن کی بساطِ شعروادب پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شہرت یہ مقبولیت کچھ تو ان کی شاعری کی وجہ سے اور بہت کچھ اس سبب سے ہے کہ وہ فرمارِوائے سلطنت نظام دکن میر عثمان علی خاں اُن کے استاد ہیں۔

پھر وقت نے کروٹ لی۔ حالات بدلے، ریاستوں کے چہرے بگڑ گئے ـ ـ ـ ـ کبھی حیدر آباد سے باہر جھانکنے کا موقع تھا نہ ضرورت تھی۔ مگر اب نکلنا پڑا۔

یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے جب میں پہلی بار بمبئی آیا۔ اس وقت کے مشہور ڈائریکٹر، پروڈیوسر کاردار صاحب سے ملاقات ہوئی اور جب میں نے انہیں بتایا میں حضرت جلیل کا لڑکا ہوں تو انہوں نے کہا:

"وہ جلیل صاحب تو نہیں جن کا یہ شعر ہے

جب سے چھوٹا ہے گلستاں ہم سے
روز سنتے ہیں بہار آئی ہے

پھر ایک دن نیو تھیٹر کے مشہور آرٹسٹ نواب کاشمیری سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا

اور سب کہنا اسیرانِ قفس سے صیاد یہ نہ کہنا کہ گلستاں میں بہار آئی ہے

اس زمانے میں پرتھوی تھیٹر کی بڑی دھوم تھی۔ ایک ڈرامہ دیکھ کر میں پرتھوی راج جی سے ملا اور جب انہوں نے حضرت جلیل کا نام سُنا تو بے اختیار یہ شعر پڑھا

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

انہوں نے کہا اسی غزل کا ایک اور شعر سنیئے

تمہاری بے وفائی کو نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے
دیا ہے وہ سبق تم نے کہ اب تک یاد کرتے ہیں

انہیں دنوں مجھے ماتھیران جانے کا موقع ملا۔ میں کسی ہوٹل میں ٹھہرا۔ صبح کا وقت تھا اچانک گانے کی آوازیں اُبھرنے لگیں، کوئی گا رہا تھا

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

میں حیران رہ گیا۔ وہ گا گا کر مانگنے والوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی تھی جو بازاری دھن میں الا پے جا رہی تھی

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل
بادل کا رنگ دیکھ کے نیّت بدل گئی

اسی زمانے میں اپنی بہن کے پاس جانے کا اتفاق ہوا۔ احمد آباد کے آگے ایک چھوٹا سا مقام ہے سِدھ پور، وہاں لوگ دوست ہو گئے۔ وہ لوگ مجھے ایک گانے کی محفل میں لے گئے۔ گانے والی نے طبلے کی تھاپ پر ایک غزل چھیڑی وہ حضرت جلیل کی تھی۔

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

اور پھر ایک دن میں نے دیکھا پھیری والے لڑکے کو۔ عمر ہوگی اٹھارہ،
انیس برس۔ وہ اپنی بے سُری آواز میں گاتے جا رہا تھا ؎

کہیں ٹھکانا نہیں ہے مِرا زمانے میں
نہ آشیانے کے باہر نہ آشیانے میں

بڑا شوق تھا خواجہ اجمیری کے دربار میں حاضری کا۔ خدا نے یہ آرزو
پوری کی اور جب میں وہاں پہنچا تو قوالی ہو رہی تھی۔ لوگ سر دُھن رہے تھے
اور قوال گا رہا تھا ؎

آج قسمت درِ خواجہ پہ مجھے لائی ہے
یہ وہی در ہے جہاں لطفِ جبیں سائی ہے

ان درباروں سے ہٹ کر فلم کے پردے پر بھی جھلک نظر آئی۔ کلکتے کے
مدن تھیٹر سے کون واقف نہیں۔ اس کی فلم لیلیٰ مجنوں چل رہی تھی۔ ایک
رومانی سین میں مجنوں جو ماسٹر نثار تھے انہوں نے لیلیٰ سے مخاطب ہو کر
یہ شعر پڑھا ؎

میری نظر نے عجب کارِ لاجواب کیا
کہ تجھ کو لاکھ حسینوں میں انتخاب کیا

اس پر لیلیٰ نے جس کا پارٹ کجّن ادا کر رہی تھی۔ اس نے اس کا جواب
یوں دیا ؎

نگاہِ لطف و عنایت سے فیضیاب کیا
حضور نے مجھے ذرّے سے آفتاب کیا

یہ والد مرحوم حضرت جلیل کے اشعار کی مقبولیت کے کچھ نمونے ہیں
جس کے پس منظر میں مجھے اپنے اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ حضرت
جلیل کی شاعری صرف دکن کی چار دیواری تک محدود نہ تھی بلکہ چاروں
طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کیا خاص، کیا عام سب کی زبان پر ان کے اشعار
تھے اور اس مقبولیت کی وجہ ان کی سہل بیانی بھی تھی اور معنی آفرینی
بھی۔ جگر مراد آبادی اپنے دور کے سب سے بڑے غزل گو تھے۔ انہوں
نے تو جلیل کے اس شعر کو سن کر کہا تھا کہ "کاش جلیل میری ساری شاعری
لے کر اپنا یہ شعر مجھے دے دیتے"۔ اور وہ شعر تھا ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

حضرت جلیل کے ایسے سینکڑوں شعر ہیں جو زبان زدِ عام ہیں۔ ان میں
سے چند ملاحظہ فرمائیے ؎

جاتے ہیں خدا حافظ ہاں اتنی گذارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دُعا کرنا

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنّا نکل گئی

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال   مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے

اُٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

حُسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بُت خانے سے

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں   جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں

شمع کو تم اٹھا دو محفل سے   یہ ہمیشہ کی جلنے والی ہے

تجھ سے ملنے پر بُتِ بے درد یہ عقدہ کُھلا   بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

جلیل آنے لگیں ہیں ہچکیاں کیوں   کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

حیاتِ جلیل کے چند پہلو

والد مرحوم حافظ جلیل حسن جلیلؔ پر اگرچہ بظاہر شاعری کا بڑا احساں ہے کہ ان کی جو کچھ شہرت ہے وہ اسی تعلق سے ہے لیکن درحقیقت حضرت جلیل شاعر سے زیادہ انسان کامل تھے۔ اردو شاعری میں مرزا مظہر جانجاناں، خواجہ میر درد، محسن کاکوردی، اور امیر احمد امیر مینائیؒ درویشی میں بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ جلیل بھی انھیں پیشروں کی طرح درویشانہ شان اور عمل کے شاعر تھے۔ اگر شاعر نہ ہوتے تو یقیناً ایک بہت بڑے عالم اور مرشدِ کامل مانے جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوصاف شاعرانہ سے قطع نظر جلیل نے ایسی درویشانہ اور متصوفانہ زندگی بسر کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ پاکیزہ باطن، صاحب حال اور ایسی پاکیزہ سیرت اور نورانی صورت کہ دیکھنے سے ایمان تازہ ہو۔ بزرگوں کی صحبت کا اثر سمجھئے یا گھر کے ماحول کا نتیجہ جانئے کہ بچپن ہی سے شوق پیدا ہو گیا تھا آپ کے والد حافظ عبدالکریم ایک باخدا درویش مزاج آدمی تھے۔ جنہوں نے لڑکپن ہی سے جلیل کو زہد و تقوی اور نماز روزہ کی ترغیب دی۔ تعلیم کا آغاز حفظ قرآن سے ہوا۔ بارہ سال کی عمر میں حافظِ قرآن ہو گئے۔ پھر لکھنؤ میں علمائے فرنگی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔

امیر اور جلیل کے درمیان ابتدا ہی سے استادی اور شاگردی کے تعلق کے علاوہ ایک قسم کی روحانی وابستگی بھی تھی۔ اس کشش نے آپ کو رامپور بلوانے پر مجبور کیا۔ ۱۸۹۰ء میں جب آپ رام پور پہنچے ہیں اس وقت آپ کی عمر ۲۴ رسال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کم عمری ہی میں آپ نے جناب امیر مینائیؒ پر اپنی عبادت و ریاضت کے جو اثرات مرتب کر لئے تھے اس کا اندازہ خود جناب امیر کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے آپ کی ملازمت کے تعلق سے عبدالعلی کوثر خیرآبادی کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں،

"آدمی یہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں۔ میں ان کی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں اور یہ مجبوری گوارا کرتا ہوں۔"

ان الفاظ سے سامعین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب یہ پودا بڑھکر تناور درخت ہوگا تو اس وقت اس کے پتوں سے بکھرنے والے سایوں نے کتنا تقدس پھیلایا ہوگا۔ جلیل رامپور پہونچے تو تھے اپنی شعری صلاحیتوں کو جلا دینے لیکن وہاں روحانی دولت بھی ان کی منتظر تھی۔ انہوں نے اپنے استاد امیر مینائیؒ کے فیض صحبت سے شاعری کے علاوہ تقوی اور تقدس بھی حاصل کیا۔ جلیل کے قیام رامپور کے زمانے کے معمولات اور زندگی کے بارے میں نبیرہ حضرت امیر مینائیؒ صدیق الزماں اپنے تجربات یوں قلمبند کرتے ہیں:

"امیر مینائیؒ صرف استاد سخن ہی نہ تھے ایک صاحب دل درویش بھی تھے۔ اس درویشانہ ماحول میں جلیل کی صلاحیت بھی ترقی پذیر ہوتی گئی۔ ایک دن استاد سے التجا کی کہ مجھے مرید فرما لیا جائے۔ یہ استدعا منظور نہیں فرمائی بلکہ کاملانِ وقت میاں محمد شاہ صاحب محدث رامپوری یا میاں محمد معصوم صاحب نقشبندی و مجددی سے رجوع ہونے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ پہلے حضرت میاں محمد شاہ صاحب محدث رامپوری کے زمرہ مریدین میں داخل ہوئے پھر اپنے شیخ کی اجازت سے میاں محمد معصوم شاہ صاحب نقشبندی مجددی سے طالب ہوئے اور ذکر و شغل میں ترقی کرنے لگے۔ اس کے بعد جلیل دائم الوضو

مطلع سن کر خاموش ہو گئے ۔ کچھ دیر انتظار کر کے میں نے مطلع دوبارہ پڑھا
کچھ دیر توقف کے بعد کہا دوسرا مصرع میں حسین گناہ کہنے کی بجائے جگر صاحب
یوں کہتے تو بہتر تھا ع

کس حسن سے گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اہل نظر ہی اس نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں کہ لفظ حسین کی ذرا سی الٹ پھیر نے
مصرع کو زبان اور روزمرہ کے اعتبار سے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ۔

طبیعت میں عجز و انکسار اور مروت بے انتہا تھی ۔ جلیل سے ملنے
اور عقیدت رکھنے والوں میں ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگ تھے ۔ استاد شاہ
ہونے کی وجہ سے بعض اصحاب یہ خیال لیکر آتے کہ ملاقات کرنے کے
لئے شاید پہلے وقت کا تعین کروانا ہوگا یا گھنٹوں انتظار کی تکلیف اٹھانا
پڑے گی ۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ جب بھی کوئی آتا ۔ اطلاع کرواتا تو آپ
فوراً باہر نکل آتے ۔ کسی کو سہرا لکھوانے کی ضرورت ہوتی کسی کو تاریخ پیدائش
یا تاریخ وفات لکھوانی ہوتی ۔ کوئی نعت کی فرمائش کرتا ۔ کوئی قوالی کے
لئے کلام مانگتا ۔ جلیل اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود سب کی فرمائشیں حتی
الامکان پوری کرتے ۔ دیوان اول تاج سخن کی ایک غزل کا مقطع انہی
فرمائشوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔

جلیل احباب کی فرمائشوں سے ناک میں دم ہے !
سمجھ رکھا ہے سب نے شعر بھی سانچے میں ڈھلتے ہیں

یہ تو تھی عام لوگوں شاگردوں اور معتقدین کی بات ۔ اب یہاں کچھ
ذی وجاہت اصحاب، شعراء ادبا اور عمائدین سے ملاقات کا ذکر بھی
کردوں ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی اپنی ملاقاتوں کا ذکر اپنی ایک
تحریر میں یوں کرتے ہیں ۔

" خدا معلوم کیا بات ہے کہ میں پرانی تہذیب کا دلدادہ
ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں حافظ جلیل حسن جلیل کا شاگرد
تو نہیں مگر ایک عرصہ تک ان سے عقیدت رہی ہے ۔ میں
چھوٹوں کی طرح ان سے ملتا اور وہ بزرگوں کی طرح مجھ
سے پیش آتے ۔ میں گیا ۔ اطلاع کروائی اور وہ فوراً باہر
نکل آئے ۔ سب کی خیریت پوچھی اور اس کے بعد ہی کہا
کچھ لائے ہو ۔ میں نے کہا جی ہاں ۔ اور کوئی غزل یا نظم
سنائی ۔ وہ جس طرح اچھے اشعار کی تعریف کرتے تھے
اس سے کیا بتاؤں میرا دل کتنا بڑھ جاتا تھا ۔ "

اس طرح جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر محمد اعظم اپنی پہلی ملاقات کا حال
یوں بیان کرتے ہیں :

" جلیل منزل پر پہلی بار جب میں پہونچا ۔ گرمی کے دن
تھے اور شام کا وقت تھا ۔ مکان کے صحن میں چھڑکاؤ ہو چکا
تھا اور کرسیوں کا ایک حلقہ نیم دائرہ بنا رہا تھا ۔ جس کے
بیچ میں ایک آرام کرسی پڑی تھی ۔ اس آرام کرسی پر ایک
پیر مرد اکیلے بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے ۔ سانولا رنگ
سیاہ داڑھی جو ان کے سن و سال کے لحاظ سے بلا شبہ
خضاب کی رہین منت معلوم ہوتی تھی ۔ سر پر لمبے بال
جن میں بیچ سے مانگ نکلی ہوئی تھی ۔ مجھے دیکھتے ہی پہلا
کام انہوں نے یہ کیا کہ قریب کی کرسی سے اپنی مخمل کی سیاہ گول
ٹوپی اٹھا کر پہن لی ۔ میں نے صاحب سلامت کے بعد ان
سے پوچھا جناب جلیل صاحب تشریف رکھتے ہیں ؟ جی
ہاں ۔ تشریف رکھئے ۔" انہوں نے ٹھیٹھ لکھنوی لہجہ میں
فرمایا ۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں ۔ اس پر میں نے
اپنا مختصر سا تعارف کروایا ۔ سن کر فرمایا ۔ ماشاءاللہ
مجھے ہی جلیل کہتے ہیں ۔۔ بعد کی ملاقاتوں میں
میں نے ان میں ایسی خوبیاں پائیں جو اس زمانے کے
لوگوں میں عنقا ہیں ۔ وہ ملنے میں اس قدر تکلف
اور حفظ مراتب کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ اس زمانے
میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی ۔ "

جلیل کی سیرت کا ایک پہلو یہ ہے کہ قدیم اساتذہ شعراء کا ذکر بڑے
احترام سے کرتے تھے ۔ نیز اپنے مقام معاصرین کا نام بھی نہایت
عزت سے لیتے تھے ۔ حتیٰ کہ حریف شعرا سے بھی محبت رکھتے تھے ۔ امیر
مینائی کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں جلیل اور داغ ایک دوسرے کے
حریف سمجھے جاتے تھے ۔ اگرچہ داغ استاد شاہ تھے اور اپنی شوخی
طبع کے باعث کافی شہرت و مقبولیت رکھتے تھے ۔ لیکن جب جلیل مشاعروں
میں داغ دہلوی کے دوش بدوش اپنی فکر کے جوہر دکھانے لگے اور
جلیل کی غزلیں خوب چمکنے لگیں تو لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو
گئیں ۔ جلیل کے معتقدین کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ جناب داغ کے
بعض شاگرد تو چھپ چھپ کر آپ کو کلام دکھانے لگے ۔ اس زمانے میں

محبت اور شفقت سے ملے ۔ اس کے بعد جب کبھی حیدرآباد
جانا ہوا تو ان کے یہاں ضرور حاضری دی ۔ پرانی وضعداری
اور استقامت کی یہ مثال آج تعجب سے سنی جائے گی کہ
ان سے پہلی ملاقات جس مکان کے جس سائبان کی جس
سمت میں کرسی پر جس ہیئت سے ہوئی تھی آخری ملاقات
بھی اسی مکان میں اسی سائبان میں اسی کرسی پر اور
اسی صورت میں ہوئی ۔ "

یہی وضعداری ان کی زبان و بیان کی صحت کے تعلق سے بھی تھی ۔ قدما
اور استادان سخن کی روش سے سرمو گریز اور بے راہروی انھیں کسی قیمت
گوارہ نہ تھی ۔ قواعد نظم کے نہایت سخت پابند ، الفاظ، محاورات اور روز
مرہ کا برمحل استعمال ان کی وہ خصوصیت تھی جس نے انھیں تحقیق لغت
میں اسنادی حیثیت دی تھی ۔ یہی رکھ رکھاؤ اور یہی وہ احتیاط ہے
جس کی بدولت آج بھی ان کے کلام سے زبان کے الفاظ و محاورات اور
امثال و استعمال کی تصدیق ہوتی ہے ۔ لکھنؤ کے نورالحسن صاحب نیر
نے جب فرہنگ آصفیہ کے جواب میں نوراللغات جیسا بلند پایہ لغت
ترتیب دیا اس میں جلیل کے سیکڑوں اشعار سند کے طور پر پیش کئے
بعض محاورات والفاظ کے لئے تو مولف مذکور نے خاص طور پر جلیل سے
اشعار کہلوائے ۔ استناد کا یہ درجہ حاصل کرنے میں جلیل نے جو ریاضت کی
اس کی ایک دو مثالیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی ۔

خانوادہ آصفی کے شہزادہ معظم جاہ بہادر شجیع کا بڑا ستھرا
مذاق رکھتے ہیں ۔ وہ بھی اپنا کلام استاد جلیل کے پاس بغرض اصلاح بھجوایا
کرتے تھے ۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کسی طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش بھی
کرتے تھے ۔ ایک بار انھوں نے غالب کا یہ مصرعہ بھجوایا ع

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

فرمائش کی تکمیل میں استاد نے نو شعر کی ایک غزل لکھ کر بھجوادی ۔ دوسرے
دن شہزادے کا آدمی غزل واپس لایا ۔ ان میں دو شعر پر خط کھینچ دیا گیا تھا
اس کے ساتھ پیام یہ تھا کہ اس غزل کے دو شعر مجھے پسند آئے ہیں جو میں
نے رکھ لئے ہیں ۔ ایک غزل اور اسی طرح پر لکھکر بھجوائی جائے ۔ یہ سلسلہ
چار غزلوں تک چلتا رہا ۔ چار غزلیں کہی گئیں ۔

ہر غزل میں سے دو تین اشعار اپنے لئے پسند کرکے باقی واپس
بھجوا دیئے ۔ واپس شدہ غزلوں کو میں نے غیرمطبوعہ کلام کی بیاض
میں درج کردیا ۔ پھر جب ترتیب دیوان کی نوبت آئی تو میں نے چاہا کہ نو
شعروں کا انتخاب کرکے ایک غزل بنالی جائے ۔ لیکن والد مرحوم کے سامنے
جب یہ بات رکھی تو فرمایا کہ اسے خارج کردیا جائے ۔ میں نے جب اصرار
کیا اور وجہ معلوم کرنا چاہی تو کہا اس غزل میں صرف ایک قافیہ " بنائے
نہ بنے ایسا ہے جو درست طریقہ پر استعمال ہوا ہے ۔ باقی سب خلاف
زبان ہیں ۔ پھر توجیہہ یوں کی کہ اٹھائے نہ اٹھے اور چھپائے نہ چھپے
کہنا چاہیئے یہی زبان ہے ۔ میں نے غالب کی عظمت کو نگاہ میں رکھتے
ہوئے اس کے جواز کی گنجائش نکالنی چاہی تو فرمایا کہ غالب نے کہا ہوگا
یہ ہماری گویائی نہیں ہے ۔

سید نورالحسن نیر نے نوراللغات کی تدوین کے دوران
ایک استفسار میں داغ دہلوی کا یہ شعر لکھ بھیجا ۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اس کے جواب میں جلیل نے لکھا ۔ ادا چھانا ، غمزہ چھانا ، ناز چھانا
درست نہیں ہے ۔ داغ نے ادا چھائی جو کہا ہے تنہا ان کی گویائی ہے ۔
گویا جلیل نے داغ کی تنہا گوئی کہکر اس کو سند کے طور پر تسلیم کرنے سے
گریز کیا ہے ۔

اس سلسلے میں ریاض خیرآبادی کا بھی ذکر کردوں ۔ ریاض حضرت
جلیل کے خواجہ تاشوں میں تھے ۔ انہوں نے اپنی ایک نظم میں فٹن بمعنی
بگھی کو مذکر باندھا یعنی ۔ موٹر اتنے فٹن اتنے کہ نہ ہو سکا جس کا شمار
اس مصرع کے تعلق سے جلیل ، جناب ریاض کو لکھتے ہیں ۔

" فٹن کو دکن میں علی العموم مونث کہتے ہیں اور ہماری زبان پر بھی مونث
ہی ہے ۔ اگر شمالی ہند میں مذکر قرار دیا گیا ہے تو براہ کرم اس سے
مطلع کیجئے ۔ قرینہ تو مونث ہی کا ہے کیونکہ تمام گاڑیاں مونث ہی بولی
جاتی ہیں ۔ حتیٰ کہ ریل بھی ۔ فٹن کو مذکر کہنا ہماری زبان کے خلاف ہے ۔ "

ایک اور ذکر جگر مرادآبادی کے تعلق سے ہے ۔ ان دنوں دہلی
کے ایک ماہنامہ " عالمگیر " میں جگر صاحب کی ایک غزل بڑے اہتمام سے
صفحۂ اول پر شائع ہوئی تھی جس کا جگہ جگہ بڑا چرچا تھا ۔ ایک دن فرصت
کے اوقات میں میں نے اس غزل کا ذکر کیا اور مطلع پڑھکر سنایا ۔ مطلع
یہ تھا ؎

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں ۔ کتنا حسین گناہ کئے جا رہا ہوں میں

رہا کرتے تھے اور تہجد کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی تھی ۔ "

امیر مینائی کے وصال کے بعد جلیل کو دنیا نے جانشینِ امیر کہکر پکارا ۔ یہ یہ جانشینی حقیقت میں پوری پوری تھی ۔ ظاہری اور باطنی دونوں اوصاف کے لحاظ سے وہ جانشینِ امیر تھے ۔ جو زہد و تقوی ، پابندی دینی ، ذکر و فکر اور خدا ترسی استاد میں تھی وہی شاگرد جلیل کے حصہ میں آگئی تھی ۔

ہندوستان کے طول و عرض میں آپ کے جاننے والے تو بہت تھے لیکن پہچاننے والے کم ۔ کیونکہ دور دراز مقامات پر رہنے والے سیکڑوں شاگرد اور معتقدین ایسے تھے جنہیں جلیل کو دیکھنے کی آرزو تھی ۔ ان کے خیال میں جلیل کا نقشہ کچھ اور ہی تھا ۔ حیرت بدایونی نے بڑے دلچسپ انداز میں اس صورتِ حال کی تصویر کھینچی ہے ۔ لکھتے ہیں :

" ان محرومانِ دیدار کے صورتخانہ خیال میں جلیل کا تصور اس طرح تھا کہ لمبے چوڑے ، لحیم شحیم بڑی بڑی مونچھیں ، منڈی ہوئی داڑھی ، مغرور آنکھیں ، رعب دار چہرہ کرخت آواز ، پر تصنع گفتگو ، شہرت و عزت و دولت اور سب سے بڑھکر شاہانِ دکن کی استادی کے نشہ میں مخمور ، شعر و نغمہ ، عیش و عشرت کی بزم آرائیوں میں مصروف کلام کی رنگینی کی طرح ان کی زندگی اور ان کی محفلیں بھی رنگین ہوں گی ۔ لیکن کسی کو کیا خبر کہ یہاں صورتِ حال اس کے برعکس تھی ـــــ شاعر کے روپ میں عارفِ کامل ، ادیب کے بھیس میں ایک صاحبِ رشد و ہدایت ، مصنف کے لباس میں ایک ذاکر و شاغل زاہد بلکہ یوں کہیئے کہ انسان کی صورت میں ایک پاک فرشتہ ۔ "

سچ یہ ہے کہ اگرچہ تمام عمر دربار شاہی سے تعلق رہا ۔ لیکن عام لوگوں کی طرح سادہ زندگی بسر کرتے رہے ، امیری میں بھی فقیری کی اور اس امارت میں بھی فقر و سلوک کی منزل طے ہوتی رہی ۔ آپ کی خوش اوقاتی کا یہ حال تھا کہ دن کا زیادہ وقت فرائض نماز کی ادائیگی اور اوراد و ظائف میں صرف ہوتا ۔ یہاں تک کہ خالی اوقات میں بھی ہاتھ میں تسبیح ہوتی اور لبوں میں حرکت ۔ آپ کی قیام گاہ جلیل منزل کے بیرونی حصہ میں ایک بڑا ہال تھا جہاں بہ پابندی پنج وقت اذان و نماز کا انتظام تھا ۔ جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اس وقت سے وصال تک کی طویل مدت میں کبھی کسی وقت نماز قضا ہوتی نہیں دیکھی ۔ طبیعت نادرست ہوتی تب بھی جماعت میں آکر شریک ہوتے اور بیٹھ کر ہی نماز ادا کرتے ۔

حیاتِ جلیل کا ایک اور اہم پہلو ان کی وضعداری تھی ۔ وضع اور لباس شرفاء لکھنؤ کا اعلیٰ نمونہ ۔ لطیف مزاج و نفیس طبع گندمی رنگ ، داڑھی دار بھرا چہرہ ، میانہ قد ، سر پر زلفیں ، اس پر ایک خاص وضع کی سیاہ مخملی گول ٹوپی ، اوسط موری کا سفید پائجامہ ۔ ہلکے رنگ کی شیروانی ، ہاتھ میں رومال اور تسبیح ـــ ہمیشہ اس وضع کے پابند ۔ اور یہ وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت پیدا کرتی تھی ۔ اپنی طویل زندگی میں آپ نے بہت کچھ دیکھا ـــ زمانہ کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا ۔ علمی و ادبی ، فکری و نظری ۔ معاشی و سیاسی انقلابات آئے اور گذر گئے ۔ لیکن جلیل اپنی ہی وضع قدیم کے پابند رہے ۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؂

وضع داری کی شان ہے یہ جلیل
رنگ بدلا نہ عمر بھر اپنا

اوائل عمر میں لکھنؤ کی تہذیب کی بہاریں دیکھیں اور آخر عمر میں مغربی تمدن و معاشرت کے سیلاب میں مشرقیت اور قدیم تہذیبی قدروں کا نکلتا ہوا جنازہ بھی دیکھا ۔ اس انقلاب کی زد سے کوئی ادیب و شاعر نہ بچ سکا ۔ سبھی نے اپنی اصلیت پر رنگینیوں کی تہیں چڑھا لیں ۔ لیکن ان میں صرف جناب جلیل ہی اپنے مقام پر پہاڑ کی طرح اٹل رہے ۔ جن کو یہ انقلابی طوفان اپنی جگہ سے ذرّہ برابر نہ ہٹا سکا ۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری نے ایک جدید مکتب کی بنیاد رکھی ۔ شاعری کے اصناف نظم و غزل نے اپنا چولا بدلنا شروع کیا ۔ ادب برائے زندگی کے نعرے گونج اٹھے ۔ نئی روشنی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی لیکن اس طوفان میں بھی جلیل کی موم بتّی والی شمع جلتی رہی اور جلتی چلی گئی ۔ زمانہ اور زمانہ کی ہر شئے بدل گئی لیکن جلیل جلیل ہی رہے ۔ اور جس راہ پر چل رہے تھے اسی پر گامزن رہے تادمِ واپسیں آپ کی زندگی اسی طرح منظم و مرتب رہی ۔ مولانا سلیمان ندوی آپ کی اس وضعداری کا ذکر اپنے رسالے " معارف " میں یوں کرتے ہیں :

" خاکسار کو سب سے پہلی دفعہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عماد الملک مرحوم کے کتب جانے کو ندوہ لانے کے سلسلے میں حضرت استاد مرحوم کے حسبِ ایما حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے مجھے تھی کشاں کشاں مجھے ان کے آستانے تک لے گئی ۔ بڑی

جلیل نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا۔

کوئی حسین ہو ہمیں اک نگاہ کر لینا
جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا

اس غزل کا مقطع یہ تھا۔

وہ جس سے ملتے ہیں اس سے ضرور بنتے ہیں
جلیل سے نہ کہیں رسم و راہ کر لینا

اس مقطع پر بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ یہ اشارہ جناب داغ کی طرف ہے جو اپنے احباب اور شاگردوں کو جلیل سے نہ ملنے کی تاکید اس سبب سے کرتے تھے کہ کہیں آپ سے مل کر آپ کی خوشگوئی کے گرویدہ نہ ہو جائیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جلیل کا آئینہ دل کبھی کسی کے غبار سے مکدر نہ ہوا۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ دو مخالف اسکولوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بھی جلیل کے معتقدین اور داغ کے شاگردوں میں کچھ تناؤ ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ اور جناب داغ کو بھی ناگوار گذرا تھا۔ لیکن اس میں جلیل کی ذات کو بہت کم دخل تھا۔ جب تک داغ بقید حیات رہے۔ جلیل اور داغ کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے اور جلیل ان کا ادب و احترام ویسا ہی کرتے تھے جو استاد شاہ ہونے کی حیثیت سے موزوں و مناسب ہو سکتا تھا۔

جلیل کے عجز کا تو یہ حال تھا کہ اگر آپ کی تعریف یا مدح میں کوئی اشعار لکھ لاتا تو اس کے سننے سے گریز کرتے۔ بعض شاگردانِ جلیل کبھی کبھی اپنی غزل ازراہِ عقیدت کوئی ایسا شعر لکھ دیتے جس میں آپ کا اسم گرامی ہوتا تو اُسے قلمزد کر دیتے۔ یہ انکسار اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ اپنے شاگردوں کو اپنے نام کے ساتھ تلمذ ظاہر نہ کرنے کی ہدایت دیتے۔

ساری عمر میں جلیل نے ہجو کا ایک شعر بھی نہیں کہا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ دہلی کے ایک حکیم صاحب جو حیدرآباد میں مقیم تھے اکثر ملنے کے لئے آیا کرتے۔ جناب جلیل نے ان سے اپنے ضعف دماغ اور رعشہ کی شکایت کا ذکر کیا۔ حکیم صاحب دوا دینے کے لئے آمادہ ہو گئے بغیوں مہینوں علاج ہوتا رہا۔ حکیم موصوف روپے پیسے کے بڑے لالچی تھے معمولی معمولی ادویات کی بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے مرحوم نے ازراہِ ظرافت کہا کہ حکیم صاحب کے متعلق ایک مصرع خود بخود موزوں ہو گیا ہے۔

ع چارہ گر بھی مجھے بیمار ملا قسمت سے

بعد میں اس مصرع پر مصرع لگا کر مطلع کیا اور پوری غزل کہی۔ مطلع یہ تھا۔

یار دلدادۂ اغیار ملا قسمت سے
چارہ گر بھی مجھے بیمار ملا قسمت سے

حرفِ آخر کے طور پر ایک اور پہلو کو بھی اجاگر کردوں۔ وہ یہ کہ ملنے والوں میں بہت سارے اصحاب اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے مختلف قسم کے سوالات و استفسار لیکر آتے۔ ان میں ایسے استفسارات کے جواب میں وہ خاموشی اختیار کر لیتے جن میں خواہ مخواہ جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا۔ مثلاً دہلی اور لکھنؤ کے اختلافات لے بیٹھے تو انھیں نصیحت کرتے اور کہتے کہ بنیادی طور پر دونوں مکاتیب خیال درست، مستند اور مکمل ہیں۔ ذیلی اختلافات میں الجھنا دانشمندی نہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کے شاگردوں اور ملنے والوں کی فہرست دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے افراد مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، خواجہ حسن نظامی حسرت موہانی۔ عبدالماجد دریا بادی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور سائل دہلوی کے نام ملتے ہیں۔ اپنے اس بیان کی تائید میں قاضی عبدالغفار صاحب کی حسب ذیل تحریر پر اپنا مقالہ ختم کرتا ہوں۔ قاضی صاحب رقمطراز ہیں:

"مرحوم (جلیل) کی عجیب خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی ذات میں اور اپنی شاعری میں دو مکاتیب کی خصوصیات جمع کر لی تھیں۔ وہ امیر مینائی کے بھی جانشین تھے اور استاد داغ کے بھی۔ داغ کی زبان اور بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر دونوں سے جلیل کی شاعرانہ فطرت نے اپنا حصہ حاصل کیا تھا۔ چنانچہ مرحوم کے وجود میں بالآخر دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے ان مختلف عناصر نے اپنا سنگم بنا لیا تھا جو نصف صدی سے زیادہ ایک دوسرے سے جدا تھے۔"

• • •



ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

جلیل مانک پوری

عہد اور کلام ـ ایک تجزیہ

جلیل مانک پوری ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ کوئی بیس سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور کوئی ساٹھ سال شعر کہتے رہے۔ اس لحاظ سے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کا زمانہ ان کی شاعری کا زمانہ رہا ہے۔ اور یہی اردو شاعری میں انقلاب اور اتھل پتھل کا دور ہے۔ اردو کے نشاۃِ ثانیہ کا دور ہے۔ جلیل کی شاعری کو ان کے عہد کی اس خصوصیت کے پس منظر میں دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے۔

جلیل امیر مینائی کے شاگرد رشید رہے ہیں۔ ویسے داغ اور امیر ہم عصر ہی نہیں ان دونوں کے شاگرد ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے

جلیل جس زمانے میں شاعری کے میدان میں اترتے ہیں اس وقت داغ اور امیر چھائے ہوئے تھے۔ اور مجنوں گورکھپوری نے بے ٹوک کہہ دیا ہے کہ ـ

" امیر۔ داغ اور ان کے شاگرد انحطاطی غزل سرائی کی آخری کڑی تھے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ہم ان کو ایک ردِ عمل ماننے کے لئے مجبور ہیں۔ ان سے پہلے غالب اور مومن کے پیچیدہ خیالوں اور مشکل گوئیوں اور اور ناسخ اور ان کے مدرسہ کی شاعرانہ بنوٹ سے ہم اکتا سے گئے ہیں۔ اور جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ ان کو بالکل اپنے سے غیر مانوس پاتا تھا۔ اس لئے جب داغ کی عشقیہ واقفیت اور امیر کی پر تکلف عمومیت نے جس کا تعلق جذبات کی اصلیت سے زیادہ زبان اور محاورے کی سلاست اور عام فہمی سے تھا، سستے قسم کی لذت پر مبنی اور خوش باشی کے سامان بہم پہنچانا شروع کیا تو ہم نے اس کو اپنے سے بہت قریب تر پایا۔"

(نگار ـ جنوری، فروری ۱۹۵۲ء)

مجنوں نے آگے چل کر اسی مضمون میں کہا ہے ـ

"امیر و داغ نے اردو زبان کی جمہوریت کو مستحکم بنایا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے اس میں رکاکت، ابتذال اور پستی کی لئے بھی ان ہی بزرگوں کے دم سے بڑھی۔"

اصل میں ادب میں ابتذال اس دور کے سماجی انحطاط کا عکس ہی تو تھا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنی تصنیف "مطالعہ امیر" (ص ـ ۲۴) میں یوں کہا ہے ـــ

" اودھ کا علاقہ بڑا زرخیز تھا۔ عام خوشحالی کے علاوہ یہاں کے حکمراں، امرا اور ان کے متوسلین بے اندازہ دولت کے مالک تھے۔ دولت کی افراط اور انگریزوں کی سیاست گری کے مفلوج کن اثرات نے ان کو تفنن اور تعیش کی طرف مائل کیا۔ حکمراں خاندان کا ایران سے نسلی تعلق، اودھ کی رومان انگیز روایات اور انگریزوں کی مادہ پرست زندگی کی جھلکیاں مزید رنگ لائیں۔ طوائفوں اور دوسری فاحشہ اور ادنیٰ درجے کی عورتوں سے تعلق اور مسکرات کا استعمال لوازماتِ امارت میں داخل ہوگیا۔ نوابین اور امرائے سے گذر کر یہ میلانات عوام النّاس تک پہنچے اور تفنن اور تعیش اور ابتذال و بازاریت لکھنؤ کی معاشرت کے امتیازی نشان بن گئے۔"

ان حالات میں سنگلاخ زمین میں کرتب دکھانا، قادرالکلامی کا مظاہرہ، جدّت و اختراع کا جنون، رعایت لفظی کا تماشہ اور اسی قسم کی باتوں نے شعر کو گرا دیا تھا۔

باعثِ گریہ جوئی فرقت میں مجھ کو سے کشی
ساقیا اشکوں سے مے کا رستالا ہوگیا — ناسخ

اک مشت استخواں پہ نہ اتنا غرور کر
قبریں بھری ہوئی ہیں عظامِ رمیم سے — آتش

جدّت و اختراع کے جنون نے شعر کو کس قدر مضحکہ خیز بنا دیا۔

چشم میں سرمے کا دُنبالہ بنا کر بو سے لے
کیوں عصا ٹیک کے کھڑی ہو جائے میری آنکھ — وزیر

مست ہاتھی ہے تیری چشم سیہ مست اے یار
صفِ مژگاں اسے گھیرے ہوئے ہیں بھالوں سے — آتش

نوکِ مژہ پہ اشکِ صباحت نظام ہے
سونٹے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے — سحر

مبتذل اور مضحک اشعار کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ
صاف آئینہ ہے سارا پیٹ — ناسخ

اس کی انگیا کی کٹوری کی ہوا دیکھ کے مست
ساقیا اب نہ دِکھا ساغرِ صہبا مجھ کو — ناسخ

ہوں گے ہم تیری چال سے محروم
بند انگیا کا جب کہ وا ہوگا — امانت

عبدالسلام ندوی نے اس مخصوص رنگ کو" بوالہوسانہ شوخی"
کا نام دیا ہے۔ ان لوگوں نے عشق و محبت کے آداب کو بالائے طاق رکھ
کر معشوق سے بے محابانہ گفتگو شروع کی۔"
(حوالے کے لئے ملاحظہ ہو"مطالعہ امیر" ڈاکٹر ابو محمد سحر ص۱۰)
امیر مینائی جہاں اساتذہ کی تقلید میں شعر کہے ہیں وہاں بھی اپنے
دور کے انحطاط کو منعکس کرتے ہیں۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں — غالب

ہٹاؤ آئینہ امیدوار ہم بھی ہیں
تمہارے دیکھنے والوں میں یار ہم بھی ہیں — امیر

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں — مومن

دیکھو جا کے آنکھ نہ دیکھو رقیب کو
چھریاں بھری ہوئی ہیں تمہاری نگاہ میں — امیر

مجنوں نے اس دور کی شاعری کے بارے میں کہا ہے ؎

"غیر شعوری طور پر یہ اشعار بھی اپنے دور کی
معاشرت کی پوری طرح آئینہ داری کرتے ہیں یعنے یہ
اشعار اس امر کا ثبوت ہیں کہ مروّجہ معاشرت سچائی اور
خلوص سے بالکل بے گانہ ہو چکی ہے اور اب چونکہ وہ بے مایہ
ہے اس لئے اپنی بے مائیگی کا پردہ رکھنے کے لئے ریا اور
نمائش سے کام لے رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اس قسم کی شاعری نہ صرف شاعر کے بگڑے ہوئے تخیل کا
ثبوت ہے بلکہ اس بات کی بھی شہادت ہے کہ سارے
معاشرتی نظام میں فساد پیدا ہو چلا ہے اور اب اس کے
بدلنے کی شدید ضرورت ہے۔"

(نگار، جنوری، فروری ۱۹۵۷ء ۔ ص ۳۳، ۳۴)

اسی شاعری نے حالی کو غزل پر فردِ جرم لگانے پر مجبور کیا اور شدّت
سے ضرورت محسوس ہونے لگی کہ غزل میں اصلاح کی جائے۔ غزل کے ساتھ
سخت زیادتی ہوگی اگر اسے خالص عشقیہ شاعری کا مترادف اور اسی
چار دیواری میں محصور اور محدود سمجھا گیا۔ غزل کی تاریخ شاہد ہے کہ ایک
صنفِ شاعری کی حیثیت سے مضامین اور طرزِ اظہار اور دونوں معنوں میں
بہت وسعت اور گنجائش موجود ہے۔ ادا بندی اور معاملہ بندی کے علاوہ کون
سا مضمون جو غزل کی زبان میں ادا نہیں ہوا۔ تصوف، فلسفہ، زندگی کی گوناگوں
کیفیات سبھی کے لئے غزل کا دامن کھلا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ غزل
کی مختصر گوئی کا انداز، علامتوں کی زبان میں بولنے کا طریقہ اس کی اشاریت
اور ایمائیت اس کی بیانیہ صلاحیتوں کو بہت وسعت بخشتے ہیں۔ اس بنا پر
نیاز فتح پوری نے لکھا ہے۔

" اگر ہم غزل کو صرف حسن و عشق تک محدود نہ رکھیں تو ہمیں
اس کا حال و مستقبل دونوں بہت شاندار نظر آتے ہیں اور یہ ماننا
پڑتا ہے کہ اسلوبِ بیان کے جتنے نئے طریقے نظر آتے ہیں وہ
اس سے پہلے کبھی نہ پائے جاتے تھے۔"

(نگار، جنوری۔ فروری ۱۹۴۱ء)

اسی دور میں جب حسرت نے کہا ۔

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

تو یہ ہمیں نئی نئی سی لگی۔ یا فراق نے جب یہ کہا ۔

سمٹ سمٹ سی گئی ہے فضائے بے پایاں
بدن چرائے وہ جس دم ادھر سے گذرے ہیں

تو مصحفی کی یاد آئی ۔

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

اور ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ ہمارے نئے شاعر نے پرانے مضمون کو نئے آفاقی ربط عطا کر دیئے ہیں۔ نظم تو نئی بلندیوں کو چھو رہی تھی لیکن غزل بھی نئی آن اور نئی شان سے مضامین کے تحفے لئے بزم سخن میں آرہی تھی ۔

اس پس منظر میں جلیل مانک پوری کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ جلیل اپنے استاد امیر مینائی کے ساتھ لکھنوٴ اسکول سے وابستہ ہیں ۔

داغ اور امیر کے دور میں بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر کے

" چونکہ معاشرت کا ایک سرا تہذیب وشائستگی اور دوسرا ابتذال وبازاریت سے ملا ہوا ہے اس لئے زبان کے خزانے میں مہذب وشائستہ الفاظ ومحاورات کے ساتھ مبتذل اور بازاری الفاظ ومحاورات بھی تھے۔"

(مطالعہ امیر ۔ ص: ۳)

یہاں شعر میں ابتذال بھی ملتا ہے تو زبان کی جمہوری قدریں بھی مستحکم ہوتی نظر آتی ہیں۔ نکھار بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے داغ "فصیح الملک" ہوئے تو جلیل "فصاحت جنگ" کا خطاب پائے ۔

امیر مینائی نے جب امیر اللغات کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا اور رام پور میں اس کے لئے دفتر قائم ہوا تو جلیل مانک پوری ہی کو اس کی ادارت کا کام سپرد ہوا۔ جلیل کوئی ۵۲، ۵۳ سال کے ہوں گے کہ انہوں نے تذکیر وتانیث پر ایک کتاب لکھی جس میں کوئی ۷ ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث کی فصاحت کی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے۔ اردو کے عروض اور اردو میں مستعملہ بحروں پر ایک کتاب مرتب کی۔ اور "معیار اردو" ایک کتاب تالیف کی جو اردو محاوروں کا مجموعہ ہے۔ شعری مجموعے تین دیوان ہیں۔ "تاج سخن" (۱۹۱۰ء)۔ "جان سخن" (۱۹۱۶ء) اور "روح سخن"۔ "معراج سخن" تفسیر کلام ہے۔ "گل صد برگ" رباعیات کا مجموعہ ہے۔ "سرتاج سخن" نظام کی تعریف میں قصائد، قطعات وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ ۱۹۲۷ء میں سوانح حضرت امیر مینائی شائع کی

جلیل کی شاعری میں جہاں ان کے پیشرو دور کی مبتذل شاعری کی یہ جھلک ملتی ہے ۔

کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو
خنجر سے کاٹتا ہوں شب انتظار کو

تو یہ گمان ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ یہ جلیل کا غالب رنگ ہے۔ اصل میں جیسا کہ خواجہ حمید الدین شاہد نے "حیدر آباد کے شاعر" میں کہا ہے

" جلیل کی شاعری قدیم رنگ تغزل کی یادگار ہے شاعری کے قدیم رنگ اور روایتی آہنگ کے استاد تھے ۔"

نیاز فتح پوری جلیل کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں ۔

" آپ امیر مینائی کے شاگرد وجانشین ہیں اور ایسے شاگرد وجانشین کہ اگر آج امیر زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزل گوئی سے دستبردار ہو جاتے ۔"

(نگار۔ جنوری، فروری ۱۹۴۱ء ص ۸)

اور یہ صحیح یوں ہے کہ امیر کے پاس "پر تکلف عمومیت" تھی جو سستے قسم کی لذت پرستی" کے سامان مہیا کرتی ۔ انہوں نے اگر داغ کے میں "عشق ومحبت کے آداب کو بالائے طاق" رکھ دیا تھا اور "معشوق سے بے محابہ گفتگو کی تھی" تو جلیل نے عشقیہ شاعری کو اپنے روایتی آداب پھر سے عطا کر دیئے تھے اور معشوق سے بات بھی کی تو رسمیں رکھ رکھاؤ کو ملحوظ رکھا۔ اور یہی جلیل کا کارنامہ ہے ۔

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینوں
جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور

جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ
کوئی جینے کا سہارا ہی نہیں ہے

میری ہر بات کو الٹا وہ سمجھ لیتے ہیں
اب کے پوچھا تو کہہ دوں گا کہ حال اچھا ہے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسمان چلے

یہ ہیں چیدہ چیدہ اشعار۔ دیوان "تاج سخن" سے "جان سخن" میں کچھ

ایسے اشعار ملیں گے۔

جلیل آنے لگیں ہیں ہچکیاں اب
کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں

تلاشِ یار لے آئی یہاں تک
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

حُسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بُت خانے سے

میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے
جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے

جلیل کے تیسرے دیوان "روحِ سخن" میں یہ شعر ملتے ہیں۔

مِلتی جُلتی ہے قیامت سے شباہت لیکن
اِک ذرا رنگ ہے گہرا شبِ تنہائی کا

نفس کی طرح کوچے میں کسی کے
ہزاروں بار میں آیا گیا ہوں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسّم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

یا پھر یہ شعر سُنئے۔

موسمِ گُل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا
صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلا رازِ جلیل
خُلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

جلیل حرف الفاظ کے ہیر پھیر کے لئے شعر نہیں کہتے۔ ان کے شعر کا "ہلکا ترنم" پڑھنے والے کو گنگنانے کی طرف مائل کرتا ہے۔
نیاز فتح پوری نے جلیل کی غزل گوئی کے بارے میں لکھا ہے۔

"جنابِ جلیل کے یہاں سلاستِ بیان کا یہ عالم ہے گویا ایک نرم و سبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہت چلا جا رہا ہے۔ اُن کا لکھنوی رنگِ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اس قدر دل نشیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔"

سادگی، روانی اور بے تکلفی جلیل کے کلام کا حسن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جلیل، حسرت نہیں۔ ہم عصر ہوتے ہوئے دونوں کے درمیان فاصلہ ہے جو جلیل اور حسرت نے اختیار کئے تھے۔ جلیل درباروں میں رہے۔ شاہوں اور شاہزادوں کو مشورۂ سخن دیتے رہے اور حسرت شاہوں سے دور تھے اور شہنشاہوں سے ٹکر لیتے تھے۔ صوفی بھی تھے اور باغی بھی۔ مشقِ سخن کے ساتھ چکّی کی مشقت بھی کرتے تھے۔ اسی لئے تو جلیل و حسرت دونوں
"پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں"

●●

ڈاکٹر عبدالخالق انصاری ایم اے، پی ایچ ڈی

فصاحت جنگ جلیل کا ادبی مقام

دنیائے ادب میں ایسی بہت سی ہستیاں ملیں گی جو جامع کمالات ہیں۔ بیک وقت وہ ادیب و شاعر بھی ہیں اور قومی رہنما و بہترین سیاس بھی۔ لیکن انہیں شہرت کسی ایک ہی شعبۂ حیات میں ملی۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کے تمام کمالات سے عوام واقف ہوں۔ ان ہی مقتدر ہستیوں میں سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، حکیم اجمل خاں، محمد علی جوہر، منشی امیر احمد امیر مینائی، ریاض خیر آبادی اور جلیل مانکپوری ہیں۔ قدرت نے انہیں گوناں گوں خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان تمام حضرات نے اپنی اپنی بساط کے مطابق دنیائے ادب کو روشنی بخشی۔

سرسید احمد خاں نے اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔ انہوں نے مسجع و مقفیٰ نثر کی روش سے انحراف کر کے اردو میں سیدھی سادی تحریر کو رواج دیا۔ ان کی یہ کوشش بہت کامیاب ہوئی۔ ادباء نے ان کے طرز تحریر کو اپنایا۔ رفتہ رفتہ اردو میں مسجع، مقفیٰ نثر نگاری نے دم توڑ دیا۔

مولانا الطاف حسین حالی ایک ممتاز ادیب و شاعر تھے۔ سرسید احمد خاں کی تحریک سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی روش بدل دی۔ اس تحریک سے منسلک ہونے سے پہلے کا ان کا اگر کلام دیکھا جائے تو اس میں نازک خیالی، معاملہ بندی، رنگینی اور معشوق سے چھیڑ چھاڑ سبھی کچھ ملے گا۔ بعد میں انہوں نے اپنی شاعری کو قوم میں جذبۂ سرفروشی اور جدوجہد پیدا کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا مسدس "مدوجزر اسلام" عوام میں بہت ہی مقبول ہوا۔

مولانا شبلی نعمانی زبردست نثار اور عمدہ شاعر بھی تھے۔ ان کا شعری مذاق بہت ہی نکھرا ہوا اور پاکیزہ تھا۔ اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں میں وہ شعر کہتے تھے۔ اگرچہ آپ اچھے شاعر تھے مگر انہیں شہرت نثر نگاری کی وجہ سے ملی۔ مولانا زبردست مورخ، سوانح نگار اور محقق تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ "سیرۃ النبیؐ" ہے۔ اس کے لئے باقاعدہ ایک دفتر قائم تھا۔ مولانائے موصوف اپنی زندگی میں اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ ان کے شاگرد رشید مولانا سید ندوی مرحوم نے اپنے استاد کے اس زبردست کارنامہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا تو غلط نہ ہوگا۔

اسی طرح آپ حکیم اجمل خاں کو لے لیجئے۔ یہ علم طب و حکمت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن طبابت کے ساتھ ہی ساتھ وہ بہت ہی عمدہ اور پاکیزہ شعری مذاق بھی رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں ندرتِ خیال، رفعتِ تخیل اور پاکیزگی کا عنصر غالب ہے۔ شیدا تخلص فرماتے تھے۔ ان کا ایک مختصر

شعری مجموعہ "دیوانِ شیدا" کے نام سے ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے
شائع ہوا۔ غالباً اس مجموعہ کو انہوں نے احباب کے لئے شائع کرایا تھا۔
آج کتنے لوگ ہیں جو حکیم اجمل خاں کو ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے
ہیں۔

ان کے بعد ایک اور ہستی سامنے نظر آتی ہے اور وہ ہے مولانا
محمد علی جوہر کی۔ مولانا نہ صرف ایک زبردست سیاسی، ورقومی رہنما
تھے بلکہ ایک اچھے شاعر و ادیب بھی۔ انہوں نے ملک و قوم کی جو خدمات
انجام دی ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی زندگی کا بیشتر
حصہ قیدِ فرہنگ میں کٹا۔ ۱۹۳۰ء میں لندن گول میز کانفرنس میں اس
عزم کے ساتھ شریک ہوئے کہ یا تو وہ ہندوستان کی آزادی کا
پروانہ اپنے ساتھ لائیں گے یا پھر کبھی غلام ہندوستان میں واپس نہیں
لوٹیں گے قدرت نے ان کی لاج رکھ لی۔ اور گول میز کانفرنس کے
دوران ہی ان کا انتقال ہوگیا اور آخری آرام گاہ کے لئے انہیں سرزمین
بیت المقدس میں جگہ ملی۔ مولانا نے موصوف قومی رہنما کی حیثیت
سے عوام کے سامنے آئے اور اسی حیثیت سے انہیں شہرت بھی ملی۔
مولانا کے کلام میں درد، فلسفہ اور تصوف و قومی بیداری کے
جذبات غالب ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہہ دو رضواں سے نہیں سایۂ طوبیٰ درکار
اپنی جنت ہے یہیں چھاؤں ہیں تلوار کی

دینا اگر نہ چاہے تو وہ موت تک نہ دے
دینے پر اگر آئے تو بے شمار دے

آدمیت ہے تو ہر بنیا دہے ہر خوبی کی
ہو نہ یہ بھی تو دھرا کیا ہے پھر انسان کے پاس

کیا ڈھونڈتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو
اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگِ چمن کہاں

منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنؤ کے ایک بزرگ شاہ مینا سے تعلق ہے۔
اور اسی مناسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ مینائی لکھتے ہیں۔ دبستان
لکھنؤ سے ان کا تعلق ہے۔ ان کا حلقہ تلامذہ بہت ہی وسیع ہے۔ ان
کے شاگردوں میں بہت سے باکمال لوگ شامل ہیں۔ نظم و نثر دونوں
ہی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مراۃ الغیب اور صنم خانہ عشق ان کی غزلوں کے
مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی ان کی تصانیف
ہیں۔

امیر مینائی اپنی غزلوں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ اگرچہ ان کا نثری
کارنامہ بھی قابلِ فخر ہے۔ غدر سے پہلے ارشاد السلطان لکھ کر شاہ اودھ نواب
واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کر کے ان سے انعام و اکرام حاصل کیا۔
لسانیات میں ان کی دو کتابیں سرمۂ بصیرت اور بہار ہند ہیں۔ اول الذکر میں
عربی اور فارسی کے ان الفاظ کا صحیح استعمال اساتذہ کے کلام کی سند سے
پیش کیا ہے۔ اسی کو بعد میں توسیع دے کر امیر اللغات کو مبسوط شکل میں پیش
کرنے کا ارادہ تھا۔

ان کا زبردست کارنامہ امیر اللغات کی تدوین و ترتیب ہے جس کے
لئے رام پور میں باقاعدہ ایک دفتر قائم تھا۔ اس کے اخراجات نواب صاحب
رام پور برداشت کرتے تھے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد دفتر
امیر اللغات مالی بحران کا شکار ہوگیا۔ اس بحران پر قابو پانے کے لئے امیر مینائی
نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ امیر اللغات میں جتنے بھی
الفاظ لئے گئے ہیں ان کی تذکیر و تانیث میں اساتذہ کے کلام کو بطور سند پیش
کیا گیا ہے۔ اس کے صرف دو حصے شائع ہو سکے تیسرا حصہ اگرچہ مکمل تھا مگر
مالی بحران کی وجہ سے زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔

جلیل مانکپوری کا شمار امیر مینائی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ جلیل
قصبہ مانکپور ضلع پرتاپ گڑھ اترپردیش کی مردم خیز سرزمین میں ۱۲۸۰ھ
مطابق ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے اس سرزمین نے بہت سے باکمال لوگوں کو
جنم دیا جن میں صوفیا، علماء، ادباء اور شعراء بھی تھے اور مجاہدین آزادی
بھی۔ اس دور میں نہ صرف ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی
ہی میں انقلاب آیا بلکہ ہندوستانی ادب نے بھی کروٹ لی۔ اردو ادب بھی
اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مولانا حالی نے شعراء کو غزل کی فرسودہ روایات کو ترک کرنے کا
مشورہ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء دو گروہ میں تقسیم ہو گئے۔ جو
گروہ مولانا حالی کا حامی تھا اس نے ادب برائے زندگی کا نعرہ لگایا۔ اور
نئی راہ پر گامزن ہوگیا۔ دوسرا گروہ ادب برائے ادب یا روایت پسند شعراء کا
تھا جو اپنی روش بدلنے پر تیار نہ تھا۔ جلیل مانکپوری کا تعلق بھی موخر الذکر گروہ
سے تھا۔

جلیل اپنی روش اس وجہ سے تبدیل نہ کر سکے کہ انہیں رام پور اور
حیدر آباد میں روایت پسند شعراء کا ہی ماحول ملا۔ درباری اور امراء روایت

پسند شاعری کے دلدادہ تھے۔ چونکہ جلیل کو انہیں لوگوں سے واسطہ رہا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ اپنی پرانی روش ہی پر ڈٹے رہیں۔

جلیل بیس سال کی عمر میں امیر حلقے تلامذہ میں شریک ہوئے ان کی خواہش تھی کہ وہ رام پور میں استاد کی خدمت گذاری میں زندگی گزار دیں۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی استاد سے کیا مگر دفتر امیراللغات میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے امیر نے اپنی معذوری ظاہر کی۔ اور کہا کہ آسامی خالی ہوتے ہی انہیں فوراً رام پور بلالیا جائے گا۔ دفتر میں گنجائش نکلتے ہی امیر مینائی انہیں رام پور بلالیا۔

جلیل کو ابتدا ہی سے الفاظ کی تحقیق کا شوق تھا۔ وہ ایک معمولی کارکن کی حیثیت سے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ اس کے پہلے ناظم وسیم خیرآبادی تھے۔ ان کے استعفیٰ کے بعد منشی ممتاز علی آہ کو یہ منصب سونپا گیا لیکن وہ بھی استعفیٰ دے کر کھیرا گڑھ چلے گئے اور جلیل کو دفتر کی نظامت سونپی گئی۔ حقیقتاً جلیل کی ادبی زندگی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ دنیائے ادب میں ناظم دفتر امیراللغات کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔

جلیل کی شہرت ان کی غزلوں کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے تقریباً تمام ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام میں امیر کا رنگ بہت ہی نمایاں ہے۔ دور اوّل کی غزلیں بالعموم بہت طویل ہوتی تھیں۔ کہیں کہیں ابتذال کا رنگ بھی آگیا ہے لیکن حقیقت بیں نظریں جانتی ہیں کہ اس میں جلیل کا قصور نہ تھا بلکہ قصور تھا اس ماحول کا جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ تعیش پسندی کی وجہ سے اچھے اچھے قادرالکلام اور مقتدر شعراء کے یہاں بھی مبتذل اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ دور ختم ہوا تو شعراء کے کلام میں درد کی بھی آمیزش ہوگئی۔ جلیل کے یہاں بھی تبدیلی آئی۔ جہاں تک مبتذل اشعار کا تعلق ہے وہ صرف جلیل کے دیوان اول میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ان چند اشعار کو چھوڑ ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو ان کے یہاں جنسی بے راہ روی بہت کم نظر آئے گی۔ ان کا کلام تغزل سے بھرپور ہے یہ اپنے رنگ و آہنگ میں منفرد ہیں۔ اور یہی انفرادیت ان کی شہرت کا باعث بنی۔

زبان اور بیان پر جلیل کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ انہیں الفاظ تلاش نہیں کرنے پڑتے بلکہ وہ خود جلیل کے حضور حاضر ہوجایا کرتے یہ قافیہ کے پابند نہیں تھے بلکہ غزلوں کے لئے قافیے منتخب کرلیتے۔ ان کے یہاں الفاظ کی نشست بہت ہی چست ہوا کرتی جو لفظ جہاں لکھ دیا ایسا لگتا ہے کہ وہ اسی جگہ کے لئے ہے۔ سلاست و روانی جلیل کے کلام کا طرۂ امتیاز رہا ہے محاوروں کا استعمال بکثرت کیا ہے جیسے ؎

دل کو جلتے ہوئے اشک کو ڈھلتے دیکھا
زخم دل ایک تجھے پھولتے پھلتے دیکھا
بجلی کی تانک جھانک سے تنگ آگئی ہے جاں
ایسا نہ ہو کہ پھونک دوں خود آشیاں کو میں
ہزاروں میں یہی دو آشنا ثابت قدم نکلے
مہینوں درد دل ٹھہرا رہا، درد جگر برسوں

ان کے اشعار کی مدد سے محاوروں کی ایک لغت باآسانی مرتب کی جاسکتی ہے۔

ان کے کلام کی مقبولیت کا دوسرا سبب بحروں کا انتخاب ہے۔ ان کے یہاں بالعموم مترنم بحریں ملتی ہیں۔ الفاظ کا حسین انتخاب دلوں کو مسخر کرلیتا ہے۔ کلام کی انہیں خوبیوں نے عوام کو اپنا گرویدہ بنا دیا۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے یہاں عاشقانہ رنگ غالب ہے۔ ایک مقبول ترین غزل کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

کچھ اور اشعار سنئے :۔

وہ کم سنی کے سبب واقف عتاب نہیں
دم سحر ہے ابھی گرم آفتاب نہیں
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
جو نیند آتی ہے کرتی ہیں پتلیاں فریاد
ارے یہ آنکھ کا پردہ ہے فرش خواب نہیں

جیسے شرمیلی دلہن گردن جھکائے شرم سے
وہ ادا ہے خون میں ڈوبی ہوئی تلوار کی

جلیل دبستان لکھنؤ سے وابستہ تھے ان کے کلام میں امیر و داغ

دونوں کا رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ جلیل کی حیثیت ایک مقلد کی ہے انہوں نے امیر کی پوری تقلید کی ہے اسی لئے ان کے کلام میں استاد کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ریاض خیر آبادی نے ان کے اسی رنگ کے پیش نظر کہا ہے ؎

جلیل استاد کے تم جانشیں ہو
تمہیں کہتے ہیں ہم استاد فن بھی
طبیعت میں وہی استاد کا رنگ
وہی شوخی وہی لطفِ سخن بھی

جلیل کا محبوب کسی اور دنیا کی مخلوق نہیں ہے چنانچہ محبوب سے شکوہ و شکایت، ہجر و وصال، رندی و شوخی اور چھیڑ چھاڑ سبھی کچھ ہے۔ جلیل کے اس رنگ کو دیکھ کر بعض نقد نگاروں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جلیل اپنے ماحول و کوائف سے بالکل بے گانہ تھے لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان کی غزلوں میں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جو صحیح طور پر اپنے دور کی عکاسی کرتے ہیں ؎

نشیمن کیا چمن بھی پھنک گیا بجلی سے اے جلیل
ہوا سب کچھ مگر گرمی نہ آئی تیرے شیون میں

ملک کے انتشار کو دیکھ کر جلیل کہتے ہیں ؎

چھوڑ دو گل و بلبل، کوئی ذکر اور ہی چھیڑ دو
کچھ لطف جلیل اب یہ ترانے نہیں دیتے

زندگی عمل کا دوسرا نام ہے۔ آرام طلبی انسان کو کاہل اور اپاہج بنا دیتی ہے۔ انسان کے دل میں کچھ نہ کچھ امنگ ہمیشہ ہونی چاہیے کہتے ہیں ؎

زندگی کیا جو بسر ہو چین سے
دل میں تھوڑی سی تمنا چاہیئے

اسی قبیل کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

سب باندھ چکے کب سے سرِ شاخ نشیمن
ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

اس گرفتاری کی پوچھو نہ تڑپ جس کے لئے
درِ قفس ہو کھلا طاقتِ پرواز نہ ہو

مجھ ہی پر ہیں کیوں باغباں کی نگاہیں اسی شاخ پر آشیاں اور بھی ہیں

ان اشعار کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ جلیل اپنے دور کے حالات سے واقف نہ تھے۔

جلیل کی غزلوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جنہیں غزل کی جان کہا جا سکتا ہے۔ جلیل کے ان شعری محاسن کے پیش نظر نیاز فتح پوری فرماتے ہیں ؎

"اگر آج امیر زندہ ہوتے تو خود اُن کے حق میں شعر گوئی سے دست بردار ہو جاتے جناب جلیل کے یہاں سلاست بیان کا یہ عالم ہے کہ گویا ایک نرم سبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کا لکھنوی رنگِ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اس قدر دل نشیں ہے کہ تھوڑی دیر کیلئے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

[مجلہ عثمانیہ جلیل نمبر صفحہ ۱۶۲ کلام جلیل پر تبصرہ]

اور قاضی عبدالغفار فرماتے ہیں

"ادب اور شاعری کی قدیم محفلوں کا شاید آخری چراغ تھا جو گل ہو گیا اردو شاعری کے شجرہ میں حضرت داغ کے بعد یہ آخری نام تھا جس کے بعد اس دستاویز میں کسی نام کا اضافہ بہت مشکل ہے ۔۔۔۔۔ اپنے اسلوب کلام میں جلیل قدیم سلسلۂ تلمذ کے آخری استاد تھے ۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنی ذات اور شاعری سے انیسویں صدی کے دو مکاتیب کی خوبیاں یکجا کر لی تھیں۔"

[میزانِ جلیل نمبر ۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء اداریہ حضرت جلیل مغفور از قاضی عبدالغفار]

جلیل اپنے دور کے مسلم الثبوت استادِ فن تھے۔ اس وقت ان کا ہم پلہ کوئی شاعر نہ تھا۔ تمام نکاتِ شعری سے واقف ہونے کے باوجود، اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ زمانے نے کبھی کسی کو بخشا نہیں ہے اس لئے ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ جو کچھ نظم کریں سوچ سمجھ کر اور احتیاط کے ساتھ کریں تاکہ کسی کو اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔ جلیل نے حتی الامکان اپنے کلام کو سقم سے بچانے کی سعی کی ہے ؎

یہ جان لو کہ زمانہ ہے نکتہ چیں کا جلیل سقم کا پہلو ذرا بچائے رہو

تنگ نظر لوگوں نے ان کے کلام میں خامیاں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اور جب کچھ ہاتھ نہ لگا تو یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ان کی شاعری زندگی کے حقائق سے بہت دور ہے۔

جلیلؔ کی زندگی کا بڑا حصّہ درباداری میں گزرا۔ رام پور میں بھی انہیں درباری ماحول ہی سے سابقہ پڑا اور جن شعراء سے انہیں استفادہ حاصل کرنے کا موقعہ مِلا وہ بھی روایت پسند تھے۔ حیدر آباد آئے تو دربارِ آصفی سے منسلک ہو گئے انہیں وجوہ کی بنا پر ان کے کلام میں درباداری کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا جلیل کے کلام پر تبصرہ کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ انہیں حالات کی روشنی میں ان کے کلام کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اگر وہ اس میں کامیاب نظر آتے ہیں تو ان کی استادی اور فن کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ان کی شاعری اس دور کے معیار پر اگر پوری اترتی ہے تو یہ ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

جلیلؔ کی قوتِ متخیلہ کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ شاگردوں میں شاہِ دکن کے علاوہ شہزادگان واعیانِ سلطنت بھی تھے۔ علاوہ ازیں ان کے شاگردوں کی تعداد بھی ان گنت تھی۔ ہر شخص کا مزاج جداگانہ تھا۔ جلیلؔ اپنے شاگردوں کے فکر وخیال کے لحاظ کرتے ہوئے ان کے کلام پر اصلاح دیتے۔ مگر ان کی فکر پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔

جلیلؔ نے فطرتِ انسانی کا بھی عمیق مطالعہ کیا ہے جس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے ؎

آتے آتے آئے گا ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

پردہ نہ تھا وہ صرف نظر کا قصور تھا
دیکھا تو ذرّے ذرّے میں ان کا ظہور تھا

قاری کے ذہن پر جلیلؔ کی سادگی جادو کا کام کرتی ہے اور یہی ان کے کلام کا اعجاز ہے ان کا کلام پڑھ کر قاری کو بحرِ تفکّر میں غوطہ لگانا نہیں پڑتا بلکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔

لکھا ہے نخلِ تمنّا کی پتّی پتّی پر
یہ وہ نہال ہے جس میں ثمر نہیں آتا

آدمی وقفِ کارِ دنیا ہے
مہماں میزبان ہے گویا
اچھے اچھوں کو پھانس رکھا ہے
زالِ دنیا جوان ہے گویا

جس کو چاہوں وہ برا ہی چاہے
ہائے نیکی کا زمانہ ہی نہیں

یہ اشعار حقیقت بیانی کا مرقع ہیں۔ جلیلؔ کے کلام کا ایک بڑا حصّہ رندو مستی سے پُر ہے۔

خمریات کے جو اشعار ملتے ہیں انہیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جلیل اگر بلانوش نہیں تاہم انہوں نے چکھا ضرور ہے۔ چند اشعار سنئے

خاکِ چمن پہ شبنم وگل کا عجب ہے رنگ
ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

کس قدر شوخ ہے شراب کا رنگ
ہو رہا ہے تمام مینا سرخ

حرمتِ میکدہ کہتی ہے مجھ سے کہ جلیلؔ
دل سے شیشے کو لگا آنکھ سے پیمانے کو

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیلؔ
بادل کا رنگ دیکھ کر نیت بدل گئی

ہوا نباہ نہ ترکِ شراب کا مجھ سے
بہار آتے ہی توبہ کو نذرِ جام کیا

ان کے کلام کی رنگینی دیکھ کر علاّمہ حیرتؔ بدایونی فرماتے ہیں :۔

جس وقت میں حیدرآباد آیا میری جوانی کا زمانہ تھا۔ جلیل کے کلام نے مجھے اپنا گرویدہ بنا دیا تھا اور دل میں ان سے ملنے کی خواہش بار بار اُبھرتی مگر

اس پس و پیش میں رہتا کہ جلیل جیسے بلند مرتبہ
شاعر جو استاد شاہ بھی ہے کس طرح ملاقات
کروں۔ ان کے کلام کی رنگینی کے پیش نظر یہ بھی خیال
تھا کہ ان کے یہاں محفلِ نشاط بھی جمتی ہوگی جب ان
سے ملاقات کی تو وہاں کچھ اور ہی رنگ نظر آیا میں
یہ سوچتا رہ گیا کہ جو شخص یہ کہتا ہے ؎

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

دیکھا تو ہاتھ میں تسبیح لئے ہوئے ذکر و اذکار میں
مشغول ہیں۔"

یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ جلیل کا کلام تصوف و فلسفہ سے
خالی ہے۔ ان کے دیوان میں ان مضامین سے متعلق بھی اشعار ملتے
ہیں۔ اگرچہ کم سہی۔ دراصل غزل کے لئے اس قسم کے بوجھل مضامین
موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ جلیل ان مضامین کے ذریعے اپنی غزل
کو پند و نصائح کا دفتر بھی بنانا نہیں چاہتے تھے۔ فلسفہ اور تصوف
کی خاردار جھاڑیوں میں پھنس کر قاری غزل کے مضامین سے
لطف اور دلچسپی حاصل نہیں کر سکتا آمد کا سلسلہ بھی منقطع
ہو جاتا ہے۔ تصوف اور فلسفے کے بھی چند شعر سنئے ؎

دیر و کعبہ کی زیارت تو فقط حیلہ ہے
جستجو تیری لئے پھرتی ہے گھر گھر مجھ کو

اس کے کرم نے بخش دیئے جنت میں بے حساب
سو تھے قصوروار تو اک بے قصور تھا

حشر میں میرے گناہوں کی سمائی ہے محال
اتنی وسعت ہے کہاں دامنِ رحمت کے سوا

ہستی و عدم دونوں ہمارے ہی لئے ہیں
اُس گھر میں چلے جائیں گے اِس گھر سے نکل کر

ہو بہو ہستیٔ موہوم کا نقشہ ہے جلیل گُل کا دم بھر کیلئے خنداں ہونا

جلیل قصیدہ نگاری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے تمام قصائد
منظرِ عام پر نہیں آسکے۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف کی مدح
میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں سے صرف ایک تاج سخن کی زینت
بن سکا۔ سر تاج سخن میں جو قصائد اور مبارکبادیاں شامل ہیں وہ
سب دورِ عثمانی کی یادگار ہیں۔ عموماً شکوہ الفاظ، ندرت بیان و
زبان قصائد کے لوازمات میں سے ہیں۔ اور محسن و ممدوح کے
منصب و مرتبہ کا لحاظ بھی قصیدے میں ضروری ہوتا ہے۔ جلیل نے
اپنے قصیدوں میں قصیدہ نگاری کی روایات اور اس کے فن کو
برقرار رکھنے کی پوری سعی و کوشش کی ہے۔ لیکن جہاں تک طرزِ
نگارش کا تعلق ہے جلیل نے سہل اور عام فہم زبان استعمال کی ہے
واقعات کی منظرکشی قابلِ تحسین ہے بلا شبہ جلیل کے قصیدوں کو
داغ کے قصیدوں سے کسی طرح بھی کم تر نہیں کہا جا سکتا۔ جلیل
کی شاعری پر نقادانِ ادب کے آراء ملاحظہ فرمائیں ـــ

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں :ـ

"جلیل جدید اور قدیم رنگِ تغزل کے جھگڑوں
میں نہیں پڑتے۔ اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے
ہیں اور یہ رنگ قدیم رنگ تغزل کی یادگار ہے۔
جلیل دورِ حاضر کی نئی تحریکوں سے متاثر نہیں ہوئے
اور اپنی ساری توجہ غزل پر صرف کر دی۔ ان کی
شاعری کی جڑیں ماضی کی فضا میں پیوستہ ہیں۔ ان کے
پھولوں میں عہدِ رفتہ کی خوشبو ہے۔"

مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں :ـــ

"جلیل غزل کے روایتی آہنگ کے استاد ہیں۔
نکھری ہوئی زبان، نرم رچی موسیقیت ان کے کلام
کی وہ ممتاز خصوصیت ہے جس نے ان کو اس قدر
مقبولِ عام بنا رکھا ہے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ جلیل کی شاعری سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں :ـ

"ان کا کلام ایسا ہے کہ اس کو ہر شخص پڑھ اور سمجھ
سکتا ہے اور جن کو خدا نے سخن فہمی کا مادہ دیا ہے۔ وہ
اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کیونکہ ان
کی غزل اپنے دائرے سے نکل کر سائنس اور فلسفے

کی جولانگاہ نہیں بنتی۔"

جلیل کی وفات پر کانفرنس گزٹ علی گڑھ ۲۴ جنوری ۱۹۴۶ء اپنے اداریہ میں یوں رقم طراز ہے ۔

"حضرت جلیل ہمارے زمانے کے ایک
جلیل القدر شاعر اور ہماری زبان ایک بڑے محسن
تھے۔"

"آج کل" دہلی فروری ۱۹۴۶ء کے مطابق :۔

"آپ اردو کے ایک بڑے جلیل القدر اور استاد
مسلم الثبوت تھے۔"

'صبح دکن' حیدر آباد نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے :۔

"آپ اس رنگِ تغزل کے استاد تھے جو اب
انقلاب زمانہ کے تحت قدیم کہا جاتا ہے لیکن جس
کی تاثیر و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

اس بات پر سب متفق ہیں کہ جلیل روایت پسند شاعر تھے۔ ان کے کلام میں معاملہ بندی اور شوخی، سلاست و روانی، رندی و مستی سبھی کچھ ملتا ہے۔ بلاشبہ جلیل اپنے عہد کے بے مثال اور منفرد شاعر تھے۔ انہوں نے عوام کے ذوق و دلچسپی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ کہتے ہیں:

ع تفریح طبع کے لئے سیکھا تھا فن شعر

جلیل ایک اچھے نثار بھی تھے۔ نثر نگاری میں مختلف موضوعات قلم اٹھایا ہے اور اپنی کوششوں میں کامیاب رہے۔ جلیل کے فطری رجحانات میں ایک اردو کی لسانی خدمت بھی تھا۔ امیر اللغات کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں زبان اردو کے تعلق سے کئی ایک مسائل میں سب سے بڑا اور مشکل ترین مسئلہ تذکیر و تانیث کا تھا جس کے متعلق جلیل کہتے ہیں ؎

مذکر اور مؤنث کی ہیں بحثیں
بڑا جھگڑا ہے یہ اردو زباں میں

دہلی اور لکھنؤ اردو کے دو بڑے اور مستند مرکز تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اردو زبان میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ کچھ اس قدر الجھا ہوا ہے کہ ہر گاؤں اور ہر دیہات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ الفاظ کے تلفظ اور تذکیر و تانیث کے مسائل کو دوسری زبانوں میں لغت کے ذریعے حل کیا گیا ہے۔ جلیل نے بھی ان اختلافات کو دور کرنے کے رسالہ تذکیر و تانیث تالیف کیا۔ اس میں تقریباً سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی ہے اور وہ بھی صرف ان الفاظ کی جو عام قاعدے سے مختلف ہیں۔ اس رسالہ کی تالیف میں جلیل نے بڑی محنت و کاوش کی ہے۔ جو الفاظ مختلف فیہہ ہیں ان کی صراحت کر دی ہے کہ یہ الفاظ فلاں جگہ مذکر و مؤنث کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اس رسالہ کے ذریعے جلیل نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور زبان میں یکسانیت پیدا ہو۔ (مولانا عبدالحلیم شرر نے اس رسالہ پر ایک مبسوط تبصرہ کیا ہے۔) ان کی دوسری لسانی تالیف 'معیار اردو' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کتاب میں جلیل نے محاوروں کے معنی اور اُن کے صحیح محل و استعمال بتائے ہیں اگرچہ بہت ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ تاہم محاوروں کا مطلب اور ان کا استعمال تمام و کمال ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اختصار کی وجہ سے انہوں نے اس کتاب میں اساتذہ کے کلام سے سند نہیں پیش کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک اور کتاب اسی موضوع پر 'میزان اردو' لکھی تھی لیکن وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ جلیل کے مکاتیب بھی لسانی مسائل کو حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن لوگوں کو کسی لفظ کی تذکیر و تانیث یا تلفظ کے بارے میں شبہ ہوتا تو وہ جلیل سے صلاح و مشورہ کرتے۔ ان کے تمام خطوط کو جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو یہ اردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف سید احمد دہلوی نے تذکیر و تانیث کے ضمن میں سند کے طور پر جلیل سے شعر کہلوا کر اپنی لغت میں شامل کیا ہے۔

شعراء کی مدد کے لئے اردو کا عروض نامی ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اردو زبان میں یوں تو اس موضوع پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں جن میں علم عروض اور شعر و شاعری کے تمام نکات کو نہایت باریک بینی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جلیل نے اپنی کتاب میں اردو کی صرف مستعمل بحروں کو شامل کیا ہے اور انہیں مثالوں کے ذریعے سمجھایا ہے۔ ایک ہی بحر میں زحافات کے ذریعے جو تغیرات ہوتے ہیں اور ایک ہی بحر میں ان کا استعمال جائز ہے انہیں بھی بتادیا ہے۔ تقطیع کرنے کا آسان طریقہ بھی بتایا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب مبتدی شعراء کے لئے لکھی گئی ہے

جلیل نے سوانح امیر مینائی بھی لکھی ہے جس سے صرف صاحب سوانح کی زندگی کے واقعات اور ان کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ تاریخ کے موضوع پر بھی ایک کتاب اختیار جنگ بہادر اختر مینائی

کی شراکت میں لکھی ہے جس میں تاریخ دکن کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ نواب میر محمود علی خاں کے عہد کو نہایت ہی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تاریخ نہیں بلکہ کسی کی ذاتی ڈائری ہے۔ کہیں کہیں ادبی چاشنی بھی ملتی ہے۔

ان تخلیقات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جلیل اپنے دور کے ایک بہت بڑے شاعر اور نثار تھے۔ اگرچہ قدیم روش کے شاعر تھے لیکن ان کی انفرادیت اور ان کے کلام کی رنگینی اور سلاست بیانی انہیں اس دور کے دوسرے شعراء سے ممتاز کر دیتی ہے۔ ان کی زبان دانی اور اسلوب بیاں کا ہر نقد نگار مدح خواں ہے۔

جلیل کے نثری کارناموں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ انہوں نے لکھنؤ کی اس روایت کا دامن نہیں چھوڑا جو اہلِ لکھنؤ نے زبان کی اصلاح کے سلسلے میں کی ہے۔ جلیل نے تذکیر و تانیث معیار اردو اور اردو کا عروض لکھ کر اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ یہ تینوں ہی کتابیں اردو لسانیت سے متعلق ہیں۔ جلیل کی ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ جلیل اپنے دور کے نہ صرف بہترین شاعر تھے۔ بلکہ بہترین نثار بھی۔ اردو کی لسانی خدمت کے سلسلے میں بھی جلیل پیش پیش رہے۔ تا دمِ حیات ان کی یہی کوشش رہی کہ اردو زبان میں جو اختلافات ہیں وہ ختم ہو جائیں اور اس میں یکسانیت پیدا ہو اور اہلِ زبان کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر اردو کی صحیح خدمت کر سکیں۔

دیوان غالب کا روسی زبان میں ترجمہ

ماسکو۔ اردو کے مشہور شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کے مجموعۂ اشعار "دیوانِ غالب" کا ترجمہ روسی زبان میں شائع کرایا گیا ہے۔

واضح رہے کہ دیوانِ غالب کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور کئی دوسری بین الاقوامی زبانوں میں پہلے شائع ہو چکا ہے۔

بقیہ: فصاحت جنگ جلیل۔ فن اور فن کار

وہ اُٹھے درد اٹھا حشر اٹھا
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

-

یہ جو سر نیچے کئے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں

-

مری نگہ نے عجب کار لاجواب کیا
کہ تجھ کو لاکھ حسینوں سے انتخاب کیا

روحِ سخن، معراجِ سخن، عطرِ سخن، سرتاجِ سخن، جانِ سخن، تاجِ سخن ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کا کلام عام فہم مگر دل کی گہرائیوں میں اترنے والا ہے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعات، نعت بھی جسم و جاں میں اتر جانے والی لکھی ہے۔

مطلع عرض ہے:

کٹے عمر صلِّ علیٰ کہتے کہتے
اُٹھوں حشر میں مصطفیٰ کہتے کہتے

-

نہ منصب نہ دولت نہ زر چاہیئے
مجھے آپ کی اک نظر چاہیئے

یہاں تک میں نے شاہانِ دکن کے دو جلیل المرتبہ دبدبہ و شوکت کے حامل نامی گرامی شعراء کا ذکر کیا کہ جنہوں نے ان کو استاد مان لیا تھا لیکن یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ شہزادہ معظم جاہ بہادر المخلص بہ شجیع نے بھی ان کی استادی کو مانا اور ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ درباری سرپرستی اعجاز و اکرام نے ان کی قابلیت کو کسی طرح گھٹایا نہیں بلکہ اس کو جلا دی۔ چنانچہ نئے دور میں بھی یہ روایتی اور قدامت پرست شاعر اپنی شعری خوبیوں جیسے شستگی، شوخی، فصاحت، سہل اندازِ بیان اور اسی طرح کی خوبیوں کی وجہ سے آپ اور ہم سب کے محبوب شاعر ہیں۔

نیا تبصرہ

عبدالسمیع بوبیرے

مشعلِ آزادی (حصہ اول)
ساغر نظامی
قیمت : چالیس روپے
ناشر : پبلی کیشنز ڈویژن - نئی دہلی ۱

"ہندوستان کی جنگِ آزادی کے بارے میں نظم ونثر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ساغر نظامی کی طویل نظم "مشعلِ آزادی" اپنی نوعیت کی منفرد کوشش ہے۔ اس میں نہ صرف رزمیہ کا رنگ و آہنگ ہے بلکہ تاریخی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اردو میں ایسی طویل نظمیں بہت کمیاب ہیں۔ ساغر نظامی اردو کے بڑے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی یہ تصنیف اندازِ بیان کی دلکشی، جوشِ بیان اور حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور ہے۔ شہیدانِ آزادی کی مقدس یاد ہمارا قومی فریضہ ہے ان کی یاد تازہ کرکے ساغر صاحب نے اس فریضہ کو بطریقِ احسن پورا کیا ہے۔"

ان جملوں میں ہی "مشعلِ آزادی" کا تعارف مکمل الفاظ میں کیا گیا ہے۔
اب اس تعارف کی روشنی میں ساغر کی یہ نظم آپ پڑھتے چلے جائیے اور لطف اندوز ہوتے جائیے۔

ساغر نظامی اردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ ساغر کی شاعری پر کچھ کہنا تو استادوں کا کام ہے لیکن ساغر کے شیدائیوں نے ساغر کی شاعری کے بانکپن، غنائیت اور الفاظ کی جادوگری کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ ساغر عمر کی جس منزل میں ہیں اسے دیکھتے ہوئے "مشعلِ آزادی" (حصہ اول) کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے یہ کام مکمل کیا ہے۔ قادرالکلامی اور حسنِ بیان نے اس طویل نظم کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

دنیا کی مختلف زبانوں کی شاعری (فارسی کو چھوڑ کر) اور اردو شاعری میں ایک نمایاں فرق ہے۔ اردو شاعری میں جو FORCE ہے وہ انگریزی یا دوسری کسی زبان کی شاعری میں نہیں۔ اردو میں فارسی، عربی، ہندی، ترکی تراکیب نے اس زبان کو اور بھی گنگا جمنی بنا دیا ہے۔ اور پھر اس گنگا جمنی زبان میں گنگ و جمن کے اس دیش کا تذکرہ "مشعلِ آزادی" کی صورت میں منظوم تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔

حرفِ آغاز میں ساغر نظامی نے مختصر پیرائے میں بہت سی باتیں کہی ہیں کہ کس طرح ان کے دل میں اس نظم کی تحریک پیدا ہوئی۔ عرضِ ناشر بھی شامل ہے۔ نیرنگِ آزادی، ارژنگِ غلامی، رازداں دریا، شعلے کا سفر، چار ابواب ہیں۔ پہلے تین ابواب میں جغرافیائی حالات، تہذیب وتمدن عظیم ورثہ، یکجہتی اور سیکڑوں مضامین ہیں۔ چوتھا باب دراصل تاریخی واقعات کی ایک خوبصورت لڑی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی؟

(شہنشاہیت کا اولین بانی) سے شروع ہو کر چیدہ چیدہ اہم تاریخی واقعات
وشخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں بانی مغل (بہادر شاہ ظفر) پر ختم ہوتا ہے
تین سو بیس صفحات پر مشتمل یہ شاہکار رزمیہ اردو میں اولین کوشش ہے
علم و ادب کے شیدائیوں اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ اور
طلباء کے لئے یہ ایک مفید منظوم دستاویز ہے۔

قومی اور وطنی شاعری میں جو رول اردو شعراء نے انجام دیا ہے وہ
فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ساغر کے اس رزمیہ نے اردو شاعری کے
اس خلاء کو بھی پُر کردیا ہے جو برسوں سے
فکرِ سخن کے لئے محتاج تھا۔

رزمیہ ایک مشکل فن ہے اور قادر الکلام شاعر ہی اس اسپ سبک رفتار
کو لگام دے سکتا ہے۔ رزمیہ کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا
ہے کہ عرضِ مدعا، موضوع سے انصاف، غلو سے اجتناب، صحیح واقعات
کا تذکرہ، تقدیم و تاخیر پر نظر اور حسنِ بیان میں مہارت ہو تو پھر اس کلام کی
ایک اور ہی شان ہوتی ہے ورنہ رزمیہ آہنگ میں آمد نہ ہو تو ایسا لگے کہ
ڈھال تلوار کی چھناچھن، چھن گئی ہو۔

طویل نظم "مشعلِ آزادی" اپنے پہلو میں رزمیہ کا خوبصورت
رنگ و آہنگ لئے ہوئے ہے۔ اس طویل نظم کے چند ہی اشعار پر
تبصرہ کرتے چلیں۔

ابتدا میں ایک جگہ "مورخ" شاعر سے مخاطب ہے۔

مغنّی ہو تم اس دھرتی کے اس دھرتی سے اُپجے ہو
تم اس دھرتی کے عرفاں کے ترانے کیوں نہیں گاتے
مرے رمز آشنا شاعر، مرے جادو بیاں شاعر

ظاہر ہے ساغر نے جو محنت ہندی الاصل الفاظ کو اردو شعر کے قالب
میں سموتے ہوئے اس نظم کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ لائقِ ستائش
ہے۔ لیکن یہاں لطافت میں" اُپجے " ہوا چھے خاصے شعر میں مثلِ نظر ہے۔
مگر کئی ایک جگہوں پر ہندی الاصل الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے استعمال
کیا ہے مثلاً

جہاں قومیں گلے ملتی ہیں تہذیبوں کا سنگم ہے
جو اپنی امتزاجی روح سے اکرامِ عالم ہے
—
ہیں جس کی روح میں محلول ادیان یہ وہ دھرتی ہے جہاں وید اور اپنشد کی حکمت ہے مناظر ہیں

جہاں توحید کے جلوے جھلکتے ہیں مظاہر میں
جہاں ہے رہنما گیتا و قرآں یہ وہ دھرتی ہے
تھے بھکشو جس زمیں کے چین و جاپاں یہ وہ دھرتی ہے
. . . .
جہاں حاصل ہوا گوتم کو نرواں یہ وہ دھرتی ہے
جہاں کی خاک رام اور کرشن کی عظمت کی حامل ہے
جہاں کی خاک اعجازِ مہا بھارت کی حامل ہے
. . . .

شاعر حمدِ عظمتِ ہندوستان گاتے ہوئے یوں گویا ہے۔

جہاں سجدے کناں ہے روحِ انساں یہ وہ دھرتی ہے
جہاں ہر موڑ، فکرِ بالمیکی گنگناتی ہے۔

فکر کبھی گنگناتی نہیں۔ اور پھر بالمیکی کی فکر عظمت و وقار اور سنجیدگی کے
ضمن میں ہو سکتی ہے۔ گنگناہٹ کے ضمن میں نہیں۔ پھر ایک جگہ منو
چھڑکتے ہیں مجھو چھو کے ترے چرن۔ آسمان کہکشاں" سوریہ چندرماں
سے ضو ملتی ہے آسماں کہکشاں سے نہیں۔ ضو چھڑکی نہیں جاتی!

لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند ایک باتوں کو چھوڑ کر ساغر کی اس نظم میں
لطافت اور چاشنی ایک ایک مصرعہ میں پائیں گے۔ مثلاً شاعر کے
بیان میں یہی نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

قدیم دھرم پوتیاں
پرانے دین کے نشاں
خزینۂ ہائے عارفاں
وہ نورِ دل وہ حرزِ جاں
الاؤ کو کھلا دیئے
نہ جل سکے تو منیظا میں
سمندروں کے پیٹ میں
ڈبو دیے بہا دیئے

درویش،

" مٹا ہے اور نہ مٹ سکے گا اپنا نام اور نشاں
ہماری داستاں تو ہے، بہت قدیم داستاں

ایک اور بند ملاحظہ فرمائیے۔

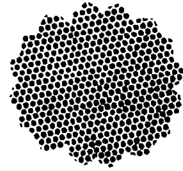
ہزاروں ہاتھ بنکروں کے بے انگوٹھا کر دیئے

جو صاحبان فن تھے سب فقیر و بے نوا ہوئے
سناں کی نوک سے چراغ ہر جگہ بجھا دیئے
ہماری چاندنی چرائی اپنے گھر کے واسطے ۔

ظاہر ہے اس طویل نظم کے محاسن بیان کرنے کے لئے اتنے ہی صفحات درکار ہوں گے جتنے صفحات "مشعل آزادی" کے ہیں۔ لیکن تنگیٔ داماں صفحات کے خیال سے بھی اور "شعل آزادی" پڑھنے والوں کی دلچسپی اور تجسس باقی رہے اس لئے تبصرہ مختصر کرتے ہیں با ایں امید کہ قارئین مشعلِ آزادی حاصل کرکے صحیح معنوں میں شاعر کو خراج عقیدت پیش کریں گے

حصہ اول کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ حصہ دوم بھی اسی شان سے شائع ہو۔ اور حضرت ساغر کی شاعری کی آن اور بڑھے۔ ساغر نظامی اس شاہکار کے لئے اور رام دھیجہ صاحب (ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن نئی دہلی) اس خوبصورت کتاب کی اشاعت کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سادہ سرورق، مضبوط جلد، نہایت نفیس کتابت وطباعت عمدہ کاغذ اور اغلاط سے پاک اس نسخہ کی قیمت چالیس روپے ہے۔

امید ہے صاحبِ ذوق قارئین اور خصوصًا اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹی کی لائبریریوں کے لئے یہ منظوم دستاویز ضرور حاصل کی جائے گی۔ یہ کتاب پبلی کیشنز ڈویژن۔ پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ سپر بازار کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱، کامرس ہاؤس، کریم بھائی روڈ بیلارڈ پیئر بمبئی ۴۰۰۰۳۸ کے علاوہ کلکتہ، مدراس اور پٹنہ کے پبلی کیشنز دفاتر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔



فارم (۴)

۱۔ اشاعت کا مقام :
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی
۱۸ واں منزلہ، نیو ایڈمنسٹیٹو بلڈنگ۔ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

۲۔ اشاعت کا وقفہ : تین مہینے

۳۔ پرنٹر کا نام :
گورنمنٹ سینٹرل پریس، بمبئی ۴۰۰۰۰۴
قومیت : ہندوستانی
پتہ :
گورنمنٹ سینٹرل پریس، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

۴۔ پبلشر کا نام :
خواجہ عبدالغفور (ممبر سکریٹری)
قومیت : ہندوستانی
پتہ :
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی
۱۸ واں منزلہ، نیو ایڈمنسٹیٹو بلڈنگ۔ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

۵۔ ایڈیٹر کا نام :
خواجہ عبدالغفور
قومیت : ہندوستانی
پتہ :
یونا وِسٹا، جے بھوسلے مارگ۔ بمبئی

۶۔ اس رسالے کے مالکان، شرکار اور ایسے افراد کے نام اور پتے جو مجموعی سرمائے میں ایک فی صد سے زیادہ کے حصہ دار ہیں :
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

میں خواجہ عبدالغفور اس تحریر کی رُو سے اقرار کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم میں درست اور صحیح ہیں۔

تاریخ　　　دستخط　　　پبلشر

اقبال مسعود

کانچ کا آسمان

باہر پاگل ہوا برف پوش چٹانوں سے لپٹ کر سسکیاں بھر رہی تھی۔

مائیکل نے اپنا بخار سے جلتا ہوا ہاتھ ارباب کے شانے پر رکھا اور کمزور آواز میں بولا ــــ "میں اس کی آواز سن رہا ہوں دوست، وہ ہمیں بلا رہی ہے، اس پہاڑ کی نورانی چہرے والی شہزادی، وہ ہوا کے ہاتھوں ہمارے لئے استقبالیہ سندیسے بھیج رہی ہے۔

ارباب نے مائیکل کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، اس کے بدن پر بخار کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ مائیکل نے اپنی آنکھوں کے دہکتے انگارے ارباب کی طرف پھینکے ــــ "سنا تم نے؟ تم فوراً روانہ ہو جاؤ!"

ارباب نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے تھپتھپایا "میں ضرور جاؤں گا لیکن ذرا آپ کی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔"

"نہیں" ــــ مائیکل نے بگڑ کر کہا۔ "وقت ضائع نہ کرو، ابھی آسمان صاف ہے۔ اگر برف باری شروع ہو گئی تو تمہارے لئے آگے بڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ کیا اس نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ پیارا اچھے موسم پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے شکاری شکار پر ــــ اٹھو، فوری طور پر کوچ کی تیاری کرو"

ارباب نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ آپ کا بخار ــــ"

مائیکل نے جواب دیا ــــ "تم میری فکر نہ کرو ــــ میں ویسے بھی اب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا، سوچو میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ ــــ میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا ــــ سمجھے۔ تم قسمت کے دھنی ہو نوجوان ــــ کوہساروں کی رانیاں سب کو اپنے وصل سے سرشار نہیں کرتیں۔ صرف سات آٹھ گھنٹے کی مسافت ــــ اور پھر تم جائز طور پر اس کے کنوارے لمس کے حق دار ہو گے۔ اس کے اتنے قریب آ کے ناکام لوٹ جانا اتنی بڑی حماقت ہو گی جس کی میں تم جیسے خردمند سے ہرگز توقع نہیں کرتا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ارباب نے کہا، "لیکن صرف پہاڑ کی چوٹی سر کرنا ہی تو ہمارا مدعا نہیں۔"

مائیکل نے سسکی بھری اور اپنی زخمی ٹانگ کو کھینچ کر بولا ــــ چوٹی پر جھنڈا گاڑنے کے بعد دیکھنا کہ بدنصیب پیٹر کی لاش کہاں پڑی ہے، کسی کھڈ، کسی غار میں یا کسی چٹان پر ــــ ؟ اس نے اپنا آخری پیغام چوٹی کے قریب ہی سے دیا تھا" مائیکل تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ پھر دم لے کے بولا ــــ "وہ بے چارہ تو ملکۂ کوہسار کے دیدار سے محروم ہی رہا۔ اگر تمہیں اس کی لاش کا سراغ مل جائے تو اسے۔" مائیکل کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور شدتِ جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا۔ اس نے منہ پھیر لیا اور غار سے باہر دھندلائی ہوئی شام کو دیکھنے لگا۔ ارباب نے مائیکل کو کمبل اوڑھا دیا اور پھر غار کے تاریک گوشے میں آگ جلانے کی کوشش کرنے لگا تاکہ فضا کی یخ بستگی کو کم کیا جا سکے لیکن آگ بار بار بجھ جاتی تھی اور ہر شعلہ برف کا نارنگی قتلہ معلوم ہوتا تھا۔ حرارت مفقود تھی اور اس میں کسی دم توڑتے مریض کی ڈوبتی سانسوں کا ارتعاش تھا۔

ارباب نے غار سے باہر جھانکا۔ فضا دھندلی دھندلی تھی اور چاروں طرف برف کی دبیز چادر پر نیلاہٹیں رینگ رہی تھیں۔ نوکیلے عمودی پہاڑوں کے ستونوں پر کہر آلود آسمان کی قلعی شدہ چھت دھری ہوئی تھی جن تک جانے کے لئے برف کی سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ وہ اس سیڑھی پر کئی روز سے چڑھ رہے تھے اور سورج پیچھے رہ گیا تھا۔ کئی دن سے انہوں نے دھوپ کی شکل نہیں دیکھی تھی اس لئے کہ دھوپ بھی پیچھے رہ گئی تھی اور اسے یاد آیا جب وہ چلے

تھے تو کیسی روشن دھوپ تھی، لہکتی مہکتی جس میں کھیت دمک رہے تھے اور دھرتی سے اناج کی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی اور اس کے باپ نے کہا تھا — " نہ جاؤ بیٹا بلندیاں دھوکا دیتی ہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہم دونوں مل کر فصل کاٹیں گے "

لیکن ارباب کو اپنے بدن سے کسی اور طرح کی خوشبو آرہی تھی۔ چہکتا بولتا لہو اس کے بدن میں زعفران کھلا رہا تھا۔ ارباب کو اپنے وجود میں ایسی مسرّت گدگدیاں کرتی محسوس ہوئی جو محبوب کے تصور سے ہوتی ہے۔ اسے یاد آیا، مائیکل نے کہا تھا — " اگر تم پہاڑ کے سچّے عاشق ہو تو پھر تمہیں عہد کرنا پڑے گا کہ تم دوشیزۂ کوہسار کو مایوس نہیں کرو گے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں وہ حسینہ دلنواز سولہ سنگھار کئے صدیوں سے تمہاری راہ تک رہی ہے۔ معاً ارباب نے اپنے اندر ایک زرد پہاڑ کو انگڑائی لیتے دیکھا۔ خواہشوں کا پربت، جس کی چوٹی کہیں اس کے دل کے پاس واقع تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ آج تک وہ اپنے اندر اس عظیم پہاڑ کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اسے خیال آیا کہ بچپن میں بھی جب اس کی نگاہ وادی سے پرے آسمان سے سرگوشیاں کرتی پہاڑ کی چوٹی پر پڑتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ دوڑتا ہوا جائے اور برف کے نیلگوں گھونگھٹ میں چھپے ہوئے دوشیزۂ کہسار کے مکھڑے کو بے نقاب کر دے۔ وہ دیر تک کھیت کے کنارے بیٹھا پہاڑ کی چوٹی کو دیکھتا رہتا پھر جب وہ اٹھتا تو اس کے دونوں ہاتھ اور کلائیاں مٹی سے لتھڑے ہوئے ہوتے اس کا باپ کہتا۔ " دیکھو تمہارے ہاتھوں میں پھر کتنی مٹی لگ گئی ہے، جا کے انہیں چشمے پر دھو ڈالو "

ارباب کو اس وقت بالکل اندازہ نہ ہوتا کہ پہاڑ کی چوٹی دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ مٹی سے کیسے لتھڑ جاتے ہیں۔ لیکن اب پتہ چلا کہ یہ مٹی باہر کی نہیں تھی، یہ تو اس کے اندر کلبلاتی ہوئی زرد مٹی تھی۔ دراصل اس کے اندر کا پہاڑ بار بار اس کے مساموں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے باپ سے جو کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا کہا —

" بابا میں جاؤں گا۔"

" کہاں — ؟" اس کے باپ نے حیران ہو کے پوچھا

" وہاں۔" ارباب نے پہاڑ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ " جہاں آسمان پہاڑ کے سنگھاسن پر براجمان ہے۔"

" پگلا۔" اس کے باپ نے پیار سے کہا — " آسمان بھی کوئی مٹھی میں آنے والی چیز ہے۔ اس سے تو زیادہ دیکھو ہماری مٹی ہے۔ کیسی زندہ اور مہکتی ہوئی۔" اس نے ہل چلے کھیت سے ایک مٹھی خاک اٹھائی — دیکھو اس میں گیہوں کی خوشبو آرہی ہے "

اس نے کہا۔ " نہیں بابا میں بچپن سے اونچے پہاڑوں میں بند وادی کے اس سنگی پنجرے سے نکلنے کے خواب دیکھتا آرہا ہوں۔ میں آسمان کو چھونا چاہتا ہوں

اس کے باپ نے کہا — " جب تو چھوٹا بچّہ تھا اور اب ایک پڑھا لکھا نوجوان۔ پھر بھی "

ارباب نے مضبوط لہجے میں کہا " میں تو جاؤں گا "

اس کے باپ نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا " اور تیری بیوی؟"

" میں اسے سمجھا لوں گا بابا۔"

اس کے باپ نے کہا " مجھے تیری ضرورت ہے بیٹے، جب فصل تیار ہو گی اور گندم کی بالیاں ہاتھ ہلا کے ہمیں اپنی طرف بلائیں گی تو میں کیا کہوں گا؟"

ارباب چپ رہا۔ اس کا باپ بولا — " اور پتہ ہے اب تو ایک بچّے کا باپ بننے والا ہے؟ کیا تو اپنی بیوی کو اس حالت میں ۔۔۔۔!"

ارباب نے کہا " بابا اسے میری سیلانی طبیعت کا پتہ ہے میں اسے منا لوں گا۔" اسے یاد آیا مائیکل نے کہا تھا۔ " میرے دوست کوہ پیمائی تو جستجو کا سفر ہے، حقیقتوں کی تلاش اور جب حقیقتوں کے تعاقب میں نکلتے ہیں تو بہتوں کو پیچھے چھوڑنا پڑتا ہے۔ شاکیہ منی نے بھی تو یہی کہا تھا۔ وہ تمام رشتوں سے منہ موڑ کر کپل وستو سے نکلا اور ابد سے بغل گیر ہو گیا۔ تم مجھے دیکھو مائیکل داڑھی کھجا کے بولا — " میں کتنی دور سے آرہا ہوں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے، آخر کس لئے۔ کس لئے دوست — ؟ محض سچائی کی تشہیر کے لئے — سنو مجھ سے پہلے بھی بہت سے اس سفر پر نکلے تھے، جان ہتھیلی پر رکھ کر — اور ان میں سے کئی اب تک واپس نہیں لوٹے۔"

ارباب نے حیرت سے پوچھا۔ " کون لوگ تھے وہ — ؟"

" لوگ —" مائیکل نے پائپ سلگایا۔ " انہیں لوگ نہ کہو وہ تو شعلہ رنگ تمنّاؤں کے تیز رو بگولے تھے۔ آتش نفس ولولے — باغی جذبے۔ اور ان میں سے ایک نام پیٹر تھا — پیٹر اینڈرسن۔ میرا دوست اور ہم وطن — جو اپنی آنکھوں میں عشق بلاخیز کی قندیلیں جلائے پچھلے موسم بہار میں گھر سے نکلا تھا اور رات دن منزلوں پر منزلیں مارتا پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کا پتہ نہیں چلا۔"

"بے چارہ۔" ارباب نے کہا ـــ" شاید کوئی حادثہ ـ ؟"
مائیکل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔ ارباب نے پوچھا۔" تو گویا آپ کے اس سفر کا مقصد پیٹر کا پتہ چلانا ہے ـ ؟"

مائیکل نے کہا۔" دراصل یہ کہنا مشکل ہے کہ میں کس کے لئے یہاں آیا ہوں۔ شاید پیٹر کی خاطر۔ شاید اس پہاڑ کے جلوۂ یکتا کے لئے جس پر پیٹر نے اپنی جان نچھاور کر دی ـــ !" ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔" پیٹر بہت بہت نامور کوہ پیما تھا اور مہم کا سربراہ بھی۔ اس کا سوگ ساری دنیا کے کوہ پیماؤں نے منایا ہے اور اب اس کے نامکمل مشن کی تکمیل کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے۔ سنو جو شخص اس چوٹی کو سر کرے گا تاریخ اس کے لئے بانہیں پھیلائے کھڑی ہے۔ ساری دنیا اس بہادر آدمی کو سلام کرے گی اور انعام اس کے علاوہ "

وہ بیس کیمپ سے روانہ ہوئے تو ان کے ساتھ بہت سے لوگ تھے اور قلیوں کا لاؤ لشکر۔ پھر جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے نفری کم ہوتی چلی گئی۔ وہ گھنے جنگلوں اور سنگلاخ راستوں کو اپنے پیچھے چھوڑتے گئے۔ تیز و تند پہاڑی دریا، ابھری ہوئی نوکیلی چٹانیں، سنگریزوں کے سرکتے ہوئے صحرا، متحرک اور جان دار گلیشیئر جو دبے پاؤں نشیب کی طرف سفر میں تھے۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور بلندیاں ان کے قدموں سرنگوں ہوتی گئیں۔ کیمپ نمبر چار اور کیمپ نمبر پانچ کے درمیان سفر میں وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ پہاڑ کی عمودی چٹانوں کی فصیل پر کمند پھینکتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ دوشیزہ کہسار برف کی شال اوڑھے بڑی تمکنت سے انہیں دیکھ رہی ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو' تھوڑی اور ہمت' اور پھر میں تمہاری ہوں۔ کہر آلود چاند ان کے ہمراہ تھا اور پھیکی چاندنی میں متحرک پتھروں اور بہتی ہوئی برف میں پاؤں جماتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ کبھی وہ اپنے لمبے بوٹوں سمیت گھٹنوں تک برف کی دلدل میں دھنس جاتے۔ اس کے علاوہ تند ہوا' برف کی ٹڈیاں، شہاب ثاقب کی طرح اڑتے پتھر ـــ راستے میں بڑی مصیبتیں تھیں۔

ارباب اپنی آہنی چھڑی ٹیکتا ہوا کسی مست بیل کی طرح جھومتا جا رہا تھا۔ مائیکل نے جو اس کے پیچھے آ رہا تھا زور سے کہا۔" میرے دوست یقین نہیں آتا کہ تم پہلی بار اس مہم پر نکلے ہو۔ لگتا ہے جیسے تم اس میدان کے پرانے شہسوار ہو اور سارا پہاڑ تمہارا دیکھا بھالا ہے' اور دیکھو یہ صحیح ہے کہ تمہارے بدن میں جوان خون ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ مگر کچھ میرا تو خیال کرو۔ میں ٹھہرا تھکا ہوا بوڑھا آدمی' کہیں اتنا نہ پیچھے رہ جاؤں کہ ۔ ۔ ۔"

" واہ ـــ" ارباب نے زندہ دلی سے کہا۔" اچھا مائیکل' آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی سے بڑھاپے کی آرزو ؟ کمال ہے آپ تو کہتے تھے کہ کوہ پیما کبھی بوڑھے نہیں ہوتے "

مائیکل نے ارباب کے نزدیک پہنچتے ہوئے کہا۔" یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ کوہ پیما سخت جان ہوتے ہیں لیکن اپنی جان سے غافل نہیں ـــ دیکھو میں تھک گیا ہوں۔ کچھ دم لے کے آگے چلیں گے "

ارباب نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک انگی چٹان کے نیچے کسی غار کا برف سے ڈھکا ہوا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ چاند کی پھیکی روشنی میں وہ غار کی طرف بڑھے۔ اسی وقت زور کا دھماکا ہوا۔ ساتھ ہی مائیکل کی چیخ ابھری۔ ارباب نے پلٹ کر دیکھا۔ پہاڑ کی ڈھلوان سے برف اور مٹی کا ایک تودہ مست ہاتھی کی طرح دوڑتا ہوا آیا اور برف کی دلدلی جھیل میں دھنس گیا۔ مائیکل اس کی زد میں آ کر نیچے گر گیا تھا۔ ارباب نے تیزی سے آگے بڑھ کر پتھروں کو ہٹایا۔ مائیکل کی ایک ٹانگ جھول گئی تھی۔ ارباب مائیکل کو اٹھا کر غار میں لے گیا اور اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگا۔

صبح تک مائیکل کو تیز بخار ہو گیا۔ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ ارباب بڑی مستعدی سے اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ مائیکل کو ایک بار تھوڑا ہوش آیا اس نے کہا" میرے دوست اب میں ٹھیک ہوں۔ تم اپنی راہ کھوٹی نہ کرو، بس اب نکل کھڑے ہو' پہاڑ کی چوٹی نزدیک ہے مگر تاخیر سے سارا معاملہ بگڑ سکتا ہے "

ارباب نے کہا" آپ میری فکر نہ کریں۔ وہ عروس کہسار اب میری زد میں ہے، میں جب چاہوں گا اُسے جا لوں گا "

مائیکل نے ہاتھ اٹھا کے نحیف آواز میں کہا۔" بس تو پھر جاؤ۔ ابھی مجھ میں اتنی قوت باقی ہے کہ تمہارے منہ سے چوٹی سر ہو جانے کی خوش خبری سننے تک زندہ رہ سکوں۔ دیکھو تم تاریخ کے ایک عظیم فرد بننے والے ہو۔ بس اب یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ کیا پتہ پیٹر کی روح بھی کہیں آس پاس تمہاری منتظر ہو۔ بہادر بہادروں کے دیدار سے خوش ہوتے ہیں "

اور اب شام ہو رہی تھی۔ ارباب نے ایک بار پھر غار سے باہر آ کے پہاڑ کی چوٹی پر نظر ڈالی جو بالکل اس کے سر پر تنی کھڑی تھی' اور اس کے شانوں پر بادلوں کے دوشالے اُڑ رہے تھے۔ وہ اس کے حسن سے ایک بار پھر مرعوب ہو گیا اور اس کے اندر چھپا ہوا پہاڑ پھر سر اٹھانے لگا۔ ناموری، شہرت، بیٹر

سے نامکمل مشن کی تکمیل، اس کے سینے میں چٹانیں تنی ہوئی تھیں ۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا ۔ اسی وقت اسے مائیکل کی بڑبڑاہٹ سنائی دی ۔" ایلس ـــ ایلس ڈارلنگ، تم کہاں ہو ۔ ڈیوڈ میرے بیٹے "
اب ارباب کے کان میں ایک جانی پہچانی آواز آئی ۔ اس کی بیوی کہہ رہی تھی۔
" آپ مجھے اس حالت میں چھوڑ کے نہ جائیں ۔ کیا پتہ پھر میں آپ کو زندہ ملوں یا ـــ "

" نہیں" ارباب نے اس کے بازوؤں کو گردن سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا ۔" مجھے یقین ہے کہ تم زندہ رہوگی اور مجھے کامیاب و کامراں واپس آتے دیکھوگی، اب مجھے جانے دو "

ارباب نے چہرہ موڑا تو باپ کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی اور گیہوں کے خوشوں نے اپنے سنہرے ہاتھ ہوا میں اچھالے ۔" بیٹے ہم دونوں فصل کاٹیں گے "

معاً مائیکل نے سسکی بھری ۔" پیٹر میرے دوست چوٹی سر ہوگئی ہے "
ارباب چونک گیا ۔ اس نے اپنا لباس ٹھیک کیا اور آنکھوں پر گاگلز جما کے خاموشی سے باہر آگیا ۔ شام دھندلا رہی تھی اور ہوا تیز تھی ۔ ارباب نے چھڑی کی نوک برف میں گاڑی اور متوازن قدم رکھتا اوپر کی طرف چل پڑا ۔ وہ چلتا گیا ۔ عجیب پراسرار فضا تھی ۔ اسے ہوا کی سنسناہٹ میں کسی کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں ۔ اسے کئی بار یوں لگا گویا کوئی دبے قدموں اس کے پیچھے آرہا ہو ۔ اس نے ذرا ٹھہر کے آنے والے کی چاپ سننے کی کوشش کی مگر وہ تو ہوا تھی ۔ ایک بار اس نے غور کیا تو اسے مائیکل کی دور سے آتی آواز سنائی دی ـــ " پیٹر کو نہ بھولنا" ۔ پیٹر کو نہ بھولنا " ـــــ پیٹر، ارباب نے سوچا کون پیٹر ؟ وہ گم شدہ نام جس کی تلاش میں مائیکل اتنی دور سے آیا ہے ؟ اس کے دل نے کہا نہیں ۔ پیٹر تو ایک ناآسودہ آرزو کا نام ہے جو ہر انسان کے دل میں برگد کی طرح پھیلتی ہے ۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتا عمودی چٹانوں پر چڑھتا گیا ۔ ہر قدم پر چوٹی قریب آرہی تھی ۔ وہ خوشی سے سرشار بڑھتا گیا ۔ اچانک شام کی دھندلی فضا میں اسے کچھ نظر آیا ۔ کوئی ہیولا تھا، برف کا بگولا سا ۔ اسے لگا جیسے وہ برفانی پیکر اس کا نام لے کے پکار رہا ہو اس نے سوچا یقیناً قدرت اس پر مہربان ہے اور غیبی طاقتیں اس کی رہنمائی کر رہی ہیں ۔ وہ اس بگولے کے پیچھے چلتا رہا پھر ایک غار سامنے آیا ۔ اس نے بے تابی سے اندر جھانکا ۔ سامنے ایک جسم پڑا تھا، شاید پیٹر کی لاش، وہ اپنی کامیابی پر مسکرایا اور اندر گیا ۔ جیسے ہی اس نے پیٹر کے بدن کو چھوا ۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔" کون ایلس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ؟ "

ارباب نے دیکھا وہ تو مائیکل تھا ۔ پھر اس نے مائیکل کے جلتے بدن کو اپنی گود میں سمیٹ کے پیار سے کہا ۔" فکر مت کرو میں تمہیں ایلس کے پاس لے چلوں گا چچا مائیکل، اس قبل کہ تم پیٹر بنو ۔"

پھر جب وہ زخمی مائیکل کو ساتھ لئے نیچے اتر رہا تھا تو اسے محسوس ہو رہا تھا ۔ جیسے پہاڑ کی چوٹی جس کے عشق میں وہ یہاں تک آیا تھا سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے آرہی ہو ۔ ہوا کی سیٹیوں میں بھی اسے متواتر اپنے نام کی تکرار سنائی دے رہی تھی مگر ارباب بے نیازی سے نیچے اترتا رہا اور ہر قدم پر اس کے دل میں یہ خیال آتا رہا کہ جیسے وہ برف سے ڈھکے ہوئے آسمان پر چل رہا ہو جو کسی بھی لمحے اس کی ٹھوکر سے کانچ کے تھال کی طرح چھناکے سے ٹوٹ سکتا ہے ۔

رفیعہ شبنم عابدی

تلخیوں اور پرچھائیوں کا شاعر ساحر

عبدالحئی ساحر، لدھیانہ کے رہنے والے ضرور تھے لیکن ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بمبئی میں گذرا۔ لہٰذا جس طرح لدھیانہ کو ان کی جائے پیدائش ہونے پہ فخر ہے اسی طرح بمبئی کو ان کے مدفن کہلانے کا شرف حاصل ہے اور یہی وہ سرزمین ہے جہاں میں نے ساحر کو پہلی مرتبہ دیکھا سنا، ان کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا گہرا اثر قبول کیا۔ اتنا گہرا اثر کہ میں نے اپنی پہلی نظم ساحر ہی کے انداز میں لکھی اور وہ ساحر کی مشہور نظم "تاج محل" تھی چونکہ اسکے موضوع سے مجھے نظریاتی اختلاف تھا لہٰذا میں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ اس میں ساحر کی نظم سے کافی حد تک استفادہ کیا گیا تھا۔ مثلاً ساحر اپنی نظم کو یوں شروع کرتے ہیں ؎

تاج تیرے لئے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
مری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گذر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی

اور میں نے اپنی جوابی نظم کی ابتدا یوں کی تھی

تاج میرے لئے اک مظہر الفت ہی تو ہے
مجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی تو ہے
میرے محبوب! یہیں آکے ملا کر مجھ سے
بزم الفت میں حسینوں کا گذر لازم ہے
ثبت جس راہ پہ ہوں عشق و محبت کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر لازم ہے

ساحر کی نظم کا ایک بند ہے ؎

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کا ستوں
دامنِ دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہیں
جن میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خوں

میں نے جواب میں کہا تھا ؎

یہ حسیں مقبرہ، یہ عشق کا رنگین محل
مغلیہ عہد کے فنکاروں کی عظمت کا ستوں
دامن دہر پہ اس رنگ کی گلکاری ہے
جذب ہے جس کی ہر اک خشت میں ممتاز کا خوں

یہاں ساحر اور اپنی نظم کا تقابلی مطالعہ مقصود نہیں، اس لئے آخری بند پہ اکتفا کروں گی۔ ساحر کہتے ہیں ؎

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
مری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

اور میں نے اپنی نظم اس بند پہ ختم کی تھی ؎

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب و طاق
اک شہنشاہ نے "الفت" کا سہارا لے کر
اہل زر، اہل ہوس سب کا اڑایا ہے مذاق
مرے محبوب! یہیں آکے ملا کر مجھ سے

پھر اس کے بعد ساحر کی ایک مشہور نظم "خوبصورت موڑ" (چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں) کا جواب اپنی نظم "واپسی" (چلو اک

بار پھر اس وادئی الفت میں لوٹ آئیں) کے ذریعے دیا - یہ دونوں نظمیں ریڈیو سیلون کی ہندی نشریات سے براڈ کاسٹ ہوئیں - ساحر تک اس کی خبر پہنچی تو وہ صرف مسکرا کے رہ گئے

اس کے بعد مختلف ادبی تقاریب میں ساحر لدھیانوی سے ملاقات ہوتی رہی - ان دنوں روزنامہ انقلاب کے ادبی صفحے "ہفت رنگ" کے قلمکاروں کی ایک فعال بزم قائم ہوئی تھی - ساحر اس بزم کے صدر تھے اور میں اس کے گرلز سیکشن کی سکریٹری - اکثر ہفتہ وار ادبی نشستیں ان کے مکان پر منعقد ہوتیں لیکن میں کبھی شریک نہ ہو سکی - کیونکہ ان دنوں وہ ورسوا میں رہتے تھے اور میں نے اتفاق سے کرشن چندر کی کہانی "آخری بس" پڑھ لی تھی لہذا اندھیری ورسوا روڈ سے بڑا ڈر لگتا تھا (اب تو وہ کافی بارونق اور آباد ہو گیا ہے) البتہ اسی دوران ایک مضمون ساحر کی شاعری پر لکھا جو ماہنامہ "صبح امید" میں شائع ہوا - پھر سنا کہ وہ "پرچھائیاں" میں منتقل ہو گئے - پھر یہ خبر ملی کہ وہ دل کے مریض ہو گئے ہیں اور شاذ و نادر ہی کسی ادبی تقریب میں شرکت کرتے ہیں - وقت کے ساتھ ساتھ بزم ہفت رنگ کی ادبی محفلیں بھی نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں اس لئے ساحر سے ملاقات بھی شاذ و نادر ہی ہوتی رہی - غالباً ۱۹۷۸ء میں برہانی کالج (جہاں میں تدریس کے فرائض انجام دیتی ہوں) کی لٹریری سوسائٹی کی جانب سے فضیل جعفری صاحب نے ساحر کے اعزاز میں ایک نشست کا انعقاد طے کیا - ساحر نے رضامندی بھی ظاہر کر لی - جعفری صاحب کی فرمائش بلکہ حکم پر میں نے اس موقع پر پڑھنے کے لئے ساحر کی شاعری سے متعلق ایک مقالہ بھی لکھا - لیکن دل کا سخت دورہ پڑنے کے باعث اپنے ذاتی معالج کے حسب ہدایت ساحر اس پروگرام میں شرکت کرنے سے معذور رہے اس لئے اسے ملتوی کر دینا پڑا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے - اس وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے ساحر پر ایک اور مضمون اس وقت لکھنا ہوگا جب وہ اس دنیا میں نہ ہوں گے - وہ پل دو پل کے شاعر تو نہ تھے لیکن پتہ نہیں کیوں پل دو پل میں وہ ہم سب کا ساتھ چھوڑ گئے صرف تلخیوں اور پرچھائیوں کی بنا ، ان کا کلام ہمارے سامنے باقی رہ گیا جو صدیوں پر بھاری ہے -

ویسے بھی ساحر نے جس دور میں اپنی شاعری کی ابتداء کی وہ رومانیت کا دور نہ تھا کہ شاعر خیالی دنیا سے وابستہ رہتا اور ایک ظالم اور جفا کار محبوب کے ستم کا شکار ہو کر دم توڑ دیتا اور بدنام گلیوں میں اپنے جنازے کی تشہیر کرواتا - افق روس سے ایک نئی صبح کی صنو پھوٹ رہی تھی - خیالات و نظریات میں تبدیلی آرہی تھی - سامراجی مظالم کے خلاف بغاوت کا احساس ہندوستانیوں کے مردہ دلوں میں انگڑائیاں لینے لگا تھا - زندگی کے سنگین مسائل نے حق کیلئے آواز بلند کرنے کا حوصلہ سکھا دیا تھا انگریزی تعلیم نے ذہنوں کو جلا بخشی تھی - جاگیردارانہ نظام جو سامراجیت کی چھاؤں تلے پرورش پا رہا تھا اب کمال کو پہنچ کر دم توڑ دینے کے قریب تھا - کمزوروں اور ناتوانوں کے لہو میں حرارت پیدا ہو رہی تھی - فاقہ زدہ جسموں میں امنگوں کی توانائی دوڑ رہی تھی مفلسی کی خاطر بکتے ہوئے جسم زرداروں کی عیش گاہوں کی پردہ دری کرنے پر آمادہ نظر آرہے تھے - یہی وہ دور ہے جسے ترقی پسندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے - اردو شاعری میں اس احساس کا پہلا اظہار اقبال کے ہاں ملتا ہے - اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے "انقلاب" کا نعرہ بلند کیا پھر اس پر لبیک کہنے والوں کی بھیڑ لگ گئی - ساحر بھی اس اژدھام میں اپنے اونچے قد کے ساتھ داخل ہوئے اور بہت جلد اپنے منفرد لہجے اور مخصوص آواز کی وجہ سے پہچان لئے گئے -

ہر چند مری قوت گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبع خود آرا نہیں ہوتی
معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

ساحر کی تمام شاعری اسی تذلیل انسانی کے خلاف ایک احتجاج اور بغاوت کی حیثیت رکھتی ہے وہ جہاں کہیں بھی جس وقت بھی اور جس انداز میں بھی انسانیت کو ذلیل ہوتے ہوئے دیکھتے تھے تو چیخ اٹھتے تھے - اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی تاج کی سطوت کے پرستار نہیں تھے خودداریوں کے خون کی ارزانی اقبال کی طرح اس فرزند پنجاب کو بھی کبھی پسند نہ آئی وہ جانتے تھے کہ یہ دنیا وہ عجیب جگہ ہے جہاں حیات کے پردے میں موت پرورش پاتی ہے اور شکست ساز کی آواز روح نغمہ سمجھی جاتی ہے - یہاں وفا ایک فریب اور طول ہوس کے سوا کچھ بھی نہیں اسی لئے متضاد رنگوں سے بنے ہوئے پیکر جب ساحر کی بصارت و بصیرت سے ٹکرائے تو پرچھائیوں کا ایک حسین جہاں آباد ہو گیا - ایسی پرچھائیاں جو اپنے اندر زندگی کی تلخیاں سمیٹے ہوئے

بیوۂ حیات پہ صدیوں سے رقص کناں تھیں ساحر ایک طرف تو اونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے جھنکاریوں کی صدائیں سن رہے تھے تو دوسری طرف طبلوں کی تھاپ پر رقص کرتے ہوئے مجبور قدم اور پائل کی بےبس جھنکاران کی قوت سامعہ کا امتحان لے رہی تھی - ایک طرف افلاس اور بھوک سے دبی ہوئی کراہیں، کارخانوں اور ملوں میں لوہے کے شور وغل کے درمیان لاکھوں کروڑوں غریبوں کی دبی اور کچلی ہوئی خاموش چیخیں انکی روح کو لرزا رہی تھیں تو دوسری طرف وسیع و عریض شاہراہوں پر رنگین ساریوں اور حریری ملبوسات کی جھلک ان کی آنکھوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں - ایک طرف پٹڑیوں اور کاروں کی ریل پیل کے شور میں انھیں غریبوں کے زرد رو سسکتے ہوئے بچے نظر آ رہے تھے تو دوسری طرف جلسہ گاہوں کے بلند و بالا اسٹیج پر ضمیر فروش رہنماؤں کی دھواں دھار تقریریں ان کا پیچھا کر رہی تھیں کہیں بدنام کوچہ و بازار اور لٹتے ہوئے کارواں تھے تو کہیں تیرہ و تار غلاظت سے بھرپور جھونپڑیاں - جب ساحر ان مناظر کی تاب نہیں لا سکے تو بے ساختہ خودی کے محافظوں اور تقدیس مشرق کے جھوٹے ثنا خوانوں کو آواز دینے پر مجبور ہو گئے تاکہ ملک کے یہ نام نہاد رہبر جمہور کے جنازے کا نظارہ کر سکیں اور اس کے بعد بھی زندگی کی یہ تلخ حقیقتیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو ساحر تلملا اٹھے - ع

یہ بھی کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ساحر افراد شاہی کے وفادار کبھی نہیں رہے اور نہ صبح کے اجالے کی تعزیر کیلئے شب کی سنگین سیاہی کا ساتھ دیا وہ نہ شاہجہاں کے خلوص عشق کے قائل تھے اور نہ جہانگیر کی محبت کے - یہ تو محض "غریبوں کی محبت کا مذاق" اڑانے کا ایک طریقہ تھا - اور اس بات کا ثبوت بھی کہ کس طرح سالہا سال تک حیناؤں کے بازار لگتے رہے اور کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کی خاطر سرخ محلوں میں جوان جسموں کو لوٹا گیا - تزئین حرم کی خاطر شاخ سے منہ بند مہکی کلیاں نوچ لی گئیں -

انسانیت کی اس تمام تر ذلت و رسوائی کے باوجود بھی اپنے تمدن اپنی تہذیب اور اپنی روایات کے تئیں فخر کا ایک احساس ان کی طمانیت قلب کا باعث بنا رہا ع

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

اس "ہم" کے پیچھے ہزاروں مزدور، لاکھوں کسان اور کروڑوں مفلس چھپے نظر آتے ہیں - یہ تھا وہ ساحر جس کے فن میں روح عصر جلوہ گر ہے جس نے اپنے "لب نغمہ گر" سے ایک ایسی آگ بھڑکائی جس کے شعلوں نے کھوکھلی عشرت کے خداؤں کی جھوٹی شان و شوکت کو جلا کر خاک کر دیا اور وہ پکار اٹھا - ع

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار کون روکے گا
فصیل آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا

ساحر کے ہاں اگر جذباتیت اور رومانیت ہے تو انقلابیت بھی موجود ہے - حق کیلئے جان دینے کی آرزو اور سرفروشی کی تمنا کہیں کہیں چپکے چپکے سر اٹھاتی دکھائی دیتی ہے - مگر شاعر سماج اور حالات کے سامنے کچھ سہما سہما بھی نظر آتا ہے - ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس باغی کے سینے میں انقلاب کی آگ روشن ہے مگر وہ حوصلہ نہیں جو چاند ستاروں کو اس کنارے سے اس کنارے تک نوچ لیتا ہے اور نہ ہی وہ عزم ہے جو چنگیز و نادر کے تاجوں میں دمکتے ہوئے پتھروں کو توڑ دیتا ہے - زمین کو وہ اپنے خون سے گلزار کر دینے میں ناکام ہے لیکن اسی پر قانع نظر آتا ہے کہ کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم:

شاید اپنی فطرت کے اسی المیئے نے ساحر کو تلخیوں اور بربادیوں بھٹاں کا شاعر بنا دیا جو ساری دنیا کو خواب بننے کی دعوت تو دیتا ہے لیکن اس کے اپنے خواب چکنا چور رہیں یہی وہ تلخی ہے جو اس کے ذہن کو ایسے کرب سے دوچار کرتی ہے جو قنوطیت پر جا کر ختم ہوتی ہے - زندگی سے اکتساب نور کرنے کا شوق ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے اور ہر جگہ، ہر کام اور ہر چیز میں ساحر کے اندر کا کرب زدہ شاعر تاریک پہلو پر نظر ڈالنے کا عادی ہو جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ تاج کی عظمت بھی ساحر کو متاثر نہ کر سکی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے

کہ - ؏

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے۔
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کیلئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ ہماری ہی طرح مفلس تھے

نورجہاں کے مزار پہ جا کر انھیں خیال آتا ہے - ؏

کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

یوم آزادی کے پہلے جشن کے موقع پر بھی ذہن کی تلخی نہیں جاتی - ؏

یہ جشن، جشن مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمع اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسین فانوس

چھبیس ۲۶ جنوری پر یوں غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں - ؏

آؤ کہ آج غور کریں اس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو وہ حسیں خواب کیا ہوئے
دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوشحالیٔ عوام کے اسباب کیا ہوئے

جشن غالب منایا جاتا ہے تو ساحر کے لب یوں تلخ نوائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں ؏

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن، یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

گاندھی شتابدی اور غالب صدی کے اختتام پر جو نظم لکھی ہے اس میں حقیقتوں کا زہر یوں اگلتے ہیں - ؏

گاندھی ہو یا غالب ہو   دونوں کا کیا کام یہاں
اب کے برس بھی قتل ہوئی   اک کی شکشا اک کی زباں
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ انھیں اب کر دیں دفن

اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ساحر کی یہ تلخ نوائی بے سبب نہیں - ایک ایسا بچہ جو چھ مہینے کی عمر ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو جائے جس کی ماں کے حقوق جاگیردارانہ نظام، امارت اور اقتدار کے ہاتھوں تلف کر دیئے جائیں، جو فاقوں اور پریشانیوں میں پرورش پائے، جس کو اپنا سلسلۂ تعلیم وقت سے پہلے منقطع کر دینا پڑے، جس کے دل میں انسانیت کا درد اور نچلے اور کمزور طبقے سے محبت کا احساس ہو، جو سماج کی غلط نشست و برخاست کو چاہتے ہوئے بھی ختم نہ کر سکے، جو بہتے ہوئے خون کے سیلاب کو روک نہ سکے، جو محبت کے گیت گانا چاہے، لیکن اسے سرکش ترانے رالاپنے پڑیں تو اس کی مجبوریوں جھنجھلاہٹوں اور ذہنی کرب کا نتیجہ سوائے تلخ نوائی کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں عشق کے نغموں سے نفرت تھی یا فطرتاً وہ خونریزی کے افسانے پسند کرتے تھے - بلکہ حقیقت خود ان کی زبان پہ آجاتی تھی۔

؏ مرے سرکش ترانوں کی حقیقت تو اتنی ہے

کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بیکسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو، امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

ساحر کی اس تاویل کے بعد ان کی قنوطیت، طنز نگاری اور تلخ کلامی کو بھول جانا ہی زیادہ بہتر ہوگا - البتہ ایک بات ضرور ہے کہ اس قنوطیت کے باوجود بھی وہ ایک نئی صبح کی نمود سے ناامید نہیں ہیں - یہی ان کی شاعری کا ایک رجائی پہلو ہے - انھیں یقین ہے کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی جب یہ زر کارانہ غلط نظام حیات تبدیل ہوگا اور مستحقوں کو ان کے حقوق حاصل ہونگے - ؏

دبے گی کب تلک آواز آدم ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

کہہ کے وہ سماج کے با اقتدار طبقے کو چیلنج کئے بغیر نہیں رہتے تھے ساحر نظریاتی اعتبار سے اشتراکی تحریک کے حامیوں میں سے تھے اور آخر دم تک اسی کے وفادار رہے - وقت کے ساتھ ساتھ

جدید شاعری کا بھوت ان پر کبھی سوار نہیں ہوا۔ وہ اشتراکی روایتوں کے اسیر رہے۔ اور انھیں روایتوں کو گلے لگائے لگائے زندگی تمام کر دی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال نے لینن خدا کے حضور میں" فرمانِ خدا" اور" فرشتوں کا گیت" جیسی نظموں میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ساحر نے انھیں توسیع بخشی۔ اقبال آنے والے کل کی روشنی میں کل کا خواب دیکھ رہے تھے اور ساحر خوابوں کی شیرینیوں کو حقیقتوں کی تلخیوں سے نبرد آزما پا رہے تھے اقبال خدا کی زبان سے دنیا کے غریبوں کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ کاخ امراء کے در و دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور ساحر زیرِ لب تبسم سے دبی ہوئی مفلسی کی تخریب آور بغاوت دیکھ رہے تھے۔ اقبال پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دینا چاہتے تھے اور ساحر پیرانِ کلیسا سے عوام کی بیزاری کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے اقبال مستقبل کے آئینے میں ایک عوامی حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے اور ساحر اس خواب کی عملی تعبیر کا نظارہ کر رہے تھے۔ اقبال کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑا دینا چاہتے تھے۔ اور ساحر کنجشک فرومایہ کا حوصلہ اور شاہین کی زیردستی کا جائزہ کر رہے تھے۔ اقبال فرقہ پرستی کے ناپاک چراغوں کو بجھا دینا چاہتے تھے اور ساحر ان چراغوں کی مدھم ہوتی لوؤں پر نظریں جمائے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ اقبال" آدابِ جنوں" کا استعمال چاہتے تھے اور ساحر ان کے استعمال کا نتیجہ دیکھ رہے تھے۔ اگر اقبال کی نظم" فرمانِ خدا" اور ساحر کی نظم" طرحِ نو" کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ یا تو ساحر نے" فرمانِ خدا" کو پیشِ نظر رکھ کے یہ نظم کہی تھی یا پھر پنجاب کے دونوں بیٹے ایک ہی نہج پہ سوچ رہے تھے۔ دونوں نظمیں ملاحظہ ہوں۔

فرمانِ خدا (اقبال)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔ کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے ۔ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ ۔ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے ۔ کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے ۔ بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے ۔ آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

طرحِ نو (ساحر)

سعیٔ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر ۔ ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر
بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں ۔ سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر
فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام ۔ سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر
طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود ۔ شاہنشہوں کے ضابطۂ خودسری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو ۔ دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر
صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں ۔ آقائیٔ ہست و بود کی صنعت گری کی خیر

حقیقت تو یہ ہے کہ ساحر کی شاعری ترقی پسندی کی اس روایت کا ایک جزوِ عظیم رہی ہے جو روسی اشتراکیت و اشتمالیت اور عوامل و ضوابط کی تفہیم کے نتیجے میں ہمارے شاعروں تک پہنچی اور اردو شاعروں کے ایک مخصوص طبقے نے ایک نئی صبح کے انتظار کو حاصلِ زندگی قرار دیا اس نئے ابھرتے ہوئے سورج کی تپش کو ساحر کے" احساسِ کامراں" نے بڑی جلدی محسوس کر لیا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں شباب اور انقلاب، عشق اور اشک، جنون اور خون، دونوں کا حسین امتزاج موجود رہا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں شیریں خوابوں سے ٹکراتی ہیں اس تصادم میں کبھی حقیقتیں شکستہ ہوتی ہیں اور کبھی خوابوں کا خون ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ساحر کے کلام میں" خون" اور" لہو" کے پھول ہر جگہ مہکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو نظم کی پوری فضا خون آلود دکھائی دیتی ہے جو

خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا
(خون پھر خون ہے)

خونِ اعداء سے نہ ہو خونِ شہیداں ہی سے ہو
کچھ نہ کچھ اس دور میں رنگِ چمن نکھرا تو ہے
(لب پہ پابندی تو ہے)

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
(اے شریف انسانو!)

ہمارا خون امانت ہے نسل نو کیلئے
ہمارے خون پہ وحشی نہ پل سکیں گے کبھی
(پرچھائیاں)

ساحر کی وہ نظم جس میں ان کا فن بلندیوں کی سرحدوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے پرچھائیاں ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "پرچھائیاں" اردو شاعری کی دوسری "سحر البیان" ہے۔ اس میں ساحر اپنے فن کا سحر جگاتے ہوئے نظر آتے ہیں گو کہ اس موضوع پر یہ ایک اکیلی نظم نہیں، اردو شاعری میں بے شمار نظمیں موجود ہیں، جن میں سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن پرچھائیاں اپنے اسلوب اور ہیئت کے لحاظ سے ایک انفرادیت کی حامل ہے۔ جنگ عظیم اور اس کے ہولناک نتیجے میں ہندوستانیوں کو کیا کچھ بھگتنا پڑا اس کی عکاسی "پرچھائیاں" سے بہتر انداز میں کہیں نہیں ملتی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شاعر کی اپنی کہانی ہے۔ اسی لئے تو اس کے سینے میں جذبات واحساسات کا ایک تلاطم برپا ہے کبھی یہ جذبات بہت تیز ہو جاتے ہیں، بھڑک اٹھتے ہیں کبھی مدھم ہو جاتے ہیں۔ کبھی رک سے جاتے ہیں۔ جوش وخروش کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بحر میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ کہانی کا ہر نیا موڑ ایک نئی بحر کو جنم دیتا ہے اور ایسی بحر کو جو اس حادثے کی متقاضی ہے۔ آخر میں تصورات کی یہ پرچھائیاں ابھرتے ابھرتے جب اس شام تک پہنچتی ہیں جو سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی تھی تو نظم کا تاثر اپنے کلائمکس پر پہنچ جاتا ہے اور قاری کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ ع

اس شام مجھے معلوم ہوا جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے
اس شام مجھے معلوم ہوا جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانوں میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے

اور اس مقام پر پہنچ کر ساحر تو کیا ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ۔ ع

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ وجدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اس پیرہن سے نفرت ہے

یہ اسی نفرت کا ردعمل تھا کہ جب ہندو پاک کی جنگ ہوئی تو جہاں اور شاعروں نے اپنے ملک کے نوجوانوں کو حب الوطنی کے نام پر جنگ کی ترغیب دلائی۔ ساحر نے ایک سلجھے ہوئے صلح کن انداز میں امن کا پیغام دیا۔ ع

آؤ کہ اس تیرہ بخت دنیا میں	فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے	ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

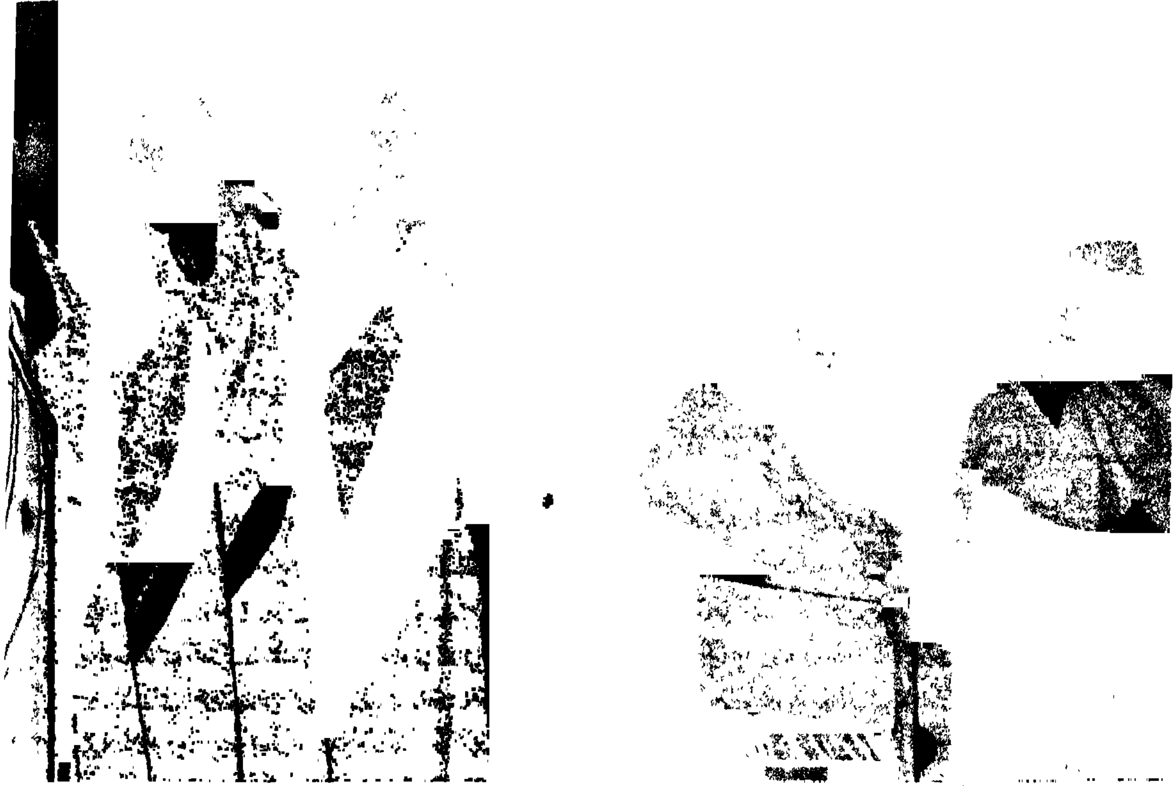
اور یہ جنگیں امن کی بقا کیلئے شاعر جن کی دعوت دے رہا ہے وہ وحشت وبربریت، اگر دآفریں سیاست، افلاس اور غلامی اور بھٹکی ہوئی قیادت سے لڑنے کا نام ہے۔ اسی لئے وہ ہار کر مایوس اور جیت کر خوش نہیں ہوتے

ع ہم کو ان سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے

ساحر کا یہ غم ان کی شاعری کی فضا پر محیط ہے۔ یہ غم کسی نہ کسی روپ میں، کسی نہ کسی رنگ میں ان کی ساری نظموں اور غزلوں میں گھلا ہوا ہے کہیں رومان کی چاشنی کے ساتھ، کہیں سیاسی کینوس پر پھیلا ہوا اور کہیں اشتراکی افق پر چمکتا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کو باآسانی تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے وہ نظمیں جو رومانی ہیں جیسے یکسوئی، شہکار، معذوری، شکست، کسی کو اداس دیکھ کر، گریز وغیرہ۔ دوسری وہ نظمیں جو سیاسی پس منظر لئے ہوئے ہیں، مثلاً گاندھی ہو یا غالب ہو، جشن غالب، اے شریف انسانو! کچھ باتیں، اجنبی محافظ، بنگال، کل اور آج، یہ کس کا لہو ہے وغیرہ تیسری وہ نظمیں جو اشتراکی نظریئے کی حامل ہیں۔ مثلاً سرزمین یاس، ایک گیت مجھے سوچنے دے، صبح نوروز، لینن ۱۹۱۷ء، لینن ۱۹۷۰ء، طلوع اشتراکیت طرح نو وغیرہ، کچھ نظمیں سماجی استحصال کے خلاف لکھی گئی ہیں جیسے چکلے، لمحے غنیمت شہزادے، تاج محل، اسی دوراہے پر، خودکشی سے پہلے، شعاع فردا، نورجہاں کے مزار پر وغیرہ۔ لیکن یہ تمام نظمیں عوامی ہمدردی، انسان نوازی اور محبت کا پیغام دیتی ہیں۔ ساحر زندگی بھر پرچھائیوں کا پیچھا کرتے رہے اور تلخیوں سے کام آشنا ہوتے رہے لیکن دنیا کو محبت بانٹتے رہے اور آخر دم تک انھیں اپنی محرومیوں سے نجات نہ مل سکی۔ ساحر نے کہا تھا۔ ع

گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے	اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں	حیات وموت کے پرہول خارزاروں سے
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری	انھیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر

لیکن خلاؤں میں کھو جانے والا یہ فنکار اردو شاعری کی فضاؤں میں ہمیشہ زندہ رہیگا۔



اقبال صدی کی اختتامی تقریب میں
شریمتی اندرا گاندھی کی تقریب

۱۰ ستمبر کو نئی دہلی میں اقبال صدی کی اختتامی تقریب کے موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے جو تقریر کی اس کا متن درج ذیل ہے۔

"مجھے بہت خوشی ہے کہ آج ہم اقبال صدی کے خاتمے کے بعد اہم ادیبوں اور لیکھکوں کے اعلیٰ خیالات کا ایک گلدستہ، ایک حسین کتاب کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ ملک بھر میں یہ صدی بڑی شان سے منائی گئی اور بھارت سرکار نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ یہ ہونا بھی چاہیئے تھا، کیونکہ اقبال ہندوستان کے

شاعر تھے، اور ہمارے اہم ادبی روایتوں کے امین تھے، وہ بھارت کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ان بڑے شاعروں میں ہیں جنہوں نے پوری نسل پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی ہے اور اپنے زمانے کے دکھ درد اور حوصلوں کو اپنایا ہے۔ بعض باتوں میں ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ہم یہ کیسے بھول سکتے ہیں کہ انھوں نے ہمیں آزادی کا وہ مشہور ترانہ دیا جو ابھی ان کے گانے میں آپ نے بھی سنا۔

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

یہ ہم کیسے بھول سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے "ساقی نامہ" میں کشمیر کے ریشم سازوں اور کاریگروں کا درد بھرا ذکر کیا، اور پچھڑے طبقوں سے اپنی محبت کا ثبوت دیا۔ وہ بہ ہموں زادۂ کشمیر ہونے پر فخر کرتے تھے۔ انھوں نے کرشن کے تشکام عمل کے فلسفے کو سراہا۔ انہوں نے "نیا شوالہ" میں بھارت سے گہری شردھا کا ان لفظوں میں اظہار کیا۔

ع خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ہم اقبال کی اس لئے بھی تعریف کرتے ہیں کہ وہ انسان کی آزادی اور ترقی کے شاعر تھے۔ مسلسل محبت، لگاتار تلاش اور کوشش ان کا نعرہ تھا ان کے دل میں انسان کے نیک ارادوں اور اچھے حوصلوں کی بڑی قدر تھی اچھے اور برے کی پہچان کے بناء دنیا میں اندھکار کیسے مٹ سکتا ہے۔ انسان کو سار اسنسار خدا کی امانت کے طور پر ملا ہے، اور یہ اس کا امتحان ہے کہ وہ اس خدا کی امانت کی حفاظت اور ترقی کے لئے کیا کیا اور کس طرح جتن کرتا ہے۔

غلامی اور سامراج کے خلاف اقبال نے بڑی زوردار اور شاندار نظمیں لکھیں۔ اور ہندوستان کو نہیں بلکہ سارے پچھڑے ایشیا کو انقلاب کی دعوت دی۔ انھوں نے برٹش غلامی کا بوجھ اتار پھینکنے کے لئے للکارا اور کہا کہ آزادی کا ایک لمحہ بھی غلامی کے ایک سال سے بڑھکر ہے

ع جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی

مسلم سیاست سے متعلق اقبال کے خیالات پر غور کرتے وقت یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت اسلامی دنیا سامراج واد کے چنگلوں میں گرفتار تھی۔ ایسے ہمت اور حوصلہ دینے کے لئے اقبال نے جو کچھ کہا ہے اسے اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

میرے والد نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے "اپنے آخری دنوں میں اقبال کا جھکاؤ زیادہ تر سوشلزم کی طرف ہونے لگا تھا۔ کچھ مہینے پہلے جب وہ ..... بستر سے اٹھ بھی نہ سکتے تھے، انھوں نے مجھے بلا بھیجا، اور میں ان کے بلاوے پر حاضر ہو گیا۔ میں ان سے کئی موضوعات پر باتیں کرتا رہا۔ میں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ اختلاف کے باوجود ان سے نباہ کرنا کتنا آسان تھا۔ وہ یادوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے

تھے۔ میں نے ان کی اور ان کی شاعری کی تعریف کی"

اقبال کی نگاہ میں دھرم انسانوں کو بانٹتا نہیں، ملاتا ہے۔ وہ دھرم کو انسانی اور اخلاقی قدروں کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ ہم ان کی آواز میں آدھی صدی سے سنتے چلے آرہے ہیں۔

ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

آج کل جو دنگے فساد ہو رہے ہیں وہ دوسری نیت سے شروع ہوئے تھے لیکن انھوں نے قومی نفرت اور دشمنی کی شکل اب لے لی ہے ہم سب کو ہمدردی اور افسوس ہے۔ ہمارا دل دکھی ہے، لیکن اس وجہ سے ہمیں اس جال میں نہیں پھنسنا چاہیئے۔ ان جھگڑوں کا کیا مقصد ہے، اسے مد نظر رکھتے ہوئے ہم پوری کوشش کریں کہ امن جلدی آئے، لوگوں کی جانیں اور مال محفوظ رہیں۔ کوئی بھی دل، کٹے یا شخص بچ نہیں سکتا ہے، اگر یہ ہمارا پیارا ملک کمزور ہوتا ہے ـــــ اور یہی سبق اقبال نے اپنے لفظوں میں ہمارے لئے چھوڑا ہے

کسی بڑے شاعر کو بندھے ٹکے پیمانے سے ناپنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ایسا پیمانہ ہے جو برابر بھرتا اور چھلکتا رہتا ہے۔ اقبال کو ہم ہی نہیں دوسرے بھی اپناتے ہیں۔ پاکستان ایران، اور عرب اور دیگر ایشیائی دیشوں کی طرح ہندوستان بھی اقبال کو بھارت کے ہی نہیں ایشیا کے بڑے شاعر کے روپ میں شردھانجلی دیتا ہے۔

ان چند لفظوں کے ساتھ میں اقبال صدی کمیٹی کے ممبران اور خاص کر علی سردار جعفری صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہ انھوں نے بہ حیثیت یادگار چھاپ کر اقبال کے پیغام کو ایک بڑے دائرے تک پہنچانے کا انتظام کیا ہے آپ سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کی اور ہمارے ساتھ اس موقع پر شامل ہوئے۔ "

اکادمی ڈائری

۳۰ مارچ

فصاحت جنگ حضرت جلیل حسن مانک پوری پر بھیونڈی (ضلع تھانہ) میں ایک عظیم الشان مذاکرہ (سیمینار) منعقد کیا گیا جس میں علم و ادب اور فنِ شعر و شاعری کی مشہور ہستیوں نے اپنے تحقیقی اور گراں قدر مقالوں کے ساتھ اکادمی کے چیئرمین محمد اسحٰق صاحب جم خانہ والا اور ممبر سکریٹری عالی جناب خواجہ عبدالغفور صاحب نے بنفس نفیس شرکت فرمائی۔

مذاکرہ کی صدارت خواجہ عبدالغفور صاحب نے فرمائی۔ جن قابل اور عظیم علمی شخصیتوں نے مختلف عنوانات پر مقالہ خوانی فرمائی۔ ان میں خاص طور پر فصاحت جنگ حضرت جلیل کے دو مشہور اور قابلِ فخر، لائق صاحبزادے جناب پروفیسر علی احمد جلیل اور جناب مشتاق احمد صاحب جلیلی قابلِ ذکر ہیں۔ علی احمد صاحب جلیلی حیدر آباد سے اور مشتاق احمد صاحب جلیلی بمبئی سے بطور خاص سیمینار اور مشاعرے میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ جناب شبیر احمد راہی نے جلیل کے ابتدائی حالات اور ڈاکٹر عبدالخالق انصاری نے بھی "جلیل کا ادبی مقام" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

علی احمد صاحب جلیلی کا مقالہ نہایت اعلیٰ ادبی و تحقیقی قدروں کا حامل تھا۔ مشتاق احمد صاحب جلیلی نے ان بے شمار اشعار میں سے بہت سے ایسے اشعار جو زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں اور روزمرّہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اپنے مقالے میں پیش کئے۔ خواجہ عبدالغفور صاحب نے اپنے مقالے میں حضرت جلیل کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے تھے۔



شب میں ٹھیک ۱/۲ ۹ بجے ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب جم خانہ والا کی صدارت میں احاطہ میونسپل اردو اسکول نال تالاب میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ نظامت کے فرائض جناب انجم رومانی صاحب نے ادا کئے۔ مقامی اور غیر مقامی کم و بیش ۲۵ شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ مہمان شعراء میں مجروح، علی احمد جلیلی، حسن کمال، قیصر الجعفری، منشاءالرحمٰن منشاء، بشر نواز، رفیق جعفر شمیم طارق، شاہد ندیم، ندیم صدیقی، ظفر شاہین، انعام دادر اور انجم رومانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

آخر میں کنوینر شبیر احمد راہی نے بطور خاص ڈاکٹر اسحٰق جم خانہ والا صاحب، خواجہ عبدالغفور صاحب اور خاص طور پر مہمان اور مقامی شعرائے کرام کا شکریہ ادا کیا اور مشاعرے کے ختم ہونے کا اعلان کیا۔

۱۵ اپریل

ممتاز پاکستانی افسانہ نگار جناب انتظار حسین اور جناب احمد ہمیش کی بمبئی میں آمد کے موقع پر ان کے اعزاز میں اردو اکادمی کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا جس کی صدارت چیئرمین اردو اکادمی ڈاکٹر اسحٰق جم خانہ والا نے فرمائی۔ اور مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب کنہیا لال کپور، گوپی چند نارنگ اور مجتبیٰ حسین نے شرکت کی۔

سب سے پہلے جناب گوپی چند نارنگ نے مشہور زمانہ فلسفی اور ادیب ژاں پال سارترے کی اچانک موت پر تعزیتی قرار داد پڑھ کر سنائی، سامعین نے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر سارترے کی موت پر اپنے غم کا اظہار کیا۔

ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور نے مہمان ادیبوں کا مختصراً تعارف پیش کیا اور اردو کے افسانوی ارتقاء کے موضوع پر 'داستان، کہانی اور افسانہ' کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون سے سامعین کو نوازا۔ آپ نے اپنے مضمون میں فرمایا کہ اردو افسانہ عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ افسانوں میں ہمارے سماج اور ماحول کی بڑی خوبصورت عکاسی نظر آتی ہے۔ مہمان خصوصی جناب کنہیا لال کپور نے اپنی دلچسپ تقریر میں برمحل اشعار سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔ اس کے علاوہ مجتبیٰ حسین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

آخر میں صدر جلسہ اور چیئرمین اردو اکادمی جناب اسحٰق جم خانہ والا نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ادب کو زمین کی سرحدوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ انتظار حسین اور احمد ہمیش کا تعلق ہمارے پڑوسی ملک سے ہے مگر وہ ہمارے لئے نئے نہیں ہیں۔ ان کی تحریریں اور افسانے یہاں نہایت دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے قدر دانوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود ہے۔

دوسرے روز پاکستانی افسانہ نگار انتظار حسین اور احمد ہمیش کے ساتھ شام افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب خواجہ عبدالغفور صاحب نے فرمائی۔ انتظار حسین اور احمد ہمیش کے علاوہ اس شامِ افسانہ میں جناب خواجہ احمد عباس، محترمہ سلمیٰ صدیقی، جناب سریندر پرکاش اور محترمہ قرۃ العین حیدر نے اپنے اپنے افسانوں سے سامعین کو نوازا۔



۲۳رجولائی

جامعہ اردو (علی گڑھ) کے امتحانات کی تیاری کے لئے مہاراشٹر اردو اکادیمی نے جامعہ اردو کلاسیز کا اہتمام کیا۔

۲۳رجولائی کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ان کلاسوں کا آغاز کیا گیا جس میں غیر اردو داں طلبہ کی ایک بڑی تعداد بھی شریک تھی۔ زیر نظر تصویر میں جامعہ اردو کی گورننگ کونسل کے رکن اور جامعہ اردو کلاسیز کمیٹی کے صدر جناب خواجہ عبدالغفور، کنوینر ڈاکٹر نظام الدین گوریکر اور سکریٹری انجمن اسلام جناب عبدالمجید پاٹکا کے ہمراہ طلبا، اور اساتذہ دیکھے جا سکتے ہیں۔



۲۹ر جولائی

ممتاز شاعر، ادیب اور محقق صفدر آہ ۲۹ر جولائی کو انتقال فرما گئے۔

صفدر آہ ۱۹۰۵ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے، ان کے نانا فارغ میر انیس کے اچھے شاگردوں میں تھے، آہ کی تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ہوئی، انگریزی، فارسی اور عربی کے علاوہ انہوں نے ہندی اور سنسکرت کے ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تلسی داس، میرا اور کبیر کے عالمانہ جائزے ان کی تحقیقی نظر اور تنقیدی بصارت کا ثبوت ہیں۔

ان کی کتابیں تلسی رام، رام چرتر مانس، میرا اور میریات ہندوستانی ڈرامہ، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، فردوسی ہند، پریم بانی اردو میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی کتاب رام چرتر مانس کو اردو اکادمی نے انعام سے نوازا تھا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی صفدر آہ کی موت پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتی ہے۔

۲۳ر اگست :

مہاراشٹر اردو اکادمی کی ایک میٹنگ منترالیہ جمخانہ میں منعقد ہوئی جس میں کئی اہم مسائل پر غور وخوض کیا گیا بورڈ میٹنگ میں یہ طے پایا کہ مشہور ڈرامہ نویس آغا حشر کاشمیری کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر اس سال ڈراموں کے انعامی مقابلے کو آغا حشر کے نام سے منسوب کیا جائے ۔ اور بمبئی میں اردو تھیٹر اور آغا حشر کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا جائے ۔

مجاہد آزادی اور ممتاز شاعر مولانا حسرت موہانی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ناگپور اور اکولہ میں سیمینار کا انعقاد کیا جائے ۔ سیمنار کے مزید انتظامات کے لئے خواجہ عبد الغفور، ڈاکٹر عبدالستار دلوی ۔ علی سردار جعفری اور سلمیٰ صدیقی پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی گئی ۔ بورڈ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ امسال مسودوں کی اشاعت کی امدادی رقوم میں اضافہ کیا جائے گا ۔

اس کے علاوہ مسودوں، کتابوں اور ڈراموں کی جانچ کے لئے ممبران اکادمی کے مشورے سے ججوں کا انتخاب عمل میں آیا ۔

مرزا غالب کی حیات اور فن پر لکھی گئی مراٹھی ناول کتھا ایک شاعرچی پر اندومتی شیورے کو اسپشل انعام سے نوازا گیا ۔

بورڈ ممبران نے بمبئی یونیورسٹی میں اردو شعبہ کے قیام کی منظوری اور اکادمی کی جانب سے پہلی



قسط کی ادائیگی پر اطمینان کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں سکریٹری خواجہ عبد الغفور اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی کی مساعی کو سراہا گیا۔

آئندہ تعلیمی سال کے دوران اردو شعبہ کا باقاعدہ قیام عمل میں آنے کی توقع ہے۔ اس شعبہ کو مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے نام نامی سے منسوب کیا جائے گا۔

پریم چند کی صد سالہ برسی کے موقع پر اردو اکادمی نے دوروزہ سیمینار اور مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اراکین اکادمی نے فیصلہ کیا کہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے بمبئی میونسپل کارپوریشن سے اردو کے اس عظیم افسانہ نگار کے نام سے بمبئی کی کسی شاہراہ کو منسوب کرنے کی درخواست کی جائے۔ مہاراشٹر کی دیگر کارپوریشن۔ ناگپور، اورنگ آباد، پونا، امراوتی، ناسک شولاپور سے بھی منشی پریم چند کی یاد میں راستہ منسوب کرنے کی درخواست کی جائے گی۔

ممبر اردو اکادمی علی سردار جعفری کو آندھرا پردیش اردو اکادمی کی جانب سے مخدوم ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ جس کے لئے اکادمی کی جانب سے ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کی گئی۔ دوسرے ممبر اکادمی ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی کتاب کی اشاعت پر ان کی خدمت میں بھی مبارکباد دی گئی۔ اس کے علاوہ بالاتفاق رائے سے مجروح سلطانپوری اور راجندر سنگھ بیدی کو غالب ایوارڈ سے نوازے جانے پر مبارکباد دی گئی۔

بورڈ میٹنگ نے جناب کنہیالال کپور، ڈاکٹر صفدر آہ، جمیل مظہری اور سردار عرفان کی موت پر گہرے رنج کا اظہار کیا اور تعزیتی قرار داد منظور کی گئی۔



۲۵ر اکتوبر

ممتاز شاعر اور رکن اردو اکادمی جناب ساحر لدھیانوی کا سانحہ ارتحال۔

ساحر لدھیانوی نے اپنی ترقی پسند رجحانات اور شاعرانہ صلاحیت کی وجہ سے بہت جلد عوامی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اپنے فلمی گیتوں میں بھی انہوں نے اپنے ادبی لب و لہجے کو برقرار رکھا۔ فلموں میں اردو کے جائز مقام دلانے کے لئے پیش پیش رہے۔

مہاراشٹر اردو اکادمی کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کئی مفید مشوروں سے نوازا تھا۔

حکومتِ ہند نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں پدم شری کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔

ان کی کتابیں 'تلخیاں'، 'پرچھائیاں'، 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' اور 'گا تا جائے بنجارہ' کے بے شمار ایڈیشن ... شائع ہو چکے ہیں۔



۸ر نومبر

آئے دن عروس البلاد ممبئی میں کل ہند بلکہ ہند۔ پاک مشاعرے اور دوسری علمی وادبی محفلیں سجتی رہتی ہیں اور یہاں کے صاحبِ ذوق اردوداں بلکہ وہ بھی کہ جو اردو بخوبی نہیں جانتے لیکن بولتے اور سمجھتے ہیں' ان محفلوں میں جوق در جوق آتے ہیں اور اپنی علم دوستی اور اردو سے بے پناہ محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔ خود ممبئی شہر ہندوستان بلکہ عالم گیر شہرت کے کے ممتاز و مفتخر شعراء اور ادیبوں کا مرکز ہے اور ان کی مقبولیت اور شہرت

اسی طرح کے مشاعرے' سیمینار' مذاکرے' مباحثے' استقبالئے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے ممبئی شہر نیز اور دیگر علاقہ جات مثلاً ناگپور' مالیگاؤں' شولاپور میں اس قسم کی تقریبات منعقد کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

اس بار مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مہاراشٹر کے مختلف علاقوں اور اضلاع کے ان شعراء کو دعوت دی جائے کہ جن کو بمبئی شہر میں روشناس ہونے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں اور جن کو ملتے بھی ہیں تو وہ گنے چنے معدودے چند ہیں اور کبھی کبھار ہی ان کو اپنے فن کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ ۸ر نومبر ۱۹۸۰ء کو اسی طرح کا ایک مشاعرہ مہاراشٹر کالج کے وسیع ہال پر منعقد کیا گیا جہاں پر جملہ اضلاع سے نمائندہ شعراء کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر اسحٰق جم خانہ والا صدر اکادمی نے کی۔ جناب سکندر علی وجدؔ نے محفلِ مشاعرہ کی صدارت سے اس محفل کو چار چاند لگائے اور اپنے کلام سے حاضرینِ محفل سے دادِ تحسین کی۔ جناب علی صاحب نوشاد موسیقارِ اعظم نے اپنی بے مثال شاعری سے بحیثیت مہمان خصوصی سامعین کے ذوق و شوق کو لطف و انبساط بخشا۔ مشہور اور ہر دل عزیز شاعر انجم رومانی نے بحیثیت کنوینر اور ناظم مشاعرہ بحسن و خوبی مشاعرہ کی کارروائی کو ازابتدا تا انتہا دلچسپ بنائے رکھا۔ بزرگ شعراء میں ڈاکٹر منشاءالرحمٰن منشاؔ۔ جناب بشر نواز۔ ناظم انصاری بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ پاگلؔ عادل آبادی نے اپنے مزاحیہ کلام سے مشاعرہ لوٹ لیا۔ دیگر نوجوان اور ابھرتے شعراء کو بھی سامعین نے دل کھول کر داد دی اور ان کے کلام سے محظوظ ہوتے۔

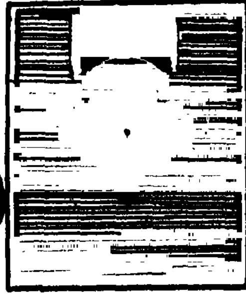
علامہ حسرت موہانی امام غزل اور مجاہدِ آزادی وطن کے صد سالہ جشن کے اس مبارک و مسعود موقع پر اس مشاعرے کو انہیں سے منسوب کیا گیا اور اردو اکادمی کے ممبر سکریٹری جناب خواجہ عبدالغفور نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اس موقع کی مناسبت سے علامہ موصوف کی شاعری اور سیاسی زندگی کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جو 'امکان' کے اسی شمارے میں شامل ہے۔ اکادمی کی جانب سے علامہ کے فن اور شخصیت پر ایک مذاکرہ بھی عنقریب ترتیب دیا جائے گا۔



رفقا مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

ریاض احمد خان، ایشور راج ماتھر۔ چیئرمین ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا
ممبر سکریٹری خواجہ عبدالغفور، اور جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر عبدالستار
دلوی کے ساتھ۔

رشتۂ تحریر



گیان چند (حیدرآباد)

مکرمی!

آداب عرض

رسالہ امکان اور کرم نامہ ملا۔ رسالہ کا کیا کہنا۔ خوب سے خوب تر ہے۔ اس کے ملنے کے لئے مشکور ہوں۔ کوشش کروں گا کہ پرچے کے لئے کچھ ارسال کرسکوں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

نیاز مند

گیان چند

وقار خلیل (حیدرآباد)

مخدوم مکرم خواجہ صاحب!

سلام مسنون

امکان پاکر بے نہایت مسرت ہوئی، مشمولات کا تنوع، تحریروں کا حسن، ترتیب کی سلیقہ مندی کے کیا کہنے۔ بالفاظ دیگر آپ صحافتی تاریخ میں خواجہ محمد نقوش (دہلی) جناب محمد طفیل مدیر نقوش لاہور) کی طرح یاد رہیں گے۔ ادھر اردو ادب اور اردو زبان نیز ثقافت کی سربلندی میں جس انہماک سے آپ مصروف بکار ہیں اس جذبے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے حیدرآبادی فرزند نے مہاراشٹر میں اردو کے جھنڈے نامساعد حالات میں سربلند کرکے زبان اور ادب کے تئیں کارنامہ انجام دیا ہے۔

خاکسار

وقار خلیل

نصیح الرحمٰن (بمبئی)

مکرمی خواجہ عبدالغفور صاحب

آداب!

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کا سہ ماہی مجلّہ "امکان" نظر نواز ہوا۔ شمارہ مکمل طور سے ایک شاہکار ہے۔ اس سے پہلے نورس کے نام سے شائع ہوا تھا۔ "نورس" اور "امکان" دونوں ہی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ مضامین اور غزلیات کافی معیاری ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، شاہد ندیم کے مضامین اس شمارہ کی جان ہیں۔ افسانے اور علاقائی ادب کے عنوان سے دیگر زبانوں کے افسانے بہت اچھے ہیں۔ اس طرح سے دیگر علاقائی زبانیں اردو سے قریب ہو سکیں گی۔

امید ہے آئندہ بھی اسی طرح کے ضخیم اور معیاری پرچے آپ کے توسط سے ملتے رہیں گے۔

مخلص

نصیح الرحمٰن

اسٹیٹ اردو اکادمی ہندوستان کی دیگر اکادمیوں سے ممتاز مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس میں آپ کی خداداد صلاحیتوں کا کافی دخل ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کرتے رہیں گے۔ کیونکہ ع
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔
دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

آپ کا
مقبول ولرن

عزیز الٰہ آبادی (بمبئی)

مکرمی خواجہ صاحب!
تسلیم و نیاز
"امکان" نظر نواز ہوا۔
رسالہ اپنے مواد اور صاف ستھری طباعت کی وجہ سے آج کے اردو کے اہم جرائد میں رکھا جا سکتا ہے۔
آپ کی نگرانی اور توجہ نے پرچے کو اعتبار کا درجہ عطا کر دیا ہے۔
میری طرف سے امکان کی مجلس مشاورت اور معاونین کو پرخلوص مبارکباد دے دیں

مخلص
عزیز الٰہ آبادی

مظہر حسین (غازی آباد)

مکرمی!
تسلیمات
سہ ماہی امکان دیکھا۔ پرچہ نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے اس شمارہ کو انعامی مقابلے میں رکھا جانا چاہئے تاکہ اکادمی کی دیگر کتابوں پر انعام کے ساتھ اس کو بھی بہترین چھپائی اعلیٰ کتابت اور معیاری صحافت کا انعام دیا جا سکے۔
اس شمارہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ نے اعلیٰ دماغوں کی خدمات حاصل کی ہے۔ اس سے آپ کے معیاری ذوق اور اردو سے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

نیازمند
مظہر حسین

انور اشفاق (مدیر نئی ٹائمز بمبئی)

محترمی! تسلیمات!
ایمرسن کے کہا تھا کہ فنکار کے فن کی قدر کرنے اور اس کو سراہنے سے زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس ہستی کو اعزاز دیں جس نے فنکار کے فن کو منظر عام پر پیش کر کے فنکار کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ ایمرسن کے کہنے کے مطابق اردو کے شیدائیوں کو خواجہ عبدالغفور جیسی عظیم ہستی کی قدر کرنا چاہئے اور ان کو اعزاز دینا چاہئے تاکہ اس ہستی کی وجہ سے مہاراشٹر میں اردو کا چراغ جلتا رہے اور اس کے پروانے ترقی کرتے رہیں۔
سہ ماہی امکان ان کی بے پناہ لگن کا نتیجہ ہے۔ ان کی اس بے پناہ لگن اور دلچسپی نے امکان کو اردو کا ایک خوبصورت اور معیاری تحفہ بنا دیا ہے۔ جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مخلص
انور اشفاق

اقبال احمد صدیقی (دہلی)

محترمی خواجہ صاحب!

آداب

آپ کے چند کارنامے ایسے ہیں جو ادبی دنیا میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ انھیں کارناموں میں سہ ماہی امکان کا اجراء بھی شامل ہے۔ امکان کا شمارہ ظاہری صورت سے جتنا خوبصورت اور دلکش ہے باطنی طور پر بھی اتنا ہی معیاری ہے۔ عمدہ اور نفیس کتابت بہترین گٹ اپ خوبصورت طباعت سے آراستہ یہ شمارہ جن ہاتھوں نے ترتیب دیا ہے میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں۔

ایسا ہی رسالہ اردو ادب میں آپ کی اس کاوش کو زندہ جاوید بنا سکتا ہے۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ کار لائق سے یاد کیجیے۔

مخلص،
اقبال احمد صدیقی

نعیم زاہد (بیڑ)

محترم خواجہ عبدالغفور صاحب!

امکان کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں اتنا صاف ستھرا، معیاری، اور کم قیمت پر اتنا ضخیم مجلہ پہلی مرتبہ پڑھنے اور دیکھنے کے لئے ملا۔ سچ جانئے آپ نے اور اکادمی کے معاونین نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس بے پناہ اور نایاب شمارہ پیش کرنے پر تمام کرم فرماؤں کا مشکور ہوں۔ اور توقع ہے کہ آئندہ بھی اسی معیار پر امکان برقرار رہے گا۔ مرحوم "ساحر لدھیانوی" پر بھی اس مرتبہ کچھ مقالات ہوں تو یہ ہماری جانب سے مرحوم کے لئے خراجِ عقیدت ہو سکے گا۔

خلوص کیش
نعیم زاہد

خداداد مونس:

گرامی قدر خواجہ عبدالغفور صاحب!

سلام مسنون۔

پہلے "نورس" اور پھر "امکان"، چشم بد دور نقش خوب تھا تو نقش ثانی خوب تر ہے۔ طباعت، ترتیب اور مواد ہر اعتبار سے کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

آپ اور آپ کے رفقاء مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا کرے کہ مستقبل کی ادبی تاریخ میں "امکان" کا اپنا ایک مقام ہو۔

نیاز مند
خداداد مونس

123746
20.3.95

مقبول ظہیر وارثی:

عزت مآب جناب خواجہ عبدالغفور صاحب!

آداب و نیاز۔

"امکان" دستیاب ہوا۔ دل خوشیوں سے جھوم اٹھا۔ اتنا حسین، اتنا دیدہ زیب مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا ادبی جریدہ ہوگا اس کا مطلق "امکان" نہ تھا۔ "نورس" کو امکان میں تبدیل کرنا بھی مصلحت ہے کیونکہ "نورس" کی دیدہ زیبی دیکھنے کے بعد اس کا قطعی امکان نہ تھا کہ نورس کی دوبارہ اشاعت ہو۔ آخر ہم لوگوں کی نظر جو لگ گئی تھی اسے ....

بہر حال دنیائے اردو ادب میں ایسے بہت کم جریدے ہیں جو اپنی پہلی ہی اشاعت کے بعد ہر خاص و عام میں مقبول ہو گئے ہیں۔ "امکان" اس حیثیت سے اپنی مثال آپ ہے ــــ بس اب "امکان" کی اشاعت سے مہاراشٹر